

گرداب

ہمارے سماج میں قانون تو کتابوں میں لکھا ہوا ہے لیکن اس کی باگ ڈور ہاں سماج کے روایتی نظام میں پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں۔ مختلف طبقات میں تقسیم ہمارے اس نظام میں قانون کے بھی کئی رخ ہیں۔ بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی تعریف کی ایک نئی تشریح کرتی ہے۔ ایسی تشریح جو کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے۔ ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے۔ جس میں طاقتور مچھلی جال کو تو ذکر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے۔ پھسٹا وہی ہے جو درمیانی طبقے سے ہو۔ محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو پس پوجاتی ہے۔ دل نہ تو طبقوں کی پروا کرتا ہے، نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اس راہ میں اسے جن آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے، یہ ہا تو دل جانے یا پھر خدا زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے ... یہ سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں۔ کبھی کبھی بازی ہلت بھی جاتی ہے، گزرا وقت تو لوٹ نہیں سکتا مگر کبھی کبھی مقدر ساتھ دے جاتا ہے۔ اس وقت تک ہلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا ہوتا ہے جرم، افسر شامی، جاگیر داری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا سلسلہ ہر سلسلہ۔



سامان سے لدا ہوا ٹرک اور سلو گرے مرسیڈز آگے پیچھے دوڑتے ہوئے وصول مٹی کے فہار سے ٹک کر ایک بڑے سے بچکے کے سامنے آٹھمڑے۔ یہ ایک سرکاری بنگلہ تھا لیکن دیگر سرکاری عمارتوں کے مقابلے میں اس کی ظاہری حالت اور رنگ و روغن نمایاں طور پر کافی بہتر نظر آ رہے تھے۔ لاہور کی جانب سے آنے والی یہ گاڑیاں جوں ہی بچکے کے گیٹ کے آگے رکیں، بچکے کا گیٹ کھٹ سے وا ہو گیا۔ کھلے گیٹ کے دونوں اطراف کی افراد انتظار بنائے استقبال انداز میں کھڑے تھے۔ ان افراد کو گاڑی میں بیٹھے افراد باہر سے ہی دیکھ سکتے تھے۔ مرسیڈز کی پہلی نشست پر موجود اسٹینٹ کشیز شہر پار عادل نے بھی بہ خوبی اس منظر کو دیکھا اور وہ جو اپنے تئیں مل از وقت پہنچ کر دوسروں کو حیرت میں مبتلا کرنے کا ارادہ کیے بیٹھا تھا، اس منظر کو دیکھ کر حیرت کی شدت سے کچھ یوں ساکت ہوا کہ ڈرائیور کے مرسیڈز کا دروازہ کھول دینے کے باوجود بھی کئی لمبے تک یہ نہیں اترتا۔

”خوش آمدید، خوش آمدید شہر پار صاحب ابڑی دیر سے ہم آپ کی ہی رانک رہے تھے۔“ شہر پار کے گاڑی سے برآمد ہوتے ہی کلف کے شلو ارتیش میں بیٹھیں، سر پر سفیدی شلہ پہنائے، بڑی بڑی مونچھوں والا لگ ٹیک ٹیک چٹین چٹین سال ایک شخص آگے بڑھا اور اپنے پیچھے کھڑے شخص کے ہاتھ سے گلاب اور مویچے کے پھولوں کا بنا بھاری بھر کم ہار کے شہر پار کے گلے میں ڈال دیا۔

”دیکھو سر!“ بیٹ شرت میں ملیں، گلے میں ٹائی اور آنکھوں پر عینک لگائے سنجیدہ صورت شخص نے شہر پار کے ہاتھوں میں ایک کیکے تمباک۔

”میں آپ کا پیالے عبداللہ ہوں اور یہ اس علاقے کے سب سے بڑے زمیندار جناب چودھری افتخار عالم شاہ ہیں۔“ سنجیدہ صورت شخص نے اپنا تعارف کروانے کے ساتھ ساتھ طے سے ہی روایتی چودھری نظر آنے والے شخص کا بھی تعارف کروایا۔ شہر پار نے اس تعارف پر سر کو کھنکھائی ایک ملکی کی جنبش دینے پر اکتفا کیا اور قدم آگے بڑھا دینے۔ پیالے عبداللہ اور چودھری افتخار عالم شاہ اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ کھلے گیٹ سے گزر کر اندرونی حصے کی طرف جاتے ہوئے دونوں اطراف کھڑے افراد نے گلاب کی پتیوں کی برسات اور تالیوں کے ساتھ شہر پار کا سواگت کیا۔ اس صورت حال پر شہر پار عادل نے شدید کوفت محسوس کی، یوں بھی وہ اچانک پہنچ کر دوسروں کو حیران کر دینے کے اپنے منصوبے کے ناکام ہونے پر پہلے ہی کافی تھکاپاٹ محسوس

کر رہا تھا۔

”مستمر سنا! میں فریش ہونا چاہتا ہوں۔“ لاؤنج میں داخل ہوتے ہی اپنے ساتھ چھوٹے سے جلیوں کی شکل میں چلتے ہوئے افراد میں سے کسی ایک کی طرف بھی نظر ڈالے بغیر شہر پار نے خشک لبے میں اپنے پیالے کو جھٹک کر تے ہوئے اپنی خواہش ظاہر کی۔

اسٹینٹ کشیز کی حیثیت سے بے شک یہ اس کی پہلی پوسٹنگ تھی لیکن وہ حکمرانی کے انداز سے بہر حال ناواقف نہیں تھا۔ لہجے کی اکڑ، گردن کا کلف اور آنکھوں کی بے نیازی، ان سب چیزوں کی تربیت اسے اپنے گھر کے ماحول سے ملتی تھی۔

وہ ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتا تھا جس کے بیشتر افراد پورہ درگاہ کی سیاست کی بھاپ پر اہم ترین بہروں کی حیثیت سے پہلے ہوئے تھے۔ جو ابھی اس میں شمل نہیں ہوئے تھے، وہ اپنے بڑوں سے کھیل کے قوانین و اصول سیکھ رہے تھے۔ شہر پار بھی بہت کچھ سیکھ اور جاننے کے بعد ہی اس میدان میں اترتا تھا۔ چنانچہ اس نے حیرت کے ابتدائی ہٹکے سے ٹک کر خود کو سنبھالنے میں زیادہ وقت نہیں لیا تھا۔ حیرت کا سبب بھی اپنے استقبال کا انداز نہیں بلکہ یہ بات بنی تھی کہ بنا اطلاع دے، مل از وقت یہاں پہنچنے کے باوجود استقبال کا یہ اہتمام کون کر سکتا ہوگا۔

”شیرسر!“ عبداللہ نے شہر پار کی فرمائش پر پہنچے تھے لیکن جواب دیا اور لاؤنج سے آگے اس کی راہنمائی کرنے لگا۔

”اسی صاحب کے تازہ دم ہونے تک چائے تیار کر کے میز پر لگاؤ۔“ خبردار! انہیں کوئی کمی نہیں دینی چاہیے۔“ عبداللہ کی راہنمائی میں لاؤنج سے نکلے ہوئے شہر پار عادل نے اپنے پیچھے چودھری افتخار کی کھجاندہ آواز سنی۔ یہ سرکاری بنگلہ تھا جہاں موجود خاندان اور بیگم کی یقیناً سرکاری ملازم تھے لیکن چودھری افتخار کے اعزاز سے لگتا تھا کہ وہ اس کے ذاتی ملازمین ہوں۔

”یہ آپ کا بیک دروم ہے سر! اس کے ساتھ ہی اٹیچمنٹ ہاتھ بھی موجود ہے۔“ آپ فریش ہو جائیں تو تھکنی کا مین دبا کر مجھے افتخار کو بھیجے گا۔ لاؤنج میں چودھری افتخار صاحب بھی آپ کے منتظر ہیں۔ آج شام کی چائے کا اہتمام انہوں نے ذاتی طور پر کروا لیا ہے۔“ تمام ضروری سہولیات سے مزین ایک کمرے میں پہنچ کر عبداللہ نے شہر پار عادل کو ہاتھ دروم اور تھکنی کے مین کی نشان دہی کرواتے ہوئے چودھری افتخار کی

بات یاد دہانی کروانا بھی ضروری سمجھا۔

شہر پار نے اس کی بات پر کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا اور چودھری افتخار کا پتہ لایا کیا بار جودہ لاؤنج میں ہی گلے سے اتار کر ہاتھ میں لے چکا تھا اور عبداللہ ان کا پیش کیا ہوا گئے، بے پروائی سے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر ڈال دیا۔

”ہائپر ٹرک پر میرا فریجنر، دیگر آرام کی اشیاء لوڈ ہیں۔“ آپ اپنی گھرانی میں سارا سامان اتر آ کر بیٹھنے میں سیٹ کروانا شروع کر دیں۔ کل تک یہ کام مکمل ہو جانا چاہیے۔“ کھجاندہ انداز میں پیالے سے کیتے ہوئے شہر پار نے ٹائی کی ٹاٹ ڈھکی کی۔

”لیکن سر! وہ چودھری صاحب!“ عبداللہ ان اس حکم پر کچھ متذبذب سا نظر آیا۔

”وہاں چودھری صاحب؟“ موجودہ صورت حال کی روشنی میں کچھ کچھ معالے کو سمجھتے ہوئے شہر پار نے تیز لہجے میں پوچھا۔

”مجھے مطلب تھا سر! چودھری صاحب نے آپ کے آنے سے قبل خود اپنے ذاتی خرچے پر بیٹھنے کی ساری ترگیمیں و آرائش کروائی ہے۔“ آپ کا لایا ہوا سامان سیٹ کرنے کے لیے نہیں چودھری صاحب کے ان تھکنے کو بٹھانا پڑے گا اور شاید یہ بات انہیں ناگوار گزرے۔“ بیڈ روم میں موجود فریجنر اور دیگر اشیاء کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عبداللہ نے جلدی جلدی اپنی اچھری بات کا مفہوم بیان کیا۔

”سو وحات؟“ چودھری صاحب نے یہ سب کچھ سمجھنے سے پوچھ کر یا میری فرمائش پر تو نہیں کر دیا۔ یہ بیگم کی الحال میرے ذہن پر استمال ہے اور اسے کس طرح اور کن چیزوں سے ڈیکوریٹ کروانا ہے۔ یہ ملے کرنے کا حق چودھری افتخار صاحب کو نہیں بلکہ مجھے حاصل ہے۔“ شہر پار نے رکھائی سے جواب دیا تو عبداللہ نے خاموشی اختیار کر لی۔ البتہ اس کے بشرے سے بے بسی صاف جھلک رہی تھی۔ دو صاحب اختیار افراد کے درمیان جھنڈا اس وقت وہ یقیناً خود کو کافی مشکل میں محسوس کر رہا تھا۔

”اور آپ یہ بتائیں کہ میرے استقبال کا سارا ڈراما کس طرح ایکٹ کیا گیا؟“ آفیشلی تو مجھے دو دن بعد یہاں آنا تھا۔ آپ کو اور باقی سب لوگوں کو میرے اس وقت یہاں پہنچنے کی اطلاع کیسے کی؟“ پیالے کو دیا وہ دیکھ کر شہر پار نے بہت دیر سے ذہن میں چٹکن سوال بھی کر ڈالا۔

”چودھری صاحب نے لاہور فون کر کے رانا صاحب سے معلوم کیا تھا۔ رانا صاحب سے معلوم ہوا کہ آپ آج کسی

وقت پہنچنے والے ہیں۔ وقت کا اندازہ چودھری صاحب نے لاہور سے آپ کی روانگی کا حساب کر کے خود ہی لگا لیا۔ آپ کے استقبال کے سارے انتظامات انہوں نے ہی کیے ہیں۔ وہ تو بہت مضرت کچھ بیٹھا ہے والے بیٹھے بلوے کے چائیں کھن میں نے سمجھا تھا کہ۔۔۔“ آج کے دور میں ان چیزوں کو زیادہ پسند نہیں کیا جاتا، انہیں ان کے اس ارادے سے باز رکھا۔“ عبداللہ نے بتایا تو شہر پار نے ساختہ ہی ایک گہرا سانس لے کر کہہ دیا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ رانا کے نام سے پہچانے جانے والے اس کے ایم اے اے ماموں کے ایک دور دراز گاؤں کے چودھری سے اسے قریبی مراسم ہوں گے کہ وہ صرف ایک فون کال کے ذریعے بھی ان سے شہر پار کے ذاتی پروگرام کے بارے میں آگاہی حاصل کر سکے۔

چودھری افتخار کا سوسر آف انفارمیشن پانے کے بعد اس نے عبداللہ کے مزید کوئی سوال کے بغیر سیدھا خانے کا رخ کر لیا۔ وہ غسل خانے سے باہر نکلا تو اس کا استری شدہ سوٹ سامنے والے ڈسکر پر لگا ہوا تھا۔ شہر پار کے ہونٹوں پر سوٹ دیکھ کر مسکراہٹ در آئی۔ تجربہ کار لوگوں کی دہی ہوئی انفارمیشن درست ثابت ہو رہی تھی۔ اس کی طرف سے کوئی بدانت نہ دینے جانے کے باوجود اس کے سوٹ کیس میں سے یہ سوٹ برآمد کروا کر استری کروانے کا یہ کارنامہ یقیناً عبداللہ نے ہی انجام دیا تھا۔ عبداللہ کو اس کا کردار پر دل ہی دل میں سراپے ہوئے شہر پار نے تیزی سے لباس تبدیل کیا اور عبداللہ کا بتایا ہوا گھنٹی کا شن و یاد دیا۔

چودھری افتخار کو اب مزید انفارماری کو قوت میں مبتلا کرنا مناسب نہیں تھا۔ شہر پار کو اندازہ تھا کہ وہ جس بے نیازی سے چودھری افتخار سے پیش آیا ہے، وہ چودھری کے حزان پر کافی گراں گزری ہوگی۔ ہر وقت اپنے آگے ہاتھ باندھے کھڑے رہنے والے لوگوں میں گہرے رہنے والے چودھری افتخار کی یقیناً اس قسم کے رویے سے آشنائی نہیں ہوگی اور اس نے بہت مشکل سے ہی شہر پار کے اس انداز کو محسوس کیا ہوگا۔

”لیں سر!“ کھنکی کا مین وہاں ہی عبداللہ کی بوتل کے جن کی طرح حاضر ہوا۔

”پلو بھیجی چل کر چودھری صاحب سے ملاقات کر لیں۔“ شہر پار نے قدرے خوش گواری لہجے میں کہا اور عبداللہ کی معیت میں کمرے سے باہر نکل گیا۔

”مجھے افسوس ہے چودھری صاحب کہ آپ کو انفارماری زحمت اٹھانی پڑی لیکن آپ سمجھ ہی سکتے ہیں کہ یہی روڈ اتنا لمبا سفر کرنے کے بعد آدمی کی کیا حالت ہو جاتی ہے۔ میں

گریز کرنا چاہیے، یہ سب کچھ انہوں نے ڈھکے چھپے الفاظ میں سمجھا دیا ہے۔ ان کے اعزاز سے لگ رہا تھا کہ ضلع کے تمام کام مجھے اپنی صوابدید یا حکام بالا کی ہدایت کے بجائے ان کے مشورے کے مطابق کرنے ہوں گے۔ آپ سے ان کے تعلقات کا خیال کر کے مجھے یہ ساری بکواس سنی پڑی۔ رات کے کھانے کے بعد میں نے بڑی مشکل سے انہیں اپنے بیٹے سے رخصت کیا ورنہ وہ جس اطمینان و فرصت سے بیٹھے تھے، اس سے لگتا تھا کہ شاید مجھے لوریاں سنا کر سنانے کا موڈ بھی رکھتے ہیں۔“

شہر یار عادل کو اپنے ماموں لیاقت رانا کی ہنسی ایک آنکھ نہ بھائی سو وہ انہیں چودھری افتخار سے متعلق مزید تفصیلات سنانے لگا جنہیں سن کر لیاقت رانا کے حلق سے ایک اور بلند قہقہہ برآمد ہوا لیکن پھر وہ فوراً ہی سنجیدہ ہو کر شہر یار کو سمجھانے لگے۔

”سمجھا کرو بیٹا جی! ان چودھریوں اور زمینداروں وغیرہ کو بھگتا بھی تمہاری جاب کا ایک حصہ ہے۔ ان سے بنا کر رکھو گے تو ہی کامیاب رہو گے۔ کمیشن کا امتحان پاس کر کے اے سی لگ جانا اتنا بڑا کارنامہ نہیں جتنا ان کو مجھ جیسے چودھریوں سے بنا کر رکھنا ضروری ہے۔ اور یہ چودھری افتخار تو تمہارے علاقے کا سب سے بڑا اور طاقتور ترین مکرچھ ہے۔ انہیں اس کے معاملے میں بہت احتیاط سے کام لینا ہوگا۔“

”میں کوئی کمزوری پھیلی تو نہیں ہوں کہ چودھری افتخار مجھے نکل جائے گا۔“ اپنے خاندانی اثر و رسوخ کے زہم میں شہر یار نے لیاقت رانا کی بات براہِ اعتراض کی۔

”بے شک، تمہارا شمار بھی مکرچھوں کی فیکٹری میں ہی ہوتا ہے لیکن سسٹم کو چلانے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ خود مکرچھوں میں آپس میں بیرتہ ہو۔ تمہاری تو ویسے بھی یہ پہلی پوسٹنگ ہے۔ بہت زیادہ احتیاط سے چھوٹک چھوٹک قدم اٹھاؤ۔ آگے تو خیر تجربے سے بہت کچھ خود ہی سیکھ لو گے مگر ابھی احتیاط لازم ہے۔ چودھری افتخار کے معاملے میں خاص طور پر احتیاط کرنی ہے۔ میں خود بھی اس سے بگاڑنے کے حق میں نہیں ہوں، جب ہی تو تمہارے پروگرام کا مقصد بھنے کے باوجود چودھری افتخار کے فون آنے پر اسے ہال نہیں سکا اور اسے تمہارے بارے میں اطلاع فراہم کر دی۔“ لیاقت رانا نے شہر یار کو سمجھایا۔

”آپ جانتے ہیں کہ میں اپنے معاملات میں کسی سے ڈکٹیشن لینا پسند نہیں کرتا۔ اگر چودھری افتخار نے مجھے ڈکٹیشن دینے اور مجھ پر تسلط جمانے کی کوشش کی تو ہمارا اختلاف

جھج جھج سی تو لڑکیاں ہیں یہاں کی۔ کوئی کام کی بات تک کرنا نہیں چاہتیں۔“ ماہ بانو حقیقتاً اتنی غریبی نہیں جتنی گناہوں آتے وقت ہمیشہ اسی کوفت کا مظاہرہ کرتی تھی۔

”مجھے کیا کرنا ہے یہاں کی لڑکیوں سے۔ جب تک دل چاہے بات کرنا ورنہ اپنی کتابیں لے کر الگ جینہ جانا۔ اتنی ڈھیر کتابیں ساتھ لے کر تو آئی ہے۔ ان کتابوں میں تو خوب دل لگتا ہے نہ تیرا۔“

صنذر جانتا تھا کہ ماہ بانو کا یہ سارا خراب اس کے سامنے موجود ہونے تک ہے، اس کے جاتے ہی وہ آہستہ آہستہ یہاں کے ماحول میں رچ بس جائے گی کیونکہ وہ بہ ظاہر غریبی لیکن حقیقت میں ایک مغایہت پسند لڑکی تھی۔ اس وقت بھی اس نے خاموشی اختیار کر لی تھی اور صنذر کے ساتھ قدم اٹھاتی ان راستوں پر چلتی رہی جہاں شاید اس کا بچپن گزرنا چاہیے تھا لیکن اب یہ راستے بھی کبھار ہی اس کے قدموں سے آشنا ہوتے تھے۔

☆☆☆

”ماموں جان! آپ نے یہ کس مصیبت کو میرے پیچھے لگا دیا ہے؟“ شہر یار عادل نے ٹپکی فون پر اپنے ماموں لیاقت رانا سے شکوہ کیا۔

”کس کی بات کر رہے ہو بیٹا جی؟“ لیاقت رانا نے تعجب سے پوچھا۔

”وہی بڑا آدمی کے چودھری افتخار عالم کی جو آپ سے معلومات حاصل کر کے میرے یہاں پہنچے سے تمہیں ہی سارے بیٹے پر قابض ہوئے بیٹھے تھے۔ میرا خاموشی سے یہاں پہنچ کر چھاپا مارنے کا پروگرام ان کی وجہ سے دھرا کا دھرا رہ گیا۔ اچھی خاصی بیٹھ بھاڑ لگا لی تھی انہوں نے یہاں۔ میرا خیال ہے کہ ان کا بس چلنا تو ایس توپوں کی سلائی کا بھی انتظام کر رکھتے مگر بس ہی نہیں چلا ہوگا اس لیے اس معاملے میں پیچھے رہ گئے۔“ شہر یار نے جملے بجنے انداز میں بتایا۔

لیاقت رانا اس کے انداز پر قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

”آپ ہنس رہے ہیں اور یہاں میرا کھول کھول کر بڑا حال ہے۔ موصوف کل سارا دن مجھ پر اور میرے بیٹے پر قبضہ کیے بیٹھے رہے۔ ملازمین کو احکامات تو بالکل اس طرح دے رہے تھے جیسے وہ میرے نہیں ان کے ملازمین ہوں۔ اس ملاقات میں انہوں نے مجھے اپنا اچھا خاصا ہدایت نامہ بھی سنا دیا ہے۔ مجھے کس زمیندار سے اچھے تعلقات رکھنے چاہئیں کس سے نہیں، کس مقامی افسر کو کھاس ڈانی چاہیے، کن معاملات میں دخل دینا چاہیے اور کن میں ہانگ اڑانے سے

لازمی ہے۔

”میں جانتا ہوں کہ تم کس مزاج کے ہو۔ تمہارے جیسا مزاج تمہاری ماں کا بھی تھا۔ ہم بھائیوں نے ساری زندگی اس کے خُرخے اٹھائے تھے۔ اب بھی میں تمہارے خُرخے اٹھانے کے لیے تیار ہوں بلکہ میں نے تمہارے بھی کبہ دیا ہے کہ تمہارا خاص طور پر خیال رکھے۔ وہ خود تمہیں بہت چاہتا ہے۔ تمہیں اس کی سپردت حاصل رہے گی۔ میرا مشورہ ہے کہ تم اپنی پستی والے دن تمہارے ملاقات ضرور کر لیتا۔ اس کے تجربے سے تمہیں کافی رہنمائی مل سکتی ہے۔“ شادو، لیاقت رانا کا بیٹا تھا جو ان دنوں ڈی آئی جی کی پوسٹ پر کام کر رہا تھا۔

”مشورہ کا شکر یہ ماموں جان! میں کوشش کروں گا کہ اس مشورہ پر عمل کر سکوں لیکن یہ بہر حال ملے ہے کہ میں کسی کو خود پر مسلط ہونے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اور چودھری افتخار جس پھجورے انداز میں یہ کوشش کر رہا تھا وہ میرے لیے بالکل ہی ناقابل برداشت ہے۔ آپ جانتے ہیں اس شخص نے میرے پیارے سے لگی ہی جھٹکے کا مارا فریج اور پردے وغیرہ تک خود اپنی مرضی سے پھینچ کر دادیے تھے۔ میں نے آج تک کسی اور کی پسند سے ایک ٹائی پن تک استعمال نہیں کی، یہ سب کیسے برداشت کروں گا؟ جس ٹرک میں، میں اپنا سامان لے گیا تھا یہی چودھری افتخار صاحب کی ساری مٹائیوں کو لوڑ کر آج صبح ان کی حویلی روانہ کر دیا ہے۔ اب یہ بات انہیں بری لگی ہو تو بھی میں ان کی خوشنودی کے لیے وہ سب قبول نہیں کر سکتا تھا۔“ شادو رانا عادل نے اپنا کارنامہ سنایا تو لیاقت رانا بے ساختہ کراہ کر رہ گئے۔ انہیں اندازہ ہو رہا تھا کہ ان کے مزاج دار بھائی نے اور تسلط پسند چودھری افتخار کے درمیان مستقبل میں تعلقات کس کسج پر جھٹکتے ہیں۔

”تم نے جو کچھ کیا شادو! میں اسے تمہارے لیے اچھا نہیں کہوں گا لیکن اب جو ہو گا سو ہو گیا۔ اصل میں چودھری افتخار ضلع میں آنے والے اکوڑا خلی افسران کو اپنی مٹائیوں کے زیر اثر لینے کا عادی ہے۔ عموماً مل کلاس سے ان پوسٹوں پر آنے والے لوگ چودھری کی ان عنایات کو پا کر خوش ہوتے ہیں۔ اگر کلاس سے ملنے دیکھنے والے بھی معمول کا ایک حصہ سمجھ کر ان عنایات کو قبول کر لیتے ہیں۔ تمہارے سامنے بھی یہی گلی بار یہ تھے وہ برائے تو تھے ہیں لیکن تم چونکہ ایک بالکل مختلف پلان ڈیزائن میں رکھ رہا ہیں پچھتے ہو اس لیے تمہیں چودھری افتخار کے رویے سے یک دم ہی ہلکا سا لگا۔ بہر حال، جو بھی

ہو اب میری یہ بات کان کھول کر سن لو کہ جی الامکان تمہیں چودھری افتخار اور ارد گرد کے دوسرے زمینداروں سے بٹا کر رہنا ہے۔ بے شک سپورٹ کے لیے میں اور سارا خاندان تمہاری ایک پرکھو جو ہے لیکن کوشش کرو کہ معاملات اس رخ پر جانے دیں نہ پائیں کہ کسی قسم کی بدحالی کا سامنا کرنا پڑے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو یا؟“ لیاقت رانا نے شادو کو سمجھانے کے بعد غرض اپنی سلی کے لیے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ شادو نے مختصر جواب دیا۔ جوش و دلولے سے بھرے اس نے جو ان کے لیے احتیاط اور محفوظی کی یہ راہ کچھ زیادہ قابل قبول نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

”ماہ بانو! یہ بھی اور شادو تجھ سے ملنے آئی ہیں۔“ ماہ بانو آسمان میں رکھی چار پائی پر بیٹھی سرمایہ مزدور سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ایک کتاب کے مطالعے میں غرق تھی کہ اپنی بہن زہرہ کی آواز پر سر اٹھا کر دیکھتا ہوا تقریباً زہرہ کی ہی عمر کی دو لڑکیاں اس کے سامنے کھڑی تھیں۔ دونوں لڑکیوں نے شوق رنگ کے لباس پہن رکھے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں چوڑیوں کے علاوہ کانوں اور ناک میں بھی سستا سا کڑی زینڈ نظر آ رہا تھا۔

”ہم دونوں بڑی بے چین تھیں تم سے ملنے کے لیے۔“ کتنا عرصہ ہو گیا تو گاؤں آئی ہی نہیں۔ ہم بس زہرہ سے ہی تیرے ٹھٹ بات کے قصے سنتے رہے۔ وہ دونوں بے تکلفی سے اس کے ساتھ ہی چار پائی پر بیٹھ گئیں اور ان میں سے ایک ماہ بانو کو بتاتے لگی۔ ماہ بانو نے سوائے نظروں سے اپنی بہن زہرہ کو دیکھا۔ وہ ان دونوں لڑکیوں کو پچکان نہیں لگتی تھی۔

”یہ بھی ہے اور یہ شادو۔ ہاں تم سے یہ بیٹیاں۔ وہی جن کے گھر کے سامنے پھیل کے دو درخت بالکل ایک ساتھ لگے ہوئے ہیں۔“ زہرہ نے ماہ بانو کی نظروں کا سوال سمجھتے ہوئے اسے یاد دلایا۔

”اچھا... اچھا مجھے یاد آ گیا۔ یہ سیریں اور شاداب ہیں۔ کسی ہوشیور لوگ؟“ ماہ بانو نے اپنی یادداشت کے تازہ ہونے ہی خوش اخلاقی سے ان دونوں سے پوچھا۔

”ہم تو ٹھیک ہیں، تو سنائیے کہ یہ اور اس واری کتنے دنوں کے لیے آئی ہے؟“ چھٹی نے بھی جوابی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ماہ بانو سے پوچھا۔

”میں بھی ٹھیک ہوں۔ رہی تھیں دن رہنے کی بات تو بس پختہ دس دن سے زیادہ نہیں رکوں گی۔ آتا ہے میں نے کہہ

دیا ہے کہ آنے والے اسکے اقرار کو مجھے لینے آ جائے۔“ ماہ بانو نے اپنے پروگرام کے بارے میں انہیں اطلاع دی۔

”صرف پختہ دس دن۔ دوسرے بعد آئی ہے، کم سے کم دو مہینے کے لیے کوئی۔“ شادو نے اعتراض کیا۔

”اسے دنوں کے لیے کیسے آسکتی ہوں؟ مجھے کالج بھی تو جانا ہوتا ہے۔ ابھی تو سر دیوں کی چھٹیاں تھیں تو میں آج بھی۔“ ماہ بانو نے اسے سمجھا دیا۔

”تو چھٹیاں کوئی صرف دس دن کی تو نہیں ہوں گی، تو زیادہ دس رکھ سکتی ہے۔“ شادو نے اصرار کیا۔

”چھٹیاں تو زیادہ ہیں مگر مجھے اپنی پڑھائی بھی کرنی ہے۔“ ماہ بانو نے وعدہ کیا ہے کہ اگر سر کے سہرا اٹھائے تو مجھے میڈیکل کالج میں داخلہ دلوا دیں گے۔“ ماہ بانو نے مسکرا کر بتایا۔

”لے لے، ماہ بانو! تو ڈاکٹر بنے گی؟ مگر سننا ہے کہ ڈاکٹری کی تعلیم (تعلیم) تو ڈیڑی بجتی ہوئی ہے۔ حیر ہے ہائی سکولوں کی ریڈیو ہے اتنی کمال ہو جاتی ہے کیا۔ کہ وہ تجھے ڈاکٹری پڑھا سکے؟“ چھٹی نے حیرت سے منہ کھول کر پوچھا۔ زہرہ سوال و جواب کے اس سیشن کو چھوڑ کر ہار پچی خانے میں جا چکی تھی۔

اسے نورماں کی حویلی سے واپسی سے قبل دوپہر کے لیے کھانے کا بندوبست کرنا تھا۔

”کیوں نہیں۔ بے ہے اور آتا کبھی میری کوئی فرمائش نہیں گئے۔ میری فرمائش پر ہی انہوں نے مجھے کالج میں داخل کر دیا ہے۔ بے ہے کہ میری بھی کہہ سکتی ڈال کر اسے پیسے جوڑنے کی کیرا میںڈ لکھ کالج میں داخلہ ہو جائے۔“

”تیرے تو حوسے ہیں۔ زہرہ بتا رہی تھی کہ وہاں کالج میں تو نے ہندو چلائی بھی سیکھ لی ہے۔ کیا کالج کے ہندو تو چلا جاتے ہیں؟“ شادو نے کچھ اس انداز میں سوال کیا جیسے اسے زہرہ کی فرمائش کو رد کرنا مطلوب ہے۔

”کچھ بتا رہی تھی زہرہ۔ اصل میں کالج میں ایف ایس سی کے اسٹوڈنٹس کو این سی سی کی ٹریننگ دی جاتی ہے۔ بس تم اسے بھی پھینکی فوٹی ٹریننگ سمجھو۔ اس ٹریننگ میں پریڈ کرنا بھی سکھاتے ہیں اور راتوں کو لوڑ کر کے چلانا بھی۔ ہماری تو اس ٹریننگ کے دوران شہری دفاع کی بھی کھائیں ہوتی ہیں۔ اس میں ہمیں زنیوں کی مرہم چھٹی کرنا، انٹینشن لگا کر دوسری چھوٹی چھوٹی باتیں سکھائی جاتی ہیں۔ اس ٹریننگ کے بعد تو مجھے اور بھی شوق ہو گیا ہے ڈاکٹر بننے کا۔“

”ہائے اللہ! یہ سب کتنا اچھا لگتا ہو گا تجھے۔ یہاں گاؤں میں تو بڑی روکھی پھینکی زندگی ہے۔ روزانہ وہی ایک جیسے کام کرو، ایک جیسے لوگوں سے ملو اور رات کو پڑ کر سو جاؤ۔

کچھ بھی تو اگ سے نہیں ہوتا۔ مگر میں نے ہی تک نہیں ہے کہ چلو اس سے ہی دل بہلا لیں۔ پورے گاؤں میں چودھری کی حویلی کے سوا صرف تین ہی دی ہیں۔ ایک تیرے چاچا کے گھر، دوسرا ماموں تلپور کے گھر جن کا پتا فوج میں ہے اور تیسرا مسٹر آفاب کے پاس۔ ہم تینوں میں سے ایک بھی کچھ نہیں جانتے۔ اب کی اجازت ہی نہیں ہے۔“ چھٹی نے ڈی حسرت سے بتایا۔

”تو تو ایسے بول رہی ہے جیسے گاؤں کی باقی لڑکیاں کو اجازت ہو۔ مولوی صاحب نے کتنی سختی سے منع کیا تھا! دی دیکھتے سے... یاد میں۔ ایسے غلاموں کے بارے میں بتایا تھا کہ میں آج تک کانوں کو ہاتھ لگاتی ہوں۔“ زہرہ ہانڈی چڑھا کر بار پچی خانے سے نکل آئی تھی۔ چھٹی کی بات سن کر کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔

”بس بس رہتے رہتے تیرے چاچا کا گھر تو تیرا ہلے والا اسرائیل ہے۔ تیرے مشیر نے دینی کی کمانی سے یہ دی خرید کر بیچا ہے۔ جب تو یہاں کر اس گھر میں جائے تو سارے عذاب و آفات بھول کر دے دی دیکھا کرے گی۔“ چھٹی فوراً چپک کر بولی۔

”نہ بات۔ میں تو نہیں پی وی دیکھنے والی۔ جس کوٹن ہے وہ خود ہی اکیلا دیکھتا بھرے۔“ زہرہ نے ایک ہانڈی کان پکڑے۔

”بھئی میرے خیال میں تو پی وی دیکھنے میں اتنی ہی حرج نہیں۔ بندہ اگلے سیدھے تاجا گانے کے پروگرام دیکھنے کے بجائے معلوماتی پروگرام دیکھتے تو پی وی سے بہت کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ اس کے ذریعے تو کھر پیٹنے، مقامات اور ایجادات دیکھنے کو مل جاتی ہیں جن تک ہماری کٹا ہی نہیں ہوتی۔ دنیا جہاں کی خبریں مل جاتی ہیں پی وی سے۔ آجائے تو پچھلے سال ہی بنار میں پی وی خریدیا ہے۔“

”تم اپنا تو ذکر ہی نہیں کرو۔ تمہیں تو بہت کچھ معلوم ہے۔“ شادو حد میرے انداز میں بولی۔

”ہاں یہ تو اللہ کا شکر ہے کہ تم لوگ بھی اپنے لیے بہت کچھ کر سکتی ہو۔ کچھ نہیں تو کم از کم تھوڑا بہت پڑھنا لکھنا ہی چکے ہو۔ کتابوں کے ذریعے بھی آدھی دنیا جہاں کی سیر کر سکتا ہے لیکن تم لوگوں نے اس طرف توجہ ہی نہیں دی۔ گاؤں میں جیسا بھی کچھ ایک اسکول ہو تو۔ اگر تم لوگ وہاں پر ہی چلی رہیں تو اس لائق تو ہو جائیں کہ اردو ہی لکھنا پڑھنا سیکھ لیں۔“ ماہ بانو نے موقع قیمت جان کر ان لوگوں کو جھگڑانے کی کوشش کی۔

”صاف بات ہے ہمیں تو پڑھنے لکھنے کا شوق ہی نہیں ہے۔ جنہیں تھا، وہ بھی دو چار جماعتوں سے آگے نہیں پڑھ سکیں۔ اسکول میں کوئی استانی تو ہے نہیں، اب لڑکیاں مرد استاد سے تو پڑھنے سے رہیں۔“ چچی نے جواب دیا۔

”یہ مسئلہ تو ہے۔ گورنمنٹ کو چاہیے کہ اس مسئلے میں کچھ کرے۔ اگر ایک لیڈی ٹیچر یہاں آجائے تو گاؤں کی بہت لڑکیاں کا بھلا ہو جائے گا۔“ ماہ بانو نے پر خیال لہجے میں تبصرہ کیا۔

”بہنیں ہی دو۔ پڑھ لکھ کر ہم لڑکیوں نے کیا کرنا ہے؟ باڈی روٹی، سلائی، کڑھائی، چٹائی سارے کام بغیر نظم کے بھی آرام سے ہو جاتے ہیں۔“ چچی نے گویا تک پر سے بھی اڑائی۔

”ایسا کہ ماہ بانو! تو ادھر ادھر آ جاؤ۔ تم ادھر ہمارے ساتھ رہنا اور اسکول میں لڑکیوں کو پڑھانا۔“ زہرہ نے اچانک ہی یہ تجویز پیش کی۔

”مم... میں... مگر مجھے تو ڈاکٹر بننا ہے۔“ ماہ بانو پیلے اس تجویز پر ہلکائی پر چڑ خیال لہجے میں یوئی۔

”بھئی کے لیے تو نہیں پرایا ہو سکتا ہے کہ جب گرمیوں میں کالج کی لکھی چٹائی پڑے تو میں یہاں رہنے آ جاؤں اور جن لڑکیوں کو شوق ہو، انہیں پڑھنا لکھنا سکھادوں۔“

”بس... بس رہنے دو یہ شیخ چلی کے منصوبے۔ چودھری صاحب کو معلوم ہو گیا کہ کوئی ایسا سوچ رہا ہے تو وہ اس کے ٹوٹے ٹوٹے کڑواؤں کے۔ انہیں کبھی پندرہ لڑکیوں کا اسکول میں پڑھنا۔“ چچی نے اپنی گول گول آنکھوں کو کھماتے ہوئے تجویز کے میں ماہ بانو کو ٹوکا۔

ماہ بانو اس کے اس انداز پر کچھ ناگواری محسوس کرتی ہوئی دوبارہ اس کتاب کی طرف متوجہ ہوئی جس کے مطالعے میں وہ ان دونوں بچوں کی آمد سے مل مسرور ہوئی تھی۔ اپنی اس مسروریت میں اسے معلوم بھی نہیں ہو سکا کہ چچی اور شادو نے آنکھوں تلخ آنکھوں میں کیا تبادلوں خیال کیا۔ اور کب وہاں سے روانہ ہوئیں؟

☆☆☆

”بڑی چودھرائن نے بھلوا لیا ہے کہ کام پر آتے ہوئے ماہ بانو کو بھی اپنے ساتھ حویلی لے کر آنا۔“ نوران صبح تڑکے سے اٹھ کر جلدی جلدی گھر کا کام کاج مٹا رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی اور آنے والی نے نوران کا منہ دیکھتے ہی اسے پیغام پہنچایا۔

”ماہ بانو کو بلایا ہے... پر کس لیے؟“ نوران حیران ہوئی۔ خود اس کا تو برسوں سے معمول تھا کہ صبح سے دو پہر تک

کا وقت حویلی والوں کی خدمت کرتے ہوئے گزارتی تھی لیکن چار دن کی مہمان آئی ماہ بانو کو حویلی سے بلائے جانے کا مقصد اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

”مجھے تو خبر نہیں، تو جا کر آپ ہی سوال جواب کر لینا دوڑی چودھرائن سے کہ انہوں نے کیوں تیری دینی کو بلایا ہے۔“ پیٹام لانے والی حویلی کی ملازمت نے طغیہ لہجے میں نوران کو جواب دیا۔

”نندہ... میں بھلا کون ہوتی ہوں دوڑی چودھرائن سے سوال جواب کرنے والی۔ انہوں نے قسم دیا ہے تو ماہ بانو کو لے کر ہی آؤں گی۔“ نوران نے گھر کا خوشامد لیبلہ اعتبار کیا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر اس ملازمت نے جا کر بڑی چودھرائن سے کچھ انا سیدھا کھد دیا تو اس کی مصیبت ہی آجائے گی۔ گاؤں کے بیشتر گھروں کی طرح اس کے گھر کا رزق بھی حویلی سے ہی وابستہ تھا اور حویلی والے خفا ہوتے تو اپنے جرم کی پینٹ پر لات سب سے پہلے مارتے تھے۔

”ٹھیک ہے۔ میں چلتی ہوں۔“ تو ماہ بانو کو لے کر نیم پر پہنچ جانا۔“ ملازمت نخواست سے کبھی ہوئی پلٹ ہی مگر نوران کے اندر ہول اٹھنے لگے۔ ماہ بانو پیلے بھی کئی بار گاؤں آ کر رہی تھی لیکن اس سے پہلے تو بھی چودھرائن کو اسے حویلی بلوانے کا خیال نہیں آیا تھا۔ نوران کے گھر بے کی روشنی میں بڑی چودھرائن کا خاص طور پر پیٹام بچ کر ماہ بانو کو حویلی میں طلب کرنا کسی مصیبت کا پیش خیمہ تھا لیکن حکم کی قیامت تو بھر حال کرتی ہی تھی۔ انہی سوچوں میں گھری ہوئی وہ دروازے سے اندر کی طرف چلی۔ آٹکن میں زہرہ لٹکی والی چھانڈو سے نیم پینڈے فرش پر پھرنے نیم کے گرے ہوئے چوں کو سمیٹ کر ایک جگہ جمع کر رہی تھی۔

”نی زہرہ! جا کر ذرا ماہ بانو کو ٹوک چگا۔“ زہرہ کو حکم دے کر نوران خود باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔

”وہ نہیں اچھی اماں! لگتا ہے مردوں سے شرط باندھ کر سوئی ہے۔“ تھوڑی دیر بعد ہی زہرہ نے آکر بے زاری سے اطلاع دی۔

”اچھا تو ادھر آ کر یہ دو دو بلو۔ میں آپ ہی اسے دیکھتی ہوں۔“ نوران اپنی جگہ سے ہٹ گئی۔ زہرہ نے فوراً ہی اس کی جگہ سنبھال لی۔ زہرہ صبح اس کے ساتھ ہی جاگ جاتی تھی اور گھر کے کاموں میں دو دو ڈوڑ کر نوران کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ آج بھی اس نے غیث کے کھیتوں پر روانگی سے پہلے اس کا اور چھوٹے بھائی الیاس کا ناشتا تیار کر کے دیا تھا اور اب گھر کی صفائی سترائی میں مصروف تھی۔ نوران کی بڑی بیٹی لکڑی بھی

اپنے بیاہ سے قبل اسی طرح اس کا ہاتھ بٹاتی تھی لیکن ماہ بانو اپنی بڑی دونوں بہنوں سے مختلف تھی۔ شہری زندگی اور گاؤں سے دوری نے اس کا مزاج اور معمولات بدل دیے تھے۔ اب بھی نوران آٹکن سے گزر کر کمرے میں پہنچتی تو اسے ماہ بانو لاف میں دیکھ کر دنیا و فانیہ سے خبر سوئی ہوئی ٹھہراتی۔ اس کی بے جا مدح پر عیند کو کچھ کھٹکی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کچھ دیر قبل کسی نے اسے چنگے کی بھر پور کوشش کی تھی۔

”ماہ بانو! اچھا۔“ دیکھ کر نکٹا دل نکل آیا ہے۔“ نوران نے نرمی سے ماہ بانو کا بازو ہلاتے ہوئے اسے آواز دی لیکن وہ اس بیکار پر ذرا سا کسمسا کر دوسری طرف کر دت بدل کر دوبارہ سوئی۔ نوران کو اندازہ ہو گیا کہ وہ اتنی آسانی سے بستر چھوڑنے والی نہیں۔ خود اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ بیٹی ماہ بانو کے تازہ خرچے اخفاقی رہتی۔ اسے وقت پر حویلی پہنچنا تھا، وہ بھی ماہ بانو کو اپنے ساتھ لے کر چنانچہ اس بار اس نے نرمی اور صروت سے کام لینے کے بجائے ماہ بانو کے اوپر سے لاف کھینچا اور اسے بری طرح بھینٹو ڈالا۔ ماہ بانو نے اس دہری افناد سے گھر آ کر انھیں کھول دیں۔

”کیا ہے اماں! کیوں اسنے سویرے پیچھے پڑ گئی ہو؟ ابھی تو سورج بھی پوری طرح نہیں نکلا۔“ ماہ بانو نے بستر پر بیٹھ کر انہی لپٹے ہوئے احتجاج کیا۔

”کوئی اتنی سویر نہیں ہے۔ اچھا خاصا دن چڑھ آیا ہے۔ اب سورج کمرے کے اندر آ کر تو کھٹنے سے رہا۔ تو باہر نکلیں دیکھو۔ اچھا خاصا اجالا ہو رہا ہے۔ زہرہ نے کھٹنا بھر پیلے اٹھ کر آدھا کام کاج بھی بند کر لیا ہے۔ لیکن تو ابھی تک پیسٹوں کی طرح بستر پر بیڑی ہے۔ خوراس نے تیرا دماغ زیادہ ہی خراب کر دیا ہے۔“ صبح اتنی دیر تک بڑی سولی دیتی ہے۔“ نوران نے لاف تکرار کر کے رکھتے ہوئے اسے پھٹکارا۔

”تو تمہیں کب لاف پڑتا ہے اماں! اور ہاتھ تو مجھے سے بے کے ساتھ ہی ہے۔ اگر تمہیں میرا یہ چند دن کا رہتا بھی اچھا نہیں لگتا تو میں آبا کو بلواتی ہوں کہ آکر مجھے وہاں لے جائیں۔“ ماہ بانو نے کھٹکی دکھائی۔

”اچھا، اب زیادہ اٹنی سیدھی باتیں نہ کر۔ باہر نکلیں مگر ہاتھ دھو۔ زہرہ نے تیرا ناشتا تیار کر دیا ہو گا جا کر کھالے۔“ نوران ابھی طرح جاتی تھی کہ ماہ بانو کے دل میں اس کے خلاف شہو ہے مگر اس کے پاس اپنی صفائی میں کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا اس لیے بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ماہ بانو کو گھر کا۔ ماہ بانو جنکلی جہر میں ڈال کر کمرے سے باہر نکلی۔ باورچی خانے سے مدھانی کی گھر

گھر رشتائی دے رہی تھی۔ وہ سیدھی غسل خانے میں چلی گئی۔ وہاں سے نکل کر برآمدے میں پیچھے پیچھے واپس آ کر تیشی تو زہرہ ناشتا لے آئی۔

”پہل چھینٹی کھسا۔“ لہجے دے رہی ہے۔ تجھے میرے ساتھ حویلی چلنا ہے۔“ نوران نے اسے حکم دیا۔

”کیوں؟ میں کیوں جاؤں تمہارے ساتھ حویلی؟“ ماہ بانو بدکی۔

”وڑی چودھرائن نے پیغام بھیجا ہے کہ تجھے ساتھ لے کر آؤں۔ تو میرے ساتھ چلی کر انہیں سلام کر دیا مگر واپس آ جانا۔“ نوران نے اسے بھلائی کی کوشش کی۔

”مجھے نہیں جانا بڑی چودھرائن کو سلام دلا کر۔“ ماہ بانو نے صاف انکار کیا۔

”دیکھ ماہ بانو! مجھے شک نہ کر۔ وڑی چودھرائن نے خود سے تجھے بلوایا ہے۔ اگر تو نہیں کی تو وہ برامانے کی اور پھر تجھے وہاں جا کر کرنا ہی کیا ہے۔ سلام کر کے ایک طرف بیٹھ جانا۔ میں موقع دیکھ کر تھوڑی ہی دیر میں تجھے کسی کے ساتھ واپس گھر بجاؤں گی۔“ نوران نے ماہ بانو کو کھنچا۔ ماہ بانو اس کے سمجھانے بجائے کانے کا تو خبر کیا اتر ہوتا لیکن ماں کی مجبوری کا خیال کر کے چپ ہو گئی۔ وہ جانتی تھی کہ حویلی والے کتنے نازک مزاج لوگ ہیں۔ ماہ بانو کے انکار کو اپنی انا کا مسئلہ بنا کر وہ لوگ اس کے ماں باپ اور بھائی بہنوں پر گاؤں کی زمین تک کر سکتے تھے۔ ماہ بانو اپنے اس چند روزہ قیام کو اپنے گھر والوں کے لیے مصیبت کا باعث نہیں بنانا چاہتی تھی چنانچہ دل میں ناگواری محسوس کرنے کے باوجود تھوڑی ہی دیر میں چادر اوڑھ کر، نوران کے ساتھ حویلی جانے کے لیے تیار ہوئی۔

”سلام کر کے ایک طرف چکی کھڑی ہو جانا۔ زیادہ پٹر پٹر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ حویلی کی طرف جاتے ہوئے نوران راستے بھر ماہ بانو کو ہدایات دیتی رہی۔ دراصل وہ خود بڑی چودھرائن کے ماہ بانو کو بلوایا بیٹھنے پر مجبور ہوئی تھی اور کسی انہونی کے ہونے کے ڈر سے پہلے سے چٹیں بندیاں کرنے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔

”سلام وڑی چودھرائن۔“ حویلی پہنچ کر نوران نے سب سے پہلے بڑی چودھرائن کے سامنے حاضری دی اور اس کی خدمت میں سلام پیش کیا۔ ساتھ ہی اس نے ماہ بانو کو بھی کہنی مار کر سلام کرنے کا اشارہ کیا۔

”السلام علیکم جی! ماہ بانو نے دسی آواز میں سلام کیا۔ چودھرائن جو چودھری الٹا کی بیویاں میں پہلے نمبر پر اور عمر

میں سب سے بڑی ہونے کی وجہ سے وڈی چوہرائی کہلاتی تھی، سلام کا جواب دینے کے بجائے بغور ماہ بانو کا جائزہ لینے لگی۔ ماہ بانو اپنی بہنوں کے مقابلے میں لاکھ کھلے ماحول میں اور آزادی سے اپنی بڑی بھئی کی بڑی چوہرائی کی خود پر بھی تنقید بھری، کاٹ دار کا ہوں سے کہنے لگی۔

”شہر کی گزریوں کی طرح پیشی نکلتی ہے۔ تو نے تو بہن کو اپنی گزری دے کر اس کا ناس مار دیا ہے تو نور۔“ ماہ بانو کے سادہ سے کان کے سوٹ اور بڑی سی چادر کے باوجود بڑی چوہرائی نے فتویٰ صادر کیا۔

”کیا کرتی جی! اماں جانی کے آنسو اور اکیلا پن بھی تو نہیں دیکھا جاتا تھا۔ اس نے جموی پھیلائی تو منع نہیں کر سکی۔“ نوران نے خوشامدی لہجے میں بڑی چوہرائی کے سامنے عرض کیا۔ ماہ بانو اپنی جگہ کھڑی چپ چاپ بوٹ چلتی رہی۔

”ستارے وہاں شہر میں رہ کر بڑی اونچی اونچی اڑاؤں بھر رہی ہے تیری بیٹی۔ شہری لڑکیوں کی طرح پڑھنے کے لیے کالج بھی جاتی ہے۔“ بڑی چوہرائی نے قہر زدہ لہجے میں فرد جرم عائد کی۔ اس با نوروں سے کوئی جواب نہیں بن پایا۔ وہ تو خود ماہ بانو کے کالج میں پڑھنے سے زیادہ خوش تھی، چنانچہ بڑی چوہرائی کی بات سن کر چپ چاپ سر جھکا کر کھڑی رہی۔

”بھلے سے تم نے بڑی اپنے بہن بہنوں کو گود دے دی ہے لیکن ہے تو یہ تمہاری اپنی دبی۔ بڑی ذات کے اس طرح آزاد پھر نے پر تم لوگوں کو غیرت نہیں آتی؟ تمہیں چاہیے تھا کہ اس کے خال خال کو اسے کالج بھیجے سے منع کرتیں اور اگر وہ لوگ نہ مانتے تو اسے واپس اپنے پاس یہاں گاؤں لے آتیں۔ جہاں ہم تمہارے سارے بچے کو پال رہے ہیں، وہاں یہ ایک اور بھی چل جاتی۔“ بڑی چوہرائی نے تقریر کرتے ہوئے نوران پر کلمات کا احسان کیا۔ حالانکہ یہ وہ احسان تھا جس کو تارے اتارے نوران اور غیاث کی ہڈیاں تک گھسنے لگی تھیں لیکن ظاہر ہے بڑی چوہرائی کو یہ بات جانی نہیں جاسکتی تھی۔ یوں بھی برسوں سے غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ذہن اپنے حق کو پہچانتے ہی کہاں تھے۔

اس وقت بھی بڑی چوہرائی کی کسی بات پر برا ماننے کے بجائے نوران کا ذہن مسلسل اس فکر میں اٹکا ہوا تھا کہ جانے کس بدخواہ نے چوہرائی کے کان بھر کر اسے نوران اور ماہ بانو کے خلاف بھڑکایا ہے، ورنہ جو بھی کی بڑی چوہرائی کے پاس اتنی فرصت کہاں ہوتی تھی کہ وہ برسوں پہلے فیصل آباد میں خوراس اور صغیر کو گود دے دی جانے والی ماہ بانو کے

بارے میں تحقیقات سے آگاہ ہوتی۔

”صغیر سے لینے آئے گا تو میں اس سے بات کروں گی جی۔ وہ میرے کہنے سے ماہ بانو کو کالج سے اٹھوا لے گا۔“ بڑی چوہرائی کا قصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے نوران نے اسے تسلی دی لیکن ماہ بانو اس بات کو سن کر تڑپ اٹھی۔

”میں ہرگز بھی کالج جانا نہیں چھوڑوں گی۔“ جذبات میں آکر دو نوران کی طرف سے عائد کردہ عزم زباں بندی کو فراموش کر چکی تھی۔

”تو چپ کر۔“ نوران گھبرا کر ماہ بانو پر اپنی۔

”ہاں... بولنے دے اسے نوران! ہمیں بھی تو معلوم چلے کہ تعلیم (تعلیم) اس کی زبان کے کہنے کا نکتہ کھول دیے ہیں؟“ بڑی چوہرائی نے غصا کیا۔

”بچی ہے جی! اور اسے خصوصیات کو نہیں جانتی۔ آپ معافی دے دیں۔“ نوران نے ہاتھ جوڑے۔

”تو پھر سکھائے اسے طور طریقے بلکہ ایسا کہ جب تک یہ یہاں ہے اسے پابندی سے روزانہ اپنے ساتھ جو بھی لے کر آ۔ یہاں دوسری عورتوں کے ساتھ اپنے بیٹے کی، جب ہی تو کچھ لکھنے کی اور دماغ میں بات بیٹھنے کی۔“ چوہرائی نے جاہلانہ انداز میں حکم سنایا۔ نوران اور ماہ بانو دونوں ہی اس اتفاق پر ہراساں ہی ہوئیں۔

”اسے جانے دیں جی! تو اور تھوڑے دن کی مہمان ہے پھر تو فیصل آباد واپس چلی جائے گی۔ ویسے ہی اسے کوئی کام کاج کہاں آتا ہے۔ اس کے جو بھی آنے سے کوئی فائدہ (فائدہ) نہیں ہو گا۔“ نوران نے عاجزی سے بڑی چوہرائی کو اس کا حکم واپس لینے پر راضی کرنے کی کوشش کی۔

”یہ تھوڑے دن کی مہمان ہے، پر تمہیں تو ادھر ہی رہنا ہوتا ہے۔... یا تمہارا بھی ارادہ ہے وہی کے ساتھ اس گاؤں کو چھوڑ جانے کا؟“ چوہرائی کے تہہ دلچے میں جو دمکلی پریشیدہ تھی اس نے نوران کے ہونٹوں پر قہر ڈال دیا۔ ماہ بانو بھی اپنی جگہ ہکا بکا اور سہی ہوئی کھڑی رہ گئی۔

☆☆☆

”سرا! چوہرائی اختیار کا شفی اللہ رکھا آپ سے ملاقات کے لیے آیا ہے۔“ شہریار عادل ایک فائل کے مطالعے میں منہمک تھا کہ کئی اے عبدالمنان نے اتر کام پر اسے اطلاع دی۔ اس اطلاع پر شہریار کو شدید کوفت کا احساس ہوا۔ پرانے اے ہی سے چارج لینے کے بعد وہ چاہتا تھا کہ ضلع کو درجہ مسائل اور دیگر معاملات کو جلد از جلد سمجھ لے تاکہ فرائض کی ادائیگی میں آسانی رہے لیکن یہ وقت بے وقت کے

ملاقاتی اسے ڈھنگ سے اس کام کو سرانجام دینے کے لیے مہلت ہی نہیں دے رہے تھے۔ اول روز تو تھر چوہرائی اختیار کا اس پر مکمل طور پر قبضہ رہا اور صرف وہی لوگ شہریار سے مل سکے جو چوہرائی اختیار کے ساتھ اس کے بچکے پر آئے تھے۔ یہ سارے لوگ کسی نہ کسی حوالے سے چوہرائی کے رشتے دار تھے اور شاید انی وجہ سے چوہرائی اختیار کی موجودگی میں شہریار سے ملاقات کی رعایت حاصل کر پائے تھے لیکن ان افراد کے سوا کوئی اور شخص اس دن شہریار کے قریب پر مارنے کی کوشش بھی نہیں کر سکا تھا۔ اب وہ سارے محروم رہ جانے والے افراد و گناہوں کو ملاقات کے لیے اس کے پاس آتے رہے تھے۔ ان افراد میں زیادہ تر اور گرد کے دیہاتوں میں رہنے والے چھوٹے زمیندار شامل تھے جو ملاقات کے لیے آتے ہوئے شہریار کے لیے تھے تھک تھک بھی ساتھ لاتے تھے۔

لیاقت رانا کی عداوت کے پیش نظر شہریار نے ان تحائف کو واپس لوٹنے کی کوشش بالکل نہیں کی تھی، البتہ وہ خود انہیں استعمال کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ اس کے زیر نگرانی کام کرنے والے اسٹاف کے حوالے آئے ہوئے تھے اور وہ موٹیں اڑا رہے تھے۔ ملاقاتیوں کی دوسری قسم ضلع میں تعینات مختلف سرکاری افسران کی تھی جو سنے اے ہی سے ہٹا کر کھینکے کے خواہش مند نظر آتے تھے لیکن ان کے انداز میں نسبتاً کم چھوڑا ہوا تھا۔ خود شہریار بھی ان افراد سے ملاقات کو انتظامی نقطہ نظر سے بہتر سمجھتا تھا۔ چنانچہ پہلے گروپ سے مصطفیٰ اور دوسرے گروپ سے ضرورتاً ملاقات کا فریضہ انجام دیتا رہتا تھا۔ اس وقت چوہرائی اختیار کے شفی کی آمد سے نام صرف ناگوار گزری تھی بلکہ اس کے کام میں حرج کا بھی سبب بنی تھی لیکن جسے بھی پڑے مصلحت کے طوق نے اس ناگواری کے انکبار کا موقع نہیں دیا اور بادل خواہ اسے عبدالمنان کو شفی کو اندر بھیجے کی اجازت دینی پڑی۔

”سلام اے ہی صاحب!“ شفی نے اندر داخل ہوتے ہی زوردار آواز میں سلام بھجوا دیا۔

”بیٹے!“ اشارے سے سلام کا جواب دیتے ہوئے شہریار نے شفی سے کہا تو وہ بڑے فیسے سے سامنے بڑی کرسی پر براہمان ہو گیا۔ وہ چوہرائی اختیار کا شفی تھا۔ اسے چوہرائی کے دست راست، اور راز داراں ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ یہ وہ اعزاز تھا جس نے شفی کی گردن میں سر پافٹ کر کے اس کی گردن میں چوہرائی اختیار یعنی تو نہیں مگر اپنی خاص اکر پید کر دی تھی۔ سر پر رکھے اوٹھے شفی کھٹکے کرتے اور چوٹاؤں والے تہ بند کے ساتھ وہ خود بھی کوئی چھوٹا موٹا

زمیندار ہی دکھائی دیتا تھا۔

”کیسے آنا ہوا اللہ رکھا؟“ شفی کو کسی غریب کی تنگدستی کا موقع دینے سے بچنے کے لیے شہریار نے فرمایا اس سے اس کی آمد کا مقصد دریافت کیا۔

”اس جتنے کو چوہرائی صاحب کے دادا حضور جناب مراد عالم شاہ صاحب کا سالانہ عرس مبارک منعقد کیا جا رہا ہے۔ اس موقع پر ضلع کے علاوہ لاہور، فیصل آباد، ساہیوال اور دوسرے شہروں سے بھی خاص خاص احباب کو مدعو کیا جاتا ہے۔ آپ کے لیے بھی چوہرائی صاحب جناب نے اس موقع پر خصوصی دعوت نامہ ارسال کیا ہے۔ چوہرائی صاحب خود تشریف لاتے لیکن گھوٹا گون مرد و عورت کے باعث آئیں سکے۔ پر انہوں نے مجھ سے آپ کی شرکت کے لیے خصوصی اصرار رکھ لیا ہے۔ آپ کی عمر میں آمد ان کے لیے باعث خوشی ہوگی۔“

اپنی زبان دانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شفی اللہ رکھا نے دعوت نامہ شہریار کی طرف بڑھایا۔ سرناٹھیں کپڑے پر سنہری حروف سے تحریر کردہ یہ دعوت نامہ مظاہرہ کے ان پیغامات کی یاد تازہ کر رہا تھا جو ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ کے پاس بھیجا کرتا تھا۔ چوہرائی اختیار کی حیثیت بھی اس علاقے میں کسی مطلق العنان بادشاہ سے کہیں بھی، چنانچہ اس کی طرف سے آنے والے دعوت نامے کو اتنی شان دار ہونا ضروری تھا۔

شہریار نے دعوت نامے کا ایک سرری سا جائزہ لینے کے بعد اسے لپیٹ کر ایک جاب رکھ دیا۔

”آپ عرس شریف میں تشریف لائیں گے نا جناب؟“ شہریار کا انداز دیکھتے ہوئے شفی اللہ رکھا نے اس کی شرکت سے متعلق یقین دہانی کر ضروری سمجھا۔

”میں پوری کوشش کروں گا۔“ شہریار نے بے نیازی سے جواب دیا۔ جان تو اسے پڑے گا، وہ بات ابھی طرح سمجھتا تھا لیکن چوہرائی اختیار یا اس کے کسی نمائندے کے سامنے بالکل ہی سر ڈال دینے پر تیار نہیں تھا۔ اُسے اپنی شخصیت کا وقار اور برتری بہر حال قائم رکھنی تھی۔ شہریار کے اس انداز پر شفی اللہ رکھا اپنا پورا زور بیان فرج کر کے اس کی شرکت پر اصرار کرتا رہا لیکن شہریار نے اس کی روانگی تک بھی اپنا انداز نہیں ہی رکھا۔

”یہ کیا سلسلہ ہے بیٹے؟“ شفی کے روانہ ہو جانے کے بعد شہریار نے عبدالمنان کو طلب کیا اور اسے دعوت نامہ دکھاتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔

”چوہری صاحب کے دادا حضور کا عرس مبارک... آپ اس قسم کے سلسلوں سے واقف نہیں ہیں سر؟“

عبدالمنان نے مسکراتے ہوئے جواب کا اظہار کیا۔

”واقف ہوں لیکن یقین نہیں آتا کہ چوہری افتخار کے خاندان میں بھی ایسا کوئی مردوسن گزرا ہوگا جس سے لوگ اپنی عقیدت رکھیں کہ باقاعدہ اس کا عرس منایا جائے۔“

شہر یار نے صاف گوئی سے اپنے شک کا اظہار کیا۔ اس بار عبدالمنان کی مسکراہٹ بہت واضح تھی۔ یقیناً اگر اسے اپنے اور شہر یار کے درمیان فاصلہ مراتب کا خیال نہ ہوتا تو یہ مسکراہٹ ایک زوردار تھپکے کا روپ دھارتی۔ مسکراہٹ پر بھی اس نے فحش میں قابو پایا اور نہایت متانت سے شہر یار کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے بتائے لگا۔

”چوہری افتخار کے خاندان میں کافی عرصے سے بڑی مریدی کا یہ سلسلہ چلا آرہا ہے۔ رہی لوگوں کی عقیدت کی بات تو یہ کوئی ایسا بڑا مسئلہ نہیں اور نہ ہی اس کے لیے خبر صاحب کے مردوسن ہونے کی کوئی شرط ہے۔ جہالت اور غربت کے مارے یہ لوگ جن کے پاس وسائل کے مقابلے میں مسائل کا ڈھیر لگا رہتا ہے، ہمیشہ کی ایسے مجبوری یا جادوئی سہارے کے محتاج رہتے ہیں جس کے ذریعہ وہ اپنے نمل ہونے والے مسائل و مصائب سے نجات حاصل کر سکیں۔ ان لوگوں کے لیے خبر صاحب کی کرامات کے چند قصوں کے ساتھ انکار کرنے والوں کے دہشت انگ انجام سے حقیقت واقعات کا چرچا کر دینا کافی ہوتا ہے۔ بس یہی جھگڑے ہوں گے جو چوہری افتخار کے دادا حضور نے استعمال کیے ہوں گے، بعد میں تو سلسلہ پھل نکلا۔ اب یہ حال ہے کہ درودرنیک ان کے عقیدت مند پائے جاتے ہیں۔ دادا کی موت کے بعد چوہری افتخار کے والد نے جیڑی کی یہ گدی سنبھالی اور اب چوہری صاحب خود گدی پر برائمان ہیں۔ ایک طرف آپائی زمینیں ہیں تو دوسری طرف آپائی قبروں پر بنائی گئی درگاہ۔ زمینیں سوئے بھی تھیں ابھی تھیں اور قبروں پر سونے چاندی کے نذرانے چڑھائے جاتے ہیں۔ چوہری افتخار دونوں طرف سے مزے میں ہے۔“

عبدالمنان کی تجر بہ کا لگا ہوں نے مختصر عرصے میں ہی شہر یار کی شخصیت کی راست بازی کو بھانپ لیا تھا۔ اس لیے اس وقت وہ بہت کھل کر شہر یار کو کافی کچھ بتا گیا تھا۔ عبدالمنان سے حاصل کردہ معلومات پر اندر ہی اندر حیرت میں مبتلا شہر یار نے ان معلومات پر بنا کوئی تبصرہ کیے عبدالمنان سے مشورہ لیتے ہوئے پوچھا۔

”تمہارا کیا خیال ہے، مجھے چوہری افتخار کی دعوت پر عرس میں شرکت کے لیے جانا چاہیے یا نہیں؟“

”بالکل جانا چاہیے سر! تعلقات کو بہتر رکھنے اور ارد گرد کے حالات سے باخبر رہنے کے لیے اس قسم کی دعوتوں میں شرکت کرنا آپ کے لیے بہت ضروری ہے۔“ عبدالمنان نے فوراً جواب دیا۔

”چلو ٹھیک ہے پھر یہ معاملہ طے پا گیا۔ اب تم ایک کام یہ کرو کہ آنے والی درخواستوں میں سے ان افراد کی درخواستیں جو پہلے بھی اپنے مسائل کے لیے یہاں رجوع کرتے رہے ہیں، الگ کر کے اور ساتھ ہی ریکارڈ میں موجود کچھ اور درخواستیں بھی لگوا کر بھیج دے دو۔ میں چاہتا ہوں کہ ایسے معاملات جو برسوں سے انکے ہونے لگے ہیں انہیں ترتیبی بنیادوں پر پہلے دیکھ لوں۔ پھر باقی چیزیں بھی انشاء اللہ ایک ایک کر کے روئین میں آجائیں گی۔“

”او کے سر؟“ شہر یار کے عزم پر عبدالمنان نے مستعدی سے جواب دیا پھر یک دم ہی کوئی خیال آنے پر کمرے سے باہر جاتے جاتے پڑا۔ ”سر! چوہری صاحب کا کتنی اپنے ساتھ چھل اور مصافی کے ٹوکے لایا تھا، ان کا کیا کرتا ہے؟“

”کئی قریبی ہستی میں بھوکا ضرورت مندوں میں تقسیم کر دادو۔ میرے لیے میری اور میرے باپ دادا کی کمائی کافی ہے۔ چوہری افتخار کے بزرگوں کی ”برکت“ سے فیض یاب ہونے کا کبیرا کوئی ارادہ نہیں۔“ شہر یار نے جواب دیا تو عبدالمنان سر کو بھیچ کر پیش دیتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس بار اس کا واسطہ ایک مختلف مزاج رکھنے والے ہی سے پڑا تھا اور عبدالمنان کا تجربہ بتا رہا تھا کہ آنے والے وقت میں بہت کچھ مختلف ہونے والا ہے۔

☆☆☆☆

بڑی چوہرائی کا حکم ناگوار گزرنے کے باوجود ماہ بانو ابھی صبح نوران کے ساتھ حویلی جانے کے لیے تیار ہوگئی۔ پہلے چل کر اس نے بڑی چوہرائی کے عزم کو ماننے سے صاف انکار کر دیا تھا لیکن نوران اسے قائل کرنے کی مسلسل کوشش کرتی رہی۔ نوران کی ان کوششوں پر بے زار ہو کر ماہ بانو نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ آج شام ہی واپس فیصل آباد چلی جائے گی۔ اس کے اس اعلان پر نوران باقاعدہ منت سماجت پر اتر آئی تھی۔ اس نے ماہ بانو کے آگے ہاتھ جوڑ کر اس کے ارادے سے باز رہنے کی استدعا کی تھی۔ ماہ بانو لاکھ اپنے گئے ماں باپ کے غلاف دل میں شکوہ کرتی تھی اور حوران اور

حضور کو ان پر ترجیح دیتی تھی لیکن حویلی تو بہر حال نوران کی ہی اولاد۔ اس سے ماں کے اپنے آگے بندے ہاتھ نہ دیکھے گئے اور وہ اپنے دل پر چکر کے اس کی بات ماننے پر آمادہ ہوئی۔ نوران خود بھی جانتی تھی کہ ماہ بانو کے لیے حویلی کی چاکری ایک نہایت ناقابل برداشت کام ثابت ہوگا لیکن وہ بھی اپنی جگہ مجبور تھی۔ اس کے پورے خاندان کی ہمت کا مسئلہ تھا۔ ماہ بانو کا انکار حویلی والوں کا جواب بن کر ان سب پر نازل ہوتا۔ بڑی چوہرائی کی دھمکی سے صاف ظاہر تھا کہ اگر اس کی بات نہیں مانی گئی تو کچھوں کی زمین نوران کے گھر آنے کے لیے تنگ کر دی جائے گی، زمین تنگ ہو جاتی تو وہ لوگ کہاں جاتے؟ اس زمین سے ان کا روزگار اور رشتے ناتے جڑے تھے، یہاں ان کے بزرگوں کی بڑیاں لگزی تھیں۔ بڑی بیٹی نکھاری گاؤں میں مای متاز کے بیٹے انور سے بیاہی ہوئی تھی۔ زہرہ کا رشتہ بھی اپنے چاچا کے بیٹے رب نواز سے طے تھا۔ رب نواز کسانے کے لیے دینی گیا ہوا تھا۔ اگلے ماہ اس کی آمد متوقع تھی۔ وہ مختصر چھٹی پر گاؤں آکر وہاں دوبارہ دینی چلا جاتا۔ اس عرصے میں انہیں زہرہ کی شادی کی تیاری کر کے اسے بیاہنا تھا۔ شادی کے اخراجات کے لیے رقم چوہری ہی مہیا کرتا۔ رقم کی یہ فراہمی پہلے ہی نوران اور غیاث کے نزدیک مشکوک تھی۔ وہ لوگ ابھی تک نکھاری شادی پر لپکا جانے والا قرض بھی نہیں اتار پاتے تھے۔ ایسے میں زہرہ کی شادی کے لیے مزید قرض طلب کرنا تو ایسے ہی اچھا خاصا مشکل اور پریشان کن مرحلہ تھا۔ ان حالات میں اگر ماہ بانو بڑی چوہرائی کا حکم ماننے سے انکار کر دیتی تو وہ لوگ کیا کرتے؟ چنانچہ نوران نے اپنی مجبور یوں اور مشکلوں کا واسطہ دے کر بالآخر ماہ بانو کو نورانی حویلی لیا اور اب حویلی جاتے ہوئے ماہ بانو نوران کے ساتھ تھی۔

”سلام دوڑی چوہرائی۔“ حسب معمول نوران نے حویلی پہنچ کر سب سے پہلے بڑی چوہرائی کی خدمت میں حاضری دی۔ کتنے کواں حویلی میں چوہری افتخار کی دوسری بیوی بھی رہتی تھی لیکن حویلی پر عکرائی بڑی چوہرائی ہی کی تھی۔ حویلی کے اندرونی امور میں اسی کے احکامات کو سب سے زیادہ ترجیح دی جاتی تھی چنانچہ ملازماں بھی سب سے زیادہ اس کی چاکری کرتی تھیں۔

”آئی تیری لاؤ تیرے ساتھ۔“ چل یہ اچھا ہوا۔“ بڑی چوہرائی نے ماں کی تقلید میں دھیرے سے سلام کر کے ایک طرف کھڑی ہو جانے والی ماہ بانو کو تیر نظروں سے گھورا اور پھر اس کا یہ غور جائزہ لینے لگی۔ آج ماہ بانو نے نوران کی

دعوت پر حویلی آنے کے لیے اپنے کپڑوں کے بجائے زہرہ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ دو عدد بچہ نہ لگے، یہ رانے سے کپڑے بڑی چوہرائی کی آنکھوں میں اطمینان کے رنگ لائے۔

”اسے بچھلے والان میں جا دل صاف کرنے والی عورتوں کے ساتھ لگا دے۔ کسی اور ماہ جو کی تو بچھلے نہیں ہے۔“ بڑی چوہرائی نے نچوت سے نوران کو حکم دیا تو وہ فوراً ہی ماہ بانو کا بازو دھام کر حکم کی تعمیل کے لیے چلی۔

”سن! بڑی چوہرائی نے پیچھے سے آواز دے کر دوا۔“

”نکھروڑی چوہرائی۔“ نوران را متوجہ ہوئی۔

”کسی کو کھینچ کر زہرہ کو بھی بولائے۔ چار دن رہ گئے ہیں عرس میں۔ حویلی میں کرنے والے بہت کام بڑے ہیں لیکن تم تک حراسوں کو تو بھی خود سے اس بات کا خیال نہیں آتا کہ کام کے وقت آپ ہی اپنی مہارائیوں کو حویلی لے آؤ۔ دیے اپنے مطلب کے لیے جب دیکھو حویلی کی چوکت پڑ کر بیٹھ جاتے ہو۔ اب بھی نیچے گھر ہے کہ گھر کے وقت سارا نیر مرچھوں کی طرح ٹوٹ پڑے گا لیکن کام کرنے سے تم لوگوں کو موت آتی ہے۔“

”معاف کر دیں دوڑی چوہرائی! بس میری مت ماری گئی تھی کہ سامنے کی بات کا خیال نہیں آیا۔ میں اس کی کو کھینچ کر زہرہ کو بلوائی ہوں۔“ چوہرائی کے بے خطا نہانے پر نوران کے ماتھے پر ایک جلی تک نمودار نہیں ہوا اور اس نے بڑی عاجزی سے اپنی لٹکھی کو تسلیم کرتے ہوئے بڑی چوہرائی کو تسلی دی کہ جلد زہرہ بھی اسی کی خدمت میں حاضر ہوگی۔ بڑی چوہرائی نے نوران کی اس عاجزی کے جواب میں ایک نوت بھری ”ادبیتہ“ کی اور کسی دوسری طرف متوجہ ہوئی۔ نوران، ماہ بانو کو ساتھ لے کر باہر نکل گئی۔ بچھلے والان کی طرف جاتے ہوئے اس نے راستے میں رک کر حویلی میں ہی کام کرنے والے بارہ تیرہ سال کے لڑکے زہرہ کو بلوانے کے لیے گھر کی طرف روانہ کیا اور پھر ماہ بانو کو ساتھ لے کر بچھلے والان میں پہنچ گئی۔ یہاں گاؤں کی کئی جڑیں چاندوں کے ڈھیر کے سامنے ایک قطار میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں مجبور کے چوں سے بے ہونے بڑے بڑے سوپ تھے جن میں جا دل ڈال کر وہ بڑی پھرتی سے انہیں پھلک پھلک کر صاف کر رہی تھیں۔ نوران نے ماہ بانو کو اسی قطار میں بٹھا کر ایک سوپ اس کے ہاتھ میں دیا اور خود باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ اس کے ذمے برتنوں کی دھلائی کا کام تھا۔ کئی افراد پر مشتمل اس حویلی میں جہاں ہر وقت کی

مہمان داری بھی لگی رہتی تھی، برتن دھونے کا کام بڑے تسلسل سے جاری رہتا تھا۔ نوران کے علاوہ بھی کچھ دوسری عورتیں اس کام پر مامور تھیں۔

”چل چل جیتی کر اور شروع ہو جا۔ خالی بیٹھ کر میم خراب کرنے کی نہیں ہو رہی ادھر۔“ نوران کے جاتے ہی وہاں کام کی گھرائی پر مامور ایک عورت نے ماہ بانو کو ڈنکا۔ ماہ بانو نے اس ڈانٹ پر فوراً سوپ اٹھایا اور دیگر عورتوں کی تقلید میں سوپ میں چاول ڈال کر پھینکے کی کوشش کرنے لگی۔ حوران نے اسے ٹھہرے کام کاج کی تربیت دے رکھی تھی لیکن تین افراد پر مشتمل کئے میں کام ہی کتنا ہوتا تھا، دوسرے ماہ بانو کی تعلیمی مصروفیات کی وجہ سے بھی حوران اس پر کام کا زیادہ بوجھ نہیں ڈالتی تھی۔ اس لیے ماہ بانو بہت زیادہ محنت اور کام کاج کی عادی نہیں تھی۔ پھر یہاں جس انداز سے چاول صاف کیے جا رہے تھے، اس فن میں تو اسے تعلیمی مہارت نہیں تھی۔ نتیجتاً اسے اپنی کوشش میں سخت ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

”اسے لڑکی! یہ کیا کر رہی ہے۔ سارے چاول بچو گر رہے ہیں۔“ گھرائی پر مامور عورت اس کے انڈی پن کو دیکھ کر چلائی۔ اس کی آواز کے ساتھ ہی ماہ بانو کچھ دبے دبے قہقہوں کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ یقیناً وہاں موجود کچھ خواتین اس کی اس طرح درگت بننے پر ہلکا ہلکا ہنسیں۔ ماہ بانو جو پہلے ہی دل پر پڑا چکر کے حوصلے آگئی تھی، اس میں ٹھیک کوسہ نہ سکی اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ بڑا سا سوپ جو پہلے ہی اس سے نہیں سنبھالا جا رہا تھا، بچے رکھ کر وہ گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگی۔

”ادھیان! آگے تو دیکھو۔ ایسے بن رہی ہے جیسے کسی مزارے کی بیٹی، لاٹ صاحب کی دچی ہے۔“ کہیں سے یہ طنز پر فقرہ آکر ماہ بانو کے کانوں سے گزرایا۔ اس کے رونے میں بچھا اور بھی شدت آگئی۔ اسے حوران اور منصور شدت سے یاد آنے لگے جنہوں نے اسے واقعی کسی مہارانی کی طرح دکھا ہوا تھا۔

”اچھا چلی، چھوڑ یہ کام اور وہاں بیٹھ کر چاولوں میں سے نگر جن۔“ مگر ان عورت کو اس کے رونے پر ترس آگیا اور اس نے ماہ بانو کو اٹھا کر دوسری طرف بیٹھی عورتوں کی جانب جانے کا حکم دیا۔ یہ عورتیں پچھلے ہوئے چاولوں میں رہ جانے والے چند ایک نگر اور دھان احتیاط سے چن رہی تھیں۔ ماہ بانو دوپٹے کے پلے سے آنسو صاف کر کے ان عورتوں کے درمیان جا بیٹھی۔ یہ کام نہایت آسان تھا۔ باقی

عورتیں جیسی بھرتی نہ ہونے کے باوجود وہ سہولت سے یہ کام کرنے لگی۔

”یہ سچی اور شادو ہیں ہی بڑی جل نگر۔ جہاں کسی کو ذرا خوش دیکھتی ہیں فوراً آگ لگا دیتی ہیں۔“ ماہ بانو کے برابر میں بیٹھی ہوئی لڑکی نے ترچی نظروں سے چاول پھینکتی ہوئی چھی اور شادو کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔ ماہ بانو کے اندازے کے مطابق اس پر ہنسنے والی بھی یہی دونوں تھیں۔ ”میری اماں نے مجھے بتایا تھا کہ ڈی چوہرا ان کے کان بھرنے والی بھی تھی اور شادو کی ماں ہے۔ اسی نے چوہرا ان کا دھیمان تیری طرف لگا ہے۔“ ماہ بانو کے چہرے پر چھائے نامی کے تاثرات کو دیکھتے ہوئے لڑکی نے ایک بار پھر سرگوشی میں اسے بتایا۔

”مگر کیوں؟ میری بھلا ان دونوں سے کیا دشمنی ہے؟ ابھی دونوں پہلے تو مجھ سے ملنے آئی تھیں۔ اس وقت تو مجھ سے بڑا پیار جتا رہی تھیں پھر بعد میں کیا ہوا کہ یہ میری دشمن بن گئیں؟“ ماہ بانو نے اچھڑا کر اپنی حیرت کا اظہار کیا۔

”پاگلے... ان کی بیٹی زبان پر مت جا۔ یہ سامنے بیٹھ کر ایسے ہی پیار جتاتی ہیں اور پھر پیچھے سے بندے کی کاٹ کرتی ہیں۔ تجھ سے تو ان کا پرانا جاپا ہے۔ زہرہ کی زبانی تیری پر حاوی اور غارت ہاٹ کے تھیں سر ان دونوں کو بڑی آگ لگا کر دیتی تھی۔ ان کی ماں بھی ان جیسی ہی ہے۔ کہنے کو رچے نام ہے ان کی ماں کا پر ہم سب اسے مای مصیبت ہی بولتے ہیں۔ اس کی وجہ سے کبھی پر مصیبت آجائے معلوم ہی نہیں چلتا۔ بیٹیوں کے کہنے پر اس نے ہی ڈی چوہرا ان کے خوب کان بھرے تھے۔ شاید تو نے بھی، شادو کے سامنے کوئی بات کر دی تھی۔ مای نے ڈی چوہرا ان کو خوب بھڑکایا کہ غیبت کی دمی ماہ بانو گاؤں آکر اسکول کھولنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ کتنی ہے گاؤں کی لڑکیوں کو تعلیم دے کر حوصلے کی چاکری سے بجاؤں کی۔ بس، ڈی چوہرا ان بھڑک گئی۔ اس نے فوراً تجھے حوصلے بولا بھیجا کہ تجھے چیری اوقات بتا سکے۔ اب دیکھ لے، ان ماں بیٹیوں کی سازش کئی کامیاب رہی۔ تو بھی گاؤں کی اور عورتوں کی طرح کی کینوں میں بیٹھی حوصلے کے کام نیز رہی ہے۔ تجھے یہاں اپنے ساتھ دیکھ کر ان شادیوں کے دل میں حشہ پڑ گئی ہوگی۔“ لڑکی کی معلومات اور تجزیہ دونوں حیرت انگیز تھے۔ اس نے بہت دھیمی آواز میں ماہ بانو کو ساری تفصیل کہہ سنائی تھی۔ ماہ بانو نے فوراً اس کی طرف دیکھا۔ اس کے دماغ نے دو سال پہلے دیکھے گئے سخت اشعور میں پلے جانے والے نقوش کو دہرائنا شروع کر دیا۔

”تو رانی ہے؟“ تیرا مگر چھی اور شادو کے گھر کے سامنے ہی تھا۔“ ماہ بانو کی یادداشت کام کرنے لگی۔ دو سال کا عرصہ بہت زیادہ نہیں ہوتا لیکن ان کی گاؤں میں عدم دلچسپی کے باعث ان دو سالوں میں وہ بہت کچھ بھول چکی تھی۔ ”مجھلی ہا میں آئی تھی تو تو اکثر مجھ سے کتابیں مانگ کر پڑھنے کے لیے لے جاتی تھی۔ اب کی دفعہ تو نے پتھر ہی نہیں لگایا۔“ چچان کا سر حلقے کرنے کے بعد ماہ بانو نے گھوہ کیا۔ ”اب کی واری وقت ہی کہاں ملا عرس کی وجہ سے۔ روز حویلی آکر دیر تک کام کرنا پڑا ہے۔ میں بس سوچتی ہی رہ گئی کہ کچھ سے پاس آؤں۔ دیتے تو نے یہ بات خوب یاد رکھی کہ میں چھی اور شادو کے گھر کے پاس رہتی ہوں۔ ساری مشکل ہی یہ ہے۔ مگر ہاں ہونے کی وجہ سے ان دونوں کو میرے چل چل کی خبر رہتی ہے اور یہ جب چاہے میرے کاموں میں رولا ڈال دیتی ہیں۔ مای مصیبت کی لگائی بھائی کی وجہ سے تو ڈی چوہرا ان نے مجھے بھی تیری جماعت کے بعد اسکول سے اٹھانے کا حکم دے دیا تھا۔ وہ سچ ہیں تاہم نہ اڑاتی تو میں پانچ جماعتیں تو پاس کر ہی چلی تھیں۔“ رانی نے مجھے اور افسردہ کی ملی جلی کیفیت میں بتایا تو ماہ بانو کو خود سے اس کی بددردی کی وجہ سمجھ آئے گی۔ وہ بھی وہیں سے ڈی گئی تھی جہاں سے ماہ بانو پر حملہ ہوا تھا۔

”فنی کریوں! باتوں میں گنگ کر کام چوری نہ دکھاؤ ورنہ ابھی ایک ایک پانچ لگاؤں کی کہہ پڑائی یاد آجائے گی۔“ ماہ بانو اور رانی کی مستقل سرگوشیاں یقیناً گھراں عورت کی برداشت سے باہر ہو گئی تھیں چنانچہ وہ ان کے سر پر کھڑی ہو کر چلانے لگی۔ ماہ بانو اور رانی کھبرا کر جلدی جلدی چاولوں میں ہاتھ چاٹنے لگیں۔

☆☆☆

شہر یا اپنے سامنے موجود درخواستوں میں سے اس وقت جس درخواست کو پڑھ رہا تھا، وہ کسی ماسٹر آفتاب احمد نے لکھی تھی۔ درخواست گزار کا تعلق جیر آباد سے تھا۔ اس نے گورنمنٹ سے استدعا کی تھی کہ جیر آباد میں قائم واحد پرائمری اسکول جو کہ فقط ایک کمرے پر مشتمل ہے، اس کی عمارت میں کم از کم ایک کمرے کا اضافہ کر دیا جائے تاکہ طالب علموں کو کچھ سہولت مل سکے۔ ماسٹر آفتاب احمد پچھلے دو سال سے تواتر سے یہ درخواست بھیج رہا تھا۔ ریکارڈ میں اس کی طرف سے بھیجی گئی پانچ درخواستیں موجود تھیں۔ آخری درخواست شہر یاہ کی جو اننگ کے دوران بعد ہی دی گئی تھی جس سے ظاہر تھا کہ ماسٹر آفتاب نے اسے ہی کی آمد کے ساتھ ہی امید باندھ کر

ایک بار پھر گورنمنٹ کو بھانے کی کوشش کی ہے۔ شہر یاہ نے اکثر کام پر عبداللہ انان کو اندر لے کا حکم دیا۔

”نہیں سر!“ عبداللہ انان پر اپنی حاضر ہو گیا۔ ”یہ ماسٹر آفتاب کی درخواستیں اتنی بار موصول ہوئی ہیں، اس کے باوجود اب تک اس مسئلے میں کوئی ایجن نہیں لیا گیا۔ کیوں؟“ شہر یاہ نے عبداللہ انان سے پوچھا۔

”میں نے ذاتی طور پر کوشش کی تھی سرگاس مسئلے میں کچھ ہو سکے لیکن چوہرا انکار عالم کے آگے میری ایک نہ چلی سکی۔ چوہری صاحب کا دعوئی ہے کہ جس زمین پر ہم اسکول کے لیے کمرے خرید کرانا چاہتے ہیں، وہ ان کی ملکیت ہے۔ پچھلے اے، یہی صاحب چوہری افکار کے اس دعوے سے متعلق تھے اس لیے میں باوجود چاہنے کے کہ نہیں کر سکا۔“ عبداللہ انان نے سادگی سے مسئلے کا خلاصہ پیش کر دیا۔

”چوہری صاحب کے دعوے کے مقابلے میں سرکاری ریکارڈ کیا کہتا ہے؟“ شہر یاہ نے دریاخت کیا۔

”ریکارڈ کے مطابق زمین سرکاری ہے۔ چوہری افکار کی بنجر زمین کا، زمین کے اس ٹکڑے سے اصل ضرور ہوتا ہے لیکن اس کی ملکیت کا کوئی سراسر غلط ہے۔“ عبداللہ انان نے بتایا تو شہر یاہ رسوا سن کر ہنسا پڑ گیا۔ وہ کھٹکتا تھا کہ اگر چوہری افکار کی سرکشی کے خلاف اسکول کے لیے کمرے یا کمروں کی تعمیر کی کوشش کی گئی تو چوہری اسے اپنی ان کا مسئلہ بنا لگا۔ لیکن اسکول کا مسئلہ انان بھی اسے صاحب نہیں لگ رہا تھا۔ آخر کار اس نے درخواست پر اپنی منظوری کا نوٹ لکھ کر دخل کر دیے۔ متعلقہ گھر سے بھی منظوری آجانی تو تعمیری کام شروع کیا گیا جاتا تھا۔ ”مجھے ایسا غصہ ہو رہا ہے عبداللہ انان کہ لوگوں کے مسائل پر ہی طرح تک پہنچ نہیں رہے ہیں۔ لوگ ہمارے تو قہمی سے ڈالنا ہو کر ہم سے رابطہ کرنا چھوڑ چکے ہیں باہر کوئی خوف ہے جو کلاٹ بن کر انہیں ہم تک آنے نہیں دیتا۔“ چچن کو ہولند میں رکھتے ہوئے شہر یاہ نے اپنے دل میں ہلکا ہلکا عبداللہ انان سے بٹایا۔

”دونوں ہی باتیں سر! لوگ مامور پر اپنے مسائل کے لئے کراس لیے ہیں آج کے یہاں ان کی شنوائی نہیں ہوتی۔ خصوصاً ایسے کیسے جن کا تعلق کسی طاقتور خاستی سے ہو، اس لیے سامنے نہیں لائے جاتے کہ سنی تو طاقتوروں کی ہی جاتی ہے۔ انٹاشکاٹ کرنے کے جرم میں غریب بے چارہ غناپ کا کھانا ہو جاتا ہے۔“ عبداللہ انان نے شہر یاہ کے خیال کی تصدیق کی۔

”پھر... تمہارا کیا خیال ہے اس مسئلے کے حل کے لیے

ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“ شہر یار اور عبدالمنان میں باہمی اعتماد کی فضا قائم ہو چکی تھی اس لیے شہر یار اس سے مشورہ کرنے میں حرج نہیں سمجھتا تھا۔

”اس سلسلے میں کھلی پکھری کا طریقہ کامیاب ہو سکتا ہے۔ آپ شخص تحریری درخواستیں وصول کرنے کے بجائے ہفتے میں ایک دن ایسا مقرر کر دیں جب ضرورت مند براہ راست آپ سے ملاقات کر کے اپنا مسئلہ بیان کر سکیں۔ اس طرح لوگوں کی جھجک ختم ہوگی اور ان کا آپ پر اعتماد قائم ہو گا۔“ عبدالمنان نے تجویز پیش کی جو شہر یار کو پسند آئی۔

”دیری گز! بہت اچھا آئیڈیا ہے۔“ اس نے عبدالمنان کو سراہا اور بولا۔ ”میرا خیال ہے یہاں ملاقاتیں کرنے کے علاوہ لوگوں سے ان کے علاقے میں جا کر بھی ملتے ہیں۔ ہفتے میں کسی بھی دن اپنا تک کسی علاقے میں جائیں گے اور وہاں تکپ لگا کر مساجد وغیرہ سے اعلان کروا دیں گے کہ آپ کے قریب کالے، سی، آپ کے مسائل سننے اور حل کرنے کے لیے خود آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ اس طرح میرے اور لوگوں کے درمیان جو دوری ہے، وہ بھی ختم ہو جائے گی اور میں علاقے کی صحیح صورت حال کا جائزہ بھی لے سکوں گا۔“

”یہ تو بہت ہی اچھی بات ہوگی سر!“ عبدالمنان جیسے اب تک شہر یار جیسا کوئی اے، ہی میسر نہیں آیا تھا، شہر یار کی بات سن کر خوش ہو گیا۔

”یہ پروگرام تو چلو قائل ہو گیا۔ اب ایک کام اور کرو۔ ماسٹر آفاب کو کسی سے پیغام بھجواؤ کہ وہ یہاں آکر مجھ سے ملاقات کر لے۔ اس کی درخواست یوں تو میں نے منظور کر لی ہے لیکن آگے بھیجنے سے پہلے صورت حال کو مزید اچھی طرح سمجھنا چاہتا ہوں۔“

”اوکے سر! میں آج ہی یہ کام کرواتا ہوں۔“

عبدالمنان شہر یار کا حکم سن کر مستعدی سے بولا۔ کئی سال کی ملازمت میں پہلی بار یہ موقع آیا تھا کہ اسے لگ رہا تھا کہ وہ سچ سچ کوئی کام کر رہا ہے ورنہ اب سے پہلے تو صرف ڈیوٹی بھگنے والی بات تھی۔ شہر یار خود بھی خوش تھا کہ اسے ایک مستعد اور ذہن ضمیر پرانی اے کا ساتھ ملا ہے جو اس کے کاموں میں حقیقی معاون ثابت ہو رہا ہے۔

☆☆☆

”اس وادی میں نے بھی دوڑے شاہ جی کی درگاہ پر نذر چڑھائی ہے۔“ رات کا کھانا کھاتے ہوئے نوران نے غیاث کو اطلاع دی۔

”وہ کس لیے؟“ غیاث نے تنویری چڑھا کر پوچھا۔

”لو، ہو رہا ہے پوچھو... پوچھتے ہو کس لیے؟ تمہیں نہیں خبر کہ کتنی مشکلیں پڑی ہیں سر پر از ہر دو کاویہ کرشمی جین نہیں۔ دو برس ہوئے کو آئے ہاں، ابھی تک گودھونی ہے۔ ممتاز نے ملنے مار مار کر جان آدھی کر دی ہے میری بچی کی۔ وہ انور بھی ماں کی ہی زبان بولتا ہے۔ صاف دھمکی دے چکا ہے نگار کو کہ اگر ایک برس اور اس کے بچہ نہیں ہوا تو اسے فارغ کر کے دوسرا دیاہ کر لے گا۔ اب اتنے تر لے کر کے، اپنی جان پر ہزاروں کا قرض چڑھا کر اس لیے تو مچی نہیں بیانی تھی کہ اس کے لیے دوبارہ پیسے میں دھکا دے دیں۔ دمی کا گھر سائے رکھنے کے لیے کچھ تو ہاتھ چڑھ مارنے ہوں گے۔ میری مت میں تو یہی آیا ہے کہ وہ ڈے شاہ جی کی درگاہ پر جا کر جھولی پھیلاؤں۔ شاید ان کی برکت سے ہی یہ مصیبت حل جائے۔“

”پر تیرے پاس چڑھانے کو ہے ہی کیا؟ وہاں تو لوگ بڑے بڑے چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔“ نوران کی بتائی ساری تفصیل سننے کے بعد غیاث نے تشویش سے پوچھا۔

”سوچ رہی ہوں اپنا یہ چھٹا چڑھاوہ۔ شاہ جی کی دعا سے زہرہ کے دیاہ کا بندوبست ہو گیا اور نگار کی گود بھر گئی تو سمجھو اس چھٹے کی قیمت وصول ہو جائے گی۔“ نوران نے اپنی انگلی میں سو جو سونے کے پیکے سے چھلکے کی طرف اشارہ کیا۔

”چل کر دیکھ یہ تدبیر بھی۔ بڑے لوگوں کی جھولیاں بھری ہیں شاہ جی کی برکت سے... شاید ہم پر بھی ان کا کرم ہو جائے۔“ غیاث نے گویا نوران کے فیصلے کی توثیق کی۔

”پر مشکل یہ ہے کہ میں عرس کے روز درگاہ پر منت ماننے جاؤں کیسے؟ اس روز تو جو مٹی میں اتنا کام ہوتا ہے کہ میں قدم بھی باہر نہیں نکال سکوں گی اور منت میں نے عرس والے دن ہی ماننی ہے۔ کہتے ہیں اس روز جو منت مانو وہ ضرور پوری ہوتی ہے۔“ نوران پوری طرح اپنی ضعیف الاعتقادی کے جال میں پھنسی ہوئی تھی۔

”یہ تو ہے، خیر تو نے کیا عمل سوچا؟“ غیاث پوری سنجیدگی سے نوران کی پریشانی میں شریک تشویش کا شکار تھا۔

”میرے دماغ میں تو یہی ترکیب آئی ہے کہ میری چنگہ تو جا کنڈر چڑھاوے اور منت مان لے۔ کام تو اس روز چھٹے بھی دس ہوں گے پر تو پھر بھی سچ میں سے موقع نکال سکتا ہے۔“ نوران نے حل بتایا۔

”ٹھیک ہے۔“ فیرمیں ہی کرلوں گا یہ کام۔“ غیاث محمد نے آمادگی ظاہر کی۔

”کیا ہو گیا ہے آپ لوگوں کو؟ کیسے کچھ حقیقہ سے کی باتیں کر رہے ہیں۔ یہ سزاواروں پر نذر ویز چڑھنا سب سے کارہائیں ہیں۔ جو کچھ مانگنا ہے اللہ سے مانگیں۔ وہ سب کچھ دیتے والا ہے۔“ ماہ بانو جو بہت دیر سے خاموشی سے ساری گفتگوں رہی تھی، آخر کار ٹوک ٹپٹی۔

”تو بڑا کڑی تو بڑا کر۔ بزرگوں کے لیے ایسی بات منہ سے نہیں نکالتے۔ بڑی برکت ہوتی ہے ان کی۔“ نوران نے فوراً ماہ بانو کو ٹوکا۔

”مان لیا کہ بزرگوں کی برکت ہوتی ہے لیکن یہ حویلی والوں کے پنکھوں سے تو کسی کو کوئی ٹپٹ نہیں مل سکتا۔ جیسے خام اور مغرور لوگ ہیں ویسے ہی ان کے بزرگ بھی ہوں گے۔ جو لوگ جیتے ہی اپنی ذات سے کسی کو فائدہ نہ دیں، وہ مرنے کے بعد خاک کی کے کام آئیں گے۔“ ماہ بانو نے اعتراض کیا۔

”بندر کا اپنی یہ فضول یک یک۔ حیرتی تسیم نے تجھے اگلے سبق پڑھا ہے ہوں گے، پر ہم حیرتی ان اٹنی سیدھی باتوں میں نہیں آنے والے۔“ نوران اچھی خاصی غضب ناک ہو چکی تھی۔

”میرا کیا ہے، مت مانو میری بات۔ میرا کام تو سمجھنا تھا۔“ ماہ بانو نے جواباً ہی سے شائے انکے ہاتھ سے کہا۔

”تو چھوڑ دے اپنا یہ سمجھانے بھانے کا کام۔ چار بیٹھیں کیا پڑھتی ہے خود کو زیادہ ہی قابل سمجھتی ہے۔ اس بے لگام زبان کی وجہ سے تو تجھ پر وقت آیا ہے کہ اچھا بھلا آرام چھوڑ کر آج حویلی والوں کی چاکری کرنی پڑ رہی ہے۔ ذرا زبان کو قابو میں رکھی اور تیرے میرے آگے اٹنی سیدھی باتیں کہیں کہیں تو یہ چار دن سکھ سے گزار کر واپس چلی جانی۔ اب سمجھتی رہا ہے کہے کہ۔“ نوران کا حویلی روز کا آنا جانا تھا چنانچہ اسے بھی ماہ بانو پر فٹنے والی افتاد کی وجہ بالا خراہ معلوم ہوئی تھی اور اب وہ اسی حوالے سے اسے طعنے دے رہی تھی۔

”جیسے میری زبان نے نہیں پھنسا اماں! مجھے تم لوگوں کی بے زبانیاں نے پھنسا ہی ہے۔ اگر تم لوگ اس طرح چپ چاپ حویلی والوں کا برہم گرداشت کرنے کے بجائے ان کے سامنے احتجاج کرنے کے عادی ہوتے تو ان کے ظلم کرنے کی عادت اتنی پختہ نہیں ہوتی۔ انہیں تو عادت ہو چکی ہے انسانوں کے ساتھ بے زبان جانوروں کا ماسلوک کرنے کی۔ اب اگر ان بے زبان جانوروں کے چم میں سے انہیں کوئی انسانی آواز سنائی دیتی ہے تو ان سے برداشت نہیں

ہو پاتا کہ کون ہے جو ان کے مقابل پول سکتا ہے؟ حویلی والوں کو ظالم بنانے والے تم لوگ ہونا۔ تم لوگوں نے ان کی عادت بگاڑی ہے۔“ نوران کا طعنہ سن کر ماہ بانو کافی جذباتی ہو گئی تھی۔

”کیا بکواس کیے جا رہی ہے؟ ابھی دوں گا ایک اگلے ہاتھ کی تو بڑی بند ہو جائے گی۔“ لڑکی ذات اور اتنا بولے یہ کہاں ان کی ریت تھی، چنانچہ غیث محمد مہمان بن کر آئی بنی پر آنکھیں دکھانے لگی۔

”چل پھل۔ جانے دے اس کو۔ اس کا تو دماغ ہی خراب ہے۔ سفور آکر اسے واپس لے جائے گا تو ہماری مشکل بھی آسان ہو جائے گی۔“ نوران نے غیث محمد کا غصہ خنڈا کرنے کی کوشش کی۔ ماہ بانو جو پہلے ہی کھانے سے ہاتھ روک چکی تھی، اٹھ کر کمرے سے باہر نکلی۔ زہرہ اور ان کا دس سالہ بھائی الیاس اس ساری بحث سے بے نیاز اپنی پلیٹوں پر بیٹھے کھانے میں اسی طرح مصروف رہے۔

☆ ☆ ☆

”مجھے ماسٹر آفتاب احمد کہتے ہیں۔“ کھدے کے کمرے اور قدرے وسیع ہوئے تھے جن میں پلیٹوں وہ شخص شہریار کے قصور سے کافی مختلف تھا۔ ماسٹر آفتاب کے نام کے ساتھ اس نے کسی عمر رسیدہ شخص کا قصور باندھ رکھا تھا لیکن سامنے موجود شخص نہ صرف جوان تھا بلکہ اپنے انداز سے صاف پہچانا جاتا تھا کہ وہ کسی دیہات یا گاؤں کا باشندہ نہیں بلکہ اس کی پرورش کسی شہری ماحول میں ہوئی ہے۔

”تشریف رکھیے۔“ شہریار نے ایک نظر جائزے کے بعد اسے سامنے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”میں آج ایک پیپٹر سے ملنے کے لیے لاہور روانہ ہو رہا تھا۔ پیغام ملا کہ اتنے ہی صاحب مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ جانے سے پہلے آپ سے ملاقات کرنا ہو جاؤں۔“ ماسٹر آفتاب نے کرسی پر بیٹھے ہی گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔

”کس سلسلے میں ملاقات کرنی ہے آپ کو پیپٹر سے؟“ شہریار جو ماسٹر آفتاب کو دیکھ کر ہی چونک سا گیا تھا، اس کی بات سن کر مزید حیرت ہوئی۔

”میرے کچھ کالمز کو کتابی شکل میں شائع کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں موصوف۔ میں اسی سلسلے میں ہماری مینٹگ ہے۔“ شہریار نے دیکھا کہ یہ بات بتاتے ہوئے ماسٹر آفتاب کی ذہانت سے پُر آنکھوں میں شرمیلا پن چھلکے گا۔ شاید وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنی ذات کی خصوصیات

دوسروں کے سامنے بیان کرنے سے جھجکتے ہیں۔

”اچھا تو آپ کالم نگار ہیں۔ کئی اخلاقی نہیں ہوا آپ کا کچھ کوئی کالم پڑھتا ہے۔ حالانکہ میں مختلف اخبارات کا بڑی باقاعدگی سے مطالعہ کرتا ہوں۔“ شہریار نے ماسٹر آفتاب کو جس موضوع پر گفتگو کرنے کے لیے بلایا تھا، اس وقت اس سے بہت ہٹ کر گفتگو ہونے لگی تھی۔

”میں اے۔ اے فٹا کے نام سے لکھتا ہوں۔ شاید یہ نام بھی آپ کی نظر سے گزرے ہو۔“

”اوہ آئی سی۔ اے اے فٹا یعنی آفتاب احمد فٹا۔ آپ کے کالمز تو میں نے اکثر پڑھے ہیں اور مجھے پسند بھی آتے ہیں کیونکہ آپ کی پارٹی یا گروپ کے حسب فٹا لکھنے کے بجائے اپنے حسب فٹا لکھتے ہیں۔ مجھے بہت خوش محسوس ہو رہی ہے کہ میں ایک حق گو آدمی سے ملاقات کر رہا ہوں۔“ شہریار نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ماسٹر آفتاب سے یہ طور خاص ایک بار پھر ہاتھ ملایا۔

”بس! اللہ کا کرم ہے کہ اس نے مجھے حق پر ڈٹے رہنے کی توفیق عطا کی ہے ورنہ میری اوقات کیا ہے؟“ ماسٹر آفتاب کے لیے میں عاجزی تھی۔

”یہ تو واقعی درست ہے کہ اللہ ہی اپنے بندوں سے کام لیتا ہے لیکن آپ بتائیں کہ آپ میرا آدمی کیا کر رہے ہیں؟ اسے بڑے اخبار میں لکھنے والا شخص اور ایک پرائمری اسکول میں ٹیچنگ کر رہا ہے، بات کچھ عجیب نہیں آتی۔“

”یہ بھی ایک داستان ہے۔ اصل میں پڑھنا، پڑھانا اور لکھنا مجھے اپنے والد کی طرف سے ورثے میں ملا ہے۔ وہ لاہور کے ایک کالج میں ٹیچر رہتے۔ ساتھ ہی مختلف اخبارات کے لیے بھی لکھتے تھے۔ ان کو دیکھ کر مجھے بھی لکھنے کا شوق ہوا۔ زمانہ طالب علمی میں، میں نے لکھنے کا آغاز پرنسپل کی بیٹی سے کیا اور پھر کچھ اخبارات و غیرہ میں لکھنے لگا۔ ماسٹر زمل کرنے کے بعد مجھے شوق ہوا کہ تعلیم کے میدان میں کچھ کروں۔ میں نے ایک ایسے اشتاعتی ادارے کو جان کر لیا جو نصابی کتب پیش کرتے تھے۔ میں نے اس ادارے کے لیے کئی کتابیں ترتیب دیں۔ میرے آئیڈیاز کو کافی پسند کیا گیا۔ سب سے پہلی بہت اچھی مقرر ہوئی لیکن پھر ایک پوائنٹ پر آکر ہمارا اختلاف ہو گیا۔ میرا مؤقف تھا کہ ادارے کو اپنی کتابوں پر راسخ زکے نام بھی دینے چاہئیں مگر وہ لوگ صرف اسے ادارے کی تصویر چاہتے تھے۔ اصل محنت کرنے والوں کا کہیں کوئی نام ہی نہیں تھا۔ بس پھر میں نے انہیں چھوڑ دیا۔ پیشنگ بننے کے مانگ کا خیال تھا کہ میں

جوانی کے جوش میں ایک جذباتی فیصلہ کر رہا ہوں اور جب دال روٹی کے حصول کے لیے زمانے کی شمشیر کھاؤں کا تو خودی پلٹ کر آؤں گا۔ میرے نزدیک جو میرا اصولی مؤقف تھا، وہ ان کے نزدیک ان کا معاملہ تھا۔ بہر حال، وہاں سے جاب چھوڑنے کے بعد مجھ پر پنی رہا جس میں۔ اسے ساتھ ہونے والے اس پہلے اہتمام نے مجھے اسیا کی معاشرتی مسائل پر لکھوں اور پنی پھر میں لکھتا چلا گیا۔ جہاں جہاں، جس کسی کے ساتھ تنقیدی اور اہتمام ہونے دیکھا، اسے قلم کے ذریعے اس کی نشان دہی کرتا رہا۔ اللہ کا کرم ہے کہ اس نے عزت بھی دی اور شہرت بھی۔ پیسے کے پیچھے بھاگنے والوں میں سے ہم بھی رہے نہیں، اس لیے چاہتا ہوں کہ وہ بہت ہے۔“

”مگر اس قصے میں پھر آدے کا تے تو کہیں ذکر نہیں۔“ ماسٹر آفتاب کی بیان کردہ تفصیلات سننے کے بعد شہریار نے اپنا سوال دہرایا۔

”اس قصے کی طرف بھی آتا ہوں۔ اصل میں میرا ایک کلاس فیلو تھا پڑاؤ جن اور تنقیدی تھا۔ ماسٹر کے بعد اس نے سی ایس ایس کا امتحان پاس کیا۔ کوئی ٹیڈل کلاس کیلی سے ملنے رکھے والا شخص پوزیشن کے ساتھ یہ امتحان بکڑ کرے تو اس کی ذہانت پر شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ یہ سوکھو میٹری ایک ایسی دوڑ ہوتی ہے جس میں آپ جیسے ایک گروٹر رکھنے والے لوگ پہلے ہی ساتھ ساتھ ٹھوکر کھائے کھڑے ہوتے ہیں۔ اپنے ایسے حریفوں کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل جانا اور پس جیت لینا آسان نہیں ہوتا۔ میرے دوست نے یہ کارنامہ انجام دیا۔ صلی میں وہ پورہ روک ٹوک کا حصہ بنا دیا گیا۔ ابتدا میں اس میں بڑا جوش تھا۔ یہاں اس علاقے میں پیشنگ ہوتی تو معلوم ہوا پھر آدے میں چند سال پہلے ایک اسکول ہوا کہ تھا جو اب ختم کر دیا گیا ہے۔ میرے دوست کو کوئی ہوا کہ گاؤں کے بچوں کی تعلیم کا انتظام کیا جائے لیکن کوئی نہیں یہاں آکر کام کرنے پر راضی ہی نہیں ہوتا تھا۔ میرے دوست نے ایک دن میرے سامنے ذکر کیا۔ میرے اندر کا بچہ اس ذکر کو سن کر جاگ اٹھا اور میں اپنا پورا پورا مسرت سمیٹ کر وہاں آدے آ بیٹھا۔ اب سورت حال ہے کہ میں اب اس کا ساعد حالات کے باوجود جیسا ہوں۔ البتہ میرے دوست کی چھ ماہ کے اندر اندر ہی کسی دور دراز علاقے میں پیشنگ کر دی گئی۔ ناچے اب وہ ”سورہ“ سمیٹا ہے اور حکمران طبقے سے غیر ضروری ”پٹنگ“ لینے کی غلطی نہیں کرتا۔ ضرورت بھی کیا ہے اسے یہ لینے کی۔ اس بے چارے نے اتنی محنت کر کے سی ایس ایس کا امتحان پاس

لے پاس کیا تھا کہ اپنے اور اپنے گھر کے حالات بدلے گا۔ اگر گھرانوں کی ناراضگی کی وجہ سے اس کی ”بدلیاں“ ہوتی رہیں تو اس کا یہ خواب تو ادھر ادھر جاتا۔ اب امید ہے کہ وہ اپنے مقاصد کے حصول میں کامیاب ہو جائے گا۔ صاحب اقتدار واقعہ ارمی خوش رہیں گے۔ ہر طرف بے کاری پچھل اور بھگڑوں کے بجائے امن و امان اور باہمی تعاون کی فضا قائم ہوگی۔ اس سب کے سچ میں اگر عوام بے چارے اپنے ہیں تو پتے نہیں، وہ تو عادی ہی ہیں یہ سب سنے گے۔ ”ماسٹر آفتاب بات اگر چہ لمبی کرتا تھا مگر شہر یار کو اس سے گفتگو کرنے میں لطف آ رہا تھا۔

”بہت خوب! آپ کافی دلچسپ آدمی ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے آپ کی درخواست منظور کرنے کا فیصلہ پہلے ہی کر لیا تھا۔ انشاء اللہ جلد اس پر عمل درآمد شروع ہو جائے گا لیکن میں چاہتا ہوں کہ جلد بازی کے بجائے حوصلہ دہی سے کام لیا جائے۔ چودھری افتخار کو ناراض کیے بغیر ان کی رہنمائی سے بھی اسکول کی مہارت میں توسیع کا کام کیا جا سکتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ میں اس سلسلے میں ان کو گمانے کی کوشش کروں تو کامیاب رہوں گا۔ بس کچھ وقت لگے گا۔ کیا آپ ٹھوڑے عرصے کے لیے انتظار کر سکیں گے؟“

”بالکل سہا! جہاں دو سال انتظار کیا ہے، وہاں ٹھوڑا سا مزید انتظار کرنے میں یقیناً کوئی قحاح نہیں۔ مجھے اصل خوشی اس بات کی ہے کہ آپ نے کم از کم میری اس درخواست کا تنقیدی سے نوٹس تو لیا اور نہ اس سے پہلے تو کسی کو اتنی بھی توفیق نہیں ہوئی۔“ ماسٹر آفتاب نے سمجھت جواب دیا۔

”او کے آفتاب صاحب! آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ میری خواہش تو یہ تھی کہ آپ سے کچھ دیر اور گفتگو ہوئی لیکن آپ بھی لاہور کے لیے لیٹ ہو رہے ہیں اور میرے پاس بھی چند ایک ملاقاتیں اور بیٹھے ہیں تو بہتر ہے، میں آپ کو اجازت دے دوں مگر اس امید کے ساتھ کہ انشاء اللہ ہماری دوبارہ بہت جلد ملاقات ہوگی۔“ شہر یار کے گفتگوں میں موجود غلطیوں اس کے چہرے سے بھی بھٹک رہا تھا۔ ماسٹر آفتاب نے گرم جوشی کے ساتھ شہر یار سے ہاتھ ملایا اور مسکراتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

”تمہیں سے برا حال ہو گیا ہے۔ جانے یہ شہری عورتیں پورا پورا دل باز ادوں میں کیسے گزارا کرتی ہیں۔ ہم تو بس کوئی ٹھنڈا بھری رہے ہوں گے ہاں، ہر سارا پنڈا اس بری طرح دکھ رہا ہے کہ اب رات کو بدن دباوے بغیر نیند

نہیں آئے گی۔“ سیاہ شیٹوں والی گاڑی بکس روک چھوڑ کر گاؤں کی طرف جانے والے کچے راستے پر آئی تو جھیل نشست پر بیٹھی تاہور نے اپنے ساتھ موجود شہر کی طرف دیکھتے ہوئے تنہا کیا۔

”شہری عورتوں کو ہماری طرح صبح تر کے گھروں سے نکل کر بازار کے لیے روانہ نہیں ہوتا پڑتا۔ یہ جو تھکن چڑھی ہوئی ہے ہمارے بدنوں پر، یہ بازار میں خریداری کے لیے گھومتے سے نہیں چڑھی۔ یہ اس سفر کی وجہ سے چڑھی ہے جو ہم نے لاہور سے خریداری کے شوق میں کیا ہے۔“ کشور کا جوابیہ تبصرہ بہت سچ لگنے لگا تھا۔

”تو تو ہر وقت بس انکار سے ہی چلتی رہتی ہے۔ اگر منور آج کل دوپے جی سے نہ ہوتی تو مجھے تجھے ساتھ لانے کا احسان نہیں اٹھاتا پڑتا۔“ تاہور کو کشور کے انداز پر غصہ آ رہا۔ ”نہ اٹھائیں یہ احسان۔ کیا ضروری تھا کہ لاہور جا کر لہری سے خریداری کر لیں۔ ادھر فیصل آباد چلی جاتیں۔ وہ قریب بھی پڑتا اور اتنی تھکن بھی نہیں ہوتی۔“ کشور نے دوبارہ جواب دیا۔

”اوپر! فیصل آباد میں بھلا کیا ملتا ہے؟ عرس پر اپنا ہی کتنے مہمان بلائے ہیں شہر سے۔ افسروں کی بیویوں نے ایسے نئے نوے ڈیزائنوں والے کپڑے پہن رکھے ہوتے ہیں ان کا مقابلہ کرنے کے لیے لاہور سے ہی خریداری کرنی پڑتی ہے۔ اب دیکھ، میں ہم تینوں بہنوں کے لیے کیسے شان دار نئے سلائے جوڑے لے کر آئی ہوں۔ گاؤں کی درزن کو تو ایسی سلائی آتی ہی نہیں۔“

”آپ کو ضرورت کیا ہے افسروں کی بیویوں سے مقابلہ کرنے کی۔ وہ اپنی جگہ ہیں ہم اپنی جگہ۔“ تاہور کی بات سن کر کشور نے اعتراض کیا مگر تاہور جواباً کچھ نہیں بولی۔ اس کی وجہ کشور سے بہت کچھ راستے پر بیٹھنے پہلی چیز اور کھنڈر کے کرتے میں بیٹوں شخص کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔

”یہ شہری منڈا اکون ہے؟“ اس نے انکی نشست پر موجود ملازم سے پوچھا۔

”یہ تو ماسٹر آفتاب ہے۔ شاید شہر سے واپس آ رہا ہے۔ کمرہ چاؤ مغرب کے بعد اپنے تانے کو پور پچھرائیں گلوٹا اسی لیے وہ چارے کو پیدل آتا پڑا ہے۔“ ملازم جواب تک ذرا نیکر کے ساتھ اٹھتی نشست پر کوئی بہری بیٹی بیٹھی تھی، تاہور کو معلومات فراہم کرنے لگی۔

”مجھ کو بھی یہی شک تھا۔ بڑے عرصے سے سن رہی ہوں کہ یہ شہری منڈا گاؤں کے اسکول میں جہم کر بیٹھا ہوا

ہے۔ دیکھتے ہیں تو اچھا پڑھا لکھا لگتا ہے۔ سوچ رہی ہوں منور کے آباے کہوں کہ منور کو گھر پر پڑھانے کے لیے اسی ماسٹر کی ڈپٹی لگا دیں۔ ابھی تو منور چھوٹا ہے، اسے پڑھنے کے لیے نہیں بھیج سکتے۔ میرا اہل ہاں نہیں کرتا اسے خود سے دور کرنے کو۔ ابھی دو تین برس ادھر رہ کر پڑھنا لکھنا سیکھ لے گا پھر بعد میں اسے شہر بھجوا دیں گے۔ تیرا کیا خیال ہے کشور! میں بات کروں تاہور کے آباے اس ماسٹر آفتاب کو منور کو پڑھانے پر لگانے کی؟“ اپنا ارادہ ظاہر کرنے کے بعد تاہور نے کشور کی رائے بھی جاننی چاہی۔ کشور جو گاڑی کے بیک ویو میر میں لٹھ پر لٹھ دوڑتے ماسٹر آفتاب کو دیکھ رہی تھی، خود کو مخاطب کیے جانے پر بری طرح چونک گئی۔

”کیا کہا آپ نے مجھ سے؟“

”میں پوچھ رہی تھی کہ منور کو پڑھانے کے لیے اس ماسٹر آفتاب کو رکھوا لوں، تو نہ جانے کن خیالوں میں ڈوبی ہوئی تھی کہ میری بات ہی نہیں سنی۔“ تاہور نے نکلی سے اپنی بات دہرائی۔

”یہ تو بہت اچھا خیال ہے آپ! آپ ضرور بھلا اشرف سے بات کریں۔“ کشور نے تاہور کی تجویز پر تائید کرتے ہوئے دوبارہ بیک ویو میر پر نظر ڈالی۔ وہاں ماسٹر آفتاب کا عکس غائب ہو چکا تھا مگر وہ اب بھی اس عکس کو دیکھ سکتی تھی۔ یہ عکس بیک ویو میر سے بہت کراس کی آنکھوں کی پتلیوں میں جم چکا تھا۔

☆☆☆

پردوں کا ایک ڈھیر تھا جسے استری کرنے کے لیے وہ گھنٹا بھر سے استری اسٹینڈ کے آگے کھڑی تھی لیکن ڈھیر تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ چودھری افتخار کی وسیع و عریض خوشی میں بے تحاشا کڑکھائیاں اور دروازے تھے۔ اسی حساب سے پردوں کی بھی ایک بڑی تعداد تھی۔ عرس کے موقع پر جب خوشی میں بہت بڑی تعداد میں مہمان مدعو کیے جاتے تھے، اس وقت خوشی کی تزئین و آرائش پر بھی خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ شہر سے مل کر آنے والے بے سنے پردے بھی اسی آرائش کا ایک حصہ تھے جنہیں استری کرنے کی ذمہ داری ماہ بانو کے سر لگائی گئی تھی۔ استری اسٹینڈ کے آگے کھڑے کھڑے اس کی ٹانگیں ٹھٹھ ہونے لگی تھیں اور کمر اکڑ کر تھک رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ سارا کام ایک طرف ڈال کر خود گھر کی راہ لے لیکن ایسا کرنے کا وہ صرف سوچ ہی نہ سکتی تھی۔ محل کی راہ میں ماں باپ اور بھائی بہنوں کی انتہا کرتی ہوئی نظریں حائل ہو جاتی

تھیں۔ یہ نظریں اس سے کبھی تھیں کہ اگر تم نے وڈی چودھرائی کے حکم سے سرتابی کی کوشش کی تو ہماری زندگی جو پہلے ہی اچھی خاصی ختم ہے اور بھی مشکل میں پڑ جائے گی۔ نظروں کی اس انتہا نے ماہ بانو کے ہاتھ بڑھانے کے بعد اس کی زبان پر بھی ہر گاہ دی تھی۔ اب وہ خود کھانے والے بر عظمیٰ کی خاموشی سے غصے کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ البتہ پہلے دن ضرور اس نے خوشی سے گھر واپس جانے کے بعد خوشی میں خود سے روار کئے جانے والے تار و اسوک کی شکایت کرتے ہوئے دوبارہ خوشی جانے سے انکار کی کوشش کی تھی لیکن اس موقع پر نوران نے اپنی منہ سماعت اور مجبور یوں کی داستان سے اسے خاموشی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ماہ بانو اپنے ماں باپ کی مجبور یوں کو سمجھتی ہی لیکن اسے ان کی اس غلامانہ روش سے سخت اختلاف تھا۔ ان کی اس غلامانہ روش نے اسے جس مشکل میں پھنسا تھا، اس کے بعد وہ اپنے ماں باپ کی طرف سے بکراہ بدل ہو گئی تھی لیکن اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ اس سلسلے میں مزید زبان نہیں کھولے گی۔ وہ شفقت کے بے پند بھاری دن خاموشی کے ساتھ گزار کر بھی نہ واپس بیٹنے کے لیے گاؤں سے فیصل آباد واپس جانے کا حکم ارادہ کر چکی تھی۔

”ماہ بانو! تجھے تاہور کی بلا رہی ہیں۔ رانی کی آواز نے ماہ بانو کو سوچوں کے سمندر سے نکالا۔

”کون تاہور بی بی؟“ استری شدہ ایک ملازمہ کو قصاتے ہوئے ماہ بانو نے بے زاری سے پوچھا۔ وہاں کام ایک جہنم کی شکل میں ہو رہا تھا۔ ماہ بانو پر استری کرنے دینی تو دوسری ملازمہ استری شدہ پردے میں ایک لگانا شروع کر دی تھی۔ یک لگانے کے بعد پردے کو اس مقام پر پہنچا دیا جاتا جہاں اسے لگایا جاتا تھا۔ اس کام کے لیے بے قدری ایک چھپرے سے بدن والی ملازمہ کو ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ وہ ملازمہ اونچے سے اسٹول پر چڑھ کر پردوں کو رینگ میں لگانے کا کام پھونپھونتی انجام دے رہی تھی۔ استری کا کام چونکہ سب سے زیادہ وقت طلب تھا، اس لیے اسے کام پر ماہ بانو کے علاوہ بھی ایک اور ملازمہ مقرر کی گئی تھی۔ اس ملازمہ نے ایک دوسرا استری اسٹینڈ منہاں رکھا تھا۔ خوشی میں بیٹلی کی سپلائی بڑے زبردست طریقے سے ہوتی تھی۔ دراصل بیٹلی کا اصل استعمال ہوتا ہی خوشی میں تھا۔ گاؤں کے زیادہ تر گھروں میں تو ساتھ دولت کے دو تین ٹھنڈے ہوئے بیٹوں اور ایک آدھ ٹھنڈے کے سوا کچلی کے استعمال کی کوئی اور شے موجود ہی نہیں تھی۔ وہ بے چارے اپنی تھکاوٹ میں اس

سے زیادہ بجلی خرچ کر کے اس کے بل کی ادائیگی کے متحمل ہو بھی نہیں سکتے تھے۔ شاید چودھری افتخار اس بات کو ناجائز طرح سمجھتا تھا اس لیے اس نے اپنے گاؤں میں اس سہولت کے فراہم کیے جانے پر کوئی روڑا اٹکانے کی کوشش نہیں کی تھی کیونکہ بہر حال، اس سہولت کا اصل فائدہ تو اسی کو پہنچتا تھا۔

”چودھری صاحب کی سب سے وڈی دہی۔ تیری اماں نے انہیں بتایا ہے کہ تجھے بڑی اچھی ڈیزین (ڈیزائن) والی مہندی لگانی آتی ہے۔ تاجور بی بی نے یہ بات سنی تو مجھے تجھے ہانے کے لیے بھیج دیا۔ وہ کل ہی شہر سے کون مہندی لے کر آئی ہیں۔ تو چھوڑ اب اس استری کے کام کو۔ اس کام پر بی بی نے مجھ سے بھی کوکھانے کا کہا ہے۔ تو چل کر بی بی کی بات سن لے۔“ رانی کا لایا ہوا پیاماہ بانو کے لیے نجات بن کر آیا تھا۔ وہ چھت استری بند کر کے رانی کے ساتھ روانہ ہو گئی۔

”چودھری صاحب کی کتنی اولاد دیں ہیں رانی؟“ رانی کے ساتھ چلتے ہوئے ماہ بانو نے اس سے پوچھا۔ اسے جس تھا کہ تین تین شادیاں کرنے والا چودھری افتخار اولاد میں کتنی رکھتا ہوگا۔

”کل پانچ بچے ہیں چودھری صاحب کے۔ وڈی چودھرائی سے ایک بیٹا اور ایک بیٹی، چھٹی سے دو بیٹیاں اور چھٹی سے صرف ایک بیٹا۔“ رانی نے بتایا۔

”مگر میں نے تو یہاں صرف ایک کشور بی بی کے سوا کسی کو دیکھا ہی نہیں۔ باقی سارے لوگ کہاں ہوتے ہیں؟“ ماہ بانو نے تعجب سے سوال کیا۔ وہ اور رانی بات مکمل کرنے کے لیے ایک ستون کے پاس جا کر کھینچیں۔

”تاجور بی بی اور صنوبر بی بی کی شادی کو تو کئی برس بیت گئے۔ دونوں پیادہ گر اپنے ماما کے گھر گئی ہیں۔ کشور بی بی کا خاندان میں کوئی جوڑ نہیں اس لیے وہ اب بھی تنگ اسی حویلی میں جمی ہیں۔ مشکل ہی ہے کہ ان کا کبھی کہیں پیادہ ہو۔ چودھری صاحب کے خاندان میں لڑکیوں کا پیادہ باہر کرنے کا رواج نہیں۔ مردوں کو بھی ایک شادی ضرور خاندان میں ہی کرنی ہوتی ہے۔ اب بے چاری کشور بی بی کی قسمت کہ دور نزدیک میں ان کے جوڑ کا کوئی رشتہ ہی نہیں۔ تینوں بہنوں سے وڈے مراد چودھری ہیں۔ وہ کئی برس سے امریکا میں رہ رہے ہیں۔ اپنے بیوی بچوں کو بھی وہیں اپنے ساتھ رکھا ہوا ہے۔ کہتے ہیں یہاں اس ملک میں تعلیم کا کوئی اچھا انتظام نہیں اس لیے وہ اپنے بچوں کے ساتھ وہیں امریکا میں رہیں گے۔ کبھی بھی ملنے کے لیے حویلی آ جاتے ہیں۔ ویسے ان کا خرچا یہاں سے چودھری صاحب بھرتا رہتے ہیں۔ سب

سے چھوٹے بہزاد چودھری تو سمجھو اللہ لوگ ہیں۔ کسی چیز کا ہوش نہیں رہتا ان بے چاروں کو۔ حویلی کی اوپر والی منزل پر سب سے الگ تھلک رکھا گیا ہے انہیں۔ ان کے خادم اور ملازمین انہیں بالکل الگ ہیں۔ ان کی ماں، سب سے چھوٹی چودھرائی عصمت بی بی کو چودھری صاحب شہر سے پیادہ کر لائے تھے۔ سنا ہے یہ ماہ بانو کی مرضی کے بغیر کیا تھا ان کے گھر والوں نے۔ وہ لوگ چودھری صاحب کی دولت اور طاقت کے رعب میں آ گئے تھے۔ عصمت بی بی بے چاری شہر کی پرچی لکھی خوب صورت لڑکی تھیں۔ انہیں چودھری صاحب کی بیوی بننا منظور نہیں تھا لیکن ظاہر ہے لڑکی ذات کیاں تک اپنے گھر والوں سے لڑتیں۔ پیادہ کر آخر کار حویلی آ گئیں، پر ان کی یہاں دل نہیں لگا۔ لوگ بتاتے ہیں بڑی اچھی طبیعت کی تھیں۔ سب سے بہت اچھی طرح بات کرتی تھیں لیکن خود بڑی اداس اور پریشان رہتی تھیں۔ شاید ان کی اس کیفیت کی وجہ سے ہی پیادہ بچے کے دو سال بعد بہزاد چودھری دنیا میں آئے تو ذاتی طور پر ٹھیک نہیں تھے۔ خصوصیت بی بی ان کی پیدائش کے وقت جان سے چلی گئیں۔ اپنی کشور بی بی کی ان سے بڑی دوستی تھی۔ انہوں نے کشور بی بی کو لکھنا پڑھنا سکھایا تھا۔ ان کی اس مہربانی کی وجہ سے اب کشور بی بی کا وقت کچھ اچھا گزر جاتا ہے۔ وہ سارا وقت کتابیں اور رسالے پڑھ کر اپنا دل بھلائی رہتی ہیں۔ کبھی بھارواہر جا کر بہزاد چودھری کا حال بھی دیکھ لیتی ہیں۔ کشور بی بی کا ہی دم ہے کہ ملازما میں بہزاد چودھری کا خیال رکھتی ہیں ورنہ اور تو حویلی میں کسی کو بھی ان کا خیال نہیں۔ خود چودھری صاحب بھی کبھی بٹے کا حال معلوم کرنے نہیں جاتے۔ ماہ بانو کے پوچھنے پر رانی نے ساری تفصیل کہہ سنائی پھر ذرا بیٹھتا ہے ہوئے ہوئی۔

”تو نے مجھے ادھر باتوں میں لگا دیا وہاں بی بی راہ دیکھ رہی ہوں گی۔ تیری وجہ سے میری بھی شامت آ جائے گی۔ ویسے ہی سب یہی کہتے ہیں کہ رانی کو باتیں بنانے کا بہت شوق ہے۔ ابھی بھی سب یہی کہتے ہیں کہ میں تجھے لے کر باتیں کرنے کڑی ہو گئی تھی۔“ تجیز تیز بولتی وہ ماہ بانو کو اپنے ساتھ لے کر ایک کمرے میں داخل ہوئی۔ یہاں اس وقت چودھری افتخار کی دونوں بیویوں کے ساتھ اس کی تینوں بیٹیاں بھی موجود تھیں۔

”کہاں مرگئی تھی تو؟ اتنی درگدی واپس آئے میں۔“ رانی کو دیکھتے ہی تاجور نے اسے ڈانٹا۔

”وہ بی بی اس کو فارغ کروا کر کبھی کو کام پر لگنے میں

تھوڑا وقت لگ گیا اس لیے دیر ہو گئی۔“ رانی نے کچھ دروغ موٹی سے کام لیتے ہوئے اپنی صفائی پیش کی۔

”ہیل، زیادہ بکواس نہ کر۔ مجھے سب معلوم ہے کہ تو کتنی بے حرام ہے۔ سوچ لےنے ہی کہیں باتیں بنانے کڑی ہو گئی ہو گی۔“ رانی نے سچ کہا تھا کہ تاخیر پر اس کی باتوں کی نفرت کو سنی مسودہ اترام خضر ایا جائے گا۔ تاجور واقعی اس کے بتائے جانے کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ رانی نے بھی مزید صفائی پیش کر کے اس کے جسم کو مزید بھڑکانے کے بجائے خاموش ہو جانا ہی مناسب سمجھا۔

”لا، وہ کون لا کر دے اسے تاکہ یہ مہندی لگا کر شروع کرے۔“ تاجور نے سخت لہجے میں رانی کو کھم دیا جس کی اس نے فوراً تعمیل کی۔ ماہ بانو اس کے ہاتھ سے کون تمام کرتا چور کی تبدیلی پر پیش ونگار بنانے لگی۔ دوسری طرف رانی نے بھی ایک بڑے کٹورے میں بھگوئی ہوئی مہندی بڑی چودھرائی کے کٹورے پر لگانی شروع کر دی۔ موسم اچھا خاصا سرد تھا۔ کٹوروں پر لگی مہندی کی ٹھنڈک کا تصور کر کے ماہ بانو کو پھریری سی آگئی لیکن بڑی چودھرائی حرسے سے گاؤں گئے سے کمر لگے نہم دراز تھی۔ اس کا دایاں ہاتھ مسلسل اپنے پہلو میں رکھی خشک میووں کی بھری ہوئی پلٹ سے اس کے منہ تک کا سفر طے کر رہا تھا۔ شاید یہ ان میووں کی ہی طاقت اور گرمی تھی جس نے بڑی چودھرائی کو اتنا جان دار بنادیا تھا کہ اس پر سردی کا کوئی خاص اثر نظر نہیں آ رہا تھا۔ دل ہی دل میں یہ سب سوچتی ماہ بانو بڑی جاغشتانی سے تاجور کے ہاتھوں پر مہندی کے گلے بٹاتی رہی۔ تاجور کے ہاتھ حیروں پر مہندی لگا کر فارغ ہوئی تو صنوبر کا نمبر تھا۔

حقیقت کے مراحل سے گزرنے کے باعث صنوبر کا جسم اچھا خاصا بے ڈھب ہو رہا تھا۔ وہ اپنی حالت کی وجہ سے خوب ہاتھ پیر پیر کر رہی ہوئی تھی۔ اس کی اس آرام طلبی کا خیال رکھتے ہوئے اس کے حیروں پر مہندی کا ڈیزائن صفائی کے ساتھ لگانا ماہ بانو کے لیے اچھا خاصا دشوار مرحلہ ثابت ہوا۔ صنوبر خود کو رانگی تکلیف میں مبتلا کرنے یا اپنے جلنے کے موڈ میں نہیں تھی لیکن فرمائش اس کی یہی تھی کہ ڈیزائن بہت عمدہ کی اور صفائی سے بنایا جائے۔ ماہ بانو پر مشکل اس مرحلے سے گزرتی تو آگے تاجور اور صنوبر کی بیٹیاں مہندی لگوانے کی بختہ بیٹھی تھیں۔ یہ ظاہر آرام سے بیٹھے بیٹھے کیا جانے والا یہ کام اتنا آسان بھی نہیں تھا، جتنا دیکھنے پر محسوس ہوتا تھا۔ پوری توجہ اور عرق ریزی سے اس کام کو کھٹائی ماہ بانو کی آنکھیں دیکھنے لگیں۔ البتہ رانی بھی کی دونوں چودھرائیوں،

تاجور اور صنوبر کے کٹوروں پر مہندی کا لب کر کے فارغ ہو چکی تھی۔ اسے بڑی چودھرائی نے کسی اور کام کا ہتھ کر کے سے باہر بھیج دیا تھا۔ اب دونوں سوتیلی بہنیں ان کی بیٹیاں آنے والی متوجہ مہمان خواہن کے کپڑوں اور زیورات وغیرہ کے بارے میں چالو خیال کر رہی تھیں۔ ماہ بانو ان کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ وہ تمام خواہن اچھی رہتے اور خواہن اور دیگر مہمانوں سے زیور اور کپڑوں کے مقابلے میں سبقت لے جانے کے لیے بھرپور تیاری کر کے بیٹھی ہوئی ہیں لیکن پھر بھی تشویش کا شکار ہیں۔ تاجور اور صنوبر بھی بیکے کی آزادی کا فائدہ اٹھا کر دل کھول کر اپنی مامی کی جو کران کی ساس بھیجی، برائیاں کرنے اور مذاق اڑانے میں مصروف تھیں۔ البتہ افسران کی بیویوں کی طرف سے وہ بھی کچھ گھبرائی کا شکار تھیں کہ کہیں ان کے اعلیٰ ذوق کے سامنے وہ خود ماندہ پڑ جائیں۔ کمرے میں موجود واحد ہستی جو خاموشی سے ایک کرسی پر بیٹھی کسی رسالے کی ورق گردانی کرتی ہوئی ان سارے معاملات سے بالکل نظر آ رہی تھی، وہ چودھری افتخار کی سب سے چھوٹی بیٹی شوبھی۔

”کشور دیکھ! کتنا سونپڑا؟“ رانی بتایا ہے تو ان کی بیٹی نے۔ تو بھی اس سے اپنے ہاتھوں پر مہندی لگوائے۔“ صنوبر نے اپنے مہندی لگے ہاتھ کشور کو دکھاتے ہوئے اسے ترغیب دی۔

”آپ ہی لگوائیں آپا! مجھے ایسا کوئی ارمان نہیں۔“ کشور نے بی بی چل صنوبر کے ہاتھوں کی طرف دیکھا اور پھر نظریں واپس رسالے پر پڑا کر رکھا تھی سے جواب دیا۔ کم عمر اور نا تجربہ کار ماہ بانو نے فکس کیا کہ ”مجھے ارمان نہیں“ کہنے والی کشور کی نگاہ جب صنوبر کے مہندی لگے ہاتھوں پر پڑی تو ان آنکھوں میں بڑی جوش کی اور اس پیش کے پیچھے ارمان ہی ارمان کر، میں لے رہے تھے لیکن اس نے اپنے ان ارمانوں پر بندہ باندھ رکھا تھا۔ ماہ بانو کو ایک دم ہی رانی کی تھوڑی دیر پہلے بتائی بات یاد آئی کہ کشور بی بی کے لیے خاندان میں کوئی جوڑ نہیں اس لیے مشکل ہی ہے کہ ان کا پیادہ ہو سکے۔ حویلی والوں سے ان کے کاکمانہ اور خالمانہ وڈے کی وجہ سے اچھی خاصی بدل ماہ بانو اپنی حساس طبیعت کی وجہ سے کشور کا کچھ محسوس کیے بنا نہیں رہی۔ وہ خود ابھی صرف ستر سال کی تھی، فی الحال اس کی زندگی میں کوئی نہیں آتا تھا لیکن اس کے آنے والے کی راہ تو دل نے چپکے چپکے دیکھنا شروع کر دی تھی۔ پھر وہ کیسے مان ملتی تھی کہ پھر پھر جو ان کشور بی بی کے دل میں کوئی ارمان نہیں تھا۔ ارمان تو ہر دل میں ہوتے ہیں، چاہے وہ دل

کسی غریب کسان یا مزار سے کی جی کا ہوا یا چودھری افتخار کی بیٹی کے سینے میں دھڑکتا ہو۔ بس کچھ گڑبگڑ کر وہی حقیقت ایسی ہوتی ہیں جو ان ماموں، خواہوں اور خواہشوں کو پھینٹ نہیں دیتیں۔ کشور کے ساتھ بھی جیسا معاملہ تھا۔

”ذرا میرے ہاتھ پر بھی تو تاجر جیسی مہندی لگا دے ماہ بانو!“ بڑی چودھرائی کی آواز سوچوں میں غلغلان ماہ بانو کو کمرے کے ماحول میں واپس کھینچ لائی۔ بڑی چودھرائی کی فرمائش سن کر تاجر اور منو پر بھی بچیاں منہ چھپ کر کے دلی دلی ہنسی ہنسنے لگیں۔ ان ہنسنے والوں میں اس کی سوتن ناہید بھی شامل تھی لیکن اس نے اپنی ہنسی کو ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ حویلی کی کمرہ پر بڑی چودھرائی کا کل کر مذاق اڑانے کی جرأت نہیں تھی اس میں۔ ایک تو وہ بڑی ہونے کی وجہ سے سبقت رشتہ تھی، دوسرے اسے حویلی کے وارث کی ماں ہونے کا فخر بھی حاصل تھا۔ ہاں اگر ناہید کے ہاں منو پر اور کشور کے علاوہ ایک بیٹا بھی ہو جاتا یا عصمت کا بیٹا ہزار دہائی معذوری کا شکار نہ ہوتا تو صورت حال قدرے مختلف ہو سکتی تھی۔ لیکن اب تو بڑی چودھرائی کے سامنے سرجھکائے رکھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

ماہ بانو کوں ہاتھ میں لیے بڑی چودھرائی کے قریب جا بیٹھی اور چودھرائی کا ہاتھ اپنے سینے میں ہاتھ کی گرفت میں لے کر اس پر بھروسہ و نگار بنانے کی کوشش شروع کر دی لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں تھا۔ چودھرائی جس کے بارے میں سنا تھا کہ عمر میں چودھری افتخار سے کئی برس بڑی ہے، تمام تر جدوجہد کے باوجود اس کے جسم پر عمر کے اثرات ظاہر تھے۔ وہ تاجر اور منو پر کی طرح بھرا بھرا اور کسی ہوئی جلد والا ہاتھ نہیں رکھتی تھی کہ ماہ بانو آسانی سے اس کے ہاتھ پر اپنی کارگیری کا ہنر دکھا سکتی۔ سبھیوں زود ہاتھ، جس پر باجبا نہیں ابھری ہوئی تھیں، ماہ بانو کے کن کو مات دے کر اسے تاکام بناتا تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ کب چڑھی بڑی چودھرائی خود یہ بات مانے اور کھینچے پر ہل نہ جائیں ہوگی اس لیے پوری تدریسی سے کوشش میں لگی ہوئی تھی۔ اس کوشش میں اسے اپنے تن بدن اور ارد گرد کا بھی ہوش نہیں تھا، جب اپنی اپنی پشت پر سے سنائی دینے والی آواز پر ہی طرے چوک گئی۔

”ادھر کیا ہو رہا ہے بھی؟“ ماہ بانو نے پلٹ کر سوال کرنے والے کو دیکھا۔ وہ چودھری افتخار تھا جو سوال تو جانے کس سے کر رہا تھا لیکن نظریں ماہ بانو کے وجود پر گڑی ہوئی تھیں۔ اس کی نظروں نے ماہ بانو کو احساس دلایا کہ اس کی آواز میں سارا ہاں میں شانے سے سرک جانے کے باعث بڑی

سے پروائی سے صرف دایم شانے پر بڑی ہوئی ہے۔ اس نے پھر کی سے اودھنی کو اپنے گرد لپیٹا۔ وہ عمر اور ناتجربہ کار تھی لیکن سوائی جہلت اسے چودھری افتخار کی نظر کا زاویہ سمجھا سکتی تھی۔

”ہم لوگ مہندی لگوا رہے تھے ابا جی!“ تاجر نے کھڑے ہو کر ادب سے چودھری افتخار کے سوال کا جواب دیا تو چودھری جہاں ماہ بانو کے نوخیز و پرکشش حسن کی رعنائیاں اودھنی کے پیچھے چھپ جانے کے باعث محویت سے نکل آیا تھا، تاجر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”اچھی بات ہے بیٹا، پر یہ بتاؤ کہ تمہاری ماں کو اس بندھے ویلے پر تڑپوں والا شوق کیوں چرایا ہے؟“ چودھری افتخار نے بڑی چودھرائی کا ستر اڑایا جس کا کسی نے جواب نہیں دیا۔ خود بڑی چودھرائی بھی بس ہراساں بنا کر رہ گئی۔

”میں تم لوگوں کو یہ بات یاد دلانے آیا تھا کہ سارے انتظامات پر گڑی نگاہ رکھنی ہے۔ کہیں کوئی کی نہیں رہتی چاہے۔ مردانے میں تو میں خود ہوں گا اس لیے کوئی مسئلہ نہیں۔ میں آپ ہی وہاں کے سارے معاملات دیکھ لوں گا، پر تم لوگ دھیان رکھنا۔ ہر بار تم لوگوں کی بے پروائی سے زنان خانے میں کوئی نہ کوئی کمی رہ جاتی ہے اور پھر زنانیاں اپنے گھروں کو واپس جا کر نام چودھری ہیں۔ اس بار بھی کوئی شکایت نہیں مٹی چاہیے تھے۔“ چودھری افتخار نے گفتگو کا موضوع بدل کر بحث کیجے میں اپنے گھر کی خواتین کو قسم دینا۔

”آپ گھر کی نہ کریں چودھری صاحب! اب مجھ آپ کے عمر کے مطابق ہوگا۔ اس داری میں نے پہلے سے ہی بڑی سختی کر رکھی ہے نوکریاں پر۔ اس داری وہ کوئی گلتی کرنے کی جرأت نہیں کریں گی۔“ بڑی چودھرائی کا سکس ساری حویلی پر چلتا تھا لیکن چودھری افتخار کے سامنے وہ ہمیشہ آواز دبا کر بات کرتی تھی۔ اس وقت بھی اس نے دھیمی آواز میں چودھری کو اطمینان دلانے کی کوشش کی تھی۔ اس کی اس یقین دہانی پر چودھری افتخار نے جواب تو کوئی نہیں دیا لیکن ایک طنز و نفرت بھری ”اونید“ کر کے کمرے سے باہر نکل گیا۔

”پہل ہٹ پرے۔ لے کر میرے ہاتھ کا تار سا رادیا۔“ بڑی چودھرائی نے چودھری افتخار کی ماہ بانو پر پڑنے والی نظریں بھی دھیمی تھیں اور اسے ایک مزار سے کی بیٹی کے سامنے اپنی بے عزتی کا بھی احساس تھا، اس لیے چودھری کے باہر نکلتے ہی ماہ بانو کو زور سے دھکا دے کر خود سے دور ہٹاتے ہوئے اپنے اندر کا غصہ نکالا۔ دھکے کے زور سے ایک طرف جا گرنے والی ماہ بانو چودھرائی کے غصے کا سبب اور اپنا

قصوری سوچتی رہ گئی۔

☆☆☆

”صاحب! میری مدد کرو۔“ شہر یار بچے نام کے بعد اپنے آفس سے باہر نکلا ہی تھا کہ ایک بوڑھا مفلوک الحال شخص اس کے راستے میں آکھڑا ہوا۔ شہر یار نے رک کر، اچانک راستے میں آکھڑے ہونے والے اس بوڑھے کا جائزہ لیا۔ بوڑھے نے چار خانوں والی دہ بند پر ایک پٹنا ہوا بوسیدہ سا گرتہ پنچن رکھا تھا۔ یہ بوسیدہ گرتہ سردی کی شدت کا مقابلہ کرنے کے لیے قلعی ناکائی تھا اور شہر یار بوڑھے کے جسم میں موجود دلرزش کو صاف دیکھ سکتا تھا لیکن یہ دلرزش کی کیا پامٹ صرف سردی کی وجہ سے نہیں تھی، اس کے پیچھے بوڑھے کا مسلسل گرہ بھی موجود تھا۔ وہ آنسوؤں کے ساتھ باقاعدہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ آنسو اس کے جھریوں زدہ چہرے سے بہتے ہوئے اس کے بوسیدہ کمرے میں جذب ہو رہے تھے۔

”صاحب! میری مدد کرو۔“ شہر یار کی طرف سے فوری کوئی رد عمل ظاہر نہ ہونے پر بوڑھے نے اسے دوبارہ مخاطب کیا۔

”اندھ چلو! یا پھر بات کرتے ہیں۔“ شہر یار باہر جانے کا ارادہ ترک کر کے دوبارہ اپنے آفس کی طرف پلٹ گیا۔ بوڑھا آدمی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

”ایک گلاس پانی لاؤ۔“ بوڑھے کو اپنے آفس میں بٹھا کر شہر یار نے چچائی کو قسم دیا۔

”پانی بنو بابا! پھر آرام سے بتاؤ کہ کیا مسئلہ ہے؟“ چہرہ اسی پانی سے لگا یا تو شہر یار نے بوڑھے کو مخاطب کیا۔

بوڑھے نے چپ چاپ شہر یار کی بات مان لی اور ایک سانس میں سارا پانی چڑھا لیا۔ پانی پی کر اس کے حواس کچھ بحال ہوئے اور وہ بائیں ہاتھ کی مدد سے اپنے رخساروں پر ٹھہرے آنسوؤں کے قطرے کو صاف کرنے لگا۔ چہرے پر آنسوؤں کے قطرے صاف کرتے ہوئے ان ہاتھوں کا کھر درا پین، ابھری ہوئی رگیں اور سیاہ پڑتی کھال گواہی دے رہی تھی کہ بوڑھے کی ساری زندگی اشتک محنت اور مشقت میں گزری ہے۔ زندگی بھر کی محنت و مشقت گویا اس کے ہاتھوں پر امنٹ لٹھن بن کر شہت ہو گئی تھی۔

”ہاں بابا! اب یوں کیا مسئلہ ہے؟ تمہیں مجھ سے کیا مدد چاہیے؟“ بوڑھے کو سمجھنے دیکھ کر شہر یار نے زری سے اس کا مسئلہ پوچھا۔

”میں لٹ گیا صاحب! میں برباد ہو گیا۔ میری زندگی

بھر کی کمائی اور عزت لوٹ کر لے گئے ظالم۔“ بوڑھے کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو چلے آئے۔

”کس نے لوٹ لیا تمہیں؟ کون ہے یہ ظلم کرنے والا؟ ذرا آرام سے اور تفصیل سے ساری بات بتاؤ۔“ شہر یار یہ تو محسوس کر سکتا تھا کہ وہ شخص کسی نہایت اندویشناک حادثے سے گزرا ہے لیکن ان چند جملوں سے پوری تفصیل اخذ کرنا مشکل تھا اس لیے اس نے بوڑھے کو کرایا۔

”کیا بتاؤں صاحب کہ وہ کون ہیں؟ ان کا کوئی نام اور پتا تو ہے نہیں۔ وہ تو بس کسی آندھی کی طرح آتے ہیں اور ہم غریبوں کو برباد کر کے چلے جاتے ہیں۔ میں نے کتنی مشکل سے اپنی دھمی کے جھیز کے لیے زیور، کپڑا بوڑھا تھا۔ رات کو کھانا کھانے کے لیے رقم جمع کی تھی۔ ظالم سب کچھ لوٹ کر لے گئے۔ ساتھ میری دھمی کو بھی لے گئے۔ میں نے کتنی محنت کی ان کی۔ سرسرووں میں رکھ دیا، مردہ و ہرے سفید چوڑے کا لحاظ کیے بغیر اس پر ٹھوکر مار کر چلے گئے۔“ بوڑھے کی بات سن کر شہر یار نے پہلی بار پوچھا کہ اس کے ہاتھ پر بائیں جانب اچھا خاصا بڑا گومڑا بھرا ہوا ہے۔ یہ گومڑا یقیناً بوڑھے کو لگائی جانے والی ٹھوکر ہی کا شواہد تھا۔

”تم نے تھانے میں رپورٹ کروائی اس واقعے کی؟“ بوڑھے کا خاندان واقعی ایک قیامت سے گزرا تھا۔ شہر یار نے اپنے دل میں اس کے لیے حقیقی دکھ محسوس کرتے ہوئے ہمدردی سے پوچھا۔

”پہلے ادھر ہی گیا تھا۔ تھانے دار وہاں ہے، پہلے دو سو روپیہ دو چکر پر چمکانے لگا۔ میں اس کو دو سو روپیہ کہاں سے دیتا؟ ڈاکو پانی پانی لوٹ کر لے گئے جہاں میرے گھرے۔ میرے پاس تو یہاں آنے کے لیے تانے کا کرنا بھی نہیں تھا۔ اپنے گاؤں سے پیدل یہاں تک آ رہا ہوں۔ سچ فخر کے بعد کا چلا ہوا ہوں۔ پہلے تھانے گیا تھا، وہاں کسی نے نہیں سنی پھر کسی نے کہا نا ہے، ہی آیا ہے اور اچھا آدمی ہے۔ اس سے جا کر شکایت کر دو وہ تمہاری عرض سے گا۔ اس لیے میں یہاں دوڑ آیا۔“

بوڑھے کی بتائی ہوئی تفصیلات سن کر شہر یار کے چہرے پر غصے کی سرخی دوڑنے لگی۔ کیا ستم تھا کہ ایک شخص پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی، وہ اپنی کل بچائی کے ساتھ ہی اس کے ظلم کی رپورٹ محروم ہو گیا تھا اور کوئی اس کے ساتھ ہونے اس ظلم کی رپورٹ لکھنے والا بھی نہیں تھا کیونکہ وہ رپورٹ لکھوانے کے لیے دو سو روپے تھانے دار کو رشٹ میں نہیں دے سکتا تھا۔

”تھانے دار کون ہوتا ہے رپورٹ لکھنے کے دو سو روپے

مانگتے والا؟ تم پر ظلم ہوا ہے، تمہارا حق ہے کہ تم اس ظلم کی رپورٹ لکھو۔“

”تمہارے دار یوتا ہے تو نے اپنے پاس بڑا مال دبا رکھا ہے۔ خیرے پاس مال تھا جب ہی تو ڈاکو تیرے گھر آئے تھے۔ اب اس مال میں سے ٹھوڑا سا حصہ ہمیں بھی دے دے۔“ بوڑھے نے تمہارے دار کا موقف بتایا۔

اس بار شہر یار نے بوڑھے سے کچھ نہیں کہا اور انٹرکام پر عبداللہ مان کو اندر آنے کا حکم دیا۔

”عبداللہ مان! گاڑی لکھو۔ ہمیں ابھی اس شخص کے ساتھ اس کے گاؤں جانا ہے۔“ عبداللہ مان کے اندر آتے ہی شہر یار نے اسے ہدایت جاری کی۔

”اوکے سر! میں ابھی پانچ منٹ میں بندوبست کرتا ہوں۔“ عبداللہ مان نے جواب دیا اور واقعی ٹھیک پانچ منٹ بعد وہ لوگ گاڑی میں سوار ہوئے گاؤں جارہے تھے۔

بوڑھا گاڑی کی اگلی نشست پر ڈرائیور مشاہیرم خان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا جبکہ عبداللہ مان شہر یار کے ساتھ چھٹی نشست پر تھا۔ راستے میں شہر یار نے عبداللہ مان کو بوڑھے کے ساتھ

بیٹے حادثے کے بارے میں مختصر آہٹا باور پھر اس سے پوچھا۔ ”کیا اس سے پہلے بھی اس قسم کے کيسر سامنے آئے ہیں؟“

”یقین سے تو نہیں بتا سکتا لیکن بعض اوقات اڑتی اڑتی یہ خیر مل جاتی ہے کہ ڈاکوؤں کے گروہ نے کسی گاؤں پر حملہ کیا اور ان کا مال و اسباب لوٹنے کے ساتھ کوئی لڑکی بھی اٹھا کر لے گئے۔“ عبداللہ مان نے مختار الفاظ میں شہر یار کے

سوال کا جواب دیا۔ اس جواب کو سن کر شہر یار نے خاموشی اختیار کر لی۔ باقی کاراستہ اسی خاموشی میں گزرا۔

راستہ کچھ طویل تھا لیکن اس طوالت کو مضبوط ٹائروں اور طاقتور انجن والی گاڑی نے بہت تیزی سے طے کر لیا تھا۔ اس کے باوجود شہر یار بوڑھے شخص کی اس تکلیف کو محسوس کیے بنا

نہیں رہ سکا جواس نے کئی گھنٹوں کی مسافت پیدل کرنے میں اٹھائی ہوگی۔ بالآخر راستوں پر دوول اڑتی گاڑی نے انہیں

بوڑھے کے گاؤں پہنچا دیا۔ شہر یار چاہتا تھا اس دور دراز گاؤں تک کامنر کرنے کے بجائے براہ راست متعلقہ تھانے پہنچ کر وہاں کے تھانے دار سے باز پرس کر سکتا تھا لیکن اس نے

مناسب یہی سمجھا کہ پہلے خود معاملے کی تحقیق کر لے پھر تمہارے دار کی کلاس لے۔ چنانچہ اب اس کا ڈرائیور مشاہیرم خان بوڑھے کی رہنمائی میں گاڑی کو اس کے گھر کی طرف جانے والے راستے پر دوڑا رہا تھا۔ اپنے کام سے کام رکھتے

والا یہ بلی ڈرائیور بڑا مستعد اور فرض شناس تھا۔ جلدی اس

نے کچے کچے اور اونچے اونچے راستوں پر مہارت سے گاڑی دوڑاتے ہوئے ان لوگوں کو بوڑھے کے گھر تک پہنچا دیا۔ گھر کیا تھا بس دو تین کمروں پر مشتمل ایک کھاسا کھوٹا تھا جس کے سامنے اس وقت بھی چار پانچ افراد کھڑے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

”کہاں چلا گیا تھا دین محمد! تیری بیوی کو خوشی کے دورے پڑ رہے ہیں اور چھوٹا لڑکا غصے میں آئے سے باہر ہوا جا رہا ہے۔ اس کے غصے سے ڈر کر ہم نے ابھی تک کمرے کی

گنڈی کھلی نہیں کھولی۔“ جون ہی بوڑھے نے ان لوگوں کے ساتھ گاڑی سے باہر قدم رکھا، تقریباً اسی کی عمر اور طبعی والا ایک شخص ایک کراس کے قریب آیا اور اسے بتانے لگا۔

”انصاف کی تلاش میں گیا تھا بھرا! یہ نئے اے، سی صاحب ہیں۔ یہ میری عرض سن کر خود یہاں تک مجھے اپنی

گنڈی میں بٹھا کر لائے ہیں۔ اب یہی کچھ کریں گے میرے لیے۔“ بوڑھے نے جسے دین محمد کہتا تھا غائب کیا گیا تھا، خود سے

مخاطب ہونے والے کو بتایا پھر وہ شہر یار اور عبداللہ مان کو اپنے ساتھ گھر کے اندر لے گیا۔ مشاہیرم خان باہر گاڑی میں ہی ان لوگوں کا منتظر رہا۔ بوڑھے کے گھر کے در و دیوار سے دیرانی

فلک رحی تھی۔ اس دیرانی میں دین محمد کی بیوی کے رونے اور داد دیا کرتے سے ڈرا دیر کو ارتعاش پیدا ہوتا اور پھر وہ دوبارہ

خوشی میں چلی جاتی تو ماحول پر خاموشی چھا جاتی۔ گاؤں کی دو چار عورتیں دین محمد کی بیوی کو سنبھالنے کے لیے وہاں موجود

تھیں لیکن ان پر بھی موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ وہ گھر جہاں سے ایک جوان لڑکی کو اغوا کر لیا گیا ہو، اس طرح موت کا منظر ہی پیش کر سکتا تھا۔

شہر یار نے اپنے پیچھے ہی گھر کے اندر آ جانے والے افراد سے واقفے کے بارے میں تفصیلات پوچھنا شروع کر دیں۔ لوگوں سے اسے جو کچھ معلوم ہوا، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ

دین محمد کی اکلوتی بیٹی کی شادی دوسرے گاؤں کے ایک لڑکے سے دو دن بعد ہونے والی تھی۔ شادی کی تیاریاں مکمل تھیں اور لڑکی کو مایوں بٹھایا جا چکا تھا۔ اکلوتی بیٹی ہونے کی وجہ سے

دین محمد نے اپنی استطاعت سے بڑھ کر اس کے لیے جہیز کا انتظام کیا تھا۔ لڑکی کے جہیز کے لیے زیور، کپڑے، برتن اور دوسری ضروری اشیاء تیار تھیں۔ نور محمد نے دوسرے گاؤں سے آنے والی برات کے کسی پانی اور کھانے کے لیے بھی رقم جوڑ رکھی تھی۔ اس کام میں دین محمد کے دونوں نو عمر بیٹوں نے بھی

خوب ہاتھ بٹایا تھا۔ وہ بھی بہن کے جہیز کی تیاری کے لیے دن رات محنت مزدوری کرتے رہے تھے۔ غرض شادی کا انتظام

مکمل تھا اور مگر میں خوشی کے شادیاں بچ رہے تھے۔ لڑکی کی سہیلیاں اور گاؤں کی دوسری عورتیں پر شام دین گھر کے گھر پہنچ کر شادی بیاہ کے گیت گاتیں اور فی مذاق کرتیں۔ ان عورتوں کی بھی دین گھر میں حسب استعداد خوب تواضع کی جاتی۔ کل بھی اس کے گھر پر عورتوں اور لڑکیوں کی یہ محفل جی بھی تھا اور حسب معمول وہ لوگ رات کا اجیرا پھیلنے کے بعد اپنے گھروں کو واپس لوٹ گئی تھیں۔ پھر جانے کیا ہوا کہ آدھی رات کو دین گھر کے گھر سے اس کی اور اس کی بیوی کے چیتنے کی آوازیں آنے لگیں۔ گاؤں والے دوڑ کر وہاں پہنچے تو خوشی کے گھر کا منظر یہ بدلا ہوا تھا۔ دین گھر اپنا سر پیٹ رہا تھا اور اس کی بیوی بچاؤں کھا رہی تھی۔ ایک کمرے کے بند دروازے کے پیچھے سے اس کے بیٹوں کے چیتنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ لوگوں کے پوچھنے پر دین گھر یہ مشکل گاؤں والوں کو بتایا کہ پانچ ڈاکو اگلے کر اس کے گھر میں کھس آئے تھے اور مال و اسباب لوٹنے کے ساتھ اس کی بیوی کو بھی ساتھ لے گئے۔ دونوں لڑکے اس صورت حال پر بہت کرم ہو گئے تھے اور انہوں نے مزاحمت کی کوشش کی تھی۔ جواب میں ڈاکوؤں نے اپنی راتکوں کے بٹ سے ان کی تواضع کی۔ دین گھر ڈاکو کے بیٹوں کا یہ جوش ان سے ان کی زندگی نہ چھین لے۔ اس نے خود اپنے ہاتھوں سے انہیں ایک کمرے میں پھینک کر باہر سے کنڈی لگا دی۔ یہ کنڈی ابھی تک لگی ہوئی تھی اور دین گھر اکیلا ہی خوار ہوتا پھر رہا تھا۔ وہ صبح سویرے نکلتے ہی گھر سے نکل گیا تھا کہ اپنے ساتھ ہونے والے حادثے کی رپورٹ کھسوا کے لیکن تھانے میں اس کی کوئی شنوائی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے بعد دین گھر کسی کے مشورے پر شہر یار کے دفتر جا پہنچا تھا۔ ساری تفصیلات سن کر شہر یار کو شدید افسوس ہوا۔ اس کے سامنے یہ کمرے کی کنڈی کھول کر دین گھر کے بیٹوں کو باہر نکالا گیا۔ ان میں سے ایک لڑکا اٹھارہ سال کا اور دوسرا تقریباً چودہ پندرہ سال کا تھا۔ لڑکوں کے چہرے پر محزون، دکھ اور غصہ صاف دیکھے جاسکتے تھے۔

”سادے بے ایمان اور لالچی لوگ بیٹھے ہیں حکومت کی سیٹوں پر۔ ڈاکوؤں کے لوٹ کے مال میں افسردہ کا بھی حصہ ہوتا ہے ایسے کوئی انہیں کچھ نہیں کہتا۔“ چھوٹے لڑکے نے شہر یار کو دیکھتے ہی چننا اور اٹرا لگا کر شروع کر دیا۔ شہر یار نے غل سے اس کا یہ اٹرا نہ سہارا لڑکا بہت غصہ ناک ہو رہا تھا اور شاید ڈاکوؤں کے ہاتھوں اٹھائی جانے والی سبکی کا بدلہ شہر یار کی اچھی طرح سے عزتی کرنے کے لیے چاہتا تھا۔ لڑکے کے تیر دیکھ کر گاؤں کے دو تین افراد نے اسے سنبھالا اور پھر

واپس اسی کمرے میں بند کر دیا۔

شہر یار نے اس صورت حال پر کوئی بھی رد عمل ظاہر کیے بغیر دین گھر کو ایک بار پھر اپنی گاڑی میں بٹھایا اور مشاہیرم خان کو قصبہ نور کوٹ میں واقع تھانے چلنے کا حکم دیا۔ وہ لوگ تھانے پہنچے تو تھانے کا علمدہ حد مستعد اور فعال نظر آیا۔ یقیناً کسی ذریعے سے انہیں شہر یار کے دین گھر کے ساتھ اس کے گاؤں جانے کی خبر مل چکی تھی، اس لیے انہوں نے اس کے تھانے پہنچنے سے پہلے سارا سیٹ اپ تیار کر لیا تھا۔ تھانے دار نے ان کے تھانے پہنچنے پر بہت ادب اور جوش سے شہر یار کا استقبال کیا۔ اس گھر اس جوش و خروش کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے شہر یار نے اپنے اعزاز کو سردی دکھا اور دین گھر کے کمرے کے مختلف باز پرس شروع کر دی۔

”تو بہ سہی تو بہ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں رپورٹ درج کرنے کے لیے کسی سے دوسرے طلب کروں۔ میں تو رات تھانے تھا ہی نہیں تھی۔ میرے پیٹ میں سخت گڑبڑ بھی اس لیے اسے کوادر میں ہی آرام کر رہا تھا۔ آپ تو جانتے ہوں گے جی کہ یہ پیٹ کی گڑبڑ بندے کو کیسا بڑا حال کر دیتی ہے۔ پر میں آدمی بڑا فرض شناس ہوں۔ بیوی نے بہت دکھ کھانچا جو بی بی پر جاؤ پر رکائیں اور طبیعت ڈرامی سنہیتے ہی تھانے پہنچ گیا۔ بس یہ ہے کہ مجھے پیچھے میں تھوڑی دیر ہوئی۔ اب آپ کہہ رہے ہیں کہ یہ بندہ مجھ پر اٹرا لگا تا ہے کہ میں نے رپورٹ لکھنے کے اس سے دوسرے مانگے تھے تو جناب جب میں صبح سے بلکہ رات سے تھانے میں تھا ہی نہیں تو روپے کیسے مانگتا۔ اس بابائی کو یقیناً کوئی غلطی ہوئی ہے۔“ شہر یار کی بات سن کر تھانے دار نے فوراً اپنے نکلے پینے شروع کر دیے اور باتیں بنانے لگا۔

”ممکن ہے تمہارے کسی مانت نے یہ حرکت کی ہو۔ فی الحال میں اس معاملے کی تحقیق میں پرکڑ وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ تم خود ہی لے کر لو کہ یہ حرکت کس نے کی ہے۔ میں صرف یہ جانتا ہوں کہ مجھے آئندہ ایسی کوئی شکایت نہیں ملنی چاہیے ورنہ اس تھانے کا سارا علمدہ محفل ہو سکتا ہے۔“ شہر یار سمجھ رہا تھا کہ تھانے دار نرزی ڈرامے بازی کر رہا ہے لیکن فی الحال کوئی سخت ایکشن لینے کے بجائے زبانی تنبیہ کرنا ہی کافی سمجھا۔

”میں خیال رکھوں گا سہا! بس آپ یہ بتائیں کہ اس بابے کا مسئلہ کیا ہے؟ ہم اپنی بات لگا کر اس کا مسئلہ حل کریں گے۔ آخر ہم یہاں بیٹھے ہیں عوام کی خدمت کے لیے

ہیں۔“ تھانے دار ضرورت سے کچھ زیادہ ہی فرض شناسی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس کی اس معمولی فرض شناسی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے شہر یار نے دین گھر کو اشارہ کیا۔ اس کے اشارے پر دین گھر اپنے ساتھ بیٹے جادو کی تفصیل تھانے دار کو سنانے لگا۔ تھانے دار نے بڑی ذمے داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے تنبیہ کی اس کی بات سنی اور اپنے ہاتھ سے رپورٹ لکھنے لگا۔

”بڑا افسوس ہوا سہی! اس بابے کے ساتھ ہونے والے ظلم کا سن کر۔ واقعی بڑا اگہرا مدمہ پہنچا ہے اس بے چارے کو۔ جوان بیٹی کا اغوا ہونا تو اس کی موت سے بھی بڑی بات ہے۔ شاید اسی لیے اس بابائی کی مت ماری گئی اور یہ اپنے خواں کھو کر اپنی سیدی شکایت لگنے آپ کے پاس پہنچ گیا۔ مجھے تو پورا یقین ہو چلا ہے کہ یہ بابا میرے تھانے میں آیا ہی نہیں اور بدحواسی میں سیدھا آپ کے پاس جا پہنچا۔ میں بھی حیران ہو رہا تھا کہ میرے محلے میں کون ایسا رشتہ خور نکل آیا جو میری اپنی ختی کے باوجود اس بابائی سے رشتہ باجک بیٹھا۔“ پر اب میں سمجھ گیا ہوں کہ گڑبڑ میرے محلے کی نہیں، بابائی کے دماغ کی ہے۔“

تھانے دار رپورٹ لکھ کر فارغ ہوا تو ایک بار پھر اپنی زبان کے جوہر دکھانے لگا۔ شہر یار دیکھ سکتا تھا کہ دین گھر میں تھانے دار کی مخالفت کرنے کی جرأت نہیں۔ شاید یہ تھانے دار کی ان نظروں کا اثر تھا جو دین گھر کی طرف اٹھی تھیں تو ان میں تہرہ ہوتا تھا۔

”شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں۔ بہر حال، اصل مسئلہ اس شخص کی دماغی حالت کا نہیں بلکہ اس کے ساتھ ہونے والے ظلم کی تحقیق کرنے کا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس رپورٹ کو صرف تھانے کے ریکارڈ کے طور پر جا کر نہیں رہیں گے بلکہ اس پر آپ کو ایکشن بھی لینا ہوگا۔ آپ فوری طور پر ایکشن لیں اور مریوہ کے بارے میں معلومات حاصل کر کے اسے بازیافت کروانے کے سلسلے میں پیش رفت کریں۔ چار دن کے اندر اندر اس کیس کی رپورٹ میرے سامنے نہیں ہونی چاہیے۔“ تھانے دار کے بیان پر کوئی اہمیت دیے بغیر شہر یار نے اسے سمجھا دیا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہونے لگا۔

”بلکہ سہا! یہ چاہئے تو پہنچے جائیں۔ جلدی میں ہم سے فی الحال یہی انتظام ہو سکا۔ کسی روز آپ اطلاع دے کر آئیں تو ہم آپ کی اچھی طرح خاطر تواضع کریں گے۔“ شہر یار کو کھڑے ہوتے دیکھ کر تھانے دار نے میز پر بے چارے کے برتنوں اور دیگر لوازمات کی طرف اشارہ کرتے

ہوئے خوشامد بھرے لہجے میں درخواست کی۔ چائے اور اس کے ساتھ موجود یہ لوازمات ابھی ابھی دوپاسی میں کمریز پر سجا کر رکھے تھے۔

”تو چائیں۔ میں بے وقت کھانے بیٹے سے گریز کرتا ہوں۔ آپ بھی احتیاط کیا کریں۔ پولیس کی نوکری کرنے والے شخص کو چاق و پونچھ اور اساتھ ہونا چاہیے۔ ورنہ پولیس والا اپنی ٹونڈ پر چنٹ ہی سنبھال رہا جاتا ہے اور بھرم بھاگ جاتے ہیں۔“ شہر یار نے تھانے دار کی دعوت قبول کرنے سے قطعی انکار کرتے ہوئے اس کی پھلتی ہوئی توند کی طرف اشارہ کر کے طعنیہ کیا۔ تھانے دار خود پر کی جانے والی اس چوٹ پر جھینپ گیا اور پھر شاید اسی لیے دوبارہ شہر یار سے چائے پینے پر اصرار نہیں کیا۔ تھانے سے نکل کر شہر یار نے مشاہیرم خان کو ہدایت کی کہ پہلے دین گھر کو اس کے گاؤں کے قریب اتار دیا جائے پھر واپس چلا جائے۔ مشاہیرم خان نے اس ہدایت پر عمل کیا۔

”دین گھر! میں نے تمہارے گاؤں میں ایک چھوٹا سا مدرسہ دیکھا تھا۔ وہ مدرسہ کس نے بنوایا ہے وہاں؟“ گاڑی روانہ ہوئی تو شہر یار کو دین گھر کے گاؤں میں دیکھی گئی اس عمارت کا خیال آیا جو تقریباً سو گز کے رتبے پر تعمیر کی گئی تھی۔ عمارت چھوٹی تھی لیکن بسا امدہ سے گاؤں کے کچے گھروں کے مقابلے میں اس کی تعمیر کافی اچھی تھی۔ شہر یار نے اس عمارت کے گیت پر کسی مدرسے کا پورڈ آجڑاں دیکھا تھا لیکن اس وقت دین گھر سے اس بارے میں استفسار کرنے کا موقع نہیں تھا اس لیے تجسس کے باوجود چپ رہا تھا۔ اب اسے دوبارہ اس مدرسے کا خیال آیا تو دین گھر سے اس کے بارے میں پوچھنے لگا۔

”وہ مدرسہ شاہ نواز صاحب نے بنوایا ہے صاحب! شاہ نواز صاحب بڑا ٹیک آؤی ہے۔ اس کے آنے سے ہمارے گاؤں کی قسمت جاگ گئی ہے۔ پہلے پنے ادھر ادھر آوارہ پھرنے میں اپنا وقت برباد کرتے تھے اب مدرسے جا کر دین کی باتیں سمجھتے ہیں۔ شاہ نواز صاحب انہیں اپنے بچے سے ایک وقت کی روٹی بھی کھاتے ہیں۔ بڑے ہی دل والے ہیں شاہ نواز صاحب۔“ شہر یار کے سوال کرتے ہی دین گھر نے کسی شاہ نواز کی تعریفوں کے بدلے بانٹے شروع کر دیے۔ ”یہ شاہ نواز صاحب اصل میں ہیں کون دین گھر۔ اور یہ آئے کہاں سے ہیں؟“ دین گھر کے جواب نے شہر یار کے استغیاق کو بھڑکایا کہ وہ شاہ نواز کے بارے میں معلومات حاصل کرے۔

”سب تو نہیں معلوم صاحب پر اتنا معلوم ہے کہ شاہ نواز صاحب بڑے اچھے آدمی ہیں۔“ دین محمد کے لہجے میں عقیدت تھی۔ شہریار نے اندازہ لگایا کہ شاہ نواز بھی کوئی ماسٹر آف آرمز کی ٹیکر کی کا آدمی ہے جو آرام اور آسائش کی زندگی چھوڑ کر گاؤں کے ان پڑے ہوئے لوگوں کی بھلائی کے خیال سے ان کے درمیان آ رہا ہے۔ دوسروں کے لیے اپنی ذات کا آرام بخ دینے والے ایسے لوگ شہریار کو بہت اچھے لگتے تھے۔ شہریار کی خواہش تھی کہ شاہ نواز سے ملاقات کرے اور اس کے مدرسے کو دیکھے لیکن آج وہ پہلے ہی ملے شدہ شہیدوں سے بہت ہٹ کر مصروف رہا تھا اور اب اس کے پاس ملتی وقت نہیں تھا کہ شاہ نواز سے ملاقات کے لیے جا سکے۔ آج اسے چودھری افتخار کے دادا کے عرس میں شرکت کے لیے ہیرا باجی پہنچنا تھا۔ وہ اگر شاہ نواز سے ملاقات کی کوشش کرتا تو چودھری افتخار کے گاؤں پہنچنے میں بہت تاخیر ہو جاتی۔ جا چار یا پانچ گھنٹے کو دبا کر بیٹھار ہا اور مشاہیر خان نے دین محمد کو اس کے گاؤں کی حدود کے قریب اتارنے کے بعد گاڑی موڑ لی۔

☆☆☆☆

شہریار وقت مقررہ پر ہیرا باجی پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ یہ گاؤں بھی اپنے راستوں اور مکانات کی حالت کے اعتبار سے کافی پسماندہ دکھائی دیتا تھا البتہ رتبے کے اعتبار سے یہ اس ضلع کا سب سے بڑا گاؤں تھا۔ گاؤں کی پیشتر زمین چودھری افتخار اور اس کے خاندان کے افراد کی ملکیت تھی۔ گاؤں کے نام کے بارے میں اسے یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ پہلے اس گاؤں کا نام کچھ اور تھا لیکن چودھری افتخار کے دادا ہیرا باد عالم شاہ کی وفات کے بعد پرانا نام بدل کر گاؤں کا نام ہیرا باد رکھ دیا گیا۔ اسی ہیرا باد میں آج چودھری مراد عالم شاہ کا عرس منایا جا رہا تھا۔ درگاہ کا احاطہ عقیدت مندوں سے بھرا ہوا تھا۔ شہریار کی گاڑی گھٹ پر جا کر رکی تو اس کے گاڑی سے اترنے سے پہلے ہی مٹی اللہ رکھا استقبال کے لیے دوڑا آیا۔ اس نے شہریار کے ذرا دیر مشاہیر خان کو متوجہ دے بغیر خود گاڑی کا دروازہ کھولا اور پھر لوگوں کے جھوم سے ہٹ کر ایک صاف ستھرے اور کشادہ راستے سے شہریار کو اس مقام تک لے گیا جہاں چودھری افتخار کے مدعو کیے گئے خاص خاص مہمانان گرامی تشریف فرما تھے۔ یہ جگہ دراصل ایک طویل دھڑلیض، بلند چوڑا تھا جس پر ایک طرف کرسیاں لگا کر مہمانوں کے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا جبکہ دوسری طرف سفید براق چاندنیوں پر قوالوں کی ٹولی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس

ٹولی کے ہر فرد نے سفید مل کے کڑیوں پر آڑھے ہاتھ پکڑ رکھے تھے اور ان کے سروں پر بڑے بڑے ٹکڑے لٹائی ہوئی تھیں۔ یہ قوال چودھری افتخار عالم کے دادا کی شان میں نامی مہنگے گارے تھے۔ منقبت کے اشعار میں کہیں کہیں ہر صاحب کے علاوہ ان کی آل اولاد کی بھی تشریف و توصیف آ جاتی تھی۔ شہریار نے غور سے منقبت کے الفاظ سنے۔ ان الفاظ کو سن کر لگتا تھا کہ ہر مراد عالم شاہ سے بڑھ کر نیک و صالح ہستی روئے زمین پر کوئی اور نہ گزری ہو۔ یقیناً قریلوں کے بے ہل بندھوانے کے لیے پیشہ ور شعرا کو بھاری قیمت ادا کی گئی تھی۔

چوہڑے پر سب سے نمایاں جگہ پر ایک بلند اور سنہری کرسی رکھی گئی تھی۔ فی الحال یہ کرسی خالی تھی۔ شہریار کی نظر ان مناظر سے جھٹکتی ہوئی چوہڑے کے دائیں طرف موجود اسٹال پر پڑی۔ یہ اسٹال عزم میں جا رہا لگائی جانے والی بیٹیوں سے مشابہ تھا۔ اسٹال کو رنگ برنگے کاغذی پھولوں سے بڑی خوب صورتی کے ساتھ سجایا گیا تھا اور میزوں پر سرخ پٹڑا بچھا کر مٹی کے بڑے بڑے شکرار گئے تھے۔ ان ٹکڑوں پر گلاب اور موسی کے پھولوں کی لڑیاں لٹائی ہوئی تھیں۔ ساتھ ہی مٹی کے چھوٹے چھوٹے گڑے بھی رکھے تھے۔ عقیدت مندوں کی بڑی تعداد اور رخ اس اسٹال کی طرف تھا۔ اسٹال پر موجود کارندے مٹی کے گڑوں میں منگوں سے پانی بھر کر عقیدت مندوں میں تقسیم کر رہے تھے جسے بڑی عقیدت کے ساتھ چار یا چار ہاتھ اسٹال پر منگوں کے ساتھ ہی ایک صندوقچی بھی رکھی تھی۔ اکثر عقیدت مند پانی پینے سے پہلے اس صندوقچی میں ہاتھ نہ کچھ ڈال رہے تھے بلکہ شہریار نے تو یہ بھی محسوس کیا کہ مٹی کے گڑوں میں تقسیم ہونے والے پانی سے وہی لوگ پیشاب ہو رہے ہیں جو صندوقچی میں کچھ ڈالتے ہیں۔ اس عقدے کو کھل کرنے کے لیے اس نے اپنے ساتھ بیٹھے ایس بی کو ٹولا۔

”بڑے ہر صاحب چودھری مراد عالم شاہ کی قبر کو کل عرق گلاب اور گیواڑا ملے پانی سے غسل دیا گیا تھا۔ یہ اس غسل کا ہی پانی ہے جسے لوگ تھک کے طور پر پیتے ہیں۔“ ایس بی نے جو کچھ کہی سالوں سے اس قریب میں شرکت کرتا رہا تھا شہریار کی معلومات میں اضافہ کیا اور پھر آواز کو مزید دہرایا کہ یہ بتانے لگا۔ ”تھوڑی دیر بعد ہر صاحب کی قبر پر وہ خصوصی چادر چڑھائی جائے گی جو ارد گرد کے زمیندار مل کر ہر سال تیار کرواتے ہیں۔ اس چادر کی تیار کی بہت جلدی پڑا استعمال ہوتا ہے۔ چادر پر کلمی عبارت اور نقوش کے

لے سوئے چاندی کے تاروں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ قبر کو غسل دینے سے پہلے پرانی چادر اور تار محفوظ کر لی جاتی ہے اور عرس والے دن ان کی چادر چڑھائی جاتی ہے۔“ شہریار ایس بی کی فراہم کردہ ان معلومات کو سن کر اندازہ لگا سکتا تھا کہ پرانی چادر جس پر سوئے چاندی کے تاروں سے کام ہوتا تھا سرخ اور گہرا لال رنگوں میں محفوظ ہوئی ہوگی۔ وہ چودھری افتخار اور اس کے باپ دادا کو ان کی جلائی پر دراد دے بغیر نہیں رہ سکا۔ لوگوں کو کلمی عقیدت سے مستعمل بنیادوں پر قائمہ حاصل کرنے کے لیے انہوں نے بڑی عیاری سے، بہت شان دار سیٹ اپ تیار کر رکھا تھا۔ اگلی شہریار چودھریوں کی اس چالاکی پر غور کر رہا تھا کہ کفنا پر مشائے مٹی کی تکلیف طاری ہوگی۔ دھڑا دھڑے ترجمی سے گھومتے لوگ صندوق کو بکڑے ہوئے۔ پھر شہریار نے وہ بھی ہوئی ڈولی دیکھی جسے انی افراد نے اٹھا رکھا تھا۔ ڈولی چوہڑے پر مٹی بلند سنہری کرسی کے مقابل لاکر رکھی گئی اور پھر اس میں سے چودھری افتخار عالم شاہ برآمد ہوا۔ آج تو چودھری کی صاحب بی بی نے بھی اس نے ایک بزرگ کا مٹی کا ہاتھ رکھا تھا۔ اس کا بی بی انی زیادہ مٹی کے وہ پیچھے سے فرش کو چھو رہا تھا۔ عبا پر کیا مہنسری کام بھی یقیناً سونے کے تاروں سے ہی کیا گیا تھا۔ چودھری کے سر پر بھی دستار بھی ہیز اور سنہری رنگ کے استراج سے تیار کی گئی تھی۔ چودھری کے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں پھر بڑی قیمتی انگلیاں تھیں۔ انہی انگلیوں کے درمیان اس نے ایک قیمتی ہوئی مٹی کی سیلچ پھنسا رکھی تھی۔ چودھری ڈولی سے اتر گیا تو ڈولی لے کر آنے والے اسے اٹھا کر واپس لے گئے۔ چودھری افتخار نے تھکے تھکے قدموں سے چل کر مٹی تک پہنچا اور پورے کمرے سے اس پر اجماع ہو گیا۔ پھر اس نے دائیں جانب کی نشستوں پر بیٹھے خاص مہمانوں کی طرف منگوا کر دیکھا اور سر کو ہلکا سا خم دینے کے بعد عقیدت مندوں کے اس جھوم کی طرف متوجہ ہو گیا جو چوہڑے کے نیچے سروں کے ایک ڈھیر کی صورت میں بالکل اس طرح نظر آ رہا تھا جیسے کھیت میں موجود کسی کھڑی فصل کے پھول نظر آتے ہیں۔ چوہڑے سے نیچے جانے والی سیزھیوں پر چودھری کے کارندے کھڑے تھے جنہوں نے عقیدت اور دھڑلے سے بے حال ہوتے ہوئے زائرین کو قابو میں رکھا ہوا تھا۔ چودھری نے اپنے کارندوں کی طرف دیکھتے ہوئے سر کو ہلکی سی جھنجھکی دی۔ کارندوں نے زائرین میں سے لاکھ لاکھ سیزھیاں چڑھ کر چوہڑے پر آنے کی اجازت دینی شروع کر دی۔ اوپر آنے والا ہزار ہا زائر دونوں

ہاتھ باندھ کر، اب سے اس کرسی کے قریب پہنچتا جس پر چودھری افتخار عالم شاہ رونق افروز تھا۔ قریب پہنچنے کے بعد وہ دوزانو بیٹھتا اور چودھری کے بیچ والے ہاتھ کی پشت پر ایک عقیدت بھرا بوسہ دے کر اپنے قدموں جچا جچا کرتے چڑے کے ساتھ چوہڑے سے اتر جاتا۔ یہ فوجی کردہ ان گئے بیٹے چند ایک لوگوں میں سے ہے جسے چودھری افتخار عالم شاہ کے ہاتھ کا بوسہ لینے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ اس کی آنکھوں سے پھونکی پڑتی تھی۔

شہریار خاموشی سے یہ قماش دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھے اور لوگ بھی مٹی کا مکر رہے تھے۔ عقیدت مندوں کو اس سعادت سے کچھ دیر نوازنے کے بعد چودھری افتخار نے ہاتھ کے اشارے سے کارندوں کو بڑے افراد کو اور پیچھے سے روک دیا۔ اب ہر صاحب کی قبر پر پہنچ کر چادر چڑھانے کا مرحلہ درجش تھا۔ چودھری افتخار نے اپنے تمام خصوصی مہمانوں کے جلوں میں درگاہ کے اس حصے کا رخ کیا جہاں اس کے دادا حضور کی قبر تھی۔ قبر پر پہنچنے کے بعد زمینداروں کے باہمی تعاون سے تیار کی گئی بڑے شیش چادر ایک بڑے سے تھال میں رکھ کر چودھری افتخار کی خدمت میں پیش کی گئی۔ چودھری نے یہ چادر بڑی عقیدت مندی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے دادا کی قبر پر چڑھا دی۔ اس موقع پر کئی اشراف نے چودھری کی معافیت کی، خصوصاً ایس بی اس کام میں پیش پیش رہا۔ خود شہریار نے اس موقع پر ذرا پیچھے رہنا مناسب سمجھا تھا۔ چادر چڑھانے کی رسم ادا ہو گئی کے بعد چودھری افتخار تمام خصوصی مہمانوں کو بے صدا سراہے ساتھ لے کر واپس روانہ ہو گیا۔

درگاہ سے رو آگئے وقت شہریار نے لنگری تقسیم کا تقارہ کیا۔ بلندی پر کھڑے چودھری افتخار کے کارندے ہلاؤ اور زور سے کی چھوٹی چھوٹی تھیلیاں جھوم کی طرف اچھال رہے تھے۔ جھوم میں شامل افراد ان تھیلیوں کے حصول کے لیے ایک دوسرے پر چڑھتے، دوڑتے لگے اور شر مچاتے ایک دوسرے سے برسر پیکار تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ اس خصوصی لنگر کا حصول صرف انہی لوگوں کے لیے نہیں ہو سکتا گا جو زیادہ طاقتور، چست اور جیڑ طرار تھے۔ بوڑھے، کمزور اور ناتوان لوگوں کا محروم ہونا جاننا بالکل یقینی تھا۔

شہریار نے اپنے دل میں سخت تاسف محسوس کیا۔ کیا تھا جو چودھری کے بے شمار کارندے فرار اسلم و نسق قائم کرتے ہوئے لوگوں کو کھانا میں کھڑا کر کے لنگری تقسیم کر دیتے۔ کم از کم انسان چند تقوں کے حصول کے لیے یوں جانوروں کی

طرح ایک دوسرے سے لڑتے جھڑپے انسانیت کی تحلیل کرتے ہوئے تو نظر نہ آتے۔ لیکن شاید چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے لوگوں کو آپس میں لڑائے رکھنے میں ہی تو حکمرانی کو مستحکم رکھنے کا راز پوشیدہ تھا۔

☆☆☆

مہمانوں کی درگاہ سے حویلی کی طرف روانگی سے قبل ہی چودھری کے ہرکارے ان کی آمد کی اطلاع لے کر حویلی پہنچ گئے۔ اس اطلاع کے حویلی پہنچنے ہی حویلی میں ہر طرف متحرک خار ماؤں کی سرگرمیاں پھول رہی تھیں۔ حویلی میں اس وقت رشتے دار خواتین کے علاوہ ارد گرد کے زمینداروں کے گھروں کی عورتیں اور کئی افسران و تاجران کی بیویاں بھی موجود تھیں۔ اعلیٰ افسران اور تاجروں کی بیویوں کو دیگر خواتین پر ترجیح دی جا رہی تھی۔ بڑی اور چھوٹی چودھرائیں خاص طور پر خود ان خواتین کی خاطر مدارات کا دھیان رکھ رہی تھیں۔ کھانا تو مہمانوں کو کھلا دیا جاتا تھا لیکن اس سے پہلے بھی لذت کا دم دہن کے لیے بڑا معقول انتظام تھا۔ موسم کی مناسبت سے چائے، کافی، ٹیکری چائے ہر شے دستیاب تھی۔ شہری خواتین کے ذوق کا خیال کرتے ہوئے کولڈ ڈرنکس اور جوسز وغیرہ کا بھی انتظام کیا گیا تھا لیکن مہمانوں کی اکثریت گرم شراب کو ہی ترجیح دے رہی تھی۔ مشروبات کے ساتھ ساتھ شکم سے بھی مہمانوں کی توجہ کے لیے گردش میں تھے۔ غرض حویلی میں کچھ جنت کا سا سماں تھا۔ ہر شخص کو اس کی حسب خواہش لوازمات میسر تھے اور مستند ملازماؤں کی دست بستہ حاضری کی وجہ سے ہر ایک خود کو کسی ریاست کا والی تصور کر سکتا تھا۔ البتہ کچھ کچھ چودھری افتخار کے خاندان سے تعلق رکھنے والی خواتین سرکشی میں اعلیٰ افسران اور تاجروں کی بیویوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے ترجیحی سلوک کے بارے میں آپس میں چڑھچڑھائیاں کر رہی تھیں۔ حویلی کی خواتین ان چڑھچڑھائیوں سے ناواقف نہیں تھیں۔ انہوں نے ملازماؤں کو کڑی ہدایت کر رکھی تھی کہ کسی بھی عورت کی خاطر توجہ میں کوئی کی نہیں دینی چاہیے لیکن بہر حال ان کی ذاتی توجہ کا مرکز وہ باہشت خواتین ہی تھیں جن کے شوہروں کے عہدوں اور حیثیت کے ساتھ چودھری افتخار کے مفادات جڑے ہوئے تھے۔ حویلی کی یہ خواتین ان پڑھ ہونے کے باوجود فصاحت و فصاحت کا حساب کتاب رکھنا خوب جانتی تھیں۔

درگاہ سے آنے والے ہرکاروں نے جو مہمانوں کی درگاہ سے روانگی کی اطلاع حویلی پہنچائی، مردانے میں فوراً

دست خوان کچھا شروع ہو گئے۔

مہمانوں کے دست خوان کے گرد بیٹھے ہی ملازمین سلجھیاں لاکر ان کے ہاتھ دھوا گئے۔ ذرا سی دیر میں گرم گرم، اشتها انگیز کھانا دست خوان پر بچھ دیا گیا۔ کھانا معیار اور مقدار دونوں ہی اعتبار سے بہت خوب تھا۔ مہمانوں کا دل خوش ہو گیا۔ اندر تان خانے میں خواتین بھی اس خوش رنگ و خوش ذائقہ کھانے سے خوب انصاف کر رہی تھیں۔ ملازماں میں ایک ڈش کا کھانا ختم ہونے سے قبل ہی تیزی سے دوسری ڈش لا رکھی تھیں۔ حویلی کی مالکان یہ اسرار مہمان خواتین کو کھانا کھلا رہی تھیں۔ خواتین کے اس جہم میں چھوٹی چودھرائیں ناہید نے دیکھا کہ ایس بی کی بیوی کھانا کھانے والیوں میں شامل نہیں۔ وہ دست خوان سے ہٹ کر سب سے الگ تھک بیٹھی تھی۔ چھوٹی چودھرائیں لپک کر اس کے پاس پہنچی اور پوچھا۔

”کیا بات ہے بہن بی! اتنی کھانا کیوں نہیں کھا رہی ہو؟“

”میں شوگر پیسٹ ہوں۔ کھانے سے پہلے مجھے انسولین استعمال کرنی پڑتی ہے۔ آج اتفاق سے میری دوا ایس بی صاحب کے بریف کیس میں رہ گئی ہے۔ انسولین لگائے بغیر میرے لیے کھانا کھانا نہیں اسی لیے سب کے ساتھ کھانے میں شامل نہیں ہوئی۔“ ایس بی کی بیوی نے اپنا مسئلہ بتایا۔

”یہ تو کوئی گل ہی نہیں ہے بی۔ میں ابھی تھادی دوا منگوا دیتی ہوں۔“ چودھرائیں ناہید نے جواب دیا اور پھر جھٹ قریب سے گزرتی دباؤ کو آواز لگائی۔

”جی چھوٹی چودھرائیں! ماہ باجو صبح سے کام کرتے کرتے مائل ہو چکی ہیں، دونوں خواتین کے قریب آئی۔

”مردانے میں ایس بی صاحب کو پیغام بھجوا کر بی بی کا دیکھا اندر بھجوا دیں۔“ چھوٹی چودھرائیں نے حکم دیا تو ماہ باجو تھک میں موجود مکانی سے بھرا اقبال دست خوان پر رکھنے کے لیے مڑی تاکہ اسے رکھ کر مردانے کا رخ کر سکے۔

”بھینٹیں کر۔“ ہاتھ جڑوں میں جان نہیں ہے کیا تیرے! چودھرائیں سے اپنے حکم کی تعمیل میں آنے والا یہ معمولی وہی برداشت نہیں ہوا اور اس نے ماہ باجو کو پھانکارا۔ ماہ باجو بنا کوئی رد عمل ظاہر کیے خاموشی سے کمرے کے بیرونی راستے کی طرف بڑھ گئی۔

”سارے بد حرام نوکر بھرے ہیں یہاں۔ کام کے نہ کاج کے دن اتناج کے۔“ دروازے سے قدم باہر رکھتے سے پہلے چھوٹی چودھرائیں کی آواز ماہ باجو کے کان میں پڑی۔

وہ خود پر بے حسی غاری کر کے مردانے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ کمرہاں اس وقت مرد حضرات بیٹھے کھانا تناول فرما رہے تھے، اس کا دروازہ نیم وا تھا۔ ماہ باجو نے دروازے کی اوٹ سے جھانک کر دیکھا۔ کوئی بھی مرد ملازم اس وقت دروازے کے قریب موجود نہیں تھا۔ ماہ باجو کچھ پریشان ہی ہو گئی۔ اگر کسی کے دروازے کے قریب آنے کا انتظار کرنی تو جانے کتنا وقت لگ جاتا اور جواب میں چھوٹی چودھرائیں اس کی بیجوری کچھ بغیر اس پر تاخیر کا اصرار دھر کر بائیں سانے لگتی۔ اس صورت حال سے بچنے کے لیے ماہ باجو ناچار دروازے سے گزر کر دو قدم کمرے کے اندر چلی گئی۔ اس بار مٹی اندر کھانے سے اسے دیکھ لیا۔ فوراً ہی اس نے ایک ملازم کو اشارہ کیا۔

ملازم لپک کر ماہ باجو کے قریب آیا اور اس سے مردانے میں آمد کی وجہ پوچھی۔ ماہ باجو نے ایس بی صاحب کو بھجوا دیا گیا پیغام اسے دیا اور خود تیزی سے مڑ کر کمرے سے باہر نکل کر ایک بار پھر دروازے کی اوٹ میں ٹھہری ہو گئی۔ وہ پردہ دار لڑکی نہیں تھی لیکن یوں بھی اس نے ڈھیر سارے مردوں کے سامنے جانے کا اٹھان نہیں بھی ہوا تھا اس لیے اچھی خاصی گھبرا گئی تھی۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ جب وہ کمرے کے اندر کمزوری محسوس ہو گئی تو کچھ ہوں نے اس کا جائزہ لیا تھا۔ کچھ لگا ہوں میں بے باقی ہو گئی تو کچھ میں بے نیازی... البتہ ایک لگاؤ ایسی بھی تھی جو بے ظاہر بے نیازی سے لپٹ گئی تھی لیکن حقیقتاً وہ ہوس سے بھری ہوئی تھی۔ ماہ باجو نے اس لگاؤ کو نہیں دیکھا تھا لیکن لگاؤ والے والے نے اسی وقت بہت کچھ طے کر لیا تھا۔ غافل ماہ باجو ایس بی صاحب سے انگلیشن لا کر دینے والے ملازم سے انگلیشن لے کر واپس زنان خانے میں چلی آئی اور ایس بی کی بیوی کو انگلیشن تھا کر خود دوبارہ کام کرنے والیوں کے ساتھ شامل ہو گئی۔ مہمانوں کی تعداد کافی تھی اور کھانا بھی بچھا لیا لہذا یہ تھا کہ دست خوان سنتے سنتے اچھا خاصا وقت لگ گیا۔

جب مہمان حویلی سے رخصت ہونا شروع ہوئے تو اس وقت تک ملازماؤں کے جسم ٹھکن سے ٹوٹنے لگے تھے اور ابھی کام سے غلامی ہوئی نظر نہیں آرہی تھی۔ کچھ قریبی رشتے دار اور دروازہ شہروں سے آئے ہوئے مہمان ایسے بھی تھے جو آج رات حویلی میں ہی قیام کرنے والے تھے۔ ان مہمانوں کا قیام پہلے سے ہی متوقع تھا اس لیے سارے انتظامات پہلے سے کیے جا چکے تھے۔ مہمانوں کو ان کے کمروں میں پہنچانے کے بعد کچھ کچھ ملازماؤں کو معقول ٹیپ کا کھٹکھٹوں سے اپنے ہاتھوں میں گردش کرتے ہوئے کھانے میں سے چند تھے

اپنے حلق سے نیچے اتار سکیں۔ وہ کھانا جو گرم بھجوا گیا اڑانا اتنی دیر تک ان کی بھوک کو چکا تا رہا تھا اب ٹھنڈا ہو کر بالکل مٹی ہو چکا تھا۔ لیکن کسی میں حوصلہ نہیں تھا کہ اسے لیے کھانا گرم کر کے کھانے کا تر دو کر سکے۔ چھپکنے کی روز کی مصروفیت اور آج پورے دن ایک ٹانگ پر کھڑے رہنے والی کیفیت نے انہیں حائل کر دیا تھا اور اب ہر ایک میں جانتا تھا کہ سونے کے لیے گرم بستر میسر آجائے تو گئے ہوئے جسم کو کچھ سکون ملے۔ کھانے کے بعد ان ملازماؤں کے سوا جن کا دن رات حویلی میں ہی قیام رہتا تھا، باقی گھر میں اپنے گھروں کو روانہ ہونے کے لیے بڑی چودھرائیں سے اجازت لینے اس کے سامنے حاضر ہوئیں۔

”راہی، ماہ باجو، شادو اور کسیری کو چھوڑ کر باقی سب چلی جاؤ۔ حویلی میں مہمان رکے ہوئے ہیں، کام زیادہ ہے اس لیے آج ان لڑکیوں کو کمینوں پر رکنا ہوگا۔“ چودھرائیں نے حکم سنایا تو جن کے نام لے گئے تھے انہیں و جہز رکنا پڑا۔ ماہ باجو جس نے زحمت میں اپنی بارگاہی مشقت اٹھائی تھی شلوہ کھان لہجوں سے نورائیں کو دیکھنے لگی۔ نورائیں خوب بے بسی، کیا کرتی۔ بیٹی سے نظر چما کر باہر نکل گئی۔ بڑی چودھرائیں نے روکی گئی لڑکیوں کے ذمے مختلف کام لگا دیے۔ ماہ باجو کے ذمے اس نے باورچی خانے میں ماسی نذیراں کی مدد کا کام لگایا تھا۔ ماہ باجو قدم بٹھکتی ہوئی ماسی نذیراں کے پاس باورچی خانے میں جا پہنچی۔ وہاں دو تین عورتیں اور بھی موجود تھیں۔

”ماسی! مجھے کیا کام کرنا ہے بتا دو۔“ مجھے کچھ انداز میں اس نے ماسی نذیراں سے پوچھا۔ ماسی نذیراں کی اچھی سہیلیوں میں سے تھی اور اسے معلوم تھا کہ ماہ باجو اس مشقت بھری زندگی کی عادی نہیں۔ اب جو اس نے ماہ باجو کی اتر حالت دیکھی تو اسے ماہ باجو پر رحم آ گیا۔ وہ ہمدردی سے بولی۔

”تو بس ایک کام کر دے۔ یہ دودھ کے گلاس سب کے کمروں میں پہنچا دے۔ اس کے بعد تیری ذمہ داری ختم۔ تو آرام سے لیٹیں بھی دیکھ کر سو جانا۔ میں ان عورتوں کے ساتھ مل کر باقی سارا کام آپ ہی سنبھال لوں گی۔“

ماہ باجو ماسی کی چاہت پر دودھ سے بھرے گلاس ٹرے میں رکھ کر سب کے کمروں میں پہنچانے لگی۔ ویسے اسے کچھ نہیں آ رہا تھا کہ تاک تک خوش کرکھانے والے یہ لوگ اب اس گلاس بھر دودھ کے لیے تنہا کس کہاں سے لگائیں گے؟ وہ سب کے کمروں میں دودھ پہنچا چکی تو ماسی نے ایک خصوصی گلاس چودھری افتخار کے کمرے میں پہنچانے کے لیے دیا۔ اور مٹی کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ کر ماہ باجو گلاس

”م... مجھے جانا ہے۔“ ماہ بانو نے خوف زدہ سے انداز میں ایک بار پھر اٹھنے کی کوشش کی۔

”بھلی جانا۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے؟“ چودھری نے ایک بار پھر اس کی کوشش کو ناکام بنادیا۔

”معاف کر دیں چودھری صاحب! میں غلطی سے ادھر سوئی تھی۔ آپ مجھے جانے دیں۔“ خوف ماہ بانو کے پورے جسم میں سرایت کر چکا تھا۔ دوا لٹی ساری تھوڑی سی بھول کر چودھری کے سامنے لجا بخت سے گڑ گڑانے لگی۔

”تیری غلطی تو ہماری خوش نصیبی ہے۔ آج ہی تو ہم نے خواہش کی تھی تیری۔ ابھی تو سوچ ہی رہے تھے کہ کیسے تیرے حصول کو ممکن بنائیں، پر تیری غلطی نے ہمارا کام آسان کر دیا۔ ہمیں تو معلوم ہی نہیں تھا کہ ہم وہاں اپنے مہمانوں کے ساتھ بیٹھے شراب سے دل بہلا رہے ہیں اور یہاں تجھ جیسی غلطی شے ہمارے بستر پر پڑی ہے۔ ہمیں تو کمرے میں داخل ہونے کے بعد تجھے اپنے بستر پر دیکھ کر یقین ہی نہیں آیا۔ ہم تجھے کہ شراب کا نشہ دراز یا دہی چڑھ گیا ہے لیکن چھوڑ دیکھا تو فوج بچ یہاں تھی۔ اب تاہم ہاتھ آئے اس انعام کو کیسے جانے دیں۔“ چودھری نے چٹخارے لیتے ہوئے ماہ بانو کو اپنی خوش نصیبی کی داستان سنائی۔

”مجھے یہاں سے جانا ہے۔ میں تمہیں تمہارے نایاب ارادوں میں کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔“ ماہ بانو جواب تک بے حد خوف زدہ تھی، اچانک بھڑک اٹھی اور دونوں ہاتھوں سے دھکادے کر چودھری کو دودھ چیلنے کی کوشش کی مگر اس جیسی نازک لڑکی کی یہ کوشش چودھری کے طاقتور وجود کے سامنے کیا حیثیت رکھتی تھی۔ وہ یک دم ہی ماہ بانو پر چھا گیا۔ اس کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش میں ماہ بانو کا جسم بھڑک کر رہ گیا۔ آخری کوشش کے طور پر اس نے زور سے چلانے کے لیے منہ کھولا لیکن چودھری پوری طرح چوکنا تھا، وہ ہاتھ آئے اس شکار کو آزاد کرنے کے لیے غلطی تیار نہیں تھا۔ چپنے کے لیے کھلے ماہ بانو کے منہ پر اپنا بڑا سا ہاتھ رکھ کر اس نے ماہ بانو کی چیخوں کا گلا گھونٹ دیا۔ اس کمرے میں اس سے قس بھی جانے لگی لڑکیوں کی چیخوں کا دم گھونٹا گیا تھا۔ ماہ بانو کا آزادی کی کوشش میں پھر کتنا جسم اپنے انجام کے خوف سے سرد پڑتا جا رہا تھا اور حلق سے آزاد ہو سکتے والی چیخوں نے اپنی ہوتی آنکھوں میں ڈیرا ڈال لیا تھا۔ لیکن چودھری افکار ہر بات سے بے پروا فقط اپنی ہوس کا پیٹ بھرنے میں دلچسپی رکھتا تھا۔ یہ ہوس ماہ بانو کو برباد کیے بغیر نہیں مٹ سکتی تھی۔

جاری ہے

طشتری میں رکھ کر چودھری افکار کے کمرے کے سامنے پہنچی اور دروازے پر دستک دی۔ دستک کے جواب میں اندر سے کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا۔ ماہ بانو نے ایک بار پھر دستک دی لیکن اب بھی اندر خاموشی ہی رہی۔ ماہ بانو نے بائیں ہاتھ سے کمرے کے دروازے کو چپکے سے دھکیلا۔ دروازہ بے آواز کھل گیا۔ سامنے کمرہ خالی پڑا تھا اور وہاں چودھری افکار کا نام و نشان نہیں تھا۔ ماہ بانو آہستہ سے کمرے میں داخل ہو گئی۔

حویلی میں آنے جانے کے اس عرصے میں یہ پہلا موقع تھا جو اسے چودھری افکار عالم شاہ کے کمرے میں آنے کا اتفاق ہوا تھا۔ کمرے کے اندر داخل ہو کر وہ کچھ پل کے لیے ساکت بی رہ گئی۔ یوں تو پوری حویلی ہی بڑی خوب صورتی سے سجائی تھی لیکن چودھری افکار کے کمرے کی تو بات ہی الگ تھی۔ اس کا کمرہ کوئی عظیم کدہ تھا جہاں ماہ بانو اچانک آنکلی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہاں غلوں اور ڈراموں میں دکھائے جانے والے کسی شہنشاہ کے کمرے کا سیٹ لگا ہو بلکہ کمرہ ان شیش کے مقابلے میں اور بھی زیادہ خوب صورتی سے سجایا ہوا تھا۔ کمرے میں الیکٹریک برش کی وجہ سے خوش گواری گری تھی۔ ماہ بانو اس خوب صورتی میں گم ہو کر بھول گئی کہ یہ چودھری افکار کا کمرہ ہے اور وہ وہاں چودھری افکار کے لیے دودھ پہنچانے آئی ہے۔ مگر زدہ سی کیفیت میں اس نے اپنے ہاتھ میں موجود دودھ کا گلاس ایک تپائی پر رکھا اور خود بڑے سے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ بیڈ پر بچھا کد اہمیت نرم اور آرام دہ تھا۔ ماہ بانو کو اس پر بیٹھ کر بہت لطف آیا۔ اس نے اس لطف کو مزید محسوس کرنے کے لیے اپنا سر پشت پر موجود نیچے پر رکھ دیا۔ نیچے بھی بے حد نرم ملائم تھا۔ ماہ بانو کو یوں لگا جیسے وہ بادلوں پر سر رکھ گئی ہو۔ اس خوش گوار کیفیت میں کتنے لمبے گزرے اسے اندازہ نہ ہو سکا۔ محسن اور فہم سے بڑ حال جسم اتنا آرام باخود رکھ کر انداز میں فہم کی آغوش میں چلا گیا۔ غفلت کے یہ لمحات کتنے طویل تھے، وہ اندازہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی آنکھ دو بارہ اپنے جسم پر محسوس ہونے والے لمس کی وجہ سے کھلی۔ کمرے میں نیم تاری تھی مگر وہ اپنی غلوں کے بالکل سامنے موجود چودھری افکار کا چہرہ بہ خوبی دیکھ سکتی تھی۔ اس نے گہرا کر بستر سے اٹھنے کی کوشش کی۔ چودھری نے اپنے ہاتھ کے دباؤ سے اس کی اس کوشش کو ناکام بنادیا اور اسے پکارتے ہوئے بولا۔

”کہاں جاتی ہے، لیٹی رو۔ بہت تھک گئی ہے نا... یہاں میرے بستر جیسا آرام کہیں اور نہیں ملے گا۔“

گزرنے جاری تھی۔ خوف کی شدت نے اسے کچھ اس
 طرح مفلوج کر دیا تھا کہ اسے وقار کے لیے ذرا سی
 حرکت بھی نہیں کر پاری تھی۔ اپنے فک جانے کے لیے اس
 کے پاس اگر کوئی امید تھی تو وہ صرف یہ کہ کوئی بیرونی امداد

حویلی کے سب سے شان دار کمرے میں موجود
 دونوں نفوس دو مختلف اہتیاؤں پر کھڑے تھے۔ ماہ بانو کے
 لیے یہ قیامت کی گھڑیاں تھیں۔
 سترہ سال کی عمر میں وہ ایک بھیا تک ترین تجربے سے



آجائے لیکن چودھری افتخار کی اس راج دہانی میں قدم رکھنے کی جرأت کس میں ہو سکتی تھی؟ خود چودھری افتخار کا حال اس سادہ سالار کا سا تھا جو اپنی راج کے قیمتی ہونے کے خیال سے کسی شہر کی تفصیل کے باہر گھڑا اور جاتا ہو کہ بس ایک زوردار حملہ جتنی دروازے کو توڑ ڈالے گا اور وہ بھر کے بعد ایک فارغ کی حیثیت سے شہر میں اپنی راج کے جھنڈے گاڑ رہا ہوگا۔ شراب کی ترنگ اور خافت کے نشے نے اسے بالکل بے ہوش کر ڈالا تھا۔ اس کی ساتیں اس شور کو سننے سے عاری تھیں جو اس کی حویلی کے کسی گوشے میں سے اٹھ رہا تھا۔ اس کی اس مدہوشی کو دروازے پر ہونے والی زوردار دھمک نے توڑا۔ چودھری اس دھمک سے بے ہوش ہو کر اٹھ اٹھا۔ ڈسٹرب ہوا لیکن ماہ بانو کو آواز دہانے پر بہر حال وہ راضی نہیں تھا۔ ماہ بانو جو بالکل سر پرچی تھی، اس دھمک کو سن کر چونکی۔ اس کے اندر سے سرے سے توانائی پیدا ہوئی کہ وہ چودھری افتخار کے خلاف حراست کر سکے۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ پوری قوت سے چودھری کے منہ پر مارا۔ چودھری نے جواب میں ایک گالی دیتے ہوئے اس کے ہاتھ کو بری طرح موڑا۔ ماہ بانو تکلیف کی شدت سے تڑپ اٹھی۔ اسی وقت دروازے پر دوبارہ دھمک ہوئی۔ دھمک پہلے سے زیادہ زوردار اور دھمکی کی۔

"اس وقت کس کی موت آئی ہے جو مجھے پریشان کرنے چلا آیا ہے۔" چودھری جو دھمک اور ماہ بانو کی حراست کی وجہ سے اچھا خاصہ مدعو ہو چکا تھا، بری طرح دہڑا اور ڈولتا ہوا کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔

"چودھری صاحب! آپر آئیں۔ غضب ہو گیا ہے۔"

باہر سے بڑی چودھرائی کی پریشان اور خوف زدہ سی آواز سنائی دی۔

"یو صبا کو مٹن نہیں ہے۔ اس پر بھی تنگ کرنے آئی ہے۔" چودھری افتخار بڑبڑایا اور دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھولنے سے پہلے اس نے اپنا چلیہ بھی جلدی جلدی تھیک کر لیا تھا۔

"چودھری صاحب! غضب ہو گیا ہے، حویلی کے مہمان خانے میں ایک کمرے میں آگ لگ گئی ہے۔ آگ بڑی زوردار لگی ہے۔ نوکر اسے بجھانے کی کوشش میں لگے ہیں لیکن ابھی تک بجھا نہیں سکے ہیں۔ مٹی سے مجھے کھلوایا ہے کہ آپ کو اطلاع کر دوں۔ مہمان بڑا ہی خاص بندہ ہے، کسی موتی والا کے بیٹے کا نام لے رہی تھی چچی۔"

چودھرائی جاتی تھی کہ چودھری اپنے آرام میں اس طرح

وقت قفل ہونے پر سخت ناراض ہو گا اس لیے دروازہ کھلتے ہی جلدی جلدی تفصیل بتانے لگی۔ کمرے کا دروازہ کچھ ایسے رخ پر تھا کہ وہاں سے چودھری کا بیکہ نظر نہیں آتا تھا۔ ماہ بانو بھی تنگ ایسی ہی تھی اس لیے چودھرائی کو خبر بھی نہیں ہو سکی کہ اس کا شوہر اپنے بندے کے میں کون سا کھیل کر رہا ہے۔

"یہ تو واقعی غضب ہو گیا۔ میں خود چل کر دیکھتا ہوں۔"

بڑی چودھرائی کی دیکھ بولی اطلاع نے چودھری افتخار کا سارا نشہ برن کر دیا اور وہ صبراً کمرے سے باہر نکلا۔ اپنے کمرے میں موجود ماہ بانو کی طرف سے اس کا دھیان میں طور پر ہٹ چکا تھا۔ موتی والا سے اس کے بہترین کاروباری مراسم تھے۔ اگر اس کے بیٹے کو حویلی میں کچھ ہو جاتا تو چودھری افتخار کو بڑی مشکل پڑ جاتی۔ یوں ہی ماہ بانو کا کیا تھا، تو وہ پھر کسی وقت دوبارہ حاصل کر سکتا تھا۔ چودھری اور اس کی بیوی کے درمیان ہونے والی گفتگو ماہ بانو کے کانوں تک بھی پہنچتی تھی۔ چودھری کے کمرے سے باہر نکلتے ہی وہ بیٹھنے سے کھڑی ہوئی۔ چودھری اپنی تیز ذہنی میں اس کے لباس کو تار تار کر چکا تھا۔ ماہ بانو نے ہنر پر بھی بڑی سی چودھری کی اپنے پورے دلجو کو اس میں لپیٹا اور کمرے سے باہر نکلی۔ کمرے میں دھیمادھیماسنا دینے والا شوہر بہت دھمکی سنائی دے رہا تھا۔ ماہ بانو نے چپکے سے بیرونی دروازے کا رخ کیا۔ حویلی کے کیمٹوں کے رہائشی صے سے قدرے ہٹ کر بیٹھے تھے مہمان خانے میں اس وقت کھرام سا بچا ہوا تھا۔ آگ کے شعلے اور دھواں دور سے بھی نظر آ رہے تھے۔ ملازمین پانی کی پالٹیوں اور پائپوں کی دھڑ سے آگ بجھانے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ متاثرہ کمرے کے علاوہ دوسرے کمروں میں موجود مہمان بھی باہر نکل چکے تھے اور ہر اماں سے کھڑے کارروائی دیکھ رہے تھے۔ بیٹھ بٹھ سونوں میں لمبوس تک سب سے تیار رہنے والے ان معزز مہمان گرامی کی اس وقت اپنے صلیوں کا ہوش نہیں تھا۔ وہ شب خوافی کے آدھے اندھیرے کپڑوں میں اپنی جان بچانے کے خیال سے اپنے کمروں سے نکل بھاگے تھے کہ کیمٹوں ایک کمرے میں لگ ہوئی آگ ان کے کمروں تک بھی رسائی نہ کر سکے۔ ان کی یہ تشویش اتنی غلطی نہیں تھی۔ براہ راست آگ کی زد میں موجود کمرے کے دائیں بائیں موجود دونوں کمرے بھی اب جزوی طور پر آگ سے متاثر ہونے لگے تھے۔ ماہ بانو نے اس سارے منظر پر ایک سرسری سی نظر ڈالی اور چوڑی باہر کی راہی۔ لوگوں کے جھوم میں اس نے چودھری افتخار

نہ ہو سکی دیکھا تھا جو بیچ بیچ کر اپنے کارندوں کو آگ بجھانے کے سلسلے میں ہدایت دے رہا تھا۔ مہمان خانے میں لگی آگ کے مقابلے میں ماہ بانو کے لیے چودھری افتخار کا وجود زیادہ بڑا مغزیت تھا۔ اگر حویلی میں یہ حادثہ پیش نہ آیا ہوتا تو چودھری افتخار، ماہ بانو کو بڑا مددگار چکا ہوتا۔ ماہ بانو کی برادری، حویلی کے اس مہمان خانے کی برادری سے زیادہ بڑی بات ہوتی۔ حویلی کے مہمان خانے کو اس جانی کے بعد دوبارہ سے استعمال کے قابل بنایا جاسکتا تھا۔ ماہ بانو برادری ہوتی تو اس نقصان کا ازالہ ممکن نہیں تھا۔ اپنے رخ جانے کی خوشی کو تو فی الحال ماہ بانو پوری طرح محسوس نہیں کر سکتی تھی لیکن بہر حال اسے اس بات کا احساس تھا کہ دست قدرت نے بالکل میں سوچ بچا اس کی مدد فرمائی ہے۔ وہ وحشت زدہ سی حویلی سے اپنے تفریحی طرف جانے والے ٹیڑھے سڑک سے، اونچے نیچے اور اوجھڑے راستوں پر دوڑتی جا رہی تھی۔ یہ رات کا بالکل آخری پہر تھا۔ عام حالات میں وہ اس وقت کمرے سے باہر قدم رکھنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن اب اسے تجربے اور راستے میں جگہ جگہ بھٹکتے کتوں کا احساس بھی نہیں تھا۔ یہ دونوں تجربے چودھری افتخار سے کم خطرناک تھے۔

☆☆☆

نورال اور زہرہ بستر میں دیکھی بے خبر سو رہی تھیں۔ کسی اور مردی کے باعث ان کی نیند بہت گہری تھی مگر زہرہ نے سوچا کہ اپنے والدین کی زوردار سی کران دونوں کی بے خبری ہو گئی۔ حقیقت دھمک دینے والے نے دروازہ کھٹکنا بھی بلکل دھڑ دھڑایا تھا۔

"خیر! کیا آگیا ہے شاید۔" نورال نے زہرہ کی طرف دیکھ کر خیال ظاہر کیا اور بہ مشکل بستر سے کھل کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھی۔ غیبت گھم گھم کی اور بہت سے لمبوس کی طرح عرس کے خاتمے کے بعد دروازے کے کاموں کے سبب روک لیا گیا تھا۔ دن بھر موجود رہنے والے لوگوں نے اپنی کی وجہ سے وہاں اچھا خاصا پھیلا دا ہو گیا تھا۔ بستر کے والے اسے پھیلا دے اور کوڑے کرکٹ کو رات میں ہی سمیٹ کر دروازہ کو پہلے والی صاف ستھری حالت دے دی۔ دوسرے داری ان حرازموں کے سرخی۔ برسوں میں معمول تھا کہ عرس کے خاتمے کے بعد دروازہ کی صفائی کی جائے۔ ان کا سوچ لگنے کا انتظار نہیں کیا جاتا تھا بلکہ یہ رات میں ہی حرازم لے کر یہ کام انجام دے دیتے تھے۔ روز بروز دروازے کے گاؤں سے آنے والے ان

قاریاں حاکم کی مقدس آیت و حواہ ہیں شہر کی ایک سے دیں مقدسیت میں حشائے شہر کے بیٹے شاہ کی جہاں تھیں انھیں حرازم کی پیشرو بہت حد تک ہدف ہوتے ہیں اور وہ بہت رنج و برنج کو بھی صبر و سلاطین کے مقابلے میں حشائے شہر کے مقدس مقامات پر لگتے۔

مستندین کی بھی روانگی ہو جاتی تھی جو رات ہو جانے کے باعث فوری طور پر روات ہونے کے بجائے دروازے کے احاطے میں ہی رک جاتے تھے۔ ان مستندین کی روانگی کے بعد دروازہ کی ایک یا پھر پچھلی کھالی کی جاتی تھی جس کے لیے حرازموں کی دوسری ٹھیک کام کرتی تھی۔ دروازہ بند ہونے کے بعد نورال نے اپنی خیال کی فکر غیبت کام سے فارغ ہونے کے بعد واپس کمر آگیا۔ لیکن دروازہ کھولنے ہی اسے احساس ہوا کہ آنے والا غیبت نہیں ہے۔ وہ جو بھی تھا، چادر میں لپیٹا ایک دھمکی صورت دروازے پر پڑا ہوا تھا۔ نورال نے جبکہ کہ اس دھمکی کا پتہ لیا۔ اسے چادر میں سے ماہ بانو کا چہرہ نظر آیا۔ ماہ بانو ہوش نہیں تھی لیکن نیچے مری کچھ اس انداز میں ساتیں لے رہی تھی جیسے اس میں لپے چلنے کی بھی سکت باقی نہ رہی ہو۔

"زہرہ! جلدی سے بھاگ کر ادھر آ۔" نورال نے پہلے تو خود ماہ بانو کو اٹھانے کی کوشش کی لیکن چونکہ اس کا جسم بالکل زچہ لڑا ہوا تھا اس لیے اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکی اور گھبرا کر زہرہ کو آواز دی۔ زہرہ ماں کی آواز میں موجود گھبراہٹ کو محسوس کر کے حیرت سے اٹھ کر آئی۔ ماہ بانو کو اس وقت دروازے پر گرے دیج کر اس کا نہ حیرت سے کھل گیا۔

"بھئی کر۔ ادھر آ کر اسے میرے ساتھ بٹھو۔" نورال نے زہرہ کو کوکا تو وہ آگے بڑھی اور نورال کے ساتھ مل کر اسے اٹھانے لگی۔ دونوں نے کمرے کا ماہ بانو کو کمرے تک پہنچایا اور چار پائی پر لٹا دیا۔ دروازے سے بڑھ کر کھلی کے اس محل میں ماہ بانو کے جسم پر لپٹی چادر گھم گئی اور اس کا جگہ جگہ سے پھنکا ہوا لباس مٹا ہوا۔

"یہ کیا؟" نورال نے گھبرا کر ماہ بانو کا جسم نونا شروع کر دیا اور پھر کسی نقصان کو محسوس نہ کر کے لمپٹان کی ساتیں لپٹے ہوئے اس کے جسم پر لٹاف و احسان دیا۔ ماہ بانو جو سردی اور خوف کے باعث کپکپا رہی تھی، گرم بڑی فرحت اور گھر

کے خوف کا احساس ہونے پر کچھ مطمئن ہی ہو کر غصے میں چلی گئی۔ نوران اور زہرہ البتہ پریشان ہی اس کے قریب ہی بیٹھیں رہیں۔ ماہ بانو جو چلی گئی تھی اور اب جس حال میں گھر واپس آئی تھی، اس کا ذہن دارو چلی سے وابستہ کوئی فرد ہی ہو سکتا تھا۔ وہ فرد کون تھا؟ اس کا جواب صرف ماہ بانو ہی دے سکتی تھی لیکن وہ اس وقت تقریباً بے ہوش تھی۔ اسی عالم میں صبح ہو گئی۔ نوران کی توقع کے خلاف غیبت صبح جمع بہت دیر سے گھر واپس آیا۔ اس دوران زہرہ الیاس کو ناشتا کروا کر مسجد کے لیے روانہ کر چکی تھی۔ الیاس کو اسکول میں داخل کروانے کے بجائے مسجد میں مولوی صاحب کے پاس پڑھنے کے لیے بھیجا جاتا تھا۔ غیبت محمد کے خیال کے مطابق الیاس کو بھی اس کی طرح کیتھون میں مل چلائے اور حویلی کی خدمت کے کام پر انجام دینے سے اور ان کاموں کے لیے اسکول کی تعلیم کی قطعی ضرورت نہیں تھی، البتہ مولوی صاحب کے پاس جانے کا معاملہ اگلا تھا۔ الیاس کے وہاں جانے سے انہیں اس کی اور اپنی آخرت سنورنے کی امید تھی۔ پھر وہاں جانے میں چودھری افتخار کی ناراضی کا بھی کوئی خدشہ نہیں تھا۔ مولوی صاحب کو چودھری افتخار کی حمایت حاصل تھی۔ اسکول کی مخالفت بھی وہ بہت حمل کر رہیں کرتا تھا لیکن اس کے وہ سرسری سے اقوال حرازموں کے کان میں پڑتے رہتے تھے جن کا کلب لہاب بھی تھا کہ اسکول کی تعلیم کاؤں کے ان بچوں کی دنیاوار آخرت سنوارنے میں کوئی مدد نہیں دے سکتی تھی۔ کیتھون میں مل چلانے کا کام وہ بغیر تعلیم کے بھی نہ خیر خواہی انجام دے سکتے تھے جبکہ آخرت سنوارنے کے لیے مولوی صاحب کے پاس جانا مناسب تھا چنانچہ الیاس کو اسکول میں داخل نہیں کروایا گیا تھا۔

”رات حویلی میں بڑا ہنگامہ رہا۔ جانے کیسے ایک مہمان کے کمرے میں آگ لگ گئی۔ ستارے وہ مہمان شہر کے ایک بہت بڑے آدمی کا بیٹا تھا۔ بے چارہ آگ میں محسوس کر خاک ہو گیا۔ صبح سے پولیس کے بڑے بڑے بڑے افسر چلی پیچھے ہوئے ہیں۔ لڑکے کی لاش کو لوگوں نے شہر بھجوا دیا ہے۔ چودھری صاحب بڑے پریشان اور غصے میں ہیں۔ میں تو تیرے دوسرے لوگوں کے ساتھ درگاہ پر ہی تھا لیکن حویلی سے خبر لے کر آنے والے نے بتایا کہ مہمان خانے کے تین چار کمرے جل گئے ہیں۔ حالانکہ بے چارے ملازموں نے بڑی کوشش کی تھی آگ بجھانے کی۔ وہ تو خراس کا کوشش میں اچھے خاصے جل گئے ہیں لیکن پھر بھی اچھا خاصا نقصان ہو گیا ہے۔ سب سے بڑی بات بندہ جان سے چلا گیا ہے۔ چودھری صاحب کا

پریشان ہونا تو بڑا ہے کہ ان کی حویلی میں ان کا مہمان جان سے گزر گیا۔“ غیبت نے گھر آتے ہی نوران کو حویلی میں ہونے والے حادثے کے بارے میں خبر دی۔ ”بڑا آگ کیسے؟“ نوران نے حیرت سے سوال کیا۔ ”مجھے کیا معلوم؟ پولیس والے آئے ہوئے ہیں، وہی جہان جین کر کے کچھ بتائیں گے۔ ابھی تو میں یہ کہہ رہی تھی جلدی سے ناشتا پانی دے۔ رات بھی منت مانتے کے چکر میں، میں لنگر سے اپنا خدشہ نہیں لے سکا تھا۔ اب بھی بڑی مشکلوں سے نظر بچا کر وہاں سے نکلا ہوں کہ پیت کی آگ بجھا کر دوبارہ ادھر جاؤں۔ آج تو سارا دن ادھر ہی خدمت میں حاضر رہنا پڑے گا ورنہ چودھری صاحب کا غصہ تو کسی پر بھی نکل سکتا ہے۔“ پچھلے پورے دن کی محنت اور رات کی جگاڑ نے غیبت کا حال بھی برا کر رکھا تھا لیکن ان ڈاک کحات میں وہ گھر بیٹھ کر آرام کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ نوران نے جلدی جلدی اسے ناشتا پنا کر دیا اور اس کے کمرے سے نکلنے سے پہلے زہرہ کو ماہ بانو کے متعلق چند روایات دے کر وہ بھی حویلی کے لیے روانہ ہوئی۔ اسے آج معمول سے بہت زیادہ دیر ہو چکی تھی اور وہ ڈر رہی تھی کہ کہیں اسے اس دیر کا خمیازہ نہ بھگتنا پڑے لیکن حویلی کی سادگی کرتا دھرتیا میں خود اتنی شدید پریشانی میں نہیں کہ انہیں نوران کے در سے آنے کی خبر بھی نہ ہو سکی۔ نوران خاموشی سے اپنے جیسے کام گھن کر واپس گھر آگئی۔ ماہ بانو ابھی تک بستر پر ہی تھی البتہ زہرہ نے اس کا لباس تبدیل کر دیا تھا۔ ماہ بانو کا پورا جسم بخار سے جل رہا تھا۔ نوران، زہرہ کو کھنڈنے پانی کی پٹیاں رکھنے کی ہدایت کر کے خود حکیم سے دوا لینے چلی گئی۔ دوا والا کراس نے ماہ بانو کو کھلائی۔ غصے سے پانی کی ٹیوب اور دوا کے اثر سے ماہ بانو کے بخار کی شدت کم ہو گئی۔ اگلے دن اتوار تھا۔ ماہ بانو نے لے شدہ معابد کے مطابق صاف صبح صبح اسے واپس لے جانے کے لیے گاؤں بھیج دیا۔ ماہ بانو کی اتاری ہوئی شکل دیکھ کر اسے سخت تشویش ہوئی۔ نوران نے ماہ بانو کی بیماری کا بہانہ بنا کر صفر کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ماہ بانو البتہ خاموش رہی اور اسی خاموشی کے عالم میں صفر کے ساتھ فیصل آباد جانے کے لیے روانہ ہوئی۔ نوران کو موقع ہی نہیں مل سکا کہ وہ ماہ بانو سے اس کے ساتھ بیٹے حادثے کے بارے میں تفصیلات پوچھ سکے۔

☆☆☆
”ایکپہر جس نے حادثے سے حلقہ اپنی ابتداء پر پورے جوش کر دی ہے۔ ان کی رائے کے مطابق آگ لگا

ایک اتفاقی حادثہ تھا جو مرنے والے کی اپنی غفلت سے پیش آیا۔ حادثے سے پہلے اس نے شراب نوشی کرتے ہوئے شاید کچھ شراب اپنے بستر پر بھی کرادی کچھ دہوشی کے عالم میں اس نے ستریت کا ٹوٹا پائنتی ہوئی دیاسلا کی بھی بستر پر ہی میک دی، نتیجتاً آگ بھڑک اٹھی۔ اس آگ نے تیزی سے بستر سے کار پینٹ اور پردوں تک کا سفر طے کر لیا۔ تحقیقاتی ٹیم کی اس رائے کو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے بھی توثیق مل رہی ہے۔ سید نیگل ایکپہر کے مطابق لڑکے نے بے تحاشا شراب پی رہی تھی۔ اس کے معدے میں الکحل کی بڑی مقدار موجود تھی۔ اس کے علاوہ ایکپہرٹ نے یہ بھی بتایا ہے کہ لڑکے نے شراب کے ساتھ ساتھ جوس کا استعمال بھی کیا تھا۔ اب آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ شخص جو یک وقت شراب اور جوس کے نشے میں دہوش ہو، وہی طور پر کس حال میں ہو گا۔ ایسے شخص کے ساتھ کسی حادثے کا پیش آجانا کبھی منطقی ہی بات ہے۔“ چودھری افتخار عالم شام کے وسیع ڈرائنگ روم میں بیٹھا شہر یار اسے حادثے کے بارے میں مابہرین کی رائے سے آگاہ کر رہا تھا جبکہ چودھری کے چہرے پر پچھلے تین دن سے چھپائی تاؤ اب بھی موجود تھی۔ شہر یار کی فراہم کردہ معلومات کو سن کر اس کے تختے چلنے لگے اور وہ غصے سے بولا۔

”کر تو ت دیکھو لڑکے کے۔ کم بخت عادی نشے باز تھا اور موتی والا بھگے سے یوں اٹھا ہوا ہے جیسے میں نے اس کے بڑی جان لی ہو۔ ٹھیک ہے، مجھے بھی حادثے کا افسوس ہے۔ میں خود شرمندہ ہوں کہ اس کا پتھر میری حویلی میں اپنی جان سے گیا لیکن اس کی جان جانے میں میری کو تو کوئی غلطی نہیں تھی۔ میرے نوکروں نے اپنی جان پر کھیل کر آگ بجھائی۔ میں نے خود نوں کر کے شہر سے فائر بریڈینڈ والاں کو بلا لیا لیکن لڑکے کی موت آگئی تھی تو اسے کون بچا سکتا تھا۔ کسی کے مرنے جیسے پروتیرا اختیار نہیں ہے۔ میں نے کوشش کی کہ موتی والا کا کم بابت سکوں۔ میں خود میت کے ساتھ اس کے گھر گیا۔ افسوس بھی کیا کہ میری حویلی میں اس کے پتھر کو ایسا جان لیوا حادثہ پیش آ گیا لیکن اس نے مجھ سے سیدہ منہ بات ہی نہیں کی۔ پھر میں نے لڑکے کے سوگم پر اپنی طرف سے کھانے کی دیکھیں، بوا کر بھیجیں تو اس نے وہی دہوشی واپس کرادی۔ اتنا شاندار کھانا تھا، لاکھ سے اوپر دینا خرچ کیا تھا میں نے اس پر۔ سارا کا سارا قیمتی خاں میں بھجوا دیا۔“ چودھری افتخار کو اپنی رقم ضائع ہونے کا شدید دکھ تھا۔ وہ رگم جو لگنے لگے اپنے کاروباری مراسم کو مضبوط بنانے رکھنے کے لیے

موتی والا کے بیٹے کے سوگم پر اپنی کچی، قیمتی خانے میں لگ گئی تھی تو یہ اس شخص کی ذہنی دہائی کے بندے کے حساب سے تو اچھا خاصا نقصان تھا۔ موتی والا اس کا بڑا پس باز تھا۔ وہ اس کے بھجوائے ہوئے کھانے کو بیٹے کے سوگم میں آئے ہوئے لوگوں کو کھلاتا تو چودھری کوئی ہو جانی کہ موتی والا اسے اس حادثے کے بعد بھی اس کے مراسم بڑے نہیں ہیں۔ دوسرے سوگم میں آنے والے موزین کو بھی جب یہ علم ہوتا کہ سوگم کا اتنا شاندار کھانا چودھری افتخار کی طرف سے آیا ہے تو وہ اس کی دریا دلی سے متاثر ہوئے لیکن موتی والا کے لیے جسے پان کی وجہ سے کھانا پہنچ گیا تھا قیمت خانے۔ اب قیمتی خانے میں موجود بھوکے بچے بچوں کے اس دعوت شیراز سے فائدہ اٹھانے سے چودھری افتخار کو کالیاں مل سکتا تھا۔ وہ بے چارے اپنے اس کھانے کو کھانے کے بعد زیادہ سے زیادہ چودھری افتخار کو دعا میں ہی دے سکتے تھے اور ان کی دعاؤں کی انتہا یہی ہوتی کہ اللہ تعالیٰ عید ازمگ چودھری افتخار کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ تو جیسا چودھری کو جنت کی کیا آرزو ہوگی، وہ تو دنیا میں بھی جنت میں رہ رہا تھا۔

”جانے دیں چودھری صاحب آپ نے جو اپنا فرض سمجھا وہ ادا کیا۔ اب موتی والا بڑے کہ وہ حقائق کو قبول کرتا ہے یا نہیں۔ میرے خیال میں تو ابھی اسے مدد سے نکل کر حقائق کا تجزیہ کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔ آخر اس کا اکلوتا بیٹا مرا ہے۔ وہ اپنے اس گم کی وجہ سے خراب یا کبھی ہو رہا ہے۔ تم میں اسے بھائی نہیں دے رہا کہ کس کس کو اس حادثے کا ذمہ دار ٹھہرائے۔ مجھ سے اور ہوں جان سے بھی کافی شکوے شکایت کر رہا تھا۔ اب دو بے چارہ جس کیفیت میں تھا، ہم اس سے یہ تو نہیں کہہ سکتے تھے کہ جناب آپ کا بیٹا خود اپنی موت کا ذمہ دار ہے۔ اگر نئے اس کی موت نہ ماری ہوتی تو وہ اس حادثے کا شکار ہی کیوں ہوتا۔ نہ ہی ہم اس سے یہ کہہ سکتے تھے کہ آپ نے اکلوتے بیٹے کو دنیا جہاں کی آسائش فراہم کر کے اسے عیاشی کرنے کے لیے بالکل آزاد چھوڑ دیا تھا۔ ٹھیک ہے اکلوتا بیٹا تھا، وہی کا پس نہیں چٹا کہ اکلوتا اولاد کے لیے کیا کچھ کر ڈالے گا اور اولاد پر چٹک ٹور کھنا چاہیے۔ وہ جس لت میں جکلا تھا اس کا انجام تو کسی نہ کسی حادثے کی شکل میں ہی سامنے آتا تھا۔ وہ یہاں حویلی میں آگ لگنے سے نہیں مرتا تو شہر ہی کسی زیادہ رش والی سڑک پر ایکسپلٹ سے مر جاتا۔ سمجھاؤ، میں اور ماموں جان موتی والا سے اس کے دکھ پر تعزیت کرنے لگے تھے، ہم اس سے یہ سب نہیں کہہ سکتے تھے۔ چنانچہ صرف افسوس کر کے

واپس آگئے۔ شہر پار چودھری افتخار کے انداز فکر کو اچھی طرح سمجھتا تھا مگر اس پر کچھ بھی ظاہر کیے بغیر اس انداز میں بات کرنے کو جیسے وہ خود چودھری افتخار کا ساتھی ہو۔ ویسے اس نے موتی والا کے بیٹے کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا وہ بالکل حقیقی تھے۔

”اصل بات یہ ہے اسی صاحب کے یہ موتی والا جیسے نوو لیتے جیسا کہنا تو جانتے ہیں لیکن ان میں اور ان کی اولادوں میں اتنا فرق نہیں ہوتا کہ اس بیٹے کو شمار کیں۔ ورنہ پھر تو میری اکلوتا بیٹی ہے۔ ہم نے اس کے اچھی بہت اٹھائے ہیں لیکن مجھ نے نہیں دیکھا۔ آج ہمیں، امریکا میں بیٹھا ہوا ہے۔ علیحدہ کا پڑا شوخ ہے۔ اسے اس شوخ کی وجہ سے واپس یہاں نہیں آئے۔ مگر فرماں بردار اتنا ہے کہ میں نے کہا پھر آجیسا ہے خاندان میں ہی کرنا ہے تو اس نے میرے علم پر ڈرامی چوں نہیں کی اور یہاں آکر خاندان کی لڑکی بیاہ کر ساتھ لے گیا۔ ایک بڑھنیں کہا کہ لاپائی میں امریکا کا پڑھا تھا بندہ گاؤں کی ان پر چلائی کہ ساتھ کیسے گزارہ کروں گا؟ اور تو اور اگر وہ چاہتا تو میری بات رکھنے کو صرف یہ کہ لیتا اور دوستی کو نہیں چھوڑ کر خود امریکا میں اپنی پسند کی لڑکی سے بیاہ کر لیتا لیکن اس نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ یہی اپنے معیار اور حزان سے الگ ہے پھر مجھ کی اسے پوری عزت سے اپنے ساتھ رکھا ہوا ہے۔ بچے اس کے وہاں امریکا کے اچھے اسکول میں پڑھ رہے ہیں۔ میں یہاں سے خرچ پانی بچھا کر جتا ہوں لیکن خود بھی ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہیں بیٹھا۔ وہاں کی ایک بہت بڑی فرم میں اچھی پوسٹ پر کام کر رہا ہے۔ تو بہت بے پائی ہے صاحب کہ خاندانی لوگ الگ ہی پتا چیتے ہیں۔ یہ موتی والا جیسے نوو لیتے تو اپنی اولادوں کا شراب خراب کر دیتے ہیں۔ موتی والا کی حیثیت ہی کیا تھی؟ چھوٹی لڑکی خیر خیر؟ دکان لے کر بیٹھ ہوا تھا۔ میں نے ہاتھ تھا تو شہر میں یہ بڑے بڑے شوروم کھول ڈالے۔ اب اس کے کارخانے میں اتنا کام ہوتا ہے کہ آتے دن سے گھر تک بھرتی کرنے پر تے ہیں لیکن یہ سب میری وجہ سے ہی ہے؟ مجھے لگا دکھتا ہے تو بے یقین سوچ رہا کہ میں کچھ بچوں کو تو سارا کاروبار چیت ہو جائے گا۔ میں نے خیال اس لیے برداشت ہے کام لے رہا ہوں کہ جوان پھر گیا ہے بے چارے کا۔ تھوڑا اسے سنبھلے گا سوچ دے دوں۔ دماغ کھانے پر آئے گا تو اسے خود اپنے سلوک کا احساس ہوگا۔ اگر احساس نہیں ہوا تو میں خود اس کا ورغ کھانے کے آؤں گا۔ مجھ سے لڑی لگا کر وہ اپنے کاروبار کو چلا نہیں سکے گا۔“ چودھری افتخار کے انداز میں جہاں اپنے

خاندانی ہونے کا غرور اور بیٹی کی قابلیت و فرمان برداری کو فخر تھا، وہاں اس شخصیت کا بھی اظہار تھا کہ جس نے میرے سامنے سر نہ جھکا جس نے نیست و نابود کر ڈالوں گا۔

”آپ فکر نہ کریں چودھری صاحب میں خود شیخ میں کر اس معائنے کو سنبھال کر نے کی کوشش کروں گا۔ اصل میں موتی والا کو آپ سے شکایت اس وجہ سے تھی کہ اس کے خیال میں آپ نے اپنے علاقے کا تحفظ ہونے کے باوجود یہاں ترقی کے کام بہت کم کیے ہیں۔ اگر آپ کوشش کرتے تو یہاں کوئی فائز اسٹیشن نہ بنی مگر یہی سڑک نہ ہوگی کہ فائز ریگولر کے گاؤں پر وقت نہ گزرتا۔ مجھ نے کام کر نہیں۔ ایک تو آج کل کے بہت دور جہاں آپ کا ہونا تھا پھر جو دو گاڑیاں آگ بھانے کے لیے آئیں ان میں سے بھی ایک بچے میں پھنس کر بنا کار ہو گئی۔“ شہر پار کے ظاہر دوست اور بددین کر چودھری افتخار کو گزرنے کی پستی پر حملہ چلا تھا۔ اس نے موتی والا کے نام سے چودھری افتخار کو جتا دیا تھا کہ وہ اپنے علاقے کا حکمران اور سیاسی نمائندہ ہونے کی حیثیت سے موٹر کار دار اور نہ میں نہ کام سے اور اس کا علاقہ نہایت غیر ترقی یافتہ ہے مگر چودھری افتخار بھی کوئی اچھی آسمانی سے گزرتا تھا اس نے والا بندہ وہیں تھا، اپنی کرسی کو کھینچ کر انداز کرتے ہوئے غصے سے بولا۔

”فضل ہو اس کرنا ہے سالانہ ۱۱۱ کا فائز بریکنگ والے جلدی بھی چٹکی جاتے تو اس کا پتہ تو کسی حال میں نہیں مل سکتا تھا۔ وہ تو بہتر کے ساتھ بیٹے کی جمل کر جسم ہو گیا ہوگا۔ نوکروں کو تو بہت بعد میں آگ لگنے کا معلوم ہوا۔ اردو ہونے سے کسی کا نقصان ہوا ہے تو وہ میں ہوں۔ میرا بھیمان خاندان مردود نہیں ہونگا بے اختیار اگ بے آرام اور خوف زدہ ہوئے۔“

میرے اپنے دو بندے اچھے خاصے جمل گئے جگ بھانے کے چکر میں لیکن میرے ان سارے نقصانات کو کھر انداز کر کے وہ موتی والا صرف اپنے پتہ کو روئے جا رہا ہے۔ مجھے تو چاہیے کہ موتی والا میرے ہر بڑے کا دعویٰ کروں کہ اس کے پتر کی وجہ سے میرا خیر خیر اتنا ہی نقصان ہوا ہے، وہ پورا کرے۔ لاٹھوں دوپے گئے تھے مہمان خانے پر۔ آگ میں سب جمل گئے تھے بڑا ہو گیا۔ اب نئے سرے سے وہاں پر کام کرنا پڑے گا تو خلی میں تو آئے دن بھیمان آتے رہتے ہیں۔ بھیمان خانہ مجھے فوری طور پر درست کرانا پڑے گا۔ علی گڑھ سے میری بات بھی ہوئی ہے لیکن کام اس لیے شروع نہیں کر سکا کہ پوسٹیں والے اپنی کارروائی پوری کر کے کھینچ لائے۔ دینے

”مجھے اعزاز ہے چودھری صاحب کہ آپ کا تحفہ فاک نقصان ہوا ہے۔ میں نے خود انش کے ساتھ آپ کے کہان خانے کا جائزہ لیا ہے مگر یہیں سامنے والے کے پاس آپ کی کچھ کمزوریاں ہیں جن کو دیکھ کر وہ آپ پر الزام تراشی کر رہا ہے۔ آپ کوشش کریں کہ ان چھوٹے موٹے مسائل کو حل کر دیں تاکہ لوگوں کے پاس انہماک اٹھانے کی توجہ نہ رہے۔ اب تو یہی میزبانے اچھی ناسی ترقی کر لی ہے۔ پہلے الیکٹرک ایک میڈیا پر صرف بی بی وی کارخانہ تھا اب نئے نئے چینل کھل گئے ہیں۔ آنے والے دو چار سالوں میں یہ پختہ ملک میں طوفان برپا کر دیں گے۔ چوبیس گھنٹے کی نشریات جاری رکھنے کے لیے کچھ نہ ہو تو چاہیے ہوتا ہے۔ جب آئیں کچھ نہیں ہے کہ تو اس طرح کے ایڈیٹرز کو برا بھلا چا کر پیش کر کے کی کوشش کریں گے۔ میڈیا کے اس طوفان کی زد میں آنے سے پہلے کچھ پیش بندیاں کرنی چاہئیں تو بہتر ہوگا۔ ہم سرکاری مائٹوں کا کیا ہے۔ تین یہاں کام کر رہے ہیں کل کی دوسرے علاقے میں ہوں گے لیکن آپ کو تو اپنے علاقے میں ہی رہنا ہوتا ہے۔ اس سے قبل کہ آپ پر میڈیا کا حملہ ہو، مستقبل کی منصوبہ بندی کر لیں۔“

شہر پار نے بات کو رات کے مشوروں پر کافی غور کیا تھا چنانچہ اب وہ حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے چودھری افتخار سے براہ راست مشورہ ہونے کے بجائے دوست بن کر اسے خوف زدہ کرنے اور اپنی مرضی کی راہ پر لانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”آپ کی بات غلط نہیں ہے۔ میں خود بھی یہ ساری باتیں محسوس کر رہا ہوں۔ فی الحال تو میرے علاقے میں میڈیا کا اتنا اثر نہیں ہے۔ اکثر لوگ ان پڑھ ہیں اس لیے اخبار وغیرہ یہاں بہت کم آتے ہیں۔ فی وی میں فی الحالہ اکاڑا کمزور میں ہی ہے اور اس پر بھی ابھی صرف بی بی وی کی نشریات ہی دیکھی جا سکتی ہے لیکن مجھے اعزاز ہے کہ گزشتہ چند سالوں میں یہ بونے والا تھوہری ذوق کے محروم نہیں رہا۔ چائے گائے گا اور ان پڑھ مزارعوں کے دماغ خراب ہو جائیں گے مگر بہر حال، ابھی تو وہ وقت دور ہے۔ جب آئے گا تو ہر میں کچھ نہ کچھ انتظام کر لوں گا۔ آپ کے غصوں زور منورے کے بے البتہ بہت بہت شکر ہے۔“ چودھری افتخار نے جس طرح شہر پار سے اتفاق کرتے ہوئے گفتگو شروع کی تھی، شہر پار خوش ہو گیا تھا کہ وہ چودھری کو چال کر لے کر لے کر کتاب ہو گیا ہے لیکن چودھری تو ایک بار پھر پکٹی چھٹی کی طرح ہاتھ سے پھسل گیا تھا۔

”تحفہ ہے چودھری صاحب! جو آپ مناسب سمجھیں،

میرا کام تو آپ کو مشورہ دینا تھا۔ آپ بہر حال مجھ سے زیادہ تجربہ دار ہو سکتے ہو جو مجھ سے ہیں۔ آپ جو فیصلہ کریں گے وہ بہتر ہی ہوگا۔ فی الحال مجھے اجازت دیں۔ کافی دیر ہو گئی مجھے یہاں آئے ہوئے۔ کی دوسرے کام بھی میری ذمہ دہی کے انتظار میں ہیں، مجھے اشتیاق بھانے ہے۔“ اپنی اچھی مینٹنگ کے بعد بھی چودھری افتخار کو برا بھلا نہ دیکھ کر شہر پار نے مینٹنگ کو ختم کر دیا ہی منب تکھا۔ ویسے وہ اس معاملے میں قطعی ناامید نہیں تھا۔ چودھری کو فاکس کرنے کے لیے اس کے جس کچھ اوپر طریقے بھی موجود تھے۔ وقت آئے پر وہ اپنی چال نہیں کر چودھری کو کسی حد تک دوسدھاری سکتا تھا۔

”آج میری چودھری افتخار عالم شام سے ملاقات ہوئی تھی۔ موتی والا کے بیٹے کی موت پر بہت ڈسٹرب لگ رہے تھے۔ شہر پار کو باری نقصان کا خدشہ ہے انہیں۔ موتی والا اپنے بیٹے کی موت پر ان سے سخت براش ہے۔ لگتا ہے چودھری افتخار اور اس کے درمیان ڈسٹرب مزید چل نہیں سکے گی۔“ شہر پار نے ملاقات کے لیے آئے ہوئے انش بی کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

”میرے خیال میں موتی والا ڈسٹرب ختم کر کے اپنے ہی حق میں برا کرے گا۔ چودھری افتخار کو تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ان کے پاس بے خوشا دہت ہے۔ ایک جگہ سے معاوضہ خراب ہوا تو وہ دوسری جگہ انوسٹمنٹ کر دیں گے۔ وہ ڈسٹرب صرف اس لیے ہیں کہ موتی والا کے بیٹے کی موت ان کی حویلی میں ہوئی ہے۔ چودھری افتخار کا جو بیک گراؤ ہے اس میں بھیمان کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ یہ لوگ بھیمان کی جان ومان کی حفاظت کرنا اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔ اب جو لڑکے کی ان کی حویلی میں موت ہوئی ہے تو انہیں لگتا ہے کہ ان کی ساکھ اس حادثے سے متاثر ہوئی ہے۔ موتی والا کے غرے بھی وہ اپنی اسی روایت کی پاسداری کی خاطر اٹھا رہے ہیں ورنہ اس کے داد چلا کرنے یا چودھری افتخار پر الزام دھرنے سے چودھری افتخار کو کچھ بگاڑنے والا تو ہے نہیں۔ میں نے تو موتی والا کے بیٹے کے بارے میں محل معلومات کر والی ہیں۔ لڑکا بچہ حد بگڑا ہوا اور ریسمت کا پکڑا تھا شراب اور چرس کے نشے میں مبتلا ہونے کی غصہ ترقی تو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے بھی ہوئی ہے۔ یہ مہمات کرنے سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ صاحب زادہ سے ہم کے میدان میں بھی سخت ناکامی کا فکاہ تھے۔ موتی والا پیسے کے زور پر اپنے بیٹے کو زبردستی آگے بڑھا رہا تھا۔ لڑکے کی ریڈ لائٹ ایریا میں بھی

مستقل آمدورفت تھی۔ موتی والا اگر چہ دھری افتخار کے خلاف زبان کھولے گا تو اس کے اور اس کے بیٹے کے بھی سارے کپے جتنے کھل جائیں گے۔ ابھی تو سب نے اس لیے خاموشی اختیار کر رکھی ہے کہ بے چارہ موتی والا صدے کا شکار ہے، ابھی اسے چھوڑ دو۔“ ایس بی کے اندازے گنگو سے صاف ظاہر تھا کہ وہ چودھری افتخار کے حق میں ہے۔

”آپ کی بات میں وزن ہے۔ ویسے مجھے اس بات کی بڑی خوشی ہے کہ آپ لوگوں نے اس کیس پر بڑی تیزی اور جا بک دینی سے کام کیا ورنہ لوگ پولیس کے گھگھے سے ہمیشہ یہی شکایت کرتے ہیں کہ یہاں کام پتا ہوتا نہیں یا بہت سست روی سے ہوتا ہے۔“ شہریار نے تحریف کی آڑ میں ایس بی کی کھنچائی کی۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے سراسر اسٹاف بہت سختی اور دیانت دار ہے اور آپ یہ مت سمجھیں گے کہ کارکردگی کا یہ مظاہرہ دو بڑی شخصیات کے انوالو ہونے کی وجہ سے کیا گیا ہے۔ اس وقت میری آمد کا مقصد آپ کو ایک دوسرے کیس کے سلسلے میں بریف کرنا تھا۔ ابھی کچھ دن قبل آپ نے اپنی عمرانی میں دین محمد نام کے ایک شخص کی رپورٹ لکھوائی تھی۔ اس شخص نے الزام لگایا تھا کہ وہ آپ کے پاس آنے سے پہلے تھانے گیا تھا لیکن تھانے دار نے رشوت طلب کی اور نہ دینے پر رپورٹ لکھنے سے انکار کر دیا۔ بے چارے تھانے دار نے اس وقت بھی آپ کے سامنے اپنی صفائی پیش کی تھی لیکن اسے خدشہ ہے کہ آپ نے اس کی پیش کی گئی صفائی کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ بہر حال، آپ کے حکم کے مطابق اس نے معاملے کی تحقیق کر کے رپورٹ بھجوا دی ہے۔ آپ ذاتی طور پر اس کیس میں دلچسپی لے رہے تھے اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ یہ رپورٹ خود آپ تک پہنچا دوں۔“ ایس بی نے ایک بند لفافہ شہریار کے سامنے رکھا۔ شہریار لفافہ کھولی کر اس میں موجود رپورٹ پڑھنے لگا۔

اس رپورٹ کے مندرجات کے مطابق درخواست گزار دین محمد کا بیان قطعی جھوٹ ثابت ہوا تھا۔ اس رات اس کے گھر پر کوئی ڈاکا نہیں پڑا تھا اور نہ ہی اس کی بیٹی اغوا کی گئی تھی۔ دین محمد نے بیٹی کے اغوا ہونے کی صرف کہانی بتائی تھی تا کہ گاؤں والوں کے سامنے بیٹی کے شادی سے پہلے اچانک غائب ہو جانے کا بہانہ بنا سکے۔ حقیقت میں اس کی بیٹی اپنے ماں باپ کے ملے کر وہ رشتے سے خوش نہیں تھی اور اس جگہ شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لڑکی کے کسی دوسرے گاہک کے لڑکے سے مراسم تھے۔ لڑکا چونکہ دین محمد کی ذات برادری کا

نہیں تھا اس لیے دین محمد اس لڑکے سے بیٹی کا رشتہ کرنے پر تیار نہیں تھا۔ لڑکی کے رنگ ڈھنگ و کچھ کر اس نے زبردستی اپنے چچا زاد بھائی کے بیٹے سے اس کا رشتہ کر دیا لیکن شادی ہونے سے پہلے ہی لڑکی اسے جل دے گئی۔ اس نے اپنے آشنا لڑکے کو گھر میں بلایا۔ لڑکے کے ساتھ اس کے دو دوست بھی تھے۔ ان لوگوں نے مل کر لڑکی کے بھائیوں کو ایک کمرے میں بند کیا اور دین محمد اور اس کی بیوی کے سامنے جھڑپ کے سامان اور ردیوں سمیت لڑکی کو لے کر فرار ہو گئے۔ بعد میں دین محمد اور اس کی بیوی نے واویلا مچایا کہ ان کے گھر ڈاکو گھس آئے تھے اور لڑکی سمیت سب کچھ لوٹ کر لے گئے مگر اس بیان میں بالکل بھی سچائی نہیں ہے۔ خود درخواست گزار دین محمد کا کردار ماضی میں کافی مشکوک رہا ہے۔ دین محمد کی موجودہ بیوی اس کی دوسری بیوی ہے جو پہلی بیوی کی قطعی بہن ہے۔ میں بائیس سال پہلے اس کی دوسری بیوی جو کہ اس وقت اس کی سالی تھی، اپنے ماں باپ کی وفات کے بعد اپنی رہ جانے کے باعث اپنی بڑی بہن کے گھر رہنے آ گئی تھی۔ دین محمد اور اس کی بہن کی شادی کو کئی سال گزر جانے کے باوجود ان کے گھر اولاد نہیں گئی۔ دین محمد جو اولاد کے نہ ہونے کی وجہ سے بیوی سے اچھا خاصا بے زار ہو چکا تھا، جوان العمر سالی کو دیکھ کر پھسل گیا۔ اس نے جانے اپنی بیوی کو کیا کھلایا پلایا کہ ابھی خاصی ہنسی کی محنت مند عورت چند گھنٹوں میں ہی چٹ پٹ ہو گئی۔ دین محمد نے اپنی اور اپنی سالی کی تنہائی کا بہانہ کر کے فوراً ہی اس سے نکاح کر لیا۔ اب وہ اپنے سے کئی برس چھوٹی بیوی کے ساتھ مزے سے رہتا ہے۔ اس کے بچے بھی ہیں لیکن ظاہر ہے، بچوں میں باپ کی خصلت تو آتی ہی تھی۔ چنانچہ بیٹی نے باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے مقصد برآری کے لیے دھوکا دی سے کام لیا اور سب کچھ سمیت کر اپنے آشنا کے ساتھ بھاگ گئی۔ اب دین محمد خالق پر پردہ ڈالنے کے لیے جھوٹی کہانی بنا رہا ہے۔

رپورٹ میں ٹوپی پوائنٹ بات کرنے کے بجائے ذاتی خیالات اور تجزیے بھی پیش کیے گئے تھے جس کی وجہ سے وہ کچھ عجیب سی لگ رہی تھی۔ شہریار نے رپورٹ پڑھنے کے بعد اسے واپس لفافے میں رکھا اور ایس بی کی طرف متوجہ ہوا۔

”یہ تو بہت سی حیرت انگیز انکشافات ہیں۔ میں خود دین محمد کے ساتھ اس کے گاؤں گیا تھا۔ گاؤں کے دیگر لوگوں نے بھی تصدیق کی تھی کہ دین محمد کے گھر ڈاکا پڑا ہے لیکن اب یہ رپورٹ تو ان ساری باتوں کی قطعی نفی کر رہی ہے۔“

آفتاب کو احساس ہوا کہ معاملہ یقیناً سیریس ہے ورنہ چودھری اشرف اسے یوں لیر چسکی میں کال نہیں کرتا۔

”سچا غم خیز... میں ابھی پانچ منٹ میں تمہارے ساتھ چلا ہوں۔“ آفتاب نے ملازم سے کہہ کر اپنے رہائشی کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ یہ وہ پہلا وقت تھا، اشمول کی چھٹی ہو چکی تھی اس کا **سامانی ماسٹر** کی کام سے باہر گیا ہوا تھا، یہی صورت حال یہ تھی کہ اگر وہ چودھری اشرف کے پیچھے کارندہ کے ساتھ اس کی حویلی چلا جاتا اور وہاں کوئی ایسا معاملہ پیش آتا جس پر چودھری اشرف پر ہم ہو کر اسے جان سے مار دیتا یا قید میں ڈال دیتا تو کسی کو علم بھی نہیں ہو پاتا کہ ماسٹر آفتاب احمد کہاں چلا گیا۔ ذہن میں گردش کرتے ان خیالات کے ساتھ آفتاب احمد نے تیزی سے لباس بدلایا اور پھر کمرے میں موجود اپنی بوسیدہ رانگٹیکل کے قریب آیا۔ رانگٹیکل پر اس کا وہ کالم جو چودھری اشرف کے فرامیگہ کی آمد سے قبل وہ لکھ رہا تھا، ادھر بڑا ہوا تھا۔ آفتاب احمد نے ایک سادہ کاغذ لے کر اس پر مارکر سے بڑا بڑا ”میں چودھری اشرف سے ملنے اس کی حویلی جا رہا ہوں“ لکھا اور کاغذ کو کپ بپور میں چھپا کر خود دیر وئی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اب اسے کم از کم یہی تھی کہ اگر وہ غائب بھی ہوتا تو ڈھونڈتے والوں کو اس کا سراغ تو مل سکے گا۔ باہر چودھری اشرف کا نمائندہ گاڑی میں بیٹھا پتھر نظروں سے دروازے کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ آفتاب احمد کے گاڑی میں بیٹھے ہی اس نے گاڑی چلا دی۔ گاڑی چودھری اشرف کی رہائش چودھری اشرف کی حویلی سے کافی فاصلے پر گئی۔ پھر آباد کی بیشتر زمین چودھری اشرف کی ملکیت تھی۔ ان زمینوں کے ساتھ ہی اس کے سالے اور سوچی کی زمینیں تھیں۔ اپنی زمینوں کی حدود میں ہی اس کی رہائش گاہ بھی تھی جہاں وہ اپنے دونوں بیٹوں اشرف، اختر ان کی بیویوں اور دیگر اہل خانہ کے ساتھ رہتا تھا۔ چودھری اشرف کا نمائندہ ماسٹر آفتاب کو اسی جانب لے جا رہا تھا۔ منزل پر پہنچنے کے بعد اسے لے جانے والے نے ماسٹر آفتاب کی آمد کی اطلاع اندر بھجوائی۔ فوراً ایک خانہ زاد اسے اپنے ساتھ اندر ایک بڑے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ ملازم کے انداز میں احترام تھا۔ اپنے ساتھ ہونے والے سلوک نے آفتاب کے اس ضد کو کم کر دیا کہ وہاں اسے دماغ درست کرنے کی نیت سے بلایا گیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد چودھری اشرف ایک تقریباً چار سالہ بچے کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو آفتاب کے باقی

ماندہ خدشات بھی ختم ہو گئے۔

”یہ میرا بیٹا منور ہے۔ بہت ذہین بچہ ہے۔ اللہ نے تین بیٹیوں کے بعد مجھے یہ بیٹا دیا ہے۔ اس لیے اس میں ہم سب کی جان لگی رہتی ہے۔ بچے کی ماں اسے اپنی نظروں سے دور نہیں کرتا چاہتی ہی ہے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ ابتدائی چند سال اسے گھر پر ہی تعلیم دی جائے۔ میں چاہتا تو اس متعدد کے لیے شہر سے کسی استاد کو بلاوا سکتا تھا لیکن سننے میں آیا ہے کہ تم بھی اچھے خاصے لائق آدمی ہو اس لیے سوچا پہلے تمہیں ہی آزما کر دیکھ لیں۔ کل سے بچے کو پڑھانے آجاتا۔ میرا ڈرائیو جہیں لے کر آتا چھوڑنے چلا جائے گا۔ اگر ہم تم سے مطمئن ہو گئے تو تمہاری ملازمت بھی ورنہ ہر شہر سے کسی دوسرے استاد کو بلا لیں گے۔“ چودھری اشرف نے ایک صوفے پر پھیل کر بیٹھے ہوئے ایک سی سانس میں سب بات کہتے ہوئے آفتاب کو حکم سنایا۔ اس کا یہ چھامنا انداز آفتاب کو بہت برا لگا۔ **اول تو وہ گھروں پر جا کر بچوں کو تھن دینا پسند نہیں کرتا تھا دوسرے پر حیثیت استاد اس کی نظر میں اس کا اپنا ایک مقام تھا۔ اس مقام اور عزت کو خاطر میں لانے بغیر چودھری اشرف اس پر یوں حکم چلائے، اسے بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ غصے اور جوش کی کیفیت میں اس کے ہونٹ اس حکم پر انکار کرنے کے لیے کھلے سین بھر پانچا کی اسے ہوش آگیا۔ اسے یاد آ گیا کہ اسے اسی شہر پارنے چودھری اشرف سے براہ راست تصادم کے بجائے مصالحانہ حکمت عملی سے کام لینے کی بات کی تھی۔ چودھری اشرف چودھری اشرف کا دام تھا۔ اس سے تصادم کا مطلب چودھری اشرف سے تصادم تھا۔ چنانچہ مصلحت پسندی کا تقاضا یہ تھا کہ آفتاب، چودھری اشرف کو انکار نہ کرے۔ چودھری اشرف کی بات مان لینے سے اس کی حویلی تک رسائی ہو جائی۔ ممکن تھا کہ وہ چودھری اشرف کو اپنا ہم خیال بنانے میں کامیاب ہو جاتا اور کچھ نہیں ہوتا تو کم از کم اتنا تو ہوتا کہ اسے منور کے نام اس پیارے سے بچے کی تعمیر و تربیت کا موقع مل جاتا۔ آفتاب احمد استاد کے کردار کی اہمیت سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ وہ اپنی کوشش سے اس بچے کو ذہن کے معصوم بچے کی سوچوں کا رخ اس طرح موڑ سکتا ہے کہ انے والے وقت میں وہ اپنے آپ داد اور نانا کی روش سے بہت کچھ مل سکے۔ اسی چھوٹی سی امید کے سہارے اس نے انکار کے غصے کو اپنے ہونٹوں پر نہ آنے دیا اور چودھری اشرف سے ہاتھ بٹھک دیا۔ وہاں سے فارغ ہو کر وہ ڈرائیو کے ساتھ واپس اپنی رہائش گاہ پر پہنچا تو اس کا سامنی استاد اس کا کندہ ہو کا کندہ ہوا تھا**

بچے نے حیران پریشان کھڑا تھا۔

”کیا ہے آفتاب؟“ آفتاب احمد کو دیکھتے ہی اس نے سوال کیا۔

”کچھ نہیں۔ میں خوش ہوں، وہم کا شکار ہو گیا تھا۔“ آفتاب احمد نے اس کے ہاتھ سے کاغذ لیا اور توڑ موڑ کر ریزی کی ٹوکری میں بھینکنے کے بعد بٹھنے لگا۔

”اچھا، وہم تھا۔ میری تو جان ہی لگی تھی۔ اگر تم اس وقت نہیں آتے تو میں تھوڑی دیر میں کہیں پر مدد مانگنے لگتا کھڑا ہوتا۔“ اس کا سامنی تھا ہوا۔

”جسٹہ دو پار کیا کروں، میں بھی ایک عام سا آدمی ہوں اس لیے بھی کچھ جانتا ہوں۔“ آفتاب احمد نے اس کا شانہ شہتہا اور اپنی کرسی پر بیٹھ کر کھم سنبھال لیا۔ اسے اپنا ادھر کا کام ہی مل کر تھا۔

☆☆☆

”چودھری صاحب اس صور کے دن قریب آ رہے ہیں۔ لاہور والی کو بھی میں اس کے رہنے کا بندوبست کر دیتی۔“ چودھری اشرف کو فارغ دیکھ کر بڑی چودھری اس کے پاس پہنچ آئی اور دعا بیان کیا۔ چودھری اشرف کے خاندان میں رواج تھا کہ جس عورت کی ڈیوہری کے دن قریب آتے اسے لاہور میں واقع چودھری اشرف کی کوئی منجھل کر دیا جاتا تا کہ بروقت اسپتال پہنچ کر بہترین طبی سہولتوں سے فیض یاب ہو ایا سکے۔ اس طرح حویلی کے کینوں کو کسی قسم کے نقصان کا احتمال نہیں ہوتا تھا۔ اپنے لیے یہ بندوبست کرنے کے بعد وہ لوگ اس فرض سے **فائل ہو گئے تھے کہ گاؤں میں مناسب طبی سہولیات فراہم کی جائیں۔ اسکول کی طرح اسپتال کی تعمیر میں بھی کسی کو کچھ نہیں تھی۔ گورنمنٹ کی طرف سے برسوں پہلے ایک چھوٹی سی ڈسپنسری قائم کی گئی تھی لیکن اس ڈسپنسری میں نزلے زکام اور بخار کی چند گولیوں کے سوا کچھ نہیں ملتا تھا۔ کئی سالوں سے کسی کو ایٹا پیڈ واک کرنے اس ڈسپنسری میں قدم نہیں رکھا تھا۔ ایک کہا کہ وہ تھا جو اپنی سوچہ بوجھ کے مطابق ضرورت پڑنے پر لوگوں کو یہ دوا میں دے دیتا تھا۔ کچھ گاؤں کے لوگوں میں ڈاکڑی ملاج کے لیے اتنی زیادہ پسندیدگی بھی نہیں تھی۔ ڈاکڑی کے مقابلے میں وہ حکیم سے علاج کروانے یا دو پند کرتے تھے لیکن بعض ناکم معاملات میں ڈسپنسری کا کچھ اور ڈاکڑی کا کچھ نہیں ملتا تو کوئی مددگار نہ پاتے تھے۔ خصوصاً عورتوں کے کمیز میں گاؤں میں موجود دوا دکانیاں ہی سارے معاملات سنبھالتی تھیں لیکن جہاں معاملہ ایسا ہوتا کہ آپریشن ضروری ہوتا وہاں یہ**

دکانیاں بے بس ہو جاتیں اور انجیام عورت کے لیے کس و دردناک موت پر ہوتا جسے ان کے ورثہ کا ذکر لکھا کچھ کچھ قبول کر لیتے۔ گاؤں کی تقدیر پر پڑا جن لوگوں کے ہاتھوں میں تھا، وہ اس سلسلے میں چکر کرتا ہی نہیں چاہتے تھے۔ ان کے لیے یہی کافی تھا کہ ان کے گھر کی عورتیں اور ان کی ہونے والی اولاد میں محفوظ ہیں۔ گاؤں شہری سہولیات سے عاری تھا تو کیا تھا وہ خود اپنے لیے تو ہر طرح کی سہولیات حاصل کرنے پر قادر تھے۔ جیسے اس وقت بڑی چودھری ان کے صوبہ کے سلسلے میں بات کی تھی۔

”ٹھیک ہے، میں کوئی فون کر دوں گا۔ وہاں ملازم سارا بندوبست کر دیں گے۔ یہاں سے کون جائے گا صوبہ کے ساتھ؟“

”ابھی تو میں رانی اور اس کی ماں کو بھجوا رہی ہوں۔ دونوں ماں بیٹی بڑی خدمت گزار ہیں۔ صوبہ کا ابھی طرح خیال رکھیں گی۔ میں اور تاجپا ایک آدھ دن پہلے چلے جائیں گے۔ یہاں حویلی کو چھوڑ کر زیادہ دن تک باہر بھی تو نہیں رہا جاسکتا۔ ان کی کینوں کے سر پر سوار نہ رہو ورنہ چھاپٹ ڈالنے ہیں ڈرامے دونوں میں۔“ بڑی چودھری ان کے جواب دیا۔

”ہوں... ابھی بات ہے۔ تم لوگوں کو کوئی آٹھ گھنٹہ تکلی رکھنی چاہئیں۔ عرس والی رات دیکھا نہیں تھا کہ ڈراما ہی بے خبری نے کتنی تباہی عاید کی تھی علم ہوتا کہ وہ اس خصلت کا ہے تو نوکر دوں کو منع کر دیتا کہ اسے شراب وہاں نہ پہنچائیں۔ ڈراما بات بھی لیکن اس کی وجہ سے ابھی خاصی مشکل پڑی۔“ چودھری اشرف کو وہ کہہ کر حویلی میں ہونے والا حادثہ یاد آتا تھا۔

”ابھی جی چودھری صاحب! اس دن کی کئی نظری ملک گئی حویلی کو۔ سارے کام اتنی ابھی طرینے سے ہوئے تھے کہ حاسدوں کو انکی اٹھانے کا موقع نہ مل سکا۔ ان کا بچہ حسدی کھا گیا موتی والا کے بٹے کو... بلکہ جیسے توڑے کے کٹیں کسی نے جان بوجھ کر آپ کو مشکلی میں ڈالنے کے لیے یہ تو اس لڑکے کے کمرے میں آگ نہیں لگوا دی؟ کچھ معلوم تھوڑی ہوتا ہے کہ کئی کا۔ جہن بن کر چپے میں جھپکھنچ رہے ہیں لوگ۔“ چودھری کی بات سن کر بڑی چودھری ان کے اپنے خیالات کا اعتبار کیا۔

”نہ بندہ رکھو بے وقوف عورت!! ابھی تک جو بات کہنے کی کسی کی امت نہیں ہوئی، وہ تو لوگوں کے ذہنوں میں ڈال دی۔ حاسدے کا اڈرامہ لڑکے کے سر پر ہے اس میں عاری بھلائی ہے۔ اگر موتی والا کو یہ خیال آگے کہ اس کا بیٹا میری

کسی دشمنی کی سمجھت چٹا چاہے تو وہ اور بھی زیادہ کے گا۔
چودھری افتخار نے بڑی چودھرائی کو بھانڈا۔

”برانہ ماہیں چودھری صاحب! میں تو بس بے خیالی
میں ہی ایسی بات کہہ کر گیا۔“ بڑی چودھرائی نے چودھری
افتخار کا مودہ خراب ہوتے دیکھ کر فوراً معذرت کی۔

”جب کھوپڑی کے اندر بھیجا نہیں ہے تو کیوں ہر
معاملے میں دخل دیتی ہو۔ منہ بند کر کے یوں نہیں دیکھا تا تم
ہے۔ ویسے بھی عورت ذات کو کیا ضرورت ہے مردوں کے
ان معاملات میں بونے کی؟ تم میں کچھ کرکھو لی کے اندر کے
معاملات دیکھا کرو۔ تم سے یہ معاملات ہی مشکل چاہیں
بہت ہے۔ باقی سب دیکھنے کے لیے میں آپ موجود ہوں۔“
بڑی چودھرائی کی معذرت کے باوجود چودھری افتخار نے اس
کی ٹھیک ٹھاک مچھائی کر دی۔

”دشمنی ہو گئی چودھری صاحب! آئندہ وہی ان دکھوں
گی۔“ بڑی چودھرائی نے ایک بار پھر معذرتی الفاظ ادا کیے۔
”ٹھیک ہے۔ آئندہ زبان کو قابو میں رکھنا۔ اب جاؤ
یہاں سے۔“

چودھری افتخار نے پرعزت انداز میں بڑی چودھرائی
کی معذرت قبول کرتے ہوئے اس کو گھبراہٹ سے بڑی چودھرائی
اس طرح کوٹ کر اپنی جیسے کھڑی ہو گئی لیکن وہاں سے ہی
نہیں۔

”اب کیا ہے؟“ چودھری افتخار نے اس کے وہاں
رکے رہنے پر پھٹے سے پوچھا۔

”ایک بات اور کرنی تھی چودھری صاحب۔“ بڑی
چودھرائی منٹانی۔

”کیا بات کرنی تھی؟“ چودھری تھوڑا دھما ہوا۔
”ہاں بھئی مجھ سے کہہ تھا کہ میں آپ سے کشور سے بھی

لاہور جانے کی اجازت لے لوں۔ بے جہاد پٹی کے لیے
زندگی میں اور تو کوئی روٹی نہیں۔ ذرا حوصلے سے نکل کر کچھ
دلوں کے لیے لاہور چلی جائے گی تو اس کا دل بکس جائے گا۔
پھر صورت پر کوئی مہین کا سہارا ہو جائے گا۔ ملازمین لاکھ خیاں
رکھیں پر مہین کی تو بات ہی الگ ہوتی ہے۔ دونوں نہیں ایک
جگہ ہیں تو دونوں کا ہی دل بھلا رہے گا۔ بڑی چودھرائی
نے مسند پر بیٹھ کر کہا۔

”بل بھلانے کا کیا سلسلہ ہے۔ حوصلی کوئی چھوٹی ہے جو
اسے دیکھو دیکھ کر پتہ نہ کا دل ادب جائے۔ ضرورت کی کسی
چیز کی بھی کمی نہیں۔ کبھی تم لوگ خواہش کرو تو تمہاری مرضی کی
خیرمداری کے لیے تم لوگوں کو کشور بھی بھجوا دیتا ہوں لیکن پھر بھی

شکوے ختم نہیں ہوتے تم لوگوں کے۔ ویسے بھی کشور سے کو
کروٹیل میں ہی دل کاٹنے کی عادت ڈالے۔ اسے رات
جیانی، رات آخری رہے گا۔ اسی حوصلی میں رہتا ہے۔ یہاں
دل نہیں کاٹنے کی تو بہت چھتاتے کی۔“ چودھری افتخار نے
بڑی چودھرائی کی درخواست کے جواب میں غرور بھاری۔

”دوسرے سمجھتی ہے چودھری صاحب! اس کا اپنی دیکھ
باتوں کی طرف کوئی دھیان نہیں۔ بڑے فقیروں کے واسطے ان
کی لڑائی ہے۔ کپڑے لٹے، زبرد مہندی کسی چیز کا شوق نہیں
ہے۔ بس اپنی کڑیوں میں مگن رہتی ہے۔ یہ جو اس کے لہو
جانے کا قصد میں نے آپ کے سامنے چھیڑا ہے، اس کی
فرمائش بھی میرے نام پر ہے۔ اس میں اسلحہ اسلحہ
ایکلی رہنے کے خیال سے کھجاری ہے۔ پھیل پار بھی جب
بچے کی پیدائش ہو لاہور بھی تھی تو یہیں شہر کر رہی تھی کہ گاؤں
سے آئی دور، ان چار چار چکر پر رہنے میں طبیعت بھاری تھی۔
اب اگر کشور ساتھ چلی تو اس کی پریشانی دور ہو جائے
گی۔ ویسے ہی اس دماغ کے دل کو بھراہٹ زیادہ ہے۔ کچھ
کم ہمت ہی ہو رہی ہے۔“ بڑی چودھرائی کو سوت کی بنیادیں
سے محبت آتی نہیں کی لیکن ان لوگوں نے یہ کام اس کے فٹ
لگا تھا تو اس کے پورا ہونے میں ہی اس کی عزت تھی۔ اگر وہ
چودھری افتخار سے یہ فرمائش نہ منوائی تو اس کی اپنی سون اور
اس کی بنیادیں کے سامنے ناک ٹپک ہو جاتی اس لیے وہ اپنی
پوری کوشش کر رہی تھی کہ کسی طرح چودھری افتخار قتل ہو
جائے۔

”ٹھیک ہے اگر صورت پر کی طبیعت کا معاملہ تو بھجوا دو
کشور کو ساتھ۔ لیکن وہی ان سے کچھ بھراہٹ نہیں۔ یہ نہ کہ
شہر جا کر خود کو باطل آزاد سمجھنے لگیں۔“ چودھری افتخار نے
آخر کار ہاری بھری۔

”آپ فکر نہ کریں چودھری صاحب! میں سب کچھ
دوں گی لڑکیوں کو۔“ بڑی چودھرائی، چودھری افتخار کا جواب
سن کر جوش سے ہوئی اور کمر سے ہاتھ نکلی۔ باہر نکلے
ہوئے اس کا اندازہ تھا نہ تھا۔ وہ ایک بار پھر یہ بات کرنے
میں کامیاب ہو گئی تھی کہ حوصلی اور چودھری دونوں پر اس کا
راج سب سے مستحکم ہے۔ بند کمرے کے اندر جو بے عزتی
ہوئی تھی اس کی کسے بھٹک چڑھتی تھی۔ موجودہ فیصلے کی روشنی
میں تو وہ قہر مچ گئی۔

”سراج آباد سے ماسٹر آقا اب آپ سے واقف کے
لے آئے ہیں۔“ شہر یاد اپنے دفتر میں بیٹھا کسی ذلیل کا مطالعہ

کر رہا تھا کہ عبداللہ انان نے اسے اطلاع دی۔

”ٹھیک ہے انکس اندر بھیج دو۔“ شہر یاد نے جواب
دیا۔

”السلام صبح۔“ ایک منٹ کے وقفے کے بعد ستر
آفتاب اس کے کمرے میں تھا۔
”صبح السلام۔“ تحریف رکھیے۔“ شہر یاد نے خوش دلی
سے اس کے سلام کا جواب دیا۔

”بغیر ہر گز آنے پر معذرت چاہتا ہوں۔ اصل میں
میرے پاس فون کی کھوت نہیں ہے ورنہ آئے سے پہلے فون
پر آپ سے اجازت لے لیتا۔ آج لاہور کے سے روانہ ہو رہا
تھا تو سوچا آپ سے بھی مذاقت کرنا ہوا چلا چوں۔ ویسے
مجھے اندازہ ہے کہ اس طرف سے وقت آنے سے آپ ڈسٹرپ
ہوئے ہوں گے۔“ آفتاب نے مہذبانہ انداز میں شہر یاد
سے بغیر وقت لے کر معذرت کرتے ہوئے کہا۔

”یہاں کوئی سسٹم ٹھیک ہے آفتاب صاحب! میں اس
سمیت ہر ضروری دھانے کے لیے نہیں بلکہ لوگوں کی خدمت
کے لیے ہی بیٹھا ہوں۔ یوں بھی بے وقت کے مذاقیاتوں سے
خشنے کی اب عادت ہی ہو چکی ہے۔ لوگ بلا مقصد صرف
اپنے غلغلے کے اسی سے تصدیق دے دھانے کے لیے بھی
یہاں چلے آتے ہیں۔ آپ کی آمد کے بارے میں تو مجھے
معلوم ہے کہ یہ سب مقصد نہیں۔ آپ جس مسئلے کے حل کے
لیے آتے ہو اسے سے درخواستوں پر درخواستیں بھیجتے رہے
ہیں اب اس کے حل کی کچھ امید نہیں ہے تو آپ کا یہاں آنا
اور اس بارے میں پوچھنا بالکل جائز ہے۔“ شہر یاد نے
سکراتے ہوئے ماسٹر آفتاب کی بات کا جواب دیا۔

”آپ نے میری آمد کے بارے میں کافی درست
اندازہ لگایا ہے۔ اصل میں اسکوں کو ترقی دینا اور علاقے کے
بچوں کو تعلیم کے ذریعہ سے آگاہ کرنا میرا خواب ہے۔
ملازمے ملک کی ستر فیصد سے زیادہ آبادی دیہاتوں میں آباد
ہے اور بے شمار دیہاتوں میں تعلیم کو کوئی مقبول بندوبست ہی
نہیں۔ جب بچے چارہائیں گے نہیں تو ملک کا مستقبل کیسے
سنو رہے گا۔ یہ علم ہے اور یہی تو ہے کہ ہم پاکستان کے قیام
کے آٹھ برس بعد بھی اتنی ترقی نہیں کر پائے جتنی ہمیں کرنی
چاہیے تھی۔ یہ حیثیت ایک پاکستانی کے، میری خواہش ہے کہ
میں ازم اس ایک علاقے میں تو تعلیم کی روشنی بکھلا دوں۔
پھر اس سے چراغ بجائے گا سلسلہ خودی شروع ہو جائے گا۔“
ماسٹر آفتاب نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔
”مجھے آپ کا طرز فکر بہت پسند آیا۔ آپ کی اس

اہمیت کا میں نے کبھی مذاقت نہ کی اندازہ لگا کر تھا لیکن
ہت وی ہے کہ میں چاہتا ہوں ہر راستہ تمام کے بغیر
بات بن جائے۔ ہر کار کی حکم جاری کرنا اتنا مشکل نہیں لیکن
میرے ڈائریکٹ آفیشن لینے کو چودھری افتخار ملے جگہ کچھ
گا۔ فی الحال تو میں نے اس معاملے میں انہیں اس لیے بھی
زیادہ نہیں چھیڑا کہ اگلی دو اپنی حوصلی میں موتی والا کے بیٹے
کی موت نا وجہ سے پریشان ہے لیکن آپ فکر نہیں کریں۔
آپ کا اسکول ضرور ترقی کر کے رہے گا۔“ شہر یاد نے ستر
آفتاب کو تسلی دی۔

”میں پرکاش ہو جائے تو مجھے سونپ جائے گا ویسے
آپ اطمینان رکھیں، مجھے آپ کی دیکھ پر کوئی اختلاف نہیں
ہے بلکہ میں خود بھی اس پر عمل پیرا ہوں۔“ چودھری افتخار
کے داہرے چودھری اشرف نے مجھ سے اپنے بیٹے کو بڑھانے کا
کہا ہے۔ ذاتی طور پر ہر جا کر شیوہ دینے کو تیار ہونے کے
وجود میں نے چودھری اشرف کی ہت اس لیے مانا کہ
میرے انکار کو بغاوت سمجھتے ہوئے دھمکے سے دشمنی نہ پال
لے۔ اپنی ذات کے نقصان کے لیے مجھے کوئی پروا نہیں لیکن
اسکوں کی مجھے بہت گھر ہے۔ میں درمیان سے ہٹ گیا تو دوسرا
کوئی یہاں نہیں تھے والا مشکل سے ہی آئے گا۔“

”آپ نے بہت اچھا فیصلہ کیا۔ فی الحال، ہمیں اسی
طرح کی مصلحت پسندی سے کام لینا ہوگا۔“ ماسٹر آفتاب کی
بات سن کر شہر یاد نے اس کے فیصلے کی ہمت کی پھر چرموٹی
انداز میں پوچھا۔ ”آپ سمجھتے ہیں اس کے لیے وہاں سے
محتاجی جتنے میں آپ کی دوستیاں وغیرہ تو ہیں؟“

”بہت زیادہ تو نہیں ہیں۔ اصل میں، میں ذرا ایک
ٹھٹھک رو کر خانوشی سے کام کرنے والا ہوں۔ لوگوں
سے ملتا ہوں لیکن بہت زیادہ بے تکلف نہیں ہوتا۔ صحافیوں کی
گروپ بندیوں اور خاص افراد، اداروں پر ہتھیاروں سے
بھردوریاں بھی پسند نہیں آتیں۔ لوگ سمجھنے کے مقدس چپے
میں دھرم بھی منافقت نہروں کا مظاہرہ کرتے ہیں اس لیے
میرے میں جتنے سے چند ایک افراد سے نہ قریبی تعلقات
ہیں۔“ ماسٹر آفتاب نے جواب دیا۔

”ان چند ایک افراد میں سے کوئی آپ تو ایسا ہو گا جو
آپ کے کہنے پر جہاد کی صورت حال پر غم اٹھائے گا۔“
ماسٹر آفتاب کا جواب سن کر شہر یاد نے دوسرا سوال اٹھا دیا۔
”بالکل، میرا ایک دوست ایسا ہے جو بڑے کستہ پر یہ
کام کر دے گا لیکن میں کسی اور سے کیوں کہ اس میں خود بھی
یہ کام کر سکتا ہوں۔ پہلے ہی ڈھکے چھپے انداز میں یہاں کے

مسائل کی نشان دہی کرتے رہا ہوں۔

”آپ کے پچھلے کالمز میں نے دیکھے ہیں لیکن میں چاہ رہا ہوں کہ اب آپ یہ کام نہ کریں۔ آپ کو مصافحت کے ساتھ ساتھ یہاں وہ کرشمی کام کرنا ہے۔ بار بار اگر آپ یہ اس سلسلے میں لکھتے رہے تو چودھری افتخار آپ کی کھونٹ میں لگ جائے گا اور میں نہیں چاہتا کہ اسے قیمتی شخص کا نقصان برداشت کروں۔ آپ بے شک لکھنے کے لیے کافی نام استعمال کرتے ہیں لیکن جب کوئی کھونٹ لگانے پر آمادہ نہ ہو اس کے لیے اصل بندہ ہے۔ نہ کہ پچھتاہٹیں رکھتا۔ اب تو یوں بھی آپ کی کتاب چھپنے والی ہے۔ کتاب کے بعد آپ لوگوں کے لیے اور بھی زیادہ نمبریں برپا جائیں گے۔“ ماسٹر آفتاب کا جواب سن کر شہر یار نے اپنی انجی بات کی وضاحت دی۔

”اگر آپ کی بیکار دے ہے تو فحک ہے۔ میں اپنے صحافی دوست سے بات کر لوں گا۔ وہ کافی متبادل صحافی ہے اور کچھ لکھنے سے شہرتا نہیں ہے۔ اپنے کچھ کی وجہ سے بے چارے کو اکثر دھمکیاں اور بھیجی بھی باندھنا کہ شکار ہونا پڑتا ہے۔ میں ہر آداب سلسلے میں کالم لکھنے کی فرمائش کروں گا کہ وہ انکار نہیں کرے گا۔ بس آپ یہ بتا دیں کہ کالمس نوعیت کا ہونا چاہیے اور اس میں کتنے نکات پر زور دے رہا ہے تاکہ میں اپنے دوست کو ریفر کروں۔“ ماسٹر آفتاب کے پوچھنے پر شہر یار دھمی آواز میں اسے اپنے ذہن میں موجود تجاویز کے متعلق سمجھانے لگا۔ شہر یار کی ہر برکت کو گور سے سنتے ماسٹر آفتاب کا سر جو اب مسلسل اٹھالی انداز میں حرکت کرتا رہا۔

☆ ☆ ☆

”سلام چودھری صاحب!“ غیاث محمد اور نوران نے ہاتھ جوڑ کر چودھری افتخار کو سلام کیا جس کا جواب دینے کے بجائے چودھری افتخار بے نیازی سے حقہ گڑا ان رہا۔ شہر کی محفلوں میں اور سفر کے دوران وہ زبردہ تھکا گیا۔ استعمال کرتا تھا لیکن حریف میں ہونے کی صورت میں اسے حتیٰ سب سے زیادہ محبوب تھا۔ اس وقت بھی اپنے محبوب سنے کے ساتھ مصروف وہ نوران اور غیاث محمد کو باریابی کی اجازت دینے کے باوجود بالکل خاموش کیے بیٹھ تھا۔ نوران اور غیاث محمد جو پہلے ہی بہت ڈرستے ڈرستے وہاں آئے تھے، چودھری کے اس انداز کو دیکھ کر سلام کے بعد زبان سے ایک نقطہ بھی حیران دہش کر گئے۔ وہ جس متعدد کے لیے آئے تھے اس کو بیان کرنے میں دینے ہی ان کی زبانیں تالو کے ساتھ لگی جاری تھیں مگر ضرورت ایسی تھی کہ یہاں آکر بیان کیے

بغیر کوئی پتہ نہ بھی نہیں بننا تھا۔ زہر کے سہ سال والوں نے بتا دیا تھا کہ رب نواز وہی پندرہ دن بعد گاؤں چلیے۔ وہاں سے رب نواز بہت کم دن کی چھٹیوں پر ہر پانچواں دن آئے۔ یہی شادی کی تقریبات کا قازق ہو چکا تھا۔ دوسرے نوران اور غیاث محمد کے پاس تیاری کے لیے کوئی نہ رہا۔ یہی نہیں تھا۔ ان کا سارا اٹھارہ چودھری افتخار کی طرف سے قرض کی فراہمی پر تھا۔ رب نواز کے گاؤں چلیے کی خبروں کا انہیں پہلے بھی اندازہ تھا اور وہ ارادہ رکھتے تھے کہ عرس کے فوراً بعد چودھری افتخار کی خدمت میں حاضر ہو کر اس سے قرض طلب کریں گے۔ عرس کے بعد کے عرس میں چودھری افتخار کا مزاج خاصا خوش گوار ہو جاتا تھا۔ پھر نوران اور غیاث محمد کے پاس اپنی جوتی کے لیے انجام دہی کی خدمات کا حوالہ بھی موجود ہوتا۔ انہیں یقین تھا کہ وہ چودھری افتخار کو اس کے مرحوم دادا کا واسطہ دے کر اس سے قرض حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن عرس کے بعد جو صورت حال بن چکی تھی۔ حریف میں ہونے والے حادثے نے چودھری افتخار کا مزاج اتنا برہم کر دیا تھا کہ نوران اور غیاث محمد اسے پاس آنے کی ہمت ہی نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن اب تو شادی بالکل دن کے سر پر ہو چکی تھی اور حریف میں ہونے والے حادثے کو بھی کافی دن گزر گئے تھے اس لیے ڈرستے ڈرستے ہی آگئی۔ چودھری افتخار کے سامنے آنے کی ہمت کر بیٹھے تھے۔ لیکن اب جیسے ساری ہمت سب ہوئی تھی اور وہ دونوں جس وجہ جوڑے اور فکریں بھگاتے چودھری افتخار کی نظر انداشت کے منتظر بیٹھے تھے۔

”اب بھی غیاث محمد اول کیا بات ہے؟“ آخر چودھری نے جتنی کی تے ہونوں سے جدا کر کے بائیں جانب ہاتھ باندھ کر عرس کے منتظر کھڑے موقوفہ مازم کو کھنکی اور ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوا۔

”آپ کی رعایا ہوں سرکار! مشکل میں ہوں اس لیے مدد مانجئے آپ کے پاس آیا ہوں۔“ غیاث محمد نے نہایت عاجزی سے اپنی بات شروع کی۔ چودھری افتخار نے ہاتھ بولے سوائے نظروں سے اس کی طرف نہ بٹھارہا۔

”میری دھی کا کیا ہوا پھر کڑا ہے سرکار! دھی بیانیے کے لیے چار چھٹیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ میرے پاس ایک دھیلا بھی نہیں۔ میں تو اس بات بھی نہیں کر سکتا۔“ غیاث محمد نے جوڑے سے ہاتھ نکال کر دھڑکے دھڑکے آگے کی قوت برائیوں کی خاطر مدد ادا کیے کروں گا؟ آپ آپ کی کامیابی ہے۔ آپ اپنا ہاتھ رکھ دیں میرے سر پر تو میں غرت سے دھی

بھاؤ دوں گا۔“ غیاث محمد نے ہاتھ جوڑے ہوئے ہی اپنا ہاتھ بیان کیا۔

”جتنے کی تے ہے غیاث محمد! اتنا سمجھتا ہوں آپ دھی سے کھانا پان کے کھجوا رہا ہے۔ اس کے مال سے یہ کھڑے ہیں لیکن ان کی دھی اور فرخ بھی لا رہا ہے۔ تیسرے بھائی کا کھڑے ہو کر پانڈے سے جڑوں سے۔ جتنے کی ضرورت ہوتی ہے یہی کو چیز دینے کی۔ خالی ہاتھ بھی بھیجے گا تو وہاں جا کر پیش کرے گی۔“ چودھری کا لہجہ بڑھ رہا تھا۔

”وہ الگ بات ہے سرکار! یہ ہمیں تو زمانے کی ریت بھائی ہے۔ دھی کو بالکل خالی ہاتھ بھیج کر کش اس کا سر سال میں نہیں بھجوا سکتے۔“ جیسے وہ میرے بھائی کا کھڑے ہیں میری دھی کے لیے تو اس کا سال اس ہی ہوگا۔ بہت نڈکی پر دو چار چھڑیں تو میں نے اسے جیسے کہ نام پر دیتی ہی ہوں کی پھر برات پر وہ ہوں کی خاطر مدد ادا کر کے لیے بھی تو کچھ چاہیے۔ آپ ہم پر کرم کریں سرکار! آپ تو دھی رقم بھیجے قرض دے دیں تاکہ میں غرت سے اپنی دھی بڑھ سکوں۔“ غیاث محمد گڑا گیا۔

”تو دھی کی رقم قرض دے دوں؟“ میرے پاس کوئی نوٹوں کے درخت تھے ہوتے ہیں جن سے نوٹ توڑ توڑ کر میں تمہارا بار وقت بھلی ہوئی چھٹیوں میں ڈالنا چاہوں؟“ چودھری نے بھائی کے چاہ پر ہی تم نے اس طرح دھڑک کر قرض لینا تھا۔ دو سال ہو گئے۔ ابھی تک آدھا قرض بھی ادا نہیں کیا اور اب دو بار دھڑک کر قرض مانگتے ہو۔“ غیاث محمد نے ہاتھ بڑھ کر غرت سے قرض لینا چاہا۔

”نہیں! ابھی غیاث محمد! یہاں سے بھائی کے کہ اپنے پچھلے حساب کتاب سے اب دیکھ کر شہر یار کے حوالہ دینے کے لیے چلے آتے ہو۔ یاد ہیں۔“ پچھلے چھوڑا حساب بے باقی کر دیا اور قرض کی بات کرنا۔“ چودھری نے رنجت سے غیاث محمد کو پکارتے ہوئے اپنا فیصلہ بتایا۔

”مجھ پر رحم کریں۔“ ابھی آپ کی پانی پانی آج دوں گا۔ میں اس قرض سے کے بدلے ساری حیاتی آپ کی خالی کروں گا، بس ابھی آپ میری مدد کریں۔“ غیاث محمد نے چودھری افتخار کے حریف پر ہر دھڑک دیا۔

”میرے بہت۔“ میرے پاس تیری یہ نوسہ نہیں دیکھنے کا وقت نہیں۔“ چودھری افتخار نے غیاث محمد کے سر پر اپنے ہاتھ سے ٹھوک لگاتے ہوئے اسے دور بٹھایا۔

”آپ کو میری سرکار کا واسطہ چودھری صاحب! آپ ہم غرتوں کو خالی ہاتھ دواؤں نہ دلاؤں گے۔ میں نے عرس والے دن اپنا چھوڑا سرکار کی قبر پر چڑھا کر منت مانجی تھی کہ میری سرکار

میری دھی کے بیاہ کے لیے بندہ دست کرادیں۔ اب تو پھر سرکار کا خون ہیں چودھری صاحب! آپ ان کے نام کی لاج دیکھ لیں۔ ہم نے تو سنا ہے کہ میری سرکار کی درگاہ پر جتنی منت بھی دیکھیں ہوتی۔ ان کے دربار سے سب کی مرادیں پوری ہوتی ہیں۔ وہاں سے سب اپنی بھولیاں بھر کر لکھتے ہیں۔ پھر ہم میری سرکار کے سامنے والے اور آپ کی رعایا ہو کر کیسے نامراد رہ سکتے ہیں۔“ نوران جو اب تک خاموش بیٹھی رہی تھی، زبانیں دینے لگی۔ اس کی ان دہائیوں کو سن کر چودھری افتخار کے کان کھڑے ہو گئے۔ نوران کا یہ حوالہ ایسا بھی تھا کہ اسے نظر انداز کیا جا سکتا۔ یہ عقیدت مندی کے استحکام کا معاملہ تھا۔ اگر نوران اور غیاث محمد نے ان کی کوئی منت مانجی تھی تو اب اس کا پورا ہوا ضرورتی تھا۔ وہ ان کی حقیقت مندی میں کمی آگئی تھی۔ دیکھ بھی چودھری افتخار غیاث محمد کی درخواست کو رد کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ وہ بس اسے اپنے دہائیوں سے لے رہا تھا۔ منکھوتے ہی حراؤں کی حاجت پوری کر دیتے ہیں اس کی چودھراہٹ کا رعب قائم نہیں ہوتا تھا۔ بھکاری کا لطف تو اسی وقت آتا تھا جب اپنے زیر عمل افراد کو چودھری طرح خاک میں ملا دیا جائے اور ان کی جلی ہوئی عزت ٹھکر کی لاش پر سینہ تان کر پھینک دی کی جائے۔

”فحک ہے، تم نے پھر دادا کا واسطہ دیا ہے تو اب ہم جیسوں خالی ہاتھ نہیں لو سکتے۔ کچھ کر سکتے ہیں تو تم لے جانا۔ وہ کاغذ پر تمہارا انگوٹھا لگوا لے گا۔“ آخر چودھری افتخار نے نوران اور غیاث محمد کو گڑا دیا۔

”میری بھائی سرکار! یہ دھی میری بھائی۔ اللہ بک آپ کی تسلیوں پر اپنا کرم کرے۔“ چودھری افتخار نے دھمکی دینا تک تو کر رہا ہے۔ یہ سرکار کی چھاؤں میں آپ سدا بھٹکتے پھرتے رہیں۔“ درخواست کی منتوری کی خوش خبری سنتے ہی نوران نے دعاؤں کی پوچھا کر دی۔ غیاث محمد جو چودھری کی ٹھوک سے قرض پر گڑا تھا، وہ بار دھڑک کر اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بیٹھ گیا۔

”اب بس فحک ہے زیادہ چال چلی نہ رہو۔ پھر دادا کے نام پر قرض سناں رہا ہے لیکن تم لوگوں کو اس کی پانی پانی چکانی ہو گی۔ یہ نہ ہو کہ اس قرض کی ادائیگی سے پہلے میری جلی کے لیے دامن پھیل کر میرے سامنے آجیو۔“ چودھری افتخار نے بے زاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بھائی سے وہ باتو کا ذکر کیا۔ اس رات ماہ بانو کے بچے لکھنے کا یہ بڑا مال تھا۔ اچھا خاصا وہ اسے قلموں پر چکا تھا کہ حادثے کی خبر سن کر بدحواس ہو گیا۔ جدی میں اسے یہ خیال بھی نہ رہا کہ ماہ بانو کو

شیطان چمک کود کچھ کر دھک سی رہ گئی۔ اسے یک دم ہی ماہ بانو کا عرس والی رات آخر حالت میں آخری پہر گھر لوٹنا یاد آیا۔ بہت دنوں سے جو سوال اس کے ذہن میں اٹکا ہوا تھا، اس کا جواب اس نے چودھری افتخار کی آنکھوں میں پالیا۔ اس جواب کو پا کر وہ کانپ اٹھی۔ چودھری کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ ایک بار ہاتھ سے نکل جانے والے شکار کو دوبارہ اپنے جڈوں میں دیو پچنے کے لیے بے تاب ہے۔

☆☆☆

”آپ! مجھے بازار جانا ہے۔ بچہ کی بچی سے میں نے کہا تھا کہ میری کتابیں خیال سے گاڑی میں رکھو دینا لیکن اس کام چور نے کتابیں رکھی ہی نہیں۔ کتابوں کے بغیر تو میرا گزارہ ہوتا مشکل ہے۔ ویسے ہی یہاں اتنی بوریٹ ہے۔“ ریوٹ ہاتھ میں لیے، بستر پر درازنی دی کے چیمبل پر چٹن بدلتی صورت کے قریب بیٹھے ہوئے کشور نے اسے اپنا مسئلہ بیان کیا۔

”چھوڑو کتابوں کو۔ ہر وقت فضول کتابیں چائے میں وقت برباد کرتی رہتی ہو۔ ٹی وی دیکھو اتنے مزے مزے کے پروگرام آتے ہیں ٹی وی پر۔ ادھر گاؤں میں تو اس سوتے ہوئے ٹی وی کے علاوہ کچھ دیکھنے کو ہی نہیں ملتا۔ یہاں دیکھو کتنے دھیر سارے چینل آتے ہیں۔ ہمیں کوئی فلم دیکھنی ہو تو وی سی آر پر کیسٹ لگا کر دیکھنی پڑتی ہے۔ یہاں ایک وقت میں سچہ سچہ جگہ سے فلمیں آ رہی ہوتی ہیں۔ ڈرامے بھی اتنے مزے مزے کے ہیں۔ میں تو ان ڈراموں کی عورتوں کے کپڑے اور زیورات اچھی طرح ذہن میں بٹھا رہی ہوں۔ ذرا فارغ ہو جاؤں تو بعد میں یہاں آ کر اپنی پسند کی سادہ چیزیں خریدوں گی۔ تم بھی ذرا میرے ساتھ بیٹھ کر کپڑوں کے ڈیزائن وغیرہ اچھی طرح دیکھ لو تاکہ اگر میں کچھ بھول بھی جاؤں تو تم یاد دلا دو۔“ کشور کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے صورت نے اس سے کہا۔

”آپ کو معلوم ہے آپا کہ مجھے ان چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ نہ مجھے کپڑوں اور زیورات کا شوق ہے اور نہ ہی مجھے یہ ڈرامے اور فلمیں کچھ خاص اچھی لگتی ہیں۔ اس لیے مجھے تو آپ معاف ہی رہیں۔“ صورت کے مشورے پر کشور نے بے زاری کا اظہار کیا۔

”تمہارے نزدیک تو تمہاری کتابوں کے سوا دنیا میں سب کچھ بے کار ہے۔ ابا جی کی شہری بیوی مرتے مرتے تمہیں اچھا مرض لگا رہی ہے۔“ صورت اس کی بے زاری پر چڑی۔ ”مرض نہیں لگایا انہوں نے مجھے۔ وہ تو مجھے پاگل

اپنے فتنے میں جکڑے رکھنے کا بندوبست کر کے جاتا۔ اس کی اس عقل کا فائدہ اٹھا کر ماہ بانو فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی۔ بعد میں بھی وہ دو تین دن تو شہر میں ہی مصروف رہا اور اس مصروفیت میں اسے ماہ بانو کا دھیان نہیں آ سکا۔ ذرا فرصت کی تو ماہ بانو گاؤں سے جا چکی تھی۔ چودھری افتخار ہاتھ مٹا رہ گیا لیکن اسے معلوم تھا کہ ماہ بانو کا حصول اتنا مشکل نہیں۔ وہ جاپتا تو اسے فیصل آباد سے بھی اٹھا سکتا تھا مگر ابھی دوسرے معاملات زیادہ توجہ طلب تھے اس لیے اس نے وقتی طور پر ماہ بانو کا خیال دل سے نکال دیا تھا۔ اس وقت نوران اور غیاث محمد کو اپنے سامنے پا کر اسے ماہ بانو ایک بار پھر یاد آ گئی اور وہ اس کا ذکر چھیڑ بیٹھا۔

”تیسری کی بجے کوئی فکرمیں ہے۔ اس کو اس کے خالہ خالو نے پالا ہے، وہی اس کے بیاہ کی فکر کریں گے۔ میرے ذمے تو بس ان دو بیٹیوں کا ہی بوجھ تھا۔ ایک کو آپ کی مہربانی سے پہلے ہی نٹنا چکا ہوں، اب دوسری بھی آپ کے ہی کرم سے اپنے گھر بار کی ہو جائے گی۔ اس کے بعد تو بس بیٹا ہے، وہ اپنے زور بازو پر آپ کی خدمت کر کے اپنے لیے خود بندوبست کر لے گا۔“ غیاث محمد نے عاجزی سے جواب دیا۔

”تیسری سالی اور اس کا شوہر تو شہر میں رہتے ہیں۔ میں ایسا نہ ہو کہ وہ تیری کڑی کو کسی شہری لڑکے سے بیاہ دیں۔“ چودھری افتخار نے تشویش کا اظہار کیا۔

”ہم نے اپنی دلی انہیں دے دی چودھری صاحب! اب چاہے وہ اس کے لیے جو بھی فیصلہ کریں۔“ نوران نے چودھری افتخار کی بات کا ہم سا جواب دیا۔

”یہی کیسے کوئی بھی فیصلہ کر لیں گے وہ لوگ؟ اس گاؤں کی کڑی واہیں نہیں آتی چاہیے۔“ چودھری افتخار نے فوراً ہی اعتراض کیا۔

”اگر یہ آپ کا حکم ہے سرکار تو سمجھ لیں ماہ بانو واہیں نہیں آئے گی۔ ہم آپ کی مرضی کے خلاف کچھ بھی نہیں ہونے دیں گے۔“ چودھری افتخار کا موڈ دیکھ کر غیاث محمد نے فوراً خوشہ انداز یہ اپنا کیا کہ نہیں ایسا نہ ہو کہ چودھری ایک بار پھر مجھے سے اکڑ جائے۔

”تم ہماری مرضی کے خلاف کچھ کرنے کی ہمت بھی نہیں رکھتے۔ ماہ بانو کو گاؤں واہیں آنا ہوگا۔ وہ خود سے نہ آئی تو ہم اسے زبردستی لے آئیں گے۔“ چودھری افتخار ماہ بانو کے معاملے میں اس قدر دلچسپی کیوں لے رہا ہے، غیاث محمد اور نوران کی سمجھ میں نہیں آ سکا لیکن جب نوران نے چودھری افتخار کے چہرے کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں نظر آتی

ہوتے ہیں۔ جیسے کہ انتظام کے کئی ہیں۔ میں تو اللہ سے بہت دعا میں کرتی ہوں ان کی بخشش کے لیے۔ اگر آج میرے پاس ان کتابوں کا سہارا نہ ہوتا تو میں کیا کرتی؟“

”اچھا بھل، زیادہ اداں نہ ہو۔ ڈرائیور کو کچھ کر بازار سے کسی کتابیں منگوائے۔“ کشمور کی بات سن کر صنوبر کو فوراً ہی بہن کی بخرو کی خیال آ پڑا اور وہ نرم پڑی۔

”ڈرائیور کو کہیں بھیجتا۔ میں خود جا کر اپنی پسند سے کتابیں خریدوں گی۔“ کشمور نے خند کی۔

”پر کہیں ایسا کیوں دے گا۔ آئے سے پہلے انہوں نے سخت تاکید کی تھی کہ کتابیں نہ خریدیں۔“ صنوبر پچھانی۔

”ابھی پسند کے پڑے لے لینے کے لیے بھی تو ہم لوگوں کو بازار جانے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ تو پھر میں اپنی پسند کی کتابیں خریدنے کیوں نہیں جاسکتی؟ اس سے پہلے بھی تو میں جب بھی آپ لوگوں کے ساتھ بازار کی ہوں، ہمیشہ کتابیں خرید کر لاتی ہوں۔ ابھی نے بھی کوئی اعتراض تو نہیں کیا اور ویسے بھی مجھے کون سا درد جاتا ہے۔ یہاں سے لبرٹی مار کھیت دور ہی تھی ہے؟“ کشمور نے فوراً ہی دیکل دی تو صنوبر کو کس بونا پڑا۔

”اچھا چلی جا۔ ساتھ میں رانی کو بھی لے لینا۔ اور ہاں، جلدی آتا۔“

”ٹھیک ہے آپ! آپ لکری نہ کریں۔“ کشمور خوش خوش باہر نکل گئی۔ صنوبر نے دیر بعد وہ رانی کے ساتھ ایک بڑی سی کتابوں کی دکان پر بھی۔ حیات میں بھی کتابوں کو منتخب کر کے وہ رانی کو کھائی رہی۔ اچھا خاصا ذخیرہ بننے کے بعد اس نے کاؤنٹر پر کتابوں کی قیمت ادا کی اور باہر نکل گئی۔

”بی بی! اس میں سے جو کتابیں آسان الفاظ میں لکھی ہوں، آپ وہ مجھے پڑھنے کے لیے ضرور دے دیجیے گا۔ مجھے بڑا شوق ہے کتابیں پڑھنے کا۔“ کتابوں کا ذخیرہ اٹھا کر اس کے پیچھے آنے والی رانی نے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے فرمائش کی۔

”تمہارا جودل چاہے، وہ کتاب پڑھ لینا۔ آخر میں بھی تو پڑھتی ہوں۔ میں نے کون سا کتاب پڑھنے سے بڑھا ہوا ہے۔ بس مسلسل پڑھتے پڑھتے خود ہی بہت کچھ آئے گا۔“ کشمور فرح دلی سے رانی کو اجازت دیتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ رانی نے بھی ڈرائیور کے ساتھ والی نشست سنبھال لی۔ ڈرائیور اس دوران گاڑی اشارت کر چکا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ گاڑی آگے بڑھتا، کشمور کی نظر ایک شاسا پیر سے پڑی۔ جینز کی پینٹ اوپر کھدکا کرتے پینے

اپنے مخصوص طے ہیں وہ یقیناً ماسٹر آفتاب ہی تھا۔

”نڈیر! یہ سائے ماسٹر آفتاب ہی گھرا ہے؟“ بیچان لینے کے باوجود کشمور نے ڈرائیور سے تصدیق چاہی۔

”جی ہاں بی بی! یہ تو اپنے گاؤں والا ماسٹر آفتاب ہی ہے۔ شاید یہاں کسی کام سے آیا ہو۔“

”جاؤ، اسے یہاں بلا کر لے آؤ۔ کہنا جہاں جاتا ہے وہاں پھوڑ دو گے۔“ کشمور نے ڈرائیور کو حکم دیا۔

”لیکن بی بی! آپ کے ساتھ؟“ ڈرائیور کشمور کا حکم سن کر گڑبڑایا۔

”جو کہا ہے اس پر عمل کرو۔ اور ہاں، ماسٹر صاحب کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ گاڑی میں حویلی کا کوئی فرد موجود ہے۔“ کشمور، ڈرائیور کی جھجک کا سبب سمجھ چکی تھی چنانچہ دراب سے اسے حکم دیا۔ ساتھ ہی دوسری ہدایت بھی دے دی وہ اسے خدشہ تھا کہ ماسٹر آفتاب لفٹ کی اس پینشن کو قبول نہیں کرے گا۔

”تم پیچھے آ جاؤ رانی!“ اگلی نشست پر بیٹھی رانی کو کھنکھارے کشمور، ڈرائیور کو ماسٹر آفتاب سے بات کرتے ہوئے دیکھ رہی۔ ماسٹر آفتاب نے ڈرائیور سے پیش کے بعد ڈرائیور کی پینشن قبول کر لی تھی اور اب اس کے ساتھ گاڑی کی طرف آ رہا تھا۔ گاڑی کے نزدیک آ کر اس نے بیٹھی سی اگلی نشست پر بیٹھنے کے لیے دروازہ کھولا، مٹی نشست پر موجود کشمور اور رانی پر اس کی نظر پڑی۔ وہ یک دم ٹھنک گیا۔

”معاف کیجیے گا۔“ مجھے معلوم نہیں تھا کہ گاڑی میں خواتین موجود ہیں اور میں نے بے وقوفی نہیں کرتا۔“ کشمور جانتی تھی کہ وہ کب کب رہا ہے۔ گاڑی کے سیاہ شیٹوں کی وجہ سے وہ دور سے ان لوگوں کی گاڑی میں موجودی کا اندازہ نہیں لے سکتی تھا اور ڈرائیور کو خود کشمور نے اپنی موجودگی ظاہر کرنے سے منع کر دیا تھا۔

”یہ مجھے ماسٹر صاحب! آپ کو ہماری موجودگی کا علم نہیں تھا لیکن میں نے خود ڈرائیور کو کچھ کر آپ کو بتا دینے کی آخری کوشش کی۔ یہ سب چارہ اپنی مرضی سے تو آپ و آخر نہیں کر سکتا تھا۔“

”آپ کی پیشکش کے لیے شکریہ... لیکن کچھ نہ سب نہیں لگتا۔ آپ لوگوں کو نہ جانے کمال جانتے ہیں میری وجہ سے آپ کو خدمت ہوگی۔“ ماسٹر آفتاب نے شائستگی سے انکار کیا۔

”خدمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ ہمارے بھائی کے استاد ہیں۔ آپ کا ایک مقدم ہے ان لیے تھوڑی بہت خدمت ہوئی بھی تو میں ہمارا گوار نہیں کر رہی۔“ کشمور کو

ماسٹر آفتاب سے منگوا کر آ چکا تھا ماسٹر آفتاب لیے وہ مسلسل اصرار کر رہی تھی۔

”خدمت افزائی کے لیے شکریہ... لیکن پلیز! آپ لوگ جائیں، میں کاشے وغیرہ سے چلا جاؤں گا۔“ ماسٹر آفتاب نے اس بار بھی انکار کیا۔

”دیکھیں ماسٹر صاحب! ہمارے ہاں پینشن کر کے پیچھے ہٹنے کا رواج نہیں۔ آپ کے انکار کرتے رہنے سے ہمیں یہاں زیادہ دیر ہو جائے گی لیکن بہر حال، آپ کو یہاں پھوڑ کر جانے کا قطعی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے اب آپ کی مرضی ہے کہ آپ ہمیں لیت کر داتے ہیں یا ہماری پینشن قبول کرنے کا شرط پیش کرتے ہیں۔“ کشمور کے اس انداز پر ماسٹر آفتاب نے پہلی بار نظر اٹھا کر براہ راست اس کی طرف دیکھا۔ چادر نے اس کے چہرے کے بیشتر حصے کو ڈھانپ رکھا تھا لیکن وہ سیاہ آنکھیں بالکل نمایاں تھیں۔ ان آنکھوں میں اصرار اور خدشہ دونوں تھے۔ ماسٹر آفتاب کو اندازہ ہوا کہ حویلی والوں میں شمار ہونے والی یہ لڑکی اپنے خاندانی حراج کے مطابق اچھی خاصی ہٹ دھرم ہے جو بغیر اپنی بات منوائے پیچھے نہیں ہٹے گی۔ اس خدشہ سے بار مانتے ہوئے بالآخر وہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔

”مجھے جس کے اڑے پر چھوڑ دو۔ مجھے وہاں سے آنا پڑا جاتا ہے۔“ نشست سنبھالنے کے بعد ماسٹر آفتاب نے ڈرائیور کو بتایا اور پھر اس طرح جب سادہ کر بیٹھا کہ گردن کو ڈرائیور کی جانب بھی نہ دی کہ سبھا کوئی خیال کرے کہ وہ پینشن پر بیٹھی حویلی کی ایک خاتون کی طرف دیکھنے کی جرأت کر رہا ہے۔ خود کشمور نے بھی پورے راستے اسے دوبارہ مخاطب نہیں کیا۔ اس کی یہ خاموشی ماسٹر آفتاب کے لیے باعث سکون تھی لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ کشمور کے اندر جو طوفان کر دیش لے رہا ہے، وہ زیادہ عرصے اس کے اس سکون کو برقرار نہیں رہے گا۔

”ماسٹر! چودھری افتخار لائن پر ہیں۔ وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے، بات کر دو۔“ شہر یار نے عبد المنان کی دلی ہوئی اطلاع کے جواب میں کہا۔

”کیا حال ہے شہر یار صاحب۔ آپ کو تو خدمت ہی نہیں ملتی، ہم نے سوچا ہم ہی آپ کی خبر نہ لے لیں۔“ فنیہ بھر بھر چودھری افتخار کی آواز شہر یار کو سنائی دی۔

”آپ کی مہربانی ہے چودھری صاحب کہ آپ میرا اتنا

خیال کرتے ہیں۔ آپ کا شکوہ بھی سر اٹھوں پر ہے لیکن بس کیا کروں، کئی معاملات میں اتنا اچھا ہوا ہوں کہ خدمت ہی نہیں ملتی۔ جیسے ہی خدمت ملی، ضرور آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔“ شہر یار نے اپنی طے کردہ حکمت عملی کے مطابق چودھری افتخار کے شکوے کا بہت خوش اخلاقی سے جواب دیا۔

”خدمت ملنے کا انتظار چھوڑیں اسے ہی صاحب! اسے ی کی کر پی پر بیٹھنے والے کو کبھی بھی خدمت نہیں ملتی۔ ایسے بندوں کو اپنی مصروفیت میں سے بڑی وقت نکالنا پڑتا ہے۔ اور اس وقت میں نے آپ کو خدمت دی ہی اس لیے کہ آپ کے بے حد مصروف وقت میں سے کچھ وقت بائیں سکوں۔“

”وہ کس سلسلے میں؟“ چودھری افتخار کی بات سن کر شہر یار کا جیس جا گیا۔

”فکار پر جانے کا پر وگرام ہے۔ ایس بی معظّم ہارڈوار فارسٹ آفیسر اقبال باجوہ کے علاوہ ایک آدھ اور دوست بھی ہوگا۔ آپ چلیں ہمارے ساتھ فکار بہت لفٹ آگے گا۔“

”پر وگرام تو واقعی دلچسپ ہے مگر بڑا اچانک بنایا آپ نے۔ آپ پچھلے دنوں جتنے تھیں رہے ہیں، اس کے بعد ایسی کسی ایجنسی کو ایسی جھپٹ نہیں کر رہا تھا۔“ چودھری افتخار کا پر وگرام سن کر شہر یار نے ہنسنے لگا۔

”ہم ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر گھبرانے والے نہیں۔ ایسے مسائل تو آتے ہی رہتے ہیں۔ ان سے گھبرا کر زندگی کے لفٹ کو تھوڑا ہی گنوا یا جاسکتا ہے۔ اور جی کہوں، زندگی کا جو لفٹ فکار میں ہے وہ اور کسی میں نہیں۔“ چودھری افتخار بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ کہنے کو وہ ایک دوسرا، مجاہدہ نہیں اور کاروباری فرد تھا لیکن اس کے ہر روپ کے پیچھے ایک فکاری جیسا جیسا تھا جو صرف جنگی جانوروں کا فکار نہیں کرتا تھا بلکہ اس کے فکار کی فہرست میں انسانی جان، مال و دولت اور لوگوں کی عزت سمیت سب کچھ شامل تھا۔ اپنے ہر فکار کے لیے وہ بھر پور منصوبہ بندی کرتا تھا اور اسے کبھی اپنے مقصد میں ناکامی نہیں ہوتی تھی۔

”چلیں، میں کوئٹہ کروں گا کہ زندگی کے اس سب سے بڑے لفٹ میں آپ لوگوں کے ساتھ شامل ہو سکوں۔ آپ دن اور وقت وغیرہ بتا دیں تاکہ میں اپنا شیڈول چیک کر کے آپ کو کوئی تھپی جواب دے سکوں۔“

”دن ہم نے ہفتے کا طے کیا ہے۔ ہفتے کی شام کو نکلیں گے۔ رات جنگل میں ہی قیام ہوگا پھر آگے روزہ تو کرنا شام تک واپسی... لیکن آپ یہ شرط قسم کی ہانی نہ بھریں۔ اگر

بہن کے پاس ان کتابوں کا سہارا نہ ہوتا تو میں کیا کرتی؟“

”اچھا بھل، زیادہ اداں نہ ہو۔ ڈرائیور کو کچھ کر بازار سے کسی کتابیں منگوائے۔“ کشمور کی بات سن کر صنوبر کو فوراً ہی بہن کی بخرو کی خیال آ پڑا اور وہ نرم پڑی۔

”ڈرائیور کو کہیں بھیجتا۔ میں خود جا کر اپنی پسند سے کتابیں خریدوں گی۔“ کشمور نے خند کی۔

”پر کہیں ایسا کیوں دے گا۔ آئے سے پہلے انہوں نے سخت تاکید کی تھی کہ کتابیں نہ خریدیں۔“ صنوبر پچھانی۔

”ابھی پسند کے پڑے لے لینے کے لیے بھی تو ہم لوگوں کو بازار جانے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ تو پھر میں اپنی پسند کی کتابیں خریدنے کیوں نہیں جاسکتی؟ اس سے پہلے بھی تو میں جب بھی آپ لوگوں کے ساتھ بازار کی ہوں، ہمیشہ کتابیں خرید کر لاتی ہوں۔ ابھی نے بھی کوئی اعتراض تو نہیں کیا اور ویسے بھی مجھے کون سا درد جاتا ہے۔ یہاں سے لبرٹی مار کھیت دور ہی تھی ہے؟“ کشمور نے فوراً ہی دیکل دی تو صنوبر کو کس بونا پڑا۔

”اچھا چلی جا۔ ساتھ میں رانی کو بھی لے لینا۔ اور ہاں، جلدی آتا۔“

”ٹھیک ہے آپ! آپ لکری نہ کریں۔“ کشمور خوش خوش باہر نکل گئی۔ صنوبر نے دیر بعد وہ رانی کے ساتھ ایک بڑی سی کتابوں کی دکان پر بھی۔ حیات میں بھی کتابوں کو منتخب کر کے وہ رانی کو کھائی رہی۔ اچھا خاصا ذخیرہ بننے کے بعد اس نے کاؤنٹر پر کتابوں کی قیمت ادا کی اور باہر نکل گئی۔

”بی بی! اس میں سے جو کتابیں آسان الفاظ میں لکھی ہوں، آپ وہ مجھے پڑھنے کے لیے ضرور دے دیجیے گا۔ مجھے بڑا شوق ہے کتابیں پڑھنے کا۔“ کتابوں کا ذخیرہ اٹھا کر اس کے پیچھے آنے والی رانی نے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے فرمائش کی۔

”تمہارا جودل چاہے، وہ کتاب پڑھ لینا۔ آخر میں بھی تو پڑھتی ہوں۔ میں نے کون سا کتاب پڑھنے سے بڑھا ہوا ہے۔ بس مسلسل پڑھتے پڑھتے خود ہی بہت کچھ آئے گا۔“ کشمور فرح دلی سے رانی کو اجازت دیتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ رانی نے بھی ڈرائیور کے ساتھ والی نشست سنبھال لی۔ ڈرائیور اس دوران گاڑی اشارت کر چکا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ گاڑی آگے بڑھتا، کشمور کی نظر ایک شاسا پیر سے پڑی۔ جینز کی پینٹ اوپر کھدکا کرتے پینے

اپنے مخصوص طے ہیں وہ یقیناً ماسٹر آفتاب ہی تھا۔

”نڈیر! یہ سائے ماسٹر آفتاب ہی گھرا ہے؟“ بیچان لینے کے باوجود کشمور نے ڈرائیور سے تصدیق چاہی۔

”جی ہاں بی بی! یہ تو اپنے گاؤں والا ماسٹر آفتاب ہی ہے۔ شاید یہاں کسی کام سے آیا ہو۔“

”جاؤ، اسے یہاں بلا کر لے آؤ۔ کہنا جہاں جاتا ہے وہاں پھوڑ دو گے۔“ کشمور نے ڈرائیور کو حکم دیا۔

”لیکن بی بی! آپ کے ساتھ؟“ ڈرائیور کشمور کا حکم سن کر گڑبڑایا۔

”جو کہا ہے اس پر عمل کرو۔ اور ہاں، ماسٹر صاحب کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ گاڑی میں حویلی کا کوئی فرد موجود ہے۔“ کشمور، ڈرائیور کی جھجک کا سبب سمجھ چکی تھی چنانچہ دراب سے اسے حکم دیا۔ ساتھ ہی دوسری ہدایت بھی دے دی وہ اسے خدشہ تھا کہ ماسٹر آفتاب لفٹ کی اس پینشن کو قبول نہیں کرے گا۔

آپ کو اس روز آتے میں مشکل پیش آئے تو ہم اپنے پروگرام میں تبدیلی بھی کر سکتے ہیں۔ اصل میں تو یہ پروگرام آپ کے لیے ہی ترتیب دیا گیا ہے، باقی افراد کو بھی بار پبلک بھی میرے ساتھ نکال کر چاہئے ہیں۔

”اگر یہ بات ہے تو پھر میں انکار نہیں کر سکتا۔ آپ کی اس قدر خیال داری کے بعد تو انکار کی مجاہدات ہی نہیں نکلتی۔“ چودھری افتخار کی بات سن کر شہریار نے فوراً اپنی رضامندی کا عندیہ دے دیا۔

”بس تو پھر آپ ہفتے کی دوپہر کو ہی میرا ہاتھ باندھ جائے گا۔ دوپہر کا کھانا جو میں اس ساتھ کھائیں گے اور پھر شام تک نکل پڑیں گے۔ آپ کو صرف وہاں پہنچنا ہے، باقی کے انتظامات ہماری طرف سے ہوں گے۔“ شہریار کے ہاں کرتے ہی چودھری افتخار کو مزاج اور بھی خوش ہو کر گیا۔

”آپ فکر نہ کریں میں بالکل صحیح وقت پر پہنچ جاؤں گا۔“ شہریار نے اسے تسلی دی۔

”بس تو پھر میں انتظار رہے گا۔“ چودھری افتخار اب منگتو سمیٹنے کے لیے پر توڑ رہا تھا۔ شہریار نے ذرا سا گھبراہٹ سے کہا کہ وہ اس میں گہری تنبیہ دیکھ کر تے ہوئے ہوا۔

”مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی تھی چودھری صاحب! پہلے ارادہ تھا کہ یہ ٹیلی فون اس کے موضوع پر بات کروں گا لیکن اب جبکہ ہماری ایک بہت خوش گواری ملاقات ملے ہو گئی ہے تو چاہتا ہوں کہ میں اس موقع پر کوئی بہت تنبیہ نویت کا مسئلہ چھیڑوں۔ اس لیے بہتر ہے کہ میں اس وقت فون پر ہی آپ سے بات کروں۔“

”بہت شوق سے اے سی صاحب! ایسے مجھے حیرت ہے کہ ایسا کیا معاملہ ہے جس پر آپ اتنے تنبیہ محسوس ہو رہے ہیں؟“ چودھری افتخار پرچکا۔

”یہ ظاہر ابھی معاملہ اتنا تنبیہ نہیں لیکن مجھے لگتا ہے کہ آنے والے وقت میں یہ معاملہ کافی تکمیل ہو سکتا ہے۔ اصل میں کل کے اخبار میں ایک کالم چھپا ہے۔ کالم نگار نے براہ راست تو کسی گاؤں یا اس کے کسی نمائندہ شخص کا نام نہیں لکھا لیکن اس نے وہی علاقوں کی اعتراضات پر کافی تنقید کی ہے۔ اور اس تنقید سے میرے میں اس نے کئی ایسے جملے لکھے ہیں جو براہ راست میرا نام لے رہے ہیں۔ اس نے لکھا ہے کہ کئی دیہی آبادیوں میں بنیادی سہولیات کا فقدان ہے اور اگر کوئی سہولت موجود ہے تو بھی اس کے اثرات صرف بڑے لوگوں تک محدود ہیں۔ بڑے وڈیوں اور زمینداروں نے مزارعوں کا بیٹا حرام کر رکھا ہے۔ وہ طرح طرح کے

جھگڑوں سے ان غریب مزارعوں کا استحصال کر رہے ہیں۔ ایک طرف باقاعدہ جسامتی نقصان دیکھا جاتا ہے تو دوسری طرف مزارعوں کو کوئی کم اجرت دی جاتی ہے کہ وہ اپنا اور اپنے خاندان کا پیٹ پالنے میں ناکام رہتے ہیں۔ شادی بیاہ، بیماری آزاری کے موقع پر غریب مزارعے اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے وڈیوں اور زمینداروں سے قرض لینے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ ان غریب اور ان پڑھ لوگوں کو یہ قرض اپنی زیادہ سودی شرح پر دیا جاتا ہے کہ وہ ساری زندگی کے لیے غلام بن کر رہ جاتے ہیں۔“

”جانے دیں اے سی صاحب! یہ کون سی نئی باتیں ہیں۔ ایسا تو اکثر ہی لکھا جاتا رہتا ہے۔ میں اس کے صحیح جھوٹ ہونے پر تنبیہ نہیں کرتا۔ اگر یہ سچ ہے تو اس سے مجھ کیلئے کی ذات پر ضرب نہیں پڑتی۔ میرے ساتھ سارے ہی اس الزام کی زد پر آتے ہیں۔“ چودھری افتخار نے درمیان میں شہریار کی بات کاٹ کر کان پر سے بھی اڑانے والے انداز میں تبصرہ کیا۔

”تو مجھے بھی معلوم ہے چودھری صاحب لیکن میں نے کہا کہ کالم نگار نے اپنا کالم یوں تو دیہی علاقوں کی مجموعی صورت حال کے بارے میں لکھا ہے لیکن کچھ پوچش ایسے آتے ہیں جن سے واضح طور پر میرا بادی طرف اشارہ ہوتا محسوس ہوتا ہے۔“

”ابھرا، وہ کون سے پوائنٹ ہیں؟ کچھ ہم بھی سنیں۔“ چودھری افتخار کے انداز میں اب بھی بے نیازی تھی۔

”کالم نگار نے لکھا ہے کہ کچھ وڈیے تو ایسے بھی ہیں جو اپنے علاقے کے حکمران کے علاوہ دیہی پشوا بھی میں بیٹھے ہیں۔ ان وڈیروں نے پوری مریدی کی آڑ میں سادہ لوح عوام کے ذہنوں کو ماؤف کر رکھا ہے۔ وہ وڈیے ہیں کہ ان وڈیروں کی مرضی کے خلاف کچھ کریں گے تو ان پر کوئی آسانی معیت آپڑے گی۔ یہ وڈیے اس جاہلانہ سوچ کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے علاقے میں تعلیم کو عام نہیں ہونے دیتے کیونکہ جانتے ہیں کہ اگر مزارع پڑھ لکھ دار ہو گیا تو ان کی غلامی کے جھنجھے سے نکل جائے گا۔ انہوں نے طرح طرح کے جھگڑوں سے اپنے علاقوں میں تعلیم کا راستہ روک رکھا ہے۔ پھر سب سے اہم اور کاری ضرب جو کالم نگار نے لگائی ہے، وہ آپ کے دادا صاحب کے عرس کے خوالے سے ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ نام نہاد سادہ فہم اور گدی ہیز مزارعوں کے خون پینے کی کمانی بڑپ کر کے اس سے اپنے بڑوں کا شان دار عرس منعقد کرتے ہیں۔ ایک علاقے کے

بارے میں تو یہ اطلاع بھی ملی ہے کہ وہاں چھوٹے زمینداروں سے زبردستی ہر سال عرس کے مولنے پر سونے کے تاروں سے نقش چادر وصول کی جاتی ہے۔ اس چادر کو شہر وچر کی قبر پر چڑھا جاتا ہے اور بعد میں زندہ ہیرا اس کے سونے کو بچا کر دام کھرے کر لیتا ہے۔ کالم نگار نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ ایک بار چھوٹے زمینداروں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنے زبردستی کی بیعت نہیں چڑھائیں گے۔ بیعت لینے والے کو پہلے سے ان کے اس ارادے کی خبر مل گئی۔ اس نے کچھ بھی کے بغیر خاموشی سے ان زمینداروں کا دماغ ٹھیک کرنے کا انتظام کر دیا۔ اتفاق سے جس منہر کے پانی سے ارد گرد کے چھوٹے گاؤں، دیہاتوں کو کھل کے لیے پانی سپلائی کیا جاتا ہے، اس منہر کی لوکیشن ایسی تھی کہ وہ زمیندار کا اس پر تسلط ہے۔ پھر کھانا ہوا تو پانی کی سرنگی اس کا جواب اس طرح دیا گیا کہ ان کے علاقے میں پانی کی سپلائی بند ہو گئی۔ پانی نہ ملنے تو کسی فصلیں اور کہاں کے کھیت! چھوٹے زمینداروں نے سمجھ لیا کہ پانی روک کر نہیں لیا جاسکتا دیا گیا ہے۔ بس بھر دو لاکھ پڑا گئے اور آئندہ بھی سرنگی کی سرنگی جرات نہیں کی۔ یہ ساری وہ معلومات تھیں جو شہریار کو اپنے عرسے میں مختلف لوگوں سے ملاقاتوں میں حاصل ہوئی تھیں۔ معلومات فراہم کرنے والوں میں متاثرہ زمیندار بھی شامل تھے اور کچھ مکاری افسران بھی۔ شہریار نے اسے طور پر تحقیق کر کے ان معلومات کی تصدیق بھی کر لی تھی اور پھر یہی معلومات ماسٹر آف آفٹ کے ذریعے اس کے صحافی دوست تک پہنچا کر کالم کی شکل میں چھپ گئی تھیں۔

”کون الونکا پٹھانے جس نے یہ ساری بکواس لکھی ہے؟ میں دماغ درست کرادوں گا اس کا۔“ چودھری افتخار جواب تک بڑا ریلیکس تھا، براہ راست خود پر چوٹ پڑی تو پھٹ پڑا۔

”کینے والا کوئی بھی ہو چودھری صاحب! اصل بات تو یہ ہے کہ آپ کچھ اس طرح سے جواب دیں کہ بولنے والے کا اعتراض ختم ہو جائے۔ کسی ایک کو ڈرا دھک کر اس کا منہ بند کر دینے سے تو مسئلہ نہیں ہوگا۔ آپ ایک کام نہ بند کر دیں گے تو دوسرا بول پڑے گا۔ آج کے دور میں صحافی اتنا مزہ نہیں رہا ہے۔ آپ تو فکر کریں کہ سب صرف ایک اخبار میں چھپا ہے۔ کل تو اگر کسی پرانیو نے جھکن کی نیم اپنے کمرے سے لے کر کچھ ہی تو آپ کیا کریں گے۔ وہ تو سب کچھ لکھا دیں گے دنیا کو...! اسپتال، اسکول، سڑکیں سارے ہی تو

مسکے ہیں میرا بادش۔“ شہریار نے چودھری افتخار کی رگڑائی کی۔

”اگر تو دیکھیں یہ بی وی والے میرے نکالتے ہیں۔ قدم بھی نہیں رکھتے دوں گا میں انہیں یہاں۔ اپنا اور اپنے کمروں کا نقصان ہی کر کے جائیں گے وہ یہاں سے۔“ چودھری افتخار مزہ پیش میں آیا۔

”وہ اس بات کو اور بھی زیادہ ایش بنائیں گے۔ آپ کا نام بدنام ہو کر رہ جائے گا۔ ابھی جو آپ کے حملاتی ہیں، وہ بھی عوام میں اپنی مقبولیت قائم رکھنے کے لیے بی وی کے نمائندوں کے سامنے آپ کی مخالفت کریں گے، آپ کے فضل کو قابلِ خدمت قرار دیں گے۔ اگر آپ میری بات مانتے تو ذرا عمل اور مصلحت پسندی سے کام لیں۔ ایک ڈھائیے کام کروا دیں اپنے علاقے میں جن سے بی بی میں آپ کی نیک نامی ہو۔ میرا وعدہ ہے کہ اگر آپ ایسا کوئی قدم اٹھاتے ہیں تو بی وی کو بڑا کڑا کا انتظام میں خود کرادیں گا۔“ شہریار کی کوشش بھی کہ کسی طرح چودھری افتخار کو قائل کر لے۔

”آپ فرمائیے کہ میں کیا کروں؟“ چودھری افتخار نے ہنسا کر پوچھا۔

”ایک معاملہ تو مجھے مرگ کا ہے۔ آپ چاہیں تو حکومت سے اس کے لیے منظوری اور فنڈز حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ دوسرا معاملہ اسکول کی توسیع کا ہے۔ اس مسئلے میں ہمارے ریکارڈ میں ڈیڑھ سو سال موجود ہیں۔ آپ اگر اسکول کی ساتھ والی زمین پر اپنی ملکیت کے دعوے سے دست بردار ہو جائیں تو ہم وہاں اسکول کے لیے چند حیرت انگیز تعمیر کر سکتے ہیں۔ ویسے آپ چاہیں تو میرے پاس ایک دوسرا آئیڈیا ہے۔

یہ ہے کہ آپ خود اپنی طرف سے وہ زمین اسکول کے لیے وقف کر دینے کا اعلان کر دیں۔ تجزیہ زمین ہے، آپ کے کسی کام کی نہیں۔ لیکن آپ نے اگر اس کام کے لیے دے دی تو آپ کی نیک نامی کی شہرت ہو جائے گی اور آپ پر سے یہ الزام بھی ہٹ جائے گا کہ آپ خود اپنے علاقے کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔“ شہریار بہت دھیرے دھیرے، بڑے سچاؤ سے چودھری افتخار کو اس موضوع کی طرف لایا تھا اور اب کسی خاطر خواہ نتیجے کا منتظر تھا۔

”میں آپ کے ان مشوروں پر غور کروں گا۔ ویسے اتنی بھر دوی سے میرے مسائل پر غور و فکر کرنے کے لیے شکر ہے۔“ چودھری افتخار نے جس لمحے میں یہ پہلے کہ کر نکلتا کا سلسلہ منقطع کیا، شہریار فیصلہ نہیں کر سکا کہ وہ کچھ ہی اس کے مشوروں پر غور کرنے کا ارادہ رکھتا ہے یا پھر اصل بات کو

پاکر اس پر ہل کر گیا ہے۔

☆☆☆

شام کے وقت جنگل میں داخل ہونے کا خیال بہ ظاہر
اعتقاد لگتا تھا لیکن وہ لوگ جن انتظامات کے ساتھ وہاں گئے
تھے، ان کی موجودگی میں خوف کا کوئی شائبہ نہیں تھا بلکہ اچھا
خاصا قہر محسوس ہوا تھا۔ وہ لوگ بیچوں کی مدد سے وہاں
پہنچے تھے۔ شکار میں استعمال ہونے والے ہتھیاروں کے علاوہ
شب بھری کا بھی بے حد متحمل انتظام تھا۔ کئی ملازم بھی
خدمت کے لیے موجود تھے جنہوں نے جنگل میں ایک
مناسب جگہ پر پہنچنے ہی جنموں کی تعصب کا کام شروع کر دیا
تھا۔ طاقتور بیڑی لائسن نے جنگل کی تاریکی کو اچھا خاصا بے
مستی کر دیا تھا اور وہاں ہر کام بے حد سہولت سے انجام دیا
جا رہا تھا۔ روشنی کے لیے ایک دوسرا انتظام ایک بڑے الاء
کی صورت میں بھی لگا جا رہا تھا۔ چودھری افتخار کے کاندے
پھرتی سے لگڑیاں اٹھتی کر کے اس الاء کو روشن کرنے کی
تاری کر رہے تھے۔ جنگل میں اس الاء کی موجودگی، روشنی
کے علاوہ دوسری دو اہم ضروریات کی وجہ سے بھی لازمی تھی۔
الاء روشن ہوتا تو جنگلی جانوروں کے پڑاؤ کے قریب آنے
سے پرہیز کرتے۔ پھر موسم کی خشکی کو شکست دینے کے لیے بھی
اس الاء کی ضرورت تھی۔ الاء روشن ہو گیا تو ملازمین نے
ساتھ لائی ہوئی کم وزن کی فولنگ جیٹرز اس کے گرد و گرد
معزز مہمانوں کے بیٹھے کا انتظام کر دیا۔ اس قدرتی ماحول
میں ایک روشن الاء کے سامنے بیٹھ کر تھکا تھکا شہر یار کو بہت
اچھا لگ رہا تھا۔ البتہ اسے یہ احساس ضرور تھا کہ تکلفات
ضرورت سے کچھ زیادہ تھیں۔ جیسے ان فولنگ جیٹرز کی
موجودگی ہی بھی جو شہری زندگی کی علامت بنی اسے جنگل کے
ماحول کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ نہیں ہونے دے رہی
تھی۔ پھر نر بندہ شہر یار کی فراخی بھی جو احساس دلاتی تھی
کہ وہ جدید معاشرے کے فائدے سے ہیں اور اس جنگل کے
لیے انہیں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

”کیسا لگ رہا ہے شہر یار صاحب؟“ چودھری افتخار جو
اب تک فاریسٹ آفیسر کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھا، کچھ
اگ تکلف اور خاموش بیٹھے شہر یار کے قریب آ کر پوچھنے لگا۔
”بہت شان دار... اگر میں آپ کی دعوت قبول کرنے
سے انکار کر دیتا تو ایک بہت ہی خوب صورت منظر سے محروم
رہ جاتا۔“ شہر یار نے بے ساختہ جواب دیا۔
”ہاں...“ چودھری نے اس کی بات سن کر قہقہہ لگا دیا اور
پھر بڑے قافخر سے بولا۔ ”ہماری بات سامنے والے ہمیشہ

فائدے میں رہتے ہیں۔ ہم تو اپنے علاقے میں آنے والے
ہر نئے افرو کو اپنا دوست بنا کر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور
یہ تو آپ جانتے ہیں کہ دوستی کے لیے ایک دوسرے کی بات
بانا بڑا ضروری ہوتا ہے۔ جو ہماری بات مان لیتے ہیں، ان
کی ہماری دوستی بھی خوب چلتی ہے اور ساتھ ہی افسری بھی
قائم رہتی ہے۔ جو ہمارا دوست نہ بنے، وہ خود اپنے آپ سے
دشمنی مول لینے کے سوا کچھ نہیں کرتا۔“ چودھری افتخار کی یہ
پر غرور باتیں سنیں جن میں ایک بھیجی ہوئی دشمنی بھی، شہر یار کو
تخت نہ گوار کر رہی تھیں لیکن وہ چہرے پر کوئی تاثر لائے بغیر
چودھری کے کاندوں کی کارروائیاں دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک
سالم بکرے کو آگ پر بھونکنے کی تیاری کر رہے تھے۔

”بہت خوب چودھری صاحب! آپ تو خود اپنے ساتھ
بکرا اٹھا لائے۔ اس بکرے کے ہوتے ہوئے ہمارا جنگل
آپ کی میزبانی کا حق کیسے ادا کرے گا؟“ فاریسٹ آفیسر
اقبال باجوہ جو درادیر کے لیے غصے کے اندر گیا تھا، باہر آ کر
چودھری افتخار سے مخاطب ہوا۔

”آپ فکر نہ کریں باجوہ صاحب! اکل ہم آپ کے
جنگل کو میزبانی کا پورا پورا موقع دیں گے۔ ابھی تو بے انتظام
اس لیے کیا ہے کہ ہمارے مہمانوں کو کوئی تکلیف نہ اٹھانی
پڑے۔“ چودھری افتخار نے اپنے مخصوص انداز میں قہقہہ
لگاتے ہوئے اقبال باجوہ کو جواب دیا۔

”آپ کتنے سوچیں میں ہیں اسے ہی صاحب؟“ اس
بار اقبال باجوہ خاموش بیٹھے شہر یار سے مخاطب ہوا۔
”میں سوچ رہا تھا کہ بے چارے بکرے کی کھال اتار کر
اسے آگ پر بھونکنے کے لیے لٹکا دینا کتنا آسان ہوتا ہے۔
اگر اس کی جگہ شیر ہوتا تو کوئی اس پر تھکا دینے کی بھی جرأت
نہ کرتا۔ شیر کو شکار کرنے سے پہلے بڑے سے بڑا کھاگ
شکاری بھی دس بار سوچتا ہے کہ کھل خود اپنی ذات کو ہی نقصان
نہ پہنچ جائے۔“ شہر یار نے بہت سلیقے سے چودھری افتخار کی
تعموزی دیر پہلے کی بات کا جواب دیا۔

”اوہ... لگتا ہے اسے ہی صاحب پر جنگل کے
ماحول کا اثر ہو گیا ہے اس لیے جنگل کا بادشاہ یاد آ رہا ہے۔
لیکن بے فکر رہیں... یہاں شیر نہیں پایا جاتا۔ یعنی یہ جنگل بغیر
بادشاہ کے ہی چل رہا ہے۔ یہاں اگر کوئی بادشاہ ہے بھی تو وہ
میں ہوں۔ اس جنگل پر میرا حکم چلتا ہے۔“

اقبال باجوہ چونکہ گفتگو کی ابتدا میں یہاں موجود نہیں تھا
اس لیے شہر یار کے جملوں کا کبھی مہر نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اس نے
شہر یار کی بات کو ایک عام بات کے طور پر لیتے ہوئے اپنا

تجربہ پیش کیا۔ اقبال باجوہ کی بات سن کر شہر یار کو احساس ہوا
کہ وہاں ایک چودھری افتخار ہی نہیں بلکہ دوسرے کی دہانوں
میں بھی حکمرانی کا خنساں بھرا ہوا ہے۔ لیکن ان لوگوں پر اپنے
اس خیال کو ظاہر کیے بغیر وہ مسکرایا اور ہلکسی سے بولا۔

”اس کا مطلب ہے باجوہ صاحب... بلکہ جب ہر شکار
کے لیے نہیں گئے تو آپ سارے جانوروں کو کان سے پکڑ کر
لائسن حاضر کر دیں گے کہ جناب جس کو دل چاہے شکار کر
لیجیے۔“

”یہ کان پکڑ کر لائسن حاضر کرنا اور بندے کی کھال مگر
دینا تو دراصل تازہ صاحب کے گھنے کا کام ہے۔ دیکھیں،
اس وقت بھی اس قدر اشتیاق سے بے چارے بکرے کے
لٹکے کا منظر دیکھ رہے ہیں۔“ اقبال باجوہ پہلے شہر یار کی بات پر
جسار اور پھر افسانہ نگار کے منظر میں طرف اشارہ کرتے ہوئے
بولا۔ ”معلم تارڑ واقعی ان لوگوں سے بہت کہ بیضا بہت شوق

تجربہ پیش کیا۔ اقبال باجوہ کی بات سن کر شہر یار کو احساس ہوا
کہ وہاں ایک چودھری افتخار ہی نہیں بلکہ دوسرے کی دہانوں
میں بھی حکمرانی کا خنساں بھرا ہوا ہے۔ لیکن ان لوگوں پر اپنے
اس خیال کو ظاہر کیے بغیر وہ مسکرایا اور ہلکسی سے بولا۔

”اس کا مطلب ہے باجوہ صاحب... بلکہ جب ہر شکار
کے لیے نہیں گئے تو آپ سارے جانوروں کو کان سے پکڑ کر
لائسن حاضر کر دیں گے کہ جناب جس کو دل چاہے شکار کر
لیجیے۔“

”یہ کان پکڑ کر لائسن حاضر کرنا اور بندے کی کھال مگر
دینا تو دراصل تازہ صاحب کے گھنے کا کام ہے۔ دیکھیں،
اس وقت بھی اس قدر اشتیاق سے بے چارے بکرے کے
لٹکے کا منظر دیکھ رہے ہیں۔“ اقبال باجوہ پہلے شہر یار کی بات پر
جسار اور پھر افسانہ نگار کے منظر میں طرف اشارہ کرتے ہوئے
بولا۔ ”معلم تارڑ واقعی ان لوگوں سے بہت کہ بیضا بہت شوق

تجربہ پیش کیا۔ اقبال باجوہ کی بات سن کر شہر یار کو احساس ہوا
کہ وہاں ایک چودھری افتخار ہی نہیں بلکہ دوسرے کی دہانوں
میں بھی حکمرانی کا خنساں بھرا ہوا ہے۔ لیکن ان لوگوں پر اپنے
اس خیال کو ظاہر کیے بغیر وہ مسکرایا اور ہلکسی سے بولا۔

”اس کا مطلب ہے باجوہ صاحب... بلکہ جب ہر شکار
کے لیے نہیں گئے تو آپ سارے جانوروں کو کان سے پکڑ کر
لائسن حاضر کر دیں گے کہ جناب جس کو دل چاہے شکار کر
لیجیے۔“

”یہ کان پکڑ کر لائسن حاضر کرنا اور بندے کی کھال مگر
دینا تو دراصل تازہ صاحب کے گھنے کا کام ہے۔ دیکھیں،
اس وقت بھی اس قدر اشتیاق سے بے چارے بکرے کے
لٹکے کا منظر دیکھ رہے ہیں۔“ اقبال باجوہ پہلے شہر یار کی بات پر
جسار اور پھر افسانہ نگار کے منظر میں طرف اشارہ کرتے ہوئے
بولا۔ ”معلم تارڑ واقعی ان لوگوں سے بہت کہ بیضا بہت شوق

تجربہ پیش کیا۔ اقبال باجوہ کی بات سن کر شہر یار کو احساس ہوا
کہ وہاں ایک چودھری افتخار ہی نہیں بلکہ دوسرے کی دہانوں
میں بھی حکمرانی کا خنساں بھرا ہوا ہے۔ لیکن ان لوگوں پر اپنے
اس خیال کو ظاہر کیے بغیر وہ مسکرایا اور ہلکسی سے بولا۔

”اس کا مطلب ہے باجوہ صاحب... بلکہ جب ہر شکار
کے لیے نہیں گئے تو آپ سارے جانوروں کو کان سے پکڑ کر
لائسن حاضر کر دیں گے کہ جناب جس کو دل چاہے شکار کر
لیجیے۔“

”یہ کان پکڑ کر لائسن حاضر کرنا اور بندے کی کھال مگر
دینا تو دراصل تازہ صاحب کے گھنے کا کام ہے۔ دیکھیں،
اس وقت بھی اس قدر اشتیاق سے بے چارے بکرے کے
لٹکے کا منظر دیکھ رہے ہیں۔“ اقبال باجوہ پہلے شہر یار کی بات پر
جسار اور پھر افسانہ نگار کے منظر میں طرف اشارہ کرتے ہوئے
بولا۔ ”معلم تارڑ واقعی ان لوگوں سے بہت کہ بیضا بہت شوق

www.jbdpress.com

نیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

275/-	آخری چٹان	275/-	مستقل علی
300/-	اورنگزادہ ٹوٹ گئی	225/-	کیلیسا اور آگ
275/-	شاہین	225/-	پورس کے ہاتھی
125/-	سومال بعد	225/-	انسان اور یوتا
225/-	یوسف بن تاشیفین	100/-	ثقافت کی تلاش

275/-

300/-

225/-

225/-

100/-

www.jbdpress.com

نیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

300/-	گمشدہ قافلے	300/-	آخری معرکہ
200/-	داستان مجاہد	225/-	آخری رات کے مسافر
275/-	پر دہلی درخت	300/-	فیروز کمری
300/-	قافلہ حجاز	125/-	اساتذہ کی حیرت انگیز
300/-	ناگ اور خون		

275/-

300/-

225/-

225/-

100/-

صاحب! چودھری صاحب کی میزبانی کا تو سب ہی دم بخورے ہیں۔ اگر آپ خواہش کریں گے تو ہر ایک کے لیے الگ الگ سالم کمرہ بھی حاضر ہو جائے گا۔" انہیں بی بی نے خوشامدانہ لہجہ میں یہ جملے کہے تو چودھری افتخار جو شہر یار کی بات سننے کے بعد ایک منگھڑی خاموشی میں جھلا ہوا تھا، خوش ہو کر مسکرائے لگا۔ اس کے بعد وہاں ماحول مسلسل بے حد خوش گووار رہا۔ یاد تو تھک چودھری افتخار اور اقبال باجوہی کر رہے تھے۔ اس بی بی معظمہ ناز بی بی کی کسی انگٹھ میں حصّے لے لیتا تھا۔ اصل میں وہ شہر یار کی موجودگی کے باعث کچھ احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ اپنی عمر اور تجربے کی زیادتی کے باوجود اسے شہر یار کے بڑے مجدد سے اور حیثیت کا احساس تھا۔ شہر یا خود اس لیے زیادہ نہیں بول رہا تھا کہ ان لوگوں کو زیادہ سے زیادہ بولنے کا موقع دے کر ان کے حراز کو ابھی طرح پرکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس منگھڑے دوران انہیں وقت گزرنے کا اندازہ ہی نہیں ہوا اور ملازموں نے ان کے سامنے کھانا چن دیا۔ کھانا بہت لذیذ تھا۔ وہ سب ہی شوق سے کھانے لگے۔ ابھی کھانا اختتام پذیر نہیں ہوا تھا کہ ایک بند جیب ان کے بڑاؤ کے قریب آ کر رکی۔ وہ سب اس جیب کی طرف متوجہ ہو گئے۔ جیب سے نکلنے والے چھروں نے انہیں سبھوت کر دیا۔ وہ دو اندھائی حسین اور طرح دار لڑکیاں تھیں جنہوں نے چمک دار رنگین کپڑے سے بے لالہ اس زینت بن کر رکھا تھا۔ یہ لالہ ان لڑکیوں کے حسن کی کلیوں کو چھپانے کے بجائے اسے بکھار دیا مایاں کرنے میں اہم کردار ادا کر رہا تھا۔

"دیکھیے چودھری صاحب! آپ کے صدمہ پر ہم یہاں بھی ملے آئے۔ اب تو ہماری وفاداری پر کسی شک کی گنجائش نہیں رہی۔ آخر ہم نے اپنی جان خطرے میں ڈالی ہے اس وفاداری کو جانچتے کرنے کے لیے۔" ان میں سے ایک جو عمر سے نسبتاً بڑی تھی، چودھری افتخار کے قریب آ کر بڑی ادا سے بولی۔ اس کی چال اور بولنے کے انداز میں جو ناز و ادا، فی و صاف بتاتی تھی کہ اس کا تعلق کسی جگہ سے ہے۔ اور یہ فیصل کی عورتوں کی وفاداری جس شے کے ساتھ مضبوط ہے اس کی چودھری افتخار کے پاس کوئی کی نہیں تھی۔ وہ اگر کچھ جھگڑا تھا تو چودھری افتخار کی دعوت پر آتی تھیں تو بھی خوب جتنی کہیں کہ یہاں محنت کا اتنا معقول انتظام ہو گا کہ ان کے لیے خطرے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور واپسی پر جو بھجوری بھر کر ٹوٹ اپنے ساتھ لے جائیں، ان کی قربت الگ تھی۔ چودھری افتخار نے ان دونوں لڑکیوں کو بھی

کہ وہ سستانے کے بعد دوبارہ اپنے فن کے مظاہرے کے لیے اٹھ کھڑی ہوں گی لیکن پھر ان کی وہاں سے روانگی کے بعد نظر آنے لگے۔

اگر آپ بھی کوئی نیا کام شروع کرنا چاہتے ہیں، تو اس وقت کے لیے روک لیا جائے۔ ہم چار بندے ہیں، اگر کچھ نیا کرنا ہو تو ہم سب کو مل جل کر کرنا پڑے گا۔ شری رام جی کی طرح لڑکیوں والی جیب کی طرف دیکھنا کسی کی رواداری کا مظاہرہ نہیں ہے بلکہ کسی کی رواداری کے خلاف ہے۔

مہربان شریعہ چودھری صاحب لیکن میں نے آپ کو بتایا
میں ان چیزوں سے پرہیز کرتا ہوں جو مجھے پر حادی
ہے۔ بس اس کی تکلیف سمجھ کر زائد خشک ہونے کا دعویٰ نہیں
کی طرح کی چیزیں جس دور سے اچھی لگتی ہیں۔
چودھری کی سرکشی پر ڈرنا سونا چاہتا اور پھر مسکراتے
تو جواب دے کر دوبارہ جپ کی طرف متوجہ ہو گیا
یہ بڑی عجیبی اور کھدی ہے لیکن ان سے دور رہنی جاری تھی۔
لیکن جناب اب چل کر سونے کے سوا کیا چارہ رہ
جپ نظروں سے باہل اور اصل ہونی تو قابلِ بار جا رہ
منظری آواز مگر نہ ہونے یہ آواز بلند تھا۔ سب لوگ
پر قہقہہ مار کر من پسندے اور بھر پیچ آرام کے
میں ملے۔

☆ ☆ ☆
 گاؤں... میں ہرگز نہیں جانے والی وہاں۔ ابھی
 سے پہلے ہی تو کی تھی۔“ حوراں کی زبانی گاؤں
 کرکامہ بانو بدی۔

اب کی بار تو ہمیں زہرہ کے بیاہ میں شرکت کی بات اگ تھی اور اس جانے کی

کے لیے جاتا ہے۔ اس موقع کو تھوڑی دلا جا سکتا ہے۔
خودا نے اسے سمجھایا۔

بلوانے کی۔ میرے پاس کیا قانون وقت ہے کہ یہ قہر توڑے دن بعد دوڑ دوڑ کر گاؤں جاتی رہوں۔" ماہِ یاقوت نے چلنے سے ہنستا ہوا ہرہ کیا۔ ایک تو اس کا بلیے گاؤں میں یاد دل نہیں لگتا تھا، اوپر سے اپنے وہاں قوی قیام میں اسے جس قسم کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا تھا اس کی وجہ سے وہ ابھی خاصی خوف زدہ بھی تھی۔

”جب میں نے نور الٰہی کے خیال سے بچے وہاں بھجوا دیا تو بے چاری بچے کا درحقیقت یہی نہیں اب وہاں کا معاملہ اور یہ ہے۔ زہرہ میری بھائی ہے تو اب نواز بھائی کو بھی غیر نہیں، اور یہی کا لڑکا ہے۔ ویسے ہی سب کہتے ہیں کہ نور الٰہی شہر کا راجہ ہے اور وہی ہے کہ کئی ہے۔ اب یہاں میں حرکت کے لئے نہیں جاؤں گی تو یہ اور یہی والے سو نام دھرن گئے۔“

آپ بھی بھرپور طاقت کے
مالک بنیے طبی دنیا میں کامیاب
اور لا جواب نسخہ

مرد حضرات ہی پڑھیں۔

[illegible]

ہیکم اینڈ سنر
سٹ بکس نمبر 2159 کراچی 74600 پاکستان

”تو ٹھیک ہے بے اتم جلی جاؤ اپنی برادری والوں سے رشتے نہ بنائے... میں تو ادھر رہ کر اپنی پڑھائی کروں گی۔“ خورال کی بات سن کر ماہ بانو نے رونے لگے میں جواب دیا۔

”بھئی ہوئی ہے کیا؟ یہاں اکیلی کیسے رہے گی؟ میں اور تیرے ابو دونوں ہی جاؤں گے بیاہ میں شرکت کے لیے۔ ویسے تو زیادہ غم نہ کر، ہمارا کوئی لہذا چڑا کر کے کارادہ نہیں ہے وہاں۔ جسے کو نماز کے بعد نکلیں گے، اس دن زہرہ کا مایوں ہے۔ نئے کو مہندی ہوگی اور آؤ اور کورات۔ پھر کے دن دو پھر کو دے گا کھانا کھا کر شام سے پھیلے رہا وہاں آجائیں گے تو تھکے گی آج اپنے کاغذ ہونا۔ آؤ اور کو تو ویسے ہی ہنسی ہوتی ہے، بس ایک ہفتہ اور پھر کے دن ہی تجھے کاغذ سے نافہ کرنا پڑے گا۔ اب سب کی بہن کی شادی پر اپنی قربانی تو دینی ہی پڑے گی تجھے اپنی پڑھائی کی۔“ خورال نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔

”بڑے آئے کہیں سے گئے اگر مجھے رکھا کھتے تو میں خود سے الگ کرتے؟“ ماہ بانو نے تھکی دکھائی۔

”اچھا بھلا، اپنی بہن کا نہیں میری بھائی کا بیاہ کچھ کر شرکت کر لے۔ ان سے نہیں مجھ سے تو ہونا رشتہ مانتی ہے نا تو؟“ خورال نے اسے پال پوس کر بڑا کیا تھا، اس لیے اسے منانے کے سارے کر جاتی تھی۔ ماہ بانو کی خاموشی بتا رہی تھی کہ وہ بدولی سے ہی تکی لیکن راضی ہو چکی ہے۔

”اچھا بھلا دیکھا! جب تو گاؤں کو بولی تھی تو میں نے تیرے لیے گیتے بنوائے تھے۔ وہ جو میں نے شیخ صاحب کے ہاں ایک لاکھی کٹنی والی تھی، وہ لکل آئی تھی پچھلے مہینے۔ میں نے تھوڑے روپے اور ملا کر تیرے گیتے بنوائے۔ زہرہ کے بیاہ پر جانے کی تو یہ گیتے ساتھ لے چلا۔ ان میں سے جو تیرا من کرے وہ بیاہ ہو جائے گی۔“ اب خورال اسے بھلانے کے لیے دوسری تدبیریں کر رہی تھی۔

”گیتے بنوانے کی کیا ضرورت تھی؟ میں نے اب اسے کہا تھا کہ میرے میڈیکل میں داخلے کے لیے روپے سنبھال کر رکھیں۔“ ماہ بانو نے خوش ہونے کے بجائے اعتراض کیا۔

”اس کے لیے بھی کوئی نہ کوئی بندوبست ہو جائے گا۔ وہ تیرا اور تیرے ابا کا معاملہ ہے۔ میں تو اس ہوں، مجھے تیری پڑھائیوں سے زیادہ تیرے بیاہ کے لیے بھیڑ جوڑنے کی فکر ہے۔“ خورال نے جواب دیا اور زہرہ زبردستی ماہ بانو کو پکڑا دیے۔

”... لے... انہیں سنبھال کر اپنے بیک میں رکھ لے۔ اور ہاں، یاد سے بیک میں تالا بھی لگا لیتا۔ راستے کا

کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ کب کوئی چور اچکا ہاتھ صاف کر جائے۔“ ان آخری ہدایات کے بعد واضح تھا کہ ماہ بانو کو ہر حال میں زہرہ کے بیاہ میں شرکت کے لیے ہر آباد جانا ہے۔ ہر آباد جانا اس بار سے ہمیشہ سے زیادہ مشکل لگ رہا تھا کہ وہاں چودھری افکار کا راج تھا۔ وہ تو یہاں فیمل آباد میں رہتے ہوئے بھی چودھری سے اچھی خاصی خوف زدہ تھی۔ ہر آباد سے واپس آنے کے بعد اس نے اکیلے کاغذ آنا جانا بالکل ترک کر دیا تھا کہ کہیں چودھری کوئی وار نہ کر جائے۔ اس کیسی پہنچ رکھنے والے بندے کے لیے فیمل آباد کوئی ایسا دور بھی نہیں تھا لیکن شاید ماہ بانو اس کے ذہن سے اتاری تھی۔ اب وہ دوبارہ ہر آباد جاتی تو یہ کیسے ممکن تھا کہ چودھری کو دوبارہ اس کا دھیان نہیں آتا؟ مگر وہ بے سب باتیں حورال کو نہیں سمجھا سکتی تھی اس لیے مرنے کیانہ کرنی کے مصداق وہاں جانے کی تیاری کرنے لگی۔

☆☆☆

جنگل کی صبح رات سے بہت تھک تھی۔ رات کی تاریکی اور جانوروں کی آوازیں مل کر ماحول کو بولناک بناتی تھیں لیکن صبح بہت خوب صورت تھی۔ صبح کا آغاز پرندوں کی چہچہاہٹ پر اکٹھے ہونے سے ہوا تھا۔ شہر یار نے غصے سے ڈپر نکل کر دیکھا تو سورج کی کرنوں کے تھکے درختوں سے چھن کر آنے کے باعث جنگل کا رنگ ہی بدلا ہوا تھا۔ مصنوعی روشنیوں کے مقابلے میں اس قدر روشنی میں وہاں موجود گل بوٹے الگ ہی رنگ دکھا رہے تھے۔ پھر جنگل کی ایک مخصوص مہک تھی صبح کی تازہ ہوا کے ساتھ شامل ہو کر تھنوں میں داخل ہوتی تو اندر تک فرحت اور سرشاری کا احساس ہوتا۔

”گنڈ مارنگ!“ اقبال باجوہ نے قریب آ کر کہا تو شہر یار چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”کیا دیکھ رہے ہیں؟“ شہر یار کے متوجہ ہونے پر اقبال نے پوچھا۔

”شاید اپنی زندگی کی سب سے خوب صورت صبح!“ شہر یار نے بہت چٹائی سے جواب دیا۔

”ہاں، یہاں صبح بہت خوب صورت ہوتی ہے۔ خاص طور پر ساری زندگی شہروں میں گزارنے والوں کو تو یہاں آکر الگ ہی مزہ آتا ہے۔“ اقبال باجوہ شہر یار کی زبان سے تعریف سن کر خوش ہو گیا۔ وہ یہاں فارلست آفسر تھا اور جنگل کی تعریف اسے اپنی ہی تعریف لگتی تھی چنانچہ وہ شہر یار کو جنگل کے بارے میں مزید معلومات بھی فراہم کرنے لگا۔

”یہ جنگل اپنی نوعیت کے اعتبار سے بڑا منفرد ہے۔ یہاں صحرائی علاقے بھی ہیں، کھلے جنگل بھی اور آبی ذخائر بھی۔ ہر آباد سے جو نہر گزرتی ہے وہ زمین سے تو ہو کر جانی ہے۔ ماحول کے اس تنوع کی وجہ سے یہاں کا ماحول اور باتیں بھی بڑا متنوع ہے۔ یہاں بے شمار قسم کے درخت، پودے اور جڑی بوٹیاں پائی جاتی ہیں۔ جانوروں میں چکراہ، غزال، باڑو، نل گائے، جنگلی سور، جنگلی بلی، ریشمی بلی، بھینر، لکڑ، لومڑی، نیولا، چیتل سب ملتے ہیں۔ آبی ذخائر میں پھلیوں کی بہت سی اقسام موجود ہیں۔ ساتھ ہی قسم کی پھلیں، HERONS, EGRETS، تیتھر، نکور، شاہین، شکرے، گدھ، بد، مرغ ذرین، عقاب، چیل اور کنگ فشر بھی پائے جاتے ہیں۔ ابھی ہم کار شروع کریں گے تو آپ کو مزہ آجائے گا۔ تیتھر تو یہاں بہت ہے اور ہم زیادہ تر اسی کا شکار کرتے ہیں۔ بڑے جانوروں جیسے چکراہ، غزال اور باڑو کی آبادی ذرا کم ہے اس لیے ان کے شکار پر پابندی حاکم کر دی ہے حکومت نے۔ سال میں ایک بار جنگل سے پرست دیتے ہیں اس کے لیے۔ ویسے میں اس جنگل پر حریہ زیرِ سر کرانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ مجھے شک ہے کہ یہاں جو چھوٹا سا مہاڑی سلسلہ ہے اس میں HOMONIDS جیسے میمونز اور APES وغیرہ کے فاسٹیل سکتے ہیں۔“

”اچھا، پھر تو اس جنگل کو نیشنل پارک کا درجہ ملنا چاہیے۔“ شہر یار کو اندازہ تھا کہ اقبال باجوہ جنگل کی خصوصیات بیان کرنے میں کچھ حد سے تجاوز کر گیا ہے خصوصاً یہ فاسٹیل پارک ڈیوالی بات تو کہیں سے سچ نہیں لگتی تھی۔ اس سلسلے میں چن چن نیشنل پارک کا نام سامنے آتا تھا اور اس کی اس خصوصیات کے پیش نظر 1989ء میں اسے نیشنل پارک کا درجہ دیا جاتا تھا۔

”ملنا تو چاہیے مگر اقوام متحدہ کی کچھ شرائط ایسی ہیں جن کے مطابق یہ جنگل نیشنل پارک کی تعریف پر پورا نہیں اترتا۔ کچھ رقبے وغیرہ کا مسئلہ ہے۔“ اقبال باجوہ نے بات کو آٹا۔

اسی وقت ان لوگوں کو تاشے کے لیے لے کر جانے لگا تو وہ دونوں تاشے کے لیے چلے گئے۔ ہلکے پھلکے تاشے کے بعد وہ لگ بھگ کے لیے تیار تھے۔ انہوں نے جنگل کے اس حصے کا رخ کیا جہاں اقبال باجوہ کے مطابق تیزوں کی بہتات تھی۔ پھر پھر کو تیتھر شکار کرنے کے مقابلے میں شنگ میں زیادہ دلچسپی لے لے وہ ایک شنگ راڈ لے کر نہر کے کنارے چلے گئے۔ چودھری افکار کا ایک ملازم اس کے ساتھ تھا۔ جنگل کی خطرناک جانوروں کی بہتات نہ ہونے کی وجہ سے وہ

لوگ زیادہ فکر مند نہیں تھے لیکن پھر بھی ارد گرد کے ماحول سے باخبر رہنا ضروری تھا۔ نہر میں اقبال باجوہ کی دلی کی اطلاع پہنچی تو پھلیوں کی بہتات میں بھی لیکن پھر بھی وقفہ وقفے سے کوئی پھلی کا نکلنے میں پھنس ہی جاتی تھی۔

”سری ادرہ نکلیں۔“ شہر یار بہت دیر سے کوئی پھلی نہ پھنسنے کے باعث کچھ بے چین ہونے لگا تھا، اب اس کے ساتھ موجود چودھری افکار کے ملازم نے تقریباً سرگوشی میں اسے مخاطب کرتے ہوئے ایک جانب اشارہ کیا۔ شہر یار نے اس کے اشارے کے تعاقب میں نظر دوڑائی۔ ان لوگوں سے کافی فاصلے پر نہر کے پانی میں پھولے ہوئے بھاری جسم کا، بھوری رنگت والا جانور تیرتا ہوا کنارے کی طرف آ رہا تھا۔ جانور کے سینوں کی لمبائی بہت زیادہ تھی لیکن وہ شکار دار اور مضبوط نظر آتے تھے۔ شہر یار مہبوت سا دے دیکھتا رہا۔

”پاڑو ہے۔ عموماً شام کے بعد یا بہت صبح سویرے غذا کی تلاش میں اپنی پناہ گاہ سے نکلتا ہے۔ پتا نہیں ہے کیسے اس وقت نکل آیا؟“ ملازم نے ایک بار پھر سرگوشی میں شہر یار کی معلومات میں اضافہ کیا۔ شہر یار اسے کوئی جواب دیے بغیر پاڑو کو دیکھنا رہا جواب نہر کے پانی سے نکل کر کنارے پر آئی تھی گھاس کے درمیان آ بیٹھا تھا۔ گھاس میں جیسے ہونے کے باعث اب شہر یار اسے صاف طور پر دیکھ سکتا تھا لیکن اس کی موجودگی بہر حال محسوس ہوتی تھی۔ اسی وقت کہیں قریب ہی سے دھام میں کی آواز کوئی اور گھاس میں چھپا بیٹھا پاڑو بری طرح اچھلا۔ شہر یار نے دیکھا کہ اس کے جسم سے خون بہہ رہا ہے۔ وہ بے ساختہ ہی شنگ راڈ ہاتھ سے چھوڑ کر اس کی طرف بھاگا۔ دوسری طرف سے چودھری افکار کا ایک ملازم بھی دوڑتا ہوا آیا۔ اس کے ہاتھ میں تیز دھار کی چھری تھی جو اس نے تڑپتے ہوئے پاڑو کے قریب پہنچ کر اس کی گردن پر پھیر دی۔ شہر یار حد سے کسی حالت میں اس خوب صورت جانور کے ذبح ہونے کا منظر دیکھتا رہا۔

”شان دار چودھری صاحب! بہت ہی پرفیکٹ نشانہ لگا! آپ نے...“ انیس فی مہم ہارڈی آؤ شہر یار کے کانوں میں پہنچی تو وہ اپنی کم مہم کیفیت سے باہر آیا۔ چودھری افکار بندوق ہاتھ میں لیے فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ سامنے ہی کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ مہم ہارڈ، اقبال باجوہ اور ملازمین بھی تھے۔ ملازمین مل کر ذبح شدہ جانور کو سنبھالنے لگے۔

”کیوں شہر یار صاحب! کیا لگا آپ کو ہمارا نشانہ؟“ شہر یار کو متوجہ ہوتے دیکھ کر چودھری افکار نے اس سے پوچھا۔

”آپ تو کہہ رہے تھے کہ یہاں چکارہ اور پاڑہ کے شکار پر ان دنوں باندی ہے۔“ چودھری افتخار کو نظر انداز کر کے شہر پارہ اقبال باجوہ سے مخاطب ہوا۔

”نئی ہاں باندی تو ہے لیکن چودھری صاحب دور سے اعزاز نہیں کر پائے کہ یہ پاڑہ ہے۔ بس انہوں نے گھاس میں اس کی جھلک دیکھ کر فائر کر دیا۔“ اقبال باجوہ فاریسٹ آفیسر ہوتے ہوئے بھی ایک ایسے جانوری ہلاکت پر جس کے شکار پر باندی عائد تھی، یہ ناظر آ رہا تھا۔

”یہ اچھا نہیں ہوا۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔“ شہر پارہ کو سخت متاثر تھا۔

”آپ فخر مت کریں شہر پارہ صاحب! پاڑہ کوئی اتنی نایاب نسل کا جانور نہیں ہے۔ پاکستان کے تقریباً چاروں صوبوں میں ہی پایا جاتا ہے۔ یہاں باندی اس لیے ہے کہ یہاں بے ڈرامہ تعداد میں ہے۔ لیکن بہر حال، ایک جانوری ہلاکت سے زیادہ فرق نہیں پڑتا۔“ اقبال باجوہ مکمل طور پر مطمئن تھا۔

”فرق کیسے نہیں پڑتا باجوہ صاحب؟ آپ فاریسٹ آفیسر ہیں۔ مجھ سے زیادہ آپ جانتے ہوں گے کہ اس ”فرق“ کیسے پڑتا۔“ کی گردان نے ہمیں ماضی میں کتنا نقصان پہنچایا ہے۔ بلکہ بیک (کالافراڈ) کے قصبے سے کون واقف نہیں۔ کسی زمانے میں چولستان کے علاقے میں ان کی کثرت تھی۔ پھر کیا ہوا؟ ہم لوگوں نے انہیں اتنی کثرت سے شکار کیا کہ ہمارے ہاں سے ہرنوں کی یہ نسل ہی معدوم ہو گئی۔ وہ تو نواب آف بہاولپور کے امریکا کو تحفے میں دیے گئے 35 کالے ہرنوں کی وجہ سے بات بھی۔ ہم نے اپنے جس قیمتی جانور کو ختم کر ڈالا تھا، اس کی امریکیوں نے اتنی اچھی طرح افزائش کی کہ بعد میں ہمیں ہی دس ہرن بھجوا دیے۔ اب ہم انہیں سنہالے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ نہ جانے ہمارے غیر بنیاد رو بہ کیوں ختم نہیں ہوتا کہ ہم پہلے اپنی چیزوں کی قدر نہیں کرتے، بعد میں ان کے حصول کے لیے دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔“ شہر پارہ کو پاڑہ کی ہلاکت اور اقبال باجوہ کے بے پروا انداز پر اتنا افسوس ہوا کہ وہ اچھی خاصی تھری کر گیا۔

”اب جو ہو گیا سو ہو گیا اے سی صاحب! میں اپنی اس فطرت کے لیے حکومت کو جرمنا داکر دوں گا۔“ شہر پارہ خاموش ہوا تو چودھری افتخار نے غصت سے کہتے ہوئے بات ختم کر دی۔ اس کے ماتھے پر بڑے ہوئے شل دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ اسے شہر پارہ کی یہ تقریر بہت بری لگی ہے۔ شہر پارہ

نے زیادہ پروا نہیں کی اور ان لوگوں کے ساتھ واپس اپنے پڑاؤ پر آ گیا۔ یہاں ملازمین نے پاڑہ کی کھال اجاگر کر اسے بھونکنے کے انتظامات شروع کر دیے۔ دو چار تیر اور شہر پارہ کی شکاری کٹی چھپلاں بھی وہ پیر کے کھانے کے بیٹوں میں شامل تھیں۔ کھانا تیار ہونے کے بعد لگا گیا تو شہر پارہ نے بسنے ہوئے پاڑہ پر گلو فٹنگ نہیں ڈالی۔ اگرچہ ”مضم“ تازہ اور اقبال باجوہ کو کوشش کر رہے تھے کہ فضا خوش وگوار رہے لیکن شہر پارہ اور چودھری افتخار کے آنے سوڈ کی وجہ سے فضا کمدری ہی تھی۔ شام سے قبل ان لوگوں نے اپنا سامان سمیٹ کر واپس کی تیاری کر لی۔ شہر پارہ جس جیب میں بیٹھا تھا اس میں چودھری افتخار بھی موجود تھا۔

”آپ کے لیے ایک خوش خبری ہے اے سی صاحب! میں نے آپ کے مشورے پر غور کرتے ہوئے اپنے علاقے کی ترقی کے لیے کچھ اقدامات کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میری ایک موبائل چینی والوں سے بات ہوئی ہے۔ وہ چاروں میں وہ ہمارے علاقے میں اپنا کاروبار شروع کر دیں گے۔ آپ دیکھیں نا، یہاں اردگرد کے علاقے میں ابھی تک موبائل سروس شروع نہیں ہوئی ہے۔ میں یہ کام کروانے والا پہلا بندہ ہوں گا۔“ جیب جھنگ کی حدود سے نکلنے والی تھی جب چودھری افتخار نے شہر پارہ کو یہ اطلاع دی۔ شہر پارہ اس اطلاع پر اس کا منہ نہکتا رہ گیا۔ اسکول، اسپتال اور سڑک جیسی بنیادی ضروریات کو چھوڑ کر چودھری افتخار کو ترقی کے نام پر اگرچہ کرنے کا خیال آیا ابھی تھا تو اپنے علاقے میں موبائل سروس شروع کروانے کا... اودہ واقعی ایک بے حد ہوشیار شخص تھا جو اپنے دامن پر گئے الزامات کے داغ ایک ایسے طریقے سے مٹانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کے کلوم افراد اس کی گرفت سے ہرگز نہ نکلنے پائیں اور کچھ نہ کچھ کام ہوتا ہو بھی نظر آئے۔

☆☆☆

خدا خدا کر کے زہرہ کی شادی ختم ہو گئی۔ ماہ بانو نے بہت ڈرتے ڈرتے اس شادی میں شرکت کی تھی۔ سارا وقت یہی دھڑک لگا رہتا تھا کہ حویلی سے بلا نہ آجائے۔ مگر خیر گزری تھی کہ اس موقع پر بڑی چودھرائی کو اپنی تحریراتی جتانے کے لیے ماہ بانو کو بلانے کا خیال نہیں آیا تھا۔ شاید شادی والے گھر کا سوچ کر کچھ غلط کر گئی تھی۔ ماہ بانو ڈرائی تھی کہ بڑی چودھرائی نے اگر بلا یا تو حویلی جانا پڑے گا اور حویلی میں چودھری افتخار بھی ہوتا جو موقع دیکھتے ہی دوبارہ ماہ بانو کو شکار کرنے کی کوشش کرتا۔ شادی والے دن ماہ بانو کو اطلاع

ملی کہ چودھری افتخار شکار پر گیا ہوا ہے۔ اس اطلاع کو سن کر اس کا دل پر سکون ہو گیا۔ اس نے آرام سے شادی اور ویسے کی تقریبات میں شرکت کی اور بے شددہ پروگرام کے مطابق ویسے کی دعوت سے واپس آنے کے بعد واپسی کے لیے اپنے سامان بیٹھے لگی۔

”دیس! ادھر آؤ۔ اہ... میری ایک بات تو سن۔“ حوراء نے اس کی مصروفیات دیکھ کر گھٹکھٹا کرتے ہوئے اسے آواز دی۔

”آئی ہوں بے بے! بس یہ آخری دو جوڑے بھی بیک میں رکھ لو۔“ ماہ بانو نے مصروف سے انداز میں جواب دیا اور جلدی جلدی کپڑوں کی تہ لگا کر انیس بیک میں رکھ کر زپ بند کرنے کے بعد اس میں دو چھوٹا سا تالا بھی لگا دیا جو وہ گاؤں آتے وقت حوراء کی ہدایت پر سامان کی حفاظت کے خیال سے لگا کر لائی تھی۔

”ہاں بے بے! اب بولو کیا بات ہے؟ امانے کیا بتایا ہے، کب تک لٹنا ہے؟ اب تو ویسے بھی شام سر پر آ گئی ہے زیادہ دیر ہو گئی تو پھر ہمیں محل تک رکنا پڑے گا۔“ ماہ بانو حوراء کے قریب آ بیٹھی۔ اس کی وقت کرنے میں وہ دونوں ہی موجود تھیں۔ حوراء باہر آگئیں میں ویسے میں شرکت کرنے کے بعد ساتھ گھر آجائے والے مہمانوں کے ساتھ مصروف تھی۔ حوراء اور صدر کے سوا وہاں گاؤں سے باہر کا تو کوئی فرد نہیں آیا ہوا تھا اس لیے کسی کے وہاں شب بصری کا کوئی امکان نہیں تھا۔ بس گاؤں میں ہی رہنے والے برادری کے کچھ لوگ تھے جو اس وقت ساتھ گئے تھے اور آگئیں میں بھی چار یا پانچ پر بیٹھے کب کب رہے تھے۔

”بات یہ ہے دیکھ کہ میں اور تیرے ابو تو ابھی تھوڑی دیر بعد فیمل آباد کے لیے نکلنے والے ہیں لیکن تیرے ابا نے کہا ہے کہ ماہ بانو سے کہو دو چار دن سہیل گھر جائے۔ تیرے کان میں وہ تیری چھٹی کی درخواست پہنچا دیں گے۔“

”مگر کیوں؟ میں کس لیے رگوں یہاں؟ میں تو نہیں رگوں کی۔“ بچھے واپس جانا ہے آج اور ابھی۔“ ماہ بانو کا رد عمل حوراء کی توقع کے مطابق تھا۔

”ختم نہ کر میری اگلی دمی! اچھا غیث نے خود تیرے پاس کہا ہے کہ ماہ بانو کو دو چار دن کے لیے گاؤں چھوڑ جاؤ۔ سو چار دنوں کے بعد ہم غیث خود بچھے واپس فیمل آباد لاکر چھوڑ دے گا۔ ابھی اسل میں ادھر کی لڑکی کی ضرورت ہے۔ مارا گھر پھیلا ہوا ہے۔ اکیلی نوراس بے چاری یہ سب کیسے چھلے گی؟ اسے حویلی کے کام سے بھی جانا ہوتا ہے۔ بیاہ

کے دنوں میں یہ تین دن کی چھٹی بھی بڑی مشکل سے سنت ساجت کے بعد کی تھی۔ مکمل سے اسے کام پر جانا ہوگا۔ ایسے میں تیرا فرض بنتا ہے کہ ماں کا ساتھ دے۔ اگر شکاری طبیعت ٹھیک ہوتی تو وہ ہی رک جاتی دو چار دن کیسے میں لیکن اس کا جی اچھا نہیں ہے۔ بڑی مرادوں کے بعد تو اسے یہ وقت دیکھنا نصیب ہوا ہے۔ اللہ خیر ہے اس کا یہ وقت نکالے۔ اس کی ساس تو ایک دن بھی اسے یہاں رکنے کے لیے نہیں بھیجے گی۔ دیکھا نہیں کہ شادی کی تقریبات میں بھی اپنے ساتھ لائی لے جاتی رہی ہے۔ اب لے دے کہ ایک تو ہی ہے جو نوراس کا ساتھ دے سکتی ہے۔“ حوراء ماہ بانو کو سمجھانے لگی۔

”مگر بے بے! میرا یہاں اکیلے دل نہیں لگتا۔ تم بھی رک جاؤ یہاں میرے ساتھ۔“ ماہ بانو نے قریباً ہلکی ”میرا انا دل چاہتا ہے کہ رک جاؤں لیکن تیرے ابا کو مشکل ہو جائے گی۔ دو وہاں اکیلا ہوگا تو کون اس کے کھانے پینے کا خیال کرے گا۔ اور تو جانتی ہے کہ تیرا ابا اب مزید یہاں نہیں کر سکتا۔ جتنے دن کا نافہ ہو گیا ہے اس سے ہی کاروبار کو بڑا نقصان پہنچا ہے۔ نانے سے اچھے بھلے بندے سے ہوئے گا کب ٹوٹ جاتے ہیں۔“ حوراء بالکل سمجھ کر رہی تھی۔ صدر بازاڑ میں جہاں پھلوں کی ریڑھی لگا تھا وہاں دوسرے بھی کی پھل خریدوں کی ریڑھیاں ہوتی تھیں۔ صدر ان سب میں سب سے زیادہ صاف تھرا اور اچھا مال رکھتا تھا اور قیمت بھی مناسب لگا تھا اس لیے اس کا کام زیادہ اچھا چلتا تھا۔ بڑی بڑی کاروں میں آنے والے بھی صدر کے ٹھیلے پر سے پھل خریدنے ناپسند کرتے تھے۔ لیکن ظاہر ہے، یہ سارے لوگ صدر کے انتظامات میں بھل خریدنا اور کھانا تو نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ صدر نہ تو وہ کسی اور ٹھیلے یا دکان سے خریداری کر لیتے۔ نقصان تو صدر ہی کا تھا اس لیے وہ جلد از جلد واپس جانا چاہتا تھا۔

”تم نے اور ابا نے مجھے دھوکا دیا ہے بے بے! تم نے مجھ سے کہا تھا کہ دینے والے دن مجھے اپنے ساتھ ہی واپس لے جاؤ گے اور اب مجھے زبردستی یہاں چھوڑ کر جا رہے ہو۔“ ماہ بانو کا کچھ اور سن نہ چلا تو حوراء سے شکوہ کرتے ہوئے روٹنے لگی۔

”میری بھجوری کو کچھ میری بیگ دمی! میں اور تیرا ابا بھلا غیث کو انکار نہیں کر سکتے۔ اگر تم نے اس کی بات نہیں مانی تو اس کا کچھ بھروسہ نہیں کہ صاف بول دے کہ ماہ بانو میری بیٹی ہے، اسے تم تم لوگوں کے ساتھ نہیں جانے دیتا۔

اب یہ ہمیشہ ہمیں رہے گی۔ ذرا سوچا اگر بھاغیا تھے اسکی کوئی بات کر دی تو ہم کیا کریں گے؟ "خود اسی خوف میں جلا جی جس میں لے پاک بچوں کے ماں باپ سدا جلتا رہتے ہیں۔

"ایسے کوئی کیسے بردستی روک سکتا ہے مجھے؟ میں تو نہیں روکن گی۔" ماہ باور دنا چھوڑ کر چل کر پوئی۔

"تو ابھی نادان ہے۔ تیری سمجھ میں ہے یا نہیں نہیں آسکتیں۔ پھر تو نے بھاغیا ت کو سچ سے دیکھا بھی کہاں ہے۔ شخص میں اس کی آنکھ سے ساری مرآت اور لگاؤ ختم ہو جاتے ہیں۔ بہتری اسی میں ہے کہ اس کی بات مان لی جائے۔" خود اس نے ماہ باور کو جواب دیا۔ ماہ بانو نے مزید کچھ بولنے کے لیے لب کھولے لیکن حور ان کے اسے بولنے نہیں دیا۔

"میں میری دلی اب کچھ نہیں بولنا۔ بس چو میں نے کہہ دیا اسے مان لے۔" اب ماہ بانو باطل مجبور بھی تھوڑی دیر بعد حور ان اور صفدر اسے پیاد کر کے رخصت ہو گئے۔ وہ بچے ہوئے دل کے ساتھ گھر میں پہلا بکھرا دیا سینے کی۔ مہمانوں کی اکثریت رخصت ہو چکی لیکن چند افراد ابھی تک بیٹھے ہیں ڈار رہے تھے۔ ادھر ادھر حرکت کرتی ماہ بانو کے کافوں میں بھی ان کی آواز پڑ رہی تھی۔

"بیرس کار کی برکت سے ہماری تو ساری مشکلیں دور ہو گئیں۔ نگاہی طرف سے قلمی، بیرس کار کی قبر پر منت مانتے ہی اس کی طرف سے خوش خبری مل گئی۔ ادھر اپنی زہرہ کے بیاہ کے لیے کوئی تیاری بھی لیکن اس کے لیے بھی وسیلہ بن گیا۔ چودھری صاحب نے پچھلا قرض باقی ہونے کے باوجود زہرہ کے بیاہ کے لیے قرض دے دیا۔ میرا تو ایمان پکا ہو گیا ہے بیرس کار کی کرامت پر۔ اگلے برس عرس ہو گا تو خوب نذر چڑھاؤں گی ان کی درگاہ پر جا کر۔" ماہ بانو باور پچی خانے میں برتنوں کے ڈیمر سے الجھ رہی تھی جب اس نے حور ان کو نہایت عقیدت سے کہتے سنا۔ ماہ بانو کو اپنی قسم دینے والی ماں کی ضیف العنیدی پر افسوس ہوئے لگے۔ بھائی اس کے کہ وہ اپنی شکایت مل ہوئے پرانے کا شہر ادا کرتی... کبھی بیرس کار کے گن گار ہی تھی۔ اس کی یہ عقیدت مندی کی باقی سینے والوں کا ایمان مزید کمزور کرنے میں اہم کردار ادا کر چکی تھی۔

"بیرس کار کی تو کیا ہی بات ہے۔ وہ مہمان ہو جائیں تو کالا چور بھی آدمی کا بعد رو بن جائے۔ وہ قصہ سنا ہے تم لوگوں نے کہ ایک کھار بے چارے کا ہاتھ کسی حادثے میں ٹوٹ گیا۔ اب ٹوٹے ہوئے ہاتھ سے بے چارہ کیا کام کرتا اور

"اپنے چودھری صاحب پر بھی ان کے دادا حضور کی بڑی نظر کرم ہے۔ دیکھا نہیں ہے کہ کسے پھل پھول رہے ہیں۔ خیر، کسی تو پہلے بھی کوئی نہیں تھی لیکن بیرس کار کے کرم سے ان کا نصیب اتنا بلند ہے کہ جس کام میں ہاتھ ڈالنے ہیں فائدہ ہی پاتے ہیں۔ اب شکار کا ہی قصہ سنو۔ چودھری صاحب اپنے دوستوں کو لے کر شکار پر گئے تھے۔ گھر سے نکلے تھے کہ بس ذرا جنگل میں گھومنے پھرنے کی تفریح رہے گی اور تھروں وغیرہ کا شکار کر کے واپس آجائیں گے لیکن ادھر تو ان کے ہاتھ پاؤہ لگ گیا۔ اب پاؤہ... پاؤہ دن کی روشنی میں بھی باہر نکلتے ہیں لیکن چودھری صاحب کے ساتھ جانے والوں نے بتایا کہ ایک موٹا تازہ پاؤہ دن دیکھا ہے

چودھری صاحب کے سامنے ایسے آگیا جیسے کسی نے اسے ان کی خدمت میں بھیجا ہو... کہ لو اس سے اپنے مہمانوں کی رخصت کرو۔ رات لگ رہی وہ لوگ واپس آئے ہیں شکار سے۔ ساتھ جانور کی کھال اور اس کی منڈی بھی ہے۔ چودھری صاحب دونوں چیزوں کو محفوظ کر دیا اپنے ڈرائنگ روم میں سجانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔" سارا قصہ سنانے والا تو عقیدت مندی میں ڈوبا ہوا تھا لیکن ماہ بانو کے ہاتھ پاؤں من پڑنے لگے۔ وہ جو ایک اطمینان تھا کہ چودھری افکار گاؤں میں موجود نہیں، اس قصہ کو سن کر رخصت ہو گیا اور وہ اپنے ارد گرد منڈلا لے خطرے سے محسوس کرنے لگی۔ چودھری افکار شکاری تھا اور شکاری کسی بھی اپنے شکار کو چھتے سے نہیں جانے دیتا۔ وہ دے قدموں سے اس کے تعاقب میں اس وقت تک لگا رہتا ہے جب تک اسے شکار نہ کر لے۔ ماہ بانو سمجھ سکتی تھی کہ چودھری افکار کچھ سے گھات لگائے اسے شکار کرنے کے لیے تیار بیٹھا ہے۔ اس کا یہ اعزاز غلط جاہت نہیں ہوا۔ مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد بھی الامکان کام مینے کے بعد جب سب گھر والے بستر پر لیٹے تو ماہ بانو نے رات کی خاموشی اور اندھیرے میں ہونے والی وہ آواز سنی۔ آواز ایسی تھی جیسے کوئی دیوار پھلا گئے کر اندر گھو۔ ماہ بانو کی ریدھ کی لمبی میں سسٹناٹ دوڑ گئی۔ خدشوں اور اندیشوں نے اس کی نیند پہلے ہی اڑا کر رکھی تھی۔ شہید شکن کے باوجود اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اب جو اس نے دھمکائی تو پوری جان سے کاپ کی گئی وہ پہلے ہی لے کر چلی گئی چودھری کے لیے تر تو ال ثابت نہیں ہوئی۔ سناہی دینے والی آواز واقعی کسی انسان کے کونے کی ہے یا کسی دیو غیرہ نے جھلاٹ لگائی ہے، پہلے یہ تعجب ہی کرنا ضروری تھا۔ ماہ بانو جیسے سے اپنے بستر سے نیچے تک گئی۔ بستر چھوڑنے سے پہلے اس نے اپنے گرد بڑی سی سیاہ چادر لپیٹ لی تھی۔ وہ رینگتی ہوئی بنا آہٹ کے کمرے کے دروازے تک گئی اور اندھیرے میں ڈوبے آنکھ کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ پہلی نظر میں اسے کچھ دکھائی نہیں دیا مگر پھر اس نے قدموں کی آہٹ سے دیوار پھلا گئے والے کو پایا۔ وہ بے قصوں سے چٹا ہوا بڑی دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ماہ بانو سمجھ گئی کہ باہر کچھ اور افراد بھی موجود ہیں جنہیں وہ اندازہ نہ کھول کر اندر بلا دیا جاتا ہے۔ وہ تیزی سے حرکت لگائی اور کمرے کے دروازے سے نکل کر باور پچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔ سیاہ چادر کی وجہ سے اس کا وجود انور سے کا جڑو ہوتا تھا اور یوں بھی دیوار پھلا گئے آئے

"وہیں رک جاؤ۔ خبردار جو کسی نے مجھے ہاتھ لگایا۔ میں خود تم لوگوں کے ساتھ چل رہی ہوں۔" ماہ بانو نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روکتے ہوئے سخت کچھ بھی کہا اور اپنے قدم آگے بڑھا دیے۔ آنے والے اس کے اس انداز پر حیران رہ گئے مگر پھر وہ بھی چل پڑے۔ آنکھ میں نور ان، غیاث اور دس سال الیاس ہر اسان کھڑے تھے۔ ہندوئی تانے ایک شخص ان کے سر والی ہر سوار تھا۔

"خبردار اگر اپنی بیٹی کی زندگی جاچے ہو تو منہ بند رکھنا۔ سچ نہیں تمہاری بیٹی زندہ مل جائے گی۔ اگر زبان کھولی تو پھر اس کی لاش ہی پاسکو۔" جس شخص نے ماہ بانو کو اٹھانے کا حکم دیا تھا، اس نے ہی باور صبح میں ان بیٹیوں کو دھمکی دی اور وہ لوگ باہر نکل آئے۔ ماہ بانو کو انہوں نے جب اس کی سیٹ پر بٹھا یا تھا اور اس پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھے۔ ان کے لیے یہ حیرت کی بات تھی کہ ایک لڑکی کو اغوا کیا جا رہا

والے کارخ اس کے بجائے دروازے کی طرف تھا اس لیے اسے باور پچی خانے تک پہنچنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ بغیر دروازے کا یہ باور پچی خانہ اسے ہرگز پناہ نہیں دے سکتا تھا۔ وہ وہاں پناہ لینے آئی تھی لیکن جس نے اسے چودھری افکار کے گاؤں میں موجود ہونے کا سن کر اس نے اس قسم کی صورت حال میں گھرنے کی صورت میں پہلے ہی اپنے ذہن میں ایک لائحہ عمل طے کر لیا تھا اور اب وہ بہت خاموشی سے اس پر عمل پیرا تھی۔ اپنی اس مصروفیت کے دوران اس کے کان باہری طرف بھی گئے ہوئے تھے۔ آنے والے اندر آچکے تھے اور ان کے قدموں کی آواز سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ جن چار سے کم نہیں۔ ڈراور میں ماہ بانو نے نور ان، غیاث اور اپنے چھوٹے بھائی الیاس کی گھبراہٹی ہوئی آوازیں سیں۔ پھر ان آوازوں میں اس نے کچھ ابھری آوازیں بھی سیں۔ یقیناً وہ لوگ اسی کے بارے میں استفسار کر رہے تھے۔ ماہ بانو جانتی تھی کہ انہیں اس تک پہنچنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ اسے اب پروا بھی نہیں تھی۔ جو کچھ کرنا تھا، وہ کر چکی تھی اور اب اطمینان سے باور پچی خانے کی دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ آخر ان میں سے ایک وہاں پہنچ گیا۔

"یہی... یہاں چھپی ہوئی ہے۔" ماہ بانو کو دیکھتے ہی اس نے اپنے ساتھیوں کو اطلاع دی۔ وہ بندے بھاگتے ہوئے تھڑکی سے وہاں آئے۔ ان سب نے اپنے چروں کو ڈھانٹوں سے چھپا رکھا تھا۔ "اٹھا لو اسے اور جیب میں ڈالو۔" آنے والوں میں سے ایک نے حکم دیا اور وہ بندے ماہ بانو کی طرف بڑھے۔

"وہیں رک جاؤ۔ خبردار جو کسی نے مجھے ہاتھ لگایا۔ میں خود تم لوگوں کے ساتھ چل رہی ہوں۔" ماہ بانو نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روکتے ہوئے سخت کچھ بھی کہا اور اپنے قدم آگے بڑھا دیے۔ آنے والے اس کے اس انداز پر حیران رہ گئے مگر پھر وہ بھی چل پڑے۔ آنکھ میں نور ان، غیاث اور دس سال الیاس ہر اسان کھڑے تھے۔ ہندوئی تانے ایک شخص ان کے سر والی ہر سوار تھا۔

"خبردار اگر اپنی بیٹی کی زندگی جاچے ہو تو منہ بند رکھنا۔ سچ نہیں تمہاری بیٹی زندہ مل جائے گی۔ اگر زبان کھولی تو پھر اس کی لاش ہی پاسکو۔" جس شخص نے ماہ بانو کو اٹھانے کا حکم دیا تھا، اس نے ہی باور صبح میں ان بیٹیوں کو دھمکی دی اور وہ لوگ باہر نکل آئے۔ ماہ بانو کو انہوں نے جب اس کی سیٹ پر بٹھا یا تھا اور اس پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھے۔ ان کے لیے یہ حیرت کی بات تھی کہ ایک لڑکی کو اغوا کیا جا رہا

تھا اور وہ بغیر کوئی داویلا کے ان کے ساتھ چلنے پر راضی ہو گئی تھی۔

”شاید پیٹرول کی بوتل کا ڈھکن ڈھلا ہو کر اس سے پیٹرول گر گیا ہے۔ مجھے جیب میں پیٹرول جیسی بو آ رہی ہے۔“ تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہی جیب ڈرائیو کرنے والے نے خیال ظاہر کیا۔

”تو تو ہمیں بھی آ رہی ہے لیکن ابھی رکے بغیر چلنے رہو۔ بعد میں آرام سے دیکھیں گے۔“ پچھلی نشست سے جواب دیا گیا۔ ماہ بانو ان سے بے نیاز بنی باہر کی طرف دیکھتی رہی۔ باہر اندھیرا تھا لیکن پھر بھی اسے اندازہ ہو گیا کہ جیب کا رخ حویلی کی طرف نہیں۔ وہ حویلی کے راستے سے ہٹ کر نہر کے ساتھ ساتھ دوڑ رہی تھی۔ یعنی اسے افواہ کروانے والا چودھری افتخار کے سوا بھی کوئی اور ہو سکتا تھا۔

ماہ بانو کے ذہن میں یہ خیال آیا اور پھر اس نے خود ہی اس خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ چودھری افتخار کے سوا کوئی دوسرا شخص نہیں تھا جس کی اس پر نظر ہوئی۔ اس رات تو اتفاقاً اسے حویلی کے اندر ہی ماہ بانو سے دست درازی کا موقع مل گیا تھا لیکن یقیناً عام حالات میں یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ حویلی میں اپنی بیویوں اور دیگر اہل خانہ کی موجودگی میں ایک لڑکی کو افواہ کروا کر اس کے ساتھ داخلہ دیتا۔ اپنے اس قسم کے مذموم مقاصد کے لیے یقیناً اس نے کوئی دوسرا اھکا بنا رکھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ لوگ اپنی منزل پر پہنچے تو ماہ بانو کے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ ڈھانا پوشوں نے اسے جس کمرے میں پہنچایا، وہاں چودھری افتخار اس کا منتظر تھا۔ ماہ بانو کو سامنے پا کر وہ کل اٹھا۔

”بہت تر پایا تو نے ہمیں۔ اس رات چکنی پھلی کی طرح ہمارے ہاتھوں سے پھسل گئی لیکن دیکھ ہم پھر تجھے پکڑنے میں کامیاب ہو گئے۔“ اپنے ہاتھ میں موجود شراب کا جام اُہراتے ہوئے اس نے ایک خوشی بھرا قبضہ لگایا۔ ماہ بانو کوئی جواب دیے بغیر خاموش کھڑی رہی۔ اس کے انداز میں عجیب سی بے نیازی اور بے پروائی تھی۔ چودھری افتخار غصہ کا اور غور سے اسے دیکھا۔

”کیا بات ہے؟ آج بڑی چپ ہے۔ نہ کوئی شور نہ گالی گلوچ۔ میں تو سمجھا تھا میرے بندے تیرے ہاتھ جبر باندھ کر تجھے میرے سامنے لا کر پھینکیں گے لیکن تو تو خود اپنے قدموں پر چل کر آئی ہے۔“

ماہ بانو اس بار بھی خاموش رہی۔

”چل ابھی بات ہے کہ تجھے خود ہی عقل آگئی۔ خاموشی

سے میری بات مان لینے میں ہی حیران فائدہ ہے۔ پر یہ تو بتا کر اب اس چادر میں پٹی ہمارے ضبط کو کیوں آزماری ہے۔ دور پھینک اس چادر کو اور یہاں میرے پاس آ۔“ چودھری افتخار کی اس فرمائش پر ماہ بانو نے اپنے گرد مضبوطی سے پٹی چادر کو سر کیا۔ سامنے سے چادر ہٹتی تو اس کی گریبان سے دامن تک پچھلے غم کی نقیص ظاہر ہو گئی لیکن چودھری افتخار کی نظر اس کی نقیص کے بجائے اس کے سامنے میں ڈھلے ہوئے جسم کو ٹوٹ رہی تھی۔ چادر سرکانے کے بعد ماہ بانو نے چودھری افتخار کے دوسرے عکرم کی پیروی نہیں کی تھی۔

”اب آجانا۔ کیوں ترپاتی ہے؟“ چودھری نے ایک بار پھر اسے پکارا۔ ماہ بانو بے حس و حرکت اپنی جگہ کھڑی رہی۔

”چل اگر تو نہیں آتی تو ہم خود تیرے پاس آ جاتے ہیں۔ اتنا غرا دکھانا تو تیرا حق بنتا ہے۔“ چودھری افتخار لڑکھڑاتے قدموں سے اس کی طرف بڑھا۔

”وہی دگ جاؤ چودھری!“ ماہ بانو نے کڑکتی ہوئی آواز میں اسے سمجھنے کی اور اپنی بندھنیں کھولی۔ اس بندھن میں ماچس کی ایک ڈیڑھا سا فٹ نظر آ رہی تھی۔

”اگر شراب نے تمہارے اندر کوئی حس باقی چھوڑی ہے تو وہیں رک جاؤ اور اس بو کو سونگھو جو میرے بدن سے آ رہی ہے۔ میں اپنے بدن پر مٹی کا تیل چھڑک کر یہاں آئی ہوں۔ اگر تم نے مجھے انگلی بھی لگنے کی کوشش کی تو میں اس ماچس سے خود کو آگ لگا لوں گی۔ تمہیں مجھ سے کچھ نہیں ملے گا۔ اگر زبردستی میرے قریب آنے کی کوشش کرو گے تو خود بھی جل کر مر دو گے۔“ ماہ بانو کا کچھ اتنا بھانک تھا کہ چودھری کا سارا نقشہ ہرن ہو گیا اور وہ ٹھٹھک کر اپنی جگہ پر جم سا گیا۔

جس بو کی طرف ماہ بانو نے اس کی توجہ دلائی تھی، وہ اس نے اس کی آمد کے ساتھ ہی محسوس کی تھی لیکن شراب کے نشے اور ماہ بانو کو پانے کی ترنگ میں نظر انداز کر گیا تھا شراب اس بو کی حقیقت اسے سمجھ آ رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر ماہ بانو کا یہ خود جواز دہ لیا۔ وہ اپنے ارادے میں نہایت غیر حیران نظر آتی تھی۔ اس کا اور چودھری افتخار کا درمیانی فاصلہ اتنا تھا کہ وہ جب تک اس کے قریب پہنچ کر ماچس کی ڈیڑھا چھیننے کی کوشش کرتا، وہ خود کو آگ لگ چکی ہوتی۔ ماچس کی ڈیڑھا اور اس سے لٹکی ہوئی ایک تیلی اس کے ہاتھوں میں بائیں تیار تھی۔

چودھری افتخار نشے میں ہونے کے باوجود جانتا تھا کہ اگر یہ تیلی جل گئی تو ماہ بانو کا مٹی کے جیل میں ڈوبا وجود اتنی تیزی سے آگ کی لپیٹ میں آئے گا کہ وہ لمحوں میں جل کر پسم ہو

جائے گی۔ وہ گھٹت خوردہ سا چبچبے ہوتا۔
 ”ٹھیک ہے، اس روز بھی ایک آگ نے بھڑک کر بجھے
 بجا لیا تھا اور آج بھی تو نے ایک آگ کی دھمکی کو درمیان میں
 لا کر ہمارے قدموں کو روک دیا ہے۔ لیکن تو نہیں جانتی کہ
 ایک آگ ہمارے اندر بھی بھڑک رہی ہے جو تجھے حاصل کیے
 بغیر نہیں بجے گی۔ ابھی تو وہ ابھی چلی جائیگی یاد رکھ کہ تجھے
 صرف اور صرف چودھری افتخار کا ہی بننا ہے۔ اس بار میں اس
 راستے سے آؤں گا کہ تو مجھے روک نہیں سکے گی۔“ کچھ دیر
 خاموشی سے بیٹھنے کے بعد اس نے ماہ بانو سے کہا اور پھر اپنے
 کسی ملازم کو آواز دے کر بلایا۔
 ”اسے واپس اس کے کمر چھوڑ آ۔“ ملازم کے حاضر
 ہونے پر چودھری افتخار نے اسے حکم دیا اور ساتھ ہی ماہ بانو کو
 بھی ہاتھ کے اشارے سے جانے کا کہا۔ ماہ بانو غیر چینی کی
 کیفیت میں اپنے گرد و بارہ چادر لٹکتی باہر کی طرف بڑھی
 لیکن اس کا انداز اس ہراساں برتی کا سا تھا جو راسی آہٹ
 پر بھی چپک اٹھتی ہے کہ جانے شکاری اب کہاں سے حملہ
 کرے گا۔

☆☆☆

غیاث محمد اور نوران حیرت کی تصویر بنے ایک تک اپنے
 کمر کے آئین میں بصر سے اس سامان کو دیکھ رہے تھے جس کی
 وجہ سے ان کے لیے اپنے آئین کا منظر اب بھی ہو گیا تھا۔ رات
 سے مسلسل وہ ایسی طرح کی جڑوں کی زد میں تھے۔ پہلے ماہ
 بانو اغوا کی گئی۔ نوران نے کچھ ہی بار ماہ بانو کے ہاتھ حالت میں
 حویلی سے واپس آنے والے واقعے کی روشنی میں بھاپ لیا
 کہ یہ کارزدانی کس نے کی ہے۔ اس نے غیاث محمد کو بھی اپنے
 خیال میں شریک کر لیا۔ غیاث محمد پوری بات سن کر اس پر بے
 حد خفا ہوا تھا کہ نوران نے اسے اس واقعے سے بے خبر کیوں
 رکھا؟ اگر وہ اسے بتا دیتی تو وہ ماہ بانو کو بھی یہاں نہ روکتا۔
 ابھی ان لوگوں میں اس موضوع پر بحث چل رہی تھی کہ ماہ بانو
 صبح سلامت واپس لوٹ آئی۔ نوران اور غیاث محمد کے
 سوالوں کے جواب میں کچھ بتانے کے بجائے اس نے صرف
 ایک بات کہی کہ جس سے فیصلہ آپا دیا جائے گی۔ لیکن
 صبح ان کے لیے ایک اور حیرت بخش خبر تھی۔ چودھری افتخار کا منی
 اللہ رکھا چلوں اور منٹائی کے ٹوکروں کے ساتھ صبح کی
 وہاں آدھ کا تھا اور اس نے ماہ بانو کے لیے چودھری افتخار کے
 رشتے کا بیٹا مرنے کے ساتھ ساتھ خود ہی بھی لے کر دیا تھا
 کہ آنے والے تھے کو عصر کے بعد چودھری افتخار اور ماہ بانو کا
 نکاح ہوگا۔ بے در پے نہیں آنے والے ان واقعات نے

نوران اور افتخار محمد کی سوچنے بچھنے کی ملا جلی سبب کر لی تھی
 اور وہ ایک تک آئین میں رکھے چلوں اور منٹائی کے ٹوکروں
 کو دیکھ رہے تھے۔ یہ اتنی ذہن ساری تعین ایک ساتھ پہلے
 بھی ان کے آئین میں نہیں اتری تھیں۔
 ”کیسے دیا وہوں اپنی اتنی سو بھڑی کڑی کو اس کے باپ
 سے بھی زیادہ عمر کے چودھری سے۔ چودھری تو پہلے ہی تین
 تین بیاد پھڑکا کر بیٹھا ہے۔ ایک تو چلو اللہ کو باری ہوئی۔ پر
 وہ جو دہشتی ہیں وہ تو ایک سے بڑھ کر ایک ظالم اور دار دار
 ہیں۔ وہ تو کھائی جائیں گی میری معصوم دھمکی۔“ آخر نوران
 کی متاعی بلہائی تو اس نے لب لبو لے۔

”ہمت ہے تو انکار کہلا دے۔ دو جاہ بھی نہیں لینے
 دے گا چودھری ہم ساروں کو۔“ غیاث محمد اس پر لانا۔ نوران
 خود بھی یہ بات سمجھتی تھی سو جواب دینے اور دھمکی کا پلو آنکھوں
 پر رکھ کر کہنے لگی۔ غیاث محمد کچھ دیر خاموش بیٹھا اسے آنسو
 بہاتا دیکھتا رہا پھر کھٹک کر اس کے قریب آیا اور سرکشی میں
 بولا۔ ”ایک بات سن نوران!“ نوران اس کے اس انداز پر
 سراٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اسے متوجہ دیکھ کر غیاث محمد
 اسی ساہتہ انداز میں بولا۔ ”میں سوچ رہا ہوں کہ چودھری کی
 بات تو ہمیں مافی ہی پڑے گی، کیوں تو خوشی سے مان لیں۔
 چودھری سے اپنی دہی زیادہ کر ہم نقصان میں نہیں رہیں گے۔
 ہماری تو شان ہی الگ ہو جائے گی۔ چودھری کا رشتہ دار
 جان کر سارے ہماری عزت کریں گے۔“ غیاث محمد کی
 آنکھوں میں حرص تھی، اس عزت اور مقام کے لیے جو ساری
 زندگی اسے کبھی میر نہیں آئے تھے۔ نوران نے اس پر ایک
 ملائی نظر ڈالی۔

”شرم کر غیاث محمد! جسے بھی باپ بن کر اپنا نہیں، آج
 اس کے ارمانوں کا خون کر کے اپنی عزت کمانے کا سوچ رہا
 ہے۔ تو کون ہوتا ہے ماہ بانو کے بارے میں فیصلہ کرنے
 والا؟ اس کے ماں بیو حوران اور مقدر ہیں۔ پہلے ان سے
 پوچھ کہ وہ چودھری سے اپنی دہی دیا ہے تو راضی بھی ہیں یا
 نہیں پھر گاؤں میں اپنی نور بتانے کی سوچتا۔“ نوران جان
 سے پہلے اپنی مجبور یوں کے قصے تھا کہ ماہ بانو کو حویلی میں
 جا کر ہی پر مجبور کرتی رہی تھی، غیاث محمد کو غصے میں کرنے لگی
 لیکن غیاث محمد بھی دینے والا نہیں تھا۔ نوران کی بات سن کر
 فوراً بھڑک اٹھا۔

”بالا کس نے بھی ہو، دہی تو وہ میری ہی ہے۔ تیرے
 بہن بہنوں کوں ہوتے ہیں میری دہی کے بارے میں فیصلہ
 کرنے والے؟ میں نے احسان کیا تھا جو ان کی سوتی گود بچے

کر اپنی دہی دے دی تھی۔ اب مرضی کہ میں جہاں جاؤں
 اپنی دہی کو بیاہوں۔ ویسے بھی چودھری کو انکار کرنے کا تو سوچا
 بھی نہیں جا سکتا۔ وہ چاہے تو کھڑے کھڑے میں گاؤں سے
 نکلا دے۔ پھر سوچ کہاں جائیں گے ہم سارے۔ ہمارا تو بیٹا
 بھی ابھی کسی لائق نہیں ہے۔ کہاں لڑنے پھرنے کے ہم اپنی
 منی کو چھوڑ کر۔“ غیاث محمد جو کچھ کہہ رہا تھا، وہ بھی بر حقیقت
 تھا۔ اس حقیقت کو نوران بھی سمجھتی تھی چنانچہ ایک بار پھر اور دہی
 کا پلو آنکھوں پر رکھ کر رونے لگی۔

”کیوں رو رہو کر اپنی جان بٹکان کر رہی ہے۔ شکر کر کہ
 ہمارے منہ پر کا لکھنے سے وہ بھگتی۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ سب
 دوسرا کار کی کرامت سے ہوا ہے۔ انہوں نے پہلے بھی ہماری
 بھڑی بھائی ہے۔ اب بھی ان کا ہی کرم ہوا ہوگا کہ ماہ بانو
 خیریت سے گھر آئی اور چودھری نے بیاہ کا بیام بیج دیا۔
 ورنہ ہماری حیثیت ہی کیا ہے چودھری کے آگے۔ میری مان،
 بھڑی مت کر اور اپنی خوشی راضی ہو جا۔ اللہ رکھا جائے
 جانتے اشارہ دے گیا ہے کہ اس بیاہ کے بعد ہم پر پڑے حقائق
 بھی معاف ہو سکتا ہے۔“ غیاث محمد نوران کو بھجھانے لگا۔ پھر
 سرکاری کرامت، عزت کا محفوظ رہنا اور قرض سے نجات وہ
 حوالے تھے جنہیں سن کر نوران بھی قائل ہو گئی اور جھٹ آٹسو
 پر ہنچ ڈالے۔

”بات تو تیری ہی کو تھی ہے غیاث محمد۔ پر دیکھ، حوران
 اور غور کو بھی اس دیا ہر بلایا۔ انہوں نے اتنی چاہ سے ماہ
 بانو کو بیاہا ہے، ان کے دل میں بھی سوار مان ہوں گے اس کے
 دواہ کے لیے۔“

”ہاں ہاں، ان کو بھی بلائیں گے۔ تو فکر ہی نہ کر۔ میں
 ایک دن پہلے ہی کو بھیج کر ان دونوں کو بلوا لوں گا۔ تو بس
 اب ماہ بانو کو سمجھانے کی فکر کر کہ اس کا حراج ذرا نیچے جاوے،
 آسانی سے نہیں مانے گی۔“ نوران کے راضی ہوتے ہی
 غیاث محمد نے پرجوش انداز میں اسے یقین دہانی کروانے
 کے ساتھ ساتھ اس کی توجہ سب سے اہم مسئلے کی طرف
 مبذول کروائی۔

”فکر نہ کر، میں اسے راضی کر لوں گی۔“ نوران نے
 اطمینان سے جواب دیا جبکہ کمرے کے دروازے پر کھڑی
 ماہ بانو اپنے گئے ماں باپ کے کیسے اس سہراحت فیصلے کو سن
 کر سانس ہی رو گئی۔ اپنے مفادات پر اسے بیعت
 چھاننے کا فیصلہ کرنے والوں نے ایک بار بھی اس سے یہ
 پوچھنے کی ذمت نہیں کی تھی کہ وہ اس قربانی پر راضی بھی ہے
 یا نہیں۔

☆☆☆

شہر یار کو جانے کا سو بھی کہ اس نے اچانک ہی پیر آباد
 کے دورے کا فیصلہ کر لیا۔ اسل میں اب تک اس کا بیٹی یار
 بھی پیر آباد جاتا ہوا تھا، وہ وہاں چودھری افتخار کے مہمان کی
 حیثیت سے گیا تھا۔ اس حیثیت میں اسے ایک باہمی موقع
 نہیں ملا تھا کہ وہ گاؤں کے حالات اور مسائل کا جائزہ لے
 سکتا۔ آج کے اس دورے کا مقصد گاؤں کا جائزہ لینا اور وہاں
 کے مسائل کو سمجھنا تھا۔ پھر وہ اسکول والے معاملے کو بھی اب
 حتمی طور پر غنما دینا چاہتا تھا۔ چودھری افتخار کے رگ و ڈھنگ
 دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ دلائل سے قائل ہونے والا
 بندہ نہیں۔ اس کے سامنے اپنے اختیارات کا استعمال کرنا ہی
 پڑے گا۔ چنانچہ اب وہ پیر آباد کی حدود میں تھا۔ اس کے
 ساتھ حسب معمول صرف ڈرائیور مشاہیر خان اور عبداللہ اللہ
 ہی موجود تھے۔ گاؤں میں داخل ہوتے ہی شہر یار نے سب
 سے پہلے اسکول کا دورہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ راستے میں ایک
 کسان نے اسکول کی کوکیشن معلوم کر کے مشاہیر خان نے
 گاڑی اسکول جانے والے راستے پر ڈال دی۔ اسکول کیا تھا،
 بس ساتھ ساتھ بنے دو کمرے تھے جن پر پرائمری اسکول
 پیر آباد کا لیڈر لگا ہوا تھا۔ مشاہیر خان نے گاڑی روکی تو
 شہر یار اور عبداللہ اللہ اس کمرے کی طرف بڑھ گئے جس کا
 دروازہ کھلا ہوا تھا اور کھلے دروازے سے تختہ سیاہ پر کچھ لکھا
 ماسٹر آفتاب صاف نظر آ رہا تھا۔ گاڑی کی آواز پر ماسٹر آفتاب
 بھی متوجہ ہو گیا تھا چنانچہ جیسے ہی اس نے شہر یار اور عبداللہ اللہ
 کو دیکھا، ایک کر ہا رہا۔

”السلام علیکم سر! آپ یوں اچانک؟“ وہ شہر یار کی آمد
 پر حیرت کا اظہار کر رہا تھا لیکن اس کے کچھ سے صاف ظاہر تھا
 کہ اسے شہر یار کو وہاں دیکھ کر بہت خوش ہوئی ہے۔
 ”اچانک آنا زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے۔ آؤں کو وہ کچھ
 دیکھنے کو مل جاتا ہے جو اطلاع دے کر آنے کی صورت میں
 چھپا لیے جانے کا خدشہ ہو۔“ شہر یار نے ماسٹر آفتاب سے
 ہاتھ ملاتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا۔

”موسم دیکھ سر۔ لیکن میرا خیال ہے کہ میرے
 اسکول کی صورت حال بہرہ ورموتوں میں آپ کا ایک جیسی ہی
 نظر آئے گی۔“ ماسٹر آفتاب کے پُر اعتماد جواب پر شہر یار
 کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ جانتا تھا کہ ماسٹر آفتاب
 ٹھیک کہہ رہا ہے۔ وہ کوئی زبردستی تو کر ہی سکتا ہے والا بندہ تو
 تھا نہیں کہ دوسروں کو دکھانے کے لیے اچھی کارکردگی کا
 مظاہرہ کرتا رہتا نہ سائل برتا۔ وہ تو مشنری جذبے کے ساتھ

نور آباد کے اس برائے نام اسکول میں نوکری کر رہا تھا۔ بلکہ نوکری بھی کیا پھر آباد کے بے شعور لوگوں میں آگیا کے دیے روشن کرنے کی جدوجہد میں لگا ہوا تھا۔ شہر یار ماسٹر آفتاب کے ساتھ کلاس روم میں داخل ہو گیا۔ بچے اسے نہیں پہچانتے تھے لیکن انہوں نے نہایت ادب سے اسے سلام کیا۔ بچوں کے سلام کا جواب دے کر شہر یار کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ اگلے ہوئے فرش، بجتی ہوئی دیواروں اور اڑے ہوئے رنگ والا یہ کراہی میں کی چمت کے ساتھ بے حد روبرو ہوا تھا۔ دو دیواروں پر چالیس ستوں میں نشیہ نمودار ہوتے جبکہ کچھ ہاتھ سے بنے چارلس وغیرہ بھی نظر آ رہے تھے۔ بچے نیچے درزیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ درزیوں پر بیٹھ کر پڑھتے تھے مختلف عمر کے ان بچوں کی تعداد گاؤں کی آبادی کے لحاظ سے بہت کم تھی لیکن پورے اسکول کے ایک کمرے میں چائے کی وہ سے جبکہ کے اٹھارے سے دو تعداد زیادہ محسوس ہوتی تھی۔ ماسٹر آفتاب کے کہنے پر دو ذرا بڑی عمر کے بچے برابر کے کمرے سے ایک کمرے اٹھائے۔ دو کرسیاں پہلے ہی وہاں موجود تھیں جو ماسٹر آفتاب نے شہر یار اور عبداللہ کے بیٹھنے کے لیے پیش کیں اور خود تیسری کرسی آنے پر اس پر براجمان ہو گیا۔

”ابھی ہمارا اسکول صرف تیسری جماعت تک ہے۔ تمام بچے اس ایک کمرے میں ہی بیٹھ کر پڑھتے ہیں۔ سردی میں تو پھر مٹی کی لڑاوہو جاتا ہے لیکن گرمی میں یوں جڑ جڑ کر ساتھ ساتھ بیٹھنے میں بچوں کو بڑی مشکل ہوتی ہے۔ اسی لیے میں بار بار درخواست دیتا ہوں کہ اسکول کی عمارت میں اور کچھ نہیں تو کم از کم ایک دو کمرے کا اضافہ کر دیا جائے تاکہ ہم کلاس آگے بڑھنے پر نئے بچوں کے بیٹھنے کے لیے مناسب کھال سکیں۔ ابھی تو یہ حال ہے کہ نہ یہاں مزید بچوں کے بیٹھنے کی گنجائش ہے اور نہ ہی پہلے سے موجود دینے ڈھنگ سے پڑھ پاتے ہیں۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ الگ الگ سبق پڑھنے والے بچوں کے ایک ہی جگہ کر پڑھنے سے کیا صورت حال پیش آتی ہوگی۔ انکڑان کے اسباق آپس میں گنڈھ بونے لگتے ہیں مگر بہر حال، فی الحال تو میں اور میرا ساتھی پھر مل کر یہ سب سچ کر لیتے ہیں لیکن آگے کی مجھے بہت فکر ہے۔ ابھی تعلیم کے لیے ضروری ہے کہ بچوں کے الگ الگ بیٹھنے کا انتظام کیا جائے اور ایک آدھ سے استاد کا بھی تقرر ہوتا کہ بچے کو مناسب توجہ دے سکے۔“ شہر یار کو سامنے ہا کر ماسٹر آفتاب نے فوراً اسکول کے مسائل بیان کرنا شروع کر دیے تھے۔ اس سے اس کے اسکول کے لیے غلوں کا

اندازہ ہوتا تھا۔ وہ واقعی اسکول کی ترقی کا دل سے خواہش مند تھا۔
 ”آپ کے ساتھی استاد نظر میں آ رہے؟“ اساتذہ کے ذکر پر شہر یار کو خیال آیا تو ماسٹر آفتاب سے اس کے ساتھی پھر کے بارے میں پوچھا۔
 ”اس کی والدہ کی طبیعت خراب ہے، وہ انہیں دیکھنے کی ہوا ہے۔ وہ ہوتا ہے تو ہم دونوں مل کر آدھے آدھے ہوتے ہیں کو دیکھ لیتے ہیں۔ یہ جو برابر والا کمرے، وہ ہم دونوں کے ہی زیر استعمال ہے۔ ہم مل کر وہاں رہتے ہیں۔“ ماسٹر آفتاب نے شہر یار کے پوچھنے پر بتایا۔
 ”گاؤں میں اسکول کے بارے میں کیا رائے ہے؟
 لوگوں میں اپنے بچوں کو پڑھوانے کا رجحان ہے یا نہیں؟“
 ”ابھی یہاں کے لوگوں کے ذہن پوری طرح بیدار نہیں ہوئے ہیں۔ اکثریت ان لوگوں کی ہے جو اسکول کی تعلیم کو اپنے بچوں کے لیے غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ خصوصاً لڑکیاں تو بہت ہی کم داخل ہوتی ہیں یہاں۔ پھر بھی ہم لوگوں نے کوشش کر کے والدین کو راضی کیا ہے کہ بچوں کو اسکول بھیجیں۔ بچوں کو کاپیاں، کتابیں اور دیگر چیزیں میں اپنی طرف سے فراہم کرنے کی کوشش کرتا ہوں تاکہ والدین کم از کم اخراجات کے بجائے گھر آکر بچے کو اسکول بھیجیں۔“
 ”کڑا نہیں۔ مجھے امید ہے کہ اللہ ایک دن ہمارا اسکول بہت ترقی کرے گا اور گاؤں کے سارے بچے یہاں پڑھنے آئیں گے۔“ ماسٹر آفتاب پر غور تھا۔
 ”حکومت نے تو بہت عرصہ ہوا تعلیم مفت کر دی ہے اور اسکولوں میں بچوں کے لیے مفت کورس اور وظائف وغیرہ بھی بھیجے جاتے ہیں۔ کیا آپ کے اسکول کو یہ سب نہیں ملتا؟“
 شہر یار، ماسٹر آفتاب کی کاپیاں، کتابیں فراہم کرنے والی بات پر چونکا۔
 ”ابھی تک تو ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میں نے اس سلسلے میں بھی ایک دو درخواستیں بھیجی تھیں، شاید وہ آپ کی نظر سے نہیں گزریں۔“ ماسٹر آفتاب نے جواب دیا تو شہر یار نے عبداللہ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
 ”بعض درخواستیں درمیان سے بھی غائب کر لی جاتی ہیں۔ ہو سکتا ہے ماسٹر صاحب کی ان درخواستوں کے ساتھ بھی ہوا ہو۔“ عبداللہ نے شرمندگی سے جواب دیا۔
 ”آپ اپنے پاس نوٹ کر لیجئے۔ ہمیں یہ معاملہ بھی دیکھنا ہوگا۔“ شہر یار نے عبداللہ کو حکم دیا اور پھر دوبارہ ماسٹر آفتاب کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”گاؤں میں پہلے بھی تو اسکول چلتا تھا۔ اس وقت جن گھرانے یہاں سے بڑھا تھا، کیا ہمیں اسکول کے اسٹاف کے لیے ان کی مدد نہیں مل سکتی؟“
 ”اس وقت تو صورت حال کون سی اچھی تھی۔ دو چار لڑکے ہی ان میں سے ایسے تھے جنہوں نے پانچویں جماعت پاس کی۔ ان میں سے ایک اپنے کی رشتے دار کے پاس شہر چلا گیا تھا وہاں رہ کر میٹرک کرنے کے بعد فوج میں بھرتی ہو گیا۔ باقی تین بھی گاؤں میں لگ گئے۔ میں نے کوشش کر کے ان میں سے دو کو مشکل سے اس بات پر راضی کیا ہے کہ وہ نڈل کا امتحان دے دیں۔ اب دو لڑکے شام میں میرے پاس الگ سے پڑھنے کے لیے آتے ہیں۔ انتہاء اللہ نڈل کا امتحان پاس کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے پھر میں انہیں میٹرک پر راضی کروں گا لیکن فی الحال تو ہمیں باہر سے ہی کوئی نچر بھرتی کرنا پڑے گا۔“ ماسٹر آفتاب نے تفصیل بتائی تو شہر یار نے اس کے لیے اپنے دل میں پہلے سے زیادہ عزت محسوس کی۔ اس شخص کی بے لوث خدمتوں کا کوئی صلہ نہیں دیا جاسکتا تھا۔ شہر یار کا دل چاہا کہ باہر جا کر گاؤں کے ان سارے لوگوں کو پکارے جو عرصے والے روز چوہری افکار کے دادا کی قبر پر اپنی حاجتیں پوری کروانے کے لیے جمع ہوتے تھے اور جو چوہری افکار کے ہاتھ کو بوسا دینے کو اپنے لیے باعث سعادت سمجھتے تھے۔ وہ ان لوگوں کو بتانا چاہتا تھا کہ تم جو مٹی کے ڈھیر کو پوجتے ہو اور اپنا انحصار کرنے والے کے ہاتھ پر بوسا دیتے ہو، اس شخص کے عقیدت مند بن جاؤ جو تمہارا سچا اندر دوزخ خواہ ہے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کی یہ باتیں جہالت کی کوکھ سے جنم لینے والی اندھی عقیدت کا کچھ نہیں لگاؤ سکتیں۔ اپنی اس خواہش کو دبا کر وہ ماسٹر آفتاب سے پورے غلوں سے بولا۔
 ”میں نے آپ کی ہر بات اچھی طرح سن لی ہے۔ اب عمل کا وقت آچکا ہے۔ آئندہ دو تین دنوں میں یہاں کتب خانہ شروع ہو جائے گی۔ بچے اساتذہ کا بھی میں جلد انتظام کرنا دوں گا۔ بس آپ اسی گھر سے اپنا کام کرتے رہیں۔“
 ”جھینک یو۔ جھینک یو دیری سچا سراپا آپ کا بہت بڑا احسان ہوگا۔“ ماسٹر آفتاب اس خبر کو سن کر خوش ہو گیا۔
 ”احسان کی کوئی بات نہیں۔ یہ میرا فرض ہے جسے میں ادا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ شہر یار نے سنجیدگی سے ماسٹر آفتاب کی بات کا جواب دیا اور پھر عبداللہ کی طرف حیدر ہو گیا۔

”عبداللہ ان مشاہیرم خان کہاں ہے؟ اس سے کہو کہ مسجد سے پیری گاؤں میں آدھ کا اعلان کروا دے تاکہ لوگ ملاقات کے لیے آسکیں۔“
 ”مشاہیرم خان لویشن دیکھ رہے سر تا کہ آپ کے بیٹھنے کے لیے مناسب جگہ کا انتظام ہو سکے۔“ عبداللہ نے شہر یار کو بتایا۔
 ”کوئی اور جگہ دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اسکول کی چھٹی ہونے والی ہے۔ آپ لوگ یہاں بھی یہ کام کر سکتے ہیں۔“ ماسٹر آفتاب نے عبداللہ کی بات سن کر فوراً ہی لویشن کی جو شہر یار کو پسند آئی۔ اس نے عبداللہ کو باہر بھیج دیا کہ مشاہیرم خان کو جگہ تلاش کرنے سے روک کر شہر یار کی اسکول میں موجودگی کا اعلان کر دیا جائے تاکہ لوگ ہلادو راست اپنے علاقے کے اسی سے مل کر اپنے مسائل پیش کر سکیں۔ عبداللہ حکم کی پیروی کے لیے باہر نکل گیا جبکہ شہر یار وہیں بیٹھ کر ماسٹر آفتاب کو دیکھنے لگا۔ وہ اپنی دیر سے سکون سے بیٹھ کر اپنے اپنے کام میں مصروف بچوں کے ایک بند کر دوانے کے بعد انہیں مشترکہ طور پر چند دعائیں زبان سے پڑھوا رہا تھا۔ پانچ منٹ کی اس کارروائی کے بعد اس نے چھٹی کا باقاعدہ اعلان کیا اور اپنے قاتار بنا کر یہ آواز بلند سلام کرتے ہوئے باہر نکلے۔ بچوں کی ان آوازوں کے درمیان شہر یار نے مسجد سے اسی کی آمد کے سلسلے میں ہونے والا اعلان بھی سنا۔ اعلان ہونے کے تھوڑی دیر بعد عبداللہ ان اور مشاہیرم خان واپس لوٹ آئے۔ ماسٹر آفتاب جو شہر یار سے اجازت لے کر بچوں کے ساتھ ساتھ ہی باہر نکل گیا تھا، ایک چھوٹے سے دھکے کے بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک ٹرسے بھی جس میں چائے کی پیالیاں اور نمک رکھے ہوئے تھے۔
 ”اس تکلف کی کیا ضرورت تھی؟“ شہر یار نے اسے ٹوکا۔
 ”آپ نے یہاں آنے کی جو تکلیف کی ہے اس کے مقابلے میں یہ تکلف کچھ بھی نہیں۔“
 ”میں ایک بار پھر آپ کو یہی جواب دوں گا کہ یہ میرے فرائض کا حصہ ہے۔“ ماسٹر آفتاب کی بات کے جواب میں شہر یار نے کہا اور پھر چائے کی پیالیاں اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لی۔ عبداللہ نوٹ کر رہا تھا کہ شہر یار کا انداز ماسٹر آفتاب کے ساتھ قدرے مختلف ہے۔ وہ جو ایک اکڑی اس کے اندر نظر آتی تھی، اس کا یہاں کوئی نام و نشان نہیں تھا اور وہ بہت نرم و خنک نظر آتا تھا۔ عبداللہ ان شہر یار کے اس انداز کو پیچھا نہ لگا

تھا۔ وہ لوگ جو اسے پسند آتے تھے، ان کے ساتھ اکی کا برتاؤ ایسا ہی ہوتا تھا۔

”جائے بہت اچھی بنائی ہے آپ نے۔“
”فکر یہ سہرا“ شہریار کی تعریف پر ماسٹر آفتاب یہی کہہ سکا۔ ابھی ان لوگوں نے مشکل سے آدمی بیانی چائے ہی پی تھی کہ سر سے پیر تک چادر میں لپیٹی ایک لڑکی دھاڑے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ لڑکی کا چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا اور وہ مہربانی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

”کیا بات ہے بی بی! آپ کو کس سے ملنا ہے؟“
عبداللہ ان فوراً لڑکی سے پوچھا۔
”مجھے اے سی صاحب سے ملنا ہے۔“ لڑکی نے کپکپاتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”فرمائیے محترمہ! میں ہوں اے سی شہریار عادل۔ آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟“ شہریار فوراً لڑکی کی طرف متوجہ ہوا۔ لڑکی کسی مشکل میں مبتلا نظر آتی تھی اور یقیناً شہریار کی آمد کا اعلان سن کر وہاں آئی تھی۔

”مم... میں بہت مشکل میں ہوں۔ مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے لیکن میں اکیلے میں آپ کو اپنا مسئلہ بتاؤں گی۔“ لڑکی نے جواب دیا اور اپنی نقاب سے چھپتی بڑی بڑی آنکھوں میں امید لیے شہریار کی طرف دیکھنے لگی۔ شہریار نے دیکھا کہ عبداللہ ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ شہریار نے اپنے سر کی جنبش سے اشارہ کیا جسے سمجھتے ہوئے عبداللہ ان نے فوراً اپنی جگہ چھوڑ دی۔ مشاہیرم خان اور ماسٹر آفتاب نے بھی اس کی پیروی کی اور سب کمرے سے باہر نکل گئے۔ ان کے باہر نکلتے ہی لڑکی نے جھپٹ کمرے کا دروازہ برابر کیا اور شہریار کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

”تشریف رکھیں۔“ شہریار نے اس سے کہا تو وہ کمری پر بیٹھ گئی۔ اب وہ قدرے مطمئن لگ رہی تھی۔ اس نے چہرے پر سے چادر کا نقاب ہٹا دیا تھا۔ نقاب کے پیچھے سے نمودار ہونے والا اس کا بھولا بھالا خفاف چہرہ چند لمبے کے لیے اسے سی شہریار عادل کو مبہوت کر گیا۔ وہ اس چہرے کو اس سے قبل چودھری افتخار کی حویلی میں بھی دیکھ چکا تھا۔ اس وقت اس نے اسے صرف ایک نظر ہی دیکھا تھا لیکن پھر بھی اس کی یادداشت میں وہ چہرہ محفوظ تھا۔ اس وقت بھی اس نے اس چہرے میں کشش محسوس کی تھی اور آج بھی وہ چونکے بغیر نہیں رہا تھا۔ وہ ایک ایسے طبقے سے تعلق رکھتا تھا جہاں لڑکے لڑکیوں کے آزادانہ میل ملاقات کو میوہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔

اس نے تعلیم بھی زیادہ تر مخلوط تعلیمی اداروں میں حاصل کی تھی جہاں ایک سے بڑھ کر ایک حسین اور طرح دار لڑکی نظر آتی تھی۔ شہریار بھی کسی چہرے کو دیکھ کر یوں ساکت نہیں ہوا تھا لیکن اس لم عمر اور سادہ سی لڑکی کے حسن میں کچھ الگ سی بات تھی جس نے شہریار کی نظر کو ہانک لیا تھا۔ لڑکی اس کو خود پر یوں نظر کرے جیسے دیکھ کر ذرا سا کسمائی تو شہریار کو اپنی پوزیشن کا احساس ہوا۔

”جی فرمائیے، میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟ لیکن ہائیز پیلے آپ مجھے اپنا نام بتادیں۔“ وہ فوراً ہی اپنے فرض کی طرف پلٹ آیا۔

”میرا نام ماہ بانو ہے اور مجھے چودھری افتخار عالم شاہ کے چنگل سے بچنے کے لیے آپ کی مدد درکار ہے۔“ لڑکی کی بات سن کر شہریار بری طرح چونکا۔ ابھی وہ اس سلسلے میں کوئی سوال نہیں کر سکا تھا کہ دروازہ زور سے کھلا اور ماسٹر آفتاب تیزی سے اندر آیا۔ وہ کچھ گھبرایا ہوا لگ رہا تھا لیکن اس گھبراہٹ کے باوجود وہ دروازہ بند کرنا نہیں بھولا تھا۔

”چودھری افتخار کی جیب اسی طرف آ رہی ہے۔ یقیناً مسجد سے ہونے والے اطلاع کی اطلاع ان تک پہنچ گئی ہے اور اب وہ آپ سے ملنے یہاں آ رہے ہیں۔“ ماسٹر آفتاب کی دی ہوئی اطلاع نے کسی خون آشام بلا کی طرح ماہ بانو کے چہرے کا سارا خون چوس کر بل میں اسے زرد کر ڈالا۔ وہ جس سے بچنے کے لیے یہاں آئی تھی وہ خود یہاں آ رہا تھا۔ چند کرسیوں کے سواہر طرح کے فرنیچر سے عاری اس خالی کمرے میں چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ اوپر دیوار میں ایک روشن دان نظر آ رہا تھا لیکن اس میں بھی سلاخیں موجود تھیں۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکلتی تو چودھری سے سامنا لازمی تھا۔ اسے کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا کہ اب کہاں جائے؟ خود شہریار بھی پریشان ہو گیا تھا۔ وہ اس لڑکی ماہ بانو کی یہاں آمد کا مقصد سن چکا تھا۔ پوری بات تو اس کے علم میں نہیں آتی تھی لیکن یہ طے تھا کہ اسے چودھری سے کوئی شدید قسم کا خطرہ درپیش ہے اور اس صورت حال میں چودھری افتخار کا ماہ بانو کو یہاں دیکھنا اور بھی خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ وہ اسے یہاں دیکھتے ہی سمجھ جاتا کہ وہ اس کے خلاف مدد مانگنے شہریار کے پاس آئی ہے۔ یعنی ماہ بانو اس وقت پوری طرح خطرے میں گھری ہوئی تھی لیکن شہریار بھی کیا کر سکتا تھا؟ نہ تو ماہ بانو کو چھپانے کی کوئی صورت تھی اور نہ ہی چودھری افتخار کو امداد آنے سے روکا جاسکتا تھا۔

جاری ہے

گرداب

تیسری قسط

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے لیکن اس کی باگ ڈور جب بالتر سماج کے روایتی نظام میں پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں۔ بالا تر طبقہ کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح نہیں رہتی ہے اور یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے۔ ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو تو زکر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے پھینکتا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہو جاتی ہے دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے، زندگی کی سسما اور وقت کے دھارے ... سب قسمت کی ہاتھیں اور تقدیر کی چالیں ہیں ... کہیں بازی ہلت بھی جاتی ہے گزرا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر تقدیر سناٹا دے جاتا ہے ... اس وقت تک یلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا ہوتا ہے جرم، افسر شامی، جاگیرداری اور پیار کے محو کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی سلسلہ در سلسلہ۔

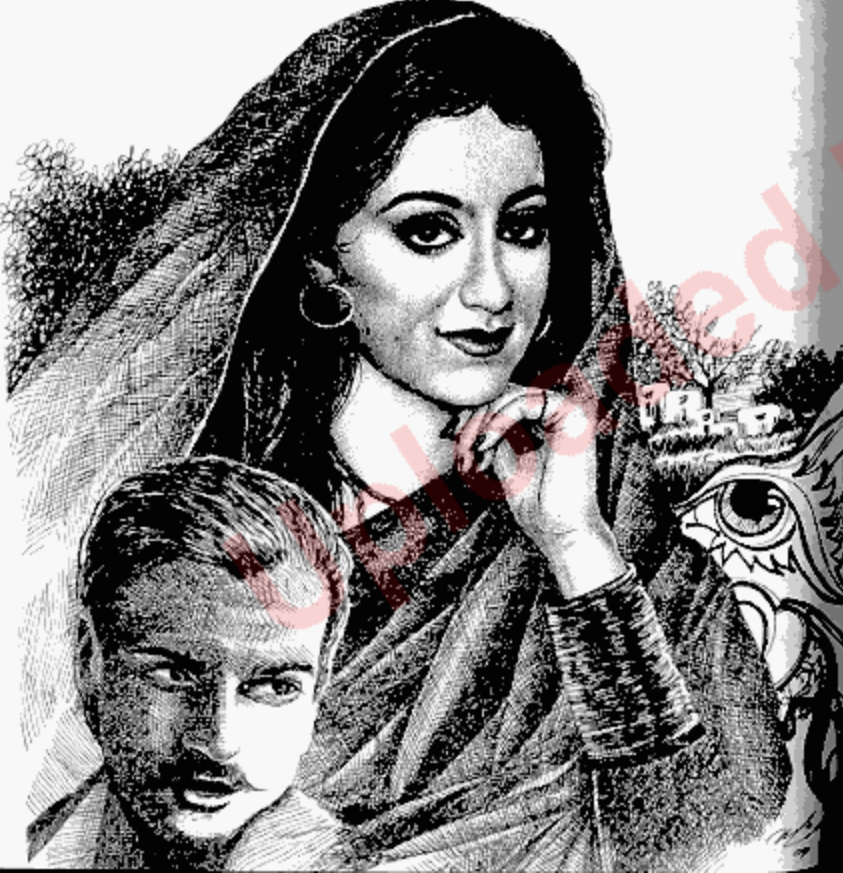


لکھے بہت تیزی سے بیت رہے تھے۔ چودھری افتخار بھی لکھے یہاں تک سکا تھا۔ وہ بچ جاتا تو ماہانہ کے لیے بہت برا ہوتا۔ وہ اپنے بچاؤ کی آخری امید کے طور پر اس نے اسے کی تک پہنچی تھی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اسے کسی براؤ راست چودھری سے اس کے لیے گھر نہیں لے سکتا۔ بہتر یہی تھا کہ اس کا چودھری سے سامنا نہ ہو مگر کوئی جائے قرار بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔

”پلیز سرائیکو کریں اگر چودھری نے مجھے یہاں دیکھ لیا تو بہت برا ہوگا۔“ ماہانہ کو گوارہ کچھ بھائی نہیں دیا تو شہر یار سے فائدہ مانگنے کی فکر شہر یار خود اچھی طرح پورے کمرے کا جائزے لے چکا تھا۔ یہاں کوئی بھی ایسی شے موجود نہیں تھی جس کے پیچھے ماہانہ کو چھپا جاسکتا۔

”آپ ادھر آ جائیں۔“ ماسٹر آفتاب جو چودھری افتخار

کے آنے کی اطلاع دینے کے بعد خاموش کھڑا ہوا تھا، ماہانہ کو کا بدلہ کر فوراً ہی مستعد ہو گیا۔ اس نے غنڈہ سیارہ کے قریب جا کر اس کو پچھلے سرے سے پکڑ کر اٹھایا۔ تختہ ماہانہ دوار میں مل طور پر لٹک نہیں تھا۔ اس کے صرف اوپر ہی لٹکے ہوئے کھسکے ہوئے سے دوار میں فٹ کیا گیا تھا۔ اس لیے جب ماسٹر آفتاب نے پچھلے سرے کو اٹھایا تو وہ اچھا غاسا اوپر اٹھ گیا۔ اس اٹھنے ہوئے لمحے سے دوار میں سو چوڑی کھسکی صاف نظر آ رہی تھی۔ اس کھسکی کو دیکھ کر ماہانہ کے چہرے پر زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ شہر یار بھی کھسکی دیکھ کر تیزی سے آگے بڑھا اور اس کا پیٹ کھول دیا۔ دوسری طرف ایک رانچی کمر افتخار آ رہا تھا جو بیٹنی طور پر ماسٹر آفتاب اور اس کے ساتھی بچے کے تصرف میں تھا۔ کھسکی زمین سے قدرے بلند پر تھی۔ شہر یار نے، ماہانہ کو سہارا دیا اور وہ اس کے سہارے سے دہری طرف دوڑ گئی۔ شہر یار نے پھر تیزی سے کھسکی کو دوار بند کر دیا۔ اس کے کانوں



نے باہر چپ کر کے کی آواز سن لی تھی۔ ماسٹر آفتاب نے محمد سیاح کے پیچھے سرے کو احتیاط سے دو بارہ دیوار پر لگا دیا۔ ماہ با تو کو فرار کا راستہ فراہم کرنے والی کڑکی کا غائب ہو گئی۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ ماسٹر آفتاب نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولی دیا۔ سامنے ہی چوہری افتخار اپنے غشی اللہ رکھا کے ساتھ کھڑا تھا۔

”السلام علیکم چوہری صاحب!“ ماسٹر آفتاب نے چوہری کو سلام کیا جسے آن کی آن کر کے وہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ ماسٹر آفتاب نے مناسب سمجھا کہ وہ خود باہر چلا جائے۔ ”آئیے آئیے چوہری صاحب! آپ نے کیوں زحمت کی، میں خود یہاں سے فارغ ہونے کے بعد آپ کی حوصلی پر ملاقات کے لیے آتا۔“ شہریار نے تپاک سے چوہری افتخار کا استقبال کیا۔

”صاف تو آپ کو پہلے وہیں آنا چاہیے تھا۔ آپ میرا آباد آئے ہیں تو اس کا مطلب ہے ہمارے یہاں ہیں مگر آپ نے نہ جانے کیوں ہماری حوصلی چھوڑ کر اس پچھلے اسکول کو عزت دینا زیادہ مناسب سمجھا۔ مجھے تو ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک کارندہ سے اطلاع ملی کہ اسے ہی صاحب میرا آباد آئے ہوئے ہیں اور سب سے اچھی آمد کا اعلان کر دیا ہے۔ میں فوراً دوڑا ہوا آیا کہ جانے ہم سے آپ کو کیا شکایت ہو گئی ہے جو آپ نے میرا آباد آنے کے باوجود ہماری طرف آنے پسند نہیں کیا۔“ چوہری نے غصے آجڑا انداز میں تفصیل جواب دیا۔

”اسکی کوئی بات نہیں ہے چوہری صاحب! آپ سے بھلا کیسی شکایت؟ میں نے تو صرف اس لیے حوصلی کا رخ نہیں کیا کہ پہلے گاؤں والوں سے مل کر ان کی شکایات سن لوں پھر بعد میں اطمینان سے آپ سے ملاقات کروں گا لیکن یہ آپ کا غلط ہے کہ گاؤں کے کسی فرد کے پیچھے سے کل ہی آپ یہاں پہنچ گئے۔“ چوہری افتخار کی شکایت کے جواب میں شہریار نے خوش گواری لکھ کر دیکھا۔

”گاؤں کا کوئی بندہ اپنی شکایت لے کر آپ کے پاس آئے، یہ تو ذرا مشکل ہی ہے۔ ان لوگوں کو برسوں سے عادت ہے کہ یہ اپنے مسئلے مسائل لے کر حوصلی آتے ہیں اور وہاں ان کے مسئلے حل بھی ہو جاتے ہیں لیکن یہ ماسٹر آفتاب باہر سے آیا ہوا بندہ ہے اس لیے حوصلی کا رخ نہیں کرتا۔ پڑھے لکھے بندوں کے ساتھ یہ بڑا مسئلہ ہوتا ہے کہ وہ کسی علاقے اور ماحول کی روایات کو سمجھے بغیر اپنی عقل کے مطابق کام کرتا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اچھی بندہ کمرے میں بھی وہ یقیناً آپ سے میرے خلاف ہی شکایت کر رہا ہو گا۔“ ماسٹر

آفتاب کے لیے چوہری افتخار کے لہجے میں واضح ناراضگی محسوس ہو رہی تھی۔

”اسکی کوئی بات نہیں ہے چوہری صاحب! ماسٹر آفتاب کو میں نے خود یہاں روکا تھا۔ اصل میں، میں اس ساتھ والی زمین پر اسکول کے لیے مزید کمرے تعمیر کروانا شروع کر رہا ہوں۔ میں نے سوچا کہ پہلے ماسٹر آفتاب سے اسکول میں بچوں کا اعداد و شمار معلوم کر لوں پھر کام شروع کر دوں۔“ اس لیے اس مسئلے میں میری اس سے گفتگو ہو رہی تھی۔ ”شہریار نے نرمی سے ماسٹر آفتاب کی معافی چاہی۔

”میرے خیال میں تو اسکول کے لیے مزید کمرے کی کوئی ضرورت نہیں۔ گاؤں میں بچوں کو تعلیم دلوانے کا رجحان نہیں ہے۔ میں خود بھی سمجھتا ہوں کہ ان لوگوں کے لیے تعلیم کی اتنی ضرورت نہیں۔ یہ لوگ نسلوں سے کھیتی باڑی کرتے آ رہے ہیں۔ ان کی روزی اور روزگار کھیتی باڑی سے وابستہ ہے اور اس بنکر کوئی نئے لیے انہیں گاؤں کے اس اسکول میں آنے کے بجائے کھیتوں میں اپنے بڑوں کے ساتھ رہ کر کام سمجھنے کی ضرورت ہے۔“ چوہری نے ناگواری سے شہریار کی بات کا جواب دیا۔

”مجھے آپ کی بات سے زیادہ اختلاف نہیں چوہری صاحب! لیکن تعلیم کی اپنی ایک اہمیت ہے۔ تعلیم صرف روزگار کے حصول کے لیے ہی نہیں، شعور کی بے داری کے لیے بھی حاصل کی جاتی ہے۔ میرے خیال میں تو یہ بچے اگر تعلیم حاصل کر لیں گے تو زیادہ بہتر طریقوں سے اپنے آباد اجداد کی زمینوں کو آباد کرنے کی سوجھیں گے۔ جدید دور کے تقاضے بھاننے کے لیے ہمارے کاشت کاروں کا بھی جدید تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو روزی پونہ زمینوں کا قیام کیوں ممکن تھا؟ حکومت نے زرعی پونہ زمینوں اسی لیے تو بنائی ہیں کہ لوگ وہاں سے پڑھ لکھ کر اپنی زمینوں سے زیادہ سے زیادہ اور بہتر بنی پیداوار حاصل کریں۔“ شہریار نے چوہری افتخار کو دلائل سے قائل کرنے کی کوشش کی۔

”آپ اس بات کو نہیں سمجھتے اے ہی صاحب! پڑھ لکھ کر یہ لڑکے اپنی زمینوں پر کام کرنا پسند نہیں کرتے بلکہ میری دانی تو گری کی تلاش میں شہر چلے جاتے ہیں۔“ چوہری نے شہریار کی مخالفت کی۔

”میرا نہیں خیال کہ گاؤں کے قیام کے تمام لڑکے تعلیم حاصل کرنے کے بعد یہاں سے شہروں کا رخ کریں گے۔ شہر اتنی بڑی تعداد میں دیہاتوں سے آنے والے تمام افراد کو

مددگار فراہم نہیں کر سکتے۔ ان لوگوں کو اپنی جگہ پر رہ کر اپنی زمینوں سے روزی حاصل کرنی ہوگی۔ اگر چند فیصد لوگ شہروں میں منتقل ہو جیں تو اس سے کوئی اتنا زیادہ فرق نہیں پڑے گا۔“

”میں جانتا ہوں، آپ میری بات نہیں سمجھ سکتے تھے۔ آپ اس ماحول کو ہی نہیں سمجھتے ہیں۔ بہر حال، میں آپ سے اسکول کے مسئلے پر بحث کرنے آیا بھی نہیں ہوں مگر ہر بات کھلی ہی آتی ہے تو میں آپ کو یہ اطلاع دے دوں کہ اسکول کے ساتھ والی زمین پر میں نے موہاں کھیتی والوں کو بیج چھوڑ نصب کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ وہ جلد یہاں آکر اپنا کام شروع کر دیں گے۔“ چوہری افتخار کی بات سن کر شہریار کو احساس ہوا کہ اس نے کتنی گہری چال چلی تھی۔ وہ شہریار پر یہ احسان پہلے ہی جتنا چکا تھا کہ وہ اس کے بچنے پر اپنے علاقے کی بہتری اور ترقی کے لیے یہاں موہاں سروس شروع کروانے والا ہے۔ اب اس نے اپنا دوسرا کارڈ بھی شکر دیا تھا۔ وہ اسکول کے ساتھ والی زمین پر موہاں کھیتی کاروں کو نصب کر دیا کہ اس مسئلے کا مستقل حل نکالنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسکول میں تو بیج کی دوبارہ کوشش نہ کی جاسکے۔ چوہری افتخار کی اس عیاری پر شہریار کے لیے اپنے غصے پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔

”دیکھیں چوہری صاحب! اسکول کے سلیبس میں، میں اوپر سے منظوری لے چکا ہوں۔ یہ زمین گورنمنٹ کی ملکیت ہے اس لیے اسے کسی کام میں لایا جائے، یہ فیصلہ کرنا گورنمنٹ کا کام ہے۔ اور فیصلہ ہو چکا ہے البتہ میں آپ کو یہ آؤ ضرور کر سکتا ہوں کہ اسکول کے لیے کمرے تعمیر ہونے کے بعد جو جگہ باقی بچ جائے آپ وہاں موہاں کھیتی والوں کو کام کرنے کی اجازت دے سکتے ہیں۔“

”پچھیں جیسا آپ کہیں ایسا ہی ہو جائے گا۔ آخروں میں ہی کام میرے گاؤں کی بھائی کے لیے ہو رہے ہیں۔ مجھے دونوں میں سے کسی پر بھی کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟“ شہریار کا خیال تھا کہ اس کا لہجہ چوہری افتخار کو ناگوار گزرا ہے گا لیکن اس نے تو فوراً ہی بدلتا بدل اپنا تھا اور یوں سکڑا کر شہریار کی بات کی تائید کر رہا تھا جیسے اسے بھی کچھ اسکول کے معاملے میں کوئی اختلاف نہ رہا ہو۔ اس کے انداز کی اس تبدیلی کے بعد شہریار کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنے انداز کو بدلتا ہو کر شک رکھتا، چونکہ وہ بھی ایک جوانی مگر اہٹ چہرے پر سجا کر چوہری افتخار کا غصہ بڑھا کر آ کر نہ لگا۔

”پچھیں پھر یہ معاملہ طے ہو گیا۔ اب آپ میرے

ساتھ حوصلی چلیں، اتنی دیر میں آپ یہ اندازہ تو کر لی گئے ہوں گے کہ گاؤں کا کوئی فرد اپنی شکایت سنائے آپ گئے پاس نہیں آئے گا۔“

دو دفعی دیر میں واقعی اندازہ کر چکا تھا کہ گاؤں کا کوئی فرد اس طرف کا رخ نہیں کرے گا۔ یقیناً ایسا چوہری کے دید بے کی وجہ سے تھا۔ لوگ اس سے اتنا ڈرتے تھے کہ شہریار کے پاس آکر اپنی کوئی شکایت نوٹ کروانے کی بات نہیں رکھتے تھے لیکن براہِ رواں لے کر سے میں ایک لڑکی موجود تھی جو نہ صرف یہاں آتی تھی بلکہ صاف طور پر یہ بھی کہتا تھا کہ اسے چوہری سے خلعہ ہے۔ شہریار کے لیے اس لڑکی کی شکایت سننا ضروری تھا لیکن وہ چوہری کو بھی نہیں ٹال سکتا تھا۔ یک دم ہی اسے ایک درمیانی راہ سوچ گئی۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”آپ کا حکم سر آگھوں پر چوہری صاحب! میں آپ کو اگر میری بیوی بانی کر دیتی تو ذرا زیادہ رحمت اٹھائی پڑے گی۔ اصل میں، میں یہاں مختصر سے دور سے پر آتا تھا۔ دفتر میں اس وقت کی کام آئیے ہیں جنہیں فوری توجہ کی ضرورت ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میرے یہاں رکنے کی صورت میں میرا بی بی عبداللہ ان دفتر جا کر وہ کام دیکھ لے۔ اب ظاہر ہے عبداللہ ان یہاں سے جانے کا تو میں اپنی گاڑی اور ذرا دیر سے غرم ہو جاؤں گا اس لیے آپ کو یہ زحمت کرنی ہو گی کہ مجھے اپنی گاڑی سے میرے دفتر واپس چھڑوا دیں۔“

”تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ آپ بے شک اپنی گاڑی واپس بھجوا دیں۔ یہاں ہم موجود ہیں نا آپ کی خدمت کے لیے۔“ چوہری افتخار کا جواب حسبِ توقع تھا۔ اس جواب کے بعد شہریار نے مزید وہاں رکنا غیر ضروری سمجھا اور باہر آکر عبداللہ ان کو سرگوشی میں ہدایات دینے کے بعد چوہری کے ساتھ اس کی حوصلی روانہ ہو گیا۔ حوصلی فتح کر دانی خاطر ہدایات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

چوہری افتخار شہریار کو اپنے آباد اجداد کی برتری، بہادری اور تعلقات سے متعلق قصے سناتا رہا۔ آدھے گھنٹے بعد انہیں کھانا کھنے کی اطلاع ملی۔ شہریار چوہری افتخار کے ساتھ اس کے شاندار ڈائننگ روم میں آیا۔ صرف عرس والے دن حوصلی میں مہمانوں کو فوری دسترخوان کی کرکھا کھانے کا اہتمام کیا گیا تھا اور ایسا شاید مہمانوں کی بڑی تعداد اور موقع کی مناسبت کے اعتبار سے ہوا تھا۔ حوصلی کا ڈائننگ روم کافی دیدہ زیب اور جدید انداز میں آرائش تھا اس سے پہلے شکار پر جانے کے موقع پر بھی وہاں ڈائننگ

روم میں آچکا تھا۔ آج بھی ڈانٹنگ ٹیبل پر لذت کام و دین کے لیے بہت سے لوازمات موجود تھے۔ چودھری کے اصرار پر وہ ایسی سوسلٹی سے لطف اندوز ہونے لگا۔ کھانا ابھی اختتام کو نہیں پہنچا تھا کہ منشی اللہ رکھا کچھ پریشان سا ڈانٹنگ روم میں داخل ہوا۔

”کیا بات ہے منشی؟“ چودھری نے ناگوار سے منشی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”چودھری صاحب! غیاب تمہارا ہے۔“ منشی اللہ رکھا نے آہستہ سے بتایا۔

”کیوں؟ ابھی تو وہی در پہلے ہی تو وہ اور اس کی گھر والی یہاں سے گئے تھے۔ اگر کوئی مسئلہ ہے، انہیں کوئی کی نگ رہی ہے تو تم اس معاملے کو نشاندہ۔ مجھے کیوں ڈسٹر ب کر رہے ہو؟“ چودھری کا لہجہ کچھ اور بھی سخت ہو گیا۔

”مسئلہ کچھ اور ہے چودھری صاحب۔“ منشی سبے ہوئے لہجے میں بولا اور پھر چودھری انکار کے بالکل قریب جا کر اسے سرگوشی میں کہہ دیا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تم سب طرف اپنے بندے دوڑا دو۔ بس کے اوڑے سے معلوم کرو اور اگر کچھ معلوم نہ ہو تو غیاب تمہارے فیصل آباد کا چاچا سے پوچھ کر آؤ۔“ چودھری نے کہا۔ ”جہاں سے تم نے کہا، وہاں سے آؤ۔“ منشی کی سرگوشی کے جواب میں چودھری انکار غضب تک ہو کر ہدایات دینے لگا۔ منشی اس کی ہدایات پر عمل پیرا ہوا تو ہی سے باہر نکل گیا۔ خود چودھری انکار کا یہ عالم تھا کہ پورا چہرہ فٹان کی طرح سرخ ہو رہا تھا اور وہ اپنے ساتھ رکھے کھانے سے بے نیاز ہو گیا تھا۔

”خیریت تو ہے چودھری صاحب! آپ کچھ پریشان نظر آ رہے ہیں؟“ شہر یار جو کچھ معاملے کی نوعیت سمجھ رہا تھا، لہجے میں تشویش ہو کر اس سے پوچھنے لگا۔

”خیریت ہی ہوئی۔“ چودھری انکار کو دھوکا دے کر نکل جاتا تھا آسان نہیں ہے۔ اس کا لہجہ کسی سانپ کی چونکارتے مشابہ تھا۔

”اگر آپ کو میری مدد کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔“ شہر یار نے پیشکش کی۔

”مگر یہ اسے ہی صاحب! معاملہ ذرا ذاتی نوعیت کا ہے۔ بہر حال، میں اس سے نسبت لوں گا۔“ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ مشکل سے خود پر ضبط کر کے بیٹھا ہے۔ شہر یار نے مزید کوئی سوال نہیں کیا اور اپنی چپٹیت میں باقی رہ جانے والا کھانا جلدی جلدی ختم کر کے کھانے سے ہاتھ صاف

لیا۔ ڈانٹنگ روم سے باہر نکلنے کے بعد اس نے چودھری انکار سے واپسی کی درخواست کی۔ چودھری شاید خوشگامی میں چاہتا تھا اس لیے اس نے شہر یار کے مزید کہنے پر اصرار نہیں کیا اور فوری طور پر اس کی واپسی کے لیے گاڑی مہیا کر دی۔

”ہاں عبداللہ! کیا بتانا اس لڑکی نے اپنے بارے میں؟“ شہر یار نے واپس دیکھتے کے بعد عبداللہ انان سے سب سے پہلے ماہ بانو کے متعلق ہی استفسار کیا۔

”اس نے مجھے زیادہ تفصیلات نہیں بتائیں مگر اس نے صرف اتنا بتایا ہے کہ اسے چودھری انکار کی طرف سے شدید خطرہ درپیش ہے اور وہ چارے پاس اس لیے آئی ہے کہ تم گاؤں سے نکلے میں اس کی مدد کریں۔ وہ اپنا سفری بیگ بھی ساتھ لے کر آئی تھی۔ میں نے مناسب سمجھا کہ زیادہ دیر بچ آباد میں نہ رکوں اس لیے میں اس لڑکی کو اپنے ساتھ یہاں لے کر آ گیا ہوں۔ اس کا اصرار تھا کہ میں اسے فیصل آباد جانے والی کسی ٹرین میں سوار کروں لیکن میں آپ کی مرضی جانے بغیر اس کی یہ فرمائش پوری نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے میں نے اسے روک لیا ہے۔“ عبداللہ انان نے شہر یار کو بتایا۔

”یہ تم نے بہت اچھا کیا۔“ چودھری کو ابھی طرح اندازہ تھا کہ لڑکی بچ آباد سے نکلنے کے بعد فیصل آباد کا کسی رخ کرنے کی کوشش کرے گی۔ کچھ دیر پہلے اس نے میرے سامنے ہی اپنے بندوں کو فیصل آباد جانے کا حکم دیا ہے۔ شہر یار نے پوسج انداز میں عبداللہ انان سے کہا۔ چودھری انکار کی دھوت پر حویلی جانے سے اسے کم از کم یہ فائدہ ضرور ہوا تھا کہ اللہ کا فی سہی، چودھری انکار کے خلاف بد دھجے آنے والی لڑکی کی اس بات کی تصدیق ضرور ہوئی تھی کہ وہ چودھری کی طرف سے خطرے کا شکار ہے۔

”لڑکی کہاں ہے عبداللہ انان؟ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ اور ہاں، یہ بتاؤ کہ اسے تمہارے ساتھ یہاں آتے ہوئے تو کسی نے نہیں دیکھا؟“

”نوسر! بچ آباد میں ماسٹر آقا بپ اور یہاں میرے اور مشاہیرم خان کے علاوہ کسی کو لڑکی کے بارے میں علم نہیں۔ گیت پر چوکیدار نے اگر دیکھا بھی ہو گا تو یہ اندازہ نہیں کر پایا ہو گا کہ ہمارے ساتھ آنے والی لڑکی کون ہے۔“ شہر یار کے سوال پر عبداللہ انان نے اسے تسلی دی اور خود باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو ماہ بانو اس کے ساتھ تھی۔ وہ اب بھی تسلی ہوئی تھی کہ وہی لڑکی اور اس نے چادروں بہت مضبوطی سے اپنے گرد لپیٹا ہوا تھا۔

”جینو۔“ شہر یار نے نرمی سے اسے اپنے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ وہ جھپٹتی ہوئی اس انداز سے کرسی پر کھنکھاتی کہ لڑکیاں کھنکھی لے اٹھ کر باہر نکل جانے کی۔

”آرام سے بیٹھو اور مجھے تفصیل سے اپنا مسئلہ بتاؤ۔ تم جو کچھ بتاؤ گی، وہ میرے علاوہ کسی اور کے علم میں نہیں آئے گا اور میں کوشش کروں گا کہ تمہاری ہر ممکن مدد کی جائے۔“ شہر یار نے اس کا انداز دیکھتے ہوئے نرمی سے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ شہر یار کی بات سے اشارہ پاتے ہوئے عبداللہ انان کمرے سے باہر نکل گیا۔

”ہاں، اب بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟“ شہر یار نے ایک بار پھر اصرار کیا۔

”چودھری انکار بہت بڑی فطرت کا آدمی ہے۔ میں آپ سے بس اتنا چاہتی ہوں کہ آپ اس سے بچا کر مجھے فیصل آباد میرے گھر پہنچا دیں۔ یہ آپ کا مجھ پر بڑا احسان ہو گا۔“

”تو کیا تم بچ آباد کی رہنے والی نہیں ہو؟“ شہر یار، ماہ بانو کی بات سن کر چونکا۔

”نہیں۔“ ماہ بانو نے نفی میں سر ہلایا اور بولی۔ ”میں فیصل آباد میں رہتی ہوں۔ میرا دسواں اپنی بہن کی شادی میں شرکت کے لیے آئی تھی۔ میرے اہلے اپنے شادی کے بعد ڈیرہ تھی مجھے روک لیا کہ وہ چار دن تک رہاں کا کھانا بنا دو پھر میں خود مجھیں فیصل آباد واپس چھوڑ آؤں گا۔ میں چودھری انکار کے خوف سے نہ کرنا نہیں چاہتی تھی لیکن سب کے اصرار پر دکاندار پر میرا خوف کچھ تھا۔ چودھری نے موقع دیکھ کر مجھے اپنے ہی کوشش شروع کر دی اور اب تو میرے اپنے ماں باپ بھی مجھے اس بدینیت انسان کے حوالے کرنے پر تیار ہو گئے ہیں۔ آپ بس مجھے فیصل آباد پہنچا دیں۔ وہاں بے پے اور ادا میرے ساتھ یہ حکم نہیں ہونے دیں گے۔ زندگی ہوئی آواز میں اپنا مسئلہ بتاتے ہوئے ماہ بانو نے ایک بار پھر شہر یار سے اصرار کیا۔

”وہ جینو، تم بالکل شروع سے اور ذرا تفصیل سے مجھے ساری بات بتاؤ۔ تمہاری ماں بانو سے میں پوری طرح سمجھ نہیں پا رہا ہوں کہ فیصل آباد اور میرا دسواں سے اصل میں کون سی جگہ تمہارے ماں باپ پر رہتے ہیں اور تم پہلے سے ہی چودھری انکار سے کیوں خوف زدہ ہیں؟“ شہر یار نے ماہ بانو کے جواب پر کچھ اٹھ کر اس سے دریافت کیا۔

”میری طرح میری بات سمجھنے کے لیے آپ کو میرا ایک گرامر بخیر سمجھ پڑے گا۔“ ماہ بانو نے اس کی طرف دیکھتے

ہوئے آہستہ آہستہ اسے سارے حالات سے آگاہ کر دیا۔

”آج چودھری نے میرے ماں باپ کو حویلی بلوایا ہوا تھا۔ وہ لوگ میری بہن زہیرہ کو میری عمرانی پر چھوڑ کر گئے تھے۔ زہیرہ نے میری حالت دیکھی تو روتی ہوئی آئی تھیں مگر تم مجھے غسل خانے میں بند کر کے یہاں سے نکل جانے میں کہہ دوں گی کہ میں نہا نے نکلی تھی، مجھے معلوم نہیں ہوا کہ کب ماہ بانو باہر سے غسل خانے کی کنڈی لگا کر گھر سے نکل گئی۔ میں نے بہن کے کہے پر عمل کیا۔ ابھی میں گھر سے نکلی ہی تھی کہ سمجھ سے اطلاع ہوتا سنا کہ اسی صاحب گاؤں میں موجود ہیں، اگر گاؤں کے کسی فرد کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے تو وہ اسکول آکر اسی صاحب سے مل سکتا ہے۔ اس اطلاع سن کر مجھے خیال آیا کہ جو اسے ہی انخرو گاؤں آکر گاؤں والوں کے مسائل سننے میں دلچسپی رکھتا ہے وہ یقیناً اچھا انسان ہوگا۔ بس اسی لیے میں اسکول نکلی تھی۔ مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں بس کے اوڑے پر چپکنے سے پہلے ہی کوئی مجھے راستے میں ہی نہ دھر لے، اس لیے آپ کی مدد لینا مناسب معلوم ہوا۔ میں نے آپ کے بی بی سے درخواست کی تھی کہ وہ مجھے فیصل آباد جانے والی ٹرین میں بٹھادیں لیکن جانے کیوں انہوں نے میری بات نہیں سنی اور مجھے یہاں لے آئے۔“ ماہ بانو نے شہر یار کے کہنے پر ذرا تفصیل سے سارا معاملہ بیان کرتے ہوئے آخر میں شکوہ کیا۔

”میرا بی بی اسے ایک مشکل مند اور تجربہ کار آدمی ہے۔ اس نے بہت اچھا کیا کہ مجھیں بس اڈے پر نہیں لے گیا۔“ چودھری انکار نے سب سے پہلے اپنے بندوں کو اسی طرف دوڑایا تھا۔ اس نے فیصل آباد میں اپنے بندے روانہ کر دیے ہیں تاکہ تم مجھے یہاں پہنچو، ان کی گرفت میں آ جاؤ۔“

”آپ کو یہ سب کیسے معلوم ہوا؟“ ماہ بانو نے شہر یار کی فراہم کردہ معلومات پر متحیر ہو کر پوچھا۔

”اتفاق سے چودھری انکار نے بے سارے احکامات میرے سامنے ہی دیے تھے۔ اس کے منشی نے میری وہاں موجودگی کے دوران کسی غیاب تمہاری شخص کے آنے کی اطلاع دے کر چپکے سے چودھری کو کچھ بتایا تھا۔ یقیناً اس نے تمہارے غائب ہونے کی اطلاع ہی دی تھی کیونکہ چودھری ایک دم بہت فحش میں آ گیا تھا اور پھر اس نے منشی کو بس اڈے اور فیصل آباد کی طرف بندے دوڑانے کا حکم دیا تھا۔ میں نے اس وقت ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ بے سارے احکامات تمہارے سلسلے میں دیے جا رہے ہیں۔ اب تم سے بات کرنے کے بعد تو مجھے ایک فیصلہ بھی اپنے اندازے کی درستگی پر شک نہیں رہا ہے۔“ شہر یار نے ماہ بانو کو جواب دیا۔

"اف خدا میں اب کہاں جاؤں گی؟ لیصل آباد کے سوا تو میرا دوسرا کوئی ٹھکانہ نامی نہیں۔" ماہ بانو نے پریشان ہو کر اپنا سر تھام لیا۔ وہ اپنے اس پریشان روپ میں بھی بہت دلکش لگ رہی تھی۔ شہریار نے اسے پہلی بار چودھری افکار کے دادا کے عرس کے موقع پر دیکھا تھا۔ اس وقت اس کے چہرے پر قدرے بے زاری کے باوجود تروتازگی اور شادابی تھی۔ وہ تروتازگی اور شادابی آج مجھ ماہ بانو نے آئی تھی۔ شاید مسلسل اذیتیں اور خوف کی وجہ سے ایسا ہوا تھا اس کے باوجود شہریار خود سے اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکا کہ وہ اب بھی بے حد قابلِ توجہ ہے۔ چودھری افکار یوں ماہ بانو پر ہی تو اس کے لیے پاگل نہیں ہوا تھا کہ اپنی ابتدائی کوششوں کی ناکامی کے بعد سید سے سید سے شادی کی بات پر آگیا تھا۔ حیثیت کے اعتبار سے تو ماہ بانو چودھری کے ہنسبھی نہیں معلوم ہوتی تھی لیکن اس کا حسن اتنا بھرپور تھا کہ چودھری نے اپنے سے بے حد چچی حیثیت کے خاندان میں رشتہ جوڑنا منظور کر لیا تھا۔ اس کیس نے چودھری کی شخصیت کا ایک اور لنگ شہریار پر غا پر کر دیا تھا۔ وہ محض اپنے کھجور کے معاشی اور معاشرتی استحصال کے ساتھ ساتھ ان کی عزتوں کا بھی دشمن تھا۔ مگر ان کے زعم و دولت کے نئے اور بوسے نے اسے اس بری طرح بکڑا رکھا تھا کہ وہ وہ جہاں رہ سکتے کے باوجود اس پر خود سے بے حد چھوٹی اس لڑکی کو حاصل کرنے کا جنون سوار ہو گیا تھا۔ شہریار ان سارے خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ ماہ بانو نے اس کی خاموشی پر گھبرا کر باقاعدہ سسکا شروع کر دیا۔ اس کی سسکیوں کی آواز سن کر شہریار اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"تمت رو۔ تم تو بہت بہادر لڑکی ہو۔ اب تک تم نے سارے حالات کو بہت بہادری سے منہ کیا ہے، اب بھی بہت سے کام لو۔ مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے انسان کو آنسوؤں کی نہیں بلکہ ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔" شہریار کو اس کا رونہ بے چین کر رہا تھا اس لیے وہ اسے تسلیاں دینے لگا۔

اس کی تسلیوں پر ماہ بانو نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی اور چادر کے پلے سے زیناروں پر ڈھنگ آنے والے آنسو صاف کرنے لگی۔ شہریار نے اپنی پھیل پر رکھا ہوا پانی کا گلاس اٹھا کر اس کی طرف دیا۔ ماہ بانو نے گلاس تھام لیا اور وہ گھونٹ پانی پینے کے بعد گلاس واپس میز پر رکھ دیا۔ اب وہ خود کو تسلیاں ملتی تھی لیکن غم ہی آنسوؤں میں اتر آئے والے سرخ زوروں نے اس کی آنسوؤں کا وہ بھی پریشانشناں بنا دیا تھا۔ شہریار نے اس کی آنسوؤں کی کشش سے نظریں چراتے

ہوئے انٹرکام پر عبد اللہ انان کو اندر آنے کا حکم دیا۔

"عبد اللہ انان! فوری طور پر اس لڑکی کے کسی محفوظ جگہ رہنے کا بندوبست کرنے سے کسی ایسی جگہ جہاں یہ چند دن خاموشی سے رہ سکے پھر میں دیکھوں گا کہ اس مسئلے میں کیا کیا جاسکتا ہے۔ فی الحال ہمارے سامنے سب سے اہم مسئلہ اس کے لیے کسی محفوظ مقام کی فراہمی ہے۔"

عبد اللہ انان کے اندر آتے ہی شہریار نے اس سے کہا۔

"میں خود بھی اس معاملے پر سوچتا رہا ہوں سر! اگر اس کیس میں چودھری افکار ملوث نہیں ہوتا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن چودھری کی وجہ سے ہمیں بہت احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ میرے خیال میں تو ہمارے سامنے مسئلے میں کوئی بھی جہانِ آخرت کے لیے مناسب نہیں رہے گی۔ اس پر سے مسئلے میں چودھری کا اچھا خاصا اثر سونچ ہے۔ اس کے بندے آرام سے ان صاحبہ کو تلاش کر لیں گے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ ہم انہیں فوری طور پر بلا ہو کر کسی دارالامان میں منتقل کر دیں۔ بعد میں کسی این پی او فیروہ کی مدد سے اس معاملے کو اٹھایا جاسکتا ہے۔"

عبد اللہ انان نے شہریار کو مشورہ دیا تو اسے مناسب معلوم ہوا۔

"ٹھیک ہے عبد اللہ انان! ایسا ہی کر لیتے ہیں لیکن اسے لا ہو کر کسی ساتھ بھجوا دو گے؟ اس کام کے لیے مجھے تو کسی اعتماد کے بندے کا انتخاب کرنا ہوگا۔"

"مشہور خان ہے تاہم اس پر آپ آجکے بندہ کر کے اعتماد کر سکتے ہیں۔ میں اس کو صورت حال ابھی طرح سمجھا دوں گا۔ ساتھ ہی دارالامان کی انتظامیہ کے ہم ایک خط بھی لکھ دوں گا تاکہ وہ لوگ ان خیرمدی موجودگی کو عملی طور پر سینڈ راز میں رکھیں۔" شہریار کی تشویش کے جواب میں عبد اللہ انان نے اسے تسلی دی۔

"ٹھیک ہے۔ تم جس طرح مناسب سمجھو اس کیس کو پنڈل کر لو۔" شہریار نے عبد اللہ انان کو جواب دیا۔

"آئیے خیرمدی۔" عبد اللہ انان نے ماہ بانو کو پکارا۔ وہ جھجکتی ہوئی اس کے پیچھے کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے باہر نکلنے ہی شہریار کو کمرے کے بے حد خالی ہونے کا احساس ہوا لیکن اس نے خیرمدی اس احساس کو اپنے دماغ سے جھٹکتے ہوئے ایک لمبائی کی طرف اپنی توجہ مبذول کر لی۔

☆ ☆ ☆

غیاث محمد، چودھری افکار کے سامنے کھڑا تھا کہ اب رہا تھا۔ چودھری کے چہرے اور آنسوؤں سے جھلکتا غضب اس کے اوسانِ خطا کیے دے رہا تھا۔

"ختم ہے میں سرکار! میرا کوئی قصور نہیں۔ میں اور

نوراں تو اسے گھر چھوڑ کر آپ کے گم ہو چلی آئے تھے۔ وہ مجھے سے کیسے نکل باہر گئی، ہمیں خبر نہیں۔ میں تو گھر جا کر ہی معلوم ہوا اور میں سب سے پہلے آپ کو اطلاع کرنے دوڑا ہوا آیا۔" سیکپائی آواز میں اس نے بڑی مشکل سے اپنی منافی پیش کی۔

"بڑا بدصوم نہ بن غیاث محمد! خیرمدی کا تم کو تو اپنی دمی کوہ میں رکھا۔ میں وہاں تو اتوں میں اس کی نفرت بھجوانا چاہتا تھا تو اس کا باپ ہو کر کیسے نہیں جان سکا کہ خیرمدی کی کسی اذیت کو کوئی کی طرح ہے جسے کام ڈال کر رکنا ضروری ہے تو نے اپنی دے داری پھیلانی ہی نہیں۔ بجائے اس کے کہ چھوٹی آئے ہوئے اس کا مجھ بندوبست کر کے آتا تو الٹا مجھے برا احسان جتانے بیٹھ گیا ہے کہ میرے باوے پر تو اور خیرمدی کو دلی بیباں آئے تھے اور پیچھے جو کہہ کر نوراں تو اس کا دے دار نہیں۔" غیاث محمد کی بات پر چودھری غضب ہاک ہو کر چٹخاڑا۔

"معاف کر دیں سرکار! میری تسلیں آپ پر قربان ہو جائیں۔ میں پہلا یہ گستاخی کیسے کر سکتا ہوں کہ آپ پر کوئی الزام رکھوں۔" غیاث محمد فوراً ہی چودھری کے قدموں میں گر گیا۔

"خیرمدی معاف کرنے کے لائق نہیں غیاث محمد! ماہ بانو میرے پاس ہماری امانت تھی۔ تو نے ہماری امانت کی حفاظت نہیں کی۔ کیسے اس نے خیرمدی کو دہلیز پار کی؟ تو اسے گھر میں چھوڑ کر آتے وقت کوئی بندوبست کر کے کیوں نہیں آیا؟" چودھری، ماہ بانو کے اس طرح ہاتھ سے نکل جانے پر بری طرح تھلکا ہوا تھا۔ اس تھلکا ہٹ کا اظہار کرنے کے لیے فی الحال اس نے غیاث محمد ہی مہر تھا۔

"میں اسے بہن کی گرائی پر چھوڑ کر آیا تھا سرکار! وہ ہے چادری ہمارے کہنے پر اس کے پاس رکی ہوئی تھی، پر ماہ بانو نے اسے دھوکا دیا۔ بڑا بزدل بزدلی کی کہ وہ ماہ بانو کو سوتا سمجھ کر غسل خانے میں ہی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ ماہ بانو سونے کا کمرہ دہری ہے اور اسے غسل خانے میں بند کر کے چھٹی پنے کی۔ اسے چادری کو تو خود خبر نہیں ہوئی کہ کب ماہ بانو نے باہر سے غسل خانے کی کڑی چڑھا دی۔ وہ تو جب اس نے باہر نکلنے کے لیے دروازہ کھولا تو ماہ بانو چلا کر دروازہ باہر سے بند ہے۔ ہمارے گھر پہنچے تک وہ خود غسل خانے کا دروازہ اٹھک سے پیٹ پیٹ کر بلکاں ہوئی تھی۔" غیاث محمد نے ایک انداز میں منافی پیش کرنے کی کوشش کی۔

"بندہ کر یہ ساری نبواں۔ مجھے خیرمدی سے یہ دھڑے نہیں

سننے ہیں۔ تیرا کیا ہے، خیرمدی کوئی کی عزت ہے جو چھٹی کے اس طرح سے بھاگ جانے سے غراب ہوگی۔ مجھ تو خیرمدی اچھے کی تاکہ چودھری افکار کی ہونے والی بیوی کا چہرے پہلے ہی گھر چھوڑ کر بھاگ گئی۔" چودھری نے غیبت عموماً کرنا۔

"نہرکار! ایک اچھے آپ کے دشمنوں کی۔ ہم نے تو ابھی تک کسی کو یہ بات بتائی بھی نہیں تھی۔ اور وہ تھا کہ آپ کی طرف سے ماہ کا جوڑا اور زینوارت لے کر جائیں گے؟ سارے گاؤں کو اکٹھے کر کریں گے۔ ابھی تو بات صرف میری بیٹیوں اور دامادوں تک تھی۔ ابھی تو میں نے حوراء اور صفرا کو بھی خبر نہیں بھجوائی تھی۔ آپ بے فکر ہیں سرکار! ہم میں سے جس جس کو یہ بات معلوم ہے، وہ مجھ لے سے بھی اپنی زبان نہیں کھولے گا۔ آپ کی عزت ہمیں اپنی جان سے باو کر عزیز ہے۔ آپ روتے رہنا مناسب سمجھتا ہوں کہ کوہار ہیں۔" ماہ بانو یہاں سے نکل بھی گئی تو آپ کی ہچکے سے باہر کہاں جانے کی؟ آپ اس کے ہاتھ اٹھانے پر اگر اس کی کوال بھی سمجھا لیں گے تو اپنے اس جنگ خوار کی زبان سے "آف" تک بھی سنیں گے۔ میں نے دہی آپ کو دینے کی ہامی بھری تھی، اب میرا اس پر سے حق ختم ہو گیا۔ وہ آپ کی پیچھے ہے، آپ ہر چاہیں اس کے ساتھ وہ سلوک کیجئے گا۔" غیاث محمد اپنی چال چلیدیں سے اس بات کا پکا انتظام کر رہا تھا کہ ماہ بانو کے اٹھانے ہوئے قدم کا نتیجہ اسے خود نہ جھٹکنا پڑے اور وہ چودھری کے عتاب سے محفوظ رہے۔

"میں اڑے پر جانے والے آدمی وہیں آئے ہیں چودھری صاحب! انہوں نے ابھی طرح معلوم کیا ہے۔ وہ کھینچے پہلے جو اس وہاں سے نکلی تھی، اس میں کوئی تھپا لڑکی نہیں تھی۔ ابھی جو بس لیصل آباد جانے کے لیے تیار کھڑی ہے، اس کی بہت اچھی طرح سٹائی کی گئی ہے۔ اس میں بھی غیاث محمد کی دمی نہیں ہے۔" اسی وقت منشی اللہ رکھا وہاں آیا اور چودھری افکار کو اطلاع دی۔

"پھر کہاں جا سکتی ہے وہ؟ تم اسے گاؤں میں سٹائی کرو، وہو سکتا ہے کسی رشتے دار کے گھر بھی بھیجیں ہو۔" منشی کی اطلاع پر حیران ہوتے ہوئے چودھری نے اسے ہدایت دی۔

"میں نے یہ کام پہلے ہی شروع کر دیا ہے۔ غیاث محمد کی دونوں بیٹیوں کے گھر کی سٹائی کی جا چکی ہے۔ اب میں اس کی زعمانی کے ساتھ اپنے اعتبار کی دو ایک عموماً کو کر رہا ہوں۔ ان سارے گھروں کی سٹائی کروا رہا ہوں جن پر

ٹھک کیا جا سکتا ہے۔ آپ بے فکر ہیں، اگر اس کی دیکھی گاؤں میں ہی ہے تو یہاں سے نکل کر کہیں نہیں جا سکتے گی۔ دوسری صورت میں، میں نے فیصل آباد کی طرف توبہ بندے دوا دی دیے ہیں۔ یہاں سے نکلیں، وہاں سے اس کا چال چل جائے گا۔" منشی اللہ رکھانے چودھری افتخار کو اپنی کارکردگی سے آگاہ کرتے ہوئے تسلی دی۔

"یہ اچھا کام کیا تو نے۔ پر میری بھینٹیں آ رہا کر گروہ بس میں سوار نہیں ہوئی تو پھر فیصل آباد کیسے پہنچے گی؟" چودھری افتخار ماہ بانو کو جاننے کے لیے جتنا بے چین تھا، اس کے نائب ہونے سے اتنی ہی ناگوار ہو رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح گھڑی کی چوٹھائی میں ماہ بانو کو تھانے کر کے اس کے سامنے حاضر کر دیا جائے۔

"ہو سکتا ہے وہ کسی خاندان کے ساتھ مل کر بیٹھتی ہو اس لیے کسی کو اعزاز نہ ہو سکا ہو۔ دوسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس نے بس میں جانے کے بجائے سڑک پر سے گزرنے والی کسی پرانچھٹ گاڑی یا ٹوٹر وغیرہ سے لٹھ لے لی ہو۔ بہر حال، جو بھی صورت یہ ہو، آپ اس بات کی تسلی کر دیں گے۔" منشی اللہ رکھانے ایک بار پھر چال چل سنا اعزاز میں چودھری افتخار کو دلدادہ کیا۔ چودھری افتخار فی الحال اس تسلی پر ہی مجبور سا کر سکتا تھا، چنانچہ منشی کی بات پر ایک ہنسا کر گھبرا کر رہ گیا۔

"میرے لیے کیا حکم ہے سرکار؟" غیاث محمد نے ہاتھ جوڑتے ہوئے چودھری افتخار سے پوچھا۔

"تو چاندور جا کر کہیں سے اپنی دیکھی کو تلاش کر۔ اگر وہ نہیں ملتی تو سمجھ لینا کہ حیرانجام اچھا نہیں ہوگا۔" چودھری افتخار نے قربانک کے لیے فیصلہ نہایا۔ غیاث محمد اس فیصلے کو سن کر کاپ اٹھا اور لڑتا ہوا چودھری افتخار کے قدموں میں گر گیا۔

"رحم سرکار دجا میں آپ کا ٹھک خوار ہوں۔ میری بد بخت اولاد کی کرنی کی سزا مجھے نہ دیں۔ وہ بد نصیب بھی جو آپ کی بھٹی عزت کی قدر نہیں کر سکی۔ میں اور اس کی ماں تو بڑے شوق سے آپ کے دیے ہوئے کپڑے اور زور لے کر گھر گئے تھے کہ وہ اتنی جتنی چیزیں دیکھے گی تو اپنے پیٹھوں پر ناز کرے گی لیکن اس کرموں میں نے تو اپنے نصیب کو کھو کر مارنے کے ساتھ ساتھ ہمارے بخت پر بھی سیلی بھجوری دی۔ پر آپ تو مجھ پر رحم کریں سرکار! آپ کا ہاتھ میرے سر سے اٹھ گیا تو میں کہاں جاؤں گا۔" غیاث محمد عورتوں کی طرح

دہانچوں پر دہانچیاں دے رہا تھا لیکن چودھری افتخار نے کان نہ دھرے اور غیاث محمد کو دہانچیاں خاک چاٹتا چھوڑ کر خود اللہ کر حویلی کے اندرونی حصے کی طرف چلا گیا۔

☆☆☆

"جانے کیا بات ہے؟" بھانٹا نے ماہ بانو کو داپس لاکر نہیں چھوڑا۔ میں نے اس سے کہا بھی تھا کہ دو دن سے زیادہ میری دیکھی کوست روکنا، پوچھنا تو تیرا دل بھی گڑبگڑا ہے اور بھانٹا کا کوئی نام و نشان نہیں۔" فیصل آباد میں اپنے گھر بھی حوران سے مسافر سے پریشانی کا اظہار کیا۔

"تیرے کہنے سے کیا ہوتا ہے؟" بھانٹا نے غیاث کا مزاج جانتی نہیں ہے۔ جب اس کا من کرے گا، جب ہی ماہ بانو کو لاکر چھوڑے گا۔

"پر مجھے تو ماہ بانو کی فکر ہو رہی ہے۔ تسلی بدلتی سے وہ وہاں رکنے کے لیے تیار ہوئی تھی۔ اس کی اصل دیکھ کر میرا اچھا جی نہیں مان رہا تھا کہ میں اسے وہاں چھوڑ کر آؤں۔ اتنی سی صورت نکل آئی میری دیکھی کی۔" حوران کا دل دھچکا، ماہ بانو میں اٹکا ہوا تھا۔

"جی تو میرا بھی نہیں مان رہا تھا پر میں خود پر جبر کر گیا۔ اگر ماہ بانو کو داپس لانے پر شدت کر تو بھانٹا اپنی اصلیت پر اتر آتا اور خواہو کہ بدلتی ہو جاتی۔ خوشی کے منہ سے پر بدلتی پھیلا تا مجھے اچھا نہیں لگا۔" اس بار مسافر نے بھی اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

"کیا کرنا کر سکتی تم آپ حیران آباد جا کر ماہ بانو کو داپس لے آؤ۔ چنانچہ کون میرا ہی اس کی طرف سے بڑا پریشان ہو رہا ہے۔ پچھلی بار بھی جب وہاں رکنے کی جی تو بار ہو کر داپس آئی تھی۔ آئے کے بعد بھی جی دن تک مجھے کچھ پریشان پریشان سی تھی۔ اصل میں گاؤں کا ماحول اس کے جی کو بھاتا نہیں ہے۔ زہرہ کے بیاہ میں شرکت کے لیے جانے پر بھی بڑی مشکل سے راضی ہوئی تھی۔ حالانکہ کہنے کو زہرہ اس کی سگی بہن ہے، پر مجھے لگتا ہے وہاں گاؤں میں کوئی میری دیکھی کے ساتھ محبت سے پیش نہیں آتا اس لیے وہ گاؤں جا کر رہے کے نام پر رہتی ہے۔"

"اچھا، زیادہ اپنا دل میلان نہ کر۔ آخر وہ لوگ کیوں اسے پیار نہیں کریں گے؟" کچھ بھی کہی، ماہ بانو ان کی سگی بی بی ہے۔" حوران کی تشویش پر مسافر نے اسے بھجایا۔

عرات کے منہ سے اسے ایک جوڑا ہی جا کر دے دیں۔" حوران داپس ماہ بانو کو بھانٹا کی دیکھی کیلین آن خود سارے گھر کے گرجی ہوئی تھی۔

"چل جانے جی دے۔ ان لوگوں کے حالات ہی کہاں ہیں ایسے کہ وہ کچھ کر سکیں۔" اللہ کا کرم ہے کہ میری دیکھی کے نصیب سے اس نے مجھے اتنا دے رکھا ہے کہ میں خواراں کے سارے شوق پرورے گرد پاتا ہوں۔ اب بھی بس یہ فکر ہی ہے کہ اتنے روپے جوڑوں کو اس کو ڈاکڑی پر جانے کا انتظام ہو جائے۔" مسافر نے حوران کو کونہ سے بولے بات کا درجہ دیا۔

"ہاں، بڑھنے کا تو اسے بڑا شوق ہے۔ میں نے اس کے لیے جو کچھ بخرائے تھے، وہ اسے دے دیے تو مجھ سے خفا ہونے لگی کہ بے پیسے کیسے کیوں بخرائے؟ میرے دانے کے لیے روپے سنبھال کر رکھ تھیں۔ میں نے بھی صاف کہہ دیا کہ یہ تیرا اور تیرے ابا کا معاملہ ہے۔ دانے دانے کا انتظام وہ خود کرے گا، میرے ذمے تو تیرا بھینٹ پانا ہے۔" حوران کا دھیان بات کیا اور وہیں کر مسافر کو تھانے لگی۔

"اللہ! اللہ! میں اس کی یہ خواہش ضرور پوری کر دوں گا۔" میرے لیے تو ماہ بانو ہی جتنی بھی ہے اور بیٹا بھی۔ میرے بس ہیں جتنا بھرا میں اس کے لیے اتنے ارمان تو ضرور ہی پورے کروں گا۔"

"اللہ نہیں بہت دے۔" مسافر کی محبت کو محسوس کر کے حوران مسکرائی پھر چونک کر کہہ بیٹھی تھی۔ "خیر، ماہ بانو کے کاغذ میں اس کی پچھلی کی درخواست نہیں دی تھی کیا؟ آن شام کے وقت ایک لڑکی آئی تھی ماہ بانو سے ملنے کے لیے۔ میں نے بتایا کہ ابھی ماہ بانو گاؤں سے واپس نہیں آئی تو حوران ہو کر کہنے لگی کہ اچھا! میں تو بھی جی ماہ بانو آج واپس آگئی ہے۔ تجوڑی در اندازہ کر گئی تھی اور سارے میں یوں خطر تھا تھا کہ دیکھنے کی جیسے میں نے ماہ بانو کو کہیں چھوڑ دیا ہے۔ مجھے اس کی بے بسی پر بھی آنے لگی۔ یہ لڑکیاں کیا لیاں بھی عجیب ہی ہوتی ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ ایسے سن لگا لگی ہیں کہ بھر دو چار دن بھی ایک دوسرے کے بغیر گزارنا مشکل ہو جاتا ہے۔" حوران اپنی بات کے اختتام پر ہولے سے کہی۔

"میری دیکھی ہے ہی ایسی کہ سب اس سے پیار کریں۔" داپس کی سگی بیٹی کی اس کی جو ہے تب ہو کر گھر تک پہنچی آئی، وہ درمیان میں تو کاغذ میں اطلاع کر دی تھی کہ شاید ماہ بانو بھی ایک دو دن اور نہ آئے۔"

"کوئی نئی سبیلی ٹکری تھی۔ اس سے پہلے تو میں نے بھی اسے نہیں دیکھا تھا۔ کوڑا نام تیری سگی۔" مسافر کے پوچھنے پر حوران نے اسے بتایا۔

"چل ہوئی کوئی۔ کل میں ماہ بانو کو داپس لے کر آؤں گا تو اسے بتاؤ، وہ آپ ہی پچان لے لی۔ بس اب جتنی ذکر دے مجھے نیند آنے لگی ہے۔ سویرے اٹھ کر پہلے منڈی سے چلے کر آؤں گا پھر ماہ بانو کو لینے کے لیے گاؤں جاؤں گا تاکہ گاؤں سے واپس آ کر شام کے وقت اپنا ٹھکانا سکھان۔" مسافر حوران کی اصل بکری کا وقت تو شام کو ہی ہوتا ہے۔ "مسافر حوران کو کھٹکھٹا سلسلہ ختم کرنے کا اشارہ دیتے ہوئے بستر پر لٹ گیا۔ اسی وقت کسی نے دروازے پر دستک دی۔

"ابھی خیر! یہ اس وقت کون آیا۔" حوران کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے گھبرائی۔

"تو تو بس ہر وقت اسی طرح ہوتی رہا کر۔ میں باکر دیکھتا ہوں۔ ہو سکتا ہے پاس پڑوس میں کسی کو کوئی کام ہو گیا ہو۔" مسافر نے حوران کو کادور خود دوسرے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس لمحے میں اس کا ایک زمانے سے قیام تھا۔ ارد گرد بے اعتبار کے لوگ تھے اور ان واپس کی صورت حال بھی تشویشناک نہیں تھی۔ اس لیے جا کوئی نہیں کیے کھٹ سے دروازہ کھول دیا۔ دروازے کی دوسری طرف موجود لوگ تو بالکل تیار کھڑے تھے اور دروازہ کھلنے ہی دوا کر دے ہوئے اندر میں آئے۔

"کون... کون یہو؟" مسافر نے ان کے اس اعزاز پر گھبرا کر پوچھا۔

"کہاں سے تیری دیکھی؟ کہاں چھاپا ہے تو نے اسے؟" مسافر کے سوال کو نظر انداز کر کے آنے والوں میں سے ایک نے تخت لکھ میں اس سے پوچھا۔

"تم کون ہو جو میری دیکھی کے بارے میں پوچھ رہے ہو؟" ایک انشوی کی زبان سے بیٹی کا ذکر سن کر مسافر کے کون نے جوش مارا اور اس نے بجائے جواب دینے کے کہے تجروں سے پوچھا۔ جواب اس کے من پر ایک زوردار تھجڑا کر لگا۔ حوران جو اس طرح انشویوں کے ایک گھر میں اٹھنے سے دم پر خود گھڑی رہ گئی تھی، مسافر کا کھنکھنے لگنے کی ذرے نہ تھی۔

"اس کی آواز بند کرو۔ یہاں گھروں کی دوا ہے دیوار جڑی ہے، کہیں آس پاس والے آواز میں نہ کر اہرنہ آجا میں۔" وہ شخص جو شروع سے سوال جواب کر رہا تھا، اپنے ایک سامنے سے بولا تو اس نے آگے بڑھ کر حوران کا

دو پنا گھسیٹا اور اس کے من میں ٹھونس دیا۔

”آخر تم لوگ کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟“ صورت حال کی سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے صفدر نے اس بار قدرے بے بسی سے سوال کیا۔

”ہم یہاں تیری دمی کا پتا معلوم کرنے آئے ہیں۔ اسے ہمارے حوالے کر دے اور اپنی جان بچرا لے۔“ اس شخص نے ایک بار پھر اپنا مطالبہ دہرایا۔

”وہ یہاں نہیں ہے۔ اپنے گاؤں میں ہوئی ہے لیکن تم لوگ کون ہو اور تمہارا میری دمی سے کیا تعلق ہے؟“ صفدر نے اس شخص کے کڑے تیور دیکھتے ہوئے اس کے سوال کا جواب تو ضرور دینا لیکن خود کو استغناء کرنے سے بھی نہیں روک سکا۔

”جھوٹ بولنا ہے۔ گاؤں سے تو وہ آج دوپہر کو ہی بھاگ نکلی تھی۔ وہاں سے بھاگنے کے بعد وہ تیرے علاوہ اور کس کے پاس جاسکتی ہے؟ یقیناً وہ یہیں آئی ہوگی۔ تو سیدھی طرح ہمیں بتا دے کہ اسے کہاں چھپایا ہے؟“ اس دفعہ اس شخص نے صفدر کے پیٹ میں زوردار لات رسید کرتے ہوئے اس سے ماہ بانو کا پتا معلوم کرنے کی کوشش کی تھی۔ صفدر پیٹ میں ٹٹکنے والی اس لات کی تکلیف سے دہرا ہونگیا۔ حور اس جس کے منہ میں کپڑا ٹھونسنے کے ساتھ ساتھ ہاتھ پر بھی باندھ دیے گئے تھے، صفدر کو تکلیف میں دیکھ کر بے چین ہونے لگی۔

”بول، پتا لکھتا ہے اپنی بیٹی کا یا نہیں؟ اگر تو نے سیدھی طرح سے میرے سوال کا جواب نہیں دیا تو میں تیرے مطلق میں ہاتھ ڈال کر پیٹ سے استریاں سمجھ لوں گا۔“ صفدر کی تکلیف کی پروا کیے بغیر اس شخص نے پورے اسے کی کے اور لاتیں رسید کیں اور اپنا سوال دہرایا۔

”میں کچھ نہیں جانتا کہ میری دمی کہاں ہے۔ میں اسے گاؤں میں چھوڑ کر آیا تھا۔ تم لوگ کہتے ہو کہ وہ گاؤں سے بھاگ نکلی ہے، یقیناً اس نے ایسا تمہاری وجہ سے ہی کیا ہو گا۔ اب کان کھول کر میرا جواب سن لو۔ اول تو مجھے معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہے لیکن اگر مجھے معلوم بھی ہوتا تو میں بزرگزم جیسے خالوں کو اس کا پتا نہیں بتاتا۔“ صفدر جواب دہتا میں ذرا خوف زدہ ہو گیا تھا، اس بارے میں جھری سے بولا۔

”تو میری نرمی کی وجہ سے اتنا زور دکھا رہا ہے تو ٹھیک ہے پھر میں بھی دیکھتا ہوں کہ تمہیں کتنا زور ہے اور تو کب تک میرے سامنے جم سکتا ہے؟“ اس شخص کا لہجہ اچانک ہی بہت ہمایا تک ہو گیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا تو انہوں نے صفدر کو دبوچ لیا اور ایک چار پائی دیوار کے

ساتھ کھڑی کر کے صفدر کو اس کے ساتھ باندھ دیا۔

”اس کا منہ بھی کپڑا ٹھونس کر بند کر دو۔ یہ اگر زبان بند رکھنا چاہتا ہے تو مجھے بھی شوق نہیں اس کی جھجھکیوں سے ٹٹکنے والوں کو جمع کرنے کا۔“ صفدر کو چار پائی کے ساتھ باندھنے والوں نے اس حکم کی بھی پھر تلی سے تعمیل کی۔ اب کمرے میں ٹھکل خاموشی تھی۔ اس خاموشی کو چاقو ٹھکنے کی کڑکڑاہٹ نے توڑا۔ یہ چاقو اس شخص نے اپنی جیب سے برآمد کیا تھا اور اب آنکھوں میں حد درجے سفاکی لیے صفدر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ صفدر ایک عام سا آدمی تھا، یہ منظر دیکھ کر اس کے جسم سے پیدتا پھوٹ بڑا۔ حور اس بھی دم غلبہ ٹھکروں سے اس شخص کی طرف دیکھنے لگی لیکن وہ تو جیسے اپنا کوئی من پسند مکمل شروع کرنے جا رہا تھا چنانچہ ان دونوں کی کیفیت کو نظر انداز کر کے صفدر کے قریب پہنچا اور چاقو والا ہاتھ بلند کر کے پوری قوت سے چاقو صفدر کے بازو میں ٹھونپ دیا۔ تکلیف کی شدت کے باعث صفدر کا جسم بری طرح تڑپا اور بازو میں سے پھوٹنے خون کے دھارے کے ساتھ ساتھ آنکھوں سے آنسو بھی نکل آئے۔ اگر اس کے منہ میں کپڑا نہ ٹھنسا ہوتا تو یقیناً اس کے حلق سے بہت کرب تک کچھ بلند ہوتی۔ جیج کارا تونہ خدا لیکن چہرے پر چھائے تاثرات اس کے کرب کی داستان بیان کر رہے تھے۔ صفدر کی یہ حالت دیکھ کر حور اس کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو گئے۔

”اس بڑھیا کا منہ کھولو۔ اگر یہ اپنے شوہر کو تکلیف سے بچانا چاہتی ہے تو پھر اسے اپنی دمی کا پتا بتانا ہوگا۔“ حور اس کی کیفیت نے اس کی صفدر سے محبت کو مایاں کر دیا تھا اس لیے اس سفاک انسان نے اپنے سوال کے جواب کے لیے اب اسے استعمال کرنے کی کوشش کی۔ اس کی جرات پر حور اس کے سر پر کھڑا آدمی اس کے من میں ٹھونسنا دو پنا ٹٹکنے لگا۔

”خیر دار جو منہ کھلنے کے بعد اپنی آواز دہرائی بلند کی تو... اگر تمہاری آواز نکلی تو میں اس کی جان نکال دوں گا۔“ حور اس کا منہ کھلنے سے پہلے اسے دھمکی دی گئی۔

”جیج کہہ رہا ہے نہیں نہیں معلوم کہ ماہ بانو کہاں ہے۔ ہم اسے گاؤں میں ہی چھوڑ کر آئے تھے۔“ منہ میں کپڑا ٹھونسے جانے کے باعث حور اس کا مطلق بری طرح خشک ہو گیا تھا پھر بھی اس نے بہت کمرے کے آواز نکالی اور اس شخص کو سمجھانے کی کوشش کی۔ رومل میں اس شخص نے اپنا ہاتھ ایک بار پھر بلند کیا۔ اس بار صفدر کا دوسرا بازو اس کا ٹٹکا بنا تھا۔ صفدر اس دوسرے وار براس بری طرح تڑپا کہ چار پائی اس کا بوجھ سہار کر کھڑی نہ رہ سکی۔ نتیجتاً صفدر اس حالت میں زمین

پھر اگر چار بائی کا پورا راجہ جو اس کے اوپر تھا۔
 ”اللہ کے واسطے کرو کہ میں اللہ اور اس کے رسول
 پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ ہم کوگوں کو
 ماہ بانو کے بارے میں خبر نہیں۔“ حورائے صفدر کی
 حالت دیکھ کر ہلک ہلک کر روتے ہوئے یقین دلانے کی
 کوشش کی۔ اس بار اس کی کوشش کسی حد تک کامیاب رہی۔
 وہ شخص فرخ پور چار بائی کے نیچے پڑے صفدر پر مشتمل خیمے
 کے بجائے حورائے صفدر کی طرف متوجہ ہوا اور اسے غور سے دیکھتے
 ہوئے بولا۔

”اگر وہ چاہتا ہے کہ اس کی اس جگہ پر پتہ لگایا جاسکے تو وہ چاہتی ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم۔ ہماری ساری برادری گھوٹوں میں ہی رہتی ہے۔ یہاں میں اور مقصود تھا ہیں۔ اس گھر کے ساتھ وہ کہیں نہیں جاسکتی۔“ خدراں نے پوری سچائی کے جواب دیا تھا جس پر یقین نہیں کیا گیا۔

”یہ دنیا ہمیں چلانے کی موش کھڑی کر رہی ہے۔ چار پائی سیرمی کر کے گھڑی کرو۔ یہ لوگ خود اپنا بھلا نہیں جانتے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔“ اس شخص نے بیٹی اور وائر میں غرا کر ختم دیا۔ اس کے جسم کی ٹیل کی کمی۔ چار پائی سے بندھے ہوئے صندوق گردن ڈھکی ہوئی سی ادھر پر ایک برس سا کمزور نظر آ رہا تھا۔ یہ کمزور یقیناً چار پائی سمیت منہ کے بل کرنے سے آیا تھا۔ وہ تو جو کئی ماہی مجرم تھا اور نہ ہی مجرموں سے مقابلہ کرنے کی استطاعت رکھنے والا آدمی... چند چاندروادیم کے اس بدترجی تشدد نے اس کی حالت تباہ کر دی تھی۔ خون کے بہتے تھا، افراتفران اور تکلیف کی شدت نے اس پر شخصی طاری کر دی تھی۔

”رحم کرو اس پر۔ تمہارا علم اس کی جان لے لے گا۔“
 صدیقی کی حالت دیکھ کر حورال بیلائی۔
 ”اگر میں تم لوگوں کی زبان کھلوں کہ تمہاری دینی کا چٹا نہیں معلوم کر سکتا تو پھر دینی صاحبہ ہمارے جان لے لیں گے۔“ حورال کی اتھا کا بے حد رکھائی سے جواب دیا گیا۔
 ”کون چودھری صاحبہ... کیا چودھری افتخار عالم شاد؟“ حورال پوچھی۔
 ”ہاں وی۔ تیری دینی نے گاؤں سے بھاگ کر ان کے فسطح کو لگا رکھا ہے۔“ حورال کے سوال کا جواب اثبات میں آیا۔

”ماہ بانو کا کیا قصہ چودھری افتخار عالم شاہ سے؟“
خواراں حیرت سے بڑبڑائی۔

”نوجوہی صاحب کا دل آگیا تھا اس پر لیکن وہ تو خود کو
کوئی اونچی شے سمجھتی ہے۔ اب اپنے ماں بیو کا حال دیکھ کر تو
شیر کی طرح سہمی ہو جائے گی۔“

”ماں بیو قرآن اپنی دھی پر۔ اس کی عزت کے بدلے
اگر ہمارے جسم کے ٹوٹے ٹوٹے ٹکڑے بھی ہو جائیں تو ہمیں کچھ
فحش ہوگا۔“ خود اس نے بے ساختگی جواب دیا جو یہی طور
پر سننے والے کو پتہ نہیں آیا۔ وہ دُعا کر بولا۔

”تو ٹھیک ہے، میں تمہاری خواہش پر تمہارے جسم کے
 نوٹے نوٹے کر رہی ڈالوں۔“ دو حوراء کے قریب آیا اور
 اس کا منہ اپنے ماتھے سے اسی طرح دبوچنے کے بعد چاقو اس
 کے دائیں کان پر رکھ کر کچھ کچھ جھنک دی۔ تیغ چھادی جا تو نے
 لہجہ میں حوراء کے کان کا پٹا اڑا دیا۔ سب اسی طرح گزشت
 میں ہوئے کے باوجود اس کے مطلق سے کھنکھاتی جھنکی برآمد
 ہوئی۔

”اسے ہوش میں لاؤ۔ اب پرمایا دہی سے محبت کا ثبوت دے گی اور پھر سونلوں کا جواب دے گی۔“
 حضور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے اپنے ساتھی کو حکم دیا اور خود حوراس کا دو بارہ بارہ سے اس کے طعن میں غور کیا۔
 ”کچھ ہوئے کان کی تکلیف سے حوراس کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ کان سے بہہ کرتے دلا خواں اس کی گردن پر گزرتا ہوا گردن میں مذبذب ہو کر اسے منہ پر دھکا دیتا۔“

”ہاں بھی بڑھے ابول کچھ تائے گا یا میں اس بڑھیا کا بھی تیری طرح حال کروں۔“ صفدر کے منہ پر پانی ڈال کر سے ہوش میں لانے کے بعد پوچھا گیا۔ صفدر جو خود پر کے گئے تشدد کی وجہ سے ہی جاوہر حال ہو رہا تھا، حوروں کی حالت کو کہہ کر بالکل سبک ہو گیا۔

”ست کرو تا ظلم“ ہمیں حج کی تمہارے سوال کا جواب نہیں معلوم۔ ”مصلحہ“ کا تہذیبی اصولوں کے ساتھ ہونا۔ ”بالے“ بھی ممکن ہے ان لوگوں کو حج کی حکم معلوم نہیں۔ ایسا کر کہ اس سے بڑی کی سبیلوں وغیرہ کے چنے معلوم کر... ہو سکتا ہے وہ دوزخ کی یہاں کے ہے بجا ہے فی جہنم کی گھر چلی گی ہو۔ ”اب تک کی ساری کارروائی کے دوران کے نامی شخص کے احکامات کی پیروی کرنے والے دونوں افراد میں سے ایک نے اپنی خاموشی کو جوتے ہوئے تجویز پیش کی۔ اس تجویز کو قبول کرتے ہوئے بالے نے یہی سوال پھر کے سامنے دہرایا۔

”ماو ہانوک ایک سہیلی تو اسی مہلی کے آخری مکان میں رہتی ہے۔ باقی کے سب مجھے زمائی ماو نہیں۔ ماو ہانوک ڈاڑھی

ہے مل جائیں گے لیکن میرے خیال میں تو وہ باغی ہو چکی ہوگی
 کہ مگر تمہیں جانتی اس کی اپنی کسی پہلی سے اتنی بے غلطی نہیں
 کرو وہ زیادہ دیر کسی کے گھر رک سکے۔ " مصدقہ دربار کی
 حالت دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا تھا۔ دوسرے اسے واقعی یقین
 تھا کہ وہ باغی ہو چکی ہے مگر نہیں جانتی اس لیے اس نے
 شرافت سے بالے کے سوال کا جواب دے دیا لیکن جواب
 کے ساتھ جراتور خیال کیا تھا اس نے بالے کو ایک بار پھر
 چیل کر دیا۔ وہ مصدقہ کے سر پر ہونے کا گراہ باغی ہو چکی
 کہ مگر تمہیں ہی ہوگی تو پھر اس کی جگہ کا پتا نہ جاساں وہ مل
 سکے۔ مصدقہ نے اس سوال کا جواب نہیں دیا۔ بیچتا ہالا اس
 اور دربار کا مسئلہ بند کرنا گیا۔ خوراس اس تشدد کی تاب
 نہ لا کر دم توڑی۔ ہم جان مصدقہ سے بھی جب پہلے ملنے کی امید
 نہیں رہی تو بالے نے اس کی شہرگ پر چاقو چا کر اس کی
 نڈکی کا چراغ بھی کر دیا۔ ان دونوں حراس غیب میاں
 ہوئی کی لاشیں اگلی صبح ملنے والوں نے دریافت کر کے پولیس
 کو بھجوا دی۔

☆ ☆ ☆
”مجھے اور تاجیک کو آج لاہور بھگوانے کا انتظام کر دیں
”دوسری صاحبہ“
”دو کس لیے؟“ چودھری الفخار اپنی سوچوں میں گم تھا۔
”چودھری صاحب“ نے آکر یہ مطالبہ کیا تو بے خیالی میں پوچھ

”صوبہ کو آج اسپتال میں داخل ہوتا ہے۔ اس موقع پر اور تاہم کاہاں ہوا ضروری ہے۔ اب کشمیری ذات کو کوئی معاملات سنبھال نہیں سکتی۔“ بیڑی چودھرائی نے ذرا دیر کے بعد چودھری کے سوال کا جواب دیا۔

”اچھا اچھا۔ میرے ذہن سے نکل گیا تھا۔ تم مجھے پہلے دلاؤ دیکھیں اب بالکل میں سوچ رہا ہوں کہ چوکی۔“

”آپ کو فرست دیں کہاں سے جو آپ کے کوئی محل کی لکے۔ وہ یہ بھی میں نے سوچا تھا کہ آپ کے مکان میں حرکت کر کے ایسا بورڈ لگوانے ہوں گی۔ نئی چوہدری کے انتقال کے لیے بھی تو یہاں کسی کو بوجہ چاہیے تھا۔ پراسسوری ہمارے لیے۔“

بڑی چودھرائن کے لکچ میں بڑی کات اور استہزائیاں
 چھری اٹھا کر کھانا اور دباؤ کر بولا۔ "منہ بند کر چانا۔"
 "ہمیشہ منہ بند کر رکھا ہے چودھری صاحب! آپ مجھ
 کو تو برسوں لاکر بٹھائے رہے لیکن میں نے کبھی زبان سے
 کچھ نہیں کہا ہے۔" جانی گئی۔ ایک لمحہ۔ اور پھر وہ

والے آدمی نہیں پھر میری بڑی صبر کی وجہ سے بھی آپ کا دل میرے ساتھ نہیں لگا۔ اس لیے جب آپ نے ناہید سے بیاہ کیا تو میں خود بخود خوشی سے بیاہ کر رہی لائی۔ عصمت کی بار بھی میں نے زبان نہیں کھولی۔ تاہم اور عصمت موتیں میں لیکن ان کے آنے سے کم از کم یہ اس میں ہوتا تھا کہ آپ نے کسی کم تر صورت کو سوچنا نہ کر جو برا بھلا ہے۔ عصمت کے سینے والے زیادہ اونچی حیثیت کے نہیں تھے لیکن عزت اور مالک تو تھے، وہ اس بار آپ نے جو فیصلہ کیا اس نے بڑا جی کو بھانپا تھا۔ دنیا میں صورتوں کی کسی کو بھی غرضی جو آپ نے کسی بیویوں کی اولاد کو حوصلہ کی مالک بنانے کی کوشش کی۔ اگر جی آج بھی کیا تھا اس لڑکی پر تو یہ کار کا کامزگہ پالنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا میں نہیں جانتی کہ آپ اس سے پہلے بھی بغیر نکاح کے عہد تھے کہ جس سے ہیں، اس بار بھی وہی کچھ کرتے۔ میری زبان پر کوئی شکوک نہیں آتا اب آپ نے کچھ لکھا کہ وہ زیادہ سے ہے آپ کی عزت دہن کر جانے کس کے ساتھ ہمارے گھر؟ کوئی تو ہو گا کہ ایسا خاص جو اسے آپ کے نکاح میں آئے۔ سے پہلے ہی نے کرنا چاہا تھا۔

یہ جو دھواں آج شاید زندگی میں ہی بار بار نے دل کا غبار لانے کا موقع ملتا تھا، چنانچہ وہ جو دھواں ان کے منہ کو خاطر سے لے لے بغیر بولتی چلی گئی۔

”جا... جا سفر کی تیاری کر۔ میں ڈرامیو کو گاڑی لائے کے لیے مہلواتا ہوں۔“ بڑی چہرہ اس کی کسی بھی بات کا جواب دیے بغیر چوہری اختیارے قدرے نرمی سے گھم دیا۔ اس بار بڑی چوہرہ اس نے اس کی گھم دہنی نہیں کی اور وہ اس پلٹ گئی۔ اس کے جانے کے بعد چوہری اختیارے کی کئی باتوں کو سوچنے لگا۔ بڑی چہرہ اس نے کچھ بھی غلط نہیں کیا تھا۔ وہ اس اعتراف کو کرنے میں بھی حق پر جانب تھی کہ چوہری اختیارے نے ایک حصار بنے کی بنی کو اس کی سوتن لے کر فائدہ کر کے اس کی توہین کی تھی۔ خود چوہری اختیارے نے بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ اتنی معمول شیت کی لڑکی کو اپنی کسی کارچندے کا لیکن اس روز ڈرامے پر راہ بانو کی خود پر ل چڑھ کر آنے اور اس کے لینے کا تمکلی دینے والی ادا دہری اختیارے کے دل کو بھج گئی۔ وہ بے اس کے دل کی سمجھ کر مستعد حاصل کرنا چاہتا تھا وہ اتنی ہی ڈرامی تھی کہ بلا خوف خطر جان دینے پر عمل پیرا تھی۔ چوہری اس سے مل ایسی کسی کی سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ کاجی چوہرے کے علاوہ اس کی دست میں آنے والی عورتیں یا تو بکاؤل ہوتی تھیں یا وہ

سے احتجاج بھی نہیں کر پاتی تھیں۔ زیادہ سے زیادہ وہ چودھری کے سامنے گونگڑا کر اس سے برحسب درخواست کرتی تھیں۔ چودھری ایسی کسی درخواست پر بھی کان نہیں دھرتا تھا اور اگر ضرورت پڑنا مانتا بھی تھا۔ پہلی بار اسے ماہ بانو بھی ان ہی عورتوں میں سے ایک محسوس ہوئی تھیں لیکن دوبارہ وہ اس نے جس جرأت مندی کا مظاہرہ کیا تھا، اس پر چودھری حیران رہ گیا تھا۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ عورتوں میں ماہ بانو کا تقریباً اختیار ڈال دینا فوری مدد سے کے باعث تھا۔

اس رات وہ بہت گہری نیند سے جگاتی تھی اس لیے چودھری انکار کے سامنے ڈٹ کر مڑی تھیں جو کسی بھی لیکن جب بھی موقع ملے اس نے جرأت مندی کا مظاہرہ کیا تھا اور چودھری انکار کے منہ پر پھینچ دے مارا تھا۔ دوسری بار وہ چودھری کی طرف سے ہوشیار تھی اور اس بات کا بندوبست کر کے آتی تھی کہ چودھری اس کے قریب بھی نہ آئے۔ چودھری ابھی بار کوشش کرتا تو وہ پھر کوئی ترکیب لائیں لیکن چودھری نے اپنی بار ایسی کوئی کوشش کرنے سے بجائے ایسا طریقہ اختیار کرنے کی کوشش کی تھی کہ ماہ بانو کے پاس احتجاج کی محتاش ہی نہیں رہے۔ دراصل چودھری کا دل چاہتا تھا کہ یہ کم عمر، سست اور بی ادب لڑکی بیٹھ اس کے تصرف میں رہے۔ بیٹھ کے اس ساتھ کے لیے شادی کا چال سب سے موزوں تھا لیکن ماہ بانو بہت چھٹی کھٹی تھی اور اس حال میں چھپنے سے پہلے ہی پھر سے اڑتی تھی۔ اب چودھری ایک غضب ناک شکاری کی طرح اسے مھونج نکالنے کے لیے بٹاؤ لیا ہوا جا رہا تھا لیکن ابھی تک اسے اپنی کسی کوشش میں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

”چودھری صاحب! فیصل آباد سے بالا واپس آ گیا ہے۔ اگر آپ ممکن تو اسے آپ کی خدمت میں حاضر کروں؟“ چودھری انکار پائی سوچوں میں ہی گمراہ تھا کہ منشی اللہ رکھا دست دے کر اندر آیا اور اسے بالے کے آگے کی اطلاع دیتے ہوئے ادب سے پوچھا۔

چودھری منشی اللہ رکھا کے انداز سے ہی جان چکا تھا کہ بالان کا کام واپس آیا ہے پھر بھی وہ بالے کی کوششوں سے متعلق تفصیلات جاننے کا خواہش مند تھا چنانچہ منشی کو بالے کو اندر بھیجنے کی اجازت دے دی۔

”اور ہاں منشی! ذرا لاہور کے لیے گڈی تیار کروا دے۔ ابھی تھوڑی دیر میں ڈی اور چوٹی چودھرائی لاہور کے لیے روانہ ہوں گی۔“ چودھری انکار کی طرف سے اجازت ملنے پر منشی تیزی سے پلٹ کر باہر جا رہا تھا کہ

چودھری نے اسے روک کر حکم دیا۔

منشی ”جی! پھر اس کا کار“ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بالے کے ساتھ اندر تھا۔ بالے نے ہاتھ جوڑ کر چودھری کو سلام کیا اور چپ چاپ نظر چمکا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے اس قدر مودبانہ انداز کو دیکھ کر کوئی شخص اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ یہ وہی بالا ہے جو جنوں میں لوگوں کی کمال اجہر کر رکھتا ہے۔ چودھری کے سامنے کھڑے ہو کر اس کی ساری سفاکی عاجزی میں اصل تھی۔ شاید یہ بھی قدرت کا کوئی اصول ہے کہ ہر زوردار اور غالب نامی سے زیادہ زوردار وہ شخص کے سامنے سر اٹھانے کی جرأت نہیں کرے۔

”ہاں بول بالے! کیا کیا تو نے فیصل آباد میں؟“

چودھری انکار نے ترش لہجے میں بالے سے دریافت کیا۔ ”میں نے اپنی بوری کوشش کر کے دیکھ لی سرکار! منشی اللہ رکھا کی طرف سے حکم ملتے ہی میں اپنے چار بندوں کے ساتھ فوراً فیصل آباد پہنچ گیا تھا۔ دو ہفتے میں نے ان کے اذہ سے بچائے کہ اگر غیبت مٹھی دھی کسی جس سے اسے تو وہ اسے قابو کر کے واپس گاؤں پہنچا دیں۔ دو بندوں کے ساتھ میں خود مصروف گھر کی گھرائی کرتا رہا لیکن پورے دن کوئی نہیں آیا۔ شام کے وقت میں نے چاند پانی کے کٹھے سے ایک لڑکی بٹوا کر سیدھے سادے پکڑوں میں اسے مندر کے گھر کے اندر بھجوا کر دیا۔ وہاں سے اندر کی سن کے کر آئے۔ لڑکی غیبت مٹھی دھی کی کہتی ہوئے کا بہانہ کر کے اندر چلی گئی۔ واپس لوٹ کر اس نے بتا کر اندر ایک عورت کے سوا کوئی نہیں۔ رات کو مصروف گھر لوٹنے کے بعد اندر جیسے میں، میں خود اپنے بندوں کو لے کر اندر جا گھسا۔ گھر کی ابھی طرح حواشی کی اور مصروف اور حواں کا بھی ریڈ ریڈ لگ کر کے دیکھ لیا لیکن لڑکی کا کچھ معلوم نہیں ہوا۔ سندھ سے میں نے اس کی کڑی کی سبیلوں کے بچے لے لیے تھے، آج سارا دن چاند پانی کے کٹھے کی لڑکیاں بیٹھنے بیٹھنے سے ان کے گھروں میں جا کھوج لگاتی رہیں لیکن کتبیا سے ذرا ہی بھی سن گئی تھیں۔ اب بھی میں اپنے بندے سے فیصل آباد چھوڑ کر آیا ہوں کہ کڑی کی سبیلوں پر نظر رکھیں اور جیسے ہی کچھ معلوم ہو فوراً حرکت میں آجائیں۔“ بالے نے اپنی ساری کارگزاری سنائی۔

”اور مصروف اور حواں کا کیا کیا... ان پر بندے نہیں لگے؟“ چودھری انکار نے پوچھا۔ ”بڑھیا ذرا ہی مار ہی جان سے گزرتی تھی، مجبور اچھے بعد میں مصروف کا بھی کام تمام کرنا پڑا اور وہ نہ بیوی کی سوت پر

بعد میں شور مچا کر سب کے سامنے آپ کا اور میرا نام لے دیتا۔ ہر آپ گنہگار کی جی چودھری صاحب! میں نے بہت اچھی طرح دونوں کو چھان چیک کر دیکھا تھا، انہیں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔“ بالے نے چودھری کے سوال کا جواب دیتے ہوئے اسے تسلی دی۔

”انہیں کچھ معلوم نہیں تھا... تو کچھ معلوم نہیں کر سکا تو اب کیا میں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر ممبر کر کے بیٹھ جاؤں؟ تم مفصلوں کی آگنی بڑی فوج میں نے اس لیے پال رہی ہے کہ کام دکھانے کے وقت تم لوگ منہ لٹکا کر اپنی ناکامی کی رپورٹ سامنے میرے پاس پلے آؤ۔“ چودھری انکار بالے کی تسلی پر غصے سے دھاڑا۔

”میں جی چودھری صاحب! ہم نے ابھی اپنی بار نہیں مانی ہے۔ میرے بندے اپنی کوششوں میں گئے ہوئے ہیں۔ میں بس اس لیے آگیا تھا کہ آپ کو اب تک کی رپورٹ دے دوں۔ ساتھ یہ نوٹ بھی لے کر آیا ہوں۔“ مصروف کے گھر کی تلاشی میں ملے تھے۔ میں نے سوچا یہ فوٹو تلاش کے کام میں مدد دے سکتے ہیں۔“ بالے نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر کاغذ کا ایک لفافہ باہر نکالا اور ادب سے چودھری انکار کو پیش کیا۔

”چودھری انکار نے لفافے میں سے تصویریں نکالیں۔ یہ

صاف نہیں تھیں۔ میں جی کر کام کی تصویریں لے آ گیا ہوں۔“ بالے کی آواز نے چودھری انکار کو تصویر پر سے نظر اٹھانے پر مجبور کیا۔

”ٹھیک ہے۔ تم باڈ اور اپنی کوشش جاری رکھو۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان تصویروں سے کیا کار لیا جاسکتا ہے۔“ چودھری انکار نے بالے کو گم سنا۔ بالا ہاتھ جوڑ کر سلام کرتا ہوا اگلے قدموں واپس ہٹ گیا۔ منشی اللہ رکھا نے بھی اس کی پیروی کی۔ اب چودھری اپنے کمرے میں تھا تھا۔ اسے جی بھلائے کے لیے ماہ بانو کی تصویر میرا جی بھی لیکن بچہ تھا کہ تصویر دل کو بھلائے کے بجائے اس کے کام زیادہ گریز تھی۔

☆ ☆ ☆

”ایک بری خبر ہے۔“

”خبر بتا دیا ہوا ہے؟“ عبدالمنان کے پر تھک چرے کو دیکھتے ہوئے شہر یار نے ٹوٹوٹ سے پوچھا۔

”وہ... جس لڑکی کو چودھری انکار سے بچانے کے لیے ہم نے دارالامان میں پناہ دوائی ہے اس کے ماں باپ کو تلاش کر رہا گیا ہے۔“

”میں نے اطلاع دی ہے؟ کیا خبر آدہ سے کوئی آیا ہے؟“ عبدالمنان کی دی ہوئی اطلاع پر شہر یار چوکا۔

”نورس! اقل ہی آدہ والے ماں باپ کا نہیں، فیصل آباد میں تھیں لڑکی کی پرورش کرنے والے ماں باپ کا ہوا ہے۔ اصل میں لڑکی کو تھکھی کر اس کے اس طرح غائب ہو جانے سے اس کے ماں باپ بہت پریشان ہوں گے۔ اس نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ فیصل آباد میں اطلاع کروادی جائے کہ وہ خبریت سے ہے اور چودھری انکار سے بچنے کے لیے لاہور کے ایک دارالامان میں پناہ گزین ہے۔ میں نے لڑکی سے وعدہ کر لیا تھا کہ یہ کام کروادوں گا لیکن فوری طور پر عمل نہیں کر سکا۔ اصل میں معاملہ ایسا ہے کہ اس کام کو کروانے کے لیے ہر ایک پر افسوس کیا جاسکتا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ مشافہ خان اس سارے معاملے سے واقف بھی ہے اور آدمی بھی اچھا کا ہے اس لیے اسی سے فیصل آباد پیغام پہنچانے کا کام لوں گا۔ شاید مشافہ خان یہاں بھی بہت معروف رہتا ہے اس لیے اسے میں فوری طور پر فیصل آباد نہیں بھیج سکا۔ آج صبح میں نے اسے اس کام کے لیے بھیجا تھا، اب وہ واپس آیا ہے تو اس اطلاع کے ساتھ کہ اس لڑکی کے والدین حواں اور مصروف لگے جا چکے ہیں۔“ عبدالمنان نے بتایا۔

”حق کا عزم کیا تھا؟“

”واضح طور پر مجھ کو نہیں کہا جاسکتا۔ البتہ یہ ضرور معلوم ہوا ہے کہ قتل سے پہلے دونوں میاں بیوی پر بے تحاشا تشدد کیا گیا تھا۔ کارروائی رات کے وقت کی گئی تھی۔ منجانب اہل محلہ میں سے کسی نے انہیں دیکھ کر پولیس کو اطلاع دی۔ مقتولین کے آس پاس والے شہیدہ حیرت کا شکار ہیں کہ انہیں عین کارروائی کا انہیں ذرا بھی نہیں پتہ ہو سکا۔ نہ تو گھنٹ پت کی آواز میں سنائی دی اور نہ ہی تشدد کے نتیجے میں میاں بیوی کی چیخیں ان تک پہنچیں۔ پولیس کا اعزاز ہے کہ قاتل کوئی بہت جلد پکڑا گیا۔ مجرم تھے جنہوں نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ اس گھمسان آبادی والے محلے میں کسی کو ان کی کارروائی کا علم نہ ہو سکے۔ عورت کی لاش اس حالت میں ملی ہے کہ اس کے منہ میں مقلوب تک پکڑا ہوا تھا، یعنی مجرموں نے تشدد کرنے سے پہلے ہی بیویوں کی روک تھام کا انتظام کر لیا تھا۔ محلے کی ایک عورت نے بتایا ہے کہ مقتولہ حوراس کی بچہ عمر سے پہلے ایک لاکھ کی گنتی بھی گئی تھی۔ حوراس نے گنتی کی اس رقم میں اپنی طرف سے کچھ اور رقم شامل کر اپنی بیوی اور بچے کے لیے زیور خریدا تھا۔ محلہ دار عورت کو یہ بات اس لیے معلوم ہے کہ گنتی اسی کے گھر ذاتی گنتی تھی اور حوراس نے زیور خریداری بھی اسی کے ساتھ جا کر کی تھی۔ عورت کے اس بیان کے بعد پولیس نے رائے قائم کی ہے کہ یہ ڈاکو زنی کی واردات تھی۔ ڈاکوؤں کو کہیں سے اطلاع مل گئی تھی کہ اس گھر میں زیور اور روپا ہے اس لیے انہوں نے موقع دیکھ کر واردات کر دی۔“ عبداللہ اللہ اللہ نے تفصیل بتائی۔

”مجھے تو پولیس کا یہ اعزازہ درست نہیں لگ رہا۔ زیور اتنی بڑی مالیت کا نہیں تھا کہ اس کے لیے اتنی عظیم کارروائی کی جانی۔ پھر جس طرح کے تشدد کا ذکر کیا جا رہا ہے، ذرا سے زیور کو بچانے کے لیے اپنے تشدد کو کئی نہیں برداشت کرتا۔ لوگ اپنی جان بچانے کے لیے عموماً فوری طور پر خودی سب کچھ ڈاکوؤں کے حوالے کر دیتے ہیں۔“ عبداللہ اللہ اللہ کی بتائی ہوئی تفصیلات سن کر شہریار نے خیال آراہی کی۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سرنگھن پولیس کی رائے کو اس وجہ سے تعزیت قرار دینا ہے کہ جانے واردات سے کسی قسم کا زیور اور روپا بچا ہوا نہیں ہوا ہے اور گھر کی حالت بھی ایسی ہے جیسے کسی نے وہاں کی کشتائی کی ہو۔ اس صورت حال سے بھی اعزازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دونوں میاں بیوی کو قتل کرنے والے واقعی ڈاکو تھے۔ ہو سکتا ہے میاں بیوی نے زیور اور روپا بچانے کے حوالے کرنے میں مزاحمت سے کام لیا ہو جس

کے جواب میں ڈاکوؤں نے ان پر تشدد کیا اور آخر میں دونوں کو قتل کرنے کے بعد وہ بیلا دور پورے کر فرما رہے تھے۔“ پولیس کی رائے ٹھیک بھی ہو سکتی ہے لیکن میں اس کیس میں چودھری کی انوائسٹ کا خدشہ محسوس کر رہا ہوں۔ خاص طور پر منظم طریقے سے کیا جانے والا تشدد مجھے شک میں ڈال رہا ہے۔ واردات کا اعزازہ ایسا ہے جیسے مجرم پہلے سے یہ سوچ کر آئے ہوں کہ انہیں دونوں میاں بیوی سے بڑھانگوانا ہے اور اس طرح سے اگوانا ہے کہ شہر کی تہہ بہہ انہوں نے اپنے تشدد کے جواب میں پیدا ہونے والی بیویوں کے روکنے کا خصوصی انتظام کیا۔ ڈاکوؤں کو عموماً آتا تشدد سے کام نہیں لینا پڑتا۔ وہ تشدد کرتے بھی ہیں تو اس میں فوری اشتعال کا رول ہوتا ہے اور اس اشتعال کے اظہار میں یقیناً احتیاطی تدابیر اختیار کرنا مشکل ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ اگر حوراس اور مقتولہ نے زیورات کا چاٹنا ہے تو مزاحمت سے کام لیا تھا تو ڈاکوؤں کے لیے سب سے آسان عمل یہ تھا کہ دونوں میاں بیوی کو ہاتھ کر ڈالنے اور گھر کی کشتائی کے لیے۔ آخر ایک چل فروش کا گھر کتنا بڑا ہو سکتا ہے اور اس میں کتنے خفیہ مقامات ہو سکتے ہیں جنہیں موصوفہ ڈاکوؤں کے لیے مشکل ہو۔ میرے خیال میں تو اس سے بڑا تشدد کے بجائے کوئی اور بات ہے۔ مجرم ان دونوں میاں بیوی سے کوئی ایسی بات معلوم کرنا چاہتے تھے جس کا جواب وہ نہیں دے سکے اور شہیدہ ترین تشدد کو نتیجہ رہے۔ وہ بات کیا ہو سکتی ہے، موجودہ حالات میں آسانی سے اعزازہ لگایا جاسکتا ہے۔ شاید یہیں یاد ہو کہ میں نے بتایا تھا کہ چودھری افتخار نے ماہ بانو کی کشتائی میں اپنے بندوں کو قتل آباد بھی روا نہ کیا تھا۔ ان لوگوں کو یقین ہو گا کہ پھر آباد سے نکل کر ماہ بانو قتل آباد ہی جاسکتی ہے۔ پہلے انہوں نے گھر میں اسے کشت کیا ہو گا اور جب وہ انہیں وہاں نہیں ملی ہوگی تو انہیں لگا ہو گا کہ حوراس اور مقتولہ نے اسے گھر کی دوسری جگہ چھپا کر رکھا ہوگا اس لیے دوسری جگہ کا پتا معلوم کرنے کے لیے انہوں نے دونوں پر اتنا تشدد کیا ہو گا۔ لیکن ظاہر ہے وہ یہ چارے کچھ جانتے ہی نہیں تھے تو انہیں کیا پتا سکتے تھے۔ میں اس سلسلے میں اپنے لیے بھی شک و شبہ ہے کہ اظہار کر رہا ہوں کہ ڈاکو عموماً ہاتھ پیر کر کے بے اعتنا ہوتے ہیں۔ ان سے کسی واردات کے دوران اگر قتل ہوتا ہے تو اس کا عزم فوری اشتعال، اپنا بیٹا یا پھر واردات کے بعد اپنے بچکانے لیے جانے کا ڈر ہوتا ہے۔ فوری اشتعال تو اس واردات میں نہیں نظر میں آ رہا۔ بھلا والا نظریہ اس لیے غلط ہے کہ دو دھڑلے خرم میاں بیوی میں سے کسی کی بھی بات

میں ہو سکتی تھی کہ وہ ڈاکوؤں کے لیے کوئی خطرہ پیدا کریں۔ آخری بات کا امکان ہے کہ مجرموں نے اپنی شناخت پر پردہ ڈالنے کے لیے میاں بیوی کو قتل کیا ہو لیکن یہاں ہم یہ بھی تو سوچ سکتے ہیں کہ مجرموں نے یہ عمل اس لیے کیا کہ مقتولین اگر زندہ رہ جاتے تو وہ پولیس کو اپنے ساتھ ہونے والی واردات کی اہمیت سے آگاہ کر سکتے تھے۔ شہریار نے بہت گہرائی میں جا کر پوری واردات کا تجزیہ کیا تھا۔ اس کے تجزیے کے بعد عبداللہ اللہ اللہ بھی یقین ہو گیا کہ واقعی ہونا ہو حوراس اور مقتولہ کے بچکانے کے لیے چھپے چودھری افتخار کا ہاتھ ہے اور اس کا ہاتھ کو پھیلے رکھنے کے لیے واردات کو ڈاکو کے کارنگب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

”میں آپ کے خیال سے اتفاق کرتا ہوں سر۔ لیکن بات وہی ہے کہ صرف تصویر کی بنیاد پر ہم چودھری افتخار پر الزام عائد نہیں کر سکتے۔ ہمیں اس کے خلاف ثبوت بھی درکار ہیں۔“

”یہی تو مسئلہ ہے۔ چودھری افتخار جیسے لوگ بہت جالاک ہوتے ہیں۔ ہم اگر کوشش کر کے کوئی ثبوت تلاش بھی کر لیں تو زیادہ سے زیادہ چودھری کے کسی بندے تک ہی پہنچ سکیں گے اور وہ بندہ اتنا ٹھیک خوار ہو گا کہ اپنی جان کے بدلے بھی چودھری کا نام کسی عدالت میں نہیں لے گا۔ اب ہمارے پاس یہی صورت پختی ہے کہ ماہ بانو کو سامنے لے کر آئیں اور کم از کم چودھری کے ان کر تو تو کو تو سامنے لے کر آئیں کہ کسے دو اپنے حکم افروزی اور قوت کی عزت کو کتنا مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔“ عبداللہ اللہ کی بات کا جواب دیتے ہوئے شہریار کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

”اس سلسلے میں، میں نے ایک این ای ٹی کو اوپر وچ کیا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کیس کے سامنے آنے سے چودھری افتخار کو بہت زیادہ خوف نہیں پڑے گا۔ زیادہ سے زیادہ میڈیا پر کچھ دن شور ہے گا پھر خاموشی چھا جائے گی۔ چودھری صاف کہہ دے گا کہ اس پر بے بنیاد الزامات لگائے جا رہے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ وہ دودھ سلیم کرے گا تو اتنا کہ اس نے ماہ بانو کے لیے شادی کا بیٹھکا بھیجا تھا۔ ظاہر ہے، اس قسم کا پیغام سمجھنا کوئی جرم نہیں۔ اگر عمر کے تفاوت کو بنیاد بنا کر چودھری کو قتل مہین کیا جائے تو بھی وہ کہہ دے گا کہ میں نے تو صرف رشتہ بھیجا تھا کوئی زور زبردستی نہیں کی تھی۔ لڑکی کو اگر کوئی اعتراض تھا تو اپنے والدین کے سامنے احتجاج کرتی۔“ عبداللہ اللہ نے شہریار کو سامنے کا ایک اور راز دکھایا۔

”میں اس بات کو سمجھتا ہوں عبداللہ اللہ! ہم ماہ بانو کے

کیس میں چودھری افتخار کی طرح مجرم ثابت نہیں کر سکتے لیکن میری خواہش ہے کہ چودھری کے اسچ پر ایک ضرب تو ضرور لگانی جائے۔ دوسرے مجرم سے سامنے ماہ بانو کے قتل کا بھی مسئلہ ہے۔ میں نے اندازاً اسے قتل آباد ہی لے نہیں جانے دیا تھا کہ مجھے تمام کہ چودھری افتخار وہاں پہنچ کر اسے آسانی سے دو ہاتھ لپک کر لے گا۔ میں اس لڑکی کی بیک مضبوط کرنا چاہتا تھا۔ اگر کوئی بڑی این ای ٹی اس کے پیچھے کمزری ہو جاتی تو چودھری افتخار کو مجبوراً پیچھے ہٹنا پڑتا لیکن انہوں نے اس بات کو اس باجاری سے اس کا ٹھکانا ہی سمجھ لیا ہے۔ دارالامان میں اب تک روکتی ہے؟ خبر، جو ہو گیا سو ہو گیا لیکن اب ہمیں اس عظیم لڑکی کے مستقبل کے بارے میں سوچنا ہو گا۔ اسے کیا پتہ ہے یا دارالامان کے سر پرستی مل جائے جو چودھری افتخار کے مقابل ڈٹ کر کھڑا ہو سکے تو اس لڑکی کے حق میں بہتر ہوگی این ای ٹی کے ذریعے میڈیا کی انوائسٹ کا ایک خاکہ بھی ہو گا کہ چودھری افتخار براہ راست لڑکی پر ہاتھ ڈالنے سے گریز کرے گا۔ دو گھ بجائے گا کہ اگر اس نے ایسی کی کوشش کی تو الزام اس کے سر پر ہی آئے گا۔“ شہریار کو حذر اعزازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ ماہ بانو کے کیس میں کیوں اتنی گہری دلچسپی لے رہا ہے اور کیوں اس کے قتل کے لیے احتیاج پڑتا ہے؟

”میں کسی حد تک آپ کا مقصد سمجھ رہا ہوں سر! آپ بے فکر ہیں، میں جلد ہی اس سلسلے میں کارروائی شروع کر داتا ہوں۔“ شہریار کی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے عبداللہ اللہ نے اسے یقین دلایا۔

”بلکہ! تم اس معاملے کو تیزی سے نمٹاؤ۔ ان دارالامان کی کبھی کبھار ہمیں ہوتا کہ وہاں پر حفاظت کے خیال سے سمجھی جانے والی خواتین محفوظ رہتی ہیں یا نہیں۔“ شہریار نے ایک اور نکتے کی طرف عبداللہ اللہ کی توجہ دلائی۔

”اس طرف سے آپ بالکل بے فکر ہیں۔ میں نے بہت سوچ کچھ کر بہت اہم سا کھنڈہ دے دالے دارالامان کا انتخاب کیا ہے۔ اول تو ماہ بانو کو کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی، اگر کوئی مسئلہ ہوتا بھی ہے تو وہاں کا ایک چوکیدار خیال رکھے گا۔ وہ چوکیدار مشہور خان کے علاقے سے منتقل رکھتا ہے۔ مشاہیر خان کی اس سے دوستی ہے۔ وہ خاص طور پر اپنے دوست کو لڑکی کا خیال رکھنے کی تلقین کر کے آئے۔“ عبداللہ اللہ نے اطلاع دی تو شہریار نے کافی حد تک خود کو سچوں محسوس کیا۔ یہ سیکور ماہ بانو کے محفوظ ہونے کے خیال



”یہ تم سے اس کی کٹائی میں کون ہی کبس ڈال دی ہے؟“

”شہر یار! تمہارا ان ہے۔“ وہ ڈانٹتے ہوئے بھلے سے اٹھا
ی تھا کہ اس کی ممانی سر آفرین رات نے اسے اطلاع دی۔
شہر یار جو کھانے کے بعد بکھڑے آرام کے خیال سے اپنے پیٹ
روم کی طرف جانے کا ارادہ رکھتا تھا، اس اطلاع پر ٹھیک فون
کی طرف بڑھ گیا۔

”موٹی والا بات کر رہا ہوں شہر یار صاحب!“ شہر یار
کی ”پیٹو“ کے جواب میں دوسری طرف سے تعارف کروایا
گیا۔ ”جی موٹی والا صاحب! فرمائیے کیسے حراج ہیں؟“
موٹی والا کی کال پر تھوڑا سا حیران ہونے کے باوجود شہر یار
نے خوش دلی سے دریا یافت کیا۔

”ٹھیک ہی سمجھ گیا۔“ موٹی والا نے اس سے لےجے
میں جواب دیا مگر فوراً ہی ٹھیک کر بولا۔

”بے وقت رحمت دینے کے لیے معذرت چاہتا ہوں۔
اصل میں تو میں نے آپ کے دفتری فون کیا تھا، وہاں سے
معلوم ہوا کہ آپ لاہور آئے ہوئے ہیں اس لیے میں نے
سوچا رانا باؤس کے خیر برائی کرلوں، ممکن ہے یہاں پر آپ
سے بات ہو جائے۔“ خلی سستی سے میرا خیال درست ہی
 ثابت ہوا اور آپ یہاں لگے۔“

”اصل میں بہت دن ہو گئے تھے مگر والوں سے
ملاقات ہوئے۔ جب سے پیٹنگ ہوئی گی لاہور آئی نہیں
ہوا تھا۔ آج بڑی مشکل سے رحمت نکالی ہے یہاں آنے کے
لیے۔ آپ بتائیے، آپ نے کس مسئلے میں مجھے یاد کرنے کی
رحمت فرمائی ہے؟“ شہر یار ج عبداللہ کی اس طرح کی بولی
ازین ہی او کے نمائندہ سے ملاقات کے لیے خاص طور پر
لاہور آیا تھا۔ لیکن موٹی والا کے سامنے اس نے سبکی ظاہر کیا
کہ اس کا لاہور کا یہ دورہ بالکل غلطی کی نوبت کا ہے۔ موٹی والا کو
اس کی بات سامنے میں ہل جاتی نہیں ہو سکتا تھا کہ ظاہر ہے
لاہور میں شہر یار کا ایک مستقل گھر موجود تھا۔ اسے ہی کی
حیثیت سے وہ سختی سے گھر میں کٹائی بھٹکتا لوٹ کر رہ رہا

بھی تھوڑے عرصے میں وہیں بلالوں گا۔ یہاں تو بچا، کے بعد
چار دن بھی سکھ کے دیکھنے کو نہیں ملے۔ پہلے سے خبر ہوئی تو
میں اماں اباکو منع کر دیتا کہ کوئی ضرورت نہیں ہے یہاں رشتہ
چوڑے کی۔ اب دینی والدین جاؤں گا بھی تو سارا وقت یہی گھر
میں رہے گی کہ چھپے سے بگم ہونے جائے۔“ رب نواز نے
مکڑے چہرے کے ساتھ نہایت بدلتی جلی سے اعلان کرتے
ہوئے کہا۔

”رب نواز ٹھیک کہہ رہا ہے چاہا! اس سمیت کو تم
اسکیسے ہی جھٹکتا۔ میں تمہیں نہیں ہے چودھری صاحب کے
غضب کو برداشت کرنے کی۔ اگر چودھری صاحب نے
تمہارے لیے ننگی دکھائی تو میں تو صاف اعلان کر دوں گا کہ
میرا اور میرے گھر والوں کا تمہارے گھر سے کوئی تعلق نہیں
ہے۔“ رب نواز نے سگ بچھیا ہوتے ہوئے بری بھینڈی دکھا
دی تھی تو انور کس بات کا لٹا کر کہتا؟ اس نے بھی صاف بتا دیا
کہ مشکل وقت میں وہ نوران اور غیاث محمد کا ساتھ دینے
والوں میں سے نہیں ہوگا۔

”یہ سب باتیں کر رہے ہیں آپ لوگ۔ اماں اباکوئی ہم
سے الگ تو نہیں ہیں جو مشکل وقت میں ہم انہیں اکیلے چھوڑ
دیں گے۔“ زہرہ نے شہر یار اور بہنوئی دونوں کی طرف دیکھتے
ہوئے احتجاج کیا۔

”جو جگہ قادی میں نے بتا دیا۔ اگر نکاح کو شوق ہو تو بے
شک یہاں رک جائے، پر میں تو اب دوبارہ یہاں نہیں آنے
والا۔“ انور نے اپنی بات کہہ کر فوراً ہی جگہ چھوڑ دی۔ رب
نواز بھی اس کی تھکد میں کھڑا ہو گیا۔ زہرہ اور نکاح دونوں
ہراساں و پریشان اپنے اپنے شوہروں کو دیکھنے لگیں۔ ان
دونوں کے خور و صف بتا رہے تھے کہ وہ اپنی جان بچانے کے
لیے اپنی بیویوں سے قطع تعلق کرنے میں ڈرا لٹا نہ کریں
گے۔

”نی کڑیوں! جاؤ، اپنے اپنے میاؤں کے ساتھ اپنے
گھر جاؤ۔ ہم اپنے سر پر پڑی پٹیلیں گے یا تم دونوں کا بوجھ
سنہاں گے۔“ نوران نے جو دامادوں کے تہور دیکھے تو
جلدی سے بیٹیوں سے بولی۔ ماں کا رو بہ دیکھ کر نکاح اور زہرہ
نے جلدی سے اپنی اڑھٹیاں اچھی طرح پٹیلیں اور اپنے
شوہروں کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئیں۔ انور اور رب
نواز باہر نکلے تو وہ دونوں ان کے پیچھے پیچھے تھیں۔ اس سیکے کی
محبت میں دیکھیں گی کیسے جہاں انہیں صرف اور صرف بوجھ ہی
سمجھا گیا تھا۔

☆☆☆

نئی تھی، اس نے یہ بھی تو بتایا تھا کہ ماسی حوران نے زہرہ
کے بیاہ سے پہلے ماہ بانو کے لیے زہرہ خریدا تھا، پر ڈاکا پڑا ماہ
بانو کے یہاں سے بھاگنے کے بعد۔ کوئی میری مانے یا نہ
مانے پر میں تو کیوں گا کہ کبھی بگم ہو رہی ہے۔“ انور نے ایک
بار پھر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

”پر ماسی کے گھر سے زہرہ اور وہ بیٹا غائب تو تھا، اگر
ماسی اور خالو مسٹر کوئی کرنے والے ڈاکو نہیں تھے تو انہوں نے
زہرہ کو غیر و کیوں بھینچا لیا؟“ انور کی بات پر زہرہ نے اعتراض
کیا۔ اس حادثے نے اسے اندر سے سہاوا تھا۔ بے شک
اس نے سب کے سامنے یہ کہانی بتا دی تھی کہ ماہ بانو اسے
دھوکے سے قتل خانے میں بند کر کے فرار ہو گئی ہے لیکن
حقیقت تو وہ جانتی تھی کہ ماہ بانو کو فرار کروانے میں اس نے
خود ہد کی تھی۔ وہ لیکن کی حالت دیکھ کر سوچ کی بھی گھراپ جو
حالات تھے، ان کو دیکھتے ہوئے لگتا تھا کہ شاید اس سے کوئی
تعلق ہو گئی ہے۔ خاص طور پر حوران اور مسٹر کے قتل کا بوجھ وہ
اپنے شانوں پر محسوس کر رہی تھی اور اس الزام سے خود کو بری
رکھنے کے لیے مسٹر اور حوران کے ساتھ پیش آنے والے
وائے کو ڈاکو کا فانی کی واردات ہی قرار دیتا جا رہی تھی۔

”تو جب کہ۔“ تجھے کیا معلوم کہ وہاں کیا کیا ہوتا ہے۔
کیا بھر و سا کہ ماسی اور خالو مسٹر کو قتل کرنے کے بعد زہرہ اور
وہ بیٹا ہی لیے غائب کر دیا گیا ہو کہ دوسری طرف شک نہ
جائے اور کیا معلوم کہ جس کھلے دار نے دونوں کی لاشیں
دیکھیں، پہلے اس نے ہی سب کچھ اڑایا ہو پھر بعد میں پولیس
کو خبر دی ہو۔“ رب نواز نے زہرہ کو ڈپٹ کر اپنا خیال پیش
کیا۔

”میرے خیال میں تو ڈاکا واکا کچھ نہیں پڑا۔ زہرہ میں
نے زہرہ کے بیاہ کے سوتے پر ماہ بانو کے پاس دیکھا تھا۔
برات والے روز اس نے کالوں میں سونے کے بندے سے پہلے
بھی تھے۔ ہو سکتا ہے کہ حوران واپس جاتے وقت اپنے ساتھ
زہرہ لے کر ہی نہ ہو۔ وہ پوسے ماہ بانو اپنے بیگ کو بڑی
حفاظت سے تالا لگا کر رکھتی تھی۔ سامان میں کوئی قیمتی چیز ہو
گی، سب ہی تو وہ حفاظت کرتی تھی۔ غصیوں جلی جاتے جاتے
وہ بیگ بھی اپنے سینے سے لگا کر لے گئی۔“ اب تک خاموش
تھیں نوران نے ایک حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہوئے دہائی
دی اور سر ہل کر درد شروع کر دیا۔

”خیر، جو بھی معاملہ ہے اور ماہ بانو نے جو بھی کچھ کیا،
میں صاف بتا رہا ہوں کہ مجھ پر اور میرے گھر والوں پر اس
بات کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ میں دینی واپس جا کر زہرہ کو

ہے تھا۔ مگر سوال وہی تھا کہ آخر اسے ہی شہر یار عادل ایک
اجنبی لڑکی کے حلقے کے لیے اتار بیٹھا تھا کیوں؟

☆☆☆

”کیا سوچا ہے چاہا! اب کیا کرو گے؟ ماہ بانو کا تو کہیں
سے کوئی آج پنا نہیں ملا۔ وہ مل جاتی تو اس کے چودھری کے
ساتھ دو بول پر صرا کر تمہاری جان چھوٹ جاتی، پر اب تو
ساری برادری مشکل میں ہے۔ کچھ معلوم نہیں کہ کب چودھری
کا ضبط جواب دے جائے اور وہ ہم پر قہر بن کر نوٹ
پڑے۔“ غیاث محمد کے دونوں داماد اور بیٹیاں اس کے گھر پر
تھیں تھیں۔ وہ سب ہی اپنی اپنی جگہ پریشان تھے۔ اس وقت
بھی غیاث محمد کے بڑے داماد انور نے سوال اٹھاتے ہوئے
اسے حالات کی نزاکت کا احساں دلایا۔

”کیا کروں پھر۔“ کچھ پہلے نہیں پڑا کہ کیا کروں اور
کہاں سے اس بد بخت کو ڈھونڈوں؟ اپنے طور پر پوشش کی بھی
کہ فیصل آباد میں مسٹر اور حوران کے جان بچان والوں سے
ماہ بانو کا پتا معلوم کر سوں، پر پھر بھی کچھ معلوم نہیں ہوا۔
میری جان تو بڑی مشکل میں پڑی ہے۔ ادھر چودھری کا
خوف ہے تو دوسری طرف لڑکی ذات کے غائب ہونے سے
مزت پر ہن آتی ہے۔ ساری برادری میں کیسے سراٹھا کر بات
کرنے کے لائق نہیں رہا۔ حوران اور مسٹر کے جنازے پر
سب ہی پھر سوچ رہے تھے کہ ماہ بانو کہاں ہے؟ میرے پاس کوئی
جواب ہوتا تو دیتا۔ سر بیوہ اڑے بیٹھا رہا، پر اس طرح کوئی
لوگوں کی زبانیں بند ہوئی ہیں۔ لوگ طرح طرح کی باتیں بنا
رہے تھے۔ ایک دکانو میں نے ایک کپتے سا کہ ماہ بانو سارا
روپا اور زہرہ لے کر اپنے کسی پار کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔

جانتے جانتے اس نے اپنے پیار کے ساتھ مل کر مسٹر اور حوران
کو قتل کر دیا ہے۔ اب بتاؤ، یہ سب سن کر میں کیا کرنا؟ جی تو
میں چاہ رہا تھا کہ کسی طرح وہ بد بخت میرے سامنے آجائے تو
اپنے ہاتھوں سے اس کا گھاگھونٹ دوں۔ کیا فائدہ! ایسی اولاد
کا جو جان بھی مشکل میں ڈالے اور عزت بھی مٹی میں دول
دے۔“ غیاث محمد خود اچھا خاصا بھرا بیٹھا تھا، داماد کے
مجھرتے ہی پھٹ پڑا۔

”تم اپنی جان پر درد ہے ہو چاہا! مجھے تو ساروں کی فکر
پڑی ہے۔ چودھری کی خاموشی کو دھمکی نہ جانو۔ اس کی
خاموشی کی بھی وقت حوران بن کر نہیں تباہ کر سکتی ہے بلکہ مجھے
تو لگتا ہے کہ ماسی حوران اور خالو مسٹر کے قتل کے پیچھے بھی
کوئی اور بات ہے۔ اگر زہرہ اور زہرہ کے پیکر میں ڈاکا پڑا تھا تو
پہلے کیوں نہیں پڑا؟ وہ جس عورت نے سبکی زہرہ کی کہانی

اسے لاہوری آنے تھا۔ البتہ شہر یار تھیں میں جتنا ہو گیا تھا کہ موتی والا کو فراہم سے ایسا کون سا کام آ پڑا ہے جو وہ جگہ جگہ فون میں کرتا تھا۔

”مجھے احساس ہے شہر یار صاحب کہ آپ کو کافی عرصے بعد مگر آنے کا موقع ملے گا اور آپ کی خواہش ہوگی کہ اس مختصر وقت کو مکمل طور پر ہماری کے افراد کے ساتھ ہی گزاریں۔ لیکن مجھے آپ سے کچھ اہم باتیں کرنی ہیں جن کے لیے میں آپ سے ملاقات کا خواہش مند ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ سے ملاقات کے لیے رات باؤس آ جاؤں؟ اصل میں، میں چاہ رہا ہوں کہ آپ لاہور میں موجود ہیں تو اس موقع کا فائدہ اٹھالیا جائے اور دوسری صورت میں بھی میں آپ سے یہی درخواست کرتا کہ آپ کا جب بھی لاہور آئے ہو وہی فرصت میں مجھے ملاقات کا وقت دے دیں۔ آنے کو تو میں وہاں آپ کے دفتر میں بھی آ کر آپ سے ملاقات کر لیتا لیکن میری وہاں آمد کچھ ٹھوکانوں کو چھوڑنے کے لیے اس لیے میں وہاں ملاقات سے گریز کرنا چاہتا ہوں۔“

موتی والا کے انداز گفتگو نے شہر یار کے تجسس کو مزید بھڑکا دیا۔ اب اس کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ موتی والا سے ملاقات کے لیے انکار کرتا پتا نہ خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ”اے کھٹک سے کیوں کام لے رہے ہیں موتی والا صاحب۔ آپ کے لیے میں اتنا کہہ دیتا ہوں کہ آپ مجھ سے ملاقات کے لیے آتے جاتے ہیں۔“

”مرمت افزائی کے لیے ٹھہریے۔ یہ فرمائیے کہ کتنے بچے تک حاضر ہو جائیں؟“ شہر یار کا جواب سن کر موتی والا نے ہنسا۔

”اگر فردی طور پر آ سکتے ہیں تو مناسب رہے گا۔ اصل میں شام سے پہلے ہی میرا وہاں کے لیے روانہ ہونے کا ارادہ ہے۔“

”بس تو پھر تمہیک ہے جس میں بچیں منت میں حاضر ہوتا ہوں۔“ شہر یار کے بتانے پر موتی والا جھٹ بولا۔ شہر یار ظاہر ہے جو اپنا ”پیشہ مار و فن“ لا شاد دہی کہہ سکتا تھا سو اس نے بڑبان اتر پر ہی ”نوع آرموسٹ ویکر“ کہا اور فون بند کر کے اپنے ساتھ ارادے کے مطابق آرام کے لیے اپنے بندہ روم میں جانے کے بجائے موتی والا کے انتظار میں اپنی مہمانی سے کب شب لگے لگے۔ ٹھیک بائیس منٹ بعد ملازم نے اسے موتی والا کے آنے کی اطلاع دی۔ اس اطلاع پر شہر یار، مہمانی سے کھٹک کو سلسلہ منقطع کر کے ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔ موتی والا عام سے شلواری میں بیٹھ کر ایک مونسے پر

بیٹھا تھا۔ شہر یار کے ڈرائنگ روم میں داخل ہونے پر اس نے اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر شہر یار سے ہاتھ ملایا۔ ”پلیز سٹریٹ کریجے۔“ شہر یار نے خود ہی ایک مونسے پر بیٹھنے ہوئے اس سے کہا۔ موتی والا پر ایک نظر ڈالنے کے بعد ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ پہلے کے مقابلے میں بہت کمزور ہو گیا ہے۔ شہر یار نے آخری بار اسے اس کے بچنے کی موت کے ایک دن بعد دیکھا تھا اور اس کے بعد آج وہ بارہا تھا۔ اس مختصر عرصے میں ہی موتی والا کی صحت پر نمایاں فرق پڑا تھا۔ یقیناً کھوتے بچنے کی موت کا کم اس نے اپنی جان سے لگا لیا تھا۔

”کیا لینا پسند فرمائیں گے آپ... خنڈا یا گرم؟ دے دیے میرے خیال میں موسم کی مناسبت سے کافی پانی چاہئے مناسب رہے گی۔“ دہی ملک ملک اور حال احوال کے بعد شہر یار نے موتی والا سے دریافت کیا۔

”کسی کھٹک کی ضرورت نہیں۔ میں بس آپ سے ایک ضروری بات کرنے آیا تھا۔ آپ میری وہ بات توجہ سے سن لیں، باقی مجھے کسی شے کی خواہش نہیں۔“

”ہاتھیں بھی ہوتی رہیں گی موتی والا صاحب لیکن ساتھ میں کچھ لے لیا جائے تو کیا حرج ہے۔ میرے خیال میں، میں کافی مشکو آ لیتا ہوں۔“ موتی والا کا جواب سن کر شہر یار نے اصرار کیا۔

”میں کھٹک نہیں کر رہا شہر یار صاحب! واقعی مجھے کسی شے کی خواہش نہیں۔ اب خواہش ہوتی ہی نہیں ہے، بس سانپوں کے سلسلے کو جاری رکھنے کے لیے ضرورتاً تھوڑا بہت زہر مار کر لیتا ہوں۔“ بے بسی سے کہتے ہوئے موتی والا کی آنکھوں میں آنسوؤں کی ٹپ ٹپکھٹکھی تھی۔ اس کی کوئی جگہ میں کھٹنے سے بچانے کے لیے وہ چھوڑ کر بالکل خاموش بیٹھا رہا۔ شہر یار نے بھی اسے چھوڑنا مناسب نہیں سمجھا اور جب چاہے اس کے سنبھلنے کا انتظار کرتا رہا۔ اسے اندازہ تھا کہ کھوتے جوان بچے کو کھوتے والا باپ اپنی زندگی کے کس انتہائی تکلیف دہ دور سے گزر رہا ہوگا۔

”یہ دنیا عجیب جگہ ہے شہر یار صاحب! آدی جاتا ہے کہ ایک روز اس دنیا کو چھوڑ کر جاتا ہے پھر بھی اس کی ہوس میں جتنا ہو جاتا ہے۔ خاص طور پر اپنی اولاد کے لیے آدی کا بس نہیں چٹا کہ کون کون سے خزانے جمع کر دے۔ میں بھی برسوں سے اسی ہوس میں جھٹا تھا لیکن اب یہ حال ہے کہ دولت کے انبار لگے ہیں لیکن جس کے لیے یہ سب کچھ بن گیا تھا وہ دنیا سے جا چکا ہے۔ اس کے جانے کے بعد مجھے

احساس ہوا ہے کہ میں اپنی غلطیوں کو سدھار لوں۔ اسی سلسلے میں، میں نے آج آپ کو ملاقات کی زحمت دی ہے۔“ موتی والا نے افسردہ سے کچھ میں اتکا کہا اور ایک بار پھر چپ سا دھلی۔

”میں آپ کی بات پوری توجہ سے سن رہا ہوں موتی والا صاحب! آپ کو جو کچھ بتانا ہے بلا تکلف کہتے جائیں۔“ شہر یار نے اسے چپ ہوتے دیکھ کر بولنے پر کامیاب تو وہ ایک گھبرائی سانس لیتے ہوئے دوبارہ بولیا۔

”آپ جانتے ہوں گے کہ میرے اور چودھری افتخار عالم کے درمیان کاروباری شراکت ہے۔ میرے بزنس کی نوعیت اور وسعت سے بھی آپ ناواقف نہیں ہوں گے۔ پہلے میں ایک چھوٹے سا بزنس میں تھا لیکن جب چودھری افتخار کے ساتھ پارٹنرشپ کی تو دیکھتے ہی دیکھتے میں سے کتنی بڑھ گیا۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ میرے بزنس کی بڑھتی چودھری افتخار کی بھاری سرمایہ کاری کی مرہون منت ہے لیکن حقیقت سے مجھ سمیت چند ہی لوگ واقف ہیں۔ چودھری افتخار نے میرے ساتھ پارٹنرشپ کرنے کے بعد سرمائے سے زیادہ ٹھکری فراہم کی۔ میرا یاد کے ساتھ جو بنگلے لگائے اس بنگلے میں بڑی تعداد میں جنم کے درخت پائے جاتے ہیں۔ ان درختوں سے حاصل ہونے والی لکڑی بہت اچھی پائے کی ہوتی ہے اور فیچر سازی میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ چودھری افتخار اور اقبال باجوہ کے تھ جوڑے نیچے میں عرصے سے مجھے یہ لکڑی تقریباً منت مل رہی ہے، بس مجھے براہت میں سے ان دونوں کو حصہ دینا پڑتا ہے۔ حصہ میں آپ سمجھیں کہ چودھری افتخار لیتا ہے، اقبال باجوہ کو تو ہم اس کی خاموشی اور جنم پونگی کی قیمت ادا کرتے ہیں۔“

”آپ یہ سب کیوں بتا رہے ہیں؟“ شہر یار نے موتی والا کو پوچھ کر دیکھتے ہوئے نہایت تنبیہ کی سے پوچھا۔

”میں جانتا ہوں کہ اس بار جب بنگلے سے لکڑی چڑا کر منت کی جاری ہو تو آپ اپنی جنم کے ساتھ چھاپا ماریں اور اس جرم میں ملوث افراد کو سزا دیں۔“

”اس صورت میں تو آپ بھی زد و کوب آئیں گے۔ جب بات ٹھکی تو ظاہر ہے پھر دوبارہ کھ جائے گی۔“ موتی والا کے جواب پر شہر یار نے اسے نکتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے احساس دلایا۔

”میں جانتا ہوں اور مجھے اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں۔“ موتی والا کا جواب حیران کن تھا۔ ”کیا ایسا آپ چودھری افتخار سے اقدام لینے کے پھر

میں کر رہے ہیں؟ چودھری صاحب شکوہ کرتے رہے ہیں کہ آپ کا کون کے ساتھ ایسا رہے ہے جیسے انہوں نے آپ کے لیے نکل کیا ہوا۔“

”میں جانتا ہوں کہ چودھری افتخار نے میرے بچے کو لقل نہیں کیا۔ کم از کم ہر ادارت تو اس نے ایسا نہیں کیا کہ میں اسے اپنے بچے کا لقمہ لاسکوں لیکن میں حالات پر غور کرتا ہوں تو مجھے اپنے بچے کی موت میں اس کا ہاتھ نظر آتا ہے۔ جب تک میری بڑھری افتخار سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، میں ایک ایمان دار آدمی تھا۔ میرا کاروبار چھوٹا تھا لیکن اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ میں خوش حالی تھی۔ میں بیوی اور بچے کو اچھا خاصا وقت دے تھا۔ میرا بہت ذہین تھا۔ اس کی ذہانت کو دیکھتے ہوئے میرے ابا بھی نے خواہش ظاہر کی تھی کہ میں اسے حافظ قرآن بنائوں۔ ابا کی عمر نے کے بعد بھی میں ان کی اس خواہش پر عمل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن پھر میری چودھری افتخار سے ملاقات ہو گئی۔ بس پھر تو میں دولت جمع کرنے کی جس میں جھکا ہو گیا۔ نہ مجھے ابا کی خواہش یاد رہی نہ بچے کو پانے کے لیے وقت بچا۔ ایک باپ کی حیثیت سے اپنے بچے کی تربیت اور نگرانی کی جو ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی تھی اس کو میں اپنے طور پر فونوں کی گڈیاں لٹا لٹا کر ادا کرتا رہا۔ پیسے کی فراوانی اور تربیت کے فقدان نے اثر دکھایا۔ میرا بچا اپنے دادا کی خواہش کے مطابق حافظ قرآن بننے کے بجائے ایک گنگوا رہا جس سے زیادہ بن گیا۔ اس کے کتو توں سے منتقل خبریں میرے کان میں پڑتی رہتی تھیں۔ ایک بار وہاں بی کرل خفا کر کے کے جرم میں گرفتار بھی ہوا تھا میں نے تھانے دار گورنٹ دے کر اسے پھیرا لیا۔ اس وقت میرے ذہن میں تھا کہ میرے بچے کو میری دولت پر ہمارے پیش کرنے کی آزادی ہے لیکن جب وہ مرا تو مجھے احساس ہوا کہ اس سے جا آزادی کا یہی نتیجہ نکل سکتا تھا۔ میں نے اپنے بچے کی پوسٹ مارٹم رپورٹ دیکھی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ کون کون حالات میں ہرا ٹھک رہا ہے یہ بھی سمجھتا ہوں کہ یہ حالات چودھری افتخار کی وجہ سے پیدا ہوئے۔ اگر وہ کچھ آرام دہ حالت سے دولت کمانے کی دھن میں نہیں لگا تو شاید ایک چھوٹے سا بزنس میں ہوتا جس کے پاس اپنے بچے کی تربیت کرنے کی فرصت ہوتی۔ جس کی کمائی میں حرام کی اس قدر آمیزش نہیں ہوتی کہ اس کی اولاد حرام و حلال کی تمیز کرنے کی صلاحیت کھینچی۔ آپ یہ مت سمجھیں کہ میں ہر برائی کی ذمہ داری چودھری افتخار کے سر ڈال کر خود کو بری الذمہ قرار دیتا جاتا ہوں۔ ایسا ہرگز نہیں

میں کر رہے ہیں؟ چودھری صاحب شکوہ کرتے رہے ہیں کہ آپ کا کون کے ساتھ ایسا رہے ہے جیسے انہوں نے آپ کے لیے نکل کیا ہوا۔“

”آپ کا شہر یہ شہر یا صاحب لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں کسی نرمی کا خواہش مند نہیں۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں، اپنے جرم کا کفارہ کچھ کر رہا ہوں اور کفارہ ادا کرنے کے خواہش مند نرمی اور آسانی تلاش نہیں کرتے۔“ اپنی اس بات کو کہنے کے بعد موتی والا حیدر وہاں رکائیں اور شہر یار سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد شہر یار بڑی دیر تک بیٹھا سوچتا رہا کہ اللہ تعالیٰ آدمی کا دماغ لٹکانے پر لانے کے لیے کیا کچھ نہیں دکھاتا مگر کم ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو دوسروں کو دیکھ کر نصیحت پکڑیں۔ عموماً لوگوں کو محض اسی وقت آتی ہے جب وہ خود ٹھوکر کھاتے ہیں اور بعض بد نصیب تو ٹھوکر کھا کر بھی نہیں سمجھتے۔

☆☆☆

”تم سوئیں نہیں ابھی تک؟“ سرد اور غمِ روشن برآمدے میں چلتی ماہ بانو اپنے خیالات میں اتنی غرق تھی کہ اسے خبر نہیں ہو سکی کہ کب دارالامان کی منتظرہ اس برآمدے میں داخل ہو کر اس کے قریب آ پہنچی۔ منتظرہ یقیناً اپنے معمول کے مطابق رات کو سونے سے قبل دارالامان کا آخری چکر لگا رہی تھی۔ وہ اجڑھمری ایک عام سی شکل و صورت کی عورت تھی جو مزاجاً ہمدرد ہونے کے باوجود کوئی اصول پرست تھی اور اس اصول پرستی کی وجہ سے اسے اکثر سختی سے بھی کام لینا پڑتا تھا مگر اس وقت ماہ بانو سے سوال کرتے ہوئے اس کے لہجے میں نرمی تھی۔

”نہیں نہیں آری۔ طبیعت بہت بے چین ہے۔“ ماہ بانو نے جھکی نظروں کے ساتھ منتظرہ کے سوال کا جواب دیا۔ آج شام ہی تو اسے منتظرہ سے سخت ڈانٹ سننے کوئی تھی۔

”جس میں سکتی ہوں کہ تم بہت پریشان ہو۔“ اپنے گھر سے الگ کسی دارالامان جیسی جگہ پر رہنا واقعی بہت مشکل ہوتا ہے۔ خاص طور پر اس صورت میں جب بندہ جانتا ہو کہ اس کے گھر میں اس سے محبت کرنے والے لوگ اس کے منتظر ہیں۔ مجھے تمہارے حالات کے بارے میں معلوم نہیں مگر مجھے تمہارے مسئلے میں بہت سختی سے یہ ہدایت دی گئی ہے کہ کسی کو بھی تمہاری یہاں موجودگی کے بارے میں خبر نہ ہو سکے۔ آج شام تم نے جو حرکت کی تھی، وہ بہت خطرناک تھی۔ جانتی ہو شام سے میرے پاس کئی دفع مختلف نمبروں سے فون آئے تھے ہیں کہ ہماری ماہ بانو سے بات کرو اور۔ میں نے سختی سے ٹھکرایا کہ یہاں کوئی ماہ بانو نہیں رہتی۔ یہ کسی کی رہائش گاہ نہیں بلکہ ایک اسپتال ہے۔ ایک لڑکی نے تو مجھ سے ابھی خاصی بحث کی کہ آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔ ماہ بانو یہاں

ہے، میں اپنا جرم تسلیم کرتا ہوں اور اس کی سزا بھگتنے کو تیار ہوں۔ اگر میری درخواست پر غور کرتے ہوئے آپ کو کوئی کارروائی کرتے ہیں تو میں از خود اعتراف جرم کر لوں گا لیکن فی الحال میرا منظر پر رہنا ضروری ہے۔ میں بیٹ اپ میں موجود ہوں گا، جب ہی آپ کو ہتھاکوئی کچھ اچھی لکھپ کب اسکی لی جائے گی۔ اس مقدمہ کو سامنے رکھ کر میں نے ابتدائی جذباتی پین کو چھوڑ کر چودھری افتخار سے اپنے مراسم دوبارہ استوار کر لیے ہیں۔ اب دوبارہ اس غلط فہمی میں جتنا ہے کہ میں اس کا روبرو حلیف ہوں لیکن جو جے وہ میں نے آپ کو بتا دیا۔“ شہر یار کے سوال کے جواب میں موتی والا نے ایک جذباتی اور کھٹکتیلی بیان دیا۔ شہر یار کچھ رہا تھا کہ موتی والا کی یہ کاپیٹ بیٹے کی موت کے شدید صدمے کا نتیجہ ہے۔

قدرت کے کارخانے میں ایسے واقعات کا جنم لینا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اولاد کے صدمے سے بڑے بڑوں کو ٹوٹا ہوا دیکھا گیا ہے۔ ہاں، کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ایسے کاری ختم کھا کر بھی لڑتی غلط روش پر ڈٹے رہتے ہیں۔ شاید وہ لوگوں کی اس قسم سے تعلق رکھتے ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہو۔ موتی والا کی کاپی اس لیے پلٹ گئی تھی کہ وہ بنیادی طور پر ایک شریف انسان تھا جس نے اپنی زندگی کا اچھا خاصا حصہ ایمان و ادبی سے کام کرتے ہوئے گزارا تھا۔ بعد میں دولت کی چمک نے اس کی آنکھوں کو چمکا چھوڑ کر دیا ورنہ جو شخص اپنے باپ کی خواہش پر اپنے بیٹے کو حافظہ قرآن بتانے کا ارادہ رکھتا ہو، وہ خطرناکے ایمان اور برائئیں ہو سکتا۔

”میں آپ کے تعاون کے لیے شکر گزار ہوں گا موتی والا صاحب آپ مجھ سے مسلسل رابطے میں رہیے گا آپ کی فراہم کردہ اطلاعات کے مطابق میں ٹکڑی کے ان انکسز کو چھاپنے کی بھرپور کوشش کروں گا۔ میری کوشش ہوگی کہ آپ کے تعاون کے سلسلے میں آپ پر دوسرے لوگوں کے مقابلے میں نسبتاً اگلی فرد درجہ عائد کی جائے۔“ شہر یار خوش تھا کہ ایک ایسے موقع پر جبکہ وہ چودھری افتخار کی شخصیت کا ایک بھیاں یک روپ لوگوں کے سامنے لانے والا تھا، قدرت نے اسے موقع فراہم کر دیا تھا کہ وہ چودھری افتخار کا ایک دوسرا روپ بھی سامنے لائے۔ ماہ بانو والے معاملے کے ساتھ ساتھ یہ معاملہ بھی سامنے آ جاتا تو چودھری افتخار کے لیے آسانی سے اپنی جان چھڑا دیتے نہیں رہتا۔ اسے یہ موقع موتی والا فراہم کرنے والا تھا اس لیے جواباً اسے بھی کوئی ریلیف ملتا چاہیے تھا مگر موتی والا کے جواب نے اسے حیران کر دیا۔ اس نے کہا۔

موجود ہے اس نے خود مجھے اس سر سے فون کیا تھا۔ میں نے کبھی نہ کہی کہ یہ ایک پبلک ٹیلیفون ہے۔ وہ سوسائٹ سے کہہ دیا کہ فون سے اس کے فون سے آپ کو فون کیا ہو۔ وہ کسی کام سے یہاں آئی ہوں گی تو آپ کو فون کر لیا ہو گا لیکن اب وہ یہاں نہیں ہیں۔ تو میں ان سے کسی طرح آپ کی بات کر دیا۔ بڑی مشکل سے اس لڑکی نے میری بات پر یقین کیا۔ لہجہ نرم ہونے کے باوجود ماہ بانو محسوس کر سکتی تھی کہ منتظر اس کی حرکت پر ہار رہا ہے۔ منتظر مجموعی طور پر ایک اچھی عورت تھی اور ماہ بانو کو اس کی تارائی اسی غلطی نہیں لگ رہی تھی۔ چنانچہ شرمندگی کے گہرے احساس کے ساتھ وہ بولی۔

”سوری میڈم! مجھے احساس ہے کہ میں نے غلطی کی ہے۔ اصل میں میری طبیعت دو تین دن سے اتنی بے چین تھی کہ میں رو رہی تھی۔“

”مجھے خود بھی تمہاری کیفیت کا اندازہ ہے۔ اس وقت میں جھپٹتی تھی سے ڈانٹ کر اندر سونے کے لیے بھیجے گئے تھے۔ میں تمہارے پاس رہی اسی لیے ہوں کہ تمہیں کچھ سکون۔ میں برسوں سے اس دارالامان میں ملازمت کر رہی ہوں۔ یہاں رہنے والی عورتیں کسی نہ کسی بھجوری یا مشکل کا شکار ہوتی ہیں لیکن خود کچھ لوگ ان سب سے کسی طرح حالات کے ساتھ بھجوتا کر دکھا ہے۔ وہ آپس میں ہنسی بولتی تھیں اور لڑائی جھگڑائی بھی ہیں۔ ساتھ ساتھ روئیں کے کام بھی چلتے رہتے ہیں۔ تم بھی اپنی کسی مشکل کی وجہ سے یہاں آئی ہو۔ امید رکھو کہ تمہاری مشکل جلد دور ہو جائے گی اور تم یہاں سے واپس اپنے گھر چلی جاؤ گی لیکن جب تک یہاں ہو، جب تک وہ جھپٹیں بہت اور بدراشت سے کام لیتا ہی ہو گا۔ اس طرح راتوں کو جاگ کر کھینچنے سے کیا حاصل ہو گا؟ چلو جاؤ شاباش! جا کر سو جاؤ۔“

ماہ بانو کی معذرت کے جواب میں منتظر نے اسے سمجھاتے ہوئے نرمی سے ہم دیا تو وہ اس قسم کی بھجوری میں اس کے سر سے کی طرف بڑھ گئی جہاں اس کا تاق تھا۔ اس کے سر سے اس کے ساتھ چند دوسری عورتیں بھی جھپٹیں۔ ماہ بانو نے دیکھا کہ وہ تمام عورتیں سکون سے کوی ٹینڈ سو رہی ہیں۔ اسے ان عورتوں کی اس قدر پر سکون نیند پر حیرت ہوئی۔ دارالامان میں اپنے چند روزہ قیام کے عرصے میں بھی وہ اپنی ساتھی عورتوں کے حالات سے اچھی خاصی واقف ہو گئی تھی۔ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ ہی کوئی نہ کوئی افسوس ناک واقعہ پیش آیا تھا۔ ایک عورت کچھلے چند روزہ سال سے یہاں رہ

رہی تھی۔ اس عورت کے ماں باپ مر چکے تھے۔ کسی عزیز نے کچھ عرصے اسے گھر بنا دیا اور پھر جان چھڑانے کے لیے بغیر دیکھ بھال کیے شادی کر دی۔ سسرال والے نہایت جاہل لوگ تھے جو بغیر چھتر کے آنے والی ملازمت بہو پر ہر طرح کا ظلم کرتے رہے تھے۔ وہ بے چاری روزانہ کی مار پیٹ اور کچی کھانچ غاصی سے سختی رہتی۔ شکایت کرتی بھی کوئی نہ کرے؟ عین کے نام پر کوئی آسرا نہیں تھا اور شوہر بھی اپنے گھر والوں کا ہم نہ ہوا تھا۔ اس عورت نے کچھ ایسا کیا کہ اس کا مرنے جینا اسی ظالم سسرال میں ہے لیکن مرنا نہ سکتا مشکل ہوتا ہے، یہ اسے اس وقت بتا چلا جب اس کی ساس اور اندھوں نے اس کی اسے جلانے کی کوشش کی۔ وہ کسی طرح ان سے جان بچا کر گھر سے بھاگ نکلی اور اپنی ننگی کمر پلٹ کر بھی واپس جانے کی ہمت نہیں کی۔ اب وہ چند روزہ سال سے اس دارالامان میں بھی اور اپنے سسرال کے مقابلے میں یہاں بہت خوش تھی۔ غرض ہر عورت کے پیچھے اسی طرح کی کہانی تھی جو وہ برتنے آنے والے کو شاید اپنے دل کا بوجھ بک کر لے کے لیے سنا دیتی تھی۔ ماہ بانو نے بھی ان لوگوں نے اس کے حالات کے بارے میں جاننے کی کوشش کی تھی لیکن ماہ بانو کو اپنی اسے عبداللہ ان کی ہدایت یاد تھیں۔ اسے یہاں بھجوانے سے قبل اس نے سختی سے ہدایت کی تھی کہ اپنے بارے میں کسی کو کچھ بھی بتانے کی ضرورت نہیں۔ ماہ بانو پوری طرح سے اس کی ہدایت پر عمل کر رہی تھی۔ لیکن وہ دارالامان میں مقیم دوسری عورتوں کی طرح یہاں رہنے بسنے میں ناکام تھی۔ اسے ہر وقت بے بے اور اپنی یاد آتی رہتی تھی اور آج کل تو کچھ زیادہ ہی بے قرار تھی۔ اس بے قراری کے ہاتھوں ہی مجبور ہو کر اس سے ایک غلطی ہو گئی تھی۔ یوں تو اس نے عبداللہ ان کے بارے میں مطلع کر دے گا لیکن پھر بھی اس کی اور باپ کو اس کے بارے میں مطلع کر دے گا لیکن پھر بھی اس کی خواہش تھی کہ وہ خود ان دونوں سے بات کر لے۔ منتظر سے اس سلسلے میں اس نے ایک بار ملازمت بھی مانگی تھی لیکن اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔ آج ماہ بانو بہت بے چین ہوئی تو اس نے دارالامان کی ایک ملازمت کو چند روزہ بے دے کر اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ اسے سوچ دیکھ کر فون پر گھبرات کر اسے دے گی۔ ماہ بانو کے اپنے گھر میں تو فون نہیں تھا۔ اس نے اپنے ملازمین کے گھر فون کیا کہ بے بے کو وہاں بلا کر بات کر لے گی لیکن ہوا یہ کہ ابھی اس نے لائن ہٹنے کے بعد صرف اتنا ہی بتا تھا کہ میں ماہ بانو بول رہی ہوں تو چائیک منتظر وہاں پہنچ گئی۔ اس نے ماہ بانو کے ہاتھ سے ریسیور چھین کر

لائن کاٹی اور پھر اسے ٹھیک ٹھاک ہاتھ میں لے کر دیا۔ ماہ بانو کو ساتھ دینے والی ملازمت کی تو اس نے کئی گنا بڑھ کر شامت آئی تھی۔ ابھی برآمدہ میں ہونے والی ملاقات میں منتظر نے اسی فون کال کے حوالے سے اسے دوبارہ سمجھایا تھا۔ ماہ بانو کا فی حد تک اس کی بات سمجھ گئی تھی لیکن دل کی بے قراری اپنی جگہ تھی۔ وہ کمرے میں موجود دوسری عورتوں کی طرح بے چارے تھیں۔ سونے میں ناکام تھی۔ اسے رو کر اسے شہریار عادل اور اس کے بی بی اسے پر بھی غصہ آ رہا تھا جو اسے اس دارالامان میں پہنچانے کے بعد جوں ہی کہتے تھے۔ لیکن ظاہر ہے، اس وقت وہ ان پر آنے والے کسی صورت میں نکال سکتی تھی چنانچہ بے بسی ہی ہو کر منتظر کے طور پر پر عمل کرتے ہوئے بستر پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

بہت دیر کی کوشش کے بعد بھی اسے صرف اتنی کامیابی ہوئی کہ ذہن کچھ کچھ غنودگی میں چلا گیا۔ غنودگی کی اس کیفیت میں اس نے باہر برآمدہ سے میں قدموں کی آوازیں سنیں۔ قدموں کی یہ آوازیں اپنی کمرے کے دروازے سے پر آ کر درمیں جس میں ماہ بانو موجود تھیں۔ ایک دم دروازہ زوردار آواز کے ساتھ کھلا۔ ماہ بانو بڑا آکر اپنے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کچھ سے دروازے سے دو ڈھانچا پٹنی اندر داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ دارالامان کی خوف زدہ منتظر بھی تھی۔ منتظر کو ایک ڈھانچا پٹنی نے اپنے رپاٹوری ڈپر لے رکھا تھا۔ ماہ بانو کو یہ کھینچے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگا کہ آنے والے ڈھانچا پٹنی چودھری اختیار کے کاتھ سے ہیں جو اس کی سائنس میں یہاں تک آچکے ہیں۔ ماہ بانو ترپ کر اپنی بکھرے تھی کہ کسی طرح ان لوگوں کی رفت میں آنے سے پہلے نہیں بھاگ جائے لیکن اس کمرے میں فرار کا واحد راستہ وہ دروازہ تھا جس پر دونوں ڈھانچا پٹنی ڈبے ہوئے تھے۔

☆ ☆ ☆

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ شہریار اپنے بیڈروم میں گہری ٹینڈ سو رہا تھا کہ اسے دروازے پر ہونے والی دستک مل گئی۔ شہریار نے چونک کر سر ہائے رچی ہوئی گزری میں وقت دیکھا اور پھر مزید حیران ہوتے ہوئے ”کیس کم ان“ کہہ لگے لیکن اس کا بکتر سامنے موجود تھا۔

”سوری سر! اس وقت آپ کی ٹینڈ خراب کرنے پر معذرت چاہت ہوں۔ اصل میں عبداللہ صاحب آئے ہوئے ہیں اور آپ سے فوری ملاقات کے خواہش مند ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ معاذ بہت عجیبہ اور فوری نوعیت کا ہے۔“ منتظر نے شہریار سے معذرت کرتے ہوئے رات کے اس پہر

اسے ڈسٹرب کرنے کی وجہ بتائی۔ وہ سن کر شہریار پریشان ہو گیا۔ عبداللہ ان ایک کچھ دار اور ڈسے دار آدمی تھا جو بلا وجہ اس وقت اسے ڈسٹرب نہیں کر سکتا تھا۔

”ٹھیک ہے، تم چلو میں آ رہا ہوں۔“ عبداللہ ان کی آمد کی وجہ کے بارے میں اندازہ لگنے کی کوشش کرتے ہوئے شہریار نے بلکرو ٹیگم ڈیا اور پھر وہ سلیک سوٹ پر گاڑن سینے کے بعد ہاتھوں میں بال سٹار داتا ہو کر اسے باہر نکل گیا۔ عبداللہ ان نے چلاؤ ڈیج میں ہی اس کا منتظر تھا۔

”سوری سر! معاذ بہت اہم تھا تو میں اس وقت آپ کو ڈسٹرب نہیں کرتا۔“ شہریار کو دیکھتے ہی عبداللہ ان نے اس سے معذرت کی۔ خود اس کے چہرے سے بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ خود بھی گہری ٹینڈ سے جگا گیا ہے۔

”کیا برا بھلا ہے؟“ عبداللہ ان کی معذرت کو نظر انداز کرتے ہوئے شہریار نے تجویز کی ہے پوچھا۔

”لاہور کے دارالامان کی منتظر کا فون آیا تھا سر! اس نے بتایا ہے کہ کچھ لوگوں نے ماہ بانو کو وہاں سے اٹھا کر لے کر کوشش کی تھی۔ یہ کوشش تو ناکام ہو گئی لیکن ماہ بانو اس وقت ملائے کے قاتلے میں ہے جہاں ایس ایچ او اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔“ عبداللہ ان کی وی ہوئی اطلاع نے شہریار کو یک دم ہی منتظر کر دیا لیکن اس نے کمال ضیاع سے کام لیتے ہوئے اپنے اضطراب کو قابو میں رکھا اور سچاٹ لکچے عبداللہ ان سے بولا۔

”یہ سب کیسے ہوا۔ ذرا تفصیل سے بتاؤ؟“

”زیادہ تفصیلات تو مجھے خود بھی نہیں معلوم سر! منتظر کے مطابق رات کے وقت دارالامان کے گیٹ پر دو چوکیدار موجود ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک چوکیدار ضرورت کے تحت ہاتھ دھو گیا ہوا تھا، اس وقت کچھ لوگ دیوار پھلانگ کر دارالامان میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے گیٹ پر موجود چوکیدار کو بے ہوش کیا اور پھر منتظر کے کمرے میں گھس کر اسے اسٹے کے زور پر بھجور کیا کہ اسے ماہ بانو تک پہنچا دیا جائے۔ ظاہر ہے، منتظر کو اپنی جان بچانے کے لیے ان کا حکم ماننا پڑا۔ دو لوگ ماہ بانو کو زبردستی اٹھا کر لے جا رہے تھے کہ وہ چوکیدار جو ہاتھ دھو گیا ہوا تھا، واپس لوٹ آیا۔ اس نے دور سے ہی صورت حال بھانپ لی اور اپنی راکٹل کے زور پر حملہ آوروں سے مقابلہ کرنے لگا اور کیا۔ وہ لوگ تعداد میں زیادہ تھے لیکن اس اپنا تک حملے کی وجہ سے سبکدوش ہو گئے۔ چوکیدار نے سب سے پہلے اس شخص کی فیک میں گولی ماری جس نے ماہ بانو کو اٹھایا ہوا تھا۔ ایک اور شخص بھی زخمی ہوا۔

مجبوراً باقی بچ جانے والے افراد کو اپنے دونوں زخمی ساتھیوں کو لے کر فرار اختیار کرنی پڑی۔ انفرافری میں وہ ماہ بانو کو بھی اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب نہیں ہو سکے لیکن ان کی جوانی فائرنگ سے بے چارے چوکیدار کو اچھا غماز نہ کر دی رہا ہے۔ اس کے جسم میں تین گولیاں ہیں اور منظر کے مطابق اس کی حالت نازک ہے۔ اگر چوکیدار کے زخمی ہونے کا معاملہ نہیں ہوتا تو منظر شاید اس واقعے کو چھپا لیتی لیکن فائرنگ اور زخمی چوکیدار کی وجہ سے فریضی تھانے میں اطلاع پہنچ گئی۔ ایس ایچ او کو منظر نے سبکیا تاکہ جلد آوے۔ معلوم تھے اور انہوں نے زبردستی دارالامان میں جس کمرے میں محروم کو گواہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ منظر نے ایس ایچ او پر غائب نہیں کیا تھا کہ جلد آوے۔ ماہ بانو کے لیے وہاں آئے تھے لیکن ایس ایچ او بہت کانٹا آدمی ہے۔ اس نے ماہ بانو کے ساتھ موجود دوسری محروم کو بھی بیان کیا اور ان محروم میں سے کسی نے بتا دیا کہ آئے والوں نے صرف ماہ بانو کو گواہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اب ایس ایچ او ماہ بانو کو اپنے ساتھ تھانے لے گیا ہے کہ اس سے اصل صورت حال کے بارے میں معلومات حاصل کرے گا۔ منظر نے پریشان ہو کر مجھے یہاں فون کیا اور میں آپ کے پاس چلا آیا کہ آپ سے صورت حال کو دیکھیں کہ کوئی قدم اٹھایا جائے۔

عبداللہ نے شہر یار کو تفصیل سنائی تو اس کے ہاتھ پر بل پڑ گئے۔ قدرتی طور پر وہ سوچ رہا تھا کہ ماہ بانو کو گواہ کرنے کی کوشش کرنے والے چوہدری افشار کے ہی ہندے ہو سکتے ہیں۔ انہیں ماہ بانو کے لاہور کے ایک دارالامان میں ہونے کی خبر کسی طرح کی تھی، یہ سوال انہی جگہاں ہونے کے باوجود اس وقت سب سے پہلی ضرورت یہ تھی کہ ماہ بانو کو تھانے سے نکال کر کسی محفوظ مقام پر منتقل کیا جائے، ورنہ چوہدری افشار کے لیے اسے وہاں بھی محفوظ کھانا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوتا۔ ماہ بانو کی تھانے سے رہائی کا کام بھی بہت رازداری سے ہونا چاہیے تھا۔ اس کام کے لیے سجاد رانا سب سے سوزوں تھا۔ وہ ایک فون کرتا تو اس ایچ او بے چوں و چرا نہ صرف ماہ بانو کو چھوڑ دیتا بلکہ اس بارے میں بھی زبان بند رکھتا کہ ماہ بانو کی رہائی کسی کے حکم پر عمل میں آئی ہے۔ عبداللہ ان سے متعلق تھانے کے بارے میں معلوم کرنے کے بعد شہر یار نے سجاد رانا کا نمبر وائل کیا۔ وہاں سے تین چار گھنٹوں کے بعد کال رسیڈ کی گئی۔

”اسلام ٹیکم سجاد بھائی! میں شہر یار بات کر رہا ہوں۔“ دوسری طرف سے سجاد رانا کی ”ہیلو“ سننے ہی شہر یار نے

جلدی سے کہا۔

”ہیلو اسلام! لیکن برادر عزیز۔ فون کرنے کے لیے یہ وقت کچھ مناسب نہیں؟ کہاں تو آپ دن کے وقت بھی یہ زحمت نہیں فرماتے، کہاں رات کے اس آخری پہر فون کھڑا دیا۔ بسٹلے میں شہر میں ہر وقت ہونے والے حادثات کی وجہ سے مشکل سے ہی سونا غیب ہوتا ہے۔ ویسے مجھے تمہارا فون کرنا بھی کچھ مشکوک لگ رہا ہے، سب خیر تھے تو ہے؟“ سجاد رانا شہر یار سے مرہمیں کافی برا تھا اور اس سے بہت محبت کرتا تھا، چنانچہ اپنی بے لگاہ محبت کی وجہ سے پہلے تو جرحی میں آ کر پوتا چلا گیا لیکن پھر اسے احساس ہوا کہ یوں رات کے اس شہر یار جیسے بندے کا فون بلا بھیجیں آسکتا۔ چنانچہ کوشش میں مبتلا ہو گیا۔

”جی ہاں سب خیر ہے۔ میں نے ایک اہم کام کے سلسلے میں آپ کو فون کیا ہے۔ لاہور کے ایک تھانے سے ماہ بانو نام کی لڑکی کو اتنی خاموشی سے چھڑا دیا ہے کہ کسی کو اس بات کا علم نہ ہو سکے کہ لڑکی کو کس نے چھڑا دیا اور وہ کہاں گئی۔“ شہر یار نے اچھا مدعا بیان کیا۔

”خیریت... کون ہے لڑکی اور جیسے اپنے علاقے میں بیٹھے بیٹھے لاہور کے کسی تھانے کا احوال کہاں سے معلوم ہوا؟“ سجاد رانا شہر یار کا مطالعہ کن کر چوٹا۔

”یہ ساری قصبات میں بتا دوں گا، مگر فی الحال لڑکی کی فوری رہائی ضروری ہے۔ آپ اسے رہا کر دیا کہ کسی محفوظ مقام پر منتقل کریں۔ میں اس دوران لڑکی کے لیے کسی دوسری جگہ کا انتظام کرتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے برادر! مجھے تھانے کے بارے میں بتاؤ، میں ابھی تمہارا کام کر رہا ہوں۔“ شہر یار کا جواب سن کر سجاد رانا نے اس سے پوچھا۔ شہر یار نے اسے تھانے کے بارے میں بتایا اور فون بند کر دیا۔ ”یہ کام تو ہو گیا۔ تم یہ بتاؤ کہ تمہارے پاس موتی والا کون نمبر ہے؟ میرے خیال میں اگر ہم موتی والا سے درخواست کریں تو وہاں ماہ بانو کو اپنے گھر میں بناوے سکتا ہے۔“ شہر یار کی بات پر کچھ کے بغیر عبداللہ ان نے اپنے بریف کیس میں سے ایک مٹی فون ڈائری نکالی اور اسے موتی والا کون نمبر نوٹ کر دیا۔ لگے عبداللہ ان پرورد کر سکیں کا ایک ایسا تربیت یافتہ شخص تھا جس نے رات کے اس پہر بہت اہم بھیجی میں ہونے کے باوجود اس بات کا خیال رکھا تھا کہ اپنا بریف کیس ساتھ لے کر نکلے۔ شہر یار نے کال پر موتی والا بھی حیران ہوا کہ اس وقت شہر یار نے یہی زحمت کی۔ شہر یار نے اسے زیادہ تفصیل میں کچھ بتانے کے

بجائے برادر راست ماہ بانو کو اپنے گھر میں بنا دیا، اہم کرنے کی بات کی۔ موتی والا بھی بغیر کسی تیل و جھجک کے فوراً راضی ہو گیا۔ شہر یار کے اگلے تین سے پچیس منٹ فون پر ادھر ادھر بات کرتے ہوئے ہی گزرے۔ کبھی وہ سجاد رانا سے بات کرتا اور کبھی موتی والا کو دایات دیتا۔ بالآخر جب اسے اطمینان ہو گیا کہ ماہ بانو تھانے سے موتی والا کے گھر پر خیریت منتقل ہو چکی ہے تو اسے سکون ملا اور وہ عبداللہ ان کی طرف متوجہ ہوا۔

”کچھ نہیں آ رہا کہ چوہدری افشار کو چاہیے کہ ماہ بانو کے لاہور والے دارالامان میں ہونے کی خبر مل گئی۔ ہم نے تو یہ سارا معاملہ بہت راز میں رکھا تھا۔“

”فی الحال کیا کیا جا سکتا ہے؟ ہمیں اس سلسلے میں تحقیق کرنی پڑے گی۔“ عبداللہ ان کے پاس بھی اس سوال کا جواب نہیں تھا۔

”کیس اس میں جی او کے نمائندے سے تو پتہ چری نہیں کر دی جس سے میں نے لاہور جا کر ماہ بانو کے کیس کے سلسلے میں ملاقات کی تھی؟ وہی ایک ایسا بندہ ہے جو ابھی اس کیس میں الزام ہوا ہے اور جسے معلوم ہے کہ ماہ بانو کہاں رکھا گیا ہے۔“ شہر یار نے اپنی سوچ کے ٹھوسے دوڑائے۔

”ذاتی طور پر تو مجھے اس پر شک نہیں لیکن کسی شخص کے بارے میں کوئی حتمی رائے دینا مشکل ہوتا ہے۔“ عبداللہ ان کا جواب بھی تھا۔

”چلو جو بھی معاملہ سے سامنے آجائے گا۔ فی الحال تو یہ اطمینان کافی ہے کہ ماہ بانو کو محفوظ مقام پر شفٹ کر دیا گیا ہے۔ تم اب جا کر آرام کرو۔ صبح دیکھیں گے کہ آگے کیا کرنا ہے۔“ شہر یار نے یک دم بات ختم کر دی تو عبداللہ ان بھی وہاں سے رخصت ہو گیا۔ چوہدری یار الیٹ اس کے جانے کے بعد بھی بہت دیر وہیں لاؤنچ میں بیٹھا غمزدگی سے اس معاملے کے بارے میں سوچتا رہا۔

☆☆☆

”یہ اچھا ہے، اہل سے یہ کہہ کر دی تھیں کہ ابھی نئے کو دل بھر کر نہیں دیکھا۔ کچھ دن اس کے ساتھ کارولن پھر چلی واپس آؤں گی... ادراپ یہ حال ہے کہ سارا وقت کتاب آکھوں کے سامنے رکھ کر اس میں کم بھی دیتی ہو۔ نئے کو تو دیکھنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔“ کٹھور صاحب عادت کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف کسی کو جورتے آ کر اسے ٹوکا۔

”نئے کے لیے کہنے کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں سارا وقت اس پر غور ہی کر رہی ہوں۔ کچھ بھی رہوں۔ ویسے آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں ابھی صوبہ آپ کے گھر سے

نئی آ رہی ہوں۔ وہ اور ان کے ولی عہد دونوں حے سے سو رہے ہیں۔ میں نے سوچا آپس دو ضرب کرنے کے بجائے تھوڑی دیر بیٹھ کر کچھ پڑھ دی لوں۔“ کٹھور نے مسکرا کر پڑی بہن کی بات کا جواب دیا۔ ویسے تاجور غلط نہیں کہہ رہی تھی، بچے کی پیدائش کے بعد جب صوبہ گاؤں واپس لوٹی تھی تو کٹھور بچے کے بہانے سے ہی اپنے سامنے کے گھر رک گئی تھی الیٹ اس رکنے کے بچے اس کے دل میں اصل خواہش ابھار گئی، وہ تو کسی کو نہیں معلوم تھا۔

”تو کتنی نہیں ہے کٹھور۔ سارا وقت ان کتابوں میں سر دے کر بیٹھے رہتے تو حیران نہیں ہرتا؟“ تاجور نے اس کے سامنے بیٹھے ہوئے کچھ حیرت سے پوچھا۔

”تھک تو میں اس زندگی سے بھی جاتی ہوں آپا۔ تو کیا سانس لینا چھوڑ دوں؟“ اس آپ یہ کچھ نہیں کہ یہ کتابیں بھی زندگی کی طرح کی کوئی چیز ہیں۔ جیسے اس ایک بھی زندگی میں بھی سوز اور چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں اس میں جی لگنے کا سامنا پیدا کر دیتی ہیں ویسے ہی ان کتابوں میں بھی بندے کو کچھ نہ کچھ ایسا مل جاتا ہے جو اس کا کئی اہمات نہیں ہونے دیتا۔“ کٹھور نے رمانیت سے بہن کی بات کا جواب دیا۔

”تو یہ اتنی بات بھی کتاب کی زبان میں کرتی ہے۔ کسی بھی بات کا آسان انھوں میں جواب نہیں دیا جاتا تھے۔“ تاجور نے ناک پر حلی تو کٹھور نے پڑی اور اس کی بولی۔

”آری بھی کتاب کی زبان میں بات نہیں کرتا، اصل میں کتاب آدمی کی زبان میں بات کرتی ہے۔“

”جی چھوڑو، کتاب کے قصے کو یہ بتاتے تھے معلوم ہوا کہ ابھی آج کل ایک جھسکا رہ جانے کے چکر میں ہیں۔“ تاجور نے بور ہو کر موضوع بدل دیا۔

”بھئی جیسے لوگوں کو شوق ہوتا ہے گاڑیوں کے نئے نئے ماڈل جمع کرنے کا، ویسے ہی ہمارے ابھی کو شوق ہے ہر تھوڑے عرصے بعد ایک نئے ماڈل کی عورت ان کے پاس آئے۔ اس بار تو انہوں نے کافی وقت کے لیے مارنڈ پہلی میں تو بڑے کم کم وقفے سے ان کی زندگی میں آئی تھیں۔“ تاجور کی دی ہوئی اطلاع پر کٹھور نے تیزی سے نمبر کیا۔

”تو بھی نہ کسی بات کو عجیب کی سے نہیں لیتے۔ اب بھی دیکھو، یہ بیک نہیں پوچھا کہ کون ہے وہ جس سے ابھی پیار کرنے کے چکر میں ہیں؟“ کٹھور کی بے نیازی پر تاجور نے غصیلی ظاہر کی۔

”بھئی، میں نے نہیں پوچھا تو آپ بتا دیں۔ ویسے بھی

بات کرنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ نبرہ کی اسپتال کا ہے اور وہاں کوئی ماہ بانو کو جاننے والا نہیں۔ لڑکی نے ان سے کہا کہ آپ مجھے وہ نمبر دے دیں۔ میں معلوم کرنے کی کوشش کروں گی کہ انہیں جو کچھ بتایا گیا ہے، وہ سچ ہے یا غلط۔ لڑکی نے ان خاتون پر یہ دیکھ بھی ڈالا کہ اس کا ایک کزن پولیس میں ایف جی سیڈ سے ہے اور وہ اپنے کزن کے ذریعے اس کال کے بارے میں مکمل تحقیقات کرنا چاہتی ہے۔ خاتون نے لڑکی کو نمبر دے دیا اور اب اس انتظار میں ہیں کہ ماہ بانو کی سنگتی جلد انہیں ماہ بانو کے بارے میں کوئی خبر دے گی لیکن رات دارالامان میں جو کچھ ہوا، اس کے بعد تو صاف ظاہر ہے کہ وہ لڑکی ماہ بانو کوئی دوست نہیں بلکہ چودھری افتخار کی کوئی آنکلا کا راجی جو بہت چالاکی سے ماہ بانو کے بارے میں ایک اہم سراغ حاصل کر کے لگی اور اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ہم سب ہی جانتے ہیں۔

عبداللہ ان کی حاصل کردہ معلومات بہت عجیب تھیں۔ وہ ایک تجربہ کار آدمی تھا جو وقت ضرورت اپنے تعلقات استعمال کرنا خوب جانتا تھا۔ رات اگر وہ ماہ بانو کو کھانے سے نکلوانا چاہتا تو خود بھی تھوڑے بہت ہاتھ پیر چلا کر کام کر سکتا تھا لیکن شہریاری اس یس میں ذاتی دیکھی محسوس کرتے ہوئے اس نے خود سے کوئی اقدام اٹھانے کے بجائے اسے اطلاع دینا مناسب سمجھا تھا اور جس طرح شہریار نے اس کی رات کے آٹھ پر بنا کوئی اعتراض کیے بغیر تیری سے ماہ بانو کے تحفظ کے لیے اقدامات کیے تھے، اس سے عبداللہ ان کو اپنے فیصلے کی درستگی کا بھی طرح اندازہ ہو گیا تھا۔

”یہ تو واقعی ماہ بانو سے بہت بڑی غلطی ہو گئی تھی۔ اگر دارالامان کا چوکیدار جرأت مندی سے کام نہ لیتا تو چودھری افتخار ماہ بانو کو وہاں سے انکار دوانے میں کامیاب ہو جاتا۔ تم نے بتایا تھا کہ اس چوکیدار کو گولیوں لگی ہیں۔ کیا خبر ہے اس چوکیدار کے بارے میں؟ اس کی حالت اب کیسی ہے؟“ عبداللہ ان کی بات پر تبصرہ کرتے ہوئے شہریار کو اچانک چوکیدار کے بارے میں خیال آیا تو اس نے اس کی بابت روایت کیا۔

”وہ بے چارہ تو صبح کے قریب چل رہا۔ اصل میں ایک گولی دل کے قریب لگی تھی۔ اس نے کام دکھایا اور اس کے علاوہ خون بھی بہت زیادہ بہہ گیا تھا اس لیے ڈاکٹر اسے بچانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔“ عبداللہ ان نے قدرے انسو سے جواب دیا۔

”کہتا ہے چوکیدار وہی تو نہیں تھا جس کے بارے میں تم

نے بتایا تھا کہ وہ مشاہیر خان کا دوست ہے۔“
”نہیں سر! یہ وہی تھا۔ مشاہیر خان خود بھی بہت بھادور اور وفادار آدمی ہے۔ اس کا دوست بھی اسی کی طرح جاہل ہوا۔“ عبداللہ ان نے شہریار کے انداز سے کی تصدیق کی۔
”یہ تو بہت بُرا ہوا۔ چودھری افتخار کی ہوس نے ایک بے گناہ کی جان سلے لی۔ چودھری افتخار کو پتا نہیں چاہیے عبداللہ ان! انہیں اس نقتے کو ختم کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ہو گا۔ تم موتی والا سے رابطہ کر کے معلوم کرو کہ جیل سے کفری کی ڈیجیو کیب کب ہو رہی ہے۔ اس کام میں شامل بندوں کو گرفتار کر کے ان سے چودھری افتخار کا نام اٹھانا ہے۔ چودھری کے جرائم تو جانے کتنے ہوں گے لیکن ہم کسی نہ کسی مقام پر تو اس کی پکڑ کریں تاکہ کچھ تو اس کی زور آوری کم ہو سکے۔“ چوکیدار کی ناحق موت نے شہریار کو بہت افسردہ کر دیا تھا، چنانچہ اس نے شد بے غم و غصے کی کیفیت میں عبداللہ ان کو تنہا کر دیا۔ عبداللہ ان نے اس کے حرا کی اس برہمی کو محسوس کیا اور مستعدی سے ”نہیں سر“ کہتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆
چودھری افتخار دھڑے دھڑھلہ بری طرح سچ و تاب کھارہا تھا۔ اس کے سامنے مذہب کوڑے بالے میں بہت نہیں تھی کہ اپنے جھگے ہوئے سر کو اٹھا کر چودھری کی طرف دیکھ سکے۔ خود چودھری بھی فی الحال بالے کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی حالت کسی چوت کھانے ہوئے سانب کی طرح ہو رہی تھی جس کا بس نہ چلتا تھا کہ کیا کرے۔ آخر فیصلے فٹلے وہ کلیں جاوے لیجئے تخت پر بیٹھا اور گاؤں سے لے لگا کر اپنے دائیں ہاتھ کو پھیلا دیا۔ پشت پر موجود حراج آتشلازم نے مستعدی سے ہتھ کی نے اس کے ہاتھ میں جمادی۔ چودھری افتخار نے پھکارنے کے انداز میں دو بار جھٹک کر لایا اور پھر ناک اور منہ سے دھواں خارج کرنے لگا۔ اس کی حالت کو دیکھ کر یہ کینا مشکل تھا کہ یہ سارا کارا دھواں ہٹے کے کش کے نتیجے میں خارج ہو رہا ہے یا پھر اس کے اندر کبھی غصے کی آگ نے اس دھواں کو اٹھا ہے۔

”کیسے نکل گی وہ تم لوگوں کے ہاتھ سے؟ تم اسے منڈے مل کر بھی ایک معمولی لڑکی کو اٹھا کر لانے میں ناکام رہے۔ اس کا گردنی کے لیے تم تو گولیوں پر اپنا روپا بنا لاتا ہوں؟“ آخر کار چودھری افتخار نے بالے کی طرف دیکھتے ہوئے غصہ ناک لہجے میں اس سے پوچھا۔
”ہم نے سب کام بزم سے طریقے سے کیا تھا سر! انون

نبرہ حاصل کر کے اس دارالامان کا پتا معلوم کرنے اور پھر لڑکی تک پہنچنے میں ہم سے کتنی کوئی چوک نہیں ہوئی تھی۔ بس وہاں میں اچانک وہ بندہ نہ جانے کہاں سے لپک پڑا۔ اس کے پاس راتفل تھی جس سے فائر کر کے اس نے وہ بندوں کو زخمی کر دیا۔ اس اچانک حملے سے ہم لوگ ہڑباز گئے اور پھر زخمی ساتھیوں کو لے کر فرار ہونا پڑا۔“ بالے نے اپنی مصافی پیش کی۔

”بہت شان دار! کیا مردانگی دکھائی تم لوگوں نے۔ ایک اکیلا آدمی راتفل لے کر آیا تو تم سے اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ میں پوچھتا ہوں اس کے پاس راتفل تھی تو تم کیا باتوں میں چڑیاں بکین کر گئے تھے۔ شہاد سے پاس اس اکیلے بندے سے مقابلہ کرنے کے لیے اسطرح تھی؟“ بالے کی وضاحت نے چودھری افتخار کو مزید چراغ باک کر دیا۔

”اکیلا بات نہیں ہے سر! ہم بھی اپنا اٹلنا ساتھ لے کر مجھے تھے لیکن بدقسمتی سے ہمیں انداز نہیں ہوا کہ گیت پر موجود چوکیدار کے علاوہ بھی وہاں کوئی مسلح بندہ موجود ہے۔ اس بندے نے سب سے پہلے ناک کر کا دے پر فائر کیا۔ قادر نے سی لڑکی کو اٹھا لیا ہوا تھا۔ گولی کھا کر وہ خود کو سنبھال نہیں سکا اور لڑکی اس کی گرفت سے آزاد ہو کر اندر کی طرف بھاگ گئی۔ ہم پر فائر کرنے والا بندہ غصہ پوزیشن میں تھا۔ ہم نہ سمجھتے، اس سے پہلے اس کے فائر نے سولائیں کو بھی نشانہ بنایا۔ ہم نے بھی جوابی فائر کیے لیکن اس بندے کا کچھ نہیں بڑا۔ غلطی کا تھا نہ دارالامان سے قریب ہی تھا۔ فائرنگ کی خبر سن کر وہاں سے فوراً ہی پارٹی فٹل نکلی تھی۔

ہمارے پاس موقع نہیں تھا کہ ہم اندر جا کر دوبارہ سے لڑکی کو پکڑنے کی کوشش کرتے۔ اس پکڑ میں ہم بھٹس بھی سکتے تھے۔ اپنے جھنڈے تو خیر میں پر دائیں بھی لیکن اس بات کا خیال تھا کہ ہمیں ہمارے پیچھے پولیس آپ تک نہ پہنچ جائے۔ ہم نے بھی بھڑکنا تھا کہ اپنے زخمی بندوں کو اٹھا کر بھاگ گئیں۔ راتفل والا بندہ الگ پیچھے رہا تھا۔ ہم وہاں سے نکلے گئے تو جوش میں آکر وہ اپنی پوزیشن سے نکل کر ہمارے پیچھے بھاگا۔ اس وقت میں نے اس کو نشانہ بنایا۔ اس بندے کے بارے میں اطلاع ملی ہے کہ وہ اسپتال میں مر گیا ہے۔“ بالے نے ایک بار پھر زور تفصیل سے سارا واقعہ بتاتے ہوئے اپنی مصافی پیش کرنے کی کوشش کی۔

”تو بس بندے پھڑکا کر خوش ہوتا رہا۔ اصل کام تم سے نہیں ہوتا ہے۔“ بالے کی سناپی تفصیل سے متاثر ہونے کے بجائے چودھری افتخار ہڈاؤں اس بار بالے نے چپ رہنا

مناسب سمجھا۔

”آگے کچھ معلوم کیا تو نہ۔۔۔ کڑی کے بارے میں کیا خبر ہے۔ کہاں ہے وہ؟“ چودھری نے خود ہی پوچھا۔
”میں نے دارالامان سے معلومات حاصل کی ہیں۔ لڑکی اب وہاں نہیں ہے۔ ملائے کے کھانے میں بھی اس واقعے کو غنڈا گردی کی ایک واردات قرار دے کر رپورٹ نکلی تھی ہے۔ رپورٹ میں خابر کیا گیا ہے کہ کچھ فٹلے سے دارالامان میں حمل کر وہاں سے عورتوں کو انکار کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دارالامان کے چوکیدار کی مداخلت کی وجہ سے انہیں ناکامی ہوئی۔ رپورٹ میں خاص طور پر ماہ بانو کا کوئی ذکر نہیں۔ مجھے ایک کانٹیل سے معلوم ہوا ہے کہ فائرنگ کے بعد کھانے کا ایس ایچ او پولیس پارٹی لے کر دارالامان گیا تھا اور وہاں میں اپنے ساتھ ایک لڑکی کو لے کر آیا تھا۔ اچھی دہ لڑکی سے پوچھنا چاہتا تھا کہ کہیں اوپر سے فون پر حکم دیا گیا کہ لڑکی کو پھینک دو۔ پھر بارہ سے کوئی بندہ آکر لڑکی کو اپنے ساتھ لے گیا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ لڑکی ماہ بانو ہی اور کھانے سے وہاں دارالامان آنے کے بجائے کسی دوسری جگہ جا ملی تھی۔ میں نے اس کانٹیل سے انہیں طرح سب معلوم کیا تھا لیکن اس کا کہنا ہے کہ اسے تو کیا خود ایس ایچ او صاحب کو بھی نہیں معلوم کہ لڑکی کو کہاں لے جایا گیا ہے۔“

”آخر ایسا کون بھر دینا ہو گیا ہے خباثت کی دھم کا؟ وہ یہاں سے بھاگ کر فیصل آباد کے بجائے لاہور کے ایک دارالامان میں چل گئی ہے۔ میں نے سنا تو جرات نہیں ہوئی بلکہ میں سوچا کہ کڑی ہوشیارگی اس لیے عقل مندی سے کام لیتے ہوئے فیصل آباد میں اپنے گھر کا رخ کرنے کے بجائے لاہور کے ایک دارالامان میں جا چکی لیکن جس طرح وہ کھانے سے غائب ہوئی ہے، اس سے تو گناہے کو کوئی فٹل والا بندہ اس کے پیچھے ہے اور اس کی مدد کر رہا ہے۔“ بالے کی بتائی ہوئی تفصیل سن کر چودھری افتخار نے پھر انداز میں تبصرہ کیا۔

”آپ بالکل فیک فرما رہے ہیں چودھری صاحب! مجھے تو لگتا ہے کہ آپ کا کوئی دشمن ہے جو اس لڑکی کا ساتھ دے رہا ہے۔“ بالے نے فوراً ہی چودھری افتخار کے خیال کی تائید کی۔ اس تائید کے پیچھے چودھری کی خوشامد کے علاوہ یہ سوچ بھی کارفرما تھی کہ چودھری کا دھیان اپنے کسی دشمن میں الجھ جائے تو وہ بالے اور اس کے ساتھیوں کی تامل کا کردار کی بھول جائے۔

”دارالامان سے کچھ معلوم ہوا کہ وہاں کس نے ماہ بانو کو گھوما یا تھا؟“ بالے کی توقع کے مطابق اب چودھری افتخار اسی لائن پر سوچ رہا تھا کہ ماہ بانو کے پیچھے اس کے کسی دشمن کا ہاتھ ہے اور اب وہ اس دشمن تک رسائی حاصل کرنے کے لیے بے چین تھا۔

”قائے میں دارالامان کی منتظر نے جو بیان دیا ہے، اس کے مطابق تو ماہ بانو خود سے وہاں آئی تھی۔ اس نے ظاہر کیا تھا کہ وہ اپنے گھر سے بھاگ بیوی ہے۔ جس کے ساتھ بھائی بھی، اس نے دھوکا دیا اور اب وہ اپنے گھر واپس نہیں جانا چاہتی اس لیے اسے دارالامان میں آگئی ہے۔“ بالے نے چودھری افتخار کو بتایا۔

”میرے خیال میں منظر ٹھیک کچھ دہری ہے۔ وہ لڑکی بڑی چالاک اور ذہین ہے۔ اس کے لیے اپنی مرضی کی بات بنانا کچھ مشکل نہیں۔“ چودھری افتخار کو وہ رات یاد آئی تھی جب ماہ بانو اپنے آپ پریمی کا تیل چمک کر اس کے روبرو کھڑی تھی۔ اس وقت چودھری افتخار اس کی تہی داری سے اتنا متاثر ہوا تھا کہ اس سے زبردستی کرنے کے بجائے اسے اپنی عزت بنانے پر مل گیا تھا لیکن اب اسے لگ رہا تھا کہ ماہ بانو نے چالاک کی اور مضبوط بندی سے کام لیا تھا اور اپنی چالاک کی سہارہ دہی کو بھی بے وقوف بنالکھتی تھی۔

”ٹھیک ہے تو جا۔ پر انھیں سنبھلی رکھنا۔ مجھے لگتا ہے کہ ماہ بانو کو ابھی حوران اور مصلح کی موت کی خبر نہیں ہوئی ہے۔ اپنے ان لاڈلے ماں بیوی کی جاہت میں وہ فیمل آباد ریلوے کی دو بارہ کوشش ضرور کرے گی، تم اس طرف اپنے بندے لگائے رکھنا تاکہ جیسے ہی کوئی ہٹک لے اسے پکڑ سکے۔ اور ہاں۔ یاد رکھنا اس بار کوئی ٹھٹکی نہیں ہونی چاہیے ورنہ میں تم سب کی کھال اوجھا دوں گا۔ مجھے ماہ بانو پر حال میں چاہیے۔“ چودھری افتخار نے بالے کو سکھ دیتے ہوئے ساتھ میں دھمکا بھی۔

”آپ فہم نہ کریں سرکار! اس داری ہم سے کوئی چوک نہیں ہوگی۔“ بالے نے چودھری افتخار کو یقین دلایا اور فی الحال اپنی ہیبت ہو جانے پر دل ہی دل میں شکر کرتا ہوا وہاں سے باہر نکل گیا۔ اس کے باہر نکلنے کے بعد چودھری نے اپنے پیچھے کمرے سے ملازم کو بھی ہاتھ سے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ ملازم باہر نکل گیا تو چودھری افتخار نے تخت پر لیٹ کے نیچے ہاتھ ڈال کر وہاں سے ایک لٹا ذرا بڑھایا۔ اس لٹا نے میں ماہ بانو کی وہ تصویر بھی جس میں وہ کالج یونیفارم میں ملبوس کالج کے لان میں کھڑی تھی۔ چودھری افتخار کچھ دیر تصویر کو دیکھتا رہا اور

پھر دانت کچکا کر بولا۔

”بتنا بھاگ سکتی ہے بھاگ کر دیکھ لے۔ آخر ایک دن تجھے میرے پاس آنا ہی ہوگا۔ چودھری افتخار اپنی پسند کی کسی چیز کو بھی اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔“ چودھری کی ہلچل اور غصے سے بے خبر ماہ بانو اپنی تصویر میں مسکراتی رہی مگر یہ مسکراہٹ اب صرف تصویر تک ہی محدود رہی تھی۔ وہ خود تو حالات کی زد میں آکر ابھر اُدھر دوڑتی پھر رہی تھی۔

☆☆☆☆

”یہ ان مشکوک ٹوڈرز کے نمبر ہیں تارڑ صاحب جن کے بارے میں مجھے اطلاع ملی ہے کہ آج رات ان کے دریلے غیر قانونی طور پر کچھ مال علاقے سے باہر لے جایا جائے گا۔“ اطلاع بہت قابل اعتماد رہی تھی۔ اس لیے مجھے کوئی شک تو نہیں ہے کہ جن نمبروں کے ٹوڈرز کی میں نے نشان دہی کی ہے، وہ غلط جہت ہوں گے لیکن احتیاطاً آپ اتنی سختی سے ناکابندی کیجیے گا کہ کوئی بھی گاڑی یا ٹوڈر وغیرہ بغیر چیکنگ کے سڑک سے نہیں گزر سکے۔ اپنے علاقے سے کسی بھی قسم کی غیر قانونی نقل و حمل کو روکنے کے لیے ہمیں بہت سختی سے اسٹیشن لینا ہوگا ورنہ جرائم پیشہ افراد کے حوصلے بڑھتے جائیں گے۔“

”میں سارا انتظام کر لوں گا سڑک میں خود اس سارے پراسس کی نگرانی کروں گا مگر آپ یہ بتائیں کہ کون سا مال لے جایا جا رہا ہے اور آپ کو کن ذرائع سے اطلاع ملی ہے؟“ منظم تارڑ نے شہریار کو پھر پھر قانون کی یقین دہانی کرواتے ہوئے تجسس سے پوچھا۔

”سوری تارڑ صاحب! اپنا سوس آف انڈر مشن تو میں آپ کو نہیں بتا سکتا۔ آپ جانتے ہیں کہ اس قسم کی تجزیہ کرنے والے شخص کے اپنے بھی کچھ تحفظات ہوتے ہیں۔ میں نے بھی اس شخص سے وعدہ کر رکھا ہے کہ میں اس کا نام ایک آؤٹ نہیں ہونے دوں گا۔ رہی یہ بات کہ کون کی چیز غیر قانونی طور پر علاقے سے باہر لے جانے کی کوشش کی جا رہی ہے تو یہ تو جب آپ ناکابندی کریں گے تو آپ کو خود بھی معلوم ہو جائے گا۔ آپ کے جھگے کے افراد اتنی اہمیت تو رکھتے ہیں تاکہ قانونی اور غیر قانونی نقل و حمل کے درمیان فرق کر سکیں؟“ شہریار نے کچھ بھی بتانے سے صاف انکار کرتے ہوئے آخر میں طرے سے سوال کیا۔

”اوکے سر! جو آپ مناسب سمجھیں۔ میں تو صرف اس لیے اسکل ہونے والے آٹم کے بارے میں جاننا چاہتا تھا کہ میرے لوگ ایک خاص حوالے کو ذہن میں رکھ کر چیکنگ کا

کام کریں لیکن اگر آپ کو ان کی ذہانت کا امتحان ہی لینا ضرور ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں اس حساب سے بھی سارا فیصلہ کر دے سکتا ہوں۔“ شہریار کا جواب منظم تارڑ کو برا لگا تھا لیکن عہدے کا پاس رکھتے ہوئے اس نے برداشت سے کام لیا اور غصے کے وجود پر اپنے لیے کوڑم ہی رکھا۔

”ڈس بیسٹ آف لک!“ شہریار کو بھی منظم تارڑ کی کیفیت کا اندازہ تھا لیکن وہ اس کے جذبات کو خاطر میں لانے بغیر اطمینان سے بولا۔ یہ جملہ اس بات کی بھی نشان دہی تھا کہ شہریار، منظم تارڑ کے ساتھ اپنی تکنیک عمل کر چکا ہے۔ منظم تارڑ نے بھی اس اشارے کو کچھ نہ لیا اور اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

”اوکے! میں جا کر اپنے جھگے کے لوگوں کو ہدایات دیتا ہوں۔ آئی ہوپ کہ میرا عمل آپ کو شکایت کا موقع نہیں دے گا اور کل صبح آپ کو مکمل رپورٹ مل جائے گی۔“ منظم تارڑ، شہریار کے دفتر سے رخصت ہو گیا۔ اس کے رخصت ہونے کے بعد شہریار نے عبدالمنان کو اندر بلا دیا۔

”کیا خیال ہے تمہارا۔ منظم تارڑ ٹھیک طرح سے کارروائی کرے گا؟“

”کچھ کہہ نہیں سکتا سر! منظم تارڑ کے چودھری افتخار سے قرعہ حرام تو ضرور چلے گا لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ اس معاملے میں چودھری افتخار کے ساتھ شریک ہے یا نہیں۔ عام طور پر اس قسم کے معاملات بڑے افسران کے بجائے نیچے ملے سے ہی طے کر لیے جاتے ہیں۔“ عبدالمنان نے شہریار کے سوال کا پختہ جواب دیا۔

”میرا بھی یہی خیال تھا اس لیے میں نے براہ راست منظم تارڑ سے اس کارروائی کے لیے بات کی ہے۔ احتیاطاً میں نے اس بات کی نشان دہی نہیں کی کہ ہم اس ناکابندی کے ذریعے کس چیز کو اسکل ہونے سے روکنا چاہتے ہیں۔ اس طرح اگر مجھے میں چودھری افتخار کا اگر کوئی تجربہ بھی تو وہ اس کارروائی کا مقصد بھی سمجھ سکے گا۔ ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہم سو فیصد رازداری کے ساتھ یہ کام نہیں کر سکتے۔ جگہ جگہ ناکابندی کرنے کے لیے ہمیں ہر حال میں پولیس کے جھگے سے مددینی ہوگی۔ پس یہ ہو سکتا ہے کہ میں غلط طور پر اس ساری کارروائی کو خود مانیتز کروں۔ اگر مجھے میں موجود کوئی کلیدی میگز مٹھنے پر مجرم پوچھی سے کام لینا چاہے تو اس کی اسی وقت پکڑ ہو سکے۔“

”یہ آئیڈیا اچھا ہے سر!“ عبدالمنان نے شہریار کے فیصلے کی تائید کی اور پھر بولا۔ ”میں آپ کے ساتھ رہوں گا سر!

آپ ہمارے آپ کس وقت تک گشت پر نکلے گا اور اسے کب سے میں اسی وقت آپ کی رہائش کا دور حاضر ہو جاؤں گا۔“ ”سوئی والا کی اطلاع کے مطابق ٹوڈرز آج رات کے بعد گزریں گے۔ میرا خیال ہے کہ ہم احتیاطاً آج رات سے پہلے ہی کل پڑیں تاکہ اگر ہم کچھ آگے پیچھے ہو بھی جائے تو ہم وہاں موجود ہوں۔“ شہریار نے جواب دیا تو عبدالمنان بولا۔

”اوکے سر! میں اسی حساب سے آپ کے پاس آ جاؤں گا۔“ اس کے بعد شہریار کا سارا دن دفتر میں ”موسل“ کے کاموں کو نھانے ہوئے گزرا۔ کام کے دوران اسے رات کو ہونے والی کارروائی کا خیال آتا تو سارے جسم میں سستی کی ایک لہری دوڑ جاتی۔ اندر تارڑ ایک ہمہ جہت طاقتور یہ خیال کہ وہ چودھری افتخار جیسے زور آور اور مطلق العنان شخص کو روک پانچانے جا رہا ہے، اسے بہت زیادہ ایکساٹسٹ میں مبتلا کر رہا تھا۔ شام کو دفتر سے اپنی رہائش کا دروازے کے بعد بھی اس کا ذہن اسی بات میں انکڑا رہا۔ اس نے ایک بار منظم تارڑ کو فون کر کے اس کے انتظامات کے بارے میں بھی معلومات حاصل کیں۔ رازداری کے خیال سے اس بات کا احترام کیا گیا تھا کہ پولیس فورس کے افراد اپنی اپنی جگہ تیار ہیں اور پھر رات کے ابتدائی حصے میں انہیں ایک ان مقامات پر پہنچ دیا جائے جہاں چیک پوسٹ بنانے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ منظم تارڑ نے شہریار کو یقین دہانی کروائی تھی کہ سارے کام اس کی ہدایات کے عین مطابق انجام دیے گئے ہیں۔ منظم تارڑ کی اس یقین دہانی کو سمجھتا شہریار کی مجبوری تھی۔ وہ جانتا تھا کہ عہدے کے حساب سے اسے ہی کی پوسٹ ہے شک بڑی ہے لیکن مطلع کی اصل نگرانی اس لیے اس کے ہاتھ میں ہی ہونی ہے۔ اس لیے وہ شخص ہوتا ہے جو مطلع کے سارے اہم معاملات کو دیکھ رہا ہوتا ہے اور اسٹینٹ کشر کا اپنے آفس سے باہر نکل کر ان معاملات میں دخل دینا اسے اپنے اختیارات میں دخل دینے کے برابر محسوس ہوتا ہے۔ شہریار کو منظم تارڑ کے اختیارات میں دخل اندازی کرنے کا کوئی شوق نہیں تھا لیکن وہ اس شخص پر سو فیصد اعتماد بھی نہیں کر سکتا تھا اس لیے آج کی کارروائی کو خود مانیتز کرنے کے لیے اچانک ان لوگوں کے سروں پر نکلنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

رات کا پکا پکا کھانا کھانے کے بعد اس نے اپنی تیاری شروع کر دی۔ اس وقت اس نے کوئی بہت باخلف لباس پہننے کے بجائے جینز اور ٹی شرٹ کا انتخاب کیا تھا۔ اس عام جینز اور ٹی شرٹ میں وہ بہت سمارت لگ رہا تھا۔ اس

سکتا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد انہیں اسکی آواز میں سنائی دیں جیسے کوئی بڑی گاڑی آ رہی ہو پھر انہوں نے اس گاڑی کی ٹیبل آئینس بھی دیکھ لیں۔ وہ ایک بڑا لوڈر تھا۔ شہر یار سمیت وہ سب سنبھل کر بیٹھ گئے۔ چیک پوسٹ پر آ کر لوڈر پولیس والوں کے اشارے پر برک گیا۔ لوڈر کو بڑی بڑی ترپالوں سے اس طرح گور کیا گیا تھا کہ باہر سے اس پر لدے ہوئے سامان کے بارے میں اندازہ قائم کرنا مشکل تھا۔ پولیس والے اس لوڈر کے گرد پھیل گئے۔ انہوں نے اسے چیک بھی کیا لیکن جس رخ سے انہوں نے ترپال بٹا کر لوڈر میں موجود سامان کا جائزہ لیا تھا شہر یار اور اس کے ساتھی اس کی مخالف سمت میں تھے لہذا انہیں اندازہ نہیں ہو سکا کہ لوڈر پر کیا سامان لوڈ ہے۔ پولیس والوں میں سے ایک نے لوڈر ڈرائیور سے اس کے کاغذات وغیرہ بھی لگا کر چیک کیے تھے۔ یہ ساری کارروائی مشکل سے پانچ منٹ میں انجام پائی اور پھر پولیس والوں نے اس کے کاغذات و گور کرتے ہوئے اس لوڈر کو آگے بڑھنے کی اجازت دے دی۔ لوڈر چیک پوسٹ سے آگے نکلا اور یہی وہ وقت تھا جب ایک پولیس والے کے ہاتھ میں موجود سرخ لائٹ کی تیز روشنی اس کی نمبر پلیٹ پر پڑی۔ شہر یار فوراً چوک اٹھا۔ یہ نمبر اس کے حافظے میں بہت اچھی طرح محفوظ تھا۔ موتی والا کی اطلاع کے مطابق اس لوڈر پر جنگل سے غیر قانونی طور پر کاٹے گئے درختوں کے سٹے موجود ہونے چاہیے تھے لیکن پولیس والوں نے نہایت آسانی سے اسے آگے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ یعنی شہر یار کا خدشہ درست تھا۔ اسے انتظام کے باوجود بھی بہت آرام سے جیتی نکلی ا مشکل کی جارہی تھی۔

”خان! گاڑی اس لوڈر کے پیچھے لو۔“ شہر یار نے مشاہیرم خان کو حکم دیا۔ دو تو سخت خری بیٹھا تھا، فوراً گاڑی اشارت کر کے سڑک پر ڈال دی۔ چیک پوسٹ پر ان کی گاڑی کو روکنے کا اشارہ کیا گیا۔ مشاہیرم خان نے گاڑی روکنے کے کے بجائے رفتار ڈرامک کی اور یہ آواز بلند گاڑی میں اسے ہی صاحب کی موجودگی کا اعلان کیا۔ اس احوال پر پولیس والے فوراً اُلٹ ہو گئے اور گاڑی کو آگے جانے کا راستہ دے دیا۔ مگر اس ذرا سی دیر کے فرق میں وہ مشکوک لوڈر کا آگے نکل چکا تھا۔ مشاہیرم خان نے اپنی گاڑی کی رفتار مزید تیز کر دی لیکن سڑک اتنی چوڑی نہیں تھی کہ وہ بین درمیان میں پہلے لوڈر کی سائیڈ میں سے اپنی گاڑی آگے نکال لے جاتا۔ مشاہیرم خان نے کئی بار انڈی کیشر دیا لیکن

لہاس نے اس کے درزشی جسم اور دراز قامت کو اور بھی نمایاں کر دیا تھا۔ لہاس کے ساتھ اس نے جو اضافی شے اپنے ساتھ لی تھی، وہ ایک جدید طرز کا پمپل تھا۔ یہ پمپل اس کی ذاتی ملکیت تھا جس کا اس کے پاس لائسنس بھی موجود تھا۔ عبداللہان اپنے کپے کے مطابق ٹھیک وقت پر پہنچ گیا۔ ڈرائیور کے طور پر تو مشاہیرم خان کے سوا کسی کے جانے کا سوال علیحدہ نہیں ہوتا تھا۔ اس کی کارکردگی شروع سے ہی قابل ستائش اور قابل اعتماد تھی۔ اس کے دوست کی ماہ بانو کے تحفظ کے لیے دی جانے والی قربانی نے شہر یار کے دل میں اس کی قدر و منزلت اور بھی بڑھا دی تھی۔ جس شخص کی بات کا پاس رکھنے کے لیے اس کا دوست جان سے گزر گیا تھا، خود اس شخص کے اپنے کردار پر تو کسی قسم کا شک کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ مشاہیرم خان کی معیت میں شہر یار اور عبداللہان مگر سے روانہ ہوئے۔ منصوبے کے مطابق چیک پوسٹس اس سڑک پر بنائی گئی تھیں جس پر سے ضلع سے باہر جانے والی ہر گاڑی کو اجالا کرنا پڑتا تھا۔ شہر یار کی ہدایت پر مشاہیرم خان نے جس چیک پوسٹ کی طرف گاڑی کا رخ کیا، اس کے بعد اس سڑک پر بس ایک ہی چیک پوسٹ رہ جاتی تھی۔ یہ آخری چیک پوسٹ اس جگہ قائم کی گئی تھی جہاں ضلع سے جانے والی سڑک کا اختتام ہو جاتا تھا اور مین ہائی وے شروع ہو جاتی تھی۔

”بس یہیں روک دو۔“ اپنی مطلوبہ چیک پوسٹ سے کافی فاصلے پر ہی شہر یار نے مشاہیرم خان کو حکم دیا تو اس نے گاڑی روک لی اور پھر شہر یار کے کہنے پر گاڑی کی لائینس بھی بند کر دیں۔ ترقیاتی کاموں کے اعتبار سے یہ علاقہ کافی پیچھے تھا اور ابھی تک وہ جنگ سے اسٹریٹ لائسنس کا بھی انتظام نہیں کیا گیا تھا اس لیے رات کے اس پیر ابھی خاصی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ شہر یار اور اس کے ساتھی اپنی گاڑی سمیت اس تاریکی کا حصہ بنے رہے۔ چیک پوسٹ پر الٹے روشنی کا انتظام نظر آرہا تھا۔ اس روشنی میں وہاں موجود پولیس والوں کی نفس و حرکت بھی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ بہت زیادہ مستعد نہیں تھے۔ اصل میں اس سڑک پر رات کے اس پہر گاڑیوں کا بہت ہی کم گزر ہوتا تھا اس لیے پولیس والوں کو بھی زیادہ سرگرمی دکھانے کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ شہر یار نے خود نوٹ کیا تھا کہ پانچ گھنٹے میں صرف ایک سوز کی پک اپ گزری تھی اور اس پک اپ کی پولیس والوں نے بہت اچھی طرح تلاشی لینے کے بعد اسے آگے جانے کی اجازت دی تھی۔ اس اعتبار سے ان کی کارکردگی کو ناقص قرار نہیں دیا جا

لوڈر ڈرائیور کے کان پر جوں تک نہ رہی۔ اب آخری چیک پوسٹ تک پہنچ گئی۔ شہر یار کو اپنی گاڑی کے بیک وپر میں بیچے سے آئی ایک پولیس بیپ صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ پولیس بیپ کسی کی مدد کے لیے آ رہی ہے، اس وقت شہر یار اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔ اسے تو اس بات پر بھی شک تھا کہ لوڈر کو چیک پوسٹ پر روکا جائے گا مگر اس کا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ چیک پوسٹ پر لوڈر کو روکنے کا اشارہ کیا گیا اور لوڈر ڈرائیور نے اس اشارے پر فوراً بریک لگا دیے۔ مشاہد خان نے اپنی گاڑی بالکل لوڈر کے قریب لے جا کر روکی۔ ان کے پیچھے آنے والی پولیس بھی رک گئی۔ شہر یار اور عبدالمنان اپنی گاڑی سے باہر نکلے تو انہوں نے اپنے پیچھے رکنے والی بیپ سے ایس پی منظم تارڑ کو لگتے ہوئے دیکھا۔ "سرا! آپ یہاں؟" شہر یار کو دیکھ کر منظم تارڑ نے حیرت کا اظہار کیا۔

"اس لوڈر کی چیکنگ کروائیں۔" منظم تارڑ کے حیرت بھرے سوال کا کوئی جواب دینے کے بجائے شہر یار نے اسے تنہا کر دیا۔

"میں اس لوڈر کے پیچھے ہی یہاں آیا ہوں۔ آج میں خود سارا وقت لشت پر رہا ہوں۔ ابھی کچھ چیک پوسٹ پر جب یہ لوڈر کھڑا تھا تو میں نے اس کی نمبر پلیٹ دیکھی تھی۔ میں کچھ فاصلے پر تھا، میری بیپ دیکھنے سے پہلے ہی یہ لوڈر آگے بڑھ گیا۔ پھر درمیان میں آپ کی گاڑی آ گئی۔ بہر حال، آپ مجھے ہیں کہ اس لوڈر پر کیا موجود ہے؟" منظم تارڑ نے شہر یار کو جلدی جلدی بتاتے ہوئے لوڈر پر پڑے ترپال پٹانے کا اشارہ کیا۔ فوراً ہی وہاں موجود افراد حرکت میں آ گئے۔ لوڈر پر سے ترپال ہٹ کر شہر یار کو حیرت کا شہید ہونے لگا۔ لوڈر پر صرف بھوسا لدا ہوا تھا۔

"اس بھوسے کو ہٹا کر دیکھیں۔" ایک امید کے سہارے شہر یار نے منظم تارڑ سے کہا۔ اس کے حکم کی تعمیل کی جانے لگی لیکن لوڈر پر واقعی صرف بھوسا ہی لدا ہوا تھا۔ چار انٹیں اس لوڈر کو آگے جانے کی اجازت دینی پڑی۔

"اس میں تو کچھ نہیں کھائے گا۔" منظم تارڑ نے شہر یار سے کہا۔ اس کا کچھ بہت عجیب و غریب بھی شہر یار کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ اس پر خطر کر رہا ہے۔

"مگر ہے دوسرے لوڈر پر ہماری مطلوب چیز موجود ہو اور اس لوڈر کو روکا دینے کے لیے مجھ سے بھر کر بھیجا گیا ہو۔ ہمیں دوسرے لوڈر کا انتظار کرنا ہو گا۔" شہر یار کی امید اب بھی برقرار تھی۔ اس امید کے سہارے وہ لوگ متحکک

انتظار کرتے رہے لیکن انتظار حاصل ثابت ہوا۔ "میرے خیال میں آپ کے خبر سے کوئی غلطی ہو سکتی ہے۔" منظم تارڑ جو سوشل شہر یار کے ساتھ ہی موجود ہوا تھا، خطر سے بولا۔ اس بار اس نے اپنے لہجے کے طنز کو چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ "شاید... ویسے یہ بھی ممکن ہے کہ میرے لیے مجری کرنے والے کے مقابلے میں مجرموں کے لیے مجری کرنے والے زیادہ مستعد ثابت ہوئے ہوں۔" شہر یار نے بھی ایک جوابی طنز کا تیر چلایا اور اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔ حقیقتاً اس ناکامی نے اسے کافی مایوس کیا تھا۔ اس ناکامی سے رات بھر کی بھاگ دوڑ کی محنت پر پانی پھرا تھا۔ وہ الگ، دوسری طرف چوہدری افتخار کے جرائم کو منظر عام پر لانے کا منصوبہ بھی خاک میں مل گیا تھا۔

☆☆☆

"اس اسے ہی کے بچے کو آخر کس نے اطلاع دی تھی ہمارے مال کی سپلائی کی؟ اور اطلاع بھی اتنی کچھ کر اسے ان لوڈرز کے نمبر تک منظم تھے جن پر مال جانا تھا۔" چوہدری افتخار بری طرح بیچ و تاب کھاتا تھا۔ اس کے سامنے بیٹھے اقبال باجوہ اور منظم تارڑ کے چہروں پر بھی گرمندی کے آثار تھے۔

"اس بات کی کوئی گمان نہ تو بہت ضروری ہے چوہدری صاحب... کیونکہ تجربہ جو بھی ہے وہ بہت قریبی بندہ ہے۔ مال کس سپلائی ہو رہا ہے اور کس نہیں، یہ بات تو عموماً میرے علم میں بھی نہیں ہوتی۔ میرے بندے جانے پہچانے خدو میں ڈرائیوروں کو دیکھ کر خودی انٹیں کھینچ کر دے دیتے ہیں۔ کل کی سپلائی کے بارے میں تو مجھے تو بھی نہیں معلوم تھا۔ مجھے اسے ہی صاحب نے بلا کر نہاندی کا حکم دیا، یہ بھی خودی طور پر میرے ذہن میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ وہ لوڈروں کی سپلائی کے معاملے سے واقف ہو گئے ہیں۔ وہ تو جب انہوں نے مجھے لوڈرز کے نمبرز نوٹ کروائے تو میرا دھیان گیا اور میں نے سوچا کہ احتیاطاً باجوہ صاحب سے منظم کرلوں۔ ان سے بات ہوئی تو منظم ہوا کہ ان نمبرز کے لوڈر پر تو سپلائی جانے والی ہے اور لوڈر پر بالکل تیار کھڑے ہیں۔ میں نے اور باجوہ صاحب نے مل کر صورت حال پر غور کیا۔ پہلے سوچا کہ جانے دیتے ہیں لوڈرز۔ چیکنگ ہوئی بھی تو چیک پوسٹ پر میرے اپنے ہی بندے ہوں گے لیکن پھر خیال آ پڑا کہ ہوسکتا ہے ان میں سے کوئی اسے ہی صاحب کا بھجرا ہو اور اسے کسی جاگر بکڑا ہو جائے۔ باجوہ صاحب نے انہیں میں سے ایک لوڈر

کو ان لوڈر کو روکا کہ اس پر بھوسے کی ڈھیریاں لوڈ کروائیں۔ دوسرا لوڈر ویسے ہی کھڑا رہے دیا کہ جویشن دیکھ کر اس کو ٹھیک کر کے۔ میں اس احتیاط نے ہی بچت کرادی۔ مجھے تو صرف مجری کا ذکر تھا، ابھی اسے ہی صاحب خود ہاتھ میں بیٹھے تھے۔ خود اپنے سامنے لوڈر چیک کر دیا۔ بھوسا دیکھ کر بڑے مایوس ہوئے پھر بھی متحکک رہے تو اس شک کے ساتھ کہ کسی نے مجری کر دی تھی اس لیے مال نہیں بکڑا گیا۔ میں نے بہت اگلائی کی کہ کوشش کی کہ کون سا مال اسکی ہونے والا تھا لیکن کچھ نہیں پایا مگر لوڈرز کے نمبرز کی وجہ سے ہم پر تو بات بالکل صاف ظاہر ہے کہ وہ جانتے تھے کہ یہاں سے کیا بھجرا جائے جانے والی ہے۔" منظم تارڑ نے تفصیل سے ساری صورت حال بیان کی۔ اس کے چہرے پر موجود گرمندی اس کے لہجے سے بھی ٹھیک رہی تھی۔

"میں نے اپنے بندوں کو ٹھٹھا باجوہ دیکھا ان بندوں میں سے تو کوئی اسے کچھ نہیں بن گیا؟" چوہدری افتخار نے روئے سخن اقبال باجوہ کی طرف کیا۔

"میرے بندے بہت اعتبار کے ہیں چوہدری صاحب! برسوں سے ہم انہی بندوں سے کام لے رہے ہیں۔ کبھی کسی کی طرف سے شکایت نہیں تھی۔ آپ تو مجھ سے زیادہ جانتے ہیں ان بندوں کے بارے میں... ان میں سے زیادہ تر آپ کے ہی تنگ غوار ہیں اور آپ کے تنگ غواروں کو میں نے جان سے گزرتے دیکھا ہے، تنگ حرای کرتے ہیں۔" اقبال باجوہ کے جواب پر چوہدری افتخار کے ہونٹوں پر غریبی مسکراہٹ پھیل گئی لیکن پھر وہ فوراً اسی عجیب و غریب لہجے میں بولا۔

"ٹھیک ہے ہمیں اپنے بندوں پر اعتبار ہے لیکن ہمیں نہ کہیں سے تو مجری ہوئی ہے۔ ہمارے درمیان کوئی تو کافی بھجرا موجود ہے۔ ہمیں اس کا بیجور کو احوط نہ ہے۔ ابھی تو گاڑی کی وجہ سے بچت ہو گئی لیکن ہوسکتا ہے آئندہ وہ اسے ہی گاڑی کو بھی ہوا نہ لگنے دے اور خود ہی اچھا کھارو والی کر ڈالے۔ تارڑ نے بتایا تو ہے کہ وہ شک ظاہر کر گیا ہے کہ کسی نے مجری کر دی اس وجہ سے مال نہیں بکڑا گیا۔"

"میرے ذہن میں ایک بندے کا نام آ رہا ہے چوہدری صاحب! میرا خیال بلکہ یقین ہے کہ یہ مجری اسی بندے نے کی ہے۔" اقبال باجوہ کا انداز سوچ تھا۔ "وہ کون؟" چوہدری افتخار نے بے یقینی سے پوچھا۔ "موتی والا۔" میرے اور آپ کے سوا جس تیرے

بندے کو ساری تفصیلات معلوم ہوئی ہیں، وہ موتی والا ہے۔ آپ اور میں تو مجری کرنے سے رہے اس لیے ایک موتی والا ہی رہ جاتا ہے جس کے بارے میں کہا جاسکے کہ وہ اسے ہی سے مل گیا ہے۔

"پراسے بھی کیا ضرورت ہے مجری کرنے کی؟ اور تو خود شریک ہے۔" چوہدری افتخار ہلکا ہلکا

"میرے خیال میں باجوہ صاحب کا اندازہ بالکل درست ہے چوہدری صاحب! ذرا سارے حالات پر غور تو کر کے دیکھیں۔ بیٹے کی موت کے بعد پہلے کبھی موتی والا آپ سے بالکل بدک گیا تھا۔ اس کے انداز سے لگا تھا کہ اب وہ آپ سے تعلقات رکھنا ہی نہیں چاہتا لیکن پھر ہمیں اس نے اپنا رویہ ٹھیک کر لیا تو ہم کچھ کہ صدے کا اثر کم ہو گیا ہے۔ اس لیے وہ دوبارہ دوسری طرف دھبنا دے رہا ہے، ہر بار کچھ میں آ رہا ہے کہ وہ سامنے بن کر آپ کا کہنا دے کے چکر میں تھا۔ ورنہ اسے برسوں سے کوئی دیکھنا نہیں رہی۔ میں یہ بات اسے وقت سے اس لیے بھی کہہ رہا ہوں کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ موتی والا بہت بڑی رقم کا کر بیٹے کے بارے میں ایک فلائی اسپتال کھولنے والا ہے۔ یہ ساری باتیں کوئی انکی نہیں ہیں۔ بہت بار دیکھنے میں آیا ہے کہ وہ لاڈ کی موت میں باپ کو بالکل بدل کر رکھ دیتی ہے۔ موتی والا کا بیٹا تو تھا ہی اگلا۔ اگلے بیٹے کے صدے سے اس کا دامناغ بالکل لٹ رہا ہوگا اور اس نے سوچا ہوگا کہ اب اس سارے مال و سوغات کا کیا کرنا ہے، جو مجھ سے وہ فلائی کا سون میں لگاے تاکہ بیٹے کے لیے ایصالِ ثواب کا بھی کچھ بندہ دست ہوا اور خرابانے دل کو بھی چین لے۔ لیکن ہے اپنے گناہوں کا کفار وادار کرنے کے لیے ہی اس نے یہ راہ بھی اوجھڑی ہو کہ وہ خوشی کی غیر قانونی سپلائی کو روکنے کا بندوبست کرے۔ اب اسے تو کوئی فکر نہیں ہے کہ آگے ہال بچوں کا مستقبل، لیکن ہے اس لیے وہ تو کچھ بھی کر سکتا ہے۔" اقبال باجوہ کی تائید کرتے ہوئے منظم تارڑ نے دلائل دیے۔

"یہ تو سوچو ہے کما کر بلی کے ج پر جانے کا معاملہ ہے چوہدری صاحب! آپ مائیں پاند مائیں لیکن مجھے تو کچھ یقین ہے کہ اس سب کے پیچھے موتی والا ہی ہے۔" اقبال باجوہ نے ایک بار پھر چوہدری افتخار کو قائل کرنے کی کوشش کی۔

"نہ ماننے والی بھلا کیا بات ہے؟ مجھے خود بھی اب یہی کچھ میں آ رہا ہے کہ اس معاملے کے پیچھے موتی والا ہی ہے۔" چوہدری افتخار پوری طرح قائل ہو چکا تھا۔ "میں اس معاملے میں اس لیے بھی شہر ہوں کہ موتی

والا کو اس سارے میٹ اپ میں میری انوائٹ کے بارے میں کیا معلوم نہیں ہے۔ وہ شک تو کر سکتا ہے کہ اس علاقے سے بالکل ہٹے ہوئے شاید میں کسی آپ لوگوں کے ساتھ ہوں گا لیکن یہی ڈائریکٹ ہماری اس حوالے سے کوئی بات نہیں ہوئی۔ اگر ایسا ہوتا تو اسے یہی صاحب مجھے رات ہونے والی کارروائی سے الگ رکھنے کا بندوبست کرتے۔ کچھ نہ کچھ شک تو انہیں اب بھی تھا اس لیے مجھے پورا معاملہ کھل کر نہیں بتایا لیکن شک کے بجائے اگر یقین ہوتا تو وہ کچھ اور ہی انتظام کرتے۔ چودھری افتخار کو کھل کر بتاتے دیکھ کر مطمئن ہونے والے اور دلیل دی۔

”اسے یہ بہت پر پھیلانے شروع کر دیے ہیں۔ پہلے اسکول والے معاملے میں مجھ سے اڑا اور اب اس دوسرے معاملے میں بھی اپنی ٹانگ اڑا رہا ہے۔ سوئی والا نے تجزیہ کی ہے تو ساتھ یہ بھی تو بتایا ہوا کہ میں بھی اس کام میں شریک ہوں۔“ چودھری کے لیے میں غصہ تھا۔

”تو پھر کوئی انتظام کریں نا اس اے سی کا چودھری صاحب... اگر یہ پیچھے ہٹ گیا تو ہم کہاں تک بچیں گے۔ ہر دفعہ ہمیں خربل جاتے یہ ضروری تو نہیں۔“ اقبال باجوہ نے چودھری افتخار کو اسکا۔

”اس اے سی کا انتظام کرنا آسان نہیں باجوہ صاحب... یہ آپ بھی کچھ سمجھ سکتے ہیں۔ اس سے پہلے ہم نے اپنے معاملات میں دخل اندازی کرنے والے جس اے سی کی تہذیب کو روکی تھی اس میں اور اسے یہ شہر یا ر عادل میں زمین آسان کا فرق ہے۔ وہ اے سی ٹھلک لایا تھا جس کا کوئی آکا بیچنا نہیں تھا۔ شہر یا ر عادل کے پیچھے تو سپورٹ کرنے والوں کی پوری فوج تھی ہے۔ ہاؤس اس کا ایم این اے، بزنس اس کا ڈی آئی بی، کرن کا سالار آئی بی اور اس کے علاوہ بھی جانتے کہاں کہاں اس کے خاندان کے افراد بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں جو اس کو اتار کر چار دیواریوں تو یہ بلا بھی نہیں ہے۔ ویسے بھی ابھی تک وہ کھل کر میرے سامنے نہیں آیا ہے۔ ہمیشہ بڑے اچھے طریقے سے ملتا ہے۔ ہو سکتا ہے، جو کچھ کر رہا ہے جانی کے جو جس میں کر رہا ہو اور اسے خیال بھی نہیں ہو کہ اس کے اندامات سے ہر اور راست مجھے نقصان پہنچ رہا ہے۔ لیاقت رانا صاحب میرے بڑے اچھے جانتے والوں میں ہیں۔ انہوں نے اپنے بھائی کو میرے بارے میں کچھ نہ کچھ سمجھا تھا کہ کچھ ہو گا۔“ چودھری افتخار شہر یا ر کے اندامات پر عارض ہونے کے باوجود ابھی ٹھوڑی بہت خوش تھی میں جلا تھا۔

”میرے خیال میں تو چودھری صاحب آپ کو راج صاحب سے بات کرنی چاہیے۔ اگر وہ اپنے بھائی کو کچھ سمجھاں بھول گئے ہیں تو اب سمجھا دیں گے۔“ اقبال باجوہ نے چودھری افتخار کو مشورہ دیا۔

”نہیں، ابھی اس کی ضرورت نہیں۔ ابھی معاملات اس حد تک نہیں آئے کہ میرے قابو سے باہر ہوں البتہ ہم ان ڈائریکٹ شہر یا ر عادل کو کھیل جانے اور ایک طرف ہو جانے کا بیٹھا دے سکتے ہیں۔ میرے ذہن میں ایک تدبیر ہے جس کے ذریعے ہم خود سے نجات دہانی کرنے والے کو سبق بھی سکھا دیں گے اور شہر یا ر کو بھی پیغام مل جائے گا کہ ہم سے پرکھ لیا ٹھیک نہیں۔“

”وہ کیا چودھری صاحب؟“ چودھری افتخار کے ذہنی انداز پر اقبال باجوہ اور مطمئن تر دونوں چمک اٹھے۔

”بس دیکھتے جاؤ۔ اب ابھی لاہور میں ہی ہے، وہ ہمارا کام کر دکھائے گا۔“ چودھری افتخار کی آنکھوں میں ابھی چمک تھی جو اپنے شہر پر کوئی چلانے سے پہلے کسی شکاری کی آنکھوں میں اترتی ہے۔



ماہ بانو ہسٹ پر لپٹی ہے جتنی سے کروٹیں بدل رہی تھی۔ چودھری افتخار کی نظروں میں آنے کے بعد سے اس کی زندگی سے سکون کی فینڈ خازن ہو چکی تھی۔ پہلے چودھری نے اپنی حوصلی میں اس پر دست درازی کی کوشش کی۔ قسمت سے اس رات وہ وہاں سے نکل بھاگے میں کا سب ہو چکی۔ اس کے بعد اس کا گاؤں میں جو ایک کنزراؤہ شہر یا ر عرف میں کنزرا کر کہیں چودھری اسے اس کے باپ کے گھر سے نالغوالے لیکن اس وقت چودھری کے اپنے معاملات میں الجھے ہونے کی وجہ سے خبر گزری۔ فیصل آباد لوٹ جانے کے بعد بھی ماہ بانو کو یہ اندیشہ رہتا تھا کہ چودھری کے ہاتھ وہاں بھی پہنچ سکتے ہیں۔ وہ نہرو کی شادی میں شرکت کے لیے گاؤں آنے سے بھی صرف چودھری کی وجہ سے ہی گریز اس کی کاس کی گاؤں میں موجود کی خبر وہاں سے چودھری کو اس کی یاد دلا دے گی اور اس کا یہ اندیشہ غلط ثابت نہیں ہوا تھا۔ چودھری نے اسے موقع دیکھتے ہی انھیں بلایا تھا۔ اگر اس روز ماہ بانو اپنی جان کی بازی نہ لگاتی تو چودھری کے بچوں سے بچ لگنا آسان نہیں تھا۔ چودھری کی خود سے شادی کی خواہش نے بھی ماہ بانو کو لڑا کر رکھ دیا تھا۔ ورثہ جو نوراں اور غیاث محمد کے نزدیک ان کی عزت میں اٹھانے کا باعث بن گیا، ماہ بانو کے لیے خود بھی کے حراف تھا۔ ماہ بانو کچھ کتنی تھی کہ چودھری

اس کے حصول کی شہد پر خواہش میں اس سے شادی پر راضی ہوا ہے۔ شادی ہو جانی اور ماہ بانو اسے حاصل ہو جانی تو پھر وہ اسے اپنی حوصلی کے کسی کو نہیں ڈال دیتا۔ چودھری کی اس ہوش کو سامنے میں ماہ بانو کے سارے خواب نمایاں ہو جاتے۔ چودھری کی بیوی بن کر نہ تو اس کے دل کو خوشی ملتی اور نہ ہی اس کی ڈائریکٹ پروری ہو پاتی۔

ماہ بانو نے اپنی زندگی کے لیے جو خواب دیکھے تھے اس میں ادھر عرصہ خاتم اور عیش چودھری کا تو کوئی گزری نہیں تھا۔ وہ تو ہمیشہ خود کو ایک لپڈی ڈائریکٹ کے روپ میں کسی پرے کھینچے اور نیک فطرت شخص کی معیت میں رہتی تھی۔ چنانچہ نہرو کا تھانوں ملنے ہی اس نے چودھری کی پہنچ سے نکل بھاگنے کی کوشش کی۔ قسمت سے اسے شہر یا ر کی مدد مل گئی اور وہ لاہور کے ایک دارالامان پہنچا دی گئی۔ خود کو دارالامان پہنچانے جانے کا فیصلہ کتنا درست تھا، اس کا اعزاز ماہ بانو کو اس رات ہوا تھا جب اسے دارالامان سے انخرا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ وہ لوگ جو اتنی دور لاہور کے ایک دارالامان میں پہنچ گئے تھے، ان کے لیے فیصل آباد پہنچنا کیا مشکل تھا۔ دارالامان میں تو جو کچھ یاد کی وجہ سے ماہ بانو کی بچت ہو گئی لیکن فیصل آباد میں اگر کسی صورت حال پیش آتی تو بے چارے حور اور مضطر کیا کر پاتے؟ ماہ بانو تو بیڑی آسانی سے دوبارہ چودھری کے چنگل میں جا پھنسی۔ اب بھی وہ اس خوف سے آزاد نہیں ہو چکی تھی۔ سوئی والا کے بڑے سے گھر کے آرام و بہتر پر لینے کے باوجود بھی اس سکون کی فینڈا ہی لیے نہیں آتی تھی کہ اسے ہر لمحے بھی دھڑکا رہتا تھا کہ جانتے کب چودھری کے بندے اس کے پیچھے یہاں پہنچ جائیں گے۔ آج رات بھی وہ اسی بے چینی کی وجہ سے نہیں سو پا رہی تھی۔ کروٹیں بدلتے ہوئے یک دم ہی اسے کسی غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔ اس احساس کا سبب نہ جاننے کے باوجود وہ بے چینی ہی ہو کر اپنے ہسٹ پر اٹھ بیٹھی۔ پھر کچھ اور کچھ نہیں آیا تو جا رہا اپنے گروپٹ کر باہر نکل آئی۔ سوئی والا اسے اپنی کونجی کے جس سے بھی ٹھہرا تھا، وہ کونجی کی آنکھیں تھیں۔ اس آنکھیں اور سوئی والا کے رہائشی حصے کے درمیان ایک خوب صورت سالان تھا۔ ماہ بانو آنکھیں سے نکل کر باہر لان میں آئی تو جا رہا اوڑھے ہوئے ہونے کے باوجود اسے ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ سردی کا موسم اپنے انتظام پر تھا لیکن رات کے اس پھر کھل میں ہونے کی وجہ سے کتنی محسوس ہو رہی تھی۔ ماہ بانو ایک منٹ تک اس علی فضا میں ساکت کھڑی رہی پھر یک دم ہی اسے انداز ہوا کہ اندر لینے لینے

اس نے کسی غیر معمولی پن کو محسوس کیا تھا۔ سوئی والا کی کونجی میں عین اٹھنے کے لیے تر بیت بانٹنے کے رات بھر کھڑے رہتے تھے۔ ٹھوڑی دیر پہلے ماہ بانو نے ان کوں کے بھونکنے کی معمولی سی آواز پر اپنی آنکھیں اور اس کے بعد یک دم ہی خاموشی چھا گئی تھی۔ کوں کا بھونکنا اور خاموشی رہا نہ دونوں ہی بانیں متنی غیر تھیں۔ سوئی والا کی بیوی نے ماہ بانو کے خوف کو دیکھتے ہوئے جہاں اسے ٹھہرا کوں کے حوالے سے سسکی دی تھی، وہاں کوں کی یہ خصوصیت کی تھی کہ یہ کتنے بھی بلا جواز نہیں بھونکتے۔ ماہ بانو نے ان چند دونوں میں سوئی والا کی بیوی کی بھی ہوئی بات کی صداقت کو یہ کہہ دیا تھا۔ کتنے واقعی اس عرصے میں ایک بار بھی نہیں بھونکے تھے۔ اپنی ٹھوڑی دیر کے بعد ماہ بانو نے جو ان کے بھونکنے کی آواز سنی وہ صرف کچھ بھر کے لیے تھی۔ اس کے بعد برا خاموشی چھا گئی تھی۔ اگر ماہ بانو جاگ نہ رہی ہوئی تو اسے توں کے بھونکنے کا کٹھن کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ اب بھی وہ فوری طور پر اٹھ نہیں پانے تھی لیکن اس کی پہلی حس نے غصے کا اظہار کیا تھا۔ اسے اندر اچھرنے والے لفظ سے اسے اس احساس کو وہ خود کو یہ سسکی دے کر بھلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ ہر سنا ہے کہ کوں کے بھونکنے کی آواز میں سے بھی وہ کبھی باہر سے گزرنے والے کسی آواز کے آواز ہو۔ اگر کوئی میں کسی غصہ ہوتا تو کتنے ذرا سا بھوک کر جب ہونے کے بجائے آسمان سر پر اٹھاتے لیکن اس دلیل کے باوجود اس کی تھیں نہیں ہو رہی تھی۔ آخر کار اس نے فیصلہ کیا کہ لان کا ایک پتھر کا کوں پر نظر ڈالے۔

وہ اپنے اس ارادے پر عمل کرنے کے لیے دبے پاؤں لان میں پہنچ گئی۔ لان میں کچھ تاریکی تھی۔ خود اس نے بھی آنکھیں کی لائیں روشن نہیں کی تھیں اس لیے اگر کوئی دور سے دیکھ بھی رہا ہوتا تو فوری طور پر اسے لان میں ماہ بانو کی موجودگی کا احساس نہیں ہو پاتا۔ جس قدم پہنے کے بعد ہی ماہ بانو کو ٹھنک کر رک جاتا پڑا۔ اس کے رنے کا سبب وہ بڑے بڑے سیاہ رنگ کے کتے تھے جن کو کچھ بار دیکھنے والا لازماً دہشت زدہ ہو جاتا لیکن ماہ بانو کے گھنے کا سبب کوں کی دہشت نہیں تھی۔ کوں سے آواز ان دونوں میں مانوس ہو چکی تھی۔ اس وقت وہ اس لیے کھنکھاتی تھی کہ اس نے دونوں کوں کو ایک دوسرے کے قریب لان کی گھاس پر گرا ہوا دیکھا تھا۔ ماہ بانو نے جب کہ ان دونوں کا جائزہ لیا۔ اسے ان کے وجود میں زندگی کی دھن محسوس نہیں ہوئی۔ کوں کے قریب ہی ماہ بانو کو گوشت کا ایک بڑا سا ٹکڑا ہوا تھا۔ ایک دم ہی سارا

معاہدہ ماہ بانو کی سمجھ میں آگیا۔ کسی نے سریع الاثر زہر ملا ہوا یہ گوشت کا ٹکڑا کونجی کے لان میں پھینک کر کتوں سے بچنے کا انتظام کیا تھا۔ تربیت یافتہ کتے کونجی کے قریب کسی کی موجودگی کو محسوس کر کے ذرا سا بھونکتے تھے لیکن بھر گوشت کے اس ٹکڑے نے ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کی تھی۔ گوشت کا یہ لالچ ان کی زندگی کا چراغ گل کر گیا تھا اور ساتھ ہی ان لوگوں کی زندگیوں بھی خطرے میں پڑ گئی تھیں جن کی حفاظت پر وہ مامور تھے۔ ماہ بانو کے علم میں یہ بات تھی کہ ان کتوں کے علاوہ کونجی کی حفاظت کے لیے صرف ایک بچہ کیدار اور تھا۔ باقی ملازمین رات گزار دیتے تھے کتوں کے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے تھے۔ صرف باورچی خانے کی ڈسٹ داری سنبھالنے والے ایک میاں بیوی تھے جن کا مستقل کونجی کے سرورٹ کوارٹر میں قیام تھا لیکن وہ بھی دو دنوں سے اپنے خاندان کی کسی شادی میں شرکت کے لیے چھٹی لے کر اپنے گاؤں گئے ہوئے تھے۔ ماہ بانو اندازہ کر سکتی تھی کہ جن لوگوں نے کتوں کو خاموش کیا ہے، وہ گیت پر موجود چوکیدار کونجی خاموش کر چکے ہوں گے۔ اب یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ خاموشی عارضی تھی یا

ابدی! ماہ بانو کا دل جا بجا کہ وہ پلٹ کر بھانتی ہوئی کونجی سے کہیں دور بھاگ جائے لیکن اس سے سرد سامانی کے عالم میں وہ بھاگ کر جانی بھی کہاں؟ اس کا ایک ہی چیم خانے میں رو گیا تھا۔ فی الحال وہ موتی والا کی بیوی کے فراہم کردہ کپڑوں پر گزارہ کر رہی تھی پھر اس اجنبی شہر میں اس کے پاس کوئی لٹکا بھی نہیں تھا۔ رات کے اس پہر وہ کونجی سے نکل کر باہر جاتی بھی تو جانے کس مصیبت میں پھنس جاتی۔ ایک دوسرا خیال اسے موتی والا اور اس کی بیوی کے بارے میں تھا۔ اسے یقین تھا کہ جو لوگ موتی والا کی کونجی میں داخل ہوئے ہیں، وہ اس کی تلاش میں آئے ہیں۔ وہ اپنی بیوی سے موتی والا اور اس کی بیوی کو مصیبت میں گرفتار چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتی تھی چنانچہ اس نے کونجی سے بھاگ نکلنے کا ارادہ ترک کیا اور کونجی کے اس مرکزی حصے کی طرف بڑھ گئی جہاں موتی والا اور اس کی بیوی رہائش پذیر تھے۔ انیسویں اس رہائشی حصے کے عقبی جانب تھی۔ ماہ بانو نے سامنے کے حصے میں جانے کے بجائے عقبی سمت موجود اس کھڑکی کا رخ کیا جس کے بارے میں اسے معلوم تھا کہ یہ موتی والا اور اس کی بیوی کے بیٹروم میں ملتی ہے۔ کھڑکی کے قریب جا کر ماہ بانو کو مایوسی ہوئی۔ کھڑکی بند تھی اور اندر سے اس کے گرد پردے لٹھے ہوئے تھے۔ مایوسی کے اس عالم میں وہ پلٹنے کا ارادہ کر رہی رہی تھی کہ اسے احساس ہوا کہ کھڑکی کی ایک جانب سے پردہ ڈرا سا ہٹا

ہوا ہے۔ ماہ بانو اس حصے پر اپنی ناک چپکا کر اندر کا منظر دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ کمرے میں روشنی ہو رہی تھی اور اس روشنی میں ماہ بانو بہت واضح طور پر اس شخص کو دیکھ سکتی تھی جو پارے انہماک سے کھلی جھوڑی میں سے زہر اور روپے سمیٹ کر اپنے بیگ میں بھر رہا تھا۔ اس شخص کی حرکت دیکھ کر ماہ بانو غصے میں پڑ گئی۔ اگر وہ ماہ بانو کی تلاش میں یہاں تک آنے والا چودھری افتخار کو کوئی بندہ تھا تو اسے مال سینے کے بجائے ماہ بانو کو تلاش کرنے کی کوشش کرنی چاہیے تھی لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ یہ شخص اکیلا لوٹ مار میں لگا ہو اور اس نے اپنے باقی ساتھیوں کو ماہ بانو کی تلاش پر مامور کر رکھا ہو اور وہ لوگ کونجی کے مختلف کمروں میں ماہ بانو کو تلاش کرتے پھر رہے ہوں۔ اس خیال نے ماہ بانو کی پرزورگی بڑھ کر بدلی تھی سنسنی سے سی روزا دی۔ اس نے ایک جھرجھری لے کر مال سینے میں مصروف شخص پر سے نظریں ہٹا کر موتی والا اور اس کی بیوی کو دیکھنے کی سعی کی لیکن وہ جس زاویے سے اندر جھانک رہی تھی اس زاویے سے اسے پورا کمرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کی نظریں حد بندی کے ایک حصے پر جا کر ختم ہو جاتی تھی اور وہاں اسے موتی والا اور اس کی بیوی کے وجود نظر نہیں آ رہے تھے لیکن پھر کچھ اور تھا جو اسے نظر آگیا۔ بیڈ کی چادر پر لٹھ بے لٹھ پھیلتا ہوا وہ دھبا قطعی طور پر سرخ رنگ کا تھا اور ایسی سرخی صرف انسانی خون کی ہی ہو سکتی تھی۔ وہ خون کس کا ہو سکتا تھا۔ یہ سمجھنے میں ماہ بانو کو ایک لمحہ بھی نہیں لگا۔ بیڈ کی چادر یقیناً ان دونوں کے خون سے ہی رنگی ہوئی تھی جو ہر رات اس بیڈ پر سو جاتے ہوئے تھے۔ آج شاید انکس اپنے ہی بستر پر ایسی خیند سلا دیا گیا تھا۔ اس منظر کو دیکھنے کے بعد ماہ بانو کے لیے مزید وہاں کھڑے رہنا ممکن نہیں تھا۔ وہ خیال جس نے تھوڑی دیر پہلے اس کے قدم کونجی سے باہر جانے سے روک لیے تھے، یک دم ہی اس کے ذہن سے نکل گیا تھا اور اب وہ ہر حال میں یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ اپنے نکل بھاگنے کی اس خواہش پر عمل کرنے کے لیے اس نے کھڑکی کے تختے پر چپکا پاؤں ہٹا کر پیسے ہی پلٹنا چاہا۔ کسی نے یک دم اس کے وجود کو مضبوطی سے اپنے بازوؤں میں دبوچ لیا۔ ماہ بانو نے اضطرابی طور پر چیخنے کی کوشش کی لیکن اسے دبوچنے والے نے اس کے کھلے ہوئے منہ پر ہاتھ رکھ کر اس کی کوشش کو ناکام بنادیا۔ وہاں پانی ماہ بانو ایک مضبوط مراد گرفت میں جکڑی سوائے پھرنے کے اور کیا کر سکتی تھی؟

حادثت و سانحہ کی شکل .. بنادہ کسی تلاش میں سرگرداں
ماہ بانو کی داستان حیات کی واقعتاً اگلی ماہ ۲۰۱۱ء

قدر کی سون گری قسمت کی چال بازی یا مقدر کا کھیل..... ملے اور بکھر جانے والوں کی کہانی

اسما قادری

گراب

چونکی قسط

پہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے لیکن اس کی باگ ڈور چبہ والا سماج کے روایتی نظام میں پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل گئے رہ جاتے ہیں۔ مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں۔ بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے اور یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہو رہی ہے۔ ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور حال کا سا ہے جہاں طاقندور مچھلی حال کو تو زکڑ اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے پھینسا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو محبت نہ تو روایتوں کو ساقطی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشیہ کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے یہ تو بس ہوجاتی ہے۔ دل طبقوں کی پیروا کرتا ہے اور یہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گبرنا پڑتا ہے، زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے ... سب تقسیم کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں ... کہیں بازی پلٹ بھی جاتی ہے گزرا وقت لوٹ تو نہیں سکتا سگی مقدر ساتھ دے جاتا ہے ... اس وقت ٹی پلوں کے نیچے سے بہت سے پانی بہہ چکا ہوتا ہے جرم، انفسر شایہ، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد کھوٹا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی سلسلہ در سلسلہ۔



ماہ بانو پر از اور نگاری قجی کر کسی طرح خود کو بکھڑے والے کی گرفت سے آزاد کرانے لیکن گرفت بہت مضبوط تھی۔ "شش... شورت مچھا... آرام سے رہو، میں تمہارا دشمن نہیں دوست ہوں۔" بچے سے اسے گرفت میں لینے والے شخص نے اس کے کان میں سرگوشی کی اور اپنا ہاتھ اس کے منہ پر سے ہٹایا۔ اس نے پلٹ کر خود کو بکھڑے والے کو دیکھا۔ تاریکی کے باوجود وہ اسے شناخت کرنے میں کامیاب ہوئی۔ وہ سونق والا کا ذرا بڑا بھائی تھا لیکن رات کے اس پہر اس کی یہاں کوئی میں موجود نہ تھی کی وجہ کچھ نہیں آ رہی تھی۔ "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" ماہ بانو نے دھیمی آواز

میں اس سے دریافت کیا۔

"یہ وقت سوال جواب کا نہیں۔ میں پہلے یہاں سے نکلے ہو گا۔" اس نے ماہ بانو کا ہاتھ تھامنا اور احتیاط سے آگے بڑھنے لگا۔ اس کا رخ بیرونی گیٹ کی جانب تھا۔ ماہ بانو کے حواس سونق والا کے بیڑوم کا منظر دیکھنے کے بعد ابھی تک غفلت تھے اس لیے وہ بنا کسی مزاحمت کے اس کے ساتھ بیڑوم کی باری لگی۔ اتنی ہی کوئی ہی اس وقت بھوکا مالہ غاری تھا۔ "جراں وقت کو بھی میں جیسے ہوئے لوٹ مار کر رہے تھے، وہ جگہ اندرونی حصے میں سرووف تھے۔ گیت پر چلے اور سو جو و تھیں۔ قحہ وہ دونوں ذیلی گیٹ سے گزر کر آرام سے بہرنگل گئے۔



اپنی ذاتی کاروباریاں موجود ہیں اس لیے یہاں دن کے
 کچھ ٹیپک فریڈرےٹ ممکن ہے۔ یہی حق ہے۔ رات کے اس
 پہرے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں کوئی سواری نہ جاؤں۔
 رواری کے لیے نہیں میں روزانہ جانا ہو گا۔ میں نے کوئی
 رکاشا یا کبھی مل جائے۔ چلتے چلتے اس نے باؤ کو کوٹھڑا
 دی ہے وہ کیا کر سکتی تھی۔ جب اس کے ساتھ بھی ہے کھانے
 پانی تو جس کی چیز ہی بھی کرتی تھی۔ اس کی رات کے
 باہر بھی میں موجود نہیں ہوتا تھا۔ اس نے باؤ کو جوتا
 ہے۔ کاپٹین تھا کہ وہ کبھی میں موجود افراد کے مقابلے
 اسے کم از کم وہی نقصان نہیں پہنچاے گا۔ وہاں جو لوگ مو
 تھے وہ بہت زیادتی کر رہے تھے۔ اور اسے یہ یقین تھا
 انہوں نے موتی کو مارا اور اس کی بیوی کو قتل کر دیا ہے۔ موتی
 کے بچہ روم میں موجود تھے جس طرح اس کی بھری ہے
 سسٹم پر تھا اور اس سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ ڈاکوؤں
 کو جو کچھ ملتا تھا اس سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ ڈاکوؤں
 کو جو کچھ ملتا تھا اس سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ ڈاکوؤں

واری کے انتظار میں ہی تو خواہر ہوا ہے۔" دو بجت میرا
ہو کر بیٹھ گیا۔ چار سے آٹھ بجے تک وہ چھپتے کھڑی ماہ بانو
کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ایک تیز سرگاہ اتر آتا ہوا
روانہ سے جگمگائی کے بغیر اس نے اپنی سبک پر بیٹھے بیٹھے ہی
بکھل کر گھسی کے دونوں تیز دور از روں کے ایک مول دیے۔
وہ دونوں عین میں بیٹھے گئے۔ عین کے اپنا سر شرر کر دے۔
دوران سر انہوں نے ایک دوسرے سے دُور سے دُور سے
خارنگ، اونٹوں کے دھن میں کئی سوالات کہنا، بے ہوشے مگر
بقیہ کو ایک طعنے کی تھک رہی ال ال خاصا۔ ابا جانے۔
"اب کس طرف لیتے؟" اس بڑے خاموشی کو ایک طعنے
وہ بچے کے جیسی آواز میں نے ہی تو ازاں وہان کے سٹوپر ملاتے
میں چلتی ہی تو وہ اب حتیٰ ممکن کی شان میں ہی تھا تھا
"اس میں آرا دو۔" اسے جواب دیا کہ کچھ نہیں، بھنے
چلتی ہی والے کو منہ دیا کہ یہ اپنے کے بعد وہ ایک بار
بھر پھول چل چرے۔ خراسی، سرور، ایک ملائے وہان کے کچھ
کرنگ اور چرچ گھوں والے ایک ملائے میں چل رہے
تھے۔ ان چرچ گھوں کے گزرتا ہوا، بانڈو کے لئے آریہ
تھیں۔ چھوٹے سے مکان کے سامنے رک کر۔ کھڑی کے اور ازاں

پڑ گئی، بجا کر دئی جانے والی جنگ کافی زوردار تھی مگر کسی اندر سے تسری و جنگ کے بعد دراصل ظاہر ہوا۔
 "اس وقت کون سے بھائی؟" غینہ میں ڈوبی سرخ اندازے سے زاری سے پوچھا۔
 "دروازہ کھول عامر ابیں سرخ ہوں۔" اس جواب پر فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔
 "تو اس وقت کیسے؟" سرخ خیر تو ہے؟" دروازہ کھولتے ہی عامر نام کے اس شخص نے اپنی تلویش کا کھنکھار شروع کر دیا لیکن پھر جیسے کھڑی ماہ بانو کو دیکھ کر اسے حیرت کا اتنا شدید ہلکا ہلکا کر دیا وہ سب کوئی سوال نہ کر سکا۔
 "پچھلے اندر آنے دے۔" بعد میں تیرے سوالوں کو جواب دوں گا۔" سرخ نے اسے ہاتھ سے پرے کر کے اپنے اوپر ماہ بانو کے اندر جانے کا راستہ بنایا۔ وہ چارہ حیران بریطان سادروازہ بند کرنے لگا۔ اتنی دیر میں سرخ ماہ بانو کو لے کر ایک جنگ لہا کر کے میں پہنچ چکا تھا عامر بھی وہیں آ گیا۔
 "کیا پتھر سے یاد آیا تو آج اپنی لیم پری کے بھائی کس کو ساتھ لے کر محسوس رہا ہے؟ کیا پڑی بدل ہی ہے؟" سرگوشی میں کیا گیا یہ سوال اس بچو نے سے سرخ نے سن کر وہ بانو کے کانوں میں بھی پائی۔ اندر ہی اندر غصت محسوس کر

کے بوجھ سے دو ایک من کی قیمت اس نے کچھت مان لی تھی۔
 ”اکیس کوئی، تیرہ نہیں ہے۔ چھری میری ابھی تھیں۔
 یہ بس ہیں کچھت کہ اس خیرتی پر راز ہے رہنے کی خواہش
 کے لیے ہر اچھا کر رہا ہے۔ اپنی عمر پر پی کو پاس کے
 ایک کوشش کرنے لگا تھا کچھن حالت کچھایتے ہو گئے کہ
 اپنے ساتھ کے کوجن پچے کے لیے ہی نہ پڑا رہا۔
 بے کے اسے کہا، ”خوب؟“ میرے گھر کا تو یہ معلوم
 لوں گی کہ آبادی کی ترقی ہو رہی ہو۔“ خیرنگ ہے۔ میری
 ٹیکس سوال کرنے کے لیے اسے خراب کر دیں گی اس لیے
 خیرے پاس آئیے کہ اسے اپنے گھر پر رکھے۔
 ”میں بہتر گھوں؟“ اس نے سچے لیے ہمارے
 ”کیسے کیا؟“ اس میری خاطر رکھ لے۔ میں پڑ
 اوس سے بول دینا کہ شے کی سمن سے لے تے تے اپنی
 کی خدمت کے لیے ہوا ہے۔ خالہ جی آتی جا رہی تھیں
 میری بات پر شے نہیں ہوگا۔
 ”اور اوس سے کیا جانے کہ گاہ؟“ وہ تو اسے میر
 شے کی جگہ نہیں، نے کی ”نہ تو کہنے والے اسٹور سے
 اسے خیرے سوال کی۔

”خالدی کو جو تیرا من کرے، دو دہائیات گھر کرنا دے۔“
میں مطمئن ہو کر تیرے لیے انیس بے وقف بنانا کوئی مشکل
نہیں۔ جاے تو میرا نام لے لیٹا۔ میرے پاس زیادہ وقت
نہیں۔ میں یہاں سے جا رہا ہوں۔ تخصیصات کل رخصتی وقت
میں مل جائیں گی۔ کھانا تو اس کے سونے والے کا انتظام کر
دے۔ دو گھنٹہ میں بولنا ہوا اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ حاصر
نے اسے روک کر ہتھ پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ دوڑ گئے پر تیار
نہیں ہوا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ حاصر کے ساتھ ساتھ ماہ
وہی بھاگتا کسی اسے جانتے ہوئے دھتکتی رہی۔

”لاہور سے ایک بڑی خبر ہے سر“ شہر پارٹی دفتر میں
 کے محمّدی ویر بعد ہی عبد المنان نے اسے مطلع کیا۔
 ”کیا خبر ہے؟“ اس نے عبد المنان کی سنجیدہ و اچھل کی
 قہ و دیکھتے ہوئے حتی الامکان خود کو پر سکون رکھتے ہوئے
 لاہور میں عبد المنان کے الفاظ نے اسے یہ حد تک تلبیش میں
 لگ کر دیا تھا۔ اس کے ذہن میں سب سے پہلا اندیشہ یہ ہوا تو
 حوالے سے ہی سرسرا اٹھا۔ وہ لاہور میں موقوفی والا کے گھر
 پر گزری تھی۔ ابھی پچھلے ہی وہ جوں ابے لاہور کے اس
 علاقے سے آغا کرنے کی کوشش کی تھی جہاں عبد المنان
 رہتے اس موقوفی کے ساتھ جو ابھا تھا کہ وہاں وہ اچھل محفوظ

رہے گی۔ وہ بانوی اعلیٰ علی غلغلی کی جہت سے کسی لیکن اس لحاظ
درازا لان میں اس کی سلسلہ خطرے میں نہ رہی تھی اس
مشاہیرم خان کا دو سہ اپنی جان کی بازی لگا کر اس کے جوانی
کو خوش کام نہ بناتا تو وہ پندرہری اختیار تک پہنچ چکی ہوتی۔
اب ایک باہر عمر عبداللہ ان اسے اطلاع دے رہا تھا کہ اس
سے کوئی بری خبر نہیں۔ اس بری خبر کا حقیق دہا بانو سے ہونے
کے بعد شے اسے بے چین کر دیا تھا۔

[illegible]

بطور خاص خواتین کیلئے

اب آپ کو بار بار تعزیرِ گم یاد کیلنگ کی ضرورت نہیں



[SHINE ON STRIPS]



After

چھپنے کے کل مہاسوں داغ جھون کو بھی دور کرتا ہے۔ چھپنے کیلئے قیمت 450 روپے اور جھون کے بالوں کیلئے قیمت 1350 روپے حاصل (اک نمبر 503 روپے علاوہ گھر بیٹنے ایک ناکہ گھر کی پارسل طلب فرمائیں)۔
E-MAIL کریں۔

fairy.perfumers@hotmail.com

بے اولاد خواتین سے خوشخبری

انکی خواہشیں اور سہاڑیں سے اور اسے کرم ہوں یا کسی دوجے اور پانچویں عیاری میں ہوں

2209 فیسٹری پرفیو مرس ہست بھس نمبر
74600 کراچی۔

سمجھا۔ ہم وہاں پہنچ کر صورت حال دیکھتے کے بعد ہی اس مسئلے میں کوئی اقدام کر سکتے ہیں۔ ممکن ہے ماہ بانو موٹی والا کے گھر پر موجود ہو اور اس نے پولیس کو وہاں اپنی موجودگی کے سلسلے میں کوئی بھی اطلاع دی ہو۔ بہر حال لاہور پہنچنے سے پہلے کوئی بھی اطلاع ملنے سے کرنا ممکن نہیں۔“ عبداللہ ان کا جواب دہنوگ تھا۔

”او کے اہم لاہور پہنچنے کی تیاری کرو۔ ہم نے ماہ بانو کو موٹی والا کے گھر پہنچا دیا تو بہر حال اس سے میرے فرما رہے تھے کہ اس موقع پر میرا وہاں پہنچنا ضروری ہے۔“ اس نے عبداللہ ان کو حکم دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ لوگ لاہور کے لیے روانہ ہو گئے۔ طویل راستہ بالکل خاموشی کے ساتھ گزرا۔ جس وقت وہ لوگ موٹی والا کی رہائش گاہ پر پہنچے، وہاں جنازوں کو روانہ کرنے کی تیاری کی جارہی تھی۔ انتظامات موٹی والا کے ایک کزن نے سنبھال رکھے تھے۔ موٹی والا کا شمار بڑے کاروباری افراد میں ہونے کی وجہ سے اس کی رہائش گاہ پر شہر کے تقریباً ہر قبیلے کے قبیلے سے ملنے والے افراد موجود تھے۔ بڑے بڑے گھرانے کے افراد کے علاوہ کئی محکموں کے اعلیٰ افسران اور سیاست دان بھی وہاں انصر آ رہے تھے۔ موٹی والا کے کزن سے تعزیت کرنے کے بعد شہر یار مختلف لوگوں سے ملتا رہا۔ اپنے ماموں لیاقت رانا اور کزن سجاد رانا سے بھی اس کی ملاقات ہوئی۔ چودھری افتخار بھی وہاں پر موجود تھا اور سب سے زیادہ سرگرم نظر آ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ جنازے کے انتظامات کرنے والا موٹی والا کا کزن سارے کام اسی کے مشورے پر کر رہا ہو۔ وہ بے چارہ ایسا یقیناً چودھری افتخار کے دہد ہے اور اس کے موٹی والا کے کاروباری شریک ہونے کی وجہ سے کر رہا تھا۔ شوہر یار نے ظاہر دوسرے لوگوں کے ساتھ مصروف تھا لیکن اس کی نظریں چودھری افتخار کا بھی جائزہ لے رہی تھیں۔ اسے اس کے چہرے پر چھانے افسردہ تاثرات بالکل معنی لگ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ چودھری افسردہ ہونے کی ادکاری کر رہا ہو۔ جنازہ روانہ ہوا تو بھی چودھری سی سی سے آگے آگے تھا مگر کی قریبی مسجد سے ملحقہ عیدگاہ میں نماز جنازہ کی اور اگلے کے بعد زیادہ تر افراد رخصت ہونے لگے۔ وہ سب مصروف ترین لوگ تھے جنہوں نے نماز جنازہ میں شرکت کا وقت بھی یقیناً بڑی مشکل سے نکالا تھا۔ مرنے والوں کی تدفین کے لیے قبرستان روانہ ہونے والوں میں موٹی والا کے قریبی عزیز، دوست اور چند ملازمین شامل تھے۔

بھائی! سجاد شہر یار سے ہاتھ ملا کر وہاں سے روانہ ہو رہا تھا۔ تب اس نے دیکھی آواز میں اس سے فرمائش کی۔

”کیوں؟“ سجاد نے پوچھا۔

”ابھی کچھ دیر قبل میں نے آپ کے ذریعے جس لڑکی کو جاننے سے چھڑا دیا تھا، وہ لڑکی موٹی والا کے گھر پر ہی رہتی ہوئی تھی۔ مجھے اس لڑکی کے بارے میں معلومات حاصل کرنی تھیں۔“ شہر یار نے آواز مزید دہرائی کرتے ہوئے بتایا۔ وہاں ارد گرد اور بھی لوگ موجود تھے اور وہ نہیں جانتا تھا کہ کسی اور کے کان میں جھنگ پڑے۔

”تم نے اس رات بھی مجھے اس لڑکی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ آخر کون سے وہ لڑکی جس کے لیے تم اسے پریشان ہو؟“ سجاد رانا نے پوچھا۔

”میں بعد میں آپ کو ساری تفصیلات بتا دوں گا۔ فی الحال یہ سمجھ لیں کہ وہ ایک معلوم لڑکی ہے جسے میری مدد کی ضرورت ہے۔ اس وقت بھی میں انکو انہی آفسر سے مل کر اس کے تحفظ کے بارے میں ہی یقین دلانی کرنا چاہتا ہوں۔ فی الحال تو مجھے یہ بھی نہیں معلوم ہو گا کہ وہ موٹی والا کے گھر پر موجود بھی ہے یا نہیں۔“

”او کے! میں انکو انہی آفسر کو آواز کر دوں گا۔ وہ تم سے ملاقات کر لے گا۔ تم ایسا کر کہ رانا ہاؤس پہنچ جائے، آفسر وہاں آکر تم سے ملاقات کر لے گا۔“ سجاد شہر یار نے اس کی فرمائش پوری کرنے کی عادت تھی۔ اس وقت بھی اس نے زیادہ بحث نہیں کی اور اس کا مطالبہ پورا کر دیا۔

”تھیک ہے سجاد بھائی۔“ شہر یار اس نے ایک نرم جوش مصافحہ کرتے ہوئے بولا اور اپنی گاڑی میں آکر بیٹھے کے بعد مشاہیر خان کو رانا ہاؤس پہنچنے کا حکم دیا۔ مہمانان اس کے ساتھ تھا۔ رانا ہاؤس میں سب معمول صرف اس کی مہمانی آفرین میں موجود تھیں۔ لیاقت رانا کی بیرونی سرگرمیاں اتنی زیادہ تھیں کہ وہ دن کی روشنی میں کبھی گھر پر واپس نہ آتے تھے۔ سجاد اپنے بیوی بچوں کے ساتھ الگ رہتا تھا اس لیے آفرین رانا کا بیشتر وقت گھر پر تھا ہی گزارتا تھا۔ بھی سجاد رانا لیاقت رانا کے ساتھ کسی گفتگو میں شرکت کرنے میں جاملتا نہیں لیکن مزاحیہ گفتگو پسند نہ ہونے کے باعث وہ عموماً گھر پر رہنے کو ہی ترجیح دیتے تھے۔

”بیوی نے یقینی ہوئی موٹی والا کی فیملی کے ساتھ۔ پہلے جوان بیٹا سجاد نے کا شکار ہو کر مر گیا اور اب دونوں بیٹیاں بیوی بھی مل ہو گئے۔ ذرا سے مرے بیٹے سارا خاندان ختم ہو گیا۔“ دو شہر یار سے حایہ دانی کو فکس کر لیتے۔

”ہاں، واقعی بات تو بڑی افسوسناک ہے۔“ اس نے قلمب دانی سے آفرین رانا کی بات کی تائید کی۔ اصل میں تو اس کا ذہن ماہ بانو میں اٹکا ہوا تھا۔ ابھی تک اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی کہ وہ کہاں سے اور کس حال میں ہے؟ موٹی والا کے گھر میں جو جہیز لگا ہوا تھا، اس جہیز میں وہ کسی سے ماہ بانو کی بہت در یافتہ نہیں کر سکتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہاں چودھری افتخار کے ساتھ اس کے کسی کارندے بھی موجود ہوں گے، اگر وہ لوگ اس کی یا عبداللہ ان کی کوئی غیر معمولی سرگرمی دیکھ لیتے تو ضرور پرکھ پڑتے۔

”تجربہ راز کا خیال ہے، فیملی اس واردات کے پیچھے کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ ہرے تو کہا جا رہا ہے کہ وہاں ڈاکا پڑا ہے اور ڈاکو بہت سارے جوان اور پور لوگوں کے ساتھ موٹی والا اور اس کی بیوی کو قتل کر گئے ہیں لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ معاملہ کوئی اور ہے۔ پہلے بیٹے کی حادثی موت اور اب دونوں بیٹیاں چھوٹی عمر کو پہنچنے والی واردات سے تو ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ کسی کی موٹی والا سے دشمنی تھی۔ ہو سکتا ہے خاندان کا کوئی فرد انکو ہلاک کر لوگ دولت حاصل کرنے کے لیے اس طرح کے جھگڑے استعمال کرتے ہیں۔“ آفرین رانا کو مشکل سے کوئی سامع دستیاب ہوتا تھا۔ یا شہر یار ہاتھ لگا تھا تو وہ دل کھول کر خیال آرائیاں کر رہی تھیں۔

”فی الحال تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ میں نے سجاد بھائی سے کہا تھا کہ اس کیس کے انکو انہی آفسر سے میری ملاقات کرادیں۔ تھوڑی دیر میں وہ آفسر یہاں آتا ہوگا۔“ شہر یار نے انھیں جواب دیا۔ اس کی پردوش کی زیادہ تر ذمہ داری انھوں نے ہی نبھانی تھی اس لیے وہ ان کا بہت ادب و لحاظ کرتا تھا۔ اس وقت بھی گفتگو کا موزن نہ ہونے کے باوجود وہ ان کے سوالوں کا جواب دے رہا تھا۔

”تم بھی تم اس آفسر سے ملاقات کے لیے یہاں رہ کرے ہو؟“ انھوں نے پوچھا۔

”جی ہاں۔ ملاقات کے فوراً بعد ہم لوگ فوراً اتار جائیں گے۔ اصل میں یہ تو میرا بالکل اعلیٰ و ذلت ہے ورنہ مجھے وہاں اتنے معاملات دیکھنے ہیں کہ فی الحال نہیں آنے پہنچنے کی فرصت نہیں۔ لیکن آپ فلن نہ کریں، میں کسی دن لیٹننٹ سے صرف آپ سے ملنے کے لیے لاہور آؤں گا۔“ شہر یار نے انھیں تسلی دی۔

”مجھے اس قسم کے وعدوں کی حقیقت بڑی اچھی طرح معلوم ہے۔ تجھارے ماموں کے ساتھ یہاں بڑوں کے زوارے ہیں مگر تم نے سجاد کی معصوفیت کا عالم بھی دیکھی رہتی ہوں۔ مجھے

علم ہے کہ ہمارے خاندان کے کسی مرد کے پاس گھر اور گھر والوں کے لیے وقت نہیں ہوتا۔ ان کے لیے میں شوق تھا مگر اس سے قبل کہ شہر یا انہیں کوئی تہی دیتا، وہ خود ہی بات بدلتے ہوئے کہیں۔ ”زرا چن کا پیکر لگا کر آئی ہوں۔ صابر سے کہا تو تھا کہ کھانا لگا دے۔ یہ پائیں وہ اب تک کیا کر رہا ہے؟“ وہ کمرے سے باہر چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد صابر کھانا کتنے کی اطلاع کے ساتھ وہاں آگیا۔ گیسٹ روم میں موجود عبدالمنان کو بھی ڈانٹتے ہوئے بلوایا گیا۔ مشاہیر خان کے کھانے کا انتظام صابر اور دیگر ملازمین کے ساتھ تھا۔ ان لوگوں کے کھانے سے فارغ ہونے کے تھوڑی دیر بعد ہی انکواری آفیسر پہنچ گیا۔

”میں ریفیٹنگ ہو رہی ہوں سر! موتی والا کیس کا انکواری آفیسر۔ وی آئی آئی میں صاحب کا حکم ملا تھا کہ آپ کیس کے سلسلے میں مجھ سے ذاتی طور پر ملاقات کرنا چاہتے ہیں، اس لیے میں کوئی فرصت میں رات باؤس پہنچ جاؤں۔ میں نے ان کے حکم کی تعمیل کی۔ اب آپ فرمائیے کہ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“ پولیس والوں کے عمومی تاثر کے برخلاف اس کی شخصیت میں نرمی اور جذبہ یکپارچگی تھی۔ وہ دروازہ کھلا، اسارت اور جوان العمر آدمی تھا جس کے صرف اچھے چھٹے اور بات کرنے کے انداز سے ہی شہر یار نے اس کے استعداد پر حیرت ہونے کا اندازہ لگا لیا تھا۔

”سب سے پہلے تو مجھے موتی والا کے کیس پر اب تک کی گئی تحقیقات کے بارے میں بتاؤ۔“ شہر یار نے اس سے کہا۔ اسے یقین تھا کہ ابتدائی تحقیقات میں ہی انکواری آفیسر کو ہوا تو کہے بارے میں ضرور کچھ نہ کچھ معلوم ہوا ہوگا۔ ”میں تقریباً آج رات کے وقت گیا۔ موتی والا کے بیڈ روم میں موجود تھی، موتی خالی جھری کو دیکھ کر بیٹھ گیا تھا۔ کھانا لگا دیا گیا۔ شاید موتی والا صاحب اور ان کی سسر نے ڈاکوؤں کے خلاف حراست کرنے کی کوشش کی ہو، اس لیے انہیں قتل کر دیا گیا۔ مگر مجھے اس تصویر پر بہت زیادہ یقین نہیں ہے۔ دونوں لائیں بند پر اس طرح پائی ہیں جیسے کسی نے سوتے میں ان پر وار کیا ہو۔ دونوں کے جسم پر چاقو کے کی وار کرنے کے بعد ان کے گتے کاٹ دیے گئے ہیں۔“ انکواری آفیسر کی اس بات پر شہر یار کے علاوہ ملاقات میں شریک عبدالمنان بھی چونک پڑا۔ قتل کا یہ انداز کچھ عرصے پہلے کیے جانے والے منصور اور حوران کے قتل سے مماثلت رکھتا تھا۔ ان دونوں کے چوتھے گتے محسوس کیے بغیر پیش کھوکھلے لپٹی بات جاری رہی۔

”میرا خیال ہے کہ اگر قتل کسی مزاحمت کی وجہ سے کیا گیا ہو تو لاٹھوں کو ستر کے بجائے چھ فرس پر یا جھری کے قریب لپٹا جانا چاہیے تھا۔ اگر قتل بلا جواز تھا تو اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ڈاکو تفرنا تھوڑے پندرہ اور باہر تھے جنہوں نے صرف تفرنا جھلس کے۔ موتی والا کا چوکیدار بھی اپنے سینک میں مردہ لپٹا گیا ہے۔ اسے گردن کی پٹی تو ڈکڑ کر لیا گیا۔ مگر ان پر باہر سے کوشش میں شامل سرنگ لاٹھ زبردستی وجہ سے مارے گئے۔ ایسا لگتا ہے کہ واردات بہت سوچ سمجھ کر اور منظم طریقے سے کی گئی ہے۔ آئے والے جرم ابھی طرح جانتے تھے کہ کوئی کی حفاظت کے لیے کیا انتظامات ہیں اسی لیے انہوں نے سب سے پہلے سینک کو ہلاک کرنے کا بندوبست کیا۔ آٹھ بجے ہتھیار استعمال نہ ہونے کی وجہ سے کسی قسم کا شور مچا بھی نہیں ہوا۔ میں نے کوئی شخص میں سے مختلف مقامات پر سے۔ خصوصاً موتی والا کے بیڈ روم سے فٹر پر نفس اٹھوا ہے۔ ممکن ہے اس سے میں کچھ مدد پاؤں۔ ویسے مجھے اس سلسلے میں زیادہ امید نہیں ہے۔ لوگ تو بہت منظم معلوم ہوتے ہیں اور اب عام سے عام جرم کو بھی اس بات کا شعور آچکا ہے کہ ہائے واردات پر اپنے فٹر پر نہیں چھوڑے۔“

”پولیس کو واردات کی اطلاع کس نے دی؟“ ریفیٹنگ کھوکھلے اب تک جو کچھ بتایا تھا، اس میں ماہ بانو کا نہیں ذکر نہیں تھا۔ شہر یار نے اسے حیرت سے دیکھا۔ ”وہ ان مانی نے دی تھی۔ وہ“ اطلاع وہاں کام کرنے والی مانی نے آتا ہے۔ وہ آتو اس صبح سات بجے سب سے پہلے ڈیوٹی پر آتا ہے۔ وہ آتو اس نے دیکھا کہ کوئی کا ڈیوٹی گت کھلا ہوا ہے۔ اسے کچھ تشویش ہوئی اور اس نے چوکیدار کے سینک میں جھانکا۔ وہاں اسے چوکیدار کی لاش نظر آئی تو وہ لڑنے لڑنے میں ہار گیا اور قریب کوشی کے چوکیدار کو مسمومیت حال بتائی۔ اس چوکیدار نے اپنے مالک کو بتایا اور انہوں نے پولیس اسٹیشن فون کر دیا۔ باقی دو لائیں پولیس نے خود دریافت کی ہیں۔“

”کیا کوئی میں چوکیدار کے علاوہ کوئی دوسرا مشتعل ملازم نہیں تھا؟“ ”نہیں۔ ڈرائیور اور مالی سمیت تمام ملازمین وراثت مبارک پر چھٹی دے دی جاتی تھی۔ صرف دو میاں بھائی مشتعل کوئی میں رہے تھے لیکن وہ پچھلی پر گئے ہوئے ہیں۔ میں نے ان کے پیچھے بندہ بھیجا ہے، وہ انہیں ان کے گاؤں سے آئے گا۔“ پچھلے طے پر ہم نے تمام ملازمین کو قتل میں شامل کر لیا ہے۔ عورت ایسی وارداتوں میں ملازمین کا شمولیت کا امکان ہوتا ہے۔ دھتے واروں میں سے کسی پر

لپٹے چٹک نہیں کیا جا سکتا کہ موتی والا کے قتل سے انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں ہی بیٹے کے مرنے کے فوراً بعد اس بات کا اعلان کر چکے تھے کہ انہوں نے اپنی کل جا خداداد اپنے بیٹے کے نام سے منسٹ قائم کرنے کے لیے وقف کر دی ہے۔ واردات کرنے والے کو موتی والا کے گھر سے زبردستی کیش کے سوا کچھ نہیں ملا ہوگا اور ظاہر ہے موتی والا بھی قتل منسٹ دہی نے تمام زبردستی کیش تو گھر پر رکھنے کی تلقین نہیں کی ہوگی۔ ان دونوں چیزوں کا بڑا حصہ تو بینک میں ہی محفوظ ہوگا۔“

”یعنی آپ کو شک ہے کہ یہ اصل میں ڈاکوئی کی واردات نہیں تھی بلکہ موتی والا اور ان کی سسر کے قتل کی واردات کو ڈاکوئی کی واردات کا روپ دینے کی کوشش کی گئی ہے؟“ شہر یار نے آفیسر کی بات چڑی۔

”جی ہاں۔“ آفیسر نے لچکاتے ہوئے اعتراف کیا۔ ”اس شب کی کوئی خاص وجہ؟ کیا آپ کے علم میں کوئی غیر معمولی بات آئی ہے؟“ شہر یار نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں سوال کیا۔

”جی ہاں۔ ملازمین سے ہمیں علم ہوا کہ موتی والا کی کوشی کی انٹیکس میں ایک مہمان لڑکی ٹھہری ہوئی تھی لیکن آپ اس لڑکی کا کچھ بات پائیں۔ دو گھنٹے سے غائب ہے۔ ملازمین اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے۔ انہیں صرف اتنا علم ہے کہ موتی والا صاحب خود اس لڑکی کو لے کر آئے تھے۔ ملازمین کے مختلف بیان کے مطابق لڑکی رات کو ان کے روانہ ہونے کے وقت تک انٹیکس میں موجود تھی لیکن صبح وہ کونہیں ملی۔ اب یہ نہیں معلوم کہ وہ لڑکی واردات میں ملوث تھی یا خوف زدہ ہو کر کوئی سے بھاگ گئی۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ ملازمین کی مدد سے لڑکی کا کچھ نوآکر اسے تلاش کرنے کی کوشش کی جائے۔“

”لیکن آپ اس کچھ کو کسی اخبار و غیرہ میں شائع مت کروائے گا۔“ شہر یار نے اسے سناہٹ سے اے نوکا اور پھر اس کی آنکھوں میں انہیں تیری کو کچھ وضاحت کے لیے بلا۔ ”میں آپ کو کچھ بچوانے سے اس لیے منع کر رہا ہوں کہ ہو سکتا ہے وہ لڑکی کیش چھپ جائے یا اگر وہ جرم نہیں تو خواتین جرموں کی نظر میں اگر کسی مشکلی میں پڑ جائے۔ جیسا کہ آپ نے بتایا ہے کہ موتی والا صاحب اسے خود اپنے ساتھ لے کر آئے تھے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ اسے جانتے تھے اور وہ ان کے لیے قابل اعتماد تھی تب ہی انہوں نے اسے اپنی کوشی میں رکھا ہو گا۔“

”میں آپ کی بات سمجھ گیا ہوں سر! میں لڑکی کا کچھ بچوانے سے گریز کر رہا ہوں۔“ ریفیٹنگ نے یقین دلایا۔ ”جنگ یو آفیر! میں جہاں تک آپ مجھے اس کیس کی انکواری سے باخبر رکھیں۔ اصل میں موتی والا صاحب سے میرے بچے انیت سے گفت سے ارادہ ایک اہم کیس کے سلسلے میں بری مدد دیکھ رہے تھے۔ اس لیے میں اس معاملے میں ذاتی طور پر دلچسپی لے رہا ہوں۔“ شہر یار نے اپنی بات کہہ کر یکدم ہی معاملے کے لیے اچھ بڑھا دیا۔ یہ ریفیٹنگ کھوکھلے کے لیے ملاقات نہ ہونے کا اشارہ تھا۔ وہ بے چارہ اگر کچھ بچنے کی خواہش بھی رکھتا تو بھی نہ پوچھتا اور اچھ ملا کر رخصت ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

سرمد کا دوسرے دن کی شاہر ہانے کے وجود کوئی اتنا چاہ نہیں تھا۔ حاصر نے اپنی ماں سے اوبانہ کو کا قریب سرمد کی کزن کی حیثیت سے کراتے ہوئے یہ کہا تھا تھا تھی کہ یہ سرمد کے مرحوم چچا کی بیٹی ہے آسٹریا سے چھ سہ ماہ سے کسی اپنے کے سہارے کا خاطر ہاں آئی تھی لیکن سرمد کی والدہ نے اس منقولہ لڑکی کو رکھنے سے صاف انکار کر دیا۔ مجبوراً سرمد اسے یہاں چھوڑ گیا کہ اسے رکھ لو۔ یہ گھر کے کام اور اماں کی خدمت کر دیا کہ اس کی سہاگت سے رہنے کا ٹھکانا بھی مل جائے گا۔ سرمد کی والدہ کچھ اپنی جھولی طراری اور تھوڑی سی وجہ سے ابھی خاصی مضطرب اس لیے حاصر کا یہاں چھل گیا۔ حاصر کی والدہ نے زہر ماہ بانو کو گتے لگا کر بلکہ ساتھ ہی حاصر کی یہ تجویز بھی قبول کر لی کہ وہ اسے مجھے داروں کے سامنے اپنی ازیزہ ظاہر کریں گی۔ ان کی طویل بیماری کے باعث لوگوں کے لیے یہاں قابل قبول لگے ہوئے۔ ماہ بانو نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کچھ فوٹو خود سرمد کی ڈسے داری سنبھال لی تھی۔ محبت کی توجہ سے خرم سرمد کافی اہتر حالت میں تھا ظاہر ہے، حاصر اپنی ملازمت کی ڈسے داروں کے ساتھ گھر کی دیکھ بھال کا کام مناسب طریقے سے نہیں کر پاتا تھا۔ اماں کی بڑھتی ہوئی حواس کا ضروریہ کے لیے ہی اپنے بہتر سے لڑکی تھیں۔ ماہ بانو نے گھر کی صفائی ستھرائی کے کھانا پکانے کے بعد انہیں لکھا یا تو وہ بہت دیر تک اسے دعا دیتی رہیں۔ ان کی ان محبت بھری دعاؤں کو سن کر اسے بے باک آگئی۔ دو گھنٹے اس کی چھوٹی چھوٹی خدمات ہر اسی طراری ہو کر دم میں دیتی تھیں۔ بہت دنوں بعد ایک چھوٹے سے گھر میں، ماہ بانو کی لڑکی کی طرح کام کاج کرتے اور کڑکڑ کی دنیا میں سینے

ہوئے اس کو اپنا فعل آباد والا گھر پر ہی طرح پاؤ تا رہا۔ وہ
 اچھی بجلی ایک سیدھی سادی زندگی گزار رہی تھی۔ اس زندگی
 میں وہ دھری انکار کیا آباد وہ ایک گرداب میں پھنسی چلی گئی۔
 اسے لگا تھا کہ اسے اس گرداب سے نکل کر دوبارہ اپنے گھر
 جا کر رہنا بھی نصیب نہیں ہوگا۔ کبھی گھر نہ تو نے کیا یہ خیال
 بہت دشت تک اور اسرہ کر دینے والا تھا۔ اس قدر ہی
 اور دشت میں اس وقت مزید اضافہ ہو گیا جب عامر شام کا
 اخبار لے کر گھر آیا۔ اخبار میں موتی والا اور اس کی بیگم کے
 کی خبر بھی تھی۔ اس خبر کو پڑھا کہ وہ بہت دیر تک روتی رہی۔
 ان لوگوں نے اسے پتا وہی تھی، خصوصاً موتی والا کی بیوی کا
 رویہ اس کے ساتھ بہت مہربان تھا مگر اب وہ دونوں کی کر
 دیے گئے تھے۔ اخباری اطلاع کے مطابق موتی کی وادرات
 دراصل ڈاکوئی کی وادرات کے ساتھ چڑی ہوئی تھی لیکن
 جانے کیوں اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ چھپ چھپ کر روتے
 اور گھر کے چھوٹے موٹے کام نہ مٹاتے ہوئے شام کا وقت گزر
 گیا۔ رات کے تقریباً دو بجے سرہ وہاں پہنچا۔ وہ بہت تھکا
 ہوا اور پریشان لگ رہا تھا۔
 ”اب جلدی سے مجھے بتا دے کہ یہ سارا پتھر کیا ہے؟“
 میں پورا دن پریشان رہا ہوں۔ لڑکی سے کوئی سوال کرنا اس
 لیے مناسب نہیں سمجھا کہ میرے چھوڑ کرنے پر ہی کسی لیکن میں
 اسے یہاں پتا وہ پکا ہوں اور اس کی پتا تو زمین کو دباؤ میں لینا
 مجھے گوارا نہیں تھا۔ ”عامر نے فوراً ہی اسے گھر لیا۔ وہ جو کچھ
 میں تھی، خود بھی بیٹھ کر آگئی تاکہ اپنے ذہن میں موجود
 بہت سے سوالوں کے جواب حاصل کر سکے۔
 ”مجھے حیرتی پریشانی کا خیال تھا یا۔۔۔ اسی لیے شنبہ پہ
 حصن کے باوجود گھر جانے کے بجائے حیرے پاس آیا
 ہوں۔ سارا دن گاڑی دوڑا دوڑا کر کام نہ مٹانے کے ساتھ
 ساتھ پولیس والوں کو بھی بھگایا ہے۔ ان کا سارا ڈر مغریوں
 پر ہی چلتا ہے اس لیے ہم سارے ملازمین کو گھیر کر بیٹھے رہے
 کسی طرح بچو بگھوائیں۔ شاکر اور اس کی بیوی کو تو شادی
 والے گھر سے واپس بلایا کہ کہیں وہ لوگ ڈاکوؤں کو ساری
 خبری کرنے کے بعد شادی میں شرکت کے یہاں سے
 تو منتر سے نہیں ہٹ گئے۔ ایک گھر انہیں مہمان لڑکی کی طرف
 سے بھی بھی کر دو کیسے اور کہاں تک اب ہوگی؟ میرا اندر سے
 گھبراہٹ کے مارے کیا حال تھا، میں تا نہیں سکتا۔ بس
 بہت کر کے سب کے ساتھ جی پوتا رہا کہ مجھے نہیں معلوم۔
 اگر پولیس والوں کو یہ پتا چلا کہ لڑکی کو میں نے وہاں سے نکالا
 ہے تو وہ ڈاکے اور مل کا ٹھکانہ بھی مجھ پر ہی کرتے۔“

”تھک تو انہیں کرنا ہی چاہیے تھا۔ میں خود پریشان
 ہوں کہ تو ڈاکے کے وقت وہاں کوئی میں کیا کر رہا تھا جبکہ
 حیرتی ذہنی تو تو ٹھیک سیارہ بیگے ختم ہو جاتی ہے۔“ سرہ کی
 پریشانی کے جواب میں عامر نے اس سے پوچھا۔
 ”تو تو جانتا ہے یا میرے اور نیکم کے معاملے کے
 بارے میں۔۔۔ میں کتنی بار اس کے گھر رشتہ بھجوا چکا ہوں۔ ہر
 بار دوسرے انکار ہو جاتا ہے۔ میری نیکم سے بات ہوئی تو
 اس نے کہا تم یہ ذرا بھاری کا کام چھوڑ کر کوئی دوسرا عزت والا
 کام کرو تو میں اپنے گھر والوں کو منانے کی کوشش کروں گی۔
 اب عزت والے کام کے لیے آبی کے پاس یا تو تعلیم ہو
 چھا۔ وقت پر تعلیم حاصل کی ہوئی تو یہ ذرا بھاری کا کام ہی
 کیوں کر پڑتا اور جیسا ہماری سات نسلوں میں سے بھی کبھی
 کسی کے پاس نہیں رہا تو میرے پاس کہاں سے آتا؟ لیکن
 میں نیکم کو بھی نہیں سوچتا تھا۔ میرے ذہن نے مجھے راستہ
 دکھایا کہ کہیں سے اتنا جیسا حاصل کروں کہ اپنا کوئی ذاتی
 کارہ بار کر سکوں۔ موتی والا صاحب کے ہاں ملازمت کرتے
 ہوئے مجھے چار یا ساٹھ سال ہو چکے ہیں۔ مجھے ان کے بارے
 میں بہت سی باتوں کا علم ہے۔ گھر میں حفاظت کا کیا انتظام
 ہے اور وہ پتا زور و غیر وہاں رکھا جاتا ہے۔ سب کچھ طرہ تھا
 بس پھر میں نے منصوبہ بنایا کہ ان کی تجویز میں نقب لگائی
 جائے۔ شاکر اور اس کی بیوی کے چھپنے پر جانے سے مجھے
 اپنے منصوبے پر عمل کرنے میں اور بھی سمجھتا ہو گئی۔ اپنے
 ملے کر وہ منصوبے کے مطابق اس روز میں ذہنی ہا کر ختم
 ہونے کے بعد کوئی سے روانہ ہونے کے بجائے شاکر کے
 کوارٹر میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ کہیں تو مضمون ہی ہے کہ میں نے
 ایک زمانے میں اپنے ایک دو عاشق پاپ کے دوست سے
 تری مدد سے تالا وغیرہ چھوٹا سیکھ لیا تھا۔ اس نے سنے میری
 مدد کی۔ میں شاکر کے کوارٹر کا تالا تو کھول کر آرام سے اندر چلا
 گیا۔ مجھے امید تھی کہ اسی من کے سہارے میں کوئی کے
 اندر وہی جسے میں بھی کھس جاؤں گا اور تجویز بھی کھول لوں
 گا۔ تجویز سے نکلا ہوا میں شاکر کے کوارٹر میں کتنے چھپا
 دیتا اور بعد میں مناسب وقت پر نکال لیتا۔ سیکھ صاحب اور
 ان کی بیگم کو وادرات سے پہلے سے ہوتی کرنے کے لیے میں
 نے سبے ہوشی کی دوا ایک اپر سے گھن میں بھری تھی۔ چوری
 کے بعد میں رات کا باقی حصہ آرام سے شاکر کے کوارٹر میں
 چھپ کر گزارا اور صبح معمول کے مطابق ذہنی پر حاضر ہو
 جاتا۔ کیٹ پڑھتی دینے والا چوکیدار زبادہ مستعد تھا اس
 لیے مجھے یقین تھا کہ وہ میرے رات کو کوئی سے نہ جانے اور

صبح اندر ہی نظر آنے پر کوئی کوشش نہیں لے گا بلکہ اسے یہی
 خیال گزرے گا کہ میری آمد و رفت ان اوقات میں ہوتی ہے
 جب وہ کیٹ سے غائب تھا۔ میں اپنی طرف سے اپنے اس
 منصوبے کو بالکل مکمل بھر رہا تھا۔ پہلے مرٹے کی کامیابی نے
 میرے اس یقین کو اور مضبوط کر دیا تھا لیکن پھر جب کچھ حالت
 ہوتا چلا گیا۔ میں آدمی رات کے بعد جب شاکر کے کوارٹر
 سے نکلا تو میں اسی وقت کسی نے باہر سے گوشت کے ٹکڑے
 کوئی کے کلاں میں اچھا لے دیے۔ کتے جو آہٹ پر چونک گئے
 تھے، وہ گوشت کے ٹکڑوں کی طرف لپے اور بے تابی سے
 اسے اپنے انٹوں سے نوچنے لگے۔ میرے لیے یہ ستر حیرت
 انگیز تھا کہ کونسی میری معلومات کے مطابق کتے تربیت یافتہ تھے
 اور مخصوص خوراک کے علاوہ کچھ بھی نہیں کھاتے تھے مگر باہر
 سے چھینے جانے والے گوشت کے لیے ان کی بے تابی پڑتی
 تھی۔ شاید اس گوشت میں کوئی ایسی خوشبو شامل تھی تھی جو
 کتوں کو مرغوب تھی۔ بے چارے کتے اس گوشت کا ذرا سا
 حصہ کھا کر ہی گر پڑے۔ میں نے اندازہ کر لیا کہ باہر سے کوئی
 کوئی میں نقب لگانے کی کوشش کر رہا ہے اور اس نے سب
 سے پہلے گھرائی پر مامور کتوں کا بندہ دست کیا ہے۔ نقب تو میں
 ہی لگنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن کتے مجھ سے مانوس تھے اس
 لیے مجھے ان کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ کتوں کے مرتے
 ہی میں کوئی کے گیت کی طرف بھاگا۔ چوکیدار حسب معمول
 کیٹ سے غائب تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ایک ٹکٹ ٹکٹ
 ہوش کیٹ جھانک کر اندر آیا اور اس نے ذہنی کیٹ کھول دیا۔
 حیرت میں اور نقب پوش اندر مٹھ آئے۔ ان میں سے وہ
 چوکیدار کے کہیں کی طرف چلے گئے اور ایک نے کوئی کی
 مرکزی عمارت کے دروازے پر پہنچ کر آرمی شروع کر دی۔ وہ
 چھپتا میرے والے لن میں بھر تھا۔ جب تک اس نے لاک
 کھولا، چوکیدار کے کہیں میں جانے والے باہر نکل آئے۔
 انہوں نے کتوں کی طرح اس کے بھی خاموش رہنے کا
 بندوبست کر دیا تھا۔ اب چونکہ انہیں اطمینان تھا کہ وہاں
 انہیں دیکھنے والا یا ان کے کام میں رکاوٹ ڈالنے والا کوئی
 شخص باقی نہیں جاتا، اس لیے وہ چاروں کے چاروں اندر
 چلے گئے۔ مجھے جانے لیا ہوا کہ اس وقت ہی کوئی سے بھاگ
 جانے کے بجائے غنمی کے طرف چلا گیا۔ صاحب کے بیڑ
 وہم کی کڑی تنقید میں ملان میں تھی، اس بات کا مجھے طرہ تھا۔
 میں نے کوئی سے ان کے بندوبست میں جھانک کر کوئی میں تھنے
 والے بھی اس وقت وہاں پہنچے تھے۔ میری نظروں کے
 سامنے دو افراد اپنے چاقو کھول کر بیڑ کی طرف لپے۔ میں

جس رخ سے دیکھ رہا تھا وہاں سے بیڑ پر سوار ہوئے لوگ
 مجھے نظر نہیں آ رہے تھے لیکن چاقو کے وار سے کچھ لگنے والا
 خون میں نے صاف دیکھا۔ ساتھ ہی مجھے اعرے بچوں کی
 آوازیں بھی سنائی دیں۔ کھل کی اس وادرات کو کچھ میں
 گھرا گیا اور خود پر تالا پانے کے لیے کھڑکی سے بہت کر ذرا
 فاصلے پر بیٹھ گیا۔ اسی وقت میں نے کوئی کوہ ہارنے دیکھا۔
 پہلے میں ذرا کہ شاید یہ کوئی میں تھنے والوں کا ٹال بھی ہے
 لیکن پھر مجھے فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ سیاہ کھال میں لپٹی وہ
 ایک لڑکی ہے۔ لڑکی نے بھی میری طرح ہی کوئی کے تختے
 سے جھانک کر اندر کا بندہ لیا۔ اس دوران میں کچھ پکان چکا تھا
 کہ یہ موتی والا صاحب کی مہمان لڑکی ہے۔ وہ بھڑکی
 سے پتلی تو اس کے چہرے پر اتنا خوف تھا کہ کچھ لگے کہ خوف
 سے تنگیں مارنے لگی اور ظاہر ہے بیچوں کی یہ آواز اندر
 بھی جاتی اسی لیے میں نے اس کی خاموشی کے خیال سے
 پیچھے سے جا کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ان کے وہم
 دونوں کوئی سے نکل بھاگے۔ میں جب اسے اپنے ساتھ کوئی
 سے لایا تھا، تب بھی مجھے احساس تھا کہ میں اپنے آپ کو
 مشکل میں ڈال رہا ہوں لیکن ایک لڑکی کو اسے بے خطرے
 میں گھرا چھوڑ کر فرار ہونا میرے خیال سے گوارا نہ کیا۔ شاید تم
 دونوں سوچو کہ اسے مالک کے گھر میں نقب لگانے کا ارادہ
 رکھنے والا شخص بھلا کہاں کا باغیر ہے۔ لیکن دیکھیں کہ
 میری اس ملک حیرانی کے ارادے کے پیچھے میری بے خبری
 سے زیادہ میری بیجوری تھی۔ میں نیکم کے گیسے رہا ہوں اور
 اسے پانے کی جوارہ مجھے بھائی دی، میں اس پر عمل پیرا۔
 سرہ نے ایک ہی سانس میں سارا قصہ سنانے کے ساتھ ساتھ
 اپنی بے بسی کو بھی اعتراف کیا۔
 ”حقیقتیں تو تم نے بہت کی ہیں لیکن یہ وقت ان
 حقائق پر نہیں برا بھلا کہنے کا نہیں ہے۔ اب اس بات جو
 ہمیں سوچنی ہے وہ یہ کہ ہم ان محترمہ کے مسئلے میں کیا کریں۔
 ظاہر ہے پولیس کے لیے ان کا غائب ہونا ایک سلاہو کا اور
 اس سے عمل کے لیے وہ ادھر ادھر ہاتھ پیرا رہے۔
 ایسی صورت میں حیرے ساتھ ساتھ میرے چھیننے کا امکان
 ہے۔“ عامر نے سرہ کو اس دایا۔
 ”میں سمجھتا ہوں یا لیکن اب جو کچھ ہوگا وہاں لڑکی کے
 مشورے کے بعد ہی ہوگا کیونکہ مجھے تو نہیں معلوم کہ یہ کون
 ہے اور صاحب نے کیا۔ اسے اپنی کوئی میں رکھا تھا؟“
 ”آپ نے سرہ کی بات سن لی کتر ہے۔ اب آپ ہمیں
 اپنے بارے میں بتا دے تاکہ ہم کوئی فیصلہ کر سکیں۔“ عامر نے

ماہ بانو کی طرف رخ کیا۔ وہ اس ساری گفتگو کے دوران خاموش بیٹھی اپنی اگلیاں مروڑتی رہی تھی۔ خود کو غائب کیے جانے پر اس نے بے مشکل اپنے لب کھولے اور کھپکھپاتی ہوئی آواز میں بولی۔

”موتی والا صاحب سے میری کوئی رشتہ داری یا ذاتی جان بچان نہیں تھی۔ وہ صرف کسی کے کہنے پر میری مدد کر رہے تھے۔ انہوں نے مجھے اپنی کوئی چیز میں پناہ دے رکھی تھی۔ مجھے یہ طرح یقین نہیں لیکن خود اس ایک ضرور ہے کہ موتی والا صاحب کی کوئی چیز میں مجھے والے لوگ میری ہی تلاش میں آئے تھے لیکن واقعی طور پر لاچاک کا کاروبار لوٹ مار میں الجھ گئے اور میرے مدد سے وہاں سے بھاگنے کا موقع مل گیا۔ اگر یہ مجھے یہاں نہ لاتے تو کوئی سے نکل جانے کے باوجود میں بڑی مشکل میں پڑ جاتی۔ اگلی لڑکی کے لیے یوں بھی خود کو محفوظ رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے اور میرے ساتھ تو یہ بھی مسئلہ ہے کہ میرے ذہن مسلسل میری بوسہ گھونٹے پھر رہے ہیں۔ آپ لوگوں سے میری یہ گزارش ہے کہ آپ اس وقت تک مجھے پناہ دے دیں جب تک میں اپنے بھردروں سے رابطہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو جاتی۔ وہ بہت اچھے لوگ ہیں۔ مجھے مشکل میں دیکھیں گے تو ضرور میری مدد کریں گے۔ ان کے اثر رسوخ کی وجہ سے پولیس بھی آپ لوگوں پر کوئی الزام عائد کرنے سے گریز کرے گی۔ بس میرا ایک بار ان سے رابطہ ہو جائے۔“

”اگر تمہارے وہ بھردروں نے ہی اثر رسوخ والے ہیں تو چلو ابھی پولیس اسٹیشن چلتے ہیں۔ پولیس خود ہی تمہارا ان سے رابطہ کروادے گی۔“ حاکم جی کی ہچکچاہٹ بولانی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

”نہیں... میں پولیس اسٹیشن نہیں جاؤں گی۔ مجھے پولیس والوں پر اختیار نہیں ہے۔“ وہ فوراً ہی بدی۔
 ”تو تم نہیں اپنے اس بھردروں کا نام اور فون نمبر وغیرہ دیتا دو؟“ ان کے ہم ان سے رابطہ کر کے تم سے اپنی جان بچا رہا میں۔“
 یہ کہ کچھ جابجا ہوا تھا۔ ایک تو اسے اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی تھی، دوسرے وہ ایک مصیبت بھی خود ہی اپنے منہ سے باندا کر لے گیا تھا۔

”ان کا نام شہر یاد ہے۔ اسسٹنٹ کمشنر شہر یاد۔ لیکن میرے پاس ان کا فون نمبر نہیں ہے۔ فون نمبر کے لیے آپ ایک دارالامان کی منتظر سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ میں آپ کو دارالامان کا پتہ بھیجا دیتی ہوں۔“ وہ ان دونوں کو پتہ بھیجے گئی۔ اگر وہ دونوں پڑے نہ دیکھتے ہوتے تو دارالامان کی منتظر

سے فون نمبر حاصل کرنے کے مشورے پر عمل کرنے کے بجائے سید سے سید شہر یاد کے دفتر میں موجود خلیفہ کا نام پوچھ کر ڈائریکٹری سے اس کے دفتر کا فون نمبر حاصل کر سکتے تھے۔ خود ماہ بانو کا داغ بھی ان حالات میں درست سمت میں سوچنے سے مفید رہتا تھا۔

☆ ☆ ☆
 ماسٹر آفتاب بڑے اشتیاق سے مزدوروں کو دیوار کھڑی کرتا دیکھ رہا تھا۔ دیوار میں جتنی جانے والی ایک ایک اینٹ اسے خوشی فراہم کر رہی تھی کیونکہ ہر جتنی جانے والی اینٹ کے ساتھ وہ اپنے خواب کو تعمیر کے مرحلے سے گزرتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ شہر یاد نے اس کے اسکول کی توسیع کا پورے دھڑکا ہوا تھا، اس پر عمل درآمد شروع ہو گیا تھا۔ خلاف توقع ابھی تک چودھری اختر کی طرف سے اس کام میں کوئی روڑا نہیں اٹھایا گیا تھا اور اسکول کے لیے کمروں کی تعمیر کا کام سکون سے جاری تھا۔ دوسری طرف موبائل فیکٹری والے بھی اپنا کام شروع کر چکے تھے۔ اسے موبائل فیکٹری کے کارڈ کی تعمیر پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس علاقے میں موبائل سروس شروع ہو جاتی تو اسے کافی سہولت ہو جاتی۔ ابھی تو لاہور رابطے کے لیے ڈاک خانے تک جانا پڑتا تھا۔ موبائل کام کرنے لگی تو یہ مسئلہ حل ہو جاتا۔

”سلام ماسٹر صاحب!“ وہ اپنے خیالوں میں گم تھیر کے کام پر نظر جمائے کھڑا تھا کہ عقب سے سنائی دینے والی نواہی آواز نے چونک کر پھٹے پر مجبور کر دیا۔
 ”میکم اسلام! کسی بھورانی؟“ سلام کا جواب دینے کے ساتھ اس نے رائی کا حال بھی پوچھا۔ رائی کا چہرہ بھائی اسکول میں زیر تعلیم تھا اور وہ اس کی شکایتیں کرنے اکثر اسکول آتی راتی تھی اس لیے وہ اسے ابھی طرح پچھتا رہا تھا۔

”رب کا شکر ہے۔ آپ اپنا حال بتاؤ؟“ آج کل تو بڑے خوش ہوں گے۔ آپ کا اسکول جوتنی کر رہا ہے۔“
 ”ہاں بھائی! میں تو بیچ بچہ خوش ہوں۔“ وہ مسکرایا۔
 ”اٹھ سائیں آپ کو سدا خوش رکھے۔ ہمارے پنڈے کے بچے پڑھ لکھ کر ترقی کر گئے تو اس میں سارا ہاتھ آپ کا ہے۔ گاؤں کے امیر سے ناخوش بھی کوئی آپ جیسا استاد ہوتا۔ مجھے بڑا شوق تھا ہی پڑھنے کا لیکن دو چار جماعتوں سے آگے پڑھ ہی نہیں سکی۔“ رائی نے کچھ اداسی سے بتایا۔
 ”تو کیا ہوا، اب پڑھ لیتا۔ میں تمہاری مدد کروں گا۔“ اس نے پیشکش کی۔
 ”جی، ماسٹر صاحب!“ وہ خوش ہوئی لیکن پھر اداسی سے

بولی۔ ”مجھے بھلا کون اسکول آکر آپ سے پڑھ دے گا؟“
 ”آئی بہت کرے تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ میں بھی تو سچے عرصے سے کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح اسکول کی عمارت میں توسیع ہو جائے لیکن نہیں میری سنوائی ہی نہیں ہوتی تھی۔۔۔ پر اب دیکھو! میں نے بہت کچھ ہاری اور کوشش جاری رکھی تو کام شروع ہو ہی گیا! میرا دوسرا منصوبہ یہ ہے کہ پورے اسکول کی چھٹی کے بعد یہاں پر دستکاری کا کام شروع کر دیا جائے۔ پنڈے کی عورتیں اتنی ہنرمند ہیں کہ ان سے کپڑوں پر کڑھائیاں وغیرہ کروا کر لاہور اور دوسرے بڑے شہروں میں لے جا کر بیچیں گے تو اچھی خاصی آمدنی ہو جائے گی۔ یہ تو مزید بہت لگنا پڑتا ہے اور حساب کتاب کرنا تو جانتی ہی ہو۔ میں ایسا کروں گا کہ اس کام کے لیے جیسے انچارج بنا دوں گا۔ تم کام کرنے والی عورتوں کی عمرانی بھی کرتی رہتا اور ساتھ میں اپنی پڑھائی بھی شروع کر دینا۔ میں تو بتا رہی ہوں ہوں، تم جب چاہو گی آسانی سے میری مدد لے سکو گی۔“

”تھوڑی دیر میری ماسٹر صاحب! میرا پڑھنے لکھنے کا خواب پورا ہو گیا تو میں آپ کو بڑی دعاؤں دوں گی بلکہ آپ کی غلام بن جاؤں گی۔“ اس کی تجویز سن کر وہ بے حد چٹائی ہو گئی تھی۔

”غلام ولام بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس جب تم پڑھ لکھ جاؤ تو گاؤں کی دوسری لڑکیوں کو بھی پڑھانا۔“
 ”بالکل جی! میں تو بڑے شوق سے یہ کام کروں گی۔“ اس نے فوراً وعدہ کیا پھر اچانک کچھ یاد آ جانے پر ہاتھ پر ہاتھ مارے ہوئے بولی۔ ”میں بھی اس ایو میں ہوں گی! جس کام سے آئی تھی، وہ تو بھول ہی گئی اور دوسری باتیں لے کر چھٹی گئی۔“

”کس کام سے آئی تھیں؟ کیا تمہارے بھائی نے پھر جیسے ستاؤ شروع کر دیا ہے اور کھر پڑے نہیں بیٹھتا۔ لیکن ایک بات میں جیسے اتنا دواں رہتا رہا ابھی بڑا ذہین بچہ ہے اور اسکول میں خوب دل لگا کر پڑھتا ہے۔“ اپنے سابقہ تجربے کی روشنی میں رائی کی آمد کے مقصد کا اندازہ لگاتے ہوئے اس نے مسکرایا۔

”مجھے معلوم ہے کہ جی میرا بھرا پڑھ لکھا اور بیٹا بچہ ہے۔ وہ تو بس میں اس پر رعب خوب رکھنے کے لیے آپ کے پاس اس کی شکایتیں لے کر آ جاتی ہوں، پر اس وقت میں اپنے کام سے نہیں آتی، مجھے شہر لے جانی ہے۔“ یہ بات بتاتے ہوئے رائی کی آواز بہت مدھم ہو گئی تھی۔
 ”کیوں؟“ دوسری طرف چونکا۔

”انہوں نے آپ کے لیے یہ بھیجا ہے؟“ رائی نے اداسی میں چھپا ہاتھ باہر نکال کر ایک کپے لے کر رنگ لگا لگاؤ اس کے ہاتھ میں تھا۔ یہ وہ لٹاؤ تھا کہ کھر پڑے کم صم کی کیفیت میں کھڑا رہا پھر آہستہ سے بولا۔

”اپنی بی بی کو بھلاؤ رائی کی یہ سب فکر نہیں ہے۔ اس طرح تو دوا لینے کے بھی مصیبت مولی لیں! اور میرا کچھ راستہ کھونا ہو گا۔ میری زندگی کا مقصد کچھ اور ہے اور میں ان سارے جھجھکیوں میں نہیں پھنسنا چاہتا۔“

”میں بی بی کو بھاننے کی کوشش کروں گی تو یہ جھجھکی بڑی بات ہو گی ماسٹر صاحب! ایسے بھی ان معاملات میں کوئی کسی کے بھاننے سے نہیں بچتا اور بی بی کو تو میں نے اسے عرصے میں پہلی بار کسی میں دیکھی اپنے دیکھا ہے۔ وہ بہت اچھی ہیں، ان کا دل دیکھنے پر ہاتھ بڑا دکھ ہو گا۔ رائی نے سب لفظوں میں شہر کی وکالت کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”اچھے لوگوں کو تو دوسروں کی اور بھی فکر ہوتی ہے۔ اگر چودھری صاحب کو اس معاملے کی ذرا بھی فکر ہو سکتی تو وہ مجھ پر یہاں کی زمین تک کر دیں گے۔ میں یہاں رو کر لوگوں کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں، ان کے کام آتا چاہتا ہوں۔ تم اپنی بی بی سے کہو کہ وہ میرے اس کام میں رکاوٹ نہ ڈالیں۔“ اس نے ہاتھ میں تھا لٹاؤ جو اس کا فون رائی کو لوہا دیا اور رخ موڑ کر دوبارہ مزدوروں کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ سب اپنے کام میں متہمک تھے اور ان دونوں کی طرف ان کی توجہ نہیں تھی۔ رائی اس کا انداز دیکھ کر واپس پٹ پٹ، یہ کہ فاصلے پر سے آتی شادو نسرین کو دیکھ کر بڑی طرح اٹھ گئی۔
 ”خیر تو ہے رائی! اس وقت یہاں کیا کر رہی تھی تو؟“
 نسرین عرف بھیجی سے سختی خیز انداز میں پوچھا۔

”ماسٹر صاحب سے سنی کی شکایت سہلنے آئی تھی۔“ اس نے بھانہ بنایا۔
 ”اچھا... نہیں ایسا کہ ماسٹر صاحب جیسے کچھ دے رہے ہیں۔“ شادو کا نرے سے بولی۔

”تو ابھی انھوں نے علاج کر دیا۔ ہر وقت لاسلاط دیکھتی رہتی ہے۔“ رائی اندر سے غمراہ لیکن اس صبر ادا کوٹھا ہر کے بغیر تڑاٹے سے جواب دے کر وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ چھٹی اور شادو جیسے لگتی لگتی اور پڑھ لکھانے والی لڑکیوں سے تو وہ یوں بھی بیوقوفانہ طور پر ہی رہنے کی کوشش کرتی تھی! اس وقت تو پھر معاملہ ہی شہر لے جانی کا تھا جس کی اگر کسی کو کان کان بھی خبر ہو جاتی تو ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوتا۔

☆ ☆ ☆

لیکن وہ خوف زدہ ہو چکی تھی اور تیز قدم اٹھا رہی تھی۔

”اے رکو“ اسے اپنے پیچھے قدموں کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی یہ پکار بھی۔ ”وہ رکنے کے بجائے تیز دوڑنے لگی۔“

”رک جا سالی! اور نہ اٹھا نہیں ہوگا۔“ وہ پیچھے سے دھاڑا لیکن وہ رکنے بغیر دوڑتی چلی گئی۔ وہ کوئی نو عمر لڑکی نہیں تھی، اچھی خاصی ادھیڑ عمر کی عورت تھی لیکن ساری زندگی ملازمت کرنے اور خود کو مصروف رکھنے کی وجہ سے کافی ایکٹیو تھی اس لیے اپنی عمر کی دیگر عورتوں کے برخلاف کافی تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ کچھ خود کو خطرے سے محفوظ رکھنے کی ٹیکہ خرابی میں بھی اسے ہمیز کر دیا تھا۔ بغیر ٹیکے کے پاٹ کھوے والے جوتے بھی اس وقت اس کے لیے کافی معاون ثابت ہو رہے تھے۔ وہ تیزی سے دوڑتی ہوئی ایک کھلی پارک کے دوسری کھلی میں داخل ہو چکی تھی۔ اس کے تعاقب میں آنے والا شخص بھی مسلسل پیچھے تھا۔ وہ پہر کا وقت ہونے کی وجہ سے گلیوں میں سناٹا تھا اور کوئی چوہے ٹکی کی اس دوڑ کو دیکھنے والا نہیں تھا۔ وہ پھوٹی سانسوں کے ساتھ دوڑتی اس کوشش میں تھی کہ جلد از جلد یہ کھلی پارک لے۔ اسے علم تھا کہ اس کھلی کے اختتام پر مین روڈ موجود ہے۔ وہ ایک بار مین روڈ پر پہنچ جاتی تو وہاں سے کوئی سواری حاصل کر سکتی تھی۔ دوسری امید اسے یہ بھی تھی کہ رش والی جگہ پر پہنچ کر یہ فیصلہ کھلے عام اس پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کر سکے گا مگر تعاقب کرنے والا بھی شاید یہ سب ہاتھ جانتا تھا۔ ابھی وہ کھلی کے سرے پر پہنچی ہی تھی کہ پیچھے سے کوئی سنسنی بھری چیز آئی اور اس کی اُمیں ٹانگ میں کھب تھی۔ تکلف کی شدت سے اس کے حلق سے ایک بے اختیاری چیخ نکلی اور اسے لگا کہ وہ ابھی گر جائے گی لیکن گر جانے میں موت تھی۔ اس نے ایک نظر اپنی ڈانگ کی طرف دیکھا۔ اس میں ایک لمبے پھل والا چاقو لگا ہوا تھا اور زخم سے خون نکلنے لگا تھا۔ اپنی تمام تر ہمتیں متوجہ کرتے ہوئے اس نے رکنے بغیر بھی کا اختتام کر دینے والا چند قدم کا فاصلہ طے کرنے کا فیصلہ کیا اور زخم کی کھوکھی ہوئی تکلیف کے ساتھ بھاگتی ہوئی کھلی سے باہر نکل گئی۔ تعاقب میں آنے والا جو اس دوران بے حد قریب پہنچ گیا تھا، اس کی اس جرأت مندی کو دیکھ کر ٹھنک گیا۔ دوسرے وہ جانتا تھا کہ اس کھلی سے باہر نکلنے کے بعد سڑک کے کنارے کے کنارے کی سوزن ٹیکس کی دکان میں ہیں۔ اگر وہ لوگ اسے ایک زخمی عورت کے پیچھے آنا دیکھتے تو شاید اسے پکڑنے کی کوشش کرتے اور اس وقت اس کے پاس اپنے ہتھوڑے کے لیے کوئی ہتھیار بھی موجود نہیں تھا۔ وہ آگے

گورنر آفس سے باہر نکلنے کے بعد اس نے سکون کا مگر اسٹاپس لیا۔ ماہ بانو کا دارالامان میں رہ جانے والا بیک اس کے لیے ایک بوجھ بن گیا تھا۔ وہ ایک ایمان دار عورت تھی اس لیے اپنے فرض کو پوری ایمان داری اور دیانت سے انجام دینے کی کوشش کرتی تھی۔ ماہ بانو کا بیک اس کے لیے ایک امانت کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس امانت کے بوجھ کو اپنے سر سے اتارنے کے لیے اس نے بیک عبداللہ کے نام سے گورنر کر دیا تھا۔ ویسے بھی اس رات دارالامان میں پیش آنے والے واقعے کے بعد وہ کچھ خوف زدہ ہی ہو چکی تھی۔ ماہ بانو کے دارالامان سے چلے جانے کے بعد بھی اس کے لیے فون آتے رہے تھے۔ اسے فون پر دھمکیاں بھی دی گئی تھیں کہ اگر وہ ماہ بانو کے بارے میں کچھ جانتی ہے تو شرافت سے بتا دے ورنہ اس کا بہت برا انجام ہوگا۔ ان دھمکیوں سے ڈر کر اس نے کچھ عرصے کے لیے منظر سے ہٹ جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ آج ہی اس کی ڈیڑھ ماہ کی رخصت منظور ہوئی تھی اور وہ یہ ڈیڑھ ماہ راولپنڈی میں اپنی بہن کے گھر گزارنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ روڈی سے قبل اس نے ماہ بانو کی امانت کو مناسب جگہ بچھوڑ دینا ضروری سمجھا تھا۔ بیک کو گورنر کرنے کا بندوبست کر کے وہ خاصی مطمئن ہو چکی تھی اور اب اطمینان سے چلتی چر تھی مارکیٹ کی طرف جارہی تھی۔ بندھی جانے سے قبل وہ بہن اور اس کے بچوں کے لیے کچھ خریداری کرنا چاہتی تھی۔ خود اس کی اپنی شادی تو ہوئی نہیں تھی اور اس نے اپنی زندگی کے اتنے سال دارالامان کی منتظر کے فرائض انجام دیتے ہوئے گزار دیے تھے۔ ان فرائض کو انجام دیتے ہوئے آج وہ اس مقام پر پہنچ گئی تھی کہ اس کی اپنی ذات کے لیے خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس خطرے سے محفوظ رہنے کے لیے اس نے اپنے طور پر ایک منصوبہ بندی کر لی تھی اور اب کچھ مطمئن ہی خراں خراں بازار کی طرف بڑھ رہی تھی۔ گورنر آفس سے کافی آگے نکلنے کے بعد وہ ایک سوز پر پہنچی تو ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوا ہی بڑی مومچوں والا آدمی اسے دیکھ کر ٹھنکا۔ اس نے خود بھی اس آدمی کا ٹھکانا محسوس کر لیا اور کچھ خوف زدہ ہی ہو کر تیز تیز چلنے لگی۔ خوف زدہ ہونے کی وجہ سے صرف اس آدمی کا ٹھکانا نہیں تھا بلکہ وہ اس آدمی کی چھوٹی چھوٹی سردار پر چھلی آنکھیں دیکھ کر بھی ڈر گئی تھی۔ یہ آنکھیں اس کے لیے آشنا تھیں اور پچھلے دنوں سے اس کے دماغ میں چلی ہوئی تھیں۔ ماہ بانو کو اغوا کرنے کے لیے آنے والے ڈھانچا پوشوں کے لیڈر کی آنکھیں بھی ایسی ہی تھیں۔ اب جانے یہ وہی شخص تھا یا نہیں

جانے یا نہ جانے کی کشش میں وہیں ٹھک کر رہا لیکن وہ اس کے رکے کو محسوس نہیں کر سکی اور اندھا دھند بھاگتی چلی گئی۔ خوف اور دہشت نے اس کے حواس کو اتنا چھل کر دیا تھا کہ اسے یہ بھی احساس نہیں ہوا کہ وہ گلی پار کرنے کے بعد مین روڈ پر آچکی ہے اور اب اسے اپنے قدم روک دینے چاہئیں وہ اسی طرح دوڑتی رہی لیکن یہ دوڑ چند لمحوں سے زیادہ نہیں تھی۔ سڑک پر وہاں جانب سے آنے والی کسی کے زور و اثر کی تمام تر کوشش کے باوجود وہ اس کی ٹیکسی کی زد میں آکر بری طرح اچھلی اور بھر پور گڑا چلائی۔ ٹیکسی کے ساتھ ہی ایک دھڑکتا ٹرک بھی پوری رفتار سے چلا آ رہا تھا جو سڑک پر لاٹھتے اس کے جسم کو پکڑا کر اسے گھل گیا۔ اس مھر کو دیکھ کر سڑک پر سے گزرنے والی گاڑیوں نے بریکیں لگانا شروع کر دیں اور دکانوں سے ٹیکسی بھی اٹھل کر سڑک کی طرف دوڑنے لگے۔ وہ جو ابھی تک گلی کے سرے پر کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا، کسی کے اپنی طرف متوجہ ہونے سے پہلے پٹا اور تیزی سے بھاگتا ہوا اس جگہ سے دور ہوتا چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

”ہاں بھی بالے اکیلا خبر ہے؟“ اسنے دونوں سے تو یہاں بڑا ایندھ رہا ہے، ایک موتی والا کوٹھانے لگانے کے سوا تو نے کوئی بھی ڈھنگ کا کام نہیں کیا اور اس کام میں بھی تو نے لاکھوں کماے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ اس کوٹھانے مار میں ہی تجھے اس بات کی خبر نہیں ہو سکی کہ کوئی میں کوئی مہمان لڑکی بھی غمخیز ہوئی ہے۔ تو نے بس ان دونوں میاں بیوی کا گھانا اور مال سمیٹ کر واپس بول لیا۔“ چودھری افتخار آج کل اپنی لاہور والی کوئی میں ہی غمخیزا ہوا تھا۔ موتی والا سے اپنی دوستی کا ثبوت دینے کے لیے وہ ہر روز اس کی کوئی پرچا کر کچھ وقت اس کے مزے لوٹنے کے ساتھ گزارتا تھا۔ پولیس افسران سے بھی اس نے موتی والا کے قاتلوں کو پکڑنے کا پُر زور مطالبہ کیا تھا۔ اسنے اس آئے جانے اور سبیل ملاقاتوں میں اسے کوئی میں متیم مہمان لڑکی اور اس کے پراسرار غیب کی خبر ہو گئی تھی۔ ملازموں سے پوچھتے تھے کہ نتیجے میں لڑکی کا حلیہ بھی معلوم ہو گیا تھا تو یہ حلیہ ماہ بانو سے بہت مشابہ تھا۔ خصوصاً خلیق ہونٹ کے قریب پائے جانے والے صلی کی نشان دہی نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ وہ مہمان لڑکی ماہ بانو ہی تھی۔ اسے موتی والا پر بھی شدید شہت سے فہرست آ رہا تھا۔ وہ شخص اس سے پوری طرح دشمنی جتنا رہا تھا مگر اس مزید غصے کے اظہار کے لیے اسے موتی والا دستیاب نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے ایک بار پھر بالے کی جان کھانا شروع کر دی کہ وہ ماہ بانو کی تلاش

کے سلسلے میں سرگرمی دکھائے اور اب بالا اس عمر کی قہقہوں میں کی گئی اپنی کارروائی کی رپورٹ پیش کرنے کے لیے اس کی خدمت میں حاضر تھا۔ لیکن پہلے خود پر جانے کردہ الزامات کی تردید کرنے ضروری تھا اس لیے وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”مہمے نے کس سرکار میں نے یا سرے آدمیوں نے کوئی بے پروائی نہیں کی۔ چہا ہمیں آپ سے بھی بہت ملتا ہے۔ پیسے کے پتھر میں ہم اپنے فرض کو بھول جاتے، دایا ہو بھی سکتا تھا۔ ہم نے موتی والا کی تجویز غالی کرنے سے پہلے پوری کوئی کا پتھر لگا دیا تھا۔ اگر وہاں کوئی لڑکی ہوتی تو ہمیں ضرورتاً میرے خیال میں تو وہ کوئی رات جہاز سے پہلے ہی کہیں چلی گئی تھی۔ اگر وہ بعد میں بھاگتی تو اس کا کوئی سامان وغیرہ تو پولیس کو ہتھ لگتا۔ ایکسی میں سے پولیس والوں کو جو ایک دو جوڑے پکڑے تھے، وہ بھی موتی والا کی بیوی کے تھے۔ اس کا مطلب تو یہی ہوتا کہ کوئی پہلے ہی اپنے سامان سمیت وہاں سے جا چکی تھی۔“ وہ جانتا تھا کہ چودھری کے پاس اس کا جھوٹ پکڑنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا اس لیے اسے آرام سے دروغ کوئی بے کام بول رہا تھا، ورنہ اس نے اس کے ساتھیوں نے تو کوئی کی جتنی چیزیں سینے کے سوا وہاں کوئی اور کام نہیں کیا تھا۔

”میں میں نے مان لیا کہ تو جگہ رہا ہے، یہ بتا کہ تو نے اب کیا کارنامہ انجام دیا۔“ لیکن کون سے کھونٹے لڑکی کی تلاش میں؟“ چودھری اس پر بولا۔ ”وہی بتا ہے کہ“ لے آیا تھا سرکار! اسنے دونوں لاہور میں رو کر میں نے ٹیم خارج نہیں کیا ہے۔ میں مسلسل لڑکی کو تلاش کرتا رہا ہوں۔ آخری بار اس کے خانے میں رہنے کی خبر ملی تھی اس لیے میں خانے کے محلے کے پیچھے لگا رہا کہ کسی طرح معلوم ہو جائے کہ اسے قاتل ہے کس نے پھڑوا دیا ہے۔ پچھلے دنوں کو کوئی تجارت معلوم نہیں تھی۔ بس یہی کہتے تھے کہ اوپر سے کہیں سے فون آ رہا تھا۔ میں نے سوچا میں آج کو ہی کھنگال جائے۔ اس کی تجویز پیمپنی شیٹ لگی اور پچھلے پانی کا لاٹچ دیا تو اس نے اٹھا کہ لڑکی کو لڑی آئی تھی سارا رات کے فون پر پھوڑا تھا۔ اب ان کے بندوں نے لڑکی کو کہاں پہنچا یا کوئی خبر نہیں۔ میں کوشش میں لگا رہا کہ کسی طرح ان بندوں کی کوئی خبر مل جائے تو آپ کو خوش خبری ملے گی لیکن کچھ معلوم ہی نہ چلا۔ پھر میں نے دارالامان کی خانہ کے پوچھتے چکرے کہ سوچا۔ پہلے اسے فون پر ڈراما رہا کہ اگر اسے کوئی خبر ملے تو بتا دے۔ ڈائریکٹ اس تک پہنچ کر کچھ معلوم کرنا اس لیے مشکل تھا کہ اغوا کی کوشش کے بعد

دارالامان کی بھرائی سخت کر دی تھی ہے۔ پولیس والے بھی پتھر لگا کر دیکھتے رہے ہیں۔ آج اتفاق سے وہ عورت مجھے باہر نظر آ گئی۔ میں نے چاہا کہ اسے پکڑ لوں لیکن وہ بھاگ کر لڑی ہوئی اور بھاگتے بھاگتے ایک گاڑی کے سامنے آ کر جان سے چلی گئی۔ مجھے لگتا ہے اسے ضرور کچھ نہ کچھ معلوم تھا اس لیے وہ اتنا غمخیز تھی۔“

”معاملا کچھ بگڑ چکی تھی، آ رہا ہے۔ ہونہ ہو، ماہ بانو کا گاڑوں سے لگتا ہے میں اس سے کسی کے بچے کا ہاتھ ہے۔ اپنے ماموں کی شہ پر بڑا اسرار بنتا ہے وہ۔ سامنے سے مجھ سے دوستی بنا کر پیچھے سے سارے ایسے کام کرتا ہے جس سے مجھے پریشانی ہو۔ ماہ بانو کو اس نے دارالامان بھولوا دیا اور پھر خانے سے پھڑوا کر موتی والا کے گھر رکھوئے میں بھی اس کا ہی ہاتھ ہو گا۔ آج کل بڑی بڑی کھتے گئی تھی اس کی اور موتی والا کی۔ اسی کی خبر یوں پر تو وہ ہمارے مال کو پکڑنے کے پتھر میں تھا۔ لیکن اب اسے معلوم ہو جائے گا کہ چودھری افتخار کو اس جیسا کل کا نوٹہ پتھر نہیں دے سکتا۔“ سارا رات کا کام سامنے آئے ہی اس نے سارے حالات کا تجزیہ کر لیا تھا۔

”آپ کہیں تو ہم اس سے کسی کوٹھانے میں سرکار! آپ کے قدموں میں اس کا سر رکھ کر اس کی کسی پیمپنی لگا میں سے کہ آؤ پکڑو کوئی آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی ہائی بھر لے گا۔“ بندہ گرواسے اپنی بے ہوشی۔ تیرے پیچھے بے عقل آدمی کے مشوروں کی ضرورت نہیں ہے مجھے۔ شکل دیکھی ہے تو نے اپنی جرات اٹھا کر لائے کی باتیں کر رہا ہے۔ اس کے خاندان والوں کو جانتا ہوتا تو کسی گل منہ سے نہ کاتا۔ تو اسے اٹھائے گا اور وہ سارے قیامت افتخار کے۔ اس سے ہی پر ہاتھ ڈالنے کے لیے تیرے جیسے افتخاری گبرے کی نہیں، عقل کی ضرورت ہے۔ اب میں اپنی عقل سے اپنی تڑپ لڑاؤں گا کہ اس کا پکڑوئے کو ایک سبق تو مل ہی جائے گا۔“ بالے کی بات پر اسے دھنپتے ہوئے چودھری نے اپنے عزم کا اظہار کیا۔ پھر بار سبیل سے اس کی تعمیر شروع کروانے اور سبیلانی کو پکڑنے کی کوشش کرنے کی وجہ سے اس کی نظروں میں ٹھک رہا تھا۔ اب جو ماہ بانو والے معاملے کے ڈانڈے بھی اس سے ملے نظر آئے تو وہ مزید بھڑک اٹھا لیکن اسے بھڑکنے میں بھی اس نے عقل کا دامن نہیں چھوڑا تھا تو براہ راست تصادم کے بجائے حکمت عملی سے کام لینے کی غامی تھی۔

☆ ☆ ☆

”آج کا شیلڈ مل گیا ہے عبد المنان! آج ہمیں کس گاؤں کا ڈنڈ کر رہے؟“

”آج نور پور جا رہا ہے سارا ہاں کے زمیندار کی طرف سے درخواست تھی تھی کہ اس کے گاؤں میں بجلی کی فراہمی کے سلسلے میں کوئی قدم اٹھایا جائے۔“ شہریار کے سوال پر عبد المنان نے اسے بتایا تو اسے یاد آ گیا کہ اس نے خود ہی یہ درخواست پڑھنے کے بعد نور پور کے دورے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ اس گاؤں جا کر وہاں کے حالات کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ زمیندار سے مل کر اس کے مزاج کا بھی اندازہ کرنا چاہتا تھا۔ تقرری کے ابتدائی دنوں میں اگر درگاہ کے بہت سے دیہاتوں کے زمینداروں نے اس کے دفتر آ کر ملاقات کی تھی لیکن نور پور کا زمیندار ملاقات کے لیے نہیں آیا تھا۔

”اوکے! اندواں جانے کا انتظار کرو۔ ویسے اندازاً ہمیں وہاں جا کر واپس آنے میں کتنا وقت لگ جائے گا؟“

”نور پور یہاں سے کافی فاصلے پر ہے اس لیے ہم تو اصحاً غاصا لگے گا۔ ہم ابھی ٹھیک سے تو سر پیر کے بعد ہی کہیں جا کر واپس ہوگی۔“

”نور پور!۔۔۔ جب جانے کا فیصلہ کر لیا ہے تو پھر چاہے کتنا ہی وقت صرف ہو، جانا ضرور ہے۔“ اپنے سامنے رکھی فائل پر کوئی نوٹ لکھتے ہوئے اس نے غصے سے بول دیا۔

”اگر آپ اجازت دیں تو میں موتی والا کے وکیل کو آج سر پیر کے بعد ملاقات کا پتہ دوں؟“ وہ صبح صبح اس کا فون آیا تھا کہ وہ موتی والا صاحب کی دل کے سلسلے میں آپ سے ملاقات کے لیے آنا چاہتا ہے۔“ عبد المنان نے پوچھا تو وہ چونک گیا۔ موتی والا کی دل کے سلسلے میں اس کے وکیل کا اس کے پاس آنا معنی خیر تھا۔

”بالکل پتہ دوں دے دو بلکہ ایسا کرنا کہ یہ ملاقات میرے پیچھے پر رکھنا۔ وہ وکیل اتنی دور سے یہاں تک آئے گا تو اس کی خاطر مدارات بھی تو ڈھنگ سے ہونی چاہیے۔“ اجازت دینے کے ساتھ ساتھ اس نے ہدایت بھی باری کی پھر لیجے کہ سرسری سا بتا دیا ہو مجھے لگا۔

”ماہ بانو کی کوئی خبر ملی؟“

”نور! انکار! آج میرے رفیق حکمران سے میں مسلسل رابطے میں ہوں لیکن اس کے پاس ماہ بانو کے سلسلے میں کوئی خبر نہیں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اگر موتی والا کے کس کے پاس میں چودھری افتخار راؤ راؤ نے پوچھا جس بات کا بھی امکان ہے کہ ماہ بانو کو وہاں سے اس کے بندے اغوا کر کے لے گئے ہوں۔“ شہریار کے سوال کا جواب دیتے ہوئے عبد المنان نے خیال آرائی کی۔

”تو پھر کسی ذریعے سے چودھری کی طرف کی سن گئی

لو۔ ہم اس طرف ہاتھ پر ہاتھ دھر کر ایک مظلوم لڑکی کو براد ہونے کے لیے اس کے رحم و کرم پر تو نہیں چھوڑ سکتے۔" اس نے تیز لہجے میں حکم دیتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا کھم کھم پر پٹخا۔ "میں سرائیں پکڑتا ہوں۔" اس کا مزاج بگڑتا دیکھ کر عبداللہ نے مستعدی سے یقین دلایا۔ اسی وقت دروازے پر دستک ابھری اور ایک چھڑاکی اینداز سے لے کر اندر آیا۔

"یہ گویہ والا دے کر گیا ہے جناب۔" اس نے ایک بیک اور لقاؤ عبداللہ کی طرف بڑھایا۔ ایک کچھ شامسا تھا لیکن عبداللہ اور شہر یار دونوں ہی فوری طور پر اسے شناخت نہیں کر پائے۔ لہذا نے پرتکبر عبداللہ کا نام تھا اس لیے اس نے لقاؤ کھول کر اس میں موجود کافور نکال لیا۔ یہ دارالامان کی مشرقی طرف سے لکھا جانے والا ایک مختصر خط تھا جس میں اس نے اپنے دھمکیوں سے گھبرا کر چھٹی پر جانے کی اطلاع دینے کے ساتھ ماہ بانو کے بیک کی بابت بھی لکھا تھا۔ خط پڑھنے کے بعد اس نے شہر یار کی طرف بڑھا دیا۔

چراہی اس دوران اس کے اشارے پر وہاں جا چکا تھا۔ "تم دارالامان فون کرو، میں سے ابھی مختصر چھٹی پر نہی ہو۔ بیک بھیجے براں کا شکر یہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ دھمکی آمیز فون کی کافور کے بارے میں بھی تفصیلات معلوم کر لیتا۔" خط پڑھنے کے بعد اس نے حکم دیا تو عبداللہ ان دین اس کی میز پر موجود فون بیٹ پر دارالامان کا نمبر ملانے لگا۔ ٹھوڑی دیر میں اس کا وہاں رابطہ ہو گیا۔ رابطے کے بعد اس نے مختصر سی گفتگو کی اور ریسپورڈر وائس کرڈیل پر ڈالنے ہوئے اداسی سے بولا۔ "مختصر تو نہیں ملی۔ اس بے چاری کا کل دو چوبیس ایک روڈ ایکسٹینٹ میں انتقال ہو گیا۔"

"تسبیب کیا ہو رہا ہے؟ وہ سارے لوگ جو انور کے ہمراہ ہیں، کسی نہ کسی طرح مارے جا رہے ہیں۔ پہلے خدراں اور صفور، پھر شہر یار خان کا دوست، مونی والا اور ان کی سسر اور اب یہ دارالامان کی مشفقہ۔ اتنے سارے لوگوں کی ایک کے بعد ایک ہلاکت کو اتفاق نہیں کہا جاسکتا۔ تم تفصیلات معلوم کرو اور کاشیکسٹ کب اور کن حالات میں ہوا۔ مجھے لگتا ہے کہ ایکسٹینٹ کے پیچھے بھی یقینی کوئی نہ کوئی سازش ہوگی۔" عبداللہ کی وہی اطلاع سن کر اس نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے اسے حکم دیا۔ عبداللہ ان کو اس حکم پر ایک بار پھر فرماں بردار رہی۔ "میں سر" ہی کہنا تھا سو اس نے کہا۔ کچھ دیر بعد جب وہ لوگ سب پر گرام فور پور کے لیے روانہ ہوئے تو ان کے ذہن میں نور پور کے دورے

سے زیادہ ماہ بانو سے بڑے واقعات چکر رہے تھے۔

☆ ☆ ☆
"شش شش۔" ماہ بانو باور پچی خانے سے کمرے کی طرف جا رہی تھی کہ عقب سے سنائی دینے والی اس آواز پر چونک کر پٹخی۔ اس کے پیچھے ہی کافور کی ایک گولی اس کے شانے سے گھرائی اور فرش پر گر گئی۔ اس نے بچے جھک کر کاندہ کی اس گولی کو اٹھا یا اور آواز کی سمت دیکھا۔ چھٹی جانب واقع مکان کی چھت پر ایک لمبے بالوں والا لڑکا ہاتھ میں کیوتر سے کھڑا تھا۔ اسے متوجہ ہوتا دیکھ کر اس نے فوراً انداز میں اپنی بائیں آنکھ کو دبا دیا۔ وہ لڑکے کی اس حرکت پر تعجب کر تیزی سے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔ اندر مامری کی تیار ہونے پر پٹخی سو رہی تھی۔ اس نے اپنی جیب میں دینی کافور کی گولی کو کھول کر اس پر پٹخت لکھائی میں خیر کر رہے مضمون پر حنا۔ وہ جامیانہ الفاظ پر مشتمل ایک ایسی خط تھا جس کی مکمل چھت پر موجود کیوتر تراز سے امید کی جاسکتی تھی۔ اس نے خط کا مکمل مضمون پڑھتے ہی کافور کے گولی پڑنے کے لیے اور کمرے کی کڑی کھول کر ان پر زور کو باہر کی میں پھینک دیا۔ گولی میں پہلے سے موجود دھیروں گولز کرکٹ میں کافور کے دو چھڑ پڑے فوراً ہی مدھم مدھم ہو گئے۔ وہ کھڑکی سے ہٹ کر وائس اپنی جگہ پر آ بیٹھی اور اپنے حالات کے بارے میں سوچنے لگی۔ سرد دارالامان کیا تھا لیکن وہاں سے مختصر کے مرے کی خبر لے کر مایوس ہو آ تھا۔ اس کے بعد بھی ملے ہوا تھا کہ سرد یا حار میں سے کوئی ایک جا کر برادر راست شہر یار سے ملاقات کر کے اسے ماہ بانو کے بارے میں اطلاع دے گا لیکن فوری طور پر دونوں میں سے کوئی نہیں جاسکتا تھا۔ سرد کو خدشہ تھا کہ پولیس والوں کی نظر میں اس پر ہوں گی جبکہ حار میں دفتر میں بچوں کے فرائض انجام دیتا تھا، وہاں سے اسے آسانی سے پھنس مانا مشکل تھا۔ اس صورت حال میں وہ فنی الحال یہاں رہنے پر مجبور تھی۔ حار کی والدہ کی خدمت کر کے اسے دلی سکون ملا تھا لیکن بے بے اور ابا کی یاد بھی بے طرح آتی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ کسی طرح معاملات ابھارے اختیار کر لیں کہ وہ پہلے کی طرح بر سکون زندگی کا آغاز کر سکیں لیکن حالات نے جس طرح اسے بگڑ لیا تھا، ایسی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ مختصر مستقبل میں غلطیاں و جھپٹاں پیٹنے ابھی اسے زیادہ دیر نہیں ٹھہری تھی کہ دروازے پر زوردار دستک ابھری۔ دوپہر کے ان اوقات میں عموماً کوئی ہمسائی ان کی خیر ضرورت معلوم کرنے آ جاتی تھی۔ اس نے کمرے سے نکل کر بے دھرمک بیرونی دروازہ کھول دیا۔ اگلے ہی لمحے ایک

لڑکی تیزی سے اندر آئی اور خودی پلٹ کر دروازے کی کھڑکی پر حادی۔ وہ کچھ گھبراہٹ ہوئی لگ رہی تھی۔ "کیا ہوا مجھی۔ کون ہوتا اور اتنی گھبراہٹ ہوئی کیوں ہو؟" اس نے لڑکی سے دریافت کیا۔

"میں جیلہ ہوں جی! اس پیچھے والے گھر میں رہتی ہوں۔ خالہ جی کی طبیعت تو پیچھے آتی تھی۔ لڑکی نے اس گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، جہاں سے اس کیوتر باز لڑکے نے کچھ دیر قبل رقتہ پھینکا تھا۔ اس نے اپنا تعارف کروایا اور اپنی آواز سننے سے چہرے پر آیا پچھتاوا پھینچ گیا۔ اس کے چہرے پر موجود گھبراہٹ ابھی تک ختم نہیں ہوئی تھی۔ ماہ بانو نے یہ غور اس کا کیا کیا۔ وہ تقریباً ہی جیسے خود قدامت کی اس کی ہم عمر لڑکی تھی لیکن اس میں نسوانی کشش برائے نام تھی۔ چڑے چڑے ہاتھ کی عورت کے بجائے مرد کے معلوم ہوتے تھے۔ بالائی ہونٹ سے اوپر اور ٹھوڑی اور رخساروں کی جلد پر گھروڑے پن کا احساس ہوتا تھا۔ یہ گھر رہائش چہرے پر جاتی ہی پاؤ ڈرکی تے کے باوجود نمایاں تھا۔

"لے جا میں گئے، لے جا میں گئے دل والے دلہنیا لے جا میں گئے۔ رو جا میں رو جا میں گئے گھر والے دیکھتے رہ جا میں گئے۔" ابھی اس کا جائزہ مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ باہر سے تالیوں اور ڈھول کی قباب کے ساتھ بھونڈی آوازوں میں گانا گانے کی آوازیں آنے لگیں۔ اس انداز میں گانا گانے والے کون لوگ ہوتے ہیں، وہ یہ غولی جاتی تھی لیکن اسے حیرت تھی کہ وہ لوگ اس دروازے پر رک کر کیوں گارہے ہیں۔ یہ کوئی خوشی کا گھر تو نہیں تھا جہاں پر اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے بدلے میں انھیں روپے پیسے سے نوازا جاتا۔

"اللہ کے نام پر دے دے۔" گانے کی آواز کے درمیان ہی کسی نے دروازے پر دستک دے کر صراحت کی۔ "دروازہ مت کھولا۔" جیلہ جی لڑکی نے اس کا ہاتھ قہر کر خوف زدہ انداز میں اسے روکا۔

"تم اندر چل کر خالہ کے پاس بیٹھو۔ میں ابھی آتی ہوں۔" اس نے نرمی سے اپنا ہاتھ پکڑا کر اس سے کہا اور خود باور پچی خانے میں چلی گئی۔ آنے کے کچھ دیر بعد ایک بیالہ آتا لے کر وہ وائس دروازے پر آئی تو دستک اور صدائوں کا سلسلہ جاری تھا، البتہ جیلہ اندر کمرے میں جا چکی تھی۔ اس نے ڈراما ساز دروازہ کھول کر باہر بھاگا۔ ذوق برق پڑوں میں پھروں پر بیک اپ کی موٹی موٹی تے بجائے وہ تھیں ٹھکڑے تھے جن کے اوپر دھکے کے پتے پیچھے ہوئے تھے۔ کچھ عورتیں بھی دروازوں کی آواز اور کھڑکیوں سے باہر بھاگتی تھیں شاید کچھ

رہی تھیں۔ "یہ لے لو۔" اس نے آنے سے گھبراہٹ آگے بڑھایا تو دستک دینے والا پتھرا ایک کر پیچھے ہٹا۔ "مجھے نہیں چاہیے یہ بیالہ بھڑا؟"

"تو پھر کیا چاہیے؟ میرے پاس تو اس وقت دینے کے لیے بس یہی ہے۔" اسے عجیب سی بے بسی کا احساس ہوا۔ خود اس کا سارا سامان تو دارالامان میں رہ رہا تھا۔ وہ کسی دوسرے کے گھر میں جہہ کر اس سے بڑھ کر کسی کی کیا دیکھ سکتی تھی۔ "تیرے پاس تو بڑا قیمتی ہیرا ہے، پر جانے دے۔۔۔ آج نہیں دیتی تو کوئی بات نہیں میں پھر آکر لے جاؤں گی۔" ٹھکڑے نے جواب دیا اور پھر وہ جوں کا توں بجاتے واپس پلٹ گئے۔ وہ ان کی بات کا مضمون سمجھے بغیر ابھی ہوئی واپس اندر پلٹ گئی۔ کمرے میں جیلہ اور حار کی اباں بائیں کر رہی تھیں۔ شاید شوگر کی آواز سے ان کی آنکھ کھل گئی تھی۔

"اچھا ہوا خالہ جی آپ کچھ نہیں۔ میں کھانے لے کر آتی ہوں۔" انہیں جانتے تھے کہ اس نے کہا اور پھر جی سے جا کر ایک ٹرے میں کھانے کے برتن اور دیگر چیزیں رکھ کر کمرے میں لے آئی۔ جیلہ کو بھی ان لوگوں نے اصرار کر کے کھانے میں شامل کر لیا۔

"یہ جیلہ بڑی اچھی لڑکی ہے۔ برتیر سے چوتھے دن پکڑا کر کمرے سے کئی کام کر جاتی ہے۔" کھانے کے دوران خالہ جی اس سے جیلہ کی تعریفیں کرتی رہیں۔ کھانا کھا کر ان پر دوبارہ غصہ کی طاری ہونے لگی تو وہ جیلہ کو ساتھ لے کر بیٹھک میں آ گئی۔ جیلہ کے سوالات کے جواب میں اس نے اپنے بارے میں وہی کچھ بتایا جو وہ لوگ پہلے سے طے کر چکے تھے۔ جیلہ ہمدردی سے اس کی مظلومیت بھری داستان سن رہی۔ موقع دیکھ کر اس نے جیلہ سے اس کیوتر باز لڑکی کے بھی شکایت کر دی جس پر اس نے یقین دلایا کہ وہ اب اسے شکایت کر کے اپنے بھائی کو سیدھا کر دے گی۔ گھر درج جلد اور مردانہ سی ساخت رکھنے والے ہاتھ چھوڑ دیں کی مالک جیلہ طبیعت بڑی ہمدرد اور مظلوم لڑکی معلوم ہوئی تھی۔

"ارے جیلہ! تو بتاؤ کہ تم جب آتی تھیں تو اتنی ڈری ہوئی کیوں تھیں؟ کیا باہر کیوں نہیں نکل کر رہا تھا؟" بائیں کرتے کرتے اسے جیلہ کی آمد کے وقت کی گھبراہٹ یاد آئی تو اس نے اس سے پوچھ لیا۔

"نہیں۔ میں گھبراہٹ ہوئی تو نہیں تھی۔ بس پچھلی گلی سے یہاں تک تیز تیز چل کر آئی تھی اس لیے سانس پھول گیا تھا۔" وہ صاف سحر کی اور پھر فوراً ہی کھڑے ہوتے ہوئے

ہوئی۔ ”اچھا اب میں چلتی ہوں، بڑی دیر ہو گئی ہے۔ تم میرے بھائی کی طرف سے فخر مت کرنا۔ اس کے میں اب اسے اچھی طرح کاٹنے والوں کی۔“ اپنی بات کہنے کے بعد دور کی نہیں اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ ماہ نور حیران سی اس کا یہ رد عمل دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆☆

نور پوری حدود میں داخل ہوتے ہی انہیں خوش گوار سا احساس ہوا۔ چمڑے سے اس گاؤں کے مکانات دیکھ کر بے فکری کینوں کی لذت جاتی کا احساس ہوتا تھا لیکن اس احساس کے ساتھ ہی بھینک کی ترتیب اور صفائی ستھرائی بھی فوراً نظر میں آ جاتی تھی۔ ان ترتیب دار گھروں سے گزر کر زمیندار کے پختہ مکان تک پہنچتے ہیں انہیں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ مکان کے دروازے پر ایک نوکر نے ان کا استقبال کیا اور پھر انہیں ایک بیٹنگ میں لے گیا۔ تھوڑی دیر میں نوکر نے کسی اور دیکر لوازمات ان کے سامنے رکھ دیے۔ دونوں نظروں کے نیچے بے ساختگی دباوے زمیندار بھی وہیں آ گیا۔ ان بیٹا کھینوں کو دیکھ کر یہ بات سمجھ آ گئی کہ دیگر زمینداروں کی طرح وہ خود شہر یا رستے کے دفتر کیوں نہیں آیا تھا۔

”وہی مہربانی تھی اسی صاحب کو آپ ادھر آئے۔ میں تو بڑے بڑوں سے آپ کی راہ دیکھ رہا تھا۔ آپ کے دوسروں گاؤں میں جانے کی خبریں تو سنی رہی تھیں۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ دیکھیں، میرے گاؤں کا مقدر کب جاگن ہے۔ رب کا شکر ہے آج آپ کو ادھر آنے کا خیال بھی آ گیا۔“ نرمی سلام دعا کے بعد اس نے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

”میری کوشش تو یہی ہے کہ اپنے علاقے میں موجود ہر گاؤں کا کم از کم ایک دورہ کر کر خیر لوگوں کو دیکھ کر کوئی ایسی مصروفیت آئے آ جاتی ہے کہ میں اپنے اس ارادے پر عمل طور پر عمل نہیں کر پا رہا۔ آپ کے گاؤں کا دورہ بھی شروع سے ہی ہماری فہرست میں شامل تھا لیکن آج بڑی مشکل سے ہم اس میں کامیاب ہو پائے۔ آپ نے گاؤں میں کھلی کی سلاخی کے سلسلے میں جو درخواست دی تھی، وہ میں نے دیکھ لی تھی۔ میں کوشش کروں گا کہ جلد از جلد اس سلسلے میں کوئی پیش رفت ہو سکے۔ آپ بتائیں کہ اس مسئلے کے علاوہ اور کون سے مسائل ہیں جن کے حل میں، میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں؟“ نور پور کا زمیندار وہ واحد شخص تھا جس نے اپنے کسی ذاتی کام کے بجائے اپنے علاقے کی ترقی کے لیے درخواست دائر کی تھی، اس لیے شہر پارک روہی اس سے بہت مختلف تھا اور وہ بجائے گاؤں کے لوگوں کے پاس جانے کے برآمد راستہ اسی

سے گاؤں کے مسائل پر چور ہا تھا۔ ”یہاں کا سب سے بڑا مسئلہ تو غربت ہی ہے۔ زیادہ تر لوگ بھیتی بازی کرتے ہیں۔ کچھ کھار اور جولا ہے ہیں۔ آبادی کے حساب سے روزگار کے ذرائع بہت کم ہیں۔ میں چاہ رہا تھا کہ گاؤں میں کھلی آجائے تو کسی چھوٹی موٹی کھریلے صنعت کی بنیاد ڈال دوں۔ لوگوں کو روزگار ملے گا تو گاؤں خود بخود ترقی کرنے لگے گا۔“ زمیندار نے جواب دیا۔

”آپ کے خیالات سن کر مجھے بہت غمی ہو رہی ہے۔ مجھے سننے والے افراد میں آپ واحد شخص ہیں جنہیں اپنے ذاتی مفادات کے بجائے اپنے گاؤں کی ترقی عزیز ہے۔“ اس نے زمیندار کو سراہا۔ ”ذاتی مفادات میں پڑنے کی میرے پاس مہیا نہیں تھی۔ میری پوری برسوں پہلے ایک خانے میں سر تھی تھی۔ میں نے اپنی باتیں اسی خانے میں گھونٹی میں۔ اولاد دھاری کوئی تھی ہی نہیں۔ اب مجھے بھلا معذور اور ادھیڑ عمر کا آدمی دولت جمع کر کے گاؤں کو اس کے کس کام آئے گی؟ میں ایک چھوٹی بھین ہے۔ اسے عزت سے اس کے گھر کا کر دوں تو میری ساری فکریں ختم ہو جائیں گی۔ مجھے جو کچھ چاہتا ہے اپنے گاؤں کے بارے میں ہی سوچتا ہے۔“ زمیندار نے سادگی سے اپنے رویے کی وضاحت کرتے ہوئے نوکر کو مزید لسی لانے کے لیے آواز دیا۔

”مزید گفتگی کی ضرورت نہیں زمیندار صاحب! اس آپ یہ بتائیں کہ آپ کے گاؤں میں تعلیم اور صحت کی کیا صورت حال ہے۔ لوگ اپنے بچوں کو تعلیم دلانے میں دلچسپی رکھتے ہیں یا نہیں؟“ شہر یار نے اسے درد کے ہوئے سوال کیا۔

”صرف دلچسپی سے کیا ہوتا ہے چناں! ان بے چاروں کے پاس تو دو وقت چہل چل کر روٹی کھانے کی بھی قلت پیش نہیں ہوتی۔ حکومت نے بھی کبھی اس طرف توجہ نہیں دی۔ یہی حال صحت کا بھی ہے۔ لوگ بیمار ہوتے ہیں تو خود ہی کچھ ٹوٹے ٹوٹے کر کے علاج کر لیتے ہیں۔ کسی کی حالت بہت بگڑ جائے تو اسے تنہی پر ڈال کر فوراً نکال دیتے ہیں۔ اب بندے کی قسمت اگر گزندگی ہو تو وہاں جانے تک بچ جاتا ہے ورنہ اسے واپس لاکر یہاں دفن دیتے ہیں۔“ دیگر دیکھا توں کی طرح وہاں بھی صورت حال بہت خراب تھی۔ بس واحد توصلہ افزا بات یہی تھی کہ گاؤں کا سب سے زیادہ ہاتھ شخص ان کا ساتھ دینے کے لیے تیار تھا۔

”آپ کے تعاون کے لیے شکریہ۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے گاؤں کے مسائل کے حل کے لیے میں

ترجمی بنیادوں پر کام کرنے کی کوشش کروں گا۔ تعلیم، صحت اور روزگار ان تینوں اشیاء پر میری نظر ہے گی۔“ زمیندار کو یقین دہانی کر دیا کہ وہ لوگ واپسی کے لیے اٹھ گئے۔ گھر کے بڑے سے کمن سے گزرتے ہوئے انہوں نے کیا داری میں موجود پھول دار پودوں پر ایک ٹوکی کو جھٹکے ہوئے دیکھا۔ وہ یقیناً زمیندار کی چھوٹی بہن تھی جو ان لوگوں کو دیکھ کر فوراً بھاگ کر ایک کمرے میں چلی گئی تھی۔ زمیندار کے کمرے سے نکلے کے بعد انہوں نے گاؤں کا پتھر کے حالات کا ایک طائرانہ سا جائزہ لیا اور پھر واپسی کے لیے روانہ ہو گئے۔ آج شہر پارک کی موٹی والا کے وکیل سے بھی ملاقات ہو گئی تھی۔ گھر پہنچ کر اسے بس اتنی ہی مہلت ملی کہ وہ غسل کر کے اپنے وجود پر سے دن بھر کی گرد و غبار کو اتار سکے۔ غسل کے بعد وہ آہستہ کے ساتھ کھڑا اپنے بالوں کو سنوار رہا تھا کہ بٹلر نے اسے عبداللہ ان کی موٹی والا کے وکیل کے ساتھ آمد کی اطلاع دی۔

”وہ کس قسم انہیں بخدا میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔“ بٹلر کو جواب دے کر وہ تیار ہوئے گا۔ سات سے آٹھ صحت میں اس کی تیاری مکمل ہو گئی۔ بیڑھیاں اتار کر وہ علی منزل پر موجود راجہ سنگھ روم میں پہنچا تو اس دور ان تربیت یافتہ ملازمین لوازمات کے ساتھ چائے سرد کر رکھے تھے۔

”حافظ شیرازی... سبز موٹی والا کے قانونی مشیر۔“ اس کے ڈرائنگ روم میں پہنچتے پر عبداللہ ان کے خداف کی رسم نبھائی۔ اس نے حافظ شیرازی سے ہاتھ ملا کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

”لاہور سے یہاں تک پہنچنے میں آپ کو زیادہ تکلیف تو نہیں اٹھانی پڑی؟“ حافظ شیرازی کی آمد کا اصل مقصد پوچھنے سے پہلے اس نے ایک رسمی سوال کیا۔ ”تکلیف کتنی؟“ میں تو اپنی ایک ذمہ داری پوری کرنے آیا تھا۔ اگر آپ موٹی والا صاحب کی تحفہ کے بعد لاہور میں ایک دو دن قیام کرتے تو میں آپ سے وہیں ملاقات کر لیتا لیکن اب بھی کوئی مسئلہ نہیں۔ مجھے تو بہر حال اپنا فرض پورا کرنا ہی تھا اس لیے میں یہاں تک چلا آیا۔“ شہر یار کے سوال کا جواب دے کر وہ ابراہیم کیس کھولنے لگا۔ براہیم کیس میں سے اس نے ایک خانہ کی الفاظ نکال کر شہر پارک کی طرف بڑھایا اور بولا۔ ”اپنے بیٹے کی وفات کے کچھ دن بعد ہی موٹی والا صاحب نے اپنی بیٹی دل (دیمت نامہ) تیار کروائی تھی۔ اس وقت انہوں نے مجھ سے آپ کا ذکر بھی کیا تھا۔ وہ بڑے جہانگیرہ آدمی تھے۔ رانا صاحب کے حوالے سے شاید آپ کو پہلے سے جانتے سے پھر یہاں کے اسٹنٹ

کھنڈ بننے کے بعد بھی انہوں نے آپ کو دیکھا۔ آپ کے بارے میں ان کی رائے بھی کہ آپ ایک اولوالعزم اور ایمان دار آدمی ہیں جو کم از کم اپنے بیٹے کے ابتدائی حصے میں تو جرگز بھی کسی کرپشن میں ملوث نہیں ہو سکتے۔“ شہر یار نے خاموشی سے حافظ شیرازی کے لیے الفاظ سنے اور خانہ کی الفاظ نکول کر اس میں موجود کاغذات نکال کر ان کا جائزہ لے گا۔ ان کا غصہ اس کے مندرجات حافظ شیرازی کے الفاظ کی تصدیق کر رہے تھے۔ موٹی والا نے اپنے اس دیمت نامے میں اسے اپنی جائیداد کا ٹرسٹی قرار دیتے ہوئے اپنے بیٹے کے نام سے خلائی اسپتال کے قیام کی خواہش کے ساتھ یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ شہر پارک اسپتال اپنے علاقے میں تعمیر کروائے۔ شاید وہ اپنے اس جرم کا کارہ ادا کرنا چاہتا تھا جو اس نے چودھری افتخار کے ساتھ مل کر جنگل سے ٹکڑی کی اسٹنگ کی شکل میں کیا تھا۔ جنگل کے درختوں سے حاصل ہونے والی یہ دولت جس پر یقیناً اس علاقے کے لوگوں کا سب سے زیادہ حق تھا، اسی صورت میں واپس لوٹتی جا سکتی تھی۔ موٹی والا نے ایک عمل مند یہ بھی کی تھی کہ شہر پارک کو رکھ دیکھیں بنایا تھا بلکہ حافظ شیرازی سمیت دکھا کا ایک سردہ کی پورڈی مقرر کی تھا جو اس کی کارکردگی کا جائزہ لیتا رہتا اور کسی طرح کی کرپشن کی صورت میں اس کی روک تھام کا بندوبست کرتا۔

”یہ میرے لیے بڑے آخری بات ہے کہ موٹی والا صاحب نے مجھے اس لائق سمجھا۔ ان کی اس دل نے میرے ہاتھ بہت مضبوط کر دیے ہیں۔ اپنے علاقے کی ترقی کے لیے میرے ذہن میں بہت سے منصوبے ہیں لیکن ظاہر ہے، میں فوری طور پر حکومت سے ان تمام منصوبوں کے لیے مراعات حاصل نہیں کر سکتا۔ موٹی والا صاحب کی اس دل کے بعد میں کم از کم اس لائق ہو جاؤں گا کہ ہاتھ کے مسائل کے حل کے لیے کچھ کر سکوں۔ مگر اس سلسلے میں میرے ذہن میں جو منصوبہ ہے، وہ موٹی والا صاحب کی خواہش سے توڑنا سخت ہے۔ میں ایک بڑے اسپتال کے قیام کے بجائے صحت کے پھولے چھوٹے مگر جدید مراکز کے قیام میں دلچسپی رکھتا ہوں۔ اگر ہم بڑا اسپتال بنائیں گے تو وہ یقیناً کسی ایک قصبے میں قائم کیا جائے گا اور لوگوں کے لیے اس اسپتال تک بروقت پہنچنے کا مسئلہ اپنی جگہ رہے گا۔ اس کے برعکس اگر ہم مختلف دیہاتوں میں چھوٹے چھوٹے پینشن قائم کر دیتے ہیں تو لوگوں کو زیادہ آسانی رہے گی۔ ایک آپریشن ٹیمیز، جزیرویات اور چھوٹی موٹی مشینوں کے ساتھ ایک لینڈ ڈاکٹر، جزیل فزیشن اور پی امیڈیکل اسٹاف پر مشتمل ان پینشن سے لوگوں

کو بہت فائدہ پہنچے گا۔ خدا نخواستہ کوئی بہت بڑا حادثہ ہو گیا تو ان پینس میں مریض کو فرسٹ اینڈ دے کر کسی بڑے شہر تک پہنچانے کی سہلت مل جائے گی۔ ابھی تو یہ حال ہے کہ کہیں کہیں یہ حکومت کی قائم کردہ ہسپتال نظر پڑتی ہیں اور وہاں بھی ڈاکٹرز اور دواؤں دونوں نادر ہیں۔ "لٹافے میں کافلات واپس رکھنے کے بعد اس نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ اس وقت وہ بہت پر جوش نظر آ رہا تھا۔ وہ مختلف منصوبے جو سسٹل اس کے ذہن میں چلے رہے تھے، اس وقت ان میں سے ایک کی تفصیل کے لیے راہ نکلی تھی۔

"جوہر تو آپ کی بہت اچھی ہے۔ مجھے اس جوہر پر کوئی اعتراض نہیں۔ میں پورے کے بانی دوہران سے بھی اس جوہر کو دیکھ کر کے آپ کو جی جواب دے دوں گا۔ میرے خیال میں تو وہ لوگ بھی اس جوہر کو پسند کریں گے۔"

حفظ شرازی کا جواب بڑا حوصلہ افزا تھا۔ اسے اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن کی چمکتی نظر آنے لگی۔ ورنہ ماہ بانو کے غیاب کے بعد جو اندھیرا سا چھا گیا تھا اس سے وہ اپنے اندر بڑی تھیں محسوس کر رہا تھا۔

☆☆☆

پرونی دروازے پر دی جانے والی زوردار دھتک پر اس کی آنکھ کھلی گئی۔ موجودہ حالات میں اسے بہت گہری نیند نہیں آتی تھی اور وہ ڈرامی آہٹ پر ہی چونک کر اٹھ جاتی تھی۔ دروازے پر دی جانے والی یہ دھتک تو بہت زوردار تھی اور مسلسل یوں دی جا رہی تھی کہ جیسے دروازہ نہ کھولنے کی صورت میں توڑ دیا جائے گا۔ خوف اور اندیشوں سے گھرا اس کا دل بری طرح جھڑکنے لگا۔ اس نے ساتھ سوئی ہوئی خالہ کی کو ایک نظر دیکھا۔ دھتک کی اس آواز پر ڈسٹر ہو کر وہ بھی کسمپرسی میں لیکن دواؤں کے زبردست اثر ان کا ذہن فوری طور پر بے دار ہونے سے قاصر تھا۔ وہ سسر سے اتر کر دروازے کی طرف بڑھی۔ اس دوران عامر کی جاگ چکا تھا اور دھتک سے نکل کر یہی دروازے کی طرف جاتا دکھائی دے رہا تھا۔

"آ رہا ہوں بھائی، کون ہے؟ ذرا صبر سے تو کام لو۔"

اس کے بالائی جسم پر کپڑے موجود نہیں تھے۔ شاید وہ ان لوگوں میں سے تھا جو ہر موسم میں ایک پیسے چلے میں سوتا پسند کرتے ہیں۔

"کیا بیگ کی فرسور ہاتھ جاتی رہے بعد آکھ کھلی ہے اور اب بھی دروازہ کھولنے کا نام نہیں لے رہا؟" باہر سے کسی کی بلند اور غصیلی آواز سنائی دی۔

"اچھا اچھا یہ تو ہے۔" نے کھول دیا میں نے دروازہ۔"

باہر سے بولنے والا یقیناً اس کے لیے ششما تھا جو اس نے اٹھیا تان سے بولنے ہوئے جھٹ دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھولنے ہی جا رہا تھا تو اس کے دندے ہوئے اندر مٹ آئے۔

"کیا بات ہے یا راتم لوگ اس وقت اس طرح کیوں آئے ہو؟" وہ سب اس کے لیے آتے تھے لیکن ان کا انداز اور چہرے کا اثر غلطی انتہی تھا۔

"وہ کھوتو ذرا کیسا معصوم بن رہا ہے۔ حالانکہ اس کا حلیہ دیکھ کر ہی سب سمجھتے ہیں کہ یہ کون ہے مگر مجھے اسے اڑا رہا تھا۔" کھیلے لہجے میں یہ جملہ بولنے والے کو ماہ بانو نے ششما کر لیا۔ وہ جھٹکے میں رہنے والا جملہ کا وہی کیو تراز بھائی تھا جس نے اس کے لیے رتھ چھینا تھا۔

"کون ہے مگر چہروں کی بات کرو ہے جو تم؟ میں سارا دن کا تھکا ہارا مہری نیند سو رہا تھا کہ تم لوگوں کی وجہ سے جاگنا پڑا اور اب تم اپنی سیدی جاٹیں کر رہے ہو۔ جاؤ یہاں سے میں کوئی تم لوگوں کی طرح باپ بھائی کی کمائی پر نہیں مل رہا کہ راتوں کو جاگ کر تھک رہے ساتھ مغز ماری کروں۔ سویرے مجھے اپنی ذیولٹی پر بھی جانا ہے۔" عامر بھڑا۔

"کو کھ رہے ہو یا راتم کیسے بڑا ہے۔" باپ بھی، آدمی کے پیش میں قفل پر تو اسے برا ہی لگتا ہے۔" کیو تراز نے ایک اور طنز کا حیر چلایا۔ عامر کی طرح کمرے کے دروازے کی آڑ میں کھڑی ماہ بانو بھی حیران تھی کہ وہ ایسی جاٹیں کیوں کر رہا ہے۔ اس کے انداز سے تو صاف لگتا تھا کہ وہ جھگڑا کرنے کی نیت سے ہی یہاں آیا ہے۔

"زبان سنہال کی بات کر پڑا اچھے جیسا آئے روز لڑکیوں کو چھیڑ کر ان کے باپ بھائیوں سے بچنے والا آخر کسی برے پر مجھ پر الزام تراشی کر رہا ہے؟" عامر نے جملے میں اسے ٹوکا۔

"میں تو صرف لڑکیوں کو چھیڑتا ہی ہوں، پر تو نے تو دیدہ دیر کی یہ حد ہی کر دی۔" جو ان جہاں لوہڑا کھڑ میں لائی ہے اور اب جسے سے عیاں کرتا ہے۔"

"تیری تو میں۔" پرویز کے اس الزام پر وہ خود پر جاہ نہیں رکھ سکا اور جھٹ کر اس کا گریبان پکڑ لیا۔ پرویز کے ساتھ آنے والے لڑکے فوراً اس کی مدد کو لپکے۔ عامر جان دار لڑکا تھا۔ اس نے پرویز کے جتنیوں میں سے ایک کے پہلو میں کھینی ماری اور دوسرے کی طرف دیکھے نظریوں ہی اپنی ہانگ پیچھے کی جانب چلا دی۔ ہانگ مقابل کے جسم کے نازک حصے پر پڑی اور وہ بری طرح ہلایا۔ اس ساری

کارروائی کے دوران پرویز کا گریبان اس کے ہاتھ میں ہی رہا تھا۔ موقع پاتے ہی اس نے گریبان کو جھٹکا دے کر پرویز کو کھینچ کر طرف دھکیل دیا۔ اس کا سر پیچھے موجود دیوار کے ساتھ جا کر لگا اور صق سے زوردار کچل گئی۔ اس دوران عامر خود بھی زور میں آ گیا تھا۔ ایک لڑکے نے اسے پیچھے سے جھٹ لیا تھا اور دوسرا اس کے پیٹ میں کے برسا رہا تھا۔ انکوں کی یہ ضرب یقیناً بے حد تکلیف دہ تھی۔ عامر کراہتا ہوا دہرا ہوا گیا اور یوں لگا کہ کچھ فحش پر بیٹھ جائے گا لیکن اگلے ہی لمحے اس نے اپنے سامنے کمرے ہو کر کے برسا نے والے کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر دایں جانب سے حملہ آور ہوتے ہوئے لڑکے پر دے مارا۔ پیچھے سے اسے جھٹلنے والا اسے دہرا ہوا دیکھ کر غیر ارادی طور پر اسے چھوڑ چکا تھا اس لیے اب وہ کسی کی گرفت میں نہیں تھا۔ اس نے لپک کر دیوار کے ساتھ لگی چار پائی کی کبی اٹھائی اور ان چاروں کی مرمت کرنے لگا۔ اس ساری کارروائی میں اچھا خاصہ شہر پیدا ہوا تھا اور قریب قریب واقع گھروں میں لوگ جاگنے لگے تھے۔

"کیا ہو رہا ہے؟" خالہ بھی اس دوران جاگ کر کبی تھیں اور سارے دھماکا ماہ بانو کے عقب میں کھڑی اس سے پوچھ رہی تھیں۔

"معلوم نہیں۔" جانے یہ کون لڑکے ہیں جو ایک ہی اندر کھس کر عامر بھائی سے لڑنے لگے ہیں۔" اس نے خالہ کی کبی بات کا جواب سرور پر دیا لیکن اس کی نظریں اپنے سامنے ہوتے مگر سے نکلیں نہیں۔ عامر کے ہاتھ میں بی آ جانے کے بعد پست ہوتے ہوئے لڑکوں نے ایک بار پھر سنہال لے لیا تھا۔ ان میں سے دو نے مل کر بی کو پکڑ لیا تھا اور دو پیچھے سے اسے جھٹلنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"کیا ہو رہا ہے؟ تم لوگ کیوں لڑ رہے ہو؟ میں کبھی ہوں رک جاؤ۔" ماہ بانو کی طرح وہیں رک کر لڑائی دیکھنے کے بجائے خالہ جی باہر تھیں اور ان سب کو کارائین لڑائی کے جوش میں ان کی کمزوری آواز دہ کر رہی تھی۔ اسی وقت آس پاس کے گھروں کے جاگ جانے والے لوگوں میں سے چند لوگ کھلے دروازے سے اندر بھٹے آئے۔

"روکوں لوگوں کو۔" ورنہ یہ لڑائی ایک دوسرے کی جان لے لیں گے۔" چند سیوں کو سامنے پا کر خالہ جی کا حوصلہ بلند ہوا اور انہوں نے ان سے مدد کی درخواست کی۔ باقی چھ افراد مل کر لڑتے ہوئے لڑکوں کو قابو میں کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ آخر وہ لوگ کچھ دیر کی کوشش کے بعد لڑائی روکنے میں کامیاب ہو گئے لیکن اس دوران عامر سمیت تمام

خوبی

اکتادار نے فریڈی میٹ سنٹ شاد کو دیکھ کر کہا تھا۔

"آپ اس طرح فٹ آئے کیسے ہاتھ پر دیتے؟"

اس نے لبیک ہی کہا تھا۔ سنٹ میں پچھلے پانچوں والی تھی اور سنٹ ایک آئین والا۔

دلی

کاروبار دیکھ کر ایک ایسے کس کا ذرا پرہیز گس لے کر ہسپتال پہنچا تو اس نے دیکھ ہسپتال کے برہنہ باہر فٹ ہاتھ پر ہانگ کے کنارے کنارے ہاتھ کو حوصلہ سے لپک رہے تھے۔

"کیا آپ کا کچھ کھو گیا ہے؟" کاروبار نے پوچھا۔

"نہیں۔" ہانگ اٹھ کھس پکڑا حیدر علی کی آہریش کر رہے ہیں۔ اس کے سینے میں کچھ کے پانچاں مقتول سا چہرہ نہیں رہا۔ ایک سرجن نے کہا۔

لڑکوں کا حلیہ اچھا خاصا بھڑ چکا تھا۔ عامر کی بیانیوں میں آ کر دو لڑکوں کے سر پھٹ گئے تھے۔ ایک کی ناک سے خون نکل رہا تھا اور ایک اپنے بازوؤں پر گرنے والی چوٹوں کو اٹھار رہا تھا۔ خود عامر کا حلیہ بھی اچھا تھا۔ اس کا لہجہ ہونٹ پر گیا تھا اور دایں آنکھ کے نیچے کی زخم آ گیا تو جسم کے بالائی ٹریاں حصے پر بھی کی پونیش دکھائی دے رہی تھیں۔ بے شک وہ بہت ہی جگر سے لڑا تھا لیکن سمجھا ہونے کی وجہ سے اس نے مار بھی سب سے زیادہ کھائی تھی۔ سمجھنے والوں نے تمام لڑکوں کے زخم دھوئے اور پھر انہیں بیضک میں ڈھکا کر بڑے کا سبب معلوم کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

"ساری غلطی عامر کی ہے۔ ہم تو صرف اس کی غلطی کا احساس دلانے آئے تھے، اس نے بلاوجہ ہم سے ہاتھ پائی شروع کر دی۔" پرویز کے ساتھ آنے والے کونہ قاسم لڑکے نے الزام لگایا۔

"لوگ کے نہیں ایک تو تم لوگوں نے خود ہے کار کی الزام تراشی کی، اس پر سے غلطی ہی میری بن جائے ہو۔"

عامر اس کی بات سن کر بھڑکا۔ وہاں بھی مجھے داؤں کی وجہ سے بھڑکنے سے تپ ہو گیا تو راتم اس کے اندر غصہ اب بھی بھڑک رہا تھا۔

"وہ صبر پڑا آرام سے بات کرو۔ ہم سب کی بات آرام سے سنیں گے۔" ایک عمر رسیدہ چڑی نے عامر کے شانے کو چھینا ہونے سے استغفار کہنے کا کاروبار کیا۔

"آپ دیکھ رہے ہیں ہو پانی؟ یہ آپ لوگوں کے سامنے بھی کس طرح بھڑک رہا ہے۔ ہم لوگوں نے اسے

سمجھانے کی کوشش کی تھی تو بھی یہی طرح بھڑک کر ہم سے اچھٹے لگا تھا۔ ورنہ ہم نے اس سے صرف اتنا ہی تو کہا تھا کہ یہ شریفوں کا محلہ ہے۔ یہاں سب ماں بیٹوں والے ہیں۔ تم اس محلے میں رہتے ہو تو شریفوں کی طرح رہو اور اپنی ماں کی پیاداری کا جائز فائدہ مت اٹھاؤ۔

”کیا مطلب؟ کیا کیا ہے عامر نے؟“ ایک لڑکے کے دیے بیان پر صبح صفائی کروانے والے افراد بھی الجھ گئے۔ ”کیا کہوں چاہتا ہوں آپات ایسی ہے کہ کچھ کہتے ہوئے زبان رکھتی ہے، پر میں اپنی آنکھوں کا دیکھ بھلا بھی نہیں سکتا۔ پر آپ تو عقل مند آدمی ہو۔ اس کا حال دیکھ کر بھی بہت کچھ سمجھ سکتے ہو۔ میں نے اسے اور اس کی بہمان لڑکی کو باہر آگھن میں بڑی بے شرمی والی حرکتیں کرتے دیکھا تھا۔“ پرویز نے عامر کے بالائی چمکیاں طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک ایسا بیان دیا جس پر سب کے من کھلے گئے۔

”جھوٹ بولتا ہے نامراد! میرا بچہ بالکل بھی ایسا نہیں ہے۔ اس کی تو بچپن کی غارت ہے کہ سر دی گری ہر موسم میں اسی طرح ٹھیک اتار کر کھاتا ہے۔ یہ پٹنی بہت شریف ہے۔ روزانہ میرے ساتھ میرے کمرے میں سوئی ہے۔“ خالد فی جہانیدہ وکورت میں وہ خود را کھتے ہیں کہ پرویز بات کو کس رخ پر لے جا رہا ہے اس لیے فوراً تڑپ کر بیٹے کی صفائی میں مصدا بن گئی۔

”آپ تو دو آدمی کھا کر بد بو خالی ہو خالی ہی آپ کو کیا معلوم چلتا ہو گا کہ کب لڑکی اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔“ پرویز نے ان کی بات اڑائی۔

”نہ تو تھا کہ اگر یہ لوگ اتنی ہی ہوشیار ہیں تو اچھی بجلی میٹک ہوتے ہوئے شرمناک حرکتیں دکھانے کو باہر آگھن میں کس لیے جا رہی ہیں؟ اور تو کہاں کا شریف زادہ ہے جو آدمی آدمی رات کو دوسروں کے کمروں میں جھانکتا ہے؟“ وہ اس سے دیے بغیر تیز لہجے میں دلیل کے ساتھ بولیں تو وہ نہیں بھانکتے لگا۔

”پھر بھی بہن جی! کوئی تو بات دیکھی ہو گی پرویز نے جو ایسا الزام لگا دیا۔“ صبح صفائی کروانے والے بزرگ خود معاند ختم کرنے کے موذ میں نہیں تھے اور چپکے لینے کے لیے بات کو آگے بڑھانا چاہتے تھے۔

”کوئی بھی بات نہیں ہو سکتی۔ یہ بچی اور عامر دودھ شریک بہن بھائی ہیں۔ اس کی بڑی بہن کے ساتھ اس کی ماں نے عامر کو بھی دودھ پلایا تھا۔ ماں کے دودھ کے رشتے سے عامر اس کی بہن کے ساتھ ساتھ اس کا بھی بھائی ہوا۔ وہ

بے چاری بڑی والی تو دو چار برس کی ہو کر ہی مر گئی تھی، اب یہی بچی ہے۔ اس کی ماں کے دودھ کا حق ادا کرنے کے لیے اگر لڑکے وقت میں ہم نے اسے اپنے کمر میں رکھ لیا تو کیا برا کیا؟ میں بوڑھی اور بیچارہ ہوں، پر بے عقل نہیں کہ جان جہان لڑکی کو یوں ہی کمر میں رکھنے کا خطرہ بھول لوں۔“ خالد فی نے ایک جھوٹ کے سہارے ساری صورت حالی الت کر رکھ دی۔ اب کسی کے پاس کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ عامر کی ماں میں اور ان کے بیان کو سمجھ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ آہستہ آہستہ کہہ کر سب لوگ وہاں سے رخصت ہونے لگے۔ پرویز نے جاتے جاتے ماہ بانو کو ایسی نظروں سے دیکھا کہ اسے لگا وہ اسے دھمکا رہا ہو۔

”یہ پرویز ہے تو سارے زمانے کا قاتل و گرد اور بد کردار ہے میری کچھ نہیں آ رہا کہ اس نے عامر پر ایسا الزام کیوں لگا دیا؟“ خالد فی اتنی دور میں اچھی خاصی غصہ حال ہو گئی تھیں۔ سب لوگوں کے رخصت ہوتے ہی انہوں نے اپنا سر کر کے پیشت سے نکالا اور بڑبڑانے کے انداز میں بولیں۔

”اس کا صلہ نکالنا عامر بھائی نہیں، میں بھی خالد جان! اصل میں وہ مجھے بے عزت کرنا چاہتا تھا۔“ ماہ بانو جو اس عرصے میں اپنے ہونٹ کی کچھنی رسی تھی، کھٹکے ہوئے لہجے میں بول رہی تھیں۔

”پر کیوں؟“ عامر چوہکا۔ اس نے پرویز کے دھمکے بھینچنے اور بھیلنے سے شکایت کرنے کا قصہ سنا دیا۔

”بالکل جی... میں سمجھ گیا۔ تمہاری شکایت پر بھیلنے نے اپنے ابا سے اس کی شکایت کی ہو گی، وہ بے چارے پہلے ہی اس کے کرتوتوں پر پریشان ہیں۔ انہوں نے مجھے میں اسے دو چار ہاتھ کھادیے ہوں گے اور اس نے انتقام لینے کے لیے یہ سارا ڈراما مار چا ڈالا۔“ اگر ماں ہمارے دودھ شریک بہن بھائی ہوتے کہ بہانہ نہ نکرتیں تو کھٹے والوں نے پرویز کو بھونٹا مان لینے کے باوجود اس بات پر زور دیا تھا کہ لڑکی جڑا لڑکی کو باہر نکالو۔“ سارا قصہ سننے کے بعد عامر نے تپنا بند کیا۔

”میں پہلے ہی اس کی بد معاشی کو سمجھتی تھی۔ پھر مجھے یقین تھا کہ تم دونوں میں سے کوئی بھی ایسا گندہ آدمی نہیں کر سکتا اس لیے ذرا سا جھوٹ بول ڈالا۔ رب میرے اس جھوٹ کو معاف کرے، پر تم دونوں یاد رکھنا کہ اب ہمیں ہمیشہ میرے اس جھوٹ کی لاج رکھنی ہے۔“ خالد فی نے ان دونوں کو نصیحت کی۔

”بالکل اماں! یہ میرے لیے آج سے پھوٹی بہن کی طرح ہی ہے۔“ عامر نے ماہ بانو کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے

یقین دہانی کروائی۔

”چلو اب چل کر سو جاتے ہیں سبھی میں پرویز کی ماں کو بلا کر اس سے کہوں گی کہ بیٹے کو راز داری سے قاصر کرے۔ باپ کی تختی نے اسے زیادہ ہی اغرا کر دیا ہے۔ اس وقت بھی باپ تانت ڈیوٹی پر ہو گا جو اس نے یہ سارا کارنامہ انجام دے ڈالا۔“ اگر اس وقت اس کا باپ موجود ہوتا تو سب کے سامنے چار چٹ کی لگا ہوتا۔ وہ تصور کرتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگیں تو ماہ بانو نے تجزی سے آگے بڑھ کر انہیں سہارا دیا۔ آج یہ فیجیف وزیر امور ت اس کے لیے بہت مضبوط ذحال ثابت ہوئی تھی، ورنہ وہ ایک آوارہ گرد کے انتقام کی زخمیں آکر آدمی رات کو بے سہاراں ہو جاتی۔

☆☆☆

”میرا آبا دے ماسٹر آفتاب آیا ہے سر۔“ عبدالمنان کی اس اطلاع پر اس کے دل میں امید کی کرن جا گئی۔ اسے علم تھا کہ عبدالمنان نے ماسٹر آفتاب کے ذمے حویلی میں کسی ذریعے سے ماہ بانو کا کھوج لگانے کا کام لے رکھا تھا۔ اس وقت ماسٹر آفتاب کی آمد کا مطلب تھا کہ اس کے پاس انہیں دینے کے لیے کوئی اہم خبر ہے اس لیے وہ یہاں آیا ہے۔

”اسے اندر بھیج دو۔“ اپنی تمام تر مصروفیات ترک کر کے اس نے عبدالمنان کو کھمبہ دیا۔

”السلام علیکم سر۔“ اچھے لمحے ماسٹر آفتاب اس کے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔

”وینکو السلام۔“ کہتے ہوئے آفتاب؟“ اس نے معافانہ کرنے کے بعد اسے اپنے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”الشف کا شکریہ ہے۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔ ”اسکول کی کنسٹرکشن کا کام کیسا چل رہا ہے؟ کہیں کوئی رکاوٹ وغیرہ تو کھڑی کرنے کی کوشش نہیں کی گئی؟ میرے پاس زیادہ بندے نہیں ہیں ورنہ میں کام کی نگرانی کے لیے تھکھار کے ساتھ اپنا کوئی آدمی بھجو دیتا۔“ ”نگرانی کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ یہ کام میں اور میرا ساتھی نیچرل چل کر کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے عمل و کرم سے اب تک سارے معاملات ٹھیک ٹھاک چل رہے ہیں۔ جیسا کہ نہیں ذرا تھا کہ چودھری صاحب کی طرف سے کوئی رکاوٹ کھڑی کرنے کی کوشش کی جائے گی تو ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ابھی تک تو ان کے کسی بندے نے اس طرف آکر ہمارا کچھ بھی نہیں لگنا ہے۔ اس معاملے میں انہوں نے بار بار مان لی ہے۔“ وہ بہت خوش لگ رہا تھا۔ خود خبردار کو بھی بتا سکی رکاوٹ کے اسکول کی تعمیر کا کام جاری رہے تو خوشی میں لیکن وہ چودھری کی

عطا الحق قاسمی کی تصنیف ”وصیت نامہ“ کا اکثر حصہ کا وصیت نامہ

گزشتہ دنوں ایک فارسی زبان کی صحیفہ ”گلبرگ“ میں ایک لکھنے والے کے لیے یہ پیر کیا اور عطا الحق قاسمی کی جو کہیں اپنی جگہ بھڑک کر ہی ہر دم سو بولی میں اس دولت مند بزرگ کی شخصیت کھل کر رہی تھی۔ میں نے سب سے پہلے اس شخص کے بیان کے لیے ہی دلائل پھر اسی شخص سے کہیں باہر سے ایک آری ایسٹس اور اب اس شخص سے تہذیبی شادی کرنا بھی سمجھنے کے لیے اس شخص میں ٹھیک کر دیا۔ جان سے گزرنے پہلے کیوں اپنے پاس بھڑک کر مارے ہوئے تھمارے باپ کو لگاؤ اکثر سمجھتے ہیں کہ اس شخص سے تو کوئی کی جیب کافی جاتی ہے پر پھر اپنی کتنی ہڈ نہیں چلایا جاتا؟

☆☆☆

تو میں یاد ہے تمہارے ایک کلاس لیو کو نمبروں کی وجہ سے پاکستان کے کسی میڈیکل کالج میں داخلگیں ملا تھا۔ اسے ماسٹر سے دو ہی دن میں ایسی ہی انیس کی ڈگری کی کواٹھائی نہ آئی تھی مگر اس نے پاکستان دلیس آکر ترقی کے قانون کی ٹیکٹ کھولا الحمد للہ وہ کروڑوں میں ٹھیک ہے ان کے سامعین کا کہنا ہے کہ وہ صرف کروڑوں میں نہیں ٹھیک بلکہ ان کے جانوں سے بھی ٹھیک ہے مگر اللہ کی قدرت و دھما اسے دل گزرنے اور بالکل براہ میں قبرستان ہونے کے بعد وہ قبرستان اسی تک پہنچی طرح انہیں ہوا۔ ابھی وہ لکھی قبروں کی جگہ ہی ہے۔

طرف سے عمل طور پر مطمئن نہیں تھا۔ اس کی فطرت کے بارے میں اس نے اب تک جو اعتراف دلایا تھا، اس کے مطابق وہ ایک متقم مزاج اور کینہ پرور شخص تھا جو موتی اپنے مخالف کو ڈھونڈنے سے نہیں بچتا تھا۔ جو اس، صفہ موتی والا اور دارالامان کی مشن کے عمل کی مثالیں اس کے سامنے تھیں۔ ان سارے حادثات میں جو دھری کے ٹوٹے ہوئے کا ثبوت نہ ملنے کے باوجود اس کا وجد ان کہتا تھا کہ ان احاط کے پیچھے اسی کا ہاتھ ہے۔ اسی نے ماہ بانو کو حفظ فرما کر اور اس سے ہمدردی رکھنے کے جرم میں ان سارے لوگوں کو ٹھکانے لگوا دیا ہے اور اب شاید ماہ بانو کو بھی اس کے ہاتھ چڑھ چکی تھی جس سے وہ اپنی بے عزتی کا انتقام نہ جانے اس اعزاز میں لیتا ہے یا رہا ہو گا۔

”میں نے فیصلہ کیا ہے کہ کتاب شائع ہونے کے بعد مجھے اس کی جو رائے تھی اس سے میں اسکول میں ڈیپجر

دلو اور گئے۔ بچے بہت خوش ہوں گے جب انہیں جھینے کے لیے چھٹی پرانی دیو کے بجائے نئی ویسکس میس کی۔ اس کی کیفیات سے بھر ماسٹر آفتاب جوش و خروش سے اپنے مستقبل کے چان سنا رہا تھا۔

"دیری جاس۔ تمہاری یہ اسپرٹ دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔ میں نے خود بھی فیصلہ کیا ہے کہ نو پرکار گاؤں میں اپنے خرچے پر ایک اسکول بنواؤں گا۔ مختلف دیہاتوں میں صحت کے مراکز قائم کرنے کا ایک منصوبہ بھی زیرِ غور ہے۔ اس سلسلے میں جلد کام شروع ہو جائے گا۔" شہر یار نے اسے سراہتے ہوئے خوش خبری سنائی۔

"یہ تو بہت ہی زبردست فیصلہ ہے! مجھے یقین ہے کہ آپ اس سب پر موجود رہیں گے۔ یہ قطعاً بہت ترقی کرے گا۔" حسبِ توقع ماسٹر آفتاب خوش ہو گیا۔

"میں نے تو ساری زبردست فیصلہ نہیں سنا دیں۔ تم سناؤ تمہارے پاس مجھے سنانے کے لیے کون سی فیصلہ ہے؟"

شہر یار بہت سلیطے سے گفتگو کو اس موضوع کی طرف لے گیا جس کے بارے میں جاننے کے لیے وہ ہر طرح سے یقین تھا۔

"مجھے عبداللہ خان صاحب کا پیغام مل گیا تھا۔ اتفاق سے حویلی میں کام کرنے والی ایک لڑکی رانی سے میری ابھی خاصی واقفیت ہے۔ میرے کہنے پر اس نے سن سن لینے کی کوشش کی تھی لیکن اسے یقین ہے کہ ماہ بانو چودھری انکار کے ہاتھ نہیں لگی۔"

"اسے یہ یقین کیوں ہے؟ ضروری تو نہیں کہ چودھری ماہ بانو کو حویلی لے کر آئے، وہ اسے نہیں اور بھی تو رکھ سکتا ہے۔" اس نے ماسٹر آفتاب کی بات کاٹنے ہوئے خیال غار کر لیا۔

"خیر یہ رانی کے معیار کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ اسے معیار کے ذریعے اس نے یہ بات کفر میں کر دیا ہے کہ ماہ بانو کو دیر سے نہیں لایا گیا۔ ویسے بھی اس کے اس یقین کے پیچھے ایک دوسری وجہ ہے۔ اس نے چودھری کی اس کے خاص بندوں کے ساتھ ہونے والی گفتگو سنی ہے۔ رانی کے مطابق چودھری اپنے بندوں پر سخت ظناور ہاتھ کر رہے ہیں۔ وہ بھی ایک ماہ بانو کو نہیں دھوئے تھے۔ اس نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ اگر وہ چار دن اور اس کے بندے ماہ بانو کو دھوئے تو اس میں ناکام رہتے ہیں تو وہ انعام کے لالچ کے ساتھ ماہ بانو کی تصویر اخباروں میں چھپوا دے گا۔ تصویر اخبار میں چھپنے کے بعد وہ اپنے آپ کو چھپانے میں کامیاب نہیں ہو سکے گی اور کوئی نہ کوئی لالچ میں آخر اطلاع ضرور دے دے گا۔"

"چودھری کے پاس ماہ بانو کی تصویریں کہاں سے آئیں؟" ماسٹر آفتاب کی دی ہوئی اطلاع پر وہ چلا۔

"میں کہا جاسکتا ہے؟ لیکن رانی نے خود چودھری کے کمرے کی صفائی کرتے ہوئے اس کے کچلے کے نیچے ماہ بانو کی تین چار تصویریں دیکھی تھیں۔ وہ پتہ رانی کی تصویریں کالج کے پو پتھار میں اور کسی تقریب وغیرہ میں شرکت کے موقع کی ہیں اور کوئی بھی تصویر گاؤں میں جاتی ہوئی نہیں تھی۔ شاید چودھری نے نور اور غیاث محمد کے ذریعے فیصلہ آباد سے یہ تصویریں منگوائی ہوں۔" ماسٹر آفتاب کے چش کروہ اس خیال کی اس نے تردید نہیں کی لیکن اس کا ذہن حور اور مسند کے لڑکی کی واردات میں الجھا رہا۔ اسے ملنے والی اطلاعات کے مطابق صفحہ کا محمد واردات کے بعد بری طرح بکھری ہوئی حالت میں ملتا تھا۔ گھر کی حالت دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ کسی نے وہاں کی تباہی کی ہو۔ اگر اس واردات میں چودھری کے بندے ملوث تھے تو اس بات کا سو فیصد امکان تھا کہ انہوں نے ہی وہاں سے ماہ بانو کی تصویریں حاصل کر کے چودھری کو پہنچائی ہوں۔ ماسٹر آفتاب کی فراہم کردہ معلومات نے جہاں اسے یہ یقین دہانی دے کر ماہ بانو کی ایک تصویر کے فروغ ہاتھ نہیں لگی، وہیں وہ اس پریشانی میں بھی گھر گیا تھا کہ خود کہاں ہے اور کس مشکل میں پھنسی ہوئی ہے؟ آزاد ہونے کی صورت میں اسے یہاں رانی کی کوشش کرنی چاہیے لیکن اس سوچ کے ساتھ اسے دوسرا خیال بھی آیا کہ وہ سکتا ہے اس نے ڈر کر اس طرف کا رخ نہ کیا ہو۔ اس علاقے میں آنے کی صورت میں چودھری کی نگہوں میں اس کی تصویریں شائع ڈرتھا۔ لیکن اب چودھری اخبار میں اس کی تصویریں شائع کر دے گا جو کام کرنے جا رہا تھا۔ اس سے ماہ بانو کے لیے خطرہ بہت بڑھ جاتا۔ اس خطرے کے پیشِ نظر تو اس نے رفیق کو گھر کو اخبار میں اس کا لالچ بھانپنے سے روک دیا تھا کہ کسی کوئی اسے پکڑا نہ لے اور وہ اپنی ماہ بانو میں خیر محفوظ ہو جائے۔ اب چودھری انعام کے لالچ کے ساتھ باقاعدہ تصویر چھپوا تا تھا وہ کسی کی بڑھ جاتا۔ کوئی دارالامان، فلاحی ادارہ یا کسی بھروسہ دار گھر۔ کسی بھی جگہ جہاں وہ چھپی ہوئی تھی، ایسا کوئی فرد ہو سکتا تھا جو لالچ میں آکر چودھری کو اس کا ٹھکانا بتا دے۔

"آپ کس سوچ میں پڑ گئے سر؟" اس کی خاموشی کو محسوس کر کے ماسٹر آفتاب نے اسے ٹوکا۔

"نہیں، کچھ نہیں۔ بس میں کچھ معاملات پر غور کر رہا تھا۔ جہاں بہت بہت گھر یہ کہ تم نے ہمارے ساتھ تعاون کیا۔"

رانی کا نکلا

بچہ امید ہے کہ ابھی وہ جہاں اتار دیا ہمارے ساتھ رہے گا۔" اس بات کا تو آپ سو فیصد یقین رکھیں۔ آپ اور میں ایک ہی شخص پر کام کر رہے ہیں اس لیے یہ ممکن نہیں کہ میں آپ کی مدد سے بھی انکار کروں۔" وہ شہر یار کے جملوں سے ملاقات کا وقت ختم ہونے کا اشارہ بھابھ گیا تھا۔ اس لیے خود بھی گفتگو کو اختتامی رخ دیتے ہوئے اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور مصافحہ کرنے کے بعد روانہ ہو گیا۔

"کچھ کھانے کو دو؟" امان بڑی بھوک لگ رہی ہے۔" نور ان ایسا کام نہ ہاتھ دھلا کر اسے ایسے ہی در سے کی طرف دھکیلنے کے پکڑ میں بھی لگن و رات بھی بھوکے پیٹ سوا تھا اس لیے اس وقت کی بھوک سے پر راضی نہیں تھا۔

"ابھی ایسے ہی چلا جا۔ دیر ہو رہی ہے، واپس آکر کھانا کھا لینا۔ اگر در سے دیر سے پہنچا تو مولوی صاحب کی مار کھانی پڑے گی۔" نور ان نے اسے سمجھا تھا کہ اور زار ادھکا کر ایسے ہی در سے جانے پر راضی کرنے کی کوشش کی۔

"میں کھاناں کا بار، پر تم مجھے کچھ کھانے کو دو۔" وہ بھی اپنی مند پر اڑا ہوا تھا۔

"کہاں سے دوں تجھے کھانے کو۔ گھر میں اناج کا ایک دانہ بھی نہیں ہے۔ جا۔ جا کر اپنے باپ سے بول دو کہے گا کہ میرے دوڑخ کا بندوبست۔" وہ خود بھی بھوکے تھی اس لیے بچے کی مسلسل مند پر چڑھی۔

"میں کیا اپنی بوٹیاں کاٹ کر تیرے لاؤں گے کو کھلاؤں۔ کتنی ہے تو کھلا دیتا ہوں۔ تیری جی ہوئی ایک اولاد میرا غضب تو پہلے ہی کھا گئی ہے، اس دوسرے کو میں اپنا آپ کھلا دوں۔" غیاث محمد جی میں بھی چار پائی پر سیدھا لیتا تھا۔ نور ان کی بات اس کے کان میں پڑی تو بلند آواز میں اسے چڑچڑے پن کا مظاہرہ کرتے لگے۔ ماہ بانو کے غائب ہو جانے سے اس کا خرت دار بننے کا خواب جو نوٹا سوٹا تھا، ساتھ ہی فاقوں کی نوبت بھی آگئی تھی۔ کئی دن ہوئے چودھری نے اس کے کام پر آنے پر پابندی عائد کر دی تھی۔ نور ان کا بھی حویلی میں داخلہ بند ہو چکا تھا۔ ایسی صورت میں ان کا دال دلی آخر کس طرح چلتا۔ چودھری کے عتاب کا نشانہ بننے والے کس کے تو سامنے سے بھی گاؤں کا یہ فرد بدانتہا تھا اس لیے کسی یار دوست سے بھی مدد کی کوئی توقع نہیں تھی۔ یار دوستوں کا کیا ذکر یہاں تو اپنے بکے بھائی اور بھائی کے دوستوں کے ساتھ موزاں تھا۔ بیٹیاں الگ اپنے اپنے گھروں میں مجبور بیٹھی تھیں۔ غیاث محمد کے گھر میں فاقے نہ اترتے تو کیا ہوتا۔

رات

سرکاری افسر کو تین چار گھنٹوں کے ساتھ اپنی دکان کی طرف آتا دیکھ کر اس نے اپنی حالت ٹھیک اور جلدی سے کھانے سے کھڑکھار کیا۔ ہاتھ جوڑ کر انہیں سلام کیا اور کھانے کے لیے اپنی بھوکے کے پلو سے کرسیاں صاف کرنے لگا۔

دو لوگ کرسیاں پر بیٹھ گئے۔ ان کے کھانے کے لیے تنگ میو اور پینے کے لیے پھولوں کا رس آگیا۔ افسر نے کھانے پینے کے بعد اپنی مونچھوں پر انگلیاں بھریں اور دکاندار سے حساب کتاب کا رجسٹر لے کر چلنے پھرنے لگا۔ ایک صفحے پر اس کی نظر پڑی۔ وہ حیران بھی ہوا اور سکر لیا بھی۔ اس نے دو صفحے اپنے ہاتھوں کو دکھایا۔ وہ کئی چارہ کر سکتا ہے۔

"کیسے لوگ ہیں؟" افسر نے کھانے کے لیے کتے کو ڈالی گئی، رانی کے کھانے کا خرچہ گمراہی سے دیکھ رہی تھی۔

کھلے ہوئے صفحے پر لکھا تھا۔

"12-2-89" کتے کا کھانا 50 روپے۔

دکاندار بھی سی سی کرنا ہوا ان کے ساتھ ہنسنے لگا۔ تموزی دیر بعد دو لوگ چلے گئے۔

دکاندار نے رجسٹر دوبارہ کھولا۔ خشک میوے سے لے کر جس تک سارا خرچہ جو زار و زر میں ایک ہی نظر تھی۔

29-8-89 کتوں کا کھانا 150 روپے۔

(ہندی بھائی ارب۔ روشن حور)

(انتخاب۔ غم ایساں چو بان، کراچی)

”جائے پترا! ابھی چپ کر کے پڑھنے چلا جا۔ پڑھنے کے بعد اللہ سے دعا کرتا کہ وہ ہمارے کھانے کے لیے کچھ بندوبست کر دے۔ اللہ تعالیٰ دعا ضرور سنے گا۔“ غیاث محمد کا از حد مجرا ہوا مزاج دیکھ کر نوران نے ایک بار پھر بیٹے کو سیبھانے کی کوشش کی۔ کچھ دیر قبل وہ لوگوں کے گھروں کے باہر پڑے سبز اور بھلے کے جھنگلے چن کر لائی تھی اور رات بھر سے میں، اس کرتی بھوک بکری کے آگے وہ جھنگلے ڈال کر اس کی میں میں بند کرنے کا انتظام کیا تھا۔ اسے امید تھی کہ بکری کا پیٹ بھرے گا تو اس کے سوتھے ہوئے تھن سے ایک بار پھر دودھ کی دھار نکل کر ان کے پیٹ کی آگ بجھانے کا بندوبست کرے گی۔ کھیتوں کی طرف ان میاں بیوی کا داخلہ بالکل ممنوع ہونے کی وجہ سے وہ اس معصوم جانور کے پیٹ بھرنے کے لیے بھی کچھ کرنے سے قاصر رہتے تھے۔ اور یہ تو شاید ساری دنیا کا اصول ہے کہ کسی سے کچھ پانے کے لیے پہلے اسے کچھ دینا پڑتا ہے۔ وہ بکری کو اس کے پیٹ بھرنے کا سامان مہیا نہیں کر پائے تھے تو وہ ان کے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے اپنا دودھ کیسے دان کرتی۔ پھلوں اور پزیروں کے جھنگلے جمع کر کے اسے کھانے کا خیال نوران کو صبح کی میں جھانکنے کے بعد آیا تھا۔ لوگوں کے گھروں کے سامنے پڑے جھنگلے سینے کا یہ کام بہت ذلت آمیز تھا لیکن وہ باپائی پیٹ کی خاطر سب سے نظریں چرا کہ یہ کام کرنا ہی تھی اور اب بکری کی طرف سے امید باندھ کر بیٹھی ہوئی تھی لیکن فی الحال تو اس کے پاس ایسا کچھ نہیں تھا کہ ایسا کو کھلا پلا سکی۔ بالآخر وہ اسے بھلا پھلا کر دے رواند کرنے میں کامیاب ہوئی۔

”چودھری صاحب نے صاف کہا ہے کہ جب تک ماہ بانو زائدہ یا مردہ نہیں مل جاتی، وہ ہرگز ہمیں معاف نہیں کریں گے۔ اب تو رب سے دعا کرتے ہو وہ بھیوں جلی نہیں سے سر پڑ کر ہی تسلی مل جائے تو ہماری جان اس عذاب سے چھوٹے۔“ ایساں کے بسور تے ہوئے گھر سے روانہ ہونے کے بعد غیاث محمد نے طے ہوئے انداز میں نوران کو مشورہ دیا۔ اس نے یہ مشورہ سنا اور خاموشی سے گھر کے کام ننانے میں مصروف ہو گئی۔ گھر میں کرنے کو کام ہی کیا وہ گیا تھا۔ صفائی سقرائی کے بعد وہ بالکل فارغ تھی۔ کچھ پکانے کو تھا نہیں جو باندھی چڑھتی اور جب کچھ پکایا کھا پانی نہیں گیا تھا تو دھلنے والے برتن بھی کہاں سے آتے۔ جو پانی کی مشقت اور مصروفیت کی عادی نوران اندر باہر کے پھر کچھ وقت کاٹنے کی کوشش کرنے لگی۔ حالانکہ اسے معصوم تھا کہ یہ چند گھنٹے آگے سر کریں گے تو ایساں کھانے کے مطالبے کے ساتھ ایک

بار پھر گھر آدھکے گا۔ دو مختلف کیفیات میں گھری وہ بھی اس وقت غیاث محمد کی طرح بھی تنہا کر رہی تھی کہ زندہ یا مردہ کسی بھی حال میں ماہ بانو مل جائے تو یہ عذاب ان پر سے نٹے۔ اس ایک کی قربانی دے کر وہ سب امن میں آسکتے تھے اور اب تو وہ سوچ رہی تھی کہ قربانی کی بھی کیا بات تھی۔ اگر ماہ بانو زندہ و حالت میں چودھری کو مل جاتی تو اس کی زندگی حوالی میں عیش کرتے ہوئے ہی گزارتی۔ کم از کم فاقوں سے مر جائے کے مقابلے میں تو اس کے نزدیک ہر طرح کی زندگی بہتر تھی۔ انہی لابی سوچوں کے درمیان بالآخر وقت گزری گیا اور ایساں در سے سے واپس آ گیا۔ اسے غصہ تھا کہ وہ آتے ہی کھانے کے لیے بانک لگے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس نے اپنا سارہ حلق پر رکھنے کے بعد آرام سے ڈنڈ پسپ سے پانی نکال کر منہ ہاتھ دھو یا اور بکری کے ساتھ چھلپیں کرنے لگا۔

”ایساں پترا! تجھے بھوک تو نہیں لگ رہی؟“ نوران نے زور سے زور سے اس کے قریب آ کر سوال کیا۔

”نہیں اماں! میں نے تو کھانا کھالیا۔ در سے میں سارہ پڑھنے کے بعد میں نے اللہ میاں سے دعا مانگی کہ مجھے کھانے کے لیے کچھ دے دو۔ میں دعا مانگ کر آ رہا تھا تو مولوی صاحب نے روک لیا کہ کھانا کھا کر جانا۔ بڑا احسن کا گوشت کا ساٹن تھا ان کے پاس کھانے کے لیے۔“ ایساں نے یوں چٹکار دیا جیسے ابھی تک زبان پر اس گوشت کا ذائقہ محسوس کر رہا ہو۔ نوران جانتی تھی کہ مولوی صاحب کے لیے جو پلے سے کھانا آتا تھا۔ گاؤں کی اکوئی مسجد کا مولوی غلام محمد، چودھری کا مشفق نظر تھا اس لیے خوب مزے میں رہتا تھا۔

”اور باں اماں! میں در سے سے واپس آ رہا تھا تو مجھے دیکھا کہ گھر کے باہر لوگوں کی بھجڑ کھائی دی تھی۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ آپا کی طبیعت خراب ہے، اسے شہر کے اسپتال لے کر جا رہے ہیں۔“ ایساں کو یک دم یاد آیا تو اس نے نوران کو اطلاع دی۔ اس اطلاع کو سن کر وہ بے چین ہو گئی۔ نگاری طرف سے خوش خبری سن کر جو اطمینان ہوا تھا، اب اس کی طبیعت کی خرابی کا سن کر بے چینی میں ڈھل گیا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ نگار کے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ وہاں اب بھی تین چار عورتیں کھڑی ہوئی تھیں البتہ نگار کو اسپتال لے جایا جا چکا تھا۔

”دودن سے بڑی بری حالت تھی بے چاری کی۔ درد رک ہی نہیں رہا تھا۔ دانی بے چاری نے تو اپنے سارے نوٹے اور دو ایمیں آزمائیں، پھر تھک ہار کر کہہ دیا ہی ممتاز سے کہ اپنی نون کو شہر کے اسپتال لے جاؤ۔ بڑی مشکل سے بہا

انور نے شہر جانے کے لیے گدڑی کا بندوبست کیا ہے۔ اب رہ کرے گا وہ چار دیواری نگار کی جان اور اس کا بچھڑ چکا ہے۔ جاتے وقت وہ جس بری طرح درد سے بے حال بھی مجھے توڑ ہی لگا رہا تھا۔

”ہاں، اللہ جانے ایک ایسا ہی کڑی کو کیا ہو گیا۔ اتنی مشکل سے تو گود بڑی ہونے کی خوشی بھی اسی اور بچی کیوں تو موت اپنی نوں کا خیال بھی بڑا رکھ رہی تھی پھر جانے ایک ایسا ہو گیا کہ چلتی چلتی کڑی کو درد شروع ہو گیا۔ وہ غور میں اس سے براہ راست مخاطب نہیں ہو رہی تھی لیکن ان کے تیروں کے نتیجے میں اسے ساری معلومات حاصل ہو گئی تھیں۔ وہاں رکنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا اس لیے وہ واپس گھر چلی آئی اور غیاث گھر کو ساری تفصیل سنائی۔

”تو اطمینان رکھ۔ گدا کو یہ خوشی میرا رکے اور سے ملی ہے۔ اس خوشی کو کچھ نہیں ہوگا۔ غیاث مجھ سے اسے ملی دی۔“
 ”پر جب میرا کڑی کی آواز دہی ہم سے خوش نہیں تو وہ ہمیں کوئی خوشی کیوں دیں گے؟ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ کوئی سزا ہے۔“
 ”تو رال سے حد خوف زدہ بھی۔ شرم کے اندھروں میں جکڑے ذہن اسی طرح سے خوف اور اندھنوں میں جکڑا رہے ہیں۔ شام و صبح جب نگار کی لاش گاؤں واپس آئی تو اس کا وہم حقیقت میں داخل کیا۔ سب سے پہلے سانس سے ناواقف اوہام اور ہشوک میں جکڑا ہوا کڑی نے نہیں سمجھی کہ وہ جس خوش خبری کو کچھ سرکاری دین تھا۔ اس کا دل روز سے ہی نگار کا نصیب نہ بننا ہے۔ افسوس کی فوج پلست پائیس کے بجائے قلمو میں غیب میں ہوئی تھی جہاں کرگھ کا ہونا ممکن ہی نہیں تھا۔ اگر نگار کو کوئی باہولت اسپتال میسر ہوتا تو اب اس میں ہی انٹرناسائز کے ذریعے یہ بات سامنے آجاتی اور بچنے کی قربانی دے کر اس کی جان بچائی جاتی۔ اب تو وہ بے چاری شدید تکلیف سہنے کے بعد غیب کے برست ہو جانے کے نتیجے میں اپنی جان سے چلی گئی تھی۔ دوسری طرف اس کی انجمنی مفیدت کا شکار ماں کے ذہن میں یہ خیال راسخ ہو گیا تھا کہ ایسا بچہ سرکار کے غیظ و غضب کی وجہ سے ہوا ہے۔ اس غیظ و غضب کی وجہ سے جو چہرہ انجمنی راجہ کی ناراضی کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔

☆☆☆☆

”کون ہے؟“ رات کافی گزر جانے کے باوجود اس کے کمرے کی جی جی رہی تھی اور وہ بڑے انہماک سے لکھنے میں مصروف تھا۔ دروازے پر اچھڑنے والی غیر متوقع دستک نے اس کے انہماک میں غفلت ڈالا اور میر پر دائیں جانب

رکے ہاتھ میں کی طرف ایک نظر ڈالنے کے بعد اس نے بلند آواز میں سوال کیا۔
 ”میں ہوں ماسٹر صاحب! رانی۔“ جواب میں باہر سے سرکشی سے کچھ بلند آواز سنائی دی۔

”رانی! اس وقت...“ حجت سے بڑا اتے ہوئے اس نے دروازے کا رخ کیا اور کچھ گڑی۔ فوراً ہی بڑی سی چادر میں لپیٹ کر ایک ٹریک اندر داخل ہوئی اور پلٹ کر تیزی سے دروازہ بند کر دیا۔ کمرے میں موجود روشنی میں دو لڑکیاں کواچھی طرح دیکھ سکتی تھیں۔ وہ لڑکی رانی نہیں تھی۔

”آپ کو یہاں نہیں آتا چاہیے تو جانی لی؟“ پچھان کا مرحلہ طے ہونے ہی اس نے آنے والی کوٹھا۔
 ”میں شاید نہ آتی لیکن آپ نے مجھ کو روک دیا۔“ وہ دیر سے سے بولی ہوئی اس کمرے پر جا چکی تھی پر کچھ دیر تک وہ بیٹھا ہوا تھا۔

”میں نے۔ میں نے کب آپ کو مجبور کیا یہاں آنے پر؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”کسی کی بات کا جواب نہ دیا جائے تو میرا سے جواب لینے کے لیے خود چل کر تباہی پڑتا ہے۔“ وہ اپنے غلطی کے جواب میں اقرار کی ہوئی خاموشی کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ ماسٹر آفتاب نے ایک گھبراہٹ سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ چوتیس پچیس سال کی اچھی خاص خوش چل اور خوش بدن لڑکی تھی۔ ناگہانی مہرے کی پابندی نے لاشعوری طور پر اس میں ایک پُر غور محنت پیدا کر دی تھی۔ وہ سوالیہ من کر آتی تھی لیکن اس کا انداز شہزادہ اویں کا سا تھا۔

”جواب تو میں نے دے دیا تھا۔ کیوں اس راہ پر چلتی ہیں جس پر کانٹے ہی کا کٹے بچھے ہیں؟ اس راہ پر چلیں گی تو بدول کو دکھوں کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔“ اس نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”دل کو جو درد لگا ہے، اس کے بعد لگتا ہے کہ ہر ذمہ بے معنی ہے۔“
 ”آپ سمجھتی ہیں نہیں ہیں؟ اگر کسی نے آپ کو یہاں دیکھا تو قیامت آجائے گی۔ آپ نے تو یہاں آتے ہوئے یہ تک نہیں سوچا کہ میں یہاں تھا نہیں رہتا۔ اگر اس وقت میرا ساتھی بچہ یہاں ہوتا تو آپ کیا کرتیں؟“ وہ اس کا جواب سن کر ہنسیلا دیا۔

”مجھے معلوم تھا کہ آج آپ تباہ ہیں اور آپ کا ساتھی اپنے گھر والوں سے ملے گیا ہوا ہے۔ میں نے رانی سے سب کچھ معلوم کروا لیا تھا۔“ اس نے اعتراض جرم کرنے والے

انداز میں بتایا۔
 ”آپ اس وقت آئی کیسے ہیں؟ کیا رانی آپ کو لے کر آئی ہے؟“ آفتاب نے چونک کر سوال کیا۔

”ہاں۔ رانی نے ہی میری خاطر یہ غلطی مول لیا ہے۔ باہر وہ اور اس کا سمجھتا رہتا ہے میں بیٹھے ہیں۔“ اس نے بتایا۔
 ”مجھے بڑی حیرت ہے۔ آخر آپ نے رات کے اس پہاڑی حویلی کی اونگھ اونگھ دیواروں کے درمیان سے یہاں آنے کی راہ کیا کیسے؟ آپ کو اپنے پڑے جانے کا خوف محسوس نہیں ہوا؟“ وہ پریشان سا کمرے میں گھومنے لگا۔

”حیرت کی بجائے کیا بات ہے؟“ آپ نے سنا نہیں کہ جہاں جا وہاں راہ۔ ویسے بھی دیوار میں کھنچا ہوا مضبوط ہوں، ان کی قید سے گھبراہٹ سے ہی چوراستے بنائے جاتے ہیں۔ رسی ڈرنے کی بات تو اب کسی بات سے ڈر نہیں لگتا۔ دلی آج کل جس لے پر رہ رہا ہے، وہ وہ اتنی خوب صورت ہے کہ کسی بد صورتی کا خیال ہی نہیں آتا۔ ایسا لگتا ہے کہ اس کیفیت میں اگر موت بھی آئی تو وہ بھی بہت خوب صورت ہو گی۔“ وہ بڑے جذب سے بول رہی تھی۔

”لیکن پھر بھی آپ کو ایسا...“ وہ اب بھی اسے سمجھانا چاہتا تھا لیکن وہ ایک دم ہی اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی اور اس کے قریب آ کر اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر اسے جملہ محفل نہیں کرنے دیا۔

”ساری حقیقتیں، سارے ذرا اور سارے اندیشوں کو اس وقت بھول جائیں آفتاب! بس یہ سوچیں کہ میں کتنی مشکل سے اپنے آپ کو داؤ پر لگا کر یہاں آئی ہوں۔ میری اس ساری جدوجہد کو بچے وہم اور اندیشوں کی نذر نہ کریں۔ مجھے کچھ دیر کے لیے اس بات پر خوش ہونے دیں کہ میں آپ کے ساتھ آپ کے پاس ہوں۔“ اس کی اگلیاں اب بھی آفتاب کے ہونٹوں پر تھیں۔ نرم و گدگد اذان چھوٹی ان اگلیوں کے کس نے اس کے ہونٹوں پر قفل ڈال دیا تھا۔

”میری زندگی کی حقیقتیں اتنی تباہ ہیں کہ میں سوچتی تھی میرا کسی خواب پر کوئی حق نہیں۔ میں تو صرف انھوں کی دنیا میں رہ کر اپنی زندگی گزار رہی تھی لیکن پھر جانے کیا ہوا؟ جس دن سے آپ کو دیکھا خواب خود ہی خود میری آنکھوں میں اترنے لگے۔ میں نے کوشش بھی کی، پر ان خوابوں کو اپنی آنکھوں سے فوج کر بھیجے کی بہت نہیں کر سکی۔“ وہ دوبارہ کمری پر جا بیٹھی تھی اور سر ہٹکا لے اپنی کیا بات بتا رہی تھی۔
 ”محبت بڑی عجیب چیز ہے۔ یہ ایک وقت آدمی کو بہت مڑول اور بہت بہادر بنا دیتی ہے۔ میں اس بات سے بہت

ڈرتی ہوں کہ مجھے میرے خوابوں سے دست بردار ہونے کا حکم دیا جائے، دوسری طرف مجھے کسے سے کوئی خوف نہیں آتا۔ مجھے اس بات سے بھی ڈر نہیں لگتا کہ میں اس جرم میں جان سے مار دی جاؤں گی۔ ہاں میں اس بات سے ضرور ڈرتی ہوں کہ آپ میری محبت کو کھرا دیں گے۔ میں آپ کو اس قاتل نہیں لگوں گی کہ آپ میری محبت کو قاتل کر سکیں۔ مگر پھر بھی میں آپ سے یہ سوال کرنے یہاں آئی ہوں۔ کیا آپ میری محبت کو قاتل کریں گے آفتاب؟“ بچے کے ساتھ سوال کرنی کٹھور کے چہرے پر راتی چائی تھی کہ وہ جواب تک ساکت کھڑا کھڑی تھی میں جواب نہیں دے سکا۔ ایک ٹریک جو بہت کمزور تھی صرف اس کی خاطر، اس کی چاہت میں سارے پہرے تو ڈر، اپنی جان کی پروا کیے بغیر رات کے اس پہاڑی محبت کا ہموں تختے کے کراس کے در پر آئی تھی۔ وہ اسے اپنی لوٹا بھی چاہتا تو اتنی بہت کہاں سے لا؟ وہ تو خود اس شدت کے سامنے ہارنے لگا تھا۔

”میں اٹھتا ہوں ہوں شکر لی بی کہیں مانگے خود چل کر اپنے در پر آئے والے خدا کے سب سے بڑے بچے کو ٹھکانے کی بہت کر سکیں۔ میں آپ کے جذبے کی دل سے قید کر رہا ہوں لیکن میری آپ سے درخواست ہے کہ آئندہ بھی خود کو یوں خطرے میں مت ڈالیں گے۔ آپ کو کوئی نقصان پہنچا تو مجھے بہت تکلیف ہوگی۔“ جانے کون سا مہر تھا جس کے ذرا اثر اس نے کٹھور کے قریب کھنکھوں کے جی بیٹھے ہوئے اس کا ہاتھ قلم کر کے بیٹھے ادا کیے۔ شکر اس کے الفاظ سن کر کھل گئی۔

”آپ کی بات میرے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے آفتاب! آئندہ میں بھی اسی طرح یہاں نہیں آؤں گی۔ میں حویلی کی بلند دیواروں کے بیچ سانس لیتے ہوئے اس وقت کا انتظار کروں گی جب محبت اپنا کوئی مجرہ دکھائے گی۔“ اس نے بہت جذب سے یہ جملے کہے اور اپنے ہاتھ پر رکھے آفتاب کے ہاتھوں کو انھوں سے لگا کر واپسی کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ آفتاب نے خود اپنے ہاتھوں سے اس کے لیے دروازہ کھولا۔ وہ خوشبو کے ایک سنگ رومجھو کی طرح اس کے قریب سے گزر کر باہر نکل گئی۔ باہر تاریکی میں وہ لگا کھڑا تھا جس میں رانی اور اس کا سمجھتا مختصر تھے۔ بڑی سی چادر میں چہرے سمیت اپنا سارا وجود چھپائے وہ تانگے کے قریب پہنچی اور تانگے میں سوار ہونے سے پہلے پلٹ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا۔ آفتاب کا ہاتھ بھی خود ہی خود ہی اٹھ گیا۔ وہ پردہ لگاتے تھے میں سوار ہوئی

تو تاجی حرکت میں آگیا۔ حرکت کرتا ہوا تاج تاریکی کا حصہ بن کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ تب بھی وہ بہت دیر تک ٹوٹی کواڑ تھا سے سائت و مسامت کھڑا رہا۔ کچھ دیر تک جو کچھ ہوا تھا خود اس کی اپنی جگہ سے بھی باہر تھا۔

☆ ☆ ☆

خط کا مضمون پڑھنے کے بعد اس نے خط والے لفظانے کوالت پلٹ کر دیکھا۔ یہ نیکے نیلے رنگ کا قلمی خط و کتابت کے لیے استعمال ہونے والا عام سا لفظ تھا۔ لفظانے پر اس کے آٹس کا چٹا لکھا ہوا تھا لیکن خط لکھنے والے کا چٹا موجود نہیں تھا۔ لفظانے پر لکھی ڈاک خانے کی مہر ذرا سی ٹوٹنے کے بعد آرا سے پر مٹی جاسکتی تھی اور اس مہر سے ظاہر تھا کہ یہ خط نو رکوت کے ڈاک خانے سے بھیجا گیا ہے۔ عام ڈاک سے آنے والے اس خط نے انہیں اچھی خاصی الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ معمول کے مطابق دفتر کے پتے پر آنے والی ڈاک کو پہلے عبداللہ انان نے دیکھا تھا۔ عام نویت کی ڈاک کو ہمیشہ وہی دیکھتا تھا اور پھر وہ خطوط جن میں کوئی توجہ طلب مسئلہ ہوتا تھا، انہیں فائل کر کے شہر یار کے سامنے پیش کر دیتا تھا لیکن آج صبح کی ڈاک سے آنے والا یہ خط اتنا عجیب و غریب تھا کہ وہ چونک گیا تھا اور باقی خطوط کے ساتھ اسے فائل کرنے کے بجائے فوری طور پر شہر یار کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔ خط کے مضمون نے اسے بھی الجھن میں ڈال دیا تھا اور وہ ایک بار اسے پڑھنے کے بعد پھر وہ بارہ پڑھ رہا تھا۔ شکت لکھائی میں املکی لا تعداد غلطیوں کے ساتھ دیہاتی طرز گفتگو میں لکھے گئے اس خط کے نفس مضمون سے ظاہر تھا کہ خط لکھنے والا بہت معمولی تعلیمی استعداد کا مالک ہے۔ خط بچوں کے اسکولوں میں استعمال ہونے والی مشکل لائن کی کاپی کے صفحات پر لکھا گیا تھا۔ نیلے بال پر اہنت سے لکھے گئے اس خط کو پڑھنے کے لیے ٹھوڑی جدوجہد سے کام لینا پڑ رہا تھا۔ خط لکھنے والے نے ابتدا میں باقاعدہ اسٹینٹل مختصر صاحب کا خطا خط استعمال کیا تھا لیکن اسے کی غلطی کی وجہ سے اسٹینٹل کھشک لفظ اسٹینٹل کھشیر پر جا جا رہا تھا۔ یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں تھی۔ دیہاتوں کے معمولی پڑھے لکھے کسے کسے کے ہاتھوں لکھے گئے خطوط میں اس طرح کی غلطیاں عام ہوتی تھیں مگر جو خط اس کے ساتھ میں تھا، وہ اس اعتبار سے مختلف نویت کا تھا کہ اسے سمجھنے والے نے نہ تو لفظانے کے بارے پر اور نہ ہی خط کے آخر میں اپنا نام لکھا تھا۔ یہ خط کسی ذاتی ضرورت یا سسٹے کی نشان دہی کے لیے نہیں لکھا گیا تھا۔ اس میں ایک اطلاع فراہم کی گئی تھی اور وہ اطلاع اس نویت کی جگہ کہ خط لکھنے والے کا اپنا نام

جیسا کچھ آتا تھا۔ خط لکھنے والے نے ابتدائی طور میں اپنا جو مختصر سا قارف لکھا تھا، اس کے مطابق وہ چودھری افتخار کے لیے کام کرنے والے کارندوں میں سے ایک تھا لیکن دراصل وہ چودھری کے ساتھ رہ کر موتی والا کے لیے کام کرتا تھا۔ موتی والا سے اسے اپنی اس وفاداری کی باتا بعد قیمت مٹی تھی۔ موتی والا کی موت پر گھر سے رنج و گمراہی اٹھار کر تے ہوئے اس نے شک ظاہر کیا تھا کہ اس کے گھر میں چودھری کے بندے ملوث ہیں۔ خط لکھنے والے کے مطابق وہ جنگی میں کام کرنے والے آدمیوں میں سے ایک تھا اور شہر یار کو بھجلی بارکزی کی اسمگلنگ سے متعلق دی جانے والی اطلاع کے لیے اسی نے معلومات فراہم کی تھیں۔ اس نے بڑے جذباتی انداز میں لکھا تھا کہ اب تک وہ معاوضہ لے کر ہر کام کرتا رہا تھا لیکن اس بار بندہ جب الوطنی نے اسے اس بات پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ جنگی سے کوئی جانے والی قومی دولت کو بچانے کے لیے کوئی قدم اٹھائے۔ اس نے اپنے خط میں واضح کر دیا تھا کہ وہ ایک گریب اور بے حیثیت آدمی ہے اس لیے خود سامنے آنے کی بھی ہمت نہیں کر سکتا لیکن دل سے اس بات کا خواہش مند ہے کہ ملک کے ساتھ دشمنی کرنے والے اور قومی دولت کو لوٹنے والوں کی روک تھام کے لیے کچھ کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے اپنا فرض ادا کر تے ہوئے اس نے اطلاع دی تھی کہ چوتیس تاریخ کو شہر بارہ بیک کے بعد سفید رنگ کی ایک بڑی سوزو کی پک اپ ابتدائی پروسس سے گزری ہوئی گاٹوروں کی کمائیں کے ترختل سے باہر جانے کی۔ اگر آپ چاہیں تو اس سوزو کی پک اپ کو روک کر اسمگلنگ کے اس مال کو پکڑ لیں اور ساتھ ہی اصل بھرموں تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

”تمہارا کیا خیال ہے اس خط کے بارے میں؟“ وہ بارہ پورا خط پڑھنے کے بعد اس نے دو تین صفحات پر مشتمل اس خط کو تکررے واپس لفظانے میں رکھتے ہوئے عبداللہ انان سے پوچھا۔

”جتنی طور پر تو سمجھیں کہا جا سکتا ہے۔ لیکن بھجلی بارہ کے حوالے سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ خط لکھنے والا یہ بندہ موتی والا کے لیے کام کرتا رہا ہے۔ یقیناً چودھری افتخار جیسے بندے کے ساتھ کام کرتے ہوئے موتی والا مکمل طور پر اس پر اعتبار نہیں کرتا ہوگا اور اس نے اپنے کچھ تجربہ و اس کام پر لگے ہوئے ہوں گے کہ وہ کسی بھی غیر موثر بات کی اطلاع اسے پہنچا دیں۔ شاید بھجلی بارہ موتی والا نے ہمیں جو نوڈرز کے نمبر و نمبر فراہم کیے تھے، وہ اپنے اس آدمی کے

ذریعے ہی حاصل کیے ہوں گے۔ چودھری کے ساتھ رہ کر اس کے مطالبہ برداشت کرنے والے کسی بندے کے لیے موتی والا مقابلہ ایک مہر بنی آدمی رہا ہوگا۔ موتی والا کی موت پر صدمے کا شکار ہونے والا شخص حق نمک ادا کرنے کے لیے اتنی ہزارت کر سکتا ہے کہ اس کے مشن کو سمجھتے ہوئے چودھری کو رک بچانے کا ایک موقع فراہم کرنے کی کوشش کرے۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے کہ کم از کم اس اطلاع پر کوئی کارروائی کرنے میں، میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔ اطلاع صح اور غلط دونوں ہونے کے پاس برابر ہیں۔ ہم کچھ کوڈ بن میں رکھتے ہوئے اپنی کارروائی کرتے ہیں، ہو سکتا ہے ہمیں کامیابی ہو جائے۔ اگر ناکامی بھی ہوتی تو کوئی حرج نہیں۔ کچھ نہ کرنے سے کچھ کر کے ناکام ہونا بہتر ہوتا ہے۔“ عبداللہ انان کی تائید کرتے ہوئے اس نے اپنا فیصلہ سنایا۔

”لیکن ہم اس سسٹے کا کیا کریں گے جس کی وجہ سے بھجلی بارہ بھی ناکامی اٹھانی پڑی تھی۔ اس کام کے لیے ہمیں پولیس سے مدد تو کئی ہی ہوتی۔ اور بھجلی تجربے سے ہم یہ بات واضح کر دی ہے کہ ایسی ہی مقیم تار، چودھری کے گروپ کا بندہ ہے۔ اس کی بعد دیہاتی چودھری کے ساتھ ہیں۔ وہ اس بار بھی ایسا کوئی بندہ دست کر دے گا کہ صورت حال پلٹ جائے۔“ عبداللہ انان نے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔

”اس بار ہم ایس بی کی کو فوالوی نہیں کریں گے۔ میرے ذہن میں جو بیان آ رہا ہے اس کے مطابق ہم چوتیس تاریخ کو اپنا چک ہی ایک ایس آئی آدمی چار پانچ کا ٹیکلو کو سکین کرتی کے بہانے سے بلوا لیں گے۔ میرے خیال میں یہ پکارت کچھ رات کے وقت سزا کرنے ہے اور اس کے لیے سکین کرتی ورکار ہے، کانی مشغول رہے گا۔ ہم تم یہ یقینی بنالینا کہ ہمیں جو بندے بھیجے جائیں، وہ ایجنٹ ہوں اور قری طور پر ایکشن لینے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اس سارنی کارروائی کو میں خود چنڈل کروں گا۔ پولیس والوں کو مین موقع پر یہ بات سمجھا دی جائے گی کہ ہمیں ایک سوزو کی پک اپ کو روک کر اس کی حفاظت لینا ہے اور قری قانونی اسمگلنگ فورڈ کرنا ہے۔ میرے خیال میں پک اپ والوں کے ساتھ ایک دو تین افراد ہی ہوں گے اور ہم آسانی سے انہیں گھر لیں گے۔“ وہ حسب غفلت جوش میں اچکا تھا اور منسوبہ بندی کر رہا تھا۔

”میرے خیال میں یہ سب بہت رکی ہو جائے گا سارا اس جرم کی مہم جوئی آپ کو سوت نہیں کرتی۔ یہ کام ہمیں کا ہے اور انہیں ہی کرنا چاہیے۔“ عبداللہ انان نے زمانے کے بہت انداز چل حاد دیکھ رہے تھے، چنانچہ اس کے جوش میں ساتھ

دینے کے بجائے اسے روکنے کی کوشش کر رہا۔

”پولیس کی کارکردگی پر پہلی ہی دھچکے ہیں۔ سہ دو بارہ ان لوگوں پر اعتبار کرنے کی غلطی نہیں کرنا چاہتا۔ اس طرح کے مواقع ہمیں بار بار پیش نہیں کئے۔ یہ سارا سوشل ہے کہ ہمیں چودھری کے کہنے کے مطابق ہونا پڑتا ہے۔ لیکن اس پر عمل کرنا ہوتا ہے۔ اگر یہی سسٹاں ہو گیا تو ہمارے لیے اس وقت کرنا اور بھی مشکل ہوتا ہے گا۔ اب بھی ہمیں ساری کارروائی کو کسی ویں پلان پر گام کے بجائے افغان کے کھاتے میں ڈال دینا ہے۔ ہمیں اور ایک کے سامنے یہی شونیا جانے کا کہ یہ معاملہ باقی الحاق سے سامنے آکر۔ اس سلسلے میں ہم یہ استوری بتاتے ہیں کہ مرادیت میسر نہ کر رہا تھا، اسی وقت سوزو کی پک اپ بھی مرادیت سے گزرتی تھی۔ پولیس والوں کے اشارہ کرنے کے بعد جو بھی پک اپ نے راستہ نہیں دیا۔ پک اپ کا ڈرائیور بہت دل ذرا یونگ کر رہا تھا اور اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ اپنے میں ہے۔ اس لیے پولیس کی کھڑکی نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ اب اس کے بعد کی کہانی حالات کے مطابق بنانی چاہی ہے۔ اگر پک اپ والوں نے غامضی سے گزرتی دے سالی تو بہت اچھی بات ہے، اگر انہوں نے حراست کی تو پھر پولیس کے پاس جاتی کارروائی کا بھانڈا موجود ہوگا۔ ہمارے ساتھ جو پولیس والے ہیں اسے اس کارروائی کو دکھانے پر انہیں ٹھوڑے سے انعامات ترقی و فوج کے لیے اپنی ہاں میں ہاں ملانے پر آمادی ہے۔ انہی کیا ہو سکتا ہے۔“ انہوں میں سب کچھ طے کر چکا تھا اور انداز انامل تھا کہ عبداللہ انان کو اندازہ ہو گیا کہ وہ کچھ سوچ چکا ہے، اس سے بچے بھانڈا کر کچھ پند نہیں کرے گا۔

”ٹھیک ہے سراسر ایسا آپ نہیں۔ میرے لیے کیا ہم ہے؟“ انہم دلی سے راضی ہوتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”تم یہیں رہنا، میرے ساتھ صرف مشاہیرم خان جائے گا۔ وہ اسٹینٹل استعمال سے اچھی طرح واقف ہے اس لیے اس کارروائی میں انہم کر لا دیا کر سکتا ہے۔“

”اگر آپ اجازت دیں تو میں بھی ساتھ چتا ہوں۔ تھوڑی بہت ششک و غمیرہ دیکھنے کی جاتی ہے۔“

”نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ ہمیں مہر جان جو جوڑ اپنے ساتھ نہیں رکھ رہا ہوں۔ تم اپنے گھر پر رہنا۔ کھڑے فون کر کے اپنی بھاری کاپارٹ کرنے کے لیے ایجنٹوں کو بلاؤ۔ اس ایجنٹس کو تم ضرورت کے وقت کی طرح منبولا رہتے۔“

یہ تہیاری صوبادید پر ہے۔ بس میں یہ چاہتا ہوں کہ اگر کوئی

حقیل کی۔ وہ صورت حال سے پوری طرح آگاہ تھا اور کافی مستعد اور چمکنا نظر آتا تھا۔ مرسیڈیز کے رکستے ہی پیچھے آنے والی پولیس جیپ بھی رگ گئی۔

”خیریت ہے سر؟“ فوراً ہی اے ایس آئی جیپ سے اتر کر مرسیڈیز کے قریب آیا۔

”ہاں، تم اندر آ کر بیجو مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔“ بہت عجیبی کی سے دے گئے اس قسم پر اے ایس آئی کچھ حیران نظر آیا تاہم اس نے حکم کی حقیل میں تاخیر نہیں کی اور دروازہ کھول کر گاڑی کی چکیل نشست پر بیٹھ گیا۔ شہر یار نے جانچنے والی نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ وہ جوان آدمی تھا اور اس کی عائد کردہ شرط کے مطابق کافی چاق و چوبند بھی نظر آتا تھا۔ البتہ اس اچانک پیش آنے والی صورت حال کے باعث اس کی آنکھوں میں انھیں حیرت سی مگر وہ اپنے چہرے کو سہاٹ رکھنے میں کامیاب تھا۔

”اگر تمہارے شولڈر پر ایک پھول کا اضافہ ہو جائے تو تمہیں کیسا لگے گا؟“ اس کی ظاہری شخصیت سے اس کی فطرت کا کسی حد تک اندازہ لگانے کے بعد شہر یار نے اس سے سوال کیا۔

”ظاہر ہے سر... بہت اچھا۔“ اس نے بے ساختہ جواب دیا۔

”میرے خیال میں میرے پاس تمہاری اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے ایک موقع ہے۔ کچھ دیر بعد اس جگہ سے ایک سفید سوز کی کپکپ اب گزرے گی۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس سوز کی کو روک کر جنہیں اس میں موجود بندوق کو گرفتار کرنا ہے۔ سوز کی میں سے جو مال برآمد ہوگا اس کی پراہنگی پر جنہیں بہت سراہا جائے گا، ساتھ میں ترقی بھی پکے۔“ سوز کی پر لوڈ مال کی نوٹیت اور اس سے چودھری افتر کا حلق ظاہر کیے بغیر وہ عبدالمنان سے ملے کیے ہوئے منصوبے کے چیدہ چیدہ نکات اسے سمجھاتا گیا۔ اے ایس آئی نے اس کی ساری بات بہت توجہ سے سنی۔

”میں سمجھ گیا ہوں سر! سب کچھ آپ کی مرضی کے مطابق ہو گا۔“ تعینات سننے کے بعد اے ایس آئی نے دبے دے جوش کے ساتھ اسے یقین دہانی کروائی۔

”میں اور میرا رفیق ابچے رہ کر ساری کارروائی پر نظر رکھیں گے۔ اگر تمہیں مدد کی ضرورت ہوگی تو ہماری طرف سے مدد ملے گی۔“ وہ تم اور تمہارے ساتھیوں کی کسب کچھ سننا نہیں گے۔ ہر دو صورتوں میں کرپٹ تمہیں ہی ملے گا۔ میرا بیان یہی ہوگا کہ اتفاقی طور پر مجرم نظر میں آئے اور تم نے

نکمراد ہو اور دونوں اطراف میں سے کوئی بھی بندہ زخمی ہو تو اسے فوری طور پر پٹائی امداد مل سکے۔“ عبدالمنان کی پیشکش کو رد کرتے ہوئے اس نے اپنے ذہن میں موجود منصوبہ بتایا۔

”مجھے یہ معاملہ خطرناک لگ رہا ہے سر! خدا نخواستہ اس کارروائی میں آپ کو کوئی نقصان پہنچ گیا تو مجھے بہت سے لوگوں کے سوالوں کے جواب دینے پڑیں گے۔“ عبدالمنان کچھ گھبرا رہا تھا۔ معاملے سے حدناؤک تھا۔ شہر یار کی اس قسم کی کسی انکیوئیٹی میں شمولیت کسی طور مناسب نہیں تھی اس لیے اپنے طور پر اس نے ایک بار پھر اسے اس کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔

”وہ زندگی ہی کیا جس میں خطرہ نہ ہو۔ آدمی کو جو بڑے سے بڑا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے، وہ اپنی جان جانے کا ہوتا ہے... جو جان بھر حال ایک نہ دن جانی ہے۔ کسی بھی کام کو کرتے ہوئے چلی جانے تو کیا برائی ہے۔ البتہ اگر تم گھبرا رہے ہو تو میری طرف سے تم پر کوئی دباؤ نہیں۔ تم اس سارے معاملے سے الگ ہو کر خاموشی سے ایک طرف بیٹھ سکتے ہو۔ جب کوئی تم سے سوال کرے گا تو تم صاف کہہ سکو گے کہ اسے ہی صاحب نے جو کچھ کیا، اپنی مرضی سے کیا اور تمہیں اس معاملے کی کوئی خبر نہیں تھی۔“

”آپ تو مجھے شرمندہ کر رہے ہیں سر! میرا مقصد یہ نہیں تھا کہ میں اپنی جان بچاؤ چاہتا ہوں۔ میں تو آپ کو معاملے کی نزاکت کا احساس دلانا چاہتا تھا۔ میرے خیال میں آپ کی اپنی فیملی کے لوگ بھی اس بات کو پسند نہیں کریں گے۔“ شہر یار کی بات پر وہ کچھ شرمندہ ہو گیا تھا اس لیے اپنی صفائی پیش کر رہے ہوئے ایک اور دلیل دی۔

”میری فیملی کے لوگ جانتے ہیں کہ میں سرپرہیوں اور اگر تم ایک سرپرہے کا ساتھ دے سکتے ہو تو ٹھیک ہے، اگر نہیں دینا چاہتے تو کوئی زبردستی یا ٹھکوتہ نہیں۔ میں تو بہر حال وہی کچھ کروں گا جو ملے کر چکا ہوں۔“ شہر یار نے اپنا فیصلہ سنایا۔

”میں آپ کا ہر ممکن ساتھ دوں گا۔“ اس بار عبدالمنان کا لہجہ بھی اہل اور مضبوط تھا۔

☆☆☆

شہر یار کی مرسیڈیز سبک رفتاری سے سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ مرسیڈیز کے پیچھے پولیس جیپ بھی جس میں ایک اے ایس آئی اور جارج کاٹھین سوار تھے۔

”بس نہیں روک لو۔“ ایک ایسے موڑ پر پہنچنے کے بعد جس سے گزرتا ضلع سے باہر جانے والی ہر گاڑی کے لیے ناگزیر ہوتا تھا، اس نے مشاہیرم خان کو حکم دیا۔ اس نے حکم کی

اپنی ٹیم کے ساتھ بروقت کارروائی کرتے ہوئے انہیں گرفتار کرنے کا کام سرانجام دیا۔ شہریار نے اسے مزید یقین دہانی کروائی تو اس کا چہرہ مکمل اٹھا اور وہ جوش سے بولا۔

”آپ فکری نہ کریں سر! اللہ اللہ آپ لوگوں کو زحمت کرنی ہی نہیں پڑے گی۔ میں اور میرے ساتھی سب سنہال ہیں گے۔“

”یہ یاد رکھنا کہ مجرموں کو زندہ گرفتار کرنا ہے۔ ان کے ذریعے ہم اصل ہندے تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔“

”راستہ سرا جیسا آپ سمجھتے ہیں ویسا ہی ہوگا۔“ اسے ایس آئی نے یقین دلایا۔

”فحیک ہے مجرم جاکر اپنے سپاہیوں کو سمجھاؤ۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں رہا ہے۔“ شہریار کے اس حکم پر وہ گاڑی سے اتر کر پولیس جیب کی طرف چلا گیا۔ مشاہیر خان نے اسے شدید سختی ملی کے تحت مرسیہ بزرگ سے کہے میں اتاری۔ اب مرگ سے گزرنے والی کسی گاڑی سے مرسیہ بزرگ کو دور سے نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ دوسری طرف اسے ایس آئی اپنے ہندوں سے بات کر رہا تھا۔ شہریار دور سے ہی ان کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیتا رہا۔ ذرا دیر کی گفت و شنید کے بعد وہ لوگ حرکت میں آ گئے تھے۔ پولیس جیب کے ذرائع دور نے جیب مرگ پر بائیں جانب بائیں کنارے پر لے جا کر کھڑی کر دی تھی۔ رات کے اس پھر حسب معمول اس مرگ پر فیک ہارے نام تھا۔ اگر کوئی گاڑی گزرتی تھی تو پولیس جیب کی وجہ سے اسے کسی مشکوک سا مانتا نہیں کرتا پڑتا۔ پولیس جیب اسی وقت رکاوٹ بنتی جب مطلوب ہر سفید سوزی ایک ایک وہاں سے گزرتی۔ اسے ایس آئی دو سپاہیوں کے ساتھ جیب میں ہی بیٹھا ہوا تھا جبکہ دو سپاہیوں نے مرگ پر دائیں جانب ڈرائیج آکر پوزیشن سنہال کی تھی۔ شہریار کی گاڑی ان سے ذرا فاصلے پر بٹھ اور پیچھے ٹھہری ہوئی تھی۔ تاہم یہ فاصلہ اتنا زیادہ نہیں تھا کہ مرگ پر سے گزرنے والی گاڑیاں ان لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہیں۔ انتظار کے سستی فیصلہات آہستہ آہستہ گزرنے لگے۔ ایک تمام خطا پر کی جانے والی یہ کارروائی ٹوٹ کر رسک تھی۔ بہت ممکن تھا کہ اس کارروائی کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا اور سرے سے ایسی کوئی گاڑی مرگ پر نمودار ہی نہیں ہوتی جس کا خلا میں ذکر کیا گیا تھا۔ مگر امکان تو اس بات کا بھی تھا کہ خلا میں فراہم کی جانے والی اطلاع درست ہو۔ وہ خود کو ملنے والے اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے وہ موجودی امید کے سہارے ہی یہ سارا کھڑا کر بیٹھا کر بیٹھ گیا تھا۔

ناکامی کی صورت میں اسے ایس آئی اور سپاہیوں کو تھوڑی بہت رقم دے کر خاموش رہنے کا حکم دیا جاسکتا تھا۔ جو کچھ بورا تھا وہ آف دی ریکارڈ تھا اس لیے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوتا تو بھی بات چند لوگوں کے درمیان ہی ختم ہو جاتی۔ حسب خواہش نتیجہ فیک کی صورت میں اتفاق والا نکلتا ہوا تھا۔ اس کھاتے میں مطلوب یہ کارروائی ڈال کر کام بھی ہو جاتا اور اسے ایس آئی کے بھی حوالے آ جاتے۔ انتظار کے اوجھل ملے گزرتے چلے گئے۔ آخر کار ایک مرگ پر سوزی ایک ایک کی سفیدی جھلکی۔ شہریار کو اپنے جسم میں خون کی گردش تیز ہوتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اسے یقین تھا کہ باقی لوگ بھی اسی کیفیت سے گزر رہے ہوں گے، والدیت اس کی بے یقینی اس لیے سوا بھی کہ چاہتے گے جو وہ وہ خود ایشین میں نہیں آسکتا تھا۔ اسلٹ کشش کی پوسٹ نے اس کے ہاتھ باندھ رکھے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اعلیٰ عہدے اور اونچے مقامات بھی کسی گرداب کی طرح ہوتے ہیں۔ ان کے پیچھا آؤں ان دیکھے دائروں میں قید خود ہی اپنے باحیثیت ہو کر بے عمل ہونے کی اذیت سے گزرتا رہتا ہے۔ اس وقت وہ اسی اذیت سے دوچار تھا۔ اس کی ہم جو فطرت سمجھتی تھی کہ میدان عمل میں اتر کر خود کچھ کر گزرے لیکن عہدے کے تقاضا تھا کہ وہ خود پر بند باندھے رکھے۔ فی الحال اس نے ملکی کیا اور بوٹ بیٹھے مرگ کا منظر دیکھا رہا۔ سوزی ایک ایک کو دیکھ کر پولیس جیب کا انجن ایک گراہٹ کے ساتھ جاگ گیا تھا اور پولیس جیب بہت تیزی سے حرکت کرتی ہوئی مرگ کے وسط میں آ رہی تھی۔ پیچھے سے آنے والی سوزی ایک ایک کو اٹھا لے کر بڑا۔ ایک ایک کر کے ہی اس میں سے ٹھوڑی ٹھوڑی چیزیں نکال کر باہر نکالا۔ اسے ایس آئی بھی جیب سے اتر آیا۔ پھر اس کے اور سوزی کی ذرائع کے درمیان گفتگو ہو گئی تھی۔ ان دونوں کی آواز میں زیادہ بلند نہیں تھیں اس لیے وہ لوگ اس گفتگو کو صرف جھجھکتا ہٹ کی صورت میں سن سکتے تھے۔ تاہم گفتگو کی نوعیت کا شہریار کو اندازہ تھا۔ اسے ایس آئی نے یقیناً سوزی کی ذرائع سے عشا کی بات کی تھی۔ ذرا ہی پس و پیش کے بعد وہ راضی ہوتا ہوا نظر آیا۔ اس کی رضامندی اور سکون نے شہریار کو تشویش میں مبتلا کر دیا۔ ایک تو وہ شخص اکٹلا تھا، دوسرے اس بات پر فخر مند بھی نظر نہیں آتا تھا کہ سوزی کی عشا کی صورت میں وہاں سے کوئی قابل اعتراض شے برآمد ہو سکتی ہے۔ اسے ایس آئی کے ساتھ موجود کا پیشگیل اس کے اشارے پر عشا لینے کے لیے آگے بڑھ گئے تھے، تاہم

دائیں طرف موجود دونوں سپاہی بہ دستور اپنی پوزیشن پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی نگاہیں سپاہیوں اور سوزی کی ایک ایک طرف بھی ہوئی تھیں۔ خاموش انجن والا وہ جیب پیچھے سے کب نمودار ہوئی، انہیں اندازہ ہی نہیں ہو سکا۔ جیب کی ہیڈ لائٹس آف تھیں اور ان لوگوں کی نگاہوں نے اسے اس وقت فوکس کیا تھا جب وہ بالکل قریب آ چکی تھی۔ اس جیب کو مرگ پر سے گزرنے والے معمول کے ٹریفک کا حصہ قرار دے کر آسانی سے گزرنے کا راستہ دیا جاسکتا تھا لیکن جیب کے ڈرامائی انداز میں نمودار ہونے پر ہر شخص اپنی جگہ ٹھک گیا تھا۔ جیب ایک ایک سے کافی پیچھے رک گئی تھی۔ عشا کی لیے آگے بڑھنے والے کا مشعلو بھی اپنی جگہ رک کر اسے دیکھ رہے تھے۔ جیب میں سوار لوگوں کے بارے میں جانے بچنے کوئی رول نہیں غالب کیا جاسکتا تھا۔ اسے ایس آئی کے اشارے پر ایک کا پیشگیل شاید یہی جاننے کے لیے اس طرف بڑھنے لگا تھا لیکن دیکھتے ہی دیکھتے صورت حال یک دم ہی بدل گئی۔ جیب کی چھٹی نشستوں پر سوار افراد نے دائیں اور بائیں دونوں جانب سے چھلانگ لگائیں اور جیب جس کا انجن ابھی تک بند نہیں کیا گیا تھا، تیزی سے متحرک ہو کر مرگ پر اس انداز میں آڑی ٹھری کر دی تھی کہ جیب سے چھلانگ لگا کر اترنے والوں کو آڑی مل گئی۔ پھر فضا میں کاشوف کا برست چلنے کی آواز کوئی اور جیب کی طرف بڑھنے والا سپاہی ایک ٹھٹکے سے اٹھ کر پیچھے کی طرف گرا۔ یہ ساری کارروائی لمحہ بھر میں ہوئی تھی اور کوئی شخص بھی کچھ سمجھ نہیں پایا تھا مگر پھر اسے ایس آئی خود اس کے ساتھ موجود کا پیشگیل نے تیزی سے حرکت کرتے ہوئے خود کو ایک ایک کی آڑ میں کر لیا تھا۔ ایک ایک کا ذرائع ابھی اس دوران تک نہیں پڑا ہے چکا تھا۔ اب پولیس والوں نے بھی جوابی فائرنگ شروع کر دی تھی۔ دونوں طرف کے فائر بے سود جا رہے تھے اور کوئی بندہ ان قانون کی زد میں نہیں آ رہا تھا۔

”میں آگے جا کر پولیس والوں کی مدد کرتا ہوں سر!“

شاہرم خان کے پاس داخل نہیں تھا اور وہ اسے استعمال کرنے کے لیے بے چین نظر آتا تھا۔ اپنی بات کہنے کے بعد وہ رکاوٹوں اور اپنی جانب موجود کا مشعلو کے قریب پہنچ کر ان کے ساتھ شریک ہو گیا۔ شہریار ابھی میدان عمل میں نہیں اترتا تھا لیکن اس کی نظریں ہر طرف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ جذبات میں آکر وہ ایک غلط قدم اٹھا چکا ہے۔ اسے ملنے والا تمام خط اس کے کسی عہدہ سے نہیں ملے گا۔ لیکن اسے لگتا تھا۔ اسے باقاعدہ منصوبہ بندی بنا کر ٹھہرا گیا

تھا۔ وہ جو اپنے تئیں بہت اچانک مجرموں کے سر پر پہنچ کر انہیں زک پہنچانے کا ارادہ رکھتا تھا، خود کھڑا چکا تھا اور ایک نقصان بھی اٹھا چکا تھا۔ مرگ پر پڑی کا پیشگیل کی لاش اس کے نقصان کا ثبوت تھی۔ پھر ایک نقصان اور سامنے آتا۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ کے سچ ابھرنے والی انسانی جھج بہن بھینک تھی۔ قاتل اور مقتول دونوں اس سے ہنیدہ شکنی رہے تھے۔ گولی کھا کر گرنے والا جوں سال اسے ایس آئی تھا۔ اس پر گولی ایک ایک کے ذرائع رہنے چلائی تھی۔ وہ زبانی جانے کس طرح پولیس جیب کی آڑ میں اس کا حساب ہو سکتا تھا اور پست پر سے فائر کر کے اس نے اسے ایس آئی کو نشانہ بنایا تھا۔ اس دوسرے نقصان کے بعد شہریار کے لیے میدان عمل سے دور رہنا ممکن نہیں رہا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور ایک کر اپنے ساتھیوں کی طرف بڑھتے ہوئے چیک اپ ڈرائیج کی طرف رہا اور کارنگ کر کے گولی چلائی۔ اس کی چلائی گئی گولی ضائع نہیں کی اور ایک ایک ذرائع کی جھج فضا میں ابھری لیکن وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ گولی نے صرف چیک اپ ڈرائیج کے بازو کو نقصان پہنچایا ہے۔ گولی کھا کر بھی چیک اپ ڈرائیج نے اپنی حرکت نہیں دینی تھی۔ غم اور غصے سے بے حال شہریار اسے نشانہ بنانے کے لیے جوش میں اندھا دھند آگے بڑھا۔ اپنے اس جوش میں وہ اس پوزیشن میں آگیا تھا کہ اس کے اپنے ساتھیوں کو فائر و کنا پڑا۔

”جیسے لیت جا میں سر!“ وہ ہاتھ سیدھا کر کے ایک ایک ذرائع پر دوسرا فائر کرتا جانتا تھا کہ مشاہیرم خان کی نو آواز ایک ٹھٹکے سے اسے ہوش میں لائی۔ اس نے تیزی سے خود کو نیچے گرایا لیکن اس دوران تک سے وہ فائر ہو چکا تھا اور یقیناً اس کے جسم کے کسی حصے کو نشانہ بنا کر بھی کیا گیا تھا لیکن اس فوری حرکت کی وجہ سے گولی جسم کے کسی حصے میں پوسٹ ہونے کے بجائے اس کے دائیں شانے کو گزرتی ہوئی گز گئی۔ اس گزراؤ کا نتیجہ بھی ایک اٹھیں رد کی صورت میں تھا۔ تاہم اسے اندازہ تھا کہ مہارت کے باوجود اچھی خاصی جھج ہو گئی ہے۔ اس پر ہونے والے اس فائر کے بعد صورت حال تیزی سے بد لگئی۔ پول لگا کر سامنے والی پادری مقابلہ کر کے فرار ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔ اسلٹک دائروں میں یہ خیال صحیح ثابت ہوا۔ مجرموں کی جیب کا انجن زوردار آواز میں غرایا اور پھر فضا میں گاڑیوں کی جھج آہستہ گئی۔ ان لوگوں کی طرف سے جیب پر فائر کیے گئے لیکن متحرک جیب کا ذرائع بڑی دشمنی سے اسے موز کر دیا جس کی طرف لے گیا۔ جیب لمحہ بھرنے کی نظروں سے اوجھل ہوئی چارہ تھی

لیکن وہ اسے روکنے کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ مجرموں کی کپ اپ اور پولیس جیب دونوں کے ہار قانچ کے نیچے میں برست ہو چکے تھے اور شہریار کی سرسبز پرکائی پیچھے گھڑی تھی۔ ویسے بھی اب وہ مفرد مجرموں سے زیادہ اپنے ساتھیوں کی فخر میں جٹا تھا۔ کاشمیل کے بارے میں تو اسے یقین تھا کہ وہ زندہ نہیں ہوگا۔ چپکے کرنے پر اس یقین کی تصدیق ہوگئی۔ اسے افسانہ آئی کی طرف سے جو ہومو می اسید تھی، وہ بھی اس کی خاموشی نہیں ہے تو زہری۔ وروی پر ایک اور پھل جانے کے شوق میں اس لیے چارے کی پوری رودی گل رنگ ہو چکی تھی۔ اس کے ساتھ موجود کاشمیل الیٹ زنگی ہونے کے باوجود زندہ تھا۔ اسے کوئی جان لیوا زخم نہیں لگا تھا۔ گولیوں نے اس کے ایک بازو اور ایک ٹانگ کو کھینچ لیا تھا۔ ان زخموں سے خون کا اخراج تھا لیکن امید کی جاسکی تھی کہ طبی امداد ملنے پر وہ نمک ہو جائے گا۔

”اس کے زخموں پر کچھ باندھ مشاہیرم خان! اور دھڑکے نظر میں دروازے ہوئے اس نے مشاہیرم خان کو حکم دیا۔ احتیاطی تدبیر کے طور پر وہ عبداللہ خان کو جس ایبویٹس کے لیے کہہ کر آتا تھا، اب اسے اس کا انتظار تھا۔ اگر ایبویٹس نہ آئی تو وہ وقت ضائع کیے بغیر اپنی گاڑی میں بھی زخمی کو لے کر اسپتال کے لیے روانہ ہو سکتا تھا لیکن ایبویٹس آجانی تو اس کا سب سے بڑا قاعدہ ہی ہوتا تھا کہ اسپتال پہنچنے سے پہلے ایبویٹس میں زخمی کو کوئی طبی امداد دے دی جاتی۔

”سرا آپ کو بھی زخم ہے۔ میں آپ کے زخم کو دیکھ لیں ہوں۔“ مشاہیرم خان سے پہلے کا ٹیبلو خود اپنے زخمی ساتھی کی مدد کے لیے کھینچ گئے تھے اس لیے وہ شہریار کے قریب آکر اس سے بولا۔

”تمہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ معمولی زخم ہے۔ تم اس کا زخم گاڑی لاؤ، اب ہمیں وقت ضائع کیے بغیر اسپتال کی طرف روانہ ہو جانا چاہیے۔ ایبویٹس کا تو کوئی نام و نشان نظر نہیں آتا۔“ وہ اندر ہی اندر اپنی حماقت اور ناکامی پر جھنجھٹا یا ہوا تھا اس لیے شائے سے منسلک ہونے والے خون کے اخراج کو نظر انداز کرتے ہوئے سخت لہجے میں مشاہیرم خان کو حکم دیا۔ وہ بے جا تو حکم کا بندہ تھا، نہ چاہتے ہوئے بھی حکم کی تعمیل کے لیے میں کھڑی سرسبز پرکائی کی طرف بڑھا گیا مگر پھر سرسبز پرکائی کی نوبت ہی نہیں آئی۔ خصوصاً سائرن بجانی ہوئی ایبویٹس سڑک پر نمودار ہوئی اور ان لوگوں کے قریب آکر رک گئی۔ ایبویٹس میں عبداللہ خان موجود تھا جو جانے تو کچھ مقررہ کچھ کافی کچھ کچھ تھا۔

”سرا آپ زخمی کا کاشمیل اور مشاہیرم خان کو ساتھ لے کر اسپتال کے لیے روانہ ہو جائیں، میں یہاں کے معاملات فرما رہا ہوں۔“ عبداللہ خان کے اس مشورے پر اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور چپ چاپ خود ہی ایبویٹس میں جا بیٹھا۔ شہر کے حکام کا احساس فکرت تھا جس نے اسے اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا۔ اس وقت وہ خود کو اس لائق بھی نہیں یاد تھا کہ کچھ سوچ سمجھ سکے، البتہ اس کیفیت میں بھی اسے اتنا اطمینان ضرور تھا کہ عبداللہ خان کچھ داری سے اس ساری صورت حال کو سنبھال لے گا۔

☆☆☆☆

جوتوں کی کھنا کھٹ کے ساتھ کمرے کا دروازہ کھلا اور شہزادہ اندر داخل ہوا۔ وہ سو بیٹین ڈریس میں تھا لیکن ظاہر ہے، باہر ڈیوٹی پر موجود سپاہی کے لیے یہ حیثیت ڈی آئی جی اس کی تحریک زخمی تھی۔ شہزادہ کی آمد سے لمحہ بھر پہلے تنہا دینے والی جوتوں کی کھنا کھٹ یقیناً سپاہی کے زوردار تکیا نہ کا نتیجہ تھی۔

”کیا حال ہے؟“ بیڈ کے ساتھ کبھی کبھی پر بیٹھتے ہوئے اس نے شہزادے سے دریافت کیا۔

”تمک ہوں۔ گولی بس چھوڑ کر زخمی تھی اس لیے کچھ زیادہ گھبراہٹ نہیں آیا۔ یہ تو آکسز زے زبردستی مجھے روک رکھا ہے۔ ورنہ میرے خیال سے تو میں بالکل فٹ ہوں اور کمرہ بے سنگا ہوں۔“

”ہر معاملے میں اپنی ذاتی رائے کے مطابق مل کی کوشش مت کیا کرو۔ جو کام جس کا ہو، وہی کرے تو مناسب رہتا ہے۔“ شہزادہ کا مود کچھ خراب تھا۔ وہ اس بات کو محسوس کیے بغیر نہیں کہ وہ کچھ خراب تھا۔

”کیا ہوا تھا؟ مجھے تفصیل سے بتاؤ۔“ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے حد درجے تنبیہ کے سوال کیا۔

”تفصیل تو کچھ خاص نہیں، بس میں ایک جگہ کا دروازہ کرنے کے بعد وہاں آکر ہوا تھا تو راستے میں کچھ نامعلوم لوگوں سے تصادم ہو گیا۔ وہ تو اتفاق ہی تھا کہ میں وہاں ہی میں، پر وہ جانے کے امکان کے پیش نظر کھینچ کر لے کر کے خیال سے پولیس والوں کو اپنے ساتھ لے گیا تھا اس لیے جیت ہوئی۔ ان لوگوں نے بڑی جاغشتی سے حملہ آوروں کو مقابلہ کر کے انہیں پسپائی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا، ورنہ شاید وہ مجھے مار گرتے بناتے میں کامیاب ہو جاتے۔ آپ بائیں خیال رکھیے کہ مجھے کی طرف سے ان لوگوں کو اس کا گردنی پر کوئی انعام وغیرہ دے دیا جائے۔ خاص طور پر ہلاک ہونے والے اسے اس

آئی اور کاشمیل کے لواحقین کے لیے مالی اعانت کا بندوبست ضرور ہونا چاہیے۔ میں نے ماموں جان سے بھی اس سلسلے میں بات کی تھی۔ انہوں نے یقین دلایا ہے کہ وہ کوشش کریں گے پھر مجھ کو چھوٹا معاملہ کر کے چھٹے گا، اس لیے میں آپ سے خاص طور پر درخواست کر رہا ہوں۔“

”حملہ آوروں نے تمہیں چار گرت بنانے کی کیوں کوشش کی؟ تم نے انہیں کیا دھمکی دی؟“ شہزادہ نے اس کی بات توجہ سے سن کر ضرور یقین اس پر کسی قسم کا اظہار رائے کیے بغیر تفتیش کا سلسلہ جاری رکھا۔ وہ شہر سے باہر ہونے کی وجہ سے اس کے ساتھ ہونے والے حادثے کی خبر سن کر فوری طور پر اسپتال میں پہنچ گیا تھا اور فون پر مختصری بات کر کے اپنی سلی گری میں ایک کنب فرحت میں اس کے پاس بیٹھال کی کھال کال رہا تھا۔

”زخمی کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے، ظاہر ہے میں اپنے ضلع میں جو کام کر رہا ہوں اس پر بہت سے لوگوں کو اعتراض ہو سکتا ہے۔ بلکہ ہے۔ انہی لوگوں میں سے کسی نے مجھے تنبیہ کرنے کے لیے یہ کارروائی کی ہوگی۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے، حملہ آوروں کا مقصد مجھے مرنے کرنا نہیں بلکہ صرف ڈرانا تھا، ورنہ وہ مجھ پر صرف ایک گولی چلاتے یا رکھنا نہیں کرتے۔“ وہ شہزادہ سے حقیقت چھپانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اپنے اس خیال پر اسے خود بھی یقین تھا کہ اس پر کیا جانے والا کارڈ بلاک فزیز نہیں تھا۔ وہ جس سے ہڑک انداز میں باہر نکل گیا تھا، وہ لوگ چاہتے تو آسانی سے اسے ختم کر دیتے تھے لیکن انہوں نے صرف ایک گولی چلانے پر ہی استغنا کیا تھا۔

”اب وہ بات بھی بتا دو جو تم نے ابھی تک مجھے نہیں بتائی ہے۔“ شہزادہ نے اسے ٹھہرتے ہوئے حکم دیا۔

”سب کچھ تو بتا چکا ہوں۔ آپ کس بات کے بارے میں پوچھ رہے ہیں؟“ وہ ان جان بٹا۔

”دیکھو شہزادہ! میں کوئی میڈیا کا بندہ نہیں ہوں کہ تمہاری بتائی ہوئی کہانی پر یقین کر لوں۔ بہت سے معاملات پہلے ہی میرے علم میں ہیں۔ جس میں اس ایبویٹس میں انوالو ہو چکے ہیں سوٹ میں کھینچ کر تھیں۔ تم مجھ سے بھاگی ہوئی ایک گولی کی سپورٹ کرنے کے لیے خوار ہو تے ہو تو مجھے کڑیوں کی اسٹینڈنگ کی روک تھام کے لیے خود میدان میں اتر آتے ہو۔ حالانکہ ہونا یہ چاہیے کہ اس قسم کا کوئی معاملہ تمہارے علم میں آئے تو تم سے پولیس کے سپرد کر کے خود ایک طرف ہٹ جاؤ۔ اس طرح خود ہر معاملے میں بھاگ دوڑ کرنا اور اپنی

جان خطرے میں ڈالنا کسی بھی طرح جہنمی حکایت نہیں۔ مجھے شک ہے کہ تمہارے ساتھ شٹل آنے والا ماٹہ بھی تمہاری اپنی کئی ایک بیوی کا نتیجہ ہے۔ ہندو تھیلہ آج رات کو کسی دور سے آئے کی کوئی کئی ہی نہیں ہے۔ تم یہ مت سمجھو کہ تمہارے بے خبر ہر کہنے پر خبر ہوا ہے۔ گا۔ مجھے تو زہری کی کوشش سے سب کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔“

شہزادہ کا کچھ غصہ تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس نے اس کے بچھانے کی گہری محنت نہیں ہوئی ہے اس لیے وہ آزادانہ مامہ کر اس کی بی معتمد بڑ کے لیے جو قصہ اس کا اندر دیا ہوا تھا وہ اس وقت باہر نہیں نکلتا، یہ شخص نہیں تھا، نہ چنچہ سینا کے سر ہانے کر کچھ نہیں سے کئی اپنی پشت کو سر ہانے کے پیچھے ہوئے قدر سے کئی سے بولا۔ ”آپ کی پولیس کی لا کھتے ہی کب کب میں کسی معاملے میں اس پر اعتبار کر سکیں۔“ کئی سے کڑیوں کی اسٹینڈنگ کی روک تھام کے لیے ایک آواز زبردست موقع مجھے ملتا تھا لیکن اس ایبویٹس کی ایک حرا کی وجہ سے معاملہ بڑھ گیا، وہ غصہ نہیں پولیس کی روری سیکر کر مجرموں کی پشت پناہی کرتا ہے۔ اس کی طرف سے ہاں ہونے کے بعد میں رسک لینے پر مجبور ہوا تھا۔“ وہ شہزادہ کو ساری تفصیلات سناتا چلا گیا۔

”اس طرح ایک کنب تمام خط پر کارروائی کے لیے وہ زہری بھی تمہاری حماقت تھی۔ تمہارے خالصتیں تمہاری جذباتیت کچھ کچھ ہیں اس لیے انہوں نے تمہارے بھائی بن کا قاتل اٹھا کر تمہیں ٹریپ کرنے کی کوشش کی۔ وہ جہنم دار بھی دینے اگر تمہارے خاندان کا حصہ نہیں ہوتے۔ انہیں معلوم ہے کہ تمہیں کچھ ہو جاتا تو ہم سب مل کر ان کا تعلق نہ کر دیتے تھے انہوں نے تمہیں یہ پتہ ضرور دیا ہے کہ وہ کچھ کیوں کر سکتے ہیں اس لیے تم کچھ ہونے سے پہلے عمل جاؤ۔“ اس کے خاموشی ہونے کے بعد شہزادہ نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

”مگر میں انہیں بتا دوں گا کہ میں ان کے جھگڑا میں سے ڈر کر بچنے بنے والا نہیں ہوں۔ میرے ہوتے ہوئے انہیں کھل کھلے کا موقع ہرگز نہیں ملے گا۔“

”پھر وہی جذباتیت۔ تم جس سیٹ پر ہو وہاں ان جذباتیت سے کام نہیں لیتا۔ کچھ نہیں تو ہوا والے ہی اعتراض کر سکتے ہیں اس لیے میری بات کو کچھ سے خاموشی رہ کر سکون سے کام کرو۔ میں اور باپاں کو کوشش کریں گے کہ تمہارے ضلع میں کچھ ایسی انتظامی تبدیلیاں کر دی جائیں کہ تمہیں اپنے ساتھ کام کرنے والوں کا اتفاق نہ لجا سکے یا پھر اگر تم کچھ تمہارا کسی دوسری جگہ ٹرانسفر کر دیتے ہیں۔“ شہزادہ

رات نے اسے سمجھ کر کے ساتھ تسلی بھی دی اور ایک تجویز بھی پیش کی۔

”ہرگز نہیں۔ فرانسفر تو میں کسی صورت نہیں کرواؤں گا۔ میرے مخالفین کی تو سب سے بڑی خواہش یہ ہوگی کہ مجھے نہیں اور فرانسفر کر دیا جائے لیکن آپ سب اس بات کو دھیان میں رکھیے گا کہ میری مرضی کے خلاف میرا کہیں فرانسفر نہ ہو سکے۔ میں واضح تجدیدی قوت بن کر ہونے تک اپنی سیٹ پر جمار ہوتا چاہتا ہوں۔“

”اوسکے انہیں ہوگا فرانسفر... لیکن جہیں بھی دھیان رکھنا ہوگا کہ منتقل کر اور خود کو بچا کر کام کرو۔ ضلع کے بااثر لوگوں سے براہ راست نگر لینے سے جتنا فائدہ ہو، نیچے کی کوشش کرو... ورنہ وہ لوگ بھی اپنے تعلقات کی ذوریوں ہلا کر تہوارے لیے مشکلات کھڑی کرنے کی کوشش میں لگ جائیں گے۔ طاقت اور اختیار کے اس گیم میں کب کس طرف کا پلڑا جک جائے، کچھ معلوم نہیں ہوتا۔“ سجاد رانا نے اسے یقین دہانی کروائی لیکن اپنے تجربے کی روشنی میں نصیحت کرنے سے بھی باز نہیں آیا۔

”میں کوشش کروں گا۔“ شہریار نے اسے جواب دیا۔ تاہم جب وہ اسپتال سے روانہ ہوا تو اسے یقین تھا کہ شہریار نے کوشش بھی کی تو اپنے حراج کی وجہ سے اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔

☆☆☆

”اچھا تو میں چلتا ہوں۔ ویسے تو دن کا وقت ہے اس لیے کسی پریشانی کی بات نہیں پھر بھی تم دھیان سے دروازہ بند کر کے رہنا۔ آگن میں بھی زیادہ ٹکٹے کی ضرورت نہیں۔ وہ ضیعت پر دیر سارا وقت اپنے گھر کی چھت پر چڑھ کر ہوا کی بازی کرتا رہتا ہے۔ تمہیں دیکھ کر خواہ مخواہ چیخو خانی کی کوشش کرے گا۔ میں نے سرمد سے کہہ دیا ہے، اگر اسے موقع ملا تو اس طرف کا پتھر لگالے گا ورنہ میں تو انشاء اللہ رات تک تہارا کام نہ ٹھاکر دیاؤں آئی جاؤں گا۔“ چھوٹا سا سفری بیگ شانے سے لٹکائے عامر، ماہ بانو کو ہدایات اور تسلیاں ساتھ ساتھ دے رہا تھا۔ بڑی کوشش کے بعد وہ اپنے دفتر سے پھنسی لینے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اب ماہ بانو کے کام سے جا رہا تھا۔ پرویز کی اپنے ساتھیوں کے ساتھ کل اس دن کی جانے والی حرکت نے اسے خوف زدہ کر دیا تھا۔ بے جگری سے اس کا مقابلہ کرنے کے باوجود وہ جانتا تھا کہ پرویز اپنی اس شکست پر آرام سے نہیں بیٹھے گا اور مسلسل اس کوشش میں لگا رہے گا کہ کسی نہ کسی طرح اسے یا ماہ بانو کو زندہ پہنچائی جائے۔

پرویز کی ایسی کسی حرکت سے پہلے وہ ماہ بانو کو یہاں سے نکال دینا چاہتا تھا۔ ماہ بانو کی حیثیت اس کے گھر میں ایک امانت کی سی تھی اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کو ذرا بھی نقصان پہنچے۔ سرمد کو بھی وہ رات ہی اپنے پروگرام سے مطلع کر چکا تھا۔ اس نے بھی اس کے فیصلے کی تائید کی تھی بلکہ وہ عامر سے بھی زیادہ بے چین تھا کہ جلد از جلد خواہ مخواہ مولی ہوئی اس ذمے داری سے نجات حاصل کر لی جائے۔

”آپ میری طرف سے بالکل غور نہ کریں۔ میں خالہ جی کے ان کے کمرے میں ہی رہنے کی کوشش کروں گی۔ ویسے بھی دن دن ہی کی تو بات ہے۔ دن بھر تو ویسے بھی آپ دفتر میں ہی رہتے ہیں اور اللہ کا شکر ہے کہ سارا دن آرام سے بیٹھ کر پریشانی کے گزر جاتا ہے۔“ اس نے عامر کو تسلی دی تو وہ اپنی ماں کے کمرے میں جا کر ان سے ملاقات کرنے لگا۔ انہیں اس نے یہی بتایا تھا کہ وہ اپنے دفتر کے کچھ اہم کاغذات وغیرہ پہنچانے کے لیے ایک دن کے لیے شہر سے باہر جا رہا ہے۔ انہوں نے دو چیمروں دعاؤں کے ساتھ اسے رخصت کیا۔

”دھیان رکھیے گا، وہاں جا کر اسے ہی شہریار صاحب یا ان کے بیٹے کے سوا کسی سے نہیں ملانا۔ ان دونوں سے ہٹ کر کسی تیسرے فرد کو میرے بارے میں کچھ نہیں بتائیے گا۔“ عامر کے پیچھے دروازے تک جاتے ہوئے اس نے کئی بار کی ہوئی نصیحت ایک بار پھر دہرائی۔ عامر یا سرمد کو اس نے اپنے تمام حالات تفصیل سے نہیں سنائے تھے۔ ان لوگوں کو بس اتنا علم تھا کہ وہ اپنے کچھ دشمنوں سے چھٹی پھر رہی ہے اور اس سلسلے میں اسے ہی شہریار وغیرہ کی سپورٹ حاصل ہے۔

”مجھے تمہاری ہدایت اچھی طرح یاد ہے۔ تم بے فکر ہو اور دروازہ بند کر کے اندر بیٹھنے کے بعد آرام سے میری واپسی کا انتظار کرو۔“ وہ اسے جواب دے کر باہر نکل گیا۔ اس کا رخ شہر سے باہر جانے والی سڑک کے اڈے کی طرف تھا۔ اڈے پر پہنچ کر اس نے پہلے ٹکٹ خریدنا بھرا ایک سبکین سے سگریٹ کا ٹکٹ خریدنے کے بعد اس کے سامنے لگے اسٹال سے آج کا اخبار بھی لے لیا۔ وہ باقاعدگی سے اخبار پڑھنے کا عادی نہیں تھا۔ کبھی کبھار کسی اہم خبر کے لیے اخبار خرید لیتا تھا۔ اس وقت اس نے راستے کی بوریت سے نیچے کے لیے اخبار لیا تھا لیکن بس میں بیٹھنے کے بعد اسے پورے ہونے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اس کے ساتھ بیٹھا ہوا مسافر بے انتہا باتوں کا جو بڑی بے تکلفی سے اس سے باتیں کرتے ہوئے قصوں پر قصے سناتا جا رہا تھا۔ مسافر کا انداز کھٹکھٹا سادہ اور برجستہ تھا کہ اسے وقت

مترنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ وہ خود بھی اسے اپنے دفتر اور دوستوں کے متعلق کیا باتیں بنا رہا تھا۔ اپنے خوش اخلاقی بہ سبب کی وجہ سے اسے احساس بھی نہیں ہوا اور سفر تمام ہو گیا۔ سامنے سفر سے ایک گرم جوش مصافحہ کرنے کے بعد وہ بس سے اتر آیا اور راڈ پر موجود رہائشوں میں سے ایک میں سوار ہو کر اسے اسے صاحب کے آفس پہنچانے کا کہا۔ لاہور کے بس ڈائری سے خرید ہوا اخبار رول کی صفحہ میں اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ رکتے میں بیٹھ بیٹھ اس نے اخبار کو کھولا اور اس کا یونیورسٹی سرسری سا جائزہ لینے لگا۔ سرسری جائزہ لیتی اس کی نظریں ایک تصویر پر آکر ٹھہر گئیں۔ وہ تھان شہدہ کا اشتہار تھا جس میں تصویر میں موجود لڑکی کے بارے میں اطلاع فراہم کرنے والے کے لیے ایک لاکھ روپے کا اعلان کیا گیا تھا۔ اعلان کے ساتھ ایک موبائل نمبر بھی موجود تھا جس پر لڑکی کے متعلق جاننے والا رابطہ کر سکتا تھا۔ وہ اس لڑکی کے بارے میں ابھی طرح جانتا تھا۔ ٹینک وہ اس کے گھر میں ہی مقیم تھی۔

”بھائی ذرا تیرا خیال دے۔ مجھے جلدی پکچھتا رہی ہے۔“ اشتہار پڑھ کر وہ خود دل میں جھلکا۔ اس ہاتھ کی لڑکی اسے اندازہ تھا کہ وہ سارے لوگ جنہوں نے ماہ بانو کو اس کے گھر میں دیکھا تھا۔ ان میں سے کسی کی بھی نظر اگر اس اشتہار پر پڑ گئی تو ایک لاکھ کے لالچ میں اس فون نمبر پر ضرور اطلاع دیں گے۔ اخبار میں گردش کی کا اشتہار دینے والے لوگ اس کے خیر خواہ تھے یا دشمن۔ اس بارے میں کیا کہا جاسکتا تھا۔ اس لیے اس کی خواہش تھی کہ جلد از جلد ان لوگوں کے پاس پہنچ جائے جن کے بارے میں ماہ بانو کو حتمی یقین تھا کہ وہ اس کے بچے بہادر اور خیر خواہ ہیں۔

پھول کی بیویں سے بھرا تھا گاڑی میں رکھنے کے بعد اس نے گاڑی کی انارٹ کی اور گولی کی طرف روانہ ہو گیا۔ موتی والا کی موت کے باوجود ابھی اس کی عازمت جاری تھی۔ موتی والا کے کزن نے کسی طرح اس بات کی اجازت لے لی تھی کہ گولی کے ایک دو کمرے اس کے چالیسویں تک کھلے رکھے جائیں اور اب وہ اپنے عقیدے اور مسلک کے مطابق وقتاً فوقتاً ان کمروں میں کوئی نہ کوئی ایسا کام کر داتا رہتا تھا جو اس کے یقین کے مطابق موتی والا اور اس کی بیوی کی مفرت کے لیے بدگوار ثابت ہو سکتا تھا۔ مرنے والا اپنے ساتھ اپنے اعمال نامے میں جو لکھوا کر لے گیا ہے، اس کی بنیاد پر اللہ کے ہاں کا معاملہ ہوگا۔ اس حقیقت سے نظر چرائے مرنے والوں کے لواحقین اپنے طور پر اس کوشش میں لگی رہتے ہیں کہ کسی طرح جانے والے کے لیے ایسا

کوئی بندوبست کر دیں کہ وہ جہنم کے شعلوں سے بچ کر جنت کے باغات میں جا سکے۔ اس خواہش میں بعض لوگ اپنی حد سے بھی تجاوز کر جاتے ہیں اور ایسے ایسے کام کرنے لگتے ہیں جو صریحاً خلاف شرع ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ان ساری رسوم کے پیچھے مرنے والے سے محبت یا بعد روی کے بجائے دنیا داری کے تقاضے جتنا بھی مقصود ہوتا ہے۔ موتی والا کا کزن اس دوسری ٹیکسٹ کی یادداشت کا بندہ تھا۔ آج بھی اس نے ایصالِ ثواب کے نام پر جانے کن کن مدرسوں اور مسجدوں کے مولویوں کو جمع کر کے ان کی دعوت کا انتظام کیا تھا۔ کھانے کے بعد وہ لوگ قبرستان میں جانے والے تھے۔ پھول کی یہ چٹاں قبر پر ڈالنے کے لیے ہی منگوائی گئی تھی۔

”میں چٹاں لے کر آ گیا ہوں... تو تاکہ اندر کا کیا حال ہے؟ کھانا دانا ہو گیا یا نہیں؟“ گولی پچھتے کے بعد شاکر سے سامنا ہوئے پر اس نے اس سے پوچھا۔

”کھانا اتنی جلدی کیسے ختم ہو گا؟ انہی شان دار مرنے کی پرانی اور کڑھائی پک کر آئی ہے کہ جب تک مطلق تک نہیں غلوں میں سے کسی کا ہاتھ نہیں رکھے گا۔“ شاکر نے جواب دیا اور اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

”پہل جو بھی ہے لی الحال تو ہماری نوکری چل رہی ہے۔ چالیسویں تک ہم بھی بھاگ دوڑ کر کے اپنے لیے کوئی نئی نوکری تلاش کر لیں گے۔ میرا ارادہ ہے کہ یہاں سے فارغ ہو کر ایک جگہ انٹرویو کے لیے جاؤں گا۔ ایک دوست نے بتایا تھا کہ ایک سینئر صاحب کو اپنی بیوی کی گاڑی چلانے کے لیے ڈرائیور کی ضرورت ہے۔“

”اں بھئی، اب تو یہی کرنا ہے۔ کاش صاحب کی مہمان لڑکی کا بھی کچھ معلوم ہوتا تو میں ہو جاتے۔“

”کیسا مطلب؟ کیا فائدہ ہوتا تھا اس کا پتا معلوم ہونے سے؟“ وہ شاکر کی بات پر چونکا۔

”آج کے اخبار میں اس لڑکی کی فوٹو ملی ہے۔ لڑکی کے بارے میں اطلاع دینے والے کے لیے ایک لاکھ کا انعام ہے۔“

”کہاں ہے اخبار؟“ پچھتے ہی دکھا۔ ”وہ یہ ہیں ہوا۔“

”میں نے سامنے گرل میں ہی اٹکا دیا تھا۔ یہاں اب اخبار پڑھنے والا ہے کوئی؟ میں ہی بھی بھی نظر نہ لیتا ہوں۔“ پہلے خیال آیا تھا کہ صاحب کے کزن سے کہوں کہ اخبار بند کر دو اور میں پھر سوچا کہ جس طرح میں بھر کے لیے ہماری روزنی لگی ہوئی ہے، بے جا رہے اخبار والے کا بھی کچھ روز اور بھلا ہو جائے۔ شاکر اور گولی کچھ بول رہے تھے کہ اس کی توجہ شاکر کی باتوں کی طرف نہیں گئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ

کر بیڑی سے گرل میں اٹکے ہوئے اخبار کی طرف بڑھ چکا تھا اور اب اخبار کھولے شاکر کی فراہم کردہ اطلاع کی تصدیق کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جلد ہی اس نے اشتہار تلاش کر لیا۔ انعام کی رقم اور فون نمبر دونوں دیکھ کر اس کی آنکھیں جھلنے لگیں۔ ٹیکسٹ پچھتے کے لیے ایک راستہ کھن نظر آ رہا تھا۔

”یار شاکر! یہ گاڑی کی چابی رکھ۔ پھولوں کی چٹاں گاڑی میں ہی رکھی ہیں۔ مجھے نوکری کے لیے انٹرویو دینے چاہیے۔ تو صاحب سے یہاں نہ دینا کہ میری طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی اس لیے میں جلدی مگر چلا گیا۔“ اخبار کا اشتہار والا مسٹر رول کر کے اپنے قبضے میں کرتے ہوئے اس نے جگت میں گاڑی کی چابیاں شاکر کو تھامیں اور گولی سے ٹیکٹ کی طرف بڑھ گیا۔

”یار! کہیں صاحب اس طرح جانے پر ناراض نہ ہوں۔“ شاکر نے اسے احساس دلانے کی کوشش کی۔

”ہوتے ہیں تو ہو جائیں۔ میرا جاننا ضروری ہے۔“ وہ خرے بغیر جواب دے کر بیڑی سے باہر نکل گیا۔ خود اس کے پاس موبائل نہیں تھا اور اس علاقے میں کوئی بی بی ایچ نہیں تھا۔ بڑی بڑی کوئینوں والے علاقے سے تیز تیز چل کر نکلتے ہوئے اس نے قریب واقع سکرٹل ایویا کا رخ کیا۔ اس علاقے میں ٹکڑی ٹیکس سٹے ہوئے تھے۔ ان ٹیکس کے سامنے مختلف شاہک اسٹور اور دیگر دکانیں بنی ہوئی تھیں۔ اسے اچھا قیصری کہ وہ اس دکان پر سے پبلک کال کی سہولت مل جائے گی۔ اس کا یہ یقین غلط ثابت نہیں ہوا۔ ایک سیڈ بیل اسٹور پر اسے پبلک فون مل گیا۔ اس نے انڈر کھول کر اشتہار نکالا اور جھڑکتے دل کے ساتھ اس میں دیا ہوا فون نمبر دیا۔

”ہیلو! رابطہ ملے پر ایک کرخت سی آواز سنائی دی۔“

”آج کے اخبار میں ایک لڑکی کی کشمکش سے متعلق جو اشتہار چھپا ہے، وہ آپ نے ہی بھیجا ہے؟“ کسی بھی قسم کی اطلاع فراہم کرنے سے پہلے اس نے تصدیق کرنا ضروری سمجھا۔

”ہاں ہاں، اشتہار ہم ہی نے دیا ہے۔ تم بولو، نہیں لڑکی کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟“ دوسری طرف سے بے تحاشا سے پوچھا گیا۔

”کچھ نہیں، بہت کچھ معلوم ہے مگر کوئی بھی اطلاع دینے سے پہلے میں انعام کی رقم کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ موتی والا کی گولی سے یہاں تک کا فاصلہ طے کرنے تک مسلسل اپنا رخ دوڑاتا رہا تھا اور اب ایک طے شدہ کھوکھل کے مطابق کھٹکھٹ کر رہا تھا۔

”انعام کا کوئی مسئلہ نہیں۔ انعام تمہیں ضرور ملے گا مگر

پہلے تم کچھ بتاؤ۔“ وہاں لگتا تھا کہ مگر کتنا مشکل ہو رہا ہے۔ ”انعام تو تمہیں دینا ہی ہو گا لیکن میری شرط یہ ہے کہ میں انعام میں ایک لاکھ کے بجائے دو لاکھ روپے لوں گا۔“ اس نے اپنا مطالبہ بیان کیا۔

”دو لاکھ... یہ تو بہت زیادہ ہے۔“ کرخت آواز والے نے اعتراض کیا۔

”زیادہ ہے تو رہے دو۔ میں بھی اطلاع نہیں دوں گا۔“

”اچھا اچھا کر۔ ایسا کرو پانچ منٹ مگر کرو۔ میں مشورہ کرنے کے بعد تمہیں جواب دیتا ہوں۔“ اس کی دھمکی پر وہ گھبرا کر جلدی سے بولا۔

”ٹھیک ہے، تم مشورہ کرلو۔ میں پانچ منٹ بعد دوبارہ فون کرتا ہوں۔“ اس نے فون بند کر دیا اور بھٹکا ہوا آگے نکل گیا۔ پانچ منٹ کا وقت اتنا زیادہ نہیں ہوتا لیکن اسے زیادہ گنگ رہا تھا۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ پانچ منٹ کے اس وقفے میں کوئی دوسری کال آجائے جو ماہ بانو کے بارے میں اطلاع دے دے۔ آخر سہ کے بجے میں کی افراط ماہ بانو کے صورت آشنا تھے۔ ان میں سے بھی تو کوئی نہ اشتہار دیکھ کر فون کر سکتا تھا۔ کسی اور کے اس عنصر وقفے میں فون کرنے کے خدشہ سے کہ وہ اس قسطی کے سہارے جھٹکنے کی کوشش کر رہا تھا کہ جب صبح سے اب تک کسی نے انڈر کھول کر فون نہیں کیا تو اب کون اتنی ہی دیر میں فون کر دے گا۔ آخر خدا خدا کر کے پانچ منٹ گزرے۔ اس یار اس نے ایک ڈیڑھ گھنٹہ اسٹور کا فون استعمال کیا۔ دوسری طرف سے کال ای پہلے والے بندے نے ریسپونڈ کیا۔

”بھئی! فیصلہ کیا تم لوگوں نے؟“ اس کی آواز سنتے ہی اس نے اپنے لکچرے کو رارعب وار بتاتے ہوئے پوچھا۔

”مگر ہاں ہی، تم لڑکی کا پتا بتاؤ۔“

”پتا جاننے کے لیے تم پون بجے بعد بھائی کرٹ پہنچ کر مجھ سے ملو۔ ساتھ میں دو لاکھ کی رقم بھی لانا۔“

”ٹھیک ہے لیکن ہم تمہیں پہچانیں گے کیسے؟“ اس کی بات سننے ہی دوسری طرف سے بے چینی سے پوچھا گیا۔

”میں نے خاکی رنگ کی چٹون پر سفید قمیص پہن رکھی ہو گی اور آنکھوں پر دھب کا چشمہ بھی ہوگا۔“

خوب رہا ایک نظر ڈالنے کے بعد اس نے اپنا حلیہ بیان کیا اور فون بند کر کے کال کی ادائیگی کرنے کے بعد سڑک پر آ کر ایک ٹیکسی روک کر اس میں بیٹھ گیا۔ یہاں سے بھائی کرٹ پہنچنے کے لیے اس کا لگایا ہوا وقت کا اندازہ بالکل درست تھا۔ ٹیکسی نے پون بجتے ہی بس ایک آدھ منٹ اور پون بجے ہی اسے وہاں پہنچایا۔ ٹیکسی کا کرایہ دے کر وہ جیسے ہی

پہلے تم کچھ بتاؤ۔“ وہاں لگتا تھا کہ مگر کتنا مشکل ہو رہا ہے۔ ”انعام تو تمہیں دینا ہی ہو گا لیکن میری شرط یہ ہے کہ میں انعام میں ایک لاکھ کے بجائے دو لاکھ روپے لوں گا۔“ اس نے اپنا مطالبہ بیان کیا۔

”دو لاکھ... یہ تو بہت زیادہ ہے۔“ کرخت آواز والے نے اعتراض کیا۔

”زیادہ ہے تو رہے دو۔ میں بھی اطلاع نہیں دوں گا۔“

”اچھا اچھا کر۔ ایسا کرو پانچ منٹ مگر کرو۔ میں مشورہ کرنے کے بعد تمہیں جواب دیتا ہوں۔“ اس کی دھمکی پر وہ گھبرا کر جلدی سے بولا۔

”ٹھیک ہے، تم مشورہ کرلو۔ میں پانچ منٹ بعد دوبارہ فون کرتا ہوں۔“ اس نے فون بند کر دیا اور بھٹکا ہوا آگے نکل گیا۔ پانچ منٹ کا وقت اتنا زیادہ نہیں ہوتا لیکن اسے زیادہ گنگ رہا تھا۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ پانچ منٹ کے اس وقفے میں کوئی دوسری کال آجائے جو ماہ بانو کے بارے میں اطلاع دے دے۔ آخر سہ کے بجے میں کی افراط ماہ بانو کے صورت آشنا تھے۔ ان میں سے بھی تو کوئی نہ اشتہار دیکھ کر فون کر سکتا تھا۔ کسی اور کے اس عنصر وقفے میں فون کرنے کے خدشہ سے کہ وہ اس قسطی کے سہارے جھٹکنے کی کوشش کر رہا تھا کہ جب صبح سے اب تک کسی نے انڈر کھول کر فون نہیں کیا تو اب کون اتنی ہی دیر میں فون کر دے گا۔ آخر خدا خدا کر کے پانچ منٹ گزرے۔ اس یار اس نے ایک ڈیڑھ گھنٹہ اسٹور کا فون استعمال کیا۔ دوسری طرف سے کال ای پہلے والے بندے نے ریسپونڈ کیا۔

”بھئی! فیصلہ کیا تم لوگوں نے؟“ اس کی آواز سنتے ہی اس نے اپنے لکچرے کو رارعب وار بتاتے ہوئے پوچھا۔

”مگر ہاں ہی، تم لڑکی کا پتا بتاؤ۔“

”پتا جاننے کے لیے تم پون بجے بعد بھائی کرٹ پہنچ کر مجھ سے ملو۔ ساتھ میں دو لاکھ کی رقم بھی لانا۔“

”ٹھیک ہے لیکن ہم تمہیں پہچانیں گے کیسے؟“ اس کی بات سننے ہی دوسری طرف سے بے چینی سے پوچھا گیا۔

”میں نے خاکی رنگ کی چٹون پر سفید قمیص پہن رکھی ہو گی اور آنکھوں پر دھب کا چشمہ بھی ہوگا۔“

خوب رہا ایک نظر ڈالنے کے بعد اس نے اپنا حلیہ بیان کیا اور فون بند کر کے کال کی ادائیگی کرنے کے بعد سڑک پر آ کر ایک ٹیکسی روک کر اس میں بیٹھ گیا۔ یہاں سے بھائی کرٹ پہنچنے کے لیے اس کا لگایا ہوا وقت کا اندازہ بالکل درست تھا۔ ٹیکسی نے پون بجتے ہی بس ایک آدھ منٹ اور پون بجے ہی اسے وہاں پہنچایا۔ ٹیکسی کا کرایہ دے کر وہ جیسے ہی

ازرا، دو بندے لپک کر اس کی طرف چڑھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں سیاہ چڑی بیگ تھا۔

”تم ہی ہو جا نہیں فون کر کے اطلاع دینے والے۔
تمہاری فرمائش پر ہم دو لاکھ روپے لے کر آ گئے ہیں۔ اب تم
میں لڑکی کا جانتاؤ۔“

”پہلے رقم“۔ اس نے مطالبہ کیا جو اس کے ہاتھ میں ایک تھما دیا گیا۔ اس نے بیک کی زپ کھول کر اندر جھانکا۔ اندر رقم موجود تھی اور خاصی محسوس ہوتی تھی۔ رقم منے کے کا موثق نہیں تھا اس لیے اسے اندازے سے بری یقین کرنا تھا۔

”اب چلو... اور ہاں، یاد رکھنا کہ ہمیں دھوکا دینے کی کوشش نہ کرنا۔ ہمارے بندے ارد گرد موجود ہیں۔ تم نے ذرا بھی ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تو تمہیں پتائی نہیں چلے گی کہ تمہیں لگنے والی گولی کس طرف سے چلائی گئی ہے۔“ رقم سے بھرا بیگ دینے والے کا لہجہ بہت سرد تھا۔ اسے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناتا جی ڈور ٹی محسوس ہوئی لیکن رقم کے لیے اتنا ریسک تو لینا تھا۔

یہ انکار ملک ہو یا دنیا۔ ”خود کو باطن و ظاہر کرتے ہوئے اس نے تنبیہ کی تھی کہ اور قدم آگے بڑھا دیے۔ ذرا سا فاصلہ طے کرتے ہی اسے احساس ہونے لگا کہ غلامتے میں کچھ کشیدگی ہی ہے۔ جبکہ لوگ ٹولوں کی صورت میں کھڑے آپس میں باتیں کرتے نظر آرہے تھے۔ وہ اس صورت حال کو نظر انداز کر دیا۔ اسے اس علاقے میں رہنے والوں کے مزاج کے بارے میں واقفیت تھی۔ ذرا ذرا سے مسئلوں پر وہ لوگ اسی طرح ٹولیاں بنا کر ٹھنوں آپس میں تبصرے اور بحث کر سکتے تھے۔ وہ اپنے ساتھ موجود بندوں کو لے کر آگے بڑھتا گیا۔ وہ چونکے سے اس کے پیچھے چلتے رہے۔ راستے میں انہوں نے ایک پولیس موٹر گاڑی کو بھی دیکھا۔

بندوں میں سے ایک نے غراہٹ آمیز سرگوشی میں پوچھا۔

بعد میں اس نے ایک خط لکھا۔ اس خط میں لکھا تھا کہ ”میری طرف سے تو نہیں ہے۔ اگر تم پولیس میں جاؤ گے تو تمہاری زندگی خطرے میں پڑے گی۔“

کی گلی کے کونے والے گھر میں رہنے والا ایک سبزی فروش تھا۔
 ”تم عامر کے دوست ہو نا؟“ بچائے اس کے سوال کا
 جواب دینے کے، اس شخص نے اس سے پوچھا۔

یہاں کیا ہوا ہے۔ یہ اتنی پولیس کیوں جمع ہے اور لوگوں کو کبھی کے اندر کیوں نہیں جانے دے رہے؟" اس نے ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے۔

”بہت برا حادثہ ہوا ہے بھائی۔ جس میں شاید معلوم ہو کہ عامر کے پردوس والے گھر میں پائے، چمکے، پائے، انار اور دوسری بارود والی چیزیں پھٹی تھیں۔ پتا نہیں وہاں کس طرح آگ لگی اور سارا بارود لپٹ میں آگیا۔ دھماکے کی آواز اتنی زوردار تھی کہ ہمارے گھروں کی کھڑکیاں دروازے سے ٹٹی کر رہ گئیں۔ وہ کم بخت گھوڑو تو مارا ہی گیا، ساتھ میں دوسروں کو بھی لے ڈوبا۔ بے چارے عامر کے گھر کی دیوار تو اس کے بارود والے کمرے سے بالکل ملی ہوئی تھی۔ گلو کے گھر کے ساتھ وہاں بھی جا ہی آگئی۔ عامر کی ماں اور اس کی رشتے دار لڑکی کی لاشیں بھی ابھی پولیس والوں نے لمبے سے نکال کر اسپتال بھجوائی ہیں۔ جنہیں اگر عامر کے بارے میں کچھ معلوم سے تو اسے اس قیامت کی خبر کر دو۔ بے چارے کی ایک ماں ہی تو تھی، اب وہ بھی نہیں رہی۔ مگر بھی تباہ ہو گیا۔ یہ سب کچھ معلوم ہو گا تو اسے برا صدمہ ہو گا۔ صدمہ تو خیر سارے گھرانے ہے۔ اکٹھے تین بندے مر گئے ہیں۔ لوگوں کا جو مالی نقصان ہوا، وہ الگ ہے۔ پیچھے پرویز کے گھر کی دیوار بھی بچ رہی ہے۔ برکت خاں کے باورچی خانے کی کھٹکیں اڑ گئی ہیں۔ لوگوں کے گھروں میں شیشے کے برتن وغیرہ ٹوٹ کر رہ گئے ہیں۔“ وہ دیکھ کر ان کو ان سے نصیحتات سنوار رہا تھا لیکن سر زمین تو اپنے ہی نقصان میں اٹک رہا تھا۔ عامر کی ماں اور اس کی رشتے دار لڑکی کی لمبے سے لٹنے والی لاشوں کی اطلاع خود اس کے اپنے خوابوں کو تو زہمزد کر رکھ دیا تھا اور اسے رہا تھا کہ ان نوٹے ہوئے خوابوں کا ملہا اس پر دھڑا دھڑا اسے کبھی قبر میں دفن کرتا جا رہا ہے۔ یا نہیں پتا تھا میں ہوا جب جس میں دو لاکھ کی رقم موجود تھی، اس کی گرفت بھگتا جا رہا تھا۔ وہ جس کا سودا کر کے اس دو لاکھ کی مالک بنا تھا جب وہی نہیں رہی تو یہ دو لاکھ بھی کیسے اس رہ سکتے تھے؟ رقم کے کر فرار ہو جانے کا خیال بھی ہے کہ اگر وہ دونوں منکر نکیر سے سر پر سوار تھے۔

اکتوبر 2009ء

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے لیکن اس کی باگ ڈور جب بالتر سماج کے روایتی نظام میں پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں۔ بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ڈھونڈتی ہے اور یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے۔۔۔ ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو تو زکر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے۔ ہشتادویں ہے جو درمیانے طبقے سے ہو۔ محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس پوچھتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے، زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے۔۔۔ سبب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں۔۔۔ کبھی بازی پلٹ بھی جاتی ہے۔ گزرا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ نہ جاتا ہے۔۔۔ اُس وقت تک ہلکوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہ چکا ہوتا ہے جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومنا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی سلسلہ در سلسلہ

تدیر کی لہروں گری، قسمت کی چال بازی یا مقدر کا کھیل۔۔۔ لے اور بھڑ جانے والوں کی کہانی



دولاکھ کی رقم سے اس نے بہت سی امیدیں وابستہ کر لی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس رقم سے کوئی چھوٹا سونا کاروبار شروع کر کے ٹیلم کے گھر والوں کو رشے کے لیے راضی کر لے گا۔ انہیں اس کے رشے پر سب سے بڑا اعتراض تھا یہ تھا کہ وہ ایک ڈرائیور ہے جس کی معاشرے میں کوئی عزت نہیں ہوتی۔ اس نوکری کے مقابلے میں وہ اگر پرچون کی چھوٹی سی دکان بھی کھول لیتا تو روایتی سی سوچ رکھنے والے ٹیلم کے والدین کے لیے قابل قبول ہو جاتا لیکن اس ناگہانی حادثے نے اس کی ساری امیدیں توڑ دی تھیں۔ وہ خالی خالی نظروں سے وہاں ہونے والی بھاگ دوڑ دیکھ رہا تھا۔ پولیس والوں کے علاوہ وہاں پر آمدادی کارکن بھی نظر آ رہے تھے۔ ایک چھوٹا سا ٹمکھا میڈیا کے افراد کا بھی تھا جنہوں نے پولیس کے ایک آفیسر کو گھیر رکھا تھا۔ حادثے کو کسی بھی قسم کی دہشت گردی کی واردات کے بجائے اتفاقی حادثہ

ثابت کرنے میں زور و شور سے مصروف اس پولیس آفیسر کو اس نے آسانی سے شناخت کر لیا۔ وہ بقیہ کھو کر تھا۔ سوئی والا کے کیس کا تحقیقی افسر! کردہ اسے یہاں دیکھ لیتا تو اس کے لیے مشکل کمزری ہو سکتی تھی۔ رشے کھو کر سے بچنے کے لیے وہ دھوم سے باہر نکلے کے لیے پلٹا۔ اس کے سر پر سوار مسٹر نکیر فرامی ہو شیاء ہو گئے۔

”کدھر؟“ ان میں سے ایک نے غراہٹ آ سمیز سرگوشی میں پوچھا۔

”یہاں سے گھو پھر میں تم لوگوں کو ساری بات بتاؤں۔“ اس نے انہیں جواب دیا اور قدم آگے بڑھا دیے۔ وہ دونوں سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ تھے۔ عامر کے گھر سے کافی دور آنے کے بعد وہ ایک جگہ آ کر رک گیا۔ ان دونوں نے بھی اس کی بڑائی کی۔

”معاذ کیا ہے؟“ کھوت سے پھونو۔ تم تو نہیں لڑکی



تک پہنچانے والے تھے۔ لڑکی کہاں ہے؟ صاف صاف بتاؤ۔ ان لوگوں کے صبر کا پیمانہ یقیناً لبریز ہو چکا تھا چنانچہ ان میں سے ایک نے درشت لہجہ میں پوچھا۔

”میں تمہیں لڑکی کے پاس ہی پہنچاؤں یا تھا لیکن اب یہ ممکن نہیں رہا ہے۔ اب میں تمہیں اس کے بارے میں صرف خبر دے سکتا ہوں۔ تم نے اپنے اشتہار میں لڑکی کے بارے میں اطلاع دینے والے کے لیے دو لاکھ کا اعلان کیا تھا۔ میں ان روپوں میں سے تمہیں ایک لاکھ واپس کر کے ایک لاکھ رکھ لیتا ہوں اور لڑکی کے بارے میں خبر دے دیتا ہوں۔“ عامر کی گلی کے کونے سے یہاں تک پہنچنے میں اس کے دماغ نے تیزی سے کام کیا تھا اور پوری کی پوری رقم سے محروم ہو جانے کے بجائے اس نے سوچا تھا کہ کچھ نہ کچھ تو بچھ لگ ہی جائے اس لیے اب وہ ان لوگوں سے نیا سودا طے کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”کیا تاک لگ رکھا ہے سالے! ہمیں تو نے کیا سمجھا ہے جو اپنے اشاروں پر پھانسی کی کوشش کر رہا ہے؟“ اس کے مقابل موجود لوگ کی شریف قسم کے کاروباری بندے تو تھے نہیں کہ اس کی مرضی اور خواہش کے مطابق سودے بازی کرتے چلے جاتے۔ وہ دروہا ہی جیسے سے اکھڑے اور ان میں سے ایک نے اس کی گدی کو اپنے قبضے جیسی انگلیوں میں بکڑ لیا۔ ”چل، سیدھی طرح ہمیں لڑکی تک پہنچا۔“ وہ جہاں کھڑے تھے اس طرف لوگوں کی آمد و رفت نہیں تھی اس لیے سامنے کھڑے بندے نے بلا تکلف اس کے منہ پر اپنا ہتھوڑے جیبا باندھ دے مارا۔

”اب میں تمہیں لڑکی تک نہیں پہنچا سکتا۔ اگر یہ ممکن ہوتا تو میں اپنا ایک لاکھ کا نقصان کیوں کرتا؟ میں مجبور ہوں اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ مجھ سے ایک لاکھ واپس لے لو اور ایک لاکھ چھوڑ دو۔ بدلے میں، میں تمہیں تمہارے کام کی بات بتا دیتا ہوں۔“ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ خطرناک لوگ ہیں لیکن پھر بھی ایک لاکھ کی خاطر خطرہ مول لے کر ان سے کسی نہ کسی طرح معاملہ چلانے کے چکر میں تھا۔

”تمہ سے کیا لینا ہے اور کیا دیتا ہے، یہ فیصلہ ہم خود کریں گے۔ تو سیدھی طرح یہ بتا کر لڑکی کہاں ہے؟“ بڑی بڑی مونچھوں والے نے اپنی سرد آنکھوں سے اسے ٹھوڑے ہوئے سوال کیا اور جب میں ہاتھ ڈال کر ایک چاقو باہر نکال کر اسے کھولنے لگا۔ کرکڑاہٹ کی لگی کی آواز کے ساتھ چاقو کھل گیا اور اس کا چمک دار پھل اس کی نظروں کے سامنے لہرائے لگا۔ اس چاقو کے نظارے کے بعد سرمد کی ساری ہمت جواب

دے گئی۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ ان لوگوں کے سامنے مزید نہیں بک کے کاٹا نہ کچھ ہے ہوئے لہجے میں بتانے لگا۔

”تمہیں جس لڑکی کی تلاش تھی، وہ میرے ایک دوست عامر کے گھر میں ٹھہری ہوئی تھی۔ میں تمہیں اپنے دوست کے گھر لے جا رہا تھا لیکن ابھی میرے ساتھ تم لوگوں نے بھی سنا ہوگا کہ بارہ روز پیش بڑی کے گھر میں ہونے والے دھماکے سے میرے دوست کا گھر بھی تباہ ہو گیا ہے اور میرے دوست کی ماں کے ساتھ ساتھ وہ لڑکی بھی اس حادثے میں مر گئی ہے۔“ اس کی وہی گئی اس اطلاع پر وہ لوگ ایک ٹاپے کے لیے دم بخوردہ گئے پھر بڑی مونچھوں والے نے خود کو سنبھالا اور سختی سے پوچھا۔ ”لڑکی وہاں کیسے پہنچی تھی؟“

”میں نے خود اسے وہاں پہنچایا تھا۔ میں موتی والا صاحب کا ڈرائیور ہوں، انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ انہیں اپنے گھر میں لڑکی کی جان کے لیے خطرہ محسوس ہو رہا ہے اس لیے میں اسے کسی محفوظ جگہ لے کر آؤں گا۔“ ان کے حکم پر ہی میں نے اس رات جب ان کا گھر ہوا، تب لڑکی کو اپنے دوست کے گھر پہنچا دیا تھا۔ اتنے دنوں سے ہم لوگ پریشان ہو رہے تھے کہ اب لڑکی کا کیا کریں؟ میں نے اخبار میں اشتہار پڑھا تو چیخوں کے لالچ میں آ کر آپ کو فون کر بیٹھا لیکن اب وہ بے چاری ہی زندہ نہیں رہی تو آپ کو کہاں پہنچاؤں؟“ سچ میں مجھ کی آمیزش کرتے ہوئے اس نے ان لوگوں کو بتایا۔ یہ سب کہنے میں اسے اس لیے مشکل پیش نہیں آئی تھی کہ عامر کے شہر یار سے ملاقات کے لیے روانہ ہونے سے پہلے ہی وہ لوگ یہ کہانی تیار کر چکے تھے۔ سرمد اس حقیقت کو کسی طرح ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا کہ موتی والا اور اس کی بیوی کے گھر والی رات وہ ان کی گلی میں چوری کی نیت سے موجود تھا۔ اس لیے یہ کہانی تیار کی تھی۔ ماہ بانو نے بھی اس کہانی کی منظوری دیتے ہوئے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ کسی کو اصل حقیقت نہیں بتائے گی۔ چنانچہ اس وقت یہی کہانی اس کے کام آ رہی تھی۔

”تو تمہیں کہیں نہیں پہنچا سکتا۔ تو چل پھوٹ کھا یہاں سے۔“ ان روپوں میں سے مجھے ایک پیسا بھی نہیں ملے گا۔“ یہ جان لینے کے بعد کہ مرنے والی لڑکی واقعی ماہ بانو ہے اور سرمد اب حیران کے لیے کام نہیں آ سکتا، انہوں نے اس کی کمر پر ایک زوردار لات مار کر اسے پرے دھکیلا اور دونوں سے پھر ابھرا ایک سنبھال کر وہاں سے چل پڑے۔ سرمد کے اندر ہمت نہیں تھی کہ ان خوں خوار لوگوں کے پیچھے جا سکتا۔

☆☆☆

بچے سے لگنے والی دونوں عورتوں کی لاشیں بری طرح سبک ہو گئی تھیں۔ ایک تو دیوار اور چھت کے گرنے والے طبقے کے جسم بری طرح توڑ پھوڑ ڈالے تھے، دوسرے برقی سکی کسر بارود کی وجہ سے لگنے والی آگ نے پوری کر دی تھی۔ لاشیں تقریباً ناقابل شناخت ہو گئی تھیں۔ ان کی پہچان کے لیے قید و قیامت اور کیس نہیں لباس کے بچ جانے والے چھتروں سے مدد کی گئی تھی۔ شناخت کا عمل اتنا زیادہ دشوار اس لیے نہیں تھا کہ یہ تو یقینی طور پر معلوم تھا کہ گھر میں موجود خواتین کون تھیں۔ بس ان دونوں خواتین کی لاشوں میں سے ایک بوڑھی عورت اور ایک جوان لڑکی کی لاش کو الگ الگ کرنا تھا۔ تو یہ کام بے آسانی کر لیا گیا تھا۔ عامر نے واپس لاہور پہنچنے کے بعد دونوں لاشوں کی شناخت کے سلسلے میں تصدیق کر دی تھی۔ ماہ بانو کی لاش کی سب سے بڑی پہچان اس کی سیاہ چادر کے وہ چھتڑے تھے جو وہ ہر وقت اوڑھتی رہتی تھی اور سر سے وقت بھی وہ اس کے جسم کا حصہ بن کر رہ گئے تھے۔ اپنے گھر پر گزرنے والی اس قیامت کی اطلاع عامر کو عبدالمنان سے ملی تھی۔ عبدالمنان نے مل کر اس نے ماہ بانو کی اپنے گھر موجودگی کی اطلاع دی تھی تو وہ اس اطلاع پر فوراً متحریک ہو گیا تھا۔ سب سے پہلے اس نے لاہور رانا ہاؤس میں مقیم شہر بار کو اس بارے میں بتایا تھا اور پھر اس کے مشورے پر ریشم کھوکھر کو یہ ذمہ داری سونپی تھی کہ وہ عامر کے گھر جا کر ماہ بانو کو اپنی تحویل میں لے لیں۔ جواباً یوں کہنے بعد ریشم کھوکھر نے جو اطلاع دی تھی، وہ بہت اندوہناک تھی۔ غیر قانونی طور پر آبادی کے مین درمیان میں بچے کے بارود کی اشیا کا کاروبار کرنے والے گلوں کے بارود کی ذخیرے میں لگنے والی آگ نے کھوسیت عامر کی ماں اور جوان سال ماہ بانو کی زندگیوں بھی ختم کر دی تھیں۔

اس حادثے کے بارے میں اطلاع ملتے ہی عبدالمنان نے مشاہیرم خان کے ساتھ عامر کو لاہور بھجوانے کا بندوبست کر دیا تھا۔ عامر مشاہیرم خان کے ساتھ سید حامد وہ خانے پہنچا تھا اور یونی فرم موجود ایک پولیس مین کے سامنے اس نے اس بات کی تصدیق کر دی تھی کہ لاشیں اس کی ماں اور ماہ بانو ہی کی ہیں۔ شناخت کا مرحلہ طے ہونے کے بعد لاشیں ورتا کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اپنی ماں کی لاش کو عامر اپنے ساتھ لے گیا تھا جبکہ ماہ بانو کی لاش کو ایسویٹس میں عہدار روانہ کر دیا گیا تھا۔ اس کے سر جانے کے بعد اب اس بات کو چھپانے کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہ گئی تھی کہ وہ گاؤں سے لگنے کے بعد موتی والا کی گلی میں

خواب

ایک نریدہ شہر نے نفسیاتی معالج کو بتایا کہ وہ ہر رات کو یہی خواب دیکھتا ہے کہ وہ بارہ خوب صورت لڑکیوں کے ساتھ ایک ویران جزیرے میں رہ رہا ہے اور اسی خواب سے اس کی زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی ہے۔

نفسیاتی معالج نے کہا۔ ”میری کچھ نہیں آتا کہ ایسا برفلف خواب دیکھنے سے آپ کی زندگی کیسے اجیرن ہو سکتی ہے؟“

زن نریدہ شہر بولا۔ ”برلف کہا خاک...! میں پوچھتا ہوں آپ نے بھی بارہ لڑکیوں کے لیے کھانا پکا لیا ہے۔“

عملی مظاہرہ

ایک دوڑیں پٹاؤں کا پتہ آپ کی ایک شراب خانے میں آیا اور بارہ لڑکیاں دیکھیں گے۔ ”میں نے سنا ہے کہ ہمیں ایک کن کنے دماغش کی ضرورت ہے جو پٹاؤں پر دماغش سے نمٹ سکے۔“ ضرورت تو بڑی شدید ہے مگر ہمیں اس کام کو کوئی تجربہ ہی ہے؟“ بارہ لڑکیاں نے پوچھا۔

”تجربہ تو کوئی خاص نہیں لیکن میں ملی مظاہرہ کر کے دکھا سکتا ہوں۔“

یہ کہہ کر کن کنے دماغش نے ادھر ادھر دیکھا۔ ساتھ والے کمرے میں ایک مست شرابی سم کا آدی فون پر کسی کو کالیاں دے رہا تھا۔ کن کنے کے کمرے میں جا کر کن کنے کو دوپٹا اور کسی احتجاج کی پر دایکے بغیر اسے شراب خانے سے باہر پھینک دیا اور دھاتانے انداز سے جھومتا ہوا اگلے آکر بیٹھا۔

”عملی مظاہرہ پٹاؤں؟“

”بہت خوب۔“ بارہ لڑکیاں نے کہا۔ ”مگر تو کوری کی اجازت

ہمیں پاس سے لگتی پڑے گی۔“

”ہاں کہاں ہے؟“ دماغش نے پوچھا۔

”جسے ہمارے پیٹنگ آئے ہو وہی اس بار کا مالک ہے۔“

چھپی ہوئی تھی اور موتی والا نے از خود اسے اپنے ڈرائیور سرمد

کی مدد سے کسی خطرے کے پیش نظر اس کے دوست کے گھر منتقل کر دیا تھا۔ موتی والا کی اسی رات موت سے اس بات کی تصدیق ہوئی تھی کہ واقعی اس کی گلی میں کوئی خطرہ موجود تھا

لیکن ہمیں سے بہت سی کیا نیاں اور قس آرائیاں بھی جسم لے

ری تھیں۔ ماہ بانو کا موتی والا سے کیا تعلق تھا؟ وہ اپنے گاؤں سے کیوں بھاگی تھی؟ وہ موتی والا کی گلی تک کیسے پہنچی تھی؟ اس کی جان کو کس سے خطرہ درپیش تھا؟ موتی والا اور

اس کی بیوی کو کس نے قتل کیا؟ ماہ بانو کی جس حادثے میں موت ہوئی، وہ واقعی کوئی حادثہ تھا یا کسی نے اس کے قتل کے

لے باقاعدہ منصوبہ بندی کی تھی؟ بے شمار سوالات تھے جو اٹھائے جا رہے تھے لیکن وہ تمام افراد جن کو اس معاملے کی ذرا بھی ہینک تھی، اپنے ہونٹ بپہنٹے تھے۔ ان افراد میں شہر یار بھی شامل تھا۔ رقیق کھوکھر کی، جی کئی حقیقت کے نتیجے میں اسے اس بات کا تو یقین ہو گیا تھا کہ ماہ بانو کی موت کے پیچھے کسی دشمن کا ہاتھ نہیں اور اس کی موت یقینی طور پر ایک اتفاقی حادثے کے نتیجے میں واقع ہوئی ہے لیکن اس کی موت نے اسے بہت رنجیدہ کیا تھا۔ وہ اسپتال سے دس خارج ہونے کے بعد ان دنوں رانا ہاؤس میں کچھ عرصے آرام کی غرض سے ٹھہرا ہوا تھا۔ جیسے ہی اسے حادثے کی اطلاع ملی، اس نے اپنی مہمانی سزا آخر تک کے روکنے کے باوجود واپسی کا فیصلہ کر لیا اور اب ماہ بانو کی لاش کو لے جانے والی ایبویٹس کے ساتھ ساتھ اس کی گاڑی بھی دوڑ رہی تھی۔ گاڑی کو مشاہیر خان چلا رہا تھا۔ وہ خود اس حادثے پر بہت رنجیدہ تھا۔ وہ لڑکی جس کی زندگی بچانے کے لیے اس کے دوست نے اپنی جان کی قربانی دی تھی، وہ اس طرح مر گئی تھی تو اس کے لیے بھی دکھ کا مقام تھا۔ شہر یار کے چہرے سے البتہ اس کی اندرونی کیفیت کا صحیح طرح اندازہ لگانا مشکل تھا۔ وہ بالکل چپ تھا اور اس کے چہرے پر گہری تنہید کی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے لاش کی شناخت بتانے والے نیلے پھولوں والی سیاہ چادر کے ٹکڑوں کو ضرور دیکھا تھا لیکن لاش کا چہرہ دیکھنے کی خواہش نہیں کی تھی۔ شاید وہ بھی یہ بات سمجھتا تھا کہ یہ خواہش بے سود ہے۔ کرنے والی اینٹوں کی ضرب اور آگ کے شعلوں سے مس ہو جانے والے چہرے کو دیکھ کر سوائے تکلیف کے حاصل بھی کیا ہوتا تھا۔ ساتھ ساتھ چلتی اس کی گاڑی اور ایبویٹس اس کے دفتر کے قریب پہنچ کر ایک دوسرے سے الگ ہو گئیں۔ وہ اپنے دفتر پر رک گیا تھا جبکہ ایبویٹس کو ابھی پیر آپا دیک کا سفر طے کرنا تھا۔ دفتر میں عبدالمنان نے اس کا استقبال کیا۔ وہ خود بھی اس حادثے سے متاثر لگ رہا تھا۔

”کیا حال ہے... سب ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے؟“

اپنے دفتر میں پہنچ کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے عبدالمنان سے دریافت کیا۔

”میں سراسر اپوری ٹھنک اذقان۔ یہاں کے معاملات کے بارے میں، میں آپ کو فون پر مطلع کر رہی رہا ہوں۔ ایس بی نے کوشش کی تھی کہ اسے ایس آئی اور کاسٹیل کے کل والے معاملے پر کوئی الٹو ٹکرا کر سکے لیکن ذہنی سپاہیوں کے بیانات کی وجہ سے اسے موقع نہیں مل سکا۔ کچھ ڈی آئی جی صاحب کی مداخلت کی وجہ سے بھی اسے دینا پڑا۔ آپ

بتائیں، اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“ زخم ٹھیک تو ہے نا؟“ عبدالمنان نے بھانپ لیا تھا کہ شہر یار کی خاموشی کے پیچھے بہت بڑا طوفان چھپا ہوا ہے لیکن ان خود اسے بھینچنے کے بجائے گفتگو کو اس کے سوال کا جواب دینے اور اس کی خیریت پوچھنے تک محدود رکھا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں اسی لیے پچھلی شتم کر کے فوراً واپس آ گیا ہوں۔ اب ہمیں بہت تیزی سے اپنے سارے منصوبوں پر کام کرنا ہوگا۔ میں اس بات کا بندوبست کر کے آیا ہوں کہ کم از کم اسکول اور صحت کے مراکز کی تعمیر میں ہمیں کسی قسم کی مداخلت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ پیر آپا والے اسکول کا کام تو بس مکمل ہی ہونے والا ہوگا۔ اسکول مکمل ہو جائے تو اس کے افتتاح اور سرگزشت کا سبک بنیاد رکھنے کے کام ایک ساتھ انجام دے دیے جائیں گے۔“ اس نے تفصیل سے اپنے منصوبے کو بیان کیا۔

”یہ تو بہت اچھی خبر ہے سر! ان منصوبوں پر جتنی جلدی عمل درآمد کیا جائے اچھا ہوگا۔ اچھی حال ہی میں پیر آپا دین ایک لڑکی بروقت طبی امداد نہ ملنے کی وجہ سے مری ہے۔ لڑکی کا نام نگار تھا۔ وہ ماہ بانو کی بڑی بہن تھی۔ بے چارے غریب لوگوں پر آفت ٹوٹ پڑی ہے۔ آگے پیچھے دو جوان لڑکیاں اپنی جان سے چلی گئی ہیں۔“ روانی میں عبدالمنان لٹھی سے ماہ بانو کا ذکر پھیلے بیٹھا۔ یہ ذکر سن کر شہر یار یل بھر کو چپ ہوا اور پھر میز کی دراز میں کچھ تلاش کرتے ہوئے ہوا۔

”اس طرف کی خبر خیر لے لینا عبدالمنان! مدفن کے سلسلے میں یا کسی اور معاملے میں ان لوگوں کو کوئی ضرورت ہو تو ان کی مدد کر دینا۔“

”او کے سر! میں خیال رکھوں گا... اور کوئی حکم؟“ ہدایت کے جواب میں اس نے مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں، فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔ میں نے موتی والا کے وکیل سے بات کر لی ہے۔ بورڈ کے تینوں وکلاء نے بڑے اسپتال کے بجائے چھوٹے ہیلتھ یونٹس کے قیام کی منظوری دے دی ہے۔ کل تم ہمارے منصوبے کی تمام تفصیلات کا ڈرافٹ تیار کر لینا۔ میں ایک آدھ دن میں بورڈ کے ممبران، انجینئر اور کنسٹرکٹر وغیرہ کی ایک مینٹنگ اراٹج کروانے کا ارادہ رکھتا ہوں تاکہ اخراجات کا تخمینہ لگا کر باقاعدہ کام کا آغاز کیا جاسکے۔“ وہ ایک بار پھر گفتگو کا موضوع بدل گیا تھا۔

”ٹھیک ہے سر! میں کل دوپہر تک یہ کام منہا لوں گا۔“

اس بار عبدالمنان نے بھی احتیاط سے کام لیا اور ایسا کوئی لفظ منہ سے نہ نکالا جو اس موضوع کو پھیلنے کا سبب بنے جس سے وہ واضح طور پر گریز کرتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

چودھری افتخار راہی حویلی میں سرٹھے بیٹھا تھا۔ ماہ بانو کی موت نے ساری بازی ہی الٹ دی تھی۔ وہ جس تکلیف بدن کو اپنی دسترس میں دیکھنے کا خواہش مند تھا، اسے اس سے پہلے موت نے اپنے گھٹنے میں دیوچ لیا تھا۔ وہ جو خدمت کا ہر کارہ بنا لوگوں میں موت بانٹا پھرتا تھا، جس کے حکم سے اس کے کارندے کھوں میں اس کے دشمن کی زندگی کا چراغ گل کر دیتے تھے، خود موت کے ہاتھوں گھسٹ کھا گیا تھا۔ اب چاہے وہ دنیا الٹ کر رکھ دیتا لیکن ماہ بانو اس کے ہاتھ نہیں آنے والی تھی۔ ماہ بانو کو حاصل کرنے کے اس کے سارے دعوے دھڑے دھڑے رہ گئے تھے۔ اسے گمان بھی نہیں تھا کہ وہ اس صورت حال سے دوچار ہوگا۔ بالے کی طرف سے یہ اطلاع ملنے پر کہ اشتہار کے نتیجے میں ایک شخص کی طرف سے کال آئی ہے کہ وہ لڑکی کے گھرانے سے واقف ہے اور وہ شخص دولاکھ کے عوض انہیں اس گھرانے تک پہنچا سکتا ہے، وہ خوشی سے اٹھ پڑا تھا اور فوری طور پر دولاکھ کی ادائیگی کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ دولاکھ اس کے لیے کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ اس معمولی رقم کے بدلے اسے نہ صرف ماہ بانو مل جاتی بلکہ وہ شہر یار کو بھی گھسٹ سے دوچار کر دیتا لیکن جب بالے کی طرف سے اگلی خبر آئی کہ ماہ بانو ایک حادثے کے نتیجے میں ہلاک ہو گئی ہے تو اس کا دماغ ہلک سے اڑ گیا۔ وہ فون پر ہی بہت دیر تک بالے پر گر جتا اور اسے گالیاں دیتا رہا لیکن اس سب سے کیا حاصل ہوا تھا؟ حقیقت تو یہ ہو رہی تھی کہ اس نے اپنی جگہ موجودگی جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا تھا۔

”غیاٹے کی لڑکی کی لاش پہنچ گئی ہے سرکار! ابھی ابھی ایک ہندہ خبر لے کر آیا ہے کہ لاہور سے ایبویٹس لاش لے کر آئی ہے۔ کہتے ہیں لاش کی حالت بڑی خراب ہے۔ ایک آدھ ہندے نے ہی چہرہ دیکھا ہے اور کچھ کرکان پڑ لیے ہیں۔ غیاٹے کی برادری کے بزرگوں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب کسی کو لاش کا چہرہ نہیں دیکھنے دیں گے۔ سنا ہے نوران بڑی ترپ رہی مگر اپنی دمی کے چہرے کو دیکھنے کے لیے لیکن مورخوں نے اسے پلا کر قابو میں کر رکھا ہے اور اسے لاش کے قریب نہیں جانے دے رہے ہیں۔ لاش کو گھن تو لاہور سے ہی چھپنا کر چھپا گیا ہے، یہاں قبر تیار ہوتے ہی اسے دفن بھی

دیں گے۔ "فشی اللہ رکھا اجازت لے کر اندر آیا اور چودھری کو متصل رپورٹ سنائی۔

"تدفین کے بعد جوئی سے غیث محمد کے گھر کھانا بھجوا دینا اور اس سے کہنا کہ مجھ سے آکر ملے۔" فشی کی ساری بات سننے کے بعد اس نے اسے حکم دیا۔

"بہتر چودھری صاحب! میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا۔ غیث محمد تو خوش ہو جائے گا کہ آپ نے اسے معاف کر دیا ہے۔" فشی خوشامدی لبہ لبس ہوا۔

"میں نے غیث سے کہا تھا کہ اس کی دبی زندہ یا مردہ کسی بھی صورت میں مجھے ملے گی، تب ہی اس کی خلاصی ہوگی۔ اب وقت آگیا ہے کہ میں اپنی بات پوری کروں۔

ویسے بھی اس معاملے میں مجھے اصل حساب غیث محمد سے نہیں، دوسروں سے لینا ہے۔ غیث محمد کی کیا حیثیت ہے کہ میرا اس سے کوئی حساب کتاب ہے۔ حساب تو ان کو دینا ہوگا جو دوست بن کر پیچھے سے دشمنی بھاتے رہے ہیں۔ موتی والا

کا معاملہ تو بالکل چل کر سامنے آگیا ہے۔ جس بندے نے باسے کو باہر لانے کے بارے میں خبر دی تھی، اس نے بھی یہی بتایا ہے کہ وہ اتنے دنوں سے موتی والا کے گھر چھپی ہوئی تھی۔ وہاں اسے کس نے پتہ چلایا، میں انکی طرح کچھ نہیں کیا ہوں۔ موتی

والا تو پہلے ہی اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے، اب میرے اس دوسرے دشمن کو بھی حساب دینا ہوگا۔ میں اسے چھوڑوں گا ہرگز نہیں۔ اسے پتا چل جائے گا کہ اس نے چودھری افتخار عالم شاہ سے ہیر لیا تھا۔" چودھری بہت غضب میں تھا۔ فشی

جانتا تھا کہ اس کے غصے کا رخ کس کی طرف ہے۔ چنانچہ اپنی ٹنگ خواری جتانے کو بڑے جوش سے ہوا۔

"آپ فکر نہ کریں سرکار! آپ کی آن پر ہم سب اپنی جانیں نچھاور کر دیں گے۔ آپ بس صرف اشارہ کر دیں پھر دیکھیے گا کہ آپ کے دشمن کا کیا انجام ہوتا ہے۔"

"ابھی کچھ نہیں کرنا۔ ابھی جو میں نے اس بچوگلے کو پہلا سبق دیا ہے، اس کا نتیجہ سامنے آنے دے۔ میرے خیال میں تو جس ماسے کی گود میں بیٹھ کر وہ مجھ سے کھیلنے کی کوشش کر رہا ہے، وہ ماما خود ہی اسے بھادے گا کہ چودھری افتخار

سے کیلنا بچوں کے بس کی بات نہیں۔ اگر وہ اپنے ماسے کی بات سمجھ گیا تو اس کے حق میں بہتر ہوگا۔ میں تھوڑی بہت چوٹ دے کر اسے معاف کر دوں گا لیکن اگر وہ نہیں سمجھتا تو پھر سارے اگلے پچھلے حساب دینے ہوں گے۔" چودھری کا

عجیب حال تھا۔ ایک طرف اس کا دل چاہتا تھا کہ باہر کو خود سے بچھین لینے کے جرم میں شہر یار کے گھر سے گھرے کر ڈالے

مگر پھر اس غصے پر مصلحت پسندی حاوی ہونے لگی اور وہ سوچتا کہ براہ راست تصادم کے بغیر ہی کسی طرح بات بن جائے تو

اچھا ہے۔ شاید غصے کے ساتھ ساتھ اپنے مفادات کے تحفظ کا خیال اسے کسی ایک فیصلے پر نہیں پہنچنے دے رہا تھا۔

"جیسا آپ حکم دیں گے ویسا ہی ہوگا سرکار! ہم تو آپ کے ٹنگ خوار اور غم کے غلام ہیں۔ آپ کی خوشی جس میں ہوگی، ہم وہی کریں گے۔" مزاح شاس فشی نے ایک بار پھر اسے مطمئن لگایا۔

"فیک ہے اوئے! مجھے معلوم ہے تم لوگوں کی وفاداری کا۔ اب جاہیاں سے اور جو میں نے کہا ہے وہ کر۔ میں بھی اب تھوڑی دیر آرام کروں گا۔" فشی کی خوشامدی کے جواب میں خوش ہونے کے بجائے اس نے اسے پھٹکار سے

نوازا۔ اس کا موڈ دیکھ کر فشی چپ چاپ باہر نکل گیا۔ چودھری اپنے شان دار بیڑ پر آکھنڈے، ٹیکے کے نیچے اب بھی ماہ بانو کی تصویریں رکھی تھیں۔ اس نے تصویریں

ٹکائیں اور ایک نظر دیکھنے کے بعد ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ وہ کوئی اس کے عشق میں جلتا نہیں تھا کہ تاجات ان تصویروں کو اپنے سینے سے لگا کر رخصتی آجیں بھرتا رہتا۔ یہ تصویریں تو اس

نے اپنا آتشیں شوق بھڑکانے کے لیے منبھال رکھی تھیں۔ تصویروں کو دیکھ کر وہ اس تصور سے خود کو بھلاتا رہتا تھا کہ جب یہ برہنہ کی طرح قلائیں بھرتی، چاندی جیسی رنجت اور

ترشے ہوئے بدن والی لڑکی اس کی غلطی میں آئے گی تو وہ کس طرح اسے برتنے گا۔ اب جبکہ یہ امکان ہی سرے سے شتم ہو گیا تھا تو تصویر کی دنیا سجا کر بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی؟

دل بھلانے کے لیے اس کے پاس اور بھی بہت ذرائع تھے۔ تصویروں کے ٹکڑے کرنے کے بعد وہ ٹیلی فون کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کی انگلیاں حُسن کی دکان چلانے والی اس

ٹانگ کا نمبر ڈائل کر رہی تھیں جو اس کے ذرا سے اشارے پر ایک سے بڑھ کر ایک ہیرا جن کر اس کے ذہن پر بے پناہ دیتی۔ ماہ بانو کا غم غلط کرنے کے لیے اس کی عیاش فطرت

نے اسے یہی راہ دکھائی تھی۔

شہر یار نے طائرانہ نظروں سے مصروف محل مزدوروں کا جائزہ لیا۔ وہ بہت تن دی سے اسکول کے قریب شدہ

کروں میں رنگ و روغن کا کام کر رہے تھے۔ کام کی رفتار بے حد تلی بخش تھی اور اسے امید تھی کہ دو دن بعد جب اسکول کی اختتامی تقریب منعقد کی جائے گی تو نہ صرف سارا کام مکمل ہو چکا ہوگا بلکہ کچھ کھانا سیت کر صفائی وغیرہ بھی کر دی

جائے گی۔ اپنے اسی خیال کا اظہار اس نے ساتھ کھڑے ماسٹر آفتاب سے بھی کیا۔

"کام تو بہت اچھے طریقے سے ہو رہا ہے۔ میرے خیال میں دو دن تک سارا کام مکمل ہو جائے گا۔"

"دو دن نہیں سر، انشاء اللہ کل شام تک رنگ و روغن اور صفائی کا کام مکمل ہو جائے گا۔ پرسوں صبح یہاں اسکول کے لیے ڈسٹبلین اور میزیں کرسیاں بھی پہنچ جائیں گی۔ بچے نئی

کلاسوں اور فرنیچر وغیرہ کے خیال سے بڑے خوش ہیں۔ اس وقت ان میں اتنا جوش بھرا ہوا ہے کہ باقی کے سارے کام ہم ان کی مدد سے ہی مکمل کر والیں گے۔" ماسٹر آفتاب کی اپنی آواز میں بڑا جوش تھا۔

"فرخپر؟ میں نے تو اس سلسلے میں کوئی آرڈر نہیں دیا تھا۔ کیا عبداللہ ان نے اسکول کے لیے فرنیچر کا انتظام کیا ہے؟"

"نہیں سر! اصل میں، میں نے خود ہی فرنیچر کے لیے آرڈر دے دیا تھا۔ اپنی کتاب کی اشاعت کے بارے میں تو میں نے آپ کو بتایا ہی تھا، بس اسی کی راتنی کا چیک ملا تھا تو

میں نے سوچا کہ اس رقم سے اسکول کے لیے فرنیچر کا انتظام کر دیا جائے۔" ماسٹر آفتاب نے شرماتے ہوئے اس کے سوال کا جواب دیا۔

"آئی ایم پراؤڈ آف یو آفتاب! اتنے سارے بے ایمانوں اور لیڈروں کے درمیان تم جیسے شخص کو دیکھنا ہوں تو میرا حوصلہ بڑھ جاتا ہے اور کچھ کر دکھانے کی انگلی

سارے سے جاگ اٹھتی ہے۔" اس نے بے ساختہ ہی آفتاب کے شانے کو تھپتھپاتے ہوئے اس کی کارکردگی کو سراہا۔

"میں تو اپنے گھر کا فرض انجام دینے کی کوشش کرتا ہوں سر۔ بس خوشی اس بات کی ہے کہ آپ جیسے قدر دان شخص کا ساتھ میسر آگیا ہے۔ اختتامی تقریب کے لیے میں نے

اپنے ساتھی منچر کے ساتھ مل کر کچھ منصوبہ بندی کی ہے۔ میں چاہ رہا ہوں کہ اس پر آپ سے رائے لے لوں تاکہ کوئی کمی محسوس نہ ہو۔" آفتاب نے عاجزی سے جواب دیتے ہوئے

گنگوکار خ دو دن بعد ہونے والی تقریب کی طرف موڑ دیا۔ "مجھے اس سلسلے میں تمہاری صلاحیتوں پر پورا اعتماد ہے۔ ظاہر ہے، یہ طور مکانی تمہارا مشاہدہ بہت وسیع ہے اور تم

انکی طرح جانتے ہو کہ ایسے مواقع پر کس قسم کے انتظامات کیے جاتے ہیں لیکن اپنی تلی کے لیے چاہو تو مجھے بتا سکتے ہو۔"

"میرا مشاہدہ اور تجربہ اپنی جگہ لیکن یہاں جو انتظامات کیے گئے ہیں، وہ اپنے جھٹ کو اور دستیاب سہولیات کو سامنے رکھتے ہوئے محدود پیمانے پر کیے گئے ہیں۔ میں نے اس

بات کا انتظام کر لیا ہے کہ اسکول کی قیادت، ڈپٹی کے ارد گرد کے علاقے اور بیڑا کے داخلی راستے پر کاندھ کی رنگ برنگی جھنڈیاں لگائی جائیں۔ خاص خاص راستوں پر ہم چونا

ڈال کر اسے صاف کرنے کا انتظام بھی کر لیں گے۔ بچوں کی مدد سے چھوٹا سا اور انٹیمی شوکی رانج کر لیا جائے گا۔"

"اس طرف سے تم بے فکر رہو۔ آخر یہ چودھری افتخار کس مرض کی دوا ہے؟ ہمارا انتظام اس کے خربے پر ہوگا۔"

"چودھری صاحب اس سلسلے میں تعاون پر راضی ہو جائیں گے، وہ تو سخت خلاف ہیں اسکول کے۔" فشر پارکی قسلی پر اس نے تشویش کا اظہار کیا۔

"خالتہ اتنی جگہ، نام ہانے کا موقع اپنی جگہ۔ اس طرف سے فارغ ہو کر میں چودھری کی عربی ہی جاؤں گا اور

مجھے یقین ہے کہ وہ انفرامیں پیش کن کرے گا کہ آٹے والے مہمانوں کی خاطر ملازمت اس کی جلی میں کی جائے۔ باقی اخراجات کی طرف سے بھی تم فکر نہ مت ہونا۔ آرام

سے خرچ کرو اور سارا حساب کتاب چاکر مجھ دے دو۔ اس خرچے کی وصولیابی میں اس موبائل مینی کے مالکوں سے کروں گا۔ سرکاری زمین پر اپنی کھیتی کا ہار نصب کرنے کے

سلسلے میں ان پر جو حساب کتاب بنتا ہے وہ انگ ہے، میں ایک دوسرا حکمتا اس صبح پر ان کی کھیتی کا لیڈر لگا کر کھلوں گا۔

نہیں معلوم ہی ہے کہ یہ کسٹل ازم کا زانہ ہے۔ موبائل مینی والے خوشی سے اس بات پر راضی ہو جائیں گے کہ اپنے بیٹرز لگو کر بدلے میں ہمیں ٹنگ ٹانگ رقم ادا کر دیں۔ آخر اس

تقریب کی کوئی ریت اور ایٹراٹک دونوں طرح کے میڈیا پر ہوتی ہے۔ موبائل مینی والے اپنی بیٹی کا یہ موقع ہرگز بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیں گے۔" شہر یار کے جواب سے اسے

اعزاز ہوا کہ اس کا ہوم ورک بالکل مکمل ہے۔ کیوں نہ ہوتا۔ آخر کو وہ ایک بیروکر سٹ تھا جس کی پرورش بیروکر سٹی اور سیاست کے دو آئندہ ماحول میں ہوئی تھی۔

"یہ تو بہت اچھی خبر سنائی آپ نے سر! اب آپ دیکھیے گا کہ تقریب کا کتنا اچھا انتظام کرنا ہوں گی۔" وہ حسب عادت پر جوش ہو گیا۔ پھر ایک طرف دیکھتے ہوئے

ہوا۔ "لیجیے، وہ لوگ بھی ابلیس آگئے۔" شہر یار نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔ کچھ راستے پر اسی جانب ہی روزنی ہوئی آنے والی گاڑی اس کے اپنے دفتر کی تھی۔ اس

گاڑی میں عبداللہ ان، آفتاب کا ساتھی منچر خذیب اور وہ فیکہ دار سوار تھا جس سے رگڑ سخت کی تقریب کے سلسلے میں ان لوگوں کا کنٹرول ہوا تھا۔ وہ لوگ اس پرانی ڈپٹری کا جائزہ

لیے مجھے تھے جسے وسعت دے کر مرکز صحت کی نئی اور جدید عمارت تعمیر کی جانی تھی۔

”ڈپنٹر کی عمارت تو بڑی خراب حالت میں ہے۔ ایک تو دیکھ بھال صحیح طرح نہیں ہوئی، دوسرے عمارت میں میسرل بھی اچھا نہیں لگا ہوا اس لیے جگہ جگہ دیواروں میں دراڑیں پڑی ہوئی ہیں۔ صحت کی حالت بھی ایسی ہے کہ مجھے یقین ہے پارٹوں کے موسم میں صحت بری طرح ٹپکتی ہوگی۔ اگر آپ میرا مشورہ مانتے تو اس پرانی عمارت کو بلند و بالا کے قریب نئی عمارت بنائی جائے تاکہ کام چکا ہو۔“ گاڑی ان کے قریب آ کر رکھی تو ٹھیکے دار گاڑی سے اترے ہی پولا شروع ہو گیا۔

”ٹھیک ہے، جیسا آپ مناسب سمجھیں۔ میرا اپنا بھی یہی اندازہ تھا اسی لیے میں نے آپ کو خاص طور پر وہاں وزٹ کے لیے بھیجا تھا۔ آپ نے اپنی نظروں سے سب کچھ دیکھ لیا ہے، اب اس کے مطابق تیاری شروع کر دیں۔ جزل صاحب کے ہاتھوں سنگ بنیاد رکھے جانے کے بعد کام کا باقاعدہ آغاز کرنا ہوگا اور تیزی سے اسے مکمل بھی کرنا ہوگا۔ اگر آپ کی کارکردگی اطمینان بخش ہوئی تو ہم اپنے اگلے کنٹریکٹس بھی آپ کے ساتھ کرنے میں خوشی محسوس کریں گے۔ یہ بات تو میں نے آپ پر پہلے ہی واضح کر دی ہے کہ یہ کوئی سرکاری پراجیکٹ نہیں ہے اس لیے سارے کام کا بہت سختی سے جائزہ بھی لیا جائے گا اور پورا حساب کتاب بھی رکھا جائے گا۔“

”بالکل جناب! آپ فکر ہی نہ کریں۔ میں اپنا کام ایمان داری سے کر کے حلال روزی کمانے والا بندہ ہوں۔ آپ کو کچھ سے کوئی شکایت ہو، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ شہر یار کی بے حد سنجیدگی سے کئی مٹی بات پر ٹھیکے دار نے زور و شور سے یقین دلایا۔

”عبدالمنان! تم ان کی روانگی کا انتظام کر دو۔ ہمیں تو یہاں ابھی کافی وقت لگے گا۔ ٹھیکے دار صاحب مصروف آدمی ہیں، انہیں واپسی کی جلدی ہوگی۔“ ٹھیکے دار کی یقین دہانی پر کئی بھی قسم کا رد عمل ظاہر کیے بغیر اس نے عبدالمنان کو ہدایت دی۔

”میں چائے تیار کرتا ہوں سر! آپ لوگ چائے پی کر جائے گا۔“ ان لوگوں کو جانے کے لیے پر تو لے دیکھ کر ماسٹر آفتاب نے جلدی سے چٹن کش کی۔

”نہیں بھئی، فی الحال ان تکلفات میں پڑنے کا بالکل بھی وقت نہیں۔ ابھی بہت سے کام منانے ہیں۔ ہاں اگر ٹھیکے دار صاحب چاہیں تو ہم انہیں چائے پلا سکتے ہو۔“

”نہیں، میں بھی اب چلوں گا۔ بہت بہت شکریہ۔“ اس نے انکار کرتے ہوئے ٹھیکے دار کی طرف اشارہ کیا تو اس نے بھی جلدی سے معذرت کر لی اور وہاں موجود لوگوں سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔ اس کے رخصت ہوتے ہی ان لوگوں نے بھی ماسٹر آفتاب اور فیض سے رخصت لی۔ حسب پروگرام ان کا رخ حویلی کی طرف تھا۔ چودھری سے لاکھ اختلافات اور عداوت کے باوجود اس موقع پر اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ اس علاقے کا سب سے زیادہ اثر رسوخ رکھنے والا بندہ تھا۔ پیر آباد میں کچھ کیا جاتا اور اس میں چودھری کی شمولیت نہ ہوتی، لیکن نہیں تھا اس لیے انہیں دو دن بعد ہونے والی تقریب کے سلسلے میں لازماً اسے باقاعدہ طور پر اطلاع دینی تھی۔

”ڈریہاں روک لو۔“ وہ لوگ اسکول سے حویلی کی طرف جانے والے راستے پر گھمزن تھے کہ راستے میں دکھائی دینے والی گاؤں کی انگوٹھی مسجد کو دیکھتے ہوئے شہر یار نے ڈرائیور کو حکم دیا۔ وہ گاڑی عرصے سے اس بات کا خواہش مند تھا کہ مسجد کے پیش امام سے ملاقات کر سکے لیکن ہمیشہ پیر آباد آنے پر دیگر معاملات میں اس طرح الجھ جاتا تھا کہ اس ملاقات کا موقع ہی نہیں نکال پاتا تھا۔ اپنے ذہن میں آنے والے ایک خیال کے تحت اس وقت اس نے امام مسجد سے ملاقات کا موقع نکال ہی لیا۔ ڈرائیور نے گاڑی مسجد کے قریب لے جا کر روکی تو وہ اور عبدالمنان گاڑی سے نکل آئے۔ مسجد کے دروازے سے اندر داخل ہونے کے بعد انہوں نے اپنے جوتے اتارے اور اس سمت بڑھ گئے جہاں سے بچوں کے قرآن پڑھنے کی آواز آرہی تھی۔ مسجد بہت زیادہ بڑی نہیں تھی لیکن اس کی تعمیر ایسے طریقے سے کی گئی تھی۔ آوازوں کے تعاقب میں وہ جس دروازے تک پہنچے، وہ ایک ہال نما کمرے میں کھل رہا تھا۔ دروازے پر ہی روک کر انہوں نے اندر کا جائزہ لیا۔ فرش پر بچے ایک قطار میں بیٹھے بل بل کر اپنے سامنے رکھے پاروں سے سبق پڑھ رہے تھے۔ نشیما ان کی مسند پر ایک صحت مند آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ آدمی کا رخ بچوں کی طرف تھا اور دروازے سے بھاگتے پر ان لوگوں کو اس کی صرف پشت نظر آرہی تھی۔ اس آدمی کے بامیں جانب ایک بچہ کھڑا اس کا بازو دبا رہا تھا۔

”الہا نہیں آیا آج بھی۔ جا کر بول دینا اس کے پاس بیو کو۔“ اگر اب اس نے ایک دن بھی اور چھٹی کی تو میں پھنسر سے اس کی دودھنا کی کروں گا کہ کمال اتر جائے گی سالے کی۔ جس دن سے بہن مری ہے، اس نے ادھر کا رخ

ہی نہیں کیا۔ لگتا ہے بہن کے ساتھ خود بھی قبر میں جا کر دفن ہو گیا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اب اسے اپنے گھر میں ہی تر لوائے لڑ رہے ہیں اس لیے ادھر کا رخ نہیں کر رہا۔ جب گھر میں فائے زور ہے تو دو دروازے گھیرے پاس آتا تھا۔ ”وہ بہت قہرناک لہجے میں بول رہا تھا مگر پھر شاید اس نے اپنے سامنے بیٹھے بچوں کی توجہ دروازے کی طرف محسوس کر لی اور خود بھی پلٹ کر اس طرف دیکھا۔ باقاعدہ ملاقات نہ ہونے کے باوجود شہر یار اور عبدالمنان کے چہرے اس کے لیے نامانوس نہیں تھے۔ عرس کے موقع پر وہ ان لوگوں کو دیکھ چکا تھا، اب جو اس نے انہیں وہاں موجود پایا تو گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

”آئیے آئیے، تشریف لائیے۔ میری خوش قسمتی کہ آج آپ لوگوں نے اس جگہ کو رونق بخشی۔“ اس کا انداز اتنا قد و پائے تھا کہ لگتا تھا، اس کا بس نہ چل رہا ہو کہ ان کے قدموں میں بچھ جائے۔ ہاتھ ملانے کے لیے اس نے شہر یار کا ہاتھ تھاما تو پھر چھوڑا ہی نہیں اور اسے تقریباً کھینچے ہوئے اپنی مسند تک لے گیا۔

”تشریف رکھیے۔“ شہر یار کا ہاتھ تھامے تھا سے ہی اس نے زبردستی اسے مسند پر بٹھانے کی کوشش کی۔

”نہیں مولوی صاحب! میں نیچے ہی بیٹھوں گا۔ بچے قرآن لے کر نیچے بیٹھے ہوئے ہیں، میرا اوپر بیٹھنا مناسب نہیں۔“ وہ مولوی سے اپنا ہاتھ پھڑا کر بچوں کے قریب ہی نیچے بیٹھ گیا۔ اس کی اس حرکت پر کھنپاتے ہوئے مولوی نے بھی عجز کی اور خود اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

”آپ کو کوئی کام تھا تو مجھے زمت دی ہوتی جناب! میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا۔“

”نہیں مولوی صاحب! آنا تو مجھے ہی تھا، بس وقت کی قلت کی وجہ سے اب تک انہیں لے کا تھا لیکن اب بہت ضروری ہو گیا تھا کہ میں آپ سے ملاقات کر لوں۔“ مولوی کا خوشامدانی انداز اسے کوفت میں مبتلا کر رہا تھا لیکن پھر بھی وہ اسے عزت دے کر ہی بات کر رہا تھا۔ خاص طور پر یہاں آتے ہی اس نے مولوی کی جس طرح کی زبان سمجھی اور اسے جس انداز میں بیٹھے دیکھا تھا یہ دیکھ کر اس کا دل بہت خراب ہوا تھا لیکن وہ اس بات سے بھی واقف تھا کہ اس قسم کے دیکھ بھال میں مولویوں وغیرہ کو خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے اس لیے ان میں خود بخود ہی ذرا سا تکبر پیدا ہو جاتا ہے۔

”آپ حکم کیجیے جناب! آپ کے حکم کی تعمیل کر کے مجھے دلی خوشی ہوگی۔“

”حکم نہیں بس ایک چھوٹا سا کام ہے۔ دو دن بعد گاؤں میں اسکول کے افتتاح اور مرکز صحت کے سنگ بنیاد رکھنے کے سلسلے میں ایک قریب متعلقہ جاری ہے۔ تقریب کا آغاز اللہ کے بارگاہ سے ہوگا اس لیے میں جانتا ہوں کہ آپ قریب میں تشریف لاکر تلاوت قرآن پاک کر دیجیے گا۔“ یہ کوئی ایسا کام نہیں تھا جس کے لیے وہ خود چل کر مولوی کے پاس آتا لیکن مسجد کے مولوی کی گاؤں کے ماحول میں اہمیت کو مد نظر رکھتے ہوئے وہ اس سے تعلقات بہترین رکھنے کا خواہش مند تھا۔ دوسرے اسکول اور مدرسے کے درمیان پائی جانے والی کھینچا تانی کو بھی اس موقع پر ختم کرنا ضروری تھا اس لیے وہ خود سے چل کر یہاں آتا تھا۔

”آپ کہتے ہیں تو میں آ جاؤں گا، ویسے ذاتی طور پر میں اسکول کو پہنچ نہیں سکتا۔ نہ جانے کون ہیں یہ ماسٹر لوگ جو انگریزی تعلیم کے ذریعے گاؤں کے بڑے سارے لوگوں کو بگاڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ مولوی صاحب نے فوراً ہی اپنی ناپسندیدگی ظاہر کر دی۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے مولوی صاحب! اسکول میں ایسی کوئی تعلیم نہیں دی جاتی جس سے بچوں کے بگڑنے کا کوئی خطرہ ہو۔ آج کے دور میں بچوں کو دینی اور دنیاوی دونوں طرح کی تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے۔ بلکہ آج کے دور کی کیا بات ہے، سربراہ خان بھی لیڈر بننے اور بڑوں پہلے بھی اس بات پر زور دیتا تھا کہ مسلمانوں کو اگر ترقی کرنی ہے تو دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی فہم بھی حاصل کرنی ہوگی۔“ اس نے انہیں قائل کرنے کے لیے دیکل دی لیکن مولوی اتنی آسانی سے قائل ہوئے والا بندہ نہیں تھا، اس کی دیکل سن کر فوراً ہی بولا۔

”اس وقت کی بات چھوڑیں جناب، وہ وقت الگ تھا۔ تب ہم آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے لیکن اب تو ہمیں حق حاصل ہے کہ اپنے ملک میں اپنی مرضی کی تعلیم اپنے بچوں کو دیں۔“

”وقت ابھی بھی نہیں بدلا مولوی صاحب! ابھی ہماری آزادی مکمل نہیں ہوئی۔ ابھی ہمیں اپنے لوگوں کے ذہنوں کو آزاد کرانا ہے لیکن اس وقت آپ اس ساری بحث کو جانے دیجیے اور مجھ سے اتنا تعاون کیجیے کہ مدرسے کے اوقات کچھ اس طرح ملے کہ میں مدرسے اور اسکول کے اوقات کے درمیان تصادم نہ ہو اور بچے دونوں جگہ جا سکیں۔“ شہر یار نے بحث کے بجائے برسر مطلب آنا زیادہ مناسب سمجھا۔

”مدرسے کے اوقات بدلنا تو بہت مشکل ہے، آپ

اسکول کے اوقات میں ہی کچھ تبدیلی کر لیں۔“ مولوی کے جواب سے ظاہر ہو گیا کہ وہ جتنی فرمایا برداری اور تابع داری کا مظاہرہ کر رہا تھا درحقیقت اتنا تھا نہیں۔ یقیناً وہ ان لوگوں میں سے تھا جو پیٹ میں ڈاڑھی رکھتے ہیں۔

”اس معاملے کو بعد میں دیکھ لیا جائے گا۔ فی الحال ہم چلتے ہیں۔ ابھی چودھری افکار صاحب سے بھی ملاقات کر لی ہے۔“ مولوی کا انداز دیکھ کر اس نے مزید اسے منہ لگانا مناسب نہیں سمجھا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ عبدالمنان نے بھی اس کی پیروی کی۔

”ارے بھئی، ایسے کیسے جا سکتے ہیں آپ؟ کچھ چائیاں تو پیتے جائیں۔“ مولوی زیرک آدمی تھا۔ اس کے مزاج کی برائی کو بھانپ گیا اور اسے روکنے کی کوشش کرنے لگا۔ ”نہیں مولوی صاحب! اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ ویسے بھی ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“ وہ باوجود اصرار کے ایک منٹ بھی وہاں مزید ٹھہرنے پر راضی نہ ہوا۔

آپ نے تو بالائی بالا سارا پروگرام طے کر لیا۔ آخر میں اس علاقے کا نامکندہ ہوں۔ پھر آباد پوری ملکیت ہے۔ یہاں کچھ بھی کرنے سے پہلے آپ کو مجھے اطلاع تو دینی چاہیے تھی۔“ چودھری افکار کی حویلی پہنچنے کے بعد اس نے اسے تقریب کے حوالے سے دعوت دی تو اس کا منہ بند ہو گیا اور وہ ٹھکڑے لگے۔

”ہم آپ کو اطلاع دینے ہی تو آئے ہیں چودھری صاحب! اصل میں سارا پروگرام بڑی جگت میں طے پایا اس لیے پہلے سے آپ سے باقاعدہ کوئی میٹنگ کرنے کی مہلت نہیں مل سکی۔ بہر حال، ہمیں آپ کی اس علاقے میں اہمیت کا احساس ہے اس لیے تو میں خود آپ کو دعوت دینے کے لیے آیا ہوں۔ بے شک اسکول اور مرکز صحت کی تعمیر سرکاری زمین پر ہو رہی ہے اور فنڈ ز بھی ہمیں ملیں اور سے ملے ہیں لیکن آپ کی اہمیت سے انکار ٹھوڑی کیا جا سکتا ہے۔ آپ تحریف لائیں گے تو تقریب میں چار چاند لگ جائیں گے۔ آپ کی حیثیت تقریب میں مہمان کے بجائے میزبان کی ہوگی۔ آخر آپ پیر آباد کے چودھری ہیں۔“

اس نے بہت نرم لہجے میں چودھری کی بات کا جواب دیا۔ اس کی اہمیت بھی تسلیم کی لیکن یہ جتنا نہیں بھولا کہ بے شک پیر آباد کی بیشتر زمین اس کی ملکیت ہے لیکن جن مقامات پر وہ اپنے منصوبوں پر کام کر رہا ہے، وہ زمین سرکاری ملکیت ہے اور اسے اس سلسلے میں چودھری کی اجازت لینے کی کوئی

ضرورت نہیں۔ چودھری ماضی میں بد عنوان افسروں کی مدد سے اسکول والی زمین پر اپنی ملکیت جتا کر بہت عرصے تک اسکول کی توسیع کا کام روک رہا تھا لیکن وہ ابھی طرح واقف تھا کہ حقیقت میں زمین سرکاری ہی ہے اور شہر یار یہ بات ثابت کر سکتا ہے اس لیے اس زمین پر سے اپنی ملکیت کے دعوے سے چپ چاپ دست بردار ہو گیا تھا۔ اگر اسے ماضی میں اس بات کا خیال آ جاتا کہ آنے والے وقت میں کوئی آفیسر اس کے خلاف بھی چل سکتا ہے تو وہ کسی طرح اس بات کا بندوبست کر لیتا کہ زمین اس کے نام منتقل ہو جائے مگر اب تو وہ صرف اندر ہی اندر تھما کر رہ گیا تھا۔

”اپنی جلد بازی کی عادت پر قابو پانے کی کوشش کیجیے۔ جوانی کے زور میں آپ ذرا ضرورت سے زیادہ ہی جوش سے کام لیتے ہیں لیکن جوش میں بھی کبھی آدمی کو نقصان بھی پہنچ جاتا ہے۔“ انجمنی چھپکے دنوں ہی آپ اچھے خاصے ڈنگی ہوئے ہیں۔ خدا نا خواستہ اس واقعے میں آپ کو کوئی بڑا نقصان بھی پہنچ سکتا تھا۔ چلیں خیر، آپ کی تو بہت ہو گئی لیکن بے چارے غریب پولیس والے مارے گئے۔ مجھے تو بڑا افسوس ہوا ان بے چاروں کی موت کا سن کر۔“ تھما بہت کو چھپا کر پھر سے پھر پھانٹا مسکراہٹ سجاتے ہوئے اس نے شہر یار کو پتہ لگانے کی کوشش کی۔ اس کی آنکھوں کی مسکراہٹ بڑی مٹی خیر صی جیسے وہ شہر یار کو بتا رہا ہو کہ دیکھا پتہ بڑے طرہ خان بنتے تھے۔ کیسا بے وقوف بنایا میں نے تمہیں۔

”پولیس والوں کے مارے جانے کا مجھے بھی افسوس ہے لیکن میرے نزدیک وہ لوگ قابلِ فخر ہیں کہ کسی دوسرے کو نقصان پہنچانے کے بجائے اپنے فرض کی ادائیگی کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ ان کی اس قربانی کو بھلا یا نہیں جائے گا اور قاتلوں کو ایک دن عبرت ناک انجام سے دوچار ہونا پڑے گا۔“ وہ خود پر بڑا جبر کر کے وہاں آیا تھا اور ایسی کوئی بات چھیڑنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا جس سے اس کی فکری کیفیت کا اظہار ہو لیکن چودھری خود ہی بات کو اس رخ پر لے گیا تھا کہ گفتگو میں کمی کا عنصر در آیا تھا۔

”میرے خیال میں ہمیں کسی تکلیف دہ موضوع پر بات کرنے کے بجائے فی الحال تقریب کے حوالے سے بات کرنی چاہیے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ پیر آباد میں ایسی کوئی تقریب ہو رہی ہے۔ اس سے پہلے اعلیٰ افسران عرس میں شرکت کی غرض سے یہاں آتے رہے ہیں لیکن ان کی وہ آمد ذاتی نوعیت کی ہوتی تھی۔ اس بار ایک سرکاری مقصد سامنے ہے۔ جبرل کو حید کو بطور مہمان خصوصی مدعو کیا گیا ہے۔ بے

ٹک موجودہ حکومت میں ان کے پاس کوئی بڑا عہدہ نہیں ہے لیکن ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ چھٹی حکومت میں وہ صوبائی وزیر اطلاعات و نشریات تھے۔ اب بھی ان کے حکومتی عہدوں میں گہرے تعلقات و روابط ہیں۔ میڈیا والے بھی ہر اہم موقع پر ان کی رائے لینا ضروری سمجھتے ہیں۔ موجودہ وزیر خزانہ سے ان کی قریبی رشتہ داری ہے۔ اگر وہ یہاں سے خوش ہو کر گئے تو ہم کم از کم پھر آبادی کے لیے تو کافی مراعات حاصل کر سکتے ہیں۔" معاملات کو کئی کی طرف جاتا دیکھ کر عبداللہ نے گفتگو میں مداخلت کی اور جلدی جلدی بولتے ہوئے ان دونوں کو موقع کی نزاکت کا احساس دلانے لگا۔

"ہم تو پہلے بھی کسی کی مہمان نوازی میں کوئی کمی نہیں کرتے۔ جنرل صاحب بے شک سرکاری دعوت پر آئیں گے لیکن پیر آباد آنے کے بعد ان کی حیثیت سرکاری مہمان کے بجائے ہمارے ذاتی مہمان کی ہوگی۔ تقریب کا آپ لوگ جیسے چاہے انتظام کریں لیکن مہمانوں کا کھانا حویلی میں ہی ہوگا۔ آپ بس مجھے مہمانوں کی تعداد بتا دیں، باقی انتظامات ہو جائیں گے۔" شہر یار کا اندازہ سو فیصد درست ثابت ہوا تھا۔ اپنی اہمیت جتانے اور اعلیٰ عہدے داروں سے تعلقات بڑھانے کا یہ موقع چودھری کسی طرح ضائع نہیں کر سکتا تھا اس لیے فوراً دعوت کی ذمہ داری خود قبول کر لی۔

"ہمیری پیش کش قبول کرنے کا شکریہ اے سی صاحب! اگر آپ انکار کر دیتے تو مجھے بڑا افسوس ہوتا۔ اصل میں مہمان نوازی ہماری روایت ہے اور چاہے کوئی دشمن بھی چل کر ہمارے پاس آئے تو ہم اس کی خاطر ضرور کرتے ہیں۔" چودھری جس وقت یہ بتلے کہ رہا تھا، مین اسی وقت ایک ملازم کو اذونات سے بھری لڑائی دھلتا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ اس ملازم کو نظر انداز کرتا ہوا شہر یار ایک دم سے اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

"اچھا چودھری صاحب! اب اجازت دیجیے۔" شہر یار نے چودھری کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ عبداللہ نے بھی اس کی پیروی میں اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا۔

"اس طرح اچانک کہاں چل دیے اے سی صاحب!

کچھ چائنی تو پیتے جائیے۔"

"بہت شکریہ چودھری صاحب! آج بالکل فرصت نہیں آپ کی مہمان نوازی سے فیض یاب ہونے کی۔ اس لیے پلیز ہمیں اجازت دیجیے۔" چودھری کے روکنے کے باوجود وہ مزید وہاں بیٹھے پر راضی نہیں ہوا۔ یہ تو معلومت پسندی تھی جو اسے یہاں تک لے آئی تھی ورنہ دل غلطی راضی نہ ہوتا تھا اس شخص سے بات کرنے پر۔ مجبوری کے باعث وہ یہاں آ گیا تھا لیکن کچھ کھانے پینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اس لیے چودھری کے روکنے روکنے بھی باہر نکل گیا۔ باہر مشاہیرم خان گاڑی لے کر اس کا منتظر تھا۔ ان لوگوں کے بیٹھنے ہی اس نے گاڑی اشارت کر دی۔ حویلی سے نکل کر وہ لوگ گاؤں سے باہر جانے والے راستے کی طرف گھڑن ہو گئے۔

"مشاہیرم خان! ذرا گاڑی قبرستان کی طرف لے لو۔" اس نے اچانک ہی یہ حکم دیا جس کی عمل کی گئی۔ قبرستان پہنچنے کے بعد وہ گاڑی سے اتر کر قبرستان میں داخل ہوا تو عبداللہ اور مشاہیرم خان بھی چپ چاپ اس کے ساتھ ہو لیے۔ قبرستان بڑا بڑا تھا۔ چند بچی قبروں کے سوا وہاں زیادہ تر قبریں ہی تھیں۔ ان قبروں کے درمیان ان لوگوں کو فوراً ہی قریب قریب بنی دوٹی قبریں نظر آئیں۔ قبروں پر کتنے سو جو دھن تھے لیکن وہ لوگ اندازہ کر سکتے تھے کہ یہ قبریں ٹھوڑے دنوں کے وقفے سے مرنے والی ان دو سنگی بنیوں کی ہیں جو عمر کی سونے سے کسی خوشیاں وصول کے بغیر ہی دنیا سے چلی گئی تھیں۔ دونوں میں سے ایک قبر کی مٹی زیادہ تازہ تھی جس سے پتا چل رہا تھا کہ یہ ماہانہ کی قبر ہو گی۔ شہر یار نے اس قبر کے سر ہانے کھڑے ہو کر دعائے مغفرت کے لیے ہاتھ بلند کر دیے۔ عبداللہ اور مشاہیرم خان نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ تقریباً پانچ منٹ تک وہ اسی طرح ہاتھ بلند کر کے بند آکھوں کے ساتھ دعا مانگتا رہا۔ دعا کے اختتام پر اس نے منہ پر ہاتھ پھیر کر آنکھیں کھولیں تو چپکے کپڑوں میں ملبوس دلا پٹلا اور سانولی رنگت والا ایک شخص دوسری قبر کے پاس کھڑا اپنی طرف دیکھتا نظر آیا۔ اس شخص کے چہرے پر گہرے رنج اور دکھ کے تاثرات تھے۔ اسے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر وہ گھٹس جھکتا ہوا اس کے قریب آ گیا۔

"آپ اس ضلع کے اے سی صاحب ہوں؟" اس کے چہرے کو غور دیکھتے ہوئے اس نے استفسار کیا جس کا جواب اس نے غصے سر ہلا کر دیا۔ اس وقت وہ خود گہرے دکھ کی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے مدد کی درخواست لے کر اپنے پاس آنے والی نو عمر لڑکی کی قبر کے پاس کھڑے ہو کر

اس کے لیے دعائے مغفرت کرنے کا تجربہ بہت تکلیف دہ تھا۔ ابھی تو وہ اس لڑکی کے لیے اپنے دل میں پیہا ہونے والی بے نام کی کشش کا تجربہ بھی نہیں کر پایا تھا کہ وہ اس دنیا کو چھوڑ گئی تھی۔ وہ ایک دم ہی بہت سڑکرم ہو کر اس دکھ کے ازالے کی کوشش میں لگ گیا تھا اور سب سے پہلے پیر آدمی اسے منصوبوں پر کام کا آغاز کر دیا تھا۔

"سنا ہے کہ آپ ہمارے پنڈ میں اسپتال بنوا رہے ہیں۔ یہ آپ کا ہم لوگوں پر بڑا احسان ہوگا۔" اس کی طرف سے تصدیق ہو جانے پر وہ شخص اس کا ہاتھ تھام کر بڑی عاجزی سے بولا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ شہر یار کے اشارے پر مشاہیرم خان نے بڑھ کر اسے سنبھالا۔

"تم کون ہو؟ کیا نام ہے تمہارا؟" وہ شخص سنبھلا تو اس نے اس سے پوچھا۔

"میں انور ہوں جی امیر میری گھر والی کی قبر ہے۔ وہاں کے دو برس بعد ہمیں خوشی کی خبر ملی تھی، پر جانے پھر اچانک کیا ہوا کہ اس و جاری کی طبیعت گجری۔ ادھر پنڈ میں کوئی ڈاکٹر تو ہے نہیں۔ دوائی ہی نوٹے نوٹے آجاتی رہی، پر جب کوئی فیدہ (فائدہ) نہیں ہوا تو اس نے کہہ دیا کہ اپنی گھر والی کو شہر کے اسپتال لے جاؤ۔ اسپتال لے جانے کے لیے میرے پاس کوئی انتظام نہیں تھا۔ میں نے فوجی جی کی بہت خوشامد کی کہ حویلی کی کسی گدی میں میری گھر والی کو اسپتال پہنچا دیں، پر غریبوں کی کون سنتا ہے جی۔ میں نے بھاگ دوڑ کر کے بڑی مشکل سے جب تک سواری کا بندوبست کیا، جب تک دیر ہو چکی تھی۔ و جاری میری گھر والی رستے میں ہی تو پڑ کر مر گئی۔" اس کی آنکھوں سے ایک بار پھر آنسو جاری ہو گئے۔

"مجھے ان حالات کے بارے میں معلوم ہے انور! مجھے معلوم ہے کہ علاج کی سہولت نہ ہونے کی وجہ سے اکثر اس قسم کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، اسی لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ پیر آباد سمیت دوسرے دیہاتوں میں بھی جلداز جلد ایسے اسپتال بنائے جائیں جہاں لوگوں کا بروقت علاج ہو سکے۔ تمہاری بیوی کی موت کا سن کر مجھے بہت افسوس ہوا ہے۔ بس اب تم دعا کر دو کہ جلد یہاں اسپتال بن جائے تاکہ تمہاری جیسی تکلیف کسی دوسرے کو نہ اٹھانی پڑے۔" شہر یار نے اس کا شانہ بچھتے ہوئے کہا تو اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے غصے کی پشت سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور ذرا جوش سے بولا۔

"اگر میرے اہل کوئی خدمت ہو تو بتائیں صاحب!"

"ابھی تو ایسی کوئی ضرورت نہیں۔ ویسے تم یہ بتاؤ کہ

کام کیا کرتے ہو؟" اس نے پوچھی پوچھ لیا۔

"کام مجھے سارے آتے ہیں۔ بڑا دم ہے میرے بازوؤں میں۔ شئی مجھے جس کام پر چاہی لگا دوں، میں آرام سے کر لیتا ہوں۔ آپ کو کبھی ضرورت ہو تو آکر مدد کر لیتا۔" وہ سینہ تان کر کھڑے ہوا تو شہر یار نے پُر خیال نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ یہ دھکی آئی جو چودھری کے شئی کے خلاف دل میں شکوہ بھی رکھتا تھا، اس کے لیے کارآمد بھی ثابت ہو سکتا تھا۔

"ٹھیک ہے انور! ابھی تو نہیں لیکن ضرورت پڑنے پر میں تمہیں ضرور آوازوں گا۔" وہ فوجی طور پر تیار رہا۔ "وہ انوکھا شانہ سمجھتا ہے ہوئے قبرستان سے نکلنے والے راستے کی طرف چل پڑا۔ بہت سے کاموں کا بوجھ سر پہونے کے باوجود اس کا ذہن انور کے بارے میں بھی سوچا رہا تھا۔ اگر اپنے دعوے کے مطابق واقعی وہ بہت کارآمد آدمی تھا تو اس سے کی اہم کام لیے جاسکتے تھے۔

☆☆☆

آخری جلد تحریر کرنے کے بعد اس نے قلم بند کے قلم دان میں رکھا تو بے حد مطمئن اور خوش تھا۔ آج کی تقریب بہت شان دار رہی تھی۔ مرکز صحت کا سنگ بنیاد رکھنے کے بعد جنرل تو حید اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسکول آئے تھے۔ انہوں نے اسکول کی چھوٹی سی عمارت کو دیکھ کر بہت خوشی کا اظہار کیا تھا اور یقین دہانی کروائی تھی کہ مستقبل میں اس اسکول کی عمارت میں تو سنیع کے سلسلے میں وہ بھرپور کردار ادا کریں گے اور ایک دن یہ چھوٹا سا اسکول ہانگی اسکول اور کالج کے درجے تک پہنچ جائے گا۔ انہوں نے بہت مؤثر الفاظ میں گاؤں کے لوگوں کو تعلیم کی طرف راغب کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔ تقریب میں شریک گاؤں والوں کے بڑے بڑے آدمی نے ظاہر کیا تھا کہ وہ ان کی باتوں سے متاثر ہوئے ہیں۔ تقریب میں چودھری افتخار کے علاوہ ارد گرد کے دیگر سے زمینداروں نے بھی شرکت کی تھی اور ناچار ہی اس کی اعلیٰ پروگرام کو سراہا تھا۔ موبائل مٹی والے بھی اس تقریب میں بڑے سرگرم رہے تھے۔ میڈیا کو بیچ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے اپنی جگہ کی ہر ہر طرف پر مٹی سے پانی پھیلا دیا۔ لوگوں کو موبائل کے استعمال کی طرف راغب کرنے کے لیے انہوں نے اپنی موبائل کچھنی کی کم کے ساتھ چند موبائل سیٹ مفت تقسیم کیے تھے۔ آفتاب اور فیب کو بھی ایک ایک سیٹ دیا گیا تھا۔ مجموعی طور پر تقریب بہت کامیاب رہی کی اور اس وقت آفتاب نے اس تقریب سے متعلق رپورٹ مٹی لکھ کر

مکمل کی تھی۔ اس رپورٹ کو اقوام کی اشاعت میں شامل ہونا تھا۔ یہ رپورٹ اس نے ایک لمبی شکل میں لکھی تھی جس میں پیر آپاد کے ساتھ ساتھ ارد گرد کے دیگر دیوتاؤں کے مسائل کا احاطہ کرتے ہوئے ان علاقوں میں فروغ تعلیم کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے غیر متعارف کواں کا ذخیرہ میں شامل ہونے کی دعوت دی گئی تھی۔ اخبار بین طبقے میں اسے اے نفا کا نام معتبر تھا اور وہ اسے ایک حق پرست فلم کار کی حیثیت سے پسند کرتے تھے اس لیے اس بات کا اچھا خاصا امکان تھا کہ وہ اس کی اپیل پر ضرور متوجہ ہوتے۔ وہ اس معاملے میں اتنا پرجوش تھا کہ پچھلے دو دنوں کی مسلسل بحث اور آج کی تقریب کی مصروفیت کی وجہ سے ہونے والی ممکن قطعی نظر انداز کر کے قلم تمام کر بیٹھ گیا تھا۔ غیب کی نیند خراب نہ ہو، اس خیال سے اس نے کمرے کی ٹیبل لائٹ بند کر کے ٹیبل لیپ کی روشنی میں اپنا کام مکمل کیا تھا۔ مسلسل جھگڑے جھگڑے رہنے کی وجہ سے اکر جانے والی گردن کا تناؤ ڈراما ہوا تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کھڑکی تک گیا جو باہر کی طرف کھلی تھی۔ کھڑکی کھول کر اس نے باہر جھانکا۔ باہر رات کا قصصہ اوجھڑا اور سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ بس صرف چاند کی روشنی تھی جس میں وہ اسکول کا پہلا اور ارد گرد کا دھندلا سا منظر دیکھ سکتا تھا۔ ارد گرد کے منظر سے تو اسے اتنی دلچسپی نہیں تھی لیکن اسکول اس کے خوابوں کی شاہراہ تعمیر پر آنے والا پہلا سنگ میل تھا اس لیے وہ اسے بہت محبت پاش نظروں سے دیکھنے میں مشغول تھا۔ مشکل سے دو منٹ ہی گزرے تھے کہ منظر میں پیش آنے والی ایک متحرک تبدیلی نے اسے چونکا دیا۔ وہ دو آدمی تھے جو اس پاس محتاط نظروں سے دیکھتے ہوئے اسکول کی طرف بڑھ رہے تھے۔ آفتاب نے کھڑکی تک آنے سے ٹل ٹیبل لیپ بچانہ دیا ہوتا تو وہ کھلی کھڑکی سے آنے والی روشنی کی وجہ سے اس کی طرف متوجہ ہو سکتے تھے لیکن اس وقت وہ اسے نہیں دیکھ سکے تھے۔ رات کے اس پہر مشکوک انداز میں اسکول کی طرف بڑھنے والے ان دو افراد کو دیکھ کر اس کا ہاتھ ٹھکا لیکن وہ اندازہ نہیں کر سکا کہ وہ لوگ کون ہیں اور کیوں اس طرف آئے ہیں۔ ان دونوں افراد میں سے ایک نے اپنے ہاتھ میں کچھ تھاما ہوا تھا۔ اندھیرے میں ابھرنے والے اس شے کے خاکے سے وہ بھی اندازہ لگا سکا کہ وہ کوئی کین نما شے ہے۔ وہ دونوں افراد ساتھ ساتھ چلتے ہوئے نے تعمیر شدہ اسکول کے کمروں میں سے ایک کے دروازے پر رکے۔ دروازے کے قریب پہنچ کر ہاتھ میں کین تھاما ہوا شخص زمین پر بیٹھ گیا جبکہ دوسرا کھڑا رہا۔ کھڑے ہونے والے شخص کی

پوزیشن ایسی تھی کہ زمین پر بیٹھنے والا شخص آفتاب کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ نہیں دیکھ سکا کہ اس شخص نے کمرے کے دروازے کے قریب بیٹھ کر کیا کارروائی کی ہے۔ انہوں نے جو کچھ بھی کیا تھا، وہ بس لوگوں کا کھیل تھا۔ اس کے بعد وہ دونوں دوسرے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ اب آفتاب کے لیے اپنی جگہ کھڑے رہنا ممکن نہیں تھا۔ وہ دونوں جو بھی تھے اور جس انداز میں بھی کارروائی کر رہے تھے لیکن یہ بات کچھ میں آ رہی تھی کہ ان کا مقصد ٹیک نہیں ہے۔ وہ اندھیرے میں ہی تیزی سے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلا اور ان دونوں کو لٹکا رہا۔ "کون ہو تم لوگ اور کیا کر رہے ہو؟" اس کی لٹاکار پر وہ دونوں تیزی سے چلے۔ اسی وقت اس نے فضا میں جھپکی پٹیرول کی بوتلوں کی۔ کچھ لمحوں میں ہی اس پر ظاہر ہو گیا کہ وہ لوگ کیا کرنے جا رہے ہیں۔ "رک جاؤ۔" چپچپے کے انداز میں بولتا ہوا آفتاب تیزی سے ان کی طرف لپکا لیکن اس سے تھوڑی سی تاخیر ہو گئی تھی۔ اس کے ان لوگوں تک پہنچنے سے قبل ہی فضا میں ایک شعلہ سا ابھرا۔ یہ تھا شعلہ ماچس کی جلتی ہوئی تیلی کا تھا جس نے تیلی جلائے والے کے ہاتھ سے تیزی سے نیچے کا سفر طے کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں خوفناک شعلہ بھڑکنے لگا۔ ان شعلوں کو بھڑکانے کے ذمے داروں نے وہاں رک کر آفتاب کا مقابلہ کرنے کے بجائے پھرتی سے راؤ فرار اختیار کر لی لیکن وہ اس سارے منظر کو دیکھ کر خود اس بری طرح بھڑک اٹھا تھا کہ انہیں بھاگنے کا موقع دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ پوری قوت سے دوڑتا ہوا وہ ان لوگوں کی طرف لپکا اور بھاگنے والوں میں سے ایک کی گردن پیچھے سے دو بوجلی۔ اپنے ساتھی کو پکڑا جاتا دیکھ کر دوسرا شخص جو ذرا آگے نکل گیا تھا، واپس پلٹا اور آفتاب کے پہلو میں لات رسید کرتے ہوئے اپنے ساتھی کو پھنسا دیا کہ ان کی کوشش کی لیکن اس وقت اس پر جون سوار تھا اور وہ ایک لات سے ہرگز بھی قابو میں نہیں آ سکتا تھا۔ پہلے شخص کی گردن بائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے اس نے خود پر حملہ کرنے والے دوسرے شخص کی ناک پر دائیں ہاتھ سے ایک زوردار مارا اور پھر اسے پیچھے کا موع دے بغیر اس پر اس کے ساتھی کو اس انداز میں دھکیلا کہ دونوں کے سر ایک دوسرے سے بری طرح ٹکرائے اور ان کے حلق سے زوردار جھپٹیں نکلیں مگر پھر وہ دونوں سنبھل گئے اور خوں خوار انداز میں اس کی طرف لپکے۔ انہوں نے دونوں پہلوؤں سے اس پر حملہ آور ہوتے ہوئے اس کے چہرے کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ یہ ایک وقت ان دونوں کے لئے

اپنے چہرے کی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ ایک دم نیچے بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں کی کینوں کا استعمال کرتے ہوئے ان کے جسم کے نیچے سے ہر نازک مقامات پر ضرب لگائی۔ اس کے ایک دم نیچے بیٹھ جانے کی وجہ سے وہ دونوں ایک دوسرے کے گھونٹوں کی زد پر آ گئے تھے۔ اس پر سے یہ ضرب لگتی تو بالکل اچھے اور نیچے بیٹھے ہوئے آفتاب کو اٹھنے کا موقع دے بغیر اس پر ہلکا پڑے۔ "کون ہے؟ کیا ہو رہا ہے یہاں؟ آفتاب! کیا یہ تم ہو؟" اسی وقت فضا میں غیب کی گھبراہٹ ہوئی آواز ابھری۔ بہت گہری نیند میں ہونے کے باعث اس کی آنکھ ذرا مشکل سے کھلی تھی اور ارد گرد کی صورت حال دیکھ کر وہ گھبرا گیا تھا۔ آگ کے بھڑکتے شعلوں نے ساری فضا پریمیت سی طاری کر دی تھی اور ان شعلوں کی روشنی میں تین افراد ایک دوسرے سے سرسری نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے دو کے چہروں پر سیاہ نقاب تھے اور انہوں نے جس تیسرے فرد کو اپنی زد پر لیا ہوا تھا، وہ ان کے درمیان کھڑا ہونے کی وجہ سے واضح طور پر نظر نہیں آ رہا تھا لیکن پٹیرول کی وجہ سے غیب نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ آفتاب ہے۔ "خبردار! قریب مت آنا ورنہ گولی مار دوں گا۔" لانے والوں میں سے ایک نے اپنا ہاتھ روک کر اپنے کرتے کی جیب میں سے ریوالت نکالا اور اسے غیب کی طرف لہراتے ہوئے دھکیل دی۔ وہ جہاں تھا، وہیں رک گیا۔ "بس، اب تم بھی سیدھے ہو جاؤ۔ ہمیں خون خرابے کا حکم نہیں اس لیے اب تک تمہیں بخشا ہوا ہے لیکن اب ہمارا راستہ روکنے کی کوشش کی تو اچھا نہیں ہوگا۔" غیب کو آسانی سے پسپا ہوتا دیکھ کر اس نے اپنے ریوالت کا رخ آفتاب کی طرف کیا۔ وہ اب بھی ہاتھ پیر چلاتا ہوا اپنے مقابل کو زک پہنچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ریوالت بردار کی دھکیل کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوا اور اس کی طرف توجہ دے بغیر اس نے ایک زوردار رخ اپنے حریف کی آنکھوں کے نیچے سے مارا۔ اس کی اس حرکت پر ریوالت بردار شخص بری طرح ٹھٹھا یا اور لات گھما کر زور سے اس کی پیٹنی پر ماری۔ یہ ضرب خاصی شدید تھی۔ آفتاب الٹ کر پیچھے جا کر۔ "چل یار! اٹھ بھاگیں۔ گتا ہے گاؤں والے جاگ گئے ہیں اور اسی طرف آ رہے ہیں۔" فضا میں ابھرتے لپکے ہوئے شوق کی آواز سن کر ریوالت بردار نے اپنے ساتھی سے کہا اور اس کا ہاتھ تمام کرا سے کھڑا کرتے ہوئے ایک سمت دوڑ گئے کی کوشش کی۔ فضا میں ابھرتے شوق کی جھینسا ہٹ

آفتاب نے بھی سن لی تھی۔ اسے امید تھی کہ اگر وہ بگڑا اور ان دونوں کو روکنے میں کامیاب ہو گیا تو گاؤں والے، ہاں پہنچ جائیں گے۔ وہ لوگ پہنچ جاتے تو نگران دونوں کا ہاں سے نکلنا مشکل ہو جاتا۔ وقت کی پہچانی ہی سہیت حاصل کرنے کے لیے اس نے اپنی تمام تر باتیں جمع کیس اور اٹل کر کرنے کے بعد کسی کیلے پھری کر زمین آ کر چھت جانے والے اپنے سر کی تکلیف پر قابو پا تا ہوا ان دونوں کے پیچھے لپکا۔ آوازیں اب بہت قریب آ چکی تھیں، چنانچہ اس بار ریوالت بردار نے اپنے لیے کوئی خطرہ مول لینا مناسب نہیں سمجھا اور ریوالت کا رخ اس کی طرف کرتے ہوئے گولی چلا دی۔ جوش میں آگے بڑھتے ہوئے آفتاب کو ایک جھٹکا اور اپنی دائیں ٹانگہ کی دان میں دھکے ہوئے لٹا کرے کی اذیت محسوس کرتا ہوا وہ نیچے گر گیا۔ حملہ آور اس کی طرف سے مطمئن ہو کر فاصلے پر بندھے گھوڑوں تک پہنچے اور لپک کر ان پر سوار ہوتے ہوئے بڑی کی طرح نکل پڑے۔ ان کے یہ گھوڑے پہلے اس کی نظر میں نہیں آئے تھے۔ ابھی جاتے تو وہ کیا کر لیتا؟ جتنی کوشش وہ کر سکتا تھا اپنی جان کی بانی لگا کے کر چکا تھا اور اب یہ کسی سے زمین پر گرنا پابند نہ ہوتا۔ ہوتے آگ کے شعلوں کی رقص کرنی روشنی میں ان کو بھڑکانے والوں کو فرار ہوتا دیکھ رہا تھا۔ ان شعلوں میں کیا کچھ جلا تھا، یہ حساب تو بعد میں ہی ہوتا لیکن اپنے غریبوں کو یوں جتا دیکھنا بہت تکلیف دہ تھا۔ اس آگ کی جھلن اپنے روم روم میں محسوس کرتا وہ دب ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا، خود اسے بھی علم نہیں ہو سکا۔ ☆☆☆

کل تک جو عمارتوں سے حزن تھی، آج ایک سیاہ ڈھانچے کی صورت میں کھڑی تھی۔ آگ نے اس کی ساری خوب صورتی کو چاٹ لیا تھا۔ کمروں میں ڈالا حلیا یا فرنیچر، دیواروں پر لگے سافٹ پورٹریز، چاروں طرف وہ آرائشی جھنڈیاں جو کل کی تقریب کے اہتمام کے لیے بطور خاص لگائی گئی تھیں، سب جل کر خاک ہو گئی تھیں۔ وہ کچھ تعمیر ناوشی کے ساتھ ہونٹ بیٹھنے والی تاجی کا بازو دے رہا تھا اس جاتی کے چپے کس کا ہاتھ ہے، اس معاملے میں اسے کوئی شک نہیں تھا۔ پیر آباد کے اس اسکول کی ترقی سے سب سے زیادہ تکلیف ایک ہی شخص کو می اور وہ شخص جو دھری افرو تھا۔ اپنی منافقت خلعت سے ام لیتے ہوئے اس نے ہاتھ پر لگی ڈالے بغیر کل کی تقریب میں شرکت کی تھی، اسکول کی توسیع پر خوشی کا اظہار بھی کیا اور آنے والے معزز مہمانوں کی

ضیافت کا بحر پر انتظام بھی کیا لیکن موقع ملنے ہی پہلی فرصت میں اپنی چال چل کیا تھا۔ آگ اُتی خونخاک بھی کر اس نے نئے تعمیر شدہ کمروں کے ساتھ ساتھ پرانے کمروں کو بھی نقصان پہنچایا تھا۔ پیڑوں کی آگ دہکے ہوئے ہی خطرناک ہوئی ہے۔ مزید یہ کہ اس جگہ تک کوئی ہنگامہ اُٹھانے کا سامان نہیں تھا۔ ایندھن تو گاؤں والوں نے ہی ہالوں وغیرہ سے پانی ڈال کر آگ بجھانے کی کوشش کی لیکن اس کوشش سے آگ اور بھی بھڑک اُٹھی۔ ان حالات میں بس ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ ضیافت کے اپنے سوا مالوں نے ہنگامی امداد کے لیے کال کر دی۔ چودھری کی بدولت قائم ہونے والے موبائل کمپنی کے میٹ ورک نے اس بُرے وقت میں بڑا ساتھ دیا۔ فون کال پر آگ بجھانے والی گاڑیاں اور ایسی بیسیں فوری طور پر پیر آباد روانہ کر دی گئیں۔ ایسی بیسیں پہنچنے تک دُعا آفتاب کو گاؤں کے لوگوں نے اپنے طور پر اُبتدائی طبعی امداد دے دی تھی لیکن سر پر کھٹنے والی چوٹ اور ران پر گولی کے باعث آنے والا زخم بھلک تھا۔ ان زخموں سے اس کا کافی خون بہہ گیا تھا۔ شہر یا کوئٹہ سے قتل ہی اس حادثے کی خبر ہو گئی تھی لیکن فوری طور پر پیر آباد آنے کے بجائے اس نے نورکوٹ کے اس پھوٹے سے اسپتال جانا زیادہ مناسب سمجھا تھا جہاں آفتاب کو لے جایا گیا تھا۔ اس اسپتال میں طبی سہولیات بہت کم تھیں۔ وہاں ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر سے جو کچھ بن پڑا تھا، وہ اس نے اپنے طور پر کر دیا تھا اور پھر اس کے حکم پر آفتاب کو فوری طور پر لاہور کے لیے روانہ کر دیا گیا تھا۔ آفتاب کی زندگی اس کے لیے بہت قیمتی تھی اس لیے اسے بچانے کے لیے وہ اپنے تمام تر اختیارات کو بروئے کار لے آیا تھا۔ نورکوٹ سے ایسی بیسیں کی روانگی کے ساتھ ہی ایک ایسی بیسیں لاہور سے بھی روانہ ہوئی تھی۔ اس ایسی بیسیں میں جدید سہولیات کے ساتھ ایک ڈاکٹر اور مکمل نرس بھی موجود تھا۔ یہ انتظام اس لیے تھا کہ یہاں سے جانے اور لاہور سے آنے والی ایسی بیسیں جس مقام پر بھی آپس میں ملیں، آفتاب کو لاہور والی ایسی بیسیں میں منتقل کر کے راستے میں ہی بہتر طبی امداد کی فراہمی شروع کر دی جائے۔ اس کی یہ حکمت عملی بہت کامیاب رہی تھی اور صبح یہاں کے لیے روانہ ہونے سے قبل اسے اطلاع ملی تھی کہ آفتاب کی جان اب خطرے سے باہر ہے۔

”آگ نے اتنی فیصد عمارت کو نقصان پہنچایا ہے۔ دوبارہ سے اس عمارت کو مرمت کرنے اور قابل استعمال بنانے میں کافی وقت لگے گا۔ تحقیقاتی ٹیم کی رپورٹ کے

مطابق آگ پیڑوں کو ڈال کر لگی تھی۔ آگ کس نے اور کیوں لگائی، اس سلسلے میں ابھی حقائق سامنے نہیں آ سکے ہیں۔ وقوعہ کے ایک گواہ ماسٹر ضیافت سے ہمیں جو معلومات حاصل ہوئی ہیں، اس کے مطابق رات کے آخری پیر اس کی آنکھ جھج و غریب شور کی آوازوں سے کھلی تھی۔ کمرے کی کھڑکی اور دروازہ کھلا ہوا تھا اور ماسٹر آفتاب کمرے میں موجود نہیں تھا۔ ضیافت نے باہر آ کر دیکھا تو اسے ماسٹر آفتاب دوہتا پوٹوں سے لڑتا ہوا نظر آیا۔ اس نے اس لڑائی میں دخل دینا چاہا تو حملہ آوروں میں سے ایک نے روبرو دکھا کر اسے دور رہنے پر مجبور کر دیا۔ ماسٹر آفتاب کو بھی اس نے گولی مارنے کی دھمکی دی تھی لیکن وہ جوش میں اس دھمکی کو خاطر میں نہیں لایا اور حملہ آوروں کے فرار کی راہ میں مزاحم ہونے کی کوشش کی۔ پیش میں آ کر دھمکی دینے والے نے اس پر گولی چلا دی۔ لڑائی کے دوران وہ پہلے ہی اچھا خاصا زخمی ہو چکا تھا، گولی کھٹنے کے بعد بالکل ہی حواس کھو بیٹھا۔ حملہ آوار اسے گولی مارنے کے بعد اپنے کھوڑوں پر بیٹھ کر فرار ہو گئے تھے۔ کھوئی کے ذریعے کھوڑوں کے سموں کا کھوج لگانے کی کوشش بھی بے کار تھی۔ ان لوگوں نے فرار کے لیے ایسا راستہ اختیار کیا کہ کھوج مل ہی نہیں سکا۔ اب ہمارے پاس واحد آپشن یہی ہے کہ ماسٹر آفتاب پوٹوں میں آنے کے بعد کوئی ایسی بات بتا دے جس سے حملہ آوروں کے بارے میں کوئی کیوں نہ سکے۔ اس نے حملہ آوروں سے براہ راست مقابلہ کیا تھا، اس مقابلے کے دوران ہو سکتا ہے اس نے ان لوگوں کو شناخت کر لیا ہو۔ ان لوگوں سے اس کی کوئی ذاتی دشمنی بھی ہو سکتی ہے۔ اس کے ساتھ وہاں موجود ایس بی آئی اسے واقعے کے بارے میں بریف کرتے ہوئے اپنی رائے بھی دے رہا تھا۔ اس کے آخری جملے نے شہر یار کے تین بدن میں آگ لگا دی۔ وہ جانتا تھا کہ ایس بی آئی اس حادثے اور اس کے ذمے داروں سے واقف تھا لیکن پھر بھی معاملے کو اپنا رخ دینے کی کوشش کر رہا تھا جس سے کسی حد تک واقعے کی ذمہ داری آفتاب پر تھوٹی جا سکتے۔

”ماسٹر آفتاب نہ تو کوئی تیرا ہے، نہ جاگیر دار اور نہ ہی کوئی اعلیٰ عہدے دار۔ اس لیے اس کی کسی سے اتنی شدید ذاتی دشمنی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور ویسے بھی واقعہ جس انداز میں پیش آیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ بھرم اسکول کی عمارت کو نقصان پہنچانے آئے تھے۔ اگر ایس بی آفتاب سے کوئی ذاتی دشمنی ہوئی تو وہ اتنا لمبا کھڑاگ پالنے کے بجائے سیدھے سیدھے اسے گولی مار کر ختم کر سکتے تھے۔ اس

لیے پلینز، آپ اپنی گفتیشی ٹیم سے کہیں کہ ماسٹر آفتاب کی ذات کو فوکس کرنے کے بجائے واقعے کی نوعیت کو فوکس کریں اور ان لوگوں کے بارے میں جاننے کی کوشش کریں جنہیں یہاں اسکول کے وجود پر اعتراض ہے۔“ بے حد رکھائی سے ایس بی آئی بات کا جواب دے کر وہ اپنے ساتھ ہی موجود عبدالمنان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”عبدالمنان! اسارے نقصان کا تخمینہ لگواؤ اور ساتھ ہی فوری طور پر یہ بھی حساب لگاؤ کہ اسکول کی عمارت کو کم سے کم عرصے میں دوبارہ استعمال کرنے میں کتنے اخراجات آئیں گے۔ میں زیادہ دن تک اس اسکول کو بند نہیں دیکھنا چاہتا۔ اور ہاں، اس بار سیکورٹی کے لیے بھی کوئی معقول انتظام کر لیتا۔ جنہوں نے ایک بار یہ حرکت کی ہے، وہ دوبارہ بھی ایسی کوئی کوشش کر سکتے ہیں۔ ان سازشی عناصر کی کوئی اور کوشش دوبارہ ہرگز کامیاب نہیں ہوئی چاہیے۔“ سخت لہجے میں احکامات جاری کر کے وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

☆ ☆ ☆

”پھر کیا کہتے ہو انور! تم یہ کام کر لو گے؟“

”کیوں نہیں سر جی! میں نے خود آپ سے کہا تھا کہ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیے گا۔ اب بھلا میں انکار کیسے کر سکتا ہوں؟“

”کام ذرا خطرناک ہے۔ بات مکمل جانے کی صورت میں تم چودھری کے قاتل کا بھی شکار ہو سکتے ہو، اس لیے میں نہیں چاہتا کہ اس سلسلے میں تم پر کوئی زبردستی کروں۔“

”میں سوچ بچھ کر ہی آپ کا کام کرنے پر راضی ہوا ہوں سر جی! میری بچھ میں یہ کل آگئی ہے کہ بندے کے نصیب میں اگر کوئی نقصان لکھا ہو تو پھر وہ نہیں بچ سکتا۔ چودھری صاحب جب میرے سرال والوں سے نراضی (ناراض) تھے تو میں نے اسی لیے ان لوگوں سے تاج توڑ لیا تھا کہ کہیں چودھری کا غصہ مجھے اور میرے گھر والوں کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔۔۔ پر کیا ہوا؟ گھر بیٹھے بیٹھے ہی اتنا بڑا نقصان ہو گیا۔ میری گھر والی بھی جان سے گئی اور میں اپنے بچے کی خوشی بھی نہیں دیکھ سکا۔ جب بھی اس نقصان کا خیال آتا ہے تو شش پشیمانی سے مروی یاد آ جاتی ہے۔ اگر وہ اس دن گولی دے دیتے تو شاید میری گھر والی بچ جاتی۔ میرا دل کھٹا ہو گیا ہے ان لوگوں کی طرف سے۔ جن کی خاطر ہم اپنا خون بہانا چاہتا ہے ان لوگوں کی بھلائی کے لیے تو سوچ رہے ہیں۔ گاؤں میں اسکول اور اسپتال بن جائیں گے تو گاؤں ترقی کرے

گا۔ ہمارے لوگوں کے روزگار کا بندوبست ہوگا۔“ انور نے بہت جوش سے اس کی بات کا جواب دیا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ چودھری افتخار کی ریڈ و انٹرویو پر ہونے کے لیے کچھ نہ کچھ ایسا انتظام کرنا پڑے گا جس کے ذریعے اس کی چالوں کا توڑ کیا جاسکے۔ اب تک اس نے چودھری کے خلاف جو بھی کارروائی کی تھی، اس کے نتیجے میں ہائی جلی تھی۔ انور سے قبرستان میں ہونے والی ملاقات کے بعد اس کے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ چودھری کے کارندوں میں سے ہی کسی کو استعمال کیا جائے تو کوئی ناکام حاصل ہو سکتا ہے۔ اسکول میں آگ لگنے کے واقعے کے بعد اس خیال میں مزید مضبوطی آگئی تھی اور اس نے انور کو کچھ رقم کی آخر کے ساتھ یہ ذمہ داری سونپی تھی کہ وہ چودھری کے خلاف ثبوت فراہم کرے جس میں ان کی مدد کرے۔ انور چوپڑی کی موت کے بعد اچھا خاصا دل برداشتہ ہو گیا تھا، اس کام کے لیے فوراً ہی راضی ہو گیا۔

”ٹھیک ہے پھر تم ہمارے معاملات پر نظر رکھنا۔ خاص طور پر یہ جاننے کی ضرورت رکھنا کہ جتنے سے لکڑی یا کھالیں کس دن اور کس وقت انہی کی جائیں گی۔ تمہارے لیے موبائل فون کا انتظام ہو گیا ہے۔ تم عبدالمنان سے موبائل سیٹ لے لینا اور اس کا استعمال بھی سیکھ لینا۔ موبائل سے یہ فائدہ ہوگا کہ تم فوری طور پر ہمیں ہر بات کی اطلاع دے سکو گے۔ مگر خیال رکھنا کہ تمہارا موبائل کسی کی نگاہوں میں نہ آئے اور تم مشکل میں نہ جاؤ گے۔ میں نے تمہیں انہی میں آنے سے بچانے کے لیے خاصی خور و دفتر کے بجائے یہاں اپنے گھر پر تم سے ملاقات رکھی کی۔ تم بھی احتیاط کرنا اور کسی کو معلوم نہ ہونے دینا کہ تم کہاں لگے تھے۔“ شہر یار اسے اس کام کی اچھی طرح سمجھا چکا تھا۔ یہ آخری ہدایات اس نے صرف حفظ و ماتم کے طور پر دی تھیں۔

”آپ کا بہت بہت شکر ہے سر جی۔ آپ نے اتنا خیال کیا۔ میں آپ کی بتائی برات یاد رکھوں گا۔“ انور نے عاجزی سے جواب دیا لیکن جاننے کے لیے اٹھائیں۔

”کیا بات ہے انور! کیا کچھ اور بھی ہوتا ہے؟“ اس کے انداز کو دیکھتے ہوئے شہر یار نے پوچھا۔

”نہیں سر جی! ابھی چھوٹا ٹھکانہ نہیں، پر ایک مرض کرتی ہے۔“

”کہو، کیا بات ہے؟“ اس کی جھجک کو محسوس کرتے ہوئے شہر یار نے حوصلہ دیا۔ ”کوئی مسئلہ ہے تو بتا دو۔ میں تمہاری مدد کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔“

”وہ جی میرا سالا ہے، الیا سا۔ وہ دو دن سے غائب

ہے۔ مگر سے تو دوسرے کے لیے نکلا تھا، پر مولوی صاحب کہتے ہیں کہ وہ دوسرے آیا ہی نہیں۔ ہر طرف اسے دھونڈ لیا ہے۔ ٹاس (پولیس) میں بھی رپٹ (رپورٹ) لکھوائی ہے لیکن کچھ خبری نہیں مل رہی اس کی۔ آپ بڑے افسر ہیں، اگر ٹاس والوں پر زور دیں گے تو وہ الٹا سے کوفٹیک طرح سے تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔ ابھی تو انہوں نے رپٹ لکھنے کے سوا کچھ بھی نہیں کیا۔ دھارے چا چا جا چکی کی بڑی حالت ہے۔ پہلے ہی وہ دو جوان بیٹیاں کا مدد کر رہا ہے۔ کچھ ہوئے ہیں۔ اس پر الٹا ہی غیب (غائب) ہو گیا۔ کچھ ایک تو پھر ہے وہ ان کا۔ آپ سمجھ ہی سکتے ہیں کہ ان چاروں پر اس کی گم شدگی سے کیا گزر رہی ہوگی۔ ”انور کی دی ہوئی اطلاع نے اسے بڑی طرح چونکا دیا۔ گاؤں سے کسی بچے کا یوں غائب ہو جانا معمولی بات نہیں تھی۔ شہروں میں تو پھر بھی امکان ہوتا ہے کہ بچے بھیڑ بھارت میں اٹھتا ہوا دھارے ہو جائیں لیکن گاؤں کے محدود ماحول میں جہاں ہر فرد دوسرے فرد سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے، کسی بچے کا یوں غائب ہو جانا بہت غیر معمولی واقعہ تھا۔ اس واقعے سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ بچہ کسی حادثے سے دوچار ہوا ہے اس لیے وہ دونوں گھر جانے کے باوجود اس کا کوئی اتنا پتا نہیں مل سکا۔

”میں تمہارے فون کر کے ہدایت کر دوں گا۔ تم اس بار سے میں گھر منت مت ہو۔“ انور پر اپنی پریشانی ظاہر کیے بغیر اس نے اسے تسلی دی تو وہ شکر یہ ادا کرنا ہوا رخصت ہو گیا۔ انور کے روانہ ہوتے ہی اس نے متعلقہ تھانے فون کر کے تھانے دار کو الٹا اس کے سلسلے میں تھانے سے ہدایت دی اور فون کرنے کے بعد غیاث محمد کے خاندان کے بارے میں سوچنے لگا۔ ان لوگوں نے خود کو کسی مصیبت سے بچانے کے لیے ماہ بانو کا بیٹا چودھری اختیار کر کے نہ کیا تھا لیکن چودھری تو انہیں کیا نقصان پہنچاتا، وہ ویسے ہی بے در بے نقصانات کی زد میں آتے جا رہے تھے۔ شاید ابھی کچھ دیر پہلے انور نے صحیح کہا تھا کہ جو نقصان آدمی کے نصیب میں لکھا دیا گیا ہو، آدمی اس سے بچ کر نہیں نکل سکتا۔ غیاث محمد بھی مسلسل ایسے ہی نقصانات کی زد پر تھا۔

☆ ☆ ☆

”آپ؟“ اسپتال کے کمرے میں داخل ہوتی مشورہ دیکھ کر وہ بڑی طرح چونکا اور اپنی نگاہ سے اٹھنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں اس کے منہ سے ایک زوردار کراہٹ نکل گئی۔ ”پلیز! آپ! لینے رہیں۔“ وہ تیزی سے آگے بڑھی اور اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے اٹھنے سے روکا۔

”آپ یہاں کیسے آئیں؟“

”مجھے آپ کے رختی ہونے اور لاہور کے اسپتال میں داخل ہونے کی خبر ملی تھی۔ خبر ملتے ہی میرا دل بے چین ہو گیا کہ کسی طرح آپ کو دیکھ لوں۔ بڑی مشکل سے رو دھو کر اماں کو راضی کیا کہ حویلی میں دل تھرا دیا جائے، تھوڑے دنوں کے لیے لاہور چل کر رہیں۔ آپ کی پریشانی میں ویسے ہی ہیرا درو کر بڑا حال ہو گیا تھا۔ کھانا پینا بھی چھوٹ گیا تھا۔ میری ایسی حالت دیکھ کر اماں نے ابائی کو راضی کر لیا کہ کچھ دنوں کے لیے وہ ہم لوگوں کو لاہور بھیج دیں۔ کل رات ہی ہم لوگ یہاں پہنچے تھے۔ صبح صبح میں نے اماں سے بھانہ کیا کہ میرے پیٹ میں بہت درد ہو رہا ہے۔ انہوں نے ڈرائیور کو بھیج کر ڈاکٹر کو گھر بلوایا۔ ڈاکٹر نے کھانے کے لیے دوادی جو ظاہر ہے میں نے نہیں کھائی مگر اماں پر یہی ظاہر کیا کہ دو کھانے کے باوجود میرا درد بڑھتا جا رہا ہے۔ رات بھی گاؤں سے میرے ساتھ یہاں آئی ہے۔ اس نے اماں کو مشورہ دیا کہ بی بی کو اسپتال لے چلتے ہیں۔ اب بے چاری اماں نے انتظار گاہ میں بیٹھی ہیں اور میں ڈاکٹر کو دکھانے اور مختلف ٹیسٹ وغیرہ کروانے کے بھانے یہاں ہوں۔ رات ہی میرے ساتھ ہی ہے اور باہر کھڑی ہے۔ وہ بیلے کے ساتھ رہی کر پی بھینے کے بجائے ابھی تک کھڑی ہوئی تھی اور مزے سے اپنا کارٹا منہ بنا رہی تھی۔

”آپ کو اس طرح یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ اس طرح آنے میں کوئی گڑبڑ بھی ہو سکتی ہے۔ میں نے آپ سے وعدہ دیا تھا کہ آپ اس طرح خود کو خطرے میں ڈال کر مجھ سے ملنے نہیں آئیں گی۔“ ساری بات سن کر آفتاب نے اسے ٹوکا۔

”میری آفتاب! مجھے اپنا وعدہ یاد ہے لیکن آپ کے زخمی ہونے کا سن کر میں رہ نہیں سکی۔ آپ نہیں سمجھ سکتے کہ جب مجھے آپ کے زخمی ہونے کی خبر ملی تو میرے دل پر کیا گزری۔ مجھے رانی نے بتایا تھا کہ آپ کو کہاں کہاں چوس میں ہیں اور یقین جانیں میں نے اپنے جسم پر ان ساری جگہوں پر درد محسوس کیا ہے۔ پھر سب سے بڑھ کر آپ کو کوئی لگنے کی خبر نے میرے ہوش اڑا دیے تھے۔ پہلے سے جگمگ میں ہی تھی لیکن کوئی کوئی معمولی چیز تو نہیں ہوئی جو میں سن کر آرام سے بیٹھی رہتی۔ میرا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ اذکر آپ کے پاس پہنچ جاؤں مگر میں جن ان دھیمی زنجیروں میں پکڑی ہوئی ان سے نجات حاصل کرنا بھی تو آسان نہیں۔ اب بھی اتنی کوشش کے بعد یہ چند لمبے ہی حاصل کر پائی ہوں۔ درد نہ دل تو یہی چاہتا ہے کہ سارا وقت یہاں آپ کے ساتھ رہوں، آپ کی

خدمت کروں اور آپ کے ہر درد کو جن لوگوں۔“ جذبات سے بھیگی آواز میں کہتی ہوئی وہ اپنی نرم انگلیوں سے اس کی آنکھ کے قریب پڑے ہوئے ٹیل کے نشان کو سہارا رہی تھی۔ اس کے جذبات سے بھیگی آواز اور نرم آنکھیں دیکھ کر آفتاب کا دل مچک گیا۔ اس نے بہت محبت سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور بولا۔

”اب تو آپ نے مجھے دیکھ لیا۔ آپ کو تسلی ہو گئی ہو گی۔ دیکھیں، میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔“

”ٹھیک ٹھیک ہیں۔ اسے دھیر دھیر زخم لگے ہیں۔“ اس کی آنکھوں کی تیزی سے آنسوؤں کی روانی میں بدل گئی۔ ”زخم لگے ہیں لیکن اب درد بالکل نہیں ہو رہا۔ آپ نے مجھے چھو کر میرا سارا درد اپنی انگلیوں کی پوروں میں سمیٹ لیا ہے۔“ آفتاب کے اس جملے پر وہ تھوڑی سی تجوج ہو گئی اور اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ کی گرفت سے آزاد کروانے کی کوشش کی لیکن اس کی گرفت مضبوط تھی، سو کامیاب نہ ہو سکی۔

”یہ میرا سوا بل فون ہے، آپ اسے اپنے پاس رکھ لیں۔ میرا پیٹے والا ایسٹ تو اس دن کی لڑائی میں ٹوٹ چھوٹ گیا تھا۔ میں نے اپنے لیے یہ پیاسیٹ منگوایا ہے۔ اس کا نمبر ابھی کسی کے پاس نہیں ہے۔ آپ اسے رکھیں، میں اپنے لیے دوسرا ایسٹ اور دم منگو کر آپ کو اس پر کال کروں گا۔ آپ فون پر مجھ سے بات کر لیا کریں گی تو آپ کی تسلی بھی ہو جائے گی اور اس میں زیادہ خطرہ بھی نہیں ہوگا۔“ آفتاب نے اپنے سر ہانے رکھا مگر بالکل چار جہت میں اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے دونوں ہنڈی اپنے بائیں ہاتھ میں تمام لیں۔ دایاں ہاتھ تو بے دستور آفتاب کی گرفت میں ہی تھا۔

”بس اب آپ جائیں۔“ آفتاب نے اس سے کہا اور اپنے ہاتھ کی گرفت میں موجود اس کے ہاتھ کی پشت پر آہستہ سے لٹکادیا۔ عین اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا اور شہر یار کمرے میں داخل ہوا۔ آفتاب نے پھرتی سے کشور کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ دوسرے سرک جانے والی اپنی چادر درست کرتی ہوئی تیزی سے دروازے کی طرف چلی۔ وہاں رانی اٹھ اٹھ و خیزاں کھڑی تھی۔ بیٹیاں شہر یار کو دکھ کر دانتی حواس باختہ ہو گئی تھی کہ بد وقت اندر اطلاع نہیں کر سکی۔

”کیسی طبیعت ہے اب تمہاری؟ میں پرس و زٹ پر لاہور آیا تھا، سو تمہاری خبر بہت بھی پوچھتا ہوا چلا جاؤں۔“ وہاں پہنچنے والی ٹیکس لکائی تھی۔ کشور کے روانہ ہوتے ہی کمرے میں سکون ہو گیا۔ شہر یار نے اس سارے منظر سے قطعی بے نیازی برتتے ہوئے کرسی سنبھال کر بیٹھتے ہوئے

اس سے گفتگو کا آغاز کیا۔

”اللہ کا شکر ہے اب تو کافی بہتر ہوں۔ انشاء اللہ جلد یہاں سے نجات پا کر گاؤں پہنچ جاؤں گا۔“

”تم پہنچو گے تو تمہیں سب کچھ ٹھیک ٹھاک لگے گا۔ میں نے آرزو کر رہا ہے کہ مجھے اسکول بلڈاز جلد ورکنگ کنڈیشن میں چاہیے۔ وہاں کام جاری ہے۔ جلد سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے ایک نئے پیچھے کاپی اور ٹیمپٹ کر لیا ہے۔ اب اسکول شروع ہو گا تو وہ پیچھے کی تمہارے ساتھ ہوگا۔ میں گاؤں کا ایک مکان تم لوگوں کے لیے ٹھیک کروا رہا ہوں۔ اب تمہارے استعمال والا کمرہ بھی اسکول میں ہی شامل ہوگا۔ اسکول کے اوپر کے کمرے کا کانا منائی اور گرائی کے لیے میں نے ایک چوکیدار کا انتظام کر دیا ہے۔ انشاء اللہ آئندہ دشمنوں کی اس طرح کی کوئی سازش کامیاب نہیں ہو گی۔“ اس نے آفتاب کو خوش خبری سنائی۔

”جیک پورا مجھے اسکول کی طرف سے بہت فکر تھی۔“ اس خبر کو سن کر اس نے ننویت کا اظہار کیا۔

”آئی فکر مت کیا کرو۔ اسکول تمہارا اکیلے کا مسئلہ نہیں، میں خود بھی اس سلسلے میں بہت چمک رہا ہوں۔ تمہارا سامانی نقصان برداشت کرنا بھی میرے لیے مشکل نہیں لیکن تم جیسے قیمتی اور قیمتی شخص کو کھونا میں بڑبڑ بھی پسند نہیں کروں گا۔ سو پلیز اپنی فکر لیں۔“

”میں خیال رکھوں گا سر۔“ شہر یار کی نصیحت کے جواب میں اس نے وعدہ دیا۔ ”لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ تم نے خود کو دوسرے انداز سے بڑھ کر خطرے میں ڈال رکھا ہے۔ باہر بڑی کھڑی تھی، میں نے اسے پہچان لیا ہے۔ وہ چودھری انار کی ملازمہ ہے اور میں نے کی بار اسے حویلی میں دیکھا ہے۔ اس ملازمہ کی موجودگی سے مجھے یہی لگتا ہے کہ کچھ دیر قبل جو خاتون یہاں موجود تھیں، ان کا حویلی سے کوئی تعلق ہے۔“

”وہ چودھری انار کی سب سے چھوٹی بیٹی کشور ہے۔“ شہر یار کے کبیر لکھ کے جواب میں اس نے آہستہ سے بتایا۔ واقعی معاملہ میرے انداز سے بہت قریب خطرناک ہے۔ ویسے تو یہ تمہارا پرسنل معاملہ ہے اور میں کسی کی ذاتیات میں دخل دینا پسند نہیں کرتا لیکن تم سے میں پھر بھی غرض رکھوں گا کہ تم نے اپنے آپ کو بہت زیادہ خطرے میں ڈال رکھا ہے۔ یہ چودھری ہاپ کے لوگ خود تو بے شک دوسروں کی عزتوں سے کھیلنے پھرتے ہیں لیکن اپنے گھر کی خوانی کے معاملے

میں بڑے حساس ہوتے ہیں۔" اسے آفتاب سے اتنی زیادہ انہیت ہو گئی تھی کہ خلاف طبیعت اسے نصیحت کر بیٹھا۔
 "میں جانتا ہوں سراسر لیکن یہ بات آپ بھی سمجھتے ہوں گے کہ بعض معاملات میں انسان خود اپنا خاصا مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے لیکن آپ یہ مت سمجھیں کہ میری اور کشمیریوں کے مابین ملوثی رہتی ہیں۔ وہ بے جاری میری حالت کا کین کر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر بڑی مشکوک سے یہاں پہنچی تھی پھر بھی میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ آئندہ یہ غلطی نہ کریں۔" وہ وضاحت دینے لگا۔
 "او کے! تم جیسے مناسب سمجھو یہ معاملہ چنل کرو۔" میں اب چلتا ہوں۔ میں نے اسپتال والوں کو تہذیبیت کر دی ہے لیکن اگر پھر بھی تمہیں کوئی ضرورت ہو تو فون پر مجھے اطلاع دے دینا۔ ٹیک کیئر! حسب عادت اس نے اچانک ہی بات ختم کر دی اور آفتاب سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔

☆☆☆☆

"میں کوشش کر رہا ہوں، اختیار صاحب کہ آپ کے گاؤں کے مسائل جلد از جلد حل کر داسکوں۔ آج میں جن لوگوں کو اپنے ساتھ لایا تھا، انہوں نے آپ کے ملاتے کا سروے کر کے مرکز صحت کے لیے جگہ کا انتخاب کیا ہے۔ اب اس کے مطابق یہ لوگ نقشہ وغیرہ بنائیں گے تو پھر کام شروع ہو گا۔ میں نے سوچا ہے کہ اس مرکز صحت کا سنگ بنیاد رکھنے کے لیے پانی و بجلی کے وفاقی وزیر کو دعوت دوں۔ وہ اگر یہاں آنے پر راضی ہو گئے تو پھر میڈیا کے لوگوں کے سامنے ہی ہم ان سے نور پور میں بجلی کی سپلائی کے سلسلے میں درخواست کریں گے۔ میڈیا والوں کی موجودگی میں وہ یہاں بجلی فراہم کرنے کا وعدہ کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ ایک بار انہوں نے وعدہ کر لیا تو پھر میں ان کا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔ سیاسی نمائندے اپنا کردار بالکل بھی ادا نہیں کر رہے۔" آج وہ سروے ٹیم کے ساتھ نور پور پہنچا ہوا تھا۔ عبداللہ ان کو اس نے پیر آباد میں اسکول کی سرمت کے کام کا جائزہ لینے کی ذمہ داری سونپی تھی اور خود یہاں آ گیا تھا۔ پھر انہیں روانہ کر کے خود نور پور کے چودھری بختیار سے ملاقات کے لیے چلا آیا تھا۔ پیروں سے معدودہ غریبوں کے دل کا چودھری بختیار سے پند آیا تھا۔

"سیاسی نمائندوں کی تو بات ہی نہ کریں جی۔ سارے کے سارے کٹھ پتلیوں کی طرح ہیں۔ چودھری افکار جیسے لوگوں نے نڈل کا اس کے پڑے لکھے ہندوں کو چڑا کر انہیں میں کھڑا کر دیا تھا۔ ان ہندوں کو کوئی جانتا تھا، نہ پہچانتا تھا

لیکن ہماری عوام کو تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ان پر حکومت کرنے والے جس کی طرف اشارہ کر دیں، یہ ہناسو پے سمجھے اسے دھت دے دیتے ہیں۔ جو بندے یہاں سے ایم این اے اور ایم پی اے بنے ہیں، وہ دوسرے سے یہاں ملتے ہی نہیں۔ شہر میں جا کر انہوں نے اپنے گھر بنا لیے ہیں اور مزے سے بیوی بچوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ یہی اسی اور کا پتلا لگاتے ہیں اور اپنے آقاؤں کے حکم کے مطابق کام کرتے رہتے ہیں۔ حکومت خوش ہے کہ اس کی شرط کے مطابق پڑھے لکھے ہندوں کے پاس سیاسی نمائندگی ہے۔ چودھری افکار جیسے مطمئن ہیں کہ جیل سے نام کسی کا بھی ہو لیکن اصل آقا وہی ہیں اور ان کے اشاروں پر جانے والے سیاسی نمائندوں کو بھی کوئی اعتراض نہیں کہ نقصان انہیں بھی نہیں، وہ اپنی جگہ پیش کر رہے ہیں۔" چودھری بختیار نے اس کی بات کے جواب میں جو تبصرہ کیا، وہ سچ سچی بات تھی بر حقیقت تھا۔ وہ خود اپنی ملازمت کے مختصر عرصے میں یہ بات بھانپ گیا تھا اسی لیے اس نے ان نمائندوں کو ہندوں سے کچھ خاص تعلق بھی نہیں رکھا تھا اور خود اپنی مرضی سے آزادانہ کام کر رہا تھا۔

"میں نے خود بھی یہ سارے حالات بھانپ لیے ہیں، اختیار صاحب! مجھے پوری طرح سے احساس ہے کہ یہاں کوئی بھی شخص عوام کے ساتھ مکمل نہیں ہے اور جو کچھ کرنا ہے، مجھے خود ہی کرنا ہے اسی لیے میں سارا وقت بھاگ دوڑ میں لگا رہتا ہوں۔ انشاء اللہ آپ جلد اپنے گاؤں سمیت سارے ضلع میں بہت ہی تہذیبیانہ دیکھیں گے۔" چودھری بختیار کی بات سن کر اس نے اسے تسلی دی اور پھر رخصت کی اجازت لے کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ حسب معمول اس کی گاڑی مشاہیرم خان ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ چودھری بختیار کے گھر سے وہ لوگ نور پور سے باہر جانے والے راستے کی طرف بڑھ گئے۔ ابھی ان کی گاڑی گاؤں کی حدود سے باہر نہیں نکلی تھی کہ ایک منظر نے انہیں چوکا دیا۔ ایک جیب بہت تیز رفتاری سے دوڑتی ہوئی آئی اور ان سے کافی فاصلے پر رک گئی۔ جیب میں چار باج آدمی سوار تھے لیکن ان میں سے کسی کی بھی توجہ ان کی گاڑی کی طرف نہیں تھی۔ وہ سب ان کے دیکھتے ہی دیکھتے پھلانگیں مار کر جیب سے اترے اور ایک طرف دوڑنے لگے۔ ان کے ہاتھوں میں موجود ڈنڈے اور کھانیاں بہت نمایاں تھیں۔ جیب جس رخ سے آئی نظر آئی تھی، اس سے یہی اندازہ ہو رہا تھا کہ جیب سواروں کا تعلق نور پور سے نہیں ہے، وہ کہیں باہر سے آئے ہیں۔ ان کے تیز بھی کافی خطرناک لگ رہے تھے۔ ان کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کسی کے

تعاقب میں ہیں۔ ان سے آگے ایک لڑکا اور لڑکی تھے جو تیزی سے درختوں کے جھنڈ کی طرف بھاگ رہے تھے۔
 "گاڑی روک لو مشاہیرم خان!" یہ محسوس کر کے کہ ان دونوں کی جان خطرے میں ہے، اس نے حکم دیا۔ اس عرصے میں ان کی گاڑی جیب کے قریب پہنچ چکی تھی۔ مشاہیرم خان نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے فوراً گاڑی کو بریک لگا دی۔ وہ اور مشاہیرم بہ یک وقت گاڑی سے باہر نکلے۔ اس وقت اگر عبداللہ ان ساتھ ہوتا تو شاید انہیں اس معاملے میں ملوث ہونے سے روک لیکن مشاہیرم خان ایک تو حکم کا غلام تھا، دوسرے خود بھی ہم جو قیامت کا مالک تھا، سو فوراً اس کا ساتھ دینے چل پڑا۔ اب وہ لوگ بھی درختوں کے اس جھنڈ کی طرف بھاگ رہے تھے جہاں انہوں نے پہلے لڑکا لڑکی اور بعد میں ان کا تعاقب کرنے والوں کو داخل ہوتے دیکھا تھا۔ اس جگہ کی زمین بہت نرم تھی اس لیے بھاگنے میں مشکل پیش آ رہی تھی مگر اس کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ قدموں کی آواز پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ اگر وہ لوگ اس راستے پر گاڑی لانے کی کوشش کرتے تو گاڑی کے دائرہ چرخوں سے ٹکراتے۔ وہ دونوں ممکنہ رفتار سے دوڑتے ہوئے درختوں کے جھنڈ میں داخل ہوئے تو کچھ آوازیں ان کی سماعتوں سے ٹکرائیں۔ ان آوازوں کا تعاقب کرتے ہوئے وہ دے قدموں آگے بڑھے۔ جھنڈ میں ذرا ہی آگے انہیں لڑکا لڑکی اور جیب میں آنے والے افراد نظر آ گئے۔

"دیکھ قربان! میں کہہ رہا ہوں کہ تو سامنے سے ہٹ جا۔ تو اس کے سامنے دیوار بن کر کھڑا نہیں رہ سکتا۔ میرے بندے تجھے ایک جھنگے میں جٹا سکتے ہیں لیکن میں صرف اس لیے لحاظ کر رہا ہوں کہ اپنے ہی نوکروں کے ہاتھوں تیری ہستی (بے عزتی) نہ ہو۔" قربان کے نام سے پکارا جانے والا ایک ٹیس بائیس سالہ نوجوان تھا جس نے ایک بھی ہوئی لڑکی کو اپنی پشت کے پیچھے چھپا رکھا تھا۔ لڑکی کی پیچھے چوڑے ہونٹ والے ایک درخت سے لگی ہوئی تھی اس لیے کسی کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ نوجوان کو سامنے سے ہٹانے بغیر لڑکی تک پہنچ سکے اور نوجوان کے چہرے سے ظاہر تھا کہ وہ ہرگز بھی لڑکی کے سامنے سے نہیں بنے گا۔ شہر یار نے لڑکی کو شناخت کر لیا۔ وہ چودھری بختیار کی بیوی تھی۔ بھگول بار وہ لوگ نور پور آئے تھے تو انہوں نے اس لڑکی کو چودھری بختیار کے گھر میں دیکھا تھا۔

"تو سامنے سے ہٹ رہا ہے یا میں ان لوگوں سے کہوں کہ تجھے تھمیت کر سامنے سے ہٹائیں اور پانڈہ کر

جیب میں ڈال دیں؟" نوجوان کو سامنے سے ہٹتے نہ دیکھ کر اس شخص نے دھمکی آمیز لہجے میں پوچھا۔

"نہیں بھرا! میں نہیں ہوں گا۔ فریڈ تک پہنچنے کے لیے جہیں میری لاش ہے گزرتا ہے گا۔ یہ میرے بلاوے پر یہاں تک آئی تھی، اس کی حفاظت میری ذمہ داری ہے۔" قربان ہی نوجوان نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ اس کے جواب سے شہر یار کو اندازہ ہوا کہ وہ نوجوان اور اسے دھمکی دینے والا آپس میں بھائی ہیں لیکن دوسرے بھائیوں میں سے ایک فریڈ کی جان کا دشمن اور دوسرا اس کا محافظ کیوں بن رہا تھا، یہ بات اسے سمجھنا آ رہی تھی۔

"لائیں ہم صرف اپنے دشمنوں کی گراتے ہیں۔ اس بے شرم کشمیری تک پہنچنے کے لیے مجھے تیری لاش گرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرے بندے ایسے ہی تجھے قابو کر لیں گے۔" اس شخص نے اطمینان سے کہا اور اپنے ہندوں کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔ وہ لوگ قربان کی طرف بڑھنے لگے۔ فریڈ جو پہلی ہی ہوئی تھی اور بھی زیادہ خوف زدہ ہو گئی اور پشت پر سے ہی لڑکے سے اس ہی طرح چٹ مٹی جیسے اس کے وجود میں سارے خود کو اپنے دشمنوں کی نظر سے چھپا لینا چاہتی ہو۔

"مغزور۔" شہر یار جواب تک خاموش تھا شامی بنا ہوا تھا ایک دم ہی درخت کے پیچھے سے نکل کر ان لوگوں کے سامنے آ گیا۔ کشمیری قسم کی اقاماتی شروا ہونے سے قبل اس نے مداحیت فروری بھیجی۔ اس کے ساتھ ساتھ مشاہیرم خان بھی منتظر رہا۔

"تو کون ہو تم لوگ؟" وہ شخص چنگا۔ اس کے ساتھی بھی ہجر کے ہونے نظر آتے گئے۔

"میں شہر یار عادل ہوں۔ اس علاقے کا اسسٹنٹ کمشنر۔ میں جانا چاہتا ہوں کہ یہاں کیا ہو رہا ہے؟" ان لوگوں کے تہوں کو خاطر میں لا کر فریڈ نے اطمینان سے اپنا تعارف کر دیا اور تخت لہجے میں پوچھا۔

"دیکھیں سرجی! ہمارے گھر کا معاملہ ہے۔ آپ اس معاملے میں داخل نہ دیں۔ ہم آپ اس مسئلے کا حل نکال لیں گے۔" وہ شخص اس کا خلاف سن کر کچھ دبا تو ضرور لیکن اپنے طور پر اڑی بازی کرنے کی بھی کوشش کی۔ یقیناً ان لوگوں کی اس بے رحم واقعہ دماغت سے اسے بد مزہ کر دیا تھا، البتہ فریڈ اور قربان کے چہروں پر اپنے لیے مداح جانے پر روشنی دوڑ گئی تھی۔

"گھر کا مسئلہ تھا تو گھر کی چار دیواری میں بیٹھ کر حل

کرتے۔ ہتھیاروں کے زور پر ان دونوں کو اس ویرانے میں گھیر کر کھڑے ہوا اور کہتے ہو کہ گھر کا مسئلہ ہے۔ میں ابھی فون کر کے پولیس کو بتاتا ہوں۔ تھانے میں رہ کر پولیس کے ڈنڈے کھاؤ گے تو ساری بد معاشی نکل جائے گی۔ اسے اس شخص کی فحشیت کا اندازہ ہو گیا تھا اس لیے اس سے اسی زبان میں بات کر رہا تھا جو اس کی سمجھ میں آ سکے۔ اس کے پیچھے کھڑے مشاہیرم خان نے مظفر باغ مقدم کے تحت اپنا رپورٹ بھی نکال لیا تھا۔ اس صورت حال نے سنا سنا ساطاری کر دیا۔

”پولیس تک بات نہ پہنچائیں سر! یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ یہ پیرے دڈے بھرا ہیں۔ پولیس تک بات پہنچی تو بڑی بدنامی ہوگی۔ آپ نے ابھی دیکھا ہی ہوگا کہ میں فریڈہ کی خاطر اپنی جان دینے کے لیے بھی تیار تھا۔ اس کی عزت اور جان کی حفاظت میں اپنی ذمہ داری سمجھتا ہوں اس لیے آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ پولیس میں بات نہ جانے دیں، اس سے فریڈہ کی بدنامی ہو جائے گی۔“ شہریار کو موہاں پر غبر فٹ کرتے دیکھ کر قربان نے آگے بڑھ کر اس سے درخواست کی۔

”ٹھیک ہے، تم کہتے ہو تو میں اس معاملے میں پولیس کو انوائٹ نہیں کرتا لیکن یہ بتاؤ کہ اب آگے کیا کرنا ہے؟“ اسے خود بھی اندازہ تھا کہ پولیس میں بات جانی تو بدنامی تو لازماً ہی ہوتی اور چودھری بختیار جیسے نیک فطرت شخص کے ساتھ یہ بڑی زیادتی ہوتی۔ اس لیے قربان کی درخواست پر اس نے فوراً موہاں جیب میں رکھ لیا۔ اس جگہ ویسے ہی سنکڑ بہت کم آ رہے تھے اور اسے امید نہیں تھی کہ کسی تھانے سے رابطہ ہو سکے گا۔

”میں اپنے بھرا کے ساتھ چلا جاتا ہوں۔ آپ فریڈہ کو اس کے گھر تک حفاظت سے پہنچا دیں۔ بس پھر سمجھیں کہ بات ختم۔“ شہریار کے ساتھ مذاکرات کی ذمہ داری نو جوان قربان نے سنبھال لی تھی اور اس کا پتہ خان بھائی اپنے ساتھیوں کے ساتھ چپ چاپ کھڑا تھا۔

”ٹھیک ہے، اس لڑکی کی عزت کی خاطر میں یہ بات مان لیتا ہوں ورنہ جو کچھ میں نے یہاں دیکھا تھا، اس کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں تم سب کو تھانے میں بند کر دوں کہ تمہارے دماغ درست کروا دوں۔“ سخت لہجے میں کہتے ہوئے اس نے معاملہ ختم ہونے کا اشارہ دیا۔ درختوں کے مچھڑ سے وہ لوگ اس طرح باہر نکلے کہ فریڈہ اس کے ساتھ تھی اور قربان اپنے بھائی اور اس کے آدمیوں کے ساتھ جا رہا تھا۔

”آپ کا بہت بہت شکریہ جی! اگر آپ نہ نکلتے تو جانے آج میرے ساتھ کیا ہو جاتا۔“ وہ لوگ گاڑی میں آ کر بیٹھے تو اب تک خاموش کردار کی فریڈہ نے اپنے لب کھولے اور اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ”کسی تنہا جوان لڑکی کے ساتھ کیا کچھ ہو سکتا ہے، یہ تو تمہیں اپنے گھر سے اتنی دور اس ویرانے میں آنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔“ اس نے خشک لہجے میں کہا تو اس نے شرمندہ ہو کر نظریں جھکا لیں البتہ رونے کا سلسلہ اب بھی ہلکی ہلکی سسکیوں کی صورت میں جاری تھا۔

”یہ کون لوگ تھے؟ اور کیا معاملہ تھا... کیا تم مجھے بتاؤ گی؟“ ذرا سے توقف کے بعد اس نے فریڈہ سے پوچھا۔ وہ لوگ ابھی تک اسی جگہ موجود تھے اور اس نے مشاہیرم خان کو گاڑی چلانے کا حکم نہیں دیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ گھر پہنچنے سے پہلے فریڈہ خود کو سنبھال لے۔

”قربان ساتھ والے گاؤں کے زمیندار کا پتہ ہے۔ اس کے اور ہمارے خاندان کے بیچ ہمیشہ سے لڑائی رہی ہے۔ بھائی جی کی ٹانگیں جس حادثے میں ٹوٹیں، اس کے بارے میں بھی یہی خیال کیا جاتا ہے کہ اس حادثے کے پیچھے قربان کے باپ کا ہاتھ ہے، پر بھائی جی کو تو آپ نے دیکھا ہے کہ کیسے مضبوط دماغ کے آدمی ہیں۔ انہوں نے یہی بات کسی اور کے سامنے نہیں کہی۔ شاید اسکیلے ہونے کی وجہ سے وہ کمزور پڑ گئے ہیں۔ خبر جو بھی بات ہو، میں آپ کو اپنے اور قربان کے بارے میں بتا رہی تھی۔ قربان سے میری ملاقات ایک دہائی پہلے ہوئی تھی۔ اس نے مجھے دیکھا اور مجھ پر مرغا۔ مجھے بھی وہاں اچھا لگا۔ یہ تو ہمیں بعد میں پتا چلا کہ ہمارے خاندان ایک دوسرے کے ہیری ہیں۔ دشمنی کی وجہ سے ملنا جلنا نہیں تھا تو ہم ایک دوسرے کو پہچانتے بھی نہیں تھے۔ پیار کا بندھن بندھنے کے بعد خبر ہوئی تو دشمنی پیچھے چلی گئی، پر دوسرے لوگ تو ہماری طرح اس دشمنی کو نہیں بھول سکتے تھے۔ ابھی آپ نے جس آدمی کو دیکھا تھا، وہ قربان کا دڈا بھرا بھانجا تھا۔ اسے ہمارے بارے میں خبر ہوئی تو وہ قربان کے پیچھے پڑ گیا کہ فریڈہ کا خیال دل سے نکال دو، پر قربان نہیں مانا۔ وہ بہانے سے چھپ چھپ کر مجھ سے ملنے آیا۔ ہمارے بھانجے کو اس کا پتا پل گیا اور اس نے دھمکی دی کہ اگر تو نے فریڈہ سے ملنا نہیں چاہو تو میں اسے اٹھا کر لے جاؤں گا اور اس کی عزت خراب کر کے لاش چودھری بختیار کے گھر کے سامنے پھینکا دوں گا۔ قربان پچھلی وادی بھ سے ملنے آیا تھا تو اس نے مجھے یہ بات بتائی تھی لیکن ساتھ ہی

اسے یہ بھی یقین تھا کہ سبحان بھرا صرف دھمکی دے رہا ہے، کرے گا کچھ نہیں اس لیے آج بھی وہ مجھ سے ملنے آگیا۔ جہاں آپ نے آج ہمیں دیکھا ہے، ہم ہمیشہ ادھر ہی ایک دوسرے سے ملنے جاتے ہیں۔ شاید سبحان بھرا کبھی یہ بات معلوم تھی جب ہی قرآن کے پختہ ہونے اور وہ دیکھ بیٹھنے لگی۔ وہ تو رب کا کرم ہے کہ آپ آگے اور میری جان بچ گئی۔ اس کے پوچھنے پر فرید نے سارا قصہ سنا دیا۔

”چودھری بھٹیہار کو اس معاملے کا کچھ علم ہے؟“
”نہی۔ انہیں کچھ بھی نہیں پتا۔ آپ بھی انہیں کچھ نہ بتانا۔“ اس کا سوال سن کر وہ جلدی سے بولی۔
”ٹھیک ہے، انہیں بتاؤں گا۔“ شہریار نے اس سے وعدہ کیا اور مشاہیرم خان کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔
”گاڑی موڑلو۔ پہلے ہم انہیں چودھری بھٹیہار کے گھر چھوڑ دیتے ہیں۔“

”نہی... گھر تک چھوڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں آپ ہی چلی جاؤں گی۔ جن سے خطرہ تھا وہ تو چلے گئے، اب مجھے کوئی ڈر نہیں۔ یہ میرا اپنا پتہ ہے، یہاں کے سارے لوگ بھی میرے اپنے ہیں۔ یہاں والوں میں سے کوئی مجھے نقصان نہیں پہنچا سکتا، پر اگر میں آپ کی گڈی میں گھر تک گئی تو بھائی جی کو کھوج لگ جائے گی کہ میں آپ کے ساتھ کیوں آئی ہوں۔“

فریدہ اس کی پیش کش سے صاف انکار کر کے گاڑی سے اتر گئی۔ اس نے بھی کوئی تعرض نہیں کیا۔ وہ جانتا تھا کہ فریدہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اسے واقعی یہاں سے اپنے گھر پہنچنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی البتہ اس کے ساتھ جانے پر وہ بات کھلنے کا اندیشہ تھا جسے وہ چھپانا چاہتی تھی۔ خود شہریار اس معاملے کو کھولے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس طرح کی کئی کہانیاں اس کے ارد گرد بھیلی ہوتی ہوں گی اور وہ انکی ہر کہانی میں خود کو گھومتے ہوئے اپنا وقت ضائع نہیں کر سکتا تھا۔

☆☆☆

”سلاہیکم سرہی امیں ایس ایچ او بشیر کا کڑا بات کر رہا ہوں جی۔“
”ولمکم السلام۔ کہو کا کڑا، اس بچے الیاس کے سلسلے میں تم نے کیا کیا؟ میں نے تم سے کہا تھا کہ جلد از جلد پتہ چکا پتا کر کے اسے اس کے ماں باپ تک پہنچاؤ، پر ابھی تک تم نے کوئی رپورٹ ہی نہیں دی۔“ بشیر کا کڑی آواز سن کر اس نے فوراً اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

”اسی بارے میں تو رپورٹ دینے کے لیے آپ کو زحمت دی ہے سرہی! آپ کے حکم پر ہم دن رات الیاس کو ڈھونڈنے میں ملے ہوئے تھے۔ سارا گاؤں جھان مارا تھا۔ بسوں کے اڈے پر بھی جا کر پوچھ گچھ کی تھی کہ کبھی بچہ گاؤں سے باہر تو نہیں نکلا مگر کچھ معلوم ہی نہیں ہو رہا تھا لیکن آج دو پہر میں سب پتا چل گیا۔ بڑے سسکی خیز انکشافات ہوئے ہیں جی۔ اتنے سالوں کی سرکشی میں، میں نے اتنا گھناؤنا معاملہ بھی نہیں دیکھا۔ لوگوں کا کچھ پتا ہی نہیں پتا، سامنے سے اتنے نیک نظر آتے ہیں اور اندر سے پورے شیطان ہوتے ہیں۔ جو اللہ کے گھر میں بیٹھ کر بھی ایسی گھناؤنی حرکتیں کرے، اسے شیطان کیا شیطان سے بھی بڑھ کر نہیں تو کم ہے جی۔“

”تفصیل اور ترتیب سے ساری بات بتاؤ مگر اپنے ذاتی تہیاری بے سرو پا ہاتھیں شتار ہوں۔“ اس نے کانٹو کاٹ کر کہا۔

”میں الیاس کے کیس کے سلسلے میں بتا رہا تھا جی۔ اس کے بارے میں خبر مل گئی ہے، پر ابھی خبر نہیں ہے۔ آج دو پہر سے پہلے گاؤں کا ایک لڑکا میرے پاس آیا تھا۔ لڑکے کا نام اوریس ہے۔ الیاس سے یہی کوئی سکن چار برس بڑا ہوگا۔ اور میں میرے پاس آیا اور زور دیتے لگا کہ اگر مجھے الیاس کی تلاش ہے تو میں مسجد کی تلاشی لوں اور مولوی غلام محمد سے اس کے بارے میں پوچھ گچھ کروں۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ یہ لڑکا مولوی پر اخرام لگانے کی کوشش کیوں کر رہا ہے؟ میں نے اس سے اس کے اس شک کی وجہ پوچھی تو پہلے تو وہ کچھ تانے پر راضی نہیں ہوا پھر میں نے زور ڈال دیا دھمکیاں اور تھانے میں بند کرنے کی دھمکی دی تو اس نے زبان کھول دی۔ اس کی بتائی ہوئی باتوں سے مجھے پتا چلا کہ مولوی کتنا گندہ آدمی ہے۔ اور میں نے رو رو کر مجھے مولوی کے اس ظلم کے بارے میں بتایا جو وہ اس کے ساتھ کرتا رہا تھا۔ الیاس کے بارے میں اس نے خیال ظاہر کیا کہ مجھے شک ہے کہ مولوی نے اسے بھی اپنی ہوس پوری کرنے کے لیے استعمال کیا ہوگا۔ اس کا کہنا تھا کہ اسے اسی وقت شک پڑ گیا تھا جب چودھری افکار کی ناراضی کی وجہ سے غیث محمد کے گھر میں فاسقے ہو رہے تھے اور الیاس مدر سے میں مولوی کے پاس کھانا کھا کر آتا تھا۔ بھوک سے بے حال الیاس کو یقیناً اس نے اپنے مطلب کے لیے راضی کر لیا تھا لیکن جب غیث محمد کے حالات سدھر گئے تو اس نے مدر سے کارخ کرنا چھوڑ دیا۔ کئی بار مولوی غلام محمد نے بچوں سے پیغام بھیج کر الیاس کو بلا دیا، پر وہ مدر سے جانے

پر راضی نہیں ہوا۔ جس دن وہ غائب ہوا، اس روز غیث محمد نے مار پیٹ کر اسے مدر سے بھیجا تھا۔ بس پھر اس کے بعد وہ جہیں ملا۔ اور میں شک کے باوجود کسی کے سامنے زبان کھولنے کی ہمت نہیں کر سکا لیکن آج جب اس نے نور اس کو روٹے پیٹنے دیکھا تو اس سے اس کی حالت نہیں دیکھی گئی اور وہ میرے پاس تھانے آگیا۔ اور میں کی رپورٹ پر میں فوراً اپنے بندے سے لے کر مسجد پہنچا، پر معلوم ہوا کہ مولوی غلام محمد آج صبح ہی اپنے کسی کام سے گاؤں سے باہر گیا ہے اور اس وقت موجود نہیں۔ مسجد میں دو تین بچے موجود تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ مولوی صاحب کے حکم پر مسجد کی صفائی کر رہے ہیں۔ ان بچوں سے پوچھ گچھ کرنے پر معلوم ہوا کہ جس روز الیاس غائب ہوا، اس روز وہ مدر سے آیا تھا لیکن مولوی صاحب اسے دیکھ کر بہت غصہ ہوئے اور غصے میں اس کا ہاتھ پکڑ کر مدر سے کے لیے استعمال ہونے والے کمرے سے باہر لے گئے کہ اب تجھے یہاں پڑھنے آنے کی ضرورت نہیں۔ بچوں نے بتایا کہ مولوی صاحب نے الیاس کو مارا بھی تھا اور انہوں نے اس کے رونے کی آواز بھی سنی تھی لیکن پھر اس کی آواز آتا بند ہو گئی اور مولوی صاحب واپس آکر انہیں پکڑے گئے۔ یہ سارا واقعہ ہمیں پہلے بھی معلوم تھا لیکن اوریس کے بیان کی روشنی میں وہ بارہو سچا تو معاملہ مشکوک لگا۔ ہم نے مسجد کی تلاشی لینے کا فیصلہ کیا۔ ساری مسجد کھلی ہوئی تھی لیکن وہ کمرہ جس میں مولوی غلام محمد رہتا تھا، اس میں تالا پڑا تھا۔ ہم نے تالا توڑ کر کمرے کی تلاشی کی تو وہاں سے ایسی کئی چیزیں ملیں جن سے اندازہ ہوا کہ مولوی واقعی مشکوک کردار کا بندہ تھا۔ انکر بڑی رسالوں سے کافی کئی گندی تصویریں، عجیب عجیب دو امیں اور گورو فام کی پوسٹ اس کے کپڑوں کے صندوق سے ملی، پر الیاس وہاں نہیں تھا۔ اسی وقت میرے دل میں ایک خیال آیا۔ میں نے سوچا مولوی نے ساری مسجد کی صفائی کا کام بچوں کے ذمے لگا دیا تھا تو اپنے کمرے کی صفائی کیوں نہیں کروائی؟ اس پر کیوں تالا مار کر چلا گیا؟ ساری مشکوک چیزیں تو اس کے کپڑوں کے صندوق میں بند تھیں اور صندوق پر تالا لگا تھا۔ اگر وہ صفائی کے لیے اپنا کرا کھلا چھوڑ کر بھی چلا جاتا تو کسی کو اس کے بارے میں کچھ علم نہیں ہوتا۔ میں نے بچوں سے پوچھا کہ کیا ہمیشہ مولوی صاحب اپنا کرا خود صاف کرتے ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ نہیں، ہمیشہ تو ہم ہی صفائی کرتے ہیں بس آج ہی مولوی صاحب تالا لگا کر چلے گئے ہیں۔ اس بات کو سن کر میرا شک اور بھی بڑھ گیا۔ میں نے اپنے سپاہیوں سے کہا کہ کمرے

کے فرش پر بھی چٹائی اٹھا دیں۔ سپاہیوں نے چٹائی اٹھانے کی کوشش کی تو وہ فرش سے چپکی ہوئی تھی۔ انہوں نے زور لگا کر چٹائی کو فرش سے اٹھا ڈیا۔ چٹائی تھی تو میرے ایک یقین میں بدل گیا۔ کمرے کا فرش کھدا ہوا تھا اور صاف پا پتا تھا کہ اسے کھودنے کے بعد دوبارہ مٹی ڈال کر برابرا کیا گیا ہے۔ میں نے کدال اور پھاڑ اور غیرہ مشکوک اور بارہ کدال کروائی تو ذرا سی دیر میں مولوی کا جرم سامنے آگیا۔ الیاس کی لاش وہاں موجود تھی اور اس کی حالت سے ظاہر تھا کہ لاش کو قتل کے پندرہ سولہ گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں گزرا۔ اپنے بڑے سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ اسے گاموخت کر مارا گیا ہے۔ اصل بات پوسٹ مارٹم ہونے کے بعد سامنے آجائے گی۔“
بشیر کا کڑا اس کے حکم پر تفصیل سے ساری رپورٹ سناتا گیا اور وہ دم سادھے اس بھیا تک واردات کا قہر سٹار رہا۔ اس ساری تفصیل کو سنتے ہوئے اس کا اپنا ذہن بھی واقعات کا تجزیہ کرتا جا رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ غلام محمد جب الیاس کا ہاتھ پکڑ کر بہ ظاہر اسے مسجد سے باہر نکال آیا تھا تو دراصل اس وقت وہ اسے باہر نہیں لے گیا تھا بلکہ اپنے ذاتی استعمال کے کمرے میں لے جا کر اسے بے ہوش کر دیا تھا۔ اس کے بعد قوم لوہا کا وہ نمائندہ اپنی ہوس پوری کرنا رہا لیکن انہیں دن گزر جانے کے بعد اسے احساس ہوا کہ الیاس کی اسے دن کی گم شدگی کے بعد اس کا منظر پر آنا خطرناک بھی ہو سکتا ہے تو اس نے اس مقصود بچے کو قتل کر کے اسے ہی کمرے میں اس کی قبر کھود کر اسے دفن دیا۔ مولوی غلام محمد پہلی ملاقات میں ہی اسے اچھا نہیں لگا تھا لیکن پھر بھی اسے یہ اندازہ ہرگز نہیں تھا کہ وہ اتنے مکرور کردار کا مالک ہوگا۔ جو کچھ ایسے لگاؤ نے اسے بتایا تھا، اسے سن کر تو اس کے اندر شعلے سے لگن اٹھے تھے اور بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح وہ غلطی آگاہ سامنے آجائے تو اپنے ہاتھ سے اس کے گلے سے گلوے کر دے۔

”مولوی کے بارے میں کیا اطلاع ہے... وہاں گیا ہے اور کب تک وہاں آئے گا؟“ خوفناک سنجیدگی کے ساتھ اس نے انہیں انجانے سے پوچھا۔
”مولوی کسی کو کچھ بتا کر تو نہیں گیا، پر میں نے اس کے بارے میں جو فیشن کروائی ہے اس سے پتا چلا ہے کہ وہ ارد گرد کے کسی گاؤں ہی گیا ہے۔ جس بس میں وہ بیٹھا تھا، اس کے کنڈیکٹر نے بتایا ہے کہ اللہ آباد یا میر و مٹھا سے کسی ایک گاؤں کے قریب اتر تھا۔ صبح جگہ سے یاد نہیں کی۔ میں نے دونوں جگہ اپنے بندے بھیجے ہیں۔ وہ واپس آئیں تو پھر پتا چل سکے گا کہ مولوی کہاں ہے؟ وہ جہاں ہی ہوا،

میرے سپاہی اسے جھڑپاں لگا کر لے آئیں گے۔ اس کی گرفتاری کے بعد میں آپ کو خبر کر دوں گا۔ ابھی تو اس لیے فون کیا تھا کہ آپ کو اب تک کی رپورٹ دے دوں۔" انہیں اچانک اٹھانے کے سوال کا جواب دیتے ہوئے یقین دہانی کروائی۔

"تمہیک ہے۔ دو گرفتار ہو جائے تو مجھے خبر دینا۔ میں اس شخص کو اس کے جرم کی کڑی سے کڑی سزا دلوانا چاہتا ہوں، سنو! کوشش کرنا کہ الپاس کے ورطہ کو اس کی لاش کا ردوائی کے بعد بغیر کسی پریشانی کے جلد مل جائے۔ وہ بے چارے پہلے ہی دھکی ہوں گے، انہیں مزید تکلیف نہیں پہنچنی چاہیے۔" انہیں اچانک اوکو بدایات دینے کے بعد اس نے فون بند کر دیا اور عبدالمنان کو اپنے کمرے میں بلا کر واقعے کے بارے میں آگاہ کیا اور تقریرت کے لیے حیر آباد جانے کا فیصلہ بھی سنایا۔

جب وہ لوگ حیر آباد پہنچے تو غیاث محمد کے گھر میں کچرام بجا ہوا تھا۔ ایک تو معصوم بچے کی بھانجی موت پھر اس شخص کے بارے میں ہونے والا انکشاف جسے وہ بہت نیک سمجھتے تھے اور جس کی ہر بات پر عمل کرتے تھے۔ لوگوں میں سخت اشتعال اور غم و غصے کے جذبات پائے جاتے تھے۔ شہر یار کو دیکھ کر وہ لوگ زور و شور سے مطالبہ کرنے لگے کہ مجرم کو فوراً گرفتار کر کے اسے سخت سزا دی جائے۔ اس نے لوگوں کو مل دی اور انہیں یقین دلایا کہ مجرم کو کسی حال میں معاف نہیں کیا جائے گا۔ اس کے بعد وہ غیاث محمد سے ملا۔ اگلوتے بیٹے کی موت نے اسے بالکل گم سم کر دیا تھا۔ شدت غم سے وہ رونے کے لائق بھی نہیں رہا تھا، البتہ نوران خوب بچھاؤں کھا رہی تھی اور جین کر کر کے رو رہی تھی۔ گاؤں کے لوگ بھی افسردہ تھے اور اس کے ساتھ آنسو بہا رہے تھے۔ مختصر عرصے میں تیسری بار نوران کی کوکھ اجڑی تھی۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ وہ جو تعزیت کے خیال سے وہاں گیا تھا، اسے اندازہ ہوا کہ وہ ان لوگوں کو کوئی تسلی نہیں دے سکتا۔ چند ہی جملے پر مشکل ادا کرنے کے بعد وہ وہاں سے روانہ ہو گیا، البتہ ایک خیال بہت شدت سے اس کے ساتھ تھا۔ خود کو تپائی سے بچانے کے لیے نوران اور غیاث محمد نے ماہ بانو کو دواؤں پر لگانے کا سوچا تھا لیکن انہیں کیا خبر تھی کہ چودھری افشار کی ذات کے علاوہ بھی ایک ذات ہے جو طاقت رکھتی ہے۔ جو زمین ہے اور رنجیم بھی لیکن جب لوگ اس کی رحمت پر بھروسہ کرنے کے بجائے ذمہ خداؤں کے خوف میں مبتلا ہو کر ان کی اطاعت کرنے کیلئے ہیں تو وہ اپنے قہار اور جبار ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ اب یہ بندوں پر منحصر

ہوتا ہے کہ وہ خود کو کی جانے والی اس تہذیب پر سنبھل کر اس رب کائنات سے توبہ و استغفار کر لیں یا سرکشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مکمل شہواں پر اتر آئیں۔

☆☆☆

"کیا خیال ہے باجوہ صاحب، اس بڑے مال سپلائی کر دیا جائے؟ ہاں بڑے کے کارخانے والے کا مسلسل فون آرہا ہے کہ مال کی شارج کی وجہ سے اسے مشکل ہو رہی ہے۔ جن پارٹیوں کے ساتھ وہ بزنس کرتا ہے، وہ پارٹیاں تقاضا گمرری ہیں۔ گمرری کے مسئلے میں بھی میری ایک نئی پارٹی سے بات ہو گئی ہے۔ مولیٰ والا کی طرح اس پارٹی کے ساتھ شراکت کے بجائے صرف مال سپلائی کر کے رقم پکڑنے کا معاملہ ملے کیا ہے میں نے۔ شراکت داری میں لوگوں کو راز مل جاتے ہیں اور بندے کا کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ کب کس کا دامغ پھر جائے۔ مولیٰ والا بھی اتنے برسوں تک ہمارے ساتھ کام کرتا رہا اور آخر میں جا کر غدار بن کر اتر آیا۔ بے کار میں حب الوطنی کا بھوت چڑھ گیا تھا سالے پر۔ اب بھی دیکھ لیں، نیسے اس کے مرنے کے بعد بھی وہ اسے ہی کا پچہ اس کی جائیداد سے اسکول و اسپتال بنواتا پھر رہا ہے۔"

"مال تو بالکل تیار ہے چودھری صاحب! جب سے شہر یار عادل اسے ہی بن کر آیا ہے، سپلائی ہوتی نہیں سکتی ہے۔ ضلع سے باہر جانے والی گاڑیوں کی وقت بے وقت چیکنگ ہونے لگی ہے، ایسے حالات میں مال سپلائی کرنے کا ریسک نہیں لیا جاسکتا۔ تازہ صاحب کی موجودگی سے بھی ہمیں زیادہ فائدہ نہیں ہے۔ شہر یار اکثر ان کے علم میں لائے بغیر ہی کوئی بھی کارروائی کر ڈالتا ہے۔ ایسے میں مجھے تو مال سپلائی کرتے ہوئے بہت خطر و محسوس ہوتا ہے۔ اگر مال پکڑ گیا تو میری ہی گردن جھنسنے کی۔ سب سے پہلے مجھ سے ہی سوال کیا جائے گا کہ جنگل سے غیر قانونی طور پر گمرری اور کھالیں نکالیں کیسے؟" چودھری افشار کی بات سن کر اقبال باجوہ نے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔

"آپ کے تحفظ کا مجھے پورا خیال ہے باجوہ صاحب! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم کام کرنے سے پہلے آپ کے بارے میں نہ سوچیں۔ میں نے حالات کا جائزہ لینے کے بعد ہی سپلائی کی بات کی ہے۔ میرے بندے انہی طرح دیکھ بھال کرتے ہیں کہ آج کل سڑک پر کبھی چیکنگ نہیں ہو رہی۔ شہر یار آج کل دفاعی کاموں میں مصروف ہے۔ اسپتالوں اور اسکولوں کی تعمیر کے پتھر میں اسے دوسری باتوں کی طرف دھیان دینے کی فرصت نہیں مل رہی اور اب وہ مولیٰ غلام محمد

والے معاملے میں بھی الجھ گیا ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ کیسے جلد جگہ مولوی کے اٹھنے والے پوسٹر لگا کر اسے گرفتار کروانے میں مدد دینے والے کے لیے انعام کا اعلان کیا گیا ہے۔ مولوی کو گرفتار کر دینے کے لیے شہر یار دیوانہ ہو رہا ہے۔ ان دنوں ضلع پولیس اس پتھر میں چھٹی جگہ جگہ مولوی کو تلاش کرتی پھر رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے لیے یہ بہت اچھا موقع ہے۔ ہم اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر اپنا مال سپلائی کر سکتے ہیں۔" چودھری نے اسے حوصلہ دیا۔

"بات تو آپ کی سچ ہے۔ واقعی ہم اس موقع کا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اگر ایک بار مال یہاں سے باہر نکل گیا تو مسئلہ حل ہو جائے گا۔ آگے تو پھر ہماری وہی پرانی سینگ بنی ہوئی ہے۔ آگے کوئی ہمارے مال کو روک دے والا نہیں ہوگا۔" وہ قائل ہونے لگا پھر اس کا دھیان مولوی غلام محمد کی طرف گیا تو وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ "ویسے آپ کا مولوی غلام محمد تو بڑی اونچی چیز نکلا۔ اس سے ایسے کام کی امید نہیں تھی۔ اگر وہ پولیس کے ہاتھ لگ جاتا تو کھٹک خٹک مشکل میں پڑ جاتا۔ اب بھی جانے کہاں چھپا بیٹھا ہے کہ کس کے ہاتھ نہیں آ رہا۔" مجھے تو لگتا ہے کہ آپ کے علاوہ بھی اسے کی سی چھوڑ حاصل تھی اور اب وہ اسی شخص کی پناہ میں چھپا بیٹھا ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ آدمی وہ نصیبت ہے۔ اس بات کو میں نے سمجھ لیا تھا اس لیے تمہاری رقم اور کپڑے دے کر اس سے اپنے مطالب کے کام لیتا رہا۔ اس کی وجہ سے مجھے بڑی آسانی تھی۔ گاؤں والے اس کی بات بہت مانتے تھے اس لیے مجھے لوگوں کو جس چیز سے دور رکھنا ہوتا، اس کے لیے مولوی سے کہہ دیتا۔ مولوی اللہ کے عذاب اور جہنم کے ڈر اور بے درگاہی کو قابو میں کر لیتا تھا لیکن اب اس کا جو کارنامہ مکمل کر سائے آیا ہے، اس کے بعد تو مجھے ڈر ہے کہ لوگ اس کی سکھائی پڑھائی ساری باتیں بھول کر اپنی من مانی کرنے لگیں گے۔" چودھری نے بھی اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔

"یہ تو زیادہ بڑا مسئلہ نہیں ہے چودھری صاحب! غلام محمد کے بعد کوئی مسجد ہمیشہ خالی تو نہیں رہے گی۔ اس کی جگہ جو غلام مولوی آئے گا، آپ اسے اپنا بھائی لے لیں گے۔ پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ اس کے سامنے بڑے بڑے زائد ڈنگا جاتے ہیں۔" باجوہ نے مشورہ دیا۔

"خیر، جانے دیں اس معاملے کو۔ یہ معاملہ تو میں وقت پر خود ہی دیکھ لوں گا۔ اس وقت جو اصل مسئلہ ہے وہ مال کی سپلائی کا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ گمرری اور کھالیں دونوں ایک ساتھ ہی سپلائی کر دی جائیں۔"

"یہ تو بہت زیادہ ریسک والی بات ہو جائے گی چودھری صاحب! بے شک آپ کو اطمینان ہے کہ شہر یار کا آج کل اس معاملے کی طرف دھیان نہیں لیکن اگر اتفاق سے اسے کچھ بھٹک پڑے گا اور وہ عین وقت پر چھاپا مار دھنوا تو ہمیں تو بہت زیادہ نقصان ہو جائے گا۔" چودھری کی تجویز سن کر اس نے فوراً اعتراض کیا۔

"ایسا نہیں ہوگا۔ میں نے اس بارے میں ساری منصوبہ بندی کر لی ہے۔ میں ایسا انتظام کر دوں گا کہ وہ کہیں اور اس طرح سے مصروف ہو جائے کہ اسے ہوش ہی نہ رہے۔" چودھری نے گہرے اطمینان کے ساتھ جواب دیا اور اسے اپنا منصوبہ سمجھانے لگا۔ اس منصوبہ کو سن کر وہ بھی مطمئن ہو گیا۔

☆☆☆

"نور پور کی تقریب کے سلسلے میں کیا تیاری ہے عبدالمنان! اس موقع پر ہر کام بالکل پرفیکٹ ہونا چاہیے۔ میں نے وزیر صاحب سے بڑی مشکل سے وقت لیا ہے۔ کوشش کرنا کہ تقریب کا انتظام ایسا ہو کہ وہ متاثرہ بے بغیر نہ رہ سکیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کے اس دورے کا پورا پورا فائدہ حاصل کیا جائے۔"

"آپ فکرمند کریں سر! میں سب انتظامات کا ذاتی طور پر جائزہ لے رہا ہوں۔ نور پور میں تقریب کے لیے سارے انتظامات کر لیے گئے ہیں۔ مرکز صحت اور اسکول کے نقشے تیار ہیں۔ وزیر صاحب کے سنگ بنیاد رکھنے سے پہلے انہیں یہ نقشے دکھا کر اپنے پتے پر دیکھنے کے بارے میں بریف کیا جائے گا۔ میڈیا والوں اور دوسری اہم شخصیات کو ڈھٹ ڈانے بھیج دیے گئے ہیں۔ انشاء اللہ اس تقریب کا بھرپور کی تقریب سے زیادہ اچھا رہائش سامنے آئے گا۔" عبدالمنان نے اسے تسلی دی۔

"خیر آج آج میں کام کیسا چل رہا ہے؟ الپاس کی لاش ڈسکور ہونے کے بعد میں دوبارہ وہاں کا چیکنگ لگای نہیں سکا۔ وزیر صاحب کو راضی کرنے، ان سے تقریب میں شرکت کا وقت لینے کے لیے اپنی اتنی بھاگ دوڑ کرنی پڑی کہ کسی اور طرف دھیان ہی نہیں دے سکا۔"

"وہاں کا کام بالکل اے دن طرے پڑے چل رہا ہے۔ اسکول کی مرمت کا کام تو تقریباً مکمل ہو گیا ہے، بس دو چار دن اور لگیں گے پھر عمارت استعمال کے قابل ہو جائے گی۔ ماسٹر آفیس بھی اس دوران اسپتال سے فارغ ہو کر واپس بھیجی جائے گا۔ ایسے آدمی بڑے کام کا ہے۔" اسپتال

میں بستر پر لیٹے لیٹے بھی اسے سمجھ نہیں ہے۔ کل کے اخبار میں اسکول والے حادثے پر اس کا ایسا کاٹ دار کا لم شائع ہوا ہے کہ میں بڑھ کر آتش کر اٹھا۔ اس نے کسی کا نام لیے بغیر اس انداز میں حادثے کا ذکر کیا ہے کہ دسے داران سمجھ بھی جائیں کہ کسی کی طرف اشارہ ہے اور کوئی اسے یہ بھی نہ کہہ سکے کہ تم نے میرا نام کیوں لیا؟" پھر آباد کے بارے میں رپورٹ دیتے دیتے عبدالمنان نے ماسٹر آفتاب کے بارے میں بھی رپورٹ دی ہے۔ ماسٹر آفتاب کے لیے اس کے لہجے میں گہری ستائش تھی۔

"آفتاب بہت ذہین آدمی ہے لیکن مسلسل خطروں سے کھیل رہا ہے۔ مجھے اس کی طرف سے بڑی فکر رہتی ہے۔" وہ انہوں کے سمجھانے کے باوجود کسی بھی خطرے کو خاطر میں لائے بغیر وہی کچھ کرتا تھا جو مناسب سمجھتا تھا لیکن آفتاب کی طرف سے اسے جج جج فکر رہنے لگی تھی۔ خصوصاً کشور والا معاملہ سامنے آنے کے بعد اسے سخت تشویش تھی کہ اگر کسی کو اس بات کی ہینک پڑ گئی تو آفتاب کی خیریت سو فیصد خطرے میں پڑ جائے گی اور وہ ایک شخص اور کام کے آدمی کو ضائع نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔

"فطرو تو ہم سب کے لیے ہی ہے سراسر اہم جن لوگوں کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں وہ ہم سے زیادہ با اختیار ہے شک نہیں ہیں لیکن اس لیے زیادہ خطرناک ہیں کہ ان میں انسانیت نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ انسانوں کی جان سے ٹھیکان اور انہیں نقصان پہنچانا ان کے لیے کوئی بڑی بات نہیں۔ آپ کو بھی ایک پیغام مل تو چکا ہے کہ جب چاہے راستے سے ہٹ جائیں ورنہ اگلی بار بات مزید بڑھ سکتی ہے۔" اس کا اشارہ اس حادثے کی طرف تھا جس میں شہر یار کو باقاعدہ وٹریپ کر کے زخمی کیا گیا تھا۔

"میں ایسی دھمکیوں سے ڈرنے والا نہیں۔" اس نے بے نیازی سے شانے اچکائے اور اچانک یاد آ جانے پر پوچھا۔ "تم نے اس اے ایس آئی اور کانٹھیل کے گھروالوں کو بھی تقریب میں آنے کی دعوت دے دی ہے نا؟ میں چاہتا ہوں کہ اس تقریب میں ان دونوں خاندانوں کے لیے مالی مدد کا اعلان کیا جائے۔ ان لوگوں کا جو نقصان ہوا ہے اسے تو پورا نہیں کیا جاسکتا لیکن ان کی عزت افزائی اور مالی معاونت کے ذریعے دوسرے لوگوں کو یہ پیغام تو دیا جاسکتا ہے کہ فرض کے لیے جان قربان کرنے والوں کی قربانی رانگاں نہیں جاتی۔" "میں سراسر انہیں نے ان لوگوں کو دعوت بھجوا دی ہے۔ تقریب والے دن دفتر کی گاڑی انہیں لینے جائے گی۔"

عبدالمنان نے اطلاع دی۔ اسی وقت میز پر رکھا فون بجنے لگا۔ اس نے ایک فائل کو کھولتے ہوئے عبدالمنان کو کال ریسیو کرنے کا اشارہ کیا۔ اس نے ریسیور اٹھا کر ایک منٹ کے لیے بات کی اور پھر ریسیور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "ایس پی تارڑ صاحب لائن پر ہیں سراسر آپ سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتے ہیں۔" اس نے اپنی ناکواری کے احساس کو چھپاتے ہوئے ریسیور تھام لیا۔ اس شخص کو سخت ناپسند کرنے کے باوجود وہ اس سے بات کرنے پر مجبور تھا۔ ایک ہی ضلع میں رہ کر وہ دونوں ہی ایک دوسرے سے پیشہ وارانہ دسے داریوں کی وجہ سے رابطے میں رہنے پر مجبور تھے۔ سجاد رانا کی یقین دہانی کے باوجود ابھی تک کوئی ایسی انتظامی تبدیلی واضح نہیں ہوئی تھی کہ تارڑ سے نجات مل جاتی۔ اس شخص کی جزیں بھی یقیناً مضبوط تھیں اس لیے سجاد اسے ابھی تک وہاں سے اکھاڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

"السلام علیکم اے سی صاحب! کیسے کیسے حراج ہیں آپ کے؟" اس کے ہیلو کہتے ہی دوسری طرف سے معظم تارڑ کی پرجوش آواز سنائی دی۔

"وہیکلہ السلام۔" فرمائیے کیسے یاد فرمایا آپ نے؟" ایس پی کی گرم جوشی کو خاطر میں لائے بغیر اس نے براہ راست کال کرنے کا مقصد دریاخت کیا۔ "آپ کو ایک اہم اطلاع دینے کے لیے فون کیا تھا۔ ویسے تو یہ پولیس کا معاملہ ہے لیکن چونکہ آپ پہلے بھی پرکھی اس معاملے میں دیکھی ظاہر کر چکے ہیں، اس لیے میں نے سوچا کہ آپ سے یہ معاملہ شیئر کر لیا جائے۔ آپ پر مجھے پورا اعتماد ہے کہ آپ اس ٹاپ سیکرٹ معاملے میں بہت احتیاط سے کام لیں گے۔"

"کیسا معاملہ؟" معظم تارڑ کی ادھوری باتوں نے اس کے تجسس کو بھڑکایا۔

"میں ڈاکوؤں والے معاملے کی بات کر رہا ہوں۔" آپ نے جب مجھ سے اس معاملے پر بات کی تھی، تب سے ہی میں نے اس پر خصوصی نظر رکھی ہوئی تھی۔ آج ایک خبر یہ اطلاع لے کر آیا ہے کہ ڈاکوؤں آج رات کارروائی کرنے والے ہیں۔ ان کا نشانہ پیر آباد، میر ویا اللہ آباد میں سے کوئی ایک گاؤں ہو سکتا ہے۔ خبر کو گاؤں کے بارے میں مکفرم معلوم نہیں لیکن یہ طے ہے کہ کارروائی آج رات ہی کی جائے گی۔ میں نے سوچا کہ آپ سے بھی مشورہ کر لوں۔ ویسے تو میں نے اپنے طور پر پولیس فورس کے جوانوں کو ہدایات دے دی ہیں۔ ان تینوں ہی مقامات پر پولیس فورس موجود رہے گی۔

ڈاکوؤں نے جس طرف کا بھی رخ کیا، انہیں منہ کی کھائی پڑنے کی نین آپ بھی اس سلسلے میں اگر کوئی حیرت دینا چاہتے ہیں تو مجھے دے دیں۔ میں اس سے قانع و اٹھانے کی کوشش کر دوں گا۔" معظم تارڑ کی دی ہوئی اطلاع واقعی بڑی دور دوری تھی۔ اگر ڈاکو اس اطلاع کے مطابق جج جج کارروائی کرنے والے تھے تو یہ بہت اچھا موقع تھا کہ انہیں گھیر کر گرفتار کر لیا جائے۔

"آپ نے اس سلسلے میں جو اقدامات کیے ہیں ذرا مجھے اس کی تفصیل بتا دیں تارڑ صاحب! جب ہی میں آپ کو کوئی مشورہ دینے کے قابل ہو سکوں گا۔" معاملہ ایسا تھا کہ وہ سارے اختلافات بھلا کر نیچیدگی سے ایس پی کے ساتھ گفتگو کرنے لگا۔ اس نے بھی باقاعدہ مختصر اپنے منصوبے کی وضاحت کر دی۔ اس کی طے کردہ حکمت عملی بہت اچھی تھی اور اس کے پیچھے اس کا برسوں کا تجربہ صاف نظر آ رہا تھا۔

"دوری نائلس تارڑ صاحب!" شہر یار نے فوراً اسے سہارا۔ "آپ کی حکمت عملی بہت اچھی ہے۔ بس آپ اس بات کا خاص خیال رکھیے گا کہ پولیس فورس کے لوگ سادہ لباس میں اور بہت خاموشی سے ان تینوں جگہوں پر اپنی پوزیشن سنبھالیں۔ جس طرح ہمیں خبر ملی ہے اسی طرح کوئی ڈاکوؤں کے لیے بھی خبری کر سکتا ہے۔ اگر انہیں پولیس والوں کی موجودگی کی ہینک بھی مل گئی تو وہ پیچھے ہٹ جائیں گے اور ہمارے ہاتھ سے انہیں گرفتار کرنے کا سنہری موقع مل جائے گا۔"

"میں خیال رکھوں گا سراسر انہیں تھوڑی سی پریشانی یہ ہے کہ تین تین گاؤں کو گور کرنے کی وجہ سے ہمیں نفری کی تھوڑی سی کامیابی ہے لیکن یہ ایذا و انتہی بھی ہے ہمارے پاس کڑا کو بے خبری میں آئیں گے اس لیے ہمارے جوان ان پر کم تعداد کے باوجود بھی قابو پانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

"یہ بہت بڑا ایذا و انتہی ہے تارڑ صاحب! بے خبری میں کم فورس کے ساتھ بھی آپ ڈاکوؤں کی بڑی تعداد پر قابو پا سکتے ہیں۔ اسی لیے تو میں نے آپ سے کہا ہے کہ آپ پوری کوشش کیجیے گا کہ کسی کو گاؤں کاں آپ کی کارروائی کا علم نہ ہو سکے۔" شہر یار نے زور دے کر کہا۔

"یہ بات تو میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں سراسر آپ دعا کیجیے گا کہ ہمیں کامیابی ملے۔"

"وش ہو بیٹ آف لک تارڑ صاحب!" اس نے تارڑ کی جذباتی درخواست کے جواب میں کہا اور فون بند کر کے تجسس نظروں سے اپنی طرف دیکھتے عبدالمنان کی طرف

متوجہ ہو کر اسے ساری تفصیل کہ سنائی۔

"کہیں ان لوگوں نے آپ کو نقصان پہنچانے کے لیے کوئی نیا پلان نہ بنایا ہو۔" ساری بات سن کر عبدالمنان نے شک کا اظہار کیا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ شہر یار حسب عادت پرجوش ہو چکا ہے اور اس سے کچھ بیز نہیں تھا کہ وہ خود اس کارروائی میں حصہ لینے کے لیے پر تون رہا ہو۔

"ہو سکتا ہے تمہارا شک بھی ہو۔ اسی لیے میں نے ایس پی کے سامنے ایسا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا جس سے اسے لگے کہ میں اس کارروائی میں شامل ہونا چاہتا ہوں، البتہ اس معاملے کی تصدیق کے لیے میں دور دور سے ہی کیونکہ ان لوگوں پر نظر ضرور رکھوں گا۔" دی نقصان پہنچنے کی بات تو مگر مت کر دو، اس بار میں ہوشیار ہوں اور پہلے سے اپنی حفاظت کے لیے ایسے انتظامات کر کے جاؤں گا کہ کچھ نقصان پہنچانے کی خواہش رکھنے والے اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہوں گے۔" اس کے اس جواب پر عبدالمنان ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ اس جذباتی جوان کو اس کے ارادے سے باز نہیں کر سکتا۔

☆☆☆

رات دھیرے دھیرے گہری ہوتی جا رہی تھی۔ دو اپنی گاڑی میں ڈی ایس پی منظور کے ساتھ موجود تھا۔ اس کی گاڑی حسب معمول مشاہیر خان اراک پر کراہا تھا۔ اس گاڑی کے پیچھے ایک پولیس جیب بھی موجود تھی۔ اس نے بین وقت پر اپنا یہ فیصلہ بدل دیا تھا کہ اس ہم سفر اپنی اقوامت کو ایس پی تارڑ سے پوشیدہ رکھے گا۔ شام کے وقت خود فون کر کے اس نے ایس پی سے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ اس کے لیے ہوئے انتظامات کا جائزہ لینے تینوں گاؤں کا دور کرنا چاہتا ہے۔ ایس پی نے اس کی اس خواہش پر کوئی تعرض نہیں کیا تھا، البتہ یہ احساس ضرور دلایا تھا کہ اس کا یہ اقدام خود اس کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ حالات کا کچھ ہٹا نہیں تھا۔ ڈاکو کی بھی وقت تینوں میں سے کسی بھی گاؤں پر دھاوا بول سکتے تھے اور اگر وہ کسی ایسے گاؤں میں داخل ہو جاتے جہاں وہ موجود ہوتا تو اسے نقصان پہنچنے کا احتمال تھا۔ وہ ایس پی کے اس خدشے کو خاطر میں نہیں لایا تھا اور اپنی خواہش پر قائم رہتے ہوئے علاقہ ڈی ایس پی کو اپنے پاس پیچھے کے احکامات دے دے تھے۔ اب ڈی ایس پی اس کے ساتھ تھا اور وہ لوگ پیر آباد اور میر ویا اللہ کا دورہ کر چکے تھے۔ والیس پر ایس پی مسلسل ان لوگوں سے رابطے میں تھا۔ موبائل فونز ہر جگہ کامیاب کرتے تھے اس لیے ڈی ایس پی اس موقع پر زیادہ

کارآمد تھا۔ وہ لوگ میرے سے نکلے تو ایک بار پھر ایس بی نے ان لوگوں سے رابطہ کر لیا۔ وائرلیس سیٹ ڈی ایس بی منظور کے پاس تھا۔ پہلے اس نے ایس بی سے بات کی اور اسے بتایا کہ وہ لوگ میرے سے نکل کر اب اللہ آباد کی طرف جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ایس بی کی خواہش پر اس نے شہر یار سے بھی اس کی بات کروادی۔ شہر یار نے اس سے بات کرتے ہوئے پھر آ باد اور میر و میں اس کے کیے گئے انتظامات پر عمل اطمینان ظاہر کرتے ہوئے ایک بار پھر اسے اپنے اللہ آباد جانے کے بارے میں بتایا اور ساتھ ہی یہ اطلاع بھی دی کہ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنے بچکے پر واپس چلا جائے گا۔ البتہ ایس بی جب چاہے دفتر فون کر کے اس کے پی اے عبدالمنان سے رابطہ کر سکتا ہے۔ کسی بھی بنگی کی صورت حال کے پیش نظر عبدالمنان آج کی رات دفتر میں ہی گزارنے والا تھا۔ ایس بی نے اس پیش کش پر اس کا شکریہ ادا کیا اور اطمینان دلایا کہ پولیس فورس آرام سے اس معاملے کو ہینڈل کر لے گی۔ اس نے شہر یار کو یہ احساس بھی دلایا تھا کہ رات بہت زیادہ ہوئی ہے اور اب اسے جلد از جلد خطرے کے ان علاقوں سے نکل جانا چاہیے۔ جواباً اس نے ایس بی کو بتایا تھا کہ دورے کی اصل وجہ کو چھپانے کے لیے اسے دونوں گاؤں میں علاقے کے مساکین سننے پر کچھ وقت صرف کرنا پڑا تھا۔ اس لیے اندازے سے زیادہ وقت لگ گیا تھا لیکن اب اللہ آباد میں وہ زیادہ وقت لگنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اس ساری گفتگو کے بعد ایس بی اور ان کے دو میان رابطہ منقطع ہو گیا اور وہ گھبر بھید کیساتھ مشاہیر خان سے بولا۔ ”اللہ آباد جانے کی کوئی ضرورت نہیں مشاہیر خان! گاڑی شعل سے باہر جانے والی سڑک پر لے لو۔“ اس کے ساتھ بیٹھا ڈی ایس بی اس حکم پر چونکا اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”اللہ آباد میں پولیس فورس کے لوگ موجود ہیں اور مجھے یقین ہے کہ باقی دونوں بنگیوں کی طرح وہاں بھی بہت اچھا انتظام ہوگا۔ اس وقت ہم اللہ آباد کے بجائے وہاں جا میں گئے جہاں ہماری زیادہ ضرورت ہے۔“

”تو پھر میں ایس بی صاحب کو پروگرام کی اس تبدیلی کے بارے میں انذارم کر دیتا ہوں۔“ انہیں آپ کی سٹیج کی طرف سے بہت گھرخی اس لیے انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ کی ساری مومنٹ سے انہیں باخبر رکھوں۔“ ڈی ایس بی نے وائرلیس سیٹ کی طرف ہاتھ بڑھاے۔

”لیکن میں انہیں اپنی مومنٹ سے بے خبر رکھنا چاہتا

ہوں۔ اگر آپ میرا ساتھ دیں تو بہت فائدے میں رہیں گے۔ آخر آپ کو بھی تو ایسے کسی کارنامے کی ضرورت ہوگی تا جس کے بعد آپ کا ڈی ایس بی سے ایس بی بننے کا سفر آسان ہو جائے۔ اگر آپ ایس بی صاحب کے احکامات کی قبیل میں گھرے تو آپ کا ریکارڈ ایسے کارناموں سے خالی ہی رہے گا، اس لیے بھرے کہ آپ میری بات مان لیں۔“ ڈی ایس بی کا وائرلیس کی طرف بڑھتا ہاتھ تمام کردہ معنی خیر لہجے میں اسے بولا۔

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا سکتا۔“ وہ اس کی بات پر مزید الجھا ہوا نظر آنے لگا۔

”میرا مطلب بہت واضح ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جو ڈراما آپ کے ایس بی صاحب نے رچایا ہوا ہے، میں اور آپ اس سے بے وقوف نہ بنیں اور اس جگہ تک جائیں جہاں اصل کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ اب تک جو میں آپ کے ساتھ ادھر ادھر کھوٹے میں وقت برباد کرتا رہا ہوں، وہ صرف اس لیے تھا کہ مجھے اس ڈرامے میں انوار کو کرنے والوں کو یقین آجائے کہ میں ان کے بنائے ہوئے پلان سے بے وقوف بن گیا ہوں لیکن یہ حق نہیں ہے۔ یہ ان لوگوں کو جلد پتہ چل جائے گا، پس اس کے لیے آپ کے تھوڑے سے تعاون کی ضرورت ہے اور یقین چاہیے ان تھانوں کے نتیجے میں آپ نقصان میں نہیں رہیں گے۔“ وہ دھیرے دھیرے ڈی ایس بی کو سارا پلان انکھانے لگا۔

آج شام ہی انور نے اسے فون پر اطلاع دی تھی کہ دو بڑے لوڈرز کے ذریعے لکڑی اور کھانسیں باہر بھیجی جاری ہیں۔ اپنے دوسرے کے مطابق وہ واقعی کارآمد ثابت ہوا تھا اور عین وقت پر ایک اہم اطلاع فراہم کر کے اسے ایس بی کی چال میں چھپنے سے بچالیا تھا۔ انور کی کال کے بعد وہ ابھی طرح سارا معاملہ سمجھ گیا تھا لیکن ایس بی کو یہ دستور یہ تاثر دینا رہا تھا کہ وہ اس کے پھیلائے ہوئے چال میں پھنس چکا ہے۔ اس تاثر کو مضبوط کرنے کے لیے اس نے باقاعدہ جی آ باد اور میر و کا دورہ بھی کر ڈالا تھا لیکن اب اللہ آباد جانے کا قطعی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اب رات کا وہ حصہ شروع ہو چکا تھا جب اس کا اس مقام پر پہنچنا ضروری تھا جہاں لوڈرز کو روکا جاسکے۔

”میں آپ کی ساری بات سمجھ گیا ہوں سراسر! مجھے آپ کا ساتھ دینے پر بھی کوئی اعتراض نہیں لیکن اس کام کے لیے ہمارے پاس لکڑی بہت کم ہے۔ ان دونوں لوڈرز کے ساتھ ساتھ افراد ہو سکتے ہیں۔ لوڈرز کو روکنے اور ان افراد سے نمٹنے کے لیے میں زیادہ لکڑی کی ضرورت ہوگی۔“ ساری بات سن کر انی

رہا مندی ظاہر کرنے کے ساتھ ڈی ایس بی نے ایک اہم مسئلے کی طرف اس کی توجہ دلائی۔ اسے معلوم تھا کہ ڈی ایس بی راضی ہو جائے گا۔ حالانکہ اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ اب تک وہاں جو کچھ ہوتا رہا تھا، اس سے ڈی ایس بی کی اصل طور پر ناواقف نہیں ہو گا۔ وہ جانتا ہوگا کہ یہاں سے لکڑی اور کھانوں کی غیر قانونی اسمگلنگ ہوتی رہتی ہے لیکن اپنا کچھ نہ کچھ حصہ لے کر جرم پوشی اختیار کر لیتا ہوگا، پر اب اس نے اسے جو آفر دی تھی، وہ زیادہ پڑی تھی۔ اس کی پشت پناہی میں وہ یہ کارروائی کرتا تو خود اپنے اوپر والوں کے عتاب سے بھی محفوظ رہتا اور مفت میں ایک کارنامہ بھی اس کے حصے میں لکھ دیا جاتا۔ مجھے کی طرف سے اس کارنامے کو سراہے جانے کے ساتھ میڈیا کی طرف سے جو پزیرائی ملتی، وہ اس کارروائی کا ایک اور پس پوائنٹ ہوتی۔

”لکڑی کی طرف سے آپ فکر نہ کریں۔ نور کوٹ کے قلعے کا کچھ عملہ کسی بنگی کی صورت حال سے نمٹنے کے لیے میں نے قلعے میں رکھنے کی ہدایت دی گئی۔ وہاں ایک آدھ کا پیشیل کو پھونڈ کر ہم باقی بندوں کو اپنے ساتھ لے سکتے ہیں۔ پس انتظام ختم کرنا ہوگا کہ کسی کوان بندوں کے ہمارے ساتھ جانے کا فوری طور پر علم نہ ہو سکے۔ اس کے لیے میں نے سوچ لیا ہے کہ کوئی طور پر قلعے کے فون کو تار کاٹ کر تار کاہر کر دیا جائے گا۔ جب وہاں سے کسی کارابطہ کی نہیں ہوگا تو یہ بھی نہیں پتا چل سکے گا کہ ہمارے ساتھ کوئی کیا ہے۔“ وہ پورا لاٹر عمل کرنے لگا تھا۔ ڈی ایس بی اس کی ہدایات کے مطابق عمل کرتا چلا گیا۔ جلد وہ لوگ سارے انتظامات کے ساتھ اس مقام پر پہنچ گئے جہاں انہیں لوڈرز کو روکنا تھا۔ اس بار وہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ پرامید تھا، اس لیے جوش بھی زیادہ تھا۔ ان کے ساتھ موجود پولیس کے جوانوں نے سڑک پر رکاوٹیں لکڑی کر دیں۔ اب کوئی بھی گاڑی بغیر چیکنگ کے وہاں سے نہیں گزر سکتی تھی۔ اس سارے عمل کے دوران ایک بار پھر ایس بی کی کال آئی تھی اور ڈی ایس بی نے اسے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا تھا کہ اسے اب صاحب تھک گئے تھے اس لیے اللہ آباد کا دورہ کیے بغیر ہی اپنے بچکے پر واپس چلے گئے۔ خود اپنے بارے میں اس نے بتایا تھا کہ وہ اگر مردے کسی قلعے میں موجود رہے گا اور جیسے ہی انہیں پڑاؤ کوئی کی آمد کی اطلاع ملے، اسے ساتھ موجود سپاہیوں کو لے کر وہاں پہنچ جائے گا۔ ایس بات کے بعد وہ بارہ ایس بی نے رابطے کی زحمت نہیں کی تھی اور وہ لوگ پورے اطمینان سے اپنا کام کر رہے تھے۔ انہیں بہت زیادہ دیر تک انتظار کی زحمت نہیں اٹھانی پڑی اور سڑک پر دو دو تین لوڈرز آگے پیچھے دوڑتے اس طرف

آتے نظر آتے۔ آگے والے لوڈر نے رکاوٹ کے بالکل قریب پہنچنے کے بعد بریک لگائے۔ یقیناً سڑک پر موجود یہ رکاوٹ ان کے لیے بالکل غیر متوقع تھی۔ انہیں قریبی کہہ کر بیجا گیا ہوگا کہ ہاں... راستہ بالکل صاف ہے۔ معمول کے مطابق ڈی بی پر رہنے والے بھی آج موجود نہیں کہ انہیں لکڑی کی کسی کاہانہ کر کے آج رات کی نہ کی جگہ کھپا دیا گیا ہے۔ ایسے میں اچانک راستے میں آنے والی یہ رکاوٹ ان کے لیے پریشان کن ہی ثابت ہوئی ہوگی۔ آگے والے لوڈر کے رکنے کے بعد پچھلے لوڈر بھی خود بخود یہ رکنا پڑا تھا۔

”کیا بات ہے ستری بارشاہ! یہ راستہ کیوں بند کر کے کھڑے ہو؟“ ان کے زک ڈرائیور نے لکڑی سے جواب کر قریب آنے والے سپاہی سے پوچھا۔

”ہمیں ان لوڈرز کی سلائی ملنی ہے۔ تم لوگ بچو اور تاکہ ہم اپنا کام کر سکیں۔“

”او یا ر جڈا اس حلاشی ولاشی کو... ہم لوگ ہلدی میں ہیں۔ کچھ لے کر مقام ختم کر... کیوں بے کار میں اپنا ہمارا وقت برباد کرتا ہے۔“

اس بار ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے انی نے گفتگو میں دخل دینے ہوئے سپاہی کو لکڑی دیا لیکن ظاہر ہے، وہ اس پیش کش کو ذل کرنے کی پوزیشن میں نہیں ٹھہرا تھا۔ جواباً ملتی سے بولا۔ ”جو اس بندہ کو اسے... ہمیں خبری ہے کہ ان ڈکوں پر غیر قانونی مال جا رہا ہے۔ ہمیں ہر حال میں ان کی سلائی ملنی ہے۔“

”تیرے باب میں بھی دم نہیں کہ نہ بروستی تھالی لے سکے۔ ہم ایسی کی بھی کر کے رکھ دیں گے تم لوگوں کی۔“ وہ شخص بھکا کرتا ہوا انہیں رپو اور لے کر نیچے اتر گیا اور انہیں اسے اندازہ ہو گیا کہ اسے نظر آنے والے دو تین سپاہیوں کے علاوہ بھی پولیس کے بہت سے جوان ان کے گرد موجود ہیں جنہوں نے انہیں گھیر لیا ہے۔

”تم لوگ گھرے جا چکے ہو، بھرے کہ جتھہ زوال دو اور خود کو قاتلون کے خالے کر دو۔“ انورای بلند آواز میں کہا گیا اعلان بھی سنائی دیا جس کے بعد کی ٹک کی صفحہ کشی نہیں رہی کہ وہ لوگ پھنس چکے ہیں۔ ”وہاں ڈرائیوروں سمیت دو کل چار تھے اور جس انداز میں پولیس والوں نے انہیں گھیرا تھا، اس سے صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ ان کے بارے میں باخبر تھے۔ ایسی صورت میں یہ ممکن نہیں تھا کہ پولیس کی لکڑی کم ہوتی۔ انہیں اپنے پچس جانے کا ٹھٹھ سے احساس ہوا لیکن وہ جتھہ زوال کر خود کو پولیس کے خالے بھی نہیں کر سکتے تھے،

اس لیے گھبراہٹ میں فوری طور پر فائر کھول دیا۔ فوراً ہی پولیس کی طرف سے بھی جوابی فائر ہوا لیکن وہ لوگ بہت محتاط فائرنگ کر رہے تھے۔ شہر پارے نے اس سلسلے میں خاص ہدایت دی تھی۔ وہ مجرموں کو زندہ گرفتار کرنا چاہتا تھا تاکہ ان کے ذریعے اصل افراد تک پہنچا جاسکے۔ اس احتیاط پسندی نے مجرموں کو موقع دے دیا کہ وہ موقع سے فائدہ ہونے کی کوشش کریں۔ دو افراد اس کوشش میں کامیاب بھی ہو گئے۔ فائر کرتے ہوئے انہوں نے پہلے آہستہ آہستہ سڑک چھوڑی پھر کچے میں اتر کر اندھیرے کا حصہ بن گئے۔ تیسرے نے بھی اپنے ساتھیوں کی پیروی کرنے کی کوشش کی لیکن اسے یہ موقع نہیں دیا گیا۔ دور افق سے یہ ایک وقت فائر ہوئے۔ ایک گولی اس کے پیچ میں لگی اور دوسری پشت میں گئی۔ گولیاں کھا کر وہ ایک جھٹکے سے گرا اور پھر حرکت نہیں کی۔ شاید پشت پر لگنے والی گولی نے دل تک رسائی حاصل کر کے اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا تھا۔ یہ صورت حال دیکھ کر جو تھے بندے نے ہتھیار پھینک کر ہاتھ اٹھا دیے۔ فوراً ہی پولیس کے جوانوں نے اسے گھیر کر اس کے ہاتھوں میں تھکڑی ڈال دی۔ دہی شخص کا معائنہ کیا گیا تو مردہ پر چکا تھا۔ دونوں لوڈرز کا سرسری سا جائزہ لینے کے بعد ہی یہ بات سامنے آئی کہ انور کی دہی گولی اطلاع بالکل درست تھی۔ لوڈرز پر دہی مانی لدا ہوا تھا جس کو اتنے دنوں سے پکڑنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اس کامیابی پر شہر پار کا چہرہ ہلکانے لگا۔ ڈی ایس بی منظور بھی بہت خوش تھا۔ اس ساری کارروائی میں اسے بھانگ دوڑیکھ خاص نہیں کرنا پڑی تھی لیکن کریڈٹ پورا پورا اسے ہی ملتا۔ شہر پار اس پورے عیس میں خود سامنے نہیں آسکتا تھا۔ ساری ستائش پولیس کے حصے میں ہی آئی تھی۔

”اسے کسی محفوظ جگہ رکھنا۔ یہ بڑے کام کا بندہ ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کی مدد سے ہم اصل مجرموں تک پہنچ سکتے ہیں۔“ گرفتار شدہ شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے ہدایت دی جس کے جواب میں ڈی ایس بی نے بڑی فرماں برداری سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس وقت وہاں بڑی ڈیل چلی ہوئی تھی۔ گرفتار شخص کو محفوظ مقام پر پہنچانا مردہ آدمی کے لیے ایجو پولیس کا انتظام اور مقامی میڈیکو پولیس کی اس کارروائی سے آگاہ کرنے کے مسائل درپیش تھے۔ مختصر نفری کے ساتھ یہ سارے معاملات نمٹانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ مفروضہ افراد کے پیچھے جانے والے بھی اندھیرے میں ٹانک ٹانیاں مار کر آچکے تھے۔ ان لوگوں کے فرار ہو جانے کا اسے افسوس تھا لیکن جتنی بڑی کامیابی ملی تھی، اس

کے مقابلے میں یہ چھوٹا سا نقصان برداشت کیا جاسکتا تھا۔ اس قسم کے آپریشنز میں ایسی چھوٹی موٹی کوتاہیوں کا مار جن رکھنا ہی پڑتا ہے۔

”سر! آئیں پھر کال آ رہی ہے۔“ وہ لوگ ابھی ان معاملات کو دیکھ ہی رہے تھے کہ مشاہیر خان نے آکر اطلاع دی۔ ڈی ایس بی کا ڈائریکٹریٹ اس کی گاڑی میں تھا۔ اس اطلاع پر اس نے سوائی نظروں سے شہر پار کی طرف دیکھا اور اس کی طرف سے کال ریسیو کرنے کا اشارہ ملنے پر خود گاڑی کی طرف چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے چہرے پر تعجب کا اثرات تھے۔ وہ کچھ پریشان بھی لگتا تھا۔

”خبریت؟“ شہر پار نے پوچھا۔

”ایس بی صاحب تھے۔ فور پور گاؤں پر ڈاکوؤں نے حملہ کر کے وہاں پر کافی لوٹ مار مچائی ہے اور فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ڈاکوؤں کی وہاں آمد کی اطلاع بہت دیر سے ملی۔ اطلاع ملنے کے بعد بھی فوری طور پر کارروائی نہیں کی جاسکی۔ ضلع کی زیادہ تر پولیس میرا آباد، میرا اور اللہ آباد کی حفاظت پر مامور تھی۔ نوکوتھانے میں موجود فوری کو بھی ہم اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ پھر تھانے کا فون بھی نا کارہ تھا اس لیے کوئی رابطہ نہیں ہو سکا۔ دوسری جگہوں پر موجود پولیس کے جوان جب تک فور پور پہنچے۔ وہاں سارا مکمل ختم ہو چکا تھا۔ ایس بی صاحب خود فور پور میں ہیں اور مجھے بھی وہیں کال کیا ہے۔“ اس نے اطلاع دی تو شہر پار بھی سشندردہ گیا۔ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ ڈاکوؤں کا ہوا کھڑا کر کے لکڑی اور کھالوں کی اسٹینگ کی طرف سے اس کی توجہ ہٹانے کی کوشش کی گئی ہے لیکن وہاں تو جھج جھج ڈاکوؤں نے کارروائی ڈال دی تھی، البتہ جن جگہوں کے بارے میں اطلاع دی گئی تھی، ان سے ہٹ کر بالکل مختلف جگہ پر یہ کام ہوا تھا۔ اب یہ نہیں معلوم تھا کہ ڈاکوؤں کو پولیس کے تاک میں بیٹھے ہونے کی خبر ملی تھی اس لیے انہوں نے اپنا رخ بدل لیا تھا یا اصل ڈراما ہی اس طرح چلان کیا گیا تھا۔ یہ بات کوئی بعد از امکان نہیں تھی کہ ڈاکوؤں کے حملے کا ڈراما جھج اس کی توجہ ہٹانے کے لیے ہی بنایا گیا ہو اور اس ڈرامے کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے فور پور کو ٹارگٹ بنایا گیا ہو۔ اس طرح ڈرامے پر حقیقت کا بھی گمان ہوتا اور ڈاکو بھی محفوظ رہتے جیسا کہ ہوا بھی تھا۔ زمینداروں، پولیس اور ڈاکوؤں کا آپس کا گتھ جوڑ کوئی نئی بات تو نہیں تھی۔ تینوں گروہوں کے لوگ آپس کے مفاد کی خاطر ایک دوسرے کی مدد بہ وقت ضرورت کرتے ہی رہتے تھے۔

”آپ نے ایس بی صاحب کو یہاں کی صورت حال کے بارے میں آگاہ کیا تھا؟“ شہر پار میں یہ ساری باتیں سوچنے کے بعد اس نے ڈی ایس بی سے پوچھا۔

”نوسرا وہ اتنی جلدی میں تھے کہ اپنی بات کہہ کر رابطہ ختم کر دیا۔ مجھے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں ملا۔“

”انہیں آپ کے بتائے بغیر بھی تھوڑی دیر میں معلوم ہو ہی جائے گا۔ بہتر ہے اس تھوڑی سی مہلت سے فائدہ اٹھا کر آپ اپنا کام مکمل کر لیں۔ میں خود اپنے ڈرامیہ کے ساتھ فور پور کے لیے روانہ ہو رہا ہوں۔ آپ سے اس بارے میں کسی بھی قسم کی جواب دہی کی جائے تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ جو کچھ بھی کیا گیا، اسے ایس بی صاحب کے کہنے پر کیا گیا۔ آپ کے فور پور نہ پہنچنے کی وجہ میں خود ایس بی صاحب کو بتا دوں گا۔“

ڈی ایس بی کا جواب سن کر اس نے اس سے کہہ کر اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے ضم پر مشاہیر خان نے گاڑی کو ہوائی جہاز بنا دیا۔ فریالے بھرنی ہوئی گاڑی جس تیزی سے فور پور کی طرف دوڑ رہی تھی، اسی تیزی سے اس کا ذہن بھی دوڑ رہا تھا۔ وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ کچھ دیر پہلے جو کچھ ہوا ہے، اس پر سارے ملوث افراد بُری طرح غماز میں گئے۔ بہر حال، وہ انہیں ذک تو پہنچا ہی چکا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ گرفتار ہونے والا شخص کتنوں کی نشان دہی کرتا ہے اور اس شخص کے بیان کی بنیاد پر اس جرم میں ملوث کن افراد پر گرفت کا جاسکتی ہے؟ اپنی اس کامیابی کے ساتھ ساتھ اسے فور پور کی بھی فکرت رہی تھی۔ اس چھوٹے سے گاؤں میں ڈاکوؤں نے جانے کتنی جاہلی مچائی ہوگی؟ غریب دیہاتیوں کو پہنچنے والے نقصان کے خیال نے اپنی اتنی بڑی کامیابی کی خوشی کو مائع کر دیا تھا۔

☆☆☆

”میرے بچو! یہ حربے سنے نہیں ہیں۔ یہ حربے یہود و نصاریٰ بھی ہم پر آزماتے رہے ہیں۔ وہ لوگ بھی خوراک، تعلیم اور صحت کے نعرے لگاتے ہوئے آتے ہیں اور انسانی ہمدردی کی آڑ میں معصوم لوگوں کے ذہنوں کو قابو میں کر کے انہیں اپنا معمول بنا لیتے ہیں۔ ان کٹار کا اصل مقصد ہمارے لوگوں کے عقائد بدل کر انہیں اپنے مذہب میں شامل کرنا ہوتا ہے۔ اب انہوں نے ایک اور چال چلی ہے۔ ان کا منصوبہ ہے کہ بے شک مسلمان اپنا مذہب نہ چھوڑیں لیکن ان کے عقیدے اس طرح بدل جائیں کہ وہ بس نام کے ہی مسلمان رہ جائیں۔ اس کام کے لیے وہ ایسے روشن خیالی کاراگ لاسپنے والے مسلمانوں کا استعمال کر رہے ہیں جنہیں تم اپنے

علاقے میں آج کل سرگرم دیکھ رہے ہو۔ ہمارے علاقے کا کیا اسے بھی ایسی انہی لوگوں میں سے ہے۔ بولے بھالے لوگ بڑے متاثر ہو رہے ہیں کہ اسے ان کی بھلائی کے کام کر رہا ہے لیکن انہیں کیا معلوم کہ اس کے بنائے ہوئے اسکولوں میں جو تعلیم دی جائے گی، اس سے مسلمان بچوں کا ذہن خراب ہو جائے گا۔ وہ اپنے دین کو بھول جائیں گے۔ اس چال باز اسے ہی کا اپنا تعلق ایسے کمرانے سے ہے جہاں کوئی اللہ رسول سے ڈرنے والا نہیں۔ ان کی محفلوں میں کھلے عام شراب پی جاتی ہے، عورتوں کو تنہا پایا جاتا ہے، جو اکھلا جاتا ہے۔ ان کے بینک اکاؤنٹ حرام کی کمائی سے بھرے ہیں۔ ایسے بے دین شخص سے کیسے توقع رکھی جاسکتی ہے کہ اس کا کوئی کام مسلمانوں کی بھلائی کے لیے ہوگا۔“ تجزیہ ڈرامی و لادادہ شخص اپنے سامنے بیٹھے چار باج لڑکوں سے بڑے نرم لہجے میں بات کر رہا تھا۔ ان لڑکوں میں سے کسی کی عمر سولہ سترہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ بہت توجہ سے اس شخص کی باتیں سن رہے تھے۔

”مگر مولانا صاحب! آج کل تو ہمارے ضلع میں سنے اسے ہی بڑی اوجھ ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ ایک ایمان دار اور بہادر افسر ہے۔ اسی کی وجہ سے یہاں سے ہونے والی لکڑی اور کھالوں کی اسٹینگ کا بیٹھا بھرتا ہے۔“ تقریباً چودہ سال کے ایک گورے بچے لڑکے نے جس کی سنیں ابھی بھینکی شروع ہوئی تھیں، کہا تو وہ شخص ایسے انداز میں مسکرایا جیسے کسی بچے کی نادانی پر مسکرایا جاتا ہے اور پھر پہلے سے بھی زیادہ ہر شفقت لہجے میں بولا۔

”کیا تو وہ جھٹکنڈے ہیں میرے بچے جن سے وہ لوگوں کو متاثر کرنا چاہتا ہے۔ سارے میں اس کی داد وہ ہوگئی لیکن دیکھو، ابھی تک کھل کر کوئی بات سامنے نہیں آئی۔ یقیناً اندھری انداز اس نے اور پولیس نے اسٹینگوں سے سک مکا کر لیا ہوگا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ بال بچہ ابھی اس لیے گیا ہوگا کہ اسٹینگ اسے اس کی مرضی کو پہنچائیں و سارے بچوں کے تم لوگ دیکھ لینا کہ آئندہ ایسا ہو نہیں ہوگا۔“

”میرے بس میں ہوتا میں ایسے مکار لوگوں کو جان سے مار دوں۔ ایسے دو چارے جا سکیں گے تو ان کے باقی ساتھیوں کے دماغ خود بہ ذریعہ فکھانے آجائیں گے۔“ جذبات کی شدت سے سرسبز ہونے چہرے کے ساتھ تیز لہجے میں یہ جملہ بولنے والا لڑکا کبھی کوئی چودہ پندرہ برس کا تھا۔

”کھل سے میرے بچے کھل سے۔ ہمیں بہت سوچ سمجھ کر ان لوگوں سے نمٹنا ہوگا۔ یہ بڑے بلی والے لوگ

ہیں۔ تمہاری طرح خود میرا دل بھی غصے سے بھرا ہوا ہے۔ خاص طور پر ان لوگوں نے مولوی غلام محمد پر جو رکیک الزام لگایا ہے، اس کے بارے میں سوچنا ہوں تو سینہ جل اٹھتا ہے۔ ایک معلم اور مسجد کے امام پر ایسا منگدہ الزام انہوں نے لگایا ہی اس لیے ہے کہ لوگوں کا دل مذہبی ذہن رکھنے والے افراد کی طرف سے خراب ہو جائے۔ دنیا جانتی ہے کہ پولیس جو چاہے وہ کر سکتی ہے۔ جانے انہوں نے کب کس طرح اس معصوم بچے کو غائب کر کے اسے جان سے مارا اور پھر لاش مولوی صاحب کے کمرے سے دریافت کر لی۔ بے چارے مولوی غلام محمد مجھ سے سادے سے آدمی تھے۔ وہ اس سازش سے کیسے منبتے۔ بے چارے اپنی جان اور عزت بچانے کے لیے نہ جانے کہاں چھپ کر بیٹھے ہوں گے؟ وہ جو پیر آباد میں کافی عرصے سے ماسٹر لوگوں کے دماغ خراب کرنے کی کوشش کر رہا تھا، اس کی تو بڑے عرصے سے خواہش تھی کہ مسجد والا درسدہ بند ہو جائے۔ اب اس سازش کے بعد تو ظاہر ہے اس کا مطلب پورا ہی ہو گیا ہوگا۔ میرے خیال میں تو وہ ماسٹر بھی اس سازش میں اسٹنٹ کشر کے ساتھ شامل ہوگا۔ بہر حال جس نے جو کچھ کیا ہے، ایک دن ضرور پھٹکے گا۔ ہوں سمجھ لو کہ ابھی ان کفار کے اکٹہ کاروں کی رتی راز ہے۔ جس دن رتی ٹھٹھکی، سب کا دم ناگ میں آ جائے گا۔ وہ کچھ میں بڑی ملاوت لیے ان معصوم ذہنوں میں زہر بھر رہا تھا۔

”کیا ہم ان لوگوں کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے مولانا صاحب؟ اپنے دین کے خلاف سازش کرنے والے ان لوگوں کے خلاف جہاد کرنا تو ہم سب پر فرض ہے۔“ وہی لڑاکا ایک بار پھر جوش سے بولا۔

”اس کے لیے بڑے حوصلے اور ہمت کی ضرورت ہے۔ جہاد جہاد پکارنا الگ بات ہے لیکن وقت پڑنے پر جان کی بازی لگانا بڑا مشکل ہوتا ہے۔“ اس نے جاچھنے والی نظروں سے اپنے سامنے بیٹھے لڑکوں کو دیکھا۔

”وقت پڑنے پر ہم اس بات کو ثابت کر سکتے ہیں۔ ہمارا جذبہ صرف زبانی نہیں ہے، ہم عمل کی بھی ہمت رکھتے ہیں۔“ ان میں سے دو تین لڑکے ایک ساتھ بول اٹھے۔

”شاہاش میرے بچہ! ہمارے دین کو تمہارے ہی جیسے جانناڑوں اور دیروں کی ضرورت ہے۔ مجھے فخر ہے کہ تمہارے اندر یہ ہمت اور جذبہ میری تربیت نے پیدا کیا ہے۔ تمہاری وجہ سے میری آخرت بھی سنور جائے گی۔“ لڑکوں کے اس جذبے پر وہ آب دیدہ سا ہو گیا۔

”پھر آپ ہمیں بتائیں کہ ہم کیا کریں مولانا صاحب؟

ہم جلد سے جلد کچھ کرنا چاہتے ہیں۔“ لڑکوں نے اصرار کیا۔ ”ابھی نہیں میرے بچہ! ابھی حوصلے اور تحمل کا وقت ہے۔ ضرورت پڑنے پر میں خود تم لوگوں کو بتاؤں گا کہ کیا کرنا ہے۔ ابھی تم لوگ انتظار کرو۔“ اس نے لڑکوں کو جلا پھر کمرے کی دیوار پر لگی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”وقت زیادہ ہو گیا ہے۔ اب تم لوگ گھر جاؤ اور جا کر آرام کرو۔ میں بھی کچھ دیر کے لیے آرام کروں گا تاکہ تھک کے لیے اٹھ سکوں۔“ اس حکم پر لڑکے فرماں برداری سے اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے اور عقیدت سے اس کے ہاتھ کی پشت چوم کر رخصت لینے لگے۔ اس نے بھی ہر لڑکے کے سر پر بڑی شفقت سے ہاتھ پھیر کر ہر ایک کے لیے انفرادی طور پر نیک خواہشات کا اظہار کیا۔

”عبدالستین! پترا آج تم یہیں رک جاؤ۔ آج میرے ساتھ ہی تھک اور فجر پڑھنا۔“ ان لڑکوں میں سے سب سے زیادہ پرجوش نظر آنے والا لڑکا جب آخر میں اس سے رخصت لینے کے لیے آگے بڑھا تو اس نے بہت محبت سے اسے حکم دیا۔ دو فوراً رضی ہو گیا۔ اپنے استاد کے حکم کی تعمیل کرنا تو اس پر فرض تھا اور پھر ان کے ساتھ عبادت میں شریک ہونا بھی ایک سعادت تھی جس سے وہ بھی کبھی کسی لڑکے کو نوازتے تھے۔ اس رات عبدالستین کو نہ صرف یہ سعادت نصیب ہوئی بلکہ ایسا بہت کچھ سننے کو ملا جس کو سن کر اس کے جتنے جتنے ہیں میں سکون سا آتا ہے۔

☆☆☆

”اور ستارہ جے! چنڈ کی کیا خبریں ہیں؟ بڑے دنوں سے تو نے کہیں کی کوئی خبر ہی نہیں دی۔“ بڑی چودھرائی نے فرش پر ایک طرف بیٹھی، اپنے دوپٹے کے کنارے پر تکیں ٹانگی رکھتے سے پوچھا۔ اس وقت وہ دوپہر کے کھانے کے بعد آرام کرنے لگتی ہوئی تھی اور ابھی اس کے پیروں پر رہی تھی۔

”چنڈ کی کیا کوئی خبر ہوئی ہے جی! جب سے غیائے کے پتر والا مالہ (معالہ) ہوا ہے، ہر طرف چپ گئی ہے۔ نوراں اپنی سمدھ بدھ کھوتی تھی ہے۔ غیاٹا بھی گپ چپ سا ہو گیا ہے۔ زہرہ بھی کبھی آکر ماں بچو کو دکھ جاتی ہے۔ پر اصل میں اسے مہاں کی باہر کی کمائی کی ہوا گئی ہے اس لیے پیکے میں زیادہ دل نہیں لگتا۔ میں نے سنا ہے کہ اس نے وہ بیخیر کاروان فون بھی لے لیا ہے۔ اس پر روز میاں سے بات کرتی ہے۔“ اسے سو بائیں کہتے ہیں اماں۔“ چودھرائی نے جھ رہتی بھی نے درمیان میں قطعہ دیا۔

”اے ہاں، وہی موٹیل۔ اسی پرگنی رہتی ہے یا پھر فی دی
دیکھتی رہتی ہے۔ اب ایسے مزے چھوڑ کر بھلا وہ روز روز پکے
کیوں جانے لگی۔ چھوڑا ہوا ہے ہاں ہو کون کے حال پر۔“
”پھوٹے لوگوں کو کچھ مل جائے تو وہ ایسے ہی ہو جاتے
ہیں۔ مٹے مٹنے والے روپے کی چمک انہیں آپے میں نہیں
رہنے دیتی۔ زہرہ کو بھی میں دیکھ رہی ہوں۔ جب سے ویاہ ہوا
ہے، حویلی میں آکر جھانک تک نہیں۔“ بڑی چودھرا ان نے
جھپٹے ہوئے لہجہ میں تبصرہ کرتے ہوئے شکوہ کیا۔

کا کام بھی میری دھیاں ہی میٹری (منٹائی) ہیں۔ وہ رانی کے
بچی تو کسی کام جوگی ہے ہی نہیں۔ سارا وقت مشہور لی لی کے
کمرے میں مٹی چالوئی کرتی رہتی ہے۔ اور تو اور اب تو اس
نے ان کی کتابیں بھی لے کر پڑھنی شروع کر دی ہیں۔ میری
مٹی اور شاہد سید مٹی سادی ہیں۔ انہیں کام سے بچنے کے لیے
یہ چال کیاں کرتی نہیں انہیں کٹر مشہور لی لی کے آگے پیچھے کوئی
رہیں۔ مٹی کھل ہے ہی! ہم تو آپ کو ہی حویلی کا اصل مالک
سمجھتے ہیں اس لیے سب سے زیادہ آپ کی ہی خدمت کر کے
خوش ہوتے ہیں۔ ”تمہارے اب اپنی بیٹی کی صفائی دیتے ہوئے
بڑی چالاک سے دوسروں کے خلاف چودھرائے کے کان بھر
رہی تھی۔ ان پڑھ اور مغرور چودھرائے فوراً اس کی باتوں میں
آگئی اور غصے سے بولی۔

ہوئی تھیں۔ اس کے پاس سوا سائے کی موجودگی کا علم ہوتا ہے ہی ان کے پیٹ میں ٹھکد بدھوئے تھی۔ آج موقع دیکھتے ہی رحمتے فوراً اس بات کو بڑی چودھرائے کے علم میں لے آئی۔ اس قسم کی لٹاکی، جھجکیوں بھی اس کی فطرت میں شامل تھی اور یہاں تو اس کے نتیجے میں ماکان سے قربت پر جانے کا موقع مل رہا تھا، چنانچہ اس نے بہت چالاکی سے اس بات کو بڑی چودھرائے کے گوشِ مکرار کر دیا۔ نتیجہ مسب توقع تھا۔ چودھرائے نے اس سے اچھٹے نہیں تھی جس کا مطلب تھا کہ اس نے اس اطلاع میں گہری دلچسپی لی۔

کی بروقت اطلاع نے ان لوگوں کی یہ سازش ناکام کر دی۔ میڈیا والے بھی اتنے بے وقوف نہیں ہیں کہ ارٹیکل کے تذکرے کے لیے کی جانے والی کارروائی کی اہمیت کو نہ سمجھ سکیں۔ انہوں نے اس نی کی بجواس کو صرف "کالے لیے اہمیت دی ہے کہ انہیں آپ کے اور اس کے درمیان اختلاف کی کو آگنی ہے اور اب دوا اس آگ کو ہوا سے کر رہے ہیں" کے لیے جٹ پٹی خبریں حاصل کرنے کی کوشش میں ہیں۔ نور پوری غرب عوام کے ڈاکوؤں کے ہاتھوں ل جانے کی خبریں بھی انہوں نے لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے چھاپی ہیں لیکن میرے خیال میں آج جب مستراڈوں میں امدادی پولیس تقسیم کیے جا رہے تو ایسی کسی فکارت کی محفل کش بنی باقی نہیں رہے گی۔"

جانے والے نور پور کے باشندوں سے بھی اس نے خاص طور پر بات چیت کی تھی اور انہیں سمجھایا تھا کہ جو کچھ ہوا، اسے بھول جائیں اور اسے یاد رکھیں جو ان کے آنے والے محل کو روشن و تابناک بنا سکتا ہے۔ گاؤں والے اس نکتے کو سمجھ گئے تھے اور اسے امید تھی کہ ان کے تعاون سے منتقلی جانے والی تقریب بہت کامیاب رہے گی۔

”میں ایس بی کی زبان کی گاڑی باتوں کو بالکل بھی خاطر میں نہیں لاتا ہوں لیکن جہاں تک مجھے اس کی فطرت کا اندازہ ہوا ہے، وہ برا کیونہ پرورد آدمی ہے۔ ایسے آدمی موقع ملنے پر بالضرور لیتے ہیں۔ اگر اس نے بدلہ لینے کی غمازی ہوئی تو آج کا دن اس کے لیے بہترین ہے۔ سیکورٹی پلان کی طور پر اس کے ہاتھ میں ہے۔ وہ کوئی ایسا موقع تلاش کر سکتا ہے جس کے ذریعے یہ ثابت کیا جاسکے کہ وزیر صاحب کا نور پور جانا سیکورٹی کے حساب سے صحیح خطرناک تھا اور میں نے پروگرام کو برقرار رکھنے پر اصرار کر کے مصافحت کی ہے۔“ پیشانی کو اٹکی سے رگڑتے ہوئے اس نے عبدالننان سے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔

”آپ فکر نہ کریں سر! میرے خیال میں وہ ایسی غلطی نہیں کرے گا کیونکہ کسی بھی ہمدردی کی صورت میں اس پر بھی ذمہ داری عائد ہوگی بلکہ زیادہ ذمہ داری ہی ہوگی۔ پھر بھی اگر آپ کہیں تو میں وزیر صاحب کی آمد سے پہلے نور پور کا پیکر لگا کر ایک دفعہ اور جائزہ لے لیتا ہوں تاکہ اگر کہیں کوئی سقم نظر آئے تو اسے دور کیا جاسکے۔“ عبدالننان نے اسے تسلی دیتے ہوئے تجویز پیش کی۔

”میرے خیال میں یہ مناسب رہے گا۔“ اس کا یہ چھوٹا سا جملہ عبدالننان کے لیے حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ وہ فوراً ہی نور پور کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد شہر یار دوسرے امور کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گیا۔ پروگرام کے مطابق وزیر صاحب کو لاہور سے یہاں پہنچنے کے بعد کچھ دیر اس کے ہنگامے پر رکنا تھا۔ یہاں وہ تھوڑی دیر رک کر آرام کرتے اور دوپہر کا کھانا کھاتے پھر اس کے بعد نور پور جا کر تقریب میں شرکت کرتے۔ واپسی میں ایک بار پھر انہیں اس کے ہنگامے پر رک کر شام کی چائے پیتی تھی۔ یہ انتظام لاہور سے نور پور تک کی طویل مسافت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیا گیا تھا۔

وزیر صاحب کی آمد کے پیش نظر ہنگامے میں بھی خوب رونق اور ہنگامے بھی ہوئی تھی۔ بارہ بجے تک اس ہنگامے نے پورے شہر کی خاص خصوصیات لہاؤں اور اڑھ لیا۔ ہنگامے کے ملازمین اور انتظامی عملے کے تحریک کے باوجود وہاں ایسا سکوت محسوس

ہوئے لگا جیسے وہاں مصروف عمل لوگ کسی خاص قسم کے بازو سے تھنکے جیسے تھے جن کے چلتے پھرنے اور بات چیت کرنے کے نظام میں کوئی ایسی ترتیب کا فرما ہے کہ ہر کام انجام دیا جاتا ہے لیکن آزادانہ پھرنے والی۔ پونے ایک بجے تک عبدالننان بھی نور پور سے واپس آ گیا۔ اس نے وہاں کے انتظامات پر مکمل اطمینان ظاہر کرتے ہوئے اطلاع دی کہ اس کے چاروں طرف لگائی جانے والی رسیوں کو، جو لوگوں کو اس کے دور رکھنے کے لیے ایک باؤنڈری لائن کے طور پر لگائی جاتی ہیں، کھلو کر اس نے دوبارہ مزید فاصلے سے لگوا دیا ہے۔ اس طرح اگر کوئی شخص ان حد بندی کرنے والی رسیوں کو پھلانگ کر اس کے قریب پہنچنے کی کوشش بھی کرتا تو اسے موقع نہ ملتا اور وہ درمیان میں ہی دھریا جاتا۔ شہر یار نے اس کی اس کارکردگی کو سراہا۔ ایک بج کر پانچ منٹ پر کال موصول ہوئی کہ وزیر صاحب سوا ایک بجے تک شہر کی حدود میں داخل ہو جائیں گے۔ اس کال کے موصول ہوتے ہی وہ لوگ پہلے سے تیار گاڑیوں میں ان کے استقبال کے لیے روانہ ہو گئے۔ ٹھیک سوا ایک بجے انہوں نے اپنے ضلع کی حدود میں وزیر صاحب کا استقبال کیا پھر ایک مشٹر کو قلعہ کی صورت میں ہنگامے پر پہنچا۔ اس موقع پر ایس بی منظم ہارڈ میسج موجود تھا اور وہ نام نہاد ایم این اے اور ایم پی اے بھی جنہیں یہاں کے عوام کی نمائندگی کا شرف حاصل تھا۔ کچھ بالکل نااہل ماحول میں لیا گیا۔ کچھ کے بعد وہ لوگ نشست گاہ میں آکر بیٹھے تو وزیر صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ کی جھلک دکھائی دی اور وہ شہر یار سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔

”یو آرسو بیک مسز شہر یار! جیل بار جب میں نے رات صاحب سے آپ کا ذکر سنا تھا، تب ہی سمجھ گیا تھا کہ آپ کوئی بیک پر تین ہی ہوں گے۔ آپ کے کام میں جس قسم کا جوش اور تیزی نظر آتی ہے، اس کی ایک نوجوان سے ہی امید کی جا سکتی ہے۔“

”میرے خیال میں سر... یہ آدمی کے اندرونی احساسات کی بات ہوئی ہے۔ اگر آدمی کے اندر جذبہ زندہ ہو تو عمر سے بہت زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ آپ میری اتنی گراں قدر فرمائشیں لیکن پھر بھی اتنا لبا سطر لے کر کے یہاں تک پہنچ ہی گئے ہیں نا۔“ موقع کی مناسبت سے وزیر صاحب کو تھوڑا سا خوش کر دینے میں اس نے حرج نہیں سمجھا۔ وہ یہاں سے خوش واپس جاتے، تب ہی یہاں کے لوگوں کے لیے خوش حالی کے درمحل سکتے تھے۔ وزیر صاحب کی گہری بولی مسکراہٹ کے ظاہر کیا کہ اس کا جملہ کارکردگیاں ثابت ہوا ہے اور وہ

اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے میڈیا کے افراد کو پانچ منٹ کا ٹائم دیا اور اپنے اسٹے لیے سفر کو چھوڑ کر حب الوطنی سے تھی کرتے ہوئے دو چار مخصوص جذباتی جملے ادا کیے۔ اس کارروائی کو بھٹکنے کے بعد وہ لوگ نور پور کے لیے روانہ ہو گئے۔ اس بار وہ اور شہر یار ایک ہی گاڑی میں تھے۔ راستے میں وہ انہیں ضلع میں کیے جانے والے ترقیاتی کاموں اور منصوبوں کی تفصیلات سناتا رہا۔ وہ خاموشی سے بلا تیرہ سب کچھ سنتے رہے۔ اپنے پرنٹس کی تفصیل سناتے ہوئے جب اس نے اپنے کام میں پیش آنے والی رکاوٹوں کا تذکرہ چیخا تو وہ بے حد توجہ سے سنتے رہے پھر ایک دم ہی بولے۔

”جس طرح آپ کو شکایات ہیں اسی طرح دوسرے لوگوں کو بھی آپ سے کچھ شکایات ہیں مسز شہر یار! ان لوگوں کا کہنا ہے کہ آپ اپنے فیکلٹی بیک گراؤ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے اختیارات سے تجاوز کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔“ ان کی بات سن کر اسے اندازہ ہو گیا کہ جن لوگوں کے لیے وہ رکاوٹ بن رہا ہے، انہوں نے اوپر اقدار کے ایوانوں میں اپنی فریاد پہنچا دی ہے۔ وزیر بجلی و پانی کا یہ ظاہر ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن انہیں موقع دیکھ کر غدا کرات کے لیے تو استعمال کیا جاسکتا تھا۔

”میرے خیال میں، میں نے ایسی کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اسسٹنٹ کمشنر کی حیثیت سے مجھے اختیار حاصل ہے کہ میں اپنے ضلع میں ہونے والے ہر کام پر نظر رکھوں اور اس کی فلاح و بہبود کے لیے اقدام اٹھاؤں۔ آپ کے خیال میں اسکولز اور صحت کے مراکز قائم کرنے یا لوگوں کو بنیادی سہولیات فراہم کرنے کی کوشش کرنے میں ایسا کوئی سا کام ہے جسے اختیارات سے تجاوز کرنا قرار دیا جاسکے؟“ اس کا لہجہ نرم لیکن لفظوں میں کات تھی۔ وزیر صاحب ذرا سا پہلو بدل کر رہ گئے پھر گھٹکھٹکاتے ہوئے بولے۔

”میرا اشارہ پچھلے دنوں کی جانے والی اس کارروائی کی طرف ہے جس کے ذریعے لکڑی اور کھالوں کی اسٹینڈنگ کو روکا گیا ہے۔ یہ ظاہر تو یہی کہا گیا کہ سارا کاروبار ہی ایس بی منظور کا تھا اور آپ نے صرف منظوری دی تھی لیکن حقیقت سے آپ بھی واقف ہیں اور میں بھی کہ آپ اس ساری کارروائی میں براہ راست شریک رہے تھے۔ ایس بی تارز صاحب کو شکایت ہے کہ اس بے وقت کارروائی کی وجہ سے وہ نور پور میں ہونے والی ڈیکتی کی واردات کو روکنے کے لیے مؤثر اقدامات نہیں کر سکے۔ آپ کو کچھ کرنے سے پہلے کم از

کم انہیں تو اعتماد میں لینا چاہیے تھا۔“

”میں انہیں اعتماد میں لے کر ایک بار پہلے بھی کارروائی کرنے کا تجربہ کر چکا ہوں۔ اس تجربے کی ناکامی نے مجھے مجبور کیا کہ میں اس تجربے کو دہرانے کی غلطی نہ کروں۔“ شہر یار نے بہت سادگی سے وزیر صاحب کی بات کا جواب دیا۔

”آپ کا یہ جملہ براہ راست الزام کے ذمے میں آتا ہے۔“ انہوں نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔

”میں نے آپ کو صرف اپنے تجربے کے بارے میں بتایا ہے۔“

”کیا گزارہ ہونے والے شخص نے اس طرح کا کوئی اشارہ دیا ہے؟“ انہوں نے اسے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھا۔ اس گاڑی میں ڈرائیور کے علاوہ اگلی نشست پر ان کا بی اے بھی بیٹھا تھا لیکن ان افراد کا شمار عمر راز لوگوں میں ہوتا تھا اس لیے وہ کچھ گفتگو کر رہے تھے۔

بھی ان کے لیے مفید ہی تھی۔ آج کا دن تو ویسے ہی وہ اس تقریب کے لیے وقف کر چکے تھے۔ اگر آٹھ دس منٹ اس کام میں خرچ بھی ہو جاتے تو کوئی حرج نہیں تھا بلکہ میڈیا کی بھرپور کوریج کی وجہ سے انہیں مزید شہرت ہی ملتی تھی۔ اس تقریب سے فارغ ہو کر وہ اسکول اور مرکز صحت کا سنگ بنیاد رکھتے اور پھر اس کے بعد وہ اپنی ہو جاتی۔

گازیاں پنڈال تک پہنچیں تو پولیس اور وزیر صاحب کے ذاتی اسکواڈ نے مل کر انسانی جسموں کی ایک حفاظتی دیوار سی بنادی۔ اس دیوار کے حصار میں وزیر صاحب اور دیگر... ذاتی چیز کو بچھاتے انچ تک پہنچا دیا گیا۔ انچ پر چودھری بختیار میٹل سے موجود تھا۔ اس نے اپنی میسجیوں کے سہارے کھڑے ہو کر وزیر صاحب کا استقبال کیا۔ وزیر صاحب نے بھی جواباً اسے بڑی شفقت بھری مسکراہٹ سے نوازتے ہوئے اس سے مصافحہ کیا۔ پھر تمام حضرات نے اپنی مخصوص نشستیں سنہنیل لیں۔ تقریب کا آغاز رواجی طور پر تلاوت قرآن پاک سے کیا گیا۔ گپیرنگ کی ذمہ داری سنبالنے کے لیے ہیرا آباد سے ماسٹر فیض کو بلوایا گیا تھا۔ آفتاب اگر چہ اسپتال سے فارغ ہو کر آچکا تھا لیکن ابھی اس کے لیے اتنی دور آکر یہ ذمہ داری سنبھالنا تکلیف دہ ثابت ہوتا اس لیے اسے زمت نہیں دی گئی تھی۔ تلاوت کے بعد فیض نے نور پور کے زمیندار چودھری بختیار کو وائس پر آنے کی دعوت دی۔ وہ میسجیوں کے سہارے چلتا وائس تک پہنچا اور بڑے موثر انداز میں وزیر صاحب کی آمد پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بڑی خوب صورتی سے آہستہ آہستہ بات کو نور پور کے مسائل کی طرف لے گیا۔ انچ کے پیچھے رکھے جزیئر کے شور پر معذرت کا اظہار کرتے ہوئے اس نے نور پور میں بجلی کی فراہمی کے لیے بھی درخواست کر ڈالی۔ وہ تقریر ختم کر کے اپنی نشست پر واپس آکر بیٹھا تو فیض نے وزیر صاحب کو وائس پر آنے کی دعوت دی۔ وہ مسکراتے ہوئے اپنی نشست سے اٹھ کر وائس تک آئے۔ ان کے وائس پر آنے پر لوگوں نے ایک بار پھر نعرے بازی شروع کر دی۔ کچھ جذبہ پاتی قوم کے نوجوان نعرے لگاتے ہوئے حفاظتی حصار کے طور پر لگائی جانے والی رسی کے بالکل قریب آ گئے۔ ان نوجوانوں میں سے ایک پندرہ سالہ نوجوان جوش میں یک دم ہی رتی پھلانگ کر انچ اور رسی کے درمیان موجود غالی جگہ پر آکھڑا۔ اس نوجوان نے گھیر دار شلوار کے ساتھ ڈھیلا ڈھالا کرتے پھین رکھا تھا۔ وہ جیسے ہی کوڈر کو لوگوں کے درمیان میں سے اس طرف آیا، حفاظت پر مامور افراد فوراً حرکت میں آ گئے۔ انہیں اس جذبہ پاتی نوجوان کو پکڑ کر واپس رسی کے اس

حرف موجود عوام کے درمیان پہنچا دینا تھا۔ دوسری طرف وہ انچ تک پہنچنے کا خواہش مند نظر آتا تھا۔ نوجوان کی اس حرکت پر انچ پر بیٹھا شہر یار بے چینی محسوس کرنے لگا۔ نوجوان کا چہرہ اس کے لیے شاسا تھا اور اس کے چہرے پر موجود تاثرات بھی کچھ بتائے نہیں تھے۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ جذباتی نوجوان انچ پر پہنچ کر کیا کرنا چاہتا ہے۔ سیکیورٹی والوں نے اسے بری طرح جکڑ لیا تھا اور اسے انچ تک نہیں آنے دے رہے تھے جس پر وہ زور زور سے چیخا ہوا کچھ بول رہا تھا۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے انچ پر موجود افراد اس کے الفاظ سمجھ نہیں پا رہے تھے مگر سب ہی اس صورت حال پر اپنی جگہ جڑ سے ہل رہے تھے۔ وائس پر کھڑے وزیر صاحب نے ابھی تک اپنی تقریر شروع نہیں کی تھی۔ ہاتھ پر ناگواری کی جگہ سی لکیر لیے وہ خاموشی سے اس ہنگامے کے منت جانے کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کے ذاتی باڈی گارڈز ان کے دائیں بائیں آکر کھڑے ہو گئے تھے۔ ہنگامہ کرنے والا نوجوان ہبتا تھا اس لیے صورت حال زیادہ تشویشناک نظر نہیں آرہی تھی اور وہ لوگ یہی قیاس کر رہے تھے کہ وہ وزیر صاحب کے قریب پہنچ کر ذاتی طور پر ان سے اپنا کوئی مسئلہ بیان کرنا چاہتا ہے۔ یہ ساری لمحوں کی کہانی تھی اور سب لوگوں کو امید تھی کہ سیکیورٹی والے ایک آدھ منٹ میں اس مسئلے سے منت میں آئیں گے۔ لیکن یہ اطمینان بس چند لمحوں کا ہی تھا۔ اس کے بعد جو واقعہ پیش آیا، وہ نہایت غیر متوقع تھا۔ جوش سے بھرے نوجوان کو سیکیورٹی والے کھینٹ کر پنڈال سے باہر لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں، یہ تو سب نے دیکھا لیکن اس کے بعد جو کان بھاڑ دھماکا سنائی دیا اور آگ کے شعلے بلند ہوئے، اس نے کسی کو کچھ کھینے کی مہلت نہیں دی۔ دھماکے نے زمین کو لرزنا کر رکھ دیا تھا اور کڑی کا انچ اس لرزش کو برداشت نہ کرتے ہوئے اپنی جگہ قائم نہیں رہ سکا تھا۔ تباہ ہوتے انچ پر موجود میزوں، کرسیوں، وائس، ٹائکس اور آرائشی پھولوں سمیت انسانی وجود بھی تباہ ہو کر رہ گئے تھے۔ اس تباہی میں کس پر کیا گزری تھی، کچھ خبر نہیں تھی۔ بس ہر طرف مرنے ہوئے اور زخمی انسانوں کی کراہیوں کے ساتھ، بلند خوف زدہ چیخیں تھیں جو سنائی دے رہی تھیں اور دیکھنے کے لیے آگ کے شعلوں کا دھماکا تھا۔ اس دھماکے میں نور پور کے عوام کی خوشیاں اور امیدیں ان کے دم توڑتے جسموں کے ساتھ ہی دم توڑ رہی تھیں۔

حادثات و سانحات کسی شکار... ہمارے کسی تلاش میں سرگردان
ماہ بانو کسی داستان حیات کے واقعات اللہ ماہ بڑھے

گلاب

پہلی قسط

بے شمار سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے لیکن اس کی باگ ڈور جب ہاتھ سماج کے روایتی نظام میں پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں بالا تو طبقہ کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے اور یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں ڈھری ہوئی ہے۔ ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں مٹا فاشور مچھلی جال کو تو زک اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے۔ پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقہ سے ہو۔ حدیث نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشیہ کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے یہ تو بس ہو جاتی ہے دل طیفوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے، زندگی کی بساط اور وقت کے دھاریے ... سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں ... کبھی بازی ہلت بھی جاتی ہے گزرا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے۔ اس وقت تک پہلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہ چکا ہوتا ہے جرم، افسر شاہی، جاگیر داری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی سلسلہ در سلسلہ۔



وہاں گویا قسمت کا ساں تھا۔ دم توڑتے اور زخمی انسانوں کی کراہوں اور چیخوں نے ان لوگوں کے اعصاب کو بھی متاثر کیا تھا جو اس حادثے میں بالکل کمزور رہے تھے۔ اس آفت زدہ مقام سے دور جانے کی خواہش میں وہ ایک دوسرے کو دھکے دیتے اور کھینچتے وہاں سے بھاگ رہے تھے۔ ان لوگوں کے درمیان شاید لوگ بھی موجود تھے جنہوں نے اپنے خواہش کو بخش نہیں ہوئے دیا تھا اور اس آفت کے نیچے میں پھسلنے والی جہاں سے نکلنے کے لیے متحرک ہو گئے تھے۔ انہی میں سے ایک شہر یار بھی تھا۔ حادثے کے وقت وہ آج پر

ایک کڑی پر برابری تھا۔ دھماکے کے باعث ان کا ٹوٹ پھوٹ کا دکھار ہوا تو وہ اپنی کڑی سمیت اس بچے کے پیچھے لے میں جا گرا۔ گرنے سے اس کی کھینچ اور ٹھٹھوں سمیت جھکے کی محسوس پر چوٹیں آئیں لیکن اس وقت اسے اپنی چوٹوں کا کوئی احساس نہیں تھا۔ کرتے کے ساتھ ہی وہ بگرنے سے اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور اپنے زخموں کی طرف توجہ دے بغیر ان طرف بھاگا جہاں اسے ڈی ایس بی منظور دکھائی دے رہا تھا۔ بالکل سب سے سلامت تھا اور بچے کو اپنے ہاتھوں میں اکامات داری کر رہا تھا۔ شہر یار اس کے قریب پہنچا تو وہ اس کی طرف توجہ



ہو گیا۔ "خود انور کوٹھانے سے رابطہ کرو اور وہاں سے مزید نفری بلاؤ گے ساتھ ساتھ امدادی کارروائی کرنے والی ٹیموں کو بھی کال کرو۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹی پولیس پورٹی کو اپنے آپ کی طرف روانہ کرو۔ وہاں سے انٹیکس وین بھی مانی ایک شخص کو اس کی پوری فیکٹی سمیت اریسٹ کر کے قتلے پہنچاؤ ہوگا۔ خیال رہے کہ یہ گرفتاری بہت خاموشی سے ہونی چاہیے اور جب تک میں وہاں نہ پہنچوں وہاں لوگوں کو کسی سے لٹنے کی اپہت نہیں رہنی ہے۔" مختصر یہ کہ ہوتے ہوئے اس نے احکامات جاری کیے۔

"اوکے سر! ڈی ایس بی آر کے پورے تین گھنٹے کی گرفتاری والے حکم کا سبب نہیں سمجھ رہا تھا میں اس نے کوئی بھی سوال کیے بغیر مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا اور اس طرف پس پڑا جب پولیس کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ شہر پارخود بھی فوراً ہل گیا اور اس کی طرف چل پڑا۔ وزیر صاحب کا ذاتی حفاظتی عملہ اس دوران انٹیکس اپنے حصار میں لے چکا تھا۔ دھماکے کے اثر سے وہ بھی محفوظ نہیں رہے تھے اور اپنی جگہ سے اچھل کر گر گئے تھے لیکن ان کے سیکورٹی گارڈز نے اس وقت ہی مستعدی سے اپنے فرائض نبھائے تھے۔ وزیر صاحب کے گرنے کے بعد وہ ان کی ڈھال بن گئے تھے چنانچہ وہ دھماکے کے اثر سے دھڑکھڑا کر لوگوں کو زخمی کرنے والی کسی شے کی زد میں آنے سے بچ گئے تھے۔ چنانچہ ان کے باؤنی گارڈز نے ان کے حصے کا ہر ذمہ اپنے جسم پر سہ لیا تھا۔ وہ اس کی طرف بڑھا تو دھڑکھڑا کر زمین پر گرا۔ وزیر صاحب کا حفاظتی عملہ اس دوران ان کے گرد اگھابو چکا تھا۔ ان لوگوں نے اس طرح وزیر صاحب کو اپنے گھر سے میں لے لیا تھا کہ وہ دکھائی بھی نہیں دے رہے تھے۔ اسے یہ مشکل اس حفاظتی گھیرے میں سے گزر کر ان تک پہنچنے کی اجازت تھی۔ انٹیکس دیکھ کر اسے یہ اطمینان ہوا کہ وہ مکمل طور پر محفوظ ہیں اور انٹیکس کوئی ذمہ نہیں آیا تھا لیکن ان کے گھر سے پر موجود شہید پریشانی اور خوف کے آثار صاف دکھائی دے رہے تھے۔

"آئی ایم سوری سر! آپ کو یہاں آئی ناخوش گوار صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ میں اس معاملے کی مکمل تحقیقات کرواؤں گا۔ فی الحال تو موجودہ چھوٹیں سے سخت لوں۔ پلیز! آپ فوری طور پر یہاں سے روانہ ہو جائیں۔ آپ کی سیکورٹی اس وقت میرے لیے سب سے اہم مسئلہ ہے۔" ان تک پہنچنے کے بعد اس نے یہ چند جملے کہے جو انہوں نے شدید تا قواری کے تاثرات کے ساتھ سنے اور

ہوا جو اسے روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اب وہاں اس خودکش حملہ آور کو جوان اور فرض کی خاطر جان قربان کر دینے والے پولیس اہلکاروں کے جسم کے ٹکڑے اور خون انٹیکس میں خلاصہ پڑنے اس طرح نظر آ رہے تھے کہ ظالم اور مظلوم کے خون کا الگ الگ شیشہ نہیں کیا جاسکتا تھا لیکن خون کا وہ ٹلاپ پڑ جان خاموشی میں سوال کر رہا تھا۔

"آخر یہ سب کیوں ہوا؟ اس پھولے سے گاؤں میں ہونے والے قربانی کا سوس سے آٹھ سو تک لاکھ تھی کہ آگ و دھن کی ہولی جھیل کر اس خوشی کی تقریب کو لگ بھگ میں تبدیل کر دیا گیا؟" فی الحال ان سوالوں کے جواب کسی کے پاس نہیں تھے۔ یہ وقت ان سوالوں کے جواب دہوں کے لیے تھا ابھی نہیں۔ ابھی تو اس سب کو جانے کا سرحدور پیش تھا جو اس حادثے میں مکمل طور پر تباہ ہو گیا تھا۔ شہر پار کے حادثہ وہاں موجود دیگر بڑے داران بھی اس وقت اسی کام میں لگے ہوئے تھے۔ لوگوں کو جانے سے روکنا جاری تھا۔

ایس بی پی کے وزیر بھی اس وقت پوری طرح متحرک تھا اور اس کی حمایت پر پولیس والے روزے بھر رہے تھے۔ اس موقع پر اس نے عبداللہ کے حسن انتظام کو پوری طرح تحسین کیا۔ اس کا اسٹیج اور لوگوں کے درمیان فاصلہ بڑھانے کا فیصلہ اس وقت بہت کارآمد ثابت ہوا تھا۔ خودکش حملہ آور اس دور میں ایسا کسی کی طرف سے نہیں کرتے۔ وہ ان کی رہی پھلائی جیسے کے باوجود اس کی قربت پہنچ جانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا اور کسی وی آئی بی کی موت واقع نہیں ہو سکتی تھی۔ پولیس والے اور قریب موجود عوام میں سے جو لوگ زخمی ہوئے تھے، ان کی موت بھی یقیناً فحشونہ گ تھی لیکن خودکش حملہ آور اپنے اصل پرکٹ یعنی اسٹیج پر موجودی کو اپنی چیز کو نشانہ بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ اس اعتبار سے حفاظتی غریب کو سراہا جاسکتا تھا۔ حفاظتی کمپنی کی دوسری مثال وہاں موجود وہ ایس بی پی اور ایک فائر فائرنگ سیکورٹی کی صورت میں بھی موجود تھی۔ اگر چاہے کوئی اس میں یا فحشونہ موجود نہیں تھا کہ قریب کے دوران اس طرح کا کوئی واقعہ بھی آ سکتا ہے اس کے باوجود یہ سارا انتظام صرف اس وجہ سے کیا گیا تھا کہ لوگوں کے اتنے بڑے مجمعے میں اگر خدا خواست کوئی ناخوش گوار صورت حال پیش آجائے تو اس سے فوری طور پر نمٹا جاسکے۔ اس وقت یہ انتظام کام آ رہا تھا۔ شہید زخمی افراد کو ایس بی پی میں ڈال کر ہسپتال کی طرف روانہ کر دیا گیا تھا۔ اس کام کے لیے پولیس کی گاڑیاں بھی استعمال کی جاتی تھیں۔ دھماکے کے نتیجے میں جو آگ بجڑی

خطرناک غلطیاں

اس نیت سے کیا کہ صرف وہ چاہتے تھے کہ چھوڑ دوں گا۔
اپنا راز کسی کو بتا کر میرے شہید رکھنے کی درخواست کرنا۔
آزمائے ہوئے گروہ بارہ آورنا۔
اپنے کو سب سے زیادہ لائق اور مصلحت مند آدمی تصور کرنا۔
ہر ایک شہید کو دوسرے کو لینا۔
جو کام خود نہ کر سکے دوسرے کے لیے ناممکن خیال کرنا۔
بے کاری میں اکدم کے بے خیالی پڑنا۔
پاکستان اور خوش رہنا۔
اپنے والدین کی خدمت نہ کرنا اور اولاد سے اس کی توقع رکھنا۔

تھی اس پر بھی فائر بریکنگ والوں نے فوراً ہوا پالیا تھا اگر یہ آگ فوری طور پر نہ بجھائی جاتی تو بڑا مسئلہ بن جاتا۔

"سر! اب یہاں سے اٹھیں۔ یہاں آپ کے مزید ٹھہرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" کوئی دیر بعد یہ صورت حال پر کسی حد تک بڑھا چکا تھا۔ اہلکاروں نے اس کے قریب آ کر اس سے کہا۔ وہ بھی اس دوران متحرک رہا تھا حالانکہ اس کی پیشانی پر کسی نے کاڑھا ہوا گولہ لگنے کے باعث اچھا خاصا گہرا زخم لگ گیا تھا جس پر اس نے اپنا رومال نہ کر کے رکھنے کے بعد ان پر پانی کو پانی کی طرح پاشا لیا تھا۔ زخم سے اب بھی خون کا مونی سار سا جاری تھا۔

"میری گاڑی وہاں آگئی ہے کیا؟" اس نے چمک کر عبداللہ سے پوچھا۔ وہ گاڑی کی طرف اس کی گاڑی سے بھی زمینوں کا پتلا تک پہنچنے کا کام لیا گیا تھا۔

"میں سراسر اخبار میں خانہ آگیا ہے۔ ڈی ایس بی پی کے منظور کی طرف سے بھی یہ پتہ ہر جگہ کہ آپ نے جنت لوگوں کی گرفتاری کے احکامات دے دیے تھے وہ گارڈ کیسے جانچے ہیں۔" اس نے بتایا۔

"اور پھر تو ہمیں فوراً روانہ ہو جانا چاہیے۔" وہ اڑا جانے کے لیے راضی ہو گیا لیکن اسی وقت اسے میرے پاس کے چھوٹا نمونہ دیکھ لیا۔

"آپ اس حادثے کے بارے میں کیا کہیں گے؟"

ی صاحب ایہ دوری بار ہوا ہے کہ آپ کی طرف سے کیے جانے والے ترقیاتی کاموں میں رکاوٹ مٹائی گئی ہے۔ پہلے ہی آباد والے اسکول کو آگ لگ گئی اور اب یہاں سنگ بنیاد رکھنے کے موقع پر بھی اتنا بڑا حادثہ پیش آ گیا۔ آپ کیا سمجھتے ہیں، ان واقعات کے پیچھے کن لوگوں کا ہاتھ ہے؟ وہ کون لوگ ہیں جو ہمیں چاہتے کہ اس ضلع میں ترقی ہو؟ انہیں غر اور اور زمین نظر آنے والے میڈیا کے ایک نمائندہ نے دو مختلف واقعات کو جوڑ کر اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ ایسے ہی سوالات اسے غلامی نہیں سمجھتے۔ واقعی حالات ایسے ہی تھے کہ گت تھا۔ کوئی اسے ان ترقیاتی کاموں سے روکنے کی کوشش کر رہا ہو، یہ آباد والے واقعے کے پیچھے موجود شخص کو تو اس نے شہادت بھی کر لیا تھا کہ چودھری انکھار کے علاوہ کوئی یہ حرکت نہیں کر سکتا لیکن نور پور میں پیش آنے والے حادثے نے اسے الجھا دیا تھا۔ اتنی بڑی سازش جس میں باقاعدہ ایک دفاتی وزاردی کی ممتاز شخصیات کوٹھ نہ جانے کی کوشش کی گئی تھی، اسے تیار کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی جرات کرنا چودھری نے قہ سے کچھ بڑا کام محسوس ہوتا تھا۔

”اس حادثے کے پیچھے کون ہے، یہ تو فی الحال میں نہیں کہہ سکتا لیکن وہ جو کوئی بھی ہے اس سمیت میں ہر فرد کو یہ پتہ ضرور دینا چاہتا ہوں کہ پھر آباد والا اسکول کس طرح تباہ ہونے کے بعد دوبارہ تعمیر ہو گیا ہے، وہی طرح کوئی دوسرا پراجیکٹ بھی ہرگز ختم نہیں کیا جائے گا۔ سازشیں کرنے والے سازشیں کرتے رہیں، تعمیر کرنے والے ہاتھ تعمیر کرنے سے نہیں گھٹیں گے۔ ہمارا مشن اس ضلع کی ترقی تک جاری رہے گا۔“

”لیکن میرا پھر بھی آپ یہ بتائیں۔“

ایک اور نمائندہ نے اس سے سوال کرنا چاہا لیکن اس نے ہاتھ اٹھا کر اشارے سے روک دیا اور بولا۔ ”آپ کو اس حادثے کے بارے میں جو کچھ جانتا ہے، وہ انہیں ہی صاحب سے معلوم کریں۔ مجھے جو کچھ تھا، وہ کچھ چکا ہوں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ میرا بیٹا اسے اچھا خاصا زخمی ہے۔ خود مجھے بھی پوچشیں آتی ہیں پھر مجھے دوسرے بھی بہت سے معاملات دیکھتے ہیں۔ اس لیے پلیز، آپ لوگ مجھے اجازت دیں۔“ اس کے بعد وہ مزید وہاں نہیں رکا اور عبدالمنان کے ساتھ اس جانب بڑھ گیا جہاں اس کی گاڑی کھڑی تھی۔

☆☆☆

”کہاں چل رہے ہو؟ آپ کے بیٹے یا آفس؟“ وہ لوگ نوکوت کی حد وہیں داخل ہو رہے تھے جب مشاہیر

خان نے یہ سوال کیا۔
”تھانے چلو لیکن اس سے پہلے گاڑی کسی میڈیکل انسور کے سامنے روک کر ڈیم کی ڈریسنگ کے لیے سامان خرید لیں۔“ عبدالمنان کی پیشانی پر نکلنے والے زخم سے خون کا کافی اخراج ہوا ہے، اس کا ٹھوٹہ اس کے ماتھے پر پانی کی شکل میں بندھی ہوئی مٹی سے بھرنا تھا۔ زخم پر رکے دو بال میں لپٹتا حریہ خون جذب کرنے کی کوشش باقی نہیں رہی تھی اس لیے اوپر سے ہاتھ مٹی کی مٹی بھی خون سے تر ہوئی تھی پھر بھی وہ کمال ہمت کا مظاہرہ کرتا رہا تھا۔ اپنے زخم کی طرف سے یہ پتہ پڑا ہوا کہ اس نے نور پور میں بھی بھر پور کارکردگی دکھائی تھی اور سڑک کے دوران بھی اپنے کسی انداز سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ تکلیف میں مبتلا ہے۔ اس وقت اس نے مشاہیر خان کو جو ہدایت دی تھی، وہ عبدالمنان کی حالت کے پیش نظر تھی۔ مشاہیر خان نے اس ہدایت پر عمل کیا اور پہلے ٹھانے والے میڈیکل انسور کے سامنے گاڑی روک کر بیٹھے اور اس اسی وقت اس کے موبائل پر کال آنے لگی۔ اس نے سواہش نکال کر اسکرین پر آنے والا نمبر دیکھا۔ وہ عباد رانا کی کال تھی۔ اس نے کال ریسیو کر لی۔

”ہیلو شہر بار کیا حال ہے؟ میں بہت اہم سے تم سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن کال مل ہی نہیں رہی تھی۔“ اس کے پہلو کہنے سے بھی پہلے عباد رانا نے یوں شروع کر دیا، وہ بہت پریشان لگ رہا تھا۔ شہر بار کو اندازہ ہو گیا کہ ان تک حادثے کی اطلاع پہنچ چکی تھی۔ اب ہو بھی تھا۔ وزیر صاحب کی سواری بہت پہلے نور پور سے تشریف لے جا چکی تھی۔ ان کے ساتھیوں نے راستے میں ہی ان پر فورن کر کے اس حادثے کی خبر پہنچا دی ہوگی۔ پھر یہ بھی ممکن تھا کہ میڈیا کے افراد میں سے کچھ نے یہ کارنامہ انجام دیا ہو۔ اپنے چیخیں اور اپنے اخبار سے خبر کو پہلے منظر عام پر لانے کی جو دوڑ لگی ہوئی تھی، اس میں سبقت لے جانے کے لیے وہ لوگ آؤٹ آف دی ویسے جا کر بھی کام کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں عباد بھائی! میں جس گاڑی میں تھا وہاں موبائل سروس کام نہیں کرتی اس لیے آپ کا مجھ سے رابطہ نہیں ہو سکا۔ اب ہم لوگ نوکوت پہنچ گئے ہیں اس لیے آپ کی کال مل گئی ہے۔ آپ بے فکر رہیں، میں واپس ٹھیک ہوں۔“ آخر میں ممانی کو بھی میری طرف سے تسلی دینے کا۔ ”اس نے ظہیر سے ہوئے لیٹے میں ان کے سوال کا جواب دیا۔

”مٹی کو تو ابھی اس حادثے کے بارے میں خبر ہی نہیں

ہوئی ہے۔“ جیسے معلوم ہے کہ وہ بی وی کم ہی دیکھتی ہیں اور میں نے اور ڈیڑی نے جان بوجھ کر انہیں پوچھنے سے روک دیا۔ تم سے رابطہ ہو جائے جب ہی انہیں اطلاع دیں گے ورنہ وہ پریشان ہوتی رہیں گی۔“

”آپ نے بہت اچھا کیا۔ ابھی میں ویسے بھی بہت مصروف ہوں۔ فی الحال مجھے نوکوت تھانے پہنچ کر کچھ لوگوں سے گفتگو ہے۔ امید ہے کہ میں اس حادثے کے ذمے داران تک پہنچ جاؤں گا۔“ مشاہیر خان میڈیکل انسور سے مطلوبہ چیزیں خریدنے کے بعد وہاں پلٹ رہا تھا۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے عباد رانا سے یہ جملے کہے۔

”کیا مطلب۔“ جیسے کوئی کلمہ اسے کیا؟ عباد رانا چونکا۔ ”کیا ہاں، ایسا ہی سمجھ نہیں۔“ اس نے تسلی جواب دینے سے گریز کیا۔

”کی کینئر فل شہر بار! اس لیے بھی تم پر ایک قاتلانہ حملہ ہو چکا ہے۔“ آج کے حادثے میں بھی میں نے سنا ہے کہ جیسے مجھ چوٹیں آئی ہیں۔ جو کچھ کرنا احتیاط سے کروا کر مجھ سے مشورہ لے لیا۔ تم تنہا رانا نقصان ہرگز بھی برداشت نہیں کر سکتے۔“ عباد رانا نے جذباتی لہجے میں کہا۔

”میں خیال رکھوں گا۔ آپ میری قلمت کریں۔ مجھے جو زخم ہے، وہ بہت معمولی نوعیت کے ہیں۔ البتہ مجھے اس حادثے میں زخمی ہونے والے مصوم دیہاتیوں کی بہت فکر ہے۔ یہاں کے اسپتال میں بھی سبکس بہت کم ہیں۔ نہیں ڈیپول کو لا کر اس کے بڑے اسپتال میں شفٹ کرنا ہوگا۔ میں نے درخواست کی تو بے کار شدہ زخمی افراد کی منتقلی کے لیے زبلی کا پھر فراہم کیا جائے لیکن ابھی تک ایسی کوئی اطلاع نہیں مل کر چلی کا پھر آ رہا ہے۔ آپ ذرا ذاتی طور پر اس معاملے کو دیکھ لیں۔“ شہر بار نے عباد رانا سے درخواست کی۔

”اوکے، میں دیکھ لیتا ہوں۔“ دینے نہیں خود بھی معلوم ہے کہ اس طرح کی کارروائی میں کچھ وقت تو لگ جاتا ہے۔ پھر حال، میں دیکھتا ہوں کہ کیا ہو سکتا ہے۔ میری کوشش ہوگی کہ کبھی کا پھر کے ساتھ کچھ ڈاکٹر ز اور ضروری میڈیسنری سہجوا دی جائے۔“

”جیک بیری کی آکر ایسا ہو جائے تو بہت اچھا ہو گا۔“ وہ خوش ہو گیا اور عباد رانا کا کھنچے اور آکر تے ہوئے نوں بند کر دیا۔ اس منظر کے دوران مشاہیر خان نے اس کے اشارے پر گاڑی کارن نوکوت تھانے کی طرف کر دیا تھا اور اب وہ لوگ تھانے پہنچنے والے تھے۔

”مجھے تھانے ڈراپ کرنے کے بعد تم عبدالمنان

صاحب کے زخمی کر دیں گے اور یہ تک کرنا اور پھر انہیں لے کر اسپتال چلے جاتا۔ "اُس نے پہلے مشاہیرم خان کو جہالت دیں پھر عبداللہ خان کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ "مجھے احساس ہے کہ تم کافی تکلیف میں ہو لیکن اس موقع پر کبھی ذرا سرخواری کا دورہ کرنا ضروری ہے تاکہ لوگوں کو کھلی دینی جائے۔ وہاں اس وقت کھرا ہوا ہو گا۔ میڈی والے الگ تختیہ کے مواقع ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ اگر مجھے اس وقت تمہارے چیلنج کی جلدی نہیں ہوتی تو میں خود اسپتال جاتا۔"

"میں بلا جاؤں گا سر! آپ مجھے شرمندہ نہیں کریں۔ میں اتنا زیادہ زخمی نہیں ہوں بلکہ آپ کو شاید مجھ سے زیادہ تپ چھوٹی آتی ہیں۔ مناسب ہو گا کہ مجھ سے پہلے آپ زخموں کی ڈریسنگ کرادیں۔"

"میں فی الحال اس کی ضرورت محسوس نہیں کر رہا۔ معمولی طبیعت کی خراشیں ہیں جنہیں بعد میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ اس وقت مجھے۔ خود سے زیادہ اس سارے معاملے کو پینڈل کرنے کی فکر ہے۔ اس وقت تو میں اس بات کا فکراؤ کر رہا ہوں کہ ماسٹر آف آپ کو پیش آنے والے حادثے کے بعد میں نے نوکوت اسپتال میں طبی سہولیات کو بہتر بنانے کے لیے فوری طور پر چند اقدامات کرنے کا ارادہ رکھا تھا، اس لیے امید ہے کہ زخموں کو فوری طور پر کچھ مناسب طبی امداد ملے گی ہوگی ورنہ جو صورت حال پہلے کی موجودہ حالات میں تو اس کے بہت بھیا بھکا نتائج نکلتے۔" اسی طرف سے تسلی دیتے ہوئے اس نے اسپتال کی بھڑی کے لیے کیے جانے والے اقدامات پر شعراؤ کیا۔ اسی وقت گاڑی نوکوت خانے کے سامنے جا کر۔ مشاہیرم خان نے تیزی سے گاڑی سے اتر کر پچھلی طرف کا دروازہ کھولا۔ دو گاڑی سے اتر کر اپنے مخصوص پے نیاز انداز میں خانے کی عمارت کی طرف بڑھ گیا۔ خون کے دھبوں اور مٹی کے ٹکڑوں نے اس کے لباس کو اچھا خاصا خراب کر دیا تھا لیکن اس اصرار سے کہ جو وہ اس کی طبیعت کا دھارہ تھا۔ ڈوبی ہوئی موجود سیاسی نے اسے کچھ کر سلیپ سے مارا۔ گردن کی خفیفی کی جنبش سے اسے جواب دیتے ہوئے دو اندر چلا گیا۔ ایس اچاؤ کے کمرے کے باہر ایک سیاتی کھڑا تھا جس نے اسے سلام کرنے کے ساتھ دروازے پر پڑی جی اٹھا کر اسے اندر جانے کا راستہ دیا۔ کمرے میں ایس اچاؤ کے بجائے ڈی اینس پی منگور موجود تھا جس نے کرسی سے اٹھ کر اس کا استقبال کیا۔

"آئیے سر! مجھے یقین تھا کہ آپ جلدی فرصت میں ان کا رخ کریں گے اس لیے میں خود یہاں موجود ہوں۔"

ایس ایچ او کی مصیبت کے ساتھ میں نے اسپتال پر پڑائی لگائی ہوئی ہے۔

”کہاں ہیں وہ لوگ؟“ اس کی بات پر کوئی تبصرہ کیے بغیر اس نے براہ راست سوال کیا۔

”اندر ایک کمرے میں بند ہیں۔ آپ کہیں تو انہیں یہاں بلاؤں؟“ ڈی ایس پی نے مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پیش کیا۔

”نہیں، انہیں یہاں لانا مناسب نہیں۔ میں ان لوگوں کی گرفتاری کو منظر عام پر نہیں لانا چاہتا۔ ہمیں خود اس کمرے میں جانا چاہیے جہاں ان لوگوں کو رکھا گیا ہے۔“

اس نے سمجھدی سے جواب دیا تو ڈی ایس پی بولا۔

”مجھے انداز ہے سر کہ یہ کچھ خاص افراد ہیں۔ میں نے آپ کی ہدایت کے مطابق ایس ایچ او کو سخت تاکید کر دی کہ کسی کو ان لوگوں کی گرفتاری کی خبر نہیں ملنی چاہیے۔ تھانے کے محوڑے سے مجھے کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ کون لوگ گرفتار کئے گئے ہیں۔ محلے میں سے بھی میں اس ضمنی افراد کو معلوم ہے جو ریڈ وٹ ایس ایچ او کے ساتھ موجود تھے۔ یہاں تو ان کے منہ چادر میں لپٹ کر انہیں لایا گیا ہے۔“

”ڈی ایس پی نے آپس کی ملازمت میں ایک مدت گزارائی تھی۔ وہ دیکھتے انداز میں دیکھ کر دھوکے کے فوراً بعد اس خاتون کی گرفتاری کا حکم دیا گیا تھا۔ اس کا حادثہ سے ہوئی نہ کوئی کھرا سچ ہے۔ شہر یادی سے اسے چھپے نفلوں پر چھلک کر ایک پوشش کو روکنے کا موقع ملا تھا۔ اس کا میاں مارے میں ایک مجرم ہاتھ چاٹنے کی وجہ سے جو سب سے اہم مشافہ ہوا تھا۔ وہ قاریت آفیسر اقبال باجوہ کے اس جرم کا شریک ہونے کا قمار۔ درون خانہ اقبال باجوہ کی گرفتاری کا مسئلہ ہو چکا تھا اور ایک آدھ دن میں یہ کمزور کیا جاتا۔ وہ جو نہیں کھس کے بعد ہی اچھا خاصا مشہور ہو گیا تھا اور اس کے ملوثین انجام سے اپنی ترقی کی امید ہاتھ سے بیٹھا تھا۔ ایک کہیں کی کامیاب تحقیق کا سہرا بھی اسے سر بندھے ہوئے تھا۔ جس کے بعد اس کی ترقی پختی تھی۔ شہر یادی سے اس قدر دن کے چھپے بھی اپنی ترقی کا لالچ ہی کا کارہ تھا۔ وہ نہ کہ ان کا میاں ہی نہ ساتھ شہر یادی کی حمایت اس کی ترقی اہم کردار اور رکھتی ہے۔

وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے تھانے کے اس سے تک پہنچے جہاں ذہین محمد اور اس کے اہل خانہ موجود تھے۔ کمرے کے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ ڈی ایس پی نے لاک کھول کر دروازہ کھولا۔ دیکھ کر کہیں

درد کرے میں اس کے پیچھے داخل ہوتے ہی شہر یا کوئلہ اڑو ہو گیا کرتا ہے۔ کایہ کر اور اسل وہ قوت خانہ تھا جسے عرف عام میں ڈرامنگ روم کہا جاتا ہے۔ کمرے میں تنہا کے کئی آلات دیواروں پر لٹکے نظر آ رہے تھے جن میں کئیوں کی رکتی، پلاس اور رے سمیت کی اشیا موجود تھیں۔ چست میں دو اکٹڑے بھی موجود تھے جن سے یقیناً طوطاں کو الٹا لٹکا کر ان سے پوچھ بچھ کی جاتی تھی۔ اسی کمرے میں دین محمد، اس کا بڑا بیٹا اور اس کی بیوی سبے ہوئے ایک دیوار کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان تینوں کے ہاتھوں، پیروں میں جڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ سٹینا اس بند کمرے میں جہاں اس درد وازے کے سوا اس کے باہر تانا کا ہوا تھا کوئی دوسرا لٹکا کر راستہ نہ ہونے کے باوجود اس قدر رستیاہ کی محنت کی کہ وہ تینوں اپنی جگہ سے ہٹ نہیں سکتے تھے۔ شاید ہی ایسی بی نظور زیبا و ی ایلی تھی دکھانے کے پلہ میں تھا۔ ایلی تھی دکھانے کے چہرے میں ہی وہ اس سے پہلے نور پر سے نکل کر اس خانے میں آ بیٹھا تھا اگر گرفتاری کا کام کرنے والے ایس ایچ اے کو اس طرح چلتا کیا تھا کہ اتنی سی کمین سیل کی پالی بھی خود اپنی جیب میں رکھ لی تھی۔

”تھیک پو ڈی ایس بی صاحب! آپ نے میرے مطلوبہ بندے کو تھک پچھار دیا، اب میں خود ان سے بات کر لوں گا۔“ کمرے میں موجود خف زو نفردوں کے چہروں کا جائزہ لیئے ہوئے اس نے ڈی ایس بی سے یہ جملہ کہا تو وہ اس کا اشارہ سمجھ کر ٹھٹھک گیا۔ لیکن ظاہر ہے، عدم صاف آخاف تو نہیں کر سکتا تھا اس لیے کچھ مایوس سا درد وازے کی طرف چلت گیا۔

ڈی ایس بی نے کہا کہ یہ لکھنوی سی طرح آپ کے سوا لوں کا جواب نہ دیں تو مجھے بلا لینیجے گا سراسر ہم پولیس والوں کی زبان ایسے لوگوں کو یاد دلائیگی طرح سمجھ آ جاتی ہے۔ میں ایک سیاہی کو اس کمرے کے درد وازے کے باہر کھڑا کر دیا ہوں۔ آپ جیسے ہی اشارہ کریں گے، وہ مجھے آپ کا بیٹا نام پچھائے گا۔“

”اس کی ضرورت نہیں... اور ہاں! پلجڑا جاتے ہوئے درد وازہ بند کر دیجیے گا۔“ قدرے دکھائی سے اسے جواب دے کر اس نے وہاں موجود دو کرسیوں میں سے ایک کرسی اٹھا کر دیوار کے ساتھ بیٹھنے ان تینوں افراد کے مقابلہ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ پیچھے درد وازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی جس سے اندازہ ہوا کہ ڈی ایس بی اپنی ہاتھ پر لٹک چکا ہے۔

میں دیکھتے ہوئے اس نے ہاتھ لپیٹ کر اس سے سوال کیا۔
 ”کون؟“ عبدالمعین نے اس کی توہمیں کچھ خیر نہیں ہوئی۔
 جب سے ہمارے ساتھ وہ ملاش ہوا ہے امدائیں لپ سا
 ہو گیا ہے۔ کئی کئی دہرے لپ آتا۔ کام چاتا بھی پورا چکا
 ہے۔ میں کچھ ہوں تو غصہ کرنے لگتا ہے۔ وہ اثر ہوا ہے اس
 کے دماغ پر بہن کے افواہ اور لپ کا۔ کسی سے سیدھے حرات
 نہیں نکلتی کرتا۔ پورے دیر کوئی آکھلوں سے یہ جواب دیتے
 ہوئے کراہک پھٹک رہا تھا۔
 ”قل؟“ وہ دیر کوئی بات نہ کر چکا۔
 ”جی ہاں قل۔ اس کے افواہ کے دوران بعد میں اس کی
 ٹوپی کھنٹی ہوئی لاش جنگل کے باہر پڑا ہوا تھی۔ ہمیں
 دالوں کے پاس رپورٹ کرنے سمجھے تو ہمیں نے الاہری
 معصومہ دھڑپری الزام لگا کر وہ اپنے کی عاشق کے ساتھ
 بھاگ گئی تھی اور اسی عاشق نے اپنا ٹکٹل (مطلب) پورا
 کرنے کے بعد اسے چھکا کر دیا۔ دیکھتے تھے بھار
 پھر پتا ہے اور تو جان یو جو کراخا (خانوہ) یو لپ کا کیم
 (نام) کر برد کر رہا ہے۔ انہوں نے مجھے دھکی دی کر اب
 بھول کر بھی اسے یہ صاحب کے پاس سنا جاتا رہے تھے اور
 تیرے دونوں بیٹوں کو کچھ کرتے تھے میں بکریوں کے اور
 جو کچھ تھا باقا۔ اسے سن کر اس کا دماغ ٹوٹنے لگا۔ اسے
 اچھی طرح یاد تھا کہ اس جس کے معاملے میں ایس بی ٹی
 نے اسے کیا پرنٹنگ دی تھی؟ اس نے کہا تھا کہ وہ میرے
 خود اپنی بیٹی کے افواہ اور لپ کا ذکر کر رہا تھا ہے وہ اس کی
 بیٹی زبردستی کی شادی سے بچنے کے لیے اپنے ایک اٹکے
 ساتھ بھاگ گئی تھی اور اس نے ہی اپنے اٹکے ساتوں کر
 اپنے ہاں باپ کو لوٹ لیا تو اس نے بیٹی سے خود دیر کے
 کردار پر بھی شک کا اظہار کیا تھا اور یہ الزام لگایا تھا کہ میں
 محمد نے اپنی بیٹی کو قتل کرنے کے دھوکے کی پھیل بہن
 سے بیاہر چاہا تھا لیکن اب نہ محمد ایک بال مختلف بات بتا
 رہا تھا اس کے بیان سے تو بجا بھر تھا اس غریب کا تاج
 نقصان بھی ہوا اور انا اسے زرا دھکا کر دیتے تھے کہ اسے
 بھی روک دیا گیا۔ میں محمد کے اس بیان کو بھٹک بھی سمجھا نہ سکا
 تھا لیکن اس کے جھڑپوں زور پیر سے پڑوہ کی خبر ہوئی وہ
 اس پر کرنے والے ظلم کی جان بہت صاف طور پر باری
 تھی۔ اگر وہ اس وقت اپنی خود شادی کے سفر پر تھا تو بھی
 کرتا تو بہت سی باتیں اٹکے میں جن کا بنیاد یہ خواہش
 ملکہ ظہر تھی۔ ایس بی ٹی نے تو یہ بھی اپنی کیا تھا کہ اس

دن قبل ایک ایسا ڈراما کھلایا جا چکا تھا جس میں ڈاکوؤں کے
 حصے کی نہ صرف کل اوقات اطلاع کی گئی تھی بلکہ پورے کوئٹہ میں بھی
 بنایا گیا تھا۔ اس وقت اس نے یہ بات اس لیے نظر انداز کر
 دی تھی کہ وہ سمجھ رہا تھا کہ ڈاکے کا ڈراما جنگل سے کی جانے
 والی اسٹینٹنگ کی طرف سے اس کا بھانپنا ہٹانے کے لیے کھلایا
 گیا ہے لیکن اب یہ بات سمجھ آ رہی تھی کہ ڈرامے بھی تو کسی نہ
 کسی حقیقت کی بنیاد پر ہی کیے اور بنائے جاتے ہیں نہ
 سارے واقعات اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر رہے تھے
 کہ پولیس اور ڈاکوؤں کا ٹکڑ جوڑ بہت مضبوط ہے اور وہ وقت
 ضرورت ایک دوسرے کی پشت پناہی کرتے رہتے ہیں۔
 ”جس میں ہری می کی لاش کی عید اہلین پانگل ساہو
 گیا۔ آپ نے خود دیکھا ہے اسے کہ وہ کتنے تیز مزاج کا منڈا
 ہے۔ ہم دونوں میاں بیوی تو دہی کا ٹم بھول کر اسے ہی
 سنبھالنے میں لگ گئے۔ وہ کسی طرح نہ بٹھنے پر راضی نہیں
 ہوتا تھا، ہر وقت مرنے مارنے کی کل کرتا تھا۔ پولیس والوں
 کے لیے تو اس کے بی میں اسی نفرت بیٹھی تھی کہ اس کا پس
 نہیں چلتا تھا کہ کسی طرح تھے بچنے کر ان سب کو جان سے
 مار دے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میں نے اس کو شہنواز
 صاحب کے پاس بھیجا کہ کسی طرح وہی آکر عید اہلین کو
 سنبھالیں۔ ہم قریب نوگ ہیں اگر وہ پولیس والوں سے جا کر
 بچ جاتا تو ان کا کیا بگاڑ پاتا۔ انا نہیں ہی نقصان پہنچتا۔
 شہنواز صاحب دسے پچھلے آدمی ہیں۔ میری گزارش پر
 انہوں نے عید اہلین کو سمجھایا بھنجا پھر اسے اپنے ساتھ ہی لے
 گئے۔ وہ ان کے پاس سے واپس آیا تو سنبھل چکا تھا لیکن پھر
 اس کے بعد اس نے بولنا چاہا۔ شہنواز صاحب سب چھوڑ دینے کی
 کئی دن گھر سے غائب رہ گئے۔ اب بھی کئی دن گزرے وہ
 گھر نہیں آیا۔ کیا آپ کے پاس اس کی کوئی شکایت آئی ہے؟
 کہیں وہ یہاں تھا ہے تو نہیں سمجھ گیا تھا؟ اگر اسی نے پولیس
 والوں کے ساتھ کوئی بدتمیزی کی ہے تو میں اس کی طرف سے
 آپ سے مافی (معافی) مانگتا ہوں۔ جوان خون ہے۔ بہن کی
 ذلت بھری موت کا ہم بھول نہیں جاتا۔ اگر اپنی اس دیوانی
 میں وہ کوئی غلطی کر بیٹھا ہے تو آپ لوگ اسے ماف (معاف)
 کر دیں۔ اب کی داری میں اسے تے میں بند کر کے رکھوں
 گا۔ وہ گھر سے نکل ہی نہیں سکے گا تو یہاں کس طرح پہنچے گا۔
 بس آپ ایک داری اسے ماف کر دیں شاید بچے بچڑ سے ہوئے
 انہوں کو ہاتھ کر دیتے ہوئے وہ شہنواز سے درخواست
 کرنے لگا۔ وہ اسے کیا جواب دیتا؟ ابھی چند کھینچنے کی تو
 اس نے عید اہلین کے صحت مند وتوان جسم کو ایک دھماکے کے

ساتھ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نکھرتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ جس کو
 تالے میں قید کر کے رکھنے کی بات کر رہا تھا وہ تو زندگی کی قید
 سے بھی نجات پا چکا تھا۔ اب چاہے یہ یوز حاسبے ساتھ
 ہاتھ کر کسی کے سامنے کتنی ہی کڑوا جائے اس کا بیٹا لوٹا نہیں
 سکتا تھا۔ وہ وہن میں پیدا ہونے والی بہت سی انجمنوں کے
 ساتھ رہتے ہوئے دین گمر کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی بیوی
 بھی رونے کے اس عمل میں اس کا ساتھ دے رہی تھی جبکہ
 سزا و اٹھارہ سال اس میں جھکے افسردہ سا بیٹھا تھا۔ وہ پورا
 منظر ایک لمبے پٹے خاندان کا تھا اور اس خاندان سے کسی
 طرح بے امید نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ اپنے بیٹے کے فعل میں
 اس کے شریک رہے ہوں گے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ
 آخر عید اہلین کیسے یہ حرکت کر بیٹھا؟ بھینا کوئی ایسا تھا جس
 نے اس کے اندر چھپے نفرت کے ذریعہ کو پیدا ہمار کرات اس
 کام کے لیے راضی کیا تھا۔ اسے ہاتھ کا جب وہ دین گمر کی
 بیوی کے غواہ ہونے کے بعد اس کے ساتھ اس کے گھر گیا تھا تو
 عید اہلین اس وقت بھی بہت پر افرورفتہ ہو رہا تھا۔ اس نے
 اس کے منہ پر اس سمیت حکومت کے تمام افراد کو اپنی اور
 بے ایمان قرار دیا تھا۔ اس کے نزدیک وہ سب ڈاکوؤں سے
 ساتھ شامل تھے۔ اس کے اس اصرار کو اس لیے غلط نہیں کہا جا
 سکتا تھا کہ پولیس کی مدد تک وہ یہ بات صاف اظہار ہی نہیں۔
 ایک ٹوکر، چڈ پانی ٹرک کے دل میں بھی بدگمانی اور نفرت
 سے غلام و تھا کر اسے خود کو شہل سے پر راضی کر لینا کوئی مشکل
 کام تو نہیں تھا۔ اسے اس کام کی ترقیب دینے والے نے اس
 سے کہا ہو گا کہ تم جو کچھ سوچتے ہو، باطل درست ہے۔ یہ
 سکر اس ہی ہیں جو تم پر گزرے ظلم کے ذمے دار ہیں۔ چنانچہ اور
 جا کر ان میں سے چھوٹو کو تم اڑا کر اسے ہوا زار دے دو سکتے کہ
 اسے بھڑکانے والے نے اسے یہ بھی امید دلائی ہو گی کہ
 موجودہ ظالم حکمرانوں سے نجات پا لو گے تو ان کی جگہ نئے
 اچھے حکمران آئے گی امید ہے۔ گاؤں کے کھدوہ داخل میں
 زندگی گزارنے والا تو عمر تو کا تھوڑی سی ہی برین داشتک کے
 بعد اس کام کے لیے تھک چکا ہو گیا ہو گا۔ خاص طور پر اس لیے
 بھی کہ خود اس کے اندر فیض اور نفرت کا جو لہر ابھڑ رہا
 تھا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اس کی اس کیفیت سے فائدہ
 اٹھا کر اسے آلے کار بنانے والا کون تھا؟ وہ کوئی ایسا شخص
 نہ تھا جس کی بات اس کے لیے اہم اور قاضی احترام ہو
 کیونکہ بہر حال اپنی جان سے گزر جانا کوئی آسان کام نہیں
 ہوتا۔ میدان میں جذبہ شہادت لے کر جانے والا سادہ بھی
 اس امید کے ساتھ اپنی جان کا خزانہ پیش کرتا ہے کہ اس

قریبانی کے بعد اسے پہنچنے کی زندگی عطا کی جائے گی۔ ہو سکتا
 تھا عید اہلین کو بھی کسی نے ایسا ہی لالچ دیا ہو اور کہا ہو کہ
 جانوں کو قتل کرنا جین ڈوب کا کام ہے اور اس کام میں اپنی
 جان دے کر وہ کوئی کھانے کا سودا نہیں کرے گا۔ اس دنیا
 میں اس کے لیے کیا رکھا ہے؟ یہاں اس کے پاس تو کچھ ایسا
 کھانا تھا ہے، رات کا لباس اور پانچ۔ عزت بھی کوئی نہیں تو
 ہر ہے کہ وہ اس شخص کی کوئی زندگی کی جگہ ختموں سے بھری
 جنت کے حصول کے لیے کوشش کرے۔ اس ترکیب سے
 مدد یوں سے لوگ معصوم ذہنوں کو استعمال کر کے ان سے
 اپنے مقاصد حاصل کرتے رہے ہیں۔ تاریخ کے صفحات میں
 حسن صباح سمیت ایسے کی کر داتے ہیں۔ عید اہلین کو بھی
 ایسا ہی کوئی فتنہ پرور آدمی کر گیا ہو گا جس نے زمین نرم دیکھ
 کر آرام سے اس میں بیٹھنے کا جج ہو دیا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ وہ
 آدمی کون تھا؟ اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کے لیے اس
 نے ان تینوں کے چہرے کو نکلوا اور پھر اس کی نظریں اہلین
 کے چہرے پر جا کر ٹھہر گئیں۔ اس کی اور عید اہلین کی عروں
 میں تین سال سے زیادہ کا فرق نہیں تھا۔ اسے فرق سے مومنا
 لیکن بھائیوں کے تعلقات سے زیادہ فرق تین بڑا اور وہ ایک
 دوسرے کے قریب ہی ہوتے ہیں پھر اہلین اور عید اہلین تو تھے
 ہی کل دو بھائی۔ حزان کے فرق کے باوجود ان دونوں کی
 آنکھیں میں دوستی بولی چاہیے تھی۔ بہت زیادہ نہ کسی مگر اسی
 دوستی کا تو ان دونوں کے درمیان اسکان موجود تھا کہ والدین
 کے مقابلے میں اہلین، عید اہلین کی سرگرمیوں سے زیادہ
 واقف ہوتا۔ اس خیال کے تحت ہی اس نے ایک فیصلہ کیا اور
 دروازے کے باہر کھڑے ہائی کو دروازے کے اندر بلا دیا۔
 ”میں سرا“ وہ کسی کوشل کے جن کی طرح فوراً حاضر
 ہو گیا۔
 ”ان تینوں کی جھگڑاں وغیرہ کھول کر انہیں پانی پلاؤ
 اور اس کے بعد ان دونوں میاں بیوی کو اکیس آج او کے
 کمرے میں لے جا کر بٹھاؤ مجھے کچھ دیر اس لڑکے سے
 اکیلے میں بات کرنی ہے۔“
 ”چاہیے تو ذی انکس فی صاحب کے پاس ہیں سرا“
 ”تو ان سے لے کر آؤ۔“ چاہیے کے طے پر اس نے
 جھلا کر گھر دیا۔ اس بار وہ خاموشی سے باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر
 بعد وہ آیا تو اس کے پاس چاہیوں میں وہ پانی کی ساتھ اس کی ایڈ
 فائدہ اس کی دیانت کے مطابق اس نے پینچ ان تینوں کے
 ہاتھ پر آڑا دیے اور پھر تینوں کو پانی پانی پلا دیا۔ پانی پی
 کر وہ تینوں کو پانی پر کون نظر آئے۔ جانے کئی دیر سے وہ اس

طرح پیا سے تھے۔ خوف اور گریہ نے طلق میں حریف کانے کا
 دیے ہوں گے۔ اب جو پانی ملا اور ان کے ذہن کے دھن
 شہنواز نے ان سے نرم لہجے میں بات کی ان کی تھوڑی سی
 احوال پر ہمدردی ہو گی کہ صورت حال اتنی سنگین نہیں تھیں کئی دو
 اپنی گرفتاری کے بعد سے جھوٹے گھر ہے۔ چیر۔
 ”آپ دونوں اس سہائی کے ساتھ جائیں۔ میں میں
 سے تھوڑی دیر بات کر کے پھر آپ سے ملوں۔“ ان کے
 نرم لہجے میں دیے ہوئے حکم پر وہ دونوں خود سے
 قند بڑ تو نظر آئے کہ ہم انہوں نے اس کی ہم عید اہلین
 کی۔ ان کے باہر گھٹنے کے بعد وہ اہلین کی طرف متوجہ ہو گیا۔
 ”ہاں بھئی، آپ تہاؤ کہ عید اہلین کہاں ہے؟“ انہیں
 کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے اس نے پوچھا۔
 ”میں... مجھے نہیں معلوم۔“ وہ پھلکا۔
 ”یہ تو معلوم ہو گا کہ اس کی کن لوگوں کے ساتھ زیادہ
 دوستی تھی؟ گاؤں کے کئی لڑکوں کے ساتھ اس کا زیادہ اشنا
 بیٹھا تھا؟“ اس نے ایک دوسرے زاویے سے سوال کیا۔
 ”اس کی کسی سے بھی زیادہ دوستی نہیں تھی۔ وہ زیادہ
 اکیلے ہی رہتا تھا۔ عید اہلین تو اس سے سب سے ملتا تھا
 پانگل بھڑا دیا تھا۔ بس بھی کچھ ہوا تو اس کے پاس چلا
 جاتا تھا لیکن اب وہ ابھری نہیں تھیں۔ میں گیا تھا ان کے
 پاس عید اہلین کے بار سے بھی معلوم کر سکتا ہوں لے تا
 کہ وہ کئی روز سے ان سے بھی ملنے نہیں آتا۔“
 ”یہ شہنواز صاحب کیسے آدمی ہیں؟“ بار بار اس شخص
 کا منتظر میں ذکر کرتے پر وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔
 ”وہ بچے آدمی ہیں۔ چنڈے کی لڑکے ان کے
 پاس بڑھتے جاتے ہیں۔ انا نے انہیں اپنی معمولی زبان ہی
 ہے کہ افسر سے یہ افسر اہلین ان کی گئی چپ کر کے سن
 تے۔ عید اہلین بھی ان کی کھل سنتا تھا۔ یہ ہاتے اب وہاں
 چلا گیا ہے؟ اس نے شہنواز صاحب کو بھی اپنے بارے میں
 کچھ نہیں بتایا۔“ انہیں افسردگی سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے ذہن
 میں کچھ دیر بھی کا سا ہوا۔ اس بات کا بھی تو اس کا نوک
 عید اہلین کو بیکارے والا شہنواز ہی ہو۔ شہنواز وہ شخص تھا
 جس کا وہ اصرار کرتا تھا اور اس کی بات نہ مانو گی سے نہ بیتا
 تھا۔ ایسے شخص کے لیے اس کی برین داشتک کے اسے لفظ
 راہ پر جانا بہت آسان تھا اس کے ذہن میں ابھرنے والے
 اس خیال کو اس بات سے بھی تھوڑی سی کمی کہ شہنواز کا
 تاثر ایک بہت سی نیک اور بہتر شخص کا تھا لیکن وہ اب اس
 قاتلے گاؤں والے اچھی طرح نہیں جانتے تھے۔ وہ ان کے

اس سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے رکے بغیر آگے بڑھ کر اپنے
 کاٹھاروں پر بیٹھ فرمائے پھر بیوی کو اس کے آگے لگائی۔ اندھا بڑا
 پہنچے تک وہ ایک طرح سے فارغ تھا اس لیے اس نے
 موبائل نکال کر عبداللہ سے رابطہ کیا۔
 ”ابن عبداللہ! کیا پوچھتے ہیں؟“ رابطہ تو یہی
 اس نے سوال کیا۔

”خبر ملی سے کشمیر دشمنی افواہ کو یہاں سے منسوخ کرنے کے لیے یکنی کالج پورہ روانہ کر دیا گیا۔ اسپتال کو بند پوری مستعدی سے زمینوں کی خریدت میں مصروف ہے۔ ہاتھ لیے لوگ جنہیں ان کاموں کی شدید سے ادارہ گرد کے علاوہ اس سے جتنی کر کے ملے گی ہیں۔ جلد دینے کے لیے بھی بہت سے لوگ جمع ہو سکے ہیں۔ امید ہے کہ زیادہ نقصان اٹھائے بغیر معاملہ سبب ہو جائے گا۔“ عبداللہ خان نے رپورٹ دی تو انہی مددک علیہماں نقل ختم۔

آئے ہیں اس نے پوچھا۔

”اوپنی معمول کے مطابق۔ کسی اسٹوری کا خروج
نکالنے کے پھر میں دو لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں میں دھڑکے

رہے ہیں۔ مجھے بھی انہوں نے گھیر لیا تھا کہ اس حادثے کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ کہیں سے آئیں۔

اطلاع بھی مل گئی ہے کہ آپ کے حکم پر چند لوگوں کو گرفتار کیا گیا ہے۔ وہ جاننے کے لیے سہ جہین ہیں کہ کن لوگوں کو گرفتار کیا گیا ہے؟ ان کا اس عادی سے کیا تعلق تھا؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ اس وقت کہاں ہیں؟" امر نے بتایا تو وہ ایک گہرا سانس لینے لڑکھ گیا۔

پہلے یادی کے ساتھ اندھا بار بار ہوں۔ تھوڑی دیر بعد جارا کو پا کر براہِ راست نہیں رہے گا تم اپنے طور پر سہارے ملاؤ۔ گھٹے سے گھٹے ہیں۔ اگر غمزدہ ہو دو کھینچو اور بار بار تھوڑا سا جاکر ریست بھی کر سکتے ہو۔ اس کی صاحب کی سواری تعریف لائی ہے۔ انہیں بھی یہ دے داری سوئی جائیگی ہے۔" وہ دھمکے سے خود بھی متڑ ہوا تھا لیکن اسے عبداللہ خان کی طرف سے کچھ بھی اصل میں اس سے چاہا ہے۔ اسے دھمکے سے بچنا خاصا خون بوسہ تھا جبکہ اسے زیادہ زبردستی چھین کی تھی جو فی الحال تو چھین کی تھی جس میں اسے ہم تھا کہ ڈراما اسے بھی یہی ہے چھین اساتجنا کر لے گئیں۔

"میں تھک چکی ہوں برا آرام کی ضرورت محسوس نہیں کر رہا۔ بدقسمت خان نے بڑی مہارت سے یہ زبردستی کی ہے۔ اس وقت بھی وہ مجھ سے اجازت لے کر بھی ادا دے رہے ہیں۔" وہ دھمکے سے خود بھی متڑ ہوا تھا لیکن اسے عبداللہ خان کی طرف سے کچھ بھی اصل میں اس سے چاہا ہے۔ اسے دھمکے سے بچنا خاصا خون بوسہ تھا جبکہ اسے زیادہ زبردستی چھین کی تھی جو فی الحال تو چھین کی تھی جس میں اسے ہم تھا کہ ڈراما اسے بھی یہی ہے چھین اساتجنا کر لے گئیں۔

”اے اجدادِ اہلِ ایمان! میں سب سے پہلے تم کو خبر دیتا ہوں کہ تم کو اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں عطا فرمائی ہیں، ان سے اپنے آپ کو محفوظ رکھو۔ اور اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ تم کو ان نعمتوں سے محفوظ رکھے۔“

”میں شہر پار پہنچا کچھ روزا تو گیا ہے اس بات کو
 سمجھیں اعلیٰ مقامی ہوئی۔ اس وقت میں نے نہیں اس کے
 کال کے کرکھی ہے بات کرلو۔ تمہیں کہیں سے حادثے کے
 بارے میں خبریں ملی ہیں اور اب تمہارے لیے برطانیہ میں
 بھجے کر خود انہیں ملے دیں۔“ مجی درانے نے کہا اور پھر
 اسے فوراً ہی سو اہل مقامی آفرین کے آواز کی دی۔

”کہاں ہو شہریار بیٹا! تم ٹھیک تو ہو؟“ دیکھی ناں جیسی

”میں بالکل ٹھیک ہوں ممانی! آپ میرے لیے فکر مند نہ کیجیے۔“

”کچھ غم نہ ہوں؟“ کہنے کو سب سے زیادہ
پریشان کر رکھا ہے۔ تاہم پیش کی کوکری میں ہو کر اگلے
دھماکوں میں نہیں گھرا رہتا تھا۔ تم پریشان کرتے ہو۔ پھر دو
سب اور اسکی بیانی ”آج“ میں تمہارے ماحول سے کہہ کر
تھک رہے ہو۔ کی پڑیں سیت کر رہی ہیں۔“ وہ بھلا
پریشانی کی کئی نئی کیفیتیں بھی تجھ پر کھیل رہی تھیں اس
کے آواز میں جو کئی نئی کئی تھیں۔ ”تمہیں تم کو دور رہنی چاہی
ہو۔“ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ان کے دل میں اس کے لیے
کیا جذبات ہیں۔ اس لیے برا نہ بھر دیکھنے کیے میں بول۔
”اس موقع پر تم مجھ پر اطمینان سے دست کرنا

ہجے، فی الحال آپ پہ تلی رکھیں کہ میں بالکل خفک ہوں اور مجھے کچھ نہیں ہوا۔ جواب میں وہ پھر شاید جو بولی تھی کہ میں اب ان کی آواز نہ کر سکتا تھا کہ آواز ہی تھی اس لیے وہ ان کی بات سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

”جیسا سنوٹر آئے بند ہو گئے ہیں مافی جان اسے
آپ سے بعد میں بت کروں گا۔“ فوراً بلڈز میں سہولت
کہتے ہوئے اس نے اپنی کاپٹ دی۔ اب ہر تیسرا ان تک
اس کی بات صحیح طرح پہنچ گئی تھی یا نہیں لیکن وہ مزید اس سے
بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اس کے ساتھ وہیں
پارٹی موجود تھی۔ بے شک وہ لوگ یہ بات سمجھتے تھے کہ
زندگی میں سب ہی اس طرح کے رشتوں اور جذبات سے
بڑے ہوتے ہیں لیکن پھر بھی وہ ان کے سامنے اس طرح کے
اظہار سے بچنا چاہتا تھا۔ بعض عجب سے اوڑھے دار یا ہاسی
ہوتے کی مقامی ہوتی ہیں کہ انہیں اپنے جذبات کو کچل دیت
کچھ کام کرتے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا وہ اس لڑکی کو اپنے
دھن سے بھٹک کر... جس نے کبھی یا اس کے دل پر دست
نہی نہیں اپنے فاضل کی بجا آوری کے لیے کوشاں ہو سکتا
تھا؟ فالو اور مضمون فائٹ کے لہجہ و آواز میں اسے تو اتنی بھی
مہارت نہیں تھی جتنی کہ بھی خود سے اس لڑکی کی صحبت کے
امتزاج کی فرصت ہی نکال پاتا۔ وہ جس گروپ میں بیٹھا
ہوا تھا۔ اس نے اسے نازک جذبات کو بری طرح سمجھ کر
موقع ہی نہیں دیا تھا۔ اسے تو یہ بھی احساس تھا کہ منہ نہ
تکلیف نہ ہو جانے والی وہ لڑکی اس کے خون میں پیچھے سے
سراست کر چلی ہے اور ہر میل ہر خطر سے بے نیاز ہو کر
خبردار رہنے کی تحریک دیتی رہتی ہے۔ وہ تہی کا خواہش تھا
مگر اس خواہش کو اب اس میں ہٹا کر دینے کا سبب ماہر تھی،
ماتنی کی احوال سمجھ نہیں رہا تھا۔

لائی خنیالات میں کمرے آتھرا کر دوپٹا اٹھا بیٹھ گئے۔ اس کی نشان دہی پر چپ کا رخ اس طرف کر دیا گیا جہاں اس نے شاہناز کا مدد سوسکتا تھا۔ چپ مدد کے دروازے پر جا کر کہی تو اس نے دیکھا کہ وہاں بیڑا تالا پڑا ہوا ہے۔ یہ ایک عجیب کا اپنے والی بات تھی۔ اس کی معلومات کے مطابق وہ شاہناز کی رہائش گاہ میں تھی۔ اور وہ یہاں رہتے تھے تو چور کی دروازے پر تالا لگوانے کی اس کے سوا کوئی وجہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ خطرہ و جانپ کر چلے ہی فرار ہو جاتے۔

”تا تو زرو۔“ اس نے ایک سپاہی کو حکم دیا۔ اسی کے حکم پر سپاہی نے اس کے سر پر انگلی کے پٹ مارنے لگا۔ پٹ سے

کچھ دیر بعد وہ اپنی آیا تو اس کے ساتھ میں مرد اور ایک نوجوان لڑکا موجود تھا۔ وہ لوگ کچھ فوفو زرد نظر کر رہے تھے۔

”جیسے... اس نے انہیں اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ کچھ سڑکڑاہٹاں بیٹھ گئے۔“

”اس مرد سے کے مالک شادباز صاحب کے بارے میں کیا جانتے ہیں آپ لوگ؟“

”وہ ڈے چنگے آدمی ہیں سرہی ابراہم سے وہی چٹخ مرغی کل کرتے ہیں۔ دل کے بھی ڈے کھلے ہیں۔“ ایک شخص فوراً ہی اس کی تحریف میں دھبہ اٹھانے ہو گیا۔ یہ وہی راے گئی جو اس سے پہلے وہیں ٹھہری زبانی بھی سن چکا تھا۔

”آج وہ کہاں گئے ہیں؟“ قمر میں سے کسی نے انہیں یہاں سے جاتے ہوئے دیکھا تھا کہ دو کب گئے ہیں؟“ تفریقوں کے اس مسئلے کو رکھنے کے لیے اس نے فوراً ہی دوسرا سوال کیا۔

”وہ آج (آج) ہی تھوڑا گئے ہیں سرہی اودو تو وہاں سے گئے ہوئے ہیں۔ ان کے ساتھ میرے اور حضرت علی کے چتر بھی گئے ہیں۔ شادباز صاحب کہہ رہے تھے کہ ہمارے چتر ڈے زین ہیں۔ انہیں پور (لاہور) کے ڈے سے مدت میں داخلہ دوانے کے لیے لے گئے ہیں۔ وہ ہم نے بھی کہا کہ اس سے ٹانی کل بھڑا کیا ہوگی۔ اور وہ وہ دونوں پنڈے کے دوپے منڈاں کے ساتھ لڑتے بھڑاتے ہی بھڑتے تھے۔ اب پور میں رہ کر تعلیم ہی حاصل کر لیں گے۔ سارا خرچ شادباز صاحب نے خود اٹھانے کا وعدہ کیا ہے۔ وہ ڈے چنگے آدمی ہیں۔ وہ۔۔۔ اللہ ان کو لمبی میانی دے۔“ وہ شخص شادباز کو داما میں دینے لگا۔ بانی وہ افراد کے چہرے پر بھی ایسے تاثرات تھے جن سے ظاہر ہوا تھا کہ وہ اس کے ہم خیال ہیں۔ یقیناً شادباز نے ان کے ذہن کو بڑی طرح اپنی گرفت میں لے لیا تھا جب ہی وہ اپنے دونوں کو اس کے ساتھ اپنی دور پیچھے ہونے اور اتر دیکھیں ہوئے تھے۔

”شادباز صاحب دو دن سے لاہور گئے ہوئے ہیں تو ان کا مطلب ہے کہ وہ دو دن سے دھرم بھی بند ہو گا؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔ دھرم سے کی بات تھی اس سے یہ نقلی ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ وہ دو دن سے بند پڑا ہوا ہے۔ گاؤں کی اس دھول اڑائی فضا میں وہ دن کے عرصے میں عمارت کے اندر انہیں خاصی دھول مٹی بیچ ہو جاتی جاچے تھے انہیں انہیں جب وہ لوگ اندر کا جنازہ دے رہے تھے تو انہیں کسی سے پرگردی نہ نظر نہیں آتی تھی۔ یوں گتہ گتہ آج کسی نے مٹائی ہی ہو۔

”مرد۔۔۔ تو نہ نہیں تھا۔۔۔ دو دن سے بچے برابر یہاں پرست کے لیے کہہ رہے ہیں۔ بچوں سے پتا چلا تھا کہ آج کل شادباز صاحب کا کوئی پودہ بنا (سہماں) آیا ہوا ہے اور وہی ان لوگوں کو پر حصار تھا۔ جس ان سے بٹنے کے لیے بھی آیا تھا۔ انہوں نے بھلا دیا کہ ان کی طبیعت تمک نہیں ہے اس لیے کسی شے نہیں کھتے۔ میں نے براہیں مانا اور میرا واپس آ گیا کہ بعد میں لوں گا لیکن آج شام میں میرا چھوٹا بچہ پودہ پور ادر دھرم سے مٹی ہی رکا رہتا ہے، گھر واپس آ گیا کہ شادباز صاحب کے دوست واپس جا رہے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ دھرم سے کوئی لاکہ کر چلے جائیں گے اور چائیاں پور میں ہی شادباز صاحب کو دے دیں گے۔“ وہ شخص جس کی اس کے سامنے یہ سطور حضرت علی رضوانہ دی کی تھی، اس کے سوال کے جواب میں بتانے لگا۔ اس کے جواب سے اسے اندازہ ہو گیا کہ اسے کیوں صاف تھرا تھا؟ ساتھ ہی اس انداز سے کی بھی تصدیق ہوئی کہ وہاں شادباز کے بارہا کوئی شخص تعلیم تھا۔ تیسرا گھر، جس میں ”مولیٰ بستر“ کے ہوتے تھے، یقیناً گاؤں کے ان لڑکوں کے لیے مخصوص ہو گیا ہو گا تو قہار دھرم سے میں قیام کرتے رہتے تھے۔

”وہیں گھر کا جینا مہانتیں بھی تو نا ہے کافی ذہین اور فطنتی ہے۔ اسے اپنے ساتھ لے گئے شادباز صاحب۔“ دین گھر اور ایشی سے اسے جو معلومات سامنے ہوئی تھیں، ان کے مطابق عبدالحق کی طبیعت کا مالک ہونے کے باوجود شادباز کی بہت سستا تھا۔ اب اسے شادباز کے ساتھ لاہور جانے والے جن دو لڑکوں کے بارے میں بتا رہا تھا، ان کی بھی یہ خصوصیت سامنے آتی تھی کہ وہ بچہ بھگوان فطرت کے مالک تھے۔ یعنی شادباز کی خصوصیت تو بکا مرکز وہ تھے جس کی فطرت میں سرگرمی و جذبہ پائی اور فلسفہ موجود تھا۔ اس قسم کے بچوں کو اس نے یقیناً کئی خاص مقدمہ کے تحت ہی خود سے قریب کیا ہو گا۔ وہ مقدمہ کیا تھا، تو عبدالحق کے انعام سے بھی ظاہر ہو رہا تھا لیکن وہ مقدمہ بن کرنا جانتا تھا کہ عبدالحق کو اس کا کم پڑا سامنے۔ الا شادباز ان تمام باتیں ”اس کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا تھا کہ عبدالحق اس کے ساتھ نہیں گیا ہو۔“

”عبدالحق نے وہ پتلا کر تھے شادباز صاحب۔ اگر وہ ادر دھرم تو شاید اسے بھی اپنے ساتھ پور لے جاتے، یہ وہ تو کئی دنوں سے غائب تھا۔ دین گھر وہ چارہ تو خود اسے وضو پڑھتا تھا۔“ فطنتی نے جواب دیا تو وہ دھرم میں پڑ گیا۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ عبدالحق کوئی دن پہلے منظر سے اس

لیے ہٹا دیا گیا ہو کہ اس سے ایک بڑا کام لیا جاتا تھا۔ شادباز نہیں چاہتا ہو گا کہ بعد میں اس کی شناخت ہونے کے بعد کوئی اس کے پاس عبدالحق سے متعلق کچھ کہہ کرے آئے۔ کوئی آتا بھی تو وہ صاف کہہ سکتا تھا کہ مجھے خبر نہیں، میں تو نہیں تھا جب عبدالحق غائب ہو گیا تھا۔ وہ جن دو لڑکوں کو اپنے ساتھ لے گیا تھا، انہیں کسی جگہ پہچاننے کے بعد یقیناً واپس یہاں آنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن دین گھر اور اس کے گھر والوں کے پولیس کی حراست میں جانے کی خبر سن کر اس کا یہاں تعلیم سامی ٹھک گیا اور جلدی جلدی تمام مشکوک چیزوں کو آگ لگا کر یہاں سے بھاگ نکلا۔ جلدی کی وجہ سے اسے شراب کی بوتلوں کو ٹھکانے لگانے یا اس سے ترشگی کو درست کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا جس سے اس کی بدعقیدگی ظاہر ہو رہی تھی۔

”شادباز صاحب کے جو دوست یہاں غم سے ہوئے تھے ان کا نام معلوم ہے کہیں جتا؟“ اب وہ ان لوگوں کے ساتھ موجود دھرم کے کی طرف متوجہ ہوا۔

”نام تو نہیں معلوم۔ شادباز صاحب نے بتا دیا کہ وہ ان کے بہت اچھے دوست ہیں۔ ڈے عالم ہیں اور پور سے ادر دھرم تو انوں کے لیے رہنے آئے ہوئے ہیں۔ ہم تو انہیں مولانا صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔“

”ان کا علیہ کیا تھا... کچھ بتا سکتے ہو؟“

”میں نے سوچنا ہونے کہنا ڈے وہ بچے پور سے آدمی تھے۔ دھرم ڈر اسٹا تھا۔ انہیں سمجھتی تھیں۔ سر کے بال کچھ فطنتی سے تھے اور ڈر اڈی منڈی ہوئی تھی۔ آٹھوں پر چٹھہ لگی لگاتے تھے۔“

”میرا چھوٹا بچہ ہے۔ اس نے بالکل صحیح علیہ بتا دیا۔ وہ دو دن سے یہی ان کی خدمت کے لیے رہا۔ میں رک ہوا تھا۔“ فطنتی نے سچ میں دھرم دیتے ہوئے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”وہ کس کسے میں رکے ہوئے تھے اور کب سے یہاں رہ رہے تھے؟“ فطنتی علی کی طرف توجہ دے بغیر اس نے لڑکے سے ایک اور سوال کیا۔

”وہ تو بڑے دنوں سے رہے تھے۔ پر اندر اپنے کمرے میں ہی رہتے تھے۔ ہمارے سامنے نہیں آتے تھے۔ وہ جرات خوری والا لڑکا ہے، ادر دھرم تھے۔ میں تو ان سے شادباز صاحب نے اپنے پور جانے سے ایک دن پہلے ہی ملوایا تھا۔“ یہ بات کافی غور طلب تھی۔ ایک شخص جو کئی دنوں سے

شادباز کا مہمان تھا، مسلسل کی دن ویاں فیم پیر رہنے کے باوجود کسی کے سامنے نہیں آیا۔ وہ دو دن پہلے شادباز نے اسے اپنے لاہور جانے سے قبل بچوں سے ملوایا کہ وہ صرف بچوں تک ہی محدود رہا اور ملاقات کی خواہش سے کر آئے والے محنت بھی کو اس نے پہلے کر ڈال دیا کہ پوری طبیعت غراب ہے۔ اس بات کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ کوئی ایسا شخص ہو جو لوگوں سے چھپ رہا ہو اور اسے ذرا ہو کر کوئی اسے شناخت نہ کر لے اس کا جو حیرت سناستے آقا، اس سے کیا یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ کمن سے کسی نے اپنا علیہ لے کر کمن کی ہو۔ سر کے بال چھوٹے کرانے کے بعد کوئی شخص اپنی ڈر اڈی بھی سوئے ڈے تو ایک نظر ڈالنے پر جان پہچان والے بھی اسے شناخت کرنے میں دھوکا کھاتے ہیں۔ اس پر اسٹیکٹ لیس اور جتنے کے استعمال سے اور بھی واضح ہوئی آئی جا سکتی ہے۔ اس تبدیل شدہ علیہ کے ساتھ وہ کمن آزما کی طور پر بچوں کے سامنے آیا ہو گا کہ آیا وہ اسے پہچانتے ہیں یا نہیں۔ بچوں میں سے کسی نے اسے شناخت نہیں کیا تھا لیکن بھڑکی دھرم کی بڑے سے کما سامنے آئے کی جرات بھی کر سکا۔ بہر حال، یہ سارے مفروضے تھے جن کی تصدیق یا تردید کرنے والا کوئی موجود نہیں تھا۔ جو بات سب سے تر یا واضح تھی وہ یہ کہ وہ یہاں کچھ نہیں سہرے کر بیٹھے تھے اور اس مشکوک شخص کو فوراً ہونے کا موقع مل گیا تھا۔ شادباز تو وہ دن پہلے ہی علیہ چکا تھا اور اب اس کے واپس آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس کے ساتھ گاؤں کے دنو مرزا کے بھی تھے جنہیں شاید وہ عبدالحق کی طرح استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ یہ خیال بہت دھشت ناک اور درجہ کلرز ادا ہے والا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ آپ لوگ جا سکتے ہیں۔“ اپنے زہن میں کھاتے ان اندیشوں کا کمن اس نے اپنے چہرے پر نہیں آنے دیا اور اپنے سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کو ہم دیا۔ وہاں شاید اس سے عورت حال جاننے کے خواہش مند تھے لیکن اس کی تنبیہ کی گویا سمجھتے ہوئے کوئی سوال کرنے کی ہمت نہیں کر سکا اور چپ چاپ باہر نکل گئے۔ ان کے باہر نکلنے کے بعد وہ ڈی ایٹھ کی منظوری کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کے چہرے پر بڑی تنبیہ تھی اور بیٹھتی پر کلکوں کا جال بچا ہوا تھا۔ وہ شروع سے اس کیفیت میں اس کے ساتھ ساتھ تھا اور یقیناً اس نے بھی وہی نتائج اندیشے تھے جو وہ اندر کر رہا تھا۔

”اس گاؤں کے قاتلے دار کو بلاؤ یہ عمارت فی الحال سبیل کر دانی پڑے گی۔ کل میں لاہور سے اسپیڈ میں آیا ہوں۔“ یہ بات کافی غور طلب تھی۔ ایک شخص جو کئی دنوں سے

کتنی ہی اعتبار دیکھ کر یہاں ان کا مسلسل قیام تھا۔ کہیں نہ کہیں انہوں نے اپنے نظر پرش ضرور پھڑوسے ہوئے۔ خصوصاً ان کمروں میں جہاں شاہنواز اور اس کا سامی قیام پزیر تھے۔ ممکن ہے فکر پرش کی وجہ سے ہمیں ان تک پہنچنے میں کامیابی ہو جائے۔ اس کے انہم پر فوراً عمل کیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد قاتلے دار اور اس کے دو ساتھی وہاں پہنچے تو انہوں نے پتہ ہمارے شک بہت زور دیا۔ ہم بھی پھر بھی ان کی آنکھوں کی سرخی اور یہ پتہ ہم کی بے ترتیبی کو دیکھ کر وہ بھی یہی نتیجہ سے چکے گئے تھے۔ لیکن چار افراد کے اسلاف پر مشتمل اس گاؤں میں موجود قاتلہ حقیقتاً سن خان پوری کے لیے ہی تھا۔ پولیس کی وہاں کارکردگی کا معیار دیکھ کر ہم بھی اپنی کارکردگی کے انفرادے نہیں سے ہی لگایا جا سکتا تھا۔ قاتلے کا قتلہ اپنی نگاہیں وصول کرنے اور گاؤں والوں کو اپنے رعب میں رکھنے کو ہی اس اپنی ذہنی تصور کرتا تھا۔ اس کے علاوہ راوی ان کے لیے ہمیں ہی جتن لگاتا تھا۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ انہیں اوپر سے کسی احتساب کا ڈر نہیں تھا بلکہ ایک طرح سے انہیں اپنے اچھے انصران کی پشت پناہی حاصل تھی۔ اس کی مثال ہمیں دیکھ کر بھی دینی والے نہیں سے ہی متی تھی۔ انہیں اپنی نے ایک معمولی قاتلہ داری اس طرح حمایت کی تھی کہ کسی کارروائی بدل کر وہ کیا قاتلہ اور وہ دیکھ کر کوئی غلطی پر سمجھتے ہوئے خاموشی اختیار کر کے بیٹھ گیا تھا۔ قاتلے دار نے اس طرح اسے ہی صاحب کو مل دے دینے پر یقیناً خود کو بڑی دار دی ہو کر کرب رات کے اس پہر وہ اسے، پولیس کے ایک آفیسر کے ساتھ وہاں نظر آ رہا تو گہری نیند سے چکے ہوئے قاتلے دار کو کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا کہ ان کی یہاں آمد کیا مقصد ہے؟ اس نے اپنی پولیس کی ملازمت کے عرصے میں یقیناً کچھ کچھ کر تو دیکھ کر ہوش کرنے کے سوا کچھ نہیں کیا تھا، ورنہ تم از کم دیکھ کر ان کے اہل خانہ سمیت گرفتاری بری کچھ چوکتا اور کسی غیر معمولی صورت حال کے لیے اپنے غصے کو افراتفر کر دے لیکن اس کی غفلت کو تو یہ عالم تھا کہ اس کے قاتلے کی حدود میں ایک عرصے میں قاتل کا اسے ہی، ذی النہی اور پولیس کے پاس اتنی دیر سے موجود تھے پھر بھی اسے کوئی خبر نہیں ہو سکتی تھی۔ گاؤں کے جاگ جانے والے افراد نے بھی یقیناً اس کی مشعل ہماری بے اعتنائی کو دیکھتے ہوئے اسے یہ اطلاع پہنچانی ضروری نہیں تھی اور اب وہ آئینیں چارے کچھ کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان لوگوں کے پاس اسے سمجھانے کا وقت نہیں تھا۔ ذی النہی کی منظور نے اسے دوسرے کی قمارت کو تسلیم کر کے وہاں بیٹھ کر وہاں

قیادت کرنے اور اندر موجود اشیا کے ساتھ پیچھے بھاڑ نہ کرنے کا حکم دیا۔ شہر یار اس ساری کارروائی سے الگ تھلک گاؤں میں جا بیٹھا۔ آخر کار رات کے بالکل آخری پیران کی اندازہ سے واقعی ممکن ہو سکی۔ وہاں کے اس سفر کے دوران اسے اپنی جسمانی کیفیت کا اندازہ ہوا۔ مسلسل بھاگ دوڑ، سڑ اور زخموں کی وجہ سے اس کا جسم کسی چوڑے کی طرح کھو رہا تھا اور اب اس بات کی شدہ ضرورت تھی کہ چوتھے شخص وقت کے لیے ہی کسی ایسے دار اور قاتلے کے ساتھ تھوڑے سے آرام کا موقع مل جائے۔

و مشکل سے دو گھنٹے کی نیند لے سکا تھا۔ اپنی رہائش گاہ پر واپس پہنچنے کے بعد بھی اسے کی اہم امور نمانے پڑے تھے۔ سید کا مقررہ کاروبار کو ختم کر کے شاہنواز کے بارے سے متعلق بتائے اور ایک شخص وہاں جلد از جلد بھانجے کی درخواست کرنے کا قہار چھانے پتال کی صورت حال کے بارے میں جاننے کے لیے عبداللہ انان کو فون کیا۔ یہ جان کر کہ شہر یار زخموں کو لاہور روانہ کر دیا گیا ہے، اسے خاصا سکون ملا تھا۔ ذہنی افراد میں سے کچھ کی موت بھی واقع ہو کر تھی۔ اندازاً اس حادثے میں پچیس، والوں سمیت نہیں سے پچیس افراد ہلاک ہو گئے تھے۔ اسے یہ بھی بھی تھے۔ مرنے والوں کے لیے افسوس اور ان کے ورثہ کی اہم شہر کی لیے مالی امداد کے سوا کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بہت زخموں کو بر وقت ہی امداد منانا بہت ضروری تھی۔ وزیر اعلیٰ کی طرف سے مرنے والوں کے ورثہ اور زخموں کے لیے مالی امداد کا اعلان سامنے آچکا تھا۔ صدر اور وزیر اعلیٰ نے بھی اس واقعے کی مذمت کی تھی۔ ان ساری اطلاعات کے ساتھ اسے یہ اطلاع بھی ملی تھی کہ اس کے منظر سے غائب ہونے کا کوئی ثر نہا نہیں ہے۔ سید، والوں نے اس انٹیکو کے کرتوس آرائیاں کی تھیں۔ حادثے کے بعد پچھراوی کی گرفتاری کی خبر بھی گزرتی گئی تھی اور میڈیا والے اسے استوری کی تلاش میں بوسہ تھے پھر رہے تھے۔ وزیر اعلیٰ نے اس صورت حال پر برہمی کا اظہار کیا تھا۔ وہ اس اطلاع کو زیادہ خاطر میں نہیں لیا۔ وزیر اعلیٰ کو بعد میں سنبھالا جا سکتا تھا مگر وہ جن کاموں میں مصروف رہا تھا، وہ کوئی توجہ کے طالب تھے۔ اب بھی اسے افسوس تھا کہ تاخیر کی وجہ سے ایک اہم شخص فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ ورنہ شاہنواز نہ کسی، ان کو وہ سہماں سامی تو پکڑا ہی جاتا۔ بہر حال، ہونے والی اس غلطی پر انہوں نے کڑے رہنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اصل بات تو یہی کہ

اس غلطی کی تلافی کی کوئی صورت نکالی جاتی اور یہ تلافی صحیح رخ پر حقیقتات کرنے سے ہی ہو سکتی تھی۔ وہ جو کچھ کر سکتا تھا، وہ کر رہا تھا۔ ذی النہی کی منہور کچھ بھی اس نے چند ہدایات راستے میں ہی دے دی تھیں۔ یہ سارے ضروری کام نمانے کے بعد ہی اسے اپنے زخموں پر مہر لگا کر ایک گاؤں دودھ کے ساتھ چل کر اپنے والد اس بدل کر ستر پر لیٹنے کی مہلت مل سکتی تھی اور یہ مہلت صرف دو گھنٹے کے لیے تھی۔ دو گھنٹے بعد ہی وہ ستر سے اٹھ کر فریض ہونے کے بعد شہر کی تیز پر آگیا تھا۔ ششما بھی اس نے بارے نہ ہی کیا تھا۔ گل کے اعصاب جس حالت میں اسے اپنے جسم میں اس نے اپنی آنکھوں سے انسانی جسموں کے اڑنے ہوئے گھرے اور اپنی کی طرح بہت خون دیکھا تھا، کچھ کچھ کچھ آسان نہیں تھا لیکن اسے معلوم تھا کہ ان حالات میں اپنے اعصاب کو کچھ دھیر رکھنا ضروری ہے۔ چنانچہ اس وقت دل نہ چاہنے کے باوجود اس نے جسمانی توانائی کے لیے نڈا کی ضرورت پوری کی تھی اور اب تیار ہوتے ہوئے عبداللہ انان سے رابطہ کرنے کے بارے میں سوچا۔ شہر یار تھا کہ بہت مین نے اسے ذی النہی کی منظوری کی اطلاع دی۔ ذی النہی کی اس وقت آمد خالی اندازے نہیں ہو سکتی تھی۔ اسے انتظار کے لیے سنگ روم میں بٹھانے کا حکم دینے کے بعد وہ جلدی جلدی تیار ہوا اور سنگ روم میں پہنچ گیا۔ سنگ روم میں قدم رکھتے ہی اس کی نظر ذی النہی کی سے چہرے پر پڑی تو اسے کی غیر معمولی صورت حال کا احساس ہوا تاہم خود سے کوئی سوال کے بغیر وہ اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے ایک منٹ کی موت پر پہنچ گیا۔

”آپ کی ہدایت کے مطابق میں نے اللہ آباد کے در سے فرار ہونے والے بندے کا کلیہ اپنے بندوں کو نوٹ کر دیا کہ انہیں بس اڈے سے معلومات حاصل کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ ایک بس کے کنڈیکٹر نے تعدیق کردی ہے کہ اس علیہ کا ایک بندہ اللہ آباد سے اس کی بس میں سوار ہوا تھا تاہم اسے یہ یاد نہیں کہ وہ کہاں اترا۔ بس یہاں سے لاہور تک کے روٹ پر چلتی ہے۔ لاہور میں جب بس خالی ہوئی تو اس کے پیچھے مسافروں میں وہ شخص شامل نہیں تھا۔ یہ بات کنڈیکٹر کو بھی طرح یاد ہے اس لیے اس کا خیال ہے کہ وہ راستے میں ہی کسی دوسرے شہر کے بس اڈے پر اترا گیا ہو گا۔ بس لاہور پہنچنے سے پہلے اپنے سے شدہ شیڈول کے مطابق دو مقامات پر ٹھہری تھی۔ ہمارے شہر سے چلتی بھی ابھی لاہور کے روٹ پر جاتی ہیں، ان کا تقریباً یکساں شیڈول ہوتا ہے۔ اصل میں روز روز لاہور تک زیادہ مسافر نہیں

جاتے۔ زیادہ تر کی منزل کوئی قریبی شہر ہوتا ہے اس لیے کنڈیکٹر اندازہ نہیں لگا سکا کہ وہ کبھی کہاں اترا۔ ذی النہی نے یہ خود ہی اسے رپورٹ دینی شہر کر دی تھی۔ بعد وہ لاہور۔ جن دو مقامات پر پہنچ کر تھی، آپ وہاں اپنے بندے کے پیچھے کر سکتے ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ وہاں اس کے دوسری بس میں بیٹھ کر آگے گیا ہوا اور اس بس کے کنڈیکٹر یا ڈرائیور کو اس کا حلیہ، وہ تو ہمیں اندازہ ہو سکے کہ وہ یہاں سے گئے کے بعد کہاں پہنچا ہے۔

”میں اس کام کے لیے ہدایت دے چکا ہوں۔ اب تک بندے سے روانہ بھی ہو چکے ہوں گے۔ سید بے کرا چھ گھنٹے بعد وہ وہاں آئیں گے تو ان کے پاس اس سسٹم میں کوئی اطلاع موجود ہوگی۔“ ذی النہی نے فرما اپنی کارکردگی کے بارے میں بتایا تاہم اس کے چہرے پر موجود پریشانی کے تاثرات پر دستور ہو رہا تھے۔

”کوئی اور بات؟“ اس کی کیفیت پر پوچھتے ہوئے اس نے تنقیدی سے سوال کیا اور کانکی پر بند کی رسٹ دانی میں وقت دیکھا۔ اسے اب تک روانہ ہو جانا چاہیے تھا لیکن ذی النہی کی موجودگی کی وجہ سے رکنا پڑا۔

”ایک بڑے نڈر سے ہرادر میں محمد اور اس کی فیملی غائب ہے۔ میں اللہ آباد سے آنے کے بعد قاتلے پہنچا تو وہ لوگ وہاں موجود نہیں تھے۔“ ذی النہی نے بھی آواز میں بتایا تو وہ چونک گیا۔ قاتلے کے ایک مقتول کرے میں، پولیس کے سپاہیوں کی نگرانی میں موجود وہ افراد تو کہاں اور یہے غائب ہو سکتے تھے؟

”وہ لوگ وہاں سے کس طرح غائب ہو سکتے ہیں وہ؟ انہیں سمجھتے تھے ان کا ایک مقتول کمرے سے نکل کر گرائی پر موجود سپاہیوں کو قتل دے کر فرار ہو جانا کس طرح ممکن ہوا؟“ اپنے ذہن میں اچھے سوال اس نے ذی النہی کے سامنے بھی کر دیے۔

”وہ خود سے فرار یا غائب نہیں ہوئے بلکہ انہیں غائب کیا گیا ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ جب ہم اللہ آباد کے لیے روانہ ہو رہے تھے اس وقت اس فی صاحب تحریف لے آئے تھے۔ ان کی تحریف آوری کے بعد کچھ ہوا اس کی اطلاع مجھے قاتلے میں موجود اپنے ایک بھڑکے ذریعے ملی ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس فی صاحب کے قاتلے پیچھے ہی انہیں اچھا دیکھا وہاں پہنچ گیا تھا۔ اسے ہم نے ساری تحقیق سے الگ رکھا تھا لیکن آپ کے حکم پر وہی فرار اس کے گھر

والوں کو اللہ آباد سے گرفتار کرنے کا کام تو میں نے اسی سے لیا تھا۔ اس نے اندازہ لگا لیا ہو گا کہ اس گرفتاری کا نور پور والے حادثے سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے موقع ملنے ہی ایس بی صاحب کے کان میں ساری بات پختہ کر دی۔ وہ تو یقیناً پہلے ہی آپ سے اور مجھ سے بالاں تھے۔ ہم نے اسٹگلف میں ملوث بندے کو جس طرح ان کے طرم میں لائے بغیر خاموشی سے غصہ ٹھکانے پر منتقل کر دیا تھا، یہ بات انہیں بھی تو نہیں ہوگی، چنانچہ انہوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا لیا اور دین محمد اور اس کی بیوی بیٹے کو کسی اور جگہ قتل کروا دیا۔ یہ کام انہوں نے اپنے بہت ہی اعتماد کے بندوں سے لیا ہے اس لیے میرے خبر کو انہیں معلوم کہ وہ جگہ کون سی ہے؟ اب صورت حال یہ ہے کہ تجھانے کے ریکارڈ میں تو ان لوگوں کی گرفتاری شوی نہیں کی گئی، عمل کسی طور ایس بی صاحب کے خلاف گواہی نہیں دے گا کہ گرفتار شدہ افراد کو انہوں نے غائب کر دیا ہے۔ یوں سمجھیں کہ جو کچھ مجھے اپنے خبر کے ذریعے معلوم ہوا ہے، وہ آف دی ریکارڈ ہے جس کے بارے میں ایس بی صاحب سے کچھ نہیں پوچھا جاسکتا۔ ان کی طرف سے صاف جواب مل جائے گا کہ جب کسی کو گرفتار ہی نہیں کیا گیا تو اس کے بارے میں غائب ہونے کا کیا سوال؟“

ڈی ایس بی کی دی ہوئی یہ اطلاع بہت تشویشناک تھی۔ دین محمد اور اس کے اہل خانہ کا دھماکے سے کوئی تعلق ہونے کے شک کا مطلب تھا کہ اب ان سے ہر ممکن طریقے سے یہ جرم قبول کروانے کی کوشش کر دینی چاہی۔ عموماً خود کش حملہ آور کا سر دھماکے کے بعد محفوظ رہ جاتا ہے۔ عبدالحق کا سر بھی موٹے پرش گیا تھا۔ اس کے چہرے کی تصاویر کی مدد سے جب اس کے بارے میں تحقیق کی جاتی تو یہ بات ثابت ہو جانی کہ وہ دین محمد کا بیٹا تھا۔ اس حقیقت کے معلوم ہونے کے بعد روئے چارہ مزید غائب میں آجاتا لیکن ڈی ایس بی کی بات سمجھنی کہ ایس بی کی طرح یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ مظلوم خاندان اس کی تحویل میں ہے اور اس کو یقیناً مکرنا ہی تھا۔ اگر اس کی نیت میں خرابی نہ ہوتی تو وہ انہیں غائب ہی کیوں کرتا؟

”اب تو جو ہو گیا سو ہو گیا۔ آپ اپنے اسٹاف سمیت زبان بالکل بند رکھیے گا۔ فوری کارروائی کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے میں نے دستک لیتے ہوئے اسے عام طریقے سے اس کیس پر کام شروع کر دیا تھا ورنہ یہ ایسا معاملہ ہے جس کی تحقیق بہت اہمیت رکھتی ہے۔ لاہور سے تم آجائے گے بعد یہ کیس اسے دیکر کر دیا جائے گا۔ ایس بی صاحب

اپنی شخصی دکھانے کے پتھر میں جو کچھ کر رہے ہیں، انہیں کرنے دو۔ انہیں جلد معلوم ہو جائے گا کہ دین محمد ان کے کسی کام کا نہیں۔“ ابتدائی طور پر تھے والے جھگڑے کے بعد اس نے خود کو سنبھال لیا اور ڈی ایس بی کی ہدایت دی۔

”میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ضرور بتائے گا۔“ اپنی شخصی توفیق ایس بی بھی دکھانا چاہتا تھا چنانچہ رخصت ہونے سے پہلے اس سے استدعا کی۔

”ہاں، پر کام کرنے کے لیے جو عزم آگے کی اس کے ساتھ آپ ہی کو رہنا ہو گا۔ کچھ ہر رنگ تو میں خود انہیں دے دوں گا لیکن چھوٹی چھوٹی باتوں کے جوابات دینے کے لیے ظاہر ہے کوئی ایسا آدمی ہونا چاہیے جو باخبر بھی ہو۔ میرے خیال میں اس کام کے لیے آپ ہی سب سے مناسب آدمی ہوں گے۔“ اس کے اس جواب نے ڈی ایس بی کا چہرہ کھلا دیا۔ وہ خود چاہا ہو یا کہ اس شخص کو ایسے مواقع فراہم کر رہا تھا کہ اسے اپنے گیریز کو اوپر لے جانے کے لیے کارکردگی دکھانے کا موقع ملے۔ ایس بی کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد اس کے اس مانت آفسر کے ساتھ اچھی انداز اسٹینڈنگ انتظامی نقطہ نظر سے بہت اہمیت رکھتی تھی۔ وہ یہ بھی محسوس کر چکا تھا کہ بے شک ڈی ایس بی اپنی ترقی کے لائق ہیں جتنا ہے لیکن فطرتاً ہی برا آدمی نہیں کہ بروقت کہنے کے لیے تیار بیٹھتا ہو۔ اس طرح کے آدمی کو ذرا سی اہمیت دے کر روشن مستقبل کی بھلک دکھائی جائے تو وہ کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ ابھی تک اس کا یہ خیال صحیح ثابت ہو رہا تھا اس لیے اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ڈی ایس بی منظور کو ہی ہر معاملے میں فرنٹ پر رکھتا ہے۔ اسے رخصت کرنے کے بعد وہ اسپتال کے لیے روانہ ہو گیا۔ اب تک اسے وہاں جانے کا موقع نہیں مل سکا تھا اور اسے علم تھا کہ میڈیا اس بات کو اچھا نہیں لے گا۔ اس پسماندہ شعلے میں اسٹینڈنگ کمشنری سب سے بڑا آفسر تھا اور اس کا مستقل دفتر سے غائب رہنا واضح طور پر نظروں میں آیا تھا۔ ممکن تھا کہ اس کے نکلنے نے بھی میڈیا کی توجہ چمکے سے اس طرف مبذول کر دادی ہو، جب ہی وہ لوگ زیادہ شور مچا رہے تھے۔ وہ جیسے ہی اسپتال پہنچا، وہاں موجود دو مہینے جالوں نے اسے گھیر لیا۔

”آپ کے شعلے کے ایک گاؤں کے افراد پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ کئی لوگ یہاں اسپتال میں دم توڑ گئے اور آپ اب ان کی جنازہ پڑی کے لیے تشریف لا رہے ہیں؟“ ایک صحافی نے تنبیہ کی تھی اس سے سوال کیا۔

”میں ان لوگوں کی طرف سے غافل نہیں تھا۔ میرا بی

اسے زخمی ہونے کے باوجود مسلسل یہاں موجود تھا اور صبراً اس سے فون پر رابطہ تھا۔ میں زخمیوں کو بہترین طبی امداد پہنچانے کے لیے جو اہل کفالت کر سکتا تھا، وہاں سے لیے۔ میری ذاتی کوششوں سے ہی یہ ممکن ہو سکا کہ زیادہ مہارت والا فرد کو پہلی کاپر کے ذریعے لاہور کے بچہ سہولیات والے اسپتال میں منتقل کیا جائے۔ حراج پری کی فائز مطلق بھانے کے لیے یہاں بہت لوگ موجود تھے لیکن میں سمجھا کہ ایسے کاموں میں مصروف تھا جو مجھے ہی کرنے تھے۔ بہت جلد سے صحافی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے آخر میں اس کا لہجہ کچھ نرم ہو گیا جس کا فوٹو لینے والے اس صحافی نے تیز لہجے میں فوراً ایک اور سوال دارغ دیا۔

”کیا آپ ان مظلوم افراد کی حراج پر ہی کے لیے آنے کی غرض فارغ ہو گئے ہیں؟“

”میرا یہ مطلب نہیں ہے۔“ وہ فوراً سنہٹا۔ ”میں اس حادثے کا شکار ہونے والے تمام افراد سے دلی ہمدردی رکھتا ہوں اس لیے پہلی فرصت میں ان سے ملنے یہاں آ گیا ہوں۔ مجھے ان لوگوں کی تسلی کر ہے، اس کا انداز تو آپ اس بات سے بھی لگ سکتے ہیں کہ خود زخمی ہونے کے باوجود میں جائے حادثہ پر مسلسل مصروف عمل رہا۔ اگر مجھے ان لوگوں کی فکر نہیں ہوتی تو میں اس طرح انہیں اپنی ذات پر ترجیح نہیں دیتا۔“ اس طرح سے سیاست دانوں کی طرح اپنی کارکردگی کو جتاتا رہا اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن یہ صحافی براہوری بات کا چھڑنا نہ دے، اس احتیاط کے پیش نظر اسے یہ جھٹکے ہوئے پڑے۔

”منا ہے، کلی آپ کے ہم سے کچھ افراد کو گرفتار بھی کیا گیا ہے۔ کیا ان کا مسئلہ فوراً حل ہوئے ہونے والے دھماکے سے ہے؟“ ایک دوسرے صحافی نے نیا سوال دیا۔

”انہی کوئی بات نہیں ہے۔ ابھی پولیس تحقیق کر رہی ہے اور یہ تحقیقات بالکل ابتدائی مراحل میں ہیں۔ کوئی واضح بات سامنے آ جانے کے بعد سیدیا کے افراد کو آگاہ کر دیا جائے گا۔“ بہت سنجیدگی سے اس سوال کا جواب دینے کے بعد اس نے اپنے قدم اسپتال کے داخلی راستے کی طرف بڑھا دیے۔ صحافی ابھی اس کی جان چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے لیکن اسے مزید کسی جواب کے لیے آمادہ نہ دیکھ کر انہیں اس کی جان چھوڑنی ہی پڑی۔

☆☆☆☆

”ہذا امر جو عبداللہ؟“ وہ دو پیر کے قریب اپنے دفتر پہنچ چکا۔ اسپتال میں زخمیوں کی حراج پر ہی سے فارغ

ہوئے ہی اسے یہ اطلاع مل گئی تھی کہ لاہور سے تحقیقاتی ٹیم پہنچ چکی ہے۔ اس ٹیم سے اس نے اپنے جھگڑے میں ملاقات کی اور دھماکے سے متعلق اپنی معلومات کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے شکوک و شبہات بھی ان کے سامنے بیان کر دیے۔ اس ملاقات کے دوران ڈی این ای میں منظور بھی وہاں موجود رہا۔ ٹیم کے ارکان سے اس کا تعارف کرواتے ہوئے اس نے انہیں تجویز دی کہ ابتدا سے اس کیس پر اس کے ساتھ ساتھ کام کرنے کی وجہ سے وہ ان کے لیے ایک کارآمد فرد ثابت ہو سکتا ہے، اس لیے وہ اسے اپنے ساتھ رکھیں۔ ٹیم کے ارکان نے اس تجویز کو قبول کر لیا۔ چائے پینے کے بعد وہ لوگ ڈی این ای میں منظور کی رہائشی میں اللہ آباد کے لیے روانہ ہو گئے، جب تکس جا کر اسے اپنے آگے کھینچ کر موقع مل سکا۔ عبداللہ ان کو اس نے اس ملاقات میں اس لیے اپنے ساتھ نہیں رکھا تھا کہ وہ دفتر میں ہی رہ کر اپنی معاملات سنبھالتا رہے۔ کل فور پور سے واپس آنے کے بعد اب جا کر ان دونوں کی ایک دوسرے سے ملاقات پوری تھی اس لیے اس نے اس سے یہ سوال کیا تھا۔

”جی سیرسز اسٹا بزم خان نے بہت اچھی ذہن داری کی تھی۔ بعد میں، میں نے ایک ڈاکٹر کے مشورے سے چین لکڑی لے لی تھی اس لیے اب بچہ سمس کر رہا ہوں۔“

اس نے جواب دیا، ”ابھی ایک لست اس کے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔“ ”یہ مرنے والے افراد کے ناموں کی لست ہے۔ میں نے بہت اصرار کر کے ایس ایچ بی صاحب سے منگوائی ہے۔ ان کے درجہ کے لیے امدادی مجلس کی تقریر کے وقت اس لست کی خاص طور پر ضرورت پڑے گی کہ اس لیے میں نے یہ لست منگوائی ہے۔ اسپتال میں داخل زخمیوں کی لست اس کے علاوہ ہے۔“

”یہ تم نے ٹھیک کیا۔ امدادی مجلس کی صحیح حق داروں میں تسلیم کے لیے اس لست کی بڑی اہمیت رہے گی، ورنہ بعد میں یہ ہوتا ہے کہ سوچ شناس لوگ فراخ او مظلوم بن کر حق داروں کا حصہ بڑپ کر جاتے ہیں۔“ اس نے لست کو اگلی پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا پھر پوچھنے لگا۔ ”جائے حادثہ کے بارے میں کیا رپورٹ ہے؟“ پولیس نے وہاں اپنی ابتدائی کارروائی تو مکمل کر لی ہوئی، ”مرنے والوں کی لاشوں کی تدفین اور خودکش حملہ آور کو اپنی گھڑی میں لے کر محفوظ کرنے کے سلسلے میں پولیس کیا کر رہی ہے؟“

”اس سلسلے میں میرے پاس بہت سادہ رپورٹ نہیں ہے۔ سراسر ایس ایچ بی صاحب ضرورت سے زیادہ اصرار سے ہونے

ہیں۔ وہ اور ان کا عمل دونوں قانون پر آمادہ نظر نہیں آتے۔ تاہم اپنے ذرائع سے مجھے یہ معلوم ہو گیا ہے کہ خودکش حملہ آور کا سر پولیس کو اپنی ہتھکڑی میں لے کر لے گیا اور پوچھ لیس فوٹو گرفتار اس کی مختلف زاویوں سے فوٹو گرفتار بھی کیا گیا۔ مرنے والوں کی تدفین کے لیے میں نے اپنے طور پر رضا کاروں کی ایک ٹیم کو ویرانہ کے ساتھ فوراً روانہ کر دیا ہے مگر غائب ہے یہ کام شام تک ہی مکمل ہو سکتا ہے۔“

”تدفین کا صحیح وقت معلوم کر لو۔ نماز جنازہ میں شرکت کے لیے ہزاروں پھر چلیں گے۔“

”اوکے سر!“ اس کے عمر پر عبداللہ ان فوراً بولا۔ ”میرے ہاتھ لگا۔“ اسپتال میں موجود لوگوں کا ان کا شکل کلی اچھا خاصا اسپتال ہو گیا تھا۔ میں نے مزید وہاں کچھ فوری طور پر منگوانے کے لیے کہہ دیا ہے، امید ہے کہ وہ جیسے جلد وہاں اسپتال پہنچ جائیں گے۔ لاہور سے آنے والے ڈاکٹر کی رہائش کا ریت ہاؤس میں انتظام کر دیا گیا ہے۔“

”بہت اچھی بات ہے۔ اسی طرح پھر چھوٹے بڑے معاملے پر نظر رکھو۔ ایس ایچ بی صاحب، وہ کسی بھی مقام پر اگر ہمارے کسی وکیل پر اگت ہو جائے تو میں کامیاب ہو گیا تو بہت اوجھل جائے گا۔ اب بھی وہ مجھے ایک ساتھ لگا چکا ہے لیکن میں جان بوجھ کر خاموش ہوں۔“ عبداللہ ان کی کارکردگی کو سراہتے ہوئے اس نے مزید چابقت دینے کے ساتھ اسے خوشیار کیا۔

”اس موقع پر ایس ایچ بی صاحب کا یہ رویہ میری کمر سے باہر ہے۔ اس وقت تو اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم سب متحد ہو کر کام کریں تاکہ ان بڑی حالات سے شہر کے ساتھ ساتھ ہزاروں بھروسوں تک رسائی بھی ممکن ہو سکے۔“

”ایس ایچ بی صاحب ہم جیسوں کے ساتھ نہیں بڑے چودھری اختیار اور اقبال باجوہ جیسے لوگوں کے ساتھ اتحاد قائم کرنے کے قائل ہیں کیونکہ اس اتحاد کے نتیجے میں انہیں مالی فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ اس وقت تو وہ ویسے ہی اپنی پلاننگ کے باوجود اس کی کردہ کھڑکی اور کھانوں کے ساتھ اپنا بندہ بکڑے جانے کا کمر بستہ ہے۔ وہ بکڑے بیٹھے ہیں۔ بڑے ہاتھ ہر مارے انہوں نے کہ کسی طرح انہیں پانچ جاگے کہ بندہ کہاں ہے؟“ اب اس کا نامی کا بدلہ لینے کا موقع مل رہا ہے انہیں۔ ”اپنے تین دو بے میں میرے کام کے سمجھ اہم بندوں کو غائب کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ تمہیں اللہ آباد میں پیش آنے والا وہ واقعہ تو یاد ہو گا جب دین محمد ام کے ایک شخص کے اپنی بیٹی کے انوکھا اور بدلتی کی حکایت لے

کر آنے پر ہم اس کے ہاتھوں کے گر گئے تھے اور وہاں اس کے بیٹے میرے ساتھ بدستری کی کوشش کی تھی۔ کل میں لڑنے کے وہ خود اپنی تلک کیا، وہاں میرا وہی چیتا ہوا تین قدم میں لے آیا وقت اسے پہچان لیا تھا اور ماٹھے کے فوراً بعد وہ نو کی چٹکی کراہت میں لے کر غلے پہچانے کے احکامات جاری کر دیے تھے۔ وہ لوگ بے چارے تو بے چارے تھے لیکن ان کے ذریعے مجھے کچھ ایسی معلومات حاصل ہو کر جس سے بڑا کھانا آباد میں موجود عدالت کا مالک کو خوف و اضطراب رکھتا ہے۔ میں پولیس ٹیم کے ساتھ وہاں کو۔ ہمارے پہلے وہ بندہ تو بار بار پوچھا تھا لیکن اس کے تلافی پنے پر کچھ ایسے شواہد ملتے ہیں جن سے مجھے بڑبڑ ہوا ہے کہ شاید اس بندے کا تعلق ہمارے پڑوسی ملک سے تھا۔ اس کیس کی رائے سامنے آنے کے بعد یہ بات خود بخود واضح ہو جائے گی کہ ایس ایچ بی صاحب نے میرے اللہ آباد سے واپس آنے تک جو کارنامہ انجام دیا، وہاں دین محمد کو اس کے خاندان سمیت قتل سے خاص کرنے کا تھا۔ اب یہ نہیں معلوم کہ انہوں نے سب مجھے برطان کرنے کے لیے کیا یا وہ خود کوئی ایسی بیٹی دکھاتا ہے جس میں۔ ان کی جو بھی خواہش ہو، مجھے ذاتی طور پر کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن اس کی تشویش ضرور ہے کہ وہ بے چارے مظلوموں کو فراخ او ان کے قاتل کا شکار ہوں گے۔“ اس نے مختصر امدادی بات بتاتے ہوئے ایس ایچ بی کے موجودہ رویے پر روشنی ڈالی۔ عبداللہ توجہ سے یہ سب سنتا رہا۔ اب اسے گوارا تھا کہ کل سے شہر بارگاہی بکروں میں بھٹا ہوا تھا وہاں اسپتال آنے کی خدمت نہیں مل سکتی تھی۔ اس کی مہم جوئیوں نے اسے زخمی ہونے کے باوجود اسے لگائیں جیتے اب تھا اور ایک بار پھر میرا جتنی طریقے سے کام کرتے ہوئے وہ حد تک بقا کر رہا کہ وہی کاٹا ہوا رگ چکا تھا۔ بالکل بات تھی کہ اس کی یہ ساری جھگڑاؤں اسلٹ کش کے عہد سے سے کچھ نہیں کرتی تھی اور اصولاً اسے سب قاتل کے ہاتھ اپنی بیٹ پر جیتے بیٹھے صرف پوچھ کر سن کر مل کر نہ ہاتھ کرنا چاہیے تھا لیکن وہ تو قریب پھر ایسی ہی کرتا تھا جس میں سہا ہے۔

”آپ ٹھیک کہتے ہیں سر! ایس ایچ بی صاحب کی نیچر میں ابھی طرح بکھرتے ہوں۔“ آپ پر آؤ تو ان کی انگوٹھی پر نکال دیں گے۔ ”اس سے ٹو بار کی آخری بات کی۔“

”مگر ایس ایچ بی صاحب ان لوگوں کی کوئی بددلی نہیں کر سکتا۔ ایس ایچ بی صاحب اپنی ایک ہی حرکت کو تسلیم کریں گے کی نہیں

اس لیے میرا ان سے اس معاملے میں بات کرنا بھی بے کار ہے۔" اس نے ایک بڑی حقیقت پر ان کی جیسے عبادت گاہ میں کھینچ کر اس لیے سر ہڈ کرنا شام ہو گیا۔

"فی الحال میں اس معاملے کو ہی ڈیو نوٹس کر رہا ہوں اور اپنے وسائل بھی زیادہ تر اس مسئلے سے منسلک کر لیے ہیں۔" انہماک کر کے ہیں لیکن اس بات کا خیال رکھنا کہ جو آہ دین مرکز صحت کی تعمیر کا جو کام میں رہا ہے وہ جاری رہے۔ نور پور میں تو ظاہر ہے کہ کام مقرر ہوئے ہیں مگر وقت لگ جائے گا لیکن میں پوری کوشش کروں گا کہ اس میں بہت زیادہ وقت نہ لگے۔ باقی پور پکیشن کا بچہ دوک بھی اس عرصے میں جاری رہنا چاہیے۔" اس نے موضوع گفتگو کو آسان بنا دیا۔

عبدالمنان کو ہدایت دی۔ یہ اس کا اپنے مطلق کی ترقی کے لیے شہید اعظمی ہی تھا جو وہاں پگائی حالات میں بھی اس بات کو نہیں بھولا تھا۔

آپ نے خود جن سرائے والے سب جاری رہے گا۔" عبدالمنان نے اسے سہی دی۔ اسی وقت اس کی میز پر رکھا فون چلنے لگا۔ عبدالمنان نے اس کے اشارے پر فون اٹھایا۔

"آئی جی صاحب کے دفتر سے فون ہے سر ان کے بی اے بات کریں گے۔" آپ بیڑے اسے اطلاع دی، اس نے کال ملانے کا کہا۔ اس طرح کی کاٹرونی اینڈ کرتا تھا۔ اگر دوسری طرف سے شہر بار سے رست کرنے پر اسرار کیا جاتا تو وہ کال اسے منتقل کر دی جاتی تھی۔ آپ بیڑے علم میں ہو گا کہ اس وقت وہ شہر بار سے کمرے میں سے اس لیے اس نے کال یہاں ترانسفر کر دی۔ کال بے حد مختصر تھی جس کے آخر میں عبدالمنان کو صرف "اوکے" کا ایک لفظ کہنے کا موقع مل سکا۔

"آئی جی صاحب تحریف لا رہے ہیں۔ پہلے دو شام چنچ بے خبر ہو کر پیش ادا کی جانے والی نماز جنازہ میں شرکت کریں گے اور پھر جائے حادثہ کا معائنہ کریں گے۔" فون رکھنے کے بعد اس نے شہر بار کو اطلاع دی۔ اب انھیں نماز جنازہ کا وقت کسی سے معلوم کرنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ یقیناً ان لوگوں نے جو انھیں کسی بھی قسم کی معلومات فراہم کرنے سے انکار رہے تھے، آئی جی صاحب کو یہ اطلاع فراہم کی تھی۔ ان کی اس بچکانہ حرکت پر وہ منکر کر گیا۔

کھانسی جی کھانسی جیسے کوئی جیسا، اسے اکھاڑ کر تو نہیں بچکے سنی تھی۔



نماز جنازہ میں شرکت کے لیے آئی جی صاحب ان کے

نہیں آئے تھے۔ ان کے ساتھ ڈی آئی جی سجاد بھی تھا۔ مقامی افسران، اورو گرو کے میٹروں کے چودھری حضرات اور ضلع کے سیاسی نمائندگان نے بھی نماز جنازہ میں شرکت کی تھی، چنانچہ ایک بار پھر پولیس کو سخت ہونا تھا۔ اس موقع پر کسی ناخوشی کو ادا کرنے سے بچنے کے لیے پولیس نے غریبی پوری طرح چھوڑ دی تھی۔ نور پور کے لوگوں نے بھی اس موقع پر بڑے صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ اپنے ہمدرد جانے والے پیادوں کے کم میں دھانڑیں مار مار کے رہے تھے۔ یہ تھے لیکن ان کے علم نے انھیں اشتعال کی راہ نہیں دکھائی تھی۔ شاید ایک غیر ترقی یافتہ گاؤں میں رہنے اور محدود ذہنی گزارنے کی وجہ سے انھیں احتجاج کے طریقوں کا طریقہ تھا۔ وہ سب جیسے سادے لوگ تھے جو اپنا ہم بس انھوں کی برسات میں مٹا رہے تھے اور پولیس کو کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔ تم زور خود پولیس والے بھی تھے۔ اس حادثے میں کی پولیس ایک بار بھی ہلاک ہوئے تھے۔ وقت کی قلت کے باعث جاسوسی پرائیوٹ اور پولیس ایک بار اس اپنی نماز جنازہ ادا کی تھی لیکن پولیس والوں کی بات بات پر مشتعل تاوت بڑھان پر ہم میں بیٹے ہونے کی وجہ سے الگ نشست کے بارے میں تھا۔ نماز جنازہ کے بعد آئی جی صاحب نے ایک مختصر خطاب بھی کیا جس میں انہوں نے اس حادثے پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے اس بات کی تلقین دہائی کروائی کہ مجرموں کو کیڑ کر دینا تک پہنچنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔ انہوں نے صدر، وزیر اعظم اور وزیر اعلیٰ کے تعزیتی بیانات بھی نور پور کے باشندوں تک پہنچائے۔ اس مختصر خطاب کے بعد پولیس ایک بار کے تہیوتوں کو پرے اعزاز کے ساتھ فورسٹ کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ سوائے ان ایک باروں کے جن کا حلقہ دوسرے علاقوں سے تھا، باقی افراد کی تدفین فورسٹ کے قبرستان میں ہی ہوئی تھی۔ نور پور کے باشندوں کے لیے ان کے اپنے گاؤں کا قبرستان تھا۔ جنازوں کی روحانی کے بعد آئی جی صاحب جائے حادثہ کے معائنے کے لیے تحریف لے گئے تو ان کے ساتھ صرف سرکاری ایکار موجود تھے۔ چودھری افتخار جیسے لوگ جو نماز جنازہ میں شرکت کے لیے آئے تھے اس لیے تھے کہ آئی جی صاحب سے ملاقات رہے گی۔ اس صورت حال پر چچ و باب کھا کر رہ گئے۔ انھیں بھلا نور پور کے غریب باشندوں پر پولیس کے معمولی ایکاروں سے کیا جیجی تھی کہ وہ ان کی نماز جنازہ میں شرکت کے لیے آتی دور آئے کی ذمہ داری تھی۔ وہ تو ہی لیے آئے تھے کہ آئی جی صاحب کی نظروں میں

آئیں گھر ان کی طرف سے یہ اعلان ہونے پر کوئی فی الحال ان کے پاس ملاقاتوں کے لیے وقت نہیں ہے، ان کے اراکوں پر پولیس پڑ گئی تھی۔ صرف نور پور کے چودھری بھتیجے سے شہر بار نے آئی جی صاحب کو کھڑے کھڑے ملوایا تھا۔ اس کے گاؤں میں اتنا بڑا احادیث پیش آیا تھا۔ آئی جی صاحب ذاتی طور پر اس سے براہ راست افسروں کے چند خطبات کیے تھے۔ یہ اس کا حق تھا مگر شاید کچھ لوگوں کو یہ بات پڑی تھی، انھیں نظر انداز کر کے نسبتاً ایک چھوٹے زمیندار کو اہمیت دی گئی تھی۔ وہ آسانی سے اسے عزتی کو ہمیں کر سکتے تھے۔

"انگلز آئی جی کا معذور نظر ہے۔" انھیں کہیں سے یہ طرح بھی کیا گیا۔ چودھری بھتیجے کی معذرت کا نہ ان ادا نے والے لوگوں نے اس کی بلند بھتیجی نہیں دیکھی تھی۔ وہ سب چارہ معذور شخص ہم دھما کے کے وقت جائے حادثہ پر موجود تھا۔ دھماکے کے اثر سے آج کرنا زور تو وہی اپنی کرسی سیت کر گیا تھا لیکن ان حالات میں بھی وہ بولکھات کا شکار نہیں ہوا اور اپنی بیوی بھی خود صدمہ بردار نہ ہو گیا۔ اس کی ہدایت پر کل رستے ہوئے اس کے ملازمین سے پولیس والوں کی اس موقع پر بھرپور مدد کی۔ بعد میں بھی وہ اپنے علاقے کے لوگوں کی اٹک شوشی اور انھیں پرستون رکھنے میں مصروف مل رہا تھا مگر دولت کے پیادوں کے لیے تو انسان کی بڑائی کا اس ایک سی پانہ تھا۔ اس کی تجویز مال و زر سے بھر کی پڑی ہوں۔ چودھری بھتیجے اس پانے کے اعتبار سے ان سے کافی نیچے بھر پڑا تھا۔

چودھری بھتیجے سے ہونے والی اس بے حد مختصر ملاقات کے بعد آئی جی صاحب اور سرکاری اہلکاروں پر مشتمل قافلہ جائے حادثہ پر چاہنچا۔ وہاں اب مرنے والوں کی لاشیں اور ان کے جسم کے ٹکڑے تو موجود نہیں تھے لیکن مٹی میں جذب ہو کر سوک جاتے والے خون کے دھبے ضرور نظر آ رہے تھے۔ اس پرے ای یا کو پولیس کے زورورنگ کے بیٹے سے گور کر کے بے بندی قائم کر دی تھی۔ ثبوت اکٹھے کرنے اور ابتدائی تحقیقات ہو جانے کے باوجود فی الحال وہاں پولیس کے چند جوان قیادت تھے۔ ان کی آئی جی صاحب کو حادثے کے بارے میں ہر رنگ دینے لگا۔ خود مشمولہ اور کس عمر کا تھا۔ اس نے کس طرح کارروائی کی۔ اس کا اصل ہدف ک تھا۔ پولیس والوں نے کس طرح اپنی جان پر فیصل کر اسے روکا۔ جائے حادثہ کے معائنے کے دوران وہ آئی جی صاحب کو تفصیل سے بتاتا رہا۔ خود مشمولہ اور کی شناخت کے معاملے میں البتہ اس نے اپنی زبان سے کچھ نہیں کیا حالانکہ

دین محمد کے قہر میں آجائے کے بعد اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ وہ عبدالمنان کی شناخت سے ناواقف رہے گا۔ مگر پھر بھی خاموش تھا تو اس کا مطلب تھا کہ اس کے ذہن میں کوئی اور منصوبہ چل رہا ہے۔

جائے وقوعہ کے معائنے کے بعد وہ لوگ نور پور سے روانہ ہو گئے۔ آئی جی صاحب نے وہاں ہی میں کچھ رہنمائی کے بیٹے پر کئے کارادہ چاہا تھا۔ بظاہر یہ غیر شہدہ اور فی الواقعیت کا پروگرام تھا، چنانچہ آئی جی سجاد رات کے علاوہ کسی اور کے ان کے ساتھ شریک ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جب وہ لوگ اس کے بیٹے پر پہنچے تو ان کے ساتھ کوئی پوچھ فرمائش تھا جو ان کی گفتگو میں شامل ہوتی۔ ان زمرہ کیے جانے سے پہلے نے والی مہلت میں وہ لوگ اراکے روم میں بیٹھ کر گرم چائے سے لطف اندوز ہونے لگے۔

"نور پور اعلیٰ قمر سے بہت تاراش ہیں بر خود دار! صبح میرے پاس ان کا فون آیا تھا اور وہ بڑی بریک تھا رہی ہے پودانی کا شہدہ کرتے رہے تھے۔ کل حادثے کی اطلاع ملنے کے بعد وہ مسلسل قسم سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتے رہے لیکن انھیں ہر دفعہ یہی جواب ملا کہ اسے ہی صاحب کسی ضروری کام میں مصروف ہیں اور فی الحال ان سے رابطہ ممکن نہیں۔ میڈیا نے اسے تہارے منظر سے غائب ہونے کی خبر دے کر ان کی ناراضگی کو بڑھایا جو حالانے میں انہم کر دار ادا کیا ہے۔" نور پور کے دورے کے دوران وہ ایک برکاری عہدے دار کی حیثیت سے اس کے ساتھ کافی با اختلاف طریقے سے پیش آئے تھے لیکن اب بالکل ریٹائرس موڈ میں صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھے تھے۔ اسے نور انما اور ہو گیا کہ اچانک اس کے بیٹے پر بھڑو بھڑو کرنے کا بظاہر غیر شہدہ نظر آئے والا پروگرام حقیقت میں لے لے شہدہ تھا۔ وہ اپنے طور پر یا نور پور اعلیٰ کی ہدایت پر کسی بھی دوسروں میں اس سے اس کی سرگرمیوں کی بات پوچھ بچھ کرنے کے لیے وہاں کے تھے۔ سجاد رات انہوں نے اس دورے میں خاص طور پر اس لیے ساتھ رکھ کر ہو گا کہ اپنے کزن کی موت پر ان میں وہ زیادہ مل کر بات کرے گا۔ سجاد رات کو اس وقت دراصل بھائی اور سر کے درمیان ایک ایسے رابطہ کا کردار ادا کرتا تھا جس کی کارکردگی یہ ظاہر نہ آئے لیکن جس کی موجودگی ہی کافی ہو۔

"میں سجاد بھائی کو جو روبرو بھیجتا رہا ہوں، وہ یقیناً آپ کو بھی جی ہوں گی۔ ان روبرو کسی روحانی میں آپ خود بخوبی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ میں جن کاموں میں مصروف رہا،

دور ذرا اعلیٰ صاحب کی کال وصول کرنے سے کہیں زیادہ اہم تھے۔ انہوں نے فون پر مجھ سے کیا کہنا تھا؟ ان کی ہدایات کے بغیر بھی یہاں سارے کام انجام دیے جا رہے تھے۔ سیاسی طور پر اپنی اہمیت جتانے کے لیے اگر وہ چلو کہنا چاہتے تھے تو اس کے لیے مینڈے سب سے سوزوں سے اور آج کے انہارات اور نواز تو سزا سے ان کے جو بیانات سامنے آئے ہیں، اس سے پتا چل رہا ہے کہ وہ اپنے حصے کا کام کر چکے ہیں۔ بیانات جاری کرنے کے سوا ان کی سیاست دانوں کو اور کون سا کام کرنا ہوتا ہے؟ اس نے مجھے بتایا کہ میں ان کی باتوں کا جواب دیا۔

”تمہاری بی بی چند ہفتہ تمہارے ہی المیوں کو تمہارے خلاف بولنے اور اپنی سیدھی پرورشیں پہنچانے کے مواقع دیتی ہے۔ تم اس طرح سے کیوں کام نہیں کرتے جس طرح اور لوگ کرتے ہیں؟“ سجاد رانا نے پہلی ہی جھلکی کا اعتراف کیا۔

”میرے خیال میں آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جس طرح دوسرے لوگ بغیر کچھ کیے بغیر پر جانچ دھرے بیٹھے رہتے ہیں، اسی طرح مجھے بھی کرنا چاہیے۔“ اس بار اس کا لیجر نرم لیکن اصرار پڑا تھا۔

”تم اگر ازم نہیں دے سب نہیں کرنا چاہیے جسے دوسرے مجھے کے افراد اپنے اختیارات میں دخل اندازی تصور کریں۔ تمہارے علاقے کے ایس بی کو تم سے اس مسئلے میں بہت زیادہ شکایت ہے۔ تم کسی پالیسی، فیسری طرح ایسا کچھ کوئی بھی سر کرنے چل پڑتے ہو۔ پچھلے دنوں کڑی اور کھالوں کی اسٹیکٹ کی جو حسیب بڑی تھی ہے، اس کا سہارا بے شک ڈی ایس بی منظور کے سر ہاندھا گیا ہے لیکن اس حقیقت سے روکنے والا نہ ہو ہی واقعہ ہیں کہ تم اس میں جس ذاتی طور پر شریک تھے۔ اگر اسٹیکٹ سے متعلق تمہیں کسی سے خبر ملی تھی تو تمہیں یہ معلومات ایس بی سے شریک کرنی چاہیے تھیں لیکن تم نے اسے مکمل اندر سے ہی رکھا۔ اس کے بعد بھی اسے بہت سی باتوں کا کم نہیں ہونے دیا گیا۔ اپنے علاقے میں پولیس کا سب سے بڑا اصرار ہونے کی حیثیت سے یہ سب جانا اس کا حق تھا لیکن جب اسے کچھ نہیں بتایا گیا تو اس نے تنگی محسوس کی۔“

”اور اس تنگی پر انہیں اتنا طعنے آیا کہ انہوں نے اپنے رشتے کے بہنوئی وزیر اعلیٰ صاحب کو میرے خلاف بھڑکا دیا۔“ آئی جی صاحب کی بات سن کر وہ بے حد اطمینان سے بول۔ اسے معلوم تھا کہ وزیر اعلیٰ کی بھروسہ میں بی بی کی زبان ہیں اس لیے وزیر اعلیٰ صاحب اس کے خلاف زیادہ شور مچا رہے ہیں۔

”بالکل۔ وہ ایسا کر سکتا تھا اس لیے اس نے ایسا ہی کیا۔ یہاں سب ہی ایسا کرتے ہیں۔ اگر تمہاری جگہ پر ہم سب لوگ نہیں ہوتے تو کیا تم ہی سے یہی سے کام کر سکتے تھے؟“ آئی جی صاحب کی یہ بات واقعی لا جواب کر دینے والی تھی۔ وہ فطری غم جو اور بیمار تھا، یہ الگ بات تھی لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ تھی کہ وہ بلا خوف و خطر کوئی قدم اس لیے بھی آسانی سے اٹھا لیتا تھا کہ اسے مضبوطی پھوٹا حاصل تھی۔

”تم ایس بی کے مقابلے میں تمہیں مزید دو مضبوط پوزیشن کے مالک ہو، اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ ایس بی کے پاس صرف ایک وزیر اعلیٰ کا سہارا ہے جو سیاسی اثر چھڑا کر دکھا کر ہو کر کرور بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن فی الحال اس کا بہنوئی اقتدار میں ہے اور وہ محض کچھ نوکر کے میں کتہ مابہر ہے۔ تم نہیں جانتے۔ اس وقت بھی تمہارے خلاف ایک رپورٹ تیار ہو چکی ہے جس کے مطابق تمہاری یہ طر استفسات کشمکش اس صنعت میں تعیناتی کے بعد یہاں کریم رینٹ بڑھ گیا ہے۔ تمہارے تقرر کے بعد پیش آنے والے پھوٹے سے چھوٹے واقعے کو بھی تمہارے ساتھ نہیں کیا گیا ہے اور اس کی وجہ یہ بیان کی تھی کہ تم بہر حال میں بے جا مداخلت کرتے ہو اس لیے پولیس کو اپنی کارکردگی دکھانے کا موقع نہیں ملتا، ورنہ پہلے حالات ان کے قابو میں تھے۔“

”یہ سب لوگ اس ہے۔ کریم رینٹ بڑھا نہیں ہے بلکہ پہلے پولیس کے ذرا دے پر ہوا ہی کی وجہ سے جن واقعات کی رپورٹ درج نہیں ہوئی تھی، اب میری دخل اندازی کے باعث پولیس والے انہیں درج کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ پھر ایک دوسری وجہ میرا برسر اقتدار لوگوں کی خواہشات کے خلاف کام کرنا بھی ہے۔ وہ لوگ جو اپنے ذریعے افراد کو بہ سہولت سے محروم رکھ کر ان پر اپنا قبضہ بنانے دیکھنا چاہتے ہیں، وہ میرے ترقیاتی منصوبے کو بے اثر کرنے کے لیے دھڑلے دھڑا کر شرارتیں کرتے رہتے ہیں۔“ اس نے آئی جی صاحب کی بات کا جواب دیا۔

”یہ سب مجھے معلوم ہے بلکہ باقی لوگ بھی جانتے ہیں لیکن جب تک یہ کوئی التزامات کرنا ہو تو اس میں متحرار وجوہات کو نظر انداز کر کے صرف اعداد و شمار کی بنیاد پر فیصلے صادر کیے جاتے ہیں۔ اسی لیے میرا تمہیں مشورہ ہے کہ کم ذرا احتیاط سے کام لو۔“

”مختار انکل ٹھیک کہہ رہے ہیں شریکار یہ تمہاری پہلی ہفتک ہے۔ تم ابھی سے اسے اسٹیکٹ کی زور پر آجائو گے تو تمہارے کیریئر کا کیا بگاڑ؟“ سجاد رانا نے بھی آئی جی کی

”اوکے... میں فی الحال پولیس کے کرنے والے کاموں سے الگ ہو جاتا ہوں لیکن کیا اس کے بعد آپ مجھے یہ یقین دہانی کروا سکتے ہیں کہ سارے کام بالکل طریقے سے انجام دیے جائیں گے؟ اللہ آدہ لے دے میرے میں کی ہور ہا تھا؟ وہاں کون لوگ قائم تھے؟ پولیس ان کی طرف سے اتنا عرصہ غافل کیوں رہی؟ ان سارے سوالات کے جواب دہوونے کے ساتھ اسٹیکٹ کے مکمل میں اقبال باجوہ کے شریک ہونے اور اس امر سے میں ڈاکوؤں کے سرگرم ہونے کے مسئلے میں قابل اطمینان حقیقت کی جائیں گی؟“ اس نے گویا اپنے پیچھے بٹنے کی شرارتیں کیں۔

”بالکل۔ فور پور دھماکے اور اللہ آباد کے در سے کا معاملہ تو وہ بھی اب بہت اعلیٰ سطح پر دیکھا جائے گا۔ غیر ملکی ہاتھ ملوث ہونے کا جو امکان تم نے بیان کیا ہے، ہم اس پوائنٹ کو خاص طور پر نوکس کریں گے۔ اقبال باجوہ کے مسئلے میں تمہارے ساتھ ہیں۔ اس بات کی کئی تمہیں اس بات سے ہی ہو جانی چاہیے کہ اس کا نام ہی ایس بی میں ڈلوایا گیا ہے۔ وہ اگر اس میں سے بچ کر ملک سے باہر بھاگنے کی کوشش کرے گا تو کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ گراس میں کوٹا خیر ہے۔ تمہیں مقامی پولیس کے ذریعے ہی عدالت میں پیش کرنا ہو گا اور اس کے لیے ضروری ہے کہ گرفتار شدہ بندہ سامنے لایا جائے۔ ڈاکوؤں کی سرکوبی والا معاملہ البتہ ذرا مزید عا ہے۔ اس کے لیے بہت اچھی منصوبہ بندی، بہادری فوری اور زیادہ وسائل کی ضرورت ہے جن کا فوری طور پر انتظام نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ میں تم سے یہ وعدہ ضرور کرتا ہوں کہ یہ معاملہ میرے مستقبل کے منصوبوں میں شامل رہے گا اور میں اس مسئلے میں بھرپور کارروائی ضرور کرواؤں گا۔“ آئی جی صاحب اسے یقین دہانی کروانے لگے۔

”اوکے... میں راضی ہوں مگر ان سب کاموں سے پہلے آپ کو ایک تھوڑا سا کام اور کرنا ہو گا۔ خوش حلقہ آور عبدالرحمن کی بیٹی ایس بی صاحب کے قبضے میں ہے، وہ بھی اس طرح کہ وہ اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ بے جا دے لوگ بے قصور ہیں اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ ایس بی صاحب سے ان کی رہائی کے لیے بات کریں۔“ اس نے اپنی رضامندی دینے کے ساتھ ایک اور شرط بیان کی تو آئی جی صاحب ہنس پڑے اور سجاد رانا نے غصہ ہوتے ہوئے بولے۔

”بھئی سجاد! پچھلے سترہ سال سے میری دامادی میں

ہونے کے باوجود تم نے کبھی اتنی شرارتیں نہیں کیں، یعنی تمہارے ان بھائی صاحب نے اس بہو کی سی ممانعت میں پیش کر دی ہیں۔“

”پلیز انکل! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں جانی سے آپ کے رشتے کا فائدہ اٹھانے کے لیے یہ سب نہیں کر رہا ہوں بلکہ یہ میرا اصولی موقف ہے۔ اگر آپ کی بڑائی اور ہوت، میں جب بھی کسی سبب سے کہنا اور سنوں، اگر کہنے اور نہ انے کی بہت نہیں دھتا تو استغناء سے کراہی جاہ سے الگ ہو جاتا۔“ سجاد رانا کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس نے معافی دینے ہوئے اپنا موقف واضح کیا۔

”میں سمجھتا ہوں پروردگار! میں نے اسے سال کی سروس میں بھرتی نہیں جھٹی ہے کہ بدلتے کوٹ پچھان لوں۔ بس میں یہ چاہتا ہوں کہ تم جتنی ضرورت ہو جاتی ہو، ہم نظر نہیں گئے۔ عبدالرحمن کی بیٹی کے بارے میں ایس بی سے معلوم کرنا چاہئے کہ لیکن فوری رہائی کی ضرورت نہ ہو۔ وہ انہیں سے تعلق کی وجہ سے وہ بہر حال مشکوک افراد کی لسٹ میں شامل ہیں جنہیں اچھی طرح کھجھکھنے کے بعد بھی دیکھا جا سکے گا۔“ انہوں نے بہت جلدی کے ساتھ بار بار یہ بات ادا دیا تو مزید اصرار نہیں کر سکا۔ استغناء تو وہ بھی سمجھتا تھا کہ صرف اس کے ان لوگوں کو بے قصور قرار دے دینے پر تو بھلا نہیں نہیں چھوڑ سکتی۔ ان لوگوں کے کام کرنے کا اپنا طریقہ تھا جس پر بہر حال انہیں عمل کرنا تھا۔

”میں آپ کی اس مجبوری کو سمجھتا ہوں۔ فی الحال ان باتوں کو چھوڑ دیتے ہیں۔ کھانا لگ چکا ہے، چیلے غار کھانا کھاتے ہیں۔“ کھٹک میں انہیں وقت کے غور کرنے کا اشارہ ہی نہیں ہو سکا۔ وہ دسمہان داری کے نئے جھانچا جہا انہیں بے اصرار اپنے ساتھ ڈانگہ دم میں لے آیا۔

”کھانا خوشنماک نہ پڑا ہوا ہے، کتاب ۱ بج میں نے غارت کو کپ کر دوئی۔ پہلے ہی کراچی اور پھر سے اس طرح کی خبریں سننے میں آتی ہیں، پر اب تو ہمارا جھوٹا سامان بھی کھنڈا نہیں رہا۔ فور پور جو بی آباد کے مقامات میں بہت بڑا سا گاؤں ہے۔ وہاں کے سید سے سادے لوگوں نے بھائی کا کیا بگاڑ تھا کہ ان کی خوشیوں کو یوں برباد کر کے انہیں موت کا تختہ دے دیا گیا۔ میرا دل بہت ادا ہے ان لوگوں کے لیے۔“ رات تقریباً بارہ بجے کا وقت تھا۔ اس وقت کچھ درجی کی چیل پھل ماند پڑ جاتی تھی۔ زبان نائے میں ذوق فریبا ساری ہی سرگرمیاں دم توڑ دیتی تھیں اور سب لوگ اپنے

اپنے کمروں میں جا کر سو جاتے تھے۔ کشور کے لیے یہ آفتاب سے بات کرنے کا سب سے مناسب وقت ہوتا تھا۔ آفتاب کا دیا ہوا سواہل اس سے بہت حفاظت سے سنیاں کر رہا ہوا تھا اور صرف اسی وقت اس سے بات کرنے کے لیے کافی تھی۔ لیچر کے لیے علیحدہ مگر مخصوص کمر دیے جانے کے باعث آفتاب کو بھی اس سے بات کرنے میں مشکل پیش نہیں آتی تھی۔ انہیں جو کچھ ادا کیا گیا تھا، اس میں تین کمرے تھے۔ دو کمروں کو ان کے سامنے چھڑ ڈال کر بیٹھ کر رہتے تھے جبکہ تیسرا نسبتاً چھوٹا لیکن الگ کمر اس کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ ایک تو اس کی حیثیت اب اسکول کے پرنسپل کی سی تھی۔ دوسرے اس کے گھنے پڑنے والے اور رات گئے تک کام کرنے کی عادت کے پیش نظر بھی دوسرے استاد نے فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے اس کے لیے الگ کمرے کو ضروری قرار دیا تھا۔ اس طرح اسے نہ صرف اپنا کام زیادہ آگے بڑھانے کے لیے کاموں میں جاتا تھا بلکہ کشور سے گفتگو کا سلسلہ بھی کسی کے ختم نہیں آتے تھے بجا ہوا تھا۔

تقریباً روزانہ جی ہونے والی اس گفتگو میں وہ ایک دوسرے کو زیادہ اچھی طرح سمجھنے لگتے تھے۔ آفتاب کی قابلیت اور لیاقت تو کبھی ہی مسلمین و خود بھی کشور کی شائستگی، وسیع مطالعے اور ہمدرد طبیعت سے واقف ہوتا جا رہا تھا۔ پہلے اگر وہ اپنے جذبے کی شدت کی وجہ سے اس سے اپنا آپ منوانے میں کامیاب ہوتی تھی تو اب اپنی خوش اطواری کے باعث اور بھی اچھی لگنے لگی تھی۔ اپنے مصروف شیڈول میں سے اس کے لیے روزانہ وقت نکالنا اسے ہرگز بھی ناگوار نہیں گزرتا تھا۔ اس وقت بھی اس نے جو کچھ کہا تھا، دوسرے اس کے اپنے دل کی آواز تھی۔ وہ خود واقعی حقیقت کی وجہ سے نور پر دیکھیں جا سکتے تھے لیکن وہاں جانے والے اس کے سامنے لیچر نے جو کچھ بتایا تھا، اس کو سن لیں یہی ایک حساس دل کے لیے کافی تھا۔ چنانچہ کشور کی بات کے جواب میں وہ خود بھی دلچسپ لگے میں بولا۔

”واضحیٰ درست کہا آپ نے۔ بہت افسوسناک واقعہ پیش آیا ہے نور پور میں۔ ایسے حالات ہیں جہاں میں پیش آئیں، قابلِ ذمت ہوتے ہیں کیونکہ زوشیں آئے والے چاہے کراچی اور لاہور جیسے بڑے شہروں کے باشندے ہوں یا نور پور جیسے چھوٹے سے گاؤں کے ہوتے بہر حال بے گناہ ہیں۔ البتہ نور پور کے حساب سے یہ واقعہ اس اعتبار سے زیادہ افسوسناک ہے کہ اتنے برسوں میں پہلی بار وہاں کسی کو کچھ ترقیاتی منصوبہ شروع کرنے کا خیال آیا تھا لیکن اس بدبخت گردی کے بعد یقیناً وہ منصوبے پیڑنگ میں چلے گئے ہوں

گئے۔ مجھے تو اسی ہی صاحب کا بھی خیال آ رہا ہے کہ انہوں نے کتنی بھاگ دوڑ اور محنت کی تھی اس سلسلے میں، وہ ساری محنت بھی راکش ہو گئی۔“

”ارے ہاں، اسی ہی صاحب کے ذکر پر یاد آ رہا کہ فی دی پران کے بارے میں مجب مجب باتیں کی جا رہی تھیں۔“

”مکروت بدلتے ہوئے اس سے موبائل گواہی میں سے بائیں کال پر لگا دیا اور بولی۔

”بھئی صاحب! آفتاب نے پوچھا۔“

”کوئی پرائیویٹ چمکل تھا جہاں سے دھماکے کے متعلق رپورٹ پیش کرتے ہوئے انہوں نے ذکر کیا گیا تھا کہ اس اہم موقع پر متعلق کے اسٹنٹ مشن صاحب پر اسرار طور پر مظاہرے کا سبب رہے۔ کافی تحقیق کی جا رہی تھی اسے صاحب پر کہ انہوں نے اس اہم موقع پر متعلق غیر ذمے داری کا ثبوت دیا اور موقع پر انہوں کی حرا جی پری کے لیے اسپتال تک نہیں پہنچے۔“ اس نے فی دی پران کی جانے والی رپورٹ کے الفاظ اختصار کے ساتھ بیان کیے۔ ایک پرائیویٹ چمکل سے نشر ہونے والی اس رپورٹ کو وہ چودھری انصاری کی خصوصی اجازت پر دیکھ سکتی تھی۔ حوالی میں ڈش ریسورسنگ سسٹم موجود تھا لیکن اس سے اشتداد اور صرف چودھری ہی کر سکتا تھا۔ حوالی میں موجود باقی فی دی پرنسپل کی فی دی کی نشریات دیکھنے کے لیے ہی کارآمد تھے۔ ایسا حوالی فی دی خواہیں گورنمنٹ کی بکلی ہوئے ہوتے رکھتے تھے یا نہیں تھا۔ جو زمانے کو کچھ دنوں میں مسرت تھے، انہیں علی آواز کی تھی۔ فی دی وی پران کو سبب قبول دھماکے سے متعلق بہت ہی تکی اور مختصر خبریں ہی دی گئی تھیں اس لیے اس نے چودھری سے اجازت لے کر ایک پرائیویٹ چمکل سے خبریں دیکھیں اور سنیں۔

”اس بارے میں مجھے بھی علم ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ شہر یا صاحب ایک بہت ذمے دار آدمی ہیں۔ وہ بلاشبہ اس کو جی کے مرتکب نہیں ہوئے ہوں گے۔ یقیناً انہیں کوئی بہت ہی زیادہ اہم کام درپیش ہو گا اس لیے وہ وقت پر اسپتال نہیں پہنچ سکے ہوں گے۔ آپ پرائیویٹ مختصر پر چمکل کی جانے والی خبروں پر بہت زیادہ غور و سامت کیا کیجیے۔ فی دی پران کی کو چمکل چمکا جاتا ہے تو پرائیویٹ مختصر پران کے ساتھ اتنا مزید سالانہ گزشتہ فی دی جہاں ہیں کہ اس وقت حق ہی سچ ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ شور بہت جانتے ہیں کہ کم مینہ کے ذریعے مسائل کو سامنے لارہے ہیں اور عوام کی خدمت کر رہے ہیں لیکن وہاں بھی کچھ الگ مکمل کیلئے جاتے ہیں۔

جو چمکل جتنی چٹ پٹی اور سنسنی خیز نہیں نشر کرے گا۔ اسے اسے ہی زیادہ روز بزمیسا میں کے گورنر یا دوسرے کا مطلب ہے اشتہارات۔ یعنی جتنے بنگلے اور بھاگ دوڑ ہے، اس کے پیچھے شیعہ کی ہوں زیادہ کا فرما ہے۔“ کشور کی ساری بات سننے کے بعد اس نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

”مکمل ہوئی یا ہاں مجھے تو فی دی نہیں رہا تھا کہ اسے ی صاحب آپ کی رپورٹ پر سنا فی دی ہیں اور آپ ان کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔“ نور میں کر بولی۔

”نور پر سنا فی دی یوں ہی نہیں ہیں جاتا۔ میں نے شہر یا صاحب کی راست بازی اور کچھ کر دکھانے کی کھن دیکھی ہے، اس لیے انہیں پسند کرتا ہوں۔“ اس نے عجیب کی سے جواب دیا۔

”نور! جناب آفتاب اہم صاحب! آئندہ میں آپ کے اسی ہی صاحب کی شان میں کوئی گستاخی کرنے کی جرأت نہیں کروں گی۔“ وہ اسے پھینچنے والے انداز میں بولی مگر پھر باہر سے سنا، ”سننے والی ایک آہستہ نے اسے ٹوکا رہا۔

”میں بعد میں آپ سے بات کرتی ہوں۔“ سرگوشی میں یہ جملہ بول کر اس نے جلدی سے موبائل آف کر کے اپنے کچے کے لیے پھیلا دیا اور تیزی سے دروازے کی طرف چلی۔ دروازے کی تکی پر کمرہ دروازہ کھلے کے بعد اس نے باہر جھانکا۔ غیر تاریک پر آمدہ خالی پر تھا لیکن آخری سرے پر تیزی سے غائب ہوئے کسی عورت کے چوہے کی جھلک اسے نظر آئی۔ وہ عورت کبھی، نہ کافی روشنی کے باعث وہ شامت نہیں کر سکتی لیکن دل کو یہ دھچکا ضرور لگ گیا تھا کہ کسی نے اس کے کمرے کے دروازے سے کان لگا کر سن کر لینے کی کوشش کی ہے۔ اس کا وہاں بھی ہو سکتا تھا اور اس بات کا بھی امکان تھا کہ کوئی ملازمہ یا چوہی پر آمدہ سے کمرہ پر کسی کام سے گئی ہو لیکن پھر بھی یہ اندیشہ تو اپنی جگہ تھا کہ کسی نے اس کی موبائل پر آفتاب سے ہونے والی گفتگو سن لی ہو۔

☆ ☆ ☆

”بھئی جان ابھی مصیبت میں آئی ہوئی ہے۔ حد سب کا بے مال میں لیکن بڑا امیر کیا ہی جاؤں گا فارایت آفیسر ہووا۔“ اقبال باجہ بہت زیادہ پریشان نظر آ رہا تھا۔ جب سے اس کی شہ بکری اور کھانسی پڑی تھی میں اس کا برا حال تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ طور فارایت آفیسر اس پر ذمے داری عائد ہوئی ہے اور جلد ہی یہ دیر اس سے اس سلسلے میں سوال کیا جائے گا۔ اس کے دل میں خیال آیا تھا کہ فرار ہو جائے لیکن ایسی فی نے اپنے اس ارادے پر عمل کرنے سے

باز رہنے کا مشورہ دیا۔ اس سے معاملات کو کتنا ہی پیچھا جاتا لیکن وہ جس پوزیشن میں تھا اسے کچھ نہ کچھ خبریں تو سن ہی جانی تھیں۔ چنانچہ وہ جانتا تھا کہ اقبال باجہ کی طبیعت پر گھبراہٹ کی جا رہی ہے اور اس سے فرار کی کوشش کی تو کھڑا جائے گا۔ اس طرح اس کی ذات مزید مشکوک قرار دی جا سکتی تھی۔ اب ایسی فی کے ذریعے ہی انہیں یہ اطلاع دی گئی کہ کس حالت میں پیش کر جانے والا ہے اور کس کد حالت میں پیش کرنے سے پہلے کی اہم شخص کی گرفتاری کا امکان ہے۔ زیادہ امکان یہ کہ تھا کہ وہ انہیں شخص اقبال باجہ وہی ہو گا۔ اس لیے وہ اپنی سر پٹی سے گھبرا کر چودھری انصاری کو ہی آگیا تھا اور شکوے کر رہا تھا۔

”کیوں فکر کر رہے ہیں باجہ صاحب؟ ہم آپ کو کھانا (اکھلا) تھوڑی چھوڑیں گے۔ اگر وہ گرفتاری ڈالتے ہیں تو ڈال لینے دیں۔ ہم نے باندہ دست کر رکھا ہے کہ وہ کسی طرح آپ پر الزام کو کھانے تک نہیں کے۔ جس روز پولیس نے مال چلا تھا، اس روز کے لیے تارڑنے آپ کو مشورہ دیا تھا کہ اپنی کئی بورنگ موٹیوں کے گواہ تیار کر لیں۔ آپ نے یہ کام کر لیا کہ نہیں؟“

”دو تھیں نے انعام کر لیا ہے۔ میرے دو دوست گواہی دینے کے لیے تیار ہیں کہ صرف اس رات بلکہ اس سے پہلے کے دو دن بھی میں ان کے ساتھ انعام میں تھا۔“ چودھری کی بات کے جواب میں اس نے فوراً بتایا۔

”اس تو فیر کیا مسئلہ ہے۔ آپ صاف بول سکتے ہو کہ کسی نے میری غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر ایسی حرکت کر ڈالی۔ اگر میں موجود ہوتا تو کبھی اور کھانسی تو ایک طرف، جنگل سے ایک جنگلی بال بھی اچھے اچھے دھڑکیا جاسکتا تھا۔“

”مگر وہ جو کم جینے لگا رہا ہوا ہے اور میرے گلے میں لٹکا ہوا ہے۔ وہ تو تھا ہی باندہ۔ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے بڑی مرضی سے ہوتا ہے۔ وہ اتنے دنوں سے پریس کی تحویل میں ہے، اب تک تو پولیس والوں نے اسے مار مار کر اس سے سب کچھ معلوم کر لیا ہو گا۔ اس کا بیان مجھے پھسوا سکتا ہے۔“ باجہ کی تشویش اپنی جگہ تھی۔

”اس کی آپ فکر نہ کریں۔ اس کا بندہ دست تارڑ صاحب خود کر لیں گے۔ آپ ہمارے مخالفین کو تھوڑا بہت کھیلنے کا موقع دے دیں۔ فی دیکھئے کہ کام کیسے آپ کو ممکن میں سے ہال کی طرح اس میں سے نکال لیتے ہیں۔ ساری محنت ملی میں ڈل گئی اس اسی اور اس کے پتہ توں کی تو میرا نام بدل کر رکھ دیجئے گا۔“ چودھری نے اسے اطمینان دلایا۔

”اس سے کی وجہ سے تو میں پریشان ہوں۔ بڑی پہنچ والا بندہ ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ کیسے اس کے اشارے پر میرا نام ای سی میں ڈال دیا گیا۔ یعنی میں چاہوں تو یہاں سے بچ کر ملک سے باہر بھی نہیں نکل سکتا۔ اپنے طور پر تو میں نے انتظام کر لیا تھا کہ اگر کسی طرف سے ہرجم ثابت ہو گیا تو میں ملک سے باہر نکل جاؤں مگر اس نے یہ راستہ بھی بند کر دیا۔“

”بھئی بڑی ہی باجو صاحب ان گزروں کو کہ آپ دیکھیں گا کہ اس بات کی فوجت ای نہیں آنے پائے کی کر آپ کو نہیں لگنے کا سوچنا پڑے۔ آپ میں بڑی فکریں گئے اس میں سے اور اپنا جگہ پر کام کرتے رہیں گے۔“ پھر دھری نے ہنسی بجاتے ہوئے اسے ٹپکی اور پھر بات بدلتے ہوئے بولا۔ ”پچھلے چل کر کھا کھا پیتے ہیں۔ کھانے کے بعد کچھ دیر بیٹھ کر شہر میں گھومنے گئے تاکہ آپ کا ذہن بہت چلے۔“ اس کا یہ حد سے زیادہ اطمینان اقبال باجوہ کے لیے بھی تسلی کا باعث تھا۔ پھر دھری کے اسے ”بھئی“ بولنے کا مضطرب تھا کہ واقعی اسے چھاننے کے لیے انتظامات کر لیے گئے ہیں ورنہ اگر وہ بیٹھتا تو پھر دھری اور ان کی بی بی بھی چھٹیں جاتے۔ وہ تینوں ایک ایسی کشتی میں سوار تھے کہ اگر کوئی ایک دو ہوتا تو وہی دو افراد انھیں ساتھ ہی لے کر ڈوبتا۔

”میں نہیں سے منت لیں تو پھر اس بات کی بھی چھان میں کرنی ہوئی کہ مال بچاؤ اس کی بھڑکیا ہو چکا ہو۔ پہلے تو چلو موٹی والا کی وجہ سے جبریلک آؤت ہوئی تھی لیکن اب کس نے یہ بھڑکی کی؟ ہماری تمام تر پلاننگ کے باوجود جس طرح اسے ہی شہر بار سے ڈی ایس بی کے ساتھ چل کر کارروائی کی، اس سے تو صاف ظاہر ہے کہ اس کے پاس بالکل کتنا بھڑکی کا مال کسب لے جایا جا رہا ہے۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ ہم نے اسے ڈاکوؤں والے معاملے میں الجھ لیا ہے لیکن حالات سے تو یہی ظاہر ہو کر وہ ہماری چال میں آیا نہیں تھا اور ایسا ہی صورت میں ہو سکتا تھا کہ اس کے پاس بالکل ساڈا انفارمیشن موجود ہو۔“ ایس انفارمڈ کو اجھڑا ہو گا ورنہ آگے بھی ہمیں مشکل پیش آسکتی ہے۔“ سوچ ڈاکوئنگ ٹیمیل پر سبے ڈھروں لوازمات سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اقبال باجوہ نے دوسرا اہم مسئلہ اٹھایا۔

”اس پر تو پہلی ہی کام شروع ہو گیا ہے۔“ عرفی کی ہانگ جھنجھڑتے ہوئے پھر دھری نے جواب دیا۔ ”میں نے بالے کو اس کام پر لگا دیا ہے۔ آج کل وہ فارغ رہی ہے۔ میں نے اس سے کہا ہے کہ ان بندوں پر نظر رکھو جو رشوت کی

کنی اور لوڈ لکھ و غیرہ کا کام کرتے ہیں۔ چاندروں کا پتہ کر کے ان کی کھالیں اتارنے اور پھونکا کرنے والوں پر تو ایسا کوئی شک کیا ہی نہیں جاسکتا۔ وہ تو سارا وقت جنگل میں ہی گزارتے ہیں۔ ان کا باہر سے کسی بندے سے رابطہ ہی نہیں رہتا کہ وہ ایسی کوئی ساز باز کر سکیں۔ بالآخر سے پھر پراس کام پر لگ گیا ہے۔ وہ ڈھونڈنے کا اس تک حرام کو۔ پھر اس کا جو شہر ہو گا اس کو دیکھنے کے بعد کسی کی بہت نہیں پڑے گی کہ اس کی ملک خرابی کا سوچ بھی سکے۔“ فیسے کے باعث اس کا چہرہ بڑھ سا گیا تھا اور اس کی طرف دیکھنے پر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی جنگی کتا اپنے ہاتھ آئے شکار کو بھیج رہا ہو۔ اس کا سامنی ہونے کے باوجود اس کے اس انداز پر اقبال باجوہ کے جسم میں پھر بھی سی وی دوڑ گئی۔ وہ ڈاکوئنگ منصوبہ بدل کر دوسرا دھری کی پہلی پھلکی پانچ کر کے لگا۔ کتا بہت کم کرنے کے بعد وہ لوگ دوبارہ دھنک میں واپس آ گئے اور شہر کی باڑی بنائی۔ شہر چھپتے ہوئے ان دونوں کا وقت خوش گوار ماحول میں بہت تیزی سے گزرا۔ اقبال باجوہ جب چوٹی سے روانہ ہوا تو بہت مطمئن تھا۔ اطمینان کے باعث وہ بہت خوش گوار موڑ میں گاڑی ڈرا کر تہا ہوا جنگل کے قریب ہی واپس اپنے بنگلے تک پہنچا۔ وہاں پہنچے اسے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک ملازم نے اسے پولیس کے آگے کی اطلاع دی۔ اس اطلاع کو سن کر اسے اپنے اعصاب میں کشیدگی کی محسوس ہوئی مگر پھر وہ خود پر قابو پاتے ہوئے اپنے کمرے سے نکل کر باہر آؤٹ میں آیا۔ یہاں پولیس کا ایک آفیسر مونسے پر بیٹھا ہوا تھا اور وہ چاہی اس کے پیچھے کمرے سے۔

”مجھے ڈی ایس بی منظور کیے ہیں۔ میں جنگل سے ہونے والی لکڑی اور کٹائوں کی غیر قانونی اسٹنگلک کے پھیلے پر کام کر رہا ہوں۔“ اس کے لادوچ میں چھپتے پر پولیس آفیسر نے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے تعارف کر دیا۔

”اوہ آپ... میں تو بہت دنوں سے منتظر تھا کہ آپ میرے پاس تحریف لائیں لیکن نہ جانے کیوں آپ نے اس میں پر کام کرتے ہوئے مجھ سے ملاقات نہ کرنا پسند نہیں کی۔ میں نے اپنے طور پر اپنا فرض ادا کرتے ہوئے آپ کے مجھے کو ایک خط بھیج دیا تھا کہ اس افسانہ تک واقعے کے وقت اگرچہ میں یہاں موجود نہیں تھا لیکن یہ طور فارایسٹ آفیسر اور مجھ واپس شہر میں اس جرم کی شہرہ خدمت کر رہا ہوں اور اگر پولیس کو اس کیس کی تحقیقات کے لیے کسی مدد کی ضرورت ہے تو میں خدمت کے لیے حاضر ہوں۔“ کتا بہت معمولیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے ڈی ایس بی کو جھٹکے کا اشارہ دیا

اور خود اس کے سامنے واپس نشست سنبھال لی۔

”آپ کا کھانا کھال گیا تھا تو درمیان میں نور پور میں دھماکا والا واقعہ پیش آیا اور ہمیں اس طرف مصروف ہونا پڑا اس لیے وقتی طور پر اسٹنگلک میں پر کام کر گیا تھا۔ اب وہ پولیس انجینئرز کے پاس چلا گیا ہے اس لیے ہم نے رکا ہوا کام دوبارہ شروع کر دیا ہے۔ اس سسٹم میں ہم آپ سے خدمت لینے نہیں بلکہ آپ کی خدمت کرنے کے خواہش مند ہیں ای سی لیکچرر دعوت نامہ لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔“ معنی خیز لہجے میں بولتے ہوئے ڈی ایس بی نے اس کی طرف ایک کانٹہ بڑھایا۔ وہ کانڈاس کے ہاتھ سے لے کر اس کا جائزہ لینے کا۔ فوراً ہی اس کے ہاتھ پر ٹھٹھکیں پھیں گئیں۔ وہ اس کی گرفتاری کا وارنٹ تھا۔

”یہ کیا کیا اس ہے؟“ فیسے کا مظاہرہ کرتے ہوئے اقبال باجوہ نے کانڈاس اپنے ہاتھ سے پھینکا تو وہ ڈی ایس بی کے قدموں میں گر کر۔ ”یہ کیا نہیں آپ کا ریٹ وارنٹ ہے۔ جنگل سے ہونے والی اسٹنگلک میں آپ کا نام شریک جرم کے طور پر سامنے آیا ہے۔ گرفتار شدہ ولام کے بیان کی روشنی میں یہ وارنٹ وارنٹ جاری کیا گیا ہے۔ اس کی رو سے میں آپ کو گرفتار کرنے کا پورا اختیار رکھتا ہوں۔ اب یہ آپ کی مرضی ہے کہ آپ میرے ساتھ تعاون کرتے ہوئے عزت کے ساتھ خود خویش کر گاڑی میں بیٹھ جاتے ہیں یا میرے ساتھ موجود سبائیوں کو زبردستی کرتے ہوئے آپ کے ہاتھوں میں پھنکریں گا کہ آپ کو زبردستی لے جانا پڑتا ہے۔“ اس نے جھک کر اپنے قدموں میں آگے دالے وارنٹ کو اٹھایا اور بے حد غصہ سے لہجے میں بولا۔

اس کے الفاظ اقبال باجوہ کو اشتعال میں مبتلا کر رہے تھے لیکن پھر اسے کچھ دیر نہیں دیا پھر دھری کا مشورہ یاد آ گیا۔ اس نے کہا تھا کہ اگر پولیس گرفتاری والے تو گرفتاری دے دیتا۔ چھٹیں جاتے کا انتظام پورا ہے۔ اس بات کے یاد آتے ہی وہ قدرے پرسکون ہو گیا اور سیات لہجے میں بولا۔ ”ٹھیک ہے، میں خود چھپنے پر راضی ہوں لیکن یاد رکھنا کہ جلد پولیس کو اپنے اس رویے کے لیے مجھ سے معافی مانگنی پڑے گی۔“

”یہ تو وقت خود بتا دے گا کہ کس کو کیا کرنا پڑے گا؟“ ابھی تو مجھے اس پر غور کرتا ہے جو اس وارنٹ پر لکھا ہے۔ ”ڈی ایس بی منظور ہے جواب دیا تو اقبال باجوہ مت جانتے ہوئے اس کے ساتھ جانے کے لیے اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس کے اس تعاون کی وجہ سے اس کے ہاتھوں میں پھنکریاں نہیں

لگائی گئیں مگر پولیس کے سپاہی چونکا اذ میں اس کے دائیں بائیں ضرور آ کر کمرے ہو گئے۔ تین صاحب اختیار اور بہ ظاہر عزت دار نظر آنے والے عزموں کی بھون میں سے ایک فرد کو قرار کر کے پولیس انجینئرز کے چاہا جا رہا تھا۔ یہی معمولی بات نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

”بڑی گزرتی ہوئی ہے سراسر آپ کی دی ہوئی انفارمیشن پر میں پولیس یا رتی کے ساتھ جنگل میں گیا تھا۔ جس کو آپ نے لکھتے دی تھی وہی وہی تو قتل کی ہے لیکن وہاں سے کچھ ہاتھ نہیں آیا ہے۔“ وہاں کوئی بندہ تھا ورنہ ہی ایسا کوئی سامان نہیں سے یہ ظاہر ہوتا کہ وہاں پکار رہے ہوئے چاندروں کی کھالیں ہزار کھالیں کسی پر ویس سے ڈرا جا رہی تھیں صرف ایسے اترے ہیں جن سے ہاتھ مل رہا ہے کہ وہاں کچھ لوگ رہتے تھے۔ یہ کیچڑی کی بھی موجود ہے جو اس بات کا شہوت ہے کہ وہاں کوئی کام کیا جا رہا تھا لیکن یہ شہوت نہ کافی ثابت ہوئی گئی۔ اگر ہم کسی بندے کو گرفتار کرنے اور کچھ سامان ہڈانے میں کامیاب ہو جاتے تو ہمارا کیس مضبوط ہو سکتا تھا۔ اب تو میں لوڈ کے ذرا بچ رہا تھا جس کے بیان پر ہی پورے سسٹم کا اٹھارہ سے اور وہ بھی میرے خیال میں اس لیے تھوڑا شہرت نہیں ہو گا کہ اقبال باجوہ کے بیان کے مطابق وہ اس عرصے میں جب جنگل سے لکڑی اور کھالیں آسکتی گئیں، یہاں موجود ہی نہیں تھا۔ اس نے جہلم میں رہنے والے اپنے دو دوستوں کے ہم ہوتے بھی نہیں کھنڈا دیے ہیں کہ جاؤ اور جا کر ان سے تعریف کر لو۔“ اس نے آئی جی مختار اد سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ پولیس کے معاملات میں دخل اندازی سے گریز کرے گا لیکن یہ کیس تو شروع سے اس کی مدد سے چل رہا تھا۔ انور کو محفوظ رکھنے کے لیے وہ اسے پولیس کے سامنے لائے گا کہ اسٹنگلک میں لے سکتا تھا۔ اس لیے ظاہر ہے کہ یہ سبھی کچھ پروردہ کر پولیس کی مدد کرنا ہی کی بھڑکی تھی۔ مال بچنے جانے کے بعد ہی اس نے انور کی بی بی کو لے کر وہی طرح فوج لگے کہ چاندروں کی کھالوں کو محفوظ کرنے کا کام کہاں کیا جا رہا ہے؟ انور کو اس کا میں کافی وقت لگ گیا تھا۔ اس دوران آئی جی صاحب کے کم پر انھیں مجبوراً کیس عدالت میں لے جانا پڑا تھا اور انھیں اس کیس کی پہلی پیشی ہونے والی تھی کیونکہ گرفتار ولام نے اقبال باجوہ کا نام لیا تھا اس لیے اسے بھی عدالت سے وارنٹ سے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ انور کی طرف سے کام کی اطلاع باجوہ کی گرفتاری کے بعد ہی تھی

اور اس اطلاع پر پولیس تحریک بھی ہو گئی تھی۔

اطلاع ملنے اور پولیس کے حرکت میں آنے کے درمیان صرف ایک رات کا وقفہ پایا تھا، وہ بھی اس مجبوری میں کہ کچھ ہنگامی تدابیر کی ضرورت تھی۔ پولیس کے غیر دانش مند نووارد پولیس پارٹی کے لیے نقصان دہ ہو سکتا تھا لیکن اس وقت نے پولیس کو ناکامی کا ذرا دکھایا تھا۔

”بصرے خیال میں باجوہ کی گرفتاری کے بعد ان لوگوں نے احتیاطاً اپنا بیٹ اب ختم کر دیا ہوگا۔ انہیں ڈر ہوگا کہ کہیں پولیس اس سے کوئی ایسا مصروف کر دے گی کہ وہ اس کا سیلاب نہ ہو جائے جس کے بعد اس طرف چڑھائی کر دے، اس لیے انہوں نے فوری طور پر سب کچھ ناگہان کر دیا۔“ اس نے ڈی ایس بی کی منظوری پر ہی بات سننے کے بعد خیال ظاہر کیا۔

”مگر اتنی اچانک؟“ اقبال باجوہ گرفتار ہوگا اس بات کا تو انہیں پہلے ہی اندازہ ہوگا۔ اس کی وجہ سے اپنا پول مل جانے کا انہیں اندیشہ تھا تو یہ ساری کارروائی پہلے ہی ہو جانی چاہیے تھی بلکہ آپ کے اندر مری اطلاع سے ظاہر ہے کہ کل تک سب کچھ موجود تھا پھر اتنی تیزی سے انہوں نے جگہ کیوں خالی کر دی؟ ہم باجوہ سے کچھ افواہوں میں کامیاب ہوئے بھی اس وقت جب عدالت سے اس کا جہان دیا گیا تھا۔ پلٹے میں کامیاب ہو جاتے۔ یعنی مجرموں کے پاس اپنی جگہ خالی کرنے کے لیے کافی وقت تھا بلکہ انہوں نے جس طرح راتوں رات کارروائی کی ہے، اس سے تو یہی ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ لوگ کسی طرح پولیس کی رہے سے واقف ہو گئے تھے۔“ ڈی ایس بی نے ایک شخص غلط فہمی کیا تھا جس پر دو سوچ میں پڑ گیا اور جو کہانی بات ذہن میں آئی، وہ وہی تھی کہ انہیں اور تو کسی کے ہاتھ نہیں چڑھ گیا؟

”آپ ویٹ کریں۔ میں تھوڑی دیر بعد آپ کو کال کرتا ہوں۔“ اس نے فوراً ڈی ایس بی کی کال منقطع کی اور اپنے موبائل سے انور کے موبائل کا نمبر ملائے لگے۔ انور کو موبائل اسی نے فراہم کیا تھا۔ اسے موبائل کے استعمال کا طریقہ بتائی تھا اور یہ کیا تھا اور ساتھ ہی یہ ہدایت بھی دی تھی کہ موبائل کو بے صدا اختیار سے سب کی نظروں سے چھپ کر رکھے۔ انور موبائل کو سہاڑا ڈوری میں باندھ کر اسے اپنے گھر میں ڈالے رکھتا تھا۔ دیکھنے والوں کو اس کے گھر میں پڑی سیاہ ڈوری ہی نظر آتی تھی۔ چھوڑا سا موٹا سیٹ اس کے گریبان سے نرہ والی ڈوری سے لگا نہیں کے پیچھے اس کے سینے سے لگا رہتا تھا۔ موبائل پر آنے والی کال کا احساس

اسے اس قدر تھرا بہت سے ہوتا تھا جو موبائل کے واہرین کرنے پر اسے اپنے سینے پر محسوس ہوتی تھی۔ اگر وہ مختل پوزیشن میں ہوتا تو کال وصول کر لیتا، ورنہ ان جان بن جاتا۔ دیکھنے والے اندازہ ہی نہیں کر پتے کہ وہ جس ڈوری میں اپنے گھر کے بغیر ہاتھ دھو کر گرہاں کے اندر چھپائے رکھتے ہیں، انور اس ڈوری سے ایک موبائل سیٹ دیکر کھنکھاتے اور چوہری کے خلاف تجزیہ کا کام کرتے ہیں۔ لیکن اب جس طرح مسلسل کال کرنے کے باوجود اس کا موبائل خاموش تھا اس سے یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کا یہ ڈوری کسی کے علم میں آگئی ہے۔ راز سے واقف ہونے والا، اگرچہ چوہری کا کوئی بندہ تھا تو یہ امر یقینی تھا کہ اب انور، چوہری کی گرفت میں ہوگا۔ شاید وہ اسے اندازہ کرے کہ فوراً بعد ہی گرفت میں آگئی تھا۔ اسے پکڑنے کے بعد وہ یہ جان لینے میں کامیاب ہو گئے ہوں گے کہ کون پولیس وہاں رہ کر رہے، والی ہے چنانچہ رات بھر میں وہ جگہ خالی کر دی تھی۔

متحدہ پارکال ماننے کے بعد بھی سب مایوسی کا سامنا ہوا تو اس نے تھک کر موبائل رکھ دیا اور ایک بار پھر ڈی ایس بی کی منظوری کا نمبر ملا یا۔

”آپ کا خیال ٹھیک مضبوط ہوتا ہے ڈی ایس بی صاحب! ہم اپنے انداز سے رابطہ نہیں ہو رہا ہے اس لیے اس بات کا پورا امکان ہے کہ وہ پکڑ گیا ہے۔“ یہ اچھا نہیں ہوا اس طرف ان کی پوزیشن مسلسل مضبوط ہوتی جا رہی ہے۔ میں نے باجوہ کے جسم میں اپنے دوستوں کے ساتھ جین دن گزارنے والے بیان کی حقیقت کے لیے جو بندے لگے تھے، انہوں نے اپنی رپورٹ دے دی ہے۔ یہاں سے جملہ کے راستے میں آنے والی متعدد چیک پوسٹ پر باجوہ کی گاڑی کے نمبروں کا ریکارڈ ملا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ واقعی جہنم گیا تھا اور ہم عدالت میں اس کے لیے گواہی دینے والے اس کے دوستوں کے بیان کو یقینی نہیں کر سکیں گے۔ ہم نے اپنے طور پر دو شخص گواہیاں جمع کر لی ہیں کہ باجوہ غلط بیانی سے کام لے رہا ہے، وہ ہرگز بھی جہنم نہیں گیا تھا اور یہیں اپنے ہنگامے میں موجود تھا۔ یہ گواہ اس کے دو گناڑے تھے لیکن اب ان کی گواہی کی کوئی اہمیت نہیں رہے گی۔ یہی کہا جائے گا کہ پولیس نے ملازمین کو ذرا دھمکا کر ان سے یہ بیان لیا ہے۔ دو ملازمین کی گواہی کے مقابلے میں باجوہ کے دوستوں کا بیان اور چیک پوسٹ سے ملنے والا ریکارڈ زیادہ مضبوط ثابت ہیں۔ ہمیں ان دونوں کے سامنے باہر جانی پڑے گی۔“ ڈی ایس بی کے سچے میں کافی

باہر تھی۔ اس کیس پر کام کرتے ہوئے وہ جتنی بڑبڑاتا تھا، اب مسلسل ناکامیوں پر ناامید سا ہو گیا تھا۔ وہ عرصے سے پولیس میں تھا اور جانتا تھا کہ ایسے ثبوت کس طرح بنائے جاتے ہیں۔ باجوہ کی پشت پناہی خود انہیں کی صاحب کر رہے تھے اس لیے اس کے لیے ایسے ثبوت حاصل کر لینا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

”آپ اتنے باہر نہیں ہوں۔ ہمارے پاس خدا بخش کی صورت میں ایک اہم گواہ تو موجود ہے۔ اس کے بیان سے عدالت ضرور متاثر ہوگی۔ پھر باجوہ کو اس بات کا بھی جواب دینا پڑے گا کہ جنگل میں موجود وہ کون کس کے استعمال میں کی اور وہ کیوں اس سے لاپرواہ؟ اس کی کم از کم اس شخص کو معطل تو ضروری کرنا ضروری ہوگی۔ آپ پریشان نہ ہوں اور کل کی عدالتی کارروائی کے لیے تیار رہیں۔“ حالات واضحی ان کے خلاف تھے لیکن وہ وہاں سے ہٹ کر انہیں ماننا چاہتا تھا اس لیے ڈی ایس بی کی کوشش تھی۔ اس وقت وہی تھا جو اس کے لیے عملی طور پر کام کر رہا تھا اس لیے اس کا حوصلہ بند نہ رہا بہت ضروری تھا۔

”میں نے کچھ نہیں کیا، کیا... مجھے تو کچھ مل رہی نہیں۔“ میں تو اس روز سویرے سے اپنے بندے سے گھما کر ڈی پوزیٹی لے کر لگا تھا کہ اس کے شہر میں کسی آدمی کو کچھ دوں گا۔ میں (پولیس) نے کچھ کرب (غریب) کو اپنا ٹکٹ بھریا۔ غیر مجھے اپنے ساتھ جانے کے بندے لگے۔ میں اسے دونوں سے ان کی قدیم تھا۔ غریب والوں نے مجھے بہت مارا پیٹا اور کہنے لگے کہ یہ بیان دے، ورنہ تم اس کوڈرے (ڈرائیور) ہو جس پر جنگل سے نکڑی اور کھائیں دھرے آھر کی جارہی ہیں۔ شروع شروع میں، میں نے ان کی گل مانتے سے انکار کر دیا، پولیس کی مار کے آگے میں کرب آدمی کب تک چھوڑا؟ میں راضی ہو گیا کہ جو تم لوگ کہتے ہو میں مان لیتا ہوں۔ مجھے چنے آن پڑا تھا کہ اسے انہوں نے کاندھا (کاندھ) پر اٹھرا لگا لیا۔ یہ میں سچ کہہ رہا ہوں سرکار! میں نے قصور ہوں۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔“ انور ڈرائیور میں کی گواہی پر اب اس میں کا اٹھار تھا، عدالت میں بیان دیتے ہوئے نفسی بدل گیا تھا۔ حالانکہ اس سے قبل وہ وعدہ معاف گواہ کے طور پر عدالت کے سامنے سچ بولنے پر راضی تھا مگر اب اس کے اس بدلے ہوئے بیان نے صورت حال بالکل بدل کر رکھ دی تھی۔ اس بیان نے کمرائے عدالت میں سسٹی می پھیلا دی تھی۔ ڈی ایس بی کی منظوری کے بعد ہی کے عالم میں کمرے

میں سسٹی می فعل بننا کر کوڈرے کوڈرے کے ڈرائیور کو گھر پر تھا۔ عدالت میں پیش ہو جانے کے بعد بیان بدل لینا اکثر مجرموں کا اختیار ہوتا ہے لیکن اس گھر کے بیان بدل لینے کا مطلب تھا، کیس کا بے حد کمزور ہو جانا۔

”گواہ نے اپنا بیان بدل لیا ہے جناب! اور نئی ہے کہ پولیس نے اسے شک کی کوشش کو کام نہ جاتے ہوئے جن دنوں کوڈرے کوڈرہ ادا ان میں سے ایک کوڈرہ میں یہ سوار تھا اور اس نے اپنے دیگر ساتھیوں کے ساتھ پولیس کے خلاف ہاتھ دھو کر عزائم کی گئی۔“ طرم سے لپٹے سے ملنے والے ہتھیار پر اور کوڈرے کے اندر سے جا بجا اس کی انگلیوں کے نشانات ملے ہیں اور یہ نشانات پولیس ریکارڈ میں موجود ہیں۔ چنانچہ میں غافل عدالت سے درخواست کر رہا ہوں کہ اس شخص کو کمرے ایک ہفتے کے ریمانڈ پر پولیس کی کڑی میں دے دیا جائے کہ اس سے حقیقت اٹھائی جائے۔“ اس موقع پر سرکاری ویلے نے مداخلت کرتے ہوئے درخواست کی۔

”یہ علم ہے سرکار! اس والوں نے زبردستی مجھے ہتھیار پکڑا یا تھا اور کوڈرہ میں بھی خود مجھے سے تھے۔ آپ مجھے ان کے حوالے کر دیں گے تو یہ مجھ پر اور ظلم کریں گے۔“ انور ڈرائیور چلے۔

”عدالت طرم کو جان کے ریمانڈ پر پولیس کڑی میں دیتی ہے، سرکاری وکیل کے پاس اگر پڑ جائے تو اسے عدالت کے سامنے پیش کرے۔“ اس شخص کے والد نے پر کان دھرے بغیر نے اپنا فیصلہ انور سرکاری وکیل کو سن دیا۔ ”شکر یہ پورا خزانے مزید کوئی گواہ پیش نہیں کرنا۔ وکیل سفائی اپنے گواہان کو پیش کر سکتے ہیں۔“ سرکاری وکیل چبھے بہت گیا۔ طرم ان کے کمرے میں کھڑے اقبال باجوہ نے اس صورت حال کو اٹھائے کیا۔ عدالت میں یہ میں پیش کرتے ہوئے ڈی ایس بی کی منظوری سے جو بیان دیا تھا، اس میں اسی کوڈرہ ڈرائیور کے بیان کی بنیاد پر اسے مورد الزام ٹھہرایا گیا تھا۔ اس کے علاوہ جنگل میں دریافت ہونے والی مشکوک کھوکھالی کے حوالہ دیا گیا تھا کہ سب سے زیادہ اہمیت اس گواہ کی تھی اور جب وہ مگر کیا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ پولیس بے بس تھی۔ کم از کم اب پولیس کے لیے اسے مزید اپنی حراست میں رکھنا ممکن نہیں تھا۔ اس کا وکیل آج ہی عدالت سے اس کی ضمانت کر دے گا اس میں کامیاب ہو جاتا۔ گواہ نے اپنا بیان کیسے بدلا ہوگا۔ یہ بات مجھے سننا تھا۔ اس کے سامنے دار چوہری اور اس کی بی بی کوئی ایسی چال چلی ہوگی کہ گرفتار طرم کو وعدہ معاف گواہ دینے میں کی پولیس کی ساری محنت

اکارت چلی گئی۔ وہ جو عدالت میں پیش ہوتے ہوئے تھوڑا سا گھبرا ہوا تھا، اب بالکل مطمئن تھا اور طرمان کے کنبہ سے میں کھڑا ہونے کے باوجود اتنے مزے سے عدالتی کارروائی دیکھ رہا تھا جیسے کسی سینٹر میں موجود ہو اور اپنے سامنے کھیل جانے والا کوئی بچہ دیکھ رہا ہو۔ ویل صفائی نے اس کے دونوں دوستوں کو باری باری عدالت کے سامنے پیش کیا جنہوں نے گواہی دی کہ اقبال باجوہ تین دن تک مسلسل ان کے ساتھ جیل میں تھا۔ چیک پائس سے حاصل کردہ ریکارڈ کی کاپیاں بھی ثبوت کے طور پر عدالت کے سامنے پیش کی گئیں۔ ان گواہیوں اور ثبوت کے بعد صورت حال یوں ہو گئی کہ بے شک اقبال باجوہ بہ طور قاریست آفیسر اپنے فرائض سے کوتاہی کا سرکھب ہوا ہے۔ جنگل میں جاری سرگرمیوں سے اسے واقف ہونا چاہیے تھا لیکن اس کے براہ راست کسی جرم میں شریک ہونے کے شواہد موجود نہیں تھے اس لیے عدالت نے اس کی درخواست ضمانت منظور کر لی۔ عدالت کے اس فیصلے پر اقبال باجوہ کا چہرہ کھل اٹھا۔ اسے یقین تھا کہ ضمانت کی طرح اسے جلد اس میں سے باخراہ بری ہونے کی خوشخبری بھی سننے کو مل جائے گی۔ جیسے ہی بج نے دونوں طرف کے افراد کو اگلی پیشی پر عدالت میں حاضر ہونے کا حکم دے کر عدالت برخاست کی، کمرائے عدالت میں موجود چند صحری افغان گلاب کے پھولوں کا ایک مونا سا بار لے کر اس کے قریب پہنچ گیا اور بار اس کے گلے میں ڈال کر گرم جوشی سے اسے مبارکباد دیتے ہوئے اس سے معاف کیا۔ اقبال باجوہ خود بھی ایسے خوش تھا جیسے واقعی بے قصور ہو۔ جیل سے گواہی کے لیے آئے ہوئے اس کے دوست بھی اس کے قریب پہنچ چکے تھے۔ ان سے مبارکبادیں وصول کرتا ہوا اب وہ اس سگھائی کے سوا لوں کا جواب دے رہا تھا جو اس کیس پر اس کا موقف جاننے کا خواہش مند تھا۔ اس قضیے سے بے نیاز بنے پولیس اہلکار کوڈر ڈرائیور کو اپنے گھر سے میں لیے عدالت سے باہر نکل گئے۔ چند قدموں کے فاصلے پر دو پولیس چین کھڑی تھی جس میں اس شخص کو لے جایا جاتا تھا۔ اس سے قبل کہ یہ چند قدموں کا فاصلہ طے ہوتا، نقضاً میں ایک فائرنگ آواز کوئی اور پولیس کے گھر سے میں موجود کوڈر ڈرائیور نیچے گر کر رہنے لگا۔ اس صورت حال پر ایک دم بھگدڑ مچ گئی۔ کچھ پولیس والے یہ سمجھ گھٹنے کے لیے بھاگے کے فائرنگس طرف سے کیا گیا ہے اور کچھ فرش پر تر پڑے ہوئے زخمی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ کوئی اس کے سر میں لگی تھی اور کھوپڑی کا ایک حصہ اڑ جانے کے باعث دماغ باہر نکل آیا تھا۔ صاف

ظاہر تھا کہ وہ کچھ لمحوں کا ہی سہا ہے۔ پھر بھی یہی کارروائی پوری کرنے کے لیے اسے اسپتال لے جانے کی ٹیگ و دو کی جانے لگی۔ جس وقت اسے زمین پر سے اٹھا کر ایمبولینس میں منتقل کیا گیا، وہ اپنی آخری سانس لے چکا تھا۔ غریب کو اسپتال پہنچنے تک کی بھی مہلت نہیں مل سکی تھی۔ مل بھی جانتی تو کیا ہو جاتا؟ وہاں موجود واحد سرکاری اسپتال میں اتنی سہولیات ہی کہاں موجود تھیں کہ اتنے شدید زخمی شخص کی جان بچانے کے لیے کچھ کیا جاسکے۔

”مان مجھے سمجھی، کیا خوب انتظام کیا آپ لوگوں نے۔ وہ بے جا روڈی ایس پی تو حسرت سے منہ دیکھتا رہی ہو گیا کہ میں کتنے آرام سے ضمانت پر رہا ہو کر اس کے ہاتھ سے نکل گیا ہوں۔ اسے تو کمان بھی نہیں ہو گا کہ اس کا گواہ عدالت میں آکر یوں بیان بدل لے گا۔“ اقبال باجوہ نے کسی بچے کی طرح قہقارے مارتے ہوئے کہا اور ہاتھ میں تھا سے جام سے ایک بڑا سا گھونٹ بھرا۔ جھلم سے اس کی خاطر گواہی دینے کے لیے آئے والے اس کے دونوں دوست کا رو باری جلتے سے قطع نظر رکھتے تھے۔ وہ اس کے ایک دودن رک جانے کی دعوت کے باوجود اپنی کارروائی مصروفیت کی وجہ سے رکنے کے لیے راضی نہیں ہوئے تھے اور واپس جیل لوٹ گئے تھے۔ وہ انہیں رخصت کر کے فارغ ہوا تو چند دھری افغان کی طرف سے پچا۔ ملاک کوئی بلنگی جاو۔ وہ فوراً وہاں پہنچ گیا اور اب وہ تینوں مہنگا اڑانی شہسپن کے ساتھ اپنی فتح کا جشن منا رہے تھے۔ ”دینے اس نے اپنا بیان بدلا کیسے؟ مجھے یقین ہے کہ اس کے پیچھے آپ ہی کی مہربانی ہوگی۔“ اب اس کا مخاطب ایس پی معظم تارڑ تھا۔

ایک آنکھ دباتے ہوئے بولا۔ ”ماشا اللہ آپ بڑے سمجھ دار ہو باجوہ صاحب! ہم کیا اور ہماری مہربانی کیا؟ بس ذرا سہا حق دیتی بھانے کی خوشی ہے کہ اور اس کے لیے کرتا بھی کہ پڑا؟ بس اس بندے کے عدالت روانہ ہوتے وقت اسے اتنا پیغام بھجووا دیا تھا کہ باجوہ صاحب پر ذرا بھی آنی تو تیرا سر بیوی بچوں سمیت جل کر بھسم ہو جائے گا۔ بندہ سمجھ دار تھا۔ کیا بولنا چاہیے، خود سمجھ گیا۔“

”ہم آپ لوگوں نے تو اس کا سمجھ داری دکھانے والا بھیجی نکال باہر کیا۔“

”وہ اس بات کی سزا تھی کہ اس کے پیچھے میں ہم سے غداری کرنے کا خیال آیا ہی کیسے؟“ غداروں کا انجام تو ہم جیوٹ

بڑا نصرت تاک کرتے ہیں۔ وہ انور ابھی نہیں ہاتھ دکھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ حرام زادہ اسے سی کا جھوس (جاسوس) بنا ہوا تھا۔ وہ اچھا بوکا کر میں سے بیٹے کے پاس لے گیا۔ ہاتھ دیا تھا کہ اپنے بچے کو جو تک حرام کو ڈھونڈ کر لائے۔ ہاتھ لے بھی نہیں اس وقت اس کو چھپا جب وہ چھپ کر خبریاں کر رہا تھا۔ حال دیکھو سامنے گا۔ ڈھنگ سے کھانے پینے کو پیش مٹا اور بچے میں موہاں لگا کر بھڑا رہا۔ بالاموہاں سمیت اسے بچہ کرکشی کے پاس لے گیا۔ فحشی نے اس سے سب انگلیاں کر کھر سے موہاں آیا اور کس کے لیے اس نے کون کون سی خبریاں سنیں؟ فحشی سے بڑی تیزی سے کھکی اس انور سے بے۔ کہتہ تھا کہ تمہاری مہر سے میری بیوی اور بیٹے کی جان لگی۔ میں اس واسطے تم سب کی جان مشکل میں ڈالنے کے لیے اسی سے مل گیا۔ اس کے کہنے پر میں نے سبیں بچش میں درخت کاٹنے پر اپنی بیوی لگائے کوکہ۔ فحشی کا تو سب سن کر متحکم ہو گیا۔ ایسی کت کائی ہے اس تک حرام کی کہ اپنی جگہ سے جلتے ہو گئے بھی نہیں رہا۔ ڈیرے پر اپنی موت کے انتظار میں پڑا ہوا ہے۔ میں نے بھی کیا کر پڑا رہے۔ دو پہلے میں ضروری کاموں سے نشت لوں پھر اس کا فیصلہ کروں گا۔

چوہری افکار کا لہو یہ سب جانتے ہوئے ہے حد تک نہیں تھا۔

”آپ نے اچھا کیا چوہری صاحب اندرون کو تو واقعی عبرت تاک سرائی چاہیے تاکہ کھرکشی میں غدار کی جرأت ہی پیدا نہ ہو سکے۔“ انہیں لپٹے اس کے فیصلے کی تائید کی۔

”غدار کی کا اچھا سب جانتے ہیں اسی لیے ہمارے تابع دار بنے رہے ہیں مگر میں بھی کسی کا دماغ پھر بھی جاتا ہے جن کا دماغ پھر جائے۔ انہیں تو ہم بددعا کی دکھانے کے لیے زندہ ہی نہیں چھوڑتے۔ باقی انھوں کو بھی نصیحت ہو جانی ہے کہ ایسی کوئی گل سوجھنی نہیں ہے۔ لوڈر کے ڈیرے کا انعام تو سب دیکھ چکے ہیں۔ اب انور سے کام بھی دیکھ لیں گے۔ ویسے ڈیرے کا تو ہم نے یوں بھی ہر حال میں کام تمام کرنا تھا۔ وہ پولیس کی نظر میں آ گیا تھا۔ عاتقا (خواتین) اس کے ڈیرے پہنچیں ہمیں تنگ کرنے کی کوشش کرتی رہتی۔

اب یہ ہے کہ جب ہاں ہی نہیں رہا تو باکسری کھر سے بیٹے کی۔ آپ پر پولیس نے جو کس بنایا ہے اس میں تو سمجھ لیں کہ ذرا دیکھیں رہا۔ ڈیرے کے بیان بدلنے پر دو لوگ پہلے ہی بکھلائے ہوئے تھے۔ سوچا ہوگا وہاں وہ اس پر کام کریں گے اور عدالت میں اپنی مرضی کا بیان لادیں گے لیکن اب تو ان کی ساری امیدوں پر اس پر فحشی ہو گئی۔ ”وہ دران کھنکھ کی جام خالی کر چکا تھا۔“ لٹے کے باعث اس کی سرخ پڑ جانے

والی آنکھوں پر کسی کھوڑی آنکھوں کا گمان ہو رہا تھا پھر سے ہر وقت جھاتی رہنے والی فحشی کے ساتھ یہ سرخ آنکھیں اسے بہت خوفناک بنا رہی تھیں۔

”ہاں جو صاحب کی عزت کی خوشی میں، میں نے آپ لوگوں کو جو دعوت دی ہے اس دعوت کا اصل لطف لینے کے لیے آپ دونوں کو میرے ساتھ ڈیرے پر چلنا ہوگا۔ ڈیرے پر چل کر ہی آپ کو کھ معش میں اعلاہ ہوگا کہ ہم دشمنوں کے کیسے دشمن اور دشمنوں کے لیے کیسے بچیں ہیں۔“ اس کے اعلاہ سے ظاہر تھا کہ وہ اب مزید شراب نوشی کا ارادہ ترک کر چکا ہے اور فوری طور پر ڈیرے کے لیے روانہ ہونا چاہتا ہے۔ ان دونوں نے اس کے ارادے کو سمجھتے ہوئے جلدی جلدی اپنے جام خالی کیے اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ اب ان کی منزل چوہری کا ڈیرہ تھا۔ وہ اپنی من پسند سرگرمیوں کے لیے استعمال کرتا تھا۔ ڈیرہ گاؤں کی آبادی سے کافی فاصلے پر ہونے کی وجہ سے ہر طرح کی سرگرمیوں کے لیے بالکل محفوظ تھا۔ گاؤں والوں کو کھنکھی بھی نہیں پڑتی تھی کہ وہاں کیا ہو رہا ہے اور اگر کسی کو کھوڑی بہت بھنگ پڑی جائے تو وہ جان بوجھ کر ان جان بین جاتا تھا۔ چوہری کے معاملات کی طرف سے آنکھیں اور کان بند رکھتا ہی ان کے حق میں بہتر تھا۔ آنکھیں اور کان بند رہتے تھے تو زبان کے پاس ہونے کے لیے بھی کھنکھی نہیں رہتا تھا۔ آبی جب بھی پھٹتا ہے، اپنی زبان سے پھٹتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ زبان بندی کا اچھی طرح اہتمام کیا جائے، سو گاؤں والے اس اصول پر عمل پیرا رہتے تھے۔

”ہاں بھی، کیا حال ہے میرے شیروں کا؟ کام کے لیے تیار ہیں؟“ ڈیرے پر پہنچ کر وہ لوگ جیسے ہی گاؤں سے اترے فحشی انڈر رکھا ان کے استقبال کے لیے دوڑا آیا۔ فحشی کے پیچھے ایک بندہ دو نوٹوں کی زنجیریں تھاے ہوئے کھڑا تھا۔ کتے تھیم ہونے کے علاوہ بہت خوش خوار بھی لگ رہے تھے۔ ان کے اعلاہ سے انکی بے چینی اور خوش خوری بھنگ رہی تھی کہ صاف لگا تھا ان کے منہ پر تھنوں سے بندی چڑے کے کہ کپ لادو شے موجود نہیں ہوتی تو وہ اپنے رکھالے کو کسی جی چھاؤ کرکھا جاتے۔ فحشی سے سوال کرتے ہوئے چوہری کی نظر ان توں پر ہی رہی۔

”بالکل تیار ہیں سرکار۔“ بلکہ ہے جمن ہیں کہ کب انہیں کام دکھانے کا موقع ملے۔“ فحشی نے خوشامدہ لہجے میں اس کے سوال کا جواب دیا۔

”اس کو پھر چلی، انہیں زیادہ انتظار کروانا بھی اچھا

تھیں۔ میرے اڈے اتنی ابر سے بھوکے ہیں تو کچھ لے میری بھی بھوک اڑ گئی ہے۔ ان کے پیٹ میں کچھ بے کا تو ہی نہیں تھی مگر تو ڈسوں گا۔“ اس کا اعلاہ بے حد معنی پڑتا تھا۔

اقبال باجوہ اور ان کی بیوی بڑی طرح سے اس صورت حال کو سمجھتا ہوا ہے۔ فحشی نے چوہری کے اعلاہ میں کچھ ایسا تھا جس سے انہیں اپنے جسم میں پھر کی بیوی کی دوڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ چوہری کی معیت میں چلتے ہوئے خاموشی سے اس کے ساتھ ڈیرے میں داخل ہو گئے۔ چوہری نے ڈیرے کے شان دار، بے سجاتے کمروں کے بجائے اپنے خالے میں جانے والی بیڑیوں کا رخ کیا تو فحشی انہوں نے اس کا ساتھ دیا۔ فحشی اور کتوں کی زنجیریں تھاے ہوئے رکھوا بھی چھپے چھپے تھے۔ وہ خالے کی فضا میں سین کی مخصوص بھٹی مگر روشنی کا مستقل انتظام تھا۔ اس روشنی میں وہ دیکھ سکتے تھے کہ اس وسیع و عریض خالے میں کی کسے سے ہوئے ہیں۔ شاید اوپر بیتے تھے پر کسے کے تھیر کے گئے تھے، نیچے بھی اتنی رقبہ استعمال ہوا تھا۔ فحشی نے آگے بڑھ کر ایک کمرے کا دروازہ کھولا تو وہ سب اس کمرے میں داخل ہو گئے۔ وہ ایک بڑا ہال نما کمرہ تھا جس میں دیوار کے ساتھ کئی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ان تین کرسیوں کے علاوہ کمرے میں کئی کئی کرسیاں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ یہ تین کرسیاں بھی شاید ان تینوں کے بیٹھنے کے لیے خاص طور پر وہاں رکھوائی گئی تھیں۔

چوہری نے ان دونوں کو اشارہ کیا تو اس کے ساتھ وہ دونوں بھی ان کرسیوں پر براہمان ہو گئے۔ فحشی انڈر رکھا ان کے ساتھ اندر نہیں آیا تھا۔ البتہ کتوں کا رکھنا ان کی زنجیریں تھاے ایک کوٹے میں دیوار سے ٹک لگائے کھڑا تھا۔ ڈیرے میں فحشی بھی وہاں آ گیا۔ اس کے پیچھے وہ ڈیرے اور تھے۔ ایک سرد آنکھوں والا خزانہ صورت بالادور و سرحد کو قریح المال انور تھے بالآخر یہاں تک نہیں ہوا ہاں لایا تھا۔

”ہاں بھی انورا بول کیا سزاؤں تجھے تیری ملک حرامی کی؟“ خرخر کر کہتے انور کو چوہری کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے سر دیکھ میں اس سے سوال کیا۔

”مجھے معاف کر دیں سرکار میں فیصے میں سب کچھ کر رہی تھی کہ وہ کوئی حالت بہت خراب تھی۔ میں نے فحشی کو یہ کہنا کہ وہ کوئی پراسے اپنا لیا بھوانے کا بندہ است کر دیا۔ یہ نہ مانے اور میری کھروالی مرئی تو مجھے بہت فدا آیا۔ میں فیصے میں ہی شہلا سوچے سمجھے ایسی کھنکھی کر رہا۔“ انور کو پہلے ہی ٹھیک خاک مار گئی جا چکی تھی اور اب اسے اپنی جان بچانی خطرے میں بھر رہی تھی اس لیے وہ اپنے سارے

دلو سے اور وہ بڑی بڑی باتیں بھول کر جو اس نے شہیار کے سامنے کی تھیں، چوہری سے معافی طلب کر رہا۔

”فحشی کی سزا تو بندے کو بھگتے ہی پڑتی ہے۔ تجھے بھی سزا تو ضرور ملے گی۔“ چوہری کے لیے جس سزا تھی۔

”اس بار معاف کر دیں سرکار میں ساری جانی آپ کا غلام بن کر رہوں گا۔ فحشی کی وجہ سے میں بھنگ کر رہا۔ پر اب دوبارہ ایسی فحشی نہیں کروں گا۔“ چوہری کے لہجے کی سنگینیت سے وہ اپنے انجام کو بوجھ رہا تو اس لیے گڑگڑاتے ہوئے اس کے قدموں میں گر گیا۔

”ہم تجھے دوبارہ فحشی کے لاتی ہی نہیں پھڑیں گے۔“ بھنگے ہوئے کورٹ دکھانے میں وہی چلی طرح آئے۔ کچھ پر تو ہم ایک طرف سے مہربانی ہی کرتے چاہے ہیں۔ جس کھر والی کی جانی میں تیری مت ماری گئی ہے۔ فحشی اس تک پہنچانے کا فیصلہ کر لیا ہے ہم نے۔“ چوہری نے انہماں سے اسے جواب دیا۔ اس جواب پر اس کے چہرے پر کھنڈی زردی کچھ اور بھی گہری ہو گئی اور وہ مزید زرد طور سے گڑگڑانے لگا۔ چوہری اس کی گڑگڑاہٹ اور منوں پر فحشی بے نیاز رہا تھا۔ باجوہ اور زرق تھے ہی خاموش ناٹاشی۔

”جانیادہ نام نہ خراب کر میرا۔“ پہلے ہی جسے شیر پڑی در سے بھوکے ہیں۔ اب ان سے ہر بورداشت نہیں ہو گی۔ تو اگر خود کو میرے کام کا بندہ ثابت کرنا چاہتا ہے تو خود کوان سے زیادہ طاقت ور اور بہادر ثابت کر کے دکھائے۔ ان سے مقابلہ جیت لے۔ تو جیت گیا تو میں تجھے اپنا خاص بندہ میں شامل کر لوں گا ورنہ تو مجھے تیری کوئی ضرورت ہی نہیں۔“ تھیرے جیسے سٹیلوں پڑے ہیں میرے پاس۔“

چوہری نے اسے جواب دیا اور پھر کی ٹھوکر سے خود سے دور دھکیل دیا۔ اسی وقت کتوں کے رکھوالے نے ان کے منہ آڑا کر کے بعد ہاتھ سے ان کی زنجیریں چھوڑ دیں۔ اسے ایسا کرنے کا اشارہ فحشی چوہری کی طرف سے ہی ملا ہوگا لیکن باجوہ اور تارڑ دیکھ نہیں سکے۔ وہ تو اپنی اپنی نشستوں پر ٹھنڈے ہو کر رہ گئے تھے۔ ایک کھڑو اور ان اور دو خوش خوار جو کتوں کی لڑائی کا کیا انجام ہو سکتا تھا۔ یہ کسی کو بتانے کی ضرورت تو نہیں تھی۔

کتے آڑا کر ہو کر انور کی طرف لپٹے تو اس کے منہ سے دہشت ناک چیخیں بلند ہوئے لیکن کھر جب پہلے کتے نے اس کی ٹانگ پر مت مار کر اسے سمجھوتا شروع کیا تو شاید اسے احساس ہو گیا کہ صرف جیتنے اور دم کی درخواست کرنے سے کچھ نہ ہوگا۔ بھکی جلی خواتین نے اس کے ہاتھوں میں

مجھے اسلام آباد کے لیے روانہ ہونا ہے۔ وہاں جیسر صاحب سے بھی ملاقات ہوگی۔ میں موقع دیکھ کر خود ہی ان سے بات کر لوں گا۔ وہ سکتے ہیں تمہارے مسئلے اور ان کو سمجھانے کی نوبت نہ آئے۔" انہوں نے اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے اپنے پروگرام سے آگے کیا اور پھر چند ایک رسمی باتیں کرنے کے بعد فون بند کر دی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ اس سے کچھ خفا ہیں لیکن اس بات کا بھی اطمینان تھا کہ وہ اس کا کچھ بوا کا کام ضرور کروائیں گے۔ اس لیے مطمئن ہو کر سسٹرائٹ ہوئے اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس کے سامنے بیچ آباد والے اسکول کے سامنے ہی انڈسٹریل بوم کے قیام کا منصوبہ تھا۔ فی الحال اسکول میں بچوں کی تعداد اتنی زیادہ نہیں تھی کہ ماسٹر آفتاب اور اس کے ساتھی سے خالی گروائے ملنے کر کے کی فوری طور پر ضرورت پڑتی۔ اس کمرے میں ایک چھوٹا سا انڈسٹریل بوم قائم کیا جا سکتا تھا جس کے لیے کچھ چاندی مشینیں ہی سی ضرورت تھیں۔ بعد میں اسکول میں بچوں کی تعداد بڑھتی تو موجودہ کمروں کے اوپر سی مزید کمرے تعمیر کیے جاسکتے تھے۔ اس منصوبے کو دیکھتے ہوئے اس کے ذہن میں خیال آیا کہ دیر دیر تو میں بھی جیسا اسکولوں کی تعمیر کا منصوبہ بنے گا چکا ہے۔ اسی طرح اسکول کے ساتھ ساتھ انڈسٹریل بوم کا قیام میں مل لایا جا سکتا ہے۔ اس طرح گاؤں کی بہتر معاشی حالت کے بہترے فائدہ اٹھانے کے ساتھ ساتھ ان کے لیے بھی مستقل آمدنی کا اچھا بندوبست ہو جاتا۔

"سر ڈی ایس نی منظور آپ سے ملاقات کے لیے آئے ہیں۔" انہی کو عبداللہ مان کو اپنے کمرے میں بلا کر اس سے اس منصوبے کو مدد ملنے کے بارے میں سوچائی رہا تھا کہ اندر کا مہر عبداللہ مان نے اسے اطلاع دی۔

"ٹھیک ہے۔ انہیں اندر بھیج دو۔" اس نے اجازت دی لیکن اسے حیرت تھی کہ ڈی ایس نی اس کے پاس کیوں آیا ہے؟ باوجود اس کے کہ اس میں اب کوئی جان نہیں رہی تھی مگر انڈسٹریل بوم کا بہت کچھ کرنا بہت مشکل تھا۔ زیادہ سے زیادہ اسے اس کی دکانی کی وجہ سے حاصل کیا جا سکتا تھا تو اس مسئلے میں وہ اور بات کر چکا تھا۔ اس ضمن میں باجوہ مقدمہ بھی دانا گیا چکا تھا اس لیے یہ کام مختصر یہ ہو جاتا لیکن ظاہر ہے ڈی ایس نی کو اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی چاہے بھی۔ دھماکے والے کیس میں کسی وہ صرف ابتدائی تحقیقات کے سونپے پر مشتمل کیا گیا تھا، اس کے بعد اس کی کوئی ضرورت نہیں رہی تھی۔ یعنی جن دنوں کیس سے اس نے اپنی ترقی کی امید باندھ رکھی تھی وہ ایسی نوعیت اختیار کر گئے تھے کہ اس کی

کارکردگی حسب توقع ابھر کر سامنے نہیں آ سکتی تھی۔

"اسلام ٹیکسٹس" وہ ڈی ایس نی کی آمد کے مقدمہ کے بارے میں کوئی اندازہ نہ کر سکتے تھے کہ کیا یہ ہوتا اس سے پہلے وہ اس کے کمرے میں پہنچا۔

"وہیکل اسلام۔" ٹیکسٹس نے اسے اشارہ کیا اور سامنے رکھی فائل کی ورق گردانی کرنے لگا۔ وہ ڈی ایس نی کو بتا رہا تھا کہ وہ بہت مصروف آدمی ہے اور اس کے لیے اس سے تعلقات برقرار رکھنے اور اس کی حیثیت سے فائدہ اٹھانے کے لیے..... صرف ملنے کی غرض سے آئے ہوئے تو اسے اندازہ ہو چکا ہے کہ یہاں ایسی کوئی محنت نہیں۔

ڈی ایس نی نے اس کے اس انداز کو اچھی طرح سمجھا لیا تھا۔ وہ کچھ اٹھ کھڑا ہوا۔ بولے بولے۔ "اے وقت زحمت دینے کے لیے معافی چاہتا ہوں سر اگر کوئی معاملہ کی نوعیت ایسی تھی کہ میں نے مناسب سمجھا کہ براہ راست آپ سے ملاقات کر کے تعین کر لوں۔"

"کیا معاملہ؟" شہر باراس کی طرف متوجہ ہوا۔

"بیچ آباد کے قریب بھٹی کی جگہ دو میں ایک لاش ملی ہے۔" لاش کی حالت بہت بُری ہے۔ کچھ چٹا ہوا۔ لاش کو بڑی طرح ٹوچا کھسکا ہوا ہے۔ موت کی وجہ تو یہ ثابت ہو رہی ہے۔ رپورٹ کے بعد ہی سامنے آنے کی گئی ابتدائی تحقیقات کے بعد جو باتیں سامنے آئی ہیں وہ کچھ چوکا دینے والی ہیں۔ مرنے والے کی کھانسی اور حیروں پر ایسے نشانات ہیں جیسے اسے کافی دیر تک رسیوں سے باندھ کر رکھا گیا ہو۔ جسم کا اچھا سا گوشت ٹوٹ چکا ہے جانے کے بعد جو کچھ چم سے کھا تھا صحت سلامت ہے۔ اس لیے پیر آباد کے کچھ لوگوں نے لاش کو شہت کر لیا ہے۔ ان کے مطابق لاش انور نی ایک آدمی کی ہے جو کچھ دنوں سے لاہور تھا۔ لاش کے جسم پر اس کے جو پچھڑے موجود تھے۔ انہیں انور کی ماں یا منادہ کو کھا کر اس بات کی تصدیق کر دی گئی ہے۔ آخری بار جب انور اپنے کام پر روانہ ہونے کے لیے گھر سے نکلا تھا تو اس نے اس رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔ مای منادہ کو خراب حالت کی وجہ سے لاش دکھنا مناسب نہیں سمجھا گیا جس کیس کے پکڑوں کے بارے میں تصدیق کر دینے سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ لوگوں نے مرنے والے کو انور کی حیثیت سے شجہ شہادت کیا ہے۔ بین اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انور کچھ دنوں میں کیوں گیا تھا۔ اور پھر جانوروں کا نشانہ بنے؟ کیونکہ اس کی لاش جنگل کے جس جھبے میں ملی ہے وہ وہاں زیادہ سے بہت قریب ہے اور اس جھبے میں جنگلی درندوں کی آمد و رفت نہیں اس لیے لوگ بے

خدا اس جھبے تک پہنچ جاتے ہیں۔ انور بھی شاید اسی وجہ سے چلا گیا تھا۔ اس کی لاش دریا تھ کر کے والا بھی ایک چھوٹا سا جھبہ تھا۔ انور کو ان کے لیے وہاں گیا تھا۔ چرواہا روز وہاں جاتا ہے کہ انور کے قریب ہونے کے فوراً بعد اس کی موت واقع ہو گئی ہوتی تو چرواہا پہلے ہی لاش دیکھ لیتا۔ پچیس کا ایک ایک اندازہ ہے کہ اسے مرنے سے پہلے بارہ گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں گزارا۔ بہر حال، موت کا سبب اور وقت کا تعلق تو یہ ثابت ہو رہا ہے کہ اس سے پہلے اس کا جسم پر ملنے والے بندھنوں کے نشانات ہیں جن سے ظاہر ہوا ہے کہ مرنے سے پہلے وہ کسی کی قید میں رہا تھا۔ دوسری چیز اس کے جسم میں تو بڑی طرح کا موٹاپا سیٹ ہے۔ سیٹ کو کسی نے ناکارہ کر دیا ہے یا کسی اور وجہ سے وہ خود ہی خراب ہو گیا ہے مگر حیرانہ ہے کہ تو انور کے پاس موٹاپا کی موجودگی ہی حیرت کی بات ہے۔ مای منادہ اور انور کے جانتے والے اس کے پاس موٹاپا کی موجودگی سے ناواقف ہیں۔ تو خود ہی بھاگ دوڑ کے بعد ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ وہ موٹاپا کب، کس نے اور کہاں سے خیرہ والا اور اس میں موجود جسم کی کم رجحان ہے۔ لیکن یہ ساری بھاگ دوڑ کرنے سے پہلے میں نے مناسب سمجھا کہ پہلے آپ سے مل لوں۔ انور کے پاس موٹاپا کی موجودگی سے مجھے شک گزرا ہے کہ انہیں انور تو یہ بندھنیں جو آپ کے لیے بھڑکی کام کر رہا تھا کینکڑ آپ نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کا اپنے بھڑکے سے رابطہ نہیں ہوا۔ پھر غارتگر کے خاندان سے بھی انور کا قریبی تعلق بتا ہے اس لیے اس بات کا امکان ہے کہ وہ ان لوگوں کی محبت میں چھوڑی کے خلاف آپ کے کام کرنے پر راضی ہو گیا ہو۔" ڈی ایس نی منظور کا سارا لہجہ یہ اس کے بڑے کانچوڑ تھا جس میں انہیں اندازہ ہے کہ کوئی غلطی نہیں تھی۔

"آپ کا اندازہ ٹھیک ہے ڈی ایس نی صاحب۔ انور واقعی میرے لیے کام کر رہا تھا اور یقیناً اسے اسی جرم کی سزا مل چکی ہے۔" شہر باراس نے اعتراف کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ انور کا نام یہ طور پر چھپانے کا مقصد اسے محفوظ فرام کرنا تھا۔ جب وہ بے چارہ اپنی جان سے ہی چلا گیا تھا تو کچھ بھی چھپانے سے کیا حاصل تھا۔

"اور اس کا مطلب ہے کہ مجھے اس کیس کو دانا چاہیے گا۔" ڈی ایس نی نے ہنستے ہوئے بولا۔

"کیوں دانا پڑے گا؟ آپ اس مسئلے میں تحقیقات کر رہے ہیں۔ اگر ہم انور کو اپنے مقدمہ کے لیے استعمال

کر رہے تھے تو یہ کوئی جرم تو نہیں تھا۔ وہ بھی ایک طرح سے قانون کی بددگر تھا اور قانون کا فرض تھا کہ اس کے قتل کی تحقیقات کر کے جرموں کو انجام تک پہنچائیں۔ اس نے انور کی گواہی کا اظہار کیا۔

"میرا یہ مقدمہ نہیں تھا۔ میں تو اسے لے کر کچھ ہاتھ کر رہا تھا۔ آپ کا نام سامنے نہ آئے۔" وہ گڑبڑایا۔

"میرا نام جن کے سامنے نہیں آتا چاہیے تھا۔ انور اسے پہلے ہی انور سے اٹھا چکے ہوں گے۔ خیر مجھے اس بات کی زیادہ پروا بھی نہیں۔ سرکار کی نگہ پر نام سامنے آ جاتا ہے تو بھی آپ بے فکر ہوں گی۔ میرا یہاں نہیں بکارت ہے۔" اس کے لہجے میں وہی نوعیت اور کفر تھا جس کا نام خاص خاص مبالغہ پر وہ سامنے والے پر اپنی حیثیت بنانے کے لیے اٹھار کرتا تھا۔ ڈی ایس نی جس نے بیٹھ اسے اپنے سامنے ٹھکان کر کے ہوئے دیکھا تھا۔ اس انداز پر نہ کیا اور وہاں تک نہیں رہا اور فوراً رخصت کی اجازت لے کر کھٹک گیا۔

☆ ☆ ☆

"کتنے دن ہو گئے کہاں آتا جو رہا اور صنوبر آہے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ آج ان سے ملنے چلتے ہیں۔" منجھوہر آہا کا منہ بھی بڑا یاد آ رہا ہے۔ "شکر رکھو! بڑا مشکل رہا تھا۔ آفتاب کو دیکھنے کے لیے اسپتال میں اس سے چوڑا بھی ہونے والی ملاقات کے بعد دوبارہ اس کی ایک جھلک بھی دیکھنے کو نہیں ملی تھی۔ زخمی ہونے کے باعث وہ جوڑ کے بیٹے منور کو بڑھا لے بھی نہیں جا رہا تھا مگر کل رات فون پر بات کرتے ہوئے اس نے منور کو بتایا تھا کہ ان سے دوبارہ کو بڑھا لے کے لیے جانے گا۔ اس اطلاع کو سننے ہی کشمکش کا جھج جھجکا ہوا تھا کہ کسی طرح بہنوں سے ملنے کے ہاتھ ان کے گھر جائے اور آفتاب کی ایک جھلک ہی کسی کو دیکھ لے۔ چنانچہ رات بھر کے فوراً بعد اس نے اپنی ماں بھولی چھوڑی سے فرائض شروع کر دی۔

"میں ڈی ایس نی سے مل کر رہی ہوں۔" دراضی ہیں تو خیر چلتے ہیں۔" اس کی فرائض کے جواب میں زہید بولے وہ کچھ چپ سی ہو گئی۔ جس دن سے اسے یہ شک ہوا تھا کہ ان کی اس کے اور آفتاب کے درمیان ہونے والی گفتگو کی کسی نے کی ہو تو ان کے کوشش کر رہا ہے وہ کچھ ٹھیک سی سمجھتی تھی۔ اس نے زہید سے بھی اس واقعے کا ذکر کیا تھا اور انی نے اسے شہر ظاہر کا قہر کچھ بھی شادو میں سے کوئی ایسی رستہ کر سکا ہے۔ چھٹی اور شادو کا نام سامنے آئے ہی یہ اندیشہ وہیں میں ابھرنا تو کہیں ڈی چھوڑا ان کو ساری بات معلوم نہ ہو گئی ہو کیونکہ

مجھی اور شادو کی ہاں ماسی رخصتہ دڈی چودھرائن کی سب سے
مست چڑھی ملازمہ تھی۔ اس نے آفتاب کو اس بارے میں کچھ
نہیں بتایا تھا کہ کہیں وہ احتیاطاً اسے فون کرنے سے منع کر
دے لیکن خود اپنے طور پر ہوشیار رہنے لگی تھی اور ابھی طرح
دیکھنے بھاگنے کے بعد ہی موہاں اپنی الماری سے نکال کر اس
سے رابطہ کرتی تھی۔ اس ساری احتیاط کے باوجود اس کے
دل میں ڈر بیٹھا ہوا تھا کہ حویلی کی کرتا دھرتا دڈی چودھرائن
اسے پکڑنے میں کامیاب نہ ہو جائے۔ اس وقت بھی
چودھرائن ہائیڈ نے دڈی چودھرائن کو ساتھ لے کر چلنے کی جو
بات کی تھی اس پر وہ کچھ جڑی ہوئی تھی۔ دڈی چودھرائن کی
ہر طرف گھراں آنکھوں کی وجہ سے تو آدمی کو اپنے سارے سے
بھی متاثر نہ ہوتا تھا۔ بھلا اس کی موجودگی میں وہ آفتاب کی
طرف متوجہ ہونے کی غلطی کیسے کر سکتی تھی؟ لیکن یہ بھی مجبوری
تھی کہ اس سے پوچھنے بغیر جانا بھی ممکن نہیں تھا۔ تاہم مضمون
کی سسرال سے پہلے تو وہ اس کا میکا تھا اور اس کے میکے جاتے
وقت اس سے سی نہ پوچھا جاتا تو وہ یقیناً نڈھال ہوتی۔

”کدھر چلے گی کھل ہو رہی ہے؟“ دڈی چودھرائن خود
وہاں آگئی تھی۔ اس نے ہائیڈ کا ہنسنے لیا تھا اس لیے پوچھنے لگی۔
”یہ اپنی شہر کدھر رہی تھی کہ کہیں سے لے بہت دن ہو
گئے۔ بچہ بھی پادا رہے ہیں تو میں نے کہا کہ چلو ان سے ملنے
چلے ہیں لیکن پہلے دڈی آپ سے پوچھ لیتے ہیں کہ ان کا کیا ارادہ
ہے۔“ چودھرائن ہائیڈ نے خوشامدی لکچے میں جواب دیا۔

”آج تو دوسرے کیمیزوں سے ننبنا سے مجھے، پر ہماری
جی کپتی ہے تو چلو ایسا کرتے ہیں کہ رات تک چلتے ہیں۔
رات رک کر کھل سویرے لوٹ آئیں گے۔“ دڈی چودھرائن
نے بڑے فیصلے لکچے میں جواب دیا لیکن اس کی تیز نظریں شہر
کے چہرے کو ٹوٹ رہی تھیں جیسے گہرائی میں جا کر اس کے اندر
کا عیجہ جاننا چاہتی ہوں۔

”اگر آپ کے پاس فرصت نہیں تو آج رہنے دیں
دڈی ماں ہم کھل وہاں چلے جائیں گے۔“ اس کی نظروں سے
گھبراتے ہوئے وہ جلدی سے بولی۔ یوں بھی جو پروگرام
دڈی چودھرائن نے ترتیب دیا تھا اس سے اسے تو کوئی فائدہ
نہیں ہوتا۔ آفتاب تو ان اوقات میں وہاں مٹا ہی نہیں۔

”کیوں رہنے دیں؟ جب تیرا دل آج جانے کو چاہ رہا
ہے تو آج ہی چائیں گے۔ اس یہاں میں بھی اپنے پیکے میں
ایک رات رک جاؤں گی، پر دیکھ کھل سویرے ہمارے ساتھ
ہی واپس آجانا ہو رکنے کی محنت کرنا تو تیرے الہامی خفا
ہوں گے۔ وہ پہلے ہی زراں (ناراض) ہو رہے تھے کہ شہر کا

میں حویلی میں کیوں نہیں لگتا؟ یہاں سے حویلی سے
باہر جانے کے موافقہ وضاحتی ہے۔“ آپ اس کے لکچے میں
ایک واضح حسیہ تھی۔

شہر کچھ جھنجھلائی گئی اور خفگی سے بولی۔ ”غلبہ ہے،
میں کہیں نہیں جاتی۔ پڑی رہتی ہوں یہیں حویلی میں قید یوں
کی طرح!“ اپنی ناراضی کا کھلی مظاہرہ کرنے کے لیے اس
نے اپنی جگہ چھوڑ کر وہاں سے باہر نکلنے کے لیے قدم بھی
دروازے کی طرف بڑھا دیے۔

”اپنی کوزی کو راسنبال کر رکھنا ہید انج کل اس کے
خزے بہت بڑھ گئے ہیں۔ مجھے تو یہ ہو رہی ہواؤں میں ازنی
دکھائی دے رہی ہے۔“ اپنے پیچھے اسے بڑی چودھرائن کی
کاٹ دار لکچے میں کہیں ہوئی بات سنائی دی تو یوں لگتا تھے فون
رگوں میں ٹنڈ ہونے لگا ہے۔ ہاں نہیں وہ اس کے راز سے
آگاہ ہو گئی تھی یا یونہی ایک بات کہہ رہی تھی لیکن اس کا
اندیشوں میں گھرا ہوا دل تو مزید خوف کا شکار ہو گیا تھا۔ اس
خوف کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ حویلی کی
بالائی منزل کی طرف بڑھ گئی جہاں مرحومہ عصمت کا دینی
معدنہ بیٹا ہزار و شاہکی فالٹو سامان کی طرح بڑا رہتا تھا۔
صرف وہ بھی جو اس کا ایک بہن کی طرح خیال رکھنے کی کوشش
کرتی تھی۔ اسے وہ اپنی ہی طرح مظلوم لگتا تھا کیونکہ اس کی
طرح اس بے چارے پر بھی خوشیوں کے سارے در بندہ تھے
بس وہ اس اعتبار سے خوش قسمت تھا کہ اس کا ذہن اس
نا انصافی کو دیکھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا تھا اور وہ ذہنی اذیت
سے بچا رہتا تھا۔ ☆☆☆

”سرا! آپ کے گھر سے فون ہے۔“ وہ بڑے اشدک
سے نی دی پر کھڑکیا جانے والا تو بچے کا خبر نامہ دیکھ رہا تھا کہ
بظلمے اسے اطلاع دی۔ گھر سے فون ہونے کا مطلب تھا
کہ کال مہمانی آفرین نے کی ہے۔

”ہیو شہر یار جینا یہ میں بول رہی ہوں تہہ ری
مہمانی۔“ اس کے پیلو کے جواب میں فوراً ہی دوسری طرف سے
سنائی دینے والے چلنے سے اس کے اعزاز کے کی تصدیق کر
دی مگر مہمانی آفرین کے لکچے میں جو پریشانی تھی، اس نے
اسے تشویش میں مبتلا کر دیا۔

”خیریت تو ہے مہمانی جان؟“ اس نے فوراً سے پوچھا۔
”نہیں، خیریت نہیں ہے۔“ حینہ آج صبح سے لاپا
ہے۔“ ان کی دی ہوئی اطلاع پر وہ کلر ہو گیا۔

حادثات و سانحات کی شکل بنا دہی تلاش میں سو کرداں
ماہ دلو کی داستان حیات کے واقعات اٹلے ماہ دہیے



گلاب

اسماقادی

ساتویں قسط

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے لیکن اس کی باگ ٹور جب بااثر سماج کے روایتی نظام میں پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں۔ مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں۔ بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح نہہرتی ہے اور یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے۔ ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور چال کا سا ہے۔ جہاں طاقتور مچھلی چال کو تو زکر اور کمزور مچھلی بیچ کر نکل جاتی ہے۔ پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس پوچھتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے، زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے ... سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں ... کبھی بازی ہلت بھی جاتی ہے۔ گزرا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے ... اُس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہ چکا ہوتا ہے۔ جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی سلسلہ در سلسلہ۔

عقرب کی فصول گری قسمت کی چاب بازی یا مقدر کا کھیل ... ملے اور پھڑپھڑ جانے والوں کی کہانی



”کیا مطلب؟ کہاں گئی وہ؟“ لفظ ”لاپتا“ نے اس کے ذہن میں بھونچال پکڑ دیا۔ ایک پندرہ سالہ لڑکی کے لاپتا ہونے کا یہ مطلب تو نہیں لیا جاسکتا کہ وہ کسی چھوٹے بچے کی طرح گھر کا راستہ بھول کر گئی ہوگی یا نہیں۔ جھپٹ بھاڑ میں گم ہوگئی ہو۔ اس کے لاپتا ہونے کا مطلب تھا کہ کسی نے غائب کر دیا ہے یا پھر وہ اپنی مرضی سے کہیں چلی گئی ہے۔ یہ دونوں ہی صورتیں نہایت تشویش ناک تھیں۔

ڈی آئی جی حیات اور ان کی بیوی کو اگر کسی نے غائب کیا تھا تو اس کے پیچھے یقیناً کوئی گہری سازش تھی۔ حیات اور ان کی کام سے روکنے یا اس سے کوئی مطالبہ منوانے کے لیے ایسی حرکت کی جاسکتی تھی جبکہ دوسری صورت بھی بعید از امکان نہیں تھی۔ شوخ و شنگ، بھولی بھالی شینا عمر کے جس حصے سے گزر رہی تھی، وہ بہت نازک تھا۔ اس عمر کی لڑکیوں کو راستے سے بھٹکا دینے والے بہت ہوتے ہیں۔

”وہ کہاں گئی؟ کچھ پتا نہیں چل رہا۔ مجھے تو خود ابھی تھوڑی دیر پہلے اس بارے میں بتایا گیا ہے ورنہ تمہارے ماموں اور سجاد دونوں نے ہی مجھ سے یہ بات چھپائی تھی۔ اب بھی انہوں نے مجھے سریم کی وجہ سے اطلاع دی ہے۔ شینا کے غائب ہونے کی وجہ سے پریشانی میں اس کا کافی لی شوث کر گیا ہے۔ میں اس وقت سجاد کے گھر میں سریم کی کے پاس ہوں۔ سریم کو ڈاکٹر کوئی دوا دے کر گیا ہے جس کی وجہ سے وہ سو گئی ہے۔ میرا دل اکیلے میں بہت گھبرا رہا تھا اس لیے میں نے تمہیں فون کر لیا۔“ اسے ان کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش صاف محسوس ہو رہی تھی۔

”اجھا، آپ پریشان مت ہوں۔ میں خود وہاں آتا ہوں پھر مل کر اس مسئلے کو حل کرتے ہیں۔“ اس نے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی۔

”ٹھیک ہے بیٹا! میں تمہارا انتظار کروں گی۔“ ان پر اس کی بات کا فوری اثر ہوا۔ اس سے ان کی جذباتی وابستگی اتنی شدید تھی کہ وہ سجاد رانا سے بھی زیادہ اس پر بھروسہ کرتی تھیں۔ اس نے دو تین مزید لمبی آمیز جملے کہے اور پھر فون بند کر کے سجاد رانا سے رابطہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ دو تین کوششوں کے بعد انہوں نے اس کی کال رد کر دی۔

”میں یہ کیا سن رہا ہوں سجاد بھائی... شینا کیسے لاپتا ہو گئی؟ آپ کہاں ہیں اور مجھے کیوں نہیں بتایا؟“ ان کی آواز سن کر اس نے ایک ہی سانس میں کئی سوالات کر ڈالے۔

”تمہیں یقیناً ہی فون کیا ہوگا۔ میں نے جان بوجھ کر تمہیں اطلاع نہیں دی تھی کہ تم پریشان ہو جاؤ گے۔“ وہ

یقیناً پریشان تھے لیکن اپنے لیے کوسنبھالا ہوا تھا۔ ”مجھے پریشان ہونا بھی چاہیے۔ میری بیٹی صبح سے غائب ہے اور مجھے خبر بھی نہیں دی آپ نے۔“ اس وقت وہ اس کی شہر یا نہیں بلکہ ایک بچھا تھا جو اپنی بیٹی کے غائب ہونے پر بری طرح پریشان تھا۔ ”مجھے تفصیل سے یہ بتائیں کہ ہوا کیا تھا؟ آخر اس طرح شینا کیسے غائب ہو سکتی ہے؟“ سجاد رانا نے اس کی بات کا جواب دینے میں کچھ توقف کیا تو اس نے فوراً ہی دوسرا سوال کر ڈالا۔

”میری بچھ میں خود بھی کچھ نہیں آ رہا کہ وہ کہاں غائب ہو گئی ہے۔ صبح وہ ساڑھے دس بجے کے قریب ڈرائیور کے ساتھ اسکول کے لیے روانہ ہوئی تھی۔ آج اس کے اسکول میں کوئی فٹکشن تھا اس لیے اسے اسکول باؤنڈ سے ہٹ کر دیر سے وہاں پہنچنا تھا۔ میں تو صبح ہی گھر سے نکل چکا تھا۔ سریم گھر پہنچی۔ پوچھنا کہ قریب آپ کا مجھے فون آیا کہ فوراً گھر پہنچیں ابھی چلی ہے۔ میں گھر پہنچا تو سریم، ڈرائیور پر چڑھ چلا رہی تھی۔ اس نے دوسرے ملازموں سے اس کے ساتھ جیر بندھوا دیے تھے۔ میں نے اس سے اس صورت حال کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ شینا کہیں غائب ہوگئی ہے اور یہ اطلاع لے کر آنے والا ڈرائیور ہے۔ میں نے ڈرائیور سے پوچھ گچھ کی تو اس نے بتایا کہ صبح جب وہ شینا کو لے کر گھر سے نکلا تو راستے میں اس کے گھر سے اس کی بیوی کا فون آگیا۔ بیوی نے اسے بتایا کہ تمہاری ماں کی طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے اور گھر میں اس کی دوا موجود نہیں۔ ڈرائیور کے مطابق اس کی ماں دسے کی مرلیفہ ہے جس کی حالت کسی بھی وقت اچانک بگڑ جاتی ہے۔ کچھلے روز اس کی بیوی نے اسے یاد دلایا تھا کہ ماں کی دوا میں ختم ہو چکی ہیں مگر وہ اتھاہ ہوا ہونے کی وجہ سے جلدی ہو گیا اور ماں کی دوا نہیں لارہا۔ اب جو اسے فون پر یہ اطلاع ملی کہ ماں کی طبیعت خراب ہو رہی ہے اور گھر پر دوا بھی موجود نہیں تو وہ پریشان ہو گیا۔ شینا نے اس کی پریشانی بھرتی نہیں کی اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اس کی ماں کی طبیعت خراب ہے تو اس نے اصرار کیا کہ ڈرائیور اسے اسکول پہنچانے سے قبل اپنی ماں کو اس کی دوا میں پہنچائے۔ پریشانی کی وجہ سے اس نے شینا کی بات مان لی اور راستے میں پڑنے والے ایک میڈیکل اسٹور سے دوا میں اور ان پلر... خرید کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کا گھر لاہور کے جس علاقے میں ہے، وہاں نمایاں اتنی تنگ ہیں کہ کوئی گاڑی اندر نہیں لے جانی جاسکتی۔ چنانچہ اسے شینا کے ساتھ گاڑی کو اپنے گھر سے دور چھوڑنا پڑا۔ گھر پہنچ کر ماں کو بے ہوش

دیکھنے اور اس کی حالت سنبھالنے میں اسے دس بارہ منٹ کا وقت لگ گیا۔ دس بارہ منٹ بعد وہ واپس اس جگہ آیا جہاں گاڑی کھڑی کی تھی تو اس نے دیکھا کہ شینا گاڑی میں نہیں۔ اس نے ارد گرد کے علاقے میں اسے تلاش کیا لیکن وہاں اس کی کوئی جگہ نہیں تھی جہاں شینا جاسکتی۔ میں نے خود جا کر اس علاقے کا معائنہ کیا ہے۔ واقعی وہاں تو کوئی دکان وغیرہ تک نہیں کہ یہ سوچا جاسکتا کہ شینا کسی چیز کی خریداری کے لیے ہی گاڑی سے اترتی ہو۔ بہر حال، ڈرائیور کے مطابق اس نے اپنے طور پر شینا کو تلاش کرنے کی کوشش کی اور پھر مزید دس پندرہ منٹ تک انتظار کرتا رہا کہ اگر شینا کسی ضرورت کے تحت گاڑی سے اتر کر نہیں گئی ہے تو اس دوران میں وہاں آجائے لیکن جب وہ نہیں آئی تو اس کی کم شدگی کی اطلاع لے کر گھر پہنچ گیا۔ سریم نے اسے اس کی بے پروائی پر پہلے خوب ڈانٹا ڈنٹا پھر اسکول فون کر کے معلوم کیا کہ شینا وہاں تو نہیں پہنچی ہے سریم کو یقین تھا کہ شینا ضرور اسکول پہنچ چکی ہوگی۔ اس نے دیکھا ہوگا کہ ڈرائیور کو دیر ہو رہی ہے تو اس نے کسی بیٹسی وغیرہ کے ذریعے اسکول پہنچنے کا فیصلہ کر لیا ہوگا لیکن جب اسکول سے یہ بتایا گیا کہ شینا وہاں نہیں آئی ہے تو سریم کو صبح معذور میں پریشانی ہوئی اور اس نے مجھے فون کر کے گھر بلاوایا۔ اس وقت کے بعد سے اب تک میں مسلسل شینا کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن کہیں سے کچھ بھی پتا نہیں چل رہا۔“ سجاد رانا نے اسے پوری تفصیلات سے آگاہ کر ڈالا۔

”میں ابھی نکل رہا ہوں یہاں سے۔ جلدی آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔“ ان کی پوری بات سننے کے بعد اس نے انہیں اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔

”رہنے دو شیریں! تم کہاں رات کے وقت پریشان ہو گے۔ یہاں ہم سب مل کر کوشش کر تو رہے ہیں شینا کو احوال کرنے کی۔“ سجاد رانا نے اسے روکنے کی کوشش کی۔

”میں یہاں رہ کر اور بھی زیادہ پریشان رہوں گا۔ ویسے بھی صبح مجھے لاہور پہنچنا ہی تھا۔ دھماکے کے زلزلوں کی عیادت کے لیے لاہور آنا میرے شیڈول میں شامل تھا۔ وقت سے کچھ پہلے پہنچ جاؤں گا تو اس میں کوئی حرج نہیں ہو گا۔“ وہ واقعی سچ کہہ رہا تھا۔ اگر ایسا نہ بھی ہوتا تو وہ شینا کے غائب ہونے کی اطلاع سن کر یہاں آرام سے بیٹھا نہیں رہ سکتا تھا۔ شینا، سجاد رانا کی اکلوتی بیٹی ہونے کی وجہ سے سب ہی کی آنکھ کا تاراجی اور وہ خود بھی اس سے شدید محبت کرتا تھا۔ یہ شدید محبت ہی تھی جس کی وجہ سے اسے اپنا لاہور چاہنا

بہت ضروری محسوس ہو رہا تھا ورنہ جس لڑکی کا باپ ڈی آئی جی، ٹانا آئی جی اور ڈاؤن ایلم اینٹ اے ہوں اس کی تلاش میں کون کی کسر باقی رہ سکتی تھی ہوگی۔ یہ بات وہ خود بھی خوب سمجھتا تھا۔

”ٹھیک ہے جیسی تھری مرضی۔ تمہارے آنے سے مریم اور مجی کو تھوڑا سا حوصلہ مل جائے گا۔“ اسے ارادے میں آئی دیکھ کر سجاد رانا نے جواب دیا اور مسلسل متفقہ کر دیا۔ اس نے ہیٹ میں کو اپنا سامان پیک کرنے کا حکم دیا اور عبدالمنان کو فون کر کے اپنی فوری طور پر لاہور روانگی سے متعلق اطلاع دیتے۔ جب چند ضروری ہدایات دینے لگا۔ عبدالمنان کو یقیناً وہ گھمراہی اس تبدیلی پر گھبراتی ہوئی ہوگی تاہم اس نے کوئی سوال نہیں کیا اور خاموشی سے اس کی ساری ہدایات منتر رہا۔ اس کا م سے فارغ ہونے کے بعد وہ جلدی جلدی تیار ہوا۔ اس دوران اس کا ضروری سامان پیک کیا گیا چٹا چٹا تھا۔ ٹھیک پندرہ منٹ بعد وہ لاہور کی جانب رواں دواں تھا۔

دیوار سے ٹیک لگے سے لنگی وہ چپ چاپ ان تینوں کو تیار ہوتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ سجاد رانی اور سجاد کے نام سے پکائی جانے والی تینوں ہتھیاں آہن میں جسی مذاق کرتے ہوئے تیار ہو رہی تھیں۔ تینوں نے فون پر کچھ کچھ اے اور ہنگ دار اور قدرے فٹنگ کے کپڑے پہنے تھے۔ اس گھر کے کپڑے پہننے کا ایک ہی سبب تھا کہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا جائے، سو وہ اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے ہر پورا انتظام کرتی تھیں یا شاید کرتے تھے۔ اسے بالکل سمجھ نہیں آتا تھا کہ ان کے لیے کون سا عینہ استعمال کیا جائے۔ وہ معاشرے کے اس تیسرے طبقے سے تعلق رکھنے والی ہتھیاں تھیں جنہیں اللہ نے مردانہ عورت کی واضح پہچان عطا کرنے کے بجائے ایک درمیانی سی حالت میں پیدا کر دیا تھا اور اب اس تیسرے طبقے سے تعلق رکھنے والے وہ اقرا اپنی تخلیق کے مقصد پر حیران پریشان زندگی کی گاڑی کو کچھ پیچھے لے کر اپنی ذات کو متاثر کر رہے تھے۔ صرف جیس کا مین نہ ہو سکنے کے باعث وہ اچھے خاصے صحت مند، ہاتھ پیر دل سے سلامت، عقل و شعور رکھنے کے باوجود معاشرے میں ایک مضبوط مصل کے طور پر زندگی گزارنے پر مجبور تھیں۔ انہیں نہ تو اپنوں کے درمیان رہنے کا حق حاصل تھا، نہ تعلیم و ترقی حاصل کرنے کا اور نہ ہی رزق حلال کمانے کے سہرے سہرے راستوں پر چلنے کا۔ وہ سارے حقوق جو بہ طور انسان انہیں حاصل تھے، معاشرے نے

سے ٹپک لگاے اپنی جگہ بیٹھی رہی۔

”جس اٹھ جانا... کیوں نگرے سوچ رہے ہیں آج تجھے؟
خواتونو ہمیں بھی دیر کروائے گی۔ ابھی خاصی شام پر گئی
ہے۔ میں نے صبح راولڈنگ کر دو شادی والے گھر تازے لیے
تھے۔ اس تیار ہو کر سیدھے وہیں جانا ہے مگر تو تیار تو...“
رائی اسے پکڑ سناٹے ہوئے تھوڑا سا جھنجھلا کر بولی۔

”شہزادی کو روک رہے دو۔ آج یہ میرے ساتھ رہے گی۔“
اس سے قبل کہ شہزادی ان لوگوں کے اصرار پر اپنی جگہ چھوڑ کر
تیار ہونے کے لیے اٹھی مگر اسے میں ایک آواز ٹھوکی۔ یہ آواز
ان سب کے گروائس کی تھی۔

”لے جانے دیں نا گروہی شہزادی کو ہمیں اپنے
ساتھ۔ آج بڑی کمائی کا چانس ہے۔ شہزادی ساتھ ہونی تو
زیادہ پیسے ملیں گے۔“ رائی نے ٹھٹھک کر فرمائش کی۔

”کیوں، تو اپنا سارا ہنر بھول گئی ہے کیا جو لوگوں نے
تجھ پر نوٹ چھاد کر نئے چھوڑ دیے ہیں؟ اگر ایسی بات ہے تو
میں تجھے اپنے ذریعے سے چتا کرٹی ہوں۔ تیری جگہ کوئی اور
آجائے گا۔“ گروہ نے فوراً اسے جھڑپا۔

”ایسی کوئی بات نہیں گروہی، رائی میں ابھی بڑا دم باقی
ہے۔ میں تو بس اس لیے کھڑی رہی تھی کہ شہزادی بڑا چھڑا وصول
جاتی ہے۔ اس کے وصول کی ٹھاپ پر میں دل سے نہ جتنی
ہوں۔“ رائی نے جلدی سے اپنی صفائی پیش کی۔

”کوئی بات نہیں، آج نگار وصول بجائے گی۔ پہلے بھی
تو یہی بھائی رہی ہے اور تم لوگ اسی کے وصول پر ناچ جا کر
کمانی رہی ہو۔ آج شہزادی سے مجھے کا سر ہے اس لیے اسے
روک رہی ہوں۔ اگر تم کچھ کم بھی کما کر لائیں تو میں کچھ نہیں
کہوں گی۔“ گروہ نے گویا سارا مسئلہ ہی حل کر دیا پھر شہزادی
سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”تو تیار ہو جا... آج تجھے
میرے ساتھ ایک جگہ چلنا ہے۔“ حکم صادر کرنے کے بعد
اس نے کمرے میں مزید رکتے کی ذمیت نہیں کی تھی۔

شہزادی کو گروہ سے سخت نفرت تھی اور اس کا دل نہیں
چاہتا تھا کہ اس کا کوئی حکم مانے مگر ان کے ضرر و جوروں کے
درمیان گروہ کی حیثیت ایک ظالم حکمران کی تھی جو اپنے ستم سے
ذرا سی بھی سرتابی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنی یہاں آمد
کے ابتدائی عرصے میں گروہ کے بڑے مظالم سہہ چکی تھی اس
لیے اب بھی دل نہ چاہتے ہوئے اس کے حکم پر عمل کرنے کے
لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ نگار نے اس کی تیاری میں مدد دی۔ اس
نے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ نگار کے کیے میک اپ نے اسے
بالکل بدل کر رکھ دیا تھا اور آئینے میں نظر آتا عکس اسے اپنے

صرف اس وجہ سے ان سے جیمن لیے تھے کہ قدرت نے
انہیں ایک واضح شناخت دینے کے بجائے آزمائش بنا کر دنیا
میں اتار رکھا۔ وہ تیسرا طبقہ معاشرے کے ان افراد کے لیے
جو ہر طرح سے مکمل تھے، ایک آزمائش ہی تو تھا لیکن
معاشرے نے ان سے جو سلوک روا رکھا تھا، اس سے صاف
ظاہر تھا کہ مجموعی طور پر پورا معاشرہ اس آزمائش میں ناکام ہو
چکا ہے۔ انہیں معاشرے سے کچھ مٹا تھا تو وہ تنہیک، حقیر اور
بھیک تھی۔ لوگ انہیں روزگار کے مواقع دینے کو ضرر مند نہیں
ہوتے لیکن چند سگے بھیک میں دینے کے بعد خود کو تخریب رو
کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان میں بھی ہمدردی اور
دردمندی کے احساس کے ساتھ بھیک دینے والے کم ہی
تھے۔ زیادہ تر تو ان کی بھوڑی آوازوں، بے لوج جسموں کی
حرکت، تالیوں کی پاپات اور ڈھول کی ڈھپا ڈھپ سے تیار
کردہ بے ہودہ نمائش سے لطف اندوز ہونے کے بعد ہی
نوازتے تھے۔ ایک مختصر تعداد ان شوقین مزارعوں کی بھی تھی
جنہیں داؤدیش دینے کے لیے سبکی آدھے اور دوسرے، معما جسم
ہی بھاتے تھے۔ اپنے ساتھ ہونے والی اس زیادتی پر آواز
احتجاج بلند کرنے کے بجائے اس تیسرے طبقے کے زیادہ تر
افراد نے معاشرے کے آگے سر ڈال دینا ہی مناسب سمجھا تھا
اور اپنی ایک الگ دنیا بنا کر سارا درد دل میں پیچھائے کسی
خوشی رہنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس کے ساتھ اس ٹھٹھک و
تارک ٹھٹھک میں موجود افراد بھی ایسے ہی تھے جن کے ماں
باپ نے تو انہیں جانے کیا نام دیے تھے لیکن وہ خود کو ملکہ،
رائی، نگار کہلا کر خوش ہوتے تھے۔ اسے بھی یہاں شہزادی کے
عہدے پر فائز کر دیا گیا تھا۔ ایسی شہزادی کے عہدے پر جس
کے پاس کوئی اختیار و سبوت نہیں تھی اور وہ ان کے ساتھ جا کر
وصول جیتی تھی، جب کہیں جا کر وہ چند روپے ہاتھ آتے تھے
جن کے سہارے زندگی کی گاڑی کو تھکنا چاہئے۔

”اے شہزادی! تو کیا کابل کی طرح بیٹھی منہ تک رہی
ہے... اٹھ کر تیار کیوں نہیں ہوتی؟“ اسے بہت دیر سے اسی
طرح پیچھے دیکھ کر ملکہ نے اسے ٹوکا۔ وہ خود آئینے کے سامنے
کھڑی تیار ہو رہی تھی۔ اپنی گردن سے ذرا نیچے تک آئے
بالوں میں اس نے طلی بالوں کی چٹیا گونجی تھی اور اب اس
چٹیا میں زرد اور سنہری رنگ کا پرانہ ڈال رہی تھی۔

”ہاں ہاں، جلدی اٹھ جا۔ دیکھ آج میں نے تیرے
لیے یہ سرخ رنگ کا جوڑا نکالا ہے۔ تو جلدی سے اٹھ کر
کپڑے بدل لے پھر میرا میک اپ بھی کرنا ہوگا۔“ رائی
نے بھی ملکہ کا ساتھ دیتے ہوئے اسے ٹوکا مگر وہ بولی دیوار

بجائے کسی اور کا محسوس ہو رہا تھا۔
 ”ہاں، ابھی شہزادی آتا ہوگی تو؟“ ابھی وہ آ بیٹھے میں
 اپنا جائزہ لے لی رہی تھی کہ گرو نے پیچھے سے آ کر پوچھا اس
 نے شخص اشیات میں سر ہا کر اس کی بات کا جواب دیا۔
 ”چل تو پھر کھل چکیں۔ ہمارا انتظار ہو رہا ہوگا۔“ گرو
 نے کہا تو وہ اس کے پیچھے چل پڑی مگر یہ پوچھنے کی ضرورت
 محسوس نہیں کی کہ انہیں کہاں جانا ہے اور کون ان کا انتظار کر رہا
 ہے؟ اس کا یہی خیال تھا کہ گرو بھی اسے کسی خوشی کے کمر میں
 کمانی کے خیال سے لے جا رہا ہے۔ ویسے یہ بات کچھ غلط
 معمول تھی۔ گرو عموماً گھر میں ہی رہتا تھا۔ کمانے دھانے کی
 ذمہ داری اس کے سر پر نہیں تھی۔ ہاں اگر کہیں کوئی بڑا
 فکشن ہو رہا ہو تو وہ خود اپنی نیم کے ساتھ نمرانی کے لیے ضرور
 جاتا تھا۔ آج نہ جانے اسے کہاں جانا تھا کہ اس نے بائی نیم کو
 ساتھ لیا ضرور ہی نہیں سمجھا تھا۔ دل ہی دل میں ابھتی ہوئی گرو
 کے پیچھے چلتی رہی۔ کتنی لمبی گلیوں میں سے گزر کے جہاں
 جگہ جگہ ٹنڈی کے ڈھیر لگے تھے، وہ دونوں کھلی جگہ پر پہنچے۔ یہ
 جگہ مین روڈ تو نہیں لیکن یہاں سے رکشا اور بسی وغیرہ
 آسانی سے مل جاتے تھے۔ اس وقت بھی گرو نے ہاتھ دے
 کر ایک خالی بسی کو روکا۔

سے اتریں تو اس وقت اپنا منہ کھولیں۔ تمہیں تمہارا منہ مانگ
کراہیل جائے گا۔" گرو نے اس بار خفی سے اس کی بات کا
جواب دیا لیکن وہ کافی ذہیف انسان تھا۔
وہ قہر بہ مار کر ہنسنے لگا پھر ایک دو چر میں شرادی کی
طرف دیکھ کر اسے آٹھ مارتے ہوئے بولا۔ "لگتا ہے تیرا گرو
تیرا سودا کرنے جا رہا ہے جب ہی اتنا مفرد ہو رہا ہے۔ ہاں
جی، آج کل تو تمہاری قوم کے بھی بڑے دام چڑھتے ہوئے
ہیں اور تو بے بھی زبردست مال۔" اس کی یہ بے جا بات
بائیس من کر شرادی نے جواب تو کوئی نہیں دیا لیکن منہ پھیر کر
کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ اسی وقت ان کی کیمچی کے قریب
پے ایک گاڑی گزری۔ گاڑی کی کیمچی نشست پر بیٹھے ہوئے
بھس کا چہرہ اس کے لیے شناسا تھا لیکن اس سے قبل کہ وہ
شناسا چہرے والے اس شخص کو آواز دیتی، گاڑی... ٹیکسی کو
آدور ٹیک کرتی ہوئی آگے نکل چکی تھی۔ دوسری طرف یہاں
ٹیکسی میں بھی صورت حال بدل چکی تھی۔ گرو کے لیے کیمچی
ڈرائیور کا روپ ہی ناقابل برداشت ہو چکا تھا اور وہ نہایت غصے
میں اسے ٹیکسی روکنے کا حکم دے رہا تھا۔

پہلی میں بیٹھی تھی۔ اس کا ذہن اس صورت حال کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر تھا۔

”اے شہزادی! اتر بیٹھے۔ کیا اس منصفہ کے ساتھ جانے کا ارادہ ہے؟“ اس نے پوچھی۔ بیٹھا دیکھ کر گرو نے اسے ڈپٹا کر اس نے لاک کھول کر اپنی طرف کا دروازہ کھولا لیکن ابھی اچھے اتریں پائی تھی کہ ڈرائیور نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے پیچھے کی طرف جھک کر تیزی سے دروازہ دوبارہ بند کر دیا۔ شہزادی کے حلق سے ایک زوردار چیخ نکلی۔ اس کا درمیان میں رکھا ہوا ہاتھ دروازہ بند کرنے کی وجہ سے بری طرح ہل گیا۔ ڈرائیور جو بیٹھا دروازہ بند کرنے کے بعد اس سمیت ٹیکسی کو پیچھا لے جانے کا ارادہ کر رہا تھا، اس چیخ پر ڈراسا ہلکا گیا۔ گرو کے لیے یہ ڈراسا وقفہ بھی کافی تھا۔ اس نے ڈرائیور کی طرف کا دروازہ کھول کر اسے گریبان سے پکڑ کر نیچے کھینچا اور دونوں تھوں سے بری طرح پیٹنا شروع کر دیا۔ اس کے ہاتھ اتنی بھاری سے چل رہے تھے کہ ڈرائیور اپنا بچاؤ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ ان کے قریب سے گزرنے والی گزریاں اور ارد گرد جو دلوگ اس قماشے کو دیکھنے کے لیے جمع ہونے لگے۔ ٹیکسی ڈرائیور کے ایک ڈھکے کے ہاتھوں پٹنے کا نظارہ کرنے سے اورو دلچسپ کام بھلا اور کون سا ہو سکتا تھا۔

مگر وہ نے کوئی کے دروازے کے ساتھ لکھنی کا ہن ہایا تو فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔
 "کیا ہوا الماس! یہ بچی زخمی کیسے ہو گئی؟" گیت کھولنے والے نے جو انہی جیسا تھا، شہزادی کے ہاتھ سے بہتے ہوئے خون کو دیکھ کر فوراً ہی چھا۔
 "ہاں ایک نصیب آدی نکرا گیا تھا، اس کی وجہ سے یہ مصیبت آ گئی۔" مگر خود شہزادی کے زخمی ہونے پر براہِ رحمہ تھا چنانچہ اس طرح دانت کچکا تے جھوٹے تپا جیسے اس طبی ڈاکٹر اور اپنے دانتوں تلے میں رہا ہو۔
 "تم اسے لے کر اندر چلو تاکہ اس کی مرہم پٹی کی جا سکے۔" اس کے مشورے پر گرو نے عمل کیا۔ ایک کمرے میں پہنچ کر گرو نے اسے صوفے پر بٹھایا اور اس کے ہاتھ پر بندھا ہوا دودھ چاٹھو لے لگا۔ دوا چٹھتی سی ایک بار پھر خون کا اخراج شروع ہو گیا لیکن اس دوران انہیں یہاں بیٹھے والا فرسٹ ایڈ بکس لے کر آ گیا تھا۔ اس نے اور گرو نے ہی کر شہزادی کے زخمی ہاتھ کی مرہم پٹی کی۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ لوگ سامان سمیت گردا ہاں فرسٹ ایڈ بکس میں رکھ رہے تھے کہ ایک لہجہ بڑا اور اجیز عمر بھڑا کمرے میں داخل ہوا۔
 "نستے مہارو دی! گروہ کام چھوڑ کر فوراً اس کی قدم ی کے لیے بچھا۔ صوفے کی پشت سے سر کاٹ کر بھی شہزادی نے کچھ چونک کر ٹرو کی طرف دیکھا۔
 "بھئی رہ... میں نے جیسے ہی سنا کہ الماس پہنچ گئی ہے، فوراً آتھ سے ملنے چلی آئی۔" گرو کے سر ہاتھ پھیرتے کے مہارو نے کہا اور پھر شہزادی کی طرف دیکھتے ہوئے "یہ شہزادی ہے نا... جس کا تو نے مجھے ذکر کیا تھا؟"
 "ہاں مہارو جی! مگر بد قسمتی سے ایک بدعاش طبیکی ایڈریک وجہ سے یہاں آتے ہوئے اس کا ہاتھ شدہ زخمی ہو گیا۔" مگر وہ الماس اپنے مہارو کو سارا قصہ تفصیل سے سناتے یہ سب سناتے ہوئے اس کے لہجے میں جو کہ اور قہر تھا، غزازی کو حیرت میں مبتلا کر رہا تھا۔ اس نے گروہ پیش خود سر کرتے ہوئے ہی دیکھا تھا اب اسے زخمی ہونے پر اس افسردہ اور غصہ ناک ہونے کی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔
 "چل جائے دے... غصہ قہوک دے۔" جہون تھا ہو "مہارو نے ساری بات سننے کے بعد الماس کو پکپکا را ست ایڈ بکس اٹھا کر باہر جاتے ہوئے اپنے دوسرے کی طرف اشارہ دیکھتے ہوئے بولا۔
 "یہی ایڈریک ہے نا... مگر اس کے ہاتھ کی حالت

پانی کی رنگت کسی پتیلی پر چلی ہے۔ گھوگڑ والا دودھ پانی کر اس میں ذرا جان شان آجائے گی۔

”ابھی لائی مہا گرو جی۔“ سوئی کے نام سے پکارا جانے والا ہنڈوا پھرتی سے کمرے سے باہر نکلا۔

”اب تو اس کی طرف سے بے فکر ہو جا الماس! سوئی اس کا خیال رکھے گی۔ تو چل کر دوسرے کام دیکھ۔ تیری شہزادی آج رات اس کمرے میں مہمان بن کر رہے گی۔“ سوچے وہاں جاتے ہوئے تو اسے اپنے ساتھ لے جانا۔

مہا گرو الماس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنے ساتھ باہر لے گیا تو تھوڑی ہی دیر بعد سوئی دودھ کے گلاس کے ساتھ وہاں پہنچ گئی۔ شہزادی نے اس کے ہاتھ سے دودھ لے کر پنی لیا۔ دودھ پینے سے اسے خاصی تھوڑی محسوس ہوئی۔

”تم اسی صوفے پر آرام سے لیٹ جاؤ۔ تھوڑی دیر بعد میں تمہارے لیے کھانے لے آؤں گی۔ کھانا کھا کر آرام سے سو جانا۔“ سوئی نے اس کے ہاتھ سے گلاس لیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ شہزادی کو محسوس ہوا کہ اس نے باہر سے دروازے کی کنڈی بھی لگا دی ہے۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس نے اس بات کی تصدیق کی۔ واقعی دروازہ باہر سے بند تھا اور وہ اسے محسوس کر نہیں سکتی تھی۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ ایسا

گروہ کے اشارے پر کیا گیا ہوگا۔ گروہ کو اس کے فرار ہونے کا خطرہ تو بہر حال لگ ہی رہتا تھا اس لیے وہ کسی بھی موقع پر احتیاط کرنے سے نہیں چوکتا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں بھی جب بھی وہ باہر نکلتی تھی تو لگہ ورائی اور نگار اس پر خصوصی نظر رکھتے تھے۔ وہ ان سب کے لیے ہی ناقابل اعتبار تھی جسے وہ

اپنی نظروں کے پھروں میں رکھنا ضروری سمجھتے تھے۔ اس وقت بھی اس کے فرار کی راہ مسدود تھی چنانچہ وہ وہاں صوفے پر آ بیٹھی اور پھر سوئی کے مشورے کے مطابق اسی پر لیٹ کر آرام کرنے لگی۔ لیٹے لیٹے اس پر بھی سی غنودگی بھانے لگی لیکن اس غنودگی کے عالم میں بھی وہ محسوس کر سکتی تھی کہ اس کمرے سے باہر اچھی خاصی چٹیل پھیل ہے۔ یوں لگتا تھا کہ

کوئی میں بہت سارے مہمان آئے ہوئے ہیں۔ شاید وہاں کوئی دعوت بھی لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ گروہ الماس اسے یہاں لانے کے بعد بالکل فراموش کر چکا تھا۔ اگر وہ اسے کسی دعوت میں شرکت کے لیے اپنے ساتھ لایا تھا تو اسے اس طرح ایک کمرے میں بند کیوں کر دیا تھا؟ یہ بات اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ یونہی سوئی باقی حالت میں سوچوں کے

درمیان نظر بیا ایک گھنٹا گزر گیا اور اسے دروازے پر آہٹ ملانی دی۔ آہٹ کی آواز پر وہ چونک کر اٹھی۔ سوئی نے اسے

اٹھائے کمرے میں آ رہی تھی۔ ٹرے لاکر اس نے میز پر رکھی اور بولی۔

”یہ تمہارا کھانا ہے۔ کھانا کھانے کے بعد برتن ایسے ہی رہنے دینا اور خود آرام سے سو جانا۔ میں بعد میں آ کر برتن لے جاؤں گی۔ اس کمرے کے ساتھ انچھڑ ہاتھ روم بھی ہے۔ تمہیں اپنی سی ضرورت کے لیے باہر نہیں لگانا پڑے گا۔ پانی بھی میں اس بوتل میں بھر کر لے آئی ہوں۔ برف بڑا ہوا پانی ہے۔ بہت دیر تک ٹھنڈا ہی رہے گا۔“

اسے یہ ساری باتیں بتا کر وہ چلتی میں کمرے سے باہر نکل گئی اور حسب سابق دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ سوئی کے جانے کے بعد اس نے ٹرے میں رکھے کھانے کا جائزہ لیا۔ چکن بریانی، مشن کزائی اور فیئرٹی پر مشتمل اس کھانے کے ساتھ سلا اور رائے کا بھی اہتمام تھا۔ کھانا دیکھ کر اسے حیرت

یقین ہو گیا کہ کوئی میں کوئی دعوت ہو رہی ہے۔ تاہم اسے خاصا نا ہو چکا تھا اور اسے بھوک بھی لگ رہی تھی چنانچہ اٹھ کر غسل خانے میں گئی اور منہ ہاتھ دھو کر اسے کھانا کھانے کے لیے کھانا کھانا شروع کر دیا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد وہ ایک بار پھر ہاتھ دھوئے غسل خانے گئی۔ اس وقت اس نے

بے غور ہاتھ روم کا جائزہ لیا۔ سفید بکڑ والے اس ہاتھ روم میں صرف پانی کی ایک باقی رہی ہوئی تھی لیکن اس کی تہہ نامرکز دیوار پر موجود درشن تھا جس میں کوئی سلاخ وغیرہ نہیں لگی ہوئی تھی۔ اگرچہ درشن دان زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن اسے امید تھی کہ اگر وہ کسی طرح اس درشن دان تک پہنچ گئی تو اپنے دلے پٹے وجود کو اس میں سے نکال کر باہر نکلتی ہے۔ فرار کا ایک امکان نظر آنے کے بعد اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ دھڑکنے دل کے ساتھ وہ ہاتھ روم سے باہر آئی اور

کمرے کے دروازے سے کان لگا کر باہر کی سن گئی۔ لیٹے لیٹے اس وقت باہر بالکل سناٹا تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے پوری کوئی میں اس کے سوا دوسرا کوئی نفس موجود نہ ہو۔ ہاتھ روم پر یہ سن گئی لیٹے کے بعد وہ وہاں ہاتھ روم پہنچی۔ درشن دان کی صورت میں نظر آنے والا فرار کا راستہ اتنا آسان نہیں تھا۔ سب سے پہلا مسئلہ تو اس درشن دان تک رسائی کا تھا۔ اس کے بعد یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس درشن دان کی دوسری طرف کیا ہے؟ وہاں سے کودنے کی کوشش میں وہ کسی کی نظر میں بھی

آ سکتی تھی۔ اگر ایسا ہو جاتا تو اس کی مشکلات مزید بڑھ جاتیں۔ گروہ الماس کا نظم اس نے صرف دیکھا ہی نہیں، سنا بھی تھا اس لیے پکارے جانے سے بے حد خوف زدہ تھی لیکن پھر آزادی کی خواہش بروز خوف پر غالب آگئی اور اس نے ایک

کوشش کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے درشن دان تک پہنچنے کے امکانات کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ درشن دان فلیش ٹینکی کے مین اوپر تھا۔ یعنی وہ فلیش ٹینکی پر چڑھ کر اس تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کر سکتی تھی لیکن فلیش ٹینکی سے درشن دان کا فاصلہ دیکھتے ہوئے اسے یہ کام مشکل لگ رہا تھا۔ گروہ کوشش کیے بغیر بارشیں ماننا چاہتی تھی، چنانچہ ٹینکی کے لیے تیار ہو گئی۔ سب سے پہلے اس نے غسل خانے میں موجود پانی کو

الٹ کر رکھا پھر اس پر پھر رکھ کر فلیش ٹینکی پر چڑھ گئی۔ اس مختصر سی جگہ پر کھڑا ہوا آسان نہیں تھا، دوسرے یہ دیر جی تھا کہ فلیش ٹینکی اس کا وزن سہارنے سے الٹا کر کے زمین بوس نہ ہو جائے لیکن خیر گزری اور ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ٹینکی کی سچ پر بہت احتیاط سے چڑھ جاتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھ دیوار کے ساتھ کھرا کر آہستہ بلند کیے۔ جلد اس کی انگلیوں نے

درشن دان کے چوکھٹے کو چھو لیا۔ انگلیاں چوکھٹے سے۔۔۔ چھوئیں تو اس کا حوصلہ بڑھ گیا اور اس نے ہاتھوں کو پوری طرح بلند کر کے چوکھٹ کو اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لے لیا۔

اب اس کے پاس درشن دان تک پہنچنے کی واحد صورت یہی تھی کہ اپنے بازوؤں کی قوت کو آزمائے اور اچھل کر درشن دان تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اس نے یہی کیا۔ اس کی یہ پہلی کوشش بس جزوی طور پر ہی کامیاب ہو گئی۔ اس کا جسم ذرا سا اوپر تو اٹھا لیکن وہ اتنا اپنے جسم کو اٹھانے میں کامیاب نہیں ہو سکی کہ درشن دان تک پہنچ پائی۔ اب اس کی پوزیشن کچھ یوں تھی کہ وہ درشن دان کی چوکھٹ سے لٹکی ہوئی تھی اور اس کے پیچھا سہا دیوار پر چھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس نے اتنی قلیل مدتی ضرورت کی تھی کہ اپنی سینڈلیں کمرے میں ہی چھوڑ آئی تھی۔ پیروں میں سینڈلیں نہ ہونے کی وجہ سے اسے پیچوں کو موز کر دیا کہ اس سہارا لینے میں

کافی مدد مل رہی تھی۔ کچھ پہچن میں درشتوں پر چڑھنے کی پریکٹس کا بھی فائدہ تھا کہ وہ اس سخت جدوجہد سے کسی نہ کسی طرح خود کو گزرا رہی تھی۔ اگر نہایت دیوار کے بجائے یہ کوئی درخت ہوتا تو وہ اب تک اس کی چوٹی پر پہنچ چکی ہوتی لیکن۔۔۔

فحاصل تو درشن دان تک پہنچنا بھی اتنا مشکل لگ رہا تھا۔ جسم کا زیادہ تر بوجھ بازوؤں پر آ جاتا ہے وہاں سے بازوؤں کو گھماتے گھماتے لیے چار کھنک تھی اور مسلسل اپنے جسم کو اچھال کر اوپر پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کوشش میں اس کا سارا جسم پتے میں نہا گیا تھا۔ آخر کار اس کی یہ محنت رنگ لائی اور وہ درشن دان

تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔ وہاں بیٹھ کر اس نے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ دوسری طرف کا جائزہ لیا۔ اس حصے میں زیادہ روشنی نہیں تھی تاہم یہ اتنا اندازہ ہوا تھا کہ یہ کوئی کے باہر کا نہیں بلکہ کوئی اندرونی حصہ ہے۔ بہر حال اس حصے تک پہنچ جانے میں بھی اس بات کا امکان تھا کہ اسے باہر جانے کا موقع مل جائے گا۔ سانس درست کر لینے کے بعد اس نے دوسری طرف اترنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس مقصد کے لیے ایک دم چھلانگ لگانے کے بجائے اس نے وہی ترکیب استعمال کی جو درشن دان پر چڑھنے کے لیے استعمال کی تھی۔ اپنے دونوں ہاتھ درشن دان کی چوکھٹ پر بٹھا کر وہ اس سے نکل گئی اور پھر آہستہ سے اپنے ہاتھ چھوڑ دیے۔ اس کی پوری کوشش

تھی کہ پانی کی طرح بچوں کے مین و مین پر گرے تاکہ چوٹ نہ آئے لیکن ظاہر ہے، اسے اس کی محنت نہیں تھی اس لیے وہ چپ سے زمین پر آ رہی۔ خوش قسمتی سے اس طرف دیوار کا تین چھٹا ہوا تھا اس لیے اسے زیادہ چوٹ نہیں آئی۔ بد خبر عاقبت یہاں تک پہنچ جانے کا دل میں شکر کرتے ہوئے اس نے

ارد گرد کا جائزہ لیا۔ یہ لاؤنچ نما کھلا حصہ تھا جہاں بید کی کرسیاں اور میز وغیرہ رکھی تھیں۔ سناٹے اور نیم جہاں کے باوجود وہ بے حد احتیاط سے دیوار کے ساتھ لگ کر آگے کی طرف بڑھی تاکہ کچھ کراس سامنے والے حصے کی طرف اسے

جہاں اس کمرے کا دروازہ تھا، جس میں اوجھڑی اور پہلے قید تھی۔ اس حصے میں پہنچ کر اسے کوئی سے باہر جانے کا راستہ اچھوٹنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ دیوار کے ساتھ لگ کر کھنک کھنک جگہ سے وہ اس مقام تک پہنچی جہاں دیوار ختم ہو رہی تھی تو ایک دم سامنے جانے کے بجائے اس نے احتیاطاً

ذرا سا سر کال کر بھاٹکا اور فوراً پیچھے کر لیا۔ وہاں اسے سوئی کے علاوہ دو تین افراد اور نظر آئے۔ لیکن ان میں سے کسی کی توجہ اس طرف نہیں گئی۔ اس نے ہمت کر کے ایک بار پھر بھاٹکا۔ وہ سب اس سے بے نیاز ایک ایسی جدوجہد میں مصروف تھے کہ ان کے اس کی طرف متوجہ ہونے کا امکان ہی نہیں تھا۔ وہ

جہاں ان پریشان سی اس منظر کو دیکھتی رہی اور پھر ان کے دائیں طرف مڑنے کے بعد خود بھی دبے قدموں سے اس طرف ہل پڑی۔ جس اور حیرت نے اسے فی الوقت اپنے فرار کا خیال بھلا دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

”کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ کیا کریں؟ نہ جانے ہیٹھا کون ہیں کھانچے سے یا آسمان نکل گیا ہے۔ تمہیں سے اس کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں مل رہی۔ پوری پوچھیں ڈس اگرت ہے۔“

☆ ☆ ☆

شہر سے باہر جانے والے راستوں کی ناک بندی کر دی گئی ہے۔ لڑکیوں کے بزنس میں انوا کو تمام گروہوں کو کھنگالا جا چکا ہے۔ پولیس کے تجربہ شہر میں سرگرم تمام جرائم پیشہ گروہوں کی سرکریوں کے بارے میں چھان بین کر چکے ہیں لیکن کہیں سے بھی ایک معمولی سا گلیو تک نہیں ملا۔ "سجاد رانا کے ذرا رنگ روم میں اس وقت وہ چار افراد بیٹھے تھے جن کا ہیٹنا سے بے حد قریبی رشتہ تھا۔ وہ چاروں ہی ملک کے با اختیار افراد میں شمار ہوتے تھے لیکن اس وقت چاروں ہی بڑے بے بس نظر آ رہے تھے۔

"میرے لیے تو حرم کو نہیں کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ ہیٹنا کے بارے میں سوال کرنا شروع کر دیتی ہے کہ پاپا، ہیٹنا کا کچھ پتا چلا اور میں شرمندہ ہو جاتا ہوں کہ آئی جی پنجاب ہونے کے باوجود اتنا بے بس ہوں کہ اپنی نوادی کے بارے میں اب تک کچھ بھی معلوم نہیں کر سکا۔" مختار مراد کے چہرے پر شہد بے بسی تھی۔

"میرے خیال میں یہ کسی عام جرائم پیشہ گروہ کا کام ہے بھی نہیں۔ ذرا تیر کو آپ لوگ اچھی طرح کھال چکے ہیں۔ نقشہ کش کا ہر طریقہ آزمانے کے باوجود وہ اپنے پہلے بیان پر قائم ہے۔ معلومات کروانے پر اس کی تمام باتوں کی تصدیق بھی ہوئی ہے اس لیے یہ سوچنا تو بے کار ہے کہ کسی نے اس سے ساز باز کر کے ہیٹنا کو غائب کیا ہے۔ موجودہ صورت حال میں میرے ذہن میں ایک خیال آ رہا ہے... ہو سکتا ہے کہ کوئی پہلے سے اس تاک میں لگا ہو کہ موقع ملے اور ہیٹنا کو غائب کر دے۔ اس مقصد کے لیے وہ مسلسل اس کی عمرانی کرتا رہا ہوگا اور کل صبح جب..... اسے ہیٹنا ایک سنسان جگہ پر تنہا گاڑی میں بیٹھی نظر آئی تو اسے انخوا کر لیا گیا۔" شہر یار نے خیال آرائی کی۔

"ایکچر ش نے بہت اچھی طرح گاڑی کا جائزہ لیا ہے۔ انہیں دروازے کے پنڈل پر ہیٹنا کے سوا کسی کی انگلیوں کے نشانات نہیں ملے بلکہ پوری گاڑی پر کہیں کسی انہی کے فنگر پرنٹس نہیں ہیں۔ گاڑی میں کسی قسم کی کوئی ابتری بھی نظر نہیں آئی جس سے خیال کیا جاتا کہ ہیٹنا کو کسی نے زبردستی گاڑی سے اتارا ہے۔ اس کا پنڈیک، فلاور، کیے اور ایک کا ڈبا جو وہ پارٹی کے لیے اپنے ساتھ لے کر گئی تھی، بالکل جوں کے توں پائے گئے ہیں۔"

"کہا آپ کی نظر میں کوئی ایسی بات ہے جس کی بنیاد پر ہم یہ سوچ سکیں کہ ہیٹنا کو انخوا نہیں کیا گیا اور وہ اپنی مرضی سے گئی گئی ہے؟" سجاد رانا کی بات سن کر اس نے بھی نظروں

سے ایک نازک سوال کیا۔ وہ رات سے یہاں آیا ہوا تھا اور ہیٹنا کی بازیابی کے مسئلے میں کی جانے والی کوششوں میں سب کے ساتھ تھا لیکن کہیں سے ایسا کوئی کیونٹین مل سکا تھا جس سے یہ گمان کیا جاتا کہ اسے انخوا کیا گیا ہے۔ ایسے میں ہیٹنا کے اپنی مرضی سے کہیں چلے جانے والی بات خود بہ خود ہی ذہن میں آ رہی تھی... لیکن ایک تو وہ خود جانتا تھا کہ ہیٹنا معمولی طبیعت کی لڑکی ہے، دوسرے ایسے کسی سوال کو زبان پر لانا بہت تکلیف دہ بھی تھا اس لیے اب تک سب نہیں کھول سکا تھا... مگر ہر طرف سے ہونے والی مایوسی نے اسے اب یہ سوال کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"ہیٹنا کو ایسی کوئی حرکت کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ سب ہی کی لاڈلی ہے اور اس کی ہر بات ہر صورت میں مانی جاتی ہے۔ اگر وہ ہم سے کوئی ناجائز مطالبہ کرتی بھی تو ہم بہت نرمی سے اسے پنڈل کرتے... مگر ایسی کوئی بات تھی ہی نہیں پھر بھی احتیاط میں اس کے تمام ملنے چلنے والوں، دوستوں اور کلاس فلوز کو چپک کر آچکا ہوں۔ وہ سب اس کے بارے میں مکمل طور پر بے خبر ہیں۔" سجاد رانا باپ تھے، چنانچہ یہ سمجھنے کے باوجود کہ وہ خود بھی ہیٹنا سے ایسی دینی کسی حرکت کی توقع نہیں رکھتا ہے، اس کے سوال کے جواب میں رکھائی سے بولے۔

"سوری سجاد بھائی! میرے اس سوال کا کوئی غلط مطلب مت سمجھیے گا۔ میں جانتا ہوں کہ ہماری ہیٹنا بہت "موم" اور تیز دار لڑکی ہے۔ میں نے صرف امکانات کا جائزہ لینے کے لیے یہ سوال کیا تھا۔" اس نے فوراً ہی ان سے معذرت کی اور اپنی گفتگو کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "ہیٹنا کو غائب ہوئے چھتیس گھنٹے سے زیادہ کا وقت گزر گیا ہے۔ اگر اس انخوا کے پیچھے ایسے افراد ہوتے جو اس کو پرغال بنا کر تاون میں آپ سے، ماموں جان سے یا مختار اہل سے اپنا کوئی مطالبہ منوان چاہتے تو انہیں اس عرصے میں رابطہ کر کے اپنا مطالبہ پیش کر دینا چاہیے تھا۔ اگر اس انخوا کے پیچھے کسی بلیک میلنگ کا امکان ختم کر دیا جائے تو دوسرا سبب انتہائی سمجھ آتا ہے۔ اب ہم سب کو اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ ہمارا کون سا ایسا دشمن ہے جو ہیٹنا کو انخوا کر کے انہیں تکلیف پہنچانا چاہتا ہے؟"

"ہمارے دشمنوں کی تو ایک طویل فہرست ہے۔ اپنے پورے سیاسی کیریئر میں، میں نے بے شمار دوست اور دشمن بنائے ہیں۔ یہی حال مختار صاحب اور سجاد کا ہے۔ ان کی فیملی ہی ایسی ہے جس میں دوست سے زیادہ دشمن بنتے ہیں لیکن

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس حد تک دشمنی میں آگے جا کھٹنے والا کون ہو سکتا ہے؟ بہر حال، اس امکان کو ہم نے نظر انداز تو نہیں کیا ہے اور ہمارے بندے ہمارے مخالفین کی ٹوہ لینے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ اگر کہیں سے کوئی معمولی سی بھی بات پتا چلی تو ہمیں معلوم ہو جائے گی لیکن اپنے طور پر مجھے یہ امکان ذرا کمزور ہی لگتا ہے۔ ہمارا کوئی بھی دشمن ایسی حرکت کرتے وقت سو بار یہ ضرور سوچے گا کہ اگر ہم اپنے مجرم تک پہنچنے کے تو اس کا اتنا بڑا حال کریں گے کہ نسلوں تک یہ بات یاد رہی جائے گی۔" لیاقت رانا جواب تک خاموش بیٹھے تھے، نہایت غلین لہجے میں بولے۔ ان کی یہ بات واقعی درست تھی۔ ہیٹنا کوئی معمولی لڑکی نہیں تھی۔ انصیال اور دو حیا، دونوں طرف کے لوگ بے حد با اختیار تھے اس لیے کسی کے لیے بھی اس پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں تھا۔

"آپ نور پوریم بلاسٹ والے کیس کو بھی تو دیکھ رہے تھے اہل! کہیں اس کیس میں تو ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی جس کی وجہ سے کوئی آپ کو دباؤ میں لے کر خاموش رکھنے کی کوشش کرے؟" اسے اپنا تک خیال آیا تو اس نے مختار مراد سے پوچھا۔

"اس کیس کی تحقیقات کے نتیجے میں تمہارے ظاہر کیے شکوک کی تصدیق ہو گئی ہے۔ ہمیں ایسے شواہد ملے ہیں جن سے یہ اندازہ ہوا ہے کہ واقعی اللہ آباد سے وائرلیس کے ذریعے مفلوک بیانات بھیجے گئے ہیں اور اس معاملے میں بڑی ملک کا ہاتھ ہے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اس معاملے میں مجھے دباؤ میں لینے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔ یہ بہت اہم کیوں کا معاملہ ہے جسے اگر پچھرا لیا تو پھر سربراہان مملکت کے کیول پر ہی جا کر بات ہوگی۔" انہوں نے اس بات کا جواب دیا پھر جیسے اچانک کچھ یاد آ جانے پر چونک کر بولے۔

"ایک اہم بات تو میں تمہیں بتانا بھولی ہی گیا تھا۔ تم نے جیر آباد کی مسجد سے مولوی غلام محمد کے جو فنگر پرنٹس انحصارے تھے، وہ اللہ آباد کے در سے ملنے والے فنگر پرنٹس سے تعلق ہو گئے ہیں... البتہ دوسرے بندے کے فنگر پرنٹس کا کہیں کوئی ریکارڈ نہیں ملا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ مولوی غلام محمد بھی شاہنواز کا ہی ساتھی تھا اور اسی مشن پر کام کر رہا تھا جس پر شاہنواز تھا۔ مجھے لگا رہا ہے کہ جیر آباد سے غلام محمد کے غائب ہونے کے بعد جب ہم نے اس کے بارے میں تحقیقات کروائی تھیں تو انہیں بھی پتا چلا تھا کہ وہ اور کرد کے کسی گاؤں تک گیا ہے لیکن گاؤں کا نام واضح طور پر سامنے نہیں آیا تھا۔ اب کچھ آ رہا ہے

کہ وہ شاہنواز سے ملنے اللہ آباد گیا ہوگا اور یہ پتا مل جانے پر کہ اس کے شرمناک کردار کا بھلا خدا بھوت چکا ہے، وہ جن چھپ کر بیٹھ گیا۔ وہاں اس نے اپنا علیحدگی بیل لیا اس لیے موقع آنے پر وہاں سے نکل جانے میں کامیاب بھی ہو گیا۔ مگر اہل! آپ خیال رکھیں کہ کسی طرح اسے اور شاہنواز کو تلاش کیا جائے۔ اللہ آباد کے دو لڑکے شاہنواز اپنے ساتھ لے کر گیا ہے جن کا کہیں سے کچھ معلوم نہیں ہو رہا ان لڑکوں کی طرح جانے اور بھی کتنے لڑکوں کے ذہن میں اس نے زہر بھرا کر انہیں نیکی کے نام پر اس قسم کے بھانک کا مل پر آمادہ کر لیا ہوگا۔ ہمارا دشمن بہت چالاک اور سازشی ہے۔ وہ ہمارے ملک کو کھوکھلا کرنے کے لیے ہمارے ہی نوجوانوں کو استعمال کر رہا ہے۔ گاؤں دیہاتوں کے مولویوں کے ذریعے لوگوں کو گمراہ کرنا کوئی نیا ٹیکنیکل انجینئر۔ جب مشرقی پاکستان ہم سے الگ ہوا تھا اس وقت بھی اسی طرح غی چاں چلی گئی تھیں۔ بعد میں کتنے ہی ایسے ثبوت ملے جن سے یہ معلوم ہوا کہ مسجدوں کے امام کے بھیس میں بھارتی جاسوس اپنی کارروائیاں کرتے رہے۔ سادہ لوح زہنوں کو بھانک کر اپنے وطن اور اپنے مذہب کے خلاف کام کرالینا کوئی اتنا مشکل کام نہیں۔ ہندوؤں کا چال باز دشمن تو اس معاملے میں بہت ہی ذریعہ ہے۔ اب جو حالات ہمارے سامنے آئے ہیں، ان سے یہی ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ لوگ اپنی مایہ ناز روایات کو برقرار رکھتے ہوئے اس وقت بھی اسی طرح لوگوں کو بھانکے میں مصروف ہیں۔ ان کا انتخاب پسما نہد گاؤں دیہات ہوتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ وہاں کے کلم لوگوں کو توڑی سی ہمدردی، غلط معلومات اور خوش حالی کے خواہیوں کے ذریعے آسانی سے بھکا یا جاسکتا ہے۔ آپ لوگ اپنی کیول پر اس مسئلے کو اٹھائیں۔ اپنے خلع میں تو میں خود اب یہ طور نامی اس معاملے پر نظر رکھوں گا اور کسی مذہب اور وطن کے دشمن کو مقدس شخصیت کے بھیس میں وہاں تک نہ کام نہیں کرنے دوں گا۔" مختار مراد کی دی ہوئی اطلاع پر ہرعت سے سارے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے وہ حسب عادت جذباتی ہو چکا تھا۔ جذبات کو قابو میں رکھنے کی تربیت جانے کیوں ایسے ہر موقع پر اپنی پشت چلی جاتی تھی۔

"اس معاملے کو بھی دیکھ میں کے لیکن پہلے ہیٹنا والے مسئلے کا تو کوئی حل نکالے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا ہے، پریشانی بڑھتی جا رہی ہے۔ مریم کے ساتھ ساتھ اب آخرین کی بھی حالت خراب ہونے لگی ہے۔ ابھی تک تو ہم ان دونوں کو تسلیاں دیتے رہے ہیں کہ جلد ہیٹنا کے بارے میں

معلوم ہو جائے گا لیکن ہمیں جس طرح ناکامی کا سامنا ہے، اس سے تو یہی لگ رہا ہے کہ ہم اس معاملے میں کچھ بھی نہیں کر سکیں گے۔" لیاقت رانا نے اصل مسئلے کی طرف توجہ مبذول کروائی۔

"اس مسئلے پر سوچتے ہوئے جو بات میری سمجھ میں آ رہی ہے وہ یہ ہے کہ ہر طرف بھاگ دوڑ کر لینے کے باوجود ہمیں ناکامی کا سامنا ہو رہا ہے تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہم جن لوگوں پر انحصار کر رہے ہیں، ان میں سے کسی نے کوئی کام نہیں کیا ہو۔" ہینا کوئی سوئی تو ہے نہیں کہ اس کے ایک بار ہاتھ سے پھل جانے پر سراغ لگانا ناممکن نہ رہے۔ وہ جس جگہ سے غائب ہوئی ہے وہاں بے شک کوئی دکان وغیرہ نہیں ہے لیکن چار پانچ مکانوں کے دروازے تو اسی طرف کھل رہے ہیں۔ ان مکانوں میں سے کسی کے کچن میں تو ہینا کو گاڑی میں بیٹھا ہوا دیکھا ہوگا۔ جس نے خود وہ جگہ دیکھی ہے اور کچھ تحقیقاتی کام بھی کر دیا ہوگا اس رپورٹ کو ماننے میں تاثر ہے کہ کسی شخص نے ہینا کو وہاں نہیں دیکھا۔ ذرا پیور کے مطابق اسے اپنے گھر جا کر وہاں آنے میں دس بارہ منٹ لگے تھے۔ دس بارہ منٹ میں اس پانچ مکانوں میں سے ایک کے بھی کچن کا باہر نکلنے یا بھاگنے کا اتفاق نہ ہوا ہو، یہ بات ذرا مشکل ہی لگتی ہے۔ میرے خیال میں تو ہمیں ایک بار پھر وہیں سے ہینا کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

"آج بھی تو ہم وہاں گئے تھے۔ تحقیقاتی ہم کے علاوہ ہم نے خود بھی تو لوگوں سے معلوم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن کسی نے کچھ نہیں بتایا۔ یہ تم بھی جانتے ہو۔" اس کی بات سن کر سجاد رانا نے اسے یاد دلایا۔

"ہم اپنے ساتھ پولیس پارٹی لے کر گئے تھے۔ لوگ اگر کچھ جانتے بھی ہوں تو پولیس والوں کو بتانا مناسب نہیں سمجھتے۔ میرے خیال میں تو ہمیں سچ جانتے کے لیے کوئی غیر روایتی طریقہ کار استعمال کرنا پڑے گا۔ کل میں خود اس علاقے میں جاؤں گا اور اپنے طور پر لوگوں سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔" اس نے اپنا فیصلہ سنایا جس کی کسی نے مخالفت نہیں کی۔ کسی بھی طریقے سے کسی انکس تو بس ہینا کے بازو یا ہاتھ کو جاننے کی فکر تھی۔

وہ بے حد احتیاط سے کام لیتے ہوئے دس قدموں ان لوگوں کے پیچھے چل رہی تھی۔ طویل برآمدہ طے کرنے کے بعد وہ آخری سرے پر موجود ایک دروازے کے قریب پہنچ کر

رکے۔ ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ سب اس کھلے دروازے سے گزر کر اندر پہنچے اور پھر دروازہ برابر کر دیا۔ وہ جوان سے کافی فاصلے پر تھی، دروازہ بند ہو جانے کے بعد تیز جیز قدموں سے چلتی ہوئی درمیانی فاصلہ طے کرنے لگی۔ چھ دنوں میں سینڈل تہ بونے کے باعث فرش پر اس کے قدموں کی چاپ نہیں ابھری تھی اس لیے وہ اس طرف سے پیچھے لڑھی کہ کوئی آواز سن کر متوجہ ہو جائے گا۔ البتہ یہ فکر ضرور تھی کہ اگر اندر جانے والوں میں سے کوئی اچانک باہر نکل آیا تو وہ دھری جائے گی۔ لیکن خیر گزری کہ ایسا کچھ نہیں ہوا اور وہ برآمدہ عبور کر کے اس دروازے سے نکل پہنچ گئی جس کے پیچھے وہ سب غائب ہوئے تھے۔ دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے جھری سے اندر بھاگا۔ اندر اسے کوئی بھی دکھائی نہیں دیا۔ اس بات پر حیرت زدہ ہوتے ہوئے اس نے آہستہ سے دروازے کو دھکیلا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا نہچانچ اس کے دھکیلنے پر کھلتا چلا گیا۔ وہ کھلے دروازے سے اندر داخل ہو گئی۔ یہ جگہ کوئی استور معلوم ہوتی تھی کیونکہ یہاں ٹونا ٹونا چھوٹا فرنیچر، ایک پرانی سی الماری اور دوسرا بے مصرف سا سامان رکھا نظر آ رہا تھا۔ یہاں داخل ہونے سے پہلے اس کا خیال تھا کہ اس جگہ کوئی دوسرا دروازہ بھی ہوگا جس سے گزر کر وہ لوگ دوسری طرف پہنچے ہوں گے، لیکن یہاں دیواروں کو دیکھ کر جن میں کوئی ٹھکانی جگہ موجود نہیں تھی، وہ دنگ رہ گئی۔ دکاش کا کوئی اور راستہ نہ ہونے کی صورت میں آخر وہ سب لوگ کہاں غائب ہو سکتے تھے؟ ان کے پاس کوئی سیلانی چادر تو تھی نہیں کہ اس میں خود کو چھپا کر غائب ہو جاتے۔ حیران پریشان نظروں سے دروازے کو دیکھتے ہوئے ایک دم ہی اس کی نظر فرش پر پڑی۔ چوکر ناکڑ والے فرش پر اسے سنہری رنگ کے گونے، جسے کرن کہا جاتا ہے، کے چند تار نظر آ رہے تھے۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ سوئی نے اسی طرح کی کرن لگا دو پناؤاؤاؤاؤ رکھا تھا۔ وہ گھر کے بل بھی لگایا اور ان سنہری تاروں کو اپنی انگلیوں کی مدد سے اٹھا چا ہا مگر تار اس کی انگلیوں کی گرفت میں ہونے کے باوجود فرش سے یوں بڑے بڑے جیسے ان کا دوسرا سرا انہیں جدا ہوا ہو۔ وہ حیران ہوئی ہوئی ٹپوں کے من فرش پر بیٹھ گئی اور یہ فوراً اس جگہ کا جائزہ لیتے گئی۔ فوراً ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ تاروں کی نظر کے درمیانی خلا میں پھنسے ہوئے ہیں۔ دور سے دیکھتے پر اس بات کا اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ چوکر ناکڑ والے اس فرش پر نظر آنے والی ٹیکروں میں سے ایک مقام ایسا بھی ہے جہاں ناکڑ کے درمیان موجود ٹیکریں ٹھس ٹھس نہیں بلکہ ایک

معمولی سا جھری نما خلا ہے۔ اس نے اس درمیانی خلا میں انگلیاں ڈال کر زور لگایا تو فرش کا وہ حصہ کسی دھکن کی طرح اٹھ گیا اور نیچے کی طرف جاتی ہوئی لوہے کی بیڑی نظر آنے لگی۔ شاید بیڑیاں اترتے ہوئے سوئی کا وہ پناؤاؤاؤاؤ کے خلا میں ایک گیا تھا۔ اس نے زور لگایا تو دو پناؤاؤاؤاؤ آیا مگر دوپٹے پر لگی کرن کے چند تار نوٹ کر وہیں چھس پکے۔ ان تاروں نے اس کی نظیر راستے تک راہنمائی کر دی۔ وہ جس کی ماری وہ فرش میں نظر آئے والے اس چوکھے خلا سے گزر کر بیڑیاں ملے کرنی نیچے اترنے لگی۔ بیڑیوں کے نور ابدی ایک دروازہ تھا جو بند تھا۔ اس نے چابی کے سوراخ سے آٹھ لگا کر اندر بھاگا۔ یہ ایک بال نما کمر تھا جس میں کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ان کرسیوں پر بیٹھ کر قریب افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ ان افراد کی اس کی طرف پشت تھی لیکن لباس اور بالوں کے اسٹائل وغیرہ کی جو جھلک نظر آ رہی تھی، اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ سب کے سب تیسری جنس کے ہی افراد ہیں۔ ان سب افراد کی توجہ اپنے سامنے موجود بڑے سے چوکر سے کی طرف تھی۔ اس چوکر پر نمایاں طور پر جو چیزیں نظر آ رہی تھیں، ان میں مہارو، گروالاس، بندوؤں کی ایک دیوی کا بڑا سا مجسمہ اور اس دیوی کے قدموں میں پڑی دھن کی طرح سرخ لباس اور زور بڑا ست سے بنی ایک لڑکی شامل تھی۔ اس لڑکی کو سوئی اور اس کے ساتھی اس کی نظروں کے سامنے اٹھا کر یہاں لائے تھے۔ لڑکی بے ہوش تھی اور وہ صرف اس لڑکی کی وجہ سے ہی ان کے عقاب میں اس جگہ تک آنے پر مجبور ہوئی تھی۔ اسے کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ لوگ دھن بنی اس لڑکی کو کہاں سے اٹھا لائے ہیں۔ لڑکی نو عمر اور حسین تھی اور اس کے نقوش کی نرمی سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ان میں سے نہیں ہے۔ ان لوگوں کا براتوں وغیرہ میں آنا جانا تو لگا ہی رہتا تھا لیکن شادی کے گھر سے تھی سنووی دھن کو اٹھا لانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ جانے وہ لوگ کس طرح اس بے چارے کو اٹھا لائے تھے اور اب اس کے ساتھ کیا کرنا چاہتے تھے؟ اندر کمرے کا منظر دیکھ کر تو یہی لگتا تھا کہ وہاں کوئی اہم کارروائی ہو رہی ہے۔ گروالاس تمام حاضرین کی طرف متوجہ کیے دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا تھا۔ اس کا یہ انداز دیکھ کر اسے فوراً وہ منظر یاد آیا جب اس نے گروالاس کو ہنستے کہتے ہوئے مہارو کے قدموں میں بیٹھتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس وقت بھی اسے اس انداز پر حیرت ہوئی تھی لیکن اپنی تکلیف کی وجہ سے وہ زیادہ دھیان نہیں دے سکی تھی۔ اب جو دوبارہ اس نے اس طرح کا منظر دیکھا تو اسے یقین ہو گیا کہ

گروالاس ہندو دھرم سے تعلق رکھتا ہے لیکن اسے راتھیوں کی اندھیرے میں دکھ کر ان پر خود کو مسلمان ظاہر کرتا ہے۔ چوکر سے پردہ ہوا تو ہاتھ جوڑ کر کھڑا گروالاس کو کہہ رہا تھا لیکن اس تک واضح آواز نہیں آ رہی تھی۔ اس کی بات سننے کے لیے اس نے اپنی آنکھ چابی کے سوراخ سے بنا کر کان اس جگہ لگا دیا۔ اس کے کان تک گروالاس کی آواز پہنچنے لگی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"دیوی ماں کی کربا سے آج میں آپ لوگوں کے سامنے شرمسار ہونے سے بچ گئی۔ اگر اتنا شک اٹھا کر یہاں پہنچنے کے بعد آپ لوگوں کو زراٹ لوفٹ پڑے تو مجھے بڑا دکھ ہوتا۔ میں مہارو کو دے گئے وہ جن کے مطابق یہاں خالی ہاتھ نہیں آتی تھی، پر راستے میں ایک ٹھکانا ہو گئی اور مجھے لگا کہ ہمارا آج کا جمع ہونا بے کار جائے گا۔ پر دیوی ماں نے کربا کی اور مہارو نے مجھے بتایا کہ دیوی ماں کوئی جانے والی بیٹھ کا انتظام ہو گیا ہے۔ اب ہم دیوی ماں کے چروں میں بیٹھ دے کر اس سے پراختیا کریں گے کہ وہ اپنے پیاروں کو اس کشت سے بچائے جو ہمیں اور ہمارے ماتحت کو اٹھا ہوا۔ پھر دوبارہ ہمارے دھرم کے سامنے والے کسی گھر میں ہم جیسی اولاد جنم نہ لے۔" یہ جملہ بولتے ہوئے گروالاس کے لیے میں گہرا دکھ تھا۔ اس کے حساس دل نے اس دیکو پوری شدت سے محسوس کیا۔ ادھر گروالاس کی بات جاری تھی اور وہ کہہ رہا تھا۔

"اب میں مہارو سے بیتی کروں گی کہ وہ دیوی ماں کے چروں میں ہم سب کی طرف سے بیٹھ چڑھیں اور دیوی ماں کی پوجا کروائیں۔" گروالاس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی اسے اندر سے "اوم ہری اوم" اور "سے دیوی کی" کے نعرے سنائی دیے پھر خاموشی جیسا کہ خاموشی چھانجانے پر اس نے اپنا کان چاند کے سوراخ سے بنا کر دوبارہ سے آنکھ وہاں لگا دی۔ اسے جس تھا کہ مہارو دیوی ماں کو کیا بیٹھ چڑھاتا ہے۔ آنکھ لگاتے ہی اس نے ایک خوفناک منظر دیکھا۔ مہارو ہاتھ میں بڑا سا چھپرہ لیے دیوی کی مورتی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پھر دھرتی کے چروں میں بیٹھنا اور ہاتھ میں موجود چھری وہاں بے ہوش پڑی لڑکی کے گے پچلا دی۔ فوراً ہی اس کے گلے سے خون کا فورہ سا پلندہ اوار مہارو اور دیوی کی مورتی اس خون میں نہا گئے۔ اس نے گھبرا کر اپنی آنکھ وہاں سے ہٹائی۔ اس وحشتناک منظر کو دیکھ کر اصولا اس کے حلق سے بلند چھین لگ جاتی ہے جسے محسوس نہ ہوتی خوف زدہ ہوئی تھی کہ اس کی آواز اندر نہیں گئی تھی

اور وہ دیوانہ وار سڑھیاں چڑھتی ہوئی واپس اوپر پہنچ گئی۔ خوف کی شدت کے باوجود اسے اس بات کا احساس تھا کہ ان لوگوں کو اس کے اس راز سے واقف ہو جانے کا علم نہیں ہونا چاہیے اس لیے اوپر پہنچنے کے بعد اس نے غنائے میں جانے والا ذخیرہ راستہ بند کیا اور وہاں سے باہر نکل گئی۔ اب اسے کسی طرح اس کوئی سے بھاگ لگانا تھا۔ وہ دوڑتی ہوئی اس دروازے کی طرف بڑھی جس سے گزر کر وہ لوگ کوئی کی عمارت میں داخل ہوئے تھے۔ دروازہ بند تھا اور اس کی بے حد کوشش کے باوجود کھلنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ یقیناً کسی بیرونی مداخلت سے نہ کھلے کے لیے ان لوگوں نے دروازے کو لاک کر دیا تھا۔ دروازے کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد وہ کھڑکیوں پر طبع آزمائی کرنے لگی۔ کھڑکیوں کے پٹ شیشے کے تھے لیکن ان پر لوبے کی مضبوط چابی لگی ہوئی تھی۔ اس چابی کو تو ذکر باہر لگانا اس کے بس میں نہیں تھا۔ ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد وہ واپس اس کمرے کی طرف چلی گئی جہاں اسے بظاہر آرام کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے قید کر دیا گیا تھا۔ کمرے کی کنڈی باہر سے بندھی۔ اس نے کنڈی کھولی اور کمرے میں چلی گئی۔ اب اس کے پاس یہی چارہ رہ گیا تھا کہ ان لوگوں پر یہ ظاہر ہونے دے کہ وہ ان کے راز سے واقف ہو گئی ہے۔ اگر انہیں اس کے واقف راز ہونے کا علم ہو جاتا تو وہ اس کی جان بھی لے سکتے تھے۔

کمرے میں آکر اس نے کھل خانے کا رخ کیا اور جلدی جلدی منہ پر چھپاکے مارنے لگی۔ چھپاکے مارنے سے اسے پہلی بار احساس ہوا کہ اس کے ہاتھ کا زخم کھل گیا ہے اور اس میں سے خون دریں دریں کو بہتو چکا ہے۔ اب تک وہ ذہنی اور جسمانی طور پر جس مشقت میں مبتلا رہی تھی، اس میں اپنے ہاتھ کی چوٹ کو فراموش کر چکی تھی لیکن اب یہ تکلیف بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ اس نے اپنی کھول کر ہاتھ فل کے تیزی سے بہتے ہوئے پانی کے نیچے رکھا۔ کچھ دیر کی جدوجہد کے بعد خون بہنا بند ہو گیا، البتہ درد کا کوئی علاج نہیں تھا۔ یہی اپنی بھی اس لائق نہیں تھی کہ اسے دوبارہ ہاتھ پر بانجھا جاسکے۔ جی تو وہیں پیچک کروہا تھوڑے سے باہر نکلنے کی تھی کہ الٹی رکھی ہوئی ہائی پر اس کی نظر پڑی۔ اس نے جلدی سے ہائی کو سیدھا کر کے اس کی جگہ پر رکھا اور واپس کمرے میں آگئی۔ اب اس کی ٹانگوں میں بالکل بھی جان نہیں رہی تھی۔ وہ لڑکھائی ہوئی مومنہ کی طرف بڑھی اور اس پر ڈھیر ہو گئی۔ آنکھیں بند کرتے ہی اس کے ذہن میں لڑکی کو زندہ کیے جانے کا منظر ابھرا۔ اب تک تو وہ اپنی جان

بچانے کی فکر میں تھی اس لیے اس منظر کی اصل حیثیت کی کو پوری طرح محسوس نہیں کر سکی تھی۔ لیکن اب جو یہ منظر آنکھوں میں دوبارہ زندہ ہوا تو اس کے پورے وجود پر کچی طاری ہو گئی۔ کچا پاتے وجود کے ساتھ گھٹنوں کو پیٹ سے لگائے اسے کتنا وقت گزر گیا، وہ اندازہ نہیں کر سکی۔ بس اسے صرف اتنا احساس ہوا کہ کوئی کمرے میں داخل ہوا ہے۔ اندر داخل ہونے والا بولا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ گروہاں سے جو سوئی پر قید کر رہا ہے۔

”میں نے تجھ سے کہا تھا کہ دروازہ باہر سے بند کر دینا لیکن تو نے میری بات پر عمل نہیں کیا۔ اگر یہ سو فیصد کا فائدہ اٹھا کر بھاگ جاتی تو کیا ہوتا؟“

”مجھے ابھی طرح یاد ہے کہ میں جب اسے کھانا دے کر گئی تھی تو میں نے دروازے کی باہر سے کنڈی لگا دی تھی۔ پتا نہیں کیسے کھل گئی؟“ الماس کی ذہانت سن کر سونے نے انہیں زندہ کیجئے میں اپنی صفائی چوٹی کی۔

”زہن بھوت آئے ہوں گے یہاں کنڈی کھولنے۔ ایک تو جو آج تک سے کام نہیں کرتی، اوپر سے جھوٹی صفائیاں بھی دیتی ہے۔“ الماس نے مجبڑے ہوئے لہجے میں اسے ڈانٹا۔

”جانے دے الماس! کیا ہوا جو کنڈی باہر سے کھلی رہ گئی۔ پوری کوئی اچھی طرح بند تھی۔ اگر تیری شہزادی اس کمرے سے باہر بھی نکل جاتی تو یہاں سے بھاگ تو نہیں سکتی تھی۔“ اس بار مہارو کی آواز سنائی دی۔ اس کی مداخلت کے بعد گروہاں کے مزید کچھ بولنے کا سوال ہی نہیں رہتا تھا، چنانچہ سونے کی جان چھوڑ کر وہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”یہ شہزادی اس طرح کیوں لپٹی ہوئی ہے؟ اس کا سارا بدن بڑی طرح کچکپار رہا ہے۔“

”ارے ہاں، وہ دیکھو لڑکی کو۔ اس کی حالت تو واقعی عجیب نہیں لگ رہی۔“ الماس کے بولنے پر مہارو بھی اس طرف متوجہ ہوا۔ پھر وہ لوگ اسے چھو کر دیکھنے لگے۔

”اسے تو برا ہی بنا رہا ہے، جب ہی تو اتنی بڑی طرح کانپ رہی ہے۔“

اور زبردستی دو گولیاں حلق سے نیچے اتارنے پر مجبور کر دیا۔ گولیاں کھانے کے بعد وہ ایک بار پھر صوفے پر گر گئی۔ شاید ان گولیوں کا ہی اثر تھا کہ خودی دیر بعد اسے کچھ آرام محسوس ہونے لگا اور نیند آگئی لیکن یہ نیند بہت سے جھین اور بے سکون تھی۔ بار بار چونک کر اس کی آنکھیں ملتی اور ایک خونی نگاہ تک کرنے لگتا۔

حسب پروگرام صبح وہ اس علاقے میں پہنچ گیا جہاں سے ہینا غائب ہوئی تھی۔ یہاں آنے کے لیے اس نے ایک ڈرائیور کے علاوہ کسی اور کو ساتھ نہیں لیا تھا حالانکہ چارواں اور مختار مراد نے اصرار کیا تھا کہ وہ ایک آدھ پولیس میں کو بھی اپنے ساتھ لے جائے لیکن اس نے صاف انکار کر دیا تھا اور اب وہاں پہنچ کر کڑکی کے نیچے چپٹ والے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ دستک کے جواب میں اندر سے ایک درمیانی عمر کا آدمی باہر نکلا۔ اس آدمی نے سفید رنگ کی دھوئی اور ہاف آستین کی بنیان چمکانی رکھی تھی۔ دونوں ہی چیزوں کی سفیدی کو مدھم کرتی ہوئی چٹا ہٹ سے ظاہر تھا کہ انہیں بہت کسرت سے استعمال کیا جاتا ہے۔ خود وہ شخص اپنے پیڑے سے بھی ایک ایسا مردور لگ رہا تھا جس کی مشقت، اس کی بد حالی کو خوش حالی میں تبدیل کرنے میں ناکام رہی ہو۔

”مجھے شہزاد عادل کہتے ہیں۔ میں ایک ضروری کام کے سلسلے میں آپ سے اور آپ کے گھر والوں سے ملنا چاہتا ہوں۔“ اس نے اس شخص سے ہاتھ ملاتے ہوئے اپنا ہاتھ بیان کیا۔

”کیسا ضروری کام؟“ وہ شخص حیران ہوا۔

”دو دن پہلے یہاں سے ایک لڑکی غائب ہوئی تھی میں اس کے بارے میں آپ لوگوں سے کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“ اس نے بے حد نرم لہجے میں بتایا۔ باحیثیت آدمی اگر کسی کم حیثیت شخص سے نرمی اور عزت سے مخاطب ہو تو اس کی بات زیادہ اثر انگیز ثابت ہوتی ہے، وہ اس حقیقت کو بہت اچھی طرح سمجھتا تھا۔

”ہم لوگ پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ یہاں اس بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ اگر کچھ معلوم ہو تو ہم پہلے ہی پولیس والوں کو بتا چکے ہوتے مگر جاننے کیوں آپ لوگوں کو یقین نہیں آتا؟“ اس شخص نے اس کی بات کے جواب میں اپنے لہجے سے بے بسی ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

”میں یقین کر لوں گا مگر اس صورت میں کہ آپ مجھے ایک بار اپنے تمام گھر والوں سے مل کر بات کرنے کی

اجازت دے دیں۔“

”ٹھیک ہے، آپ اندر آجائیں۔“ وہ شخص اس کے اصرار پر بادل تا فرات پیچھے ہٹ کر اسے اندر آنے کا راستہ دیتے ہوئے بولا۔ جس شدت سے یہ پولیس رہاں پاؤں کچھ کرتی رہی تھی اور مختلف بحیثیت افراد کا آتا جاتا رہا تھا اس سے علاقہ کینوں کو اس بات کو بہت اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ غائب ہونے والی لڑکی کسی بڑی شخصیت کی بیٹی ہے۔ اب وہ اس بارے میں معلوم کرنے وہاں پہنچا تو اس کی شخصیت اور عقب میں چاروں ڈرائیور کے ساتھ کڑی نئی قیمت گاڑی کو دیکھ کر بھی برائے اندازہ لگا کر مشکل نہیں تھا کہ وہ لڑکی یا اثر شخصیت ہے، اس لیے اس شخص نے اس کا مطالبہ اسے سے انکار کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اجازت ملنے پر وہ اس شخص کے ساتھ گھر میں داخل ہو گیا۔ گھر کافی چوڑا تھا جس کے مختصر سے صحن میں پڑے تخت پر بیٹھے افراد نا آشنا کرنے میں مصروف تھے۔ ان افراد میں مرد سے چار بچے برس پہلی ایک بورت، دو دو جوان لڑکیاں اور ایک سات آٹھ سالہ لڑکا شامل تھے۔ وہ سب افراد اسے اندر آنا دیکھ کر لنگ لگے۔

”میرے سارے گھر والے اس وقت یہیں ہیں۔ آپ کو جو بھی مل کر رہی ہے کہیں۔“ مرد نے ایک سال زندہ کسی لکڑی کی کرسی اسے بیٹھنے کے لیے پیش کرتے ہوئے کہا۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور ان لوگوں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بولا۔

”میں معذرت خواہ ہوں کہ میری وجہ سے آپ لوگوں کو زحمت ہوئی مگر میری بھوری ایسی ہے کہ میں آپ لوگوں کو زحمت دینے بغیر ہر بھی نہیں سکتا تھا۔ میری بہت معصوم اور کم عمر بیٹی آپ کے گھر سے غائب سے غائب ہو گئی ہے۔ میری

اور میرے گھر والوں کی تکلیف کا آپ لوگ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ تقریباً میری بیٹی ہی کی عمر کی لڑکیاں اس صحن میں بھی موجود ہیں۔ اگر آپ اپنی بیٹیوں کو سنا رہے ہیں تو آپ کو ہماری تکلیف اور پریشانی کا احساس ہو جائے گا۔ بے شک پولیس آپ لوگوں سے کچھ پوچھ کر چلی ہے اور آپ انکار کر چکے ہیں کہ آپ کو کچھ خبر نہیں مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ پولیس والوں کو کچھ بھی بتا سنے سے بے شرف لوگ نہ ہوتے ہیں کہ کہ کن کن خواہ مخواہ تھانے کبری کے بلکہ میں نہیں جانتی۔ اس وقت میری یہاں آدم کائیں اتنا مقصد ہے کہ آپ لوگوں سے انسانیت کے نام پر اپنی کرسیوں کہ اگر آپ کو کچھ معلوم ہے تو بتا دیں۔ میرا وعدہ ہے کہ آپ کو کسی قسم کی زحمت نہیں اٹھانی پڑے گی۔ جو کچھ آپ مجھے بتائیں گے، میں اس باراد رکھوں گا اور یہ پہلی بھول بھالوں کا گھر مجھے یہ بتاتا ہے والا

وہ دیکھ رہا تھا کہ ان لوگوں پر اس کے لہجہ کا اثر ہو رہا ہے اور وہ سب ہمدردی سے اس کی بات سن رہے ہیں۔ ایک چل کے لیے اسے یوں بھی محسوس ہوا کہ دونوں لڑکیوں میں سے ایک نے کچھ کہنے کے لیے لب و لہجہ ہلکا کر دیا تھا۔ اسے اس کی نظر کے زاویے کو محسوس کرتے ہوئے عورت جو کہ یقیناً ان بچوں کی ماں تھی، زور سے کھنگھاری اڑا رہا تھا اور اڑ میں بولی۔

”صاحب! میں نے پہلے ہی بتایا تھا اور اب پھر بتا رہی ہوں کہ یہاں کسی نے کچھ نہیں دیکھا۔ میرا گھر والا مزدوری کرتا ہے اور سویرے ہی گھر سے نکل پڑتا ہے۔ بچوں سے کچھ بھی سویرے ہی اسکول چلے جاتے ہیں اور چھپے میں ان کی گھر کے کام کاج کرنے کو رہ جاتی ہوں۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد مجھے فرصت ہی نہیں ہوتی کہ دروازے سے باہر جھانک بھی سکوں۔ اگر آپ دس پندرہ منٹ بعد یہاں آتے تو آپ کو گھر پر میرے سوا کوئی نہیں ملتا۔ اب آپ بتائیں کہ جس وقت آپ کی بھئی اس جگہ سے غائب ہوئی یہاں کون بیٹھا تھا کہ جو دیکھ سکتا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا۔ کون اسے لے گیا؟“

”تمہیک سے غرض! میں آپ کی بات مان لیتا ہوں اور یہاں سے چلا جاتا ہوں۔ آپ لوگ میرا کارڈ رکھ لیں، اس پر ہیرافون نمبر درج ہے۔ اگر کسی وقت آپ کو میری انسانیت کے نام پر کسی کی اپیل کا خیال آئے تو اس نمبر پر فون کر سکتے ہیں۔“ اس نے اپنا ڈیٹنگ کارڈ نکال کر عورت کے قریب تخت پر رکھا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ وہاں بیٹھنے سے پہلے اس نے ایک بار پھر لڑکی کے پیروں پر نظر ڈالی، وہ اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ نظریں چار ہوئیں تو وہ جلدی سے چہرے کا رخ موڑ گئی۔ اسے شدت سے احساس ہوا کہ شاید یہ لڑکی کچھ جانتی ہے لیکن مسئلہ وہی تھا کہ وہ زبردستی تو اس سے کچھ نہیں اگلا سکتا تھا چنانچہ ان لوگوں سے زحمت دینے پر ایک بار پھر معذرت کرتا ہوا باہر نکل گیا اور دوسرے مکان کا رخ کیا۔ ایک در سے وہاں ہو جانے کے باوجود وہ سبزی فروش اپنی نو جوان بیوی، چند ماہ کے بچے اور بچوں اور شدید بیمار ماں کے ساتھ گھر تھا۔ سبزی فروش بیچ کر کے تڑکے سبزی منڈی روانہ ہو چکا تھا اور اس کی نو جوان بیوی بچوں اور بیمار ساس کو سنبھالنے میں جس بڑی طرح بٹکان ہوئی جاری تھی، اسے دیکھتے ہوئے واقعی یقین کیا جا

سکتا تھا کہ اسے گھر سے باہر جھانکنے کی تو کیا سرکھانے کی بھی فرصت نہیں ملتی ہوگی۔ تیسرے گھر میں دھیر سارے افراد، نظم تھے۔ اس گھر میں اڑے پر کپڑوں پر زری، ستاروں، کماہتو اور سنسے وغیرہ کا کام کیا جاتا تھا۔ گھر کا چھوٹا بڑا ہر فرد اس کام میں حصہ ڈالتا تھا۔ وہ جب اس گھر میں داخل ہوا تو سب بھی وہاں کام جاری تھا اور سب کا یہی کہنا تھا کہ وہ کچھ نہیں جانتے۔ ایک بار پھر بڑی کامندہ دیکھنے کے بعد وہ اس گھر سے باہر نکلا۔ اب بس ایک ہی گھر رہ گیا تھا جہاں سے کچھ معلوم ہونے کا موقع سامان تھا۔ البتہ اسے اس بات کا یقین تھا کہ وہ جس پہلے گھر میں گیا تھا، ان لوگوں کو یا کم از کم اس لڑکی کو تو ضرور پچھنے کا کچھ معلوم تھا مگر اس نے جان بوجھ کر اپنے لب ہی لیے تھے۔ اگر آخری مکان سے بھی اسے کچھ معلوم نہ ہو پاتا تو پھر اس کے پاس یہی چارہ رہ جاتا تھا کہ پہلے گھر کے کچھوں سے سختی سے باز پرس کر کے وہ سب اگلا لے جو وہ چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چوتھے گھر کی طرف قدم بڑھانے سے پہلے اس نے مڑ کر پہلے گھر کی طرف دیکھا۔ اسے وہی لڑکی مکان کی چھت پر نظر آئی۔ چھت پر تھکنا چارفت کی دیوار ابھی ہو گئی اور وہ لڑکی اسی دیوار کے پیچھے کھڑی، ہر جھانک رہی تھی۔ اسے اپنی طرف متوجہ ہونا دیکھ کر اس نے ہاتھ سے اسے رکے کا اشارہ کیا اور دیوار کے پیچھے غائب ہو گئی۔ تیس بیٹھیں سیکنڈ بعد اس کا پیروہ وہ دیوار کے پیچھے سے ابھر اور اس نے ہاتھ کھڑا کر اس کی طرف کچھ پوچھا۔ بھئی گئی وہ شے اس کے قدموں کے قریب آ کر گری جبکہ لڑکی ذرا ہی غائب ہو گئی۔ اس کے لیے یہ بہت آکڑا چویش تھی۔ ذرا نیچر گاڑی میں بیٹھا تھا وہ پھر اس سے بے نیاز تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ اچھی طرح اس پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ بہر حال، اس وقت اسے اپنی پوزیشن سے زیادہ دھینکے کے بارے میں جاننے کی فکر تھی۔ اگر یہ گھر نہ ہوتی تو وہ اس طرح ایک ایک گھر کے دروازے کو کھٹکھٹا کر ان لوگوں سے تھوون کی درخواست کیوں کرتا؟ اپنے خاندان کے تمام تر اعتبارات کے باوجود ہاتھ آئے والی ناکامی نے تو اسے اس مقام پر لا کھڑا کیا تھا کہ وہ لوگوں پر رحم صادر کرنے کے بجائے ان سے درخواستیں کرتا پھر رہا تھا۔ اس وقت پیش آنے والی آکڑی چویش کو بھی اس نے دھینکا کی خاطر قبول کر لیا اور ہنک کر اپنے قدموں میں پڑے ایک چھوٹے سے پتھر سے بندھے ہوئے شہدہ کا کاندھا اٹھالیا۔ کاندھا کسی ٹوبہ کے مانند بہت چھوٹے سا ڈھانچہ میں لٹکا ہوا تھا اور اس کے ساتھ پتھر، بندہ دیا گیا تھا جو یقیناً اس لیے تھا کہ کاندھا اپنی بے وزنی کی وجہ سے

مطلوبہ جگہ کے علاوہ کسی اور جگہ نہ پہنچ جائے۔ پتھر سے بندھے اس کا کاندھا اٹھانے کے بعد اس نے مناسب سمجھا کہ اپنی گاڑی میں چاہیے۔ یہاں کھڑے کھڑے اسے اس کا کاندھا کھول کر پڑھنا پڑھنا ٹھیک نہیں تھا۔ کہیں سے بھی کوئی شخص نکل کر آ سکتا تھا چنانچہ وہ گاڑی کی پہلی نشست پر جا بیٹھا اور پتھر ٹھیکہ کرنے کے بعد کاندھا کی نہیں کھوئے لگا۔ ذرا نیچر کو اس نے گاڑی چلانے کا اشارہ نہیں کیا تھا اس لیے وہ اس کے علم کا منتظر ہونے کے باوجود بے حس و حرکت بیٹھا ہوا تھا۔ کاندھا پوری طرح نکل گیا تو اس پر پہلی روشنی سے نکلی تحریر نظر آئی گئی۔ لکھنے والی کی لکھائی خراب نہیں تھی لیکن کہیں کہیں سے بگڑ جانے والے الفاظ کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس نے بہت جگت میں یہ سب لکھا ہے۔ بغیر کسی القاب کے شروع ہونے والی اس تحریر کا متن کچھ یوں تھا۔

”مجھے اس لڑکی کے بارے میں معلوم ہے۔ پہلے اس لیے نہیں بتایا کہ اماں نے مجھے سختی سے منع کر دیا تھا کہ زبان نہ کھولنا۔ وہ نہیں جانتی تھیں کہ میں کچھ بتاؤں اور پولیس والوں کے سوال جواب کا سامنا کروں لیکن آج آپ نے جس دھک بھرے انداز میں تعاون کی درخواست کی، اسے سن کر میرا دل تپ اٹھا۔ پولیس والے تو بہت بد نظری اور سختی سے پوچھتے تھے اس لیے میں نے ذکر ان کے سامنے نہیں کیا۔ اب بھی آپ کو اس وعدے کے ساتھ سب کچھ بتا رہی ہوں کہ میرا امین ذکر نہیں ہوگا۔ دو دن پہلے جب آپ کی بھئی اغوا ہوئی تھی اس دن میں نے اتفاق سے اسکول کی چھتوں کی تھکی اور کپڑے پھیلائے چھت پر آئی تھی۔ کپڑے پھیلاتے ہوئے میں نے جھانک کر باہر دیکھا تو مجھے ایک شاندار سی گاڑی کھڑی نظر آئی۔ اس گاڑی میں ایک لڑکی بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ یہ اتنی اچھی سی گاڑی اور لڑکی یہاں کہاں سے آگئی؟ میں چھت پر کھڑی اور گردن دیکھتی رہی کہ دیکھوں تو یہ گاڑی کس کے گھر آئی ہے۔ اسی وقت مجھے دو تین وہ افراد اس طرف آتے نظر آئے جو نہ ”بی“ میں شمار ہوتے ہیں اور نہ ”شی“ میں۔ ان لوگوں نے گاڑی کے قریب آ کر ہلکے ماگی۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ کیوں مگر گاڑی میں بیٹھی وہ لڑکی دروازہ کھول کر باہر نکل آئی اور ان لوگوں سے کوئی بات کرنے لگی۔ ان میں سے ایک فرار نے بات کرتے کرتے باہر آکر نظر دوڑائی اور پھر اس پاس کسی کو پا کر اپنے خلیے میں سے ایک بڑا سا پھر اٹھالیا۔ پھر پھر سے کے زور پر وہ اس لڑکی کو زبردستی اپنے ساتھ لے گئے۔ میں چھت پر سے یہ سب دیکھ رہی تھی مگر ان میں سے کسی کا دعویٰ ان اس

طرف نہیں تھا اس لیے وہ مجھے نہیں دیکھ سکے۔ میں اس منظر کو دیکھ کر بڑی طرح ڈر گئی اور بھاگتی ہوئی پیچھے گئی۔ اماں کو میں نے ساری تفصیل سنائی۔ اس نے جھانک کر باہر دیکھا۔ باہر کوئی نہیں تھا لیکن گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ اماں نے مجھے سمجھایا کہ میں اس بار سے میں اپنی زبان بند رکھوں ورنہ ہم لوگ بھی کسی پکڑ میں پھنس سکتے ہیں۔ اماں کی ہدایت کے مطابق میں نے اپنے چھوٹے بہن بھائی کو بھی یہ بات نہیں بتائی تھی لیکن اب آپ کو بتا رہی ہوں۔ جو لوگ آپ کی بیٹی کو لے گئے، میں انہیں نہیں پہچانتی۔ جو کچھ مجھے معلوم تھا، وہ سب میں نے آپ کو بتا دیا۔ ان معلومات کی روشنی میں آپ اپنی بیٹی کو ڈھونڈ سکتے ہیں تو ڈھونڈ لیں۔ مگر برائے مہربانی دوبارہ میرے گھر کا رخ مت کیجیے گا۔ یہاں آ کر آپ نے مجھ سے کچھ پوچھا بھی تو میں صاف انکار کر دوں گی۔“ ان الفاظ پر آ کر تحریر ختم ہو گئی تھی۔ جس طرح تحریر کے شروع میں القابات موجود نہیں تھے، اسی طرح اختتام پر بھی کسی کا نام موجود نہیں تھا۔

”گھر چلو۔“ پوری تحریر پڑھنے کے بعد اس نے ذرا نیچر کو حکم دیا اور خود صورت حال پر غور کرنے لگا۔ لڑکی نے بتایا تھا کہ دھینکا گاڑی سے اتر کر ان لوگوں سے کھٹکھٹا کر گئی تھی، تب اسے پھر اٹھ کر اغوا کر لیا گیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ دھینکا گاڑی سے اتری ہی کیوں تھی؟ اسے ان لوگوں میں کیا وجہ تھی؟ ان ہی سوچوں میں گم وہ تیارانہ کے گھر پہنچ گیا۔

”کیا ہوا۔“ کچھ معلوم ہوا دھینکا کے بارے میں؟ وہ لاؤنج تک ہی پہنچا تھا کہ مریم اسے دیکھ کر سوال کرنے لگی۔ وہ بہت تک مسک سے رہنے والی خاتون تھیں لیکن دھینکا کے دکھ نے انہیں اپنا آپ بھلا دیا تھا۔ نہ انہیں لباس بدلنے کا ہوش تھا اور نہ ہی بال ستوانے کا۔ ان چند دنوں میں ہی ان کے چہرے کی خوب صورتی ماند پڑ گئی تھی اور وہ برسوں کی بیمار لگنے لگی تھیں۔

”ایک گھنٹہ تو تھا آ رہا ہے۔ انشا، اللہ اس کی مدد سے ہم جلد دھینکا کو صحت بخش دیں گے۔“ اس نے اپنی جیب سے کاندھا نکال کر وہیں پر موجود تیارانہ کے حوالے کیا۔ وہ کاندھا پر لکھی تحریر پڑھنے لگے۔ مریم بھی ان کے قریب ہی بیٹھ کر ان کے ساتھ ساتھ وہ تحریر پڑھنے لگی۔

”اوہ گاڑی میں کچھ لکھا تھا کہ دھینکا کیسے ان لوگوں کے ہتھے چڑھی۔ اسے اپنے اسکول کے ایڈولڈ ٹیچر میں ایک بے میں جو تھیرا کا رول پر فارم کر رہا تھا۔ وہ یقیناً اسی سلسلے میں افکار مشور حاصل کرنے کے لیے ان لوگوں سے بات چیت

کرنے کے ارادے سے گاڑی سے اتر بیٹھی اور وہ بد بخت اسے اغوا کر کے اپنے ساتھ لے گئے۔ سجاد! آپ فوراً آرڈر دیں کہ ان لوگوں کے قبضے سے میری بیٹی کو برآمد کیا جائے۔" غر پر ہنسنے کے بعد صبر جوش سے بولی تو اس کی اس الجھن کا جواب مل گیا کہ شینا گاڑی سے کیوں اترتی تھی۔

"میں ابھی آرڈر کرتا ہوں کہ شہر میں خواہبر سڑاؤں کے جو گروہ مختلف علاقوں میں سرگرم ہیں، فوری طور پر ان کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جائے اور مشکوک گروہوں کے خلاف ایکشن لیا جائے۔" کلیو ہاتھ آٹے پر چارواں خود بھی جوش میں آگئے اور اپنے ارادے پر عمل درآمد کے لیے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر فوری طور پر نمبر ڈائل کرنے کے بجائے شہر یار سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔ "کیا خیال ہے شہری! میں اس خطہ والی لڑکی کو بھی تمہارے جواؤں؟ اس نے لکھا ہے کہ وہ ان لوگوں کو کیسی پیچھا چکی مگر میرا خیال ہے کہ وہ ان کے طبعی تو ہوتی ہی سکتی ہے۔"

"نہیں، یہ مناسب نہیں ہوگا۔ میری انسانیت کے نام پر گئی درخواست کے نتیجے میں اس لڑکی نے اپنے گھر والوں سے چھپ کر مجھے یہ اطلاع دی ہے اور اطلاع دینے کے ساتھ یہ وعدہ بھی چاہا ہے کہ اس معاملے میں اس کا کہنا نہیں ہوگا۔ اس لڑکی کا آسان تسلیم کرتے ہوئے میں چاہتا ہوں کہ اس کی خواہش کا احترام کیا جائے۔ ہمارا اسے تھانے پوانا اس کے لیے مسئلہ بھی بن سکتا ہے۔ وہ جس کا اس سے تعلق رکھتی ہے، وہاں لڑکیوں کو پہلے ہی بہت سے مسائل کا سامنا ہوتا ہے۔ ہم اس کے لیے ایک اور مسئلہ کھڑا کر دیں یہ کچھ مناسب نہیں ہوگا۔" اس نے ان کی تجویز کی مخالفت کی۔

"او کے اگر تم کہتے ہو تو رہنے دیتے ہیں۔" انہوں نے فوراً اس کی بات مان لی۔ شاید اپنی جیٹی کی جدائی نے ان کے دل کو زیادہ نرم کر دیا تھا جو وہ کسی اور لڑکی کی مشکل کو آسانی سے سمجھ گئے ورنہ پوئیس کی ملازمت کرتے کرتے وہ خود اچھے خاصے سخت مزاج ہو چکے تھے۔

کروٹ کے مل لینے وہ ایک تک نگار کو دیکھ رہی تھی۔ میک۔ اپ، ہار بندوں اور چیلنے بڑھکے پٹروں سے آراستہ اس وقت وہ بہت ہی سادہ سلیب میں بڑی سی سلیب چادر اوڑھ لیے نماز پڑھنے میں مصروف تھی۔ وہاں رہنے والی وہ واحد مسیحی تھی جو اپنی باقی زندگی سے نماز پڑھتی تھی۔ اگر کسی مصروفیت کی وجہ سے اس کی کوئی نماز رہ بھی جاتی تو وہ بعد میں قضا نماز ضرور پڑھا کرتی تھی۔ ابھی ظہر کا وقت تھا اور ان وقت مومناؤں کو لوگ گھر

میں ہی رہتے تھے اس لیے وہ بہت اطمینان سے نماز پڑھ رہی تھی۔ نماز مکمل کرنے کے بعد اس نے دعا کی اور منہ پر ہاتھ پھیر کر اچھے ہوئے جائے نماز پر تکرر بھی کی کہ اس پر نظر پڑ سکتی۔ جائے نماز کو اس کی جگہ پر رکھنے کے بعد وہ اس کے قریب آئی اور اس پر ہلکا ہارنے کے بعد پوچھنے لگی۔

"اب کیسی طبیعت ہے میری شہزادی کی؟" اس نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ اس کی خاموشی کی پروا کے بغیر خود ہی بولی رہی۔ "تو نے تو ذرا کڑی رکھ دیا تھا۔ اتنا تیز بخار اوپر سے بار بار ڈر کر اٹھ جانا۔ ہم لوگ تو گھبراہٹ گئے کہ جانے کیا ہو گیا تھے؟ شہر سے اللہ کا آج تیری طبیعت ذرا تمہیں کئی ہے ورنہ بڑی مشکل ہو جاتی۔ اسپتال جا کر دو الٹا کوئی آسان کام ہے ہم لوگوں کے لیے۔ لوگ ایسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہیں اور ذائق اڑاتے ہیں جیسے ہم انسان ہی نہیں کہ ہمیں بھی پیار پڑنے پر دواداروں کی ضرورت پڑے۔" اس کے لہجے میں وہی دکھ تھا جو ازل سے ان جیسے لوگوں کے مقدر میں لکھا یا گیا تھا۔

"تم تو مجھے کسی بہت اچھے گھر کی لگتی ہو نگار! تم کیسے یہاں پہنچ گئیں؟" اس نے نگار سے پوچھا۔

"ٹھیک ہوتی ہو، میرا گھر اب بڑا اچھا تھا۔ سارے نمازی پر ہیزار گارہ خیرات ڈکوة دینے والے لوگ تھے۔ مجھے بھی بچپن میں ہی نماز پڑھنے کی عادت پڑ گئی تھی لیکن بچپن تو کسی خواب کی طرح فوراً ہی گزر گیا اور پھر مجھے احساس ہونے لگا کہ میں اپنے گھر والوں کے لیے شرمندگی اور مشکلات کا سبب بن رہی ہوں۔ بس پھر نہ چاہتے ہوئے بھی بھٹے دل پر جبر کر کے اپنا گھر چھوڑنا پڑا اور میں یہاں گرد کے پاس پہنچ گئی۔" اس نے اپنی بے بسی اور دکھ بھری داستان حیات چند جملوں میں کہہ سنائی۔

"تمہیں گرد کے ساتھ رہنے میں مشکل نہیں ہوئی؟ میرا مطلب ہے وہ اتنا سخت، اکڑا اور بے دین سا ہے۔ تم اس کے ساتھ کیسے گزارہ کرتی ہو؟"

"مجھ کو دی انسان سے سب کچھ کروالیتی ہے۔ اگر میں گرد کے ساتھ گزارہ نہ کروں تو پھر کہاں جاؤں؟ سر چھپانے کا کھکا ہوا ہوا ہے، یہ بہت ہے۔" اس کے لہجے میں قناعت پسندی تھی۔

"گرد نے تمہیں کبھی نماز پڑھنے سے روکا نہیں؟ وہ تو بدو بندو ہے، ایسے لوگ کب پسند کرتے ہیں کہ ان کے سامنے کوئی نماز روزہ کرے۔" نگار کے لیے یہ انکشاف تھا۔ وہ حیرت سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی اور پھر سرسراہتی ہوئی آواز میں

بولی۔

"کیا کہا تم نے؟ گرد بندو ہے۔ تمہیں کیسے معلوم ہوئی یہ بات؟"

"اس دن جب وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا تھا، جب میں نے اس کا اصل روپ دیکھا۔ وہ بھنا ہوا بیباک نظر آتا ہے اس سے نہیں زیادہ، بیباک اور ظالم ہے۔" یہ جملہ بولتے ہوئے اس کی آواز بڑی طرح کپکپاتی اور جسم بھی جھٹکے لڑنے لگا۔

"مجھے پوری طرح بتا شہزادی کہ اس روز جب تو گرد کے ساتھ گئی تھی تو کیا ہوا تھا؟ گردو تجھے کہاں لے گیا تھا؟ تو نے وہاں کیا دیکھا جو تیری ایسی حالت ہو گئی؟" نگار نے اسے چھوڑتے ہوئے پوچھا۔

"گرد انسان نہیں شیطان ہے۔ وہ سارے شیطان ہیں۔ انہوں نے اس معصوم لڑکی کو... وہ بچکیوں اور سسکیوں کے درمیان وہ سب کچھ بتائی چلی گئی جو اس نے ماڈل ہاؤس کی اس پرانی سی کوئی کے دھانے میں دیکھا تھا۔ نگار! غصے چھاؤ سے یہ داستان کتنی بری۔ داستان کے اختتام تک اس کی حالت بہت بری ہو چکی تھی۔ نگار کو لگا کہ اس کی طبیعت پھر غلب ہو جائے گی۔ وہ اسے سنہالنے کی کوشش کرنے لگی۔

"بوش کر شہزادی! استیصال خود کو۔ تیری آواز سن کر نہیں وہ لوگ یہاں نہ آجائیں۔" اس نے اسے احساس دلایا پھر ایک کراہیک گھاس میں پانی بھرا لی اور اسے مہار... دے کر بھانے کے بعد گھاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ دو تین مکھوٹ پانی پینے کے بعد اس کی طبیعت ذرا سنبھلنے لگی۔

"چل آرام سے لیٹ جا۔ میں یہیں ہوں تیرے پاس۔ تیرا سر دبا دیتی ہوں۔ ملکہ اور رانی باورہتی خانے میں کھانا پکا رہی ہیں۔ کھانا یک جا ہے تو پھر میں تجھے لا کر کھلائی ہوں۔ اتنی کمزور ہو گئی ہے تو۔ ڈھنگ سے کچھ کھائے گی ہے گی، جب ہی جسم میں جان آئے گی۔" نگار مسلسل بول رہی تھی اور اس کا دھیان بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"گرد کہاں ہے؟" وہ تھوڑی دیر خاموش لیٹی رہی پھر نگار سے پوچھا۔

"سو جا رہا ہے۔" نگار کے لہجے میں گرد کے لیے واضح نفرت اور بے زاری تھی۔ ایک تو اس کا اپنی شاشت چھپا کر ان لوگوں کو جو کے میں رکھنا اور اس پر سے شہزادی کا بیان کر دہ تھا۔ گرد کے لیے اس کے دل میں نفرت پیدا ہونا ایک قدرتی بات تھی۔ اس کا سر دھاتے ہوئے وہ اپنی گرد کے لیے نفرت کا اظہار کرنے لگی۔

"گرد کے کروت تو مجھے شروع سے پتہ نہیں۔ تجھے نہیں معلوم کہ وہ ملکہ اور رانی کو گانے بجانے کے علاوہ دوسرے دھندے کے لیے بھجتا ہے۔ یہ جو دوڑوں کبھی کبھی پوری رات گھروا نہیں آتیں تو اسی دھندے پر لگی ہوتی ہیں۔ بڑے بڑے بد بخت اور حرام کاریاں کرنے والے پڑے ہوئے ہیں یہاں اور گردو جیسے لوگ ان کی بدد کرتے ہیں۔ مجھے بھی اس نے اس الزم پر لگانے کی کوشش کی تھی لیکن میں مار کھا کر بھی راضی نہیں ہوئی تو مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا۔ پر اب اس کا اصل روپ جان کر میرا ابراہما اچھے کجا ہے۔ ہندوؤں کے سازشی ذہن کا کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ کب کیا کر جائیں۔ مجھے تو رہ رہ کر اس معصوم لڑکی کا خیال آ رہا ہے جسے ان خالوں نے اپنی دیوی ماں کے چٹوں میں بھیجت چڑھا دیا۔ معلوم نہیں کس کے گھر کا گناہ ہو گیا ہے جاری۔ کیسے ظالم ہیں... انسان کھلانے کے تو لائق ہی نہیں یہ لوگ۔"

"کیا کر رہی ہو تم دونوں؟ کیا باتیں مل رہی ہیں تمہارے درمیان؟" اچانک ہی گرد وہاں چلا آیا اور سخت لہجے میں ان دونوں سے پوچھنے لگا۔

"کچھ نہیں گرد! شہزادی کے سر میں درد ہو رہا تھا اس لیے میں اس کا سر دبا رہی تھی۔" نگار نے جواب دیا۔

"بس بہت کڑے اٹھالے اس کے۔ اس سے کہو کہ اب پانک کی جان چھوڑے اور کچھ کائے دھانے کی فکر کرے۔ ہم نے کوئی اس کے بازو خراے اٹھانے کے لیے اسے یہاں نہیں رکھا ہوا۔" گرد بولتا رہا اور وہ دونوں سر جھکا کر کھڑی رہیں۔

"کیا اطلاع ہے سجاد بھائی! کچھ معلوم ہو شینا کے بارے میں؟" وہ اپنی آتشیں مجبور یوں کی وجہ سے لاہور سے واپس آ گیا تھا۔ اس کے ضلع میں کئی مسائل تھے جن پر توجہ دینا ضروری تھا اس لیے اس کا مزید لاہور میں رہنا ممکن نہیں رہا تھا۔

"کہاں پارا کچھ معلوم ہی نہیں ہو رہا۔ اسے دنوں میں بس اتنا ہی معلوم ہو سکا ہے کہ فوجی سڑاؤں کا ایک گروہ مسلسل اپنے ٹھکانے سے غائب ہے۔ شینا کے انووا راں گروہ کے غائب ہونے کا غم۔ ایک ہی ہے۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ شینا کے انووا میں بھی گروہ انووا ہے جس پر اگرا گروہ اٹھ کر کہاں چلا گیا، کچھ معلوم نہیں چل رہا اب میرے پاس یہی چارہ رہ گیا ہے کہ ایسے تمام گروہوں کے ٹھکانوں پر چھاپہ پڑاؤں۔" انہوں نے افسردہ انداز میں اسے بتایا۔

”دوسرے کس بات کی ہے؟ آپ فوراً اس پروگرام پر عمل شروع کر دیں۔“ اس نے مشورہ دیا۔

”مجھے خود بھی اس بات کا احساس ہے لیکن تم اندازہ کرو کہ پورے لاہور میں خوابیہ سرائوں کے کتنے گروہ کام کر رہے ہیں۔ ان کی اکثریت ایسے ملاوٹوں میں رہتی ہے جو بیچ و بیچ نکلیں پر مشتمل ہیں۔ ایسے ہر گروہ تک پہنچنا، اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا اور پھر کوئی ایکشن لینا اتنا آسان کام نہیں ہے۔ ایک باپ کی حیثیت سے مجھے بھٹی پریشانی ہے، وہ صرف میں ہی جانتا ہوں لیکن پولیس فورس کو جو مشکلات درپیش ہیں، وہ بھی میرے علم میں ہیں۔ مگر اسے تلاش کرنے کے لیے مجھے شہر کی ایک ایک اسٹریٹ بھی اکھاڑنی پڑی تو میں اس سے گریز نہیں کروں گا۔ مجھے اپنی بیٹی ہر حال میں چاہیے۔“ وہ بہت سست سست چل کر بول رہے تھے مگر آخر میں بخور سے جھپٹتی ہو گئے۔

”انشاء اللہ ہمیں ہماری ہیبا ضرور ملے گی۔ آپ حرم امید رہیں اور سریم بھائی کو وصلہ دیتے رہیں۔ میں فرصت ملے ہی جلد لاہور کا چکر لگاؤں گا۔“ ریسپورڈ کر ٹیل پر رکھتے ہی فوراً کھٹکی بند کی۔

”بھرا آباد کے ماسٹر آفتاب آپ سے بات کرنا چاہ رہے ہیں سر!“ ریسپورڈ اٹھانے پر دوسری طرف سے اطلاع دی گئی۔

”ٹھیک ہے۔ بات کرواؤ۔“ اس نے اجازت دی۔

”وہ سلام علیکم سر!“ دوسری طرف سے ماسٹر آفتاب کی آواز سنائی دی۔

”وہ سلام السلام... کیا حال ہے آفتاب؟ کیسے یاد کیا؟“ اگرچہ اس کا ذہن اکٹھا ہوا تھا اور وہ کوئی غیر ضروری کال سننے کے سوا کچھ نہیں تھا پھر بھی، ماسٹر آفتاب جیسے پر خلوص شخص سے برا اخلاق سے پیش نہیں آ سکتا تھا۔

”الحمد للہ میں بہت بہتر ہوں۔ بس آپ کو انڈسٹریل ہوم والے پروجیکٹ کے سلسلے میں یاد دہانی کروانے کے لیے زحمت دی گئی۔ آپ نے اس کا تذکرہ تو کیا تھا لیکن ابھی تک کوئی پیش رفت نظر نہیں آتی۔“

”ساری تیزی ہو چکی ہے۔ مشینوں وغیرہ کے ساتھ آج میں خود بھرا آباد آؤں گا۔ مجھے چودھری افکار سے بھی ملاقات کرنی ہے۔ انڈسٹریل ہوم کا افتتاح میں جو جلی کی کسی قانون کے ساتھ سے کروانا چاہ رہا ہوں۔ اس سلسلے میں چودھری صاحب سے بات کرنی ہے۔“ اس نے اپنا پروگرام بتایا۔

”یہ تو آپ نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے سر اس طرح انڈسٹریل ہوم کو مضبوط بنایا جائے گی۔ یہ چور کو چھوڑ کر جانے والی بات ہے۔ جو جلی کے کسی فرد کے ہاتھوں افتتاح ہونے کا مطلب ہو گا کہ پھر اس طرف سے کوئی مخالفت سامنے نہیں آئے گی۔“ آفتاب نے فوراً ہی اس کا اصل مقصد سمجھتے ہوئے اس کے فیصلے کو سراہا مگر یہ بولا۔ ”اب تو آپ بھرا آباد آ رہے ہیں، ملاقات ہونے پر مزید گفتگو ہوگی۔“

”نہیں بھئی، میں تمہاری طرف نہیں آسکوں گا۔ میرے لوگ سامان پہنچا دیں گے۔ تم اپنی گمرانی میں بیٹنگ کروالینا۔ میں جو جلی میں چودھری افکار سے ملاقات کر کے واپس آ جاؤں گا۔“

”چلیں، آج نہ کسی پھر دوپارہ کسی موقع پر ملاقات ہو جائے گی۔“ آفتاب کو اس کا پروگرام سن کر تھوڑی سی مایوسی تو ہوئی لیکن وہ خوش دلی سے بولا۔ اس نے جواب مسکراتے ہوئے ”انشاء اللہ“ کہہ کر فون بند کر دیا۔ شیڈول کے مطابق ایک گھنٹے بعد اس کی بھرا آباد کے لیے روانگی تھی۔ یہ ایک گھنٹہ ضروری نوعیت کے چند کام نٹانے ہوئے گزر گیا۔

چودھری افکار کی جو جلی میں اس کا استقبال زور سے حیرت کے ساتھ کیا گیا۔ اس کا ٹیکہ والا معاملہ منظر عام پر آنے کے بعد سے یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ وہ دو الگ الگ کمپنوں کے افراد ہیں۔ اگرچہ اس معاملے میں چودھری کا نام مکمل کر نہیں لیا گیا تھا لیکن حقیقت تو دونوں ہی طرف کے افراد سمجھتے تھے۔

”آئیے جناب اسے ہی صاحب آپ کو کیسے فرصت ملی ہمارے غریب خانے کو روکنے کیلئے؟“ چودھری نے طنز یہ لہجہ میں اس کا خیر مقدم کیا۔

”فرصت تو واقعی نہیں ہے میرے پاس مگر آپ سے ملاقات کے لیے آنا بھی اس ہے تھوڑا سا مصروفیت کا ہی ایک حصہ ہے۔“ اس نے رمان سے چودھری کے منہ کا جواب دیا۔ چودھری کی اس علاقے میں حیثیت مسلمہ تھی۔ اس کو ساتھ لے کر چلے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا چنانچہ وہ دعویٰ بھائی کی خاطر اپنی چودھری کے لیے تمام تر پابندیوں کو بالا سے ماق پر رکھتے ہوئے اس سے ملنے آ گیا تھا۔

”زیر نصیب۔ فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“ اس کا جواب سن کر چودھری نے اسی طنز یہ لہجہ میں پوچھا۔

”ہم اسکول کے ساتھ انڈسٹریل ہوم کا آغاز کر رہے ہیں۔ انڈسٹریل ہوم ظاہر سے خواتین کے لیے کھولا جا رہا ہے۔“

اس لیے میری خواہش ہے کہ اس کا افتتاح علاقے کی ہی کسی معزز خاتون کے ہاتھوں سے کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں انہیں بی صاحب کی تنظیم کا نام زبردستی غور آیا تھا لیکن پھر اس خیال سے روک دیا کہ علاقے میں آپ کے گھرانے سے زیادہ بااثر کوئی اور نہیں ہے۔ اس لیے یہ کام جو جلی کی کسی خاتون کے ہاتھوں انجام پانا چاہیے۔ وہ فوراً ہی مطلب پر آ گیا۔

”جو جلی کی خواتین پر وہ دار ہیں۔ وہ کیسے اس طرح کا کوئی کام کر سکتی ہیں؟“ چودھری نے ناگواری سے جواب دیا تو اس کے ذہن میں سے سادہ سی وہ منظر ابھرا آیا جب اس نے کشور کو لاہور کے ایک اسپتال میں آفتاب کے ساتھ اس طرح پایا تھا کہ اس کا ہاتھ آفتاب کے ہاتھ میں تھا۔ لیکن ظاہر ہے، وہ چودھری کے سامنے اس بات کا تذکرہ نہیں کر سکتا تھا چنانچہ شخصیت پستندی سے کام لیتے ہوئے بولا۔

”پر دے کی آپ فکر نہ کریں۔ ہم پر دے کا پورا خیال رکھیں گے۔ سمجھیں کہ جلی طور پر یہ خواتین ہی کی تقریب ہوگی اور کسی مرد کو تقریب میں شمولیت کی اجازت نہیں ہوگی۔ تقریب کی کوریج کے لیے اخبار میں شائع ہونے والی رپورٹ، میں خود اپنے کسی جاننے والے صحافی سے کھسوا کر چھپوا دوں گا۔ رپورٹ میں یہ بات آنے سے کم سوز چودھری افکار نے انڈسٹریل ہوم کا افتتاح کیا، آپ کو بہت فائدہ ہو گا۔ آپ کی مسز کے ہاتھوں اس افتتاح کا یہی مطلب لیا جائے گا کہ آپ عوام کی بھلائی کے لیے کیے جانے والے ایسے کاموں میں ذاتی طور پر دلچسپی رکھتے ہیں۔“

وہ چودھری کے گرد وہی جال بک رہا تھا جس سے وہ ہمیشہ دھوکا کھا جاتا تھا۔

چنانچہ اس بار ڈرازاری سے بولا۔ ”ٹھیک ہے اسی صاحب اگر آپ اتنا اصرار کر رہے ہیں تو میں بھی مجرید انکار نہیں کر سکتا۔ آپ اپنے پروگرام کا شیڈول بھجوا دیجیے گا۔ میں خواتین سے کہہ دوں گا کہ وہ مقررہ وقت پر تیار رہیں۔“

بالآخر اس نے ہائی بھری پھر موضوع گفتگو بدلتے ہوئے بولا۔

”یہ اپنے باجوہ صاحب مفت میں پھنس گئے۔ پہلے ان پر اسٹیکنگ کا الزام لگا کر پولیس نے بے جا تفتیش کرنا دیکھا۔ اپنے طور پر شاید پولیس والے سمجھ رہے تھے کہ جموہ کواد پیش کر کے باجوہ کو مجرم ثابت کر دیں گے لیکن اللہ بندے کی عزت رکھنے والا ہے۔ گواہ عدالت میں پولیس کی مرضی کے مطابق بولا ہی نہیں اور باجوہ بے قصور ثابت ہو گیا۔“ چودھری کے لیے ذکر چمکھنے پر اس کے سینے میں کوئی آگ سی دیکھنے

لگی۔ اسے گواہ کا بین وقت پر بیان بدلانا اور پھر عدالت سے باہر نکلتے ہی قتل ہو جانا بھولا تو نہیں تھا۔ ایسے میں چودھری کا دھڑلے سے یہ کہنا کہ اللہ نے باجوہ جیسے شخص کی عزت رکھ لی تھی، مصرعہ زحمت کی گئی۔ اس بات کو تو یوں سمجھا جاتا ہے کہ اللہ ظالم کی رشتی دور دراز تھا جاتا ہے لیکن حسب ایک مقررہ وقت پر وہ رشتی سمجھنے کا پھر ایسے افراد کو نہیں کوئی جانے پناہ نہیں ملے گی۔

”مجھے یقین ہے کہ جیسے باجوہ پر یہ الزام ثابت نہیں ہو سکا، اسی طرح اس پر اپنی اور کوئی اور الزام لگا کر اسے اس کے عہدے سے ہٹلایا گیا ہے، ایک دن وہ الزام بھی غلط ثابت ہو جائے گا۔“ اس کی اندرونی کیفیت کو چودھری بھی سمجھتا تھا لیکن آج ان دنوں اپنے خیالات کا اظہار کیے جا رہا تھا۔

”ان سب یا تو قیام فیصلہ تو وقت کرے گا۔ قبل از وقت کسی بھی قسم کی قیاس آرائیاں کرنا بے کار ہے۔ وقت خود سب سے بڑا منصف ہے۔“ وہ خودی بوج اور صورت کو کھول کر سامنے لے آئے گا۔“ چودھری کی بات کے جواب میں وہ جمپدیگی سے بولا مگر ایک دم ہی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

”اب اجازت دیجیے چودھری صاحب! مجھے کچھ دوسرے اہم کام بھی سنبھلنے ہیں۔“

”کچھ پروتو رکے۔ رات کے کھانے کا وقت ہونے ہی والا ہے، کھانا کھا کر جا بیٹے گا۔“ چودھری نے اسے روکنے کی کوشش کی۔

”نو ٹھیکس! کھانے کی کوئی خواہش نہیں۔ یہاں سے جا کر بھی میں مشکل ہی سے کھانا کھاؤں گا۔“ اس نے رمان سے انکار کیا۔

”میں سمجھتا ہوں... جس خاندان کی جوان لڑکی غائب ہوگی ہواس کے افراد کی ہوج پھاس اڑ جاتا تو بالکل فطری سی بات ہے۔ آپ کی بھاری ہمت ہے کہ خود کو سنبھال کر دوسرے دھندوں میں لگے ہوئے ہیں۔ اللہ ذکر سے ہمارے ساتھ ایسا کوئی حادثہ نہ ہو جاتا تو ہم زمین آسمان ایک کر ڈالتے۔“ بے حد ہمدردی سے کہے چودھری کے ان الفاظ نے اسے ایک پل کے لیے سا کر دیا۔ اپنے طور پر انہوں نے یہ بات راز میں رکھنے کی پوری کوشش کی تھی لیکن تلاش کے سلسلے میں اسے لوگوں اذات دہنے کے عمل طور پر راز داری کا امکان ہی نہیں تھا۔ کسی ذریعے سے چودھری تک بھی یہ خبر پہنچ گئی تھی اور وہ ہمدردی کی آڑ میں اس پر طنز کا ایک تیر چلا گیا تھا۔ اس تیر سے گھائل ہونے کے باوجود اس نے کوئی جواب

نہیں دیا اور لیے لیے ڈگ بھرتا ہوا ہار لکھ گیا۔

☆ ☆ ☆

”سینئر سندر رام۔“ کوٹھی کے گیت پر لگی نیم پلیٹ پر رکھا ہوا پیاز پڑھنے کے بعد انہوں نے ذرا میوہ کا اشارہ کیا تو اس نے فوراً زوردار آواز میں گاڑی کا بارن بجایا۔ روٹل میں زلی دروازہ کھول کر پوچھ کر باہر نکلا۔

”ذی آئی جی سجاد رانا صاحب شریف لائے ہیں۔“ سینئر سندر رام سے ان کی اس وقت ملاقات ملے ہے۔ ”ذرا میوہ لے کر آیا تو پوچھ کر باہر جھرتی سے بڑا گیت کھولنے لگا۔ یقیناً اسے سینئر سندر رام کی طرف سے پہلے ہی ذی آئی جی سجاد رانا کی آمد کے بارے میں اطلاع دے دی گئی تھی۔ گیت سے گزر کر ان کی گاڑی پور ٹیکہ میں داخل ہوئی تو سینئر سندر رام ان کے استقبال کے لیے خود وہاں پہنچا۔ یقیناً گیت کھولنے کے بعد پوچھ کر ان سے سب سے پہلے انٹرکام پر اندر اطلاع کر دی تھی۔ سندر رام ایک مشہور صنعت کار تھا جس کی کئی ٹیکسٹائل ملز چل رہی تھیں۔ اس کی دولت کے سامنے ماڈل ٹاؤن میں واقع یہ پرانی سی کوٹھی بہت معمولی تھی اور جاننے والوں کو حیرت میں مبتلا کر لی تھی کہ اس جیسی حیثیت کا مالک اتنی عام سی کوٹھی میں کیوں رہتا ہے؟

”آپ کی طرف سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی گئی تو بڑی خوش ہوئی۔“ آپ کی ٹیلی کا تو بڑا نام ہے۔ اتنی زور مٹیلی کی ایک شخصیت مجھ سے ملنا چاہتی ہے، یہ سننے کے بعد میں نے اپنی ساری مصروفیات ملتوی کر دیں اور آپ کا انتظار کرنے لگا۔“ بہت جوش و خروش سے ان کا استقبال کرنے کے بعد وہ انہیں اپنے ساتھ اندر لے جاتے ہوئے بولا۔

ہندو ہونے کے باوجود اس کی اردو بہت صاف تھی اور ایسا یقیناً اس لیے تھا کہ وہ پشما پشت سے تھیں رد ہا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد بھی اس کے بزرگوں نے اپنا کاروبار سمیٹ کر یہاں سے ہجرت کر کے بھارت چلے جانے کے بجائے یہیں رہنا مناسب سمجھا تھا اور ان کا یہ فیصلہ اس حساب سے بہت سودمند تھا کہ وہ پاکستان میں رہ کر خوب چمک چمک رہے تھے۔

”تمہیک یو سندر رام صاحب! مجھے احساس ہے کہ آپ بہت مصروف ہیں۔ میری طرف سے ملاقات کی اس ایسا ایک خواہش کی وجہ سے آپ کا شیڈول مزید بوجھ ہو گا لیکن معاملہ یہی ایسا تھا کہ میرا فوری طور پر آپ سے ملاقات کرنا ضروری تھا۔“ سندر رام کے اشارے پر ایک سوئے پر بیٹھے ہوئے انہوں نے کہا۔ وہ خود بھی ان سے مقابل ایک

دوسرے صوفے پر بیٹھ چکا تھا۔

”کیوں غیر دوں جیسی بات کر رہے ہیں رانا صاحب! آپ کے لیے تھوڑا سا ڈسٹرب ہونا مجھے بالکل برا نہیں لگا۔ میں نے بارے میں سے آپ کو اپنے غریب خانے پر خوش آمدید کہا ہے۔“

”اپنی کوٹھی کے لیے غریب خانے کی اصطلاح خوب استعمال کی آپ نے۔“ ویسے تو یہ کوٹھی کافی تمہیک تھا کہ ہے لیکن آپ جیسے اعلیٰ سرپرست کے اعتبار سے تو یہ واقعی غریب خانہ ہی لگتی ہے۔“ سجاد رانا پولیس کا ایک تربیت یافتہ اور سینئر آفیسر تھا۔ ایک چھوٹی سی بات کا سراسر اتمام کر بہت خوب صورتی سے گفتگو کو اپنے مطلب کے رخ پر موڑ دیا۔

”یہ بات بہت لوگ کہتے ہیں مجھ سے لیکن میں اس کوٹھی میں ہی رہتا ہوں۔“ اصل میں یہ کوٹھی میرے بزرگوں نے اس وقت بنوائی تھی جب یہاں ارد گرد کوٹھی اور عمارت نہیں تھی۔ ”کوٹھی کی نشانی، اس کوٹھی کو چھوڑنے پر میرا من راضی نہیں ہوتا۔ اگر بال بچے ساتھ ہوتے تو اس کوٹھی کو چھوڑ کر نہیں جانے پر غور کرتا۔“ جی بروس گز رہے پر لوگ سدھار گئی۔ جی بیاہ کر لینڈ اپلی گئی۔ چنا آسٹریلیا میں ہے وہاں سے پڑھ لکھ کر واپس آنے کا تو اپنے لیے اپنی مرضی سے پتہ نہ ملتا تھا۔ کوٹھی اور کوٹھی دیکھ لے گا۔ تب تک میں اپنے بزرگوں کی اس نشانی کے ساتھ خوش ہوں۔“ اس نے ذرا تفصیل سے ان کے سوال کا جواب دیا۔

”یہ آپ کے مزاج کی سادگی ہے جو آپ اس طرح سوچتے ہیں، ورنہ دنیا کا تو یہ چلن ہے کہ ذرا سارو دنیا بھر میں آیا نہیں اور سب بھول بھال کر اپنے سے اونچا نازنے کی فکر میں ماضی سے جان چھڑائی۔“ انہوں نے یونہی رد و اداری میں ایک بات کہی۔ اسی وقت فرانی دھلیں گرا اندر آئی ہوئی ملازمہ کی وجہ سے ان کی توجہ ہٹ گئی۔ ملازمہ سندر رام کے اشارے پر فرانی چھوڑ کر فرانی ہار چلی گئی۔

”یہ میری ملازمہ سوئی ہے۔ اس کے ہاں باپ بھی ہمارے ہاں ہی ملازمت کرتے تھے۔ وہ دونوں چنہ برس گزرے آگے چلیے مر گئے۔“ یہ کہہ کر انہیں پیہا ہوئی اور پلی بڑھی اس لیے میرے مزاج کو خوب متحرق ہے۔ میں ملازموں کی بھلا بھلا کر پتہ نہیں کرتا۔ گیت پر پوچھ کر دیتا ہے اور اندر کے سارے کام یہ خود اپنی ہی سنبھال لیتی ہے۔ بہرہ کی وجہ سے اس نے چاروں کے لیے پھر کھانا نہیں ہے۔ آپ خود بھی جانتے ہوں گے کہ اس جیسے افراد کے ساتھ لوگ بہتر سلوک کرتے ہیں۔“ ان کی آنکھوں میں تیرنی ابھرنی

کو دیکھ کر سندر رام نے خود ہی سوئی کا تعارف کرادیا۔ ”جی ہاں، مجھے اندازہ ہے۔“ انہوں نے سرسری لیے میں اس کی بات کا جواب دیا اور پھر ذرا سا کھنکھارے ہوئے بولے۔ ”میری اس وقت آپ کے پاس آمد کا تعلق کچھ انہی افراد سے متعلق ہے۔ معاملہ ایسا ہے کہ پولیس پارٹی آپ کے پاس تفتیش کے لیے آئی یا کم از کم آپ کی ملازمہ کو کھانے بلوایا جاتا۔ لیکن آپ کی حیثیت کو مد نظر رکھتے ہوئے میں نے مناسب سمجھا کہ کسی پھونے آفیسر کو آپ کے پاس بھیجنے کے بجائے میں خود آپ سے بات کروں۔“

”ایسا کیا مسئلہ ہے ذی آئی جی صاحب! کیا سوئی سے کوئی جرم ہوا ہے؟ لیکن وہ بے چاری تو کوٹھی سے باہر جاتی ہی نہیں۔“ سندر رام نے تشویش سے پوچھا۔

”سوئی کوٹھی سے باہر نہیں جاتی یہ تو میرے بھی علم میں ہے لیکن ہماری اطلاع کے مطابق انھارہ تاریخ کی شام آپ کی کوٹھی پر سوئی جیسے کئی افراد کا اجتماع ہوا تھا۔ میں سوئی سے ان افراد کے بارے میں جاننے کے علاوہ اس اجتماع کی نوعیت کے بارے میں بھی پوچھنا چاہتا ہوں۔“

”انھارہ تاریخ۔“ سندر رام نے سوچنے کے انداز میں اپنی ٹانگی پر انگلی کی مدد سے دو تین ہلکی سی ضربیں لگائیں اور پھر بولا۔ ”انھارہ تاریخ کو میں کر پائی میں تھا۔ اس دن کے لیے سوئی نے مجھ سے اجازت لے کر وہ اپنی چند سہیلیوں کو دعوت پر بلانا چاہتی ہے۔ اس کی سہیلیاں ظاہر ہے، اس جیسی ہی ہوں گی لیکن اس بات سے پولیس کو کیا پریشانی ہے؟ اس طرح کے لوگوں کا ایک جگہ اکٹھے ہونا اور اس جیسا قانوناً کوئی جرم تو نہیں۔“

”میں نے اسے جرم کہا بھی نہیں ہے لیکن میں ایک جرم کی کھوج میں ضرور ہوں۔ سترہ تاریخ کی صبح ایک لڑکی کو اغوا کیا گیا تھا اور آپ کو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ اغوا کرنے والے قیدیوں سڑاؤں کے ایک گروہ سے متعلق رکھتے تھے۔ پولیس نے اپنی تحقیقات کے ذریعے اس گروہ کے بارے میں کچھ کچھ تو حاصل کر لیے ہیں لیکن وہ گروہ غائب ہو گیا ہے۔ میں سوئی سے مل کر اس بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“ انہوں نے اپنا مقصد بیان کیا۔

”تمہیک ہے۔ میں سوئی کو بلوایا ہوں لیکن اس بات کا مجھے پورا یقین ہے کہ سوئی کی کسی جرم پر پتہ گروہ کے افراد سے دوستی نہیں ہو سکتی۔“ سندر رام نے انہیں جواب دیا اور کھلی کھلی دیکھ کر سوئی کو طلب کر لیا۔

”مجھے سینئر صاحب سے معلوم ہوا ہے کہ انھارہ تاریخ کو

تم نے اپنی کچھ سہیلیوں کو دعوت پر بلا رکھا تھا۔ اچھی ان سہیلیوں کی تعداد اور نام بتے لکھوا دو۔“ سوئی کے حاضر ہوتے ہی انہوں نے اسے حکم دیا۔

”تعداد اور نام تو میں بتا سکتی ہوں صاحب لیکن سب کے بتے مجھے نہیں معلوم۔ اصل میں، میں خود تو باہر آئی جاتی نہیں ہوں اس لیے مجھے کسی کا بتا لینے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔“ اس نے مؤدبانہ جواب دیا۔

”پھر تمہاری ان لوگوں سے دوستی کیسے ہوئی؟“ انہوں نے سختی سے سوال کیا۔

”آپ کو تو معلوم ہے صاحب کہ ہم جیسوں کا زیا و دہ ز گزارہ بھیک مانگ کر ہی ہوتا ہے۔ بس ایسا ہی ہوا کہ ان میں سے دو تین افراد ایک بار مانگنے کے لیے آئے تو پوچھ کر کے نہ ہونے کی وجہ سے مجھے خود گیت پر جانا پڑا۔ اپنے جیسی ایک ہستی کو ایک گھر میں دیکھ کر ان لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی۔ انہوں نے مجھ سے بات چیت شروع کر دی پھر پتے پتہ وہ دن میں جب بھی ان کا چکر لگتا، وہ مجھ سے مل کر ضرور جاتے۔“

سینئر صاحب بڑے دباؤ میں۔ مجھے اجازت ہے کہ میں دروازے پر آئے والے فقیر کو جو چاہے دے دوں، اس لیے میرے بھائی بند جب بھی آتے خوش ہو کر جاتے۔ انہی کی وجہ سے آہستہ آہستہ میری گھر بیٹھے دو چار اور سے بھی دوستی ہو گئی۔“ سوئی نے وضاحت پیش کی جس پر سر جلاتے ہوئے انہوں نے اپنی جیب سے چھوٹی سی نوٹ بک نکالی اور اسے انھارہ تاریخ کی دعوت میں شریک افراد کے نام لکھنے کے کو کہا۔ سوئی نے چھ افراد کے نام لکھوائے۔ ساتھ ہی ملاقوں کے نام بھی بتا دیے۔ مکمل ہونے پر اسے نہیں معلوم تھے لیکن بقول اس کے بات چیت میں رہائی ملاقوں کا ذکر تو نکلی ہی آتا تھا۔

”اچھا، ذرا یہ تصویر دیکھ کر بتاؤ کہ ان میں سے کسی کو تم پہچانتی ہو؟“ انہوں نے کارڈ سائز کی ایک تصویر اس کے سامنے کی۔ اس تصویر میں تین خواہہ سنا رہے ہوئے صاف نظر آرہے تھے۔ مشکوک گروہ کے افراد کی تصویر بڑی بگ و دو کے بعد ان کے ہاتھ آئی تھی۔ سوئی نے ان کے ہاتھ سے تصویر لے کر دھیمی دھیمی پھر فرانی واپس کر دی۔

”انہیں صاحب! میں ان میں سے کسی کو نہیں جانتی۔“ تصویر انہیں پکڑا رہے ہوئے اس نے یہ جملہ بولا۔ اس نے جس سبب انداز میں تصویر کو دیکھا تھا، اس کے بعد وہ اسی جواب کی توقع کر رہے تھے۔

”تمہیک ہے، تم جاؤ۔“ انہوں نے مایوس ہوتے ہوئے

اسے جانے کی اجازت دی۔

”کیا میں پوچھ سکتا ہوں ڈی آئی جی صاحب کہ انہوں نے وہاں لڑکی کون ہے؟ آپ کی یہاں آمد سے تو یہی ظاہر ہو رہا ہے کہ لڑکی کا تعلق کسی بہت بااثر گھرانے سے ہے۔“ سندھ رام نے ان سے سوال کرتے ہوئے خود ہی ایک خیال بھی پیش کر دیا۔

”آپ کا خیال درست ہے۔ زیادہ تفصیلات بتانے میں معذور ہوں۔“ انہوں نے اسے جواب دیا اور ابھر کھڑے ہوئے۔ سندھ رام نے بھی فوراً ہی اپنی جگہ چھوڑ دی۔ وہ انصاف سے بولا۔ ”اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ضرور بتائیے گا۔ سوئی بھی ہر وقت آپ کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے تیار رہے گی۔“

”تھیک ہو!“ اس کی پیش کش کے جواب میں انہوں نے فقط اتنا ہی کہا اور پھر اس سے ہاتھ ماکر باہر نکل گئے۔ ڈرائیور کم گاڑی گاڑنے انہیں دیکھتے ہی پھرتی سے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا اور ان کے بیٹھے کے بعد دروازہ بند کر کے خود ڈرائیورنگ سیٹ پر آ گیا۔ گاڑی پور بیک سے نکل کر مین گیٹ پر پہنچی تو چوکیدار گیت کھول چکا تھا مگر ان کے اشارے پر ڈرائیور نے گاڑی گیت سے باہر لے جانے کے بجائے درمیان میں ہی روک دی اور چوکیدار کو اشارے سے گاڑی کے قریب بول دیا۔

”کیا تم ہے صاحب؟“ چوکیدار کچھ گیا تھا کہ گاڑی رکوا کر اسے بولانے والا کون ہے اس لیے پچھلی نشست پر بیٹھے سجاد راٹا سے کھڑکی میں جھک کر پوچھا۔

”یہ تصویر دیکھ کر بتاؤ کہ ان میں سے کوئی اٹھارہ باروخ کو سونی کی طرف سے دی ہوئی دعوت میں شرکت کے لیے آیا تھا یا نہیں۔“ انہوں نے وہی تصویر جو کچھ دیر پیش سوئی کو دکھائی تھی اس کے آگے لہرائی۔

”مجھے نہیں معلوم صاحب! دعوت والے دن میں ڈیوٹی پر نہیں آیا تھا۔ چھٹی لے کر اپنی بہن سے ملنے گیا ہوا تھا۔ ویسے میرے خیال میں ان میں سے کوئی دعوت میں نہیں آیا ہوگا۔ میں نے سوئی کی سٹیپوں کو دیکھ رکھا ہے۔ اس تصویر میں ان میں سے کوئی بھی موجود نہیں۔“ چوکیدار نے جواب دیا تو انہوں نے تصویر واپس رکھتے ہوئے ڈرائیور کو گاڑی بڑھانے کا حکم دے دیا۔

اس وقت ان پر شہید بابائی اور منجیلا ہٹ عماری پوری تھی۔ شینا کے بارے میں جو دو اکیلا گویا تھا، وہ بھی بے کار چلا گیا تھا اور وہ اس کی تلاش میں ہنوز ناکام تھے۔ آج پہلی بار

انہیں ایسے افراد کا خیال آ رہا تھا جو عوام میں شمار ہونے کے باعث اپنی جان، مال اور عزت میں سے کچھ بھی گنوانے پر پولیس اسٹیشن کے پکڑے کا شے رہ جاتے تھے لیکن انہیں کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا تھا۔ وہ اسے بار بار سننے کے باوجود اپنی بیٹی کو اصرار نے میں ناکام تھے اور ناکامی بے بسی کا احساس دلاتی ہے۔ بے بسی آدی امیر ہو یا غریب بالآخر ایک ہی طرح پر کھڑا نظر آتے لگتے ہے۔

چن چننا دے نیرے نیرے ہو
دھول جانیا دے نیرے نیرے ہو
بے سری آواز میں گائے جانے والے گانے کے یوں کا ساتھ نبھانے کے لیے پیشانی تک دو ہٹاؤڑھے وہ سر جھکائے مشتاقی انداز میں دھول بجا رہی تھی۔ دھول بھونے کے باوجود دھول پر پڑنے والی ہر چاب بڑی جی جی جی جس کی دھمک ہر ایک اپنے دل پر محسوس کر سکتا تھا۔ ملکہ، رانی اور نگار جھکے لگتی، دھول کی لے پر اپنی بھڑکی آواز میں لہک لہک کر گاتی تھیں۔ ان کے گرد موجود مورتوں، بچوں اور مردوں کا مجمع خوب لطف اندوز ہو رہا تھا۔ تالیاں بجا بجا کر بلند آواز میں داد دی جا رہی تھی لیکن یہ وہ ایک لمحہ تھی جس میں سنسور کا پہلو نمایاں تھا۔ وہ تینوں تو شاید عادی میں ایسے بے ہودہ فخرے اور مذاق پر داشت کرنے کی... لیکن وہ جو جبراً ان کے ساتھ شامل کی گئی تھی، ہر بار بڑی اذیت کے ساتھ یہ سب سہتی تھی۔ اس وقت بھی اس کے چہرے پر غصے اور نفرت کی سرخی تھی لیکن چہرے پر بے انگلیط طریقے سے بھی میک اپ کی موٹی تھ کے باعث اس سرخی کو دیکھا نہیں جاسکتا تھا۔ ان تینوں کے ساتھ شامل ہو کر ڈانس کرنے والے دو بچوں نے چاہا بھی کہ اس کے ساتھ چھڑ چھڑ کر کے اسے کچھ بولنے پر مجبور کر لیں مگر وہ لب سے دھول بجاتی رہی۔ خدا خدا کر کے گانے اور ناچنے کا سلسلہ ختم ہوا تو حاضرین کی طرف سے نچھاور کیے گئے تو ت سینے جانے لگے۔ وہ اس کام میں بھی شامل نہیں ہوئی اور دھول کی دھڑپاں کستی ایک طرف تینگی رہی۔

”خالہ! آج رات اسے دھول بجانے کے لیے نہیں روک لیں۔ ہم لوگوں کا آج رات چکر کرنے کا پروگرام ہے، پر ڈھنگ سے دھول بجانا کسی کو نہیں آتا۔ یہ اتنا اچھا دھول بجاتی ہے، آپ اس کو روک لیں تو ہمارا کام بن جائے گا۔“ وہ سر جھکائے اپنے کام میں مصروف تھی کہ اسے ایک لڑکی کی آواز سنائی دی۔

”دماغ خراب ہے کیا؟ رات بھر اس لڑکے کو یہاں روک کر مجھے لوگوں کی باتیں سننی ہیں کیا؟“ خالہ کہہ کر مخاطب کی جانے والی عورت نے سخت لہجے میں جواب دیا۔

”کوئی نہیں سنا ہے گا نہیں۔ آپ کے سامنے کسی کی کیا مجال کہ کچھ کہہ سکے۔“ اس بار خوشامد سے کام لیا گیا۔

”بالکل خالہ! ایسے بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔“ ایک اور آواز سنائی دی اور پھر تو بیسے ساری لڑکیاں اس عورت کے پیچھے لگ گئیں۔ لڑکے بھی لڑکیوں کی حمایت کرنے لگے۔ شاید انہیں تفریح کا ایک عمدہ موقع ہاتھ آتا نظر آ رہا تھا۔ آخر کار اس عورت کو ہتھیار ڈالنے پڑے اور وہ دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے کرخت آواز میں بولی۔

”چپ کر جاؤ کم بختو! سن لی ہے میں نے تمہاری بات... پر مجھے ان لوگوں سے تو پوچھ لینے دو۔“ پھر وہ اس کی طرف رخ کرتے ہوئے بولی۔ ”ہاں بھی! کیا ارادہ ہے تمہارا؟ رکے گی رات یہاں؟ پورے پانچ سو دوں گی۔“ وہ چپ رہی۔

”اس ایکلی کو ہم رات بھر کے لیے یہاں نہیں چھوڑ کر جا سکتے۔ یہ بڑی سی سی ہے، ایک گھر بھانجی کی۔“ ملکہ جو گرو کی غیر موجودگی میں اپنی سیاری رانی کی وجہ سے گروہ میں سب سے زیادہ مقام رکھتی تھی، خود جواب دینے کے لیے آگے بڑھی۔

”تو تم میں سے کوئی ایک اس کے ساتھ رک جائے حفاظت کے لیے۔“ عورت نے سخت سے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے، پر صرف پانچ سو روپے پر بات نہیں بنے گی۔ ساتھ ایک جوڑا، منضائی کا ڈبا اور تھوڑا سا ناچ بھی دینا ہو گا۔“ ملکہ نے فوراً سوسے بازی شروع کر دی۔

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے... دسے دوں گی۔ میری بھانجیوں بھتیجیوں نے فرمائش کی ہے۔ اب میں باپ کر کے کے بعد ان معمولی چیزوں کے پیچھے ان کا دل تو نہیں توڑ سکتی۔“ عورت نے بے حد شائبانہ انداز میں جواب دیا جس پر وہاں موجود لڑکیوں نے زوردار فخرے لگائے۔

”میں رک جاتی ہوں شہزادی کے ساتھ یہاں۔“ عورت کے ہاں بھرے ہی نگار نے ان کو خوش کنش کی جیسے ملکہ نے قبول کر لیا اور دھمکے مگر سخت لہجے میں نگار سے بولی۔ ”دھیان رکھنا۔ اگر یہ ادھر ادھر ہوئی تو گرو تیری کھال کھینچ لے گا۔“

”مجھے معلوم ہے سب... تو زیادہ باتیں نہ دے۔“ نگار نے رعب میں آئے بغیر جواب دیا۔ اس جواب پر ملکہ نے اسے کھور کر دیکھا مگر زبان سے کچھ نہیں بولی۔ پھر وہ اور

رانی کچھ دیر بعد وہاں سے روانہ ہو گئیں۔

”لڑکیوں! پہلے کھانا کھا لو... پھر بعد میں آرام سے گانے بجانے بیٹھنا۔“ کرخت آواز والی عورت نے گرو کو ان کے گرد موجود ہجوم میں گانے اور کھانے کے لیے ایک دوسرے کو آواز دی جانے لگیں۔ ”میں میں موجود لڑکے جو دھول کے ان پر زبلاں کر رہے تھے، وہ بھی کسی کے گارنے پر اندر چلے گئے۔ ایک لڑکی نے پاؤں سے بھری دو تیلیں ان دونوں کو کھینچ لیا تھا۔

”یہ اچھی مصیبت ہے۔ پیسے کے لالچ میں وہ لوگ میں رات بھر زلت سنے کے لیے یہاں چھوڑ گئے۔“ تنہا جی نے ہی اس نے دھمکی آواز میں نگار کے سامنے اپنی ناگواری کا نگاہ کیا۔

”بے وقوف! اچھا ہے کہ وہ لوگ لالچ میں جھٹھے یہاں چھوڑ گئے۔ سمجھ لے کہ ان کے لالچ کی وجہ سے مجھے آزادی حاصل کرنے کا ایک موقع مل گیا ہے۔ ویسے تو سب تو پر نظریں گاڑ کر بیٹھے رہتے ہیں کہ تو ادھر ادھر نہ ہو جائے۔“ ایک بڑا سا فخر مند میں ڈالتے ہوئے نگار نے اسے جواب دیا تو وہ حیران رہ گئی اور اس حیرانی کے عالم میں بولی۔

”کیا مطلب؟ تم مجھے یہاں سے گرو کے اڈے کے علاوہ کہیں اور جانے دو گی؟“ نگار نے زبان سے جواب نہیں دیا، اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔

”میں ہاتھ سے نکل کر تو گرو تمہارا بہت بڑا معاملہ کرے گا۔ یاد نہیں ابھی ملکہ جاتے جاتے کیا بولی کر گئی ہے؟“ وہ خود بھی اس ماحول سے فرار کی خواہش مند تھی۔ خصوصاً گرو کا اصل روپ دیکھنے کے بعد تو اس کی نفرت کی گتا بڑھ گئی تھی لیکن اپنی وجہ سے نگار کو مصیبت میں ڈالنا اسے گوارا نہیں تھا۔ نگار نے اس کی تشویش سن کر کان پر سے کھینچ اڑانے والے انداز میں ہاتھ ہٹا دیا اور جلدی جلدی منہ چلائے ہوئے نواز حلق سے بچنے لگا کہ بولی۔

”گرو کی ایسی کی تھی۔ اس کا فخر کے ذرے اب میں تجھ پر مزید ظلم نہیں ہونے دوں گی۔ تجھے مجھ نہیں آیا مگر میں کچھ بھی ہوں کہ اس دن گرو تجھے کس لیے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اگر تو تھی نہ ہوئی ہوتی تو اس لڑکی کی طرح تجھے بھی لوگ بی بی چڑھا دیتے۔ اللہ سائیں کا رحم ہو کہ تجھ پر کتنی سیسے ڈالے کی وجہ سے دشمن ہو گئی۔ اب وہ مردود لڑکی کو تو اپنی دہلی کے آگے بھینت چڑھا نہیں سکتے تھے، اس لیے تجھے چھوڑ دیا، پر جب تو پوری طرح ٹھیک ہو جائے گی تو گرو پھر دوبارہ تجھے وہاں لے جائے گا۔“ نگار کی باتیں سن کر وہ بڑی طرح کانپ

ابھی اور نظریں بے ساختہ اپنے زخمی ہاتھ کی طرف گئیں۔ وہاں موجود دم مندوں نے لگا تھا۔ اس زخم نے اسے بہت تکلیف دی تھی لیکن اب احساس ہو رہا تھا کہ وہ تھوڑی سی تکلیف اس کی زندگی کی ضمانت بن گئی تھی۔

”میں نے سوچ لیا ہے، ہم صبح ہونے سے تھوڑی دیر پہلے چپکے سے یہاں سے نکل جائیں گے۔ ان لوگوں سے روپے میں رات میں ہی وصول کر لوں گی۔ تجھے جہاں جانا ہو، چل جانا... میں اپنے کمر پہلی جاؤں گی۔ تجھے بھی میں اپنے ساتھ ہی لے جاتی مگر مجھے معلوم ہے کہ گرد و جہاز کی تلاشی میں سب سے پہلے وہیں پہنچے گا۔ میری تو خیر ہے۔ آخر کو میرے گئے ماں باپ اور بہن بھائی ہیں۔ میری جان بچانے کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے لیکن تجھے وہاں پناہ نہیں ملے گی۔ میرا اپنے گھر والوں پر بھروسہ چلتا ہوتا تو میں تجھے بھی اپنے ساتھ لے کر جاتی، پر میں خود مجبور ہوں... ورنہ اللہ گواہ ہے کہ میرے دل میں حیرے لیے کئی بیٹوں جیسا پیارا پیدا ہو گیا ہے۔“ وہ اسے اپنے منہ سے آگاہ کر رہی تھی کہ اس نے تم سے لپکے ہیں یولی۔

”تم میرے لیے جو کچھ کر رہی ہو وہ بھی بہت ہے۔ تمہاری اس قربانی نے تو مجھے میری اپنی بہن کی یاد دلادی ہے۔“ اس نے نگاہ کا ہاتھ تمام کمر لکیر لپکے میں جواب دیا تو وہ دوسرے ہاتھ سے پیار بھرے انداز میں اس کا ہاتھ تھمبھانے لگی چمک دمی ہی اس کا ہاتھ بٹاتا ہوا ہے یولی۔ ”جیل بہت خود تو کچھ کھاتی نہیں۔ لے کر میرا لدا بھی غنڈا کر داری ہے۔“ یہ کہنے کے ساتھ اس نے گفتگو کے دوران ایک طرف رکھ دی جانے والی اپنی پلیٹ دوبارہ اٹھالی۔ شہزادی بھی مسکراتی ہوئی اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ وہ دونوں کھانے سے فارغ ہو کر بیٹھی ہی تھیں کہ لڑکیوں نے آکر انہیں گھیر لیا۔ صحن میں بڑی سی دری پر چاند ناپاں بھجا کر محفل سجائی گئی۔ بھانجلی چٹوں، ادریں اور پاکستانی گلی گانوں اور باپ سنگرز کے گائے مشہور زمانہ گیتوں سمیت ہر شے کی ہلک توڑی جانے لگی۔ نگاہ ان لڑکیوں کا ساتھ دینے میں جوش جوش تھی، البتہ اس نے حسب معمول ہونٹ سی لیے تھے۔

”اے پھلو، اندر چل کر گاتے ہیں۔ جس کی خاطر ہم اپنا گلا بھارتے ہیں، وہ مختصر نہ تو آرام سے سو رہی ہیں۔ ذرا اس کے سر پر بھی تو جا کر ہنگامہ کیا جائے تاکہ اسے پتا چلے کہ بیاہ کر کوئی ایسی آسان بات نہیں۔“ گاتے گاتے ایک لڑکی نے آئینہ دیا جسے سب نے پسند کیا مگر چار پائیوں پر ذرا

فاصلے پر بیٹھے لڑکے احتجاج کرنے لگے۔ انہیں پائیوں بیٹھی دہن کے کمرے میں جانے کی اجازت نہیں تھی اور لڑکیوں کے اندر چلے جانے کی صورت میں ان کی تفریح ختم ہو جاتی۔ ”ٹھیک ہے، تم سب اندر جاؤ مگر ان دونوں کو بیٹھیں رک پڑے گا۔“ ذرا سی ہش کے بعد شہزادی اور نگاہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک لڑکے نے شرط پیش کی۔

”انہیں تو تم نہیں روک سکتے۔ انہیں تو ہمارے ساتھ ساتھ ہی رہنا ہو گا۔ ہم نے خالہ سے کہہ کر انہیں روکا ہے۔“ ایک لڑکی نے چمک کر جواب دیا۔

”لیکن خالہ نے عورتوں اور لڑکیوں کے سوا کسی اور کو دہن کے کمرے میں جانے سے بھی تو منع کیا ہے۔“ اسی لڑکے نے اعتراض کیا۔

”ہاں تو یہ توں سارہ دیں؟“ لڑکی نے بے نیازی سے جواب دیا۔

”عورت بھی تو نہیں۔“ فوراً اعتراض ہوا جس پر سب نے زوردار قہقہہ مارا... یہ سوچے بغیر کہ ان کے اس بھی فحشوں پر کسی کی دل آزادی ہو رہی ہے۔

”تم جو بھی کہو، ہم انہیں اپنے ساتھ اندر لے جائیں گے۔“ بھئی کا طوفان تھا تو لڑکیوں نے سراسر زبردستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان دونوں کو اپنے زمرے میں لے کر اندر وئی حصے کا رخ کیا۔ وہ سب انہیں لے کر جس کمرے میں داخل ہوئیں، وہاں ایک لڑکی زرد لباس میں چار پائی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ لباس کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے کا رنگ بھی زرد ہو رہا تھا۔ لڑکیوں کو کمرے میں آتے دیکھ کر وہ چار پائی پر اٹھ بیٹھی اور حیرت سے انہیں سوالیہ انداز میں دیکھنے لگی۔

”بہت سوئیں گی، تو اب کچھ دیر ہمارے ساتھ جاؤ۔ ہم پاکی نہیں کر بیگنی شادی میں عبد اللہ بوانے بنے رہیں۔ تمہیں بھی ہمارا ساتھ دینا ہو گا۔“ اس کی نظروں کے سوال کا جواب فوراً دیا گیا۔

”میں بہت تھک گئی ہوں۔ سونا چاہتی ہوں۔“ اس نے بے زاری سے جواب دیا۔

”کل دن بھر سو لیانا۔ دے دیے بھی ابھی تو تمہارے مہندی بھی لگنی ہے۔ اسی کے لیے تو تمہیں جاکنا ہی پڑے گا۔“ اس کی بے زاری کی قطع پر ادا کرتے ہوئے کسی نے کہا اور پھر جس کو جہاں چکھی، وہ وہاں بیٹھ گیا۔ ایک بار پھر گانے بجانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ جب سے اس گھر میں آئی تھی، تیسری بار وصول سنہا تھا۔ عام حالات میں وہ رات بھر بھی یہ کام کر سکتی تھی لیکن اب ہاتھ کا زخم بے حد تکلیف

دینے لگا تھا اس لیے وصول بھانا روک دیا۔

”کیا ہوا... کیوں وصول نہیں بھارتے؟“ لڑکیوں نے فوراً شور مچا شروع کر دیا۔ اس نے اپنا ہاتھ سامنے کر دیا۔ ”اوئی اللہ! میں تو بھولی ہی گئی تھی کہ تیرا ہاتھ زخمی ہے۔“ لایچھے دے وصول، میں بھائی ہوں۔“ نگاہ سب سے پہلے اس کا مسکھائی اور فوراً اس سے وصول لے لیا۔ وہ ایک طرف... ہو کر بیٹھ گئی۔ وہ کئی دن بیمار رہی تھی اس لیے ابھی تک کمزوری بہت تھی۔ اپنی دیر کی محنت نے اور بھی تھکا دیا تھا۔

”میں نے اکر جانے والی پینے کو آرام دینے کے لیے اس نے چار پائی کے پاس سے پشت لگا دی۔ اسی وقت اس کی نظر چار پائی کے نیچے پڑی ایک پاسپورٹ سائز تصویر پر پڑی۔ تصویر میں موجود چہرہ اسے کچھ آشنا لگا۔ اس نے ہاتھ پر حاکر تصویر کو چپکے سے وہاں سے اٹھا لیا۔ تصویر میں موجود شخص سے وہ واقعی واقف تھی۔ اس شخص کی شناخت ہو گئی تو اس نے سر موڑ کر دہن کا جائزہ لیا۔ زرد رنگت والی بے زار صورت دہن بقیہ اس شادی پر خوش نہیں اور اس کے ناخوش ہونے کی وجہ بھی اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔

”اسے کریاں اپار دوانی کا لون آیا ہے کہ اس کی پھولی فوت ہو گئی ہے اس لیے وہ مہندی لگانے نہیں آ سکتی۔ اب تم لوگ خود ہی کچھ کر لو۔“ اسی وقت وہی گرفت آواز والی عورت کمرے میں آئی اور اپنی شصتوں آواز میں اطلاع دی۔ ”ہائے اللہ! اب کیا ہو گا؟ لگانے کو تو کوئی بھی مہندی لگا دے، پر دہن کے ہاتھوں بیدوں پر تو بڑی ابھی مہندی لگنی چاہیے۔“ لڑکیاں فوراً شور مچانے لگیں۔

”میں لگا دوں دہن کو مہندی؟“ مجھے بڑی اچھی مہندی لگانی آتی ہے۔“ ان کی پریشانی دیکھ کر اس نے بھاری آواز میں جوش جوش کی۔

”ہیں... تم بولی بھی ہو؟ ہم تو سمجھتے تھے تم گولی ہو۔“ اس کی زبان سے نکلنے والا یہ سلا فخر سن کر ایک لڑکی نے حیرت کا اظہار کیا۔ وہ جواباً ذرا سا مسکرا کر روئی۔

”پھلو تم ہی لگا دو۔ پر یاد رکھو، مہندی لگانے کے صرف سو روپے والی کی۔ زیادہ منہ مت کھانا۔“ عورت کا تو جیسے مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ اس نے اس کی جوش کش قبول کرتے ہوئے ساتھ ہی اپنی شرط بھی سنائی جو اس نے فوراً ہی منظور کر لی۔ ایک لڑکی نے اسے کون مہندی لا کر دے دی۔ وہ اوپر چار پائی پر دہن کے مقابل بیٹھ گئی اور اس کا ہاتھ تمام کر بیٹھی ہوئی چمک کر تصویر رکھی۔ تصویر دیکھ کر وہ چونک گئی اور جلدی سے ارد گرد نظر ڈالی۔ عورت باہر جا چکی تھی اور لڑکیاں دوبارہ

سے گانے میں مصروف ہو چکی تھیں۔ اس نے ہتھیلی پر چری تصویر فوراً اپنے تنکے کے خلاف میں چسپائی۔

”تم کچھ ہو؟“ کون مہندی دلا میں ہاتھ میں سکاراں کی ہتھیلی پر چکی کھیر ڈالتے ہوئے اس نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ اس سوال پر اسے بہت زوردار ہنسا ہوا۔

”تم... تم کون ہو؟“ اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے وہ اسے ٹھوکرے سے بڑھائے لگی۔

”میں جو بھی ہوں، اتنا جانتی ہوں کہ سرمد سے اور ظلم سے محبت کرتا ہے۔ کیا تم سرمد کی محبت نہیں ہو؟“ انہوں اور گانوں کے درمیان ان کی بے حد دھیمی آواز جیسے گئی گفتگو کی کونسا نہیں دے رہی تھی۔

”ہاں، میں ظلم ہی ہوں... سرمد کی ظلم۔“ ان کی آنکھوں میں آنسو بہنے لگے۔

”یقیناً سرمد تمہارے ماں باپ کی شہ کے مطابق کسی باعزت نوکری یا کاروبار کا انتظام نہیں کر سکا اس لیے آپ تم کسی اور سے شادی کر رہی ہو؟“ اس نے ایک چہچہا ہوا سوال کیا۔

”ماں باپ کی شہ نہیں، صرف سو تنگی کی شرط پر عورت جو ابھی اندر آئی تھی، میری سوتیلی ماں ہے۔ اسی نے میرے ابا کو بکا کر سرمد کا رشتہ قبول نہیں ہونے دیا۔ شرم سے اس کی خواہش تھی کہ میری شادی اس کے بیٹے، لندہ اور سے، چار بچوں کے باپ مگر دولت مند بولی زراہ ہو جائے۔ وہ غیبت میرے ابا کی اس عورت سے شادی کے بعد سے ہی مجھ پر نظر میں لگا کر بیٹھا تھا۔ جائے میری سوتیلی ماں نے میرے باپ کے کسی طرح کان پھیرے کہ وہ بھی ان رشتے پر راضی ہو گیا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ عورت میرے ابا کو کوئی شے والی چیز پاتی ہے جس کی وجہ سے وہاں سارا سامان یا تو سوتے رہتے ہیں یا کم ضرر پھرتے رہتے ہیں اور اس کا جونی چاہے، وہ من مانی کرتی پھرتی ہے۔ شروع میں تو اس نے مجھے بھی بہت بے وقوف بنایا اور یہی لار سے لے پتی رہی کہ سرمد کوئی باعزت کام کر لے تو تجھے اس سے بیاہوں گی۔ ان کی باتوں میں آکر میں سرمد پر ذرا غوری چھوٹنے کے بے زور ڈالتی رہی اور پیچھے سے اس نے چپکے سے ہر رشتہ بھی کر دیا۔ جس دن سے شادی کی تاریخ طے ہو گئی ہے اس گھر سے قدم نہیں نکال سکی۔ ہر وقت اس کا کوئی نہ کوئی بھائی بھتیجا باہر دروازے پر بیٹھا پیراوتار بٹاتا ہے کہ میں گھر سے باہر قدم نہ رکھ سکوں۔ ایسے میں بھلا میں سرمد سے کیسے رابطہ کرتی؟“ اس نے سارا حال کہہ سنایا۔

جاسوسی ڈائجسٹ 183 جنوری 2010ء

”میں تمہیں یہاں سے نکال سکتی ہوں۔“ کچھ دیر غورو
مخوض کرنے کے بعد وہ بولی تو ٹیلم چونک پڑی۔
”وہ کیسے؟“ وہ اس کے ہاتھوں پر نقش و نگار بناتے
ہوئے دھیمی آواز میں سارا منصوبہ اسے سمجھانے لگی۔ اس کا
منصوبہ سن کر ٹیلم کی آنکھوں کی انجمی ہوئی چمک ہونے لگی۔
”تمہارا یہ احسان میں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔“
”اس احسان کے بدلے میں تمہیں بھی ایک کام کرنا ہو
گا۔“

”میں تو یہی کہوں گی کہ تو ابھی طرح سوچ لے۔ کہیں اس ہمدردی کی وجہ سے تجھے خود اپنے کے دینے نہ پڑ جائیں۔“ نگار نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”اس کا نام انسانیت ہے، نگار تم خود بھی تو میری خاطر رستہ لینے کے لیے تیار نہیں۔ اس اسی طرح میں نایم کی خاطر غمخوار ہوں۔“ نایم میری باتوں کو سختی سے لے کر سر ہکا بھکا کر دیکھ رہا تھا۔ بہت بڑا احسان ہے۔ اس احسان کا بدلہ اتار دینے کا موقع مل رہا ہے مجھے تو میں پیچھے کیسے بہت سکتی ہوں؟“ اس کی یہ بات سن کر نگار نے خاموشی اختیار کر لی۔ وہ سمجھ گئی کہ شہزادہ کی کو اس کے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ خاموشی کی چادر اوڑھ لیا۔ وقت آہستہ آہستہ آگے ہٹنے لگا۔ صبح سے ذرا پہلے شہزادہ کی چار پائی سے اتر کر دو بے قدموں نایم کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کا انداز بے حد محتاط تھا۔ گھر میں موجود تمام لوگ اگرچہ ٹینڈ میں ڈوبے ہوئے تھے لیکن یہ ڈرامائی جگہ تھا کہ کہیں ذرا سی آہٹ پر کسی کی آنکھ نہ چل جائے۔ مگر خبر کوڑی کہ کسی کے بھی علم میں آئے بغیر وہ آرام سے نایم کے کمرے کے دروازے تک پہنچ گئی۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے بے حد ہوشی آواز میں دستک دی۔ فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔ یقیناً نایم اس کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔

”میں نے اندر سے لکڑی اس لیے کالی تھی کہ کہیں کوئی ہمارا لڑکی یہاں سونے کے لیے نہ آجائے۔“ اس کے کونے سے پہلے ہی نایم نے دروازہ اندر سے بند کرنے کی تیاری کر لی تو اس نے بھی انداز میں سر ہلایا اور بولی۔

”اب جلدی کرو۔ مجھے اپنے کپڑے دے دو اور خود رے کپڑے پہن لو۔ میں نے نگار سے بات کر لی ہے۔ وہ مجھیں اپنے ساتھ لے کر یہاں سے نکل جائے گی۔ کچھ وقت خرابے کا تو دیکھیں وغیرہ کھل جائیں گی۔ تم کسی پی سی او سے سرہم کے موافق پر کال کر لینا۔“ خبر تو اچھی طرح یاد ہے۔

”جی ہاں نایم نے اثبات میں سر ہلایا۔

نایم تاریک کمرے میں ان دونوں نے آپس میں لباس بدل کر لیے۔ اب وہ باہر کے دروازے میں اب نایم اس کے ساتھ کچھ پین سے کھینچے نیلے لباس میں تھی۔ لباس کی جلی کے بعد اس نے نایم کے فراہم کردہ کاندھ پر پال بننے والے ایک مختصر سا پیغام سرہم کے نام لکھا۔ کمرے میں روشنی ہے۔ تم بھی اس لیے اسے یہ مختصر پیغام لکھنے میں بھی کافی ہمدردی سامنا کرنا پڑا۔ باب روشن کرنے کا غمخوار اس نے خود نہیں لیا تھا کہ کہیں روشنی کسی کو اس طرف متوجہ نہ کر دے۔

م والا کاندھ دیکر اس نے نایم کے حوالے کیا جسے اس

نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر رکھ لیا۔ شہزادی کی آمد سے پہلے وہ اپنے پاس موجود خوضی سی روم کو بھی اسی جگہ رکھ چکی تھی۔ کمرے سے باہر قدم رکھنے سے پہلے وہ شہزادی سے کرم جوش انداز میں لگے اور نرمی ہوئی آواز میں بولی۔

”مجھے معلوم ہے کہ تم میرے لیے بہت بڑا خطرہ مول لے رہی ہو۔ بس اسے میری خود غرضی سمجھو کہ میں سرحد تک پہنچنے کا یہ موقع نکھو تاہیں چاہتی اس لیے جانتے ہو مجھے تمہیں اس مصیبت میں چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ ہو سکے تو مجھے میری اس خود غرضی کے لیے معاف کر دینا۔“

”ایسا مت سوچو۔ اگر تم انکار کرتیں تو بھی میں زبردستی تمہیں راضی کر لیتی کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے پاس اس کی ایک موع ہے، نجات حاصل کرنے کا۔ اپنے لیے مجھے یقین ہے کہ اللہ کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی دے گا۔ وہ مالک ہے اسے پہلے مجھے بڑی بڑی مصیبتوں سے نکالتا رہا ہے۔ تم میرے لیے دعا کرتی رہنا اور میرا پیغام یاد سے سرحد کے حوالے کر دینا۔“ اس نے نیام کی بیٹھ سہلاتے ہوئے اسے ملی اور ہدایات دیں پھر اسے دروازے کی طرف دھکیلتے ہوئے بولی۔

”جاؤ۔۔۔ اب اور دیر مت کرو۔ صبح ہونے والی ہے۔ سب لوگ اٹھ گئے تو کتنا مشکل ہو جائے گا۔“

نیم باہر نکل گئی اور وہ دروازے کے دونوں پنوں درمیان بھری سی بنا کر اسے دھکیلتی رہی۔ اس کے کمرے میں آگ لگتی سی چار پانی پر لگی لگا رہی اٹھ نکلی تھی۔ وہ قریب آئی تو اس نے سر ہانے رکھا و صول اسے تنہا دیا۔ دونوں ہاں میں دھول کو کسی نیچے کی طرح تمام کمرے کے اس کمرے میں رکھ لیا کہ بھونٹ اور تک اس کی آڑ میں چھپ کر دو چار پہلے ہی خوب پھیلا کر پیشانی تک آڑھا گیا تھا۔

طلحے میں آکر کوئی سرسری نظر ڈالنا تو بالکل بھی اندازہ نہ کر سکا وہ شہزادی کے بجائے نیم ہے۔

”بھائی جان! ہم جا رہے ہیں۔ ہمیں راستہ دے دو۔“

در دروازے کے ساتھ چار پانی لگا کر سونے ہوئے نیم کی مالاں کے بجائے سے گہا گیا لگا کر یہ جملہ اسے کمرے کی مٹائی دیا۔

”کیا مصیبت آئی ہے تم لوگوں کو جو اتنی صبح جانے کے لیے تباہ ہو گئے ہو۔“ لڑکا یقیناً گہری غصہ سے جگمگاتے ہوئے بھونچا گیا تھا۔

”میں یہاں غنیمتیں آ رہی۔ اپنے گھر جا کر آرام سے کروں گے۔ ویسے بھی ہماری رات ہی بات ہوئی تھی کہ ہم چل دیں گے۔“ لڑکا کہہ کر غصہ آواز

میں اسے جواب دیا۔
 ”اوسے جانے دے شیدے! کیوں بحث میں پڑ کر
 سب کی فیند خراب کر رہا ہے؟“ سخن میں ہی سوسے ہوئے
 افراد میں سے کسی نے ہانک دیا کہ کڑے کوٹو کا دھاس نے
 بڑبڑا رہتے ہوئے انہیں باہر جانے کا راستہ دے دیا۔ دونوں
 ہرگز ٹھکیں تو اس نے سکون کا سانس لیتے ہوئے کمرے کا
 ازارہ بند کیا اور ٹیلم کی چار پائی پر آ لی۔ نہایت تگ و دو
 کے گزر جانے کے بعد نئے والے اس عارضی کون کے
 دوران اس نے بیٹا بار اپنے کمرے پر موجود رو لیا جس نے
 بیٹن کی مہک کو محسوس کیا۔ یہ مہک یقیناً ناپوں منجھی دھن کے
 ذرات میں پھیل چکی کہ اسے آنکھوں میں خوب صورت چٹنے
 جانے پر اکساتی ہوگی۔ خود اس کے اپنے احساسات بھی
 سب سے ہونے لگے لیکن فی الحال کوئی پہنا ایسا نہیں تھا جسے
 اپنی آنکھوں میں جھانک کر وہ پند چھوئے چھوئے خواب جو
 نے اپنے مستقبل کے حوالے سے بھی دیکھے تھے تو
 بات کے گرداب میں پھنس جانے کے باعث فیر کے
 عمل میں داخل ہوتے دکھائی نہیں دیتے تھے۔ قدر کے
 کھیل کے بارے میں سوچتے ہوئے کب اس کی آنکھ لگ
 اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ باہر سے سنائی دینے والے
 پر اس کی آنکھ لگا۔ کمرے میں ابھی غاسی رو شنی اور ہی
 جس کا مطلب خاک کا فی دن چڑھا ہے۔ آنکھ ملنے ہی
 یہ خیال بھی آیا کہ ابھی اسے ایک نہایت مشکل صورت
 کا سامنا کرنا ہے مگر اس سے پہلے باہر سے سنائی دینے
 کا سبب جانتا ضروری تھا۔ ہمز چھوڑ کر وہ دبے قدموں
 رے کے قریب پہنچی اور کڑی کھول کر دروازے کے
 میں ڈراسی جھری بناتے ہوئے باہر بھاگا۔ سخن میں دو
 بیس والے، ملکہ اور شلم کے رشتے دار نظر آ رہے تھے۔
 ”میں جتا چکی ہوں کہ وہ فیکرے جو اس کے سامنے تھے،
 یہ ہی یہاں سے نکل کر چلے گئے تھے۔ تمہاری کجگوئی
 بات کیوں نہیں آ رہی؟“ ٹیلم کی سوتیلی ماں کی کرفت
 اس تک پہنچی۔
 ”کجگوئی بی امی بھی جتا چکا ہوں کہ ہمارے آدمی اس
 سے پر آدمی رات سے موجود ہیں۔ وہاں کوئی نہیں
 سرود نے رات بھر مار کھانے کے بعد یہ بیج اگایے
 وں کے نام پر جن دو بندوں کو تھکادے گھر چھوڑ کر
 ان میں سے ایک تھکا نہیں بلکہ لڑکی ہے جسے انہیں
 بتایا ہوا تھا۔ ہمیں اس لڑکی کی تلاش ہے۔ سمیت اپر
 کی بازیابی کے آرڈر آئے ہیں۔ ہم تمہاری ذہنی

کافی بات پر یقین نہیں کر سکتے۔ ہمیں تمہارے گھر کی تلاشی لینی ہوگی۔" ملکہ کی لکڑی پر زوردار ہاتھ مارتے ہوئے پولیس والے نے اسے جواب دیا۔ ملکہ کی حالت سے ہی ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کی ٹھیک تھا کہ حرمت ہوئی ہے۔ شاید اس حرمت کے نتیجے میں علی وہ اپنی راہنمائی میں پولیس والوں کو یہاں تک لے کر آئی تھی۔ دروازے کے پیچھے مڑی شیرازی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ پولیس والے کی زبان پر اسے آرزو آئے کہ اس کو وہ سمجھ کر کہوں لو کہ چپ چپ کی وجہ سے پولیس اس کا سراغ لگاتے لگاتے یہاں تک پہنچی تھی ہے۔

"شریفوں کے گھروں کی تلاشی ایسے نہیں لی جاتی صاحب! پہلے وارنٹ دکھاؤ پھر تلاشی لیتا۔" نیکم کی سوتیلی والدہ نے اپنی قانون دلی گھماری۔

"کیوں ہے کار میں روڑے لگا رہی ہے رشیدہ! لینے دے انہیں تلاشی۔ حیرا کیا جا رہا ہے؟ بس بے کار میں ہر بات میں اپنی قابلیت بھانڈنے کا شوق ہے تجھے۔" اسی وقت ایک مرد نے مداخلت کرتے ہوئے تیز و طرار رشیدہ کو بھڑکا۔ وہ مرد شایع نیکم کا باپ تھا۔

"تم چپ رہو۔ معلوم بھی ہے شادی والا گھر ہے۔ بری کے زور، پڑوں کے علاوہ دیوں کی چیزیں آتی رہی ہیں۔ ان پولیس والوں کا کیا بھروسہ کہ تلاشی کے بہانے کیا کچھ بار کریں۔ کوئی چیز کم ہوگئی تو ہم سلطان کو کیا جواب دیں گے کہ اس کی بھگوانی ہوئی چیزیں کہاں ہیں؟" وہ عورت یقیناً بدعالمی میں اپنی مثال آپ تھی جو پولیس والوں سے بھی دہپنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ عورت کے الفاظ سن کر اسے اندازہ ہوا کہ باپ پولیس والے بڑی طرح تیش میں آجائیں گے اور بھگوانی مزید بڑھ جائے گا، چنانچہ اس نے خود ہی ہرنگل کر ان لوگوں کے سامنے آجانا مناسب سمجھا۔

"یہ دیکھو... یہ بری شیرازی۔ ان لوگوں نے بھگوانی کو بھی کہیں اندر ہی چھپایا ہوا ہوگا۔" سب سے پہلے ملکہ کی اس پر نظر پڑی اور وہ زور سے ہنسی۔

"لگا رہا اندر نہیں ہے۔ دو سچ نیکم کو لے کر گھر سے جا چکی ہے۔" اس نے پولیس آفیسر کے بالکل برابر میں کھڑے ہوتے ہوئے نہایت اطمینان سے بتایا۔ اس کے اس انکشاف پر وہاں کھلی سی ہنسی کی۔

"کیا جب رہی ہے تو؟ کہاں لے کر چلا گیا وہ بھگوانی نیکم کو؟" رشیدہ نے اس پر ہنسنے کی کوشش کی جسے ایک پولیس والے نے اپنے ہاتھ میں موجود ڈھرا درمیان میں اڑا کر ناکام بنادیا۔

"وہاں، جہاں وہ اس ظلم سے محفوظ رہ گئے۔ جو قریب کی شادی الٹی میں ایک بوڑھے سے کر کے اس پر ڈھانا چاہتی تھیں۔" اس نے جواب دیا۔

"ہائے رہا ہم لست گئے... رہا وہ بھگوانی۔ دیکھو نیکم کے ابا! تمہاری بیٹی تمہارے منہ پر کالک مل کر چلی گئی۔" وہ سر پٹ پٹ کر دوا دیا کرتے تھے۔

"یہ کیا مسئلہ ہے بی بی؟" پولیس والا اس سے خطاب ہوا۔

"مسئلہ بہت صاف ہے آفیسر! یہ عورت نیکم کی سوتیلی ماں ہے جو اس کی مرضی کے خلاف اس کی شادی زبردستی ایک بوڑھے سے کر رہی تھی۔ رات میرا نیکم سے سامنا ہوا تو وہ میری جانے والی تھی۔ میں نے اس سے وعدہ کر لیا کہ میں اسے یہاں سے نجات دلا دوں گی۔ وہ میرے کپڑے چپکن کر لگا کر کے ساتھ یہاں سے نکل گئی۔ اب تک امید ہے کہ وہ محفوظ ہاتھوں میں پہنچی ہوگی۔" اس نے مختصراً سارا قصہ سنایا۔

"مگر قریب کر لیں اسے انسپکٹر صاحب! اس پر انوکھا کپڑا چپ کا نہیں۔ اس نے میری بیٹی کو درگاہ کر گھر سے ہرکا دیا۔" رشیدہ نے شور مچایا۔

"مگر چپ تو تمہارے خلاف کتنے چاہیے۔ تم ایک عاشق و بالغ لڑکی کو کہیں بے جا میں رکھ کر اس کی شادی اس کی مرضی کے خلاف کر رہی تھیں... یہ کتنا بڑا جرم ہے کچھ اندازہ ہے تمہیں؟" اس نے دوبارہ جواب دیا۔ پولیس کا تحفظ مل جانے کے باعث اس کا بھگوانی ہوا اختلاوت آیا تھا اور وہ اپنی سابقہ جون میں لوٹ رہی تھی۔

"اس مسئلے کو بعد میں دیکھیں گے بی بی! ابھی آپ ہمارے ساتھ چلیں۔ ہمیں اوپر والوں کو آپ کے مل جانے کی رپورٹ بھی دینی ہے۔" انسپکٹر نے مداخلت کرتے ہوئے بحث کو بڑھنے سے روکا تاہم اس کا بوجھ منہ ہوا تھا۔ اس نے انسپکٹر کی بات مان لی۔ فوراً ہی ان لوگوں کی وہاں سے روانگی عمل میں آگئی۔ چھپے نیکم کے خاندان والے شور مچاتے رہ گئے۔

"ان لوگوں کے ساتھ گروا لیا اس بھی گرفتار ہو گیا۔" رات میں اس نے انسپکٹر سے پوچھا۔

"نہیں... وہ وہاں سے چھپنے سے نکل ہی اڑے سے بھگوانی کا تھا۔ آپ بتائیں آپ مجھے ان لوگوں کے ہاتھ تک نہیں؟" اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے انسپکٹر نے اس کے بارے میں جانا بچایا۔

"یہ ساری تفصیلات میں صرف انہی کو بتا سکتی ہوں جن کے حکم پر آپ نے مجھے تلاش کیا ہے۔" اس نے انسپکٹر کو کچھ بھی بتانے سے گریز کیا۔ وہ اصرار نہیں کر سکا۔ چلتی اور سے آرزو ملے تھے، اس سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ لڑکی کا تعلق کسی بہت اونچے خاندان سے ہے۔ ایسے لوگوں کے معاملات کے بارے میں ضرورت سے زیادہ کھوجن لگانے سے احتیاط ہی اس کے لیے مناسب تھا۔ اس کا کہنا اس کے لیے کسی مصیبت کا درکھول دیتا۔ اس کے مقابلے میں یہی مناسب تھا کہ وہ خاموش رہے اور لڑکی کی بازیابی کا کارنامہ انجام دینے کے مسئلے میں ملنے والے انعام یا ترقی کا انتظار کرے۔ تھانے پہنچ کر ملکہ کو حوالہ میں دھکیلا گیا اور اسے احترام سے اپنے کمرے میں بٹھا کر انسپکٹر فون پر کسی سے بات کرنے لگا۔ تمام تفصیلات سے آگاہ کرنے کے بعد اس نے فون رکھ دیا۔

"میں نے اوپر اطلاع کر دی ہے۔ وہاں سے آرزو آجائے تو ہم آپ کو آپ کے گھر پہنچا دیں گے۔ جب تک آپ بتائیں کہ میں آپ کی کیا خدمت کروں؟ اگر کہیں تو ہاشا منگوالوں؟"

"نہیں۔ اب میں گھر پہنچ کر ہی ہاشا کروں گی۔" اتنی طبع متوقع رہائی نے اسے بیچان میں مبتلا کر دیا تھا۔ خالی ہیٹ ہونے کے باوجود اس کیفیت میں اس کا کچھ بھی کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

"نیکم آپ کی مرضی۔ میں ایسا کرتا ہوں کہ صرف جائے منگوالیت ہوں۔" بے انتہا خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے سنتری کو جانے کے لیے کھینچی کاٹن دیا یا گھر سنتری کی آمد سے جس ہی ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے فون اٹھایا اور دوسری طرف کی بات سن کر "نیکم سر... میں سر" کی ہی گردان کر رہا۔ فون بند ہوا تو وہ کھنٹی کی آواز پر اندر آنے والے سنتری کو اپنے پہلے ارادے کے مطابق حکم دینا بھول چکا تھا۔

"سب کو الٹ کر دو۔ آئی جی صاحب اور ڈی آئی جی صاحب خود ان قانون کو لینے یہاں آ رہے ہیں۔ دس پندرہ منٹ میں وہ یہاں پہنچ جائیں گے۔" اس قسم پر تھانے کی حدود میں فخر ترقی ہی نہیں تھی۔ پندرہ منٹ کے وقفے میں دوڑ دوڑ کر سب کچھ ٹھیک کرنے کی کوشش کی جانے لگی۔ انتظار کے پندرہ منٹ پولیس والوں کے ساتھ اس کے لیے بھی بڑے کچان خیر تھے۔ آخر کار یہ پندرہ منٹ گزری گئے اور باہر سے جوتوں کی مخصوص ٹھک سنائی دینے لگی جو اس بات کا ثبوت

تھی کہ آنے والے آچکے ہیں اور ماتحت افراد سے سیٹھت وصول کر رہے ہیں۔ انسپکٹر اپنے اعلیٰ افسران کے استقبال کے لیے نوکدرے سے باہر نکل کر جا چکا تھا۔

"آئیے سر پلیز! آپ کی مطلوبہ خاتون اندر موجود ہیں۔" باہر سے اس کی آواز سنائی دی اور پھر جی ہن کر وہ افراد کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اس نے گردن موڑ کر اپنی خاطر وہاں آنے والے آئی جی اور ڈی آئی جی کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی ان دونوں کے چہروں پر یہ یک وقت حیرت اور مایوسی کے تاثرات ابھرے۔

"تم کون ہو؟" ڈی آئی جی حیرا دانا نے سرسرفانی آواز میں یہ مشکل یہ سوال کیا۔

☆☆☆☆

"اماں! میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔ مجھ سے بالکل بھی یہاں بیٹھا نہیں جا رہا۔ میں حوصلے میں واپس جاؤں گی۔" کشور نے منہ بناتے ہوئے اپنے ساتھ بیٹھی چھوٹی چودھرائی دہیہ سے کہا۔ اس سیت حوصلے کی تمام خواہشیں اس وقت اضطراب ہوم کی افتتاحی تقریب میں شرکت کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ بنیادی طور پر تو اس تقریب کو بہت سادگی سے منعقد کرنے کا پروگرام بنایا گیا تھا لیکن وہ پروگرام چودھری انکار کو اپنے شاہان شان محسوس نہیں ہوا۔ اس کا کہنا تھا کہ بڑی چودھرائی اس افتتاح کے لیے خاص طور پر حوصلے سے باہر نکلے گی، اس لیے تقریب بھی زوردار ہونی چاہیے۔ اس زوردار تقریب کا انتظام اس نے اپنے لیے سے کر دیا تھا۔ اس وقت بڑے سے پنڈال میں پورے گاؤں کی عورتیں جمع تھیں۔ ان عورتوں کے بیٹھنے کے لیے دریاں بچھائی گئی تھیں جبکہ حوصلے کی معزز خواتین اوپر اسٹیج پر رکھی شان دار کرسیوں پر بیٹھی تھیں۔

اسکول کی افتتاحی تقریب کے موقع پر پیش کیے جانے والے ورثائی پروگرام کی خبر حوصلے تک بھی پہنچی تھی۔ اس تقریب کو بھی وہی رنگ دینے کے لیے بڑی چودھرائی نے فرمائش کی تھی کہ وہ عورتیں جن کی آواز اچھی ہے، داد دے چنا بیٹھتی ہیں، انکار پر اگر اپنے فن کا مظاہرہ کریں۔ عورتوں میں تقسیم کرنے کے لیے وہ بہت سے تحائف بھی اپنے ساتھ ایک کر دیا کر آئی تھی۔ کشور کی مدد سے اس نے اس موقع کے لیے ایک تقریر کی بھی تیاری کر لی تھی۔ یعنی اچھا ناما لیا پروگرام تھا جس میں کافی وقت لگا جبکہ کشور نے اس منٹ سے بھی کم عرصے میں سرور کی کجایت کرتے ہوئے حوصلے کی واپس جانے کی فرمائش کر دی تھی۔ اس کی یہ فرمائشیں سر چھوٹی

چودھرائی پریشان ہوئی اور آہستہ سے بولی۔

”اسے کیسے واپس چلی جائے گی؟ وہی چودھرائی کو برا لگے گا۔“ فیرنگی نے بھی نوٹیک ہی لکڑی ہے باہر۔ دوسری تو چودھری صاحب نے واپس چلی ہوئی تھی۔

”اوہو! گاڑی کا کیا ہے؟“ جیسے چھوڑ کر واپس آجائے۔ باقی کوئی ناراض ہوتا ہے تو ہونے دو۔ میرا درد سے بڑا حال ہو رہا ہے۔ دوسروں کی ناراضی کا خیال کر کے کیا میں اپنی جان سے گزر جاؤں؟“ وہ جھنجھلائی اور پھر ماں کا جواب سننے سے ٹل ہی اشارے سے ہاتھ فاسلے پر کھڑی رانی کو بلا کر اس سے بولی۔ ”ڈرائیور سے کہو گاڑی قریب لے کر آئے۔ میں جو چلی واپس جاؤں گی۔ اسے مجھے چھوڑ کر واپس نہیں آتا ہوگا اور ہاں۔ تم میرے ساتھ ہی چلو گی۔“

”جی اچھا بی بی!“ رانی صیٹ پٹ عزم کی قیبل کے لیے روانہ ہوئی۔

”تو روز بہ روز بڑی ضدی ہوتی جا رہی ہے کشور! ہر وقت اپنی مرضی کرتی ہے اور مشکل مجھے ہوتی ہے۔“ ناہید نے دینی آواز میں اسے کھرا کہ وہ دونوں اس کی بالکل کونے والی کرسیوں پر بیٹھی ہوئی تھیں اس لیے دوسروں تک ان کی آواز نہیں پہنچ رہی تھی۔ کشور ماں کی ڈانٹ سننے کے بعد بھی بے نیاز بنی بیٹھی رہی۔ ڈرائیور کے پاس پیغام لے کر جانے والی رانی لکھوں میں واپس آگئی۔

”گاڑی تیار ہے بی بی!“ قریب آکر اس نے اطلاع دی۔ اس اطلاع کو سنتے ہی کشور اپنی چادر درست کرتی ہوئی اسٹج سے نیچے اتر آئی۔ بڑی چودھرائی اور دونوں بیٹیں اس کی اس طرح روائی پر حیران ہو رہی ہوں گی، اسے خبر تھی لیکن اس نے جان بوجھ کر ان میں سے کسی کی طرف نہیں دیکھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی ماں سب کے سوالوں کے جواب دینے کا فریضہ پر غویٰ نبھالے گی۔ اس وقت اس پر جو وطن سوار تھی، اس کے سامنے اسے کسی کی ناراضی کی فکر نہیں تھی۔ آج تو وہ اس کے کہنے پر بھی رکنے والی نہیں تھی جس کی خاطر یہ خطرہ مول لے رہی تھی۔ قسمت سے جو موقع ہاتھ آیا تھا، وہ پھر جاتا تو بھی وہ بات نہ بولی جو آج سننے جانے میں تھی۔

پنڈال کے باہر ڈرائیور نے اس طرح گاڑی لگا لی تھی کہ اسے کھلے آسمان سے دو قدم بھی نہیں چھنا پڑا۔ وہ جیسے ہی گاڑی کے کھلے دروازے سے گزر کر کچھلی نشست پر بیٹھی، رانی نے پھر ہی سے دروازہ بند کر دیا اور خود ڈرائیور کے ساتھ والی اگلی نشست پر جا بیٹھی۔ ڈرائیور نے فوراً ہی گاڑی آگے

بڑھا دی۔ کچے کچے راستوں سے گزرتے ہوئے وہ درختوں کے ایک جھنڈ کے قریب پہنچے تو رانی نے ڈرائیور کی طرف دیکھتے ہوئے حکمرانہ لہجے میں کہا۔ ”گاڑی یہیں روک دو شریف!“ ڈرائیور نے اس حکم کی قیبل کی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ عزم دینے والی زبان بے شک ایک ملازمہ کی ہے لیکن ہم مالک کی طرف سے ہی جاری ہوا ہوا۔

”تم یہیں روک کر ہمارا انتظار کرو۔“ تھوڑی دیر بعد ہم بیٹیں واپس آئیں گے۔“ دروازہ کھول کر گاڑی سے نیچے اترتے ہوئے رانی نے اسے دوسری ہدایت دی۔

”مم۔۔۔ مگر۔۔۔ میں دوسروں کو کیا جواب دوں گا؟ کسی کو معلوم ہو گیا تو میری کھال اتر جائے گی۔“ ڈرائیور کچھ سکتا تھا کہ اس طرح چودھری جیسے راستے میں اترنے کا کیا مطلب ہے۔ جہاں بہت زیادہ پابندیاں ہوں، وہاں اس طرح کے چور راستے تلاش کر ہی لیے جاتے ہیں۔ رانی یقیناً اپنی مالکین کی راز دار اور دست راستہ تھی جو اس کی خاطر خود کو خطرے میں ڈال رہی تھی لیکن وہ کیوں خود خواہ اپنی گردن پھسانا۔ اس لیے پیچھے بیٹھی مالکین کے لحاظ کے باوجود اپنے خدشے کو زبان پر لائے بغیر نہیں رہ سکا۔

”کہہ دینا گاڑی خراب ہو گئی تھی، اسے ٹھیک کرنے میں دیر ہو گئی۔ کسی نے اگر ضمنیوں میں کھڑا دیکھ لیا تو اس سے گاڑی خراب ہونے کا بہانہ کرنے کے ساتھ یہ بھی کہہ دینا کہ بی بی کا یوں سچ راستے میں کھڑا ہونا مناسب نہیں تھا اس لیے رانی انہیں اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئی ہے۔“ وہ نیچے طور پر ایک طے شدہ منصوبے پر عمل کر رہی تھی اس لیے اس کے پاس سارے عمل موجود تھے۔ سب سے زور دار اور طاقتور عمل وہ نوٹ تھے جو اس نے اپنی بات کے اختتام پر ڈرائیور کی پھٹکی پر رکھے تو وہ خوف زدہ ہونے کے باوجود تعاون کے لیے آمادہ ہو گیا۔ اس کو آمادہ دیکھ کر کشور گاڑی سے نیچے اتر آئی۔

انہیں جہاں جانا تھا وہ جگہ یہاں سے قریب ہی تھی۔ اور گرد کوئی کھیت نہ ہوئے اور گاؤں کی تمام عورتوں کے قریب میں شرکت کے لیے چلے جانے کے باعث یہ ذرا بھی نہیں تھا کہ کوئی کشور کو دیکھ کر پچپان لے گا۔ تیز تیز دوڑوں سے تھکی وہ دونوں ایک مکان کے سامنے جا کر رہیں۔ یہ وہی مکان تھا جو آفتاب اور اس کے ساتھی ٹیچر ڈاکٹر ہاشم کے لیے دیا گیا تھا۔ رانی نے دستک دینے کے لیے دروازے پر ہاتھ رکھا تو وہ ہاتھ کے زور سے کھٹکا چلا گیا۔ کھلے دروازے کے دوسری طرف صحن میں ہلکا سا آفتاب صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ

دونوں تیزی سے اندر داخل ہو گئیں۔ آفتاب نے آگے بڑھ کر دروازہ بند کیا اور پھر کشور کی طرف رخ کرتے ہوئے مہنوی ناراضی سے بولا۔

”آخر آپ اپنی ضد پوری کر کے ہی رہیں۔“ ”کبھی کبھی نہیں بھی اپنی ضد منوانے کی اجازت ملنی چاہیے۔ بیٹھ تو ہم آپ کے کہے پر عمل کرتے ہیں۔“ اس کی طرف دیکھتی ہوئی وہ شرارت بھرے لہجے میں بولی تو وہ بیل بھر کے لیے اسے گھورتا رہا اور پھر سکرا دیا۔

”ماں لیا میں نے آپ کا حق۔“ چلیں اندر چل کر بات کرتے ہیں۔“ اس کا ہاتھ تمام کروہ اپنے کمرے میں لے گیا۔ رانی تو اندر قدم رکھنے کے بعد فوراً ہی اندھی، بہری اور کوئی بین تھی۔۔۔ کہ یہی مالکین سے حق و فاداری نبھانے کا طریقہ تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی کشور کی نظر سب سے پہلے میز پر رکھے ہوئے سے ٹپک اور اس کے ساتھ ہی رکھی دو کتابوں پر پڑی۔

”مجھے آنے سے اتنی سختی سے منع کر رہے تھے اور یہاں پورا انتظام کر رکھا ہے۔ اگر میں نہ آتی تو آپ کا انتظار تو راکھاں چاہا جاتا۔“ ان چیزوں کو دیکھ کر وہ آفتاب کی طرف رخ کرتے ہوئے باز سے بولی۔

”ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ آپ ضرور آئیں گی۔“ وہ یقین سے بولا۔

”وہ کیوں بھلا؟“ اس نے منکراتے ہوئے پوچھا۔ ”محبت کرنے والوں کو یہاں سے خبر مل جاتی ہے کشور بی بی! اپنے محبوب کے ارادوں کی پہنچ پر کھنے کے لیے یہ کافی ہوتا ہے۔“ اس نے اپنے ہاتھ میں موجود کشور کا ہاتھ اپنے سینے پر بائیں جانب سین دلی کے اوپر رکھا۔ وہ اپنے ہاتھ کے نیچے اس کے دل کی دھڑکن کو سننے لگی۔ اسے ایسا لگا کہ اس کے ہاتھ کے نیچے موجود دل کی ہر دھڑکن اس کا نام لے رہی ہو۔ وہ جوجب سی ہوئی۔ آفتاب کے قریب آئے کا یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس کے دل کی دھڑکن سن سکے۔ اس کا شمارانا اور گھیرنا غریبی تھا۔ اسی کیفیت کے باعث اس نے ذرا سا زور لگا کر اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ کی گردنت سے آزاد کروانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہو سکی۔

”اے بھئی! اب ایسی کوئی کوشش بے کار ہے۔ ایک ضد آپ نے کی تھی، میں نے اس کا احترام کیا۔ اب ایک ضد میرے دل کی ہے کہ اس کی سیسا کا ہاتھ پکڑ کر یہیں رکھا رہے تاکہ اسے قرا لے۔ آپ کو میرے دل کی اس ضد کا احترام کرنا ہو گا۔“ اس کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کی گردنت مضبوط

کرتے ہوئے اس نے اسے ٹوکا۔

”تو اب آپ بدل لیں گے ہم سے؟“ اس نے گھبراہٹ میں دوبارہ ہاتھ چڑھانے کی کوشش نہیں کی۔

”اگر آپ کو ایسا لگتا ہے تو لیجیے میں اپنی ضد سے دست بردار ہو جاتا ہوں۔“ آفتاب نے فوراً اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ ”میں تو مذاق کر رہی تھی۔“ اس طرح ہاتھ چھوڑ دیا جانے پر اسے دم کا لگا اور وہ فوراً صفائی دینے کی۔

”میں بھی مذاق کر رہا تھا۔ ہاتھ دھوئیں نے اس نے چھوڑا ہے کہ آپ اپنی سالگرہ کا سیک کاٹ لیں۔“ کتاب کی خاطر نور کوٹ جا کر بڑی مشکلی سے یہ سیک لیا ہوں۔ آج اپنے اصول کے خلاف مجھے اسکول کی چھٹی تھی کرنی پڑی ہے۔“ اس کے شانوں کے دریا پنازہ و پھیلا کر اسے میز کے قریب لے جاتے ہوئے اس نے بتایا تو وہ کھٹکا کر بس دی اور پھر ذرا اترتے ہوئے بولی۔

”محبت اسی کا نام ہے، ماضی صاحب محبت اپنے اصول خود طے کرتی ہے۔ اس کے اصولوں کے سامنے آدمی کے ذاتی اصول بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اپنے اصول کے خلاف آپ کو اسکول کی چھٹی کرنی پڑی، یہ سن کر مجھے افسوس ہوا لیکن حق چاہیے کہ اس سے بھی بڑھ کر مجھے ڈوٹی ہوئی ہے کہ ایسا آپ نے میری خاطر کیا۔ اپنی اس اہمیت پر میں بڑی نازاں ہوں۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ ابھی باہر جاؤں اور سب کو بتا دوں کہ آفتاب اندھ کو کچھ سے محبت ہے۔“ اتنی دھیر ساری محبت کہ وہ میری خواہش کی تکمیل کے لیے اپنا ایک اصول قربان کر گئے۔“

”بی بی! ہاں۔ بالکل ضرور جا کر اپنا یہ ثبوت پورا کیجیے تاکہ آپ کے لیا حضور دھامیں دھامیں میرے سینے میں گولیاں اتار کر مجھے نہیں دفن کر داریں۔ بعد میں آپ میری قبر پر مجاور بن کر بیٹھ جائیے گا۔“ اس کی بات سن کر وہ چڑانے والے انداز میں بولا تو اس نے فوراً ہی دلی کراس کے ہوتوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور ٹھٹکی سے بولی۔

”اللہ نہ کرے۔۔۔ کیوں ایسی بری باتیں منہ سے نکالنے ہیں؟“

”میں نہ بھی کہوں تو کیا یہ سچ نہیں ہے کہ چودھری صاحب کے طم میں جیسے ہی یہ بات آئی، وہ میرے سامنے سے گم بھی ہو گیا ہوگا۔“ اس نے ہنسنے پر رکنے اس کے ہاتھ کو چوم کر اپنے ہاتھ میں لیتا ہوا ڈھنگ سے بولا۔ ”میں اپنے کسی سچ کو نہیں منسا چاہتی۔ کم از کم آج کے دن تو ہرگز بھی نہیں۔ میں آپ کی کتاب شائع ہونے اور اپنی

سال گرہ کی خوشی سارے خدشے اور وابہ بھول کر منانا چاہتی ہوں۔ میں نے اتنا خطرہ مول لے کر یہاں تک آنے کی راہ اس لیے نہیں نکالی کہ میں ایسی بدگوشی کی باتیں سنوں۔ اس کے لیے کی نفی قائم رہی۔

”فہمیک ہے بابا! اب نہیں کروں گا ایسی باتیں۔ آپ ایک تو کاٹیں۔“ اس نے فوراً ہی معذرت کرتے ہوئے اس کے ہاتھ میں پھری تھمائی اور ایک پر گئی موسم بیاں روشن کرنے لگا۔ کشور نے ایک کاٹا اور ایک چھوٹا سا تھیں اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے ڈراما کھا کر وہی تھیں اپنے ہاتھ سے اسے کھلایا۔ وقت کے ان لحاظ میں وہ ایک دوسرے کے ساتھ کھن پر طرح کے اندیشوں سے آزاد اور بے فکر ہو گئے تھے۔

”لائیے اب میرا تھو دیجیے۔“ کشور نے اس سے فرمائش کی تو اس نے ایک کے قریب رکھی کتابوں میں سے ایک کتاب اٹھا کر اس کے ہاتھ میں تھمائی۔ اس نے کتاب کھول کر دیکھی۔

”اپنی زندگی کی سال گرہ پر اس کے لیے چھوٹا سا تھو!“ پہلے ہی منٹوں پر خوب صورت سنہری حروف میں یہ تحریر لکھی ہوئی تھی۔ کل رات فون پر ہنگامہ کے دوران اس نے کشور کو بتایا تھا کہ اس کے کالم پر مشتمل کتاب چھپ کر آچکی ہے۔ فی الحال کتاب کی روانگی کی تقریب ہونا تھی لیکن جیسا کہ اسے کتاب کی چند جلدیں بچھوا دی تھیں۔

کشور اس کی زبانی یہ اطلاع سن کر بے چین ہو گئی۔ اس کا مطالبہ تھا کہ کل اس کی سال گرہ سے اور اس موقع پر اسے یہ کتاب آکر گراف سمیت تحفے میں دی جائے۔ مطالبے کے ساتھ ہی اس نے سارا منصوبہ بھی طے کر لیا کہ وہ کیسے انڈسٹریل ہوم کی افتتاحی تقریب سے بہانہ کر کے نکلے گی اور اس تک پہنچ جائے گی۔ آفتاب نے بڑی کوشش کی کہ اسے اس ارادے سے باز رکھے لیکن اس پر دھن سوار ہو گئی۔ اس کا کہنا تھا کہ اپنی سال گرہ کے موقع پر اس سے اپنا سمن پسند تھو، اپنی سمن پسند جگہ پر آکر وصول کرنا اس کا حق ہے۔ آفتاب اس کے اس حق کو چیلنج نہیں کر سکا اور اب وہ بیچنا یہاں لگ گئی۔

”یقیناً جیسے آفتاب۔۔۔ پوری زندگی میں تو کبھی میری سال گرہ کا دن اتنا خوب صورت گزارا اور نہ ہی کوئی اتنا شان دار تھو ملا۔“ شکر یہ کہ اگر محبت کے اصولوں کے خلاف نہ ہوتا تو میں آپ کا شکر یہ ضرور ادا کرتی۔“

”شکر یہ ادا کرنے کی ضرورت ہے بھی نہیں۔ جو ابا

آپ بھی مجھے اس خوب صورت موقع پر ایک تھو دے سکتی ہیں۔“ اس کی بات سن کر اس نے مسکراتے ہوئے مشورہ دیا۔

”میں تو اپنے ساتھ کچھ لائی ہی نہیں۔“ وہ شرمندگی سے بولی۔

”مجھے ساتھ لائی ہوئی کوئی چیز چاہیے بھی نہیں۔ بس اپنے ہاتھ سے چند لفظ لکھ کر میری اس کتاب کی قیمت بڑھا دیں۔“ اس نے کتاب کی دوسری جلد کھول کر اس کے سامنے رکھی اور اپنی جیب میں انکا پین نکال کر اسے تھمایا۔ وہ چین تمام کر لئے بھر کے لیے کچھ سوچی رہی پھر کتاب کے کچھ سائے پر لکھنے لگی۔ وہ سامنے کھڑا اسے انتہک سے دیکھتا رہا۔ بہت سلیقے سے اور مہجی مہجی چادر اب کچھ بے ترتیب ہو گئی اور چادر کے نیچے سے جھانکتا اس کا ہلکے سبز رنگ کا لباس اسے متوجہ کر رہا تھا۔

”آج کی تیاری میرے لیے کی گئی تھی تو پھر مجھے ہی کیوں محروم رکھا گیا؟“ وہ کتاب پر اس کے حسب فرمائش لکھنے کے بعد فارغ ہوئی تو اس نے شکوہ کیا۔ وہ فوراً ہی اس کا مطلب سمجھ گئی اور چہرے پر سرخی سی دوڑ گئی۔ تو ہم اس نے آفتاب کی فرمائش روک نہیں کی اور بڑی سی چادر اٹار کر ایک طرف رکھ دی۔ چادر کے نیچے اس نے جارت کے لباس کا ہم رنگ دوپٹا اوڑھ رکھا تھا۔ دوپٹے کے کناروں پر بہت خوب صورت سی تیل لگی ہوئی تھیں۔ چادر جٹ کا یہ دوپٹا چادر کی طرح اس کے جسمانی خطوط کی پردہ پوشی کرنے میں کام تھا اور اس کے وجود کی رہنمائی اسے خوب خوب اپنی جھلک دکھا رہی تھیں۔ آفتاب نے پہلی بار اسے یوں بغیر چادر کے دیکھا تھا چنانچہ اپنی نظریں اس کے وجود سے ہٹانے میں ناکام رہا۔

”بہت دیر ہو گئی۔ اب مجھے چلنا چاہیے۔“ وہ عورت تھی۔ اس کی نظریں کی زبان بڑھ لیتا اس کے لیے بہت آسان تھا، چنانچہ کلائی پر بندھی کھڑی میں وقت دیکھتی ہوئی گھبراہٹ، شرمائی ہوئی بولی اور ایک جانب رکھی اپنی چادر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”مت جاؤ۔۔۔ یہیں میرے پاس ہی رہ جاؤ۔“ وہ بے قرار ہو کر آگے بڑھا اور اسے اپنی ہاتھوں کے مہسار میں لے لیا۔ کشور کسی جسم کی طرح ساکت ہو گئی۔ آفتاب کے ہونٹ اس کے چہرے کے خدوخال سے کشمکش کرنے لگے۔ یہ سب اس سے چپا زمین پر بارش کے چند پھینٹے پڑنے والی بات تھی جن کے سبب زمین سیراب ہونے کے بجائے سبز بیک اٹھتی ہے۔ وہ بھی جذبات کی شورش سے دھک رہی تھی۔ اس پر

ہر نئے والا بادل بھی ایسا تھا جو وادی وادی گھوم کر آنے کے باوجود کسی سرزمین پر نہیں برساتا تھا۔ یہ بادل کھل کر برس جاتا تو زمین سیراب ہو جاتی لیکن اسی وقت دروازے پر ہلکی سی دھتک ہوئی۔ وہ دونوں اپنی انجھی انجھی سانسوں کو سنبھالتے چک دم ہوش میں آ گئے۔

”ابنازت ہے۔“ وہ جانتی تھی کہ دھتک دینے والی رانی ہے جس نے اسے وقت کا احساس دلانے کی کوشش کی ہے اس لیے پھرتی ہے چادر اٹھا کر اپنے گرد لپٹی اور بھی نظریں اسے آفتاب سے سوال کیا۔

”ہاگل۔“ اس نے جواب دیا تو کشور نے قدم دروازے کی طرف بڑھا دیے۔

”میری گستاخی ناگوار گزری ہو تو میں اس کے لیے معافی چاہتا ہوں۔“

وہ پیچھے سے آہستہ آواز میں بولا تو وہ تپ کر مڑی اور شکوہ کنان انداز میں بولی۔ ”آپ کو تو یہ بھی یاد نہیں کہ محبت میں شکر بے کی طرح معذرت کرنا بھی اصول کے خلاف ہوتا ہے۔“

”بہت اچھی طرح یاد ہے لیکن میرا ماننا یہ ہے کہ چھوٹی سی معذرت آپ کی عقل کو اور بھی مضبوط کر دیتی ہے۔ محبت میں اپنا نہیں ہوتی اور صرف آدمی کی ان ہی ہوتی ہے جو اسے اپنے قصور پر معذرت کرنے سے روک دیتی ہے۔ انہی دو اور صرف محبت ہوتی آدمی ہے تصور بھی بلا جھجک معذرت کر لیتا ہے۔“ اس نے اپنا انتہائی نظریہ بیان کیا جسے سن کر وہ مسکرا دی اور مسکراتے ہوئے بھی بولی آنکھوں کے ساتھ بولی۔

”تو جناب کا خیال ہے کہ درحقیقت آپ سے کوئی گستاخی نہیں ہوئی اور آپ بس یونہی ہم سے تعلق مضبوط رکھنے کے لیے معذرت کر رہے ہیں۔“

”آپ تو بچ بچ بہت ذہین ہیں۔ میرا مطلب بڑی اچھی طرح سمجھ گئیں۔“ وہ بلند آواز میں ہنسا۔ کشور نے بھی دھتکی آواز میں اس کی ہنسی کا ساتھ دیا اور پھر ہاتھ پلاتی ہوئی باہر نکل گئی۔ رانی پھر سے پریشانی کے لیے سامنے کھڑی تھی۔

”اب ہمیں چلنا چاہیے۔“ اس نے اس کی شکل دیکھ کر فقط اتنا سہا ہی جملہ کہا لیکن کشور کو احساس تھا کہ وہ اتنی دھتک جانے کے باعث پریشان ہو چکی ہے۔

”فہمیک جو رانی انجھادی ہے اسے آج مجھے اپنی زندگی کی بڑی آن مول خوشیاں ملی ہیں۔“ رانی کا ہاتھ تمام کر اس نے اس کا شکر یہ ادا کیا اور پھر وہ دونوں وہاں سے باہر نکل کر اس راستے پر چل پڑیں جو درختوں کے اس جھنڈ تک جا رہا تھا

جہاں انہوں نے ڈرامہ گواڑی سیت چھوڑا تھا۔ دوسری سے انہوں نے دیکھ لیا کہ گاڑی کا ہونٹ اٹھا ہوا ہے اور قریب کھڑا ڈرامہ گواڑی سیت سے ادھر ادھر دیکھ رہا ہے۔ ان دونوں کو آواز دیکھ کر اس کے چہرے پر اطمینان چھا گیا۔ ہونٹ کا کر اس نے پھرتی سے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا اور خود ڈرامہ گواڑی سیت پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ ان دونوں کے گاڑی میں بیٹھتے ہی گاڑی فرار نے پھرتی ہوئی سوئی کی طرف رواں ہو گئی۔ اس تیز رفتاری سے وقت کے فرق کو کم نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن یہ ڈرامہ گواڑی کا اضطراری ٹیل تھا کہ وہ لاشعوری طور پر ایسی کوشش کر رہا تھا۔

☆☆☆

”کیا پوزیشن سے عبدالمنان! سب کچھ ٹھیک چل رہا ہے نا؟“ گاڑی سیر آباد کی حدود میں داخل ہوئی تو اس نے عبدالمنان کا نمبر ملا کر اس سے پوچھا۔ سیر آباد میں جاری افتتاحی تقریب کے انتظامات سنبھالنے کے لیے عبدالمنان میج سے وہاں پہنچا ہوا تھا جبکہ وہ خود دور پور کے دورے پر جا گیا تھا۔ ایک تو اسے وہاں جاری ترقیاتی کاموں کا جائزہ لینا تھا، دوسرے وہ سیر آباد میں زیادہ وقت نہیں گزارنا چاہتا تھا۔ تقریب میں شرکت کرنے کے باعث اسے اپنا وقت چودھری کے ساتھ گزارنا پڑتا۔ جبکہ چودھری اور وہ دو مختلف دنیاؤں کے بندے تھے، چنانچہ چودھری کو برداشت کرنا اس کے لیے کسی کڑے امتحان سے کم نہیں تھا۔ خود کو اس امتحان میں زیادہ دیر جٹا ہونے سے بچانے کے لیے اس نے اپنا آج کا شیڈول اس طرح ترتیب دیا تھا کہ سیر آباد میں مختصر وقت کے لیے ہی نمبر پڑے اور اب طے شدہ شیڈول کے مطابق وہ مقررہ وقت پر سیر آباد کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔

”ابوری تھنک از آل رانت سرائے تقریب ابھی جاری ہے۔ میرے ساتھ آنے والی خاتون صحافی اندر بیڑا ال میں موجود ہیں اور تقریب کی کوریج کر رہی ہیں۔ سوئی کی خوانین کے علاوہ جن خواتین کو دعوت نامے بھیجے گئے تھے، ان میں سے انہیں بی صاحب اور ڈاکٹر مسعود کی مسز بھی کچھ دیر قبل یہاں پہنچی تھیں۔ اندازہ ہے کہ آدھے گھنٹے میں تقریب ختم ہو جائے گی اور ہم فارغ ہو جائیں گے۔“

”اصولاً تو اب تک تقریب کو ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ پھر سے انڈسٹریل ہوم کے افتتاح کے لیے اتنا زیادہ وقت خرچ کرنا میری سمجھ سے باہر ہے۔“ وہ عبدالمنان کی پیش کردہ رپورٹ کو کن کر بیٹھ گیا۔

”آپ چودھری صاحب اور ان کی فیملی کے مزاج کے

بارے میں تو جانتے ہی ہیں سرکہ کس قدر شہزاد لوگ ہیں۔ پہلے چودھری صاحب نے تقریب کو اپنی جگہات کے شایان شان منعقد کرنے کے چکر میں پھیلایا اور اب ان کی تہنیک بانی کی سرپوری کر رہی ہیں۔ میرا اندر موجود خاتون صفائی سے رابطہ ہے۔ انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ بڑی چودھرائی تقریب ختم کرنے کے موڈ میں نہیں ہیں۔ پہلے ورائٹی شو کے نام پر اچھا خاصہ وقت لگایا گیا اور اب تصویریں کھینچوانے کا سلسلہ جاری ہے۔ چودھری صاحب کی طرف سے اخبارات میں جوئی کی خواہشیں کی تصویریں شائع کرنے پر پابندی ہے لیکن چودھرائی اپنا ذاتی کمرالے کر آئی ہے اور اب انہوں نے ہماری سبھی ہوئی خاتون صفائی کو اپنا نوکر مقرر کر رکھا ہے۔“

عبدالمنان نے بے بسی سے بتایا۔
”اوکے! تم کوشش کرو کہ جلد از جلد تقریب ختم ہو جائے۔ میں جیسا کہ چاہتا ہوں اور اب جوئی تجھے ہی والا ہوں۔ تم فارغ ہوتے ہی وہاں آجانا۔“ عبدالمنان کی مجبوری کو سمجھتے ہوئے اس نے اپنی بھینچا ہٹ پر قابو پایا اور اسے ہدایت دینے کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا۔ اگلے دو منٹ میں وہ جوئی پہنچ چکے تھے۔

ڈرائیور نے گاڑی جوئی کے بازو سے جھانک سے اندر داخل کی تو وہی ایک دوسری گاڑی بھی پیچھے سے چلی آئی۔ اس کے گاڑی سے اترنے سے پہلے ہی پہلی گاڑی سے دو خواتین برآمد ہوئیں۔ ان میں سے ایک تو پوری طرح چادر میں بھپی ہوئی تھی لیکن دوسری کو اس نے پہچان لیا۔ وہ وہی ملازمہ تھی جس کو اس نے لاہور کے اسپتال میں آفتاب کے کمرے کے باہر دیکھا تھا۔ اس ملازمہ کو دیکھ کر وہ یہی قیاس کر سکتا تھا کہ چادر پوش لڑکی آفتاب کی محبوبہ کشور ہے۔ وہ گاڑی سے اترنے کے بعد جب تک اندر نہیں چلی گئی، وہ احتیاطاً اپنی گاڑی میں ہی بیٹھا رہا۔ چودھری افکاری دختر کا اتنا احترام لازمی تھا۔

”تو خانی کشوری بی بی کو اپنے ساتھ لے کر آیا ہے۔“ باقی وہیں میری اگلی گندی میں کیسے واپس آئیں گی؟“ مشاہیر خان نے اس کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولا، تب اس کے کان میں چھپی گاڑی کے ڈرائیور سے کہا گیا یہ جملہ پڑا۔

”میں بھی دوبارہ واپس جاؤں گا۔ بی بی کی طبیعت خراب ہو رہی تھی اس لیے وہ جلد ہی اٹھ آئی تھیں، یہ نصیب کی خرابی کہ راستے میں گندی ہی خراب ہو گئی۔ وہی مشکل سے میں نے اسے ٹھیک کیا، تب کہیں جا کر ہم ادھر پہنچ سکے۔“ مجھے تو خود فکر ہو رہی ہے کہ اُدھر گندی کا انتظار ہو رہا ہوگا۔

وہی چودھرائی تو سخت غما ہوں گی کہ میں نے اتنی دیر کیوں لگائی۔۔۔ پر میں کیا کرتا؟ ان مشینوں کو کوئی مجروح سا تھوڑی ہوتا ہے، اچانک سے آدھی دو ٹوکا دے جاتی ہیں۔“ اندر جاتے ہوئے ڈرائیور کی بیان کردہ صورت حال اس کے کانوں میں بھی پڑی جس کو کہیں نہ ہو کہ کچھ کیا کہ تقریب ختم نہ ہونے کے باوجود دشواریوں کی جلدی واپس آئی ہے۔ اس کا استقبال کرنے والے ملازم نے اسے سوئی کے شان دار ڈرائنگ روم تک پہنچایا۔ وہاں چودھری کے ساتھ ایس بی ٹی ٹھہرنا پڑا۔ پہلے سے موجود تھا۔ وہ دونوں شہر کے بڑی بڑی ہمارے ہوئے بیٹھے تھے۔

”آئیے اسے ہی صاحب! ہم آپ کا ہی انتظار کر رہے تھے۔ بڑی دیر لگا دی آپ نے۔“ اسے دیکھتے ہی چودھری نے پرجوش انداز میں استقبال کرتے ہوئے شکوہ کیا۔
”جی ہاں، اصل میں آج مجھے نوپور کے دورے پر بھی جانا تھا۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ وہاں بھی ہمارے پرنٹیشن پر کام ہو رہا ہے۔ بس وہاں سے واپس آتے آتے کچھ تاخیر ہو گئی۔“ چودھری اور ایس بی ٹی دونوں سے باری باری مصافحہ کرتے ہوئے اس نے اپنے دیر سے کی وجہ بتائی۔

”اتنی سے عمر میں آپ کبھی میلوں میں پڑ گئے ہیں اسے ہی صاحب! ابھی تو یہ آپ کے کہنے کھانے کی عمر ہے۔ ابھی آپ لائف کو انوائس کریں۔ بہت وقت پڑا ہے اس طرح کے سوشل ورکس کرنے کے لیے۔“ اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے چودھری نے اسے مشورہ دیا۔

”چودھری صاحب! میں ان لوگوں کو بے وقف بھتا ہوں جو وقت پر مجھ دوسرا کر کے اپنی عمریں برباد کر دیتے ہیں۔ ویسے بھی ”ہم کھانے والوں“ میں سے نہیں ہیں اور ”کھیل“ بھی فیئر طریقے سے کھیلنا پسند کرتے ہیں۔ ہاں اگر سامنے والا بے ایمانی پر اتر آئے تو پھر اس کی چالوں کا ہمارے پاس یہی توڑ رہ جاتا ہے کہ اس کی چال اسی پر الٹ دیں۔“ اس نے معنی خیز لہجے میں چودھری کی بات کا جواب دیا اور باطل پر بکھرے مہروں کا جائزہ لینے لگا۔ مہروں کی پوزیشن بتا رہی تھی کہ ایس بی ٹی کو مات ہونے ہی والی ہے۔

”کیا ایس بی ٹی صاحب کو مات ہونے سے بچانے کے لیے غور کر رہے ہیں اسے ہی صاحب!“ چودھری نے اسے ہانپڑا۔

”بی ٹی نہیں۔ آپ میں سے کسی کو بھی مات ہو، میرا اس میں کوئی نقصان نہیں۔ آپ کھیل جاری رکھیے۔ میں دیکھتا

ہوں کہ ایس بی ٹی صاحب خود کو مات سے بچانے کے لیے کیا دیکھ لڑاتے ہیں؟“ اس نے مسکرا کر اسی معنی خیز لہجے میں جواب دیا جسے نہ سمجھتے ہوئے وہ دونوں ایک بار پھر ہیل کی طرف متوجہ ہو گئے لیکن اس سے قبل ہی ڈرائنگ روم میں ہوجھال سا اُٹھ گیا۔ بھونچال بن کر وہاں آئے والا اُدھت من و ذوق کا ایک نوجوان لڑکا تھا جس کے چہرے پر موجود مخصوص جھٹ اس کی ذاتی معذوری کا اعلان کر رہی تھی۔

”میں یہاں کھیلوں گا۔ تم گندی ہو، مجھے کہیں بھی نہیں جانے دیتیں۔“ وہ باجی ہوئی ملازمہ سے مخاطب تھا جو اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ ملازمہ سے کہتا ہوا ہاتھ میں پلاسٹک کے پلے سے ڈرائنگ روم میں سجے قیمتی ڈیکوریشن پیسروں کو بال کی طرح ہٹ کر رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے چار ڈیکوریشن جیس اس کے پلے کی زد میں آ کر زمیں پر ہونے کے بعد چکنا چور ہو گئے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ ہر ٹوٹنے والے ڈیکوریشن جیس کے ساتھ ساتھ ملازمہ کے چہرے پر بچھائے خوف اور بے بسی کے بادل گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

”آپ اوپر چلیے چھوٹے شاہ بی! وہاں آپ کے بہت سارے کھلونے ہیں۔ اوپر جا کر میں آپ کے ساتھ کھیلوں گی۔“ ملازمہ کی بانی ہوئی آواز میں اس اپنا دل نوجوان کو بھانسنے کی کوشش کرتے ہوئے اس کے پیچھے چل رہی تھی۔ خوف اور پریشانی کے عالم میں اسے نیچے بڑی کرچوں سے زخمی ہو جانے والے بچروں کا بھی ہوش نہیں تھا۔ مہمانوں کے سامنے پیش آنے والی اس صورت حال پر چودھری کا موڈ بڑی طرح خراب ہو گیا اور وہ جلال میں بھرا ملازموں کو نکالنے لگا۔ فوراً ہی تین چار ملازم وہاں آ پہنچے اور اس کے اشارے پر نوجوان کو قاتلوں میں کر کے ڈرائنگ روم سے باہر لے گئے۔

”ماف کر دیں سرکار! مالوم نہیں کیسے چھوٹے شاہ بی میری آنکھ بچا کر پیچھے اتر آئے۔ دوبارہ ایسی غلطی نہیں ہو گی۔“ زخمی بچروں والی ملازمہ فوری طور پر باہر جانے کے بجائے پیچ کر دوں ہاتھ جوڑتے ہوئے چودھری سے سواکتی ہوئی۔

”تیرا تو تین بعد میں فیصلہ کروں گا۔ ابھی اپنی شکل گم کر بھرے سامنے سے۔“ چودھری غضب زدگ ہو کر مارتا۔ وہ چہ چاری اس کی بات سن کر اور بھی زبردہ پوری طرح لڑنے لگا تاہم اس میں مزید کچھ کہنے کی ہمت نہیں تھی اس لیے چپ چاپ باہر نکل گئی۔ اس کے باہر نکلنے کے بعد ایک دوسری

ملازمہ آ کر وہاں موجود پھیلاوا دیکھنے لگی۔
چودھری کے چہرے کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ اس کا مزاج بڑی طرح برسم ہو چکا ہے اور اسے اپنا موڈ حال کرنے میں سخت دشواری پیش آرہی ہے۔
”آپ لوگ تقریب دیکھیں، میں ابھی تھوڑی دیر میں واپس آتا ہوں۔“ بالآخر وہ برداشت نہ کر سکا کہ یہ کہتا ہوا ڈرائنگ روم سے باہر چلا گیا۔

”کون تھے وہ صاحب زادے؟“ شہزاد یہ تو سمجھ چکا تھا کہ لڑکے کا تعلق چودھری کے خاندان سے ہے، بس اس نے چودھری سے اس کا رشتہ معلوم کرنے کے لیے یہ سوال کیا۔

”چودھری صاحب کا سب سے چھوٹا بیٹا ہوا تھا۔ بچے جارہے تھے طور پر معذور ہے۔“ ایس بی ٹی نے بتایا تو وہ سر کو تقریبی جنبش دے کر خاموش ہو رہا۔ تھوڑی دیر بعد چودھری بھی واپس آ گیا۔ اب اس کے چہرے کے تاثرات قدر سے پرسکون تھے۔

”میں نے ملازموں کو کھانا لگانے کا کہہ دیا ہے۔ ہم لوگ چل کر کھانا کھا لیتے ہیں۔“ خواتین تھوڑی دیر میں واپس آجائیں گی تو ان کے لیے الگ دسترخوان لگ جائے گا۔ میں نے چودھرائی کو ہدایت کر دی تھی کہ تمام سوز خواتین کو اپنے ساتھ جوئی لے کر آئیں۔ مہمان صفائی خانہ سے ان کی تقریب کے بارے میں رائے بھی معلوم کر لی جائے گی تاکہ اندازہ ہو سکے کہ وہ اخبار کے لیے کیسی رپورٹ تیار کریں گی۔“

ایک سوٹ پر بیٹھے ہوئے اس نے کہا: لگوانے کی اطلاع دینے کے ساتھ آگے کا پروگرام بھی بتایا۔ جوئی میں کھانے کا ڈر اب شہزاد کی طبیعت پر ناگوار گزرنے لگا تھا۔ چھپیلی ایک دو ملاقاتوں میں تو اس نے وہاں کچھ بھی کھانے پینے سے سخت اجتناب کیا تھا لیکن آج اس کوئی کٹاں نظر نہیں آ رہی تھی۔ اپنی اندرونی کیفیت کو چھپائے وہ بات چیر کے ساتھ وہاں بیٹھا رہا۔ اسی وقت اس کے موبائل کی داہرہ پیش سے اسے پتا چلا کہ کوئی اسے کال کر رہا ہے۔ اس نے موبائل نکال کر اسکرین پر آنے والا نمبر دیکھا۔ سارا ناکی کال آ رہی تھی۔ ”بس“ کا فن دہاتے ہوئے اس نے کال ریسیو کی۔

”کہاں تھے شہزی؟“ اس کا کافی دیر سے قہقہہ زدن کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آٹس سے معلوم ہوا کہ تم دورے پر ہوا اور موبائل پر کال کرنے پر کوئی دہانسی ہی نہیں مل رہا تھا۔“

”فی الحال تو میں بھر آباد میں ہوں۔ اس سے پہلے نور پور میں تھا۔ شاید آپ نے اس وقت مجھے کال کی ہوگی اس لیے رابطہ نہیں ہو سکا۔ نور پور میں سواگل سرس کام نہیں کرتی ہے۔ آپ بتائیں کہ سب ٹھیک تو ہے؟ کوئی نئی خبر...؟“ اپنے بارے میں وضاحت دینے کے بعد اس نے ان سے سوال کیا۔ اس وقت ان کی کال آنے پر لاعلمی اس کے ذہن میں یہی بات آتی تھی کہ وہ دھینکا کے حوالے سے کوئی خبر دینا چاہتے ہیں مگر انہوں نے اسے جو اطلاع دی اسے سن کر وہ بہ مشکل خود کو اکٹھل پڑنے سے روک سکا۔ سجاد رانا جو کچھ کہہ رہے تھے، وہ بالکل اُن ہونی بات تھی۔

”آپ فی الحال اسے اپنے پاس رکھیں۔ میں فوری طور پر پہنچتا ہوں۔“ مکمل تفصیلات جاننے کا یہ موقع کئی نہیں تھا اس لیے اس نے ان سے کہا اور سواگل آف کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔

”خیریت اسے ہی صاحب؟“ چودھری اور ایس پی جو اس کے چہرے کے تاثرات سے کچھ بھی سمجھنے میں ناکام رہے تھے، اسے کھڑا ہوتے دیکھ کر پوچھنے لگے۔

”ایک ابھرنیسی ہے، مجھے فوری طور پر جانا ہو گا۔ میں معذرت خواہ ہوں کہ کھانے پر آپ لوگوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔“ اس نے مختصر الفاظ میں بتایا اور دونوں سے مصافحہ کر کے باہر نکل گیا۔ ڈرائنگ روم سے نکل کر اپنی گاڑی تک جاتے ہوئے اس کے حساس کانوں نے کسی صورت کی کوئی بھی نہیں سنیں۔

”چھوڑ دو... ماف کر دو مجھے۔ اب کبھی ایسی بھول نہیں ہوگی۔“ وہ دوتے ہوئے کسی سے التجا کر رہی تھی۔ اس آواز پر اس کا دھیان فوراً اس ملازمہ کی طرف گیا جس کی غفلت کی وجہ سے بہترادشاہ ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا تھا اور وہاں توڑ پھوڑ مچا دی تھی۔ یقیناً اس ملازمہ کو اس کی کوتاہی پر سزا دی جا رہی تھی۔ چودھری تھوڑی دیر کے لیے ڈرائنگ روم سے شاید اسی کام کے لیے باہر نکلا تھا کہ ملازمہ کے لیے سزا کا معین کر سکے، اب ہی جب وہ واپس آیا تھا تو اس کے چہرے پر اطمینان تھا۔ انسانیت کے ساتھ وہ اس ناانسانی پر جتنا کڑھتا وہ اپنی گاڑی میں آ بیٹھا۔

”بھگے پر چلو۔ وہاں سے ہم لاہور کے لیے روانہ ہوں گے۔“ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد اس نے مشاہیرم خان کو حکم دیا۔ لاہور جانے کے لیے اپنے ذاتی سامان کو لینے کے علاوہ گاڑی کو بھی ایک بار چیک کرنا ضروری تھا اس لیے بیٹن سے براہ راست روانگی کے بجائے کچھ دیر نورکوٹ میں اپنے بھگے پر کھٹالائی تھی۔

”میں ایک ضروری کام سے فوری طور پر لاہور جا رہا ہوں۔ تم یہاں کے سارے معاملات خود ہی سنبھال لینا۔“ گاڑی کے چلتے ہی اس نے مہدالمان کو فون کر کے اسے براہیت دی۔ پھر کار مشاہیرم خان صاحب لوگوں کے مزاج کو سمجھنے میں ماہر تھا۔ اس وقت بھی اس نے اندازہ لگا لیا کہ شہر یا راجست میں ہے اس لیے بہت مشاقی کے ساتھ مل ایپنڈ میں گاڑی دوڑا دی۔ حیرت رقی سے چلتی گاڑی بھر آباد کے قبرستان کے قریب سے گزری تو وہ کسی معمولی طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس قبرستان میں ایک قبر ایسی تھی جس پر ماہ بانو کے نام کا کتبہ لگا ہوا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں اس قبر میں دفن ہستی کے لیے دعائے مغفرت کی اور راتے کی طرف توجہ مبذول کر لی۔ جانے پچھانے راستوں سے گزرتی اس کی گاڑی بھگے پر پہنچ گئی۔

”دفتر سے فون آیا تھا۔ کوئی سرمد صاحب آپ سے بات کرنے کے خواہش مند تھے۔ شاید کوئی بہت اہم معاملہ تھا۔ انہوں نے آپ پر فز کو اپنا نمبر دے کر براہیت کی قسمی کہ جیسے ہی آپ آئیں، ان سے رابطہ کر لیں۔ آپ سیر نے احتیاطاً فون کر کے مجھے بھی نمبر نوٹ کر دیا تھا کہ اگر آپ آفس کے بجائے یہاں پہنچیں تو آپ کو پتہ چلا۔ اسے دیا جائے۔“ بھگے میں داخل ہوتے ہی بیٹ مین نے اس کے ہاتھ سے بریف کیس لیتے ہوئے پیام دیا تو وہ تھوڑا سا الجھ گیا۔ فوری طور پر اسے بالکل بھی یاد نہیں آ رہا تھا کہ سرمد نامی شخص کون ہے؟

”میں لاہور جا رہا ہوں۔ تم میرا سامان ریڈی کر دو۔“ سرمد کے بارے میں یاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے بیٹ مین کو حکم دیا اور ٹیلی فون کے ساتھ رکھے نوٹ پیڈ پر درج سرمد کے نمبر کو دیکھنے لگا۔ یہ سواگل سرمد کا نمبر تھا۔ بیٹ مین کے سامان چیک کرتے کیس نے والی مہلت میں اس نے اس نمبر پر کال کر کے اپنی اطمینان کو دور کر لینا مناسب سمجھا۔

”میں اسسٹنٹ کمشنر شہر یا عادل بات کر رہا ہوں۔ آپ یقیناً سرمد صاحب بات کر رہے ہیں؟ فرمائیے آپ کو کس طبقے میں مجھ سے فوری طور پر بات کرنی چاہی؟“ رابطہ ہوتے ہی اس نے اپنا احوال کرواتے ہوئے اس سے دریافت کیا جو اب وہ بہت پر جوش انداز میں اپنے فون کرنے کی وجہ بتاتے لگا۔

حادثات و سانحات کی شانکار... تباہ کنی تلاش میں سرگودھا
ماہ بانو کی داستان حیات کے واقعات اگلے ماہ توہج

قدر کی غول گری، قسمت کی پابندی یا مقدر کا کھیل..... ملے اور بچ کر جانے والوں کی کہانی

اسحاق ندوی

گلاب

آئینہ قسط

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے لیکن اس کی باگ ڈور جب یا اثر سماج کے روایتی نظام میں پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں۔ مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں۔ بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے اور یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے۔ ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے۔ جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے۔ پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو۔ محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہو جاتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرننا پڑتا ہے، زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے ... سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں ... کبھی بازی ہلت بھی جاتی ہے۔ گزرا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ لے جاتا ہے ... اس وقت تک پہلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہ چکا ہوتا ہے۔ جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی سلسلہ در سلسلہ۔



مردے زندہ نہیں ہو سکتے لیکن وہ ہو گئی تھی۔ وہ جس کے نام کی قبر پر آباد کے قبرستان میں موجود تھی، اس کے سامنے زندہ سلامت جیتی جاتی حالت میں بیٹھی تھی۔ پہلے کے مقابلے میں اگر اس میں کوئی فرق آیا تھا تو صرف یہ کہ اس کی صحت کافی گہمی تھی اور چہرے پر زردی کی کھنڈی ہو گئی تھی۔

”یہ کیا ہے ماہ بانو؟ تم زندہ ہو تو وہ کون بھی جسے تمہارے نام پر دفن کیا گیا؟ تم اتنے عرصے کہاں غائب رہیں؟“

”آپ کے ان سارے سوالوں کا جواب دینے کے لیے میں آپ کو اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات سناتی ہوں۔“

اس نے پے درپے کیے گئے اس کے سوالوں کے جواب میں کہا اور پھر ذرا سا کھٹکھٹاتی ہوئی روانی سے شروع ہو گئی۔

”آپ کو موتی والا صاحب اور ان کی بیوی کا تو علم ہوگا ہی۔ اس واقعے کی رات موتی والا صاحب کے ڈرائیور سرمد نے مجھے اپنے ایک دوست عامر کے گھر منتقل کر دیا تھا۔ میں عامر کے گھر اس کی بوڑھی کے ساتھ رہنے لگی۔ اسی محلے میں جیلہ نائی ایک لڑکی رہتی تھی۔ اللہ کی مصلحت کہ اُس نے اس بے چاری کو مکمل شخصیت نہیں دی تھی۔ خوبصورت اور ایک گروہ کی اس پر نظر پڑی تو وہ اسے اپنے ساتھ گھر کر لے جانے کے پتھر میں پڑ گئے۔ ایک روز وہ عامر کی ای کی حراج پر کی گئی تو بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ اسی وقت اس نے مجھے اپنی اصلیت سے آگاہ کیا۔ وہ اتنی ڈری ہوئی تھی کہ وہاں اپنے گھر جانے کی بھی ہمت نہیں کر پاتی تھی۔ میں نے یہ ترکیب نکالی کہ اس کا اور اپنا لباس آپس میں بدل لیا اور اس سے کہا کہ میں گلی کے کھڑکیک جاتی ہوں۔ جو لوگ تمہارے پیچھے لگے ہیں وہ دھوکا کھا کر میرے پیچھے لگ جائیں گے، تم اتنے میں چپکے سے اپنے گھر چلی جانا۔ میرا اندازہ صحیح نکلا۔ جیلہ کا پیچھا کرنے والے کپڑوں سے دھوکا کھا کر میرے پیچھے لگ گئے۔ میرا ارادہ تھا کہ کڑ پر پہنچنے کے بعد میں اپنے چہرے پر سے چادر ہٹا دوں گی تاکہ وہ لوگ یہ جاننے کے بعد کہ میں جیلہ نہیں ہوں، میرا پیچھا چھوڑ دیں۔ مگر یہاں مجھ سے اندازہ نہ کی گئی ہوئی۔ اس سے پہلے کہ میں اس پکٹی سی لمبی گلی کے کھڑکیک پہنچیں، ان لوگوں نے مجھ پر ایک بڑی سی چادر ڈال کر مجھے قابو کر لیا اور مجھے اپنے ساتھ اپنے ڈیرے پر لے گئے۔ وہاں جا کر ان پر یہ بات چلی کہ وہ جیلہ کے بجائے کسی اور کو اغوا کر لائے ہیں۔ وہ مجھ گئے کہ ان کے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ مجھے میں ان کے گردوئے مجھے بری طرح مارا پیٹا اور رسیوں سے باندھ کر ایک طرف ڈال دیا کہ جب ہمیں جیلہ لے گی، جب ہی تجھے چھوڑ دیں گے۔ دوسرے دن وہ لوگ

دوبارہ اس محلے میں گئے اور انہیں پتا چلا کہ عامر کا گھر دھماکے سے اڑ چکا ہے اور اس حادثے میں اس کی ماں اور مہمان لڑکی باری گئی ہیں۔ میں تو ان کے قبضے میں تھی اس لیے انہوں نے سمجھ لیا کہ سرمد نے والی لڑکی جیلہ تھی، ان کا گروہ ایک ظالم اور غصہ ور شخص تھا۔ جیلہ کے ہاتھ سے نکل جانے کا اس نے مجھ سے پورا پورا انتقام لیا۔ اس کی مار پیٹ اور تشدد سے گھبرا کر میں اس کا یہ مطالبہ ماننے پر راضی ہو گئی کہ میں جیلہ کے بدلے میں ان کے ساتھ رہ کر کام کروں گی۔ وہ لوگ اگلے سیدھے کپڑوں اور میک اپ کے ذریعے میرا حلیہ بگاڑ کر مجھے اپنے ساتھ اپنے دھندے پر لے جاتے۔ ان لوگوں کی سخت نگرانی اور تشدد سے خوف زدہ ہو کر میرا ذہن اس بری طرح مآؤف ہوا کہ مجھ میں فرار کی ہمت ہی نہیں رہی۔ مگر کچھ دن محل میں نے آپ کو لاہور میں دیکھا، اسی دن مجھ پر یہ حقیقت بھی کھلی کہ گروہ الماس ایک ہندو ہے۔ ان دونوں باتوں نے میرے کھو جانے والے حواس کو بحال کر دیا۔ گروہ نے اپنے گروہ سے بھی اپنی حقیقت چھپا رکھی تھی۔ میں نے ان میں سے ایک کو اس راز سے آگاہ کر دیا اور یوں مجھے اس کی ہمدردیاں حاصل ہو گئیں۔ پچھلی رات وہ اور میں ایک شادی والے گھر میں رکے ہوئے تھے۔ ہم نے منصوبہ بنایا کہ وہاں سے فرار ہو جائیں گے لیکن اتفاق سے مجھے معلوم ہو گیا کہ جس لڑکی کی شادی ہو رہی ہے وہ سرمد کی محبوبہ بنیم ہے اور اسے مجبور کر کے زبردستی اس کی شادی ایک بوڑھے سے کی جا رہی ہے۔ میں نے تسلیم کر لیا کہ ساتھ وہاں سے فرار کروا دیا اور خود ان کی جگہ لے لی۔ میں نے تسلیم کے ہاتھ سرمد کو یہ پیغام بھی بھیجا تھا کہ وہ کسی طرح آپ سے رابطہ کر کے میرے بارے میں اطلاع دے دے۔ صبح پولیس نے تسلیم کے گھر آگئی۔ انہیں خوبصورت اور ان کے قبضے میں موجود ایک اغوا شدہ لڑکی کی تلاش تھی۔ میں یہی بھی کہ سرمد کا آپ سے رابطہ ہو گیا ہے اور آپ نے پولیس کو بھیجا ہے لیکن بعد میں جب ڈی آئی جی صاحب تھانے پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ تو کوئی اور لڑکی تھی جسے تلاش کیا جا رہا تھا۔ میں جانتی تھی کہ ڈی آئی جی صاحب آپ کے کزن ہیں۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ آپ کو میرے بارے میں اطلاع دے دی جائے۔ بس پھر اس کے بعد وہ مجھے اپنے ساتھ یہاں لے آئے۔ لیکن معلوم نہیں سرمد نے آپ سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟ مجھے فکر ہو رہی ہے کہ تسلیم اس کے پاس خیریت سے پہنچ چکی ہے یا نہیں؟ ساری داستان اختصار سے سناتے کے بعد اس نے آخر میں تسلیم کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا۔

”سرمد کا مجھ سے رابطہ ہو گیا تھا۔ تسلیم اس کے پاس پہنچ چکی ہے اور ان دونوں نے نکاح بھی کر لیا ہے۔“ اس کی تسلی کے لیے شہر یار نے اسے اطلاع دی اور پھر سجاد رانا کی طرف متوجہ ہو گیا جو اس ساری گفتگو کے دوران بالکل خاموش بیٹھ رہے تھے۔ شہینا کے ملنے کی امید بندھنے کے بعد ملنے والی بایوسی نے اسے بے حد رنجیدہ کر دیا تھا لیکن پھر بھی وہ کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھالے ہوئے تھے۔

”خوبصورت اور ان کا وہ گروہ گرفتار ہو چکا ہے۔ فرار ہونے والے خوبصورت اور ان کا وہ بھی اس کے گھر سے اغوا لیا گیا ہے۔ ان کا گروہ ابھی ہاتھ نہیں آسکا۔ گروہ کا بھرم ہے لیکن ان تینوں کو بھی اعانت جرم میں سزا دی جائے گی۔“ سجاد نے اسے اپنی طرف رخ کرتے دیکھ کر خود ہی بتایا۔

”ان افراد کی گرفتاری کے علاوہ انسپکٹر رفیق کوکھر سے بھی پوچھ بچھ ضروری ہے۔ وہ ماہ بانو کے کس پر کام کر رہا تھا۔ آخر اس سے اتنی بڑی غلطی کیسے ہوئی کہ اس نے جیلہ کو ماہ بانو تسلیم کر لیا؟ سرمد نے والوں کا پوسٹ مارٹم ہوتا تو یہ بات واضح ہو جاتی کہ جولا کی سری، وہ ماہ بانو نہیں تھی۔“ اس نے ایک لوجیکل نکتہ اٹھایا تھا۔ ایک نارمل لڑکی اور تیسری جنس سے تعلق رکھنے والے فرد کا فرق تو سرسری جائزے میں ہی فوراً واضح ہو جاتا لیکن ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی تھی۔ اس کا یہی مطلب تھا کہ رفیق کوکھر نے بے پروائی دکھائی ہے۔

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں ابھی اس سے بات کرتا ہوں۔“ سجاد رانا نے اس کی تائید کی اور فوراً ہی فون پر کسی سے رابطہ کر کے حکم دیا کہ رفیق کوکھر سے بات کر دینی جائے۔ دو منٹ بعد ہی رفیق کوکھر کا فون آگیا۔

”فرمائیے سراسر میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“ اس نے مودبانہ لہجے میں ان سے پوچھا۔

”بھائی گیٹ کے قریب مجھے میں بلاسٹ میں ماہ بانو نامی جولا کی ہلاک ہوئی تھی، تم نے اس کا پوسٹ مارٹم کروایا تھا؟“

”نہیں سر۔“ اس نے فوراً اثبات میں جواب دیا مگر لہجے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔

”چند منٹ میں وہ پوسٹ مارٹم رپورٹ میرے پاس لے کر آؤ۔“ سجاد نے اسے حکم دیا۔

”اتنی جلدی سراسر رپورٹ تو ریکارڈ میں ڈھونڈنی پڑے گی۔ ویسے خیریت تو ہے سر۔“ وہ اس کا حکم سن کر کچھ اور گھبرا گیا۔ اس کی یہ گھبراہٹ چھٹی کھار تھی کہ شہر یار کا اندازہ درست ہے اور پوسٹ مارٹم کی کارروائی سرمد سے کی ہی نہیں گئی۔

”میری طرف تو سب خیریت ہے لیکن تمہاری خیریت مشکوک ہے۔ مجھے شک ہے کہ اس حادثے میں ہلاک ہونے والوں کا پوسٹ مارٹم سرمد سے کروایا ہی نہیں گیا تھا۔“ سجاد رانا نے سرمد کے جواب دیا۔

”ایسی تو کوئی بات نہیں سر۔“ اس کا لہجہ کمزور تھا پھر بھی وہ اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔

”ایسی ہی بات ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جس لاش کو ماہ بانو نامی لڑکی کے نام سے شناخت کیا گیا تھا اس وقت وہ میرے سامنے زندہ حالت میں بیٹھی ہوئی ہے۔“

”مم۔ مگر لڑکی کے کپڑوں وغیرہ سے تو اس کی شناخت ہو گئی تھی۔“ وہ صبح معنوں میں گھبرا گیا اور کمزوری دیکھ دی۔

”تمہاری اس نا اطمینانی نے ثابت کر دیا ہے کہ تم پولیس کے مجھے میں کام کرنے کے لائق نہیں۔ تم اسی وقت سے اپنے آپ کو فارغ سمجھو۔ تحریری آرڈر بھی جلد تم تک پہنچ جائیں گے۔“ اس نے مجھ سے کہے ہوئے فون بچ دیا۔

”میری اس شخص سے ملاقات ہوئی تھی تو مجھے کافی اطمینان تھا۔ بندہ لگا تھا لیکن نا اطمینانی اس مظاہرے کے بعد پتا چلا ہے کہ میرا اندازہ غلط تھا۔“ شہر یار نے تبصرہ کیا۔

”اب اسے اپنی اس بھائی کی سزا بھگتنی پڑے گی تو معلوم ہو جائے گا کہ پولیس کی جاب کوئی مذاق نہیں۔ اس جیسے نا اہلوں کی وجہ سے ہی تو پولیس کا کلچر بدنام ہو کر رہ گیا ہے۔“ وہ شدید مجھ سے تھکا۔

”رہنمائی سجاد بھائی! اس طرح اپنا نمبر لوڑ کریں گے تو معاملات کیسے سنبھالیں گے۔“ اس نے انہیں غصا کرنے کی کوشش کی اور پھر خاموش تماشائی بنی ماہ بانو کی طرف رخ کرتے ہوئے بولا۔ ”تم گیسٹ روم میں جا کر آرام کرو۔“ وہ اس حکم پر اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ اس کے لاہور پہنچنے تک بھی وہ گیسٹ روم میں ہی گاس لیے وہاں تک کاراستہ معلوم تھا۔

”سجاد اویکھیں میں نے شہینا کی تصویریں نکالی ہیں۔ آپ بدنامی کا خیال چھوڑیں اور یہ تصویریں سارے اخبارات میں چھپوا دیں۔“ ہوسکا ہے کہ تصویریں اخبارات میں چھپیں تو کوئی نہیں ہینٹا کے بارے میں اطلاع دے دے۔“ اس کے باہر نکلنے سے پہلے روم وگروں حالت میں ہاتھ میں بہت سی تصویریں لیے وہاں چلی آئی اور دو ساری تصویریں سینٹرل شیل پر اس انداز میں رکھیں کہ وہ گھری ہوئی۔ ماہ بانو جس کی توجہ خود بخود ہی اس طرف مبذول ہو گئی تھی، تصویروں پر نظر پڑنے پر بدی طرح چوکی اور پھر

ایک تصویر ہاتھ میں لے کر یہ غور اس کا جائزہ لینے لگی۔ جیسے وہ تصویر کا جائزہ لے رہی تھی اس کے چہرے کا رنگ بدلتا جا رہا تھا۔

”مجھے آپ سے تنہائی میں کچھ کہنا ہے نہ! کیا آپ میرے ساتھ گیسٹ روم تک چل سکتے ہیں؟“ بالآخر ایک فیصلہ کن نتیجہ پر پہنچ کر اس نے شہر بار سے درخواست کی۔ وہ کچھ نہ سمجھنے کے باوجود اس کے کچھ کی سنجیدگی کو محسوس کر کے اس کی بات ماننے پر راضی ہو گیا۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے گیسٹ روم تک پہنچے۔

”ہاں بولو... کیا کہنا چاہتی تھیں تم؟“
”میں اس تصویر والی لڑکی کے بارے میں بات کرنا چاہتی تھی۔ وہ لڑکی کون ہے؟“

”وہ تیار بھائی کی بیٹی بیٹیا ہے۔ کچھ روز پہلے اسے خواہر سراؤں کے ایک گروہ نے اغوا کر لیا تھا لیکن اب تک ہم اپنی تمام تر کوشش کے باوجود اسے تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ مگر تم کیوں اس بارے میں پوچھ رہی ہو؟“ اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے اس نے ذرا چونک کر پوچھا۔

”مجھے یقین ہے کہ میں نے اس لڑکی کو دیکھا ہے اور... اور مجھے یہ شک ہے کہ اب وہ زندہ نہیں ہے۔“ اس نے... یہ مشکل اسے یہ اطلاع دی۔ ماڈل ٹاؤن کی کوٹھی میں کھلیا جانے والا خوفی کھیل اس کی یادداشت سے بالکل بھی ٹوٹ نہیں ہوا تھا اور اب دنیا کی تصویر دیکھ کر تو اور بھی شدت سے اس پر اسے واقف کی یاد آئی تھی۔

”تم کس وجہ سے یہ سب کہہ رہی ہو؟ مجھے تفصیل سے پوری بات بتاؤ۔“ شہر بار نے اس سے کہا تو جواباً وہ ایک ایک کر سارا قصہ سناتے لگی۔ ساری بات سن کر وہ تیر کی مانند تیزی سے گیسٹ روم سے باہر نکل گیا۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ اس کے اندر غم و غصہ کی ایک آگ سی بھڑک رہی ہے جس میں وہ سب کچھ جلا کر بھس کر دے گا۔

☆☆☆

مشاہیر خان گاڑی کو اڑاتا ہوا ماڈل ٹاؤن کی طرف لے جا رہا تھا پھر جی اے ٹی نہیں ہو رہی تھی۔ بے قراری اس قدر تھی کہ دل چاہتا تھا، پک چمکتے ہیں یہ راستے ہو جائے۔ ماہ بانو سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں اس نے خود ہی سندھ سندھ رام کی کوٹھی جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ فی الحال وہ سجاد رانا کو قاتی بڑی بات بتانے کی ہمت نہیں کر سکا تھا اور چاہتا تھا کہ پہلے خود تصدیق کر لے۔ ان کی زبانی اسے سندھ رام کے بارے میں معلومات تو پہلے ہی حاصل ہو گئی

تھیں لہذا یہ اطمینان تھا کہ وہ اور مشاہیر خان مل کر وہاں موجود افراد کو آرام سے سنبھال لیں گے۔ سندھ رام جیسے معروف شخص کا تو اس وقت کوٹھی پر موجود ہونے کا امکان نہیں تھا۔ اسے بھی اصل میں سوئی نام کے اس کردار سے دودھ ہاتھ کرنے تھے جس کا تذکرہ سجاد رانا نے بھی کیا تھا اور ماہ بانو نے بھی۔

گاڑی سندھ رام کی کوٹھی کے سامنے جا کر رکی تو مشاہیر خان نے اس کے اشارے پر پارن دیا۔ دو تین بار بارن دینے کے باوجود اندر سے کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا۔

”اتر کر تیل بجاؤ۔“ اس نے حکم دیا۔ مشاہیر خان نے حکم کی تعمیل کی مگر فن دہانے پر اسے اندر سے کھٹی پیچھے کی آواز سنائی نہیں دی۔ جانے کھٹی خراب تھی یا بند کر دی تھی۔ اس نے لوہے کے دروازے کے کندھے کو بجایا۔ یہ زوردار دستک بھی بے کار تھی۔ دوسری طرف ایسی خاموشی تھی گویا کوٹھی خالی پڑی ہو۔

”دوسری طرف کود کر اندر سے کنڈی کھولو۔“ وہ جو گاڑی میں بیٹھا ہوا اس کی کارروائی دیکھ رہا تھا، مغز بھر کر نیچے اتر آیا اور حکم دیا۔ مشاہیر خان نے حکم کی تعمیل کی اور گیسٹ کے دوسری طرف کود کر ڈیڑھ دروازہ کھول دیا۔ وہ فوراً کھلے دروازے سے اندر داخل ہوا۔ اسی وقت اس کی نظروں نے نسوانی کپڑوں کی جھلک دیکھی۔ وہ یقیناً کوئی عورت تھی جو کوٹھی کی اندرونی عمارت سے نکل کر بائیں جانب کی پستی کی گلی میں دوڑتی ہوئی کوٹھی کے قریب سے جا رہی تھی۔

”تم اندر دیکھو، میں پیچھے جاتا ہوں۔“ اس نے مشاہیر خان کو جوابی پشت کا منظر نہیں دیکھ سکا تھا، تیزی سے حکم دیا اور خود بھی اسی گلی کی طرف دوڑ گیا۔ گلی پار کر کے وہ کوٹھی کے عقب میں پہنچا تو وہ عورت پچھلی دیوار پھلانگ کر سندھ رام کی کوٹھی کی عقب سے جڑی ہوئی دوسری کوٹھی میں اترنے کے چکر میں تھی۔ اس نے جھپٹ کر اس کی بائیں ٹانگ بٹور کر پھینکی۔ ٹوٹل میں عورت نے اپنی دائیں ٹانگ چلائی۔

شہر بار کے چہرے پر اس کی ٹانگ کی ضرب کی ٹیکنیک چونکہ وہ دونوں ہاتھوں کی مدد سے دیوار سے لگی ہوئی تھی اور اس کی ایک ٹانگ بھی اس کی گزشت میں تھی اس لیے ضرب زیادہ زوردار نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ جھٹکیا اور پورا زور لگا کر عورت کو کھینچا۔ اس بار وہ دیوار پر اپنے ہاتھوں کی گزشت قائم رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکی اور دھپ سے زمین پر آگری لیکن نیچے گرتے ہی اس نے خود کو حیرت انگیز پھرتی سے سنبھالا اور اچھل کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ اس وقت شہر بار کو

ادراک ہوا کہ کوئی عورت نہیں بلکہ لہجہ اسے جس کا قد چھ فٹ سے ایک آدھ انچ ہی کم ہوگا۔ سیدھے کھڑے ہونے کے بعد وہ بس ٹیل بھر کے لیے ہی رکھا ہوگا پھر فوراً ہی اس پر حملہ کر دیا۔ اس کے حملہ کرنے کا انداز ایسا تھا کہ شہر بار نے فوراً ہی جانچ لیا کہ وہ جوڑو کے فن میں ماہر ہے۔ دائیں جانب جھک کر اس نے خود کو اس کے وارے سے بچانے کی کوشش کی لیکن یہاں اس سے اندازے کی غلطی ہو گئی۔ حملہ آور نے بائیں طرف حملے کا ذرا دے کر اس کے دائیں شانے پر کھڑی پھٹکی کا زوردار وار کیا تھا۔ دائیں شانے پر لگنے والی یہ ضرب اتنی زوردار تھی کہ اسے لگا کہ اس کے شانے پر لگنے والی یہ ضرب انسانی پھٹکی کے بجائے لوہے کی کسی مضبوط راڑ سے لگائی گئی ہو۔ وہ افراد جنہیں اس نے ساری زندگی سڑکوں پر تالیاں بجا بجا کر بھیک مانگتے دیکھا تھا، ان میں سے کوئی لڑائی بھڑائی کے فن میں اتنا ماہر بھی ہو سکتا ہے، اسے یہ جان کر حیرت سی ہوئی لیکن اس وقت اس حیرت کا اظہار کرنے کی فرصت نہیں تھی۔ اپنے شانے پر لگنے والی ضرب سے فوراً سنبھلتے ہوئے اس نے اپنی بائیں ٹانگ چلائی جو حملہ آور کے پہلو میں لگی۔ ضرب زوردار ہونے کے باوجود وہ اسے آرام سے سہ گیا اور خود بھی اپنی بائیں ٹانگ سے ایک بار پھر اس کے شانے کو ٹوٹا نہ بنایا۔ وہ بارہ اسی جگہ چوٹ کھا کر شہر بار ذرا سا لڑکھا گیا۔ اس نے خود ایک زمانے میں مارشل آرٹ سیکھا تھا لیکن مٹی زندگی میں اس آرٹ کو آزمانے کی اسے بھی ضرورت نہیں پڑی تھی جبکہ سامنے والے کی پھرتی، قوت اور مشاقی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اس فن میں پوری پوری مہارت رکھتا ہے۔ شانے پر ضرب لگانے کے بعد بھی وہ رک نہیں بلکہ منہ سے ایک زوردار آواز نکالتے ہوئے ایک بار پھر اس پر حملہ آور ہوا اور اس کے دونوں پہلوؤں میں اپنے دونوں ہاتھوں کی پھٹکیوں سے ضرب لگائی۔ درجہ کی طرح کاٹ دینے والی یہ ضرب کھا کر اس کے منہ سے ”اوغ“ کی آواز نکلی اور وہ زمین پر گر گیا۔ گرتے گرتے البتہ اس نے حملہ آور کے بالوں کو پکڑ کر اس کا سر زمین پر مارنے کی کوشش ضرور کی تھی لیکن نتیجہ میں اس کے بال اس کے ہاتھ میں رہ گئے اور وہ حق لگا۔ شہر بار کے ہاتھوں میں آجانے والے بال دراصل ایک وگ تھی جس کے سر سے الگ ہو جانے کے بعد حملہ آور کا مردانہ ہیئر اسٹائل دیکھا جا سکتا تھا۔ کرخت چہرے پر عورتوں والے میک اپ اور لباس کے ساتھ یہ مردانہ ہیئر اسٹائل بہت عجیب لگ رہا تھا اور اس کی جنس ایک بار پھر مشکوک ہو گئی تھی۔ وہ یقیناً خوبہ سرا کے روپ میں کوئی مرد تھا

جو سر سے وگ الگ ہو جانے پر ذرا سا ٹھٹھا کر ضرور مگر پھر رے بغیر گرے ہوئے شہر بار کے پیٹ میں ایک زوردار ضرب لگائی اور ایک بار پھر پچھلی دیوار کی طرف دوڑ گیا۔ دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف پھلانگتے ہیں اس نے بندر کی سی بھرتی دکھائی۔ جب تک شہر بار سنبھل کر اس کے پیچھے دوڑتا، وہ دوسری طرف کود چکا تھا۔ اس کی پیروی میں وہ بھی دیوار پر چڑھا مگر اس دوران وہ دوڑتا ہوئی قہقی کوٹھی کے گیٹ تک پہنچ چکا تھا۔ وہ جب اس کوٹھی میں کودا تو وہ گیٹ سے باہر نکل چکا تھا۔ اس کے تعاقب میں اس نے بھی گیٹ کا رخ کیا۔ آدھے راستے میں ہی اسے باہر سے کسی گاڑی کا انجن اشارت ہونے کی آواز سنائی دی۔ وہ گیٹ پر پہنچا تو اسے باہر سے بند پایا۔ جب تک اس نے گیٹ پر چڑھ کر دوسری طرف چلائی لگائی، گاڑی بہت دور جا چکی تھی۔ فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ گاڑی کا نمبر نوٹ نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن اس نے یہ ضرور دیکھ لیا تھا کہ وہ سلور گرے لکڑی آلتو تھی۔ اس آلتو کا تعاقب کرنے کے لیے گاڑی کی ضرورت تھی اور اس کی گاڑی سندھ رام کی کوٹھی کے سامنے کھڑی تھی۔ یہاں سے اس تک پہنچنے کے لیے پوری گلی پار کر کے ایک لمبا چکر کاٹنا پڑتا۔ اس راستے کو اختیار کرنے کے بجائے وہ جس راستے سے آیا تھا، اسی پر واپس پلٹا اور قہقی دیوار پھلانگ کر سندھ رام کی کوٹھی میں پہنچ کر مین گیٹ کی طرف بھاگا۔ اس دوران البتہ اس نے یہ نوٹ کر لیا تھا کہ کوٹھی کے اندر وہی صحنے میں آگ لگی ہوئی ہے۔ شاید مشاہیر خان اس آگ کی وجہ سے ہی مصروف ہو گیا تھا جو اس کی طرف ہلٹ کر نہیں آیا تھا۔ وہ خود اس آگ کو نظر انداز کر کے گیٹ پر کھڑی اپنی گاڑی تک پہنچا۔ وہ لوگ ایسی صورت حال میں کوٹھی کے اندر داخل ہوئے تھے کہ مشاہیر خان کو گاڑی لاک کرنے یا چالی لٹکانے کا خیال نہیں آیا تھا۔ لپک کر گاڑی میں سوار ہونے کے بعد اس نے اسے اشارت کیا اور نقل اسپینڈ میں اس جانب دوڑا دیا جس طرف سلور گرے آلتو لگی تھی لیکن تمام تر پھرتی کے باوجود اسے دیر ہو چکی تھی۔ کوشش کے باوجود وہ آلتو کی ڈھول کوٹھی نہیں پاسکا اور تھوڑی دیر اور گری سڑکوں پر پہنچنے کے بعد واپس سندھ رام کی کوٹھی کا رخ کر لیا۔ وہاں کا نقشہ بدلا ہوا تھا۔ فائر بریگیڈ کی گاڑیاں کوٹھی کے گیٹ کے سامنے کھڑی صاف نظر آ رہی تھیں اور اس کا حملہ کوٹھی میں لگی آگ بجھا رہا تھا۔

”آپ کہاں چلے گئے تھے سر؟ میں آپ کے موبائل پر رابطہ کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن آپ نے کال ہی ریسیو نہیں کی۔“ اسے دیکھتے ہی مشاہیر خان لپک کر اس کے قریب

آیا۔ اس کی بات سن کر اس نے اپنی مصیبتیں چھپھرائیں۔
موبائل موجود نہیں تھا۔ شاید وہ جتنی جانب اس شخص سے لڑائی
کے دوران اس کی جیب سے نکل گیا تھا۔

”کوئی کے اندر چھ لاشیں ہیں۔ پانچ افراد کو تو لگتا ہے
کہ کوئی زہر پٹی شے دے کر مارا گیا ہے۔ جس کمرے میں
لاشیں پائی گئی ہیں، وہیں شراب کی بوتلیں اور گلاس بھی موجود
ہیں۔۔۔ جبکہ جیسے شخص کو سر پر کوئی بھاری ضرب لگا کر ہلاک کیا
گیا ہے۔ میں آپ کو فوری طور پر ان لاشوں کے بارے میں
اطلاع دیتا لیکن وہاں ایک کمرے میں زبردست آگ لگی
ہوئی تھی۔ میں نے کوشش کی کہ پہلے اس آگ کو بجھا دوں لیکن
مجھے کامیابی نہیں ہوئی اور آگ مزید بھڑک اٹھی۔ مجھے مجبوراً
فائر بریگیڈ والوں کو فون کرنا پڑا۔ آپ سے تو رابطہ ہی نہیں
ہو رہا تھا ورنہ میں پہلے آپ سے اجازت لیتا۔ اب بھی میں
نے اس کمرے کا دروازہ بند کر دیا ہے جس میں لاشیں ہیں
تاکہ آگ بجھانے والے عملی ان لاشوں پر نظر نہ پڑ سکے۔
اب آگے آپ بتائیں کہ کیا حکم ہے؟“ مشاہیرم خان نے
اسے مکمل رپورٹ دی۔

”تم ذرا جھجھکی طرف جا کر چیک کرو کہ وہاں میرا
موبائل تو نہیں گرا ہوا؟ میں اس دوران لاشوں کو دیکھتا ہوں۔
کس کمرے میں ہیں لاشیں؟“ اس نے اسے حکم دینے کے
بعد اندر کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”وہ جو درمیان بائیں پر پہلا کمرہ ہے۔“ مشاہیرم خان نے
بتایا جسے سن کر وہ سر ہلاتا ہوا اس کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ فائر
بریگیڈ کا عملہ اپنا کام کر رہا تھا۔ ان پر توجہ دیے بغیر وہ اندر کی
طرف بڑھتا چلا گیا۔

”اے بھائی! اندر کہاں جا رہے ہو؟ اندر آگ لگی ہے،
باہر ہی رہو۔“ ایک آدمی نے بلند آواز میں اسے ٹوکا۔

”شٹ اپ۔ اپنے کام سے کام رکھو۔“ جواباً وہ غرایا
اور قدموں کو روکے بغیر آگے بڑھتا چلا گیا۔ اس کا انداز ایسا
تھا کہ اسے ٹوکنے والا دیک کر چپ بوریا۔ اس نے مشاہیرم
خان کے بتائے ہوئے کمرے کے سامنے پہنچ کر دروازے کا
لٹوٹھا کر دروازہ کھولا۔ وہ ایک ڈرائنگ روم نما کمرہ تھا جس
میں سچ سج سج عدد لاشیں موجود تھیں۔ لاشوں کی صورت میں
وہاں موجود افراد میں سے چار غولہ سرائے جن کی لاشیں
صوفوں پر ہی آدھی ترچھی پڑی ہوئی تھیں۔ انہی لاشوں کے
ساتھ ایک ادھیڑ عمر آدمی کی بھی لاش تھی۔ اس کے انداز سے
کے مطابق جیتی لباس میں ملیوں وہ شخص سیٹھ سندھ رام ہو سکتا
تھا۔ ان افراد کے آس پاس لڑکھتے ہوئے شراب کے جام نظر

آ رہے تھے جبکہ میز پر چوتھائی سے بھی کم بھری ہوئی شراب کی
بوتلی سے علاوہ ایک بھرا ہوا جام بھی موجود تھا۔ اس منظر کو دیکھ
کر سب سے پہلا خیال یہی آیا تھا کہ کسی نے ان افراد کو
زہر پٹی شراب پلا کر ہلاک کیا ہے۔ یہ شخص وہی ہو سکتا تھا جس
سے ابھی ٹھوڑی دیر پہلے اس کا ٹکرا ہوا تھا۔

چھٹی لاش دروازے کے قریب ہی پڑی ہوئی تھی۔ اس
کی کھوپڑی پیچھے سے بری طرح بھردھن تھی اور اس بھردھ
جسے سے خون اور مغز کا مفلج باسا بہہ کر قالین میں جذب ہو رہا
تھا۔ لاش کے قریب ہی سنگ مرمر کا ایک خون آلود بھاری ٹبل
دان پڑا ہوا تھا جو جتنی طور پر آگ لگتی تھا۔ کمرے کا نقشہ دیکھ کر
جو بات اسے سمجھ آ رہی تھی، وہ وہی تھی کہ کچھ دیر ٹبل کو بھی سے فرار
ہونے والا شخص یقیناً ان تمام افراد کے لیے شاد تھا جس نے
بہت آرام سے ان لوگوں کو دھوکے سے شراب میں زہر ملا کر
پلا دیا۔ چھٹا کمرے والا شخص اپنے حلیے سے چونک رہا تھا
جسے یقیناً بھانے سے کمرے میں بلایا گیا تھا اور پھر پیچھے سے
دار کر کے اس کی کھوپڑی کو پاش پاش کر دیا گیا۔ ٹبل کا ٹھکر
یقیناً ان افراد کے سینوں میں موجود رازوں کو پوشیدہ رکھنا
تھا۔ وہ سارے ایک حتمی کے چنے بٹے تھے جو ایک ساتھ ہی
دوسرے جہان پہنچا دیے گئے تھے۔

”فائر بریگیڈ والوں نے آگ بجھا دی ہے سرائے
کے ذریعے علاقے کی پولیس کو بھی علم ہو گیا ہے کہ اس کوئی
میں کوئی حادثہ پیش آگیا ہے۔ وہ لوگ یہاں پہنچ چکے
ہیں۔“ اس نے ابھی کمرے کا سرسری سا جائزہ ہی لیا تھا کہ
مشاہیرم خان اس کے موبائل سمیت واپس آگیا اور
اطلاعات فراہم کیں۔

”تم ان سے جا کر بات کرو، میں سجاد بھائی کو فون کرنا
ہوں۔“ اس نے مشاہیرم خان کا اپنی طرف بڑھایا ہوا موبائل
تھام کر اسے حکم دیا تو وہ فوراً ہی کمرے سے باہر نکل گیا جبکہ وہ
خود سجاد رانا سے رابطہ کرنے لگا۔

”شہر بارا تم ایک جاگ کہاں چلے گئے ہو یا؟“ رابطہ تلے
ہی سجاد رانا نے اس سے پوچھا۔

”میں ماڈل ٹاؤن میں سیٹھ سندھ رام کی کوٹھی پر ہوں
سجاد بھائی! پلیز آپ بھی فوراً یہاں آجائیں۔“

”لیکن تم وہاں کیا کر رہے ہو؟“ وہ حیران ہوئے۔
”مجھے شینا کے مسئلے میں ایک کلیڈ ملا تھا اسی لیے میں
یہاں آیا تھا مگر یہاں تو معاملہ بہت ہی گڑبڑ ہے۔ میں آپ کو
فون پر زیادہ تفصیلات نہیں بتا سکتا۔ بس آپ آجائیں اور
ساتھ ہی اپنے اعتماد کے کسی آفیسر کو بھی یہاں آنے کا کہہ

دیں۔ میں فون بند کر رہا ہوں، مجھے یہاں موجود پولیس
والوں سے بھی نمٹنا ہے۔“ اس نے جلدی جلدی کہنے کے بعد
فون بند کر دیا۔ علاقے کے تھانے کا ایس ایچ او کمرے کا بند
دروازہ کھول کر اندر آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے ہی مشاہیرم خان
بھی تھا۔

”یہ کیا ہے تو سیٹھ سندھ رام ہیں اور یہ ان کی ملازمہ
سوئی۔ انہیں کسی نے قتل کیا؟“ وہ جو اپنے علاقے کے ایک
صاحب حیثیت شخص کی کوٹھی میں کٹنے والی آگ کی اطلاع سن
کر یہاں تک آیا تھا، لاشیں دیکھ کر بوکھلا گیا اور شہر یار سے
پوچھنے لگا۔

”یہ معلوم کرنا تو آپ کا کام ہے۔ ویسے میں آپ کو بتا
دوں کہ اس معاملے کو دیکھنے کے لیے آپ کے ڈی آئی جی
سجاد رانا صاحب خود یہاں آ رہے ہیں۔“ اس نے ایس ایچ او
کو بے نیازی سے جواب دیا مگر خود اس کے اندر بڑا شدید
اختیار اور بے چینی تھی۔ یہاں کے حالات دیکھ کر باہر باؤ کی
شینا کے متعلق وہی ڈی اطلاع کافی حد تک درست لگنے لگی تھی۔
اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اگر اس کے خاندان پر سچ سچ اتنا بڑا
سانحہ گزر چکا ہے تو وہ سارے لوگوں کو اس بارے میں کس
طرح اطلاع دے گا؟ ابھی تو اسے سجاد رانا سے سامنا کرنے
کے خیال سے ہی پریشانی ہو رہی تھی لیکن ان سے کچھ چھپانا
بھی ممکن نہیں تھا۔

”میں ایکپرس کو کال کرتا ہوں تاکہ وہ جائے وقوعہ
سے ثبوت وغیرہ جمع کر لیں۔“ یقیناً باہر مشاہیرم خان نے ہی
اسے آگاہ کر دیا ہوگا کہ اندر موجود شخص کی کیا حیثیت ہے۔
مشاہیرم خان کی اطلاع پر شاید اس نے بھر وسانہ کیا ہو لیکن
اب ڈی آئی جی صاحب کے وہاں پہنچنے کی اطلاع سن کر
بالکل ارٹ ہو گیا تھا چنانچہ اپنی سینٹ سنبھالنا ہوا تیزی سے
باہر پکا۔

”تم میرے ساتھ آؤ۔“ ایس ایچ او کمرے کے
دروازے پر اپنے ایک سپاہی کو کھڑا کر گیا تھا چنانچہ یہاں
رکے رہنے کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے اس نے باہر کی طرف
قدم بڑھا لے اور ساتھ ہی مشاہیرم خان کو بھی اپنے ساتھ آنے
کا حکم دیا۔ اب اسے اس سنسور روم کی تلاش تھی جہاں سے ماہ
بانو کی اطلاع کے مطابق وہ خانے کے لیے رستہ جاتا تھا۔ جلد
ہی وہ اس سنسور روم اس کی نظروں میں آ گیا۔ یہ غور دیکھنے پر
اسے ٹانگڑے درمیان وہ معمولی سا فرق بھی نظر آ گیا جو
دراصل وہ خانے تک پہنچنے کے لیے بنا گئے تھے خفیہ راستے کی
نشان دہی کرتا تھا۔ اس کے اشارے پر مشاہیرم خان نے درز

میں انگلیاں ڈال کر اس جگہ کے ٹانگڑے کو روک کر اوپر کی طرف
کھینچا تو اس حصے کے ٹانگڑے کی دھکن کی طرح اوپر کی طرف
اٹھتے چلے گئے۔ فرش میں پیدا ہونے والے اس خلا سے نیچے
کی طرف جاتی سیر حیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ وہ اور مشاہیرم
خان آگے پیچھے ان سیر حیاں سے گزرتے نیچے پہنچ گئے۔

سیر حیاں کے قریب ہی کمرے کا دروازہ تھا۔ اس نے اس
دروازے کو کھولا تو ماہ بانو کی بتائی باتوں میں سے ایک اور
بات کی تصدیق ہو گئی۔ اس ہال نما کمرے میں بہت ساری
کرسیاں موجود تھیں اور ایک چوڑے پر سچ سچ ایک بڑی سی
مورتی رکھی تھی۔ وہ کرسیوں کے درمیان میں سے گزرتا ہوا
چوڑے کے قریب پہنچا اور اس مورتی کا جائزہ لینے لگا۔
بھیا تک خند و خال والی وہ مورتی بے حد عجیب سنوڑی ہونے کے
باوجود دل میں کراہیت کا احساس پیدا کر رہی تھی۔ مورتی کے
گھٹے میں اور کانوں میں موجود سونے کا زیور اس کے لیے اس
کے پیار یوں کی عقیدت کا ثبوت تھا۔ یہ سوچ کر کہ اس بھیا تک
مٹی کی مورتی کے قدموں میں شوخ و چنگل، زندگی سے بھرپور
شینا کو بھیجتے چڑھا دیا گیا تھا، اس کا دل کاٹ کاٹ اٹھا اور
آنکھیں ڈبڈبایں لگیں۔ اسی وقت اس کے موبائل کی
تھر تھر اہٹ نے کوئی کال آنے کا اشارہ دیا۔ اس نے موبائل
کی اسکرین پر آنے والا سجاد رانا کا نام پڑھا اور خود کو سنبھالنے
ہوئے کال ریسیو کر لی۔

”تم کہاں ہو شہری؟ میں پہنچ گیا ہوں مگر تم نظر نہیں
آ رہے۔“

”میں یہیں ہوں، ابھی آپ کے پاس آتا ہوں۔“ اس
نے انہیں جواب دیا اور پھر واپس اوپر جانے والے راستے کی
طرف بڑھ گیا۔ مشاہیرم خان اس کے پیچھے تھا۔ وہ لوگ
لاشوں والے کمرے تک پہنچے تو دیکھا ایکپرس کی ٹیم بھی پہنچ
چکی ہے۔ وہ لوگ لاشوں کی تصویریں لیتے، ایف بی اٹھانے
اور موٹے پر موجود تمام اہم اشیاء اپنی سکڑی میں لینے کا کام
کر رہے تھے۔ علاقے کے تھانے کا ایس ایچ او وہاں موجود
نہیں تھا اور ایک دوسرے شخص کی زیر نگرانی یہ سارا کام ہو رہا
تھا۔ اس شخص کو دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ وہ سجاد رانا کا بندہ ہے۔

”ان ناچوں افراد کے منہ سے کڑوے باداموں کی سی
بو آ رہی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں سانکا نڈرے کر
مارا گیا ہے۔ جتنی بات پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سامنے آنے
کے بعد ہی کہی جا سکے گی۔“ نگرانی کرنے والے آفیسر نے
اپنی رائے کا اظہار کیا۔ اس رائے کو سن کر وہ لوگ چونک
گئے۔ ان افراد کی موت زہر خورانی سے ہوئی ہے، یہ تو سمجھ

آئی گیا تھا لیکن سنا سنا کر اس کا استعمال معاملے کو مزید گھیر کر رہا تھا۔ اس سرخ لاش زہر کا استعمال اتنا عام نہیں تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ قاتل کوئی معمولی شخص نہیں۔

”یہ تین افراد وہی ہیں جن کے بارے میں شک تھا کہ انہوں نے شہینا کو اغوا کیا ہے۔ ان تینوں افراد کو پولیس شہر بھر میں ڈھونڈ رہی اور یہ یہاں چھپے بیٹھے ہوں گے، ذرا اندازہ نہیں تھا۔“ وہ سجاد رانا کے قریب جا کر کھڑا ہوا تو اس نے تین خوبہ سراؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے دھیمی آواز میں بتایا۔ آواز دھیمی ہونے کے باوجود اس کے لہجے کا پہچان محسوس کیا جاسکتا تھا۔

”مجھے سے غلطی ہو گئی کہ میں نے سندھ رام کی حیثیت دیکھتے ہوئے اس کی بات پر اعتبار کر لیا۔ اگر میں اسی وقت اسے اور اس کی ملازمہ کو اغوا کران سے پوچھ چکے ہوتا تو شہینا کا پیغام معلوم ہو جاتا۔“ اپنے دائیں ہاتھ کی سبکی بائیں ہاتھ کی پٹھلی پر مارتے ہوئے اس نے غصے کا اظہار کیا اور نفرت بھری نگاہ سے سندھ رام کی لاش کو دیکھا۔

”میں سپاہیوں کو گولی کی تلاشی لینے کا حکم دیتا ہوں۔ جس طرح اس شخص کی لاش ان خوبہ سراؤں کے ساتھ ملی ہے، اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے درمیان بہت قریبی مراسم تھے۔ جب یہ لوگ اس گولی میں موجود ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ شہینا بھی یہیں نہیں ہوگی۔“ وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے جوش سے باہر کی طرف لپکا۔

”ایک منٹ سجاد بھائی! آپ رک جائیں۔ میں یہ کام کرتا ہوں۔“ اس نے فوراً ایک کرسچاؤ کا بازو پکڑتے ہوئے اسے روکا تو وہ ٹھٹک سا گیا مگر اس کی بات مان لی۔

”میرے خیال میں آپ دوسرے کمرے میں چل کر بیٹھیں۔ میں خود بھی وہیں آتا ہوں۔“ اسے امید بھی تھی لیکن سجاد نے یہ بات بھی خلاف توقع مان لی اور کچھ گم سم سے انداز میں کمرے سے باہر نکل گیا۔

”آفسیر! یہاں سے فارغ ہو کر تم اپنی مہم کو پیچھے نہ خانے میں لے جانا۔ وہاں سے تم لوگوں کو خصوصاً خون کا کوئی نمونہ حاصل کرنے کی کوشش کرنی ہوگی۔ مجھے امید ہے کہ وہاں موجود چوہترے یا مورتی پر سے تمہیں یہ چیز مل سکتی ہے۔“ سجاد رانا کے باہر نکلنے کے بعد وہ پولیس آفسر سے مخاطب ہوا اور اسے حکم دینے کے ساتھ ساتھ تھوڑے خانے تک پہنچنے کا راستہ بھی سمجھا دیا۔

”جس کمرے میں آگ لگی ہے اس کے بارے میں کچھ معلوم ہوا کہ وہاں کیا تھا؟ وہ کمرہ کس مقصد کے لیے استعمال

ہوتا تھا؟“ باہر نکلنے نکلنے اس نے پلٹ کر آفسر سے پوچھا۔ ”میں سرا میں نے معلوم کیا ہے۔ آگ اصل میں ایک نہیں، دو کمروں میں لگی تھی اور باقاعدہ بیڑوں چمک کر لگائی گئی تھی۔ ویسے تو آگ نے سب کچھ جلا کر خاکستر کر دیا ہے لیکن کمروں کا جائزہ لینے پر اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک کمرہ ایڈمرل اور دوسرا اسٹڈی روم تھا۔“ آفسر نے بتایا تو وہ سر ہلاتا ہوا باہر نکل گیا۔ یہ اطلاع بھی بڑی معنی خیز تھی۔ عموماً لوگ اپنی رستل اشیاء خصوصاً ڈائریز اور کاغذات وغیرہ انہی دو جگہوں پر رکھتے ہیں۔ ان دونوں جگہوں پر آگ لگنے جانے کا مطلب تھا کہ سندھ رام کی زندگی میں کوئی ایسا حادثہ جس کو چھپانے کے لیے یہ قدم اٹھایا گیا۔ اس واقعے نے اسے اللہ آباد کے مدرسے کی یاد دلا دی تھی۔ وہاں بھی کچھ مشکوک چیزوں کو اسی طرح آگ لگا کر ان کا وجود چھپانے کی کوشش کی گئی تھی۔ وہ ایک سپاہی کی نشان دہی پر اس کمرے میں پہنچا جس میں سجاد رانا اس کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے چلا گیا تھا۔ وہ ایک مومنے کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے بیٹھا نظر آیا۔ اس کے چہرے پر پریشانی اور دکھ کا جال سا پھیلا ہوا تھا۔ اس کی آہٹ یا کراہنے نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھیں بے حد سرخ ہو رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ضبط گریہ کی کوشش کرتا رہا ہو۔

”مجھے شہینا کے بارے میں بتاؤ شہر یار... اس کے ساتھ کیا ہوا ہے؟... وہ بے ہوش یا نہیں؟“ آخری سوال کرتے ہوئے اس کی آواز کا پ گئی تھی۔ سجاد رانا نے پولیس کی ملازمت میں برسوں گزارے تھے اور اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ تجربہ کار تھا۔ اس لیے اس کے رویے سے یہ بھانپ لینا کہ کوئی بہت ہی غیر معمولی واقعہ پیش آچکا ہے، اس کے لیے مشکل نہیں تھا۔ شاید شہر یار... کے مشورے پر وہ سب کے درمیان سے بہت کراس الگ تھلک کمرے میں آکر بیٹھے پر بھی اسی لیے راضی ہو گیا تھا کہ اسے خود کو کمپوز کرنے کے لیے تھوڑی سی سہلت درکار تھی۔

”فی الحال کچھ کہنا بہت مشکل ہے۔ کوئی میں ابھی تک ایسا کوئی سرا نہیں ملا ہے کہ شہینا کی یہاں موجودی کا ثبوت مل سکے۔ البتہ میں ماہ بانو کی جس اطلاع کو سن کر یہاں پہنچا تھا، اس اطلاع کے ساتھ جزی بہت سی باتوں کی تصدیق ہو گئی ہے اور یوں لگتا ہے کہ ہمارے بدترین خدشات درست ثابت ہوں گے۔“ وہ آہستہ آہستہ سارے حقائق ان کے سم میں لاتا چلا گیا۔

”میری بیٹی کا خون رانگاں نہیں جائے گا۔ میں اس کے

قاتلوں کو زمین کی تہ سے بھی کھینچ نکالوں گا۔“ ساری بات سن کر وہ ایک جوش کے عالم میں بولا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا وہاں سے باہر نکل گیا۔ اس کے کمرے سے باہر نکلنے سے قبل شہر یار نے اس کی آنکھوں کا رنگ دیکھا تھا۔ وہ پہلے سے بھی کہیں زیادہ سرخ ہو گئی تھیں اور یوں لگ رہا تھا کہ کسی بھی لمحے ان آنکھوں سے خون چھٹک پڑے گا۔

☆☆☆

”بی بی! کھانا تیار ہے۔ آپ کے لیے یہیں لے آؤں یا ڈائننگ ٹیبل پر لگا دوں؟“ وہ ایک کتاب کا پوچی سرسری سا مطالعہ کر رہی تھی کہ ملازمہ دستک دے کر اندر داخل ہوئی اور اس سے پوچھا۔ وہ سجاد رانا کے گھر میں ہی تھی۔ یہاں اس کا ایک مہمان کی طرح خیال رکھا جا رہا تھا لیکن یہ عزت اور مہمان نوازی اسے کسی پتنگ کی طرح ڈولنے اپنے مستقبل سے بے فکر نہیں کر سکتی تھی۔ اسے تو نو گاؤں کے بارے میں کچھ خبر تھی اور نہ ہی بے بے اور ایسا کے بارے میں۔ دارالامان میں پیش آنے والے واقعے کے بعد وہ محتاط ہو گئی تھی کہ فون پر ان لوگوں سے رابطہ کرنے کی کوشش نہ کرے۔

اس وقت بھی وہ صرف ایک فون کال کرنے کے نتیجے میں بری طرح پھنس گئی تھی۔ اگر دارالامان کا چوکیدار اپنی جان پر کھیل کر اس کے اغوا کے لیے آنے والوں کو نہ روکتا تو وہ چودھری افکار کے پاس پہنچ چکی ہوتی۔ دولت کے نشے میں پڑا ہوں گے اس کی سچائی سے بچنے کے لیے وہ انہوں سے دور اور دھڑا دھڑا جھٹکتی پھر رہی تھی۔ آہلہ پائی کے اس سفر میں گرد و لباس کے ٹھکانے پر گزرنے کیلئے وہ اور ذلت آمیز شب و روز بھی شامل تھے۔ قسمت اسے اس قید سے تو نکال لائی تھی لیکن انہوں تک پہنچنے کی راہ اب بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ شہر یار سے اس موضوع پر بات کرنا چاہتی تھی لیکن وہ بھی اسے دستیاب نہیں تھا۔ جب سے اس نے اسے شہینا کے بارے میں اطلاع دی تھی، اس کا کچھ پتا ہی نہیں چل رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ سجاد رانا بھی گھر سے غائب تھا۔ کل رات نہ جانے کس وقت ان دونوں کی گھر واپسی ہوئی تھی اور آج پھر وہ علی الصبح ہی رات نہ ہو گئے تھے۔ ان حالات میں وہ شہر یار سے اپنے متعلق کوئی بات کرنے کا موقع کہاں سے نکالتی؟ چنانچہ فی الحال یہیں رہنے پر مجبور تھی۔

”آپ نے بتایا نہیں بی بی! آپ کھانا کہاں کھائیں گی؟“ ملازمہ نے اپنا سوال دہرایا تو وہ اپنے خیالات سے نکل کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”ایسا کرو، ڈائننگ ٹیبل پر ہی کھانا لگاؤ۔ بیگم صاحبہ نے بھی

تو کھانا نہیں کھایا ہوگا، ہم دونوں ساتھ مل کر ہی کھالیں گے۔“ ”مگر بیگم صاحبہ تو صبح کچن گئی ہیں۔ میں ان سے پوچھ کر آئی ہوں۔“ اس کی بات سن کر ملازمہ نے اطلاع دی۔ ”تم کھانا لگاؤ۔ میں خود دائیں لے کر آتی ہوں۔“ وہ پھر میں چپل ڈالتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی اور مریم کے بیڈ روم کے سامنے پہنچ کر دروازے پر دستک دی۔

”میں، کم ان۔“ اندر سے مریم کی کھنکھی آواز سنائی دی۔ وہ آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ وہ شہینا کی ایک فریم شدہ تصویر پر نظر پڑا۔ جمائے اپنے بیڈ پر نیم دراز تھی۔ اسے مریم پر بہت شدت سے رحم آیا۔ اس کی بیٹی کو چند خاموشیوں نے اپنی اندھی حقیقت کی سمجھت چڑھا کر چھین لیا تھا اور وہ اب تک اس کی ڈوری سے بندھی اس کی واپسی کی منتظر تھی۔

”خیریت... کوئی کام ہے یا تمہیں مجھ سے؟“ وہ اس کی آہٹ پر تصویر سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف متوجہ ہوئی اور قدرے حیرت سے پوچھا۔

”میں آپ کو کھانے کے لیے بلانے آئی تھی۔ میرا اکیلے کھانا کھانے کا بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا۔“ اس نے اپنا منہ بیان کیا۔

”اچھا، چلو میں چلتی ہوں تمہارے ساتھ۔“ حیرت انگیز طور پر وہ فوراً ہی راضی ہو گئی۔ ”میری بیٹی شہینا کو بھی اکیلے کھانا کھانا بالکل پسند نہیں۔ کبھی میرا موند گئی ہو تو اس کی وجہ سے مجھے زبردستی تھوڑا بہت کھانا چڑھا تھا۔“ ڈائننگ ٹیبل پر پہنچنے کے بعد جب اس نے خود اپنے ہاتھ سے مریم کی پلیٹ میں کھانا نکالا تو اس نے بے ساختہ نئی بات بتائی۔ مریم کی اس بات کو سن کر وہ سمجھ گئی کہ اس نے اس کے ساتھ کھانا کھانے کی ہائی کیوں بھرنی تھی۔ وہ اس کے وجود سے اپنی پیاسی مٹا کو بھلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”شہینا گھر واپس آجائے تو میں ایک بہت بڑی پارٹی کروں گی۔ تم بھی اس پارٹی میں ضرور آنا۔ اللہ نے چاہا تو اس وقت تک تمہارے مسائل بھی حل ہو جائیں گے۔ شہر یار بہت اچھا اور ہمدرد لڑکا ہے۔ اس کی زبانی مجھے تمہارے حالات کا تھوڑا بہت علم ہوا ہے۔ تم غم نہ کرو، وہ کسی نہ کسی طرح تمہیں اس مصیبت سے نجات دلا کر رہے گا۔“

وہ شاید اپنے اندر کی تنہائی سے گھبرا کر اس سے مسلسل باتیں کر رہی تھی جبکہ کھانے کی طرف اس کا دھیان بہت ہی کم تھا۔

”پارٹی پر میں تمہیں اپنے قار اور ان لاز سے بھی

ہونے کے بعد مریم کو اپنے موبائل کا دھیان آیا لیکن اس سے قبل کہ وہ ڈائلنگ روم سے باہر نکلتی، اسے کھلے دروازے کی دوسری طرف ایک ڈھانچا پوش شخص نظر آیا۔ اس نے ایک کر دروازے کو بند کیا اور آؤٹ لاک لاک لگانے کے ساتھ ساتھ اوپر کی چھٹی بھی چڑھادی۔ ڈھانچا پوش جو اس طرف متوجہ نہیں تھا، دروازہ بند ہونے کی آواز پر چونک کر متوجہ ہوا۔

”وہ یہاں ہے۔ اس کمرے میں چھپی ہے شاید۔“ اس کی آواز بند دروازے کے پیچھے سے ان لوگوں کو سنائی دی۔ پھر فوراً ہی دروازے کے لاک پر فارغ کیا گیا۔ یہ ریپٹر سے کیا گیا فارغ تھا جس نے لاک کے پرچھے اڑا کر رکھ دیے۔ ایک گولی اطلاع کے آگے والی ملازمہ کے پہلو میں چھپی تھی۔ وہ بری طرح چیختی ہوئی فرش پر گر کر اور ترے گی۔ مریم کی قسمت اچھی تھی کہ وہ دروازہ بند کرنے کے بعد ایک طرف ہٹ گئی تھی ورنہ ملازمہ کے ساتھ ساتھ وہ بھی گولی کی زد میں آسکتی تھی۔ لاک ٹوٹنے کے بعد اب باہر سے دھکا دے کر دروازے کی چھٹی اکھاڑنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ چھٹی زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکے گی۔

”آؤ، ادھر سے باہر نکلتے ہیں۔“ مریم نے سلائیڈنگ ونڈو کی طرف قدم بڑھا دیا تو اسے کہا۔ زمین سے چند فٹ بلند اس سلائیڈنگ ونڈو کی طرف کھینچی کا لانا تھا۔ وہ دونوں باری باری دوسری طرف کود گئیں۔ خود اس کے لیے تو کوئی مسئلہ نہ تھا کہ ہٹنے کے بعد اس کے ساتھ ساتھ اپنی چھٹی فطرت کی وجہ سے اسے اس طرح کی اچھل کود کرنے کی مشق تھی لیکن مریم قدرے بھرے ہوئے جسم کی مالک تھی۔ ساتھ ہی اسے اپنی بے حد آرام دہ زندگی کی وجہ سے ایسی کسی مشقت کی عادت نہیں تھی اس لیے اسے دوسری طرف کودنے میں تھوڑی سی دقت پیش آئی اور ماہ بانو کو اسے سہارا دینا پڑا۔ جس لمحے ان دونوں نے لان میں قدم رکھے ڈائلنگ روم کے دروازے کی چھٹی ٹوٹ گئی اور دھکا دینے والے اندر داخل ہو گئے۔

”ادھر دیکھو۔ وہ ادھر سے نکلی ہیں شاید۔“ دو مریم کے ساتھ دوڑتی ہوئی چھٹی جانب بے سروت کوارٹرز کی طرف جارہی تھی، جب کسی کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔ ان دونوں نے اپنے قدموں کی رفتار اور بھی تیز کر دی۔

”اسے ارک جاؤ... ورنہ گولی مار دوں گا۔“ لمبے بھر میں ہی دوبارہ سنائی دینے والی اس آواز پر ان دونوں کو احساس ہوا کہ انہیں دیکھ لیا گیا ہے۔ بند کمرے میں موجود علی ہوئی سلائیڈنگ ونڈو کو دیکھ کر ظاہر ہے ان کے فرار کی سمت کا

ملوؤں گی۔ میری مدد کی تو ذمہ دہ ہو گئی ہے لیکن سجاد کی کمی کی وجہ سے مجھے ان کی کمی زیادہ محسوس نہیں ہوتی۔“ آخرین آہنی بہت کا سنڈ اور سوٹف ہیں۔ وہ میرے پاس ہی رہ رہی تھیں لیکن انکل کا بی بی بہت شوٹ کر گیا تھا اور ان کے انجانا کی تکلف بھی شروع ہو گئی تھی اس لیے ان کی وجہ سے آخرین آہنی کو گھر واپس جانا پڑا۔ ڈاکٹر نے مشورہ دیا تھا کہ انہیں مینشن والے ماحول سے دور رکھا جائے۔“ وہ خود ہی اسے سب کچھ بتاتی جارہی تھی۔ وہ پوری توجہ سے اس کی بات سن رہی تھی۔ اس وقت اسے اس پر بھی لکھی مائزن عورت اور اپنی آن پڑھ سیدی سادی بے بے میں کوئی فرق نہیں لگ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ بے بے بھی اس کی جدائی میں اسی کیفیت سے گزر رہی ہوگی۔

”ارے! تم تو کچھ کھاؤ۔ صرف میری باتیں سننے میں لگی ہوئی ہو۔“ باتیں کرتے کرتے مریم کا دھیان اس کی پلیٹ کی طرف گیا تو اس نے اسے ٹوکا اور خود سائمن کی ڈش اس کی پلیٹ کے قریب کرتے ہوئے اس کی پلیٹ میں سائمن ڈالنے لگی۔ اسی وقت لٹا میں گولیوں کی تڑتڑاہٹ گونگی۔ اس آواز کو سن کر وہ دونوں ہی بری طرح چھپیں پھر مریم نے تیزی سے اپنی جگہ چھوڑتے ہوئے دروازے کا رخ کیا۔ ماہ بانو بھی اس کے پیچھے لپکی گران دونوں کے ڈائلنگ روم سے باہر نکلتے سے مل ہی ایک ملازمہ دوڑتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

”پتا نہیں کون لوگ ہیں بیگم صاحبہ... دیوار پھلاگ کر چپکے سے اندر گھسنے کی کوشش کر رہے تھے۔ گارڈز نے دیکھ لیا اور فائر کھول دیا۔ جواب میں وہ لوگ بھی فائرنگ کر رہے ہیں۔“ ملازمہ نے خوف زدہ سے لہجے میں انہیں اطلاع دی۔ ”کون لوگ ہو سکتے ہیں؟ یہاں گھسنے کی کوشش کرنے کے لیے بڑی جرأت چاہیے۔“ وہ بڑبڑائی پھر اس کی نظر گھبراہٹی ہوئی ماہ بانو کے چہرے پر پڑی۔ فوراً ہی اس کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔

”مجھے لگتا ہے کہ تہماری یہاں موجودگی کی خبر لیک ہو گئی ہے اور اسی پتھر میں وہ لوگ یہاں آئے ہیں۔“ مریم نے اپنی رائے کا اظہار کیا اور تیزی سے ڈائلنگ روم میں ہی موجود فون کی طرف لپکی کرا گئی ہی لمحے اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ ٹیلی فون لائن بے جان تھی۔ دوسری طرف باہر سے سنائی دینے والی فائرنگ کی آواز لمحہ بھر کے لیے بھی نہیں رک رہی تھی۔

”میرا موبائل شاید بیڈ روم میں ہی رہ گیا ہے۔ میں وہاں جا کر سجاد کو کال کرتی ہوں۔“ فون کی طرف سے مایوس

اندازہ لگا تاں ملہ آوروں کے لیے ذرا مشکل ثابت نہ ہوا ہوگا۔ ماہ بانو نے بھانجے بھانجے ذرا سا مڑ کر پیچھے دیکھا۔ ایک نقاب پوش ہاتھ میں خطرناک گھن لیے وٹروں سے لائن میں کود رہا تھا۔ اسی نے یقیناً انہیں گولی مارنے کی دھمکی دی تھی لیکن وہ دونوں ہی اس دھمکی کو خاطر میں لائے بغیر بھاگتی چلی گئیں۔ سرونٹ کو وارنٹ اب بس دو چار قدم کے ہی فاصلے پر تھا۔ یہ فاصلہ ختم ہوتا، اس سے قبل ہی ان کے پیچھے آنے والے شخص نے لگا تار دو تین فائر کیے۔ گولیاں سائیں سائیں کرتی ہوئی ان کے دائیں بائیں سے گزر گئیں۔ مگر گولی کی اپنی ایک دہشت ہوئی ہے۔ محفوظ رہنے کے باوجود مریم اپنے اتنے قریب سے گزرنے والی گولیوں سے اتنی بری طرح دہشت زدہ ہوئی کہ اس کے قدم لڑکھڑا گئے اور وہ بین سرونٹ کو وارنٹ کے دروازے پر گر پڑی۔ ماہ بانو نے گھبرا کر اپنے پیچھے دیکھا۔ وہ نقاب پوش ہاتھوں میں گھڑنے لیے اس طرف دوڑتے آرہے تھے۔ وہ دونوں ان کے نشانے پر تھیں۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے دوبارہ فائر کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

یہ ایک اسے اور اک ہوا کہ جلد آور جو بھی ہیں، ان کی جان لینے کا ارادہ نہیں رکھتے بلکہ انہیں زندہ بچا کر چاہتے ہیں۔ ابھی جو فائر ان پر کیے گئے تھے اس کا مقصد بھی صرف انہیں دہشت زدہ کرنا تھا۔ وہ اس کھلی جگہ پر وہ دونوں ہی اتنے واضح طور پر ان کے نشانے پر تھیں کہ وہ لوگ چاہتے تو آسانی سے انہیں نشانہ بناسکتے تھے۔ جان کی طرف سے نکلنے والی اس بے فکری کے احساس نے اسے حوصلہ دیا اور وہ سہارا دے کر مریم کو اٹھنے میں مدد دینے لگی۔ اسی وقت دو فائر مزید ہوئے اور گولیاں مریم کے بالکل قریب زمین پر آکر لگیں۔ ان گولیوں کے زمین پر پڑنے کی وجہ سے اس جگہ کی تھوڑی سی مٹی اٹھڑی اور مریم اور اس کے چہرے کو خاک آلود کر دیا۔ مریم کے حلق سے ایک بار پھر دہشت زدہ چیخیں بلند ہوئیں۔ خود اس کے اپنے چہرے کا رنگ بھی اڑ گیا۔ خوف کے اس عالم میں وہ چاہتی تو خود سرونٹ کو وارنٹ میں داخل ہو کر اپنے آپ کو محفوظ کرنے کی کوشش کر سکتی تھی لیکن اسے مریم کو یوں چھوڑ دینا گوارا نہیں تھا۔ مریم کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لے کر اس نے اُسے کھڑا کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ اس بار خود مریم نے بھی ہمت سے کام لیا اور کھڑی ہونے میں کامیاب ہو گئی۔ کھڑے ہونے کے بعد سرونٹ کو وارنٹ میں داخل ہونے کے لیے باقی رہ جانے والا ایک قدم کا فاصلہ طے کرنا زیادہ مشکل نہیں تھا مگر اس ایک قدم کو اٹھانے میں اتنی تاخیر ضرور ہو گئی تھی کہ تعاقب میں آنے والے نقاب پوش

ان کے سر پر پہنچ چکے تھے۔ ماہ بانو کو پورا یقین تھا کہ جب اس نے کو وارنٹ کا دروازہ بند کیا تو وہ لازماً اُسے موجود آدمی کی ناک سے ٹکرایا ہوگا۔ یہ چھوٹا سا کو وارنٹ کونجی میں کام کرنے والے ملک کے زیر استعمال تھا اور اس کا دروازہ اتنا مضبوط نہیں تھا کہ وہ دونوں زیادہ دیر کے لیے اپنے تعاقب میں آنے والوں سے محفوظ رہ سکتیں۔ ان کی توقع کے عین مطابق باہر سے دروازے کو توڑنے کی کوشش کی جانے لگی لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے ایک ایسی آواز بھی سنی جس نے انہیں حوصلہ دیا۔ یہ پولیس کی گاڑیوں کے سائرن کی آوازیں تھیں جو لمحہ بہ لمحہ قریب آتی محسوس ہو رہی تھیں۔

”پلیز آپ میرے ساتھ مل کر اسے دروازے کے سامنے رکھتے ہیں مدد کریں۔“ کو وارنٹ میں موجود بڑے سائرن کے ایک جتنی صندوق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے مریم سے درخواست کی۔ وہ اس کا مقصد سمجھ کر فوراً ہی مدد کے لیے آگے بڑھی۔ اس جتنی صندوق کی چوڑائی اتنی تھی کہ وہ پورا کا پورا دروازے کے سامنے فٹ ہو جاتا۔ بلندی کے اعتبار سے بھی صندوق اتنا اونچا ضرور تھا کہ نصف دروازے کی بلندی تک پہنچ سکتا تھا۔ یہ صندوق بند دروازے کے بالکل ساتھ ملا کر رکھ دیا جاتا تو قبضے اٹھانے کے باوجود دروازہ گرنے سے محفوظ رہتا اور انہیں تھوڑی سی مہلت مل جاتی۔ اس بڑے صندوق میں یقیناً کھانے پینے کے اور دوسرا کوئی بھاری سامان رکھا ہوا تھا جس کی وجہ سے انہیں اسے دھکیلنے کے لیے جتن دینا پڑا۔ صرف یہ خود کو محفوظ رکھنے کی جلی خوار ہوا تھی جو وہ دونوں، خواتین والی مخصوص نازک حرا کی کفراموش کیے یہ سخت کام کر رہی تھیں۔ دروازے کے کمرور پڑتے قبضے بھی انہیں ہمیز کر رہے تھے۔ کسی بھی لمحے یہ قبضے مکمل طور پر اکٹڑ جاتے اور دروازہ اندر آگرتا۔ پینا پینا ہوتے ان دونوں نے اپنی تمام تر قوت صرف کرتے ہوئے بالآخر اس بڑے سے صندوق کو دروازے کے سامنے پہنچا دیا۔ یہی وہ تھا جب دروازے کے قبضے مکمل طور پر اکٹڑ چکے تھے لیکن صندوق سامنے آ جانے کے باعث دروازہ گر نہیں۔

”سایلوں نے دروازے کے سامنے کوئی بھاری چیز رکھ دی ہے۔“ انہیں باہر سے کسی کی چھٹیلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”چھوڑ دو۔ جانے دو۔ پولیس پہنچ گئی ہے۔ یہاں سے نکلنے کی کرو ورنہ ہم بڑی مشکل میں پڑ جائیں گے۔“ ایک دوسرے شخص نے بلند آواز میں یہ حکم دیا۔ اس حکم کے ساتھ ہی

دروازے پر جاری کارروائی بند ہو گئی اور دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ یہ آوازیں لمحہ بہ لمحہ ان سے دور جا رہی تھیں۔ ان آوازوں کو سن کر ان دونوں ہی نے سکون کا سانس لیا اور تھکے تھکے انداز میں صندوق کے ساتھ ہی اپنی پشت ٹکا کر فرش پر بیٹھ گئیں۔

☆ ☆ ☆

پولیس ہیڈ کوارٹر میں موجود وہ کرا انسانی بیچوں سے گون رہا تھا۔ یہ بیچیں اس شخص کے حلق سے برآمد ہو رہی تھیں جو بھت میں لے آئے تھے۔ اس کی مدد سے الٹا لٹکا کسی پنڈولم کی طرح جھول رہا تھا۔ ایک تو الٹا لٹکنے کی اذیت، دوسرے قریب کھڑے سادہ لباس پولیس والے کے ہاتھ میں موجود بید کی مسلسل حرکت جس کا نشانہ اس کی پیچھے تھی۔ وہ چیخیں نہ بارتا تو کیا کرتا لیکن اس کی چیخیں سن کر کمرے میں موجود کسی شخص کا دل نہیں کانپ رہا تھا۔ وہ شخص اس لائق ہی نہ تھا کہ اس پر رحم کیا جاتا۔ اس کی گردن پر تو اتنی محسوس زندگیوں کو برباد کرنے کا بوجھ تھا کہ اگر ان لوگوں کو اس سے چند اہم معلومات حاصل نہ کرتی ہوتیں تو اس وقت وہ بیروں کے بجائے گردن کے بل ہی اس آئینے کے ساتھ لٹکا ہوا ہوتا۔ وہ شخص گردن لٹکا تھا جسے وہ لوگ بڑی جدوجہد کے بعد ڈھونڈنے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ سندرام کی کونجی سے نکلتے ہی سجاد رانا نے اپنے سپر آئی جی مختار مراد کے ساتھ مل کر شہر بھر کے خواجہ سراؤں کے پلا بول دیا تھا۔ شینا کے خواجے سلسلے میں خواجہ سراؤں کے غوث ہونے کا معلوم ہونے پر پہلے ہی ان لوگوں کی شامت آتی ہوئی تھی اور اب تو گویا ان لوگوں پر مصیبت ہی ٹوٹ پڑی تھی۔ کئی مظلوم اور بے تصور لوگ بھی اس کارروائی کی زد میں آئے تھے۔ جو بھی شخص ذرا مشکوک لگا تھا، اسے گرفتار کر کے تھانے میں بند کر دیا گیا تھا اور اس سے بے حد جتنی کے ساتھ پوچھ پچھ کی جا رہی تھی۔ پولیس کی یہ کارروائی میڈیا کی نظر میں آئی تھی اور وہ لوگ خواجہ سراؤں کے ہمدرد بن کر پولیس کے خلاف کھڑے ہو گئے تھے۔ کل شام بھی شہر کے بہت سے خواجہ سراؤں نے میڈیا کے افراد کے ساتھ مل کر پریس کلب کے سامنے احتجاجی مظاہرہ کیا تھا۔ کئی رپورٹرز آئی جی اور ڈی آئی جی سے رابطہ کر کے اس صورت حال کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر چکے تھے لیکن انہیں کوئی بہت واضح جواب نہیں دیا گیا تھا۔ سجاد رانا اور مختار مراد دونوں پر ہی ایک جنون سا سوار تھا جس کے باعث وہ کسی تعقید اور عجلت کو خاطر میں نہیں لارہے تھے۔ یہاں تک کہ صبح وزیر اعلیٰ کی طرف سے

آنے والی کال کو بھی نظر انداز کر دیا گیا تھا اور انہیں یہ کہہ کر تسلی دے دی گئی تھی کہ بہت اہم اور ٹاپ سیکرٹ معاملے کی جھان بین کے لیے یہ کارروائی تاگزیر ہے۔ مسلسل تحقیقات کے نتیجے میں جو حالات سامنے آ رہے تھے، اس سے یہ بات جگ بھی ہوئی دکھائی دے رہی تھی کہ واقعی معاملہ بہت پیچیدہ ہے۔ اس پیچیدہ معاملے کی تک پہنچنے کے لیے دو سب پوری طرح سرگرم تھے۔ ذاتی دکھ نے ان کی سرگرمی کو ہمیز کر کے بہت تیز کر دیا تھا۔ مفرد گردن والی سبک دہائی بھی اس سرگرمی کی وجہ سے ممکن ہو سکی تھی۔ اس سلسلے میں انہوں نے نگار کا تعاون حاصل کیا تھا۔ اسے خواجہ سراؤں کے کئی ایسے ٹھکانوں کا علم تھا جن کے بارے میں پولیس بھی کچھ نہیں جانتی تھی۔ اس کی مدد سے وہ ان ٹھکانوں پر گردن والی سب کو ڈھونڈتے رہے تھے۔ نگار کی گمانی اور مدد کے لیے دو پولیس والے بھی خواجہ سرا کا روپ دھار کر اس کے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ بالآخر اندرون شہر کی گلیوں میں پہنچتے پہنچتے وہ لوگ اس جگہ پہنچے جہاں کامیاب ہو گئے جہاں گردن والی اپنے ٹھکانے سے بھاگنے کے بعد روپوش تھا۔ پولیس والوں نے دیکھتے ہی اس کے اس نے ٹھکانے کو گھیر کر پڑا تھا اور اسے گرفتار کر کے یہاں لے آئے تھے اور اب وہ الٹا لٹکا ان کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔ جہاں کسی سوال کا جواب دینے میں اس کی زبان اٹھتی، وہاں اس کے سر پر مسلط سادہ لباس شخص کا ہاتھ متحرک ہو جاتا اور اس وقت تک متحرک رہتا جب تک اس کی زبان دوبارہ نہ چل پڑتی۔

”تسلی لڑکیوں کو قتل کر چکے ہو تم اپنی دیوی کو بھینٹ دینے کا نام پڑ؟“

”صرف تین!“ اس نے سکاری بھرتے ہوئے جواب دیا۔

”صرف تین... تیرے نزدیک تین انسانی جانیں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں؟“ سوال کرنے والے سجاد رانا نے اس کے منہ پر ایک زوردار پیچہ مارا پھر نگار مارتی چلا گیا۔

”آخری بار تم لوگوں نے جس لڑکی کو قتل کیا تھا، اس کی لاش کہاں ہے؟“ شہر یار نے آگے بڑھ کر سجاد رانا کو بازو سے پکڑ کر پیچھے بناتے ہوئے اس سے سوال کیا۔ وہ اس سوال کے جواب میں خاموش رہا لیکن پھر بید کی پے در پے ضربوں نے اسے زبان کھولنے پر مجبور کر دیا اور وہ اس جگہ کا بتاتے لگا جہاں شینا کو مارنے کے بعد اس کی لاش کو دفن کیا گیا تھا۔

”پارٹی تیار کرو۔ اس کی بتائی ہوئی جگہ پہنچ کر ہمیں

لاش ڈس کور کرنی ہے۔" سادہ لباس پولیس آفیسر کو یہ حکم دیتے ہوئے سجاد رانا کی آواز کانپ گئی اور وہ تیزی سے پلٹ کر اس کمرے سے باہر نکل گیا۔ شہر یار اور مختار سدا بھی اس کے پیچھے لپکے۔ وہ اپنے آفس میں گیا تھا اور میز پر سر رکھ کر کسی بے نیے کی طرح بھوت بھوت کر رہا تھا۔ اسی میز پر ایک فائل میں وہ رپورٹس بھی موجود تھیں جن میں سیدھے سندھ رام کی کوشلی پر لکھ ہوئے والے افراد کی پوسٹ مارٹم رپورٹس اور موٹے پر پائی جانے والی دیگر شہادتوں کی تفصیل موجود تھی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹس نے تصدیق کر دی تھی کہ قتل ہونے والے پانچوں افراد کی موت سائیکل کی وجہ سے ہوئی ہے جو شراب کے ذریعے ان کے جسم میں داخل کیا گیا تھا۔ چونکہ ان کی موت کا سبب سر پر لگائی جانے والی ہلک ضرب تھی۔ شراب کی بولس اور گلاسوں پر مرنے والوں کے سوا کسی کی انگلیوں کے نشانات نہیں پائے گئے تھے اور شہر یار کو اچھی طرح یاد تھا کہ کوشلی میں اس کی جس شخص سے ملے بیٹھ رہی تھی، اس نے اپنے ہاتھوں میں سائیکل کے باریک دستانے پہن رکھے تھے۔ ان رپورٹس میں سب سے اہم رپورٹ خون کے اس نمونے کی تھی جسے تھ خانے میں موجود موٹری پر سے حاصل کیا گیا تھا۔ اس نمونے کا جو تجزیہ پیش کیا گیا تھا، اس کے مطابق اس بات کا قوی امکان تھا کہ یہ ہینا ہی کا خون ہے مگر پھر بھی انہیں موبو ہی امید تھی کہ شاید ہینا مری نہ ہو اور صرف زخمی ہوئی ہو لیکن الماس سے حاصل ہونے والی معلومات کے بعد یہ موبو ہی امید بھی ختم ہو گئی تھی۔ اس کی زبانی ہینا کی موت کی تصدیق کے علاوہ دیگر بھی کئی حیرت انگیز افکاشات ہوئے تھے۔ الماس کے مطابق ہندو خلیہ سراؤں پر مشتمل ان لوگوں کی ایک تنظیم تھی جو سال بھر سے کام کر رہی تھی۔ اس تنظیم میں ملک کے ہر حصے کے افراد شامل تھے لیکن ان افراد کا انتخاب بہت احتیاط سے کیا جاتا تھا۔ اس لیے ان کی کل تعداد انہیں سے زیادہ نہیں تھی۔ ان افراد کو مہارو کی حیثیت سے پہچانے جانے والے ایک شخص نے تنظیم کیا تھا۔ لاہور میں سوئی اس کی مددگار تھی اور اسی کے ذریعے وہ لوگ اس تنظیم میں شامل ہوئے تھے۔ الماس سے انہیں تنظیم کے دیگر افراد کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ اس کے مطابق مہارو کی طرف سے انہیں آپس میں ٹھکانے ملنے اور ایک دوسرے کے بارے میں جاننے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ حکم اس لیے دیا گیا تھا کہ اگر اتفاق سے کوئی پکڑا جائے تو باقی افراد محفوظ رہیں اور ان کے نزدیک شروع کیا جانے والا مقدمہ شمن جاری رہے۔ الماس کے بیان سے یہی سمجھ آیا تھا

جن کے ذریعے کوئی حتیٰ راستے قائم کرنا مشکل تھا۔ سندھ رام کی کوشلی سے بھی انہیں کوئی کھینچ نہیں سکا تھا۔ اگرچہ ہوگا بھی تو وہ آگ میں جل کر ختم ہو گیا ہوگا۔

"حوصلے سے کام لو سجاد اگر تم اس طرح سے ہمت ہار بیٹھے تو مریم کو کیسے حوصلہ دے گے؟" وہ دونوں سجاد رانا کے پیچھے کمرے میں آنے کے بعد کچھ دیر تو بالکل خاموش کھڑے رہے پھر آخر کار مختار مراد نے ہی آگے بڑھ کر اسے حوصلہ دینے کی کوشش کی۔ البتہ اس کی کوشش میں وہ خود بھی غڑ حال نظر آ رہے تھے۔ خود ان کا اپنا غم بھی تو الگ نہیں تھا۔ انہوں نے بھی اپنی انگوٹھی نوای کو کھو گیا تھا۔

"مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ میں مریم کو کیسے حوصلہ دوں گا؟ میں ہر روز اسے یہ سلی دے کر گھر سے نکلتا تھا کہ جلد ہینا کو ڈھونڈ کر اس کے پاس لے آؤں گا لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ مجھے اپنی بیٹی ایک لاش کی صورت میں ملے گی۔ میں مریم کے سامنے اس کی بیٹی کی لاش لے کر کیسے جاؤں گا؟" یہ وہ سوالات تھے جو ان میں سے ہر ایک کے ذہنوں میں تھے۔ اسے تسلی دینے والے مختار مراد کی اپنی آنکھوں سے بھی آنسو نکل پڑے۔ پولیس کی ملازمت ایسی تھی جس میں ان لوگوں کا دن رات لاشوں سے واسطہ پڑتا تھا۔ دیگر لوگوں کی طرح خود ان کا اپنا بھی یہی خیال تھا کہ وہ اتنی موتیں، اتنے حادثات دیکھ چکے ہیں کہ ان کا دل ختم ہو گیا ہے اور اب اس پر کسی بات کا اثر نہیں ہونے والا۔ لیکن اس وقت جو دھچکا پہنچا تھا، اس نے ان کے خیال کو غلط ثابت کر دیا تھا اور وہ اپنے دل میں ویسی ہی تکلیف محسوس کر رہے تھے جیسی یقیناً اپنے پیاروں کو کھونے والا کوئی بھی شخص محسوس کر سکتا تھا بلکہ ان کی تکلیف دوسروں سے دو چہرہ ہی تھی۔ طاقت اور بہت سا اختیار ہاتھ میں ہونے کے باوجود وہ اتنے بڑے نقصان سے کیسے دوچار ہو گئے تھے، انہیں سمجھ ہی نہیں آتا تھا۔

"مختار بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں سجاد بھائی! وہ لے شک بہت بڑا ہے لیکن اب حوصلے سے اسے سہنے کے سوا ہمارے پاس کوئی چارہ بھی نہیں رہا ہے۔ ہم خود حوصلہ کریں گے تو دوسروں کو بھی سنبھال سکیں گے۔ پھر اس وقت ہمارے شانوں پر جو سب سے بڑی ذمہ داری ہے، وہ ہینا کے اصل قاتلوں تک رسائی اور انہیں کیفر کر دینا تک پہنچانا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ابھی ہم اس خلیہ سرا الماس کی زبان مکمل طور پر کھلوانے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ اس پر ہمیں مزید کام کرنا ہوگا تاکہ مکمل معلومات حاصل ہو سکے۔ ہینا کی ڈیڑھ باڈی ڈس کور ہو جائے تو پھر اس معاملے کو اچھی طرح

دیکھتے ہیں۔" شہر یار خود بھی ہینا کی موت سے بری طرح متاثر ہوا تھا لیکن اس نے نسبتاً جلد خود پر قابو پالیا تھا۔ اصل میں تو وہ ماہ بانو سے حاصل ہونے والی معلومات کے بعد ہی سمجھ گیا تھا کہ ہینا قتل کی جا چکی ہے۔ اس کی اب تک کی ساری بھاگ دوڑ بس اسی بات کی تصدیق کے لیے تھی جبکہ سجاد رانا ایک باپ کی حیثیت سے سب کچھ جانتے بوجھے بھی امید کا دامن تھا جسے ہونے تھا اس لیے اسے خود کو سنبھالنے میں مشکل پیش آرہی تھی۔

"میں ماموں جان کو فون کر کے کہتا ہوں کہ وہ اور آخر میں مامنی آپ کے گھر پہنچ جائیں۔ ہم ہینا کو لے کر گھر پہنچیں اس سے پہلے مریم بھائی کے پاس کسی کا ہونا ضروری ہے۔" اس نے دیکھا کہ اس کی باتوں کا ان پر خاطر خواہ اثر ہوا تھا اور انہوں نے خود کو کمپوز کرنا شروع کر دیا تھا چنانچہ دوسری طرف توجہ دی اور اپنے موبائل سے آخرین رانا کا نمبر ملایا۔

"کہاں ہو تم شہر یار! لاہور میں رہ کر تمہارا کچھ پتا نہیں چل رہا۔ اپنے ماموں جان کی طبیعت تک معلوم کرنے نہیں آئے؟" اس کی آواز سن کر انہوں نے فوراً شکوے شروع کر دیے۔

"سوئی مامنی جان! میں بہت مصروف رہا اس لیے نہیں آ سکا۔ آپ ایسا کریں کہ ماموں جان کے ساتھ ایک آدھ گھنٹے میں سجاد بھائی کے گھر پہنچ جائیں۔ دو تین دن رہنے کے اہتمام کے ساتھ آئیے گا۔ میں بھی تھوڑی دیر میں وہیں پہنچ رہا ہوں۔"

"سب ٹھیک تو ہے نا شہر یار؟" اس نے اگرچہ اپنا لہجہ نارمل ہی رکھا تھا لیکن آج کل وہ لوگ جن حالات سے گزر رہے تھے، ان کے باعث آخرین رانا کا کھلبک جانا کچھ غلط نہیں تھا۔

"ابھی میں آپ کو تفصیلات نہیں بتا سکا۔ بس آپ میری بات پر عمل کریں اور سجاد بھائی کے گھر چلی جائیں۔ وہاں آپ لوگوں کی ضرورت ہے۔" اس نے یہ مشکل یہ چند جملے کہہ کر بالکل منقطع کر دی۔ اسی وقت میز پر رکھا انٹر کام بجھا۔ سجاد رانا اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ دوسری طرف وہی پولیس آفیسر تھا جس کے ذمے انہوں نے پولیس پارٹی تیار کرنے کا کام لگایا تھا۔ وہ انہیں ہم کے تیار ہونے کی اطلاع دے رہا تھا۔ کئی دن قتل و غنیمت کی جانے والی لاش کو قبر کھود کر نکالنے کے لیے خصوصی انتظامات کی ضرورت پڑی ہے۔ ان انتظامات کو کرنے میں ہی تھوڑا سا وقت لگ گیا تھا۔

”او کے اہم لوگ آتے ہیں۔“ سجاد رانا نے اسے مختصر جواب دیا اور اپنی سیٹ سے کھڑا ہو گیا۔

اب وہ اپنے آپ کو مکمل طور پر سنبھال چکا تھا۔ اس کے رد عمل سے شہر یا راور مختار سردار کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ دوسری طرف کون ہو گا اس لیے وہ بھی اس کے ساتھ ہی حرکت میں آئے۔ ابھی وہ لوگ کمرے کے دروازے تک ہی پہنچے تھے کہ سجاد رانا کا موبائل بجنے لگا۔ انہوں نے موبائل نکال کر چیک کیا۔ گھر سے کال آ رہی تھی۔ پہلے اس نے سوچا کہ انکو ر کمرے پر گھر پر مہم کی پریشانی کا خیال کر کے کال ریسیو کر لی۔ دوسری طرف سے اسے جو کچھ بتایا گیا، اسے سن کر اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ ابھی کال سن ہی رہا تھا۔ کہ مختار سردار کال پر اسے ایک پولیس آفیسر کے ساتھ تیز تیز قدموں سے چلتا ان لوگوں کے قریب آیا اور مختار سردار سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”سر! اطلاع آئی ہے کہ ڈی آئی جی صاحب کے گھر پر حملہ ہوا ہے۔ پولیس کے بروقت پہنچ جانے کے باعث گھر کے افراد محفوظ رہے لیکن گارڈز اور دیگر ملازمین مارے گئے ہیں۔ حملہ آور پولیس والوں کے ہتھیاروں سے قتل ہی فرار ہو گئے تھے اس لیے کوئی گرفتار نہیں ہو سکا۔“

پلی اس کی دی گئی اطلاع سن کر ان لوگوں کو اندازہ ہو گیا کہ سجاد رانا کو فون پر کیا بتایا جا رہا ہے جسے سن کر اس کے چہرے کی رنگت مختصر ہو گئی ہے۔

”ہمارے لیے کیا حکم ہے سر؟“ پلی اس کے ساتھ آنے والے آفیسر نے مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مختار سردار سے پوچھا۔

آئی جی اور ڈی آئی جی کی وہاں ہر ایک وقت موجودگی کے علاوہ اس انداز سے نے کہ وہ اپنے کسی بھی معاملے کی تحقیق و تفتیش میں مصروف ہیں، پولیس ہیڈ کوارٹر میں ابھی خاصی جھلکی چارگئی تھی۔ کئی افراد تو اس بات سے واقف بھی تھے کہ سجاد رانا کی مغوی بنی ہینا کے بارے میں تحقیقات کی جارہی ہیں۔ ہینا کی بازیابی کے سلسلے میں اب تک کتنی بھی کوششیں ہوئی رہی تھیں وہ دیگر افسران کو شریک راز بنائے بغیر ممکن نہیں تھیں۔

”میں اور میرا بی اے پولیس پارٹی کے ساتھ ڈیٹا ڈی کی ڈس کوری کے لیے جا رہی ہیں جبکہ ڈی آئی جی صاحب اور شہر یا راور گھر جائیں گے۔ تم ذرا زیادہ زور اطلاع دے دو۔“ انہوں نے حکم دیا تو پولیس آفیسر ”سیرس“ کہتا ہوا پلٹ گیا۔ اس دوران سجاد رانا کال سے فارغ ہو چکا تھا۔

”آپ کا فیصلہ بالکل ٹھیک ہے۔ ہم دونوں کو فوری طور

پر گھر پہنچنا ہو گا۔ مہم بہت پریشان ہو رہی ہے۔ اس نے خیال ظاہر کیا ہے کہ حملہ آور اس لڑکی ماہ بانو کی تلاش میں آئے تھے اور اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔“ مختار سردار کے فیصلے کی تائید کرتے ہوئے اس نے بتایا تو شہر یا راور چونک گیا۔ ماہ بانو کی تلاش میں کسی کا سجاد رانا کے گھر پر دھاوا بولنے کا ایک ہی مطلب تھا کہ کسی ذریعے سے چودھری مختار کو اس کی وہاں موجودگی کا علم ہو گیا ہے کیونکہ وہ ہی واحد شخص تھا جسے اس کی تلاش تھی۔ البتہ اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے بے پناہ جرأت مندی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ اس بات سے بے خبر تو نہیں ہو گا کہ اس حملے کے بعد وہ ان لوگوں سے براہ راست دشمنی مول لے گا۔

☆☆☆

”ایک بار پھر نا کا می۔ میں نے اس لڑکی کے پیچھے اتنا بڑا خطرہ مول لیا کہ مجھے ڈی آئی جی کے گھر میں گھس کر اسے لانے کی اجازت دے دی اور تو اتنا بگاڑ مچانے کے بعد بھی خالی ہاتھ آیا۔ اب تیرے پیچھے کون کی طرح کھسوٹے ہوئے وہ لوگ مجھ تک پہنچ جائیں گے۔ کڑی ہاتھ آجاتی تو میں یہ دشمنی بھی خوشی مول لیتا لیکن اب تو بالکل بے کاری کی معصیت اٹھانی پڑے گی۔“ کمرے میں ٹھہرا ہوا چودھری مختار بالے پر برس رہا تھا۔ ایک بار پھر جرم و رد جانے کے احساس نے اس کو اس قدر مایوس کیا تھا کہ مایوسی کی وجہ سے چہرہ ہی مسخ ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ کچھ دیر قبل ہی پیرا پار سے لاہور پہنچا تھا۔ لیکن جس کے لیے پہنچا تھا وہی نہیں ملی تھی۔ وہ تو ماہ بانو کو مردہ تسلیم کر کے صبر بھی کر چکا تھا لیکن جب یہ اطلاع ملی کہ وہ مردہ بھی جانے والی لڑکی زندہ ہے تو ایک بار پھر اسے پانے کے لیے بے چین ہو گیا اور اپنی بے چینی میں سجاد رانا کے گھر پر حملے کا حکم دینے سے بھی نہیں پوچھا۔ ماہ بانو کے زندہ ہونے کی اطلاع اسے اسپیکٹر ریش کو کھڑک سے ملی تھی۔ اپنی معطلی کے احکامات صادر ہو جانے کے بعد پہلے تو وہ کوشش کرتا رہا تھا کہ کسی طرح سجاد رانا اسے معاف کر دیں لیکن پھر ان کے انداز سے یہ سمجھنے کے بعد کہ وہ نرم نہیں پڑیں گے، اس نے پینٹر بدل لیا۔ تفتیش کے دوران اس پر یہ بات تو قبل ہی چکی تھی کہ موٹی والا کے گھر سے غائب ہونے والی اور پھر بلاست میں مردہ بھی جانے والی لڑکی کے پیچھے کون شخص پڑا ہوا ہے، چنانچہ جب سجاد رانا کے سامنے وال نہ گئی تو چودھری سے ساز باز کر بیٹھا۔ ماہ بانو کے زندہ ہونے کے علاوہ اس کی سجاد رانا کے گھر میں موجودگی کی اطلاع دینے پر اسے چودھری سے ٹھیک ٹھاک فلع حاصل ہوا تھا۔ ملنے والی رقم سے

وہ کوئی چھوٹا سا کاروبار شروع کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ چودھری سے ہونے والا یہ عہدہ بیان اپنی جگہ تھا کہ اب وہ دونوں ساتھی ہیں اور وقت ضرورت ایک دوسرے کے کام آتے رہیں گے۔ لیکن ابھی تو اصل مسئلہ ماہ بانو کے نہ ملنے کا تھا۔ چودھری جو اس کے خوابوں میں کھویا ہوا تھا اب تک پہنچا تھا، اسے نہ پا کر بری طرح بچا واپس کھارہا تھا۔ اپنی ناکامی کی اطلاع اسے بالے سے بھی پہلے ملی۔ غصہ بھرا دل سے پھر ہونے والے نیوٹیشن سے مل گئی تھی۔ غصہ بھرا دل سے ہی نیوز چینل سے ڈی آئی جی سجاد رانا کے گھر پر مسلح افراد کے حملے کی خبر نشر کی جا رہی تھی۔ خبر کے ساتھ ہی اسکرین پر ان کے گھر کے مناظر بھی دکھائے جا رہے تھے۔ ان مناظر میں مرنے والے گارڈز اور ملازمین کے خون کے دھبوں کے علاوہ گھر کی مختلف دیواروں اور دروازوں پر گولیوں کے نشانات بھی شامل تھے۔ خبروں میں سب سے زیادہ چونکا دینے والی خبر سجاد رانا کی کم سن بیٹی کے فائرنگ کی زخمیں آکر ہلاک ہونے کی تھی۔ چودھری جو کہ ہینا کے انوادی بات سے باخبر تھا، سمجھ گیا تھا کہ سجاد رانا نے موقع سے فائدہ اٹھایا ہے۔ بہر حال، فی الحال اسے اس معاملے سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو ماہ بانو کے بارے میں جانا چاہتا تھا اور خبروں میں اس کا سرے سے کوئی تذکرہ ہی نہیں تھا۔

”میں نے پوری احتیاط کی تھی سرکارا آپ کا نام کہیں نہیں آئے گا۔ احتیاط کی وجہ سے میں خود اپنے بندوں کے ساتھ ڈی آئی جی کی کوششیں نہیں کیا تھا بلکہ اپنے چوکھر صاحب نے کسی ذریعے سے بندوں کا انتظام کر دیا تھا۔ ان بندوں کو کم دے کر کام کر دیا گیا تھا۔ انہیں تو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کس کے لیے کام کر رہے ہیں۔ خود چوکھر صاحب بھی سامنے نہیں آئے۔ اس لیے آپ اطمینان رکھیں، آپ پر کوئی آج نہیں آئے گی۔“ بالے نے چودھری کو تسلی دی۔

”تیرا بڑا احسان ہے مجھ پر کہ تو نے اپنی قتل مندی سے مجھے بچالیا۔“ بالے کی تسلی کو چودھری پر الٹا اثر ہوا اور اس نے قریب رکھا ایک آرائشی گل دان اٹھا کر اسے دے مارا۔ گل دان اچھا خاصا بھاری تھا لیکن بالے کی قسمت اچھی تھی کہ اس کا سر زخمی نہیں آیا اور گل دان اس کے بازو سے ٹکرا کر پیچھے فرس پڑ گیا۔

”الودے بچے! میں تجھے حلق تک نوٹ اس لیے بھنسا ہوں کہ تو میرا کام پورا کرنے کے بجائے مجھے تسلیوں پر رکھے۔ تیری وجہ سے لڑکی ایک بار پھر میرے ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ دیکھ نہیں رہا تو کہ کیسے اس کے ہمدردوں نے اس کے

بارے میں خبر کو اپنے پیٹ میں چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ کہیں کسی نے معمولی سی بھاپ بھی نکالی ہے لڑکی کے بارے میں اپنے منہ سے؟ اب تک وہ لوگ اسے کسی دوسری جگہ پہنچا چکے ہوں گے۔ مجھے جو کچھ کا معلوم تھا وہاں سے تو لڑکی کو لائیں سکا۔ دوسری جگہ کا پتا کہاں سے لائے گا؟“ بالے کو گل دان کی ضرب سے بخروا کرنے کے باوجود اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں پڑا تھا اور وہ مسلسل منہ سے کف اڑاتا اس پر برس رہا تھا۔

”لڑکی کا پتا مل جائے گا سرکارا! خبر یہی ہے کہ وہ ابھی تک ڈی آئی جی کے گھر میں ہی چھپی ہوئی ہے۔ جن بندوں کے ذمے ہم نے اسے اٹھانے کا کام لگایا تھا، وہ ڈی آئی جی کے گھر کی نگہبانی کر رہے ہیں۔ اگر لڑکی کو کسی دوسری جگہ لے جایا گیا تو انہیں ملامت ہو جائے گا۔ ان کا ہم سے وعدہ ہے کہ وہ ہر حال میں لڑکی کو حاصل کر کے رہیں گے۔ لڑکی کے ملنے کے بعد ہی انہیں پوری رقم ملے گی۔“ چوت کھا کر بھی اف کیے بغیر بالے نے ایک بار پھر چودھری کو تسلی دینے کی کوشش کی۔

”ٹھیک ہے۔ اس قدر داری ہو تیری کارکردگی کو دیکھ لیتے ہیں۔ ملامت پڑ جائے گا کہ تو کتنے پانی میں ہے۔“ گھرائی والی بات سن کر اسے کچھ تسلی ہوئی تو وہ ٹھوڑا سا ٹھنڈا پڑا اور کمرے میں بیٹھنے کا سلسلہ ختم کر کے ایک کاؤچ پر بیٹھتے ہوئے بالے کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا۔ اب اس کی توجہ ایک بار پھر فی دی کی طرف تھی جہاں ڈی آئی جی کے گھر پر حملے کی خبر کو بار بار نشر کرنے کے ساتھ ساتھ مختلف اعلیٰ حکومتی عہدے داروں کے مذمتی اور تعزیتی بیان بھی نشر کیے جا رہے تھے۔

”آج رات بارہ بجے کے بعد میں انڈسٹرل ہوم میں آپ کا انتظار کروں گی۔“ اپنے موبائل پر موصول ہونے والے کثرت اس منیج کو پڑھ کر وہ پریشان ہوا تھا۔ اس کا اس طرح بار بار جوبی سے نکل کر چوری چھپے اس سے ملاقات کے لیے آنا بہت خطرناک تھا۔ کسی کو خبر ہو جاتی تو دونوں ہی کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی۔ خود اپنی ذات کے لیے تو وہ اتنا فکر مند نہیں تھا لیکن شہر کو کوئی نقصان پہنچتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ خود اس کی اپنی زندگی کا معاملہ تو ایسا تھا کہ وہ کسی بھی وقت زور پڑا سکتا تھا۔ گاؤں والوں کی فلاح کے لیے جاری اس کا مشن اور اخبار میں چھپنے والے ٹیکے کا مہم اس کے لیے کسی بھی وقت کوئی بڑا خطرہ بن سکتے تھے۔ اپنے اس بالکل مختلف جبر و زندگی کے باعث ہی اس نے ابتدا میں شہر کی محبت کو قبول کرنے سے انکار کیا تھا لیکن پھر اس کی محبت نے کسی تند غری کی طرح اسے اپنے ساتھ بہہ جانے پر مجبور کر دیا۔

جاسوسی ڈائجسٹ 181 فروری 2010ء

پھر بھی وہ خواہش مند تھا کہ احتیاط کا واسطہ نہ چھوڑا جائے لیکن کشور اپنی شوریدہ سرئی سے اس کے ہر ارادے کو ڈھا دیتی تھی۔ اس وقت بھی اسے یہ نتیجہ بھیجے کے بعد اس نے اپنا موبائل آف کر دیا تھا۔ منیج اسے آٹھ بجے کے کچھ بعد ملا تھا اور اس کے بعد سے وہ مسلسل کشور کا نمبر لڑائی کر رہا تھا لیکن ہر بار سنا ہی دینے والی ریکارڈنگ اسے بتا رہی تھی کہ اس کا مطلوب نمبر..... آف ہونے کی وجہ سے رابطہ ممکن نہیں۔ اس نے کال کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد کشور کو دو تین منیج بھی بھیجے تھے کہ اگر وہ کسی لئے اپنا موبائل آن کرے تو اسے وہ منیجر مل جائیں لیکن بھیجے گئے منیجر کی ڈیوٹی رپورٹ نہ آنے پر اسے معلوم ہو گیا کہ کشور نے ایک منٹ کے لیے بھی اپنا موبائل دوبارہ آن نہیں کیا ہے۔ یعنی طور پر وہ جانتی تھی کہ اس کا پیغام ملنے پر آفتاب کی طرف سے اسے روکنے کی کوشش کی جائے گی۔ وہ اس کی ایسی کسی کوشش کو کامیاب نہیں ہونے دینا چاہتی ہوگی، اس لیے رابطہ کی واحد صورت ہی ختم کر دی تھی۔ اتنا یقین تو اسے بھی ہوگا کہ وہ لاکھ چھوٹا لے، مخالفت کرے مگر اس کا پیغام ملنے کے بعد آئے گا ضرور۔ یہ تو ہوئیں سکتا تھا کہ وہ اپنی جان کا خطرہ مول لے کر حویلی کی اوچی دیواروں کو خاطر میں لائے بغیر رات کے اندھیرے میں اس سے ملاقات کے لیے پہنچتی اور وہ خود وہاں نہ جا کر اسے مایوس کر دیتا۔ دماغ کے مشورے اور عقل کی سکھائی ہوئی احتیاطیں اپنی جگہ لیکن جب معاملہ دل کا ہو تو اہل دل کو پاسبان عقل کو رخصت کر کے پاؤں ڈھونڈ کر چپ کروانے کے بعد اپنے دل کی ہی مانی پڑتی ہے۔ اس نے بھی یہی کیا۔ ساڑھے گیارہ بجے تک جب اس کا کشور سے کوئی رابطہ نہ ہو سکا تو وہ اس سے ملاقات کے لیے جانے کے لیے تیار ہوئے لگا۔ لباس کے معاملے میں بہت سادہ مزاج ہونے کے باوجود اس وقت اس نے ذرا تکلف سے کام لیا تھا اور اپنا ایک بھترین لباس زیب تن کرنے کے ساتھ ساتھ پرفیوم کا اسپرے بھی کیا۔ اس کے سامنے رات کو جلدی سو جانے کے عادی تھے، چنانچہ جب وہ بارہ بجے سے کچھ قبل گھر سے روانہ ہوا تو ان میں سے کسی کو خبر نہ ہوئی۔ اسے پیدل ہی گھر سے اسکول سے ملحقہ انڈسٹریل ہوم تک کا سفر طے کرنا تھا۔ یہ چندہ منٹ کا فاصلہ تھا۔ وہ بارہ بجے میں دس منٹ قبل گھر سے نکلا تھا، اس حساب سے بارہ بج کر پانچ منٹ پر وہ مقررہ جگہ پر پہنچ جاتا۔ کشور نے بارہ بجے کے بعد ہی اپنے آنے کی اطلاع دی تھی اور اسے امید تھی کہ وہ اس سے پہلے ہی وہاں پہنچ جائے گا۔ ٹھیک بارہ بج کر پانچ منٹ پر وہ

لیکن آپ نے تو اس وعدے کا بھی پاس نہیں رکھا۔

آفتاب... آپ صحرا میں جھکتے جیسے مسافر کی کیفیت سمجھتے ہیں ایسے مسافر کے سامنے اگر غصہ ہے، بیٹھے پانی کا چشمہ آجائے تو کیا وہ خود کو اس پانی سے سیراب کیے بغیر رہ سکے گا؟ ہرگز بھی نہیں۔ میرا بھی یہی حال ہے۔ میں بہت پیاسی تھی۔ لگتا تھا ایک دن اسی پیاس کے ساتھ مرا جاؤں گی لیکن پھر آپ میری زندگی میں چلے آئے۔ کسی کی محبت کو تر سے میرے پیاسے بدن میں امید کی ایک کوئیل پھوٹ پڑی۔ اس نئی پھوٹنے والی کوئیل نے مجھے حوصلہ دیا کہ زندگی پر میرا بھی کوئی حق ہے۔ میں اپنے اندر پھوٹنے والی امید اور خوشی کی اس بھی کوئیل کو آپ کی محبت سے سیراب کرنے کے لیے آپ کے پاس آئی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ میرا راز بہت عرصے تک راز نہیں رہے گا۔ اس راز کے کھلنے کے بعد مجھے اپنی جان بچانے کا بھی خطرہ ہے اس لیے میں چاہتی ہوں کہ اس تھوڑی سی مہلت میں ہی آپ کا دفتر سارا پیار والوں تاکہ جیب مروں تو میرے اندر کوئی شک نہ ہو۔ اس کی آواز بھرانے لگی جس سے آفتاب کو اندازہ ہوا کہ وہ رورہی ہے۔ وہ فوراً نرم ہو گیا۔

”اچھا آئی، ادھر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ یوں کھڑے کھڑے تو آپ تھک جائیں گی۔“ کشور ابھی تک دروازے سے پشت لگا کر کھڑی ہوئی تھی۔ وہ اس کا ہاتھ تمام کر فریٹ پر بھی درمی طرف لے گیا۔ انڈسٹریل ہوم کی حیثیت رکھنے والے اس کمرے میں دو دیواروں کے ساتھ بائکان والی سلائی مشینیں رکھی ہوئی تھیں۔ ان مشینوں پر کام کرنے والوں کے لیے بیٹھنے کی نشستیں اس طرح بڑی ہوئی تھیں کہ انہیں وہاں سے الگ نہیں کیا جاسکتا تھا، چنانچہ اس نے کشور کے ساتھ ہاتھ کی کڑھائی وغیرہ کرنے والی خواتین کے بیٹھ کر کام کرنے کے لیے بجائی کی درمی کارخ کیا تھا۔ اس درمی پر وہ ایک دوسرے کے پہلو پہ پہلو بیٹھ سکتے تھے۔ درمی پر بیٹھنے کے بعد اس نے پہلی بار کشور کو ٹھیک سے دیکھا۔ دروازے کے قریب موم بتی کی روشنی بہت کم تھی، یہی اس لیے اسے بہت کچھ نظر نہیں آیا تھا۔ اب وہ جس جگہ بیٹھتے تھے، وہاں ان دونوں پر ہی روشنی اچھی طرح پڑ رہی تھی۔ اس روشنی میں وہ کشور کا گھائی رنگ کا خوب صورت لباس دیکھ سکتا تھا۔ اس لباس کے ساتھ اس نے چینگ کا مین سا دو پٹا اوڑھ رکھا تھا۔ دو پٹا اگرچہ سر پر اوڑھنے پر پھیلا کر اوڑھ لیا گیا تھا لیکن یہ صاف جیسے بھی نہیں اور سامنے آتے بھی نہیں والی صورت حال تھی۔ اس دوپٹے کے پار اس کی کھلی سیاہ زلفیں

بھی نظر آ رہی تھیں اور کانوں اور گلے میں پہنا زیور بھی۔ زیور اور لباس کے اس اہتمام کے علاوہ آنکھوں میں موجود کاجل اور ہونٹوں پر چمکتی لپ اسٹک بھی اس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ آج کی اس ملاقات کے لیے اس نے خصوصی تیاری کی ہے۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟“ وہ جو اس کی نظر میں چنے کے لیے ہی یہ سارا اہتمام کر کے آئی تھی، اسے مستقل اپنی طرف دیکھتا ہوا کچھ عجیب سی ہنسی ہو کر پوچھنے لگی۔

”اپنی خوش قسمتی پر ناز کر رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ نے یہ سب پہلے ہی نہیں کیا ہوگا اور اب میرے لیے کیا ہے تو مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔“ آفتاب نے اس کی تیاری کی طرف اشارہ کیا۔

”خود کی تیاری کون سی کم ہے؟ اتنی خوشبو لگا رکھی ہے کہ مجھے دور سے ہی چہنچاہ گیا تھا کہ آپ آرہے ہیں۔“ اس نے لہجہ بھر کے اسے اس پر نظر ڈالی اور پھر جھکی نظروں کے ساتھ اسے جتا یا۔

وہ اس کی بات سن کر ہنس پڑا پھر بولا۔ ”بھی تیاری تو لازمی تھی۔ کوئی ہمارے لیے اتنا کٹ اٹھاے تو کیا ہمارا دل نہیں چاہے گا اس کی نظر میں چنے کو۔“

”آپ تیاری نہ کرتے، تب بھی مجھے اچھے لگتے۔ جو دل میں بستے ہوں وہ نظر کو بھی ہمیشہ اچھے لگتے ہیں۔“ اس نے اپنا سر آفتاب کے کندھے پر ٹکا دیا۔ اس کی خوشبو آفتاب کے وجود میں سیرایت کرنے لگی۔

”آج کی اس ملاقات کا انتظام بھی یقیناً آپ نے اپنی اس ملازمہ خاص کے تعاون سے کیا ہوگا... کہاں ہے وہ؟“ مجھے باہر کیس نظر نہیں آئی۔ ”وہ جانتا تھا کہ اس خوشبو کی گرفت سے بچا لگنا بہت مشکل ہے مگر پھر بھی ادھر ادھر کی باتیں چھیڑ کر دھیان بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”وہ یہاں سے کچھ فاصلے پر اپنے میگزین کے ساتھ اس کے ساتھ تکیے میں بھی میری راہ دیکھ رہی ہے۔“ اس نے سرسری جواب دیا اور اس کے مزید قریب کھٹک آئی۔ اب صرف عواس پر چھائی خوشبو ہی نہیں تھی بلکہ ایک میٹھی سی آج بھی تھی جو اس کے وجود میں پھیلتی جا رہی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے ہاتھ بڑھا دیا اور کشور کی زلفوں سے کھینچ لگا۔ اس کے سر پر موجود دو پٹا تو نہ جانے کب کا ڈھلک چکا تھا اور یوں لگتا تھا کہ اسے اس کی فکر بھی نہ ہو۔

”چلیں، ایک خواب بیٹھے ہیں آفتاب! ایک ایسا خواب جس میں ہم دونوں ہوں، ایک چھوٹا سا گھر ہوا اور اس گھر میں

ہماری محبت کی پیاری پیاری یثنا نیاں ہوں۔ تصور کریں کہ ہم ہر خوف اور اندیشے سے آزاد جب ایسے کسی گھر میں ہوں گے تو زندگی اتنی خوب صورت ہوگی۔ میری زندگی میں اگر کبھی وہ وقت آگیا تو مجھے یقین ہے میرے قدم زمین پر نہیں ٹپکتیں گے۔ میں تو بادلوں کے سنگ اڑتی پھروں گی۔ اس کے شانے سے سرنگار آئیں موندے وہ خوابیدہ سے بچھ میں بولتی اس وقت بھی زمین کے بجائے آسمانوں میں اڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ صرف ایک خواب نے اس کے چہرے پر اتنے رنگ بکھیر دیے تھے کہ وہ خود اپنا آپ ان رنگوں میں بھیکتا محسوس کر رہا تھا۔

”ہم ایسا کریں گے کہ اپنا گھر ہی زمین کے بجائے بادلوں کے درمیان بنالیں گے۔“ وہ خود بھی چپکے سے اس کے خواب میں شامل ہو گیا۔ عورت خوب صورت ہو، من پسند ہو اور مائل بہ کرم بھی۔ تو مرد کا خود کو قابو میں رکھنے کا عہد بھی دیر تک قائم رہ سکتا ہے؟ خوابوں کی دنیا کی سیر کرتے کب انہوں نے ایک نیا جہان دریافت کر لیا، انہیں خبر بھی نہیں ہو سکی۔ بادل ٹوٹ کر برساتا رہا۔ پانی زمین سیراب ہوئی رہی۔ خوابوں کے گھروندے میں رنگ بھرتے رہے اور پھر ایک کلی کھل کر مکمل پھول بن گئی، تب کہیں جا کر انہیں ہوش آیا۔ ہوش میں آنے کے بعد ان دونوں کی عجیب سی کیفیت تھی۔ احساسِ ندامت تھا جو ایک دوسرے سے نظر نہ ملانے دیتا تھا مگر ساتھ ہی ایسی سرشاری بھی تھی کہ تن من میں پھول کھلتے محسوس ہو رہے تھے۔ اس کلی کی کیفیت میں مبتلا جب وہ ایک دوسرے سے جدا ہوئے تو ان کے لب بالکل خاموش تھے۔ لیوں کو اب کچھ کہنے کی حاجت ہی کہاں رہ گئی تھی؟ سب کچھ تو کسی اور زبان میں کہا جا چکا تھا۔ اس سب کے بعد بھی اگر زبان کو زحمت گفتگو دی جاتی تو یہ ایک اضافی سی بات محسوس ہوتی۔ چنانچہ وہ دونوں کچھ بھی کہے بغیر وہاں سے رخصت ہو گئے۔

☆☆☆

”تمہارا بیک عبدالمنان نے کل تمہارے حوالے کر دیا ہوگا۔ تم نے اپنا سارا سامان چیک کر لیا ہے؟“ وہ لوگ ناشتے کی ٹیبل پر تھے جب اس نے ماہ بانو سے پوچھا۔ یہ سوال اس بیک کے متعلق تھا جو دارالامان میں رہ گیا تھا اور بعد میں دارالامان کی منظمہ سے کوریئر کمپنی کے ذریعے ان لوگوں کو بھجوا دیا تھا۔ ماہ بانو کے غیاب کے عرصے میں وہ بیک یونہی رکھا رہا تھا۔ کسی کو دھیان ہی نہیں آیا کہ اس کی یہ امانت اس کے درواہ کے حوالے کر دی جائے کہ اسے مردہ قرار دے

دے جانے کے بعد وہ حق و دار تھے لیکن ایک طرح سے یہ کوتاہی اس کے حق میں بہتر ہی ثابت ہوئی۔ اب وہ خود اپنی امانت وصول کرنے کے لیے موجود تھی۔

”جی۔“ ماہ بانو کا جواب بے حد مختصر تھا۔ وہ کافی افسردہ نظر آ رہی تھی۔

”مجھے معلوم ہے کہ تمہیں میرا فیصلہ زیادہ اچھا نہیں لگا... ہوگا۔ اپنے عزیزوں سے دور ایک بالکل انجینی گھڑ پر جا کر رہنا واقعی بہت مشکل ہوتا ہے لیکن سارے حالات تمہارے سامنے ہیں۔ لاہور میں تمہاری موجودگی منظر پر آ چکی ہے اور اس کے نتیجے میں اتنا خون ریز واقعہ بھی پیش آ گیا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ اس فحشی واقعے کا ذمہ دار چودھری افتخار ہے لیکن ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں کہ ہم اس پر ہاتھ ڈال سکیں۔ اس لیے میں یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ تم کچھ عرصے کے لیے مشاہیر خان کے گاؤں میں رہو۔ وہاں تم سکون سے اپنے امتحان کی تیاری کر سکتی ہو۔ جب امتحان شروع ہو جائیں تو فیصل آباد جا کر پھر زور دے دینا۔ تب تک حالات میں بھی تبدیلی آجائے گی۔ ابھی تو تمہیں خود بھی اندازہ ہوگا کہ ہم سب ہینا والے حادثے کے بعد کتنی بری طرح ڈسرب ہیں۔ ٹھوڑے سے حالات منجمل جائیں تو پھر تمہارے مسئلے کا بھی کوئی بہتر حل نکالنے کی کوشش کی جائے گی۔“ سجاد رانا کے گھر پر حملے کے بعد وہ لوگ مل کر رہ گئے تھے۔ حملہ آور کون تھے، وہ جو کوشش کے معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ خیال یہی تھا کہ چودھری نے اپنے بندوں کے ذریعے یہ کارروائی کروائی ہوگی لیکن بغیر ثبوت کے کچھ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ پھر اس حملے کے ساتھ ہی ہینا کی موت کی خبر بھی جاری کیے جانے کی وجہ سے مصروفیت بے پناہ بڑھ گئی تھی۔ اعلیٰ حکام، سیاست دانوں اور کاروباری افراد سمیت ہر نمایاں شخصے سے تعلق رکھنے والی شخصیات مسلسل تعزیت کے لیے سجاد رانا سے ملنے آ رہی تھیں۔ سجاد صاحب اور لیاقت رانا بھی مستقل ہیں موجود تھے۔ چنانچہ ان لوگوں کے پاس فرصت ہی نہیں تھی کہ اس معاملے پر زیادہ توجہ دی جاسکے۔ فی الحال تو خواجہ سرا الماس سے بھی دوبارہ ملاقات کا موقع نہیں مل سکا تھا کہ اس سے مزید معلومات حاصل کی جاسکیں۔ اسے جس آفیسر کے حوالے کیا گیا تھا، وہ اپنے طور پر کوشش کر رہا تھا لیکن اس کی طرف سے یہی اطلاع تھی کہ الماس نے اپنے ہونٹوں کو سی لیا ہے اور اب کچھ بھی اٹکنے پر راضی نہیں۔ ان حالات میں جب مشاہیر خان نے یہ تجویز پیش کی کہ ماہ بانو کو بہستان میں واقع اس کے گاؤں کا گندہ منتقل کر دیا جائے تو

شہر یار کو یہ تجویز بہت پسند آئی۔ کل رات ہی اس نے ماہ بانو کو اپنا یہ فیصلہ سنایا تھا لیکن اس وقت زیادہ بات کرنے کا وقت نہیں مل سکا تھا اس لیے اب رواں گئی سے کل ناشتے کی میز پر یہ موضوع چھیڑ بیٹھا تھا۔ خوراسے بھی آج ہی واپس جانا تھا اور طے یہ پایا تھا کہ وہ خود اپنی گاڑی ڈرائیو کر کے واپس جائے گا جبکہ مشاہیر خان ماہ بانو کو اپنے گاؤں پہنچا کر واپس ڈیوٹی پر آجائے گا۔

”مجھے آپ کے کسی فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں۔ ظاہر ہے، آپ یہ سب میری خاطر ہی کر رہے ہیں اور یہ آپ کا مجھ پر احسان ہے۔ بس میری اتنی خواہش ضرور ہے کہ جانے سے پہلے میری ایک بار اپنے لہا اور بے سے ملاقات ہو جائے تاکہ ان میں ان سے ٹون پر ہی بات کر لوں۔“ وہ اپنے دل کی خواہش ہونٹوں پر لے آئی۔

”سوری... موجودہ حالات میں تو یہ ممکن نہیں۔ اس موضوع پر ہم پھر بھی بات کریں گے۔“ صاف انکار کرتے ہوئے وہ بیک دم اپنی جگہ چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

”اچھا سجاد بھائی! اب میں چلتا ہوں۔ ابھی نکل گیا تو جلدی پہنچ جاؤں گا۔“ اب تک خاموشی سے بیٹھے ساری گفتگو سے بے نیاز سجاد رانا کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس نے ان سے کہا تو انہوں نے بھی جواباً اپنا ہاتھ بڑھا کر اس سے مصافحہ کیا۔ آج کل وہ بہت زیادہ چپ رہنے لگے تھے۔ مریح کی حالت ان سے بھی زیادہ خراب تھی اور وہ اپنے بندہ روم سے بھی باہر آنے کے لیے راضی نہ ہوتی تھی۔

”تم جی ذرا جلدی لکھنے کی کوشش کرو۔ مشاہیر خان باہر تیار بیٹھا ہے۔ جلد سے جلد یہاں سے روانہ ہو جاؤ تو بہتر ہے۔“ سجاد رانا سے مصافحہ کرنے کے بعد اس نے ایک بار پھر ماہ بانو کی طرف رخ کرتے ہوئے اسے ہدایت دی۔

”میری تیاری مکمل ہے۔ بس میں ذرا مریم بھائی سے مل لوں پھر روانہ ہو جاؤں گی۔“ اس نے جواب دیا تو وہ سر ہلاتا ہوا ڈانٹنگ روم سے باہر نکل گیا۔

باہر مشاہیر خان کھڑا اس کی پہلے ہی سے چھاتی ہوئی گاڑی کو حیر پر چکانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے آتے دیکھ کر اس نے اسے سلام کیا پھر بولا۔ ”صاحب! گاڑی بالکل اسے دن کنڈیشن میں ہے۔ ہم نے اچھی طرح سب چیک کر لیا ہے۔ آپ کو کوئی مشکل نہیں ہوگی۔“

”ٹھیک ہے خان! اب اسی فرض شناسی اور ذمہ داری سے کام لیتے ہوئے تمہیں ماہ بانو کو گاندہ پہنچانا ہوگا۔

تمہیں معلوم ہے تاکہ اس لڑکی کے لیے کتنا خطرہ ہے یہاں؟“ کھلے ہوئے دروازے سے گزر کر ڈرائیوگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اس نے ہدایت دی۔

”آپ فکر ہی نہ کریں صاحب! ہم نے ڈس داری اٹھائی ہے تو پھر چاہے اپنی جان سے گزرنا پڑے، ہم پیچھے ہٹنے والا بندہ نہیں ہے۔ جیسا دارالامان میں ہمارے دوست نے لڑکی کی جان بچانے کے لیے اپنا جان دیا تھا، ویسا ہی ہم بھی کر سکتے ہیں۔“ اس کی ہدایت پر خان نے سید پھلکار دعوئی کیا۔ اس کے اس دعوے پر ذریعہ لب مسکراتے ہوئے اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ گاڑی اسٹارٹ ہوتے ہی گیٹ پر موجود گارڈز اُترتے ہوئے اس کے وہاں تک پہنچنے سے قبل ہی پھرتی سے گیٹ کھول دیا۔ کھلے گیٹ سے گاڑی باہر نکالنے کے بعد بھی اس نے گاڑی کی رفتار بڑھائی نہیں بلکہ اطمینان سے ڈرائیو کرتا رہا۔ پھر سے کے بے نیازانہ تاثرات کے برعکس اس کا ذہن اس وقت پوری طرح الٹ تھا اور نظریں مسلسل بیک ویو مرر کے ذریعے پیچھے کے منظر کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس علاقے میں یوں بھی پبلک ٹرانسپورٹ کا گزر نہیں تھا، دوسرے بہت صبح کا وقت ہونے کی وجہ سے بھی کافی سناٹا ہو رہا تھا اس لیے اگر کوئی مشکوک فرد یا گاڑی عقب میں ہوتی تو فوراً ہی نظر میں آ جاتی۔ فی الحال ایسا کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کی یہ احتیاط اس خیال کے پیش نظر تھی کہ جن لوگوں نے ماہ بانو کو سجاد رانا کے گھر سے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی، وہ اس حقیقت سے واقف ہوں گے کہ وہ ابھی تک انہی کے گھر میں ہے۔ دوبارہ حملہ کرنے کی تو خیر وہ لوگ جرأت نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اب سیکورٹی پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ بڑھائی جا چکی تھی مگر انہیں یہ اندازہ ضرور ہوگا کہ ماہ بانو مستقل وہاں نہیں رہ سکتی۔ اسے کہیں اور شفٹ ضرور کیا جائے گا، چنانچہ وہ لوگ اس تاک میں ہوں گے کہ باہر کی مقام پر اسے اٹھرا جاسکے۔ وہ چونکہ ماہ بانو کے معاملات سے براہ راست منسلک ہو چکا تھا اس لیے اسے شک تھا کہ اگر کوئی فرد دگرگانی پر مامور ہو تو اس کے پیچھے ضرور آئے گا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا اور وہ اطمینان سے گاڑی چلاتا ہوا ایک ایسے موڑ پر جا رہا تھا جہاں سے مشاہیر خان کا گزرنا ناگزیر تھا۔ ایک تو وہ گاڑی بہت سست روی سے چلاتا ہوا لایا تھا، دوسرے لکھنے سے پہلے ماہ بانو کو جلد رواں گئی کے لیے خصوصی ہدایت بھی دی تھی اس لیے موڑ پر گرنے کے بعد اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا اور کرائے کی اس جیب میں جو... برطور خاص پاکستان تک کا طویل سفر طے کرنے کے لیے منتخب کی

گئی تھی، مشاہیرم خان آتا ہوا نظر آیا۔ جب کی پچھلی نشست پر
 حسب پروگرام برہنہ میں بیوس ماہ بانو بیٹھی گئی۔ جب تیزی
 سے اس موٹر پر سے گزر گئی۔ اس نے چونکہ اپنی گاڑی ایسے
 زاویے سے گزری کہ کبھی کسی کی نظروں میں نہ آسکے اس
 لیے وہ لوگ اسے نہیں دیکھ سکے۔ ان کے موٹر پر سے گزر
 جانے کے بعد اس نے اپنی گاڑی اشارت کی۔ وہ موٹر وہ
 تک ان کے پیچھے جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ
 اگر کوئی ان لوگوں کے پیچھے ہوا تو وہ لاہور میں ہی نہیں
 گھیرنے کی کوشش کرے گا اور شہر سے باہر نکلنے کا موقع نہیں
 دے گا۔ ابھی تک ایسی کوئی صورت حال پیش نہیں آئی تھی اس
 لیے اسے کچھ کچھ اطمینان ہو چلا تھا لیکن اپنا ارادہ بہر حال اس
 نے تبدیل نہیں کیا تھا۔ گاڑی اشارت کر کے دوبارہ سفر کا
 آغاز کرنے سے قبل ہی جب کے تعاقب میں آنے والی ایک
 موٹر سائیکل کو دیکھ کر اسے اپنے فیصلے کی درستی کا احساس ہوا۔
 اب سفر اس انداز میں جاری تھا کہ سب سے آگے مشاہیرم
 خان کی جیب تھی، درمیان میں موٹر سائیکل سوار اور پیچھے کافی
 فاصلے پر وہ خود تھا۔ ملتان روڈ شروع ہونے سے قبل موٹر
 سائیکل کی رفتار یک دم تیز ہو گئی اور وہ جیب کو اور ٹیک کرتے
 ہوئے تیزی سے آگے نکلنے کی کوشش کرنے لگی۔ موٹر سائیکل
 سوار کی اس حرکت پر اس کا جسم اکڑ گیا۔ اسے خطرہ محسوس
 ہوا کہ کہیں وہ چلتی جیب میں مشاہیرم خان یا ماہ بانو کو نشانہ
 بنانے کی کوشش نہ کرے۔ اس نے خود بھی جھٹ اپنا پھل
 نکال لیا لیکن تیز گزری اور اس کے اندیشوں کے برعکس موٹر
 سائیکل سوار تیزی سے آگے نکل گیا۔ اب ملتان روڈ کا آغاز
 ہو گیا تھا۔ اس روڈ پر مشہور زمانہ شاہ نور اسٹوڈیو کے علاوہ کئی
 ڈانس اکیڈمیاں، ایکٹنگ اکیڈمیاں اور کچھ درکشاپس بھی
 تھیں۔ ظاہر ہے، صبح کے اس دھندلکے میں یہ سارے
 مقامات سناں پڑے تھے۔ ان سارے مقامات پر رونق
 لگانے والے اتنی صبح اٹھنے کی زحمت کرنے کے عادی نہیں
 تھے۔ چنانچہ فی الحال ملتان روڈ پر عجیب و غریب چیموں والی
 اکیڈمیوں کے اشتہاری بورڈز کی ہی اجارہ داری تھی۔ ملتان
 روڈ پر سفر کا آغاز کرنے والی پہلی سواری موٹر سائیکل تھی، اس
 کے پیچھے مشاہیرم خان کی جیب تھی اور اصولاً تیسری گاڑی اس
 کی ہوتی چاہیے لیکن اس سے قبل ایک سرخ شیراؤ نے
 بازی ماری۔ اب وہ سرخ شیراؤ اس کی گاڑی اور مشاہیرم
 خان کی جیب کے درمیان سفر کر رہی تھی۔ یہ کوئی غیر معمولی
 بات نہیں تھی۔ سڑک پر کسی ایک فرد یا گاڑی کی اجارہ داری
 نہیں ہوتی کہ اس کی جگہ کوئی دوسری گاڑی نہیں لے سکتی۔

جب کوئی شخص سفر پر نکلتا ہے تو خود دسیوں گاڑیوں کو اور ٹیک
 کرتا ہے اور دسیوں ہی گاڑیاں اسے اور ٹیک کرتی ہیں
 چنانچہ اس نے سرخ شیراؤ کے اچانک وارد ہو جانے کا خاص
 نوٹ نہیں لیا اور خود مختار فاصلے سے تعاقب کرتا رہا۔ اس کا یہ
 اطمینان لمحے بھر کا ہی تھا۔ موٹر سائیکل سوار جو یہ ظاہر سڑک پر
 سیدھا جا رہا تھا، اس نے اچانک ہی اپنی رفتار کم کر لی۔ ساتھ
 ہی سرخ شیراؤ کی رفتار یک دم بڑھ گئی۔ موٹر سائیکل سوار نے
 اپنی موٹر سائیکل سڑک پر توجہ بھی کھڑی کرتے ہوئے پھرتی
 سے مشاہیرم خان والی جیب کے نازک نشانہ بنایا۔ فضا میں ناز
 بیٹھنے کی زوردار آواز گونجی اور جیب لہر اسی لیکن مشاہیرم خان
 نے مہارت سے اسے بے قابو ہونے سے بچایا۔ اس دوران
 موٹر سائیکل سوار دوسرا فائر بھی کر چکا تھا جس نے جیب کے
 دوسرے نازک ٹکڑی کا رخ بنادیا۔ جیب کی دو مشاہیرم خان نے
 اپنی جانب کا دروازہ کھول کر باہر چھلانگ لگائی اور دائیں
 ہاتھ میں موجود گن سے موٹر سائیکل سوار پر فائر کیا۔ گولی اس
 کے سینے پر دائیں جانب جا کر گئی لیکن بے اثر گئی۔ یقیناً اس
 نے اپنے پیراشوٹ کے سرخ اور نیلے کنٹراسٹ والے آپر
 کے نیچے ہلٹ پر فوج چیکٹ پہن رکھی تھی اس لیے گولی کھا کر
 بھی اطمینان سے کھڑا تھا۔
 ”گن پھینک کر ہاتھ اوپر اٹھا لو ورنہ جان سے جاوے
 گے۔“ سرخ شیراؤ والے اس دوران اس کے سر پر پہنچے تھے
 تھے۔ وہ تعداد میں جا رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے اپنی
 رائفل مشاہیرم خان پر تانتے ہوئے اسے یہ دھمکی دی تھی۔
 دھمکی سننے کے باوجود اس نے گن نہیں پھینکی اور تذبذب کے
 عالم میں کھڑا رہا۔
 ”ہماری ٹم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ ہمیں صرف لڑکی
 چاہیے۔ ہمیں لڑکی لے جانے دو، ہم تمہیں کچھ نہیں
 تمہیں گے۔“ اسی شخص نے ایک بار پھر زبان کھولتے ہوئے
 جیب کی پچھلی نشست کی طرف اشارہ کیا۔ دور سے اب وہاں
 برقع پوش ماہ بانو نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ مشاہیرم خان کی مدایت
 پریٹ کے نیچے دیک کر چھٹ گئی تھی مگر مطالعہ کرنے والوں کو بھی
 اندازہ تھا کہ وہ کہاں ہوگی اسی لیے انہوں نے مشاہیرم خان
 سے مذاکرات کا آغاز کیا۔ ان مذاکرات کے کسی بھی مرحلے
 میں داخل ہونے سے قبل شہر یار اپنی گاڑی سمیت ان کے
 سروں پر پہنچ چکا تھا۔ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ہی اس نے ایک
 فائر کیا۔ گولی رائفل بردار شخص کے ہاتھ میں جا کر گئی اور اس
 کے ہاتھ سے رائفل چھوٹ گئی۔ شہر یار کو دیکھ کر مشاہیرم خان
 جو ایک لمحے کے لیے سکت ہو گیا تھا، ایک بار پھر اپنی جون

میں لوٹ آیا۔ اس نے بھی اپنی گن سیدھی کی اور ایک فرد پر
 گولی چلا دی۔ گولی اس کے بازو میں گئی اور وہ نہٹا ہو گیا۔ دو
 افراد کے زخمی ہونے کے باوجود حملہ آوروں کو اب بھی عددی
 برتری حاصل تھی۔ موٹر سائیکل سوار سمیت ان کے دو آدمی
 اب بھی بالکل صحیح سلامت تھے۔ ان دونوں آدمیوں نے
 پھر بھی سے شیراؤ کی آڑ میں پناہ لے لی جبکہ موٹر سائیکل سوار
 نے اپنے ہتھیار سے مشاہیرم خان کو نشانہ بنایا۔ وہ اس وقت
 شیراؤ کے پیچھے چھپنے والوں کی طرف ایک رہا تھا، چنانچہ موٹر
 سائیکل سوار کا نشانہ خطا گیا اور گولی سائیں کی آواز کے ساتھ
 اس کے قریب سے گزر گئی۔ اس دوران شیراؤ کے پیچھے چھپنے
 والوں نے شہر یار کی گاڑی پر فائرنگ شروع کر دی تھی۔ اگر وہ
 گاڑی میں بیٹھا رہتا تو گولیوں کا نشانہ بن جاتا۔ پہلا فائر
 کرتے وقت ہی اسے معلوم تھا کہ جوانی فائرنگ ضرور کی
 جائے گی، چنانچہ وہ فائر کرنے کے ساتھ ہی فوراً دروازہ کھول
 کر اپنی سیٹ سے اتر کر رینگتا ہوا گاڑی کے عقبی حصے میں چلا
 گیا تھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے شیراؤ والوں پر جوابی فائرنگ
 کی۔ اس ساری جوشین میں شیراؤ والے اور مشاہیرم خان ہی
 زیادہ نازک پوزیشن میں تھے بلکہ ایک طرح سے ان کی
 پوزیشن عجیب و غریب تھی۔ وہ لوگ جیسے ہوئے بھی تھے اور
 دوسروں کو بھی پھنسیا ہوا تھا۔ شہر یار اور موٹر سائیکل سوار
 قدرے بہتر پوزیشن میں تھے۔ وہ چاہتے تو وہاں سے فرار بھی
 ہو سکتے تھے لیکن ظاہر ہے، وہ فرار ہونے کے لیے تو اس لڑائی
 میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ دونوں نے فائرنگ کا سلسلہ
 جاری رکھا۔ آخر کار موٹر سائیکل سوار کا میا نی حاصل ہوئی اور
 بین اس وقت جب مشاہیرم خان دونوں مجروح افراد کے
 ہتھیار اپنے قبضے میں لینے کے بعد انہیں اپنی جیب کی عقبی
 نشست پر پھینک کر پلٹ رہا تھا، دو گولیاں سائیں سائیں کرتی
 ہوئی آئیں اور اس کے جسم میں پیوست ہو گئیں۔ وہ ایک جھٹکا
 کھا کر سڑک پر گر کر اس عالم میں بھی اس نے نہ تو اپنی گن
 ہاتھ سے چھوڑی اور نہ ہی ہمت ہاری۔ اور بے پناہ قوت
 برداشت سے کام لیتا ہوا جیب کے نیچے رینگ گیا۔ اب وہ
 قدرے محفوظ پوزیشن میں تھا لیکن اس درمیانی وقفے کا فائدہ
 اٹھاتے ہوئے دونوں مجروح افراد شیراؤ کی آڑ میں چھپے اپنے
 دونوں ساتھیوں سے جا ملے تھے۔ ان لوگوں کے پاس جینی
 طور پر اضافی ہتھیار بھی موجود تھے، چنانچہ ان کے اپنے
 ساتھیوں کے ساتھ شامل ہوئے ہی ایک دم ہی فائرنگ میں
 تیزی آ گئی۔ وہ لوگ اپنی دونوں جانب فائرنگ کر رہے
 تھے۔ ان حالات میں نہ تو مشاہیرم خان جیب کے نیچے سے

نکل سکتا تھا اور نہ ہی شہر یار اپنی پناہ گاہ چھوڑ کر آگے بڑھ سکتا
 تھا۔ بس وہ طریق فائرنگ کا سلسلہ تھا جو جاری و ساری تھا اور
 اس فائرنگ سے ملتان روڈ گونج رہا تھا۔ شاہی بینڈ باجا، ملٹری
 بینڈ سروس اور بانجورم بھی اکیڈمیوں سے ابھرنے والے
 ساز و آواز کے عادی ملتان روڈ پر بالکل الگ ہی موسیقی کا
 رائج تھا۔ اس موسیقی کی وجہ سے ہی یقیناً ملتان روڈ پر سفر کرنے
 کا ارادہ رکھنے والے ڈرائیور حضرات کئی کات کر گزرے
 جا رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ یہ موسیقی روح کی بالیدگی کے
 بجائے اس کے جسم سے پرواز کر جانے میں زیادہ معاون و
 مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اب پھلے سے لوگ زندگی کو نکلتا ہی برا
 بھلا کہیں... اس سے بے زاری کا اظہار کریں مگر حقیقت میں
 زندگی سب کی کوآئی پیاری ہوتی ہے کہ جہاں ڈر سا خطرہ نظر
 آیا، وہاں سے رخ پھیر لیا۔ چنانچہ وہاں گونجتی موسیقی سے
 لطف اندوز ہونے کے لیے ہتھیار بند موسیقاروں کے سوا کوئی
 بھی گھبرنے کو تیار نہیں تھا۔ یہ انوکھے موسیقار تین دیہی سے اپنی
 پر فارمٹس دینے میں مصروف تھے۔ سب کو معلوم تھا کہ جس کا
 ہاتھ رکھا، اس کی زندگی کا رگ بھی وہیں دم توڑ دے گا۔ شیراؤ
 والے چاروں افراد کے دوبارہ متحد ہو جانے کی وجہ سے ان کا
 زور بڑھ گیا تھا۔ شہر یار کا ساتھ دینے کے لیے مشاہیرم خان
 بھی انہی کی طرف توجہ دے رہا تھا۔ شدید زخمی حالت میں اس
 کی یہ کارکردگی بھی قابل تحسین تھی اور اگر وہ اپنے عقب میں
 موجود موٹر سائیکل سوار کی طرف سے غافل ہو گیا تھا تو یہ ایسی
 قابل گرفت بات نہیں تھی۔ موٹر سائیکل والے نے اس کی
 اس غفلت کا فائدہ اٹھایا اور جیب کی طرف بڑھا۔ یقیناً وہ عقبی
 حصے میں موجود ماہ بانو کو قابو میں کر کے اس لڑائی کا فیصلہ کرنا
 چاہتا تھا۔ ہلٹ پر فوج چیکٹ اور سر پر جیسے ہیٹس نے اس کا
 اعتماد بہت بڑھایا ہوا تھا چنانچہ وہاں چلتی گولیوں کی زد میں
 آنے کی پروا کیے بغیر وہ جیب کے عقبی حصے کی طرف بڑھتا چلا
 گیا۔ اسے امید ہوئی کہ نشست کے نیچے دیک ہوئی ماہ بانو کی
 گولی بندھی ہوئی ہوگی اور وہ کسی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر اس
 پر قابو پالے گا لیکن اس کی یہ غلط فہمی خود اور اعتمادی اسے لے
 ڈوبی۔ وہ جیسے ہی جیب کے قریب پہنچا، ایک رائفل کی ٹال
 اس کے پیٹ کے بالکل نیچے حصے پر آ کر گئی اور اگلے ہی پل وہ
 بری طرح چپٹا ہوا اچھل کر پیچھے کی طرف گرا۔ ہلٹ پر فوج
 چیکٹ کی حفاظت سے محروم اس حصے میں رائفل کی گولی نے
 داخل ہو کر ایک بہت بڑا سوراخ کر دیا تھا اور اس سوراخ سے
 فوراً ہی طرح خون اچھل کر باہر نکل رہا تھا۔ ماہ بانو کی کالج
 میں حاصل کی گئی این سی سی کی ٹریننگ زندگی کے ان نازک

محلات میں اس کے کام آئی تھی۔ اس ہلکی پھلکی ٹریڈنگ کے ذریعے اگرچہ کوئی بھی طالب علم ہتھیاروں کے استعمال میں ماہر نہیں ہو سکتا لیکن اس لائق تو بہر حال ہو جاتا ہے کہ کئی لوڈز رائل کلبی دبا کر فائر کر سکے۔ اس نے بھی کبھی کیا تھا۔ مشاہیر خان نے حملہ آوروں سے چھپن کر جیب کے عقبی حصے میں جو رائفل چھپی تھی، ان میں سے ایک اس نے اپنے قبضے میں لے لی تھی اور وقت پڑنے پر اس کا بڑی تدبیر سے استعمال بھی کر لیا تھا۔ اپنی اس کامیابی نے اس کا حوصلہ بلند کر دیا اور وہ ہر فتنے کا اوپری حصہ اپنے سر سے اتار کر ایک طرف رکھتے ہوئے باقاعدہ طور پر معرکے میں شامل ہونے کے ارادے سے نشست پر سنبھل کر بیٹھ گئی۔ سوز سائیکل سوار سڑک پر کچی حقیر جانور کی طرح پڑالوث پوٹ ہو رہا تھا جبکہ اس کے سامنے اب بھی شیراز کی آڑ لے لیے ہوئے فائرنگ میں مصروف تھے۔ مشاہیر خان اور شیراز کے مقابلے میں وہ ایسی پوزیشن میں تھی کہ اسے وہ لوگ صاف نظر آرہے تھے۔ اس نے رائل کلبی مخصوص انداز میں اپنے دائیں شانے کے ساتھ ٹکیا اور سانس روک کر ان کی طرف فائر کر دیا۔ اس جیسی اناڑی سے امید نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ اتنے فاصلے سے درست نشانہ لے سکتی ہے لیکن وہاں چار چار ہدف موجود تھے اور ایک دوسرے سے قریب بھی تھے۔ اس نے جس شخص کا نشانہ باندھ کر فائر کیا تھا، اسے تو کوئی نہیں لگی لیکن اس کے ساتھ چپہ چوڑ کر بیٹھا اس کا سامنے زو میں آگیا۔ اس کی کھوپڑی کے پرچھے سے اڑ گئے اور بھیجا نکل کر اس کے کئی ٹکڑے اس کے سامنے کے لباس پر جا گرے۔ جس شخص کو اس نے نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی، اس نے بے پناہ بھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی طرف جوابی فائر کیا مگر خوش قسمتی سے وہ اپنے کیے ہوئے فائر کے جھٹکے سے سنبھلنے میں ناکام ہونے کے باعث نشست پر جاگری تھی، چنانچہ بال بال بچا گئی۔ موت کو اتنے قریب سے گزرتے دیکھ کر ایک ہلکے لیے اس کے ہاتھ ہیر پھٹنے پڑے مگر پھر اس نے خودی اپنے آپ کو سمجھایا کہ اس طرح ہاتھ ہیر چھوڑ کر بیٹھ جانے سے زندگی کی بھلائی نہیں۔ وہ جس گرواب میں پھنس چکی ہے اس سے نکلنے کے لیے اسے خود بھی ہمت کرنی پڑے گی، ورنہ ہو سکتا ہے کہ ایک وقت وہ بھی آجائے کہ اس کے ساتھی بھی ہمت ہار کر ہسپتالی اختیار کر لیں۔ ہسپتالی میں ذلت اور موت دونوں کے سوا کچھ حاصل نہیں ہونے والا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک بار پھر رائل کلبی پر اپنی گرفت مضبوط کی اور احتیاط سے سر اٹھاتے ہوئے پیچھے کی جانب دیکھا۔ اسے گرتے دیکھ کر اس

پر فائر کرنے والا شاید یہ سمجھا تھا کہ وہ گولی کا نشانہ بن چکی ہے اس لیے اس طرف توجہ نہیں تھا اور پیٹ کے بل لیٹ کر دھیرے دھیرے آگے کی طرف رینگتا ہوا مشاہیر خان کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے رائل کلبی کی اور پوری احتیاط سے اس شخص کا نشانہ باندھا۔ اس بار اس کا نشانہ اپنے ہدف سے چوک کر کسی دوسری طرف نہیں لگا بلکہ گولی سڑک پر اوندھے لیے شخص کے پیٹ میں جا گئی۔ تین ساتھیوں کی موت نے جہاں حملہ آوروں کے اوسان خطا کیے، وہیں شیراز اور مشاہیر خان کو بھی سہولت ہو گئی۔ مشاہیر خان تو تیز رفتاری سے ہونے کی وجہ سے زیادہ تیزی سے حرکت کرنے کے قابل نہیں تھا لیکن شیراز نے سوتے کے فائدہ اٹھایا۔ باقی بچ جانے والے دو افراد جو اب تک اس کی طرف فائرنگ کر رہے تھے، عقب سے ہونے والے فائر سے گھبرا کر پلٹ کر اٹھنا دھند جیب کی طرف فائر کرنے لگے۔ ماہ بانو اپنے پہلے فائر کا زخم دیکھ چکی تھی اس لیے اس بار وہ فائر کرنے کے بعد خود ہی نیچے تک گئی تھی۔ یہ سخت عملی و موہن ثابت ہوئی اور وہ کسی گولی کی زد میں نہ آ سکی۔ اس دوران شیراز اپنی گاڑی کی آڑ سے نکل کر اس پوزیشن پر پہنچ چکا تھا کہ ان دونوں کو نشانہ بنا سکے مگر اس نے کوئی ہلاکت خیز فائر کرنے کے بجائے ان کے پیروں کو نشانہ بنانا ہی کافی سمجھا۔ ان دونوں کی چیخوں کے ساتھ ہی ملتان روڈ پر جاری فائرنگ کی گونج بھی ختم ہو گئی اور پولیس کی گاڑیوں کے سائرن سنائی دینے لگے۔ اس سائرن پر کان دھرے بغیر وہ اپنی گاڑی کی طرف لپکا اور ڈیٹیل بورڈ پر پڑا ہوا سواہل اٹھا کر سجاد رانا کا نمبر ڈائل کیا۔ جب تک انہوں نے کال ریسپونڈ کی پولیس کی سائرن بجائی ہوئی گاڑیاں ان کے قریب آ کر رگ بھی تھیں۔

”زیادہ تفصیلات بتانے کا وقت نہیں ہے سجاد بھائی! بس اتنا بتا سکتا ہوں کہ راستے میں کچھ افراد نے ماہ بانو کو گواہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان افراد سے اچھا خاصا معرکہ ہوا ہے اور میرے خیال میں تین تین بندے مارے گئے ہیں۔ میرا ڈرائیور مشاہیر خان بھی زخمی ہوا ہے۔ آپ کے چھکے کے لوگ حسب روایت سارا معاملہ منٹے کے بعد سوتے پر پہنچ گئے ہیں اور یقیناً اب یہ لوگ کارروائی کے نام پر وقت ضائع کرنے کی کوشش کریں گے میری آپ سے بس اتنی گزارش ہے کہ ان لوگوں کو قابو میں رکھنے کا انتظام کر دیں۔“ اس نے جلدی جلدی خلاصہ بیان کرتے ہوئے مطالبہ پیش کیا۔

”تم کسم کسم کہہ رہو؟“ انہوں نے بھی زیادہ تفصیلات

میں جانے کے بجائے سنجیدگی سے پوچھا۔

”ملتان روڈ پر... شاہ نور اسٹوڈیو کے بالکل قریب۔“ اس نے بتایا۔

”اوکے! میں ابھی تمہاری جان چھڑانے کا بندوبست کرتا ہوں۔“ انہوں نے کبھی سلسلہ متقطع کر دیا۔ فون سے فارغ ہونے کے بعد وہ زخمی مشاہیر خان کی طرف توجہ ہوا۔ وہ جیب کے پیچھے سے نکل آیا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ اور بازو پر گولیاں لگی تھیں جن سے خون کی بہت بڑی مقدار نکلنے کے باعث اس کے کپڑے سرخ رنگ میں ڈوبے ہوئے محسوس ہورہے تھے۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔

”اسے سڑیا ہی سب کیا ہوا ہے... کیا آپ ہمیں بتا سکتے ہیں؟“ اس کی گاڑی اور لباس سے اس کی اصل حیثیت کا نہ کبھی مگر اس بات کا تو اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کوئی صاحب ثروت آدمی ہے، اس لیے اس نے اس کی پٹنی جیب پر لگنے والے اس سے نہایت اچھے انداز میں سوال کیا۔

”اسے سی شہریار عادل۔“ خود کو پکارے جانے کے انداز پر قدرے برا راستے ہوئے اس نے اپنا تعارف کروایا اور دوبارہ مشاہیر خان کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”یہاں کیا ہوا ہے یہ تو تھوڑی دیر میں آپ کو آپ کے چھکے کے ڈی آئی جی سجاد رانا صاحب خود بتا دیں گے، فی الحال آپ سب سے پہلے زخموں اور لاشوں کو اسپتال پہنچانے کے لیے ایبویٹنس کا بندوبست کریں۔“ اس کا اپنا تعارف، اوپر سے ڈی آئی جی کے حوالے کے ساتھ حکمرانہ لہجے سے اس نے اس کی بات سنائی گئی۔ بے چارے کی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس کی بات پر یقین کرے بھی یا نہیں۔ ایک آدھ منٹ تذبذب میں رہنے کے بعد اس نے یہی مناسب سمجھا کہ پہلے کم از کم ایبویٹنس تو بلوالے۔ جس بندے کے بارے میں وہ تذبذب کا شکار تھا، وہ کبھی بھاگتا ہوا تو نظر نہیں آ رہا تھا جس سے ایک طرح سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ وہ اپنے بیان میں سچا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے موبائل پر ایبویٹنس کے لیے کال کرنے لگا۔ اس کال سے فارغ ہو کر اس نے اپنے جیبوں کو بلند آواز میں ایک دو احکامات ہی دیے تھے کہ موبائل بجنے لگا۔ اس نے جتنا طعنا انداز میں کال ریسپونڈ کی، اگلے ہی لمحے وہ اس طرح اٹھن پھٹن پھٹن کر پڑا کہ جیسے ڈی آئی جی صاحب فون پر اس سے مخاطب نہ ہوں بلکہ نفسی نفس سانسے کھڑے ہوں۔ ”لیس سر“ کی گروان کے ساتھ اس نے ان کی تمام ہدایات سنیں اور فون بند ہونے کے بعد ایک گہرا سانس لیتا ہوا شیراز کی طرف بڑھا۔ وہ مشاہیر خان کے قریب بیٹھا اس سے کوئی بات کر رہا تھا۔

”ایبویٹنس ابھی تک نہیں پہنچی ایس ایچ او صاحب؟“ اسے اپنے قریب یا کر اس نے پلٹ کر پوچھا۔

”میں نے کال کر دی ہے سر ایس ایچ او صاحب! وہی ہوگی۔“ اس نے مؤدبانہ جواب دیا۔ اسی وقت ایبویٹنس کا مخصوص سائرن سنائی دینے لگا۔

”تم میری گاڑی میں جا کر بیٹھو۔“ اس کا یہ جملہ سن کر ایس ایچ او برقع پوش ماہ بانو کی طرف متوجہ ہوا۔ پولیس کی گاڑی کا سائرن سن کر وہ جیب میں ہی دپک چکی تھی اور دوبارہ صحیح طریقے سے برقع پہن لیا تھا۔ برقع پہننے کے بعد وہ ابھی ابھی جیب سے پر آمد ہوئی تھی اس لیے ایس ایچ او کی پہلی بار اس پر نظر پڑی تھی۔ شیراز کی ہدایت کے مطابق وہ اس کی گاڑی کی طرف بڑھی تو ایس ایچ او سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا ضرور رہا لیکن زبان پر کوئی سوال لانے کی جرأت نہیں کر سکا۔

”یہ میرا خاص بندہ ہے۔ اس کے علاج کے لیے ڈاکٹر کو خصوصی ہدایت دی ہوگی آپ کو۔ باقی بندوں کے بارے میں بھی مناسب بندوبست کر کے رپورٹ براہ راست ڈی آئی جی صاحب کو دینیے گا۔ آگے وہ جو ہدایات دیں، ان پر عمل کیجیے گا۔“ مشاہیر خان کو ایبویٹنس میں منتقل کیا جا رہا تھا، تب اس نے ایس ایچ او کو یہ ہدایات دیں اور خود اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ گاڑی کی چھٹی نشست پر ماہ بانو بیٹھی تھی اور دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے سسکائے رہی تھی۔

”کیا بات ہے... کیوں رو رہی ہو؟“ اس نے مڑ کر اس سے پوچھا۔

”میں نے تین تین بندوں کو مار ڈالا۔ اب پولیس مجھے ان کے قتل کے الزام میں پکڑے گی۔“ اس نے مزید بلند سسکیوں کے درمیان پریشان اپنے رونے کی وجہ بتائی۔

”اپنے ڈیٹنس میں کسی کو مارنے پر قانون کی طرف سے کافی چھوٹ ہے... پھر تم سے تو کسی نے اب تک ایک لفظ بھی نہیں پوچھا تو تمہیں کیوں فکر ہو رہی ہے؟ اس سارے معاملے کو ہم لوگ اپنے طریقے سے پیٹل کر لیں گے۔ تمہیں اس سلسلے میں قطعی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے اسے سمجھایا اور گاڑی اشارت کر دی۔

”اب ہم لوگ کہاں جائیں گے... کیا واپس ڈی آئی جی صاحب کے گھر؟“ اس کی تسلی پر ذرا مطمئن ہوتے ہوئے اس نے آگے کا پروگرام جاننے کی کوشش کی۔

”نہیں۔“ انہیں جلد از جلد یہاں سے نکالنا اب اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔ تم پروگرام کے مطابق ابھی جا کر

ہی جاؤ گی۔ البتہ اب مشاہیر خان تمہیں وہاں تک نہیں پہنچا سکتا، چنانچہ اس کے مشورے سے یہ طے پایا ہے کہ میں خود تمہیں ہشام تک پہنچاؤں گا۔ وہاں سے تمہیں مشاہیر خان کا بھائی آگے لے جائے گا۔ اس کا بھائی پورے اور اسکر و آتا جاتا رہتا ہے۔ مشاہیر خان نے بتایا ہے کہ اگر ہم کے ٹو موٹیل فون کر کے اس سے بات کرنے کی خواہش کریں تو بات ہو جائے گی ورنہ وہ نہ بھی ہوا تو پیغام ضرور ہی پہنچ جائے گا۔ اس نے بتایا اور پھر اپنے موبائل پر کوئی نمبر ڈائل کرنے لگا۔ رابطہ ہونے کے بعد اس نے گفتگو کا آغاز کیا تو ماہ بانو کا اندازہ ہو گیا کہ وہ کے ٹو موٹیل کے فون پر بات کر رہا ہے اور اسے وہاں مشاہیر خان کا بھائی مل گیا ہے۔ اس فون سے فارغ ہونے کے بعد اس نے سجاد انا کو فون کیا اور انہیں سارے واقعات کی تفصیل سنانے کے بعد مشاہیر خان کا خصوصی خیال رکھنے کے ساتھ ساتھ معاملے کی تحقیقات کروانے کی درخواست کی۔ سوڑوے پر سفر کا آغاز ہونے کے بعد اس نے موبائل کو واپس ڈیش بورڈ پر ڈالتے ہوئے اپنی پوری توجہ ڈرائیونگ پر مبذول کر لی۔

”جاہو تو اب تم اپنا برقع اتار سکتی ہو۔ موسم کافی گرم ہو رہا ہے کہیں تمہیں تکلیف نہ ہو۔“ گاڑی لکھراہ کی ڈھلوانوں پر رینگتی، سوڑوے کے لیے ترانے گھے سرخ پہاڑوں کے درمیان سے گزر رہی تھی، تب اس نے ماہ بانو سے یہ بات کہی۔ گاڑی میں چلتے ایئر کنڈیشنر کی وجہ سے اگرچہ اندر کا موسم خاصا خوش گوار تھا پھر بھی اس نے شہر یار کی بات پر عمل کیا۔ عادت نہ ہونے کے باعث وہ برقعے میں خود کو بے آرام محسوس کر رہی تھی۔ اب اجازت ملی تو جھٹ برقع اتار کر اس کی جگہ اپنے بیک سے ایک وہ پنا کال کراؤ ڈھ لیا۔ یہ نپلے رنگ کا ایک بڑا سادہ پنا تھا جسے اچھی طرح اپنے گرد لپیٹنے کے بعد وہ سیٹ سے پشت لگا کر بیٹھ گئی۔ پچھلے دو تین دن بہت زیادہ ٹینشن میں گزرے تھے اور وہ سچ طرح سو بھی نہیں سکتی تھی۔ اب جو سیٹ سے ٹیک لگا کر بیٹھتی تو اسے خود بھی اندازہ نہ ہوا اور وہ ٹینڈ کی وادی میں جا رہی۔ گاڑی ڈرائیو کرتے شہر یار نے بیک ویو مرر میں یہ منظر دیکھا۔ نپلے دوپٹے کے بالے میں ٹیم واپتونوں کے ساتھ ٹینڈ میں ڈوبی وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی لیکن پھر بھی ایک ہی سیٹ تھی۔ یہ کی نپلے پھولوں والی اس سیاہ چادر کی بھی جس میں وہ اول روز سے اسے دیکھتا آ رہا تھا اور جو عامر کے گھر پر بلاست میں مرنے والی جیل کے ساتھ ہی نیست و نابود ہو گئی تھی۔ جیل کی سیٹ کے ساتھ چادر کے باقی ماندہ ٹکڑے دیکھ کر ہی تو اسے

خود بھی ماہ بانو کی موت کا یقین آ گیا تھا۔ اب وہ چادر نہیں رہی تھی لیکن ماہ بانو جو بوجھ اور اس چادر کے بغیر کچھ ادھوری ادھوری سی لگ رہی تھی۔

☆☆☆

”تم فریش ہونا چاہو تو ہو جاؤ، میں بالکونی میں ہوں۔“ ایک طویل ٹھکا دینے والے سفر کے بعد وہ لوگ ہشام موٹیل پہنچے تو شام سر پر آ پڑی تھی۔ ہوٹل کے ریسپشن پر راک کر اس نے دو سنگل بیڈز والے ایک کمرے کی بکنگ کروائی اور کمرے میں آنے کے بعد ماہ بانو سے یوں ہوا بالکونی میں چلا گیا تا کہ وہ بغیر کسی جھجک کے سہولت کے ساتھ خود کو سفر کی تکان اور دھول مٹی سے نہایت دلانے کا بندوبست کر سکے۔ ویسے ٹھکان اور چھلے کی خرابی کی ڈسے داری طویل سفر سے زیادہ ملتان روڈ پر پیش آنے والے خونی تصادم پر غامد ہوتی تھی، ورنہ سفر تو ایئر کنڈیشننگ گاڑی میں بڑے آرام اور سہولت کے ساتھ کنا تھا۔ بالکونی میں کھڑے ہو کر اس نے پیچھے بہتے دریائے سندھ پر ایک نظر ڈالی۔ قدیم تاریخ رکھنے والے دریائے سندھ کے بہاؤ کا بلاسا شورشام کے اس دھندلے منظر میں کسی آرسٹرا سے نکلتی مترنم موسیقی کی مانند محسوس ہو رہا تھا۔ اس انوکھی موسیقی میں ہم ہو کر وہ کچھ دیر کے لیے سب کچھ فراموش کر بیٹھا۔ تکت کی جھیل و ماسروڈ سے بہہ کر آنے والے دریائے سندھ میں کچھ ایسی ہی انوکھی بات ہے کہ آدمی حرزہ ہونے کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ بھی کچھ کھوں کے لیے اس حراز کا شکار ہو گیا لیکن پھر جلد ہی اس کام کی طرف اس کا دھیان گیا جسے کرنے کے ارادے سے وہ بالکونی تک آیا تھا۔ اسے لاہور فون کر کے سجاد رانا سے وہاں کے حالات کے بارے میں معلوم کرنا تھا، چنانچہ ہاتھ میں پکڑے موبائل کی طرف متوجہ ہو گیا مگر اگلے لمبے مایوس کن تھا۔ موبائل کی بیٹری بالکل ڈاؤن ہو چکی تھی اور اسے دی چارج کے بغیر استعمال نہیں کیا جاسکتا تھا۔ چارجر اس کی ہڈی میں پڑا تھا۔ کوفت کے عالم میں وہ چارجر لانے کے ارادے سے کمرے سے باہر نکلا۔ ریسپشن کے قریب سے گزرتے ہوئے اسے خیال آیا کہ کیوں نہ لینڈ لائن پر ہی بات کر لی جائے۔ موبائل کو دی چارج کر لینے کے بعد بھی صورت حال حال جانے کیا ہوئی؟ اس علاقے میں سنگٹہ بھی ٹھیک طرح سے آتے ہیں یا نہیں، اسے علم نہیں تھا۔ وہ ریسپشن پر ہی رک کر ان غیر ملکیوں کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگا جو اپنے لب و لہجے سے امریکی لگ رہے تھے۔ چار پانچ افراد پر مشتمل وہ گروپ شاید ایسی ہی ڈیشن پر جا رہا تھا اور ہشام میں اسے کا ارادہ رکھتا تھا۔ ریسپشنسٹ نے انہیں کمرے

کی چابیاں پکڑائیں تو وہ وہاں سے ہٹ گئے اور اس نے آگے بڑھ کر مدعا بیان کیا۔ استقبال لکھراہ نے مسکراتے ہوئے فون اس کی جانب کھسکا دیا۔ ٹھوڑی دیر بعد وہ سجاد رانا سے بات کر رہا تھا۔

”ہم لوگ ہشام پہنچ گئے ہیں۔ آپ بتائیں وہاں کی کیا صورت حال ہے؟“ اس نے قطاں الفاظ میں گفتگو کا آغاز کیا۔ پبلک پلس پر کھڑے ہو کر گفتگو کرنے میں یہ احتیاط لازمی تھی۔ ”یہاں تو صورت حال بہت پیچیدہ رہی اختیار کر چکی ہے۔ ملتان روڈ پر جن لوگوں سے تمہارا واسطہ پڑا تھا، ان کی شناخت ہو گئی ہے۔ وہ ایک ایسے ٹینگ سے تعلق رکھتے ہیں جو رقم کے عوض اغوا، قتل، دنگ نافذ سب کچھ کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ان افراد کی ہتھیاری کرنے پر معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے ہی میرے گھر پر بھی حملہ کیا تھا۔ مقدمہ دونوں دفعہ ایک ہی تھا۔ دو لوگ ماہ بانو کو اغوا کرنا چاہتے تھے۔ اس کام کے عوض انہیں بہت بڑی رقم ادا کی جا رہی تھی اس لیے خطرے کے باوجود وہ راضی ہو گئے۔“ سجاد رانا نے بتایا۔ ”وہ کس کے لیے کام کر رہے تھے، یہ نہیں بتایا انہوں نے؟“

”بتایا ہے اور نام سن کر میں حیران ہو رہا ہوں کہ اتنے معمولی آدمی کی کیا سیال ہے کہ وہ اتنی بڑی رقم ادا کر کے... پھر اس کا ماہ بانو سے کوئی تعلق بھی نہیں۔ انسپکٹر میں کچھ کھو کا نام سامنے آیا ہے اس سلسلے میں۔ اسے تلاش کیا جا رہا ہے لیکن وہ منظر سے غائب ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ خود کو معطل کیے جانے کے بعد اس نے انتقاماً چوہری انکار سے ساز باز کر لی ہے اور چوہری نے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے اس کے ذریعے یہ کام کروایا ہے۔“

”آپ کا خیال بالکل صحیح ہے۔ میں بھی اسی رخ پر سوچ رہا ہوں۔“ اس نے فوراً ان کے خیال کی تائید کی۔ ”بہر حال، تم فکر نہ کرو۔ میں رفیق کھو کھو کو تلاش کروا رہا ہوں۔ باقی معاملات بھی میں نے سنبھال لیے ہیں۔ جائے وقوعہ پر کچھ اخباری رپورٹرز وغیرہ بھی گئے تھے۔ انہیں بھی بتایا گیا ہے کہ کچھ مشہور افراد کہیں سے ذہنی کی واردات کر کے فرار ہو رہے تھے کہ پولیس سے تصادم ہو گیا اور نتیجے میں تین افراد ہلاک اور دوزخی ہو گئے ہیں۔ تمہارے ذرا نیوہ کے دخی ہونے کی خبر منظر پر نہیں لائی تھی۔ پولیس رپورٹ میں بھی تمہارا یا ماہ بانو کا کوئی ذکر نہیں ہے۔“ اس کی توقع کے عین مطابق انہوں نے سارا معاملہ بالکل اسی طرح سیت کر دیا تھا جس طرح وہ چاہتا تھا۔ اس واردات میں جو افراد مارے گئے

تھے، ان کی ہلاکت ماہ بانو کے ہاتھوں ہو چکی تھی۔ چاہتا تھا کہ حالات کے گرداب میں پھنسی وہ مشکل میں پڑے۔ جو افراد مارے گئے تھے، وہ مجرم تھے اور یہی طے تھا کہ اگر انہیں موقع ملتا تو وہ اسے مشاہیر خان کو قتل کر کے ماہ بانو کو اپنے ساتھ لے جاتے۔ ”تھیک یو سجاد بھائی! مجھے آپ سے یہی امید تھی۔“ اس نے بدلے کے ان کا شکر یہ ادا کیا پھر پوچھنے لگا۔ ”الماس کی کیا خبر ہے؟“

”بہت بری خبر ہے۔ اس نے خودکشی کر لی ہے۔“ انہوں نے گہرا سانس لیتے ہوئے بتایا۔ ”کب... کیسے؟“ وہ بری طرح چونکا۔

”رات کو کسی وقت۔ اسے پانی پینے کے لیے جواسٹیل کا گلاس فراہم کیا گیا تھا، اس کا کنارہ کافی چلا اور تیز تھا۔ اسی کی مدد سے اس نے اپنی کاٹنی کی رگیں کاٹ لیں۔ صبح ہونے کے بعد ہی اس کی موت کا پتا چل سکا۔ میرے پاس اطلاع تمہارے روانہ ہونے کے بعد پہنچی تھی۔ بس سمجھو، صبح سے ہی میرے پاس بری اطلاعات آنا شروع ہو گئی تھیں۔ سارا دن میں انہی معاملات میں الجھا رہا۔ سبھو سندرام کے بارے میں بھی تفتیش جاری ہے۔ کئی مشکوک باتیں سامنے آئی ہیں۔ اس کی کوٹھی کے پیچھے والی کوٹھی بھی اسی کی ملکیت تھی۔ اسے وہ اپنے گودام کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ خاص بات جو معلوم ہوئی ہے وہ یہ کہ اس گودام میں جو کچھ اڑکھا جاتا تھا، وہ مختلف کھپیوں کے ذریعے اغوا یا اسمگل کیا جاتا رہا ہے۔ ایک کھپی سے معلوم ہوا ہے کہ کپڑے کے کچھ خصوصی تھان ایسے بھی ہوتے تھے جنہیں بارڈر پر آدمی کے افراد ہی خریدتے تھے۔ مجھے شک ہے کہ کپڑوں کے ان تھانوں کے درمیان کوئی خاص شے رکھ کر انڈین آدمی تک پہنچائی جاتی رہی ہے۔ وہ ہمارے ملک کے قیمتی راز بھی ہو سکتے ہیں کیونکہ سندرام کا جو کردار اب تک سامنے آیا ہے، اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ یہاں رو کر بھارت کے لیے جاسوسی کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اس کے بچوں تک اس کے مرنے کی اطلاع پہنچا دی گئی تھی لیکن انہوں نے پاکستان آنے یا باپ کی جانکاد میں کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ سندرام کے بڑے کے بارے میں بھی جو معلومات سامنے آئی ہیں، اس سے پتا چلتا ہے کہ بے تحاشا کمانے کے باوجود وہ شخص بینکوں کا بے حد مقروض ہے۔ یعنی وہ کمائی ساری کی ساری بیرون ملک مقیم اپنے بچوں کو پہنچا دیتا تھا اور یہاں جو کچھ ہے، اس کی نیلائی کے بعد اتار ل سکتا ہے جس سے بینکوں کا قرض ہی ادا کیا جاسکتا ہے۔“ وہ

جو کچھ بتا رہا تھا، وہ ساری معلومات صرف آج کے ہی دن میں حاصل نہیں کی گئی تھیں۔ اس کا اضافہ سندھ رام اور خواجہ سراؤں کی بلاکت کے بعد مسلسل کام کرتا رہا تھا لیکن درمیان میں وہ شہینا کی لاش کی بازیابی اور پھر اس کی تدفین کے سلسلے میں اپنی بری طرح مصروف ہو کر... یہ ساری معلومات لینے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔ آج کی دن بعد اس کا دوبارہ اپنے دفتر جانا ہوا تھا تو یہ ساری معلومات بھی اس تک پہنچ گئی تھیں اور اب وہ انہیں اس سے شیئر کر رہا تھا۔

”صورت حال واقعی بہت پیچیدہ ہے۔ ذمے دار افراد کو جتنی سے کوئی ایکشن لینا چاہیے، پھر بیان نہ پھر استقبال کلرک کی بار بار خود پر انہی نظروں کو محسوس کرتے ہوئے بولا۔ ”کال بہت لمبی ہو گئی ہے، میں واپس پہنچنے کے بعد آپ سے دوبارہ اطمینان سے بات کروں گا۔ فی الحال آپ مجھے اجازت دیں۔“ اس نے ریسور واپس کر بیڈل پر رکھ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

”اس کال کے چار جز میرے مل میں شامل کر دینا۔“ کلرک سے مختصر آکھتا ہوا وہ تیز تیز قدموں سے چلتا وہاں سے ہٹ گیا۔ پہلے باہر جا کر اپنی گاڑی سے موبائل کا چارجر نکالا پھر واپس کمرے میں آ گیا۔ ماہ بانو اس دوران غسل سے فارغ ہو چکی تھی اور اب بالکونی میں کھڑی تھی۔ اس نے بھی اپنے کپڑے لگا لے اور فریش ہونے چلا گیا۔ وہ فریش ہو کر واپس کمرے میں آیا، تب بھی ماہ بانو بالکونی میں ہی کھڑی تھی۔ وہ خود بھی وہاں جا پہنچا۔ دریائے سندھ پر رات اتر آئی تھی اور اس کی سلیٹی چادر پر ان روشنیوں کا عکس جھلکار ہا تھا جن کا منبع اس کے پار واقع پہاڑوں پر موجود جھوپڑوں میں جلنے والے دیے یا لالٹینیں وغیرہ تھیں دریائے سندھ پر اتری رات اس کی دھندلی شام سے زیادہ خوب صورت تھی۔ وہ خاموشی سے ماہ بانو کے ساتھ اس حیرانگیز منظر کا نظارہ کرنے لگا۔ دریا کے پانیوں سے نکرا کر آنے والے ہوا کے جھوکوں کی خشکی نے بتایا کہ وہ لاہور سے بہت دور ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں سے آگے کی دنیا بہت مختلف ہے۔ کل وہ ماہ بانو کو اس دنیا کی طرف روانہ کر کے خود واپس پہلے والے ماحول میں لوٹ جاتا لیکن ابھی تو وہ اس کے نظارے میں کھڑکی کی سنگت میں ٹھہرا سیکھیں ٹھہر جانے کی، وقت کو روک لینے کی خواہش کر رہا تھا۔

”اچھی خاصی خنڈک ہو رہی ہے، اندر چلتے ہیں۔ کھانا کھا کر آرام سے سو جانا۔ مجھے بھی واپس جانا ہے اور تمہیں بھی لہا سفر کرنا ہے اس لیے بہتر ہے کہ ہم اچھی طرح آرام کر

لیں۔“ اس حرم میں جکڑے رہنے کے خوف نے اسے ماہ بانو کی محویت توڑنے پر مجبور کر دیا اور وہ جھکنا نہ لچھے میں کھتا ہوا اپنی پلٹ گیا۔ وہ چونکی اور پھر تابع داری سے اس کے حکم کی پیروی کرتے ہوئے خود بھی اس کے پیچھے ہی کمرے میں پہنچ گئی۔

☆ ☆ ☆

”بالا بتا رہا تھا کہ تم ہم سے ملنا چاہتے ہو... کوئی کام تھا کیا؟“ سامنے کھڑے رفیق کھوکھر سے چودھری نے پُر عورت لچھے میں سوال کیا۔

”کام اب بھی سمجھ سکتے ہیں چودھری صاحب! اس لڑکی ماہ بانو کو اغوا کرنے کے پتھر میں میرے ہاتھ کیے ہوئے بندے کے پڑے گئے ہیں اور میرا نام سامنے آ چکا ہے۔ ڈی آئی جی صاحب پہلے ہی مجھ سے خفا تھے، اب پھر میرا نام سامنے آنے پر ان کی فحش کا کیا عالم ہوگا؟ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں۔ پولیس پورے شہر میں مجھے ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔ اگر مجھے بد وقت ملتاں روڈ والے واقعے کی اطلاع نہ ملتی تو میں دھریا جاتا۔ یہ اطلاع ملنے ہی کہ تصادم کے بعد دو بندے زخمی حالت میں زندہ گرفتار کر لیے گئے ہیں، میں نے فوراً اپنا کمر چھوڑ دیا تھا۔ اس کے بعد سے مسلسل ادھر ادھر بھٹکتا پھر رہا ہوں۔ بڑی مشکل سے آپ تک پہنچا ہوں کہ آپ مجھے جانا فراہم کر دیں۔ آخر آپ کا کام کرتے ہوئے ہی تو میں اس مشکل میں پھنسا ہوں۔“ رفیق کھوکھر نے جتنا۔

”تم بھول رہے ہو ایکسپوز کر تم نے ہمارا کام کرنے کے عوض منہ مائی رقم لی تھی۔ ہم نے رقم ادا کر دی تمہاری ذمے داری ختم۔ اب یہ تمہارا مسئلہ ہے کہ تم اپنی حفاظت کے لیے کیا کرتے ہو۔“ چودھری کے اس کورے جواب پر مل بھر کے لیے رفیق کھوکھر کا چہرہ فحش پڑ گیا کہ پھر وہ جیترا بدلتے ہوئے بولا۔

”سوچ لیں چودھری صاحب! میرا محفوظ رہنا آپ کے مفادات کے لیے بھی بہت ضروری ہے۔ اگر میں پھڑا گیا تو آپ بھی مشکل میں پڑ سکتے ہیں۔ میں خود پولیس کی نوکری کرتا رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ جب پولیس والے کسی سے کچھ اگوائے پر آجائیں تو پھر بندے کے لیے زبان بند رکھنا ممکن نہیں رہتا۔ آپ نے مجھے تحفظ فراہم نہیں کیا اور میں پھڑا گیا تو تمہی دیر تک آپ کا نمک حلال کرنے کے لیے اپنی زبان بند رکھ سکوں گا۔ کچھ کہ نہیں سکتا۔ پر مجھے افسوس بڑا ہوگا کہ آپ میری وجہ سے پریشانی میں پڑ گئے۔“

چودھری اس کی بات سن کر دباؤ۔

”تم مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کر رہے ہو؟“

”نہیں جنتا! میری ایسی کجبال کہاں؟ میں تو آپ کو صرف

ایک حقیقت بتا رہا ہوں۔“ اس نے عیاری سے جواب دیا۔

”سننا ہے ابھی سال بھر پہلے ہی تمہاری شادی ہوئی ہے۔ مگر والی بڑی خوب صورت ہے۔ مگر یہ بوجھ ہی ماں اور جوان خوب صورت بیوی کے علاوہ کوئی اور نہیں ہوتا۔ اگر ان دونوں عورتوں کی جان و عزت خطرے میں ہو تو کیا تب بھی تم اپنی زبان کو بند رکھتے سے انکار کرو گے؟“ چودھری نے اس کی عیاری کے جواب میں اپنا جو کارڈ دکھایا، اس نے اس کی ساری تیزی و طراری کو جھگا کی طرح چبھ جانے پر مجبور کر دیا۔

”کک... کک... کیا مطلب؟ میری ماں اور بیوی کا اس معاملے سے کیا تعلق؟“ وہ ہٹکا یا۔

”بھی ان کا تم سے تعلق ہے تو تمہارے معاملات سے بھی تعلق ہوگا۔ ہم سے وصول کی گئی رقم سے انہیں بھی تو پیش کرواؤ گے۔ سننا ہے تم نے اپنی ماں اور بیوی کو اچھی خاصی موٹی رقم دے کر دھیم یار خان بیوی کے نیچے کھجوا دیا ہے کہ کچھ دنوں وہاں رہیں اور خوب عیش کریں۔ اب بتاؤ، جب وہ تمہاری کمائی پر عیش کریں گی تو کیا تمہارے افعال کی ذمے دار نہیں ہوں گی؟“ چودھری کی باتوں نے رفیق کھوکھر کے ہونٹوں پر تالا ڈال دیا۔ اس وقت پہلی بار صبح منوں میں اسے احساس ہو رہا تھا کہ اپنی اوقات سے بڑھ کر اونچا اڑنے کا کیا انجام ہوتا ہے۔ اچھی جھلی عزت کی نوکری تھی۔ پہلے اس نے اپنے فرائض سے کوتاہی برتی، جب اس کو تباہی کی سزا ملی تو بجائے معافی طلبی کے ذریعے وہ اس سزا کو ختم کروانے کی کوشش کرتا، چودھری سے مل بیٹھا۔ خیال یہی تھا کہ چودھری سے رقم بھی ملے گی اور ضرورت پڑنے پر وہ تحفظ بھی فراہم کر دے گا لیکن اس نے تو صاف بری جھنڈی دکھا دی تھی اور ساتھ ہی یہ اشارہ بھی دے دیا تھا کہ اگر اس نے زبان کھولنے کی غلطی کی تو ماں اور بیوی کی خیر نہیں۔ وہ اتنا باخبر شخص تھا کہ اسے یہ تک معلوم تھا کہ اس وقت وہ خواتین کہاں موجود ہیں۔ ایسے شخص کے لیے اپنی دھمکی پر عمل کرنا کتنا سہل ہوگا، وہ سمجھ سکتا تھا۔

”تم کچھ پریشان ہو گئے اسپیکر! پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ہم اپنے خدمت گزاروں کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں۔ ابھی جتنی باتیں ہوئی ہیں انہیں بھول جاؤ اور آرام سے یہاں رہو۔ ہم آج اپنے گاؤں واپس جا رہے ہیں۔ تمہیں بھی یہاں سے آج ہی کسی اور جگہ منتقل کر دیا جائے گا۔ ہماری اس کوٹھی کے بارے میں سب کو علم ہے اس لیے تمہارا یہاں رہنا مناسب نہیں۔ میں بالے سے کہہ دوں گا۔ وہ تمہیں کسی دوسری محفوظ جگہ پر جہاں تمہارے گلے کے آدنی نہ کھینچ سکیں، پہنچا دے گا۔ تم

بے فکر ہو جاؤ، اب تم ہمارا مسئلہ ہو۔“ رفیق کھوکھر ابھی پریشانی کے عالم میں کہ منہ مائی کھڑا تھا کہ چودھری نے ایک بار پھر تیزی سے جیترا بدلا اور اپنا موڈ فحش بدلتے ہوئے خوش گوار مسکراہٹ کے ساتھ اسے تسلی دی۔

”شکریہ چودھری صاحب! بہت مہربانی آپ کی۔“ اس کے منہ مردہ میں گویا جان ہی پڑ گئی۔

”شکریے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم ہمارے اتنے کام آئے ہو تو ہم تمہارا خیال کیسے نہیں رکھیں گے۔“ چودھری نے اسے جواب دیا اور پھر اس کے پیچھے بالکل خاموش کھڑے بالے سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”اسپیکر صاحب کو ساتھ لے جا باؤ! اور ان کا اچھی طرح بندوبست کر دے۔ یہ ہمارے لیے کتنی اہمیت رکھتے ہیں تو اچھی طرح جانتا ہی ہے۔“

”بالکل سرکار!“ بالے نے اسے جواب دیا اور پھر رفیق کھوکھر کو باہر نکلنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بھی اس کے ساتھ ساتھ ہی باہر نکل گیا۔ ان کے کمرے سے نکلتے ہی چودھری کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔ وہ ہمیشہ اپنی من چاہی مرادیں پوری ہوتے دیکھنے کا عادی تھا لیکن ماہ بانو کے سلسلے میں اسے مسلسل تباہی کا سامنا تھا۔ وہ ہر بار اس کے ہاتھ میں آتے آتے کسی پختی پختی کی طرح پھسل جاتی تھی اور اب اس کے پیچھے جو لوگ اکھڑے ہوئے تھے، ان کی وجہ سے اس تک رسائی اور بھی مشکل ہو گئی تھی۔ وہ بارہا منے والا بندہ نہیں تھا، نہ ہی اس کی اتنا اجازت دیتی تھی کہ کسی اور کو خود سے بڑھ کر با اختیار تسلیم کرتے ہوئے مقابلے سے پیچھے ہٹ جائے۔ وہ شہینا کی موت پر تعزیت کرنے سجادانا کے ٹھہر گیا تھا اور ان سے گہرے دکھ کا اظہار بھی کیا تھا لیکن یہ تھکا کہ جو جنگ شروع ہو چکی ہے، وہ جاری رہتی ہے۔ اس جنگ میں کتنے مہرے کام آجاتے، اسے غرض نہیں تھی۔ رفیق کھوکھر جیسے معمولی مہرے کو بھی اس نے پڑنا لینے کا فیصلہ کر لیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے کھوکھر کو زندہ رہنے دیا تو آگے جا کر وہ خود اسے مروا دے گا۔ وہ اپنے لیے کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ کھوکھر پولیس کے ہاتھ نہ لگے، اس بات کی اہمیت کا اسے خود بھی اندازہ تھا اور صبح سے اس کے اپنے بندے اسے تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ یہ تو اس کی بد قسمتی تھی کہ وہ اپنے تحفظ کے لیے حق جتانے خود ہی یہاں آ پہنچا اور ان لوگوں کے لیے آسانی پیدا کر دی۔ اس کی فرمائش پر اسے ملاقات کا شرف بخشے ہوئے اس نے اس سے جتنی بھی گفتگو کی تھی، وہ محض دل لگی کے لیے تھی۔ ورنہ فیصلہ تو پہلے ہی ہو چکا تھا اور اس وقت بالا اس فیصلے پر عمل

درا آمد کے لیے ہی کھوکھرو ایک ایسی جگہ منتقل کرنے لگا تھا جہاں تک نہ تو پولیس کی رسائی تھی اور نہ ہی وہ خود واپس لوٹ سکتا تھا۔

☆☆☆

”میں نے ایسے مناظر صرف ٹیلی ویژن پر دیکھے تھے۔ میں کبھی تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ کبھی میں اتنی قرب سے یہ سب دیکھ سکوں گی۔“ دریاے سندھ کے کنارے پر موجود اس بڑے سے پتھر پر بیٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے سادگی سے بتایا۔

”تمہیں یہ سب اچھا لگ رہا ہے؟“ وہ دیکھ رہا تھا کہ وہ اپنے قدم جما کر پتھر پر براجمان ہونے کی کوشش میں کامیاب نہیں ہو پا رہی، چنانچہ سہارا دے کر اس کی کوشش کو کامیاب بناتے ہوئے اس سے پوچھا۔ اس وقت وہ لوگ اس کی فرمائش پر ہی موٹیل سے باہر نکل کر یہاں تک آئے تھے۔ صبح کے اس پہر جبکہ ابھی سورج کی روشنی پوری طرح نہیں پھیلی تھی، دریاے سندھ کے..... کنارے پر بیٹھ کر اس کا نظارہ کرنا واقعی بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔

”ابھی چیزیں تو ہر ایک کو اچھی لگتی ہیں۔ مجھے بھی یہ سب بہت اچھا لگ رہا ہے۔“ اس نے اسی سادگی سے جواب دیا۔ ”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ جب تم مشاہیرم خان کے بھائی کے ساتھ یہاں سے آگے جاؤ گی تو اور بھی کئی خوب صورت مناظر دیکھنے کو ملیں گے۔ مجھے امید ہے کہ تمہارا چلتا بھی وقت یہاں گزرے گا، تم پور نہیں ہو گی۔“ وہ خود بھی اس کے قریب ہی پتھر پر ٹنگ گیا۔

”سنا کر کئی خوب صورت لپٹی جگہ لیکن اس سے بڑھ کر خوب صورت وہ رشتے ہیں جو مجھے اپنے پیچھے چھوڑ کر آنے پڑے ہیں۔ اتنے بہت سارے دن گزر گئے، میں نے اہا اور بے کے بے کی شکل تک نہیں دیکھی۔ مجھے ان کی کوئی خبر نہیں۔ اگر آپ مجھ سے میری خواہش پوچھیں تو میں ان سارے خوب صورت مناظر کے مقابلے میں فیصل آباد میں موجود اپنے چھوٹے سے گھر میں اپنے اہا اور بے کے ساتھ رہنا زیادہ پسند کروں گی۔“ وہ جو ابھی اتنی پرجوش لگ رہی تھی، ایک دم ہی اداس ہو گئی۔ وہ بے اعتباری سے نظر چرا گیا کیونکہ جانتا تھا کہ اس کی یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہو سکے گی۔ وہ شہر اور گھر اسے دوبارہ مل بھی جاتے تو وہاں اس کے پیارے تو نہیں مل سکتے تھے۔

”انسان کی ساری خواہشیں پوری ہونا تو ممکن نہیں ہوتا۔ اپنی ادھوری خواہشوں پر یہ سوچ کر مہر کر لینا چاہیے کہ

جو ہمارے لیے زیادہ بہتر تھا، وہ اللہ نے ہمیں عطا کر دیا۔ میری کامیاب زندگی کے پیچھے یہی سوچ کا فرما رہا ہے۔ میرے بیٹے جس جگہ میں بہت کم عمر تھا، تب ہی ایک حادثے میں انتقال کر گئے تھے۔ ان کے بعد ماموں جان، مہمانی اور سجاد بھائی نے اتنا خیال رکھا کہ میں سمجھتا ہوں اتنا خیال دنیا میں بہت کم لوگوں کا رکھا جاتا ہے۔ خصوصاً آفرین مہمانی تو مجھ پر جان چڑھتی ہیں۔ ان کی تربیت کی وجہ سے میری شخصیت میں کئی ایسے رنگ ہیں جنہوں نے مجھے دوسروں سے کچھ بہتر بنا دیا ہے، ورنہ ہو سکتا تھا کہ میں بھی ان سارے لوگوں کی طرح ہوتا جو اختیار ہاتھ میں آ جانے پر برے بھلی کی تیز کو بیٹھتے ہیں۔ اللہ نے مجھ سے ماں باپ نہیں نعمت لے کر بدلے میں انسانیت کا شعور عطا کیا ہے اور میں اس کے اس فیصلے پر راضی ہوں۔ کیا تم میں حوصلہ ہے کہ تم اللہ کے فیصلوں کو بہتر سمجھ کر ان کے آگے اپنا سر جھکا سکو؟“ وہ بات جواتنے دنوں سے وہ اسے بتا نہیں سکا تھا، ایک دم ہی بتانے کا فیصلہ کرتے ہوئے اس نے اس کے مضبوط کوا بیٹھنے کی کوشش کی۔

”کیا مطلب؟ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ میری بے اور ابا ٹھیک تو ہیں؟“ وہ اس کے سوال پر بری طرح چوٹی۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس تمہارے لیے ان کے بارے میں کوئی اچھی خبر نہیں۔“ اس نے جواب دیا اور آہستہ آہستہ سارے حالات سے آگاہ کرتا چلا گیا۔ ”اتنے دن گزر گئے اس حادثے کو اور مجھے پتا بھی نہیں چلا۔ وہ دونوں مجھ پر اپنی جان چھڑکتے تھے اور میری ہی خاطر اپنی جان سے چلے گئے۔ کتنی بد نصیب ہوں میں۔“ وہ بری طرح سسکتی لگی۔

”کیسی باتیں مت کرو۔ بد نصیب صرف وہ لوگ ہوتے ہیں جو اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کی قدر نہ کریں اور اس کے فیصلوں کو قبول کرنے سے انکار کریں۔ تم پر ایک مشکل وقت پڑا ہے، لیکن جانے کہ جب تم اس آزمائش سے نکلو تو تمہارے ہاتھوں اللہ کتنے بڑے بڑے کام انجام دلاوے۔ ایسے کام جو تمہارے ساتھ ساتھ تمہاری بے اور ابا کی بھی بخشش کا ذریعہ بنیں۔“ وہ اسے سمجھانے لگا اور وہ حیرت زدہ ہی اس کی باتیں سنتی رہی۔ افسرانہ شان کے ساتھ رہنے والا اور آپ تولد کر گھٹو کرنے والا وہ شخص ایسی باتیں بھی کر سکتا ہے، اسے قطعی اندازہ نہیں تھا۔ وہ تصور پر حیرت بنی اس کی صورت دیکھتی رہ گئی۔

”چلو، واپس چل کر ناشتا کرتے ہیں۔ ناشتے کے بعد چاہو تو دوبارہ یہاں آ جانا۔ مشاہیرم خان کا بھائی شام سے پہلے

یہاں نہیں پہنچ سکے گا۔ تم سارا دن آرام سے یہاں کا نظارہ کر سکتی ہو۔“ اس نے مسکراتے ہوئے اس کے رخسار پر ہنسر ہوا آنسو لگی کی پور سے صاف کیا اور اس کا ہاتھ کچڑ کر اٹھاتے ہوئے بولا۔ وہ ساتھ ساتھ چلتے موٹیل کے قریب پہنچے تو کل شام ریسپشن پر نظر آنے والے غریبی اپنی جیب میں روانہ ہوتے ہوئے نظر آئے۔ ان میں سے ایک نے ماہ بانو کی طرف دیکھتے ہوئے ہوائی بوسا اچھالا۔ اس کی اس حرکت پر وہ غصت زدہ ہی ہو گئی۔ شہریار کے ہاتھ پر بھی ناگواری کی شکلیں نمودار ہوئیں۔ ممکن تھا کہ وہ ان سے اچھ جاتا لیکن ان کی جیب حرکت میں آ کر وہاں سے آگے بڑھ گئی تھی، سو یہ ممکن نہ ہو سکا۔ وہ دونوں واپس موٹیل پہنچ گئے اور ناشتے کا آرڈر دیتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد ایک ادیب مزعمر میرانا ناشتے لے کر کمرے میں پہنچ گیا۔

”صاحب! اگرچہ کوئی چادر ہی خریدو گے؟ میری بیوی نے اپنے ہاتھ سے بنائی ہیں۔ بہت اچھی ہیں۔“ ناشتے کے برتن لگانے کے بعد میرے نے اس سے پوچھتے ہوئے ترغیب دی۔

”لا کر دکھا دو۔ اگر پسند آئیں تو لے لیں گے۔“ اس نے اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ تھوڑی دیر بعد میرا جب ناشتے کے برتن لینے آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک تھیلہ تھا۔ تھیلے میں سے چادریں نکال نکال کر وہ ان دونوں کو دکھانے لگا۔ اس کے دعوے کے برخلاف وہ چادریں بالکل بھی اچھی نہیں تھیں۔ کچھ کی کڑھائی بھدی تھی تو کبھی کے رنگ نامناسب تھے۔ وہ بے زار ہو کر اس سے یہ سب سمیٹ لینے کا کہنے ہی والا تھا کہ ایک سیاہ چادر پر نظر پڑی۔ اس چادر پر نپٹے رنگ سے چھوٹے چھوٹے پھول کا ڈھمکے تھے۔ اسے دیکھ کر اسے بے ساختہ ماہ بانو کی وہ چادر یاد آگئی جس کے بغیر وہ ادھوری لگتی تھی۔ اس نے فوراً وہ چادر خرید لی۔ کپڑے کی کوالٹی اور کڑھائی کے مقابلے میں اس کی قیمت بہت زیادہ تھی لیکن اس نے پروا نہیں کی۔ جب میرا ناشتے کے برتن اور اپنا سامان سمیٹ کر باہر نکل گیا تو اس نے وہ چادر ماہ بانو کو تھما دی۔

”یہ میرے لیے ہے؟ میں تو ابھی آپ اپنے گھر کے کسی فرد کے لیے لے رہے ہیں۔“ وہ حیران ہوئی۔

”میں نے یہ تمہارے لیے ہی لی ہے۔ تمہاری چادر عامر کے گھر پر ہونے والے حادثے میں خراب ہو گئی تھی نا اس لیے۔“ اس نے جواب دیا اور پھر تیزی سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ شام تک کا وقت ایسے گزرا کہ وہ زیادہ تر باہر ہی رہا۔ سامنا ہوا ابھی تو زیادہ گھٹو نہیں کی۔ شام کو مشاہیرم

خان کا بھائی اسے لینے پہنچ چکا تھا۔ اس کے ساتھ روانہ ہوتے ہوئے وہ عجیب ادھوری کی کیفیت میں تھی۔ نہ شہریار کا رویہ سمجھ رہا تھا اور نہ ہی اپنی فلی کیفیات۔ کوئی نیا سا احساس تھا جو وہ ایک نئے سفر پر روانہ ہوتے ہوئے اپنے ساتھ لے کر جا رہی تھی۔

☆☆☆

”پیر آباد والے مرکز صحت کی کنسرکشن کا کام مکمل ہو گیا ہے سرائفینجر، ضروری آلات اور دوا میں وغیرہ بھی دو دن کے اندر وہاں پہنچا دی جائیں گی۔ اسٹاف کے ایجنٹ منٹ کا پروسس بھی تقریباً مکمل ہو چکا ہے، بس لیڈی ڈاکٹر کے سلسلے میں مشکل پیش آ رہی ہے۔ کوئی لیڈی ڈاکٹر فی الحال وہاں جا کر کام کرنے کے لیے راضی نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ہم منتقل اشتہار شائع کر رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے دو چار دن میں یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے۔“ وہ حق ہی اپنے طویل سفر سے واپس لوٹا تھا اور آج دفتر میں موجود تھا۔ پچھلے کئی دن کی مصروفیات کی وجہ سے اسے علاقے میں جاری کاموں کے بارے میں جاننے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ چنانچہ آج پہلی فرصت میں اس نے عبد المنان سے اس سلسلے میں معلومات حاصل کرنا شروع کر دی تھیں۔

”اچھی پروگرامیں ہے۔ لیڈی ڈاکٹر والا مسئلہ بھی انشاء اللہ جلد حل ہو جائے گا۔ تم ایسا کرو کہ اشتہار میں یہ بھی پیش کر دو کہ اس جاب کے لیے اہل قرار پانے والی خاتون کو ان کی مثالی سمیت رہائش کی سہولت دی جائے گی۔ عموماً خواتین دور دراز علاقوں میں جاب کرنے کے لیے تنہا ہی اور رہائشی مسائل کی وجہ سے ہی راضی نہیں ہوتیں۔ ہم یہ سہولت پر دوا کر کے ان کی یقین دہانی کروائیں گے تو انشاء اللہ جلد اچھا رزلٹ سامنے آئے گا۔“ اب تک کی کارکردگی پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے اس نے ایک مشورہ بھی دیا جو عبد المنان نے نوٹ کر لیا۔

”نور پور میں کیا صورت حال ہے؟ وہاں کا کام کیا چل رہا ہے؟“

”وہاں بھی تیزی سے کام جاری ہے۔ چودھری بختیار کے تعاون کی وجہ سے وہاں ہمیں بڑی سہولت ہے۔ امید ہے کہ جلد ہی وہاں کا کام مکمل ہو جائے گا۔“

”گذا؟“ اس اطلاع پر اس نے خوشی کا اظہار کیا پھر پوچھنے لگا۔ ”چودھری، باجوہ اور تارڑ کے ٹرائیکا نے تو میرے پیچھے کوئی گزبڑ کرنے کی کوشش نہیں کی؟ خلیفہ سے باہر جانے والے مال پر اچھی طرح نظر تو رکھی جا رہی ہے نا؟ اس معاملے

پر چپک رکھنا بہت ضروری ہے۔ ہم ذرا بھی لوز پڑے تو یہ لوگ پھرسے اٹھیں ہو جائیں گے۔“

”آپ بے فکر ہیں سر! میں اس سلسلے میں مسلسل ڈی ایس پی منظور سے رابطے میں ہوں۔ اب تک وہ ہم سے بھرپور تعاون کر رہا ہے۔ سخت نگرانی کی وجہ سے کسی کی ہمت نہیں کہ یہاں سے کچھ اٹھانے کی کوشش کر سکے۔ ویسے بھی باجوہ معطل ہے اور چودھری بھی پچھلے دنوں زیادہ تر لاہور میں رہا ہے۔ اس لیے ان کا اثر ان کے یہاں بالکل بھی اٹیکو نظر نہیں آیا۔“

”اچھی بات ہے۔“ اس نے ذرا سارٹیکس ہو کر بیٹھے ہوئے کہا اور پوچھنے لگا۔

”اور کوئی اہم بات... کوئی خاص مسئلہ؟“

”آپ کی غیر موجودگی میں اللہ آباد سے کچھ لوگ آئے تھے۔ وہ لوگ شاہ نواز کے ساتھ غائب ہونے والے لڑکوں کی بازیابی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ انہیں دین محمد اور اس کی فیملی کے بارے میں بھی تشریحات تھیں کہ وہ لوگ کہاں غائب ہو گئے ہیں؟ پولیس ان لوگوں کو اپنے ساتھ گرفتار کر کے لے گئی تھی۔ یہ بات گاؤں والوں سے پتہ نہیں چلے۔ اس لیے وہ مطالبہ کر رہے تھے کہ اگر دین محمد کا خاندان کسی جرم میں ملوث بھی ہے، تب بھی ان لوگوں کے بارے میں کوئی خبر قومی چاہیے۔“

”اللہ آباد والوں کے مطالبات اپنی جگہ بالکل درست ہیں لیکن وہ لوگ اندازہ نہیں کر سکتے کہ یہ معاملہ کتنا زیادہ پیچیدہ ہے۔ اس معاملے میں غیر ملکی ہاتھ ملوث ہونے کے جو شواہد سامنے آئے ہیں، اس کے بعد صورت حال یکسر مختلف ہو چکی ہے۔ خفیہ ایجنسیز اس سلسلے میں کام کر رہی ہیں لیکن فی الحال مجھے ایسی کوئی خبر نہیں ملی کہ میں غائب ہونے والے لڑکوں کے سلسلے میں کچھ بتا سکوں۔ دین محمد کی فیملی والے معاملے کے بارے میں الیٹ میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ انہیں تو تارڑ صاحب نے اپنی فیملی دکھانے کے چکر میں بلاوجہ بھٹاس رکھا ہے۔ میری پوری کوشش ہوگی کہ ان... بے چاروں کی جان بخشی ہو جائے۔ وہ بے چارے تو اپنے بیٹے کی حماقت کو بھگت رہے ہیں۔ اگر وہ لڑکا شاہ نواز کے بھکاؤ سے میں آکر بم بلاسٹ میں ملوث نہ ہوتا تو خود بھی زندہ رہتا اور اپنے گھر والوں کو بھی مشکل میں نہ ڈالتا۔“ عبدالمنان کی بات کا جواب دیتے ہوئے وہ تھوڑا سا اداس ہو گیا۔

اس وقت اس کی نظر میں جذباتی سے چودہ پندرہ سالہ عبدالستین کی شکل محوم مٹی تھی۔ اپنی بہن کے انخواہ

آبروریزی اور پھر بے دردی سے قتل کر دیے جانے کے المناک حادثے نے اس کم عمر لڑکے کو اس حد تک متاثر کر دیا تھا کہ وہ شاہ نواز جیسے شخص کے بھگانے پر اپنی ذات سمیت دوسرے بھی کئی افراد کی موت کا سبب بن گیا۔ نور پور میں ہونے والا وہ بم بلاسٹ جس میں عبدالستین خود شہید اور کے طور پر سانسے آیا تھا، اسے اب بھی کسی حالیہ دیکھی گئی فلم کے مناظر کی طرح یاد تھا۔ ٹیل بھرنی ہی تو بات تھی وہ... لیکن اس ایک ہل میں کسی جیتے جاگتے وجود کا اہل بن گئے تھے اور کتنوں ہی کے حصے میں عمر بھر کی معذوری آگئی تھی۔ اداس کر دینے والے ان بوٹھلوں میں انٹرکام بجنے سے ارتعاش پیدا ہوا۔ عبدالمنان نے ریسورٹا کر دوسری طرف سے کسی جانے والی بات سنی پھر ماتھوٹیں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے اطلاع دی۔ ”چودھری افتخار صاحب ملاقات کے لیے تشریف لائے ہیں سر!“ اس اطلاع کو سن کر اس کے ماتھے پر ناگواری کی ٹھنکیں پھیل گئیں۔ اس شخص سے ملنا اسے ہمیشہ ہی طبیعت پر گراں گزرتا تھا لیکن پھر بھی ملنا پڑتا تھا۔ شینا کے انتقال پر بھی وہ سجاد رانا کی کوٹھی پر تعزیت کے لیے آیا تھا۔ وہاں بھی اسے دھکے دے کر باہر نکال دینے کی خواہش کو قوت میں رکھتے ہوئے اسے برداشت کرنا پڑا تھا اور اب پھر وہ اس کے ضبط کو آزمانے کے لیے اس کے دفتر میں موجود تھا۔

”بولو... دیکھتے ہیں کہ کس سلسلے میں چودھری صاحب کو ہماری یاد آئی ہے۔“ عبدالمنان کی خود پر مبنی سوالیہ نظروں کے جواب میں بالآخر اس نے ملاقات کے لیے رضامندی دے دی مگر لے کر اس کی سب سے صاف ظاہر تھا کہ وہ یہ رضامندی خود پر بڑا جبر کرتے ہوئے طوعاً و کرہاً ہی دے رہا ہے۔ بہرحال، چودھری کے اندر آنے تک وہ خود کو کمپوز کر کے چہرے کے تاثرات کو سپاٹ بنالینے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

”کیا حال چال ہے اسی صاحب؟ سنا ہے کل ہی واپسی ہوئی ہے۔ یہ تو غلط بات ہے جناب! آپ کی غیر موجودگی میں بھلا ہمارے ضلع کا انتظام کیسے چل سکتا ہے؟ اب تو آپ ہی یہاں کے کرتا دھرتا ہیں۔ زیادہ دنوں کے لیے یہاں سے دور نہ رہا کریں، آپ کے پیچھے کوئی گزربھوئی تو کون دیکھے گا؟“

”مجھے خود بھی اپنی ذمہ داری کا احساس ہے چودھری صاحب لیکن آپ سے بڑھ کر کس کو خبر ہوگی کہ پچھلے دنوں میں کس قدر کراسز میں رہا ہوں ان کراسز سے منت کر یہاں پہنچنے میں کچھ وقت لگ گیا۔ آپ سنا ہیں، آپ کی طرف تو سب ٹھیک ٹھاک ہے نا؟ سنا ہے آپ بھی پچھلے دنوں زیادہ تر

گاؤں سے باہر ہی رہے ہیں؟“

چودھری کی فضول بکواس کے جواب میں اس نے اشاروں کنایوں میں اسے بتا دیا کہ وہ جانتا ہے کہ بہت سارے گھپلوں کی ذمہ داری چودھری پر عائد ہوتی ہے مگر چودھری ڈھیت بندہ تھا۔ اس کے جتانے کا برائے بغیر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”اللہ کا کرم ہے کہ میری طرف سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہی ہے۔ جو نہیں ہے، اسے بھی میں ٹھیک کر لوں گا۔ اس وقت تو میں آپ کے پاس دو خوش خبریوں کے ساتھ حاضر ہوا ہوں۔ امید ہے آپ سن کر خوش ہوں گے۔“

”کیسی خوش خبریاں؟“ وہ ذرا سا چونکا۔ چودھری افتخار جیسے شخص کی طرف سے ملنے والی کوئی خبر کچ خوشخبری ہی ہوتی، اس بات پر یقین کرنا تھوڑا مشکل ہی تھا۔

”میرے لیے تو بھی دونوں ہی خوش خبریاں بہت اہم ہیں لیکن پہلے میں آپ کو وہ خبر سناؤں جس سے نہ آپ محسوس کریں گے کہ ہم نے آپ کا ایک اہم مسئلہ حل کر دیا اور ہمیں بھی اپنے علاقے کی اتنی ہی فکر ہے جتنی آپ کو۔“ سیدی طرح جواب دینے کے بجائے اس نے تمہید بانوہ کر شہر یار کے محسوس کو بھڑکانے کی کوشش کی لیکن اس نے اپنے چہرے پر ایسا کوئی تاثر نہ آنے دیا جس سے چودھری کو اس کی دیکھی کا اندازہ ہو سکے۔ اس کے اس سے نیازانہ انداز پر وہ تھوڑا سا جڑبو تو ہو لیکن اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

”سنا تھا کہ اسپتال کے لیے لیڈی ڈاکٹر کا بندوبست نہیں ہو پا رہا۔ ہم نے سوچا ہم یہ مسئلہ حل کر دیتے ہیں، آخر کو یہ ہمارے علاقے کا ہی مسئلہ ہے۔ آپ چار دن کی نوکری میں یہاں کے مسائل حل کرنے کے لیے اتنے ہنگام رہتے ہیں تو ہم تو خیر یہاں کے جدی پیشگی مہرانوں میں سے ہیں۔“ وہ یقیناً یہ ساری باتیں اسے اشتعال دلانے کے لیے کر رہا تھا لیکن کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ شہر یار کو اندازہ تھا کہ ماہ بانو کے ایک بار پھر ہاتھ سے نکل جانے پر وہ کتنا تھلا یا ہوا ہے اور اب اس تھلاہٹ کے اظہار میں خود کو اس کے مقابلے میں زیادہ با اختیار اور عزت دار ثابت کرنے کے لیے ایسا باتیں کر رہا ہے۔ وہ کمال ضبط سے کام لیتا ہوا اس کی ساری موشگافاں ستار ہا۔

”ہم نے آپ کے اسپتال کے لیے ایک قابل لیڈی ڈاکٹر کا انتظام کر دیا ہے۔ لیڈی ڈاکٹر کی رہائش کا انتظام اور تنخواہ وغیرہ سب ہمارے ذمے ہوگی۔“

”یہ تو آپ نے بہت زیادہ تکلف کیا چودھری

صاحب! رہائش اور تنخواہ کا انتظام تو موتی والا صاحب ن جانکا دے قائم کردہ ٹرسٹ کے ذریعے بھی ہو سکتا تھا... آخر اسپتال کی تعمیر بھی تو اسی ٹرسٹ کے ذریعے ہو رہی ہے۔“

چودھری کے اس قدر جتانے پر اس سے برداشت نہیں ہوا تو خود بھی بہت سلیقے سے اسے بتا دیا کہ جہاں اتنے بڑے بڑے اخراجات اس کے تعاون کے بغیر ہو رہے ہیں، وہاں یہ کام بھی ہو سکتا ہے۔

”تکلف کی کیا بات ہے جناب! اس بہانے کچھ ٹوٹا ہوا ہم بھی کمائیں گے۔ ساری نیکیاں آپ کے حصے میں ہی چلی جائیں یہ تو ہم سے برداشت نہیں ہوگا۔ کچھ نہ کچھ تو ہمارا بھی ہونا چاہیے اس کا رٹوٹا ہمیں۔“ اس کا جتنا محسوس کر کے وہ فوراً ہی منافقت بھری عاجزی کا مظاہرہ کرنے لگا۔

”چلیں جس میں آپ کی خوشی۔ اگر آپ نیکیاں کمانا ہی چاہتے ہیں تو مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ اب میرانی کر کے ذرا جلدی سے دوسری خوشخبری بھی سنا دیں۔ آپ کو تو علم ہی ہے کہ میں کتنے دنوں بعد آج واپس آیا ہوں۔ مجھے کئی معاملات پر توجہ دینی ہے۔“ گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے اس نے ملاقات کو مختصر کرنے کی کوشش کی۔

”دوسری خوشخبری ذاتی نوعیت کی ہے لیکن آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ آپ کے دوست چودھری بختیار اور ہمارے درمیان رشتے داری قائم ہو رہی ہے۔ ہم اپنے بچہ کی شادی چودھری بختیار کی بہن سے کر رہے ہیں۔“

چودھری کی دی ہوئی یہ اطلاع ذرا چونکا دینے والی تھی۔ اسے علم تھا کہ چودھری بختیار کی اکلوتی بہن فریدہ اپنے چچا زاد قربان میں دلچسپی رکھتی ہے۔ خود چودھری افتخار اور چودھری بختیار کے درمیان تعلقات کی نوعیت بھی زیادہ اچھی نہیں تھی... بلکہ ایک وقت تو ایسا بھی آیا تھا جب چودھری بختیار نے روایت سے انحراف کرنے کی کوشش کرتے ہوئے چودھری افتخار کے دادا کے عرس کے موقع پر سونے کے تاروں والی چادر چڑھانے سے انکار کر دیا تھا لیکن بعد میں اسے پانی کے مسکے کی وجہ سے چودھری افتخار کے سامنے کھٹنے کھٹنے پڑے تھے۔ ان حالات میں یہ رشتے داری قائم ہونا کچھ انوکھی بات تھی۔ فریدہ کی پسند والا معاملہ تو خیر اس لیے نظر انداز کیا جا سکتا تھا کہ جس شخص کو وہ پسند کرتی تھی، اس کی فیملی نے اس کے بھائی کے تعلقات سے حد خراب تھی۔ پھر لڑکیوں کی پسند ناپسند کو تو ابھی تک کی شہری گھرانوں میں بھی بہت زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی تو ایسے میں فریدہ بھی گاؤں کی پروردہ لڑکی کی پسند کون پوچھتا؟ لیکن وہ مخالف

چودھریوں کے درمیان رشتے داری حیرت انگیز تھی۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ چودھری بختیار حشیت کے اعتبار سے چودھری افتخار سے بہت کمتر تھا۔

”یہ تو واقعی اچھی خبر ہے۔ آپ کو مبارک ہو۔ میرے علم میں نہیں تھا کہ آپ کے صاحب زادے امریکا سے تشریف لائے ہوئے ہیں۔ اچھا ہے، مجھے ان سے ملاقات کا موقع مل جائے گا۔“ اپنی حیرت کا اظہار کرنے کے بجائے اس نے چودھری کو مبارکباد دی۔

”خیر مبارک! لیکن آپ کا یہ اعزاز غلط ہے کہ چودھری مراد یہاں آیا ہوا ہے۔ وہ تو امریکا میں ہی ہے اور بہت مصروف ہے۔ پھر شادی ہو بھی اتنی جلدی میں رہی ہے کہ اس کا پہنچنا ممکن ہی نہیں۔ وقت کی کمی کی وجہ سے زیادہ لوگوں کو دعوت بھی نہیں دی گئی ہے۔ بس آس پاس کے ہی خاص خاص لوگ ہیں جن کو دعوت نامے دیے ہیں۔ آپ کا دعوت نامہ میں یہ طور خاص خود لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔“ چودھری نے دعوت نامہ اس کے سامنے رکھا تو اس نے بے ساختہ ہی اسے فوراً کھول لیا۔ دعوت نامے پر دولہا کا نام چودھری بہزاد عالم شاہ تحریر تھا۔ وہی بہزاد عالم شاہ جسے اس نے چودھری کی حویلی میں ایک ایب نارل لڑکے کی حیثیت سے دیکھا تھا۔ ایک اچھی بھلی لڑکی کے دولہا کے طور پر اس ایب نارل لڑکے کا نام دیکھنا اس کے لیے ایک شدید ذہنی جھٹکا ثابت ہوا۔ ساتھ ہی اسے یہ بھی یقین آ گیا کہ چودھری افتخار سے کسی بھی وقت کوئی بھی غیر معمولی اور غیر انسانی کارنامہ سرانجام دیے جانے کی امید رکھی جاسکتی ہے۔ جس شخص میں انسانیت نہ ہو، بھلا اس سے انسانیت کے احترام کی امید رکھی بھی کیسے جاسکتی ہے؟ چودھری کے اندر ذرا بھی انسانیت ہوتی تو آج ماہ بانویوں و بد رکیوں ہوتی؟ اور جو اس سالہ ریتیں کھوکھر اپنی جان سے کیوں جاتا؟ ہشام سے واپسی میں شہر یا تھوڑی دیر کے لیے لاہور میں سجاد رانا کے گھر رک کر آیا تھا۔ وہاں اسے ریتیں کھوکھر کے قسمت کی اطلاع سننے کو ملی تھی اور اس اطلاع کو سننے کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اس بے وقوف انپکڑ کی موت کا ذمہ دار کون ہو سکتا ہے؟ ریتیں کھوکھر ایک ایسا فرد تھا جو پولیس کے ہاتھ آ جاتا تو چودھری کے خلاف ایک مضبوط گواہ ثابت ہو سکتا تھا۔ ظاہر ہے، یہ بات چودھری بھی سمجھتا تھا اس لیے اس نے خود کو بچانے کے لیے اس کا کام تمام کر دیا۔ افسوسناک بات یہ تھی کہ وہ لوگ یہ سارے حقائق جانتے تھے لیکن کوئی ٹھوس ثبوت نہ ہونے کے باعث چودھری پر ہاتھ ڈالنے سے

معدود تھے اور وہ ان کی بے بسی کا تماشا دیکھتا اپنے مظالم کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیے آزادی سے گھوم رہا تھا۔ چودھری بہزاد کی شادی کے دعوت نامے کی صورت اس کے ظلم کا ایک اور مظہر اس وقت اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ حیران تھا کہ افتخار عالم شاہ کے اس ظالمانہ فعل میں چودھری بختیار جیسا اچھی فطرت رکھنے والا بندہ کیونکر شامل ہوا؟

☆☆☆

”ایسا کر رانی، میرے یہ کپڑے استری کر دے۔ میں تا جوڑ آپا کے ساتھ شہر بھی، تب انہوں نے زبردستی مجھے یہ جوڑا دلویا تھا کہ تجھ پر بہت اچھا لگے گا۔“ پر تب میرا ہی نہیں چاہا تھا ایسا شوخ رنگ پیٹنے کو۔ اتنے عرصے سے ایسے ہی ان پھوڑا پڑے یہ جوڑا، پر آج ہی کر رہا ہے اسے پہننے کو۔ بس تو جلدی سے اسے اچھی طرح استری کر دے۔“ اندری سے سرخ رنگ کا موتیوں کے کام والا ایک ریڈی میڈ سوٹ نکال کر رانی کے ہاتھ میں تنہا کی کشوری آواز میں بڑی تھک تھی۔ رانی نے اس کا تھپا ہوا جوڑا ہاتھ میں تولے لیا لیکن اپنی جگہ تذبذب کی کھڑی رہی۔

”کیا ہے؟ مل کیوں نہیں رہی اپنی جگہ سے؟ ابھی موقع ہے۔ ایسا کی وہ جاسوس نوکرانیاں اپنے کاموں میں مصروف ہیں۔ تو جلدی سے یہ کپڑے استری کر کے میری الماری میں ٹانگ دے۔ اگر ان جاسوسیوں کی نظر پڑ گئی تو وہ میں لگ جائیں گی کہ میں نے آج یہ کپڑے کیوں استری کروائے ہیں۔“ رانی کو اپنی جگہ تھکے ہوئے دیکھ کر اس نے اسے ٹوکا۔

”میرا جی بول رہا ہے بی بی! بار بار اس طرح حویلی سے نکل کر جانے میں برا خطرہ ہے۔ کسی کو خبر ہوگی تو بڑی مشکل پڑ جائے گی۔“ وہ اپنے اندر کا وسوسہ زبان پر لے آئی۔

”تجھے اپنی جان جانے کا ذریعہ کیا ہے کیا؟“

”نہ بی بی نہ! اپنی جان کی فکر نہیں ہے مجھے۔ آپ کی خاطر اگر جان چلی جاتی ہے تو پروا نہیں، پر آپ کا سوچ کر دل ہول ہے۔ مجھے خبر ہے کہ یہاں سب آپ کی چھوٹی سونی خواہشیں تو آسانی سے پوری کر دیتے ہیں، پر اس معاملے کی ذرا بھی تھک پڑ گئی تو آپ کو معافی نہیں ملے گی۔“ کشور کے کمرے کے لہجے میں پوچھنے پر وہ بھٹکا کر وضاحت پیش کرنے لگی۔

”مجھ سے زیادہ اچھی طرح مجھے یہ بات معلوم ہے، پر سوچتی ہوں کہ اب جان بھی چلی جائے تو کوئی بات نہیں۔ یوں گھٹ گھٹ کر جینے سے ایک بار ہی مر جانا اچھا ہے۔ کم سے کم مرتے وقت یہ سکون تو ہوگا کہ اپنی مرضی اور خوشی سے نکلی ہوا میں چند سانس لینے کوں نہیں۔“ صحبت نے اسے اتنا

غیر متاثر کیا تھا کہ اب موت کی بھی پروا نہیں رہی تھی۔

”پھر بھی بی بی! میری اوقات تو نہیں آپ کو شوروہ دینے کی، پر میں یہی کہوں گی کہ آج آپ نہ ہی جائیں تو اچھا ہے۔ آج تو وہ ڈے چودھری صاحب بھی حویلی میں ہیں۔ ان کے ہوتے سارے نوکر جا کر زیادہ ہی ہشیار رہتے ہیں۔ ہمارا کلنا مشکل ہو جائے گا۔“ وہ مقدور بھر اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”آج نہ روک رانی! آج میں اپنی خواہش پر نہیں ان کے بلاوے پر جا رہی ہوں۔ آج پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ انہوں نے خود مجھے بلایا ہے، ورنہ اب سے پہلے ہمیشہ میں ہی ضد کر کے ان سے ملنے جاتی تھی۔ اب انہوں نے بلایا ہے تو کیسے انکار کر دوں؟ آج تو میں رک نہیں نہیں سکتی۔ آج تو مجھے ہر حال میں جانا ہے۔“

”ٹھیک ہے بی بی! جیسی آپ کی مرضی۔“ اس کے ارادے کی مضبوطی دیکھتے ہوئے بالآخر رانی نے ہار مان لی اور کپڑے لے کر پلٹنے لگی۔

”کپڑے لے کر باہر مت جانا، یہیں میرے کمرے میں ہی بیٹھ کر ان پر استری پھیر دے۔“ کشور نے اسے ٹوکا۔

”جی اچھا بی بی!“ اس نے تابع داری سے جواب دیا لیکن لہجہ پر مشرور ہی تھا۔

”کیوں اتنا پریشان ہو رہی ہے؟ اس سے پہلے بھی تو جا چکے ہیں ہم۔ تب کسی کو خبر ہوئی تھی جواب ہو جائے گی؟ چھپکلی بار کی طرح آج بھی تو سب کو دودھ میں نیند کی دوا ملا کر پلا دینا۔ کسی کو کانوں کاں خبر نہیں ہوگی اور ہم واپس بھی آ جائیں گے۔ دوا تو ہوگی تاہم یہ پاس؟“ اس کا انداز دیکھ کر کشور نے اسے تسلی دینے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

”جی بی بی! دو اتو ہے، اس کا مسئلہ نہیں۔ پر مجھے رات سے پہلے جا کر اکو سے بھی ملنا ہو گا کہ وہ تیار رہے اور چوکیدار کو بھی ادھر ادھر کرنے کا بندوبست کر دے۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ ادھر اسکول کی دیکھ بھال کے لیے چوکیدار ہوتا ہے۔ آپ وہاں جائیں اور وہ وہاں ہو تو کچھ اچھی گل نہیں ہوگی۔“ اس نے ذرا تفصیلی جواب دیا۔

”ٹھیک ہے، تو اپنے سارے کام نمٹالے۔ میری طرف سے رات تک تیری چھٹی ہے۔ مغرب کے بعد لوٹ کر آ جانا۔“ کشور نے اسے اجازت دی۔ جب سے انڈسٹریل ہوم کا آغاز ہوا تھا، رانی سہ پہر کے بعد حویلی آنے لگی تھی۔ کشور نے اپنی سفارش سے اسے انڈسٹریل ہوم میں کام کرنے کی اجازت دلائی تھی۔ وہاں سے فارغ ہو کر وہ حویلی

آتی اور پھر باقی کا وقت وہیں گزارتی۔ اپنے گھر اس کا دن میں ایک آدھ گھنٹے کے لیے ہی جانا ہوتا تھا لیکن یہ معمول اسے اس لیے زیادہ گراں نگر نہ تھا کہ حویلی میں اس کی حیثیت کشور کی خاص ملازمت کی سی ہو چلی تھی اور کشور کا سلوک اس کے ساتھ بہت اچھا تھا۔ اس وقت بھی وہ اپنے تمام تر اندیشوں اور وسوسوں کے باوجود کشور کے احکامات کی پیروی کرنے کے لیے راضی ہو گئی۔ ان کو کورات گئے چوری جیسے اسکول تک چھوٹی بی بی کو لے جانے کے لیے راضی کرنے کا مرحلہ ہمیشہ سب سے دشوار ثابت ہوتا تھا لیکن وہ کچھ اپنی محبت کے واسطے دے کر اور کچھ کشور کی بھجوانی مٹی ریم کے زور پر اسے تیار کر رہی تھی۔ آج بھی اس نے ایسا ہی کیا۔ حسبِ حکم مغرب کے بعد اس کی حویلی میں واپسی ہوئی تو سب کچھ سیٹ ہونے کی خوش خبری ساتھ تھی۔ رات گہری ہونے کے بعد سب کے اپنے کمروں میں چلے جانے تک کا وقت کشور نے بڑی بے چینی سے گزارا۔ حسبِ معمول جب رانی سب کو ان کے کمروں میں دودھ کے گلاس پہنچانے لگی تو وہ اپنا کمر بند کر کے تیار ہونے لگی۔ ایک تو سرخ رنگ کا لٹینا بائکین، دوسرے اس کی دل سے خود کو سنوارنے کے لیے کی گئی جدوجہد۔ مکمل طور پر تیار ہونے کے بعد وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی تو خود اس کی اپنی نظریں بھی اسے سراسر بے رحم نہ رہ سکیں۔ رانی اپنے کام سے فارغ ہونے کے بعد واپس آئی تو اس نے سبھی بر ملا اس کی تعریف کی۔ پھر وہ دونوں کچھ دیر بعد یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ سب لوگ شہر آدھ دودھ کی کمرہری نیند سو چکے ہیں، روانگی کے لیے تیار ہو گئیں۔ کشور کی مسمری اور پیچھے کار پیٹ پر اس اعزاز سے گاؤں گئے رکھ کر ان پر چادر پڑ پھیلا دی گئیں جیسے وہ اور رانی دونوں سو رہی ہوں۔ رانی نے بندوبست کیا تھا کہ حویلی کے کینوں کے علاوہ کچھ اور شادو بھی خواب آور گولیاں ملا دودھ بی بی لیں اس لیے راستے میں انہیں کسی رکاوٹ کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ دے دے قوموں چلتی وہ دونوں حویلی کے پچھلے حصے میں پہنچ گئیں۔ یہاں عقی دیوار میں ایک دروازہ تھا جو حویلی کے پچھلے حصے سے متصل چودھری کے آبائی قبرستان میں کھلتا تھا۔ اس دروازے پر ہر وقت کالا پڑا ہوتا تھا۔ کبھی حویلی کی خواتین اپنے بزرگوں کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے قبرستان جاتیں تو جب یہ کالا کھولا جاتا۔ ٹالے کی چابیاں چوکیدار کے پاس ہوتی تھیں۔ رانی نے ایک دن ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے چابیوں کے گھمے سے اس دروازے کے ٹالے کی چابی اڑائی تھی اور پھر اٹھکٹ بنوانے کے بعد واپس کچھ میں پہنچا دی تھی۔ اب قبرستان کی طرف

کھلنے والا ہوئی دروازہ خفیہ آمد و رفت کے لیے استعمال ہو رہا تھا۔ آج بھی وہ دونوں اسی دروازے سے گزر کر قبرستان میں پہنچیں اور رات کے ہولناک سناٹے اور قبرستان کی مخصوص وحشت کی پروا کیے بغیر قبروں کے درمیان سے گزرتی آگے بڑھنے لگیں۔ عام حالات میں کوئی لڑکی یقیناً تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ رات کے اس پہر کسی قبرستان سے گزرتی لیکن محبت کی شوریدہ سری نے کشور کو ہر خوف سے آزاد کر دیا تھا۔ رانی حق و فاداری نبھانے کے لیے اس کا ساتھ دیتی تھی۔ اس وقت بھی ایک ہاتھ میں نارنج تھا وہ بڑی مستعدی سے اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ نارنج کو مستقل جلائے رکھنے کے بجائے وہ وقفے وقفے سے ہنس لہو بھر کے لیے روشن کرتی تھی تاکہ آگے کا راستہ واضح ہو جائے۔ مستقل روشنی کیے رکھنے میں کسی کے متوجہ ہو جانے کا خطرہ تھا، چنانچہ سیاہ چادروں میں اپنے اپنے وجود چھپائے انہوں نے تقریباً تیار پٹی میں ہی قبرستان کو پار کیا اور اس مقام پر پہنچ گئیں جہاں اکوٹا سے سمیت ان کا منتظر تھا۔ کشور کو دیکھ کر اس نے سلام کیا جس کا اس نے سر کی جنبش سے محض اشارے میں جواب دیا اور تانے میں سوار ہو گئی۔ رانی بھی اس کے ساتھ ہی تھی۔ ان دونوں کے سوار ہوتے ہی اکوٹا نے تانے کو حرکت دے دی۔ تاریک اور سنسان راہوں سے گزرتا تانے کی شدہ منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ سفر اتنا طویل نہیں تھا جتنا خوف اور اندیشوں میں گھرے ہونے کے باعث محسوس ہوا لیکن یہ احساس صرف اکوٹا اور رانی کے لیے تھا۔ کشور تو ہر خوف سے آزاد آنے والے لمحوں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ آفتاب سے باتیں کرنا، ملنا اور اسے دیکھنا اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی تھی۔ ایسی خوشی جس کے سامنے زندگی کی اپنی حیثیت بھی گھٹ جاتی تھی۔ جس کی خاطر زندگی قربان کر دینا بھی مہنگا سودا نہیں تھا اور پچھلی بار کی ملاقات نے تو اس کے انگ انگ میں نشہ سا پھیر دیا تھا۔ اس نشے کا سرور وہ اب تک اپنے اندر محسوس کرتی تھی اور اس وقت بھی ایک سرور کی کیفیت میں ہی اپنے محبوب سے ملنے جا رہی تھی۔ چنانچہ اسے خبر بھی نہ ہو سکی کہ راستہ کیسے اور کب ملے ہو۔ سو وہ رانی کی آواز پر چونکی جو اسے منزل پر پہنچ جانے کی اطلاع دے رہی تھی۔ اس اطلاع پر وہ چونک کر تانے سے پیچھ اتری۔ انڈسٹریل ہوم کے دروازے پر تالا نہیں تھا جس کا مطلب تھا کہ آج آفتاب ان سے پہلے پہنچ چکا ہے۔ رانی نے آگے بڑھ کر ہولے سے دروازے پر دستک دی۔ فوراً ہی دروازہ کھل گیا اور آفتاب کا چہرہ نظر آیا۔ اسے سامنے پا کر کشور بلا جھجک اندر داخل ہو گئی۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی

دروازہ فوراً بند کر لیا گیا۔ آج بھی اندر وہی پہلے والا ماحول تھا۔ موسم ہی اسی دن کی طرح ہی ایک آٹھ سو رگی مل رہی تھی اور کمرے میں بس اتنی ہی روشنی تھی کہ وہ ایک دوسرے کے دھندلے دھندلے سے نقش و نگار دیکھ سکتے تھے۔ البتہ محسوس کرنے کا معاملہ مختلف تھا۔ وہ ایک دوسرے سے فاصلے پر کھڑے ہونے کے باوجود ایک دوسرے کی کیفیت سمجھ سکتے تھے۔ وہ گویا کسی ساگر اور ندی کی مانند تھے۔ ندی بڑی۔ بے قرار سی ہے چل کر ساگر سے ملنے آتی تھی تو ساگر بھی اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لینے کو بے قرار تھا مگر اس سے قبل کہ ان کی یہ بے قراری کوئی رنگ دکھائی، باہر سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کشور دروازے کے قریب کھڑی تھی اس لیے اس نے پہلے سے آواز ہی سنیں۔ آوازوں سے لگتا تھا کہ تین چار افراد دل کر اس طرف آرہے ہیں۔ وہ ایک دم شکاری کی آہٹ پا جانے والی کسی ہرنی کی طرح سر اٹھ ہو گئی۔ قدموں کی چاپیں عین دروازے کے قریب آ کر گئیں اور اگلے ہی لمحے سناٹے میں ابھرنے والی دستک کی آواز نے اسے یوں ہراساں کیا جیسے دستک کے بجائے کسی زوردار بم دھماکے کی آواز سنائی دے گئی ہو۔ اس کا دل زور زور سے دھک دھک کرتا پھیلتا تو نوکر باہر نکلنے کو فرما رہے ہوئے لگا۔ آفتاب نے اس کی یہ وحشت زدہ حالت دیکھی اور شاید دروازہ کھولنے کے ارادے سے آگے بڑھا۔

”من... نہیں۔“ دروازے کی کنڈی کی طرف اس کا ہاتھ بڑھنے سے قبل ہی کشور نے لپک کر اس کا بازو دبوچ لیا اور یوں خوف زدہ نظروں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگی جیسے دوسری طرف موت کا فرشتہ منتظر کھڑا ہو۔

”دروازہ مت کھولیں اور اگر یہاں سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ ہے تو آپ چپکے سے یہاں سے باہر نکل جائیں۔“ آفتاب کا بازو پکڑے پکڑے ہی اس نے سرگوشی میں اسے مشورہ دیا۔ آفتاب نے اس مشورے پر چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ آنکھوں میں ناچتی وحشت، خوف، تھر تھر کا پتہ بدن، دہشت زدہ دل کی بے ترتیب دھڑکن کا پتا دیتا جیسے کاغذ بجزر... ہر ہر شے گواہی دے رہی تھی کہ اس نے کسی آنے والے طوفان کی آہٹ سنی ہے پھر بھی وہ اسے یہاں سے بھاگ نکلنے کا مشورہ دے رہی تھی اور اسے طوفان سے بچا کر خود اس کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھی۔ اس ایثار و قربانی یاد دہانگی کو فقط ایک نام ہی دیا جاسکتا تھا... محبت...!

حادثات و سلخات کی شکار... پناہ کی تلاش میں سرگرداں
ماہ بانو کی داستان حیات کے واقعات اٹلے ماہ پڑھے



تقدیم کی فہرست گری، قسمت کی جاہلاری یا مقدر کا کیل لئے اور چھڑ جائے ماؤں کی کہانی

اسما قادری

کتاب

نویں قسط

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے لیکن اس کی باگ ڈور جب ہالڈر سماج کے روایتی نظام میں پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں۔ مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کٹی رخ ہیں۔ بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے اور یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے۔ ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور چال کا سا ہے۔ جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے۔ پھشتا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو۔ محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہو جاتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے، زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے ... سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں ... کبھی بازی ہلٹ بھی جاتی ہے۔ گزرا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے۔ اس وقت تک پسوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہ چکا ہوتا ہے۔ جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی سلسلہ در سلسلہ۔

وقت گویا ہم سا گیا۔ آفتاب ایک تک اپنے قریب کھڑی اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا جو اس پر اپنی جان تک لٹا دینے کے لیے تیار تھی۔ وہ ہمیشہ اس لڑکی کی شدتوں سے ہارتا آیا تھا لیکن وہ اس سے کس انتظار رہے کی محبت کرتی تھی، اس بات کا حقیقی اور اک وقت کے ان نازک لمحوں میں ہی ہو سکا۔ کسی پر اپنی جان لٹا دینا آسان نہیں ہوتا اور جو محبت میں اس حد کو چھو لے، اس سے بڑھ کر انمول کون ہو سکتا ہے؟ وہ اس انمول لڑکی کے قریب کھڑا باہر موجود لوگوں سے غافل ہو چکا تھا۔ دروازے پر ایک بار پھر دستک دی گئی تو وہ چونکا۔ دستک بہت زور سے نہیں دی گئی تھی لیکن رات کے سناٹے میں زوردار محسوس ہو رہی تھی۔

”پلیز آفتاب! میں آپ سے کہہ رہی ہوں تاکہ آپ کسی طرح یہاں سے نکل جائیں۔“ ہر اسان و خوف زدہ کشور نے اس کا بازو جھنجھوڑتے ہوئے سرگوشی میں اس سے احتجاج کی مگر اس نے اپنی جگہ سے ہٹنے کے بغیر اپنے بازو پر موجود اس کے ہاتھ کو ہلے سے تھپکا اور دروازے کی طرف منہ کرتے ہوئے قدرے بلند آواز میں بولا۔

”پانچ منٹ انتظار کرو غیب! میں بی بی کو ساری صورت حال سمجھا دوں پھر تم لوگوں کو اندر بلاتا ہوں۔ پریشان مت ہو، باہر کوئی دشمن نہیں بلکہ میرے دوست ہیں اور میرے بلائے پر ہی یہاں آئے ہیں۔“ ابھی ابھی نظروں سے اپنی طرف دیکھتی کشور کو اس نے تسلی دی اور اس کا ہاتھ تھام کر فرش پر پچھی روٹی کی طرف لے جاتے ہوئے بولا۔

”ادھر چل کر بیٹھیں میں آپ کو سب کچھ سمجھاتا ہوں۔“ اس نے خاموشی سے یہ بات مان لی مگر اس کی سوالیہ نظریں مسلسل آفتاب کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

”آپ یقیناً حیران ہو رہی ہیں کہ یہ سب کیا ہے؟“ اس کی نظروں کا سوال پڑھتے ہوئے آفتاب نے گفتگو کا آغاز کیا۔ وہ کسی بھی قسم کا رد عمل ظاہر کیے بغیر چند پہلوؤں کی کیفیت میں اس کی طرف دیکھتی رہی۔ چند لمحوں میں وہ جس کیفیت سے گزر رہی تھی، اس کے بعد دوسری عجیب و غریب صورت حال سمجھنے میں اسے کافی دشواری پیش آرہی تھی۔ دروازے پر دستک کی آواز سن کر اس پر کسی قیامت گزری تھی، یہ تو وہ خود ہی جانتی تھی۔ اسے لگا تھا کہ رات کے سارے دن اسے جی ثابت ہونے والے ہیں۔ وہ دنگی تھی کہ شاید حویلی سے کوئی اس کا تعاقب کرتا ہوا یہاں آ پہنچا ہے۔ اتنی جلدی اپنی محبت کے چھین جانے کے خوف نے اس کے وجود سے ساری توانائیاں نچوڑ لی تھیں اور وہ ابھی تک اس خوف کے زیر اثر دھیرے

دھیرے کا ٹپ رہی تھی۔

”میں معافی چاہتا ہوں کہ میری وجہ سے آپ کو تکلیف اٹھانی پڑی۔“ آفتاب نے اس کی حالت کو بھانپتے ہوئے معذرت کی۔

”خدا را! مجھے گناہ گار نہ کریں۔“ اسے آفتاب کا معافی مانگنا ہرگز بھی گوارا نہ ہو سکا اس لیے خود پر قابو پاتے ہوئے فوراً اپنی اسے ٹوکا۔

”اصل میں بات کچھ ایسی تھی کہ میں چاہتا تھا، فون پر کرنے کے بجائے رو برو ہی کروں۔ آپ پر اعتماد تھا کہ آپ میری بات ماننے سے انکار نہیں کریں گی اس لیے باقی کے انتظامات پہلے ہی کر لیے تھے بس ذرا سی نا عین غلط ہو گئی۔

آپ میرے اندازے کے برخلاف کچھ تاخیر سے یہاں پہنچیں ورنہ یہ صورت حال پیش ہی نہیں آتی۔“ وہ تمہید باندھتے لگا لیکن اس تمہید سے کشور کے لیے اصل معاملے تک پہنچنا ممکن نہیں تھا۔

”آج تباہی حویلی میں ہی موجود تھی اس لیے ہم بہت سی احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کے بعد یہاں تک آنے کی راہ نکال سکے۔ احتیاط کی وجہ سے ہی دیر بھی زیادہ ہو گئی۔“ خود انہیں میں ہونے کے باوجود اس نے فوراً اپنے تاخیر سے آنے کی وضاحت پیش کی۔

”میں سمجھ سکتا ہوں کہ آپ کو یہاں تک آنے کے لیے کتنی دشواریوں سے گزرنا پڑا ہو گا اسی لیے ہمیشہ آپ کو روکنا رہا لیکن آج کی ملاقات کے بعد ضروری تھی اس لیے میں نے آپ کو خطرے میں ڈالنا بھی گوارا کر لیا۔“

”ایسی کیا بات ہے آفتاب! آپ مجھے بتاتے کیوں نہیں؟“ اس بار وہ اپنے ہونٹوں پر سوال آنے سے نہ روک سکی۔ کچھ دیر کے بعد آفتاب نے اس کی طرف سے آزاد ہونے کے بعد وہ اس کے روئے سے انہیں میں پڑ گئی۔ جواباً آفتاب نے ایک گہرا سانس لیا اور کہنے لگا۔

”ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، اس امر میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے اور یہ بات بھی اپنی جگہ حقیقت ہے کہ دو چاہنے والوں کو ایک دوسرے کی طلب بھی ہوتی ہے۔ ہماری پہلی ملاقات میں جو کچھ ہوا، وہ اسی محبت اور طلب کی کارستانی تھی۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ وہ لمحے میری زندگی کے سب سے خوب صورت لمحے تھے لیکن آپ سے جدا ہونے کے بعد ایک ایسا جی میرے سامنے آ کھڑا ہوا کہ میں اس مورد کی طرح جو بے خودی میں ناپتے ناپتے اپنے بد صورت بیروں کو دیکھ کر شرمندہ ہو جاؤ

ہے۔“ وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا، اس کے لیے سمجھنا مشکل تھا۔ ذہن میں کئی اندیشے کھلنے لگے جس میں سب سے بڑا خدشہ یہ تھا کہ کہیں آفتاب کی زندگی میں کوئی اور عورت تو نہیں۔ کوئی ایسی عورت جو اس کی ان بھٹیوں کی حق دار ہو اور وہ اس کا حق کشور پر لانے کے بعد شرمندہ ہو رہا ہو۔

”محبت کے ساتھ طلب کا ہونا گناہ نہیں لیکن اس طلب کے ساتھ قانونی اور شرعی رشتے میں بندھے بغیر بہہ جانا اتنا بڑا گناہ ہے کہ پھر محبت، محبت کہلانے کی حق دار نہیں رہتی۔۔۔ ہوس کہلانے لگتی ہے اور مجھے اپنی محبت کے دامن پر یہ داغ گوارا نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ محبت کے دامن پر لگے اس داغ کو دھونے کے لیے ہم نکاح کے بندھن میں بندھ جائیں۔ اگر آپ میری یہ بات ماننے کے لیے راضی ہیں تو میں ابھی غیب اور اپنے دوسرے دوستوں کو اندر بلا لیتا ہوں ورنہ آپ کے لیے باہر کا راستہ کھلا ہے۔ میں آپ کو یہاں سے جانے سے روکوں گا نہیں مگر پھر بھی آپ کے بلائے پر آؤں گا بھی نہیں۔“ اس کے اندیشوں سے بے نیاز اپنی بات مکمل کرتے ہوئے اس نے آخر میں دو لوگ لہجے میں اپنا فیصلہ سنایا اور اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ خود بھی اسی کو دیکھ رہی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس کی نظروں میں کوئی سوال نہیں بلکہ بے انتہا عقیدت تھی۔ یہ عقیدت دھیرے دھیرے آسوں میں گر اس کی آنکھوں سے بہنے لگی۔

”تھیک یو آفتاب! آپ نے یہ بات کہہ کر مجھے کتنا معجز کر دیا ہے، میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔ میری انہی محبت میں اتنی تسکین نہیں تھی کہ میں آپ سے یہ مطالبہ کر سکتی۔ اب آپ نے کہا ہے تو احساس ہو رہا ہے کہ میں کی بڑی غلطی میں مبتلا تھی۔ محبت کرنے والے مرد و عورت کے درمیان اگر نکاح کے دو بول نہ ہوں تو وہ سب کچھ پانے کے بعد بھی ہمیشہ بچی خوشی سے غروم رہتے ہیں۔ آپ کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے یہ بچی خوشی عنایت کرنے کا سوچا۔“ زندگی ہوئی آواز میں اس نے آفتاب کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

”اوکے! آپ ٹھیک سے چادر اوڑھ کر بیٹھ جائیں۔ میں ان لوگوں کو اندر بلاؤں گا۔“ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کشور کے بہتے ہوئے اشکوں کو اپنی انگلی کی پوروں پر چن لے لیکن باہر کھڑے غیب اور دوسرے لوگوں کا خیال تھا۔ باہر وہ لوگ نکاح پر حوٹے کے منتظر کھڑے تھے اور جن کا نکاح ہونا تھا، وہ ایک بند کمرے میں تھما ڈھکرات میں مصروف تھے تو یہ ابھی خاصی معیوب صورت حال تھی۔۔۔ چنانچہ کشور کا منہ یہ پاتے ہی

فورا اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کی طرف لگا۔ دروازہ کھول کر اس نے غیب، شہر سے آئے اپنے دوستوں اور نکاح خواں کو اندر بلا دیا۔ نکاح خواں کو طم طم کر نکاح کس صورت حال میں پڑھایا جاتا ہے۔ اسے لانے والے آفتاب کے دوستوں نے پہلے ہی سوائے اس بات کے کہ کہیں گاؤں کے مالک چودھری انکھار عالم شاہ کی بیٹی ہے، سب کچھ بتا دیا تھا۔ لاہور کے رہائشی اس نکاح خواں کو نہ تو اس دروازے گاؤں کے چودھری کے نام کا علم تھا اور نہ ہی دہلیا لہن کی اصلیت جاننے سے دہش تھی۔ وہ فقط اس رقم کی کشش میں یہاں آیا تھا جو اسے آفتاب کے دوستوں نے دی تھی اور جو نکاح کی عام فیس کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ تھی۔ بعد میں کوئی مشکل پڑتی بھی تو اسے یہی کہنا تھا کہ مجھے کیا معلوم لڑکی کس گاؤں کی رہنے والی ہے۔ میں تو لاہور میں رہتا ہوں اور میرے پاس لڑکا لڑکی مع گواہان خود چل کر نکاح کے لیے آتے تھے، ہوس نے یہ نیک کام کر دیا۔ سنی کا بدلہ روز جزا پر اٹھا کر رکھنے کے بجائے اس نے ہمیں کڑک فونوں کی صورت میں وصول کر لیا تھا۔ یہ بات ظاہر ہے، وہ کسی کو نہیں بتاتا۔

آفتاب نے کشور کی سہولت کے لیے رانی کو بھی اندر بلا دیا تھا اور اب وہ خوف اور خوشی کی بلی کیفیت میں اپنی مالکین کے نکاح میں شریک تھی۔ ایجاب و قبول کے مراحل طے ہونے کے بعد نکاح خواں نے مختصر عا کروائی پھر غیب نے اپنے ساتھ لایا ہوا لمٹھائی کا ڈبہ کھول کر سب کا منہ میٹھا کر دیا۔

”بھائی! ابھی تو ہم نے آپ لوگوں کی بھوری کو بھٹتے ہوئے اس مضامی پر گزارہ کر لیا ہے لیکن یہ بات کان کھول کر سن لیں کہ دوسرے کی دعوت آپ لوگوں پر ڈیو ہے اور وہ آپ نے ہمیں ضرور کھلائی ہے۔ وقت کی طرف سے ہمیں کوئی فکر نہیں۔ اگر آپ ہمیں اتنی ہیٹ دعوت دیر کھائیں کہ اس دعوت میں ہمارا کوئی نتیجہ باقی بھی بکھر کر کے لے دیا میں آپہنچے تو بھی ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“ مضامی کھاتے ہوئے آفتاب کے ایک دوست نے شوخ لہجے میں براہ راست گھونکھٹ کی آڑ میں بھی کشور سے مطالبہ کیا تو اس کے ہونٹوں پر تجوہ سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اسے آفتاب کے دوست کا خود کو بھائی کہہ کر مخاطب کرنا بہت اچھا لگا تھا۔ نکاح کے دو بولوں نے اس کی اور آفتاب کی محبت کو ہی مضبوط نہیں کیا تھا بلکہ وہ رشتے بھی اس کی جھپولی میں لا ڈالے تھے جن کے بارے میں وہ بھی سوچ ہی نہیں کر سکتی تھی کہ اسے بھی مل جائیں گے۔

”وقت کافی زیادہ ہو گیا ہے۔ اب آپ لوگوں کو یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے۔“ آفتاب نے یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا مگر گزرتے وقت کا خیال کر کے اور خود پر جبر کرتا ہوا کھشور سے بولا تو وہ اپنی اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی اور گھونگھٹ کے طور پر لی گئی چادر کو آفتاب کے انداز میں چہرے پر پھینک دیا۔

”کتنے بے چارہ دولہا ہے۔ بہانے دیں رخصت کرو اور اپنے ساتھ لے جانے کے اسے رخصت کرنے جا رہا ہے۔“ وہ لوگ دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے جب آفتاب کے دوست نے ایک آہ بھر کر بولے ”چھپے سے یہ نکلتیں دیے۔ وہ اُن کی کرتا ہوا کھشور کے ساتھ باہر نکل گیا۔ باہر نکلنے کے بعد ان دونوں کے ہی قدم خود بخود رک گئے جبکہ رائی بے خیالی میں یا پھر شاید جان بوجھ کر انہیں تنہائی فراہم کرنے کے خیال سے تانے کی طرف بڑھ گئی۔

”کتنے توجہ ہی ہیں میرے دوست... واقعی میں کتنا بے چارہ سا دولہا ہوں جو اپنی دین کو روک بھی نہیں سکتا۔ نہ سرخ جوڑے میں ہے اس کے کفن کو سراہ سکتا ہوں۔ ویسے سچ بتائیں، یہ سرخ جوڑا محض اتفاق تھا یا آپ کے دل کو جبر ہو گئی تھی کہ آج کچھ خاص ہونے جا رہا ہے؟“ اس نے کھشور کو چھیڑا۔

”میرے لیے تو یہ بھی خاص بات تھی کہ آج پہلی بار آپ نے خود مجھے بلایا تھا۔ آج کی رات مجھے اتنا معتبر کرنے والی ہے، یہ معلوم ہوتا تو جانے کتنا اہتمام کرتی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اہتمام اہتمام میں ہی سارا وقت گزر جاتا اور آپ نکاح خواں اور گولہ بان کے ساتھ یہاں بیٹھے میرا راستہ ہی نکلتے رہ جاتے۔“ جذباتی لہجے میں اپنی دلی کیفیات کا اظہار کرتے ہوئے آخر میں وہ بیک دم شرم ہو گئی تو آفتاب نے ہنس پڑا۔

”چلیں، آج نہ کسی پھر بھی آپ کو یہ موقع مل جائے گا۔ اب تو آپ جب بھی مجھ سے ملنے آئیں گی مسز آفتاب احمد کی حیثیت سے ہی آئیں گی، پھر دیکھیں گے کہ ہماری بیہیم صاحبہ نہیں زیر کرنے کے لیے کن کن میل کا تنوں سے لیس ہو کر آتی ہیں... پر دھیان رکھیے گا اب آپ کے جملہ حقوق ہمارے نام محفوظ ہو چکے ہیں۔ اب جو ملاقات ہوگی اس میں ہمارا کوئی اثر ہی رنگ دیکھنے کو ملے گا آپ کو۔“ اس نے دھیرے سے کھشور کا ہاتھ دوہرایا۔ وہ اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑا کر ٹھکسلا کر ہنسنے ہوئی آگے بڑھ گئی۔ آگے کچھ فاصلے پر وہ تان کھڑا تھا جس میں بیٹھ کر اسے واپس جھونکی جانا تھا۔ تانے کی طرف بڑھتے اس کے قدموں کے برخلاف اس کا

شریر دل ہلک ہلک کر پیچھے کی طرف لپک رہا تھا مگر مجبوری تھی کہ اس وقت وہ دلی کی بات ماننے کی پوزیشن میں نہیں تھی چنانچہ آگے بڑھتی چلی گئی۔ تانے پر چڑھنے سے پہلے البتہ اس نے پیچھے مڑ کر ضرور دیکھا۔ آفتاب اپنی جگہ کھڑا اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ لہرا کر اسے الوداع کہا تو جواب میں اس کا ہاتھ بھی الوداعی انداز میں اٹھ گیا۔ البتہ تو دونوں ہی جانتے تھے کہ الوداع کا استعارہ ہے یہ ہاتھ وصل کے لمحوں کے لیے کس شدت سے منتظر ہیں۔

☆☆☆

لکڑیوں کا چولہا جلا کر اس نے تو رکھا اور پرات میں گوندھے ہوئے آنے کا بیڑا بنا کر روٹی بننے لگی۔ مشاہیرم خان کے گھر پہنچنے کے بعد دوسرے دن سے ہی اس نے گھر کی ساری ذمے داریاں سنبھال لی تھیں۔ اس کی بوجھ میں ماں نے جو انک ایک کرار دو روٹی تھی، ابتدا میں اسے روکنا چاہا پھر اس کی ضد کے آگے ہار مان لی۔ اب وہ گھر کے تقریباً سارے ہی کام کرتی تھی پھر بھی دن مشکل سے گزرتا تھا۔ ہزار افراد سے بھی کم آبادی پر مشتمل اس گاؤں میں زندگی بہت محدود تھی اور مشاہیرم خان کے گھر میں تو محدود ترین۔ اس کا بھائی اکرم خان اسے یہاں اپنی ماں کے پاس چھوڑنے کے بعد اس کو واپس چلا گیا تھا اور اسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ ایک ایسی عورت کے ساتھ رہ کر جو اس کی بات بھی پوری طرح نہیں سمجھ پاتی، کس طرح وقت گزارے؟ بس گھر کے کام کاج میں کچھ وقت اچھا گزر جاتا تھا ورنہ سارا دن وہ ہوتی تھی اور ذہن پر سوار کرکس اور پریشانیاں۔ سچی بے جا اور ایسا کی موت کا ٹیم رلاتا تو کبھی اپنے مستقبل کا سوچ کر طبیعت گھبرا نے لگتی۔ اس وقت بھی وہ انہی سوچوں میں مگن ہوئی پکا رہی تھی۔ پہلی روٹی تو سے سے اڑی تو سیانہی مائل رحمت دیکھ کر طبیعت کچھ اور سکدر رہی ہوئی۔

”گیا تو؟“ نامی گندم کے آنے کی روٹیاں ایسی ہی کپتی تھیں۔ ان روٹیوں کو پکاتے اور کھاتے ہوئے اسے وہ سنہری مائل روٹیاں یاد آ جاتیں جنہیں وہ ساری زندگی کھاتی رہی تھی اور جنہیں کھاتے ہوئے اسے بھی گمان بھی نہیں گزرا تھا کہ ایک دن وہ اپنے شہر سے بہت دور کا گندم نامی اس بستی میں بیٹھی ہوگی۔

سست روٹی سے دوسری روٹی تیل کرتے پر ڈالتے ہوئے اسے بیرونی دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی۔ پھر ذرا دیر بعد ایک مردانہ آواز سنائی دینے لگی۔ وہ یقیناً اکرم خان تھا جو اپنے کھڑا تھا۔ اس کی آواز سن کر اس نے جلدی

جلدی ہاتھ چلانے شروع کیے اور اس کے حصے کی روٹیاں بھی کا ڈالیں۔ روٹی پکانے کے بعد وہ کھانے کے برتن وغیرہ لے کر اندر کمرے میں گئی۔ اکرم خان اپنی ماں کے پاس بیٹھا اس سے باتیں کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ خوش ہو گیا۔

”جیو ہمارا بہن! ہم ہمیشہ سوچتا تھا کہ ہمارا کوئی بہن ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ آج تم کو دیکھ کر لگ رہا ہے کہ اللہ نے ہمارا تمنا پورا کر دیا۔“ اسے کھانا لگتا دیکھ کر وہ اپنی خوشی کا اظہار کرنے لگا۔ اسے اس طرح خوش ہونا دیکھ کر وہ مسکرائے لگی۔

”تمہارے لیے شہر یا صاحب نے کچھ سامان بھجوایا ہے۔ یہ ادھر رکھا ہے۔ کھانا کھانے کے بعد تم دیکھ لینا اور ان کو کوئی خط لکھنا ہو تو وہ بھی بعد میں لکھ لینا۔ ابھی ہم ایک ٹیم کے ساتھ ہوئے تنگ جاتا ہے۔ وہ لوگ ادھر رکھا تھا تو ہم تھوڑی دیر کے لیے گھر آ گیا تھا۔ ٹیم کو بوسے میں چھوڑ کر واپس آئے گا، تب بھی تھوڑی دیر کر داریاں اس کو روک دیا جائے گا۔“ اس کی اطلاع پر ماہ بانو کی نظر ایک طرف رکھتے گئے کے بڑے سے کارن پر پڑی۔ وہ کھانا کھانے کے بجائے فوراً اٹھ کر اس کارن کے قریب پہنچی۔ اس پر چلتی سفید رنگ کی چٹ پر چلی حروف میں لکھا تھا۔ ”اکرم خان بورڈ۔ گاؤں کا گندے ڈاک خانہ تھامس۔ تحصیل مشاہیرم۔ ضلع گھانچے۔ اکروہ بلتستان۔ پاکستان۔“

”اس پر تو آپ کا نام لکھا ہے اکرم بھائی!“

”وہ تو اس لیے لکھا ہے کہ ادھر سب ہم کو جانتا ہے۔ پر صاحب نے ادھر کے نو مونس میں ہم کو فون کر کے بتا دیا تھا کہ ماہ بانو نی کی کے لیے سامان بھجوا رہا ہوں۔ ویسے بھی وہ ہمیں کیوں کچھ بھجوائے گا؟ آپ کو ہی بھیجا ہے یہ سب۔“

اکرم خان نے جیسے جیسے اسے یقین دلایا تو اسے قائل ہوتا پڑا۔ پھر اس شخص نے کہ اس کارن میں کیا ہے، اسے فوراً ہی کارن کھولنے پر مجبور کر دیا۔ سامان کے اوپر ہی ایک سفید رنگ کا لفافہ رکھا تھا جس پر اس کا نام موجود تھا۔ اس نے۔۔۔

یہاں سے لفافہ کھولا۔

”امید ہے کہ تم خیریت سے ہو گی۔ لاہور سے غلت میں روانہ ہونے کی وجہ سے تمہاری ضرورت کا سامان نہیں لیا جاسکا تھا۔ اسے انداز سے کے مطابق کچھ چیزیں بھجوا رہا ہوں۔ اگر ان کے علاوہ بھی کسی اور شے کی ضرورت ہو تو اکرم خان کو لکھ کر دے دینا۔ میں اس سے فون پر معلوم کر لوں گا۔“

بے حد مختصر پیغام پر مشتمل اس خط کے علاوہ لفافے میں کچھ رقم بھی موجود تھی۔ وہ لفافہ بند کر کے کارن میں موجود سامان کا

کون کہتا ہے کہ؟

اولاد نہیں ہو سکتی

آج بھی لاکھوں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ مایوسی گناہ ہے۔ انشاء اللہ اولاد ہوگی۔ خاتون میں کوئی اندرونی پر اہلم ہو یا مردانہ جراثیم کا مسئلہ۔ ہم نے ویسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کیا ہے۔ جو آپ کے آگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھلا سکتا ہے۔ آپ کے گھر میں بھی خوبصورت بیٹا پیدا ہو سکتا ہے۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر تمام حالات سے آگاہ کر کے بذریعہ ڈاک وی پی پی VP بے اولادی کورس منگوائیں۔

المسلم دار الحکمت ریسرچ (دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد۔ پاکستان

0300-6526061
0547-521787

فون اوقات

صبح 9 بجے سے رات 11 بجے تک

آپ ہمیں صرف فون کریں

دوائی آپ تک ہم پہنچائیں گے

جانزہ لینے لگی۔ گرم بلبوسات، اس کے کورس کی کتاہیں، موم سرہا میں استعمال ہونے والے لوشنز کے علاوہ کچھ تفریحی رسائل وغیرہ بھی موجود تھے۔ اس نے بے حد خیال سے اس کی ضرورت کی تمام اشیاء بھیجی تھیں اور فی الحال اسے اس سامان میں کسی شے کی کمی نہیں ہو رہی تھی پھر بھی دل کچھ اداس سا ہو گیا۔ دل میں خواہش ہی چمکی کہ کاش اس سارے سامان کے بجائے وہ خود اس کی خیریت معلوم کرنے یہاں تک آ گیا ہوتا لیکن پھر وہ خود ہی اپنی اس خواہش پر اپنے آپ کو سرپیش کرنے لگی کہ اسے یہ شہر یا ر عادل جیسے اونچی حیثیت والے شخص کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ وہ اس جیسی معمولی لڑکی سے ملنے اس دور دراز گاؤں تک آتا۔ اس نے انسانیت کے نام سے یہ سب چیزیں بھجوا دی تھیں تو یہ بھی اس کا بہت بڑا احسان تھا۔

”اماں کہہ رہی تھی کہ تم صبح سے روٹی نہیں کھاتے۔ ہم اس بار آنے لگے تو ساتھ میں دوسرا آنا لے کر آئے گا۔ یہ گیاؤں کا روٹی کھانا واقعی بڑا مشکل ہوتا ہے، پر کیا کرے... جب سے ادھر سیلاب نے چائی چایا ہے، بڑا مشکل پڑ گیا ہے۔ کتنا لوگ نے تو ادھر سے دور گینداس تھنک میں جا کر بستی آباد کر لیا ہے حالانکہ ادھر ان کو پانی کا بڑا پریشانی ہے۔ خیر، ہم آگے تو اسکو دے آجھا والا گندیم کا آٹا لے کر آئے گا۔“ وہ اپنے خیالات میں ڈوبی ہوئی تھی اس لیے معلوم ہی نہیں ہو سکا کہ کب اکرم کھانے سے فارغ ہوا اور اماں برتن اٹھا کر باہر نکل گئی۔ اکرم خان بولا تو وہ چونکی پھر شرمندہ سی ہو کر بولی۔

”ایسی کوئی بات نہیں بھائی اکرم! بس ابھی عادت نہیں ہے اس لیے مشکل ہو رہی ہے۔ آہستہ آہستہ عادت پڑ جائے گی۔ تم بتاؤ مشاہیرم خان کا کیا حال ہے؟ اے سی صاحب نے اس کی خیریت کے بارے میں کچھ بتایا ہے کہ نہیں۔“

”وہ ٹھیک ٹھاک ہے۔ اس کا نام ہمارے باپ نے مشاہیرم کی چوٹی سے واپس آنے کے بعد مشاہیرم خان رکھا تھا۔ ہمارا بھائی کسی پہاڑ کی طرح ہی مضبوط اور طاقتور ہے۔ چھوٹا مونا ڈنم اسے کچھ نہیں کہتا۔ وہ مرد کا بچہ ہے، ہر تکلیف بہادری سے سہہ سکتا ہے۔ اگر اماں کی دی قسوں کا خیال نہ ہوتا تو وہ شیر جوان گورا لوگ کے ساتھ بڑی بڑی چوٹیاں سر کرنے جاتا۔ شلیمبی (ٹانگا پر بت) تو اس کو بہت اچھا لگتا تھا، پر اماں نے ہم دونوں بھائیوں کو قسم دیا کہ ہم ادھر جانے کا سوچے گا بھی نہیں تو بس پھر وہ شہر چلا گیا۔ کہتا تھا کہ ادھر

رہوں گا تو پہاڑوں سے دور نہیں رہ سکوں گا اور ماں کی دلی قسم توڑ دوں، یہ بھی گوارا نہیں۔“

”مگر اماں نے ایسی قسم دی ہی کیوں؟“ اکرم خان کی بات سن کر اس نے حیرت سے پوچھا۔

”اماں اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ اصل میں ہمارا باپ ہماری پیدائش کے تھوڑے عرصے بعد ہی ایک ٹیم کے ساتھ کلیمنگ کے لیے گیا تھا تو ادھر ایوان الاچ میں دب گرمیہا۔ باپ پر اماں نے صبر کر لیا لیکن جب ہمارا سب سے بڑا بھائی اچھل خان برالدور پا میں گر کر مر اٹھا تو اماں نے ہم دونوں سے وعدہ لیا کہ ہم خود کو ایسے خطرے میں نہیں ڈالیں گے۔ بس پھر مشاہیرم خان ادھر چلا گیا اور ہم ادھر رہتا ہے لیکن اسکو دے لے کر بس ہوئے تنک کا ہی سفر کرتا ہے۔ آگے پہاڑوں کا سفر نہیں کرتا۔ پیسا کم ملتا ہے، پر پروا نہیں... ماں تو خوش ہے۔“

اکرم خان نے اداس لہجے میں بتایا اور پھر یک دم ہی غلٹ کا مظاہرہ کرتا ہوا اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

”اب تم چلتا ہے، بہت دیر ہو گیا ہے۔ ادھر صاحب لوگ ناراض ہو رہا ہوگا کہ پورے کچھ چلا گیا ہے۔“ اپنی بات کہنے کے بعد وہ رے لہجہ باہر نکل گیا۔ ماہ یا تو عقیدت سے ان لوگوں کے بارے میں سوچتی رہی جو پہاڑوں کے پاس تھے اور پہاڑ جیسا ہی ظرف رکھتے تھے۔ اکرم خان نے ایک بار بھی تو اسے نہیں بتایا تھا کہ اس کا بھائی جسے ماں نے اس کی سلامتی کے خیال سے پہاڑوں کے سفر سے روک دیا تھا، اس کی خاطر شدید زخمی ہو کر اسپتال میں پڑا تھا۔ بس اس نے یہاں آتے ہوئے اتنی گزارش کی تھی کہ ماں کو مشاہیرم خان کے زخمی ہونے کے بارے میں نہ بتانا۔ اس کے بعد جیسے وہ سب کچھ بھول گیا تھا اور کچھ یا تھا تو صرف اتنا کہ وہ اس کے گھر مہمان ہے جس کا اس نے ہر ممکن خیال رکھنا ہے۔ بھائی جدوجہد میں غلطی وہ کچھ اور لوگوں کے غلوں کی مقرر ہو گئی اور جانے ابھی یہ سلسلہ کب تک جاری رہنا تھا۔

☆☆☆

صبح صبح کا وقت تھا۔ کشور اپنے کمرے سے نکلی اور اوپری منزل کی طرف جانے والی سڑکیاں چڑھنے لگی۔ حویلی کے کینٹوں میں سے وہی تھی جو اکثر و بیشتر وہاں جاتی رہتی تھی۔ جانے کا مقصد اپنے سوچے بھائی چودھری بہزاد کی خیر و عافیت سے آگاہ رہنا ہوتا تھا۔ چودھری بہزاد کی سری ہوئی ماں نے اسے علم کی روشنی عطا کرنے کا جو احسان کیا تھا، وہ اس احسان کا بدلہ اس کے اب نارمل بننے کی وقت تو قتا خیر گیری کے ذریعے اتارنے کی کوشش کرتی تھی لیکن آج

سڑکیاں طے کر کے اوپری منزل تک پہنچنے کا مقصد کچھ اور تھا۔ وہ اس لڑکی سے ملنا چاہتی تھی جو کل رات چودھری بہزاد کی دلہن بن کر حویلی میں آئی تھی۔ حویلی کی خواتین کو یہ تو معلوم تھا کہ چودھری بہزاد کی شادی نور پور کے زمیندار چودھری بختیار کی بہن سے ہو رہی ہے لیکن یہ بات کسی کے لیے نہیں پڑی تھی کہ چودھری بختیار نے اپنی بہن کی شادی ایک ایسے نارمل لڑکے سے کرنا کیسے منظور کر لیا۔ تاہم اور صورت نے خیال ظاہر کیا تھا کہ ہونہ ہو، لڑکی میں ضرور کوئی عیب تھا جب ہی یہ بیان ممکن ہو سکا۔ وہی چودھراؤن کے خیال میں لڑکی خود بھی بچی ہی تھی۔ کشور کی ماں ناہید کا خیال تھا کہ چودھری بختیار، چودھری افتخار کا مقروض تھا اور اس نے قرض معاف کروانے کے لیے بہن کو بیچ چڑھا دیا۔ غرض ہر فرد نے ہی اپنے اپنے طور پر اس شادی کے بارے میں کوئی نہ کوئی خیال آرائی ضرور کی تھی۔ حقیقت کا کسی کو علم نہیں تھا۔ یہاں تک کہ برات کے ساتھ بھی حویلی کی کسی عورت کو نہیں لے جایا گیا تھا۔ چودھری کے ساتھ اس کے چند خاص ملازمین، آس پاس کے دیہاتوں کے ایک دو زمیندار اور چودھری بہزاد کے ذاتی کاموں کے لیے مختص ملازمہ نے ہی برات میں شرکت کی تھی۔ اسی ملازمہ نے دلہن کو رخصت کر کے لانے کے بعد اوپری منزل پر اس کے کمرے تک پہنچانے کا فرض بھی ادا کیا تھا۔ جب تک چودھری افتخار کی اجازت نہیں ملتی، کسی کی مجال نہیں تھی کہ خود سے چند سیریلیوں کا قافصلہ طے کر کے اوپری منزل تک جلا جائے لیکن کشور کے تجسس نے اسے زیادہ صبر نہیں کرنے دیا اور وہ صبح ہی صبح جبکہ ابھی سارے لوگ سوئے ہوئے تھے، اوپری منزل پر جا پہنچی۔ اس وقت وہاں بھی سنانا چھایا ہوا تھا۔ اس نے سب سے پہلے چودھری بہزاد کے کمرے کا رخ کیا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ اس نے ہکا سادہ ڈالا ڈالا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ اس نے کھلے دروازے سے اندر بھاگ کر دیکھا تو اسے بہزاد اپنے پٹنگ پر گہری نیند میں ڈوبا نظر آیا۔ بستر پر اس کے ساتھ اس کا چھوٹا بھالو بھی موجود تھا اور وہ اس بڑے سے بھالو کی گردن میں اپنی بائیں ڈالے دیا واماں ہا سے بے خبر تھا۔ نیچے قایلین پر اس کی ملازمہ خاص بھی گہری نیند سو رہی تھی۔ کمرے میں دلہن کا کوئی نام و نشان نہیں تھا اور نہ ہی ایسا کوئی اہتمام نظر آتا تھا جو کسی نئی نوہی دلہن کے استقبال کا چاہتا رہتا۔ نہ کوئی سیاہتھی اور نہ ہی پھول پتوں کا وجود۔ وہ ابھی ہوئی سی وہاں سے جھٹکی۔ یہ تو سوچا لیکن جاسکتا تھا کہ دلہن وہاں لائی ہی نہیں تھی۔ تجسس کی ماری وہ رات گئے تک برات کے واپس لوٹنے کے انتظار میں جاگتی

رہی تھی اور اس نے خود اپنے کمرے کی کھڑکی سے بڑی سی چادر میں لپیٹ کر دلہن کو حویلی میں اترتے دیکھا تھا لیکن وہ جس کی دلہن بنا کر لائی گئی تھی، اس کے کمرے میں موجود نہیں تھی۔ اب یہی سوچا جا سکتا تھا کہ وہ کسی اور کمرے میں ہے۔ اس خیال کے ذہن میں آنے پر وہ تیزی سے دوسرے کمروں کے دروازے کھول کر کھانگنے لگی۔ کمرے حسب معمول خالی تھے۔ اوپری منزل چودھری بہزاد کے سوا کسی کے استعمال میں نہیں رہتی تھی اور ان کمروں کے استعمال کی نوبت صرف اسی وقت آتی تھی جب حویلی میں بے تحاشا مہمان ہوتے تھے۔ عموماً ایسا سالانہ عرس کے موقع پر ہی ہوتا تھا۔

کشور ایک ایک کمرے کو دیکھتی چوتھے کمرے میں پہنچی تو اسے بستر پر ایک سرخ رنگ کی ٹھڑکی سی پڑی نظر آئی۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ سرخ عرزی جوڑے میں بلبوس ایک لڑکی ہے جو کھٹنے پیٹے سے لگائے ہوئے جس و حرکت پڑی ہوئی ہے۔ وہ جلدی سے اس لڑکی کے قریب پہنچی۔ قریب سے جانزہ لینے پر اسے اور بھی بہت کچھ دیکھنے کو ملا۔ بستر پر بڑے سسلے ہوئے پھول، ٹوٹی ہوئی کالج کی چوڑیاں اور مزید کچھ نشانیاں ایسی تھیں جو گزری رات کا افسانہ سناری تھیں۔ اسے حیرت سی ہوئی کہ اپنے کمرے میں بھالو کی گردن میں بائیں ڈال کر سونے والے اس بچے چودھری بہزاد نے یہ افسانہ کیسے رقم کیا ہوگا؟ حیرت میں ڈوبے ڈوبے ہی اس نے لڑکی کا چہرہ دیکھنے کے لیے اس کے چہرے پر ہڈیاں کا آچھل سرکایا۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ لڑکی کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں حالانکہ وہ یوں بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی کہ اسے لسمے بھر کو گمان گزرا تھا کہ کہیں وہ بے ہوش تو نہیں ہے۔ اب جو آنکھوں کے حرکت کرتے ہوئے ڈیلے دیکھے تو یہ اطمینان ہو گیا کہ وہ ہوش میں ہے۔

”میں کشور ہوں۔ چودھری بہزاد شاہ کی بہن۔“ اپنا تعارف کرواتے ہوئے اس نے لڑکی کے چہرے پر موجود آنسوؤں کے نشانات کا بھی جائزہ لیا۔ لگتا تھا کہ وہ کئی گھنٹوں تک روٹی رہی ہے۔

”میرا تمنا تھا دیکھنے آتی ہو؟“ اس کا تعارف سن کر وہ قہر آلود لہجے میں بولی تو پہلی بار کشور کی نظر اس کے نچلے ہونٹ پر موجود ڈنم پڑی۔ اسے شدت سے کچھ غلط ہونے کا احساس ہوا۔ اس کے سامنے موجود لڑکی بے شک عرزی لباس میں تھی لیکن سہاگن والی ڈنم بھی رقص اس کے وجود میں نہیں جھلک رہی تھی۔ وہ تو کوئی لٹی پی، برباد ہو جانے والی عورت نظر آ رہی تھی۔ اگر اسے آفتاب کی قربت کا بجز یہ نہ ہوا

ہوتا تو وہ اتنی باریک بینی سے اس لڑکی کا جائزہ لے کر کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکتی تھی۔ آفتاب کو پانے کے بعد اس نے جب بھی آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تھا، اسے وہاں عجیب سی چمک نظر آتی تھی... لیکن یہ لڑکی تو ایسا لگتا تھا کہ قبر سے نکلا ہوا کوئی مردہ ہو۔ شاید اس کا یہ حال اس لیے تھا کہ اسے رفتی حیات کے طور پر چودھری بہنو کا ساتھ ملا تھا اور اپنی طور پر یہ ساتھ کسی بھی ہوئی مند لڑکی کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے شدت سے لڑکی کے لیے اپنے دل میں ہمدردی محسوس کی اور اس کے سر ہانے بیٹھ کر اپنے ہاتھ سے اس کے بصر سے ہونے والے بال سنوارتے ہوئے بولی۔

”مجھے معلوم ہے کہ تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ بہنو! کسی طور تمہارے لائق نہیں تھا۔ اباجی کو تمہارے ساتھ ایسا ظلم نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

”تمہیں کیا خبر کہ تمہارے باپ نے میرے ساتھ کتنا بڑا ظلم کیا ہے؟ اس ظلم کا بدلہ ایک دین اسے کیا اس کے پورے خاندان کو چکانا پڑے گا۔“ نہایت غمی سے کہتے ہوئے اس نے کشور کا ہاتھ جھٹکا اور اپنی جگہ پر اٹھ بیٹھی۔

”مصور صرف اباجی کا تو نہیں۔ تمہارے گھر والوں نے بھی تو جانتے ہو جیسے تمہیں بہنو اسے عیا ہے۔ تمہیں بد دعا دینی ہے تو آئیں مجھی دو۔“ اسے اپنے خاندان کو بد دعا دینا برا لگا تھا اس لیے اسے نوک بیٹھی۔

”جانتے ہو جیسے نہیں، مجبور میں اپنی عزت بچانے کے لیے انہیں یہ فیصلہ کرنا پڑا۔ ورنہ میرے بھائی تو سخت ناپسند کرتے ہیں تمہارے اباجی کو۔ عام حالات میں تمہارے اس پاگل بھائی کے بجائے اگر ولایت سے ڈگری لانے والے بھائی کا پیغام بھی آتا تو میرے بھائی صاف انکار کر دیتے، پراگمی تو وہ مجبور ہو گئے تھے۔“

”وہ کیسے؟“ کشور نے حیرت سے پوچھا۔

”میرے نصیب کی خرابی ان کی مجبوری بن گئی۔“ اس نے اداسی سے جواب دیا۔

”میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھی۔ تم اس طرح پہیلیاں بھجوانے کے بجائے ذرا مکمل کر تفصیل سے سب کچھ نہیں بتا سکتیں؟“ وہ تھوڑا سا جھنجھلائی۔

”پر میں تمہیں کچھ بتاؤں ہی کیوں؟ تم کون لگتی ہو میری؟“ وہ جیسے سے اکھڑنے لگی۔

”گتے لگانے کو چھوڑو۔ اگر تم چاہو تو ہم ایک دوسرے کی سہیلیاں بن سکتے ہیں۔ سمجھو میں بھی تمہاری طرح اس جو جی میں تمہا ہوں اور تمہاری طرح میرے بھی بہت سے

حقوق باہال کرتے ہوئے زندگی کی حقیقی خوشیوں سے دور رکھنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔“ اس کی کئی کارہانے بغیر وہ نری سے بولی تو وہ کچھ دیر تو اسے جانچنے والی نظروں سے دیکھتی رہی پھر بولی۔

”تم بھتی ہو میں تمہاری گل کا یقین کر لیتی ہوں۔ اگر تمہارا کہا جھوٹ بھی نکلا تو میرا کیا بکڑے گا۔ میرا تو جو نقصان ہونا تھا وہ وہ چکا۔“

کشور نے اس کی بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا، بس مختصر نظروں سے اس کی طرف دیکھی رہی۔ آخر کار اس نے تانا شروع کیا۔

”میں فریہ ہوں۔ نور پور کے چودھری بختیار کی بیٹی اور اکلوتی بہن۔ میں اپنے چچا زاد قربان سے محبت کرتی تھی۔ قربان ساتھ والے پنڈ میں ہی رہتا تھا لیکن رشتے داری کے باوجود کچھ دشمنیوں کی وجہ سے ہمارا آپس میں ملنا جلنا نہیں تھا۔ اتفاق سے میں اور قربان ایک دیاہ پر ایک دوپے سے ملے تو فیر ایک دوپے کی محبت میں مبتلا ہو گئے اور دشمنی کے باوجود آپس میں چھپ چھپ کر ملنے لگے۔ قربان سے بڑے بھائی سہان کو یہ کھل بتا چلی تو وہ ہمارے پیچھے پڑ گیا اور قربان کو سبیلے جھکیوں پر اتر افریں ہمیں نقصان پہنچانے کی کوشش کرنے لگا۔ ہم نے فیر بھی ایک دوپے سے ملنا نہیں چھوڑا۔ کچھ دن گزرے، میں اور قربان ایک دوپے کے ساتھ تھے کہ سہان نے ہمیں گھیر لیا۔ اس روز قربان اپنی گھوڑی پر بیٹھ کر مجھ سے ملے آیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ سہان پر خون سوار ہے تو اس نے مجھے اپنے ساتھ گھوڑی پر بٹھایا اور گھوڑی دوڑادی، پر ہم جاتے کہاں؟ دونوں میں سے کسی کے بھی گھر والے ہمارے ساتھ کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔ ایسے میں قربان کے ذہن میں آیا کہ میرا آپاد چلتے ہیں اور وہاں میرا سرکار کے مزار میں پناہ لے لیتے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ ہم نے مزار میں پناہ لے لی تو پھر چودھری افتخار بھی ہمارا ساتھ ضرور دے گا۔

علاقے کے سب سے وڈے چودھری کی حمایت مل جاتی تو کسی میں مخالفت کی جرات نہیں رہتی، پر چودھری نے تو ہمارے ساتھ عجیب ہی چال چلی۔ اس نے قربان کے گھر والوں کو بلا کر اسے ان کے حوالے کیا اور مجھے اپنے ڈپرے پر قید کرنے کے بعد میرے بھائی کو پیغام بھجو دیا کہ اگر اپنی ٹپ بچانا چاہتے ہو تو اپنی بہن کا نکاح میرے چھوٹے پتر سے پڑھانے کو تیار ہو جاؤ ورنہ لڑکی تو ہمارے ہی قبضے میں ہے، ہم جو چاہیں گے اس کے ساتھ وہ سلوک کریں گے اور

پھر تمہا بھی لگا نہیں گے۔ بھائی و چارے اس دھمکی کو سن کر ڈر گئے۔ مجھے بچانا تو ان کے لیے کسی صورت ممکن نہیں تھا، سو انہوں نے میری بہتر بھانجھاپنی ٹپ بچا لیں۔ میں نے بھی ان کی خاطر چھیار ڈال دیے ورنہ سچ ہے کہ تمہارے اباجی کا کوئی فیصلہ ماننا تو دور کی گل ہے، میں تو اس شخص پر تھوکتا بھی پسند نہیں کرتی۔“ اس کے لہجے میں شدید نفرت تھی اور کشور کے خیال میں وہ اس نفرت کے لیے حق بجانب بھی تھی۔ جس سے اس کی محبت جھین کر اس کا وجود کسی اب نادل انسان کے حوالے کر دیا گیا ہو، اس لڑکی کے پاس خود سے زیادتی کرنے والے کے لیے نفرت کے سوا اور کوئی کیا سکتا تھا۔

”میں شرمندہ ہوں فریہ کہ میرے اباجی نے تمہارے ساتھ اتنا بڑا دھوکا کیا لیکن میں شرمندہ ہونے کے سوا اور کبھی کیا سکتی ہوں؟ میں تو خورد و اچوں اور پابندیوں میں جکڑی ایک کمزور لڑکی ہوں جسے خود ہر مل کسی ایسے روزن کی تلاش رہتی ہے جہاں سے کچھ تازہ ہوا اور روشنی اندر آ سکے۔“

”میں جانتی ہوں، جب ہی تو تمہیں تمہارے باپ کا وہ روپ نہیں دکھایا جسے دیکھنے کے بعد تم شرم سے زندہ زمین میں دفن ہو جانے کی خواہش کرنے لگو گی۔“ اپنی بات کے جواب میں کبھی گئی فریہ کی بات نے اسے بڑی طرح چونکا دیا۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب رہنے دو۔ میں نہا کرتی ہوں۔ تم اتنی دیر میں میرے لیے ناشتے پانی کا تو انتظام کرواؤ۔ ملازمہ سے کہنا کہ اسے رات کو آئیں بند کر کے رکھنے کا حکم ہے، اب دن میں تو آنکھیں کھول لے اور کچھ بات چہ چلائے۔“ اس کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی اور انداز بھی نیکر بدلا ہوا تھا۔ وہ جو تھوڑی دیر پہلے ایک لٹی پی پی سی عورت دکھائی دیتی تھی، اب کوئی چوٹ دکھائی ہوئی ناخن لگ رہی تھی جس کا پس نہیں چٹا کہ کس طرح خود کو چوٹ لگانے والے سے انتقام لے۔ اس سے یہ سب کہہ کر وہ قتل خانے میں گھس گئی مگر کشور کچھ بھی نہ سمجھنے والے انداز میں اس اچھی پھیلی کے گل کے لیے وہیں بیٹھی، کوئی سرا کھو جتی رہ گئی۔

☆☆☆

وہیے کی تقریب میں شریک شہر یا مختلف لوگوں سے ملاقات کرتے ہوئے اور گرد و کبا بھی جائزہ لیتا جا رہا تھا۔ تقریب میں بہت زیادہ لوگ شریک نہیں تھے۔ صرف مقامی افسران، زمینداروں اور رشتے داروں کو ہی مدعو کیا گیا تھا۔ ایسا نصیحتا وقت کی قلت اور دوہلا کی ذہنی معذوری کی وجہ سے

ہوا تھا ورنہ چودھری افتخار جیسا بندہ تو موقع کی تلاش میں رہتا تھا کہ کس طرح اہم شخصیات سے تعلقات اور رسم و رواج بڑھانے کے لیے آج کی اس تقریب کا رنگ پیکا تھا۔ یہاں تک کہ دلہن کا بھائی چودھری بختیار بھی دعوت میں شریک نہیں تھا۔ اسے موقع نہیں مل سکا تھا کہ چودھری بختیار سے ملاقات کے لیے جاتا اور اسے جو شادی کے بارے میں استفسار کرتا۔ خود چودھری بختیار کی طرف سے بھی شادی کا دعوت نامہ نہیں ملا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ویسے کی تقریب میں ملاقات ہوگی تو وہ چودھری سے اس ظلم کی بابت دریافت کرے گا لیکن یہ بھی ممکن نہیں ہو سکا۔ چودھری بختیار نے اپنی معذوری اور بیماری کا عذر پیش کر کے تقریب میں شرکت سے انکار کر دیا تھا۔

شہر یار کے گرد سے لوگوں کا ہجوم چھٹا تو اس کی نظر آفتاب پر پڑی۔ وہ بھی اس تقریب میں شریک تھا۔ ایک ملازم سے کہہ کر اس نے اسے اپنی ٹپ پر بلوایا۔

”کیا حال ہے آفتاب؟ مجھے امید نہیں تھی کہ تم سے یہاں ملاقات ہو سکے گی۔“ آفتاب کے قریب آنے پر اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اس نے اس سے کہا۔

”جی ہاں، امید تو مجھے بھی نہیں تھی کہ کوئی کی کسی تقریب میں مجھے مدعو کیا جائے گا لیکن شاید دوزیروں، سفیروں کی کمی کی وجہ سے ہماری منجانبش نکل آئی۔“ اس نے بیٹھے ہوئے جواب دیا۔

”دزیروں، سفیروں کو بلا کر چودھری افتخار کو اپنے لیے مصیبت بلوائی گئی؟ دزیروں، سفیروں آتے تو ساتھ میڈیا والے بھی آتے اور یہ بات خوب اچھلتی کہ چودھری صاحب نے اپنے ذہنی معذور بیٹے کا نکاح ایک چھوٹے زمیندار کی محنت مند لڑکی سے کیا ہے۔ وہ لوگ اصل اسٹوری بھی کھوجنے کی کوشش کرتے کہ یہ نکاح ہوا کیسے؟ ویسے میرے خیال میں تمہیں تو علم ہو گا اس اسٹوری کا؟“ اس نے بڑے یقین سے آفتاب سے سوال کیا تو وہ انکار نہیں کر سکا اور کشور کی زبانی علم میں آنے والی تمام معلومات فراہم کر دیں۔

”مجھے پہلے ہی شک تھا کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہے۔ چودھری بختیار عرصے سے چودھری افتخار کی آنکھوں میں کھٹک رہا تھا۔ اس نے موقع دیکھ کر اس بے چارے کی مجبوری سے فائدہ اٹھالیا۔“ ساری تفصیل سن کر اس نے دانت کچکچاتے ہوئے افسوس کا اظہار کیا۔ اس وقت وہ اور آفتاب ٹپل پر تھپتھے اور گفتگو بھی دھیمی آواز میں ہو رہی تھی اس لیے کسی اور کے کچھ سن لینے کا احتمال نہیں تھا۔

”چودھری کی شقی افسوس کوئی ڈھکی چھپی بات تو نہیں

سرا ہم لوگ تو خود اس کی اس فطرت کا مظاہرہ دیکھ چکے ہیں۔" آفتاب دھیمے لہجے میں بولا۔ اسی وقت ملازمین نے کھانا لگا کر شروع کر دیا۔ ان کی میز پر کھانا لگ چکا تو چودھری خود لپک کر ان کی طرف آیا۔

"بسم اللہ کیجیے اسے سی صاحب! آج اس خوشی کے موقع پر مختلف بالکل بھی نہیں چلے گا۔" آفتاب کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے اس نے شہر یار سے کہا اور خود بھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ایک سنگین ذی امیر سے ساتھی میرا انتظار کر رہے ہیں، میں ان کے پاس جا کر بیٹھتا ہوں۔" آفتاب خود ہی معذرت کرتا ہوا وہاں سے اٹھ گیا۔ اس نے چودھری کی ناگواری بھائی بیٹی کی تھی کہ اسے ایک معمولی اسکول بچہ کا اس جگہ بیٹھنا اچھا نہیں لگتا تھا۔

"شروع کیجیے جناب! میں دو چار لٹے آپ کے ساتھ لینے کے بعد باقی مہمانوں کا ساتھ دیتے ان کے درمیان جا کر بیٹھوں گا۔ میری ذاتی خواہش تو یہی تھی کہ آپ سب معززین ایک ہی جگہ بیٹھ کر کھانا تناول کرتے لیکن باجوہ صاحب نے خیال ظاہر کیا کہ آپ ان کے ساتھ بیٹھنا پسند نہیں کریں گے۔ ایس بی صاحب سے بھی آپ کے تعلقات کچھ زیادہ خوشگوار نہیں ایس لیے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ آپ حضرات کو ایک میز پر جمع ہونے کی زحمت نہ دی جائے۔ ناگواری کے ساتھ بھلا کیا خاک کچھ کھایا جاتا ہے۔" اسے

کھانے کی ترغیب دیتے ہوئے چودھری نے خود بھی اپنے لیے ایک پلیٹ میں تھوڑا سا سالن نکال لیا۔ شہر یار نے البتہ چاول لینا پسند کیا۔ یہ چند لٹے چاول بھی وہ بمشکل ہی کھا سکا۔ ایک تو چودھری کی کمانی میں حرام کی آمیزش کا خیال، دوسرے پر احساس کہ ایک معصوم لڑکی کے ارمانوں کی راکھ پر خوشی کی پمختل برپا کی گئی ہے، اسے بری طرح چوکے لگا رہا تھا۔

دہن اندر زنان خانے میں تھی لیکن دولہا کے طور پر ادھر ادھر پھرتے چودھری ہنر او کو دیکھ کر تو اندازہ لگا یا ہی جا سکتا تھا کہ اس شادی سے اس بے چاری پر کیا گزری ہوگی۔

"آپ نے تو کچھ کھا ہی نہیں۔ ذرا سا کچھ کربھی ہاتھ سمجھی لیا۔ کچھ اور بھی لیجیے نا۔" اسے ہاتھ سمجھتے دیکھ کر چودھری نے بچل پر موجود انواع و اقسام کی ڈسٹرکی طرف اشارہ کرتے ہوئے اصرار کیا۔

"بس چودھری صاحب! مجھے بھوک نہیں ہے۔" "اچھا تو یہ ذرا سا میٹھا ہی کچھ لیں۔" اس کے انکار کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے چودھری نے زبردستی اس کی پلیٹ

میں کھیر ڈال دی۔ ناچار اسے دو تین پیچھے کھیر کھانی پڑی۔ "مجھے اچھا نہیں لگ رہا آپ کا اس طرح سونگھنے کے انداز میں کھانا کھانا۔ بہر حال، میں آپ سے زبردستی بھی نہیں کر سکتا۔ آپ بیٹھیے، میں ذرا دوسرے مہمانوں کو بھی دیکھ لوں۔" چودھری وہاں سے اٹھ کر اس دوسری میز پر چلا گیا جہاں باجوہ اور تارڑ کے علاوہ کچھ دوسرے مقامی افسران بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک ملازم شہر یار کی میز پر سے کھانے کے برتن سمیٹنے لگا۔ ابھی برتن مکمل طور پر سمیٹے بھی نہیں گئے تھے کہ اسے پیٹ میں ہلکی سی تکلیف محسوس ہوئی۔

"لگتا ہے چودھری کا حرام مال مجھے ہضم نہیں ہوا۔" وہ آہستہ سے بڑبڑایا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ فانی بیٹی پوری ہو گئی تھی اور اب مزید یہاں رکنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے کھڑا ہوتے دیکھ کر چودھری دیگر مہمانوں کو چھوڑ کر لپک کر اس کی طرف آیا۔

"ارے یہ کیا اے سی صاحب! آپ اتنی جلدی جانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ ہمارا ارادہ تو آج کی رات آپ کو یہیں روکنے کا تھا۔ دوستوں کی تفریح کے لیے کچھ خاص انتظام کیا تھا ہم نے۔ آپ ہماری درخواست پر رد کر جائیں تو بڑے لطف اندوز ہوں گے۔" ایک آنکھ دہاتے ہوئے اس نے معنی خیز لہجے میں اسے ترغیب دی۔

"میری طرف سے معذرت چودھری صاحب! میرا ایسی کسی تفریح کا موڈ نہیں اور طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی۔" پیٹ میں اٹھنے والی درد کی شدید لہر کو برداشت کرتے ہوئے اس نے انکار کیا۔

"اگر آپ کی مرضی نہیں تو میں زبردستی نہیں کروں گا۔ آئیے میں آپ کو آپ کی گاڑی تک چھوڑ دوں۔" اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیتے ہوئے چودھری نے جین شل کی اور اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگے لیکن شہر یار محسوس کر رہا تھا کہ ہر اچھے قدم کے ساتھ اس کی تکلیف میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ اب تکلیف کے ساتھ ساتھ شدید پچکھ اور شل بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس کے قدم لڑکھڑانے سے لگے۔

"آپ کی طبیعت تو زیادہ ہی خراب لگ رہی ہے۔ ایسا کریں آج رات یہیں موٹی میں آرام کر لیں۔ میں ڈاکٹر کو بھیج کر دیکھ لوں۔ آرام آجائے تو کل صبح واپس چلے جائے گا۔" اس کی حالت دیکھتے ہوئے چودھری نے جین شل کی۔

"نہیں، میں واپس جاؤں گا۔" تکلیف کے باوجود وہ اپنی بات پر اڑا ہوا تھا لیکن پھر زوردار ابائی آئی اور اسے

تے ہو گئی۔ چودھری فوراً ہی اپنے ملازمین کو آواز دینے لگا۔ ملازمین اس کی آواز سن کر دوڑے چلے آئے۔ مہمان بھی متوجہ ہو گئے۔ متوجہ ہونے والوں میں آفتاب بھی شامل تھا۔ "اے سی صاحب کو اندر لے چلو اور اسپتال سے ڈاکٹر کو لے کر آؤ۔" چودھری نے ہدایات جاری کیں جن پر فوراً عمل درآمد کیا جانے لگا۔ شہر یار پر اتنی ہی تہمت طاری ہو چکی تھی کہ وہ اپنی کوئی رائے دینے کے قابل نہیں رہا تھا اور کسی اور میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ چودھری کی رائے کے سامنے اپنی رائے دے سکتا۔ یوں بھی صورت حال کے مطابق اس نے جو احکامات جاری کیے تھے، وہ مناسب ہی معلوم ہوتے تھے۔

آفتاب البتہ تشویش میں مبتلا تھا کہ اچانک شہر یار کی اتنی زیادہ طبیعت کیسے خراب ہو گئی۔ کھانے سے قبل تو وہ اس کے ساتھ بالکل ٹھیک تھا کہ بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ کھانا کھانے کے تھوڑی دیر بعد ہی اس کی یہ حالت ہو جانا اسے شک میں مبتلا کر رہا تھا کہ کہیں کھانے میں تو کوئی گڑبڑ نہیں تھی... لیکن اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ کھانے میں چودھری خود بھی شہر یار کے ساتھ شریک تھا۔ اگر کھانے میں کچھ ملا ہوا تھا تو اس پر بھی اثر ہونا چاہیے تھا جبکہ وہ بالکل ٹھیک تھا کہ نظر آ رہا تھا۔ ملازمین شہر یار کو اندر لے گئے۔ اس کی حالت سے ظاہر تھا کہ وہ اس قدر بڑھال ہو چکا ہے کہ تقریباً نیم بے ہوش کی حالت میں ہے۔

"آپ یہیں روکو ماسٹر صاحب! امرکار کا حکم ہے کہ کسی کو اندر نہ آئے دیا جائے۔" بھیر بھارتی سر پیش کر کے پریشانی ہو گی۔ "آفتاب جو بے اختیار ہی شہر یار کو اٹھا کر لے جانے والوں کے پیچھے لگا تھا، اسے ایک ملازم نے روک کر سہ حکم نامہ سنایا۔ اس حکم کو سن کر وہ پیچھے ہٹ گیا۔ چودھری کی اجازت کے بغیر زبردستی اندر داخل ہونا ممکن نہیں تھا۔ ویسے بھی بات ایک طرح سے معقول ہی تھی۔ سر پیش کے گرد موجود تیار داروں کا جھوم بسا اوقات اس کے لیے باعث تسلی بننے کے بجائے زحمت بن جاتا ہے۔ وہ پریشان سا واپس ایک کرسی پر جا بیٹھا۔ چودھری کے بندے فوری طور پر کمر صحت سے ڈاکٹر کو لے کر آ گئے۔ یہ ایک لینڈ ڈاکٹر تھی جو وہ دن قبل ہی میر آباد پہنچی تھی۔ لینڈ ڈاکٹر کے پیچھے چودھری کا ایک ملازم بڑا سا میڈیکل باکس اٹھائے ہوئے چل رہا تھا۔ ڈاکٹر کے پیچھے جانے سے آفتاب کو کچھ تسلی ہوئی اور وہ لوگوں کے درمیان سے نکل کر باہر نکلے جسے بھی پہنچ گیا۔ یہاں آنے والے مہمانوں کی گاڑیاں پارک تھیں۔ ان گاڑیوں میں شہر یار کی گاڑی شناخت کرنے میں اسے کوئی مشکل پیش نہیں

آئی۔ وہ ٹھٹھا ہوا اس گاڑی تک چلا گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر مشاہیرم خان کے بجائے کوئی اور ڈرائیور موجود تھا جو سیٹ کی پشت سے سر نکالے مزے سے سو رہا تھا۔ اس نے کھڑکی کے کھلے شیشے سے ہاتھ اندر ڈال کر ڈرائیور کا شانہ ہلایا۔ وہ ہڑبڑا کر نیند سے جاگا۔

"تمہارے صاحب کی طبیعت خراب ہے اور تم یہاں مزے سے سو رہے ہو۔" ڈرائیور کے آنکھ کھولنے پر اس نے ناراضگی کا اظہار کیا۔

"کیا ہوا صاحب کو؟" وہ پریشانی کے عالم میں گاڑی سے اترتا۔

"معلوم نہیں۔ بس کھانا کھا کر باہر نکل رہے تھے کہ اچانک ہی طبیعت بگڑ گئی۔ چودھری صاحب انہیں اپنے بندوں کے ذریعے اندر لے گئے ہیں۔ اسپتال سے ڈاکٹر کو بھی بلوایا ہے۔ ڈاکٹر بھی اندر ہی ہے۔ آگے مجھے نہیں معلوم کہ کیا حال ہے؟" اس نے بتایا۔

"میرے خیال میں میں ہی اے سی صاحب کو اس بات کی اطلاع دینی چاہیے۔" ڈرائیور پریشانی سے بولا تو آفتاب کو اپنی صحت کا احساس ہوا۔ پریشانی میں اسے خیال ہی نہیں آیا تھا کہ عبدالمنان کو فون کر دے۔ وہی ایک ایسا شخص تھا جو شہر یار کا سچا ہی خواہ بھی تھا اور جسے روکنا چودھری کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ وہ اپنا موبائل نکال کر عبدالمنان کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ دوسری طرف تیل جاری تھی لیکن کوئی کال ریسپو نہیں کر رہا تھا۔

"بی اے صاحب کال ریسپو نہیں کر رہے ہیں۔" اس نے ڈرائیور کو بتایا۔

"آج ان کی سالی کی شادی ہے، وہ ادھر گئے ہوئے ہیں۔ ہو سکتا ہے شادی کے بنگے میں انہیں فون پہنچے کا پتا ہی نہ چلا ہو۔ آپ دوبارہ کوشش کر کے دیکھیں۔" ڈرائیور نے اسے معلومات فراہم کرتے ہوئے مشورہ دیا تو وہ ٹھیک ہی انداز میں سرگوشش دیتے ہوئے ایک بار پھر کوشش کرنے لگا۔ ڈرائیور کی فراہم کردہ اطلاع نے شہر یار کی یہاں اسکی موجودگی پر بھی روشنی ڈال دی تھی، ورنہ عموماً تو عبدالمنان اس کے ساتھ ہی ہوتا تھا۔

دوسری بار کوشش کرنے پر بھی کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکلا۔ آفتاب نے کچھ مایوس ہوتے ہوئے موبائل واپس جیب میں رکھ لیا۔ موبائل جیب میں رکھتے ہی سمجھنے لگا۔ اس نے نکال کر دیکھا تو دیکھ کر پر عبدالمنان کا نام ہلکا رہا تھا۔ اس نے کال ریسپو کر لی۔



سید محمد علی قادری

ذَٰلِكَ الَّذِي جَعَلَ فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَجَعَلَ فِيهَا سِرَاجًا وَقَمَرًا مُنِيرًا

آپ کے ستارے کیا کہتے ہیں؟

آپ کیلئے کون سا سال 'مہینہ' دن بہتر رہے گا؟ محبت، دولت اور دیگر معاملات میں کب کامیابی ملے گی؟

معروف ملیر فلکیات سید محمد علی قادری سے راہنمائی حاصل کریں۔

اس کے علاوہ قادری صاحب آپ کے دنیاوی مسائل کا قرآنی آیات اور اسماء الحسنیٰ سے پیش کرتے ہیں۔

☆ شاہ صاحب! میں نے بڑی مجبوری میں آپ کو فون کیا تھا

میرا شوہر میرا بالکل خیال نہیں رکھتا تھا نہ ہی اسے اپنے بچوں کا

خیال تھا نہ ہی مجھے خرچہ دیتا تھا 'ماگوں تو مارتا تھا' میں نے سلامتی

کر کے بچوں کو نیشن پڑھا کر گھر چلا رہی تھی پھر آپ کا کسی

نے بتایا تو آپ نے کسی عورت کا پتہ بتایا تھا پھر آپ نے

مجھے چاندی کا نقش اور مبارک پتھر دیا 'میں نے تقریباً دو ماہ

وظیفہ پڑھا مگر کچھ نہیں ہوا' میں بہت مایوس ہو گئی تھی مگر آپ

نے کہا مگر نہ کرو وظیفہ 31 دن اور پڑھو جب دوبارہ پڑھنا

شروع کیا تو ان کے رویے میں کچھ تبدیلی نظر آئی اور پھر تو

آہستہ آہستہ وہ بالکل ٹھیک ہو گئے 'مجھے سلامتی کرنے سے بھی

منع کر دیا' خود سارے گھر کا خرچہ اٹھاتے ہیں 'میرا خیال بھی

بہت رکھنے لگے ہیں' بچوں سے بھی بہت شفقت ہے 'میں آتے

ہیں قادری صاحب آپ کے لیے ہر وقت میرے دل سے

دُعائیں نکلتی ہیں آپ نے میرا گھر اجڑنے سے بچایا 'اللہ آپ

کو اس کا اجر دے گا 'نقش کا کیا کرنا ہے؟ (تسلیم کراہور)۔

☆ بیٹی! اللہ کا شکر ادا کریں 'میں نے تو صرف آپ کی

راہنمائی کی 'مگر تو آپ کا اللہ نے بچایا' وظیفہ ابھی 21 دن اور

پڑھ لیجئے گا اس کے بعد اسے ٹھنڈا کر دو 'فصل شکرانے کے

ادار لیجئے گا 'اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ (آمین)

☆ شادی کب ہوگی اپنی یا فیروں میں؟ (ٹانیا لاہور)

● شادی کا امکان اگلے سال میں تک نظر آ رہا ہے 'اپنیوں میں

زیادہ امکان ہے۔

☆ میں نے بی۔ اے کے پیپر دیئے ہیں 'محنت تو بہت کی ہے

کامیاب ہو جاؤں گی؟ (نورین اختر 'امیت آباد)

● کامیابی کا امکان نظر آ رہا ہے۔

☆ قادری صاحب! میرا مسئلہ یہ تھا کہ میری مفتی زبردستی ایک

ایسے لڑکے کے ساتھ کر دی گئی تھی جو مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا

تھا 'قریب تھا کہ میں خودکشی کر لیتی کہ میری ایک دوست نے

مجھے آپ کا بتایا آپ سے فون پر بات کر کے میرے دل کو

بہت تسلی ہوئی، آپ نے ایک لوح مبارک اور سعد پتھر

منگوانے کا کہا 'میں نے یہ سب چیزیں منگوائیں اور وظیفہ

شروع کیا 'ایک ماہ بعد ہی وہ لڑکا جس سے میری مفتی ہوئی تھی

اس نے خودی مجھ سے شادی کرنے کے لیے انکار کر دیا 'عام

حالات میں تو یہ بہت برا ہوتا لیکن میرے لیے یہ بہت بڑی

خوشی کی بات تھی 'ہر وقت آپ کے لیے دعا کرتی ہوں وظیفہ

ابھی جاری رکھنا ہے؟ (تسلیم کوثر 'مجمرات)

● بیٹی! اللہ کا شکر ادا کریں 'لوح کو ٹھنڈا کرادیں اور دو نفل

شکرانے کے ادا کریں 'نماز کی پابندی رکھیں۔

"چلیں، اگر آئے بغیر آپ کی تسلی نہیں ہو سکتی تو پھر

تشریف لے آئیں۔ ہم تو جاگ ہی رہے ہیں۔ آپ کے

استقبال کے لیے بھی تیار رہیں گے۔" عبدالمنان نے یقیناً

اس کی تجویز ماننے سے انکار کر دیا جب ہی اس نے مایوسانہ

انداز میں اسے یہ جواب دینے کے بعد فون بند کر دیا۔ اسی

وقت اس کی نظر آفتاب پر پڑی۔

"اوپر سے اسٹار آؤ! ابھی تک یہیں ہے؟ کیا بات ہے،

کیا روٹی ٹوٹی نہیں ملی تھی اب تک؟"

"میں اسے ہی صاحب کی خیریت معلوم کرنے کے

لیے رکا ہوا ہوں۔" چودھری کے توہین آمیز لہجے پر خود پرکڑا

ضبط کرتے ہوئے اس نے اسے جواب دیا۔

"یہ بولنا کہ تھے چچہ کی رکی کا چھامو موقع ملا ہے۔ ابھی

تیرا کوئی اور مطلب انکا ہوا ہوگا اسے ہی سے 'جب ہی ادھر

چکرا رہا ہے۔" چودھری نے ایک اور طنز کیا۔

"میرا کیا مطلب انکا ہے ان سے چودھری صاحب!

میں نہ سرکاری افسر ہوں اور نہ ہی کوئی جاگیردار۔ علاقے کے

پھوٹے موٹے مسائل کے حل کے لیے ضرور کوشش کرتا

ہوں۔۔۔ پر اللہ کا شکر ہے، یہ سنے اسے ہی صاحب خود ہی بہت

اجتہاد کرتے ہیں۔ کسی کے توجہ دلائے بغیر مجھے بہت کچھ کرنے کا

عزم رکھتے ہیں۔ اللہ انہیں حاسدوں کے شر سے محفوظ رکھے۔

انشاء اللہ آنے والے وقت میں بہت کچھ بدل کر رہ جائے

گا۔" آفتاب بے باکی سے چودھری کو یہ جواب دے کر لے

لبے ڈگ بھرتا ہوا بیرونی راستے کی طرف بڑھ گیا۔ یہاں

مزید کرنا سوچا کہ وہ منہ نہیں تھا۔ شہر بارنگ وہ لوگ اسے جانے نہیں

دیتے اور یہاں رکھنے سے فضول میں مزید کوئی بد مزہ ہو جاتی

تو یہ کسی بھی اعتبار سے اچھا نہیں ہوتا۔

"ہائے! اڈا کسٹری کو جا کر بول کہ تھوڑی دیر بعد اسی

کا پی اے ادھر آ رہا ہے۔ وہ چنگی طرح سب دیکھ بھال

لے۔" باہر نکلتے نکلتے اس کے کانوں میں چودھری کی آواز

پڑی۔ اپنے کارندے کو یہ عام سی ہدایت دیتے ہوئے اس

کے لہجے میں جوش تھا، وہ یقیناً آفتاب کی باتوں کے ڈھیل

میں پیدا ہوا تھا۔ چودھری کے اس طیش پر وہ مسکراتا ہوا باہر

نکل گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اصل طیش تو اسے کل کا اخبار پڑھ کر

آئے گا۔ مقامی اخبارات اگر اس کے ایب نارل بننے کی

شادی پر خاموش تھے تو کیا ہوا؟ کل لاہور کے اخبارات میں تو

"خیریت آفتاب صاحب! آپ اس وقت کیسے کال

کر رہے تھے؟ میں اصل میں اپنی سسران لاکھ شادی میں آیا

ہوا ہوں۔ یہاں رخصتی کا سلسلہ چل رہا تھا اس لیے ہنگامے

میں مجھے آپ کی کال ریسپونڈ کرنے کی مہلت نہیں مل سکی۔

فرمائیے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" وہ بہت

شائستہ لہجے میں اس سے دریافت کر رہا تھا، جواباً اس نے

شہر یار کی طبیعت کے بارے میں اسے آگاہ کر دیا۔

"بہت اچھا ہوا کہ آپ نے مجھے اطلاع دے دی۔

اب میں خود اس معاملے کو پیٹل کر لوں گا۔" ساری بات سن

کر عبدالمنان نے کہا تو اس کے لہجے میں پریشانی جھلک رہی

تھی لیکن بہر حال وہ تجربہ کار آدمی تھا جو ہر طرح کی صورت

حال سے نمٹنا جانتا تھا۔ آفتاب اس سے بات کرنے کے بعد

قدرے مطمئن ہو گیا اور واپس اندر پنڈال میں چلا گیا۔

مہمانوں کی اکثریت رخصت ہو چکی تھی۔ صرف ایس

بی معتمد تارڑ اور چند ایک دوسرے افراد ہی نظر آ رہے تھے۔

ان افراد کو بھی طور پر شہر یار سے دلچسپی تو نہیں تھی لیکن وہ اپنے

ضلع کے اے سی کو یہ باور کروانے کے لیے کہہ رہے تھے کہ انہیں اس کی

بہت فکر ہے، ابھی تک یہاں رکے ہوئے تھے۔

"بہن! فکر نہ کرو بیٹی! اے سی صاحب یہاں بڑے

آرام نال ہیں۔ ڈاکٹری نے پہلی طرح ان کو دیکھ لیا ہے، کہہ

رہی تھی فوڈ پوائزننگ ہو گئی ہے۔ اس نے کچھ انجکشن وغیرہ

لگا دیا ہے۔ اب اے سی صاحب کی حالت تسخیر ہو گئی ہے۔ وہ

آرام سے سو رہے ہیں۔ پھر بھی میں نے ڈاکٹری کو رات

بیسویں روک لیا ہے۔ وہ رات بھر بیٹھیں رہ کر اے سی صاحب کی

دیکھ بھال کر رہے گی۔ صبح فجر میں انہیں واپس بھجوانے کا

بندوبست کر دوں گا۔" آفتاب ان بڑے لوگوں کی تکمیل سے

کچھ فکاہ صلب کر رہا تھا جب اس نے چودھری افتخاری کی آواز سنی۔ یقیناً

اس کے موہل پر عبدالمنان کی کال آئی ہوئی تھی جسے وہ یہ

تسلیم دے رہا تھا۔

"آپ آنا چاہتے ہیں تو شوق سے آئیں۔ میں تو

صرف اس لیے منع کر رہا تھا کہ کہاں رات کے وقت اتنا لمبا

سفر کر کے بے آرام ہوں گے۔ ہم یہاں شہر یار صاحب کا

خیال رکھ رہے ہیں۔ ہمارے لیے یہ صرف ضلع کے اے

سی کا معاملہ تھوڑی ہے، ہمیں تو رانا صاحب کو بھی جواب دینے

کی فکر ہے۔ ان کا بھانجا ہمارا مہمان بن کر کسی تکلیف میں مبتلا

☆☆☆

"کیسی طبیعت ہے اب آپ کی؟" اس کے اشارے

نوٹ: خط لکھتے وقت اپنا نام اپنی والدہ کا نام تاریخ پیدائش اور وقت پیدائش ضرور لکھیں۔ براہ راست جواب کے لیے جوابی تلفاز ساتھ بھیجیں۔

911-A، سیکٹر B-11، تار تھ کراچی نزد ٹیلی فون ایکسچینج کراچی۔ موبائل: 0333-2105914

E-mail: mashal_e_raah@yahoo.com / mashal_e_raah1@hotmail.com

پرائیکہ کر رہی تھیں تو آفتاب نے دریافت کیا۔
 ”بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ اگر عبدالمنان آرام پر اتنا زیادہ اصرار نہ کرتا تو میں آج آفس چلا جاتا۔ معمولی سا فوڈ پائزن تھا۔ ڈاکٹر ماربا کے ٹریٹمنٹ سے فوراً کنٹرول میں بھی آگیا۔ کل سارا دن کچھ کمزوری کا احساس ضرور ہوا لیکن آج تو میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”پھر بھی آرام کرنا مناسب تھا۔ عبدالمنان صاخب نے بالکل ٹھیک مشورہ دیا۔ پرسوں رات آپ کی جو حالت ہوئی تھی، اسے دیکھ کر تو میں ڈر ہی گیا تھا۔“
 ”مجھے تمہاری پریشانی کا علم ہے۔ تمہاری فون کال پر عبدالمنان کو آدمی رات کو دوڑ لگانی پڑی۔ بے چارہ صبح تک جانتا رہا پھر مجھے واپس لے کر یہاں آیا۔ یہاں بھی میں اس کی کڑی نگرانی میں ہوں۔ میرے آرام کے خیال سے وہ کسی کو مزاج پر ہی تنک کے لیے نہیں آنے دے رہا۔ کل چودھری افتخار کو بھی باہر ہی سے ٹال چکا ہے۔ تمہیں تو میری خصوصی سفارش پر اجازت ملی ہے۔“ اس نے ہنسنے سے روک دیا۔

”جی ہاں، مجھے علم ہے۔ کل میں نے فون پر خیریت معلوم کی تھی، تب ہی انہوں نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ۔۔۔“
 ”ذال آل آپ کسی سے ملاقات نہیں کر سکتے اسی لیے تو میں آج آیا ہوں۔“ آفتاب نے مسکراتے لیوں کے ساتھ کہا پھر جیدگی اختیار کرتے ہوئے بولا۔ ”وہی آپ کی اس طرح اچانک طبیعت خراب ہو گئی؟ آپ نے واپس آنے کے بعد کسی اور ڈاکٹر سے چیک اپ کروایا؟“

”یقیناً کھانے پینے میں کوئی بد احتیاطی ہو گئی ہوگی۔ شاید میں نے دو پھر کو جو کھانا کھایا تھا، سوچ سے ہضم نہیں ہوا تھا۔ اس پر میں نے دعوت کا کھانا بھی کھا لیا تو معدہ برداشت نہیں کر سکا۔ رہی کسی اور ڈاکٹر سے چیک اپ کروانے کی بات تو اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر ماربا اچھی ڈاکٹر ہے۔ میں اس کی تجویز کردہ میڈیسن لے رہا ہوں اور بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔“ اس نے بے پردائی سے جواب دیا۔

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ گریز دعوت والے کھانے میں ہی ہو۔ چودھری افتخار جیسے شخص سے کسی بھی بات کی توقع رکھی جاسکتی ہے۔“ آفتاب نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔
 ”ارے نہیں، میرے خیال میں وہ اسے گھر پر میرے ساتھ کوئی ایسی ویسی حرکت کرنے کی غلطی نہیں کر سکتا۔ ویسے بھی مجھے یہ تکلیف پہنچا کر اسے کیا فائدہ مل سکتا تھا؟ ویسے

عبدالمنان احتیاطاً اہم معاملات کی چیلنگ کروا چکا ہے۔ ایسی کوئی اطلاع نہیں ملی کہ جس سے یہ شک گزرے کہ مجھے خافل کر کے ان لوگوں نے علاقے سے مال و ہزار ہر کرنے کی کوشش کی ہو۔ میرا خیال ہے کہ یہ سب ایک اتفاق ہی تھا۔“
 ”ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو ورنہ چودھری افتخار پر اعتبار کرنا بہت مشکل ہے۔ میں نے چودھری جیسا موقع پرست آدمی نہیں دیکھا۔ چودھری بہزاد کی شادی کی مثال سامنے ہی ہے۔ چودھری بختیار سے بدلہ لینے اور اس کا سراپے آگے جھکائے رکھنے کے لیے اس نے ایک مصروف لڑکی کی زندگی کس طرح داؤ پر لگائی ہے، یہ ہم سب ہی جانتے ہیں۔“ آفتاب اب بھی مشکوک ہی تھا۔

”واقعی یہ معاملہ ہے تو بہت انصافناک۔۔۔ لیکن ورثہ کی موجودگی میں ہونے والے اس نکاح کو پیش بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں، اگر لڑکی خود اس سلسلے میں کوئی احتجاج کرے تو ہم اس کی مدد کر سکتے ہیں۔“ اس نے خیال ظاہر کیا۔
 ”میں کشور کے ذریعہ فریاد کو یہ پیغام بھیجوں گا کہ وہ آپ کے پاس انصاف کے لیے تحریری درخواست بھجوادے۔ فریاد نے درخواست بھیجی چاہی تو کشور اس کام میں اس کی بھرپور مدد کریں گی۔ میں تو بہر حال اس ظلم کے خلاف اپنے طور پر جس طریقے سے احتجاج کر سکتا تھا وہ کر چکا ہوں۔ آپ نے لاہور سے نکلنے والے محل کے اخبارات تو دیکھی ہی لیے ہوں گے؟“

”اوہ ہاں، اچھا تو یہ تم تھے جس نے چودھری بہزاد کی تصویر کے ساتھ خبر اخبار کے دفاتر تک پہنچائی تھی۔“ آفتاب کے سوال پر وہ چونک کر بولا۔ ”دولہا والی تیاری کے ساتھ کسی تین چار سالہ بچے کی طرح رو تے چلتے چودھری بہزاد کی وہ تصویر پیشی طور پر ایسی تھی کہ کئی لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے ہوں گے۔“

”جی ہاں، یہ میرا ہی کام تھا۔ میں دعوت میں شرکت کے لیے وہاں پہنچا ہی تھا کہ میری نظر چودھری بہزاد پر پڑی۔ حویلی کے دو تین ملازمین اسے لے کر اپنے ساتھ چنڈال میں داخل ہونے والے تھے کہ وہ اچانک اس بات پر تعجب کیا کہ وہاں کو بھی وہاں بلایا جائے۔ ملازم اسے سمجھاتے رہے کہ دلہن زمان خانے میں ہے اور اسے باہر مردوں میں نہیں لے جایا جا سکتا مگر وہ سامنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔ خند میں آکر اس نے نیچے زمین پر لیٹ کر اڑیاں رگڑنی شروع کر دیں۔ میرے پاس مو بائل تو موجود ہی تھا۔ موٹے کا فائدہ اٹھا کر میں نے چودھری بہزاد کی تین چار یادگار

تصویریں کھینچ لیں اور جس اخبار کے لیے لکھتا ہوں، اس کے ایڈیٹر کو تصویریں مع خبر SEND کر دیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ خبر میں چودھری افتخار کا محل کرنا نہیں لیا گیا۔ صرف یہ لکھا گیا ہے کہ جناب کے ایک دور افتادہ گاؤں کے چودھری کے بیٹے کے ویسے کے موٹے پر لیا گیا دولہا کا خصوصی پور۔ تفصیل میں بھی اتنی ہی درج ہے کہ ایک با اختیار جاگیردار نے اپنے ایک نازیل بیٹے کی شادی زبردستی ایک صحت مند لڑکی سے کروادی۔ دولہا ایک صحت مند یا کسی بھی قسم کی لڑکی سے شادی کرنے کا کتنا اہل ہے، اس کا اندازہ اس تصویر کو دیکھ کر لگا جا سکتا ہے۔“

آفتاب نے تفصیلات بتائیں تو وہ ہنسنے لگا پھر ایک ذرا سی تشویش سے بولا۔ ”میں تمہاری یہ جرأت تمہیں بھی نہ پڑ جائے۔ چودھری اخبار کے ایڈیٹر سے یہ جاننے کی کوشش ضرور کرے گا کہ اس کے خلاف یہ خبر کس نے لگوائی ہے؟“
 ”کر دیکھے کوشش۔ ایڈیٹر سب سے پہلے تو اسے یہ جواب دے گا کہ جناب! ہمیں نہیں معلوم کہ یہ خبر آپ کے خلاف ہے۔ ہمارے ایک فری لانسر صحافی نے ہمیں بغیر کسی حوالے کے یہ خبر بھیجی تھی، سو ہم نے چھاپ دی۔ معلوم ہوتا کہ اس خبر کا تعلق آپ سے ہے تو آپ نے تصدیق کر لیتے۔ ویسے تو جرم ثابت ہو تو لیکن اگر آپ کے مطابق جھوٹی ہے تو ہم اپنی اس غلطی کی تلافی کے لیے تیار ہیں۔ آپ ایک عدد تردید کی بیان دے دیں، ہم اسے بھی اپنے اخبار میں چھاپ دیں گے۔“

”اور بے چارہ چودھری یہ کر نہیں سکتا۔ اس کے تردید کی بیان دینے کا مطلب ہوگا کہ جن لوگوں کو علم نہیں انہیں بھی معلوم ہو جائے گا کہ خبر چودھری افتخار کے متعلق ہے۔ بہت خوب۔۔۔ زبردست ذکاوت پانچاں تم نے چودھری کو۔ دیکھنے میں کتنے شریف اور سیدھے سادے لگتے ہو لیکن ہونا جرنلسٹ۔۔۔ کہیں نہ کہیں اپنی اصلیت دکھائی جاتے ہو۔“ وہ بے حد مسحوظ ہوا۔

”دوسرے لفظوں میں آپ مجھے چالاک اور چال باز ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ جو حقیقت تھی، میں نے لوگوں کو وہی بتایا۔ دھوکا تو چودھری افتخار جیسے لوگ دیتے ہیں۔ میں نے دیکھا تھا کہ بہزاد چودھری کے غمخیز جانے پر ملازمین اسے واپس لے گئے تھے اور پھر وہ تقریباً تقریب کے اینڈ میں ہی دوبارہ نظر آیا تھا۔ وہ بھی اس حال میں کہ میرا خیال ہے اسے کوئی خاص میڈیسن دی گئی تھی جس کی وجہ سے وہ بالکل غم خیز ہو گیا تھا اور چپ چاپ وہی کر

رہا تھا جو اس کے ساتھ۔۔۔۔ موجود ملازم اس کے کان میں کہتا جا رہا تھا۔“ کچھ احتجاجی انداز اختیار کرتے ہوئے اس نے شہریار کی توجہ ایک اہم نکتے کی طرف مبذول کروائی۔
 ”واقعی یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔۔۔ چودھری نے یہ بہانہ تو پہلے ہی بنادیا تھا کہ دولہا کی طبیعت کچھ ساز ہے اس لیے جو لوگ حقیقت سے واقف ہیں انہیں چھوڑ کر باقی لوگ یہی سمجھ رہے ہیں کہ خرابی طبیعت کی وجہ سے دولہا بے چارہ کچھ ست ست نظر آ رہا ہے۔“ اس نے داد دینے والے انداز میں آفتاب کے تجزیے سے اتفاق کیا۔

اسی وقت ایک ملازم چائے کی ٹرالی لیے اندر داخل ہوا۔ چائے پیش کرنے کے ساتھ اس نے ایک خاکی لافانہ بھی شہریار کے سامنے رکھا۔ ملازم کی اس حرکت پر وہ چونک گیا۔ کسی ملاقاتی کی موجودگی میں کسی بھی قسم کی ڈاک کا اس طرح پیش کیا جانا معمول کے خلاف تھا۔ دولہا ڈانٹنے بغیر نظروں ہی نظروں میں اس کا جائزہ لینے لگا۔ قریبی شہر کے ڈاک خانے کی مہر لگا یہ عام سلفاق تھا لیکن اس پر لکھے اس کے نام کے ساتھ موجود پرسنل اور مسٹرار جنٹ کے الفاظ اسے خاص بنا رہے تھے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر لافانہ اٹھا لیا اور الٹ کر دوسری طرف پھینچنے والے کام دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہاں کوئی نام موجود نہیں تھا۔ اس نے کسی قدر ابھین محسوس کرتے ہوئے لافانہ چاک کیا اور ہاتھ ڈال کر اس کے اندر سے کارڈ ساز کی ایک تصویر باہر نکالی۔ اگلا جو اس کے لیے بے حد دھماکا خیز تھا۔ وہ اس بڑی طرح شاکد ہوا تھا کہ اپنے چہرے کی بدلتی ہوئی رنگت بھی چھپانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

”خیریت ہے سر؟ آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔“ آفتاب کی آواز کا قوں میں بڑی تواسے خیال آیا کہ وہ اس جگہ پر تنہا نہیں ہے۔ اس نے چونک کر تصویر سے نظریں ہٹا کر کمرے کا جائزہ لیا۔ ملازم واپس جا چکا تھا جبکہ آفتاب کمری پر بیٹھا اسے تشویش نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”ایک سیکنڈ آفتاب! آپ چائے پیئیں۔ میں مزید آپ کو وقت نہیں دے سکوں گا۔“ خیران پریشان آفتاب سے کہتا ہوا وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ باہر نکلنے سے وہ خاکی لافانہ اس کے ہاتھ میں تھا، البتہ لافانے سے نکلنے والی تصویر اس نے واپس اندر ڈال دی تھی۔

☆☆☆

”گڈ ایوننگ سر! معاف کیجیے گا مجھے آپ کے پاس آنے میں تھوڑی دیر ہو گئی۔ اہل میں جب آپ کا ڈرائیور

پیغام لے کر پہنچا تو کافی مریض بیٹھے ہوئے تھے۔ انہیں فارغ کرنے میں کچھ دیر لگ گئی۔ اچھا نہیں لگتا کہ کسی بڑے آدمی کی کال پر بے چارے غریبوں کو بے بارود دگاڑ چھوڑ دیا جائے۔ ویسے بھی مجھے نسلی تھی کہ آپ کو کوئی ایمر چلی نہیں ہو سکتی۔ ایمر چلی کی صورت میں آپ اتنی دور سے مجھے بلانے کے بجائے یقیناً پر کسی ڈاکٹر سے رابطہ کرتے۔ یقیناً آپ نے مجھے صرف اپنی نسلی کے لیے چیک اپ کروانے بلایا ہوگا۔ یہ ڈاکٹر مار یا تھی جسے شہر یار کے صدمہ پر پیر آباد سے بلوایا گیا تھا۔ اس کے بیچنے تک وہ گویا دیکھنے انگڑوں پر چلتا رہا تھا اور آپ انگڑوں چلتی ہی سرفی اس کی آنکھوں میں اتری ہوئی تھی جس سے مکمل طور پر بے خبر ڈاکٹر مار یا اپنے دیر سے آنے کی وضاحت پیش کرتے ہوئے بڑی من مانی اپنے شو لڈر بیک سے اسٹیکھ اسکو پ نکالنے کے بعد اس کی طرف بڑھی اور ہاتھ بڑھا کر اس کی کٹائی کی بٹھ چیک کرنی چاہی۔

”خبردار! دور رہو مجھ سے اور آرام سے اس کرسی پر جا کر بیٹھو۔“ اس کے کٹائی پکڑنے سے پہلے ہی شہر یار نے بے حد صدمہ دیکھنے میں غم جاری کیا۔

”لے لیکن سر... میں آپ کا چیک اپ کیسے کروں گی؟“ وہ پکھائی۔

”کیسا چیک اپ؟ کیا وہی ای جیسا تم نے پیر آباد میں چودھری افتخار کی حویلی میں کیا تھا؟“ شہر یار نے طنز سے پوچھا۔

”میں کبھی نہیں سرا کیا آپ کو مجھ سے کوئی شکایت ہے؟ میں نے تو اپنی طرف سے آپ کو بہترین ٹریٹمنٹ دیا تھا۔ آپ کی طبیعت چند گھنٹوں میں ہی مستحکم ہو گئی تھی۔ اب بھی آپ مجھے بالکل ٹھیک ٹھاک لگ رہے ہیں پھر آپ کو مجھ سے کیا شکایت ہے؟ کیا آپ کے خیال میں مجھ سے آپ کی خدمت میں کوئی کوتاہی ہو گئی ہے؟“ وہ اس کے غم پر کرسی پر تک تو گئی لیکن خوفزدہ سے انداز میں اس نے ایک ہی سانس میں کئی وضاحتیں اور سوالات کر ڈالے۔

”میری خدمت...“ شہر یار کسی سانپ کی طرح پھوکارا۔ ”خدمت تو تم نے چودھری افتخار کی ہے۔ مجھے تو تم اپ پر بتاؤ گی کہ اس خدمت کے صلے میں چودھری نے تمہیں کتنی رقم ادا کی ہے؟“

”میں سمجھی نہیں۔“ ڈاکٹر مار یا نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

”تو پھر یہ دیکھ لو۔ شاید انہیں دیکھ کر تمہیں بہت کچھ سمجھ آ جائے۔“ اس نے سانس میں رکھے لفافے سے تصویریں نکال کر اس کے سامنے میز پر پھینکیں۔ ان تصویروں کی تعداد

تین تھی۔ اُس وقت اس نے آفتاب کے سامنے محض ایک ہی تصویر نکال کر دیکھی تھی اور وہ تصویر اتنی شرمناک تھی کہ وہ لفافے میں موجود دوسری تصویریں نکالنے کی ہمت نہیں کر سکا تھا۔ تصویر میں اسے اور ایک لڑکی کو جس شرمناک انداز میں دکھایا گیا تھا، اس کے بعد تو اسے اپنا دماغ ہی بھٹک سے اڑتا ہوا محسوس ہوا۔ جب ہی اس نے آفتاب کو بھی بے حد سرد مہری کے ساتھ نظر انداز کر دیا تھا۔ کواکبجیشن میں پڑھنے، کمزور نگار میں شرکت کرنے اور کئی خواتین سے دوستی ہونے کے باوجود اسے اپنے کردار پر ہمیشہ ناز رہا تھا۔ نہ خود اس نے کبھی حدود پار کی تھیں اور نہ ہی کسی اور کو یہ موقع دیا تھا کہ وہ اس کے شفاف کردار پر بدتمنا داغ بن سکے لیکن یہ تصویریں کہہ رہی تھیں کہ وہ تصویر میں موجود لڑکی کے ساتھ ہر حد پار کر گیا تھا۔ تصویریں اتنی بے باک اور شرمناک تھیں کہ اس جیسے شفاف کردار کے مالک شخص کے بجائے کوئی کرپٹ آدمی بھی ہوتا تو حواس کھو بیٹھتا کیونکہ بہر حال تصویروں کے حقیقی یا غیر حقیقی ہونے سے قطع نظر انہیں سمجھنے جانے کا مقصد صرف ایک ہو سکتا تھا... وہ تھا تصویر میں موجود بندے کو بلیک میل کرنا... اور وہ جانتا تھا کہ اپنے کیریئر کے اس پہلے مرحلے پر ہی وہ کس کے گتے میں لٹک گیا تھا؟ اور کون تھا جو اس کو اپنی راہ سے ہٹانے کے لیے اوجھے جھٹکنڈے استعمال کر سکتا تھا؟ یہ سب کب اور کیسے ہوا ہوگا، مجھے سمجھنا ہی اس کے لیے درجوع دو چار کی طرح سیدھا سادہ حساب تھا۔ آفتاب نے ٹھیک کہا تھا کہ چودھری کسی صورت بھی اعتبار کے لائق نہیں لہذا طبیعت گھڑنے پر طبیعت ادا کے یہاں اسے حویلی کے اندر لے جایا گیا اور علاج کے لیے لیڈی ڈاکٹر مار یا کو بلایا گیا حالانکہ مرکز صحت میں تو میل ڈاکٹر بھی موجود تھا۔ ڈاکٹر مار یا کے آنے تک وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ بے ہوش کے اس عالم میں اس کے ساتھ کیا کچھ کیا گیا، اس وقت اسے خبر نہیں ہو سکی لیکن اب تصویریں دیکھ کر سمجھ آ رہا تھا کہ اس کی بے خبری سے فائدہ اٹھا کر دشمن غصہ کی چال چل گیا تھا۔ ڈاکٹر مار یا کی صورت میں اس کے سامنے دشمن کا جو اہم تر مہرہ موجود تھا، اس نے سب سے پہلے اسی سے نمٹنے کا سوچا تھا اس لیے اب وہ اس کی رہائش گاہ پر اس کے سامنے موجود تھی۔

”یہ کیا ہے؟ آپ بے ہودہ تصویریں مجھے کیوں دکھا رہے ہیں؟“ تصویروں پر نظر پڑتے ہی ڈاکٹر مار یا کا چہرہ سفید ہو گیا تھا مگر پھر اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے غصے کا اظہار کرنے کی کوشش کی۔

”اچھا، تو یہ تصویریں بے ہودہ ہیں؟ کمال ہے، اس

بات کا خیال آپ کو تصویریں اترواتے وقت کیوں نہ آیا۔“

”آپ مجھ پر کس قسم کی الزام تراشی کر رہے ہیں۔ میں آپ کی یہ فضول الزام تراشیاں سننے کے لیے کسی صورت بھی یہاں نہیں رک سکتی۔“ اس کے ہنر پر وہ سختی ہوئی اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی۔

”آرام سے تشریف رکھیں خاتون! میری اجازت کے بغیر آپ یہاں سے نہیں نہیں جاسکتیں۔“ اس نے سرد لہجے میں حکم دیا۔

”آپ کیوں میرے ساتھ زبردستی کر رہے ہیں؟ میرا ان تصویروں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“ وہ بے بسی سے دوبارہ کرسی پر بیٹھی اور اس سے نظریں چراتے ہوئے بولی۔

”لیکن مجھے یقین ہے کہ ان تصویروں میں جو لڑکی نظر آ رہی ہے، وہ آپ ہی ہیں۔“ وہ ایک ایک لفظ زور دیتے ہوئے بولا۔

”یہ آپ کس بنیاد پر کہہ رہے ہیں؟ ان تینوں میں سے کسی بھی تصویر میں لڑکی کا چہرہ نظر نہیں آ رہا۔ صرف آپ کا چہرہ واضح ہے۔“ اس نے اپنی طرف سے ایک مضبوط دلیل پیش کی لیکن لہجے کا کھوکھلا پن اس دلیل کو کمزور ثابت کر رہا تھا۔

”میرے یقین کے پیچھے دو بڑی وجوہات ہیں۔ نمبر ایک، مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ تصاویر دو دن پہلے اس وقت چودھری افتخار کی حویلی میں لی گئیں جب میں بے ہوش تھا۔ نمبر دو یہ کہ تصویر میں آپ کی شکل نہ کسی نگرشوں تک دکھائی ہوئے براؤن اور گولڈن بال صاف نظر آ رہے ہیں۔ اس ہمیشہ اسٹائل اور ہمیشہ کلرز والی کوئی دوسری خاتون میں نے ان چند دنوں میں اپنے آس پاس بالکل نہیں دیکھی۔“ اس نے اپنے دلائل پیش کیے تو وہ ایک گھبرا سانس لیتے ہوئے سر جھکا کر آہستہ سے بولی۔

”آپ بہت ذہین ہیں۔“

”تقریف کے لیے شکریہ لیکن بہر حال میں نے آپ سے یہ تقریباتی کلمات سننے کے لیے آپ کو زحمت نہیں دی۔ میں جانتا چاہتا ہوں بلکہ جانتا تو ہوں مگر یوں سمجھیے کہ آپ کی زبان سے سننا چاہتا ہوں کہ آپ نے کس کی ایما پر یہ کام کیا اور اس کے لیے کیا قیمت وصول کی؟ یقیناً اس کام کی قیمت تو اس بیکری کے مقابلے میں اور بھی زیادہ اچھی ہوگی جس کے لالچ میں آپ نے شہری زندگی چھوڑ کر ایک گاؤں میں آ کر رہنا اور جاب کرنا منظور کر لیا۔“ وہ ایک ایک لفظ چا کر بولتے ہوئے خود کو بہت قابو میں رکھتے ہوئے تھا لیکن

درحقیقت اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مسیحا کے روپ میں اس کرپٹ لڑکی کے ساتھ کس بری طرح پیش آئے۔ ڈاکٹر مار یا نے اس کی ہر بات خاموشی سے سنی پھر منہ سے کوئی جواب دینے کے بجائے اپنے چہرے پر دونوں ہاتھ رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”آپ کے سامنے جو حالات ہیں، ان کی روشنی میں آپ جتنا چاہیں مجھے برا بھلا کہہ سکتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجھے بھی آپ کی طرح ٹرپ کیا گیا ہے۔ میں اپنی خوشی سے اس کمزور کام کے لیے راضی نہیں ہوئی۔“ انگریزوں اور سکیڈوں کے درمیان اس نے یہ چند جملے کہے تو شہر یار چونکا۔

”کیا مطلب؟“

”میں ایک مڈل کلاس گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ میرے والد میرے بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ میری می نے خود جاب کر کے بڑی جدوجہد سے مجھے بڑھا لکھا کر ڈاکٹر بنایا۔ مجھے پریکٹس شروع کیے صرف تین سال گزرے ہیں۔ اپنی ملازمت کے بعد میں نے می سے جاب چھڑوا دی تھی۔ ہم دونوں ماں بیٹی بہت مطمئن زندگی گزار رہے تھے کہ اچانک مصیبت نے ہمارے گھر کا راستہ دکھ لیا۔ ایک روز میں اپنی جاب سے واپس آ رہی تھی کہ ایک آدمی نے مجھے روک کر ضروری بات کے لیے فریبی ریسٹورنٹ چلنے کا کہا۔ میں نے اس کی بات مان لی۔ ہم ریسٹورنٹ پہنچے تو اس نے چائے پینے کے دوران مجھے پیر آباد کے مرکز صحت میں رہائش اور اچھی بیکری کے ساتھ جاب کی آفر کی۔ اس شخص کی پیش کش پر کشش تھی لیکن میں شہر چھوڑ کر گاؤں نہیں جانا چاہتی تھی۔ میں جس پرائیویٹ اسپتال میں جاب کر رہی تھی، وہ بہت نامور تھا اور وہاں بڑے بڑے ڈاکٹروں کے ساتھ بہت کچھ سمجھنے کو ملتا تھا۔ اپنی وہ جاب چھوڑ کر میں پیر آباد آ جاتی تو تجربہ کار ڈاکٹر زندگی راہنمائی سے محروم ہو جاتی۔ اس کے علاوہ دوسرا مسئلہ میری می کا تھا۔ ساری زندگی ملازمت کرنے کی وجہ سے می بہت موٹا تھیں۔ جاب چھوڑنے کے باوجود ان کا دوستوں میں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ میں پیر آباد آئی تو انہیں بھی یہاں آنا پڑتا اور یقیناً بات ہے کہ گاؤں کی محدود زندگی میں وہ بور ہو جائیں۔ ان وجوہات کی بنا پر میں نے اس شخص کی بہت اچھی آفر کے باوجود اس ملازمت کے لیے انکار کر دیا۔“ اس نے بہت تیزی سے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا اور اب اپنے متعلق تفصیلات سے آگاہ کر رہی تھی۔

”میرے انکار کے باوجود وہ شخص مسلسل میرے پیچھے

بڑا ہا۔ سٹری کی آفر بھی ڈبل کر دی لیکن مجھے اس کے اس طرح پیچھے پڑنے سے کچھ چڑھائی تھی اس لیے میں نے پھر انکار کر دیا۔ آہستہ آہستہ اس کا اصرار دھمکیوں میں تبدیل ہو گیا۔ جب میں ان دھمکیوں کو بھی خاطر میں نہ لائی تو میرے ساتھ وہ گھٹیا چال چلی گئی جس کے بعد میں ان کی بات ماننے پر مجبور ہو گئی۔

”کیسی چال؟“ وہ بولتے ہوئے اچانک خاموش ہو کر اپنی جھلی کی کپڑوں کو کھینچنے لگی تو شہر یار کو اسے تو کنا پڑا۔ ”ایک دن اسپتال جاتے ہوئے مجھے راستے میں اغوا کر لیا گیا۔ اغوا کرنے والے کون تھے، مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ میں چند گھنٹے بے ہوشی کی حالت میں ان کے قبضے میں رہی پھر ہوش میں آنے کے بعد مجھے واپس میرے گھر پہنچا دیا گیا۔ چونکہ یہ سب چند گھنٹوں میں میرے ڈیوٹی آؤرز میں ہوا تھا، اس لیے مجھے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ خود میں نے بھی کچھ نہیں بتایا کہ میرے اعداد سے کے مطابق کدھنچر نے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا لیکن اگلے ہی دن ڈاک سے موصول ہونے والی اپنی شرمناک تصویروں نے مجھے بتایا کہ مجھے کس طرح شرم کیا گیا ہے۔ اس واقعے کے بعد میں پھر آدائے سے انکار کر رہی نہیں سکتی تھی۔ خود کو بدنامی سے بچانے کے لیے مجھے یہ مطالبہ ماننا پڑا۔“

”اور شاید اسی بلیک میلنگ سے ڈر کر آپ نے میرے خلاف کھیلے جانے والے ڈرامے کا حصہ بننا بھی منظور کر لیا؟“ شہر یار نے نتیجہ اخذ کیا۔

”جی ہاں۔“ اس کا سر جھٹک گیا۔ ”میں واقعی مجبور ہو گئی تھی۔ بدنامی کے خوف سے میں نے وہ دو افرام کر دی جس کو کھاکر آپ کی حالت بگڑ گئی اور آپ بے ہوش ہو گئے۔ پھر آپ کی بے ہوشی کے دوران ہی یہ شرمناک تصویریں بھی منسلک کی گئیں۔ میں نے اپنے طور پر احتجاج ضرور کیا لیکن میری اپنی تصویروں نے مجھے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔ ان لوگوں نے مجھے تسلی دی کہ آپ کے ساتھ کچھ بھی جانے والی تصویروں میں میرا چہرہ دکھائی نہیں دے گا اس لیے مجھے کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ یہ وعدہ پورا بھی کیا گیا لیکن آپ اپنی ذہانت کی وجہ سے حقیقت سمجھ گئے۔“

”ذہانت کی بات نہیں، یہ بالکل سیدھا سادہ معاملہ ہے جو ذرا سا غور کرنے پر کسی بھی شخص کی سمجھ میں آ سکتا ہے۔ لیکن آپ بتائیں کہ آپ نے اپنے بارے میں کیا سوچا ہے؟“ اتنا کہ کڑواں ان لوگوں نے صرف مجھے شرم کرنے کے لیے تو کھڑا نہیں کیا ہوگا۔ حالات سے ظاہر ہے کہ وہ آئندہ

بھی آپ کو اس قسم کے کاموں کے لیے استعمال کرتے رہیں گے۔ آپ چند تصویروں کی وجہ سے کب تک ان کے ہاتھوں کدھنچا کر رہیں گی؟“

”میری خود کدھنچا نہیں آتا کہ میں کیا کروں؟“ اس کے پوچھنے پر وہ اپنی انگلیاں مروڑتے ہوئے بے بسی سے بولی۔ ”تھوڑی سی ہمت کریں۔ آپ ہمت کر کے بیان دیکھ کر ڈر کر دینے پر راضی ہو جائیں تو ہم دونوں مل کر چودھری کے خلاف لڑ سکتے ہیں۔“

”یہ کسی صورت ممکن نہیں۔ جو کچھ میں نے آپ کو بتایا ہے، وہ کسی ریکارڈ پر لانا تو دور کی بات میں چودھری کے سامنے بھی اسے نہیں کوہرا سکتی۔“ ڈاکٹر ماریا نے صاف انکار کیا۔

”لیکن کیوں؟“ وہ اس لیے کہ اب تصویروں سے بھی بڑھ کر میری ایک کمزوری اس کے ہاتھ میں ہے۔ میں نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ میں پھر آدائے ہوئے اپنی جی کو سنا نہیں لاتی تھی۔ مجھے یہاں اور جنت آنا پڑا تھا جبکہ کسی کی خواہش تھی کہ وہ اپنے تمام احباب سے الوداعی ملاقات کر کے اور گھر کا ضروری سامان سمیٹ کر یہاں آئیں لیکن وہ نہیں پہنچیں۔ آج صبح میں نے ان سے فون پر رابطہ کرنا چاہا تو دوسری طرف سے کسی انجینی نے میری کال ریسپونڈ کی اور مجھے بتایا کہ میری جی اس کے قبضے میں ہیں۔ اگر میں نے کسی بھی معاملے میں زبان کھولی تو میری جی کی جان خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ میں نے جو کچھ آپ کو بتایا ہے، وہ انسانیت کے ناتے صرف یہ سوچ کر بتایا ہے کہ آپ اپنے تحفظ کے لیے جو کچھ کر سکتے ہیں وہ کر لیں۔ میں بہر حال، آپ سے اس کے سوا مزید کوئی تعاون نہیں کر سکتی۔“ وہ یک دم ہی روڑ ہو گئی تو وہ سوچ میں پڑ گیا پھر نرمی سے بولا۔

”فہمک ہے، آپ کھل کر میرے ساتھ تعاون نہیں کر سکتیں لیکن کچھ سوالات کے جواب تو دے سکتی ہیں؟“ ”کیسے سوالات؟ آپ پوچھ کر دیکھ لیں۔ اگر مجھے لگے کہ ان سوالات کے جواب دینا میرے اور میری جی کے لیے نقصان دہ نہیں ہے تو میں آپ سے تعاون کروں گی۔“ اس نے محتاط انداز میں جواب دیا۔

”آپ تسلی رکھیں، ایسا کچھ نہیں ہوگا۔“ شہر یار نے اسے یقین دلایا پھر اگلے چند روز مت ان دونوں کے درمیان سوال جواب کا سلسلہ جاری رہا جس کے دوران وہ اپنے سامنے رکھے نوٹ پیڈ پر کچھ ضروری نوٹس لیتا رہا۔ چند روز مت

بعد اس نے مطمئن ہوتے ہوئے ڈاکٹر ماریا کو وہاں سے جانے کی اجازت دے دی اور خود فون پر مصروف ہو گیا۔

☆☆☆

”آئی جی صاحب! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ آپ کا کلمہ آخر کیا کرتا پھر رہا ہے؟“ ”میں سمجھا نہیں جتا کہ آپ کس بارے میں ارشاد فرما رہے ہیں؟“ وزیراعلیٰ کے نہایت غصے کے ساتھ پوچھنے لگے سوالات کے جواب میں اس نے خنڈ سے لہجے میں بے نیازی کا تاثر دیتے ہوئے پوچھا۔

”خوابگردی کی گرفتاری کے بارے میں بات کر رہا ہوں میں۔ کیا محکمہ پولیس کے پاس کرنے کے لیے کوئی دوسرا کام نہیں رہا ہے جو آپ لوگ ان مظلوم افراد کے پیچھے لگ گئے ہیں؟“ وزیراعلیٰ کو یقیناً اس کی یہ بے نیازی ناگوار گزری تھی چنانچہ اس کا لہجہ کچھ اور خراب ہو گیا۔ ”یہ ایک ٹاپ سیکرٹ معاملہ ہے سر! جس پر محکمہ پولیس پوری جان نشانی سے کام کر رہا ہے۔“ اس بار آئی جی مختار مراد نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

”ٹاپ سیکرٹ معاملہ...“ وزیراعلیٰ نے ایک استہزائیہ سا ہنکا کر بھرا۔ ”آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ یہ ایک نجی معاملہ ہے جس کے پیچھے آپ محکمہ پولیس کو استعمال کر رہے ہیں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ جو کچھ آپ نے اور آپ کے داماد نے کر لیا اور پبلک کو بتایا ہے، مجھے بھی بس اتنا ہی معلوم ہے؟“ ”مجھے ایسی کوئی غلط فہمی نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ میرے سمجھ میں ایسے کئی لوگ ہیں جو ملازمت تو پولیس کی کرتے ہیں لیکن خدمت سیاست دانوں کی انجام دیتے ہیں۔ آپ کو بھی آپ کے کسی تنگ خوار نے بہت کچھ بتا دیا ہو گا لیکن میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ جو کچھ کیا جا رہا ہے، وہ ملکی مفادات میں ہی ہو رہا ہے۔“ مختار مراد نے سیاست سے لہجے میں وضاحت دی۔

”سیاست دان ہونے کا طعنہ نہ دیں آئی جی صاحب! سیاست دان تو آپ کے سمدھی صاحب بھی ہیں اور شاید اسی وجہ سے آپ کے داماد کو مانی کرتے پھر رہے ہیں۔ انہیں تو دو طرفہ پھوٹ مل گئی ہے لیکن یاد رکھیں کہ جادو انا کا یہ پاگل پن اسے بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اگر اس کی بیٹی کے اغوا اور موت کے پیچھے خوابگردیوں کا کوئی گروپ تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ شہر کے خوابگردیوں کا بیٹا ہو کر دوڑ کر دے۔ پریس نے پہلے ہی اس سلسلے میں اچھا خاصا طوفان اٹھایا ہوا ہے۔ خوابگردی الماس کے پولیس کسٹڈی میں مارے جانے کا

میڈیا نے بڑی شدت سے توجہ لیا ہے۔“ ”اس سیکشن کی سربراہی خواجہ سرائی الماس کو پولیس کسٹڈی میں مارا نہیں گیا بلکہ اس نے خود کو گولی کی تھی۔“ مختار مراد نے فوراً دھم دے کر انہیں ٹوکا۔

”یہ تو آپ کا موقف ہے نا جس پر پبلک یقین نہیں کرتی۔ پولیس کسٹڈی میں ملتان پر کیے جانے والے غیر انسانی تشدد کے نتیجے میں ان کی جان بچا جانا اور اس واقعے کو خود کشی قرار دے دینا آپ کے سمجھ کے بہت پرانی روایت ہے جس سے اب سب ہی واقف ہو چکے ہیں۔“

”میں آپ کے اس الزام کے جواب میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ الماس کی موت واقعی خود کشی کے نتیجے میں ہوئی تھی ورنہ ہم اس سے جو معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے، ان کے حصول کے لیے اس کا زندہ رہنا بہت ضروری تھا۔ اب آپ کی مرضی کہ آپ میرے اس بیان پر یقین کریں یا نہ کریں۔ بہر حال، میں آپ سے یہ ضرور جانتا چاہوں گا کہ اس وقت آپ کے کال کرنے کا کیا سبب ہے؟ ظاہر ہے آپ نے ان ٹکڑے ہوئے واقعات پر غفلت کے لیے تو اتنی زحمت نہیں کی ہوگی۔“ مختار مراد نے چاچا کر بولتے ہوئے دریافت کیا۔ وزیراعلیٰ کے اختیارات اور اپنی جگہ لیکن یہ بہر حال وہ خود بھی کوئی ایسا معمولی آدمی نہیں تھا کہ ایک ایسا شخص جو اپنی پارٹی کے حکومت میں ہونے یا نہ ہونے کی بنیاد پر عروج و زوال کے دور سے گزرتا رہتا ہو، ان پر مکمل طور پر حاوی ہو سکتا۔

”میرے پی آراؤ نے مجھے اطلاع دی ہے کہ لاہور کے سارے خوابگردیوں کو وزیراعلیٰ ہاؤس کے سامنے احتجاجی مظاہرہ کرنے والے ہیں کیونکہ ان کی رات پولیس نے پھر کسی خوابگردی کو گرفتار کیا ہے اور ویسے بھی پولیس مسلسل ان لوگوں کو تنگ کر رہی ہے۔ پولیس کے نام پر ان لوگوں کو کوئی کئی گھنٹے قحطوں میں بٹھا کر رکھا جاتا ہے جس کی وجہ سے ان کا کام دھندا متاثر ہوتا ہے۔“

”اور شاید وہ لوگ بھی جو ان کی خدمات سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔“ مختار مراد نے یہ بات صرف دل میں سوچی مگر کہی نہیں۔ پچھلے عرصے کی تحقیقات کے نتیجے میں ایسے چند افراد کے نام سامنے آئے تھے جو سرکاری طور پر بڑی اہمیت کے حامل تھے اور ان افراد کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ وہ جس دوسری قسم کا شوق رکھتے ہیں اس کی تسکین کے لیے انہیں اس قسم کے افراد کی حاجت ہوتی ہے۔ ان کے سمجھ کو شوق تو نہیں ملے تھے لیکن انہیں شک سا تھا کہ

خواب سراؤں میں سے کچھ ایسے افراد بھی تھے جو پڑوسی ملک کے لیے جاسوسی کے فرائض انجام دے رہے تھے اور ان شوقین افراد کا دل بھلانے کے عوض قیمتی معلومات حاصل کر کے پڑوسی ملک تک منتقل کر رہے تھے۔ سندھ رام کی ٹیکسٹائل مل میں تیار کردہ کپڑے کے چند مخصوص تھانوں کا اثرین آرمی کے ہاتھ ہی فروخت کیا جانا ایک بہت ہی قابل غور بات تھی۔ یقیناً کپڑے کے یہ تھان معلومات کی خفیہ ترسیل کا ذریعہ بنے رہے تھے۔ سندھ رام کی موت کے بعد چونکہ یہ سلسلہ ختم ہو گیا تھا اس لیے اس سلسلے میں تھی ثبوت تو کوئی نہیں تھا، بس واقعات کی ترتیب کو سامنے رکھ کر ہی قیاس آرائی کی جاسکتی تھی۔

”میں جانتا ہوں کہ محکمہ پولیس کی طرف سے آپ مجھے اس سلسلے میں یقین دہانی کروائیں کہ اب شہر کے کسی خواب سرا کو تنگ نہیں کیا جائے گا تا کہ میں احتجاج کے لیے آنے والوں کو مطمئن کر سکوں... ورنہ یاد رکھیے کہ آپ کا محکمہ میڈیا کی زبردست تنقید کی زد میں آ جائے گا۔“ اس کی سوچ اور پریشانیوں سے خبر وزیراعلیٰ اپنی ہی کہے جا رہے تھے۔

”ٹھیک ہے۔ آپ کر لیں وعدہ۔“ مختار مراد نے جان چھڑائی۔

”آپ نے اور آپ کی پارٹی نے اس سے پہلے کب عوام سے کیا ہوا کوئی وعدہ وفا کیا ہے جو اس ایک وعدے کے پورا نہ ہونے پر کسی کو حیرت ہوگی۔“ یہ اس کے ذہن میں ابھرنے والی وہ سوچ تھی جس کا اس نے وزیراعلیٰ کے سامنے اظہار نہیں کیا اور گفتگو کا سلسلہ ختم ہو جانے کو غصیت جانتے ہوئے ریسیور واپس رکھ کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ ابھی مشکل سے چندہ منٹ ہی گزرے تھے کہ فون ایک بار پھر بج اٹھا۔ ریسیور اٹھانے پر اسے دوسری طرف سے ڈی آئی جی سجاد رائے کے آن لائن ہونے کی اطلاع ملی۔

”ٹھیک ہے، بات کرواؤ۔“ اس نے مصروف سے انداز میں اجازت دی۔

”ایک بینڈ نیوز ہے اگلے!“ اس کی ہیلو کے جواب میں سجاد رائے کی کچھ پریشان سی آواز سنائی دی۔

”کیا؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔

”کل رات جس خواب سرا کو گرفتار کیا گیا تھا، وہ پولیس کسٹڈی میں مر گیا ہے۔“

”کیسے؟“ اس اطلاع پر وہ بھی ہلکا سا گھبراہٹا ہوا تھا۔

”جیسی طور پر تو پوسٹ مارٹم کے بعد ہی کچھ کہا جاسکتا

ہے لیکن لاش کی ظاہری حالت دیکھ کر یہی کہا جاسکتا ہے کہ موت کا سبب زہر خوردانی ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ گرفتاری کے بعد اس شخص کی مکمل تلاشی کی گئی تھی اور اس کے پاس موجود معمولی سے معمولی شے بھی قبضے میں لے لی گئی تھی اس لیے یہ نہیں سو جا جاسکتا کہ اس نے اپنے پاس زہر رکھا ہوا تھا جسے کھا کر خودکشی کر لی۔ یقیناً اس کی موت کا سبب بننے والا زہر باہر سے ہی آیا تھا اور یہ بات ہمارے گلے کے لیے بدنامی کا سبب بن سکتی ہے۔“

”یہ تو تم نے بہت تشویشناک بات بتائی ہے۔ اس ایڈووکیٹ کے کہنا پر تو میں یا بہت طوفان برپا کرے گا۔ پہلے ہی ہم پر مسلسل تنقید ہو رہی ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی میری وزیراعلیٰ سے بات ہوئی ہے۔ وہ بڑی طرح برہم ہو رہے تھے کہ ہمارا محکمہ کیوں ہاتھ دھو کر خواب سراؤں کے پیچھے پڑ گیا ہے۔“ وہ سجاد رائے کو وزیراعلیٰ سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں آگاہ کرنے لگا۔

”یہ تو واقعی بہت بڑا مسئلہ ہو جائے گا۔ شینا کی ڈیوٹی کے بعد ڈیوٹی خود کو سنبھالنے میں کامیاب نہیں ہو پارہے ہیں۔ ان کی صحت فی الحال اس لائق نہیں کہ کسی سیاسی محاذ آرائی میں لڑ سکیں۔ ان حالات میں اگر وزیراعلیٰ بھی میڈیا کے ساتھ مل گئے تو ہمیں بہت مشکل ہو جائے گی۔“ ساری بات سن کر سجاد رائے نے تشویش کا اظہار کیا۔

”اگر کی کوئی کنٹیننٹس ہی نہیں۔ وزیراعلیٰ ہر حال میں میڈیا کے ساتھ ہی کھڑے ہوں گے۔ میں اس شخص کو ابھی طرح جانتا ہوں۔ سستی شہرت حاصل کرنے کا کوئی بھی موقع ضائع کرنے والا آدمی نہیں ہے۔ وہ بہر حال، تم فی الحال سب سے پہلے تو ظلم کی موت کے وقت ڈیوٹی پر موجود عملے کی معطلی کے احکامات جاری کرواؤ تا کہ پبلک کو یہ یقین دلایا جاسکے کہ غفلت کے مرتکب ہونے والے افراد کے خلاف انکوائری کی جارہی ہے۔ ساتھ ہی کوشش کرنا کہ وہ بندہ پکڑا جائے جس کے ذریعے زہر دیا گیا۔ یقیناً یہ نیکلے عملے میں سے ہی کوئی فرد ہوگا۔ میں اس دوران اوپر بات کرتا ہوں۔ ہم اپنے طور پر جو کوششیں کر سکتے تھے وہ کر لیں، اب انٹیلی جنس کے افراد کو اس معاملے میں اعتماد میں لینا ناگزیر ہو گیا ہے۔“ مختار مراد نے ہدایات جاری کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا اگلا پروگرام بھی بتایا جس کی سجاد رائے موجودہ حالات میں مخالفت نہیں کر سکتا تھا ورنہ اس کی دلی خواہش تھی کہ اپنی بیٹی کے قتل میں ملوث ایک ایک فرد کو اپنے ہاتھوں کیفر کر دینا چاہتا ہے۔

☆☆☆

”اور سنا ہے چودھری صاحب! اپنے اے سی صاحب کے کیا حال ہیں؟ کچھ دنوں کا ہٹکا نے آیا محترم کا نہیں؟“ صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر دونوں ٹانگیں خوب پھیلا کر بیٹھے ہوئے منظر ہارڈ نے پوچھا۔

”حال تو پتلا ہے بے چارے اے سی کا۔ کل بلایا تھا اس نے ڈاکٹر ماریا کو پوچھ چکھ کے لیے۔“ ہارڈ کی بات کا جواب دے کر چودھری نے ہتھ کی نے منہ سے لگائی اور بے حد لطف اندوز ہونے والے انداز میں ایک نیا شلنگ لگایا۔

”پھر کیا بتایا اسے ڈاکٹر ماریا نے؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی وجہ سے تم پریشانی میں پڑ جائیں۔ ان عورتوں کا کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ کب بندے کو چھنسا دیں۔“ ایس پی نے تشویش کا اظہار کیا۔

”ارے نہیں ہارڈ صاحب! تمہی فکر نہ کرو۔ ڈاکٹر بی پوری طرح ہمارے ہاتھ میں ہے۔ وہ ایسی کوئی غلطی نہیں کرے گی کہ ہمیں مشکل پڑ جائے۔ آپ تو بس اب اطمینان سے اس دن کا انتظار کرو جب اے سی ہمارے سامنے تاک سے نکلیں گے۔ اس وادی ایسا وار کیا ہے ہم نے کہ اس کا بیج کھانا ممکن ہی نہیں۔ بڑے نام والے خاندان کا سپوت ہے۔ ہم سے اڑی لگا کر اپنے خاندان کی عزت رو لے کر خطرہ نہیں مول لے سکے گا۔“ چودھری بے حد مطمئن تھا۔

”بات تو آپ کی بھی ٹھیک ہے۔ اب یہ بتائیں کہ کب اس سلسلے میں اے سی سے مذاکرات شروع کریں گے؟“

”دو چار دن گزرنے دیں پھر بات بھی کر لیں گے۔ ایک جلدی کیا ہے؟ ابھی تو ہم چند دن اس اے سی کے بیٹے کے ترپے کا تماشا دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہی نیندیں اڑاتی ہیں اس نے ہماری، اب کچھ دن وہ بھی تورت چکا منائے۔ ابھی تو بے چارہ اس الجھن میں پھنسا ہوگا کہ تصویریں ہم نے بھجوائی ہیں یا نہیں اور؟ اس کی بے بسی کا تماشا دیکھنے کے لیے ہی تو میں نے ان تصویروں کے ساتھ کوئی خط پتر نہیں بھجوا تھا۔ شک ہے شک اسے ہم پر ہی ہے لیکن خود سے گل چھیننے کی ہمت تو نہیں کر سکتا۔“ چودھری کی خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔ شہر یار جس کے ہاتھوں اس نے ہمیشہ زک اٹھائی تھی، اب اپنے داڑ میں پھنسا نظر آ رہا تھا تو یہ کوئی معمولی بات تو نہیں تھی۔ اسے یقین تھا کہ ان تصویروں کے ذریعے شہر یار کو بلک سیل کر کے اس سے اپنے کئی مطالبات پورے کروائے جاسکتے ہیں۔

”اصل میں بات یہ ہے چودھری صاحب!“ ایس پی سیدھا ہو کر بیٹھا ہوا ذرا سا ہلکا ہوا۔ ”اپنے باجوہ صاحب

کچھ پریشان ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ جلد از جلد اس معاملے کو نمٹایا جائے تا کہ ان کی جی جی بخالی ہو سکے۔“

”ایک تو باجوہ نے ہارڈ پریشان کر رکھا ہے۔ ذرا وصلہ نہیں اس آدمی میں۔ مجھے بھی ہارڈ پریشان کر کے میرے کان کھاتا رہتا ہے۔ اب آپ کس قدر ہارڈ پریشان کر دیا ہے۔ میں تو سوچ رہا ہوں جان پھڑاؤں اس بندے سے۔ ویسے ہی سالہا سب کی نظروں میں آ گیا ہے۔ بھال ہوگا تو بھی پریشانی ہی رہے گی ہمیں۔“ چودھری نے ہانگاری سے کہا۔

”باجوہ کا یہی خیال ہے کہ آپ اس سے جان چھڑانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مجھ سے شکایت کر رہا تھا کہ چودھری صاحب کا رویہ کچھ بدلا بدلا سا ہے۔ مجھ سے ڈھنگ سے بات نہیں کرتے کہیں ایسا تو نہیں کہ مجھے اس سارے سیٹ آپ سے الگ کرنے کے پکڑ میں ہوں؟“

”تو آپ اسے بتا دیں کہ اس کا خیال ٹھیک ہے۔ فارینٹ آفیسر کا کیا ہے؟ اس کی جگہ جو باندھ آئے گا ہم اسے پانز ہٹائیں گے۔ خواجہ اہ ایک شک کی زد میں آئے بندے کو اپنے ساتھ لے کر کھینے کی کافرورت ہے ہمیں۔ بہت کمالیا اس نے ہمارے ساتھ رہ کر۔ اب کسی اور کو موقع دے۔“

”یہ اتنا آسان بھی ثابت نہیں ہوگا چودھری صاحب! باجوہ بکھر جائے گا۔ ہو سکتا ہے غصے میں آ کر وہ کوئی ایسا قدم اٹھا لے جس کے بعد ہمارے نام بھی سامنے آ جائیں۔ ابھی تو جو کچھ ہے صرف شک کی حد تک ہے۔ باجوہ نے کوئی اقبالی بیان دے دیا تو ہم بڑی طرح پھنس جائیں گے۔“ ہارڈ نے اسے معاملے کی نزاکت کا احساس دلایا۔

”میرے خیال میں آپ یہ گل اپنی طرف سے نہیں کر رہے ہیں۔ باجوہ نے اپنی تشویش کے ساتھ یہ دھمکی بھی آپ کے کانوں تک پہنچائی ہے۔“ چودھری نے غصے سے بولتے ہوئے ہارڈ کی شکل دیکھی تو وہ نظر چرا گیا۔ یہ ایک طرح سے اس کی طرف سے اعتراف تھا کہ وہ اپنی باجوہ نے ایسی کوئی دھمکی دی ہے۔

”تمہی یہ معاملہ مجھے پھر پھر دو ایس پی صاحب! میں آپ باجوہ سے ٹٹ لوں گا۔ تمہی ٹیکس کر۔“ چودھری نے ایک دم ہی موڈ بدل لیا اور نرم لہجے میں اسے تسلی دینے کے بعد ایک ملازم کو پکارا۔

”اوشیدے! ایس پی صاحب کے لیے کھانا شانا لگوا۔ بڑے دن گزر گئے ہم نے اپنے جن کے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں کھایا۔“ اس کے انداز سے ہارڈ نے اندازہ لگالیا کہ وہ اب مزید اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرے گا اور واقعی اس

کمرے سے اٹھ کر ڈائنگ روم تک جانے اور کھانا کھانے کے دوران چودھری اور اُدھر کے موضوعات پر ہنس ہنس کر باتیں کرتا رہا لیکن باجوہ والا معاملہ دوبارہ نہیں چھیڑا۔ ایسی ہی بھی انجمن بن گیا اور خوشگوار ماحول میں شان دار کھانا تناول کر کے خاموشی سے رخصت ہو گیا۔ اس کے رخصت ہونے کے بعد چودھری نے ہالے کو بلا دیا۔

”ختم چودھری صاحب! وہ فوراً ہی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

”سنا ہے اپنے باجوہ صاحب کی زبان بڑی کھجھڑی ہے۔ ان کے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے ہیں۔ بس نہیں چل رہا کہ جو کچھ اندر سے باہر نکال دیں۔ اور تو جانتا ہے کہ ہم ایسی حرکتوں کو پسند نہیں کرتے۔“

”آپ ختم کریں چودھری صاحب! باجوہ کا علاج ہو جائے گا۔ اگر لا علاج ہوا تو اسے وہاں بھی پٹینا جا سکتا ہے جہاں ہر لا علاج مریض کو پٹینا ہوتا ہے۔“ ہالے کو گویا اس کا من پسند مشغلہ ہاتھ لٹکنے والا تھا جس کے بارے میں سن کر اس کی چھوٹی چھوٹی سرد آنکھیں جھپکنے لگیں۔

”ابھی تو ایسا کر کہ اس پر نظر رکھ۔ آگے کیا کرتا ہے، میں تجھے بعد میں بتاؤں گا۔“ کوئی بھی انتہائی حکم صادر کرنے کے بجائے اس نے ہالے کو صرف گھرائی کا کام سونپا۔ عین وقت پر اسے خیال آ گیا کہ باجوہ کو کوئی نقصان پہنچا تو ایسی ہی کھٹک جائے گا کہ یہ اسی کا کام ہے اور فی الحال وہ ایس پی کی پائنٹز سے محروم نہیں ہونا چاہتا تھا۔ باجوہ کے مقابلے میں وہ اب بھی اس کے لیے کارآمد تھا پھر وزیراعظمی سے اس کی رشتے داری کا لحاظ رکھتے ہوئے بھی احتیاط کرنی پڑتی تھی۔ باجوہ کو کچھ ہوتا تو اس کے آگے پیچھے کوئی ایسا بڑا آدمی نہیں تھا جو چودھری کے گھگھے پر تاہن ایس پی اسے پھنسا سکتا تھا۔

”ٹھیک ہے چودھری صاحب! جیسا آپ کا حکم۔“

ہالے کو کچھ مایوسی ہوئی لیکن ظاہر ہے وہ چودھری کے سامنے اس کے فیصلے پر اعتراض تو نہیں کر سکتا تھا اس لیے فرماں برداری سے بولا۔

”ایک کام اور کرنا۔ ڈاکٹر ماریا سے کہنا کہ تیار ہے۔ آج رات ہم اسے اپنے ڈیرے پر لیٹنا چاہتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے چودھری صاحب! میں خود اسے رات کو آپ کی خدمت میں لے آؤں گا۔“ ہالے نے جواب دیا اور پھر اس کا اشارہ پاکر باہر نکل گیا۔ چودھری مسرور سا آنے والی رات کے تصور میں کھو گیا جو اسے اپنی کسی موتی بھدی بیوی یا بزاری عورت کے بجائے ڈاکٹر ماریا جیسی بھرپور

عورت کی قربت میں گزارتی تھی۔

☆☆☆

خوف سے تھر تھرا کر بیٹھے اس شخص پر سجاد رانا نے ایک قہر آلود نظر ڈالی۔ وہ کل رات ڈیوٹی پر موجود سپاہیوں میں سے ایک تھا۔ پولیس کسٹڈی میں زہر خورانی کے نتیجے میں ہلاک ہونے والے خولہ سر کی ہلاکت کے بارے میں یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ اس کی موت کا سبب کھانے میں شامل زہر تھا، فوری طور پر ڈیوٹی پر موجود دیگر افراد کی طرف ہی دھیان گیا تھا۔ خولہ سر کی موت کا انکشاف صبح اس وقت ہوا جب رات والا ٹکڑا واپس جا چکا تھا اور صبح اس کی جگہ نئے عملے کی تحقیقات کرنے والوں نے فوری طور پر رات والے عملے کو کال کر لیا۔ سارا ٹکڑا حاضر ہو گیا مگر تنویر احمد نامی سپاہی نہیں آیا۔ حاضر افراد نے تفتیش شروع کرنے کے ساتھ ہی دو سپاہی تنویر احمد کے گھر کی طرف روانہ کیے گئے جہاں اس کی بیوی نے بتایا کہ تنویر گھر پر نہیں ہے۔ وہ صبح ڈیوٹی سے واپس آتے ہی اپنے چند جوڑے کپڑے لے کر گھر سے نکل گیا تھا کہ کسی ضروری کام سے جاتا ہے۔ سپاہیوں نے اس بات کی اطلاع ایس پی کی کوئی۔ تنویر احمد کے بلاوے پر حاضر نہ ہونے پر ویسے ہی اس کی طرف سے شک کا ہو گیا تھا، اب جو اس کے گھر سے غائب ہونے کی اطلاع ملی تو یقین ہو گیا کہ خولہ سر کے قتل کے پیچھے اسی شخص کا ہاتھ ہے۔ برقی رفتار سے ہر طرف بندے دوڑائے گئے۔ تنویر احمد کے گھر سے کپڑے وغیرہ لے کر نکلنے سے یہی اندازہ ہوا تھا کہ وہ شہر سے باہر نہیں جانے کا ارادہ رکھتا ہے چنانچہ اسی رخ پر تحقیق کی گئی۔ اس کی بیوی کو ڈراوہ کا کر اس سے ان کے بیرون شہر مقیم رشتے داروں کے نام پتے معلوم کیے گئے۔ تنویر احمد کے گھر سے اس کی چند تصویریں بھی مل گئیں۔ سپاہی تصویریں سمیت ریلوے اسٹیشن اور بسوں کے اڈے کی طرف دوڑے۔ بالآخر اس بھاگ دوڑ کے نتیجے میں بس اڈے سے معلوم ہو گیا کہ اس صلیب اور شکل و صورت کا آدمی فلاں روٹ کی بس میں بیٹھ کر فلاں وقت روانہ ہوا ہے۔ بس جس شہر کی طرف تھی، وہاں تنویر احمد کی بیوی کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق اس کی بہن رہتی تھی۔ اب پولیس کے پاس یہی مسئلہ تھا کہ یا تو یہاں سے کسی کو تنویر احمد کے تعاقب میں روانہ کرے یا وہاں کی مقامی پولیس کو ڈسے داری سوئے کہ پیچھے ہی تنویر احمد پیچھے، اسے گرفتار کر کے واپس لاہور بھیجا جائے۔ لیکن سجاد رانا کی ذاتی دلچسپی اور خست دہائیات کے باعث پولیس والوں نے کچھ غیر معمولی مستعدی دکھائی۔ ٹرانسپورٹ کمپنی سے یہ معلوم

کرنے کے بعد کہ وقت کے اس دورانیے میں ان کی کمپنی کی بس کہاں تک پہنچی ہوگی، اس علاقے کے تھانہ انچارج کو حکم دیا گیا کہ راستے میں ہی بس روک کر فلاں شخص کو گرفتار کرو اور فوری طور پر لاہور روانہ کر دو۔ نتیجتاً اس وقت تنویر احمد بھی اڑنے بھی نہ پائے تھے کہ گرفتار ہو گئے۔ کے صدقاً ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنے وہاں موجود تھا۔ سجاد رانا نے معاملہ کسی اور پر چھوڑنے کے بجائے خود اس سے پوچھ گچھ کے لیے آہنچا تھا اور اب اس شخص کو قہر آلود نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”کس کے کہنے پر تم نے اس شخص کو زبردیا؟“ چند لمحوں تک اسے گھورنے کے بعد اس نے سرد لہجے میں سوال کیا۔

”اللہ پاک کی قسم سر! میں نے کسی کو زہر نہیں دیا۔“ اپنی شہرگ پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے کاہنی آواز میں جواب دیا۔

”تو پھر بھاگ کیوں رہے تھے شہر سے؟“ اس نے کچھ اور کاٹ دار لہجے میں پوچھا۔

”میں بھاگ نہیں رہا تھا سر! میری بہن کا فون آیا تھا کہ اس کے گھر والے کی طبیعت خراب ہے اس لیے میں ابیر جی میں اپنی بہن کے گھر جا رہا تھا۔ راستے میں پولیس والوں نے مجھے گرفتار کر لیا۔ میں نے بہت پوچھا مگر کسی نے نہیں بتایا کہ مجھے کس جرم میں گرفتار کیا گیا ہے۔ یہاں آکر مجھے معلوم ہوا کہ مجھ پر ہلاک اب میں بند خولہ سر کو زہر دینے کا الزام ہے۔“ وہ اب کسی حد تک خود کو سنبھال چکا تھا اور شاید وہ سب کہہ رہا تھا جو اس دوران اس نے اپنی صفائی میں کہنے کے لیے سوچا تھا۔

”آپ خود سوچیے سر! میری بھلا اس خولہ سر اسے کیا دشمنی تھی جو میں اسے زہر دے کر مارتا؟“ سجاد رانا کو براہ راست مخاطب کر کے یہ جواب دیتے ہوئے اس نے پہلے تھوک نکل کر اپنے خشک ہونے خلیق کو تڑکنے کی کوشش کی تھی۔ خود کو بزار سنبھال لینے کے باوجود بہر حال اس معمولی سپاہی کا ڈی آئی جی سے بات کرتے ہوئے پتہ پانی ہو رہا تھا۔

”میرے خیال میں ہاشی صاحب... فیض شرافت کی زبان نہیں سمجھے گا۔ بہتر ہے کہ اسے اس کے ساتھیوں کے حوالے کر دیا جائے۔ وہ لوگ خود ہی اس سے سارا جھوٹ اگلا لیں گے۔“ اس کے بیان کو خاطر میں لائے بغیر سجاد رانا نے ایس پی کو مخاطب کرتے ہوئے سیات سے لہجے میں حکم دیا تو تنویر احمد کا جسم ایک بار پھر کانپنے لگا۔ اس نے پولیس کی ملازمت میں پانچ سال گزارے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اس

کے ساتھی اس سے سچ اگھانے کے لیے کون کون سے طریقے استعمال کریں گے۔ ان طریقوں کو بھروسہ پر آزمانا مختلف بات تھی، خود پر سہنا اور بات۔ وہ فوراً ہی ڈھبے گیا۔

”میں سچ بتاتا ہوں سر! میں آپ کو سب کچھ سچ بتاتا ہوں۔“ اس سے قبل کہ ایس پی کے اشارے پر اسے وہاں سے لے جایا جاتا۔ وہ فوراً ہی بول پڑا اور دونوں ہاتھ ان کے سامنے جوڑ دیے۔

”بولو... لیکن یاد رکھنا کہ ایک لفظ بھی جھوٹ کہا تو تمہارے حق میں بہت بڑا ہوگا۔“ سجاد رانا نے اسے دھمکایا۔

”میں اپنے بچوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جو کچھ کہوں گا، سچ کہوں گا۔“ اس نے یقین دہانی کروائی پھر ذرا سا توقف کرتے ہوئے بولنا شروع کیا۔

”میں رات کے کھانے سے پہلے باہر بان والے کے کھوکھے سے سکر بیٹ لے گیا تھا۔ سکر بیٹ لے کر واپس آیا تو ایک عورت نے آواز دے کر روک لیا۔ بے چاری اچھی خاصی بوڑھی عورت تھی۔ اس کے ہاتھ میں سلور کا ایک ٹفن تھا۔ مجھ سے کہنے لگی کہ پولیس نے میرے بے گناہ بچے کو پکڑ لیا ہے۔ وہ بے چارہ پہلے ہی قسمت کا مارا ہے کہ نہ تو مکمل طور پر عورت ہے نہ ہی مرد۔ بہن بھائی اس نا کردہ گناہ کے جرم میں بے چارے کے ساتھ خوارت سے پیش آتے ہیں۔ باپ ناراض رہتا ہے کہ اس کی وجہ سے سر جھک گیا۔ ایک لے دے کر میں اس کی ماں ہی ہوں جو اپنے تخت جگر کا دکھ بھتی ہوں۔ اب بھی پولیس نے اسے گرفتار کیا ہے تو بہن بھائیوں اور باپ کو کوئی ٹھکر نہیں۔ میں ہی ماری ماری پھر کر اس کے یہاں موجود ہونے کا معلوم کرنے کے بعد یہاں آئی ہوں۔ پہلے کوشش کی تھی کہ اپنے بچے سے ملاقات کروں لیکن جواب ملا کہ بڑے صاحب کی اجازت نہیں۔ مجھ مت کی ماری کو اور کچھ کچھ نہیں آیا تو گھر جا کر اپنے بچے کے لیے کھانا پکا کر لے آئی۔ اب جب سے یہاں انتظار میں کھڑی ہوں کہ کوئی رحم دل شخص نظر آئے تو اس کے ذریعے اپنے بچے کو کھانا بھجواؤں۔ تم تھانے سے نکلے تھے جب ہی تمہاری شکل دیکھ کر میں نے سمجھ لیا تھا کہ تم کی نیک ماں باپ کی نیک اولاد ہو۔ بیٹا! اللہ کے واسطے مجھ دھاری کی مدد کرو۔ میرے بچے تک یہ کھانا پہنچا دو۔ اس کا پیٹ بھر جائے گا تو میرے کچھ میں بھی ٹھنڈ پڑ جائے گی۔ میں رکھوں گی ماری ماں اس بھلائی کے بدلے میں تمہیں ڈھیر ساری دعائیں اور یہ پانچ سو روپے دوں گی۔ بس جناب! میں اس عورت کی باتوں میں آ گیا۔ کچھ میرا دل پیچھا، کچھ باجی سو کے لا لچے نے کام دکھایا۔ میں

نے کھانے کا فن عورت سے لیا اور قیدی کو پہنچا دیا۔ صبح کے قریب میں نے چکر لگایا تو دیکھا کہ وہ مرنے لگا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ ہونہ بولکھانے میں کوئی گڑبڑ تھی۔ بوزی عورت باتیں بنا کر مجھے بے وقوف بناتی ہے۔ گھبراہٹ میں میری اور تو کچھ سمجھ نہیں آیا، ڈیوٹی کا نام سنم ہوتے ہی میں گھر گیا اور پھر وہاں سے چند جوڑے لے کر بس اڈے چلا گیا۔ خیال تھا کہ کچھ دن بہن کے گھر چسپ کر رہوں گا اور دیکھوں گا کہ معاملات کیا رخ اختیار کرتے ہیں لیکن راستے میں ہی دھڑلایا گیا۔

اس نے ایک سانس میں ہی سب کچھ کہہ ڈالا۔ سجاد رانا کی تجربہ کار نگاہیں کسی پولی گراف مشین کی طرح اس کے کہے ہوئے ایک ایک لفظ کو جاتی رہیں۔ ان کا تجربہ کہہ رہا تھا کہ اس نے جھوٹ نہیں کہا۔ واقعات اسی ترتیب سے پیش آئے ہیں جیسے اس نے بتایا ہے لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس کی حماقت اور لالچ کی وجہ سے نہ صرف وہ چھٹے تھے بلکہ ایک اہم کلیہ بھی ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ ان کے خیموں نے کئی دن کی محنت کے بعد جسم فروشی کے دھندے میں ملوث اس خولہ سرا کا پتا لگایا تھا۔ تحقیق سے معلوم ہوا تھا کہ یہ خولہ سرا کچھ بڑے عہدے داروں تک بھی رسائی رکھتا ہے اور اسی بنیاد پر اسے مشکوک قرار دیتے ہوئے گرفتار کیا گیا تھا کہ ممکن ہے یہ شخص جاسوسی کا کام انجام دے رہا ہو۔ اگر وہ لوگ اس کی زبان کھولانے میں کامیاب ہو جاتے تو اس شخص تک رسائی ممکن ہو سکتی تھی جس کی نگرانی میں سب ہو رہا تھا مگر اس کی ملاکت سے سارا منصوبہ ہی دھوا رہ گیا، البتہ اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ واقعی وہ دشمنوں کا ایک اہم مہرہ تھا جس کے ہاتھوں اپنے چھپنے سے قبل ہی انہوں نے خود ہی اسے پٹوا دیا تھا۔

”لے جاؤ اسے اور چیک کرو کہ جو کچھ اس نے کہا ہے ٹھیک ہے یا نہیں۔“ وہ جانتا تھا کہ اس کا یہ حکم بے معنی ہی ہے لیکن خیر احمد پر جو قصہ تھا، وہ کسی صورت تو ٹھکانا ہی تھا۔

☆☆☆

”میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھی۔“

”بالکل سیدھی سادی تو بات ہے۔ میں تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ تم اپنی اس زبردستی کی بے جوڑ شادی کے خلاف قانونی مدد حاصل کرنے کے لیے درخواست دو۔ درخواست میں لکھ دو گی، تم صرف دستخط کرو۔ تمہاری درخواست کو آگے پہنچانا میری ذمہ داری ہے۔“ فریدہ کے حیرت بھرے لہجے میں یہی بات کا جواب نہایت

دوران سے دیتے ہوئے اس نے ایک بار پھر اسے ساری بات سمجھائی۔

”میں تو میں کہہ رہی ہوں کہ کیوں؟ آخر تمہیں مجھ سے کیا ہمدردی ہے کہ تم اپنے ہی گھر والوں کے خلاف مجھے اکسا رہی ہو؟“ وہ عمر میں کشور سے کافی چھوٹی تھی مگر دونوں کے درمیان حیثیت کا بھی واضح فرق تھا، اس کے باوجود وہ اسے مخاطب کرنے کے لیے ”تم“ کا صیغہ استعمال کرتی تھی۔

”میں تمہیں اپنے گھر والوں کے خلاف نہیں، ظلم کے خلاف اکسا رہی ہوں۔ ایک عاقل و بالغ لڑکی کا کسی ذہنی طور پر پسماندہ شخص سے نکاح اس کے ساتھ ہراسنا نا انسانی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اس ظلم اور نا انسانی کے خلاف آواز اٹھانے میں تمہارا ساتھ دوں۔“

”مگر تم یہ سب کرو گی کیسے؟ تم بھی تو میری طرح اس حوصلے سے بنا اجازت باہر نہیں جا سکتیں۔ چلو مان لیا کہ تمہاری کوئی ملازمہ میری درخواست کو کسی سرکاری دفتر تک پہنچا دے گی لیکن درخواست پر غور کون کرے گا؟ سارے افسر اور قانون وڈے چودھری کی منگی میں ہیں۔ کسی کی ہمت ہی نہیں ہوگی کہ انہیں کچھ کہیں۔“ فریدہ دبا دبا کر کہتی تھی۔

”اس بات کی تم فکر نہ کرو۔ جو کچھ کر سکتے ہیں انہوں نے ہی مجھے تم تک یہ پیغام پہنچانے کے لیے کہا ہے۔“ کشور مسکرائی۔

”کون؟ کون ہے وہ؟“

”اس بات کو رہنے دو۔ تم صرف درخواست بھجوانے کی بات کرو اور پھر انتظار کرو کہ کب تمہیں یہاں سے نجات ملتی ہے۔“ کشور نے اسے ٹالا۔

”یہاں سے نجات مل بھی گی تو کیا فائدہ ہوگا؟ میرا جو نقصان ہونا تھا، وہ تو ہو ہی چکا۔ اس حرکت کے بدلے میں الٹا میرے بھائی بھی پھنس جائیں گے۔ میں نے پہلے ہی انہیں ڈاڑھ دکھ دیا ہے، اب ہوران کی عزت خراب نہیں کر سکتی۔ اب جو بھی کرنا ہوگا، میں آپ ہی کروں گی۔“

”بے وقوف مت بنو۔ تم کچھ نہیں کر سکتیں۔ یہاں عورت کسی جانور کی طرح بے بس ہے۔“ اس کے انکار پر کشور بھونکا کر بولی۔

”تم نے وہ کھل تو سنی ہوگی نا کہ وقت آنے پر چوٹی بھی ہاتھی کو کاٹ لیتی ہے۔۔۔ بس میں بھی وقت کے انتظار میں ہوں۔“

”اچھا ٹھیک ہے، مت مانو میری بات۔ ایسا کرو کہ مجھے اپنے اس کزن قربان کا پتا بتا دو۔ تم از کم میں اس بے

چارے کو تو تمہاری کوئی خبر نہ دے دوں۔“ اس کی ضد دیکھتے ہوئے کشور نے بات کا رخ موڑ دیا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ قربان کا نام سننے ہی فریدہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس بار اس نے ہٹا کیل و جت کے اس کے سوال کا جواب دے دیا پھر ایک دم ہی اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے کشور نے بھی اسے مزید چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا اور واپسی کے لیے اٹھ گئی۔ بہن ارشدہ کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس کی نظر کھلے دروازے سے اندر گئی تو اس نے وہاں فریدہ کو اس کے ساتھ ربر کی بڑی سی گیند سے کھیلنے ہوئے دیکھا۔ بہن ارشدہ دلہن کو اپنے ساتھ کھیلنے پا کر بہت خوش تھا اور اس خوشی کا اظہار تالیاں بجا بجا کر کر رہا تھا۔ فریدہ کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ تھی لیکن یہ مسکراہٹ خود پر کتنا جبر کرنے کے بعد اس نے اپنے ہونٹوں پر سجائی ہوگی، غصہ سمجھ سکتی تھی۔ دل میں گہرا تاسف لیے وہ اوپر ہی منزل سے اتر آئی۔ سیزھیاں اترتے ہی اس کا بڑی چودھرائی سے سامنا ہو گیا۔

”وڈے لاڈ ہو رہے ہیں نوی بھادج کے۔ جب دیکھو تب اوپر جاتی آتی نظر آتی ہے۔ وڈے چودھری صاحب نے منع بھی کیا ہے کہ اس سے زیادہ میل ملاپ کی ضرورت نہیں ہے، پر تیری مت میں تو کچھ آتا ہی نہیں ہے۔۔۔ جو جی میں آتا ہے وہی کرتی پھرتی ہے۔“ اسے سیزھیاں اترتے دیکھ کر اس نے فوراً تنقید کی۔

”زیادہ کہاں جاتی ہوں اماں! بس پورے دن میں ایک ہی پتھر تو لگتا ہے اوپر کا۔ اور وہ تو میں بہن ارشدہ کے لیے دیکھ بھی لگاتی تھی۔“ وڈی چودھرائی سے بگاڑنا مناسب نہیں، یہ بات وہ بھی سمجھتی تھی چنانچہ نرمی سے ذرا لاڈ بھرے لہجے میں بولی اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے دروازہ اندر سے بند کیا اور الماری میں کپڑوں کی تھکے درمیان چھپا کر رکھا موبائل نکال کر آن لکھا۔ ذرا دیر میں وہ آفتاب کو آج فریدہ سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں بتا رہی تھی۔

”آپ اسے سمجھانے کی کوشش کریں۔ اس طرح چپ رہ کر وہ اپنے ساتھ مزید ظلم کر رہی ہے۔“

”میرے خیال میں یہ کام میرے مقابلے میں قربان زیادہ بھڑھڑاتی ہے۔ میں نے فریدہ سے اس کا پتا معلوم کر لیا ہے۔ آپ اس پتے پر جا کر قربان سے ملیں۔ کسی دن موقع دیکھ کر ہم ان دونوں کی موبائل پر بات کروا دیں گے۔ قربان سمجھائے گا تو وہ سارے ڈر خوف بھول کر

ہماری بات ماننے پر راضی ہو جائے گی۔“ اس نے آفتاب کو قربان کا چاہتا ہے ہوئے امید لاکر ہی۔

”جو حکم نیگم صاحب! بندہ آپ کے حکم کا غلام ہے۔ آپ جیسا کہیں گی ویسا ہی کرے گا۔ ویسے کیا بات ہے، آج کل آپ کی طرف سے ملاقات کا حکم ملنا بند ہو گیا ہے؟ اب ہم خنجر ہیں ایسے کسی پیام کو آپ کی طرف سے خاموشی ہے۔“ شجیدگی سے بات کرتے کرتے وہ اچانک ہی شوشی پر اتر آیا اور کشور کو چھیڑا۔

”اب اس خنجر سے انڈر میل ہوم میں ملنے کا جی نہیں چاہتا۔ اب بھی ملیں گے تو ایسے احوال میں جو ہمارے رشتے کے شایان شان ہو۔ جب سے میرے نام کے ساتھ آپ کا نام جڑا ہے، اپنا آپ اتنا معتبر لگتا ہے کہ کسی عام سی جگہ پر آپ سے ملنے کے لیے آنے کا جی ہی نہیں چاہتا۔“ اس نے شرمیلے لہجے میں جواب دیا۔

”بہت خوب! یعنی اب ملنے کے لیے لمبا انتظار کرنا ہو گا۔“ آفتاب نے ایک مصنوعی سر آواز بھری۔

”کوئی حرج نہیں۔ ویسے بھی سیانے کہتے ہیں کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔“ اپنے لیے اس کی بے قراری محسوس کر کے اس کے دل میں خنجر کا احساس جاگا اور وہ کھکھلا کر شوشی سے بولی۔ جواباً آفتاب اس سے کچھ کہتا، اس سے قبل ہی کمرے کے دروازے پر دھک کی آواز ابھری۔ کشور نے جلدی سے لائن کاٹ کر موبائل ایک دراز میں ڈالا اور دروازہ کھول دیا۔ سامنے بھی کھڑی تھی۔

”کیا بات ہے؟“ جی کی پچھلی ہوئی باجھوں پر اندر ہی اندر جڑ بڑھتے ہوئے اس نے سختی سے پوچھا۔

”آپ کے کمرے کی صفائی کرنے کے لیے آئی تھی بی بی۔“ اس کے لہجے کی سختی کو خاطر میں لائے بغیر اس نے ہنوز پچھلی ہوئی باجھوں کے ساتھ بتایا۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے۔ معلوم تو ہے تجھے کہ میرے سارے کام رانی کرتی ہے پھر کس لیے منہ اٹھا کر چل آئی ہے؟“ اس نے کچھ اور سختی سے اسے جھڑکا۔

”جیسی تباہی مرضی بی بی۔ میں تو وڈی چودھرائی کے کہنے پر آئی تھی۔“ وہ جھج سے لہجے میں کہہ کر لبرائی مل کھاتی وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ کشور دروازے پر ہی کھڑی پڑھوچ انداز میں اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ جی بھی اسے لگتا تھا کہ بڑی چودھرائی اس کے ساتھ چوے چوے چوے لگا کر کوئی کھیل، کھیل رہی ہے۔ وہ کھل کر بھی کچھ کہتی نہیں تھی لیکن آنے بھانے اسے جانی ضرور تھی کہ وہ اس کی نگرانی

کی طرف سے غافل نہیں ہے۔ وہ بی دل میں خود کو مزید محتاط رہنے کی تلقین کرتے ہوئے کشور، چھٹی کے نظروں سے غائب ہونے پر دروازے پر سے پلٹ کر واپس اپنے بیڈ پر آکر لیٹ گئی اور سر ہانے پر بھی ایک کتاب اٹھا کر پڑھنے لگی لیکن یہ پریشانی ایسی نہیں تھی کہ کتاب سے خود کو بہلا کر نظر انداز کی جاسکتی۔

☆☆☆

”ڈاکٹر ماریا کے متعلق آپ کی مطلوبہ معلومات حاصل ہوگئی ہیں سر! آپ نے جو ایڈریس نوٹ کروایا تھا، وہ لاہور کے اسی گھر میں رہتی تھیں۔ محلے والوں کے مطابق وہ اور ان کی والدہ سٹھیا تقریباً تین سال سے اس گھر میں رہ رہی ہیں۔ محلے والوں سے ان لوگوں کا زیادہ ملنا جلتا نہیں البتہ سٹھیا آتے جاتے آس پڑوس والوں سے تھوڑی بہت بات کر لیتی تھیں۔ مجموعی طور پر محلے والوں کے مطابق دونوں ماں بیٹی شریف اور بے ضرر خواتین ہیں۔ ڈاکٹر ماریا کے بچہ آباد آنے کے بارے میں سٹھیا نے ایک دو محلے داروں کو بتایا تھا اور یہ ارادہ ظاہر کیا تھا کہ چند دن بعد وہ دھوکھی بیٹی کے پاس چل جائے گی۔ سٹھیا نظر نہیں آتی تو ان لوگوں نے یہی خیال کیا کہ وہ بچہ آباد چلی گئی ہے۔ جن لوگوں کے ذمے میں نے یہ معلومات جمع کرنے کا کام لیا تھا، انہوں نے ڈاکٹر ماریا کے گھر کا جائزہ لیا ہے۔ گھر کا کافی سامان بندھا ہوا ہے جس سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ مکین کہیں جانے کی تیاری میں تھے۔ ڈاکٹر ماریا جس اسپتال میں جاب کرتی تھیں، وہاں سے بھی یہی اطلاع ملی ہے کہ وہ بہت اخیر طبی میں جاب چھوڑ کر گئی تھیں۔ سہاں تک کہ انہوں نے اسپتال سے اپنے واجبات بھی وصول نہیں کیے۔“ عبد المنان نے جو رپورٹ پیش کی، وہ ڈاکٹر ماریا کی اپنے بارے میں مہیا کردہ معلومات کی تصدیق کر رہی تھی۔ اس نے ایک گہرا سانس لیے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹپک لگایا اور دھیمی آواز میں بولا۔

”جینک یو عبد المنان! مجھے امید تھی کہ تم یہ کام ذمے داری سے انجام دو گے اسی لیے میں نے اسے تمہارے سپرد کیا تھا۔“

”مجھے آپ کے اس اعتماد پر خوشی ہے سر! اللہ نے چاہا تو میں آئندہ بھی آپ کے اعتماد پر پورا اتروں گا۔“ اس نے مؤدبانہ جواب دیا پھر ذرا توقف کے بعد بولا۔ ”کیا بات ہے سر! آپ مجھے کچھ پریشان لگ رہے ہیں؟ کیا آپ کو ڈاکٹر ماریا پر کسی قسم کا کوئی شک ہے؟“

”نہیں... اصل میں، میں ان کی والدہ کے سلسلے میں

معلومات حاصل کرنا چاہ رہا تھا۔ ڈاکٹر ماریا کے مطابق انہیں کسی نے جس بے جا میں رکھا ہوا ہے اور اس بنیاد پر انہیں بلیک میل کر رہا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ ان کی کسی قسم کی مدد کرنے سے قبل پہلے تصدیق کروا لوں جب ہی کوئی اسٹیبل لوں گا۔“ تصویروں والا معاملہ اتنا نازک تھا کہ وہ اسے فی الحال عبد المنان سے بھی شیعہ کرنے کی ہمت نہیں کر سکا تھا اس لیے صرف اتنی ہی بات بتا کر اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

”اوہ! آئی سی۔“ عبد المنان نے ہونٹ سیکنے سے بھر پوچھنے لگا۔ ”کیا ڈاکٹر ماریا نے کسی پر شک ظاہر کیا ہے؟“ ”بہت صاف لفظوں میں تو نہیں لیکن مجھے ان کی باتوں سے ایسا لگا تھا کہ شاید چودھری افتخار کی طرف سے انہیں پریشان کیا جا رہا ہے۔“ اس نے ایک بار پھر گریز کی راہ اپناتے ہوئے مختصر جواب دیا۔

”پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟ اس سلسلے میں ہمارا کیا لائحہ عمل ہونا چاہیے؟“ عبد المنان فوراً مستعد نظر آنے لگا۔ ”فی الحال تو ہم خاموش رہیں گے۔ اگر ڈاکٹر ماریا کی والدہ دو تین دن میں خود ہی واپس آ جاتی ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ پھر کوئی کارروائی کریں گے۔“ اس کا یہ جواب اس کی فطرت کے خلاف تھا جسے عبد المنان نے محسوس تو کیا لیکن مزید کوئی سوال کیے بغیر اس سے اجازت لے کر باہر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد بھی شہر یار کافی دیر تک سوچ میں ڈوبا بیٹھا رہا۔ تصویروں والا یہ معاملہ کتنا بڑا اسکیڈزل بن سکتا ہے، وہ جانتا تھا۔ اس اسکیڈزل کے سامنے آنے پر ان کے خاندان کی ساکھ داؤ پر لگ جاتی مگر مسئلہ یہ تھا کہ اسے صرف تصویریں بھیجی گئی تھیں۔ جیسے والے نے نہ تو اپنا تعارف کروایا تھا اور نہ ہی کوئی ذیما ٹھہر سانسے رکھی تھی۔ ان حالات میں وہ چودھری افتخار سے براہ راست اس موضوع پر کوئی بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ وہ صاف مکر جانتا کہ یہ میرا کام نہیں۔ وہ بہتر بادشاہ کے لیے یہ اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعے کا حوالہ بھی دیتا تو بے کار جاتا۔ جو تصویریں اسے بھیجی گئی تھیں، ان میں نہ تو ڈاکٹر ماریا کا چہرہ نظر آ رہا تھا، نہ ہی کوئی اور ایسی شے دکھائی دے رہی تھی جس سے ثابت کیا جاسکتا کہ تصویریں حوالی کے اندر بھیجی گئی ہیں۔ وہ عجیب مشکل میں پڑ گیا تھا۔ برلہ بھی فکر رہتی تھی کہ جانے ان تصویروں کی بنیاد پر کون سا مطالبہ کر دیا جائے۔ فی الحال تو وہ ایسی صورت حال میں پھنس گیا تھا کہ انکار کر نہیں سکتا تھا اور اقرار کرنے کا مطلب ذمہ کے سامنے پسپائی اختیار کرنا تھا۔

جاسوسی ڈائجسٹ 118 مارچ 2010ء

”ڈاکٹر ماریا آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں سر!“ ٹیلی فون کی گھنٹی پر اس نے چونک کر ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے اسے اطلاع دی گئی۔

”ٹھیک ہے۔ بات کروائیں۔“ ڈاکٹر ماریا کا نام سن کر اس نے اجازت دی۔

”ہیلو سی صاحب! کیسے مزاج ہیں آپ کے؟“ رابطہ بننے پر دوسری طرف سے ڈاکٹر ماریا نے اس سے پوچھا۔ پھر اس کی طرف سے کوئی جواب دیے جانے سے قبل ہی بولی۔ ”ظاہر ہے آپ پریشان ہوں گے۔ میں نے آپ کی پریشانی کا سوچ کر ہی آپ کو فون کیا ہے۔“

”جینک یو سوچ۔“ وہ فی الحال یہی کہہ سکتا تھا ورنہ ڈاکٹر ماریا کے فون کرنے یا نہ کرنے سے اسے کیا فرق پڑتا تھا۔ اپنی مجبوری پتا کر وہ کسی بھی قسم کے تعاون سے پہلے ہی صاف انکار کر چکی تھی۔

”جینک یو تو جب کہیں گے جب میں آپ کو اپنے پاس موجود ایک زبردست خبر دوں گی۔“

”کیسی خبر؟“ اس کے لہجے میں موجود جوش کو محسوس کر کے وہ اپنی کرسی پر بالکل سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگا۔ ”آپ کا فون تو محفوظ ہے نا؟ یہ نہ ہو کہ آپ پریئر یا کوئی اور ہماری گفتگو سنے۔“ اس نے خیر ستانے کے بجائے محتاط لہجے میں پوچھا۔

جاسوسی ڈائجسٹ 119 مارچ 2010ء

چودھری نے آپ کی تصویریں اور ان کے ٹیکے زچہ چاکر کر رکھے ہوئے ہیں۔ چودھری کے ذمے میں موجود ہتھ خانے کے ایک کمرے میں خفیہ تجویری ہے۔ اس تجویری میں وہ اپنے خاص خاص کاغذات اور دوسری بیش قیمت اشیاء رکھتا ہے۔

آپ کی تصویریں بھی اسی تجویری میں رکھی گئی ہیں۔

”آپ کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟“ ڈاکٹر ماریا کی پرجوش لہجے میں فراہم کردہ معلومات کو سن کر اس نے حیرت سے پوچھا۔

”مکمل رات میں چودھری کے ذمے پر اس کے ساتھ ہی موجود تھی۔ شراب کے نشے میں چور جب وہ میرے ساتھ اپنی من مانیوں کر رہا تھا، میں نے موقع دیکھ کر اس کے ساتھ یہ موضوع چھیڑ دیا۔ میں نے کہا... چودھری صاحب! آپ نے اسے ہی شہر یار کو جو تصویریں بھیجی ہیں، ان کو دیکھ کر اس کا سارا شک تو آپ پر جا رہا ہے۔ وہ بالآخر آ رہی ہے، کچھ معلوم نہیں کہ آپ کی حوالی وغیرہ کی حقائق لینے پر اثر آئے۔ جواب میں وہ بولا کہ ادل تو ایسا ممکن ہی نہیں پھر بھی اگر کسی طرح یہ ممکن ہو جاتا ہے تو اسے کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔ میں نے وہ تصویریں بڑی حفاظت سے اپنی خفیہ تجویری میں رکھی ہیں جس تک پہنچنا اس کے لیے ممکن ہی نہیں۔ بس پھر میں نے اس کو اس طرح اپنی باتوں میں الجھایا کہ اس نے خود ہی اپنی خفیہ تجویری کے بارے میں ساری تفصیل اگل دی۔ مگر خفیہ ہے بڑا چالاک۔ آپ کے بارے میں تو زبان کھول دی لیکن میری ماں کے متعلق کچھ نہیں اگلا۔ اب کوشش کروں گی کہ اگلی بار میں اس کی زبان کھلوا سکوں۔“

ماریا نے اسے بتایا۔

”اس کا مطلب ہے آپ کا مشتعل چودھری کی غلوت میں آ جاتا ہے؟“

”ظاہر ہے، میں مجبور ہوں۔ میری کمزوریاں اس کے ہاتھ میں ہیں اس لیے مجھے اس کا مطالبہ بھی ماننا پڑتا ہے اور آئندہ بھی اس وقت تک ماننا پڑے گا جب تک میں خود کو ان کمزوریوں سے چھٹکارا نہ دلاؤں۔“

”میں کوشش کروں گا کہ آپ کی اس سلسلے میں کوئی مدد کر سکوں۔“

”بہت شکریہ۔ فی الحال تو آپ خود کو بچانے کی کوئی تدبیر کریں۔ مجھے جو کچھ معلوم ہوا ہے... اس کے مطابق چہر آباد میں عفریب جو سالانہ میلہ لگنے والا ہے، اس کے حوالے سے آپ کو بلیک میل کیا جاسکتا ہے۔ چودھری کا پروگرام ہے کہ نیلے سے پہلے آپ کو پیغام بھیجا جائے گا کہ

آپ اس کے راستے سے ہٹ جائیں۔ مزاحمت نہ کرنے کی صورت میں آپ کی تصویر پر بھی منظر پر نہیں آئیں گی اور آپ کو انعام و اکرام سے بھی نوازا جائے گا۔ اگر آپ انکار کرتے ہیں تو میلے میں دوسرے تماشاؤں کے ساتھ اپنی تصویریں بھی دیکھنے کے لیے تیار رہے گا۔ ویسے بھی اس بار بہت بڑے پلانے پر میلے کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ کئی سیاسی اور سماجی شخصیات مدعو کی جائیں گی۔ میڈیا کو رنج تو لازمی ہے۔ سمجھیں، آپ بڑی طرح پھنس جائیں گے اس لیے بہتر ہے کہ جو کچھ کرنا ہے ابھی کر لیں۔... بعد میں آپ کے پاس بچاؤ کی کوئی صورت نہیں رہے گی۔“ وہ بہت غلو سے مشورہ دے رہی تھی۔ اسی کی باتیں سن کر شہر یار کے دگ وپے میں سنسناہٹ دوڑنے لگی۔

اس بار چودھری نے اس پر بہت کاری وار کیا تھا۔ سب کچھ اگر اسی ترتیب سے پیش آ جاتا جس طرح ڈاکٹر ماریا کے مطابق چودھری نے پلان کر رکھا تھا تو وہ بڑی طرح پھنس جاتا۔ چودھری کے سامنے ہتھیار ڈال دینے یا اپنے خاندان کے ناموس کو داؤ پر لگا دینے کے سوا اس کے پاس کوئی راستہ نہ رہتا اور ان دو آپشنز میں سے کسی ایک کا بھی انتخاب کرنا اس کے لیے ناقابل قبول تھا۔ اس وقت تو ڈاکٹر ماریا کی صورت میں ایک طرح سے اس کی ٹیبلی امداد ہوئی تھی۔ وہ چودھری کے بچھانے ہوئے جال میں خود کو پھنسنے سے بچانے کے لیے ہاتھ بچر مار سکتا تھا۔

”آپ مجھ سے جتنا کوآپرہٹ کر رہی ہیں اس کے لیے بہت بہت شکریہ ڈاکٹر ماریا... جائز آپ مجھے چودھری کی خفیہ تجویری کے متعلق تفصیلات سے آگاہ کر دیں۔“ اس نے بے حد ممنونیت سے کہتے ہوئے درخواست کی۔ جواب میں ڈاکٹر ماریا سے مطلوبہ معلومات فراہم کرنے لگی۔

☆☆☆

کرسی پر بیٹھی ادنیٰ عمر عورت کی نظریں وال کلاک پر جمی ہوئی تھیں۔ تین بجے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ اسے صرف پانچ منٹ ہی انتظار میں گزارنے تھے۔ پانچ منٹ بعد اس کی معاون لڑکیاں وہاں پہنچ جائیں۔ ندا اور حنا نامی وہ دونوں لڑکیاں وقت کی بے حد پابند تھیں۔ انہیں اس شادی دفتر میں اس کے زیر نگرانی کام کرتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا لیکن وہ یہ بات بہر حال جانچ چکی تھی کہ دونوں لڑکیاں وقت کی پابندی کے معاملے میں بے حد ذمے دار تھیں۔ انہیں ہر روز شام چھ بجے ڈیوٹی پر پہنچنا ہوتا تھا اور انہوں نے بھی اس سلسلے میں کوتاہی نہیں برتی تھی۔ آج بھی

انہیں معمول سے تین گھنٹے قبل پہنچنے کا حکم دینے کے باوجود وہ مطمئن تھی کہ دونوں اپنی عادت اور تربیت کے مطابق ٹھیک وقت پر پہنچ جائیں گی۔ یہ یقین بے بنیاد نہیں تھا۔ وہ سب مل کر جن لوگوں کے لیے اور جس ناسک پر کام کر رہی تھیں، اس میں ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ ذرا سی کوتاہی اور غفلت کا انعام ناکامی اور تذلیل کے ساتھ ساتھ بسا اوقات موت بھی ہو سکتا تھا اس لیے وہ سب بہت احتیاط سے کام لیتے تھے۔ اب بھی انتظار کے چار منٹ مزید گزرے تو اس نے بیڑھوں پر کسی کے قدموں کی آواز سنی۔ پھر بیرونی حصے میں جو کہ یک وقت انتظار گاہ اور استقبالہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا، دونوں لڑکیوں کے چلتے پھرنے اور باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ایک منٹ کا مختصر دورانیہ جیسے ہی گزرا اور گھڑی نے تین بجنے کا اعلان کیا، اس کے آگے کے دروازے پر دستک کی آواز ابھری۔

”میں... کم این۔“ اس نے پُر وقار انداز میں اجازت دی۔ فوراً ہی دروازہ کھلا اور دو نوجوان لڑکیاں اندر داخل ہوئیں۔ دونوں لڑکیوں نے چہرہ پر تڑپا خراش کے شلوار قمیض زیب تن کر رکھے تھے۔ ان کی شکلیں آپس میں کافی ملتی جلتی تھیں جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ آپس میں بہنیں ہیں۔

”ہیو آئیٹ۔“ اس نے سپاٹ لیجھ میں ان دونوں سے کہا۔

”تھینک یو میڈم۔“ وہ دونوں کرسیاں کھسکا کر ان پر بیٹھ گئیں اور ہنسواں کیے منتظر نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگیں۔ اس طرح بے وقت اپنے بلائے جانے پر وہ اندرونی طور پر بے حد اذیت تھیں۔ انہیں اندازہ تھا کہ معمول سے ہٹ کر دفتر بلائے جانے کا مطلب تھا کہ کوئی خاص بات ہے۔

”تم دونوں ہماری بہت اچھی ورکر ہو۔ اب تک تمہیں جو بھی کام سونپا گیا، تم دونوں نے ہی اسے بہت اچھے طریقے سے انجام دیا لیکن آج جو ذمے داری تمہیں سونپی جا رہی ہے، وہ نہ صرف مختلف ہے بلکہ بے حد نازک بھی ہے۔ اس کام کو کرنے میں تمہیں بے حد ہوشیاری اور ہوش مندی کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ ناکامی کا نتیجہ صرف ایک صورت میں نکلے گا اور وہ ہے موت۔“ اس نے اپنے سپاٹ اور سر دلچھے میں گفتگو کے لیے تہیہ بنا دیا۔

”ہم ہر ممکن طریقے سے اپنے کام کو پُر فہم کے ساتھ انجام دینے کی کوشش کریں گے۔ ناکامی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن اگر ایسا ہو ہی گیا تو اوپر سے علم آنے سے پہلے ہم خود اپنے لیے موت کا انتخاب کر لیں گے۔ ہمارا جیون

ہمارے دلش کی امانت ہے۔ ہمارے پانے بھی فرض کو نبھایا تھا، ہم سے بھی کوئی کوتاہی نہیں ہوگی۔“ ندا تا ہی لڑکی نے جواب دینے کا فریضہ انجام دیتے ہوئے یقین دہانی کروائی۔ ”گدا! مجھے تم سے یہی امید تھی۔“ اس کا لہجہ ذرا سا نرم ہوا پھر وہ ان دونوں کو ان کا کام سمجھانے لگی۔ وہ دونوں پوری توجہ سے اس کی بات سنتی رہیں۔ ان کے چہرے کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ کام کی نوعیت بچ بچ بڑی حساس ہے۔ اس سے قبل انہوں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا تھا۔ بہر حال، انہیں اس نئے کام کو کرنے میں بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔

”تم لوگ میری بات سمجھتی ہو؟“

”ہیں میڈم! آپ فکر نہ کریں۔ سب کچھ آپ کی ہدایات کے مطابق ہی ہوگا۔“ ندا نے جواب دیا۔ اگرچہ دیکھنے پر دونوں بہنوں میں چھوٹی بڑی کا اندازہ لگانا مشکل تھا لیکن وہ جس طرح ہر سوال کا جواب دینے کی ذمہ داری خود انجام دیتی تھی، اس سے یہ بات واضح ہو جاتی تھی کہ وہ ہی بڑی بہن ہے۔

”ٹھیک ہے پھر تم دونوں روانہ ہو جاؤ۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“ چھ بجے تھیں یہاں اپنی ذیوی پر دوبارہ موجود ہونا چاہیے۔“ اس نے وال کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے حکم دیا تو وہ دونوں خاموشی سے اٹھ کر باہر نکل گئیں۔ استقبال پر ان کی مطلوبہ اشیاء موجود تھیں۔ حنا نے ایک تھمبھال کھول کر اس میں موجود اشیاء باہر نکالیں۔ یہ ایک سیاہ رنگ کا برقع، ایک بڑی سی چادر اور دو عدد سن گلاسز تھے۔ برقع اس نے غدا کو تھمبھالیا اور خود چادر اوڑھنے لگی۔ اس کے چادر اوڑھ کر ایک پلو کو نقاب کے انداز میں چہرے پر پھیلا کر، سن گلاسز لگانے تک غدا نے بھی برقع اوڑھ کر سن گلاسز لگالے۔ ان دونوں کو دیکھ کر اب کوئی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ یہ وہی لڑکیاں ہیں جو کچھ دیر قبل اس دفتر میں بیٹھیں تھیں۔

اس تیاری سے مطمئن ہونے کے بعد انہوں نے ایک دوسرے کو ”اوکے“ کا اشارہ دیا اور غدا نے وہاں رکھا دوسرا بیگ اٹھا لیا۔ کیونکہ یہ بیگ اچھا خاصا بھاری تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو اس بیگ کو اٹھانے میں غرے دکھائی لیکن اسے مستقل ورزش اور یوگا کی عادت کی وجہ سے کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ اس کے بیگ اٹھا کر باہر کی طرف قدم بڑھاتے ہی حنا نے بھی اس کی پیروی کرتے ہوئے اپنے قدموں کو حرکت دی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پیئڈ بیگ تھا۔ اپنے ذاتی پرس ان دونوں نے پہلے ہی ایک دروازے کھول کر اس میں رکھ دیے تھے۔ دفتر سے نکل کر وہ آرام سے

سیڑھیاں طے کرتی ہوئی نیچے کی طرف جانے لگیں۔ اس چار منزلہ عمارت میں مختلف نوعیت کے کئی دفاتر تھے۔ سیڑھیاں اترتے وقت کسی نے انہیں دیکھا بھی ہوگا تو زیادہ نوٹس نہیں لیا ہوگا اور یہی سمجھا ہوگا کہ دونوں خواتین کی شادی دفتر میں اندراج کے لیے یا پھر کسی عامل یا پروفیسر کے پاس اپنے کسی رکنے ہوئے کام کی تکمیل کے لیے یہاں آئی ہوں گی۔ اس عمارت میں اس قسم کے دفاتر کی بھرمار کی وجہ سے اس طرح کے طے والی خواتین کا مسلسل آنا جانا لگا رہتا تھا اور کوئی بھی ان کے آنے جانے کا نوٹس لینے کی زحمت نہیں کرتا تھا۔

عمارت سے باہر نکل کر وہ دونوں پیدل چلتی ہوئی قریبی بس اسٹاپ کی طرف بڑھیں اور اسٹاپ پر آنے والی پہلی بس میں سوار ہوئیں۔ حنا نے کنڈیکٹر کو گریہ ادا کیا۔ دو اسٹاپ گزرتے ہی وہ دونوں بس سے اتر گئیں۔ یہاں سے وہ پھر ایک بس میں سوار ہوئیں۔ اس بس میں انہوں نے صرف ایک اسٹاپ کا فاصلہ طے کیا اور پھر ایک رکنے میں بیٹھ کر اسے ایک معروف مارکیٹ کی طرف چلنے کا حکم دیا۔ وہ اپنے دفتر کے نیچے سے براہ راست رکنے میں بیٹھ کر مارکیٹ تک جا سکتی تھیں لیکن وہ جو کام انجام دینے جا رہی تھیں، اس کے لیے احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ کوئی رسک نہ لیا جائے۔ اب اگر کسی طرح وہ کسی کی نظروں میں آجھی جاتیں تو رکنے والا بعد میں ان کے دفتر کی نشان دہی نہیں کر سکتا تھا۔

مارکیٹ تک کا فاصلہ انہوں نے خاموشی سے گزرا۔ مارکیٹ میں داخل ہوتے ہی انہوں نے دو دکانوں سے خریداری کی اور بنا کسی حیل و حجت کے دکان دار کو اس کی مطلوبہ قیمت ادا کر کے آگے بڑھ گئیں۔ اب غدا کے ہاتھ میں کیونٹس بیگ کے علاوہ مزید دو شاپنگ بیگ اور نظر آرہے تھے۔ حنا نے بھی ایک بڑا سا شاپنگ بیگ اٹھا رکھا تھا۔ انہیں دیکھ کر یہ لگتا تھا کہ وہ کافی دیر سے مارکیٹ میں ہیں اور بہت سی خریداری کرنے کے باوجود ابھی اور بھی بہت کچھ لینے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ دونوں اپنے دائیں بائیں موجود دکانوں کا بغور جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھیں۔ آخر انہیں ایک ایسی دکان نظر آگئی جو ان کی مطلوبہ خصوصیات کی حامل تھی۔ یہ ایک کپڑے کی دکان تھی جس میں قوت پر چاندنیاں بچھا کر کپڑے کے تھان ڈالے گئے تھے۔ دکاندار اچھی کوٹنی کے سوٹ فنی پر تے نظر آرہے تھے۔ دونوں بہنیں اس دکان میں داخل ہو گئیں۔ دکان کافی تنگ تھی۔ تخت اور گاہکوں کے بیٹھنے کے لیے بچھائی گئی بیچوں کے درمیان کا فاصلہ اتنا کم تھا کہ گاہک بچ

پر بیٹھنے تو ان کے گھٹنے تخت سے تقریباً ٹکرائے گئے۔ وہ دونوں دکان پر موجود تین خواتین کے درمیان سے راست بناتی بمشکل اندر داخل ہوئیں اور بچ پر بیٹھ گئیں۔ بیٹھنے ہوئے انہوں نے اپنے ہاتھوں میں موجود تھیلے نیچے زمین پر قدموں کے قریب رکھ لیے۔ ان تھیلوں میں کیونٹس کا وہ بھاری بیگ بھی شامل تھا۔

”جی ہائی! کیا دکھاؤں آپ کو۔“ ان کے بڑے اچھے رنٹ آئے ہوئے ہیں میرے پاس۔“ ایک سیڑ میں فوراً ان کی طرف متوجہ ہوا۔

”اچھا تو پھر دکھاؤ۔“ حنا نے اسے جواب دیا۔ وہ تھان کھول کھول کر ان کے سامنے پھیلانے لگا۔ ساتھ ہی سیڑز مینوں والی مخصوص چوب بیانی کا مظاہرہ بھی کرتا رہا۔

”یہ سوٹ دیکھیں جی ہائی! بالکل نیا پرنٹ آیا ہے اور یہ والا کڑو تو آج کل بہت ہی ان ہے۔“ وہ ہر تھان کھولتے ہوئے تقریباً اسی طرح کے بیٹے ادا کر رہا تھا۔

”اور بھی دکھاؤ۔“ اس کے پانچ چھ تھان کھولنے کے بعد غدا نے فرمائش کی۔ دکان پر موجود دوسری گاہک خواتین اپنے لیے کپڑے کا انتخاب کر چکی تھیں اور اب ان کی سیڑز مین سے قیمت پر بحث چل رہی تھی۔

”جی ہائی! آپ تو بہت ہی کم قیمت لگا رہی ہیں۔ اتنی تو ہماری خرید بھی نہیں ہے۔ آپ کے لیے میں ایسا کرتا ہوں کہ پچاس روپے کم کر دیتا ہوں۔ دیکھیں، اب مزید بحث مت کیجئے گا۔“ انہیں کپڑے دکھاتے ہوئے سیڑز مین نے اپنے ساتھی کی مدد کرتے ہوئے ان کے درمیان ہونے والی بحث میں دخل دیا۔ اسی وقت غدا نے اپنے پیچے کے قریب رکنے کیونٹس بیگ کو چپکے سے تخت کے نیچے دھکیل دیا۔

”یہ والے پرنٹ کا ایک سوٹ نہیں نکال دیں اور دوسرا وہ فیروز کی والا دے دیں۔“ حنا جس نے غدا کی کارروائی دیکھ لی تھی، کام مکمل ہوتے دیکھ کر سیڑز مین سے بولی۔ اب مزید یہاں رکنے کا وقت خالص کرنا تھا۔ سیڑز مین نے فوراً اس کی بات پر عمل کیا۔ البتہ اس کی زبان مسلسل ان دونوں خواتین کو کنوئیں کرنے کے لیے مصروف عمل تھی۔ ان دونوں نے بغیر کسی بحث و مباحثہ کے اپنے خریدے ہوئے سوٹوں کی قیمت ادا کی اور ان کے ساتھ ساتھ دوسرا خریدہ ہوا سامان بھی اپنے پیروں کے پاس سے اٹھا کر دکان سے باہر نکل گئیں۔ اس سامان میں وہ کیونٹس بیگ شامل نہیں تھا۔ کپڑے کی دکان سے نکلنے کے بعد انہوں نے کسی اور دکان کا رخ نہیں کیا اور مارکیٹ سے نکلتی چلی گئیں۔ یہاں سے انہوں

نے پہلے والے طریقے پر ہی عمل کرتے ہوئے واپس اپنے دفتر کا رخ کیا لیکن بس سے اترنے کے بعد وہ دونوں اکٹھی عمارت میں داخل نہیں ہوئیں۔ ڈیڑھ دو گھنٹے تک ایک ساتھ دوبارہ دکھائی دینے پر وہ کسی کے نوٹس میں آ سکتی تھیں چنانچہ احتیاطاً پانچ منٹ کا وقفہ دے کر اندر گئیں۔

دفتر پہنچ کر انہوں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ابھی چھ نہیں بجے تھے۔ برقعہ اور چادر سے نجات حاصل کر کے واپس پہلے والے طے میں آنے کے لیے یہ مہلت کافی تھی۔ انہوں نے پھرئی سے یہ کام انجام دیا۔ خریدی ہوئی اشیاء اور برقعے وغیرہ کو ایک الماری میں رکھنے کے بعد وہ استقبال پر یوں تروتازہ کھڑی تھیں جیسے ابھی ابھی دفتر آئی ہوں۔ ٹھیک چھ بجے ان کے پاس کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ ان کی پاس نے باہر آنے کے بجائے صرف دروازے سے ہی جھانک کر ان کی طرف دیکھا۔ غدا نے اٹھکھٹوں کی مدد سے وکٹری کا نشان بناتے ہوئے اسے دیکھا۔ جواباً اس نے مطمئن سے انداز میں اپنا سر ہلایا اور واپس پلٹ گئی۔

حنا اور غدا جو کہ درحقیقت ارمیلا اور گیتا تھیں، اس کی بہت کارآمد ماتحت تھیں۔ اسے ان سے اسی کارکردگی کی امید تھی۔ اگر وہ کامیاب نہ ہوتیں اور جنس جاتیں تو بھی لوٹ کر واپس دفتر نہیں آتیں۔ چھپنے کی صورت میں وہ اپنے دیے ہوئے دھجن کے مطابق وہ نہر پیلہ کپھول نکل لیتیں جو بعد وقت ان کے پاس موجود رہتا تھا۔ وہ کوئی عام لڑکیاں نہیں تھیں جو موت کو گھگھاتے ہوئے ہچکچاتیں۔ ضرورت پڑنے پر جان دینا اور جان لینا انہیں بہت اچھی طرح سکھایا گیا تھا۔ وہ ”را“ کے مابین تازہ ایجنٹ راجیش شرما کی بیٹیاں تھیں۔ راجیش شرما نے اپنی ساری زندگی پاکستان میں ہی گزاری تھی۔ وہ ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوا تھا جو کڑ برہمن تھا۔ اس کے باپا بچا تقسیم کے وقت پاکستان سے ہجرت کر کے بھارت تو گئیں مگر لیکن انہوں نے تقسیم کے فیصلے کو قطعی غلط قرار دیتے ہوئے ساری ذمہ داری مسلمانوں کے سر ڈال دی۔ ان اچھا پسند والدین کے زیر سایہ پٹنے والا راجیش بھی انہی جیسی سوچ کا حامل تھا چنانچہ پاکستان میں اپنے لیے خدمت انجام دینے والوں کے متلاشی رہنے والوں کی نظر انتخاب اس پر پڑ گئی۔ وہ ان کے لیے کام کرنے پر بہ خوشی راضی ہو گیا لیکن اس کی زندگی نے زیادہ وفا نہیں کی۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے آقاؤں نے اس کی بیوی ستیا سے رابطہ کیا۔ ان کے مشورے پر ستیا نے اپنی دونوں بیٹیوں سمیت دکھاؤ کا اسلام قبول کر لیا۔ اب وہ بچیاں جوان ہو

ہنگی تھیں۔ لوگ انہیں جناور نما کہہ کر پکارتے تھے لیکن ان کی تربیت جن خطوط پر ہوئی تھی، اس کی وجہ سے وہ اندرونی طور پر اب بھی ارمیلا اور گیتا بنی تھیں۔ بھارت ماما کی وہ قابل فخر بیٹیاں جن کے لیے جان دینا اور لینا ایک کھیل تھا... شادی دفتر کی آڑ میں انہوں نے اپنے قدم خوب ہمارے رکھے تھے۔ اس دفتر کی انجارج اور ان کی باس ان کی صلاحیتوں کو استعمال کرنا خوب جانتی تھیں۔ ان کی کارکردگی کے پیش نظر اس نے بڑے بڑے افسروں سے کئی قیمتی راز اگھوائے تھے اور اب اپنے موہاں فون پر ریڈیو لگائے مختلف اسٹیشن ٹیون کر رہی تھی۔ آخر ایک اسٹیشن سے نشر ہونے والی نوز نے اس کے کانوں تک اس کی مطلوبہ خبر پہنچا دی۔ شہر کی معروف مارکیٹ میں ایک کپڑے کی دکان پر ہونے والا بم دھماکا کافی ہلاکت خیز ثابت ہوا تھا۔ دھماکے نے اس دکان کے ساتھ ساتھ اس کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں کی کئی دکانوں کو بھی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ رش کا وقت ہونے کی وجہ سے تمام ہی دکانوں پر ایچے خاصے گاؤں موجود تھے چنانچہ بڑی تعداد میں ہلاکتوں کے ساتھ ساتھ کافی لوگ زخمی بھی ہوئے تھے۔

”وزیراعظم نے کہا ہے کہ اس قسم کی پرتشدد کارروائیاں کرنے والوں کے خلاف سخت ایکشن لیا جائے گا اور کسی کو عوام کی جان و مال سے کھیلنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔“ نوز ریڈیو خبریں پڑھتے ہوئے وہی روایتی بیان دہرا رہی تھی جو اس سے قبل بھی ایسے مواقعوں پر دیا جاتا رہا تھا۔

”ہمیں کسی کی اجازت کی ضرورت ہے بھی نہیں۔“ وہ مسکراتے لیوں کے ساتھ بڑبڑاتی۔ اسی وقت دروازے پر دستک کی آواز ابھری۔

”ہیں... کم ان۔“ اس نے تیزی سے اپنے چہرے کے تاثرات بدلتے ہوئے اجازت دی۔ نندا کی محبت میں ایک عمر رسیدہ خاتون اندر داخل ہوئیں۔ خاتون شکل اور لباس سے کافی خوش حال لگ رہی تھیں۔ اس کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ کر جب انہوں نے اپنی بیٹی کی تصویر سامنے رکھتے ہوئے اس کے اور اپنے کونائف بتانا شروع کیے تو اس کے انداز سے کی تصدیق ہوئی۔ وہ این ماؤں میں سے تھیں جن کی بیٹیاں اپنے آئینہ میں جیون ساہی کے انتظار میں عمر کا قیمتی حصہ گزار دیتی ہیں اور بعد میں مامیں ان کی تصویریں پرس میں ڈالنے ان کے لیے کسی مناسب برکی تلاش میں شادی دفتر کی خاک چھاتی پھرتی ہیں۔ خاتون کا مسئلہ نہایت ہمدردی سے سننے ہوئے اس کے چہرے پر اتنی نرمی تھی کہ کوئی اندازہ ہی نہیں لگا سکتا کہ ابھی کچھ دیر قبل یہ عورت

ایک بم بلاسٹ کی خبر سن کر بڑی سفاکی سے مسکراتے ہوئے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

☆☆☆

”سوال ہی نہیں پیدا ہوتا سر۔“ اس نے مستعدی سے جواب دیا۔ شہر یا مزیہ کچھ کہے بنانا تک کو دھکیلا ہوا ہنگے سے ذرا آگے لے گیا اور پھر یہ اطمینان ہونے کے بعد کہ اس محفوظ فاصلے سے بانگ اشارت ہونے کی آواز ہنگے کے اندر سونے ہوئے ملازمین میں سے کسی کے کانوں میں پڑ کر اسے بیدار کرنے کا سبب نہیں بنے گی، اسٹیشن میں چابی ڈال کر بانگ اشارت کی۔ موٹر سائیکل کا انجن غرایا۔ اگلے ہی لمحے وہ اس دو پہیوں والی قطعی غیر افسرانہ سواری پر بیٹھا ہوا ہو چکا تھا۔ حکمرانی کے اصول و قواعد کی مجبوری اپنی جگہ مگر خود اسے ذاتی طور پر یہ سواری بڑی پسند تھی۔ دو پہیوں میں وہ عموماً موٹر بانگ پر ہی سفر کرتا پسند کرتا تھا اور اسے اس دو پہیوں کی سواری کو چلانے میں خاصی مہارت بھی حاصل تھی اس لیے اس وقت بڑے آرام سے اپنی منزل کی طرف اڑا جا رہا تھا۔ آج اسے جس مشن پر جانا تھا، وہ قطعی غیر سرکاری نوعیت کا... بلکہ اس کے عہدے کی شان سے متصادم تھا لیکن اس کی رگوں میں دوڑتے جوان اور گرم خون کو اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی۔ ڈاکٹر ماریا سے ملنے والی معلومات کی روشنی میں اس نے اپنے ذہن میں ایک منصوبہ ترتیب دے لیا تھا اور اب اس پر عمل پیرا بھی تھا۔ کسی فور و جمل گاڑی کے بجائے بانگ کا انتخاب اس نے اس لیے کیا تھا کہ اس چھوٹی سی سواری کو کہیں بھی چھپانے میں آسانی رہتی تھی جبکہ گاڑی آسانی سے نظروں میں آ جاتی پھر اس کی گاڑی تو کبھی بھی جانی پہچانی... اور وہ یہ قطعی نہیں جانتا تھا کہ کوئی شخص بطور اسٹنٹ کشیر اسے شناخت کر سکے۔ مگر اور بے باک ہونا اپنی جگہ لیکن دکن کی کچھار میں ہاتھ ڈالنے سے قبل جولاڑی احتیاط تھی، وہ تو اسے کرتی ہی تھی۔

اپنی آج کی اس مہم پر جاتے ہوئے اسے مشاہیر خان بڑی شدت سے یاد آ رہا تھا۔ اس جیسا مگر اور جان ڈار شخص اس مہم میں اس کے لیے بہت کارآمد ثابت ہو سکتا تھا۔ اگر وہ یہاں ہوتا تو وہ اسے اپنے ساتھ ضرور لے کر جاتا لیکن مجبوری یہ کہ ملتان روڈ پر پیش آنے والے خونی تصادم میں مشاہیر خان بری طرح زخمی ہوا تھا۔ خود ذاتی طور پر تو وہ یہی کہتا تھا کہ اب میں بالکل ٹھیک ہوں لیکن شہر یار نے اسے ابھی تک ڈیوٹی پر آنے کی اجازت نہیں دی تھی اور وہ لاہور میں ہی مقیم تھا۔ ان حالات میں وہ اسے ایک ایسے مسعر کے پرانے ساتھ لے جانے کے لیے کیسے بلا سکتا تھا جہاں کافی احتیاط کی امید تھی۔ مشاہیر خان کے بعد جس دوسرے شخص پر اسے اعتبار تھا، وہ عبدالمنان تھا لیکن عبدالمنان ذرا مختلف فطرت کا آدمی

تھا۔ وہ اس سے کہتا تو وہ ساتھ چل پڑنے پر راضی تو ہو جاتا لیکن مادہ دھڑا اور اچھل کود اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ پھر اس میں اور مشاہیر خان میں ایک بڑا فرق یہ تھا کہ مشاہیر خان کم تجسس کرنے والا، سیدھا سادہ اور خاموشی سے حکم کی تعمیل کرنے والا آدمی تھا جبکہ عبدالمنان عرصے سے بیوروکریسی کا ایک چھوٹا سا سرگزہ ہونے کے باعث بے حد ذہین اور معاملہ فہم تھا۔ اپنی تربیت کے مطابق تجسس اور کھوج کی عادت اس کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔ وہ خاموش رہتا اور اس سے کوئی سوال نہ کرتا، جب بھی معاملہ بھانپ جاتا اور شہر یار نہیں جانتا تھا کہ تصویروں والا معاملہ کسی بھی شخص کے علم میں آئے۔ بالائی بالا اس معاملے کو نمٹانے کی جو سبیل ڈاکٹر ماریا کے تعاون کی وجہ سے نکلی تھی، وہ اس کا بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔

بانگ کی تیز رفتاری کی وجہ سے اس نے پیر آباد تک کا فاصلہ عموماً دو روایتی سے نصف وقت میں ہی طے کر لیا البتہ پیر آباد کی حدود میں داخل ہونے کے بعد اسے احتیاط کرنی پڑی۔ تاہم وار کپے راستے پر پہلے کے مقابلے میں قدرے کم رفتار میں بانگ دوڑتا ہوا بالآخر وہ اس جگہ پہنچ گیا جہاں چودھری کا ڈیرا موجود تھا۔ ڈیرے کی عمارت سے کچھ فاصلے پر اس نے بانگ کا انجن بند کر دیا اور اسے ٹھہرتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ ڈیرے کے قریب ایک درخت کی آڑ میں پہنچ کر اس نے بانگ کھڑی کی اور خود دیے قدموں ڈیرے کی عمارت کی عقی دیوار کی طرف بڑھنے لگا۔ دیوار بہت زیادہ اونچی نہیں تھی۔ یقیناً اپنی ریاست میں واقع اپنے اس خاص ٹھکانے میں کسی کے ٹھہنے کی جرأت کرنا چودھری کے خیال کے مطابق ناممکن ہوگا اس لیے زیادہ بلند والا دیواریں تعمیر کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اس بے نیازی کی دوسری وجہ وہ کتے بھی تھے جو اس کے نوکروں کے علاوہ پھر سے داری کے فرائض انجام دیتے تھے۔ اگر کوئی شامت کا مارا دیواروں کی کم بلندی دیکھ کر چوری چکاری یا کسی دوسرے مقصد کے لیے ڈیرے میں ٹھہنے کی کوشش کرتا تو چوکیداری پر مامور یہ کتے اسے چر بھاڑ کر رکھ دیتے۔ وہ خود ڈاکٹر ماریا کی فراہم کردہ معلومات کی وجہ سے ان کتوں کی موجودگی سے واقف تھا چنانچہ بے خبری میں مارے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

دیوار کی منڈیر پر ہاتھ جھاک کر ایک کراس پر چڑھنے کے بعد اس نے دوسری طرف چھٹلا لگانے کی قطعی قطعی نہیں کی اور وہیں بیٹھ کر پھر سے دارکٹوں کا انتظار کرنے لگا۔

سائیکس لگا رہا اور اس کے ہاتھ میں بالکل تیار تھا۔ انتظار کا یہ دورانیہ چند سیکنڈ سے زیادہ کا ثابت نہیں ہوا۔ اس کی جھک وار دو بین نظروں نے اس طرف نمودار ہونے والے دو جسم کو فوراً ہی دیکھ لیا۔ اس نے نہایت بھرتی سے ریو اور کی نال سیدھی کی اور بچی دبا دی۔ ریو اور سے گولی نکل کر آگے والے کتے کے سر میں ٹھک سے لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ دوسرا آگے سامنے گھر گرتے دیکھ کر ٹھکا اور پھر زور زور سے بھونکنے لگا لیکن اس نے اسے زیادہ بھونکنے کا موقع نہیں دیا۔ اس کے ریو اور سے نکلنے والی گولی اس دوسرے کتے کے بھی سر میں پیوست ہو کر اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش کر گئی۔ دوسرے کتے کے جہاں فانی سے کوچ کرتے ہی اس نے دیوار پر سے چھلانگ لگائی اور ڈیرے کے احاطے میں کود گیا۔ اسے معلوم تھا کہ ڈیرے پر رات کے وقت پہرے داری کا فریضہ انجام دینے والے کتوں کی تعداد صرف دو ہی تھی۔ وہ دونوں اپنے اس فرض سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فارغ ہو چکے تھے اور اسے ان کے کسی بھائی ہند کی آمد کا خوف بھی نہیں رہا تھا چنانچہ وہ قدرے اطمینان سے مگر محتاط قدموں کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ یہ چودھری کا ڈیرا تھا اور یہاں اس کے گرگوں کا موجود ہونا لازمی تھا۔ محتاط انداز میں آگے بڑھتے ہوئے وہ اس بات کی بھی امید کر رہا تھا کہ کتے کے بھونکنے کی آواز سن کر کوئی نہ کوئی سبب جانے کے لیے اس طرف کا رخ کرے گا لیکن اس کی توقع کے خلاف کوئی شخص نمودار نہیں ہوا اور وہ بنا کسی ٹکراؤ کے اگلے حصے تک پہنچ گیا۔

”تو بہت کام بھرے شریف! میں نے تجھ سے کہا تھا کہ کتنا بھوکا ہے، ذرا جا کر دیکھ لے کہ کیا مسئلہ ہے۔۔۔ پر تو اپنی جگہ سے مل کر کبھی نہیں دیا۔“ کسی کی شکل نظر آنے سے پہلے ہوا کے دوش پر لہرائی یہ آواز اس کے کانوں تک پہنچی۔

”میں کام چور ہوں تو تو جا کر دیکھ لے۔ تیرے پیروں میں مہندی لگی ہے یا تو میرا افسر لگا ہے جو خود چل کر جانے کے بجائے مجھے حم دے رہا ہے۔“ وہ یقیناً شریف نامی شخص تھا جو مجڑے توروں کے ساتھ جواب دے رہا تھا۔

”حکم شکر نہیں دے رہا، تجھے احساس دلا رہا ہوں۔ تو ساری ذمے داری مجھ کٹے بندے پر ڈال کر خود پڑا بیڈتا رہتا ہے۔ کسی روز میں نے چودھری صاحب نوں تیری شکایت لگا دی تو تیرے ٹکڑے نہ کرتا۔“

”چل چمڈ یار! تو بھی ایسوں ناراض ہو جاتا ہے۔ یار نہیں ہے میرا؟ ذرا سا کتے کے بھونکنے پر میرا مزہ کیوں خراب کرتا ہے۔ جتاور (جانور) ہی تو ہے، بھونک دیا ہوگا۔

کوئی لہزا ہوتا تو وہ کوئی ایک واری بھونک کر چپ ہو جاتا؟ اس نے تو آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ ”سامنے کی دھکی پر شریف نامی آدمی اگر چھوڑ کر خوشدانہ انداز میں اپنے سامنے کے سامنے دیکھیں پیش کرنے لگا۔ وہ یقیناً کام چور آدمی تھا جو ہاتھ پر چلانے کے بجائے زبان ہلا کر ہی جہاں تک کام نکل سکتا ہو، لگانے کا قابل تھا۔

”کہہ دو تو ٹھیک ہی رہا ہے۔ چل چمڈ جانے دیے۔ لا میرے پیالے میں تھوڑی سی پور ڈال۔“ شریف کا سامنے فوراً ہی نرم پڑ گیا اور جانے کس چیز کی بابت فرما کر بٹش کرنے لگا۔ وہ جوتائی دیر میں یہ انداز لگا چکا تھا کہ وہ صرف دو ہی آدمی ہیں، آڑے سے نکل کر فوراً سامنے آ گیا۔ وہ دونوں جو پیش کی چھوٹی سی گھڑی سامنے رکھے اس میں سے ہلکے نکل کر پی رہے تھے، اسے یک دم سامنے پا کر ہکا بکا ہو گئے۔ سیاہ لباس میں، سر پر سیاہ ہی ہیملٹ پہنے ہوئے۔۔۔ وہ بھی اس انداز میں کہ ہیملٹ کا شیشہ گرا ہونے کی وجہ سے اس کی شکل نظر نہیں آ رہی تھی، وہ یقیناً ان لوگوں کو ایک جیل کے لیے بھوت ہی لگا ہوگا۔ بھوت بھی ایسا جس نے اپنے دائیں ہاتھ میں ریو اور تمام رکھا تھا۔

”اے! کون ہے تو؟“ بالآخر ان میں سے ایک نے خود کو سنایا اور بھڑک کر بولتے ہوئے اپنے دائیں جانب رکھی کلاشکوف اٹھانے کی کوشش کی۔

”خبردار! حرکت مت کرنا ورنہ گولی مار دوں گا۔“ اس نے غرات سے بولے تنبیہ کی۔ کلاشکوف کی طرف بڑھنے والا ٹھٹھک کر روک گیا مگر اس کے سامنے نے احمقانہ دیر سے کام لیتے ہوئے بھٹ کر کلاشکوف اٹھانے کی کوشش کی۔ ابھی وہ اسے پوری طرح اپنی گرفت میں لے بھی نہیں پایا تھا کہ شہر یار کے خاموش ریو اور سے ایک گولی سنائی ہوئی نکلی اور اس کے ہاتھ کی پشت پر لگی۔ اس آدمی کے حلق سے چیخ برآمد ہوئی اور اس نے کلاشکوف چھوڑ دی۔

”میری بات خاموشی سے مان لو گے تو فائدہ میں رہو گے ورنہ انجام تم خود بھی سمجھ سکتے ہو۔ ممکن ہے اگلی بار میں ہاتھ یا پیر کو نشانہ بنانے کے بجائے تمہاری کھوپڑی کو نشانہ بناؤں۔“ شہر یار نے سرد لہجے میں دھمکی دی۔ حقیقتاً وہ یہاں خون خرابائیں چاہتا تھا۔ اسے یہاں سے صرف اپنی تصویریں لینی تھیں اور وہ یہ کام کسی انسانی جان کے نقصان کے بغیر کرنا چاہتا تھا۔۔۔ مگر وہ لوگ شاید اس بات پر آمادہ نہیں تھے اور چودھری کا نمک حلال کرنا چاہتے تھے چنانچہ اس کے ہاتھ میں موجود ریو اور کی پروا کیے بغیر اس کی طرف بچھے۔ ذہنی آدمی

زیادہ ہی بلجایا ہوا تھا چنانچہ کسی بھینے کی طرح ڈکراتا ہوا اس کی طرف بڑھا اور اسے مگر مارنے کی کوشش کی۔ اس کے حملے میں ایسی پھرتی تھی کہ شہر یار دو بارہ ریو اور کو استعمال کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں فیصلہ نہ کر سکا۔ بہر حال، عین اس لمحے جب وہ جینا اس سے ٹکرانے کی لگا تھا، اس نے دائیں جانب بچتے ہوئے خود کو اس کے حملے سے بچایا اور اڑتا ہوا اس دوسرے آدمی پر جا گرا جو اس پر ہاتھ پیروں سے حملہ کرنے کا ارادہ ملاتی کر کے ایک بار پھر کلاشکوف کا سہارا لینا چاہتا تھا۔ وہ اس سے ٹکرایا تو جھٹکے سے کلاشکوف اس کی گرفت سے نکل گئی۔ شہر یار نے اسے ایک زوردار لٹ رسید کی اور ریو اور ہولسٹر میں رکھ کر خود کلاشکوف پر قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس دوران ذہنی آدمی جو اس کے ایک طرف ہٹ جانے کے باعث اپنے ہی زور میں آگے چلا گیا تھا، سنبھل کر ایک بار پھر حملہ آور ہو چکا تھا۔ اس نے شہر یار کو سر سے تمام لیا اور زمین پر رگیلے گئے پیکر میں تھا لیکن اس نے اس کی پیش نہ چلنے دی اور کبھی کی مدد سے اس کے بائیں پہلو میں ایک نیپلی ضرب لگائی۔ ضرب کی شدت کا اندازہ ذہنی آدمی کی چیخ سے لگایا جاسکتا تھا۔ وہ تکلیف سے بلجھا کر اس کی کمر چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ اس کی گرفت سے آزاد ہو کر شہر یار دوسرے بندے پر تھپتا۔ وہ ایک بار پھر کلاشکوف پر قابض ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان دونوں کو ہی احساس تھا کہ کلاشکوف جس کے قبضے میں ہوئی، اس لڑائی کا پلڑا اس کے حق میں جھک جائے گا چنانچہ وہ اپنی سی کوشش کر رہے تھے۔ مقابل کے مقابلے میں شہر یار کی پھرتی قابل دید تھی۔ اس کے پاس یہاں سے کامیاب واپس جانے کے سوا دوسرا کوئی آپشن نہیں تھا۔ ایک طرح سے تو اس نے یہاں آ کر ہی حرافت کا مظاہرہ کیا تھا۔ ایک پیرو کریت سے اسے غیر متوجہ ہونے کی امید کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ اگر وہ یہاں پھنس جاتا تو بہت بڑے اسکینڈل کا سامنا کرنا پڑتا۔ کسی کے سامنے اپنی یہاں موجودگی کا جواز پیش کرنا بھی اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا چنانچہ اسے ہر حال میں یہاں سے واپس جانا تھا اور اس صورت میں کہ اپنے مقصد میں بھی کامیاب رہتا اور دشمنوں کے ہاتھ اپنی یہاں آمد کا کوئی ثبوت بھی نہ لے دیتا۔ اپنی ساری تیاری میں اس نے اس بات کا خصوصی اہتمام کیا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے پاس موجود ریو اور بھی وہ تھا جو کسی چور بازار سے اس تک پہنچا تھا۔۔۔ وہ بھی اتنے ہاتھوں سے گزرنے کے بعد کہ تحقیق کرنے والے کوشش کرتے بھی تو ان کے لیے اس تک پہنچنا ممکن نہیں ہوتا۔ ویسے تو اسے معلوم ہی تھا کہ

یہاں کی پولیس اتنی باریک بینی سے کسی کیس کی تفتیش و تحقیق کرتی ہی نہیں کہ کسی خاص ٹیک کے ہتھیار سے چلائی گئی گولی کے سہارے اس کے استعمال کرنے والے تک پہنچ سکے۔ اس کے پھرتی کے مظاہرے کے باوجود وہ شخص کلاشکوف کو گرفت میں لینے میں کامیاب ہو چکا تھا لیکن بہر حال، فائر کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ شہر یار نے بے پناہ جرأت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نال کی جانب سے کلاشکوف کو تھام لیا۔ اب ان دونوں میں اسے اپنے قبضے میں لینے کے لیے زور آوری ہو رہی تھی۔ شہر یار نے اگر باقاعدہ ورزش اور جوڑو وغیرہ کی تربیت کے ذریعے خود کو کافی مضبوط بنا رکھا تھا تو وہ بھی دیہاتی ماحول کا پروردہ بھاری ڈیل ڈول کا آدمی تھا۔ دونوں اپنی طرف سے پورا زور لگا رہے تھے کہ کسی طرح کلاشکوف اپنے قبضے میں لے لیں۔ بالآخر شہر یار نے کلاشکوف کو اپنی طرف کھینچنے کی جدوجہد چھوڑ کر اس کی نال پر دونوں ہاتھوں کا دباؤ ڈالتے ہوئے اپنے جسم کو اٹھایا اور دونوں پیر اپنے مقابل شخص کے پیٹ میں دے مارے۔ اس چوٹ کو کھا کر اس شخص کی کلاشکوف پر گرفت ختم ہوئی اور وہ پیٹھ کے بل پیچھے کی طرف گرا۔ شہر یار بھی خود کو گرنے سے نہیں بچا سکا اور اسی آدمی کے انداز میں ہی خود بھی پشت کے بل زمین پر گر گیا لیکن اسے یہ برتری حاصل تھی کہ کلاشکوف اس کے قبضے میں آچکی تھی۔ اسے نال سے پکڑے پکڑے ہی وہ اچھل کر کھڑا ہوا۔ اس دوران اس کا مقابل بھی بے حد پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کھڑا ہو گیا تھا لیکن اس بار شہر یار نے اسے حملہ کرنے کی مہلت نہیں دی اور کلاشکوف کو لاشی کی طرح استعمال کرتے ہوئے اس کا بٹ اس کے پہلو میں مارا۔ اس شخص کے حلق سے مٹی سی چیخ برآمد ہوئی لیکن وہ پسپائی اختیار کرنے پر تیار نہیں ہوا اور شہر یار کے پیٹ میں اپنے سر سے ٹکر مارنے کی کوشش کی۔ اس کا ارادہ بھانپ کر شہر یار چند قدم پیچھے ہٹا اور نہایت اطمینان سے کلاشکوف کے بٹ سے اس کے سر پر ایک نیپلی ضرب لگائی۔ ضرب کھا کر اس شخص نے منہ سے ”اورغ“ کی آواز نکالی اور زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کا سامنے پہلے ہی زمین جاٹ رہا تھا۔ بائیں پہلو میں ایک خاص زاویے سے لگائی گئی شہر یار کی کبھی کی ضرب کوئی معمولی نہیں تھی۔ یہ ضرب پہلیوں کے حلقوں میں جھڑکنا تھا۔ اس نے بغیر اس کے دل پر اثر انداز ہوئی تھی جس کے نتیجے میں وہ جو پہلے ہی ہاتھ سے بچتے خون کی وجہ سے نڈھال ہو رہا تھا، نیم بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس کے دو بارہ اٹھ کھڑے ہونے کا امکان نہ ہوتا ہے ہوئے بھی شہر یار نے مناسب سمجھا کہ اس

کے تربوز جیسے سر پر بھی کلاشکوف کے ہٹ سے ہلکی سی چٹکی دے دے۔ یہ شفقت بھری چٹکی وصول کرنے کے بعد وہ شخص بالکل ہی اغماغیل ہو گیا جبکہ اس کا سامھی تو پہلے ہی بے ہوش کے مزے لوٹ رہا تھا۔ ان دونوں کی طرف سے مطمئن ہوتے ہوئے اس نے یہ خانے کا رخ کیا۔ اس ڈیرے پر اس کا پہلی بار آنا ہوا تھا لیکن ڈاکٹر ماریا نے اسے ہر بات اتنی تفصیل سے بتائی تھی کہ اسے بالکل بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ اپنے مقابلے پر آنے والے ان دو آدمیوں کو نمٹانے کے بعد اس نے کسی شہرے کی تلاش میں بھی اس لیے وقت ضائع نہیں کیا تھا کہ ڈاکٹر ماریا کے مطابق چودھری کی عدم موجودگی میں ڈیرے پر اس کے دو تین سے زیادہ آدمی موجود نہیں ہوتے تھے۔ اگر کوئی تیسرا وہاں موجود ہوتا تو اس دھچکا مشقی کے دوران سامنے آچکا ہوتا چنانچہ کسی بھی مداخلت کی طرف سے قطعی مطمئن وہ یہ خانے کی طرف بڑھ گیا۔ میز حیاں اتر کر بچے بچنے کے بعد اس نے سب سے آخر میں موجود کمرے کا رخ کیا۔ کمرے کے دروازے میں جدید ساخت کا آئینہ لگا ہوا تھا۔ اس کی اطلاع کے مطابق یہ چودھری کا کمرہ خاص تھا جس کی چابی کسی کارندے کے پاس ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس نے ہاتھ میں موجود کلاشکوف سیدی کی اور ہاتھ لگا کر پھانسی دیا۔ یہ خانے میں کلاشکوف چیلنے کی آواز بڑی طرح گونجی مگر اسے اطمینان تھا کہ یہ آواز باہر نہیں سنائی جاسکتی۔ ڈیرا گاؤں کی آبادی سے دور ذرا سنان سے علاقے میں تھا جہاں عموماً چودھری کے آدمیوں کے علاوہ دوسرے لوگ رہ کر پائند نہیں کرتے تھے۔

کلاشکوف سے نکلنے والی گولیوں نے لاک توڑ دیا تھا۔ پیر کی شوکر سے دروازہ کھول کر وہ کمرے میں داخل ہوا۔ کمرہ ایندروم کے انداز میں سجا ہوا تھا اور یہ سجاوٹ اتنی عمدہ تھی کہ دیکھنے والے کی آنکھیں رادوبے بنا نہ رہ پائیں لیکن اس کی آنکھوں سے کسی بھی قسم کی حسنین کے بجائے نفرت اور کراہیت برس رہی تھی۔ یہ وہ کمرہ تھا جہاں چھپیلی ہی رات چودھری نے ڈاکٹر ماریا کی بے بسی اور مجبوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دایہ پیش دی تھی۔ اور بھی جانے کتنی لڑکیاں اس کمرے میں آئی جاتی رہی تھیں اور چودھری کی ہوس کا نشہ نہ بنی رہی تھیں۔

دل میں ٹھانیں مارتے نفرت کے طوفان کو قابو میں رکھتے ہوئے وہ دیوار میں بیٹے بک شیلٹ کی طرف بڑھا اور ہاتھ سے دباؤ ڈال کر اسے بائیں طرف کھسکانے کے لیے

زور لگایا۔ بک شیلٹ بائیں طرف موجود دیوار کے خلا میں غائب ہو گیا۔ اب اس کے سامنے ایک اور شیلٹ موجود تھا جس میں ملکی اور غیر ملکی شراب کی بوتلیں تھیں۔ ان بوتلوں کو دیکھ کر بھی گمان ہوتا تھا کہ انہیں ہی پوشیدہ رکھنے کے لیے بک شیلٹ کے پیچھے یہ خفیہ الماری بنائی گئی ہے لیکن درحقیقت یہ بھی ایک ڈانچ تھا کہ تلاش لینے والا ان سے دھوکا کھا کر پلٹ جائے۔ اگر اس کے ساتھ ڈاکٹر ماریا کا تعاون نہ ہوتا تو وہ بھی دھوکا کھا جاتا لیکن اسے حقیقت معلوم تھی کہ اس شراب کی بوتلوں سے بھری الماری کے پیچھے بھی کچھ ہے۔ اس نے اس الماری کو زور لگا کر دائیں طرف دھکیلا۔ بک شیلٹ کی طرح وہ بھی دیوار کے خلا میں غائب ہوئی۔ دراصل یہ سارا سیٹ اپ دہری دیوار میں ہوا کہ ان کے درمیان بنایا گیا تھا۔ سرسری نظر ڈالنے والے کو خیال ہی نہیں گزرتا تھا کہ دو کمروں کی درمیانی دیوار ایک نہیں ہے بلکہ دو الگ الگ دیوار ہیں انھما کر درمیان میں یہ خفیہ جگہ بنائی گئی ہے۔ ویسے بھی اس یہ خانے تک دو طرح کے افراد کی ہی رسائی تھی۔ ایک چودھری کے تنگ خوار اور دوست تھے تو دوسرے وہ ستم رسیدہ افراد جو پہلے ہی اپنی کسی نہ کسی مجبوری کے سبب چودھری کے ہاتھوں پامال ہو رہے تھے۔ دونوں گروہوں کے افراد کے پاس چودھری کے خلاف کچھ بھی سوچنے اور عمل کرنے کی غمازش نہیں تھی۔ اب تک یہاں جو مظلوم افراد لائے گئے تھے، ان میں شاید ڈاکٹر ماریا ہی وہ ذی شعور ہستی تھی جس نے مجبور ہونے کے باوجود اپنے حواس قائم رکھے تھے اور چودھری کے چند اہم راز جان کر یہاں سے باہر نکل گئی۔ اس کی اس ہوش مندی نے شہر بار بار بڑا بھلا کیا تھا۔ اس وقت وہ دونوں الماریوں کے ہٹ جانے کے بعد وہاں پیدا ہو جانے والے درمیانی خلا میں کھڑا اپنے سامنے موجود مجبوری کو دیکھ رہا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے سوچ بورد تلاش کر کے وہاں روشنی کر دی تھی۔ وہ روشنی یہاں تک بھی آ رہی تھی۔ روشنی کی مدد سے وہ سامنے موجود مجبوری کا جائزہ لے رہا تھا۔ ڈاکٹر ماریا نے اسے صاف بتا دیا تھا کہ وہ مجبوری کھولنے کے طریقے سے واقف نہیں۔ نہ ہی چودھری نے اسے براہ راست مجبوری کا دیدار کروایا ہے جو وہ اس میں موجود لاک کی نوعیت سے اسے آگاہ کر سکے۔ خود اس کا اندازہ تھا کہ مجبوری میں نمبروں والا تالا ہی موجود ہوگا اور نمبر ظاہر ہے صرف چودھری ہی جانتا ہوگا اس لیے اس نے سوچ لیا تھا کہ کسی زحمت میں پڑے بغیر سیدھے سیدھے دیوار کی گولی سے لاک توڑ دے گا لیکن اب جو لاک کا جائزہ لیا تو

اندازہ ہوا کہ یہ نمبروں والا لاک نہیں بلکہ ای کی طرز پر بنایا گیا ہے۔ مختلف انداز کا لاک ہے۔ مجبوری پر نظر آتے ڈاکٹر نے بھروسے کے بجائے الفاٹیش نظر آرہے تھے۔ یہ فوراً ہی نیشن والا لاک تھا جس کا درست کئی نیشن جیسے ہی ملایا جاتا، لاک کھل جاتا۔ لاک کو دیکھ کر وہ سوچ میں پڑ گیا۔ چودھری کی نفسیات کو سامنے رکھتے ہوئے اس نے غور کیا کہ اس جیسا بندہ کیا کتنی نیشن سیٹ کر سکتا ہے؟ فوراً ہی اس کے ذہن میں چودھری کا نام ابھرا۔ اس جیسا خود پسند بندہ اپنے نام کے کسی حصے کو ہی سوچ سکتا تھا۔ انھما عالم شاہ... اس نام میں "عالم" اور "شاہ" دو ایسے حصے تھے جن میں چار چار الفاٹیش آتے تھے۔ اس نے ان دونوں کو ہی باری باری آزمایا لیکن ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس ناکامی پر وہ تھوڑا سا جھجھکا گیا۔ جھجھکاہٹ میں اس نے کلاشکوف سیدی کی اور لاک پر فائر کرنے ہی جا رہا تھا کہ ایک اور خیال ذہن میں ابھرا۔ اس خیال کو آزمانے کے لیے اس نے آخری کوشش کے طور پر ہی، آئی اے اور ایس کا کئی نیشن ملایا۔ یہ چودھری انھما عالم شاہ کے مکمل نام کے ہر حصے کے پہلے حرف والا کئی نیشن تھا جسے ملاتے ہی لاک کھل گیا۔ لاک کھلتے ہی اس نے مجبوری کا پٹ کھولا۔ اس کی آنکھیں خیرہ رہ گئیں۔ وہاں سونے کے سٹیکس کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا۔ غریب مزاجوں کا خون چوس کر اور دوسری بے ایمانیوں سے نکالی گئی حرام دولت کو چودھری نے اپنی اس خفیہ مجبوری میں سونے کی شکل میں جمع کر رکھا تھا۔ بہر حال، اسے سونے کے اس ڈھیر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ یہاں وہ اپنی ان تصویروں کے حصول کے لیے آیا تھا جن کے ذریعے چودھری اور اس کے سامھی اسے زیر کر کے کا منصوبہ بنا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے مجبوری کے نیچے خانے میں موجود مختلف کاغذات اور بند لٹافوں کو نوٹوں شروع کر دیا۔ ایک لفافے میں اسے آخر کار اپنی تصاویر مل گئیں۔ تصویروں کے ساتھ ان کے ٹیکسٹر ز بھی موجود تھے۔ اس لفافے کو اپنی پلٹ میں اڑانے کے بعد اس نے مجبوری کی مزید تلاش لینا جاری رکھا۔ اسے ڈاکٹر ماریا کی تصویروں کی تلاش تھی۔ وقت کی قلت کے باعث وہ وہاں موجود کاغذات کی نوعیت جاننے میں دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ اسے صرف تصویروں کی تلاش تھی لیکن اس تلاش میں اسے کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ بالآخر وہ مایوس ہو کر واپس پلٹ گیا۔ واپس پلٹتے ہوئے اس نے مجبوری کو بزدل کرنے یا شیلٹ کو واپس ان کی جگہ لانے کی کوشش نہیں کی البتہ شراب کی بوتلوں میں سے چند قیمتی شراب کی بوتلیں نکال لیں اور کمرے میں بیٹھنے کے بعد انہیں بید کر اؤن سے

نکھڑا کر توڑ ڈالا۔ قیمتی شراب بوتلوں سے نکل کر بستر پر گر گئی اور کمرہ بالکل کی بو بھریا گیا۔ اس نے سائڈ بورڈ پر پڑا سہری لائٹ اٹھایا۔ یہ لائٹ وہ کمرے میں داخل ہونے کے بعد وہاں کا جائزہ لینے ہوئے پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ اس کے آنکھوں کی معمولی سی جھنک سے سہری لائٹ نے ایک سرخ شعلہ لگایا۔ اس نے کسی خون آشام بلا کی سرخ زبان جیسا شعلہ لگتے اس لائٹ کو بستر کی طرف اچھال دیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا پیچھے مڑ کے دیکھے، باہر نکلتا چلا گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ایک شعلے سے وہاں کی شعلے بھڑک چکے ہوں گے۔ یہ سرخ سرخ شعلے ذرا دیر بعد چودھری کے اس پیش کدے کو خاک میں بدل دیتے مگر اسے کوئی افسوس نہیں تھا۔ چودھری کا لاکہ کا مال خاک میں تبدیل ہونے کے باوجود ان مظلوم لڑکیوں کے نقصان کا ازالہ نہیں ہو سکتا تھا جن کے وجود یہاں، اس پیش کدے میں پامال کیے گئے تھے۔ اس نے جو کچھ کیا تھا، وہ ظالم اور اس کے ظلم کے خلاف نفرت کا معمولی اظہار تھا۔ اظہار کے اس لمحے میں وہ بھول چکا تھا کہ وہ ایک اونچے خاندان سے تعلق رکھنے والا، ذمے دار اور قانون کا پاسدار اسٹنٹ کمانڈر ہے۔ اس وقت وہ ایک جد باقی اور غصے سے بھرا نوجوان تھا جس کے ذہن میں اقبال کا یہ شعر گونج رہا تھا۔

اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا ڈالو
جس کھیت سے دھقان کو میسر نہ ہو روزی

اپنے پیچھے جاری شعلوں کے رقص کو چھوڑ کر وہ ڈیرے سے باہر نکل آیا۔ سونہرے بانگ اپنی جگہ پر موجود تھی۔ ذرا دیر میں وہ اس پر سوار ہوا آباد سے باہر جانے والے راستے پر گامزن تھا۔ واپسی کا سفر اس نے پہلے سے بھی کم وقت میں طے کر لیا۔ چونکہ ایشیائی اس کی ہدایت کے مطابق مستعد اور چوکنا اس کا منتظر تھا۔

"صبح سے پہلے ہی وہ آدمی جو یہ بانگ دے کر گیا تھا، یہاں آئے گا۔ تم بانگ اس کے حوالے کر دینا۔" سر پر موجود ویسٹ اٹار کر اسے پہلے سے بھی کم وقت میں طے کر لیا۔ وینڈل کے ساتھ لگاتار وہ اس نے چونکہ ایشیائی اس کا منتظر تھا۔

"ٹھیک ہے سرا" چونکہ ایشیائی نے جواب دیا۔

"اور ہاں شادرا تم نے اسے ٹرانسفر کے لیے جو درخواست دی تھی، وہ میں نے منظور کر لی ہے۔ بہت جلد تم اپنی خواہش کے مطابق اپنے آبائی علاقے میں جا کر وہاں کام کر سکو گے۔" اندر کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے اس نے چونکہ ایشیائی سے کہا۔

”بہت بہت شکر یہ سہرا“ چوکیدار خوش ہو گیا۔
 ”شکر ہے کی کوئی ضرورت نہیں... بس آج کی رات کو
 ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بھول جانا ورنہ نقصان میں رہو گے۔“ اس
 نے بے حد سرد لہجے میں کہا اور اندر کی طرف بڑھ گیا۔ اس
 کے لہجے کی سننا ہٹ اپنی ریڑھ کی ہڈی میں محسوس کرتا ہوا
 چوکیدار اپنی ڈیوٹی دینے لگا۔ ☆☆☆

”آپ خوب تر ساری ہیں مجھے۔ آپ کو نہیں معلوم
 کہ میں آپ سے ملنے کے لیے کتنا بے قرار رہوں۔“
 ”مجھے ہم بھی تو ایسے ہی بے قرار رہتے تھے اور آپ
 پابندیاں لگاتے تھے۔“ وہ اس کی بے قراری کا لطف لیتے
 ہوئے دھجھے سروں میں ہنسی۔

”تب اور اب میں بڑا فرق ہے محترمہ! پہلے میں جسے
 روکتا تھا وہ میرا بادی ایک چودھرا کن تھی لیکن اب جس سے
 ملنے کی خواہش کر رہا ہوں، وہ میری منکوحہ ہے۔“ آفتاب
 نے جتایا۔
 ”میں فرق تو مجھے روکتا ہے۔ میں نے پہلے بھی آپ
 سے کہا تھا کہ اب اس پہلے والی جگہ پر ملنا مجھے اپنے رشتے کے
 شان و شان نہیں لگتا۔ میں آپ سے ملوں گی لیکن ابھی نہیں۔
 ذرا مجھے موقع ملے دیں پھر میں لاہور چلی جاؤں گی۔ آپ بھی
 وہیں آجائے گا۔“

”اس پروگرام پر عمل درآمد ہونے میں کتنا وقت لگے
 گا؟“ آفتاب نے بے تابی سے پوچھا۔
 ”کچھ کہہ نہیں سکتی۔ اصل میں مجھے شک ہے کہ بڑی
 ماں کو کسی قسم کی جھلک ہو گئی ہے۔ ان کی جیتی ملازما میں میری
 نوہ میں رہنے کی کوشش کرتی ہیں۔ مجھے آپ سے فون پر بات
 کرنے کے لیے بھی بہت محتاط رہنا پڑتا ہے۔“ اس نے اپنی
 مجبوری بتائی تو وہ تشویش میں مبتلا ہو گیا۔
 ”لیکن آپ کسی مشکل میں نہ پڑ جائیں۔“

”آپ بے فکر رہیں۔ میں پوری طرح ہوشیار رہتی
 ہوں۔“ کشور نے اسے تسلی دی اور پھر گفتگو کا موضوع بدلنے
 کی غرض سے بولی۔ ”آپ نے فریڈ والے معاملے میں کچھ
 کیا؟ میں نے آپ سے قربان کا پتا معلوم کرنے کا کہا تھا۔“
 ”آپ کے حکم کی تعمیل ہو چکی ہے سرکار! میں نے اپنے
 ایک شاگرد سے ذکر کیا تھا۔ وہ قربان کو جانتا ہے۔ اگر میں
 اس سے کہوں گا تو وہ قربان کو میرے پاس لے آئے گا پھر ہم
 اس کی اور فریڈ کی آپس میں بات کروادیں گے۔“
 ”جھپک یو آفتاب! اصل میں فریڈ کے سلسلے میں بڑا
 بوجھ محسوس کرتی ہوں۔ اس پر ظلم ہوا ہے اور ظلم کرنے والے

حادثات و سانحات کی شکار... پناہ کی تلاش میں سرگرداں
 ماہ بانو کی داستان حیات کے واقعات اگلے ماہ پڑھیں



دسویں قسط



اسماقادی

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور ہاتھ میں لے کر روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں۔ مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں، بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے..... یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے..... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے۔ پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو۔ محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہو جاتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے۔ زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں..... کبھی بازی ہلٹ بھی جاتی ہے۔ بیٹا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے..... اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے۔ جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

تقدیر کی فٹوں گری قسمت کی پالیا بازی یا تقدیر کی کھیل..... طے اور محض جانے والوں کی کہانی

اسے اپنے ارد گرد موجود ہر شے گھومتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ یہ پھرتا ہوا ہے دو دیوار پوری قوت سے آکر اس سے ٹکرائیں گے اور اسے پاش پاش کر کے رکھ دیں گے۔ موجودہ منظر نے اس کی ساری ہمتی کو تو ہالا کر کے رکھ دیا تھا۔ آفتاب کی اپنی زندگی میں آمد سے قبل وہ خوشی کے وجود سے ناواقف تھی۔ زندگی اس کے نزدیک ایک جلتے جلتے صحرا میں تنگے پر سفر کرنے کے سوا کچھ نہیں تھی لیکن ابھی وہ جس لمحے میں موجود تھی، وہ تو ساری عمر کے دکھوں سے بڑھ کر تکلیف دہ تھا۔ آج اس نے اپنی زندگی کا سب سے کریمہ منظر دیکھا تھا۔ اس منظر نے اسے بہت کچھ یاد دلادیا تھا۔

حولی میں فریادہ کی وہ پہلی صبح... جب وہ اس سے ملنے اس کے کمرے تک آئی تھی اور حیران ہو رہی تھی کہ کیا بہزاد شاہ بھی کسی لائق ہے؟ آج اس پر سارے اسرار کھل گئے تھے۔ فریادہ کی رخ اور ہر میں ڈوبی ہوئی باتوں کا مفہوم بھی اس لمحے اسے بہت اچھی طرح سمجھ آ گیا تھا۔ چند سیکنڈوں کے اندر وہ انکھی کے کرب ناک عذاب سے گزری تھی۔ اسے لگا کہ مزید ایک سیکنڈ بھی وہاں رہی تو اذیت سے مر جائے گی۔ چنانچہ وہ اپنے جسم کی تمام تر طاقتیں جمع کرتی ہوئی چلی اور دیوانہ وار دوڑ پڑی۔ بالائی منزل سے چلی منزل کی طرف جانے والی بیڑیاں اس نے اتنی برق رفتاری سے ملے کیں جیسے کسی پہاڑی دھولوں سے لڑھک رہی ہو۔ بیڑیاں ملے کر کے وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی تو رانی نے اسے دیکھ لیا۔ وہ برآمدے میں اسی کے انتظار میں کھلی رہی تھی۔

”کیا گل ہے بی بی! سب خیر تو ہے؟“ رانی گھبرا کر اس کی طرف چلی۔ ساتھ ہی اس نے کشور کے عقب میں بھی نظر دوڑائی۔ اسے اندیشہ تھا کہ کوئی نہ کوئی اس کے تعاقب میں ہو گا لیکن برآمدہ بنوز سنسان پڑا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آیا کہ پھر کشور کی یہ حالت کیوں ہے؟

رانی کو زیادہ غور و خوض کرنے کی مہلت نہیں ملی۔ کشور اس کے وجود کو سر اسر نظر انداز کرتی ہوئی وحشت زدہ انداز میں بغیر رکے اپنے کمرے میں گھس گئی۔ رانی نے کمرے میں داخل ہونے سے قبل گردن موڑ کر یہ ضرور دیکھ لیا تھا کہ کوئی پیچھے تو نہیں آ رہا اور پھر مطمئن ہو جانے پر کمرے میں داخل ہو گئی۔ کشور اپنے بستر پر گری لیے لیے سانس لے رہی تھی۔ رانی نے احتیاطاً پہلے دروازے کی کنڈی چڑھا کر کشور کے قریب آئی۔

”تمہی ٹھیک تو ہو بی بی! کیا کسی نے دیکھ لیا ہے؟“ پریشانی کے عالم میں اس نے کشور سے پوچھا لیکن پھر اسے احساس ہوا کہ بستر پر گری کشور بری طرح کچپکارتی ہے اور کوئی جواب دینے کے قابل نہیں ہے۔ اس نے جلدی سے اسے ایک تھپس اوڑھ لیا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کی ہتھیلیاں رگڑنے لگی۔ کافی دیر بعد کشور کی حالت ذرا سنبھلی۔

”کیا ہوا تھا بی بی! آپ کس چیز سے ڈر گئی تھیں؟“ اسے سنبھلا ہوا دیکھ کر رانی نے اپنا سوال دہرایا۔

”کسی سے نہیں۔ تم جتنی بھادو، مجھے نیند آ رہی ہے۔“

کشور نے روکنے سے لچکے میں جواب دے کر اپنی آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔ حیران پریشان رانی نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور خوب لائٹ بند کر کے ٹائٹ بلب روشن کر دیا۔ بلب روشن کرنے کے بعد اس نے کشور کے سر ہانے پر ماموں بکلی افکار الماری میں اس کی مخصوص جگہ پر رکھا اور الماری کو ٹالا کھل دیا۔ کشور پلکوں کی درز سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ اپنی وفادار ملازمہ کی اس قدر خیال داری پر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس حویلی میں جہاں ہر پہل ساز میں جنم لیتی رہتی تھیں، خدمت گزاروں کی فوج جبراً بھرتی کی جاتی تھی۔ انسانی حقوق اور انسانیت کی پامالی معمولی باتیں نہیں، وہاں رانی جیسی ملازمہ کا میسر آ جاتا بہت بڑی نعمت تھی۔

”یہ ٹائٹ بلب بھی بند کر دے رانی!“ آنکھوں پر بازو رکھے رکھے ہی اس نے حکم دیا جس کی فوراً تعمیل کی گئی۔ کمرے میں مکمل اندھیرا ہو گیا لیکن وہ جو یہ سمجھ رہی تھی کہ اندھیرے میں کچھ دیر بھی دیکھنے کے منظر سے فرار حاصل ہو جائے گا، اپنی کوشش میں بڑی طرح ناکام رہی۔ اندھیرا تو اس منظر کو اور بھی واضح کر کے دکھا رہا تھا۔ اس منظر کے پس منظر میں اسے اپنی آواز سنائی دے رہی تھی۔

”میں شرمندہ ہوں کہ میرے اباجی نے تمہارے ساتھ اتنا برا دھوکا کیا لیکن میں شرمندہ ہونے کے سوا اور کچھ بھی کیا سکتی ہوں۔“ فریادہ سے پہلی ملاقات کے موقع پر جب اسے یہ علم ہوا تھا کہ چودھری انقار نے پناہ کے لیے اپنے پاس آنے والی فریادہ اور اس کے محبوب قربان کو دھوکا دے کر فریادہ کی شادی زبردستی بہزاد شاہ سے کروادی ہے، اس وقت اس نے یہ بات فریادہ سے کہی تھی۔ جواب میں فریادہ نے کہا تھا۔ ”میں جانتی ہوں، تب ہی تو تمہیں تمہارے باپ کا وہ روپ نہیں دکھایا جسے دیکھنے کے بعد تم شرم سے زندہ زمین میں ڈوبنے کی خواہش کرنے لگو گی۔“ واقعی اس نے جو منظر دیکھا

تھا، اسے دیکھ کر دل یہ چاہا تھا کہ زمین میں شق ہو جائے اور وہ اس میں سما جائے۔ ان کے خاندان کے مرد و عورتیں مزاج اور عیش پرست ہیں، یہ حقیقت جاننے کے باوجود اس کے لیے اپنے باپ کا وہ مکروہ روپ دیکھنا بے حد تکلیف ثابت ہوا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا باپ ایک بُرا آدمی ہے لیکن یہ خبر نہیں تھی کہ وہ اتنا بُرا باپ ہے کہ اسے اپنے رشتوں کے تقدس کا بھی احساس نہیں۔ وہ اپنے ذہنی معذور بیٹے کی بیوی کو بہو کی نظر سے دیکھنے کے بجائے اپنی داشتہ بنا بیٹھا تھا۔ وہ اپنے دل میں اس کے لیے اتنی شدید نفرت محسوس کر رہی تھی کہ اس کے مقابل کھڑی ہو کر بھی اس نفرت کا اظہار کر سکتی تھی۔

☆☆☆

”کدھر مری رہتی ہو تم دونوں؟ کچھ ہوش رہتا ہے جنہیں حویلی کا یا نہیں؟“ بڑی اور چھوٹی دونوں چودھرائیں صبح کی اس پہلی گھڑی میں چودھری کی عدالت میں موجود تھیں اور وہ ان پر برس رہا تھا۔

”ایسا کیا ہو گیا چودھری صاحب! حویلی میں تو سب چنگ بھلا چل رہا ہے۔ فیہ بھی اگر کوئی گل ہے تو بیٹوں دسو۔“ ”میں نے منع نہیں کیا تھا کہ کوئی بہزاد کی وہ ہمتی سے تعلق نہیں رکھے گا؟ وہ میرے دشمن کی بہمن ہے۔ میں اس کی ناک چینی کرنے کے لیے اس کی بہمن کو بہزاد سے دیا وہ کر لایا ہوں، یہ یہاں تو اس سے دوستیاں گھڑی جا رہی ہیں۔ کیوں جانی ہے بھلا کشور اس سے ملنے اور؟ تم اسے روکتی کیوں نہیں ہو؟“ چودھری کا روئے خشن بڑی چودھرائیں کی طرف تھا کیونکہ کشور کی ماں سے زیادہ بڑی چودھرائیں ہی حویلی کی کرتا دھرتا تھی۔

”میں تو اسے بہت داری سمجھا چکی ہوں چودھری صاحب! پر آپ کی یہ دہی بڑی اچھی ہے۔ میرے روکنے پر بولی کہ میں اپنے بھرا سے ملنے جاتی ہوں۔ میں نے تو ناہید سے کہا تھا کہ سنبھال کر رکھا اپنی دہی کو ورنہ یہ کوئی نہ کوئی گل کھلا کر رہے گی، پر اسے دہی کی ویران زندگی کا برا خیال رہتا ہے۔ میرے سمجھانے پر بھی اس کے ساتھ زیادہ روک ٹوک نہیں کرتی ہے۔“ بڑی چودھرائیں نے فوراً توپوں کا رخ سوکن کی طرف کر دیا۔

”تم گل نہیں ہے چودھری صاحب! میں تو بس اس لیے نہیں روکتی کشور کو اوپر جانے سے کہ وہ چارے بہزاد چودھری کی محبت میں جانی ہے۔ کشور کو روکنے کا سوچوں تو دل میں خوف خدا آتا ہے۔ فیہ یہ بھی سوچتی ہوں کہ میرے روکنے ٹوکنے پر کل کو کوئی یہ الزام لگا دے گا کہ میں گئے سوتیلے کا فرق

کرتی ہوں۔ کشور اور بہزاد شاہ گئے بھائی بہن نہیں اس لیے کشور کو اس سے ملنے نہیں دیتی۔“ چھوٹی چودھرائیں ناہید نے شک بڑی چودھرائیں سے دہی بھی لیکن خود کو چھینتا دیکھ کر اشارے کئے اس میں ہی کئی، سوکن کو روک دینے سے باز نہ رہ سکی۔ اس کی اس حرکت پر بڑی چودھرائیں کوئی جوابی حملہ کرتی، اس سے ٹیل ہی کمرے کے دروازے پر زور دار دستک ہوئی اور پھر ایک ملازمہ پریشان اور گھبرائی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

”کیا گل ہے؟“ اس دخل اندازی پر چودھری نے غصے سے پوچھا۔

”مشی اللہ رکھا آپ سے فوراً ملنا چاہتا ہے۔ کہتا ہے کہ کوئی بہت بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے، چودھری صاحب سے ملنا ضروری ہے۔“ ملازمہ نے خوف زدہ سے لچکے میں بتایا تو چودھری کچھ سوچتا ہوا ملاقاتی کمرے کی طرف چلا گیا۔ ویسے وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ مشی کیا اطلاع لے کر آیا ہو گا؟ اسے اتنی جلدی کی امید نہیں تھی۔

”ہاں بھی مشی! بول کیا خبر لایا ہے جسے سنانے کے لیے اتنا بے تاب ہو رہا ہے؟“ ملاقاتی کمرے میں پہنچ کر اس نے اطمینان سے مشی سے پوچھا اور خود اپنے مخصوص تخت پر بیٹھ کر سنے کی تہام ل۔

”خبر بڑی بُری ہے چودھری صاحب! ابھی ابھی بالا وہ خبر لے کر آیا ہے۔ میں اسے بلواتا ہوں، وہ آپ ہی سب کچھ بتائے گا۔“ مشی کے لچکے میں واضح کچپکارتی تھی۔ بالے کا ذکر سن کر چودھری چپکے سے بھی زیادہ مطمئن ہو گیا۔ بالا کمرے میں آیا تو اس کا حق چہرہ دیکھ کر وہ تھوڑا سا ٹھنکا۔

”کیا گل ہے؟ یہ تیرے پوتے پر بارہ کیوں نچ رہے ہیں؟ جس کام کے لیے گیا تھا اس میں کوئی گڑبڑ کیوں کیا؟“ اس نے تیز لچکے میں بالے سے پوچھا۔

”نہ چودھری صاحب! وہ کام تو میں نے وڈی چنگی طرح کر دیا ہے۔ ادھر سے آپ کو جلد اپنی مرضی کی خبر مل جائے گی، پر ابھی جو میں خبر لایا ہوں، وہ بڑی بُری ہے۔“ ”اب کب بھی دے کہ کیا ہو گیا ہے؟ بُری خبر، بُری خبر کہہ کر جب سے دونوں مجھے ہولانے کی کوشش کر رہے ہو۔“ بالے کا جواب سن کر چودھری کا ضبط جواب دے گیا اور وہ بڑی طرح دباؤا۔

”میرا تو آپ کو معلوم ہی ہے سرکار کہ رات میں ڈیرے پر نہیں تھا۔ دو بندوں کو ادھر چھوڑ کر میں آپ کا حکم پورا کرنے گیا ہوا تھا۔ کام ہوئے کے بعد میں ڈیرے پر پہنچا تو

وہاں عجیب حال تھا۔ جن دو بندوں کو میں ڈیرے پر چھوڑ کر گیا تھا، وہ پانی کا پائپ لگائے بیچے تھے خانے کی آگ بجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ لگ گیا۔ آگ بجھی تو میں نے ان دونوں سے تفصیل پوچھی۔ انہوں نے بتایا کہ کوئی بندہ ڈیرے میں چپکے سے گھس آیا تھا۔ اس نے کتوں کو بھی ٹھکانے لگا دیا اور ان دونوں کو بھی بے ہوش کر ڈالا۔ وہ ہوش میں آئے تو بندہ غائب تھا اور بیچے تھے خانے میں آگ لگی ہوئی تھی۔

”یہ کیا بکواس ہے؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ کس مائی کے لال میں اتنی جرات ہے کہ چودھری انٹار کے ڈیرے میں گھس کر یہ سب کرے؟“ چودھری یہ خبر سن کر ہنسنے لگا۔

”معلوم نہیں چودھری صاحب! دونوں بندوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے اس آدمی کی شکل نہیں دیکھی مگر یہ اندازہ ضرور ہے کہ وہ ادھر پیر آباد کا رہنے والا نہیں تھا۔ وہ تو یہ تک کہہ رہے تھے کہ وہ بندہ آدمی کے بجائے کوئی بھوت لگ رہا تھا جو پوری کوشش کے باوجود ان کے قابو میں ہی نہیں آیا۔“

”ان بڈھرا موں کی تو میں کھال کھینچوا دوں گا۔ پڑے ہوں گے نثر کر کے اس لیے کچھ خبر نہیں ہوئی اور اب بہانہ بنا رہے ہیں کہ کوئی بھوت تھا، بھوتوں کو بھلا کی ضرورت پڑی ہے ڈیرے میں گھس کر آگ لگانے کی۔ وہ یقیناً میرا کوئی دشمن تھا جو ان بندوں کی غفلت کی وجہ سے ہاتھ دکھا گیا ہے۔ ان حرام خوردوں سے تو میں اچھی طرح حساب لوں گا۔ پہلے میں ڈیرے پر جا کے دیکھوں کہ وہاں کیا حشر مچا ہے۔“

”جیسے سے سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ چودھری اپنے تخت سے اٹھ کھڑا ہوا۔ چند لمحوں بعد ہی وہ تینوں ایک شان دار لینڈ کروزر میں بیٹھے ڈیرے کی طرف جا رہے تھے۔ لینڈ کروزر کے طاقتور انجن نے بہت تیزی سے انہیں ان کی منزل تک پہنچا دیا۔ چودھری زمین پر زور زور سے جبر مار کر چتا ہوا ڈیرے میں داخل ہوا۔ سامنے ہی اس کے چہیتے کتوں کی لاشیں موجود تھیں۔ ان لاشوں کے قریب شریف اور اس کا ساتھی سر جھکائے بیٹھے تھے۔ چودھری کے کچھ دوسرے کارندے بھی ڈیرے پر موجود تھے۔ ان سب کے چہرے سستے ہوئے تھے لیکن شریف اور اس کے ساتھی کی حالت یکنگھی۔ وہ جانتے تھے کہ رات کو جو کچھ پیش آیا ہے، اس کی ذمہ داری انہی کے سر ڈالی جائے گی۔ وہ حافظہ ہو کر ڈیرے کی حفاظت کرنے میں ناکام رہے تھے اور چودھری کے نزدیک یہ ناکامی محض حرامی کے زمرے میں آتی تھی۔ اس لیے وہ دونوں خوف زدہ تھے

کہ جانے ان کا کیا انجام ہوا؟ اگر انہیں اپنے پیچھے اپنے بچوں کی زندگی کا خوف نہ ہوتا تو وہ ہوش میں آنے کے بعد ایک لمحہ بھی یہاں رکنے کے بجائے گاؤں سے فرار ہو جاتے۔ میں ہی عافیت سمجھتے۔ اپنے گھر والوں کا لرزہ خیز انجام سوچ کر وہ اپنی ذات کی قربانی دینے کے لیے تیار ہو گئے تھے لیکن بہر حال، انجام سے خوف زدہ تو تھے۔ چودھری کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ کسی پالتو جانور کی طرح لپک کر اس کے قریب آئے اور اس کی ٹانگوں میں اپنے سر رکھ دیے۔

”صورت تم کرو ان نمک حراموں کی۔“ چودھری نے دونوں کے سروں پر باری باری پیرے زوردار شوکر لگائی اور اس طرف بڑھ گیا جہاں تھے خانے کا راستہ تھا۔ منشی اور پالا دونوں اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ پہلی بڑھی پر قدم رکھتے ہی ان کے ہاتھوں سے وہ مخصوص بو نکرائی جو کسی جگہ لگنے والی آگ کو بجھائے جانے کے بعد آتی ہے۔ آگ بجھے کافی دیر ہو چکی تھی چنانچہ اندر دھواں تو نہیں بھرا ہوا تھا لیکن بہر حال، محض ضرور محسوس ہو رہی تھی۔ چودھری نے سب سے پہلے اپنے مخصوص کمرے کا رخ کیا۔ کمرے کا دروازہ کھڑکی کا تھا اور اس کا بیشتر حصہ جل چکا تھا۔ چودھری نے چونک کر پھرتے ہو کر کمرہ بھر کے لیے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرے میں موجود ہر شے کو آگ کے شعلوں نے جالت لیا تھا۔ وہاں اگر کچھ خاک بننے سے رہ بھی گیا تھا تو بس ایک سیاہ ڈھانچے کی صورت میں ہی موجود تھا۔ بڑی جاہت سے سہائے گئے کمرے کی یہ حالت دیکھ کر اسے دھچکا تو ضرور لگا لیکن اس سے بھی زیادہ اسے تجوری میں موجود اپنے خزانے کی فکر تھی۔ دو تین لمبے ڈگ بھر کر اس نے درمیانی فاصلہ طے کیا اور اس خلا تک پہنچ گیا جس میں اس کی خفیہ تجوری موجود تھی۔ تجوری پوری کھلی ہوئی تھی۔ اس میں رکھے گاؤں کا جمل کر خاک ہو چکے تھے۔ سونے کا ڈھیر بھی مٹا رہا تھا لیکن بہر حال موجود تھا۔

”اسے کسی صندوقی میں ڈال کر محفوظ جگہ پر رکھواؤ۔“ اس نے سونے کے ڈھیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتا سکی کوئی طلب کیے حکم صادر کیا۔

”بہتر سرکار! منشی کو معلوم تھا کہ یہ حکم اس کے لیے ہے اس لیے فوراً مستندی سے جواب دیا۔

چودھری پلٹ کر کمرے سے باہر نکلا۔ آگ بڑے خوفناک طریقے سے لگی تھی لیکن بہر حال پچھت ہوئی تھی کہ آگ کے شعلوں نے اس کمرے کے سوا تھے خانے کے کسی اور حصے کو لپیٹ میں نہیں لیا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر اس کے کارندوں کے لیے آگ بجھانا کسی طور ممکن نہ ہو پاتا۔ کمرے

سے نکلنے کے بعد وہ تھے خانے میں مزید نہیں رکھا اور سڑھیاں چڑھ کر اوپر کھلے حصے میں آگیا۔ بالا اس کے پیچھے پیچھے تھا جبکہ منشی حکم کی پیروی کے لیے وہیں رک گیا تھا۔ کھلے حصے میں منشی کر چودھری نے اپنا موبائل نکال کر ایس پی کا نمبر ڈائل کیا۔

”میں آپ کو ہی فون کرنے والا تھا چودھری صاحب! لیکن لگتا ہے آپ کو میرے فون سے پہلے ہی خبر مل گئی ہے۔“ کال ریسیو کرتے ہی تارڑ نے پونا شروع کر دیا۔

”کیسی خبر؟“ چودھری لمحہ بھر کے لیے چوٹکا۔

”اوہ! اس کا مطلب ہے آپ کو نہیں معلوم۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی میرے پاس اسٹیٹ پونٹ سے ڈاکٹر کا فون آیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اقبال باجوہ کا شوفا اور ملازم اسے لے کر اسٹیٹ پونٹ آئے تھے۔ باجوہ کا چپک اپ کرتے ہی ڈاکٹر کو اندازہ ہو گیا کہ وہ مر چکا ہے اور موت کی وجہ ہارٹ فیل ہے۔“ ایس پی نے مختصر آسانی بات بتائی۔

”اوہو... یہ تو صبح صبح دوسری بڑی خبر سننے کو مل گئی۔“ چودھری نے تبصرہ کیا۔

”دوسری بڑی خبر! اس بات سے آپ کا کیا مطلب ہے؟“ ایس پی چوٹکا۔

”ادھر میرے ڈیرے کے تھے خانے میں کسی نے آگ لگا دی ہے۔ میرا خاص کمرہ جل کر خاک ہو گیا ہے۔ رات جانے کون آدمی ڈیرے میں گھس آیا تھا۔ اس نے پہلے میرے کتوں کو گولی ماری پھر میرے بندوں کو بے ہوش کر کے تھے خانے میں آگ لگا دی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ساتھ میں کچھ لے بھی گیا ہو لیکن ابھی میں اندازہ نہیں لگا سکا۔ آپ کو ایسی لیے کال کی تھی کہ یہاں آکر ذرا اس واقعے کی چھان بین تو کریں۔“ چودھری نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

”یہ تو بڑی بڑی خبر سنائی آپ نے۔ ایسا کون سا جی دار دشمن پیدا ہو گیا آپ کا جس نے ڈیرے میں گھس کر یہ کارروائی کرنے کی ہمت کی؟ بہر حال، آپ پریشان نہ ہوں۔ میں پیر آباد پہنچ رہا ہوں۔ باجوہ والا معاملہ بھی دیکھ لوں گا اور ڈیرے کا بھی چکر لگاؤں گا۔“ ایس پی نے چودھری کو تسلی دے کر فون بند کر دیا۔ فون سے فارغ ہو کر چودھری بالے کی طرف متوجہ ہوا۔

”کام تمام ہو گیا ہے باجوہ کا۔ ایس پی بتا رہا تھا کہ موت ہارٹ فیل سے ہوئی ہے، یعنی کسی کو شک نہیں ہوگا کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔ تو بتا... مجھے تو کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی؟“ چودھری کے چہرے پر چھائی تھی ڈراما ہوئی تھی۔

”کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی سرکار! میں آپ کا پیغام لے کر باجوہ صاحب کے پاس گیا۔ پروگرام کے مطابق میں کافی رات گئے وہاں پہنچا تھا۔ جب انہیں پیغام پہنچا کہ فارغ ہوا تو اور بھی دیر ہو گئی تھی۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ باجوہ صاحب کا نوکر میرا پار ہے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ رات میںیں رک جا۔ میں رک گیا اور اپنے بار کے ساتھ ساتھ لگا رہا۔ اس نے باجوہ صاحب کے لیے دودھ گرم کر کے گلاس میں نکالا تو میں نے بھانے سے اس کی توجہ ہٹادی اور موسیٰ کا فائدہ اٹھا کر دودھ میں آپ کی دی ہوئی دواملا دی۔ اگر رات موقع نہ ملتا تو میں سویرے چائے میں دواملا سکتا تھا، پر قسمت اچھی تھی کہ رات میں ہی کام ہو گیا اور میں منہ اندھیرے اذانوں سے بھی پہلے وہاں سے لوٹ آیا۔ ڈیرے پر پہنچا تو یہاں الگ مصیبت نظر آئی تھی، پر میرے پیچھے سے یہ فائدہ (فائدہ) ہوا کہ آگ بجھانے میں آسانی ہو گئی۔“ بالے نے اپنی کارکردگی رپورٹ پیش کی۔

”یہ مسئلہ تو حل کرنا ہی پڑے گا کہ یہاں میری تاک کے نیچے آکر کارروائی ڈالنے کی حرکت کس نے کی؟ اتنا کھلا بیچنے کرنے والے دشمن کو میں ہرگز معاف نہیں کروں گا۔“

”موت چھوٹا ڈیرے سے ہوئے چودھری غریبا۔“

”یہ کام دو ہی بندے کر سکتے ہیں چودھری صاحب! ایک چودھری بھتیجا، دوسرا ایسی شہر یار۔ یہ وہی بندے ہیں جن کی ذمہ داری آپ نے باؤں رکھا ہوا ہے۔ دونوں میں سے کوئی بھی ہلکا کر حملہ کرنے کی غلطی کر سکتا ہے۔“ بالے نے چودھری کی توجہ اس کے دشمنوں کی طرف مبذول کروائی تو چودھری سوچ میں پڑ گیا۔

”تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ سارا ایسی ہی کیا دھرا ہے۔ وہ اپنی تصویروں کی تلاش میں آیا ہوگا۔ اب جانے تصویریں لے گیا یا نہیں جلا کر رکھ کر دیں، پر ہمارا بڑا نقصان ہوا۔ ساری محنت ہی ضائع ہو گئی۔ دوبارہ اس ایسے ہی کے بیچے کو اس طرح گھیرنا بڑا مشکل ہوگا۔“ اس کا حراج باجوہ کی موت کی خبر سن کر ذرا سا بحال ہوا تھا، ایک بار پھر برہم ہونے لگا۔ پہلے کشور کا اسے فریڈ کے کمرے میں دیکھ لیتا، پھر ڈیرے میں آگ لگنا اور اب اتنی منصوبہ بندی کے بعد حاصل ہونے والی تصویروں کا ہاتھ سے نکل جانے کا خیال... اسے تو برہم ہونا ہی تھا۔

”میں حوصلی واپس جا رہا ہوں۔ وہاں سے باجوہ کے بیچے پر جاؤں گا۔ تو ادھر ہی رک اور شریف اور کرے کی بھجرائی کا مزہ چکھا۔ کھال ادھیڑ ڈالنا سالوں کی، پر جان نہ لگنے

دینا۔ ایس بی ادھر آئے گا تو ان سے ملنے کی بات بھی کرے گا۔ ویسے تو اپنا ہی بندہ ہے، پر پھر بھی ہشیار رہنا ضروری ہے۔ بندوں کو زخمی دیکھے گا تو ہم رات آگ لگا کر جانے والے کے سرائرام رکھ دیں گے، پر بیان دینے کے لیے اُن خبیثوں کا زندہ رہنا ضروری ہے۔“ بالے کے لیے احکامات جاری کرنے کے بعد وہ آف موڈ کے ساتھ ڈیرے سے روانہ ہو گیا۔ ہمیشہ اپنی شرائط پر، کامیابی کے نشے سے شرار زندگی گزارنے کے عادی اس شخص کے لیے متواتر ناکامیوں کا سامنا کرنا بہت مشکل تھا۔ شہریاری شرمناک تصویروں کے حصول کے بعد جو امید بندھ گئی تھی، وہ بھی ڈیرے پر لگنے والی آگ میں جل کر خاک ہو گئی تھی۔ وہ جو یہ گمان کیے بیٹھا تھا کہ اور بہت سے کام نکالنے کے ساتھ ساتھ شہریار سے ماہ بانو کا چا بھی حاصل کر لے گا۔ خود کو لگنے والی اس چوٹ پر اندر تک ہلکا کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆

”رات بالا چودھری صاحب کا پیغام لے کر آیا تھا۔ صاحب نے اس سے ملاقات کی تو اس وقت چنگے پھلے تھے۔ فیر میں نے روزانہ کی طرح انہیں سونے سے پہلے دودھ کا گلاس لے جا کر دیا، تب بھی مجھے وہ بالکل ٹھیک نظر آئے۔ آرام سے بیٹھنے کی وی پر کوئی انگریزی فلم دیکھ رہے تھے۔ میرے سامنے انہوں نے دودھ پیا۔ میں خالی گلاس لے کر باہر نکلا، تب بھی ان کو دیکھ کر ایسا کوئی خیال نہیں آیا کہ ان کی طبیعت خراب ہے۔ وہ تو سویرے جب میں نے بالے کو ناشتا کروا کر ادھر سے روانہ کیا تو صاحب نے کھنٹی بجائی۔ میں حیران سا کھنٹی کی آواز سن کر ان کے کمرے کی طرف لپکا۔ صاحب اتنے سویرے نہ تو کبھی اٹھتے تھے اور نہ ہی مجھے بلا تے تھے۔ میں کمرے میں پہنچا تو صاحب کی حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔ وہ بالکل بے دم سے پڑے تھے۔ میں نے جلدی سے ڈرائیور کو جا کر چگایا۔ ہم دونوں نے مل کر صاحب کو گاڑی میں ڈالا کہ اسپتال لے جائیں، پر اندازہ ہم دونوں کو ہی ہو گیا تھا کہ صاحب ختم ہو گئے ہیں۔ ادھر اسپتال میں ڈاکٹر صاحب نے بھی تصدیق کر دی اور بولے کہ صاحب کا دل بند ہو گیا ہے۔“ اقبال باجوہ کا ملازم مٹے ہوئے چہرے کے ساتھ ساری تفصیل سن رہا تھا۔ تفصیل سننے والوں میں ایس بی، ڈی ایس بی اور مقامی تھے دار سمیت شہر پر بھی شامل تھا۔ چودھری کے ڈیرے پر رات اس نے جو کارروائی کی تھی، اس کے بعد اسے سونے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اپنے معمول کے مطابق صبح جب وہ انکمر ساز میں مصروف تھا، اس وقت اس

کے پاس ایس بی کی کال آئی اور اس نے اقبال باجوہ کی موت کی اطلاع دی۔ اطلاع سن کر فوراً پیر آباد کے لیے روانہ ہونے کے بجائے اس نے اپنے معمولات نشتائے اور پھر مقررہ وقت پر دفتر پہنچ کر اسٹاف کو چند ضروری ہدایتیں دیں پھر ڈرائیور کے ساتھ پیر آباد کے لیے روانہ ہوا۔

اقبال باجوہ کا رہائشی بنگلا گاؤں سے کافی بہت کر بنگل کے قریب تھا۔ وہ بنگلے پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ لاش ابھی کچھ دیر قبل ہی مرکز صحت سے بنگلے پر پہنچائی گئی ہے۔ موت طبعی تھی اس لیے پوسٹ مارٹم وغیرہ کا تو مجتہد نہیں تھا لیکن ڈیڈ باڈی کو تیرہ چودہ گھنٹے کی مسافت پر واقع باجوہ کے آبائی گاؤں پہنچانا تھا۔ چنانچہ غسل دینے اور لفتانے کے بعد جب لاش کو تابوت میں منتقل کیا جا رہا تھا تو ڈاکٹر نے چند ایسے انتظامات کر دیے کہ لاش جلد خراب نہ ہو۔ شہریار کے وہاں پہنچنے کے چند منٹ بعد ہی اقبال باجوہ کی ڈیڈ باڈی اس کے آبائی گاؤں روانہ کر دی گئی۔

ڈیڈ باڈی کی روانگی کے بعد ایس بی صاحب کی عمرانی میں باجوہ کے ملازم کا بیان لیا جا رہا تھا اور اس وقت شہریار بھی موجود تھا۔ ملازم کے بیان سے یہ ظاہر ہونے کے بعد کہ بالا رات چودھری کا کوئی پیغام لے کر آیا تھا اور صبح تک بنگلے پر ہی رکھا تھا، وہ چونک پڑا۔

”بالا چودھری صاحب کا کیا پیغام لے کر آیا تھا باجوہ صاحب کے پاس؟“ اس نے ملازم سے پوچھا۔

”کوئی ایسی خاص بات تو نہیں تھی۔ چودھری صاحب نے آج رات کے کھانے کی دعوت کھلوائی تھی۔ اکثر ہی وہ بلا تے رہتے تھے صاحب کو۔ ہر چند وہی دن میں ان کا فون آجاتا تھا صاحب کے پاس کہ فلاں وقت کا کھانا میرے ساتھ کھانا۔ کل بنگلے کا فون خراب تھا، شاید اس لیے انہوں نے بالے سے کھلوایا۔ وہ کہیں ہو رہی کام سے گیا ہوا تھا اس لیے ادھر پہنچنے میں دیر ہو گئی اور میرے کہنے پر رات ادھر ہی ٹھہر گیا۔“ ملازم نے تفصیل سے اس کے سوال کا جواب دیا۔ یہ ظاہر یہ ایک سیدھی سادی صورت حال تھی جس میں کسی قسم کا شک کرنا مناسب نہیں تھا۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ موت کی وجہ قطعی طبعی تھی پھر بھی وہ اپنے اندر ٹھیک سی محسوس کر رہا تھا۔ حالانکہ دیکھا جاتا تو باجوہ تو خود چودھری کا ہی ساتھی تھا اس لیے اس سے اسے نقصان پہنچنے کے امکانات بہت کم تھے لیکن چودھری کی سانپ جیسی فطرت کو سمجھنے کے بعد وہ اس سے کوئی ایسی امید نہیں رکھتا تھا۔ سانپ ڈسنے پر آتا ہے تو بھلا کب دیکھتا ہے کہ سامنے

دوست ہے یا دشمن... وہ تو بس دس لیتا ہے۔

”ملازم کا بیان مکمل ہو گیا ہے اگر آپ اس سے کوئی اور سوال نہ کرنا چاہتے ہوں تو میں اسے فارغ کر دوں؟“ اسے سوچ میں ڈوبے ہوئے دیکھ کر ایس نے اس سے پوچھا۔

”تھک ہے۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔ فوراً ہی ایس نے اس کے حکم پر ملازم سمیت دیگر افراد بھی باہر نکل گئے۔ اب کمرے میں صرف وہ دونوں ہی موجود تھے۔

”چودھری صاحب نظر نہیں آ رہے یہاں؟ ورنہ ہاجوہ کے دوست کی حیثیت سے تو میں ان کی یہاں موجودگی کی امید کر رہا تھا۔“ اس نے ایس سے پوچھا۔

”تھوڑی دیر پہلے تک وہ یہیں موجود تھے پر انہیں مجبوراً جانا پڑا۔ وہ بے چارے خود بڑی پریشانی میں ہیں۔ رات جانے ان کے کس دشمن نے ڈیرے میں قتل کر دیا۔ خانے میں آگ لگا دی۔ لاکھوں کا سامان جل گیا۔ خیر، مال کی تو چودھری صاحب کو فکر نہیں لیکن پریشان ہو گئے ہیں کہ کس دشمن نے اتنی جرأت کی؟“ اس کی طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے ایس نے جواب دیا۔

”یہ تو واقعی تشویش کی بات ہے۔ آپ کے مجھے کے لوگوں نے انوسٹی گیشن کی اس معاملے کی؟“ اس نے بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انجان بن کر پوچھا۔

”ابتدائی تحقیق تو ہو چکی ہے۔ حملہ آور تھا اور موٹر سائیکل پر آیا تھا۔ ہمیں موٹر سائیکل کے پتھروں کے جوشانات ملے ہیں، اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پیر آباد سے باہر کا آدمی تھا جو آیا اور اپنی کارروائی کر کے چلا گیا۔ اس کا اصل مقصد کیا تھا، یہ ابھی سمجھ نہیں آیا۔ ممکن ہے کسی نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی ہو یا پھر یہ کہ کوئی کسی خاص شے کی تلاش میں آیا ہو۔“ ایس نے کالہجہ معنی خیز تھا۔ اپنے آخری جملے سے اس نے یہ ظاہر کر دیا تھا کہ شہر یار کی ذات بھی شک کی زد میں آئی ہے لیکن شہر یار قطعی تروٹ نہیں ہوا اور بے پروائی سے بولا۔

”چودھری صاحب سے ان خاص چیزوں کی فہرست بنوائیں جن کی تلاش میں ان کے خیال میں کوئی ڈیرے میں گھسنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ چیزوں کی تفصیل سامنے آئے گی تو مشکوک افراد کے نام بھی سامنے آجائیں گے۔“ اسے معلوم تھا کہ اس کے اس مشورے پر عمل ممکن نہیں۔ کم از کم چودھری یہ تو ہرگز بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ اس نے ڈیرے میں موجود اپنی خفیہ نگاری میں چند ایسی تصویریں رکھی ہوئی تھیں جن کے ذریعے وہ شہر یار کو بلیک میل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

اس جگہ کو حلیم کے بغیر شہر یار پر کوئی الزام عائد کرنا کسی طور ممکن نہیں تھا۔ کم از کم وہ لوگ اسے قانون کے شکنجے میں جکڑنے کی ہمت تو ہرگز بھی نہیں کر سکتے تھے۔

”آپ تو یقیناً یہاں سے چودھری صاحب کے پاس ہی جائیں گے۔ میری طرف سے انہیں پیغام دیجیے گا کہ اگر میری مدد درکار ہو تو تکلف نہ کریں۔ میں فی الحال مزید یہاں رک نہیں سکتا ورنہ خود ان سے ملاقات کرتا۔ اپنے پیچھے کئی اہم کام چھوڑ کر آیا ہوں اس لیے جلد واپس جانا ضروری ہے۔“ اس نے ایس کی کواپنا پیغام دیا اور اس سے مصافحہ کیے بغیر باوقار انداز میں قدم اٹھا تا وہاں سے روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

”آپ کو کیا ہو گیا ہے بی بی؟ رات سے ایسے ہی لپٹی ہیں۔ نہ کچھ کھاتی ہیں، نہ لپٹاتی ہیں۔ اس طرح تو آپ بیمار پڑ جائیں گی۔“ کشور کے سر ہانے کھڑی رانی توشیش زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے حق تعالیٰ سے

”جی تو کرتا ہے سر جاؤں، پر موت پر بھی تو اختیار نہیں۔“ آنکھوں پر بازو دھرے کشور نے رند سے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”اللہ نہ کرے بی بی! مریس آپ کے دشمن۔ چکا بولیں، کوئی کھڑی قویلت کی بھی ہوتی ہے۔“ رانی نے دہل کر اسے ٹوکا۔

”اس وقت تو سب سے اچھا یہی لگ رہا ہے کہ اپنی جان سے چلی جاؤں۔ گناہ کرنے والے گناہ کرتے نہیں شرماتے لیکن میں ایک گناہ کو ہوتے دیکھ کر اتنی شرمندہ ہوں کہ جی چاہتا ہے زمین پیسے اور اس میں سا جاؤں۔“ وہ ہنوز اسی کیفیت میں تھی۔

”آپ دل کی بہت نرم ہیں نا، جی، اس لیے ذرا داسی گل پر اتنی شرمندہ ہو جاتی ہیں... ورنہ ادھر تو لوگ وڈے سے وڈا گناہ کر کے بھی اکڑ کر چلتے ہیں۔“ وہ نہیں جانتی تھی کہ کشور کی اس حالت کی وجہ کیا ہے، بس بونٹی ایک عمومی بات کر رہی تھی لیکن یہ بات کشور کو کوڑے کی طرح لگی اور چودھری کا چہرہ نظروں کے سامنے آ گیا۔ کتنے بڑے بڑے گناہوں کا بوجھ تھا اس کے سر پر لیکن وہ اس بوجھ کو محسوس کیے بغیر پوری ڈھٹائی سے جی رہا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ اپنے باپ کے مہدے پر فائز اس ظالم اور بے حیا شخص کو کوئی کڑی سزا سناتا ڈالے مگر یہ اس کے اختیار میں نہیں تھا۔

بے بسی سے جیسے پر ادھر سے ادھر سر ہٹاتے ایسے یک دم ہی شہر یار کا خیال آیا۔ آفتاب کے مقابلے وہ ایسا شخص تھا جو

چودھری سے ٹکر لے سکتا تھا۔ اگر فریڈ ساتھ دیتی تو شہر یار کی مدد سے چودھری کے خلاف کارروائی کی جاسکتی تھی۔ شدید دکھ اور اذیت کے احساس سے دو چار وہ اس خیال کے آتے ہی بستر چھوڑ بیٹھی۔ اسے فوری طور پر فریڈ سے ملنا تھا اور اسے قائل کرنا تھا کہ وہ خود پر غلبہ کرنے کے بجائے اس ظلم کے خلاف اٹھ کھڑی ہو۔ اسے امید تھی کہ رات والے واقعے کے بعد اسے فریڈ کو راضی کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی۔

”کہاں جا رہی ہیں بی بی؟ کوئی کام ہے تو مجھے حکم دیجیے۔“ اسے پھر سے بونے سوڈے کے ساتھ کمرے سے باہر کا رخ کرتے دیکھ کر رانی نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ آج صبح سے ہی حویلی کی فضا میں ایسا خاصا مٹکھٹکا تھا۔ ڈیرے پر آگ لگنے کی خبر حویلی میں بھی پہنچ گئی تھی۔ ہاجوہ کی موت کا بھی پتا چلا تھا اور یہ دونوں واقعات ایسے تھے جن سے حویلی کی فضا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ لیکن رانی محسوس کر رہی تھی کہ ان وجوہات کے علاوہ بھی کوئی وجہ ایسی ہے جس کے سبب وڈی چودھران کا مزاج پریم ہے۔ چودھران ناہید بھی اسے کچھ پریشان ہی لگتی تھی۔ بڑی چودھران نے اسے حکم بھی دیا تھا کہ کشور کو میرے کمرے میں بھیجو لیکن اس نے کشور کی بے حد خراب طبیعت کا بہانہ بنا کر اسے ٹال دیا تھا۔ کشور کی مزاج آشنا ہونے کے ناتے وہ جانتی تھی کہ اس وقت وہ جس کیفیت کا شکار ہے، بڑی چودھران کی حکم کی ہرگز بھی تعمیل نہیں کرے گی۔ بڑی چودھران کی منہ چڑھی ملازما نہیں چھٹی اور شاید کشور کی مزاج پریم کے بہانے آکر اس بات کی تصدیق کر رہی تھیں کہ وہ واقعی بیمار ہے یا بہانہ بنایا گیا ہے۔ چودھران ناہید بھی وہاں آئی تھی لیکن کشور نے آنکھیں کھول کر ماں کی طرف دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی اور اسے تھوڑی دیر چپ چاپ بیٹھنے کے بعد ہانپوس ہو کر واپس جانا پڑا۔

ان ساری باتوں سے رانی نے اندازہ لگایا تھا کہ کوئی ایسی بات ہوئی ہے جس کی وجہ سے کشور اپنے برہنگوں سے اور بزرگ اس سے ناراض ہیں۔ اپنے اسی اندازے کی بنیاد پر وہ کشور کو ناغیانہ کی کیفیت میں کمرے سے باہر نکلتے دیکھ کر گھبرا گئی تھی اور اسے روکنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن وہ اس کی کسی بات پر دھیان دینے بغیر باہر نکل گئی اور برآمدہ پارک کے سیدھے اوپری منزل کی طرف جانے والی سیزھیوں کا رخ کیا۔ پریشان ہی رانی اس کے پیچھے پیچھے تھی۔

”کوک کا کشور اتنا اوپر نہیں جاسکتی۔“ ابھی کشور نے پچھلے قدم پر ہی پیر رکھا تھا کہ ایک رعب دار آواز فضا میں

ابھری۔ کشور اس جھکنا نہ آواز کو پہچان سکتی تھی پھر بھی اس نے گردن گھما کر حکم دینے والی ہنسی کی طرف دیکھا۔ وہ بڑی چودھران تھی جو اس کی طرف کچھ جلال نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”کیوں؟ کیوں نہیں جاسکتی میں اوپر؟“ اس نے چودھران کی جلال بھری نظروں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے منتنا کر پوچھا۔

”یہ تیرے ابا جی کا حکم ہے۔ میرے روکنے سے تو کوئی نہیں، کیا ان کی کھل بھی نہیں مانے گی؟“ وہ گویا اسے چیلنج کر رہی تھی کہ چودھری کی طرف سے عائد کردہ پابندی کے بعد بھلا وہ کیسے حکم عدوی کی جرأت کر سکتی ہے؟

”کسی کا بھی حکم ہو... میں نہیں رکھنے والی۔“ کشور نے رکھائی سے کہتے ہوئے سیزھی پر اپنا پیر رکھا۔ رات سے اب تک وہ خود کو سنبھال ہی نہیں پائی تھی ورنہ اس جرأت مندی کا مظاہرہ وہ کیا ہی ہوش و حواس کرنا ممکن نہیں تھا۔

”رب دا واسطہ بی بی! ضد نہ کریں۔“ واپس اپنے کمرے میں چلیں۔“ وقادار ملازمہ نے اس بکڑی ہوئی صورت حال کو سنبھالنے کی کوشش کی اور اس کے قریب جا کر اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے اس سے استدعا کی۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ رانی کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔

”مت روک مجھے۔ اب میں کسی ظالم کے دباؤ میں آنے والی نہیں۔“ وحشت زدہ سے انداز میں کہتے ہوئے اس نے ایک قدم اور بڑھایا۔

”مت ماری گئی ہے اس کڑی کی۔ گلتا ہے دماغ پر کوئی اثر ہو گیا ہے۔ کہاں ہے ناہید؟ اسے بلاؤ۔ کہو کہ اگر آپ اپنی دھی کو سنبھال لیں۔“ اس کی کھلم کھلا بغاوت نے بڑی چودھران کو چراغ پا کر دیا اور وہ زور سے چیخی۔ اس سے قبل کہ وہاں موجود ملازموں میں سے کوئی اس کے حکم کی تعمیل کے لیے جاتی، افتان و خیزاں چودھران ناہید خود وہاں آ گئی۔

”کیا ہو گیا ہے میری دھی؟ کیوں اتنی ضد کر رہی ہے؟ تو نے سنا نہیں کہ تیرے ابا جی نے تیرے اوپر جانے پر پابندی لگائی ہے۔ تو چل میرے ساتھ اپنے کمرے میں۔ میں تیرے ابا جی سے گل کر کے تجھے بہزاد سے ملنے کی اجازت دلا دوں گی۔ مجھے معلوم ہے تو اپنے بھرا سے وڈی محبت کرتی ہے۔ اس سے ملے بغیر نہیں رہ سکتی، پر اس وقت تھوڑا سا صبر کر لے۔“ اپنے بھاری جدو کے ساتھ تیزی سے چل کر آئے اور پھر دو تین سیزھیاں چڑھنے کی وجہ سے چودھران ناہید کا

سانس پھول رہا تھا لیکن پھر بھی وہ کشور کا بخاری کی حدت سے جلتا ہاتھ تھا اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”کیا ہنگامہ ہو رہا ہے یہاں؟ کیوں تماشا لگا کر رکھا ہوا ہے؟“ چودھرائن ناہید کو اپنی کوشش میں کامیابی ہوئی، اس سے پہلے ہی چودھری افتخار خود وہاں چلا آیا۔ ایک تو ذریعے والے حادثے نے پہلے ہی موڈ آف کر رکھا تھا، اس پر سے حوصلے کے زخموں نے خاتمے میں قدم رکھتے ہی جو پہلا منظر دیکھنے کو ملا... اسے کچھ کرمزاج اور بھی برہم ہو گیا۔ کشور کو میز چیلوں پر کھڑے دیکھ کر صورت حال بھی اس کی سمجھ میں آگئی تھی چنانچہ اپنے مخصوص دنگ اور بارب لہجے میں بے آواز بلند پوچھنے لگا۔

”کچھ نہیں چودھری صاحب! یہ کشور کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ بخار دماغ پر چڑھ گیا ہے اس لیے عجیب عجیب ضدیں کر رہی ہے کسی فکر نہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ چودھرائن ناہید نے گھبرا کر بہانہ بنایا تاکہ بیٹی کو باپ کے خطاب سے بچا سکے مگر وہ خود اس وقت اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھی۔ ماں کی مصلحت پسندی کی پروا کیے بغیر زور سے بیتی۔

”کوئی دماغ خراب نہیں ہوا ہے میرا۔ مجھے بس اوپر جانا ہے۔“

”کیوں جانا ہے تجھے اوپر؟ جب ایک واری منع کر دیا تو تیری سمجھ میں نہیں آتا؟“ چودھری نے اپنے لہجے کے جہال سے اسے ڈرانے کی کوشش کی۔

”ہاں نہیں آتا میری سمجھ میں۔ آپ بتائیں آپ کیوں جاتے ہیں اوپر؟“ وہ بجائے دہنے کے باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی تو اس کی نظروں میں اتنے شرارے تھے جن کی چودھری جیسا بندہ بھی تاب نہ لاسکا اور بے اختیار نظریں چرا گیا۔ وہاں موجود دیگر لوگ البتہ کشور کی اس جرأت مندی پر دنگ رہ گئے تھے۔ رانی نے تو اپنے حلق سے نکلنے والی چیخ کو روکنے کے لیے باقاعدہ اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس جرأت مندی کے اظہار کے بعد کشور کو خونخوار انجام سے دوچار ہونا پڑے گا۔

”اس کو تو دماغ سچ خراب ہو گیا ہے۔ گلتا ہے علاج کے لیے کسی وڈے ڈاکٹر کو دکھانا پڑے گا۔ تم لوگ اس کا سامنا تیار کرو۔“ کل سویرے میں اسے لاہور بھجوا دوں گا۔ اُدھر وہ کہ اس کا علاج ٹھیک طرح سے ہو جائے گا۔“ دوسرے لوگوں کو باپ بیتی کے درمیان چھری سرد جنگ کی وجہ معلوم نہیں تھی اس لیے وہ اس نرم سزا کو سن کر حیران رہ

گئے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ چودھری جس جرم کا ارتکاب کرتے ہوئے بیتی کے سامنے رکتے ہاتھوں پکڑا گیا ہے، اس میں خود بھی اتنی تاب نہیں رہی کہ اس کا سامنا کر سکے اسی لیے علاج کے بہانے اسے شہر بھجوا کر اس کی نظروں سے بچا جاتا ہے۔

”آئیں بی بی! اپنے کمرے میں چلیں۔“ چودھری بہ ظاہر پورے رعب کے ساتھ احکامات جاری کرنے کے بعد وہاں سے فوراً ہی ہٹ گیا تھا۔ رانی نے سادگی سی کڑی کشور کا ہاتھ زنی سے دھاتے ہوئے اس سے دھیس لکھے ہیں کہا تو وہ جیسے گہری نیند سے جاگی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھائی رانی کے سہارے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

”ماہ بانو! تیار ہونا؟“ وہ اپنے دروازے بالوں کی چٹیا گوندھنے کے بعد اپنے گرد چادر لپیٹ رہی تھی، جب اکرم خان نے اسے پکار کر پوچھا۔

”ہاں بھائی اکرم! تیار ہوں۔ ابھی باہر آتی ہوں۔“ اس نے اکرم خان کو جواب دیا اور دیوار پر ایک میل کی مد سے ٹکے دھندلے سے آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر مسکرائی۔ نیلے پھولوں والی سیاہ چادر میں اس کا چہرہ اس دھندلے آئینے میں بھی چمکتا ہوا نظر آ رہا تھا اور اسے یقین تھا کہ یہ چمک اس کے چہرے کے گرد ہالے کی طرح لپٹی اس چادر کی وجہ سے ہے جو بڑی شدت سے کسی کی یاد دلاتی ہے۔ اسے یہ چادر خرید کر دینے والا خود تو شاید اپنی اس مہربانی کو بھول گیا ہو گا لیکن وہ ایک پل کے لیے بھی اسے بھلا نہیں پاتی تھی۔ وہ بہانے بہانے سے اُسے یاد آتا تھا۔ اس کے بھجوانے گرم کپڑوں کی حدت میں، ہاتھ پیروں پر لگائے جانے والے لوشن کی ہلک میں، کٹائیوں کی سطروں میں، ہر برہنہ میں اس کی یاد کی تھی۔ وہ یہاں نہیں تھا لیکن ہر پل، ہر دم، یہیں تھا۔ وہ یہاں بھی لیکن ہر پل، ہر لمحہ یہاں سے بہت دور، بخاب کے اُس ضلع کے کوچوں میں، بھنگی مٹی جہاں وہ اسٹینٹ مشینری ڈسے داریاں بھجاتا یقیناً اسے یاد کرنے کی فرصت بھی نہ پاتا ہوگا۔ اُس سے جدا ہوتے وقت اُس نے اپنے دل میں جو عجیب سی کیفیت محسوس کی تھی، کاندے کے تقابض دروزنے اس کی خوب وضاحت کر دی تھی۔ وہ جان کی تھی کہ وہ دیکھنے میں ذرا ذرا سا خود پسند اور مغرور نظر آنے والا اسے ہی اس کے دل میں بس چکا ہے اسی لیے ہر پل کسی سامنے کی طرح ساتھ ساتھ محسوس ہوتا ہے۔ شہر یار کے لیے اس کے دل میں وہ جذبہ بیدار ہو چکا تھا جو لوگوں کے جہم میں گھر کر بھی انسان

کو سب سے کٹ کر تیار رہنے کا ہنر سکھا دیتا ہے لیکن یہ تہائی ایسی ہوتی ہے کہ انسان اپنے سن کی دنیا میں محفل سجائے بیٹھا رہتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس محفل میں سوائے محبوب کے کسی اور کو قدم رکھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اس وقت آئینے کے سامنے کھڑی وہ ایک دم ہی محبوب کی اس محفل میں پہنچ گئی تھی۔ دروازے پر آہٹ ابھری تو چونک کر اس طرف متوجہ ہوئی۔ اکرم خان کی ماں چوکت پر کھڑی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ شرمندہ ہی ہوئی۔

”تیار ہوں ماں جی! آ رہی ہوں۔“ اس نے بولتے ہوئے دروازے کی طرف قدم بڑھاے۔ باہر محرم میں اکرم خان منتظر کھڑا تھا۔ اس کے قریب ہی دو بیک تیار رکھے تھے۔ ان میں سے ایک بیک ماہ بانو کا تھا جبکہ دوسرے بیک میں اکرم خان اور اس کی ماں کا سامنا تھا۔ وہ لوگ اکرم خان کے ماموں زاد بھائی کی شادی میں شرکت کے لیے ہوئے جا رہے تھے۔

”آ جاؤ بہن! اوپر سے نکلے تو مشکل ہو جائے گا۔ ہم تو عادی ہے ان راستوں کا پر تمہارے لیے یہ سفر تھوڑا مشکل رہے گا۔“ اسے دیکھتے ہی اکرم خان دونوں بیک کاندے پر لٹکاتے ہوئے بولا۔ وہ ایک پرنسپل پور تھا جسے بڑا بھاری بوجھ سامنا اپنے شانوں پر رکھ کر ادھر سے ادھر پہنچانے کی اچھی خاصی مشق تھی۔ ان دونوں بیگز کو تو اس نے یوں اٹھالیا تھا، گویا گلاب کے پھول ہوں۔

”ہمیں تو یہ سارا راستہ ہاتھوں کی لکیروں کی طرح یاد ہے۔ ادھر اسکرودے ہوئے ٹنک اتنے پتھر لگائے ہیں کہ کتنی بھی یاد نہیں۔ آج کل سیاح لوگ گندو گورو دیکھنے بہت جاتا ہے۔ ہم ماں کی بیج سے پہاڑوں پر نہیں جاتا لیکن اسکرودے ہوئے ٹنک سفر کرتا رہتا ہے۔“ گاؤں کی گلیوں میں سے گزرتے ہوئے وہ خوش گوار موزوں ماہ بانو کو بتا رہا تھا۔

”پھر تو آپ کا ہوئے میں ماموں کے گھر بھی آنا جانا لگا رہتا ہوگا؟“ ماہ بانو نے اس کی گفتگو میں دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں، ہر بار ادھر جانے کا موقع نہیں ملتا۔ ہم ہم کے ساتھ جاتا ہے تو پھر اسی کے ساتھ رہنا پڑتا ہے۔“ اکرم خان نے بتایا۔ اسی طرح کی چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے ہوئے وہ لوگ اس مقام پر پہنچ گئے جہاں کاندے نالا بہرہ تھا۔ بلند پہاڑوں سے بہہ کر آتے اس نالے کے پانی کا شور دور سے ہی سنائی دے گیا تھا۔ نالے میں تیزی سے بہتے پانی کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے پتھر لڑی لڑکتے ہوئے دکھائی دے

رہے تھے۔ نالا پار کرنے کے لیے جو پل بنایا گیا تھا، وہ محض دو پتھر والی پریشان تھا۔ اس پل کے ذریعے اسے پرشور نالے کو پار کرنے کے خیال سے ماہ بانو کا منہ کپ گئی۔

”فکر نہ کرو بہن! ہم جہیں سہارا دے کر پل پر سے لے جائے گا۔“ اکرم خان نے اس کے خوف کو محسوس کرتے ہوئے اسے تسلی دی پھر بھی اس کا ذہن نہیں ہوا۔

”اسی ایلان کو لے کر جاؤ۔“ اس نے اکرم خان سے کہا تو اس نے مسکراتے ہوئے اپنی ماں کا ہاتھ تھام لیا۔ پہاڑوں کی باسی اس بوڑھی عورت نے بنا جھجکے پھسلن زدہ پتھروں پر مستقل پل پر قدم رکھا اور اپنے جوان بیٹے کے سہارے نالے کے اس پار جا پہنچی۔ ماں کو اُس پار پہنچانے کے بعد اکرم خان واپس آیا۔ اس دوران ماہ بانو اپنے اندر کافی حوصلہ پیدا کر چکی تھی، چنانچہ اس کے ساتھ جانے پر راضی ہوئی لیکن پھر بھی خوف تو دل میں تھا ہی۔ اس نے اپنی زندگی میں پانی کا جو سب سے بڑا ذخیرہ دیکھا تھا، وہ پیر آباد کی نہر تھی۔ وہ نہر اچھی خاصی طویل اور گہری ضرورت تھی لیکن اس کا پانی اتنا ہنگامہ پرور نہیں تھا کہ دیکھنے والا دور سے ہی ڈر جائے۔ زیر لب دعا میں مانگتے اس نے اکرم خان کے سہارے کاندے کا کیت تاک نالا پار کیا اور کنارے پر پہنچتے ہی ایک طویل اطمینان بھرا سانس لیا۔

”اچھا ہوا ہم نے تمہیں اس نالے کے بارے میں پہلے سے کچھ نہیں بتایا تھا۔ اگر ہم تمہیں یہ بتا دیتا کہ اس نالے میں گرنے کے بعد آبی کا پتھا ممکن نہیں تو تم تو پل پر قدم ہی نہیں رکھنا۔ اس میں گرنے والا تو بس بہتا ہوا سیدھا نیچے شیوک میں ہی پہنچتا ہے۔ شیوک دریا کا نام تو سنا ہوگا تم نے؟“ اکرم خان اس کی حالت سے محفوظ ہوتے ہوئے اسے چھیڑنے لگا۔

”مجھے ابھی بتا دو کہ آگے تمہارے ہوئے کے راستے میں اور کتنے ایسے ندی نالے پڑتے ہیں تاکہ میں یہیں رک جاؤں۔ اس سے آگے میں اور کوئی ایسا خطرناک نالا پار کرنے کو تیار نہیں۔“ ماہ بانو نے ہجر بھری لہجے سے کہا تو اکرم خان زور سے ہنس پڑا پھر اسے اطمینان دلاتے ہوئے بولا۔

”فکر نہ کرو ہمارا بہن! آگے ایسا کچھ نہیں ہے۔ یہاں سے آگے ہم ہوئے ٹنک آرام سے جیب میں سفر کرے گا۔“ ماہ بانو نے دیکھا تو واقعی وہاں کچھ قافلے پر چند جیمیں کھڑی ہوئی تھیں۔ اکرم خان اسے اور اپنی ماں کو لے کر ان میں سے ایک جیب کی طرف بڑھ گیا۔ جیب ذرا نیچو اس کا

آشنا تھا جس نے مقامی بولی میں اس سے دوستانہ لہجے میں بات کرتے ہوئے ان لوگوں کے جیب میں بیٹھنے کی جگہ بنا دی۔ جیب میں بہت سا سامان لدا ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کے بیٹھنے کے لیے مشکل سے ہی جگہ بن سکی تھی۔

”پچیس جیب میں جو ایشیائی ڈیشن نیم بیٹھا ہے، یہ اس کا سامان ہے۔ یہ جیب ڈرائیور ہمارا دوست ہے اس لیے ہمیں ساتھ لے جانے کے لیے راشی ہو گیا ہے ورنہ ادھر سے ہوشے تک جانے کا جیب والا بہت پسپا لیتا ہے۔“ اکرم خان نے جیب میں موجود سامان اور غیر آرام دہ نشست کے لیے اس کے سامنے وضاحت پیش کی۔

”کوئی بات نہیں بھائی اکرم! آپ نے بتایا تھا کہ یہ صرف گھنٹے بھر کا راستہ ہے، تو کوئی مسئلہ نہیں۔ ایک گھنٹہ تو آسانی سے کٹ جائے گا۔“ اس نے اکرم خان کو شرمندگی سے بھاننے کے لیے کہا۔ جیب روانہ ہوئی تو وہ ارد گرد کے مناظر کا جائزہ لینے میں مصروف ہو گئی۔ کہیں درخت اور جھاڑیاں تھیں تو کہیں بڑی بڑی چٹانیں۔ ان کا کھیتوں کے ایک سلسلے کے قریب سے بھی گزر رہا تھا۔

”اس پل کے پار جانے کے بعد ایک چڑھائی آئے گی اور ہم ہوشے پہنچ جائیں گے۔“ اچھا خاصا طویل راستہ طے کرنے کے بعد جب ان کی جیب چٹانوں کی اوٹ میں سے گزر رہی تھی تو اکرم خان نے گہرائی میں موجود پل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرخوشی کے عالم میں بتایا۔ اس کے لہجے کی اس خوشی پر وہ ابھی خود کرا رہی تھی کہ جب نے پل طے کر لیا اور ایک زبردست چڑھائی پر چڑھنے لگی۔ چڑھائی اتنی زیادہ تھی کہ اسے لگتا تھا، جیب سے نکل کر پیچھے جا کر گئے کی لیکن خبر کڑی اور ماہر ڈرائیور نے انہیں بے خبر عافیت ہوشے پہنچا دیا۔ چند گھنٹوں پر مشتمل ہوشے گاؤں کا ایک کچا کچا مکان ان کی منزل تھا۔ اپنی اکڑ جانے والی ناٹوں کو سیدھا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے، وہ لوگ جیب سے اتر کر جیسے ہی اس مکان میں داخل ہوئے ایک لڑکی سامنے آگئی۔ لڑکی کی رنعت صاف تھی اور اس نے اپنے بالوں کو بے شمار مینڈھیوں کی صورت میں گوندھ رکھا تھا۔

”یہ گل مینا ہے، ہمارا ماموں زاد۔“ لڑکی پر نظر پڑتے ہی اکرم خان کی آنکھیں پٹکتے نکلیں اور اس نے ماہ بانو سے اس کا تعارف کروایا۔ ایک دم اس پر مشکف ہو گیا کہ اکرم خان کی خوشی کا سبب یہی لڑکی گل مینا ہے۔ گل مینا سسٹے اپنی پھوٹی سے ملی پھر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ ماہ بانو نے آگے بڑھ کر

اسے گلے لگا لیا۔ گل مینا کے جسم سے ہلکی سی بوائحہ رہی تھی۔ یقیناً ہوشے کی روایت کے مطابق وہ بھی بہت کم کم ہی نہانے کی زحمت کرتی تھی۔ ماہ بانو کے ہنستوں نے اس کو محسوس ضرور کیا لیکن ناگوار کی احساس کے بغیر... کیونکہ اس کی ہوشے کے مقابلے میں محبت کی وہ ہنک زیادہ طاقتور تھی جسے کوئی محبت بھرا دل رکھنے والا ہی محسوس کر سکتا ہے۔ ماہ بانو نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ گل مینا کے چمن دل میں اکرم خان کی محبت کا پھول ہنک رہا ہے۔

☆☆☆☆

مختوں سے اونچے سینے چپکٹ گھا گھروں کے ساتھ، سر پر پٹی پرانی سی اوڑھنیاں رکھے وہ دونوں عورتیں زمین پر ادھر ادھر نظر دوڑاتی آتے بڑھ رہی تھیں۔ ان کے شانوں سے بڑے بڑے بھولے لٹک رہے تھے جن میں وہ راستے میں ملنے والے ہڈیوں اور کاغذ کے ٹکڑوں کے علاوہ کاغذ کے ٹرے اور دیگر اسی طرح کی چیزیں ڈالنی جاری تھیں۔ ان کے چہروں کی سیاہ رنگت، چڑی زدہ ہونٹ اور گندے اچھے ہوئے بال ان کے شانوں سے لٹکے جھولوں سے پوری طرح ہم آہنگ تھے۔ لوگ اس طے میں لگیوں اور کچرا کنڈیوں سے کچرا چھنے والی ان عورتوں کو دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ ان دونوں عورتوں کو بھی کسی ایک افراد نے دیکھا تھا لیکن سرسری سی نظر ڈال کر ایک معمول کا حصہ سمجھتے ہوئے آگے بڑھ گئے تھے۔ کسی نے اگر گہری نظر ڈالی بھی تھی تو ان کے چہروں پر نہیں بلکہ ان نشیب و فراز پر جو سر پر کی اوڑھنیوں کے دونوں پلو شانوں سے پیچھے پڑے ہوئے کی وجہ سے ہر ایک کو ہی دعوتِ نظارہ دے رہے تھے۔ جو ہوس پرست تھے، وہ اس نظارے سے بن باگی نفوت کی طرح لطف اندوز ہونے کے ساتھ ہی ایک آدھ فحش جملہ جھپٹک کر آگے بڑھ جاتے مگر کوئی ان کے زیادہ قریب نہیں آتا تھا... کہ سب ہی کو معلوم تھا، یہ کچرا چھنے والی عورتیں کس درجہ بد زبان اور مرد مار ہوتی ہیں۔ کھلی بھوری بن کر سرکوں پر بچھرنے والی یہ عورتیں اپنی بے باکی سے محسوس کرنا کہ کوئی بھی اس اعتماد کی بنیاد پر نہیں کہ ان کی مرضی کے بغیر کوئی مانی کا لال ان پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ کوئی جرأت کرتا تو وہ اس کی عزت کو کچرا کرنے میں بھی بھر بھی نہیں لگاتیں۔ چنانچہ من چلے دور سے چاہے جتنی آنکھیں پٹکتیں، قریب آنے کا رسک نہیں لیتے تھے۔ ان عورتوں کے گندے طے بھی مردوں کو ان سے دور رکھنے کا ایک سبب تھے۔

وہ دونوں بھی اپنی برادری کی دیگر عورتوں کی طرح

اپنے کام میں منہمک بڑی بے نیازی سے قدم اٹھا رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر کوئی گمان نہیں کر سکتا تھا کہ جب وہ اپنی نظریں ارد گرد دوڑاتی ہیں تو صرف زمین پر پڑے پکڑے کوئیں ٹوٹتیں بلکہ اپنے اطراف کا بے حد ماہر انداز اور پیشہ ورانہ جائزہ بھی لیتی ہیں۔ یہ ظاہر بے نیازی سے لیکن حقیقت میں ایک ایک قدم چوک چوک کر اٹھاتی وہ دونوں اب ایک سرکاری اسکول کے مین گیٹ کے سامنے سے گزر رہی تھیں۔ ابھی انٹرویل نہیں ہوا تھا لیکن اسکول کے گیٹ کے باہر ٹھیلے اور خواتین والے جج ہو گئے تھے۔ وہ دونوں اسی منظر کو سرسری نظر سے دیکھتی ہوئی اسکول کے سامنے سے گزر کر دائیں جانب مڑ گئیں۔

اسکول کی دائیں جانب کی دیوار کے ساتھ اہل علاقہ نے کچرا کنڈی بننا بھی شروع کر دی۔ وہ دونوں کی معمول کی طرح اس کچرا کنڈی میں داخل ہو گئیں۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے کچرا چھنے کا عمل جاری رکھا۔ پھر ان میں سے ایک کچرا چھنے چھتے اسکول کی دیوار کے بالکل قریب پہنچ گئی اور اپنے شانے پر لٹکا بڑا سا جھولا پھرتی سے اتار کر دیوار کی جڑ میں رکھ دیا۔ اس عمل سے فارغ ہوتے ہی اس نے ذرا فاصلے پر کچرا چھتی اپنی ساتھی کی طرف دیکھ کر کچری کا نشان بنایا اور پھر وہ دونوں جس انداز میں وہاں آئی تھیں، اسی انداز میں اس علاقے سے دور نکلتی چلی گئیں۔ اس علاقے سے بہت دور نکلنے کے بعد ایک گاڑی ڈرائیور سمیت ان کی نظر کسی گاڑی میں بیٹھنے کی انہوں نے اپنے طے تبدیل کرنا شروع کر دیے۔ جیسے جیسے گاڑی آگے بڑھتی جا رہی تھی، کچرا چھنے والی عورتوں کے چولے میں سے دو مختلف لڑکیاں برآمد ہو رہی تھیں۔ ”را“ کی خصوصی اینجنس اور میلا اور گیتا لیسٹ اور دھڑا۔

☆☆☆☆

”ایک ہفتے میں دوسرا بل ملاست... وہ بھی ایسا جس میں اسکول کے معصوم بچے مارے گئے۔ لوگ کیسے برداشت کر سکتے ہیں اس صورت حال کو؟ اوپر سے نیچے تک سب مل کر رہ گئے ہیں۔“ اپنی کپ اتار کر ٹھیل پر رکھتے ہوئے مختار مراد خود دکھائی کے انداز میں بولا اور کرسی پر براجمان ہو گیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ وہ بہت زیادہ اعصابی دباؤ اور ٹھنک کا شکار ہے۔

”اوپر والوں کو رہنے دیں۔ انہیں کسی حادثے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ وہاں چڑھنا ہی جان دے کر فارغ ہو جاتے ہیں۔ یہ ہم پولیس والے ہیں جو ایسے ہر موشتے پر نگہوں کی طرح کام بھی کرتے ہیں اور لوگوں کی باتیں بھی

سننے ہیں۔ آپ معلوم کر کے دیکھ لیں، وزیر اعظم اور صدر میں سے کوئی رات کے اس پہر نہیں جاگ رہا ہوگا۔“ مختار مراد نے تھکے تھکے انداز میں خود بھی ایک کرسی سنبھالنے ہوئے تلخ لہجے میں تبصرہ کیا جسے سن کر مختار مراد کے لبوں پر ہمہ می مسکراہٹ دوڑی اور پلی بھر میں معدوم ہو گئی۔

”آج تو تم اپنے کزن شہریار کے لہجے میں بات کر رہے ہو۔“

”ہر جگہ آدمی کو ان حالات میں اسی لہجے میں بات کرنی چاہیے۔ میں جانتا ہوں کہ شہریار غلط نہیں ہے، بس مصلحتی ہی اسے تو کتا رہتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ جذبات کا اظہار ہم جیسے لوگوں کو سوٹ نہیں کرتا لیکن میں تو بہر حال، ہم بھی انسان۔ آپ بتائیں، کیا آپ کا دل نہیں کاٹا ان جھوٹے چھوٹے بچوں کی سونڈ لٹائیں اور پھر بے ہوش ہوئے ہوئے دیکھ کر؟ لیکن میڈیا والے ہم سے ایسا رویہ رکھتے ہیں جیسے یہ سب کچھ ہم نے اپنے ہاتھوں سے کیا ہو۔ پولیس کیا کر رہی ہے؟ حادثے کا ذمے دار کون ہے؟ اس واقعے کے پیچھے کوئی جہادی تنظیم ہے یا پڑوسی ملک کے دہشت گرد؟ ہر سوال کا جواب آن دی اسپاٹ چاہیے ہوتا ہے انہیں۔ کیا پولیس کو الہام ہوتا ہے کہ حادثہ ہوتا ہی کھڑے کھڑے ان کے ہر سوال کا جواب دے دیں۔ اگر نہیں کسی پر شک بھی ہے تو کیا میڈیا پر ایسی باتیں بتائی جاسکتی ہیں کہ ہمارے کچھ کرنے سے پہلے ہی بھرم ہوشیار ہو جائیں۔“ حادثے کی ہولناکی، دن بھر کی بھاگ دوڑ اور میڈیا کی مسلط کردہ اعصابی جنگ نے اسے اتنا اعصاب زدہ کر دیا تھا کہ اس وقت وہ کسی طرح اپنے مزاج کی برہمی کو چھپانے میں کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔

”بانی پوتا کہ کچھ فحش ٹھنڈا ہو۔“ مختار مراد نے گلاس میں بانی اٹھیں کر اس کی طرف بڑھایا اور اثر کام پر چائے اور انیس کے لیے آرڈر دینے لگا۔ اسے مختار مراد کی ذہنی کیفیت کا مکمل ادراک تھا۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ ایک ایسا شخص جس نے حال ہی میں اپنی نوجوان بیٹی کو کھو یا تھا، معصوم بچوں کے کئے چھنے جسم دیکھ کر کس ذہنی و فکری اذیت سے گزر رہا ہوگا۔ خود وہ بھی بری طرح ڈسٹرب ہو ا تھا لیکن کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھالے ہوئے تھا۔

”سوری! میں کچھ جذباتی ہو گیا تھا۔“ اس کے مشورے پر گلاس بھر پانی پینے کے بعد مختار مراد زرا ٹھنڈا ہوا تو شرمندگی سے بولا۔

”کوئی بات نہیں، سمجھی نہ سمجھی ہم میں سے ہر ایک پر یہ

وقت ضرورت آتا ہے جب وہ اپنے عہدے اور فرائض سے ہٹ کر ایک عام انسان کی طرح ری ایکٹ کرنے لگتا ہے۔ تربیت اپنی جگہ لیکن اپنے جذبات کو کنٹرول کرنے سے انکار نہیں کرتا۔ یہاں پر محض اس کے لئے مخصوص نمبر سے ہونے والے انداز میں اسے جواب دیا۔ اسی وقت دروازے پر دستک کی آواز ابھری اور ایک ملازم اجازت ملنے پر چائے اور اسٹیکس سے بھری ہوئی ٹرائی لیے اندر داخل ہوا۔ ملازم کے ٹرائی پہنچا کر وہاں پہلے جانے تک کمرے میں مکمل خاموشی رہی۔ وہ واپس چلا گیا تو مختار مراد نے گفتگو کا سلسلہ ایک بار پھر جوڑا۔

”میں تمہاری کیفیت کو بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ میڈیا والے بعض اوقات واقعی بہت زیادہ زیادتی کر جاتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم بھی آپ سے باہر ہو جائیں۔ جس طرح کی جذباتیت کا مظاہرہ تم ابھی میرے سامنے کر رہے تھے، اگر کسی نیوز چینل کے نمائندے کے سامنے گردینے تو اس کا انجام جانتے ہو؟ ہمارے ہاں پہلے ہی پولیس سے بڑھ کر ناقابل اعتنا کوئی ادارہ یا فرد نہیں۔ تم میڈیا کے خلاف کچھ الٹا سیدھا کہہ دیتے تو ہر طرف سے لوگ پچھے پچھے جھانک کر تمہارے پیچھے پڑ جاتے۔ پہلے ہی تمہاری پوزیشن کافی نازک چل رہی ہے۔ خوبصورت سرائی والے معاملے میں تمہارا نام سر فہرست ہے۔ پولیس کھڑی میں جو خوبصورت امارا گیا، اس کے بارے میں ہی ہم ابھی تک میڈیا کے شکوک و شبہات دور نہیں کر سکے۔ ایسے حالات میں اگر تم نے میڈیا کے خلاف کچھ بول دیا تو وہ لوگ تمہیں چھوڑیں گے کیا؟ وہ تو تمہارے اگلے پچھلے سارے کھاتے کھول کر بیٹھ جائیں گے۔“ اس کا کہا ایک ایک لفظ اپنی جگہ درست اور جبری حقیقت تھا۔ مختار مراد نے پہلے ہی اپنی جذباتیت کا احساس ہو چکا تھا، کچھ اور بھی شرمندہ ہو گیا۔

”آپ جانتے تو ہیں اگلے کل میں ہینا والا کیس ابھی تک حل نہ ہونے کی وجہ سے کتنا پریشان ہوں۔ ابھی تک اس معاملے میں کوئی حتمی بات معلوم نہیں ہو سکی۔ اوپر سے ان ہم دھماکوں نے ابھی کر رکھا ہے۔ مارکیٹ والے بلاست پر کتنا کام کیا میری ٹیم نے لیکن کیا معلوم ہوا؟ اتنی جدوجہد کے بعد صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ جس دکان میں رہ کر ہمارا گھبراہٹ ہوا بلاست سے پہلے وہ ایسی لڑکیوں کو جانتے دیکھا گیا تھا جن میں سے ایک کے ہاتھ میں بھاری بیگ تھا۔ نہ لڑکیوں کو کوئی جانتا تھا اور نہ ہی کوئی ان کا حتمی حلیہ بتا سکا۔ خفیہ اداروں

نے بھی کوئی ایسی بات نہیں بتائی جس سے کیس کو حل کرنے میں مدد ملے یا تحقیق کی گاڑی آگے بڑھانی جاسکے۔ اب آج والے بلاست میں بھی دو مشکوک عورتوں کا ذکر سننے میں آیا ہے۔ ہم اسکول کی جس دیوار کے ساتھ رکھا تھا، اس کے ساتھ کچرا گھر ہے اور بلاست سے پہلے وہاں کچرا چھنے والی دو عورتوں کو جانتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ پولیس کے مختار آج سارا دن ان لوگوں کے درمیان دونوں عورتوں کی بوسہ کھاتے ہوئے پھرتے رہے ہیں، لیکن سے کوئی کچھ نہیں ملا۔ بات ویسے بھی سمجھ آتی ہے۔ یقیناً کچرا چھنے والی عورتوں کا گیٹ اب دہشت گردوں نے گور کے لیے استعمال کیا تھا۔ اب وہ عورتیں آرام سے اپنے کسی ٹھکانے پر بیٹھی ہوں گی اور ان کی وی خبریں دیکھ کر ہماری بے بسی اور اپنی کامیابی پر تعجب لگا رہی ہوں گی۔“ اپنے رویے کی وضاحت پیش کرتے ہوئے وہ ایک بار پھر نہ چاہتے ہوئے بھی جذباتی ہو گیا۔

”ان معاملات میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے، ایسے کام کرنے والا احتیاط سے کام تو لے گا۔ مجرم خود تو اپنے آپ کو قہالی میں جک کر ہمارے سامنے پیش نہیں کر سکتا۔ اس قسم کے خصوصی کیسز میں تو ویسے بھی حالات بہت پیچیدہ ہوتے ہیں۔ اکثر تو سارے کیسز بھی مل جاتے ہیں اور مجرم کی شناخت بھی ہو جاتی ہے لیکن مصعقوں اور مجبوروں کی وجہ سے کچھ بھی سامنے نہیں لایا جاسکتا۔ تم نے تو ایک طویل وقت گزارا ہے ملازمت میں۔ تم خود یہ سارے حقائق جانتے ہو۔ میرے خیال میں تو مجھے تمہیں کچھ بھی سمجھانے کی ضرورت نہیں ہوتی چاہیے تھی۔“ مختار مراد نے گفتگو کے دوران سامنے رکھی جانے والی سینڈویچز کی پلیٹ کی طرف اسے متوجہ نہ ہوتے دیکھ کر چائے کے برتن اپنی طرف کھکے۔

”آپ رہتے دیں۔ میں بناتا ہوں۔“ اسے یک دم اپنی کوتاہی کا احساس ہوا۔ عہدے کے اعتبار سے بھی اور رشتے کے لحاظ سے بھی دونوں صورتوں میں مختار مراد اس کے لیے واجب الاحترام تھا۔ اگر تنہائی اور بے تکلفانہ ماحول درکار نہ ہوتا تو اس وقت ملازم یہ خدمت انجام دینا لیکن ملازم کی عدم موجودگی میں تو اس کا ہی فرض بنتا تھا کہ وہ اس بات کا دھیان رکھے مگر وہ اپنی الجھن میں گھر کر کوتاہی کا مرتکب ہو گیا تھا۔ اب خیال آیا تو فوراً مستعد ہوا۔

”ساتھ میں کچھ کچھ بھی لیتے تو اچھا ہوتا۔ چند گھنٹوں بعد صبح پھر بھاگ دوڑ شروع ہو جائے گی۔“ جب وہ اپنی ہائی بوٹی چائے کی پیالی میں سے گھونٹ بھر رہا تھا تو مختار مراد نے اسے ٹوکا۔

”نہیں، کچھ بھی کھانے کا دل نہیں چاہ رہا۔ چائے لی کر اب فوراً گھر کے لیے نکلوں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ مریم ابھی تک جاگ رہی ہوگی اور پریشان ہوگی۔ ہینا کے بعد اس کی ذہنی حالت بہت خراب ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کا اثر لے لیتی ہے۔ آج والا حادثہ اس کے علم میں آیا ہوگا تو بڑی طرح متاثر ہوئی ہوگی۔ میں تو سوچ رہا ہوں کہ اسے لے کر ممی کی طرف شفٹ ہو جاؤں۔ کم از کم مجھے یہ اطمینان تو رہے گا کہ میری عدم موجودگی میں وہ کسی اپنے کے ساتھ ہے۔“ ”تم ٹھیک سوچ رہے ہو۔ میرے خیال میں تو تمہیں فوراً اپنے اس فیصلے پر عمل کر لینا چاہیے۔“ مختار مراد نے اس کی بھرپور تائید کی۔

”میں ایسا ہی کروں گا۔ ابھی تو مریم کی فکر کی وجہ سے میں بہت سے معاملات اٹھو رہے چھوڑ کر گھر واپس لوٹنے پر مجبور ہو جاتا ہوں لیکن اسے ممی کے پاس شفٹ کرنے کے بعد میں پوری یکسوئی سے ہینا کے کیس کی عمرانی کر سکوں گا۔ اپنی بیٹی کے قاتلوں کو کیلبر کردار تک پہنچانے بغیر مجھے کسی صورت چین نہیں آئے گا۔ مجرم کتنے ہی طاقتور اور تھنچ والے کیونکر نہ ہوں، میں نے انہیں نیست و نابود کرنے کا عہد کر رکھا ہے۔ اس عہد کی راہ میں کوئی مصیبت اور مجبوری نہیں آسکتی۔“ اس نے اپنے عزائم کا اظہار کیا اور پیالی میں موجود آخری گھونٹ بھی اپنے حلق میں اٹھ لی کر کھڑا ہو گیا۔

مختار مراد خاموشی سے اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ اب تک جو حالات سامنے آئے تھے، ان سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ ہینا کا کل کسی عام مجرم کے ہاتھوں نہیں ہوا ہے۔ اس قتل کے ڈانڈے جن لوگوں سے جا کر مل رہے تھے، ان کے مقابل کھڑا ہونا آگ کے شعلوں میں کودنے کے مترادف تھا۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ اپنے ہی لوگ اس جنگ میں ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے لیکن وہ سجاد مراد کو روک بھی تو نہیں سکتا تھا۔ اولاً وہ جدائی کے غم سے جہل ہوا اب اس کا سینہ کسی بھی مصیبت کا پانی چھڑک کا ٹھنڈا نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بات وہ اچھی طرح جانتا تھا۔

☆☆☆

”کیسی ہیں ڈاکٹر ماریا۔ مزاج تو اچھا ہے آپ کا؟“ ”جی ہاں، میں ٹھیک ہوں۔ آپ سنائیں، آپ کا مسئلہ کیا ہوا؟“ ”اسی کے سلسلے میں آپ کا شکر یہ ادا کرنے کے لیے فون کیا تھا۔ اصولاً تو مجھے کل ہی آپ کو فون کر لینا چاہیے تھا لیکن مصروفیت ہی کچھ ایسی رہی کہ موقع نہیں مل سکا۔

فارینٹ آفیسر اقبال باجوہ کے انتقال کے بارے میں تو آپ کو علم ہے ہی۔ اس کی وجہ سے کل شیڈول سے ہٹ کر میرا آواز آنا پڑا مگر دوسرے بہت سے کام بھی دیکھتے تھے اس لیے آپ کو کال کرنے میں تاخیر ہو گئی۔“ وہ دل سے ماریا کا احسان مند تھا اس لیے شکر یہ ادا کرنے میں دیر ہو جانے پر اتنی وضاحت پیش کر رہا تھا۔

”کوئی بات نہیں اسے ہی صاحب! مجھے اندازہ ہے کہ آپ بہت مصروف آدمی ہیں اس لیے آپ سے شکوہ کرنا ٹھیک نہیں۔ آپ کا کام ہو گیا ہے، اس کا اندازہ کل ڈیرے پر آگ لگنے کی اطلاع سن کر ہی ہو گیا تھا۔ خوب سبق سکھایا آپ نے چودھری مختار کو۔ تملایا ہوا پھر رہا ہے بے چارہ۔ میرے خیال سے تو کل کا دن آپ کے لیے بہت ہی خاص تھا۔ ایک طرف چودھری کو ڈک پہنچانی تو دوسرے اس کے اہم حلیف باجوہ سے بھی جان چھوٹ گئی۔ لگتا ہے قدرت بھی آپ کا ساتھ دے رہی ہے۔ میری طرف سے ان کامیابیوں پر مبارکباد قبول کریں۔“

”بہت بہت شکر یہ لیکن سچ یہ ہے کہ مجھے باجوہ کی موت کی خبر سن کر بالکل بھی خوش نہیں ہوئی۔ میں کسی کی موت کو اپنی کامیابی تصور کر کے شادمانے نہ جانتے والا آدمی نہیں ہوں۔ ہاں، البتہ اگر باجوہ کا جرم ثابت ہو جاتا اور اسے عدالت سے سزا ملتی تو مجھے بہت خوشی ہوتی۔“ شہر یار نے سنجیدگی سے اس کی بات کا جواب دیا۔

”یہ تو اپنا اپنا نقطہ نظر ہے۔ آپ سرکاری آدمی ہیں اس لیے قانون کی برتری دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم جیسے عام لوگوں کے لیے یہی کافی ہوتا ہے کہ کسی بھی طرح کی بڑے آدمی سے نجات مل گئی۔ آپ کے بڑے اعتبارات ہیں، کوشش کیجئے گا کہ باجوہ کی جگہ کوئی ایسا بندہ آجائے جو چودھری کا پٹھو نہ بنے۔ بے کوئی ایسا شخص آپ کی نظر میں؟“ ”نی الحال تو نہیں لیکن آپ فکر نہ کریں۔ میں خیال رکھوں گا کہ نیا فارینٹ آفیسر کو ڈیڑھ گھنٹہ کا بندہ ہو۔“ اس نے ڈاکٹر ماریا کو تسلی دی۔

”ایک نام میں بھی تجویز کر سکتی ہوں۔ عابد انصاری نام ہے ان صاحب کا۔ میں جس اسپتال میں جاب کرتی تھی، ایک بار وہ اپنے پتے کے آپریشن کے سلسلے میں وہاں کچھ عرصے داخل رہے تھے۔ ان دنوں میری ان سے کافی بات چیت ہوتی تھی۔ مردم شناسی کا دعوئی تو نہیں لیکن چونکہ ڈاکٹر کی حیثیت سے دن میں بے شمار لوگوں سے ملنا پڑتا ہے، اس لیے کچھ نہ کچھ بندے کی پرکھ ہے مجھے۔ عابد انصاری صاحب کو

میں نے بہت اچھا آدمی پایا تھا۔ اپنی گفتگو سے بہت بڑھے لکھے، نفیس اور ایمان دار آدمی لگتے تھے۔ اگر ہو سکتے تو آپ انہیں ضرور آزما لیتے گا۔ ڈاکٹر ماریا نے بے حد شائستگی سے انہیں اسے مشورے سے نوازا۔

”جی ہاں، میں دھیان رکھوں گا۔ آپ یہ بتائیں کہ آپ کی والدہ کی کوئی اطلاع ملی؟ اس وقت آپ کا شکر یہ ادا کرنے کے علاوہ میرے کال کرنے کا اہم مقصد ان کے بارے میں معلوم کرنا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد کر سکوں۔ چودھری کے ایک دو خاص بندے ہیں میری نظر میں۔ ان میں سے کسی کو اپنے آدمیوں سے انھوں کو اثر پوچھ کر کہیں تو آپ کی والدہ کا پتا معلوم ہو سکتا ہے۔“

”نہیں نہیں، پلیز! ایسا کچھ مت کیجیے گا۔ اس طرح میری جان خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ آپ چودھری کے آدمیوں میں سے کسی سے اگر اس سلسلے میں تفتیش کریں تو فوراً یہ بات واضح ہو جائے گی کہ میں نے آپ کو کئی دالے معائنے کی خبر دی ہے اور مجھے یہ بات پہلے ہی سمجھا دی تھی کہ اگر میں نے کسی کو کچھ بتایا تو میری زندگی کی کوئی ضمانت نہیں۔ میں کسی کی زندگی کے لیے کوئی رسک لینے کو تیار نہیں۔ اس لیے پلیز! آپ کوئی بھی کارروائی کرنے سے گریز کریں۔ میری قسمت میں جب ہوگا، مجھے مل جائیگی۔ اب بھی تو میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ زندہ ہیں اور فون پر بھی بکھار مجھے ان کی آواز سنا دی جاتی ہے۔“ خوف زدہ سے لہجے میں اسے کوئی بھی قدم اٹھانے سے روکتے ہوئے ڈاکٹر ماریا نے اپنے انکار کی وجہ بیان کی۔

”لیکن اس طرح تو آپ نامعلوم مدت تک چودھری کے چنگل میں پھنسی رہیں گی اور وہ آپ کا جڈ پاتی و جسمانی استحصال کرتا رہے گا۔ میری مائیں تو تھوڑی سی اہم کریں اور مجھے کوشش کرنے دیں۔“ شہر یار نے اسے سمجھایا۔

”ہاں نہیں... میری امی اس دنیا میں میرا واحد رشتہ ہیں۔ میرے ساتھ چاہے کچھ بھی ہو جائے لیکن میں ان کے لیے ذرا سا بھی رسک لینا پسند نہیں کروں گی۔ اگر آپ نے زبردستی اپنی مرضی سے کچھ کرنے کی کوشش کی تو میرے تعاون سے محروم ہو جائیں گے۔ اپنی امی کی حفاظت کے لیے میں آپ کا ساتھ چھوڑ کر چودھری انفرادی صف میں بھی کھڑی ہو سکتی ہوں۔ یہ بات اچھی طرح یاد رکھیے گا۔“ ڈاکٹر ماریا کا لہجہ کچھ دھمکی آمیز ہو گیا لیکن شہر یار نے برا نہیں مانا۔ وہ جانتا

تھا کہ ماریا بہت خوف زدہ ہے اور کسی بھی صورت اسے اس کے ارادے سے باز رکھنا چاہی ہے اس لیے اس طرح کی باتیں کر گئی ہے۔

”اے ڈاکٹر ماریا... رہیں! آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ کی اجازت کے بغیر اس معاملے میں دخل اندازی نہیں کروں گا۔“ اس نے ماریا کو بل دی۔

”تھیک پو اے سی صاحب! مجھے اُمید ہے کہ آپ میری باتوں کا برا نہیں منائیں گے۔ آپ میری پوزیشن کچھ سمجھ سکتے ہیں۔ میں درندوں کے زرخے میں پھنسی ایک تباہ لڑکی ہوں اور ایسی کوئی غلطی نہیں کرنا چاہتی جو مجھے ناقابل تلافی نقصان سے دوچار کر دے۔ لیکن آپ سے میرا وعدہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے گا آپ کی مدد کرنی رہوں گی۔“ اس کی سلی پر مطمئن ہو کر وہ اپنے تعاون کی یقین دہانی کروانے لگی۔

”جیسی آپ کی مرضی۔ میں بہر حال، ہر وقت آپ کی مدد کرنے کے لیے تیار ہوں۔ آپ جب چاہیں مجھے فون کر سکتی ہیں۔“ اس نے ڈاکٹر ماریا کو جواب دیا اور ایک دو روایتی الوداعی جمنے ادا کرتے ہوئے رابطہ قطع کرنے کے بعد ایک گہرا سانس لیا۔ چودھری کے جرائم اور مظالم کی کئی داستانیں سامنے ہونے کے باوجود وہ ابھی تک کوئی ایسا ثبوت حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا کہ اس کے خلاف ٹھوس اقدامات اٹھا سکے۔ چودھری کا اثر و رسوخ اور دہشت قدم قدم پر رکاوٹ بن کر سامنے آ جاتی تھی۔

☆ ☆ ☆

”آپ کا شک درست لگا۔ چودھری صاحب! آپ کے ذریعے پر کارروائی کرنے والا شخص یعنی طور پر اے سی شہر یار ہی تھا۔ میں نے اپنے ذرائع سے معلومات حاصل کی ہیں۔ اس بات کی تصدیق ہو گئی ہے کہ جس رات ڈیرے پر کارروائی ہوئی، اس رات اے سی نے اپنے بیٹے پر ایک موٹر سائیکل چوری جیسے منگوائی تھی اور صبح دو بندہ جس کی موٹر سائیکل تھی، اسے بیٹے سے واپس لے گیا تھا۔ موٹر سائیکل کی حالت دیکھ کر ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس پر طولیں سفر کیا گیا ہے۔ وہ بھی کچے کچے، میز سے میز پر ہوتے رہے۔“

”تو پھر آپ کارروائی کریں یا نہیں بی صاحب! آپ کے پاس ثبوت ہے تو پھر آپ چاہیں تو اے سی کو گرفتار بھی کر سکتے ہیں۔ میں نے ابھی تک ایف آئی آر میں کسی شکوکہ بندے کا نام نہیں لکھوایا۔ آپ کہیں تو اب اے سی کا نام لے لیتا ہوں۔“ اس نے تارڑ کی فراہم کردہ اطلاع سن کر چودھری

اپنی جگہ سے اچھل پڑا اور پُر جوش لہجے میں اسے مشورے سے نوازتے ہوئے خود بھی آگے کی منصوبہ بندی کرنے لگا۔

”ایسا نہیں ہو سکتا چودھری صاحب! ہمارے سارے ذرائع ایسے نہیں ہوتے کہ ہم انہیں عدالتوں میں گواہ بنا کر کھڑا کر سکیں۔ بس آپ سمجھیں کہ یہ آف دی ریکارڈ معلومات ہیں جو میں نے آپ تک پہنچائی ہیں۔ اگر میں نے کسی طرح خبری کرنے والے کو عدالت میں گواہی دینے پر مجبور بھی کر دیا تو بھی ہم اے سی کو نہیں گھیر سکیں گے۔ وہ کہہ دے گا کہ ہاں، میں نے اس رات اپنے بیٹے پر ایک موٹر سائیکل منگوائی تھی اور رات بھر اس پر ارد گرد کے علاقے میں گھومتا رہا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں چودھری افتخار کے ذریعے پر آگ لگانے بھی جا پہنچا تھا۔ کیا وہاں کوئی ایسا ثبوت ملے جس سے میری آمد ثابت ہو سکے؟ چودھری یا اس کے کسی بندے نے اپنی آنکھوں سے مجھے وہاں آتے دیکھا تھا؟ اگر دیکھا تھا تو پہلے ہی دن کیوں نہ بتا دیتا؟“

”اس کا مطلب ہے کہ آپ کی تصدیق کے باوجود میں اس اے سی کے بیچے کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ آپ کی دی ہوئی انفارمیشن آف دی ریکارڈ ہی رہے گی اور اس سے مجھے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔“ تارڑ کے انکار اور دلائل نے چودھری کو کھچلا ہٹ میں جتا کر دیا۔

”اب ایسی بھی بات نہیں ہے کہ آپ کو اس انفارمیشن سے کوئی فائدہ ہی حاصل نہ ہو۔ کم از کم آپ اے سی پر دباؤ تو ڈلوای سکتے ہیں۔ فون کریں اس کے امم این اے ماموں کو اور بتائیں کہ اس کا بھانجا یہاں کیا کچھ کرتا پھر رہا ہے۔ ساتھ یہ احسان بھی جتا دیں کہ سب کچھ جانتے ہو جتنے میں صرف آپ کے لحاظ میں آپ کے بھانجے کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر رہا۔ ابلیقت رانا خود اپنے بھانجے کو سمجھالے گا کہ چودھری سے زیادہ پیگا نہ لو۔ مجھے یقین ہے کہ اے سی صاحب کم از کم اپنے ماموں کے علم میں تصویریں دانی بات لانا پسند نہیں کریں گے کیونکہ اس میں انہیں ڈر ہوگا کہ جانے ماموں یقین کریں یا نہ کریں... انا اپنا کردار مشکوک ہو جائے۔“ تارڑ نے شہر یار انداز میں چودھری کو صلاح دی تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔

”مجھ تو تھوڑی ہانگ ٹھیک ہے ایس بی صاحب! چلیں تو فیروا یہاں کرتے ہیں۔ کچھ دن تو وہ بلوگڑا آرام نال بیٹھے گا۔“ آخر اس نے تارڑ کا مشورہ قبول کر لیا۔

”آپ نے ہانگ ٹھیک فیصلہ کیا ہے چودھری صاحب! ان سیاست دانوں اور بیوروکریٹس سے ذرا مختلف

انداز میں منہ پر تپا ہے۔ ان لوگوں کے معاملے میں ڈائریکٹ ایکشن سے زیادہ اس طرح کی چال بازیوں سے کام لینا مناسب رہتا ہے۔ کیونکہ صاف بات ہے کہ ہم انہیں آسانی سے اپنے راستے سے ہٹا نہیں سکتے، اس لیے بہتر ہے کہ تھوڑی نرمی، تھوڑی گرمی کے ساتھ معاملات چلاتے رہیں۔“ ایس بی نے اس کے فیصلے کو سراہتے ہوئے اسے مزید سمجھایا۔

”آپ کا مشورہ ہے تو ہم ماننے سے انکار کیسے کرتے، پر یاد رکھیے گا کہ جلد ایسا کوئی موقع دوبارہ آئے گا جب آپ کو ہماری طرف کی بات جاننے کے بعد اے آف دی ریکارڈ رکھنا ہوگا۔“ چودھری نے ممتی خیر لہجے میں کہا تو تارڑ الجھ گیا۔

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا چودھری صاحب؟“ اس نے تاحی کے انداز میں وضاحت چاہی۔

”کل یہ ہے ایس بی صاحب کہ وہ لڑکی ماہ بانو ابھی تک ہمارے دل میں پچاس بن کر چبکی ہوئی ہے۔ جب تک ہم اسے پانچیں میں گئے، چھین نہیں آئے گا... لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ماہ بانو کا پتا اپنے اے سی صاحب کے سوا کسی کو معلوم ہی نہیں۔ میرے بندوں نے اس کے اسٹاف کو بڑا نٹوڑا۔ رشوت، دھونس، دھمکی سارے حربے آزمائے، پر کہیں سے کچھ معلوم نہیں ہوا... جس کا مطلب ہے کہ کسی کو کچھ معلوم ہی نہیں ہے۔ اب میرے پاس آخری حل یہی ہے کہ اے سی سے ماہ بانو کا پتا انگوڑوں... پہلے سوچا تھا کہ تصویریں والے معاملے میں اسے ہلک سیل کر کے اور کاموں کے ساتھ یہ کام بھی لگوا لوں گا، پر تصویریں تو نکل گئیں تاحہ سے۔ اب میں ایسا سوچ رہا ہوں کہ یہ اپنے اے سی صاحب گڈی میں بیٹھ کر بہت ادھر ادھر وڈیں لگاتے پھرتے ہیں۔ کسی دن موقع دیکھ کر انہیں اپنے کسی ٹھکانے پر پہنچا دوں۔ کچھ دن آرام بھی کر لیں گے اور ہمیں ماہ بانو کا پتا بتا دیں گے۔ اب آپ بتائیں کہ یہ معاملہ آف دی ریکارڈ رہے گا کہ نہیں؟“ چودھری نے اپنا پورا منصوبہ ایس بی کے سامنے رکھتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

”یہ ذرا خطرناک کام ہو جائے گا چودھری صاحب! بہر حال، آپ اتنا اطمینان تو رکھیں کہ میرا تعاون آپ ہی کے ساتھ ہوگا لیکن جلد بازی سے کام مت کیجیے گا۔ کچھ دن انتظار کریں، ہو سکتا ہے کسی اور ذریعے سے لڑکی کے بارے میں معلوم ہو جائے۔ وہ اس کے ماں باپ... اور ایک بہن بھی تو ہے یہاں۔ ممکن ہے کسی مرد لڑکی خود اپنے رشتے داروں سے رابطہ کرے۔ آپ ان لوگوں پر نظر رکھو امیں تو میرے خیال

میں آپ کا مقصد زیادہ آسانی سے پورا ہو جائے گا۔“ ایس پی کے مشورے نے چودھری کو یاد دلایا کہ وہ ایک عرصے سے ماہ بانو کے ماں باپ کو فراموش کیے بیٹھا ہے، وہ دونوں کیا کر رہے ہیں اور کیسے ان کا گزارہ ہو رہا ہے، کچھ معلوم ہی نہیں؟ اس نے فوراً ان معلومات کے حصول کے لیے فشی اللہ رکھا کھانا آوازی۔

”حکم سرکار!“ فشی اس کی پکار پر فوراً اوجھل کے جن کی طرح حاضر ہوا۔

”غیاثے اور نوران کی کیا خبر ہے؟ زندہ ہیں کہ مر کھپ گئے ہیں؟“

”زندہ ہیں سرکار... پر مردوں جتنی حالت میں۔ نوران تو اپنے پتر کی موت کے بعد حواسوں میں ہی نہیں رہی۔ سارا دن گاؤں میں ماری ماری پھرتی ہے۔ غیاثا سے پکڑ پکڑ کر گھر لے جاتا ہے۔ اس کا اپنا حال بھی اچھا نہیں۔ ایک تو اکلوتے پتر کی موت کا غم، اس پر سے گھر والی کی حالت۔ سالا کی کام جو گا نہیں رہا۔ سنا ہے اسے اسی کے دفتر سے اس کے گھر کے لیے مہینے کا راشن جاری ہو گیا ہے۔ اسی پر گزر رہے ہو رہی ہے۔“ فشی کی معلومات ہمیشہ اپ نوڈٹ ہوتی تھیں اسی لیے تو وہ چودھری کے اتنے قریب تھا۔ اس وقت بھی اس نے اس کے سوال کا بھرپور اور تفصیلی جواب فراہم کر دیا تھا۔

”ٹھیک ہے، تو جا۔“ چودھری نے اسے رخصت دی اور ایک بار پھر تارڑ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”آپ نے سنا تارڑ صاحب! فشی کیا کہہ رہا تھا؟ ان باتوں کو سن کر تو مجھے نہیں لگتا کہ ان لوگوں کی نگرانی کروانے سے کچھ حاصل ہوگا۔ ویسے بھی ماہ بانو اپنے ماں پیو سے ناراض تھی، وہ ان سے رابطہ کیوں کرے گی؟“

اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کے دادا اور لالچ میں آکر غیاث اور نوران نے ماہ بانو کی اس سے شادی کا جو فیصلہ کیا تھا، وہ ماہ بانو کو اپنے ماں باپ سے بدگمان کر گیا تھا۔ اس لیے اس بات کا امکان ذرا کم ہی تھا کہ وہ اپنے ماں باپ سے دوبارہ رابطہ کرنے کی کوشش کرے۔ اسے رابطہ کرنا ہوتا تو اپنی بڑی بہن اور بھائی کی موت کے موقع پر کرنی لیکن جب وہ اتنے نازک مواقع پر خاموش رہی تھی تو اب کس لیے ان سے رابطہ کرے خود کو مضطر پر لانے کا خطرہ مول لیتی؟

”اگر یہ معاملہ ہے تو پھر آپ جو مناسب سمجھیں وہ کریں لیکن ذرا باتھ بیٹھ کر صفائی کے ساتھ... اور ہاں، کچھ کرنے سے پہلے مجھے ضرور مطلع کر دیجیے گا۔ میں بھی کچھ

انتظامات کروں گا۔ خصوصاً ڈی ایس پی منظور کو اس موقع پر ادھر ادھر کرنا ہوگا۔ پچھلے دنوں بڑی چمچ گیری کرتا رہا ہے وہ اسے سی کی۔ یقیناً اسے سی کو استعمال کر کے میری جگہ خود ایس پی بننے کے خواب دیکھ رہا ہوگا۔ بہر حال، میں نے بھی کوئی بجٹی گولیاں نہیں کھلی ہیں جو اسے اس کے مقصد میں کامیاب ہونے دوں۔ خواب ہی دیکھتا رہ جائے گا وہ ایس پی بننے کے۔“ تارڑ نے بھی اپنے اندر چلتی ڈھکی کا اظہار کیا۔

”گزر زیادہ مسئلہ ہے تو مجھ سے کہیں، میں کام ہی تمام کروا دیتا ہوں آپ کے دشمن کا۔ ہمارے ہوتے ہمارے دوستوں کو کوئی پریشانی ہو، ہمیں ذرا اچھا نہیں لگتا۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ باجوہ کا کتنا ساتھ دیا ہم نے۔ ہمارے ہی تعاون کی وجہ سے وہ مشکوک ہونے کے باوجود سلاخوں سے باہر بیٹھا تھا۔ دیکھا جائے تو ہمارے کام کا بھی نہیں رہا تھا، فیر بھی ہم اس سے آخری دم تک دوستی نبھاتے رہے۔“ تارڑ کو پیش کش کرتے ہوئے چودھری نے ایک ایسا حوالہ دیا جو خود تارڑ کے لیے معنا بننا ہوا تھا۔ باجوہ کی موت طبعی تھی اس کے باوجود جانے کیوں اس کے دل میں کھٹک سی تھی۔ شاید اس کی وجہ وہ ملاقات تھی جس میں اس نے چودھری سے باجوہ کے خدشات کو دھسکس کیا تھا اور جو اب چودھری نے بہت عجیب و غریب رویہ اپنایا تھا پھر باجوہ کی موت والی رات اس کے بچنے پر پالے کا ہونا بھی بڑا معنی خیز تھا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ مگر کڑھت میں موجود دونوں ڈاکٹرز نے موت کی وجہ رپٹ ٹیل بتائی تھی۔ وہ ڈاکٹرز کے بیان پر مکمل اعتماد نہیں کر سکتا تھا کیونکہ جانتا تھا کہ ڈاکٹرز کو خبر یہ لینا چودھری کے لیے کوئی مشکل بات نہیں مگر ڈاکٹرز کے بیان کو چیلنج کر کے زبردستی باجوہ کا پوسٹ مارٹم کروانا بھی اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس کی ایسی کوئی کوشش چودھری کو بھڑکا سکتی تھی۔ وہ چودھری کو بھڑکا کر اپنے لیے مصیبت میں مول لے سکتا تھا۔ اس لیے وقتی طور پر خاموش ہو گیا تھا مگر اس صورت حال میں اس کے لیے چودھری پر پہلے جیسا اعتماد کرنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ اس کے دل میں ذرا سا پیدا ہو گیا تھا کہ کسی روز وہ بھی باجوہ جیسے انجام سے دوچار ہو سکتا ہے... وہ بھی صرف اس وجہ سے کہ چودھری کو محسوس ہونے لگے کہ وہ اس کے لیے اب مفید نہیں رہا۔

”کیا ہوا ایس پی صاحب! کس سوچ میں پڑ گئے؟“ اسے غائب دماغ پا کر چودھری نے اسے ٹوکا۔ ”کچھ نہیں، بس باجوہ کا خیال آ گیا تھا۔ اچھی سیٹنگ بنی ہوئی تھی اس کے ساتھ۔ اب نہ جانے اس کی جگہ جو نیا

فاريسٹ آفيسر آئے، وہ کيسا بندہ ہو؟ ہم سے تعاون کرے يا نہیں؟ پہلے ہی اسے کی وجہ سے بڑی خراب ہو رہا ہے۔ اگر فاريسٹ آفيسر بھی کوئی اس کا جوڑی دار آگيا تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔

اپنی اصل قلبی کیفیات چھپاتے ہوئے تارڑ نے بات بنائی جسے سن کر چودھری مسکرا ديا اور خوش دلی سے بولا۔ ”تشی کیوں فکر کرتے ہو ایس کی صاحب! میں ہوں نا۔ میں اپنا پورا زور لگا دوں گا کہ نيا فاريسٹ آفيسر اپنے مطلب کا بندہ ہو۔ اللہ نے چاہا تو آنے والا باجوہ سے زيادہ کام کا بندہ نکلے گا۔“ وہ جو شیطان کا پیر و کار تھا، اپنے پیدائشی مسلمان ہونے کا فائدہ اٹھا کر بڑے دھڑلے سے اپنے مذموم مقاصد کی کامیابی کے لیے اللہ کا نام استعمال کر رہا تھا۔ یہ سوچتے سمجھتے بغیر کہ اللہ بھی کبھی ظالم کا ساتھ نہیں دیتا، بس کبھی بھی اس کی رنج و راز کر دیتا ہے۔

☆☆☆

”تم بہت خوب صورت ہو گل بیٹا! تمہارے بال تو بہت ہی پیارے ہیں۔“ گل بیٹا دھوپ میں بیٹھی اسے کیلے بالوں میں گھسٹتا کرتے ہوئے انہیں شگ کرنے کی خوش گھسی کر رہی تھی۔ ماہ بانو کی اس پر نظر پڑی تو اس کے قریب چلی آئی اور بڑی بے ساختگی سے اس کی تعریف کرنے لگی۔ وہ بے یہ بات اپنی جگہ بالکل سچ تھی کہ بالوں کو میٹھ جیوں کی شکل میں باندھ کر قدرے میلے سے چلبے میں رہنے والی گل بیٹا اس وقت واقعی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ آج اس کے بھائی کی برات تھی اور اس خوشی میں جانے کتنے دنوں بعد اس نے غسل کی رحمت کی تھی۔ اس کا دھلا دھلا یا اور تر و تازہ وجود بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔

”بال سکھانے کے بعد کیا تم دوبارہ ان کی میٹھ جیوں بنالو گی؟“ وہ گل بیٹا کے برابر میں ہی بیٹھ گئی اور اس کے نرم ریشمی بالوں کو چھوتے ہوئے پوچھا۔ ویسے اسے گل بیٹا کے جواب کا پہلے ہی سے اندازہ تھا۔ اس نے گل بیٹا سمیت یہاں تمام خواتین کو ایسی ہیئر اسٹائل میں دیکھا تھا جبکہ بچوں کے سروں پر مونا ستر اچھا ہوا تھا۔

”بالوں کی میٹھ جیوں نہیں بنائے گا تو کیا کرے گا؟“ ادھر اس کے بغیر گزارہ نہیں ہوتا۔ ”اس کی توقع کے مطابق گل بیٹا نے اسے جواب دیا۔ وہ ”کیوں“ کا سوال اٹھاتے

اٹھاتے ایک دم چپ ہو گئی۔ اسے یاد آگيا تھا کہ پانی کی قلت اور موسم کی سختی کا شکار ان علاقوں اور پنجاب کے میدانوں میں بڑا فرق ہے۔ جغرافیائی تقرباتی ماحول اور مزارع میں بھی تبدیلی پیدا کر دیتی ہے۔ ہوشے کی گل بیٹا پنجاب کی ماہ بانو کی سی عادات کی مالک نہیں ہو سکتی، البتہ فطرت دونوں کی ایک تھی۔ گل بیٹا مشاہیرم کے دامن میں واقع جس ہوشے میں رہتی تھی، وہاں سیکڑوں مسائل تھے۔ سال کی ایک فصل، پھل دار درختوں کی کمی، شدید برف باری، لکڑی کی قلت... جانے کون کون سے مسائل تھے جن کا اسے سامنا تھا پھر بھی وہ مطمئن تھی اور اپنی مٹی سے محبت کرتی تھی۔ ماہ بانو نے یہ سارے مسائل نہیں دیکھے تھے لیکن ایک دردناک صفت انسان کے ہاتھوں اس بڑی طرح ستائی تھی کہ اپنا علاقہ چھوڑ کر ان پہاڑوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئی تھی لیکن وہاں پلٹ کر جانے کی خواہش اب بھی دل میں موجود تھی۔ اس خواہش کے پیچھے یقیناً وہی فطری محبت تھی جو ہر انسان کو اپنے گھر سے ہوتی ہے۔ انسان کہیں کا بھی ہو، ماضی سے اسے آگاہ نہیں کر سکتا۔

”کیا سوچتا ہے؟“ اکرم خان تار بٹا ہاتھ کر تم ادھر لاہور سے آیا ہے۔ ادھر اور ادھر میں تو بڑا فرق ہے۔ تم رہ لے گا ادھر؟“ ماہ بانو کو خاموشی پا کر اس نے خود گفتگو آگے بڑھائی۔ ”کیوں نہیں، آخر مشاہیرم خان بھی تو یہاں سے جا کر وہاں رہ رہا ہے۔... اور بھی کتنے لوگ رہتے ہیں۔ جب یہاں والے وہاں جا کر رہ سکتے ہیں تو میں کیوں یہاں نہیں رہ سکتی؟“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”وہ انگ بات ہے۔ یہاں سے لوگ تعلیم اور روزگار کے لیے جاتا ہے، یہاں زندگی بڑا سخت ہے۔ باہر سے لوگ یہاں گھونٹنے پھرنے تو آ سکتا ہے لیکن رہنے کے لیے نہیں۔“ گل بیٹا کے اداس لہجے میں یہی گئی بات میں دلیل تھی۔ اس سے قبل کہ وہ کچھ کہتی، کچھ لوگوں کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ یوں لگتا تھا کہ بہت سے افراد مل کر کسی بات پر بحث کر رہے ہوں۔ بولنے والے سب مرد تھے چنانچہ وہ خواہش کے باوجود بھی گھر کے اس حصے کی طرف نہیں جا سکی۔ گھر میں موجود دیگر خواتین کے چہروں پر بھی تشویش نظر آرہی تھی۔ آخر شور کچھ تھا اور اکرم خان اس طرف آتا نظر آیا۔

”کیا ہوا، سب خیر تو ہے نا؟“ اس نے سب سے پہلے آگے بڑھ کر اکرم خان سے سوال کیا۔

”دہن کے گھر سے آدمی آیا تھا۔ دہن کے باپ نے کہلویا ہے کہ دن ہزار کا اور بندوبست کرو نہ لگا کچ نہیں ہو

گا۔“ اکرم خان نے پریشانی سے بتایا۔ اس جواب پر باقی خواتین تو آپس میں جھگڑیوں اور تھروں میں مصروف ہو گئیں لیکن اس کی حیرانی سونچتی۔

”کیا مطلب؟ کیسے دس ہزار؟“

”ہمارے ہاں رواج ہے کہ لڑکا شادی سے پہلے دہن کے باپ کو رقم دیتا ہے۔ میرے ماموں زاد نے بھی اپنے سر کور دیا ہے لیکن اب وہ دس ہزار اور مانگتا ہے۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ ایک بار جو بات ہو جائے تو اس کے بعد کوئی اپنی زبان نہیں بدلتا، پر اس خانہ خراب کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے؟ ابھی تو ہم نے بڑی مشکل سے سب کو سمجھا بھگا کر چپ کر دیا ہے کہ ذرا آرام سے مل بیٹھ کر اس مسئلے کا حل سوچتے ہیں لیکن ہم کو معلوم ہے کہ زیادہ دیر تک کوئی چپ نہیں رہے گا اور خاندانہ (خوخواہ) لڑائی شروع ہو جائے گا۔“ اکرم خان جو کچھ بتا رہا تھا اس کی روشنی میں یہی سمجھ آ رہا تھا کہ دہن کے باپ نے مین وقت پر ایک بالکل ناز یا مطالبہ کیا ہے جس کے نتیجے میں اچھا بھلا شادی کا گھر دنگ بن سکتا تھا۔ ماہ بانو اپنی نرم طبیعت کے باعث یہ ساری صورت حال جان کر پریشان ہو گئی۔ پھر ایک دم اس کے ذہن میں ایک خیال نکلی گی طرح کو نکلا۔

”بھائی اکرم! تم مجھے دہن کے گھر لے چلو۔“ وہ ذہن میں خیال آتے ہی اس نے اکرم خان سے مطالبہ کیا۔

”لیکن تم وہاں جا کر کیا کرے گا؟“ اکرم خان اس مطالبے پر حیران ہوا۔

”جو بھی کروں گی تم اسے چھوڑ دو۔ بس مجھے وہاں لے چلو۔ میرے جانے سے شاید یہ مسئلہ بغیر کسی لڑائی جھگڑے کے ختم ہو جائے۔“ اس نے اپنی بات پر زور دیا۔

”ہماری تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ تم کیا کرنا چاہ رہا ہے؟“ اکرم خان مذہب کا شکار تھا۔

”وہ تم میرے ساتھ چلو گے تو دیکھ لینا لیکن پہلے مجھے لے کر تو چلو۔“ اس نے تھوڑی سی ہتھکڑا ہٹ کا مظاہرہ کیا۔

”ٹھیک ہے۔ ہم لے چتا ہے لیکن دھیان رکھنا کہ تم ادھر اجنبی ہے۔ ادھر کے رواجوں کو جاننا نہیں ہے۔ کچھ انا سیدھا ہو گیا تو ہمیں بڑا مشکل ہو جائے گا۔ ہم نے مشاہیرم خان کے صاحب سے تمہاری حفاظت کا وعدہ کیا ہے۔“ وہ راضی تو ہو گیا لیکن پریشان تھا۔

”ایسا کچھ نہیں ہوگا، تم بے فکر ہو۔“ ماہ بانو نے اسے تسلی دی اور ایک منٹ انتظار کرنے کا کہہ کر اندر کمرے میں چلی گئی۔ کمرے سے باہر آئی تو اس نے اپنی مخصوص سیاہ چادر

اوڑھ رکھی تھی۔ تازہ صورت حال پر تبصرے میں مصروف خواتین کو اس کے اور اکرم خان کے درمیان ہونے والی گفتگو کا علم نہیں ہو سکا تھا۔ ان دونوں کو باہر جاتے دیکھ کر وہ چونک گئیں۔

”ہم لوگ ابھی تھوڑی دیر میں واپس آتا ہے۔“ سوالات کرنے والوں کو یہ مختصر جواب دے کر اکرم خان اسے لیے گھر سے باہر نکل گیا۔ گاؤں بہت مختصر تھا۔ بس چند گھنٹوں ہی میں جن میں کچھ کے مکان تھے۔ ہر گئی کے بعد ایک اترائی آتی اور پھر کھیت شروع ہو جاتے۔ اس مختصر سے گاؤں کو البتہ یہ اعزاز حاصل تھا کہ دنیا بھر سے آنے والے پہاڑوں کے عاشق اسے محبوب یعنی پہاڑوں تک پہنچنے سے قبل کچھ دیر اس کی خیمہ گاہ میں ضرور ٹھہرتے تھے اور پھر واپسی میں بھی جب وہ محبوب کو سر کرنے کے نشے میں چور ہوتے تھے، ہوشے کی قدم پوئی کرتے ہوئے ہی واپس جاتے تھے۔ وہ دونوں بھی اس بے ظاہر چھوٹے گھر درحقیقت عظیم ہوشے کی گھنٹوں میں قدم رکھتے چند منٹوں میں دہن والوں کے گھر پہنچتے۔ اکرم خان کی، وہ بھی ایک اجنبی لڑکی کے ساتھ آمد کو وہاں بہت عجیب سے دیکھا گیا تاہم کسی نے کوئی سوال نہیں کیا اور اکرم خان کی خواہش پر انہیں دہن کے باپ سے ملوا دیا گیا۔

”ہمیں آپ کا پیغام ملا تھا۔ اس پیغام کو سننے کے بعد ہی میں بھائی اکرم سے اصرار کر کے آپ سے ملنے کے لیے آئی ہوں۔“ ماہ بانو نے خودی گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے بھاری آوٹی لہاؤں کے ساتھ سر سفید آوٹی ٹوپی پہنے دہن کے بوڑھے باپ کو بتایا۔ جواباً وہ کچھ بولا لیکن صرف سوالیہ نظروں سے اس طرح اس کی جانب دیکھتا رہا جیسے اس کے چہرے سے اسے پیغام کا رد عمل جاننا چاہتا ہو۔

”مجھے آپ کے رواجوں کا علم نہیں۔ بھائی اکرم خان نے البتہ اتنا ضرور بتایا ہے کہ ایک بار جو بات ملے ہو جائے اس کے بعد کوئی فریق اپنی زبان سے نہیں بھرتا۔ آپ نے پیغام بھیج کر مزید دس ہزار کا مطالبہ کیا ہے اس کے پیچھے یقیناً آپ کی کوئی مجبوری ہوگی۔... نہ تو تھوڑے، آپ اپنی روایت کے خلاف کیوں جاتے؟ میں اس وقت آپ سے آپ کی مجبوری کے بارے میں پوچھنے نہیں آئی ہوں۔ میں آپ کو یہ دس ہزار دے آئی ہوں تاکہ آپ کا مسئلہ بھی حل ہو جائے اور سب کی خوشی بھی قائم رہے۔“ اس نے اب تک چادر کے نیچے چھپا کر رکھا اپنا دایاں ہاتھ باہر نکالا اور چند نیلے نوٹ بوڑھے کے سامنے رکھ دیے۔ وہی نوٹ تھے جو شہر یار نے

یہاں آنے کے بعد اسے بھجوائے تھے۔

”ماہ بانو! یہ کیا؟“ اکرم خان اس کے عمل پر ہنستا گیا۔

”کچھ مت کہو بھائی اکرم!“ اس نے اکرم خان کو

زبان کے ساتھ ساتھ ہاتھ کے اشارے سے بھی منع کیا اور

خود بوڑھے کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”اب ہم چلتے ہیں بابا! وقت پر بات لے کر آئیں

گے۔“ ساکت و صامت بیٹھے بوڑھے سے نرم لہجہ میں یہ

مختصر بات کہنے کے بعد وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی اور باہر

کی طرف قدم بڑھا دیے۔ اکرم خان کو بھی اس کی پیروی کرنی

پڑی، البتہ بوڑھا نہ تو اپنی جگہ سے مل سکا تھا اور نہ ہی اپنے

سامنے دھڑے ٹوٹوں کی طرف ہاتھ بڑھا سکا تھا۔

”تم نے اتنا بڑا رقم اس لاچکی بڈھے کو دے دیا۔ یہ

سب کرنے سے پہلے تمہیں ہمیں بتانا تو چاہیے تھا۔“ وہابی

کے راستے پر چلتے ہوئے اکرم خان اس سے لہجہ بڑھا تھا۔

”کوئی بات نہیں بھائی اکرم! میرے پاس بھی تو وہ

روپے پونجی رکھے تھے۔۔۔ اگر ان روپوں سے کوئی بھنگڑا رک

گیا اور کسی کو خوشیاں ملنے کی امید بندھ گئی تو میرا کیا گیا؟ تم

پریشان مت ہو، نہ ہی کسی اور کو اس بارے میں کچھ بتانا۔ جو

کچھ ہوا، وہ بس میرے اور تمہارے درمیان رہتا چاہیے۔“

اپنے میزبانوں کے گھر میں داخل ہونے سے قبل ماہ بانو نے

اکرم خان کو سمجھایا۔ اکرم خان نے اس کی بات کا مان رکھا

اور کسی کو بھی اصل صورت حال بتانے بغیر دکن کے باپ کے

مان جانے کی نوید سنائی۔ مقررہ وقت پر سفید پھندوں والی

سرخ ٹوپی پہنے دو لہکے کر برات دکن کے گھر کی طرف

روانہ ہوئی تو اکرم خان کو ماہ بانو کی بات کی اہمیت کا اندازہ

ہوا۔ اگر وہ سب کو اصل صورت حال بتا دیتا تو حالات میں

کشتیدگی ہوتی اور کسی کے پیچھے پر وہ خوشی دیکھنے کو نہیں ملتی

جواب نظر آ رہی تھی۔ دکن کے گھر پہنچنے کے بعد شادی کی

مخصوص رسومات انجام دی گئیں۔ آخر میں کچھ خوش گلو

نوجوانوں نے طرہ پر گیت چھیڑ دیے۔ گیتوں کی لے اور

تالیوں کے آہنگ کے ساتھ بہت سے لوگ رقص کرنے

لگے۔ شاید اس طرح یہ محفل میں پچھڑے گیتوں کی آوازیں

بوٹے کی گلیوں سے نکل کر اس کیسچنگ سائٹ تک بھی پہنچی

تھیں جہاں موجود رنگ برنگے ٹیموں میں سفید پوش

پہاڑوں کے عاشق فروکش تھے۔ ان میں سے کچھ مہکن چلے

گئے میں کیرے لٹکائے ہوئے کی گلیوں میں اتر آئے اور

خود بھی اس محفل کا حصہ بن گئے۔ یہاں کسی کو بھی ان کی آمد

پر اعتراض نہیں تھا۔ خود ماہ بانو بھی گھن گھن جب تیری

بار اس نے اپنے چہرے پر غنیمت کی چمک محسوس کی تو ناگواری

کے احساس کے ساتھ اس حرکت کے مرتکب شخص کی طرف

متوجہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔ اسے متوجہ دیکھ کر وہ غیر ملکی

پوری ڈھٹائی کے ساتھ مسکرایا اور اپنے ہونٹوں پر ہاتھ رکھتے

ہوئے اس کی جانب ایک ہوائی بوسا اچھالا۔

ماہ بانو جو ابھی اس کے کچھ کچھ آشنا کئے نقش و نگار میں

ابھی ہوئی تھی، اس حرکت پر یک دم ہی اسے پہچان گئی۔ یہ

وہی شخص تھا جس نے بشام ہوٹل کے سامنے بھی یہی حرکت کی

تھی۔ اس کی اس حرکت پر ماہ بانو کے ساتھ موجود شہر یار

چارخ باہو گیا تھا لیکن چونکہ یہ شخص چلتی چپ میں سوار تھا، اس

لیے شہر یار اسے اس حرکت کا مزہ نہیں چکھا سکا تھا۔ اس روز

ماہ بانو نے دل میں شکر ادا کیا تھا کہ اچھا ہوا وہ بد تمیز آدمی

شہر یار کے ہاتھ نہیں لگا ورنہ خواہ مخواہ کا بھگڑا کھڑا ہو جاتا۔۔۔

لیکن آج اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس شہر یار یہاں موجود ہوتا

اور اس شخص کا منہ توڑ ڈالنا۔ مگر شہر یار یہاں کہاں تھا؟ وہ تو

اس سے بہت دور بیٹھا اپنے فرائض منصبی نبھاتا تھا۔ ماہ بانو کی

حیثیت بھی اس کے نزدیک ایک فریضے کی سی تھی جسے محفوظ

مقام پر پہنچانے کے بعد شاید وہ اسے بھول بھی گیا تھا۔ اسے

ضرورت بھی کیا پڑی تھی اسے اسے اتنی کم تر اور بے حیثیت ماہ

بانو کو یاد رکھنے کی؟ وہ تو کسی شہزادے کی طرح تھا جس کے

ساتھ کوئی شہزادی ہی بنتی۔ ماہ بانو تو بس اسے اپنے دل کی

دھڑکنوں میں بسا کر چپکے چپکے چاہنے کی ہی جرأت کر سکتی تھی۔

اس چاہت نے اسے روپے خواہوں کے بجائے نارسائی کے

دھم میں اپنی اداسی عطا کی تھی۔ اس نے محبت کا بیشاید تجربہ بھی

بڑے طرف سے سینے سے لگا کر کھا تھا لیکن یہ اداسی سچی سچی

اسے ساری دنیا سے کات کر اپنی ذات میں ختم ہو جانے پر

مجبور کر دیتی تھی۔ اس وقت بھی وہ اس بد تمیز غیر ملکی سیاح

سمیت اس ساری خوشی بھری محفل کو فراموش کر بیٹھی اور خالی

خالی نظروں سے اپنے ارد گرد کے مناظر دیکھنے لگی۔ اس خود

فراموشی کے عالم میں اسے احساس بھی نہ ہوا کہ کب دکن کا

باپ اس کے ساتھ آکر کھڑا ہوا اور اس کی منگی میں کوئی شے دے

کر فوراً ہی اس سے دور بھی ہٹ گیا۔ وہ چونک کر اپنی منگی کی

طرف متوجہ ہوئی۔ اس کی منگی میں وہی نیلے ٹوٹ دے ہوئے

تھے جو چند منٹ قبل وہ کسی کی خوشیوں کو برقرار رکھنے کے لیے

اس بوڑھے کی نذر کر کے آئی تھی۔ یقیناً بوڑھا ایک اجنبی لڑکی

کے غلوں سے ہار گیا تھا اور احساس ہوتے ہی پہلی فرصت

میں اپنی غلطی کی تلافی کر ڈالی تھی۔

☆☆☆

”بی بی! آپ کے لیے فون ہے۔“ وہ میرس پر رکھی

کر سیوں میں سے ایک کر سی پر غم سہمی بیٹھی آسمان کی دستکوں

میں کھوئی ہوئی تھی۔ رانی نے فون کی اطلاع دی تو اپنے

خیالات سے چونک کر اس مندی سے اٹھ کر اندر کمرے میں

رہی اس تپائی کی طرف بڑھی جس پر نیلی فون سیٹ دھرا تھا۔

”ہیلو!“ ریسپونڈر تھا کہ اس نے بے حد بے دلی سے

کہا۔ اندازہ تھا کہ یہاں اس کے لیے آنے والی کال حویلی

کے ہی کسی کین کی طرف سے ہو سکتی ہے۔

”محبت کرنے والوں کے ساتھ ایسا سلوک تو نہیں

کرتے۔ کچھ اندازہ ہے آپ کو کہ میں اس طرح اچانک آپ

کی طرف خاموشی چھپا جانے پر کتنا پریشان ہوں۔“ دوسری

طرف سے اس کی توقع کے بالکل برعکس جو آواز سنائی دی،

اس نے اس کے جسم و جان کو لرزہ کر رکھ دیا۔

”آفتاب! آپ! آپ کو یہاں کا نمبر کیسے ملا؟“ بے

پناہ حیرت سے سننے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے کانپتی

ہوئی آواز میں پوچھا۔

”آپ کا کیا خیال تھا کہ آپ موبائل آف کر دیں گی

اور اپنی شہر والی کو بھی میں آچھپیں گی تو مجھے آپ سے رابطے کا

کوئی ذریعہ ہی نہیں ملے گا؟“ اس کے لہجے میں محسوس کی

جانے والی گنگائی تھی۔

”آپ غلط سمجھ رہے ہیں آفتاب! ایسی کوئی بات نہیں

ہے جیسا آپ گمان کر رہے ہیں۔ میں نے موبائل آف نہیں

کیا، بس مجھے اسے چارج کرنے کا خیال نہیں رہا اور شاید

بیٹری ڈاؤن ہونے کی وجہ سے وہ خود ہی آف ہو گیا۔“ کشور

نے وضاحت پیش کی۔

”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ ایسا کیا ہو گیا تھا جس کی وجہ

سے آپ کو موبائل چارج کرنے جیسا اہم کام بھی یاد نہیں رہا؟“

آپ تو مجھ سے بات کیے بغیر وہ ہی نہیں سکتی تھیں پھر یہ کیسا

اغصاب آیا کہ آپ کو وہ شے بھول گئی جو میرے آپ کے

رابطے کا ذریعہ ہے؟“ اس کے لہجے سے ہنوز ناراضی بھٹک

رہی تھی۔

”مجھ سے کچھ نہ پوچھیں۔ میں آپ کو کچھ نہیں بتا

سکتی۔“ بالآخر اس کے ضبط کی طنائیں ٹوٹ گئیں اور وہ سسک

پڑی۔ اس کے اس طرح رونے سے آفتاب اپنی ناراضی

بھول کر پریشان ہو گیا۔

”کشور! پلیز! اس طرح روئیں نہیں۔ مجھے بتائیں کہ

کیا ہوا ہے؟ دیکھیں، میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔ اس

رات آپ میری فریاد سے بات کروانے کا کہہ کر غائب ہی

ہو گئیں اور میں انتظار کرتا رہا۔ میں نے خود رابطہ کرنے کی

کوشش کی تو آپ کا موبائل بند جا رہا تھا۔ رانی بھی انڈسٹرل

ہوم نہیں آئی کہیں اس سے آپ کے بارے میں پوچھتا۔ پھر

اس کے بھائی کی زبانی مجھے اطلاع ملی کہ آپ لاہور پہنچی ہوئی

ہیں اور رانی آپ کے ساتھ ہے۔ میں سمجھا کہ آپ نے مجھ

سے ملاقات کے لیے کوئی کیمبل نکالی ہے۔ میں فوراً لاہور پہنچ

گیا لیکن یہاں آکر بھی آپ نے کوئی رابطہ نہیں کیا تو مجھے

بہت برا لگا۔ میں نے آپ کی کوٹھی کا فون نمبر حاصل کیا اور

آپ سے رابطے کی کوشش کرنے لگا۔ ہر بار کوئی ملازم فون

اٹھاتا تھا اس لیے مجھے بتا بات کیے لائن کا کٹنی پڑتی۔ اس بار

فون پر رانی کی آواز سنائی دی تو میں نے اس سے آپ سے

بات کروانے کے لیے کہا۔ آپ سمجھ سکتی ہیں کہ اپنی پچھلی

نا کامیوں پر میں اچھا خاصا جھنجھٹایا ہوا تھا اس لیے آپ کی

آواز سننے ہی کچھ عجیب ہو گیا۔ لیکن پلیز! آپ اس طرح روئیں

تو نہیں۔ مجھے آپ کے رونے سے بہت تکلیف ہو رہی

ہے۔“ وہ اپنے جھجکے کی وضاحت پیش کرتے ہوئے اسے

چپ کروانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”میں نے آپ کی باتوں کا بُرا نہیں مانا آفتاب! مجھے

اندازہ ہے کہ آپ بہت پریشان رہے ہوں گے اور پریشانی

میں آدمی کے منہ سے کچھ بھی ایسا سنا سکا ہے۔ آپ

نے تو ایسا کچھ غلط کیا ہی نہیں۔“ اسے شرمندہ پا کر کشور نے خود

کو سنبھالا اور ابھٹکی سے بولی۔

”تو پھر وہ کیا بات ہے جس نے آپ کو اس قدر دھکی

اور پریشان کر دیا ہے؟ کیا حویلی میں کچھ ہوا ہے؟“ آفتاب

نے اندازہ لگنے کی کوشش کی۔

”حویلی میں تو ہر روز کوئی نہ کوئی غیاظ و ستم ہوتا رہتا

ہے اور یہ میری بد قسمتی۔۔۔ کہ میں وہاں پیدا ہوئی۔“ اس کے

لہجے میں ہی اور دکھ دونوں ہی جھٹک رہے تھے۔

”آپ مجھے کچھ بتائیں تو سہی کیا ایسا کیا ہوا ہے جس کی

وجہ سے آپ اس قدر پریشان ہیں؟“ آفتاب نے اصرار کیا۔

”نہیں بتا سکتی۔ بات ایسی ہے کہ زبان پر لاتے

ہوئے میں شرم سے مرنے لگتی ہوں۔ رانی دن رات میرے

ساتھ رہتی ہے، میں اسے بھی کچھ بتانے کی ہمت نہیں کر سکتی۔“

اس نے انکار کیا تو آفتاب سوچ میں پڑ گیا۔ کشور کی باتوں

سے اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ کوئی بہت ہی غیر معمولی واقعہ پیش

آیا ہے جس کی وجہ سے وہ شاید ڈپریشن کا شکار ہے۔ اس کا یہ

ڈپریشن خود آفتاب کو تکلیف میں مبتلا کر رہا تھا۔ اس مسئلے کا یہی

صل تھا کہ کشور کی اس سے ملاقات ہو جاتی کیونکہ وہ جانتا تھا

کہ اس کا ساتھ کشور کو ایسی بے پایاں مسرت عطا کرتا ہے کہ اس کے آگے وہ سب کچھ بھول سکتی ہے۔

”آپ مجھے بتائیں چاہئیں تو میں اصرار نہیں کروں گا لیکن آپ تکلیف میں ہوں، یہ بھی مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتا۔ آپ کسی طرح مجھ سے ملاقات کی راہ نکالیں جگہ ایسا کریں کہ کہیں میں خریدنے کے بہانے لبرٹی تک آجائیں۔ میں وہاں بک شاپ پر آپ کا منتظر رہوں گا۔“ اس نے پروگرام ترتیب دیا لیکن جوا بکشور خاموش رہی۔

”کیا بات ہے، آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟ کیا آپ مجھ سے ملنے کے لیے آج نہیں چاہئیں؟“ اس کی خاموشی کے باعث آفتاب نے پوچھا۔

”یہ بات نہیں ہے۔ آپ سے ملنا تو میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہے لیکن ہم آج نہیں ملیں گے۔ آپ کو ملاقات کے لیے تھوڑا سا انتظار کرنا ہوگا۔ میں خود فون کر کے آپ کو وقت کے بارے میں بتاؤں گی۔“ کشور کا انداز کچھ پراسرار تھا۔ آفتاب الجھ سا گیا تاہم کوئی اختلاف نہیں کیا۔

”چلیں جیسی آپ کی مرضی۔ میں یہاں اپنے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ بس دو دن اور ہوں یہاں۔ اگر ان دو دنوں میں آپ کا موڈ بن جائے تو مجھے بتا دیجیے گا۔“ اس نے اپنی بات کہہ کر فون بند کر دیا۔ اس کے لہجے سے ظاہر تھا کہ اسے کشور کا جواب سن کر کچھ اچھا نہیں لگا ہے۔ ظاہر ہے، وہ اپنے سارے کام چھوڑ کر اس کی خاطر دوڑا آیا تھا اور وہ بہانے بنا رہی تھی تو اس کا موڈ آف ہونا لازمی تھا۔ کشور نے اس کا انداز محسوس کر لیا پھر بھی زیادہ توجہ نہیں دی اور ریسورس کرڈیل پر رکھ کر دلی کو وائز دینے لگی۔

”ذرا پیور سے کھو گاڑی نکالے۔ مجھے ضروری کام سے جانا ہے۔“ رانی آئی تو اس نے حکم دیا۔ اس حکم پر رانی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”کیا ماسٹر صاحب سے ملنے جانا ہے بی بی؟“ آفتاب کے فون کے بعد اس کے اس حکم کو سن کر رانی یہی نتیجہ اخذ کر سکتی تھی۔

”نہیں... کہیں اور جانا ہے۔“ اس نے بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مختصر جواب دیا لیکن اس کے چہرے پر جھلی جھلی مسکراہٹ بڑی معنی خیز تھی جس کا مطلب یہ سمجھنے کے باوجود رانی اتنا اندازہ لگنے میں تو کامیاب ہوئی تھی کہ بی بی اپنے پچھلے دنوں کی کیفیت سے باہر آ رہی ہیں۔

☆☆☆

”گل مینا! یہ جو تمہارے گاؤں میں کیمپنگ سائٹ

ہے وہاں چلیں؟ میرا بڑا دل چاہتا ہے کہ قریب سے ان دیوانوں کو دیکھوں جو ابھی بجلی آرام کی زندگی چھوڑ کر اسے مشکل مشکل پہناؤں کو سر کرنے نکل پڑتے ہیں۔ سفر ناموں میں ان لوگوں اور ان کی خیمہ گاہوں کے بارے میں بہت پڑھا ہے۔ آج ذرا قریب جا کر اپنی آنکھوں سے اس دنیا کا نظارہ کرنا چاہتی ہوں۔“ شادی کا ہنگامہ کل رات گئے تک جاری رہا تھا، اس کے باوجود گل مینا وہ لوگ جلدی جاگ گئے تھے۔ اس نے لکڑی کے چپے پر توار کے جلدی جلدی روٹیاں تھوپتی گل مینا سے اپنی خواہش بیان کی تو وہ تذبذب میں پڑ گئی۔

”ابھی تو بہت کام کرنا ہے۔ اتنا کام چھوڑ کر ہم کسے جا سکتا ہے؟ ویسے بھی اوسر کچھ نہیں رکھا۔ ہماری بستی کا پچھ لوگ گوروں کے ادھر قدم رکھتے ہی ان سے سارا چاکلیٹ اور چوٹکم وغیرہ نکلوا لیتا ہے۔ ادھر کیمپ جائے گا تو ہمیں کچھ نہیں ملے گا۔ مفت میں گور لوگ تصویریں کھینچنے کے لیے پیچھے پڑ جائے گا۔“ اپنی مصروفیت کے علاوہ گل مینا نے اپنے ساتھ نہ چلنے کی جو بیج بتائی، اسے سن کر مادہ بانو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے سن رکھا تھا کہ اس طرح کے علاقوں کے باسی ولایتی چاکلیٹس اور اسی قسم کی دوسری اشیاء ہتھیانے کے لیے ساحلوں کا پیچھا لے لیتے ہیں۔ گل مینا کی بات سن کر اس بات کی تصدیق ہوئی۔ وہ بھی تو اسی ماحول کا حصہ تھی جہاں کے باسی اپنی غربت اور بھوک کے باوجود آئے دن یہاں سے گزرنے والے غیر ملکی ساحلوں کی عنائوں کے باعث ولایتی مال کی کثرت میں مبتلا ہو چکے تھے۔

”ٹھیک ہے، تم اپنا کام کرو۔ میں خود چکر لگا کر آتی ہوں۔“ وہ کہتی ہوئی باہر نکل گئی۔ گل مینا نے پیچھے سے آواز دے کر اس سے کچھ کہا بھی لیکن اس نے ان کی طرف سے آزادی کے احساس کے ساتھ اس دھندلی سی صبح میں ہونے کی گلیوں میں چلنا اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ یہاں کا موسم اس کے لیے کچھ سخت ضرور تھا لیکن وہ اس خوف سے آزادی کی کہ چودھری یا اس کا کوئی ہر کار وہ اسے دیکھ لے گا۔ آزادی کی اس نعمت سے لطف اندوز ہوتی وہ گرم کپڑوں میں ملبوس ہونے کی کیمپنگ سائٹ کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ یہاں دو تین خیمہ گاہیں تھیں۔ اتنی صبح کے وقت وہاں دو روٹن تو نظر نہیں آ رہی تھی جس کا تذکرہ سفر ناموں میں پڑھتی رہی تھی لیکن دھندلی سی صبح میں سر اٹھانے کھڑے رنگ پرنگے خیموں کا نظارہ بھی بہت شان دار لگ رہا تھا۔ ایک خیمہ گاہ میں جھانکنے پر اسے متحرک پور نظر آئے۔ وہ چند خیموں کو اکٹھا

رہے تھے۔ شاید وہاں موجود کسی ٹیم کو بہت جلدی تھی اور وہ جلد سے جلد روانہ ہونے کے خواہش مند تھے۔ مادہ بانو اس خیمہ گاہ کو چھوڑ کر دوسری طرف بڑھ گئی۔ یہاں بالکل خاموشی تھی۔ خیمہ گاہ کے کھلے چھانک سے اندر داخل ہو کر پہلے تو وہ دیوار کے ساتھ ساتھ لگے پائپر کے درختوں کے نیچے سے گزرتی وہاں موجود سورج کی پودوں کا جائزہ لیتی رہی پھر خیموں کے درمیان چلی آئی۔ یہاں چند ہی خیمے تھے اور ابھی ان خیموں میں زندگی کا حرکت نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید ان خیموں میں پہناؤں سے اتر کر آنے والے سیاح استراحت فرما رہے تھے جو ابھی کے سفر سے پہلے اپنی تھوڑی سی تھکن اتار لیتا جا چکے تھے۔ اس سولی ہوئی خیمہ گاہ کی خاموشی سے لطف اندوز ہوتی وہ ایک بڑے سے خیمے کے سامنے سے گزر رہی تھی کہ ایک دم ہی کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔ اس اچانک ٹوٹنے والی افتاد نے اسے اتنی بڑی طرح ہولکھا ہٹ میں مبتلا کیا کہ وہ چیخ تک نہیں سکی۔ کچھ لمحے کے توقف کے بعد ذرا سنبھلتی تو خیمے میں موجود روشنی میں اس نے اس امر کی نوک دیکھا جسے پہلے وہ بٹام موئیل کے باہر اور کل رات تک نہیں ہونے میں بھی دیکھ چکی تھی۔

”تم بڑی خوب صورت لڑکی ہو۔ پہلی بار تمہیں دیکھا تھا، جب ہی دل تمہیں پانے کے لیے چل گیا تھا لیکن اس وقت ایک تو تم کسی اور کے ساتھ تھیں، دوسرے میرے پاس بھی وقت نہیں تھا اس لیے صبر کرنا پڑا۔ تمہیں شاید میری دلچسپی کا اندازہ ہو گیا تھا جب ہی کل رات مجھے گاؤں میں دیکھنے کے بعد آج صبح صبح خود ہی مجھے دھونڈتی ہوئی آ گئی ہو... لیکن دیکھو، میرے پاس بس ایک ڈیڑھ گھنٹہ ہی ہے۔ پھر ہم لوگ واپس چلے جائیں گے۔ تم مجھے اس وقت میں خوش کر دو۔ میں تمہیں اس ریٹ سے بھی زیادہ دوں گا جسے تم رات بھر کے لیے چارج کرتی ہو۔“ وہ بہت رواں اور صاف اردو میں بات کر رہا تھا۔ ایک امریکی گورے کو اتنی صاف اردو میں بات کرتے دیکھ کر حیرت زدہ رہ جانے والی مادہ بانو کو اس کی کئی بات کا مفہوم سمجھنے میں کچھ دیر لگی۔ جب بات سمجھ آئی تو اس کا چہرہ فیسے سے سرخ پڑ گیا۔ اس نے ابھی تک گورے کی گرفت میں موجود پانی کاٹی کو بھٹکا دے کر چھڑانے کی کوشش کی لیکن اس کی گرفت مضبوط تھی۔

”ناراض کیوں ہو رہی ہو؟ اگر تمہیں میری آفر قبول نہیں تو تم اپنی مرضی کا ریٹ بتا دو۔“ وہ اسے جو بھڑک رہا تھا، اسی حساب سے بات کر رہا تھا۔ شاید بٹام میں اسے شہر یار کے ساتھ دیکھنے کے بعد یہاں ہونے میں مقامی لباس میں

مقامی لوگوں کے درمیان دیکھ کر اس نے اپنی مرضی سے کچھ اندازے قائم کر لیے تھے اور اب اسے ایک کال گرل کی طرح ذلیل کر رہا تھا۔

”بکواس بند کرو۔ میں اس طرح کا کام کرنے والی لڑکی نہیں۔“ اس کی غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے مادہ بانو کاپنی زبان کھولتی پڑی۔

”اچھا! اس کا جواب سن کر وہ بے چینی سے بولنے ہوئے ہنس۔“ تم جو بھی ہو، اب میں تمہیں ایسے تو نہیں جانے دوں گا۔“ اس نے مادہ بانو کاپنی طرف کھینچا اور پھر زور لگا کر اسے زمین پر پٹکے میٹرز پر گرادی۔ اس کی اس حرکت پر مادہ بانو کے اوسان خطا ہونے لگے۔ اسے لگا کہ سہری بالوں اور گوری رنگت والے اس شخص کے نقش میں ڈھلنے لگے ہوں۔ شاید ہر بوس پرست کا چہرہ اتنا ہی بھیاںک اور مکروہ لگتا ہے۔ وہ ایک چودھری سے اپنا آپ بچا کر اس الگ تھلک دنیا میں آ کر کسی بھی تو یہاں اس جیسے دوسرے سے واسطہ پڑ گیا تھا۔ چودھری اگر ایک گاؤں کا مالک ہونے کے تاتے اپنے علاقے میں موجود ہر جان دار بے جان شے پر اپنا حق سمجھتا تھا تو اس وقت اس کے سامنے موجود شخص بھی اس قوم کا فرد تھا جو پوری دنیا کو اپنا محکم بنانے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ حکومت قوم کی کمزور عورتیں تو قافحان سب سے پہلا نشانہ ہوتی ہیں۔ وہ امریکی گورابھی مادہ بانو کو ذہنی اور معاشی غلامی میں مبتلا قوم کی کمزور عورت سمجھ کر اس پر ہل پڑا تھا۔

مادہ بانو اپنی تمام تر جدوجہد کے باوجود خود کو اس کی گرفت سے چھڑانے میں کامیاب نہیں ہو پاری تھی۔ اس کے جسم سے پٹکی چادر الگ ہو چکی تھی اور اب لبادہ بھی جدا ہونے کو تھا۔ اس صورت حال سے بچنے کے لیے وہ ہاتھ جبر چلانے کے ساتھ ساتھ ٹانگیں بھی مار رہی تھی۔ شاید یہ ان چیزوں کا ہی نتیجہ تھا کہ اس نے خیمے میں کسی اور کی موجودگی کو محسوس کیا اور پھر اگلے ہی لمحے اس کے وجود سے لپٹن عفریت ایک جھٹکے سے دور جا گرا۔ خیمے میں آنے والا اکرم خان تھا جس نے غیر ملکی سیاح کو اپنی تھوکروں میں رکھ لیا تھا۔ اب وہاں مادہ بانو کے بہانے اس گورے کی چیخیں گونج رہی تھیں۔ مادہ بانو نے پھرتی سے اپنا لباس درست کیا اور ایک بار پھر اپنے گرد چادر لپیٹ لی۔ اس دوران خیمے میں دو تین افراد اور بھی گھس آئے تھے۔ ان افراد کے آنے کے بعد معمول سے کافی بڑا خیمہ بھی تنک پڑ گیا تھا۔

”اسناپ... اسناپ اٹ!“ اندر آنے والے افراد

میں دو غیر ملکی اور ایک مقامی آدمی تھا۔ اکرم خان کو رکھنے کا حکم غیر ملکی نے دیا تھا جسے سن کر اکرم خان تو نہیں رکھا لیکن مقامی شخص نے آگے بڑھ کر اسے قابو کر لیا۔

”چھوڑ دو ہمیں۔ ہم اس گورے کو چھوڑے گا جسے اس نے ہماری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔“ اکرم خان بھرا ہوا تھا۔

”میں نے کچھ نہیں کیا۔ یہ اپنی مرضی سے یہاں آئی تھی۔ میں نے اس سے ریٹ لے لیا تھا۔“ فرش پر گرا وہ

امر کی سیاحت کر بیٹھے ہوئے پوری ڈھٹائی سے بولا۔

”جھوٹ بولتا ہے بد بخت۔“ اکرم خان چلا یا۔

”دیکھ یارا! جھگڑا مت کر۔ ہم نے بھی دیکھا تھا کہ یہ لڑکی خود آیا تھا۔ ہم چانک پر سے ہٹ کر حاجت کے لیے

جا رہا تھا، تب ہم نے اس لڑکی کو ادھر آتے دیکھا تھا۔ ہم جلدی میں تھا اس لیے اسے روک نہیں سکا۔ بعد میں یہ ہمیں

نظر نہیں آیا تو ہم سمجھا واپس چلا گیا ہے۔ ابھی تم ادھر آیا اور پھر لڑکی کا بیچ سنا دیا تو ہمیں پتا چلا کہ یہ ادھر صاحب کے

خیمے میں ہے۔“ مقامی شخص جو اس خیر کا چوکیدار تھا، اکرم خان کو سمجھانے لگا۔

”یہ ادھر صرف گھومنے آیا تھا۔“ اکرم خان نے ماہ بانو کی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ خود اس میں تو اتنی بھی

ہمت نہیں رہی تھی۔

”جھٹ مت کرو خان! اگر تم نے مزید بد معاشی دکھانے کی کوشش کی تو میں تمہارا ایسا بندہ ہوں کہ کروں گا کہ

اس علاقے میں نظر بھی نہیں آؤ گے۔“ امر کی پوری طرح سمجھل چکا تھا اور اکرم خان کو دھمکی دے رہا تھا۔ اس کے

ساتھیوں کے تیر بھی خاصے خطرناک تھے۔

”جائے دے اکرم خان! کیوں خود کو مشکل میں ڈالتا ہے؟ ان لوگوں کا کتنا کچھ ہے، تجھے بھی معلوم ہے۔ تو چپ

رہے گا تو کچھ نہیں جانے گا۔“ لوگ تو ویسے بھی گھٹنا بھر بعد ادھر سے نکلنے ہی والا ہے۔ اگر تو نے بات بڑھائی تو تو زیادہ

مشکل میں پڑ جائے گا۔“ چوکیدار اب سرگوشیوں میں اکرم خان کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ماہ بانو نے بھی اس کی یہ سرگوشیاں سنیں۔

مصرفیت کی وجہ سے آنے سے منع کر دیا تھا اس لیے میں اکیلی ہی آئی تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہاں...“ تھوڑا سا فاصلہ

ٹپنے کرنے کے بعد اس نے اکرم خان کے سامنے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ امر کی گورے نے اس پر جو الزام

لگایا تھا، اس کی وجہ سے وہ اکرم خان کے سامنے بڑی سبکی محسوس کر رہی تھی۔

”ہمیں معلوم ہے۔ گل مینا نے ہمیں بتایا تھا کہ تم اس طرف آیا ہے جب ہی تو ہم نہیں ڈھونڈتا ہوا ادھر آیا تھا۔ اللہ

کا شکر ہے کہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا ورنہ ہمارے مشاہیرم خان اور اس کے صاحب کو کیا جواب دیتا؟ ان گورالوگ کی فطرت

ہمیں ابھی طرح معلوم ہے۔ ہم دیکھتا رہتا ہے انہیں کہ یہ کیسے شراب پی کر عورتوں کے ساتھ موج مسیقی کرتا ہے۔ ان

کے ساتھ گورت لوگ آتا ہے، وہ بھی انہی جیسا ہوتا ہے، پر ہم تمہیں جانتا ہے۔ تم ہمارا بہن جیسا ہے اور ہمیں معلوم ہے کہ

ہمارا یہ بہن بہت اچھا اور نیک ہے۔“ اس کی پیش کی گئی نامکمل وضاحت کے جواب میں اکرم خان نے جو ہنسل کہے، وہ

اسے اپنی نظر میں سرخ زور کرنے کے لیے کافی تھے۔

☆ ☆ ☆

”میں امریکا جا رہا ہوں۔“

”اچانک کیوں؟“ خیریت تو ہے چودھری صاحب؟“

تارڑ اس اطلاع پر حیران ہوا۔

”ہاں ہاں، سب خیر ہے۔ بس بڑے دنوں سے اپنے بچے کی یاد آ رہی ہے۔ آٹھ ماہ ہو گئے اس سے ملا نہیں۔ خود وہ تو

ادھر آنے کی کل کرتا نہیں۔ میں نے سوچا، میں آپ ہی اس سے مل کر آ جاتا ہوں۔ اس بہانے تھوڑا مہینوں کے ساتھ بھی

وقت گزارنے کا موقع مل جائے گا۔“ اپنے امریکا جانے کی وجہ بتاتے ہوئے آخر میں چودھری نے ایک اور شوشا چھوڑا

اور خود اپنی بات سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ہنسنے لگا۔

”مہینوں کی آپ کو کیا کمی چودھری صاحب! اب تو پیر آباد میں آپ کو ایک مہم کی اولاد مل گئی ہے۔“ تارڑ نے ڈاکٹر ماریا کی طرف اشارہ کیا۔

”وہ اپنی جگہ ہے۔ چیز زبردست ہے... مجھے انکار نہیں، پر ساری خالص مہم نہیں۔ اس کا باپ ایشیا کی تھا۔ پڑھنے کے لیے ولایت گیا تو گوری مہم کو بھانگا۔ بے جادہ ایسی دیوانی ہوئی کہ اس کی خاطر ولایت چھوڑ کر ادھر آئی۔ شوہر کے مرنے کے بعد بھی واپس نہیں گئی۔ ان دونوں عاشقوں کی اولاد وہ ڈاکٹر بنی ادھر ہمارے پاس ہے، پر پوری مہم نہیں۔ پوری مہم سے ملے نہیں ادھر امریکا ہی جاتا پڑے گا۔“

چودھری ایک بار پھر خباثت سے ہنسنے لگا۔

”پھر کب تک جا رہے ہیں؟“ تارڑ نے اس کا پروگرام جاننا چاہا۔

”ویرا گئے کے لیے دے دیا ہے۔ دو چار دن میں کام ہو جائے گا تو نکل جاؤں گا۔ آپ کو تو مالوم (معلوم) ہے کہ

میرا آتا جانا لگتا رہتا ہے اس لیے کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ یہ تو اس وادی ہی کی کچھ لمبا وقت گزر گیا ورنہ جب سے مراد ادھر

ہے، ہر چار چھ ماہ بعد جاتا ہی رہتا ہوں۔“

”چلیں اچھی بات ہے۔ آپ کچھ عرصہ بیٹے کے ساتھ انجوائے کر لیں۔ یہاں تو ویسے بھی پرنس ڈاؤن جا رہا

ہے، ابھی خاصی فراغت ہی ہے۔ اسے مطلب کا نیا فارمیت آفیسر آگیا تو کچھ کام بن جائے گا۔ آپ بتائیں، آپ نے

لیاقت رانا صاحب سے شہر یار کے سلسلے میں بات کی؟ ذرا وہ خیرا بیٹھے تو میں ڈی ایس ایس منظور کو بھی یہاں سے کھسکاؤں۔

ابھی تو اس کے سر پر اسے سی کا تھم ہے اس لیے کہیں اور ٹرانسفر کرنا مشکل ہوگا۔“ چودھری انکار تو جتنی جاکیر دار

تھا۔ اتنے سیدھے جھنڈوں میں نہیں پڑتا تب بھی زمینوں سے اتنی آمدنی ہوتی تھی کہ تجور یا بھری پڑی رہتی تھیں۔ وہ تو

اپنی ہوس کے انجھون بھجور ہو کر یہ سارے جھنڈے کرتا تھا ورنہ حقیقتاً اسے کوئی کمی نہیں تھی لیکن تارڑ کو کلڑی اور کھالوں کی

اسٹاکنگ میں سے ملنے والا کمیشن بند ہو جانے سے بڑا فرق پڑ گیا تھا۔ حرام نہ کوٹنے کے بعد سو کھی تھوڑے میں گزارہ مشکل لگتا

تھا اس لیے اسے بڑی پریشانی تھی کہ کسی طرح پچھلا سٹیٹ اپ دوبارہ قائم ہو جائے۔

”لیاقت رانا سے تو میں نے گل نہیں کی۔ سوچا کچھ دن اور اس بلوچن کو سکون مانی کرنے دوں۔ واپس آ کر دیکھ لوں

گا، پر کسی فکر نہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ چودھری نے بے پروا سے انداز میں اسے تسلی دی۔

”آپ کہتے ہیں تو نہیں کرتے فکر۔ آپ امریکا جا کر گورہوں کے ساتھ انجوائے کریں۔ ہمارے لیے ذرا ڈاکٹر

ماریا کو اشارہ کر جائے گا، ہم بھی کچھ دن اجوری مہم کے ساتھ گزار کر غم دوراں کو بھولنے کی کوشش کر دیکھیں گے۔“

تارڑ نے موقع دیکھ کر اپنی خواہش بیان کی۔ جب سے ڈاکٹر ماریا کو دیکھا تھا، اس کی طلب ستاری تھی لیکن چودھری کی اس پر خالص توجہ دیکھ کر اس کا مطالبہ کرنے کی ہمت نہیں ہو سکتی تھی۔

”ٹھیک ہے۔ میں کہہ دوں گا اس سے۔ آپ جیسے دوستوں کی کئی بات کہے ہی جا سکتی ہے بھلا۔“ چودھری کے جواب نے ایس بی کو خوش کر دیا۔

”تھینک یو چودھری صاحب! آپ سے مجھے یہی امید تھی۔ اچھا اب اجازت دیجئے... اور ہاں، پلیز! آپ کی سیٹ کنفرم ہو جائے تو مجھے ضرور بتائیے گا۔“ میں ان پورٹ تنک

آپ کو آف کرنے ضرور چاہوں گا۔“

”کیوں نہیں، میں آپ کو اطلاع کروں گا۔“ تارڑ کو یقین دہانی کروانے کے بعد چودھری نے فون بند کر دیا اور

ایک نوکر کو آواز دے کر یاٹے کو بھیجے گا حکم دیا۔ ذرا دیر میں بالا اس کی خدمت میں حاضر تھا۔

”دیکھ بھیجی بالے! تیری پچھلی ساری غلطیاں میں نے ناف (معاف) کر دی تھیں، پر اس وادی جو کام تیرے سرگ

کر جا رہا ہوں اس میں کوئی غلطی نہیں ہونی چاہیے، ورنہ میرے کچھ کرنے سے پہلے تو آپ ہی مارا جائے گا۔ میرے

پچھلے ٹوٹنے سارا کام وڈی صفائی اور ہیشاری سے کرنا ہوگا۔“

”دستی فکر ہی نہ کرو ورنہ! میں سب سنبھال لوں گا۔ میں تو خود چاہتا تھا کہ ڈیریکٹ (ڈائریکٹ) انٹینشن کا موقع

مل جائے۔ آپ نے وڈا چنگا لیا ہے کہ سیدھے سیدھے اسے ہی پڑی جھٹلانے کا سوچا ہے۔ اب آپ دیکھیے گا کہ میں

کیسے اس کا دماغ ٹھکانے لاتا ہوں۔ غیائے کی دھجی کا پتا تو وہ میرے دو ہاتھ کھا کر فوراً ہی اگل دے گا۔ میں تو اس کے

کانوں کو ہتھ لگاؤں گا۔ آپ اپنے منہ سے کسی لٹوے میں پڑنے سے توبہ کر لے گا لیکر آپ دیکھیے گا کہ ادھر سے بھاگ

ہی نکلے گا۔“ بالا حسب عادت سینہ جھٹکا کہ چودھری کو یقین دہانی کروانے لگا۔

”زیادہ بھڑکیں نہ مار۔ تجھے تیری بھڑکیں نہیں سننی۔ کم (کام) دیکھنا ہے تم... بچوں کا ٹھکانہ بچاؤ کے اغوا کو۔

اس کے سارے مامے چاہے اسے ڈھونڈنے کے لیے کھڑے ہو جائیں گے۔ تجھے بہت صفائی سے کام کرنا ہوگا۔

راز داری کی وجہ سے میں نے ایس بی کو بھی یہ گل نہیں بتائی، پر اسے میرا ارادہ تو مالوم ہی ہے۔ سب سے پہلے تم لوگوں پر ہی

ٹنک کرے گا، پر اسے بھی ہوانہ لگے دینا۔ وہ میرا ساجھے دار

سکے، پر آدمی کا کیا پتا چلتا ہے کہ کب دھوکا دے جائے۔“

چودھری کی اپنی فطرت میں وہ فائنل تھی اس لیے وہ دوسروں پر بھی بھروسہ نہیں کرتا تھا۔

”جیسا آپ کا حکم سرکار! آپ نے کہہ دیا تو سمجھیں کسی کو انوں کان بھی خبر نہیں ہوگی۔“ بالے نے ایک بار پھر اسے یقین دہانی کروائی۔

”اور ہاں، دیکھ... ڈاکٹر ماریا کا بھی دھیان رکھنا۔ ایسی کام کی چیز ہاتھ لگی ہے، اسے ہاتھ سے لٹکانا نہیں چاہیے۔“

اپنے ایس بی کی رال چک رہی ہے اس پر۔ میرے جانے کے بعد کسی ایک واری ڈاکٹر مار یا کو اس کے پاس لے جاتا۔ ایس بی با رہا رخصت کرے تو اسے بہانے سے ٹال دیتا۔ سمجھ رہا ہے تا میری کس؟“ بالے کو مزید بدلتوں سے نوازتے ہوئے چودھری نے اس سے پوچھا۔

”جی سرکار!“

”چلی گئی ہے۔ میرے پیچھے تھے ہی یہ سب دیکھنا ہے۔ منشی زمینوں کے معاملات دیکھنے کا اور تجھے یہ پھنسنے غنائے ہوں گے۔ میں چند روزی دن سے زیادہ نہیں لگاؤں گا امریکا میں۔ میرے آنے تک تجھے ماہ کا نوکٹا چلا کر اسے لانا بھی ہوگا اور سنبھال کر بھی رکھنا ہوگا۔ اس واری اسے ہاتھ سے لٹکانا نہیں چاہیے۔ اس کے پیچھے میں اتار سک لینے کو تیار ہوا ہوں۔ وہ منشی تو میں جان نکال دوں گا تم ساروں کی۔“

چودھری نے بالے کو دھکیلا جس کے جواب میں ظاہر ہے اسے اپنی تابع داری کا یقین دلاتے ہوئے چودھری کو سب کچھ ٹھیک ہو جانے کی یقین دہانی ہی کروانی تھی۔

☆☆☆

”اچھا مریم! میں ذرا کام سے جا رہا ہوں۔ مجھے داہنی میں کافی دیر ہو سکتی ہے۔ تم کی کو بتا دینا اور خود بھی آرام سے سو جانا۔“ اپنی تیاری کو فاصلہ بخ دینے کے لیے سجاد رانا نے خود پر ایک بار پھر پر نیوم چھڑکا اور بستر پر لیٹی ہوئی مریم سے کہتے ہوئے باہر کا رخ کیا۔ سبز حیاں اتر کر وہ نیچے پہنچا ہی تھا کہ ٹیلی فون کی بجلی ٹھنکی نے اس کے قدم روک لیے۔

”ہیلو! اس نے ریسپونڈ کرنا کون سے لگایا۔“

”السلام علیکم سجاد بھائی! خبریت سے ہیں آپ؟“

دوسری طرف شہر یار تھا جو اس کی آواز سن کر خیر خبریت دریافت کرنے لگا۔

”میں ٹھیک ہوں، تم اپنی سناؤ۔“ اس نے اپنی گلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ ابھی اس کے پاس کچھ وقت تھا چنانچہ وہ شہر یار سے بات چیت کر سکتا تھا۔

”میں بھی ٹھیک ہوں۔ بس ماموں جان سے ایک کپ کام کے سلسلے میں بات کرنی تھی اس لیے فون کیا تھا۔ خوش قسمتی سے آپ کی آواز سننے کو مل گئی ورنہ آج کل جیسے حالات ہو رہے ہیں، مجھے اندازہ ہے کہ آپ کے پاس فرصت بالکل نہیں ہوگی۔ پچھلے دنوں بھائی سے بات ہوئی تھی تو انہوں نے بھی یہی بتایا تھا کہ آپ بہت مصروف ہیں۔“

”ہاں یار! مصروفیت تو بہت ہے اسی لیے میں مریم کو لے کر ہمیں شفقت ہو گیا ہوں۔ میری غیر موجودگی میں اب کم

از کم اسے بالکل تنہا نہیں رہنا پڑے گا۔“ سجاد رانا کی آواز میں اداسی و رنجی تھی مگر پھر اس نے خود کو فوراً ہی سنبھال لیا اور ہش ہش لہجے میں بولا۔ ”تم سناؤ کوئی ٹیگز تو نہیں کر دی جس سے غصے کے لیے پایا کی مدد کی ضرورت ہے؟“

”نہیں، فی الحال تو خاصا امن وامان ہے، بس ایک بندے کے سلسلے میں ماموں جان سے بات کرنی تھی۔ عابد انصاری نام سے اس کا۔ مجھے کسی کے تجویز دی گئی کہ باجوہ کی جگہ اس شخص کو فارم آفس کی جگہ دلوادوں تو اچھے نتائج سامنے آئیں گے۔ میں نے سوچا ماموں جان سے ڈسکس کر لوں اور اگر واقعی وہ اچھا آدمی ہے تو کوشش کر کے اسے اپنے علاقے میں لے آؤں۔“ شہر یار نے اپنے فون کرنے کی وجہ بتائی۔

”عابد انصاری تو کافی ٹھیک تھا کہ بندہ ہے۔ میری تھوڑی بہت واقفیت ہے اس سے۔ کبھی کسی قسم کی کرپشن کے سلسلے میں اس کا نام سننے میں نہیں آیا۔“ اس نے شہر یار کو بتایا۔

”بس تو پھر ٹھیک ہے، میں ماموں جان سے کہوں گا کہ پھر پور کوشش کر کے یہ بندہ مجھے دلوادیں۔ میں اپنے علاقے میں جو تھوہریاں چاہ رہا ہوں اس کے لیے مجھے ایک اچھی ٹیم کی اشد ضرورت ہے۔“ سجاد رانا کی عابد انصاری کے سلسلے میں اچھی رائے نے اسے خوش کر دیا۔

”اللہ تمہیں تمہارے ٹیک مقصد میں کامیاب کرے۔ میں بھی جدوجہد میں لگا ہوا ہوں۔ شینا کے قاتل کی تلاش میں جانے کون کون سے انکشافات ہوئے ہیں مجھ پر۔ جن مختلف قسم کے سپلائرز کو معمولی فنڈ سے کچھ کریم پولیس والے چھوٹ دے رہے ہیں، انہی کے روپ میں کیسے کیسے خطرناک اینجنس چھپے بیٹھے ہیں، اس سے کل اندازہ ہی نہیں تھا۔ جسم فرشی کی آڑ میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ بہت ہی بھیاںک ہے۔ ٹیلی فون پر میں تمہیں زیادہ تفصیلات نہیں بتا سکتا۔ ملاقات ہونے پر بتاؤں گا۔ ابھی تم پاپا سے اپنے کام کے سلسلے میں بات کر لو۔“ سجاد رانا نے ایک دم ہی اس سے گفتگو کا سلسلہ ختم کر کے کال لیاقت رانا کے بیڑوم میں موجود ایک میٹیشن پر ٹرانسفر کر دی اور باہر نکل گیا۔

باوردی ڈرائیور گاڑی سمیت اس کا منتظر تھا لیکن وہ ڈرائیور یا کسی گاڑی کو اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ گاڑی اس کے ساتھ جانا چاہتا تھا لیکن اس کے حکم کے سامنے اس کی ایک نڈ چل سکی۔ اپنی گاڑی خود ڈرائیو کرتے ہوئے وہ جس مقام پر پہنچا وہ شہر کا ایک مشہور قایم بازار ہوٹل

تھا۔ ریسپیشن سے اس نے پہلے سے کب شدہ کمرے کی چابی لی اور لفٹ کے ذریعے کمرے میں جا پہنچا۔ یہ ایک ذیل بند کمرہ تھا جہاں دنیا جہاں کی آسائشات جمع کر دی تھی تھیں۔ وہ اس کمرے میں کئی سے ملاقات کے لیے آیا تھا۔ اس ملاقاتی کے آنے تک وہ فی وی کے مختصر بدل بدل کر دیکھتا رہا لیکن درحقیقت اس کا ذہن کسی بھی پروگرام کی طرف توجہ دینے سے صاف تھا۔ وہ اپنے متوجع ملاقاتی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ بالاخر انتظار کے یہ پوسل محلات کسی نہ کسی طرح گزر گئے اور کمرے کے دروازے پر دستک کی آواز بھری۔

”میں کم ان۔“ اندرونی بے چینی کے باوجود اس نے خود اٹھ کر دروازے تک جانے کے بجائے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے جواب دیا۔ اس کی طرف سے اجازت لینے پر دروازہ بے آواز کھلا اور ویر کے یونیفارم میں ملبوس ایک اوجیز عمر شخص اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے ہی جینز اور دنی شرت میں ملبوس ایک شولڈر کٹ میز اسٹائل والی الزما ڈاکڑی بھی تھی۔

”آپ کا کام کر دیا ہے سر! کوئی اور حکم ہو تو یوں؟“ ڈاکڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ویر نے موڈ بانہ پوچھا۔

”نہیں۔ فی الحال اتنا کافی ہے۔“ اس نے بے نیازی سے جواب دیا اور پرس سے ایک نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھادیا۔ ویر نے دانت نکالتے ہوئے نوٹ وصول کیا۔

”ریفریگریٹر میں دوسری کام کی چیز بھی آپ کو مل جائے گی سر! اس کے علاوہ کچھ چاہیے ہو تو روم سروس پر بتا دیجیے گا۔ میں خود پہنچا دوں گا۔“ وہ ہاتھ کے اشارے سے سلام کرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ ڈاکڑی جو ابھی تک کھڑی ہوئی تھی، دروازہ لاک کر کے چلی اور اس کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے روم ریفریگریٹر کی طرف بڑھ گئی۔

ریفریگریٹر سے اس کیس کیوں اور ایک سر، ممبر ہوٹل نکال کر اس نے قریب ہی رکھی ایک ٹرے میں ترتیب سے رکھے۔ اس ٹرے میں نہایت نفیس کالج کے دو گلاس پہلے ہی سے موجود تھے۔ ان خاص لوازمات سے کئی ٹرے اٹھائے وہ سجاد رانا کی طرف آئی۔ اس کی ہر حرکت میں بڑا توازن اور اعتماد تھا۔ وہ کال گرل کی حیثیت سے اس کمرے میں آئی تھی لیکن اس کے کسی انداز میں بازاری پن نہیں تھا۔ اسے دیکھ کر کسی بھی پڑھی لکھی الزما ڈرائیور کی خیال آتا تھا۔ سجاد رانا جو بہت قیمتی نظر سے اس کی ایک ایک جنبش کو نوٹ کر رہا تھا، کافی مطمئن نظر آنے لگا۔ اس نے اپنے تجربوں کی اطلاع پر جن لوگوں کو چیک کرنے کا فیصلہ کیا تھا، ان کے بارے میں یہی معلوم ہوا تھا کہ ان کے لیے کام کرنے والی لڑکیاں بے حد

نفیس ہوتی ہیں۔ اعلیٰ عہدے داروں اور سیاست دانوں کے ذوق کی تسکین کے لیے کسی عاصم بازاری عورت کا رکھ رکھاؤ رکھنے والی عورت سے گزراہ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ اس قسم کی لڑکیوں کے سپلائرز کے طور پر جو نام سامنے آئے تھے، ان میں سے ایک اس قایم بازار ہوٹل کا ویریجی تھا۔ اس نے اپنے جس آدمی کے ذریعے ویر سے رابطہ کیا تھا، اس نے صاف لفظوں میں ویر کو بتا دیا تھا کہ لڑکی ڈی آئی جی صاحب کو درکار ہے اس لیے کوئی ایسی لڑکی ہونی چاہیے جو اعلیٰ عہدے داروں کے ساتھ وقت گزارنے کا ٹھیک ٹھاک تجربہ رکھتی ہو۔ کمرے میں موجود لڑکی کو دیکھ کر اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ ویر نے اس کی ذمہ داری پوری کرنے کا مکمل اہتمام کیا ہے۔

”موری سر! میں نے آپ سے اجازت نہیں لی لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ کو اس وقت سب سے زیادہ اسی کی ضرورت ہوگی۔“ ٹرے اس کے سامنے رکھتے ہوئے اس نے نہایت متحرک لہجے میں کہا اور پھر بڑے بے تامل انداز میں پیکی تیار کرنے لگی۔ ایک جام اسے تھامنے کے بعد دوسرا اس نے خود تھام لیا۔

”وہیں اس اتھارٹی ایفی ہینسی دیکھتے ہوئے مجھے ابھی سے اندازہ ہو رہا ہے کہ تمہارے ساتھ میرا وقت بہت اچھا گزرے گا۔“ سجاد رانا کے چہرے پر پہلی بار مسکراہٹ ابھری اور اس نے اسے تعریف سے نوازتے ہوئے جام سے ایک گھونٹ بھرا۔ وہ کوئی زامہ شک نہیں تھا۔ پارٹیز میں دوستوں کے ساتھ ڈرنک کرنا ایک معمول کی بات تھی اور اس وقت تو وہ جو رول ادا کر رہا تھا اس میں شراب کے بعد شباب کی بھی باری آتی تھی۔

”تعریف کے لیے شکریہ سر! میرا کوئی سسٹر کبھی مجھ سے ناخوش نہیں ہوا، آپ بھی مایوس نہیں ہوں گے۔“ اس نے ایک ادا سے بال جھٹکتے ہوئے اسے جواب دیا اور نہایت نزاکت سے جام سے ایک گھونٹ بھرا۔

”میں نے سن رکھا ہے کہ بڑے بڑے لوگ تمہارے سسٹر میں شامل ہیں۔ آج ہمیں بھی یہ اعزاز حاصل ہو گیا۔“ اس نے غیبت عاشقانہ لہجہ اچٹایا۔

”اعزاز تو یہ ہمارے لیے ہے سراجا ہاری ساری قدر و قیمت تو آپ کے دم سے ہے۔ اس روم سے باہر ہوں تو ہم کچھ بھی نہیں۔ لیکن ابھی آپ کے ساتھ ہیں تو ہوٹل کے معمولی ویر سے، لاک تک جس سے بھی سامنا ہو جائے، وہ جھک کر عزت سے بات کرے گا ہمارے ساتھ۔“ وہ واقعی اپنے بیٹھے کے اعتبار سے تربیت یافتہ تھی جسے اپنے گاہک کو غبارے کی

طرح ہوا بھر کر کھلنا خوب آتا تھا۔

”تم تو کافی حساس اور ذہین خاتون نکلتی ہو۔ مجھے لگتا ہے کہ آج کے بعد بھی میرا تم سے بار بار ملنے کا کامیاب رہے گا۔“
سجاد رانا بھی اپنی شکست مٹانے کے مطابق خوب چل رہا تھا۔
”بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ آپ ابھی تو ہم سے مل کر دیکھیں۔“ وہ ایک دم جارحانہ موڈ میں آگئی۔ اپنے دماغ کو پوری طرح الارٹ رکھنے کے باوجود بھی سجاد رانا کو تسلیم کرنا پڑا کہ وہ لڑکی کسی بھی مرد کے ہوش و حواس چھین لینے کی پوری پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ اس کے ساتھ گزرنے والے اگلے دو پڑھ دو گھنٹے اس کے لیے خست آزمائش کے تھے۔ اس آزمائش سے کسی نہ کسی طرح گزرنے کے بعد جب اس نے اس حسین فتنے کو وہاں سے رخصت کیا تو اتنا مطمئن ضرور تھا کہ اس لڑکی کی صورت میں ایک ایسا راستہ دکھائی دے گیا ہے جس پر چلتے ہوئے وہ اپنے اصل ہدف تک پہنچ سکتا ہے۔

☆☆☆

سجاد رانا سے ہونے کے کمرے میں کال گرل کی حیثیت سے ملنے والی اس لڑکی کا نام جولیا تھا لیکن اپنے قدر دانوں میں وہ مس جولیا کے نام سے پہچانی جاتی تھی۔ قیامت خیز حسن رکھنے والی مس جولیا جب ہوٹل سے روانہ ہوئی تو اسے پورا یقین تھا کہ وہ سجاد رانا کو متاثر کرنے میں کامیاب رہی ہے۔ اس کامیابی کا مطلب تھا کہ اسے سجاد رانا سے مزید ملاقات کے مواقع بھی میسر آئیں گے۔ اس پہلی ملاقات میں تو اس نے احتیاطاً اسے کسی حساس موضوع پر چھیڑنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ مبادا وہ چونک جائے لیکن اسے امید تھی کہ آئندہ دو بار ملاقاتوں میں وہ اسے کھولے میں کامیاب ہو جائے گی۔ یہی اس کا مشن بھی تھا۔ ہائی ڈسٹنسی میں مود کرنے والی کال گرل کا بہرہ وہ اس نے کچھ خاص مقاصد کے حصول کے لیے ہی اٹھایا تھا لیکن ابھی تک اس کے کریڈٹ پر کوئی خاص کارنامہ موجود نہیں تھا۔ ابھی تک وہ ایک آدھ ہی اعلیٰ افسر تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکی تھی اور وہ بھی ایسے نہیں تھے جن سے وہ بہت زیادہ کارآمد معلومات حاصل کر سکتی۔ اسے تو اس پر بھی حیرت ہوئی تھی کہ اسے سجاد رانا سے ملاقات کے لیے کیوں منتخب کیا گیا؟ حالانکہ اس کی طرف سے واضح طور پر خواہش ظاہر کی گئی تھی کہ کوئی بہت ہی تجربہ کار لڑکی ہونی چاہیے۔ وہ بہت یافتہ بھی لیکن عملی تجربہ بہ اتنا زیادہ نہیں تھا جتنا کہ اسے یوں کی ہدایت پر اس نے سجاد رانا پر یہی ظاہر کیا تھا کہ وہ اس سے پہلے بھی

بہت سے اعلیٰ عہدے داروں کے ساتھ وقت گزار چکی ہے۔ اس نے اس کی بات پر یقین بھی کر لیا تھا اور اب وہ اس سے رخصت ہو کر بہت خوش خوشی واپس جا رہی تھی۔ سجاد رانا کے منہ میں آجانے کا مطلب تھا کہ وہ اس سے بہت سے قیمتی راز اگوانے میں کامیاب ہو جائے گی اور یہ کامیابی اسے اپنے آقاؤں کے سامنے سرخ رو کر کے اس کی ترقی کا سبب بن سکتی تھی۔ کامیابی کے نشے میں چور اپنے ٹھکانے کی طرف واپس لوٹتے ہوئے اسے قطعی اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ تعاقب کرنے والے کی مہارت نے بھی اس کے بے خبر رہنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ وہ سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ موجود ہونے کے باوجود اس کی نظروں سے اوجھل رہا تھا۔

جولیا شہر کے پوش علاقے میں رہتی تھی۔ اس کے پاس اپنی ایک چھوٹی سی گاڑی بھی موجود تھی جسے وہ خود ہی ڈرائیو کرتی تھی۔ اس وقت بھی وہ اسی گاڑی کو ڈرائیو کرتے ہوئے اپنے فلیٹ کی طرف جا رہی تھی۔ ڈرائیونگ کے دوران ہی اس نے گلوکسٹن میں رکھا ایک موبائل سینٹ نکالا اور اسے آن کیا۔ اس موبائل میں موجود نام ڈیڑھ سو منوں میں سے ایک تھی جو اس نے اپنی دیگر ساتھیوں کی طرح غیر قانونی طور پر رکھی ہوئی تھیں۔ کال ٹریس ہونے کے خطرے سے بچنے کے لیے ایسی ہم کا استعمال سب سے محفوظ رہتا تھا۔ اس وقت وہ اپنے فلیٹ پر پہنچنے سے پہلے اپنی کارکردگی کی رپورٹ اوپر والوں کو دینا چاہتی تھی اسی لیے موبائل باہر نکالا تھا لیکن نمبر ملانے پر اس کا اپنے مطلوبہ نمبر پر رابطہ نہیں ہو سکا۔ موبائل کی اسکرین پر روشن ہونے والے NOT AVAILABLE کے الفاظ نے اسے حیرت میں مبتلا کر دیا۔ باقی کا راستہ بھی وہ بار بار نمبر ملا کر دیکھتی رہی لیکن ہر بار ایک ہی نتیجہ سامنے آتا رہا۔ اسی الجھن میں مبتلا وہ اپنی منزل تک پہنچ گئی اور اسے علم ہی نہ ہو سکا کہ ہوٹل سے یہاں تک اس کا تعاقب کرتے ہوئے آنے والا شخص اس کا فلیٹ نمبر جاننے کے بعد کب چپکے سے واپس بھی چلے گیا۔ اپنے فلیٹ میں داخل ہونے کے بعد اس نے پہلے لاؤنج کی انٹ روٹن کی اور پھر بیڈ روم کی طرف بڑھی۔ بیڈ روم مکمل تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے سوچ بورڈ پر موجود تیسرے طبقہ کو بالکل صحیح انداز سے کے ساتھ اس طرح دبا دیا جیسے دن کی روشنی میں اسے دیکھ رہی ہو۔ منہ دبتے ہی کمرے میں ٹیوب لائٹ کی دودھیا روشنی پھیل گئی لیکن اس روشنی میں اس کی نظر جس چہرے پر پڑی، اس نے اسے منگ کر دیا۔

”مس گیتا آپ؟ میں تو خود آپ کو فون پر رپورٹ کرنے والی تھی لیکن آپ سے رابطہ ہی نہیں ہو سکا۔“ اس نے خود کو لگنے والے جھٹکے سے تیزی سے سمجھتے ہوئے کرسی پر بیٹھی تقریباً اپنی ہم عمر لڑکی سے کہا۔ لڑکی کے ہم عمر ہونے کے باوجود جولیا کے کچھ میں موجود احترام بتا رہا تھا کہ وہ اس سے سینئر ہے۔

”اچھا! کیا رپورٹ ہے تمہارے پاس؟“ گیتا نے تسخیرانہ کچھ میں اس سے دریافت کیا۔
”ابھی تو پہلی ملاقات تھی لیکن میں سجاد رانا کو متاثر کرنے میں کامیاب رہی ہوں۔ اس نے خواہش ظاہر کی ہے کہ وہ دوبارہ بھی مجھ سے ملنا پسند کرے گا۔ میرے خیال میں وہ اتنا متاثر ہو چکا ہے کہ ایک آدھ دن میں دوبارہ رابطہ ضرور کرے گا۔“ وہ جو سجاد رانا سے ملاقات کے بعد بہت بڑبڑھاتی تھی، گیتا کو اپنے فلیٹ میں پا کر خاصی کنفیوز ہو گئی تھی اور کچھ دے دے سے انداز میں اپنی کارکردگی کے بارے میں اسے بتا رہی تھی۔

”میرے خیال میں تمہارا اندازہ بالکل ٹھیک ہے۔ سجاد رانا تو تم سے اتنا متاثر ہوا ہے کہ اس نے تمہارا ٹھکانا معلوم کرنے کے لیے تمہارے پیچھے پیچھے اپنا آدمی بھی بھیج دیا ہے۔“ گیتا نے بے حد چپا چپا کر بولنے ان جملوں نے جولیا کے چہرے پر خوف دوڑا دیا۔

”یہ نہیں ہو سکتا۔“ اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے تردید کرنے کی کوشش کی۔

”ایسا ہی ہوا ہے لیکن تمہاری بے خبری سے ظاہر ہے کہ تم نے اپنی تربیت سے کچھ نہیں سیکھا۔ اگر ہم نے تمہاری عمرانی پر اعتیاد اپنا آدمی نہ لگا دیا ہوتا تو تم اپنے ساتھ ساتھ اور بھی بہت سون کو مر وادیتیں۔“ گیتا کا لہجہ زہر خند ہو رہا تھا۔ جولیا اپنا سر پکڑتی ہوئی بند پر دھمکی گئی۔

”اسی باتیں کارکردگی کا انجم معلوم ہے نا تمہیں؟“ گیتا نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا جس کے جواب میں وہ شخص سر ہی ہلا سکی۔

”تمہیں یاد ہو گا کہ ہم سب کی طرح تم نے بھی ”را“ میں شامل ہوتے وقت وجہ دیا تھا کہ دیش کی خاطر جان بھی دینے سے نہیں ہٹتی تھی۔ اس وقت کی ناکامی کا داغ دھونے کے لیے تمہیں اپنا وہ جن پرور کرنا ہوگا۔“

”کیسے؟“ وہ بے مشکل گیتا سے یہ سوال کر سکی۔

”یہ رائٹنگ پیڈ اٹھاؤ اور اس پر لکھو کہ میں ایک کال کرل کی زندگی گزارتے گزارتے بیزار ہو گئی ہوں اس لیے

اس زندگی سے چھکارا پانے کے لیے خودکشی کر رہی ہوں۔“ وہ کانپتے ہاتھوں سے گیتا کی ہدایت پر عمل کرنے لگی۔ گیتا کی آنکھوں میں کبھی اپنی موت وہ بہت اچھی طرح پڑھ رہی تھی۔ اگر اس کی بات ماننے سے انکار کرتی، تب بھی موت سے نہیں بچ سکتی تھی اس لیے بہتر تھا کہ اس کی بات مان لے۔ کم از کم اس پر دیش دروہی (نقدار) ہونے کا الزام تو نہیں آتا۔

”ویری گڈ! اب یہ، یہ دودھ پی کر اچھے بچوں کی طرح بست پر آنکھیں بند کر کے لیٹ جاؤ۔“ وہ نوٹ لکھ کر فارغ ہوئی تو گیتا نے پہلے سے تیار کیے ہوئے دودھ کے گلاس کی طرف اشارہ کیا۔ جولیا کو اندازہ تھا کہ ہوٹل سے اس کے تعاقب کا علم ہوتے ہی اس کے اوپر والے فوراً حرکت میں آگئے ہوں گے، تب ہی تو اس کے فلیٹ پر پہنچنے سے قبل گیتا اس کی موت کا ہر کارہ بن کر پہلے ہی وہاں پہنچ گئی تھی۔ دودھ کی شکل میں گلاس میں موجود اپنی موت کو کھنے سے بچنے کا تارے ہوئے اسے اس سوال کا جواب بھی مل گیا تھا کہ سجاد رانا جیسے افسر کے لیے کسی بھی ہوئی ایجنٹ کے بجائے اس کا انتخاب کیوں کیا گیا؟ یقیناً طور پر وہ لوگ سجاد رانا کی طرف سے پہلے ہی مشکوک تھے چنانچہ کسی قیمتی ایجنٹ کو ضائع کرنے کا رسک لینے کے بجائے انہوں نے جولیا کو چالا بنا کر سجاد رانا کے سامنے ڈال دیا تھا اور اب اسے دیش پر بھی ہونے کا ثبوت دینے کے لیے خود اپنی موت کو اپنے وجود میں اتارنا پڑ رہا تھا۔

☆☆☆

”کیا خبر ہے سلیم! کہیں کوئی گریز تو نہیں؟“
”گریز تو کافی تھی سر لیکن ہم نے معاملہ سنجال لیا ہے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ہم سجاد رانا کی ایکٹیویز کے بارے میں پہلے ہی خاصے الارٹ تھے ورنہ خبری میں مارے جاتے۔ اسے یقیناً کہیں سے کیول گیا تھا کہ ہماری ورکر لڑکیاں کال گرل کے جیسے میں بھی کام کر رہی ہیں۔ کسی طرح وہ درمیانی آدمی تک بھی پہنچ گیا تھا۔ میں پہلے ہی سے الارٹ تھی اس لیے کسی خاص ورکر کے بجائے جولیا کو اس کے پاس بھیج دیا۔ جولیا کی نگرانی پر موجود بندے نے جیسے ہی یہ اطلاع دی کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے، میں نے فوری ایکشن لے لیا۔ دیگر فرد اسٹین ڈیوٹی سے واپس جاتے ہوئے ایک ٹرک کی زد میں آکر مارا گیا ہے جبکہ جولیا کی موت آتما تھیا ظاہر کی گئی ہے۔ دونوں کام بالکل نیچرل طریقے سے کیے گئے ہیں لیکن ظاہر ہے، سجاد رانا چونکہ تو ضرور جائے گا۔ اسے ملنے والے کلیڈ زمانے کے لیے اپنے دونوں ورکرز کی بی دینا ضروری ہو گیا تھا ورنہ آئندہ اس سے بھی زیادہ نقصان اٹھانا پڑتا۔“

سٹھیا نے مودبانہ لہجے میں اسے مکمل رپورٹ پیش کی۔
 ”ورکرز کا پرائم نہیں۔ ایسے نچلے درجے کے کام کرنے کے لیے تو بہت لوگ مل جائیں گے لیکن اصل مسئلہ سجاد رانا کا ہے۔ بیٹی کی موت نے اسے پاگل کر دیا ہے اور وہ ہر حال میں اس کے قاتلوں تک پہنچنا چاہتا ہے۔ اس کے اس پاگل پن کی وجہ سے اچھا خاصا بنا بنا یا سیٹ اپ خراب ہو گیا ہے۔ مجھے اپنے سارے لوگ انڈر گراؤڈ کرنے پڑے ہیں۔ اب اگر وہ تمہاری ورکرز کیوں کے پیچھے پڑ گیا تو ہم اور بھی کھٹائیوں کا شکار ہو جائیں گے۔“

”اگر آپ سخت دیر تو اسے خاموش کرنے کا بندوبست کیا جائے؟“ سٹھیا نے مغربی غصے میں سوال کیا۔

”میرے خیال میں ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ ہماری...“

گڈلک ہے کہ ذاتی انتقام کے چکر میں پڑنے کی وجہ سے سجاد رانا نے ساری انفارمیشن اپنی ذات تک ہی محدود رکھی ہے۔ میں اپنے سوسر سے اس بات کی تصدیق کر چکا ہوں کہ سجاد رانا اپنی کسی بھی ایکٹیویٹی کو کسی انجینی کے ساتھ شیئر نہیں کر رہا ہے۔ پھر بھی خطرہ تو ہے کہ وہ ہمارے لیے کوئی مصیبت کھڑی کر سکتا ہے۔ پہلے ہی پیر آباد اور اللہ آباد والے سیٹ اپ جڑنے کی وجہ سے اوپر والے مجھ سے ناراض ہیں۔ تم سب کی تو پھر بھی بچت ہو جاتی ہے لیکن مجھے ڈرائیونگ جواب دینا پڑتا ہے۔ اوپر والے مجھ سے پوچھتے ہیں کہ مسٹر ورما! تمہارے لوگ یہ سیٹی غلطیاں کر رہے ہیں؟ میرے پاس شرمندگی کے سوا کوئی جواب نہیں ہوتا۔“ وہ خاصا خفا لگتا تھا۔

”لیکن سجاد! ہماری طرف سے تو آپ کو کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔ پچھلے دنوں ہم نے اپنے دونوں ٹاسک کتنی کامیابی سے پورے کیے ہیں۔ یہاں کی ایکٹیویز یہ تک معلوم کرنے میں کامیاب نہیں ہوئیں کہ ایلپو زیو آیا کہاں سے؟“ سٹھیا نے اپنی کارکردگی بتائی۔

”اس بات سے تو مجھے بھی انکار نہیں۔ میرا خیال تھا کہ تمہاری ان کارروائیوں سے ہم حکومت کو بلانے کے علاوہ سجاد رانا کا دھیان بھی بنانے میں کامیاب رہیں گے۔ اصولاً موجودہ چیئرمین میں اسے اتنا مصروف ہو جانا چاہیے تھا کہ اپنی بیٹی کی موت کے معاملے کو بھول جاتا لیکن وہ نہیں بھولا۔ ایسے لوگوں کے لیے یہی مناسب رہتا ہے کہ ان کا کوئی مستقل انتظام کر دیا جائے۔“ ورمانے گویا سجاد رانا کی موت کے پروانے پر ہر تصدیق شیت کر دی۔

”آپ کہیں تو یہ کام بھی میں کر دوں سر؟“

”نہیں، فی الحال تو تم بھی احتیاط سے کام لو۔ یہ کام

کرنے کے لیے دوسرے بندے ہیں میرے پاس۔“ ورمانے سختی سے انکار کیا تو سٹھیا کو خاموشی اختیار کرنی پڑی۔

”یہ بتاؤ کہ شہر یار کے سلسلے میں کچھ ہوا یا نہیں؟ جوانی کے جوش میں وہ بہت پر پڑے نکال رہا ہے۔ وہ ایکٹیو ہوتا تو ہمارا پیر آباد اور اللہ آباد والا سیٹ اپ تباہ نہیں ہوتا۔ سالے آئیش کو اپنی بری عادت کی وجہ سے پیر آباد کی مسجد چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ دوسرے اگر وہ اسے ہی کاچر اس معاملے میں نہیں کودتا تو پولیس والے اتنی اپنی شخصی دکھائی نہیں دیتے تھے کہ مسجد کے حجرے کا فرش کھود کر بچے کی لاش نکال لیتے۔ پانڈے کی حماقت کے بارے میں میں بھی نہیں معلوم ہے۔ اس نے نور پور میں بلاسٹ کے لیے غلط لڑکے کا سلیکشن کیا۔ لڑکے کا مادر سے سے تعلق ظاہر ہونے کے بعد یہ سمجھنا کون سا مشکل تھا کہ اس کارروائی کے پیچھے کون تھا۔ وہ تو پانڈے کی ملک اپنی بھی کر وہ پہلے ہی نکل چکا تھا اور آئیش کو بھی نکلنے کا موقع مل گیا۔“

سٹھیا رینک کے اعتبار سے ورمانے نیچے تھی لیکن اس کی کارکردگی ہمیشہ اتنی اچھی رہی تھی کہ وہ دوسروں کے مقابلے میں بہت زیادہ قابل پھر وساجھی جاتی تھی اس لیے ورمانے بھی اس کے سامنے یہ ساری گفتگو کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کر رہا تھا۔

”آپ فلیکشن مت لیں سر! دھیرے دھیرے سب معمول پر آجائے گا۔ شہر یار کو بھی قابو کر لیا جائے گا۔ وہ اپنے ضلع کی ترقی کے جو خواب دیکھ رہا ہے، وہ ہرگز پورے نہیں ہوں گے۔ اس سلسلے میں ہمیں بہت زیادہ محنت نہیں کرنی پڑے گی۔ آدھا کام تو وہاں کا ڈیرا افتخار عالم ہی کر دے گا۔“

سٹھیا نے اسے تسلی دی اور اس کے کشیدہ اعصاب کو آرام دینے کے لیے وہ مسکائی کہ کام تیار کرنے کی۔

کسی زمانے میں وہ اس لائق تھی کہ خود سے کئی سال چھوٹے ورما کو شراب کے ساتھ ساتھ شباب سے بھی مستفید کر سکے لیکن جوانی ڈھلنے کے بعد ورمانے کے لیے اس کے وجود میں کوئی کشش باقی نہیں رہی تھی۔ وہ اگر شباب سے لطف اندوز ہوتا بھی چاہتا تو اس کا انتخاب سٹھیا کے بجائے اس کے انڈر کام کرنے والی کوئی شعلہ جوالا ہوتی تھی۔ ذہن اور نیچہ دار سٹھیا نے وقت کی اس تبدیلی کو آسانی سے قبول کر لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

”رانی! تو نے میری ساری بات اچھی طرح سمجھ لی ہے نا؟ دیکھ، کوئی غلطی نہیں کرنا ورنہ مشکل ہو جائے گی۔“

آدم آجینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے کیلے بالوں میں برش

بھرتی ہوئی کشور نے رانی سے کہا۔

”نہی فکر نہ کرو بی بی! میں سب سنبھال لوں گی۔“

سرخ کام دار دوپٹے کو احتیاط سے ذکر کے ایک بیک میں رکھتے ہوئے رانی نے جواب دیا اور پھر بڑی خوبصورتی سے کشور کی طرف دیکھنے لگی۔ آج وہ بڑی نکری نکری سی لگ رہی تھی۔ پچھلے دنوں کی کیفیت کہیں اندر چھپ گئی تھی اور اندر سے جو روپ نکلا تھا وہ بڑا ہی پیارا تھا۔ اس روپ کو مزید نکھار ایک مشہور پارلر کی ماہر بیوٹیشن نے دیا تھا۔ کل جب کشور نے اسے اچانک باہر چلنے کا حکم سنایا تھا تو وہ بھی تھی کہ بی بی ماسٹر آفتاب سے ملنے جا رہی ہیں لیکن اس کے انداز سے اس نے بڑی برخلاف کشور اسے لہری لے لی تھی جہاں سے اس نے بڑی چھان چٹک کے بعد سرخ عروسی جوڑا اور اس کی بیوٹنگ کے زیورات وغیرہ خریدے تھے۔ لہری نے وہ لوگ سیدھے ایک مشہور پارلر پہنچے تھے۔ اس پارلر کے بارے میں کشور کو اخبار میں چھپنے والے اشتہار کے ذریعے علم ہوا تھا۔ پارلر میں کشور نے اگلے دن کی کنگ کروانے کے ساتھ بیوٹیشن کے مشورے پر ضروری فیس فریٹنٹ بھی کر دیا تھا اور ہاتھ پیروں پر مہندی بھی لگوائی تھی۔ مہندی کو ڈرائیور کی نظروں سے چھپانے کے لیے وہ پارلر سے خود کو بہت اچھی طرح چادر میں لپیٹ کر نکلی تھی۔ واپس آئی تھی۔ کوئی واپس پہنچنے کے بعد کل سے آج تک کا سارا وقت اس نے اپنے کمرے میں ہی گزارا تھا کہ سہارا کوئی میں کام کاج کرنے والی چونکدار کی بیوی نہ چونک جائے۔ کھانے پینے کا سامان رانی نے اسے کمرے میں ہی میا کر دیا تھا۔ کل سے اب تک وہ کشور کی ایک جنبش کا جائزہ لیتی رہی تھی۔ آفتاب سے ملنے جانے کے لیے وہ ہمیشہ ہی بڑی پر جوش نظر آتی تھی لیکن آج تو معاملہ ہی الگ تھا۔ آج وہ صرف محبوبہ بن کر نہیں بلکہ منکوحہ کی حیثیت سے جا رہی تھی۔ اس کے انگ انگ سے چھلکتی مستی اس کی اندرونی کیفیت کے راز افشا کر رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر سچا آؤدھم بالکل ویسا ہی تھا جو بابل کے آنگن سے رخصت ہو کر بی بی کے گھر جانے والی دہن کے چہرے پر چھلکتا ہے۔

”کیا دیکھ رہی ہے رانی؟“ اس کی خوبصورت محسوس کر کے کشور نے اس سے پوچھا۔

”اپنی نظروں سے آپ کی بلائیں لے رہی ہوں بی بی! آج تو آپ اتنی پیاری لگ رہی ہیں کہ آپ کے چہرے سے نظر ہٹانے کو نہیں ہی نہیں کرتا۔“

”اچھا۔“ اس کی بات سن کر کشور خوش گوار انداز میں ہنسی۔

”سوچ لیں ماسٹر صاحب! آج ہم آپ کے ہوش اڑا

کر رکھ دیں گے۔ ابھی تو کچھ تیاری کی ہی نہیں تو رانی کی ہمارے بارے میں بد رائے ہے، جب ہم مکمل تیاری کے ساتھ آپ کے روبرو ہوں گے تو آپ کیا کریں گے؟“ آدھ کی پٹیوں سے آئینے میں اتر آنے والے آفتاب کے عکس کو دیکھتے ہوئے اس نے دل ہی دل میں اسے چیلنج کیا اور پھر خود ہی شرمائی۔

”شریف سے بول رانی کہ گاڑی نکالے۔ میں بھی آ رہی ہوں۔“ رخساروں پر اترتی سرخی کو رانی سے چھپانے کے لیے اس نے بھانے سے اسے کمرے سے باہر بھجا اور تھوڑی دیر بعد خود بھی بڑی سی چادر میں اس طرح لپیٹ کر کہ سوائے آنکھوں کے جسم کا کوئی عضو نظر نہیں آ رہا تھا، کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے سامان والا ایک رانی پہلے ہی ساتھ لے گئی تھی۔ پورٹیکو میں رانی اور ڈرائیور دونوں اس کے منتظر تھے۔ شریف نامی یہ ڈرائیور گاؤں سے ان کے ساتھ ہی یہاں آیا تھا۔ اس سے ملے جب کشور انڈر سٹریل ہوم کی افتتاحی تقریب چھوڑ کر بھانے سے آفتاب سے ملنے اس کے گاؤں والے گھر میں گئی تھی، اب بھی بیٹی ڈرائیور ان کے ساتھ تھا۔ وہ ان کا مکمل راز داں نہیں تھا لیکن جتنا دیکھتا تھا، اسے بھی قیمت وصول کرنے کے بعد بھول جاتا تھا۔ کشور کی حالیہ مصروفیات پر بھی اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور صرف حکم کا غلام بننا مکمل کر رہا تھا۔

”مجھے پارلر میں کافی دیر لگ جائے گی رانی! مجھے وہاں پہنچانے کے بعد تو شریف کے ساتھ کوئی واپس چلی جانا اور حاجرہ کا کام میں ہاتھ بٹانا۔ میرے ساتھ پارلر میں بیٹھ کر تو تجھے کھلیاں مارنے کا کام بھی نہیں کرنا پڑے گا۔ میں دوڑھاٹی کھٹے بعد یا جب بھی فارغ ہوں گی، تجھے کوئی پر فون کر دوں گی۔ تو شریف کے ساتھ آکر مجھے لے جانا۔“ طے شدہ منصوبے کے تحت راتے میں کشور نے بے آواز بلند رانی کو حکم دیا۔ اصل مقصد ڈرائیور کو سنانا تھا۔

پارلر میں داخل ہو کر کشور نے پہلے اپنا سامان ایک مددگار لڑکی کے سپرد کیا پھر اپنے سوا بکسل سے آفتاب کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری ہی من پر کال ریسپونڈ کر گئی۔

”آخر آپ کو ہماری یاد آئی تھی؟“ کال ریسپونڈ کرتے ہی اس نے شکوہ کیا۔

”یاد آنے کے بارے میں تو پوچھیے۔ جن کا خیال دل سے جدا ہی نہ ہوتا ہو، انہیں یہ شک ہو کہ ہم انہیں یاد کرنے کے لیے بھی فرصت کی تلاش کرتے ہیں... تو دل بڑا دکھتا ہے۔ ہم تو بس اپنا وعدہ نبھانے کی کوشش میں لگے ہوئے

تھے۔ کہا تھا کہ اب جب بھی ملیں گے تو اس طریقے سے ملیں گے جو طریقہ ہمارے رشتے کے مطابق شان ہو۔ ہم اپنا وعدہ نبھانے کے لیے تیار ہیں۔ آپ بتائیں، دو گھنٹوں کے اندر آپ ایسی کسی جگہ کا انتظام کر سکتے ہیں جہاں ہم آپ سے ملنے آسکیں؟“ اس نے آفتاب کے شکوے کا بھرپور جواب دیتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”جگہ کا تو کوئی مسئلہ نہیں۔ میں اپنے دوست کے گھر ٹھہرا ہوا ہوں۔ آپ بتائیں کہ یہاں کیسے پہنچیں گی؟ آپ چاہیں تو میں آپ کو لینے آجاتا ہوں... بتائیں کہاں ملیں گی؟“ وہ سارے شکوے بھول کر اس سے ملنے کے خیال سے جوش میں آگیا۔

”بتائیں... ایسی بھی کیا جلدی ہے؟ بس دو گھنٹے تک انتظار کیجیے پھر آپ کو جگہ بھی بتا دی جائے گی۔“ اس کی بے قراری سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کشور نے شرارت سے کہا اور لائن کاٹ دی۔ اس کا خیال تھا کہ آفتاب دوبارہ کال کر کے اس سے بات کرنے کی کوشش کرے گا لیکن تیاری کے طویل مرحلے سے گزرتے ہوئے ایک بار بھی اس کے موبائل کی گھنٹی نہیں بجی۔ آفتاب کی اس بے اعتنائی پر وہ دل ہی دل میں رو ہائی ہوئے تھے۔

بیوٹیشن نے اسے مکمل تیار کر کے اپنے کے سامنے کھڑا کیا تو اس وقت تک وہ عجیب سے تدبیر کا شکار ہو گئی تھی۔ اسے کچھ نہیں آ رہا تھا کہ جس شخص سے ملنے کر وہ بارہ پوچھا بھی نہیں اس کے لیے اتنی تیاری کرنی بھی چاہیے تھی کہ نہیں؟ وہ ابھی اسی سوچ میں گھری کھڑی تھی کہ خاموش موبائل بول پڑا۔ کال کرنے والا آفتاب کے سوا کوئی دوسرا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

”امتحان کے دو گھنٹے گزر گئے ہیں محترمہ! اب فرمائیے کہ کہاں حاضر ہوں؟“ اس کی شوخ زندگی سے بھرپور آواز نے کشور کے تن مردہ میں بھی جان ڈال دی۔ اس نے فوراً آفتاب کو اس پارکار کا پتہ بتایا جہاں وہ اس وقت موجود تھی۔

”بس دس منٹ انتظار کیجیے۔ میں پہنچتا ہوں۔“ اس نے جواب دیا اور واقعی دس منٹ بعد وہ وہاں پہنچ چکا تھا۔ پارلر سے نکلنے سے پہلے کشور نے پہلے ہی کی طرح خود کو چادر میں چھپایا تھا لیکن غلطی بنی وہاں اور گلاب کے پھول کی مہی تو خاموش ہوتی ہے کہ چھپانے کے باوجود ان کی مہک چھپ نہیں پاتی۔ آفتاب نے بھی اس کی تیاری بھانپ لی تھی اور زیر لب مسکرا رہا تھا۔

”لگتا ہے آج آپ مجھے سر پر اندر دینے کے موڈ میں

ہیں۔“ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے ساتھ بیٹھی کشور کو چھیڑا۔ جواباً وہ خاموش رہی۔ آفتاب نے بھی راستے بھر مسکراتے رہنے کے سوا اس سے دوسری کوئی بات نہیں کی۔ دس منٹ بعد وہ اپنے دوست کے دو منزلہ مکان کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ دروازے پر گاڑی روک کر اس نے ہارن دیا تو تقریباً اسی کے ہم عمر ایک مرد نے گیٹ کھول دیا۔ آفتاب کھلے گیٹ سے گاڑی اندر لے گیا۔ سامنے ہی ایک بے حد گوری اور فربہ سی خاتون کے ساتھ دو چھوٹے بچے کھڑے ہوئے تھے۔ آفتاب گاڑی سے اتر کر اس کی ساختہ والے دروازے پر آیا اور اسے ہاتھ پکڑ کر گاڑی سے اتارا۔ وہ جو اسے سر پر اندر دینے کے لیے آئی تھی، اب شرم و حیا اور گھبراہٹ کے مارے ہاتھ کا قہار رہی تھی۔ وہی سہمی کسر اس وقت پوری ہو گئی جب استقبال کے انداز میں کھڑی خاتون اور بچوں نے پہلے اس پر پھولوں کی چٹائیاں بچھا دیں اور پھر خاتون نے ایک موٹے سا ہار اس کے گلے میں ڈال کر اسے خود سے لپکا کر پیار کیا۔

”بڑی امیر جی میں آئی ہو دیورانی صاحبہ... اس لیے اگر کوئی کمی رہ جائے تو نظر انداز کر دینا۔“ اسے گلے سے لگائے لگائے خاتون نے کہا اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر کی طرف لے گئیں۔ دونوں بچے بھی ساتھ ساتھ تھے۔ خاتون کشور کو ایک کمرے میں لے جانے لگیں تو بچوں میں سے ایک نے احتجاج کیا۔

”یہ کیا میاں! کیا دیکھ رہا ہے؟ ساتھ ڈرنیوں کرے گی؟“ ”جی، لیکن ہمارے ساتھ نہیں بلکہ اپنے دوہلا کے ساتھ ڈرنے کرے گی۔“ خاتون نے بچے کو جواب دیا اور کشور کی طرف متوجہ ہو کر اس سے بولی۔

”مجھے اندازہ ہے کہ تم زیادہ وقت کے لیے یہاں نہیں رک سکو گی اس لیے تمہیں اور آفتاب کو ایک ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کا موقع دینے کے لیے میں نے یہ انتظام کیا ہے کہ تم لوگ کھانا اپنے کمرے میں ہی کھاؤ۔ ہمارا آپس میں تفصیلی تعارف اور ملاقات بعد میں ہو جائے گی۔ ابھی تم بس یہ سن لو کہ آفتاب، افضل کو اپنے گئے بھائیوں کی طرح عزیز سے اور اس کے حوالے سے تم بھی ہمارے لیے اتنی ہی اہم ہو۔ ہمیں بھی غیر مت بھنا۔“ خاتون کے غلوں میں جملے کو سنتے ہوئے وہ کمرے کے اندر داخل ہوئی تو مہربوت رہ گئی۔ پورا کمرہ اچھولوں سے بھرا ہوا تھا اور لگتا تھا کہ کئی دہائیوں کے استقبال کے لیے بائیں پھیلائے کھڑا ہو۔

”یہ سارے پھول آفتاب خرید کر لایا تھا۔ میں نے اور افضل نے اس کے ساتھ مل کر انہیں ڈیکوریت کیا ہے۔“

خاتون نے اسے اطلاع دی تو وہ مسکرا دی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ دو گھنٹے جو اس نے پارلر میں گزارے تھے، ان میں آفتاب بھی بہت مصروف رہا تھا۔

خاتون اسے کمرے میں پہنچا کر بچوں سمیت باہر نکلیں تو فوراً ہی آفتاب چلا آیا۔ خوشی اس کے چہرے پر بھی مسکراہٹ بن کر کھیل رہی تھی۔ گاڑی میں تو وہ حیا کی وجہ سے دھیان نہیں دے سکی تھی لیکن اب اس نے دیکھا تھا کہ وہ اپنے ہمیشہ والے لباس سے بہت کم بہت خوب صورت آف و ہائٹ رنگ کے کرتے شلوار میں ملیں ہے۔

”مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ آپ کس انداز سے ملنے کے لیے آ رہی ہیں۔ دو گھنٹے کے مختصر وقت میں بڑی بھاگ دوڑ کر کے یہ سارا انتظام کیا ہے۔ افضل اور مہتاب بھابی نے بھی میرا بڑا ساتھ دیا اور تم آپ کے سر پرانز کے مقابلے میں ہماری ادھوری تیاری تو ہمیں آپ کے روپر و شرمندہ کروا دیتی۔“ کشور کے مقابل بیٹھتے ہوئے اس نے گفتگو کا آغاز کیا اور اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے جگر جگر کرتے ہوئے گھنٹوں سے مرصع ناز کی انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنا دی۔

”جس دن سے نکاح ہوا ہے اسے جب میں لیے محوم رہا تھا کہ جیسے ہی موقع ملے حق، حق دار تک پہنچا دیا جائے۔“ خوشی سے بوجھل لہجہ کشور کو یقین دل رہا تھا کہ اس نے ناحق اس شخص تک پہنچنے کے لیے اتنا کٹھن نہیں اٹھایا۔ وہ واقعی اس کا سچا قدر دان تھا۔ بالکل اس جو ہری کی طرح جس کے ہاتھوں میں آکر غیر تراشیدہ ہیرے کی قسمت جاگ اٹھتی ہے۔ اس نے بھی بے خوشی اپنا آپ اپنے قدر شاس جو ہری کو سونپ دیا۔



”تو بی بی کے ساتھ ہی رک جاتی تو اچھا تھا۔“ گاڑی واپسی کے راستے پر ڈالتے ہوئے شریف نے رانی سے کہا۔ ”کیسے رک جاتی؟ خناسن تھا تو نے کہ بی بی نے آپ مجھے کوٹھی واپس جانے کا حکم دیا تھا۔“ شریف کی بات کے جواب میں رانی چمک کر بولی۔

”دو تھک ہے، پر مجھے دے چودھری صاحب سے فرگلتا ہے۔ کیا خبر انہیں بی بی کا اس طرح اکیلے کوٹھی سے باہر نہیں رہنا چھانڈ لگے۔“ وہ تدبیر کا شکار تھا۔

”اس سے نہیں کیا؟ ادھر تو بی بی ہی ہمارے سامنے ہیں۔ ہمیں ان کا ہی حکم ماننا ہوگا۔ دے دیے بھی دے چودھری کو خیر کیسے ہوگی اس گل کی... کیا تو بتاے گا انہیں؟“ بے نیازی کا مظاہرہ کرتے کرتے اس نے اچانک معنی خیز انداز میں پوچھا۔

”مینیو لوڑ پڑی ہے؟ میں تو بی بی کے خیال سے ہی کہہ رہا تھا۔“ وہ رمان کر بولا۔ پھر پانی کے راستے میں اس کے اور رانی کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ کوٹھی واپس پہنچنے کے بعد رانی چوکیدار کی بیوی حارہ کے ساتھ کاموں میں ہاتھ بٹانے لگی۔ کاموں کے دوران ڈیڑھ گھنٹے کا دورانیہ تیزی سے گزر گیا۔ کام کرنے کے ساتھ ساتھ حارہ سے باتوں میں مصروف رانی کا ذہن وقت کا حساب کتاب بھی کر رہا تھا۔ پونے دو گھنٹے گزرنے کے بعد اس نے چوبلیے پر چائے کا پانی چڑھا یا۔

”باورچی خانے کا باقی کام میں دیکھ لوں گی حارہ... تو ذرا میری کر کے بی بی کے کمرے کی بھانڈ پونچھ کر دے۔ بی بی نے کھر سے نکلے ہوئے مجھے حکم دیا تھا، پر میں بھول گئی۔ تو جلدی سے یہ کام کر اچھل کر چائے پیٹے ہیں۔“ چائے کا پانی کھولنے لگا تو اس نے بہانے سے حارہ کو وہاں سے بنایا۔ وہ اس کی بات مان کر باہر نکل گئی تو اس نے جلدی سے چائے تیار کر کے پہلے ایک پیالی میں اپنے لیے نکالی پھر باقی کی چائے میں اپنے گریباں میں چھپا کر رکھی بڑا نکال کر اس میں موجود گولیاں الٹ دیں۔ یہ لیٹین ہونے کے بعد کہ گولیاں چائے میں پوری طرح حل ہو چکی ہیں، اس نے چائے کو تین پیالیوں میں الٹا اور کپڑے میں رکھ کر باہر نکل گئی۔ سب سے پہلے اس نے گیٹ پر موجود چوکیدار کو چائے پہنچائی پھر شریف کے کوارٹر میں پہنچ گئی۔

”لے بھائی شریف! چائے پی لے۔ بی بی کا فون آیا تھا۔ کہہ دی تھیں ابھی ادھا گھنٹا ہو رہے گا۔ تو چائے پی کر تھوڑی دیر آرام کر لے۔ فیر ہم انہیں لینے چلیں گے۔“

”چنگا ہے۔“ شریف نے اس کے ہاتھ سے چائے کا کپ لے لیا پھر بڑبڑانے کے انداز میں بولا۔ ”ایک گل مجھ نہیں آ رہی۔ یہ اچانک بی بی کی نوینے سنورنے کا اتنا شوق کیوں چڑھ گیا کہ روز روز پور (پارلر) جانے لگیں؟“

”کیوں، بی بی انسان نہیں ہیں کیا جو ان کا دل کسی چیز کو نہیں چاہ سکتا؟ ویسے بھی مجھے کچھ مجھے کی ضرورت کیا ہے؟ تو اپنے کام سے کام رکھ۔“ براہ راست مخاطب نہ کیے جانے کے باوجود وہ جانتی تھی کہ شریف نے اسی سے سوال کیا ہے اس لیے اسے کوک کر باہر نکل گئی۔ سامنے ہی حارہ چلی آ رہی تھی۔

”کردی صفائی؟ چل آتیرے کوارٹر میں بیٹھ کر چائے پیٹے ہیں۔ تھوڑی مگ شپ بھی لگائیں گے۔“ حارہ کو لے کر وہ اس کے کوارٹر میں چلی گئی۔ اپنی اپنی چائے پیٹے ہوئے وہ

دونوں ہاتھ بھی کرتی رہیں۔ چائے شمع ہوتے ہی حاجرہ جمایا لیتے گی۔

”آج چائیں کیوں ابھی سے نیند آنے لگی؟“ منہ پر ہاتھ رکھ کر جھانی روکنے کی کوشش کرتے ہوئے حاجرہ نے کہا۔
 ”تھک گئی ہوگی۔ تھوڑا آرام کر لے۔ میں بھی چلتی ہوں۔ ابھی شریف کے ساتھ بی بی کو لینے بھی جانا ہے۔“ اسے مشورہ دے کر وہ کوارٹر سے باہر نکل گئی۔ گولیوں کی اثر انگیزی کے بارے میں اسے اچھی طرح معلوم تھا۔ ان گولیوں کی مدد سے تو وہ حویلی میں موجود ملازمین اور مالکان کی بڑی تعداد کو غافل کرنے میں کامیاب ہو جاتی تھی۔ یہاں صرف تین بندوں سے نمٹنا کیا مشکل تھا؟ چائے کی ٹرے باورچی خانے میں رکھ کر وہ گیٹ کی طرف آئی۔ چوکیدار کرسی پر بیٹھا ادگھر رہا تھا۔

”نیند آ رہی ہے تو اندر اپنے کوارٹر میں جا کر سو جاؤ۔“ گھٹنے دو گھٹنے بعد ڈیوٹی پر واپس آ جانا۔“ چوکیدار کا شانہ ہلا کر اس نے اسے یہ مشورہ دیا تو وہ اٹھتا ہوا اپنے کوارٹر کی طرف چلا گیا۔ اب رانی کو اطمینان تھا۔ صبح حسب پروگرام کشور رانی سمیت اُن تینوں کو اپنے سامنے ہلا کر ان کی غیر ذمے داری پر ڈانٹ بھی پلائی اور یہ بھی ظاہر کرتی کہ کوشی پر کسی ملازم سے رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے رات اسے مجبوراً کوشی سے تنہا واپس آنا پڑا۔ ملازم اس صورت حال پر مشکوک تو ضرور ہوتے لیکن ظاہر ہے وہ مالکان سے بحث نہیں کر سکتے تھے۔ رانی بھی مالکان کی ڈیوٹی ہونے کی وجہ سے محکوم نظر آتی۔

ہر طرف سے مطمئن رانی کوشی میں کشور کے زیر استعمال کمرے میں چلی آئی۔ یہاں کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود تھا۔ وہ احتیاطاً رات جاگ کر گزرتا چاہتی تھی چنانچہ ایک کتاب لے کر بیٹھ گئی۔ اردو کے اس دلچسپ ناول میں کھوئے اسے احساس ہی نہیں ہوا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے۔ گیٹ پر کسی گاڑی کا زوردار ہارن سنائی دیا تو وہ چونگی اور پھر کتاب چھوڑ کر بھاگتی ہوئی گیٹ کی طرف دوڑی۔ خیال تھا کہ کشور واپس آئی ہوگی۔ اپنے اسی خیال کے سبب اس نے بے دھرم گیٹ کھول دیا لیکن سامنے موجود گاڑی اور اس میں سوار افراد کو دیکھ کر اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے ہی رہ گیا۔ گاڑی میں تاجور اور اس کا شوہر اشرف بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے گیٹ ملل واکیا تو گاڑی تیزی سے اندر آ گئی۔ کانپتے ہاتھوں سے گیٹ بند کر کے رانی تیزی سے گاڑی کی طرف بڑھی اور پچھلی نشست پر بیٹھی تاجور کی گود میں سر رکھ کر سوئے ہوئے منور کو اپنی گود میں لے لیا۔

”چوکیدار کہاں مر گیا ہے جو تجھے گیٹ کھولنا پڑا؟“ جاسوسی ڈائجسٹ

اشرف نے سخت لہجے میں اس سے سوال کیا۔

”اس کی طبیعت دڑی خراب ہے جی۔ اپنے کوارٹر میں پڑا لوٹ رہا ہے۔“ حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے اس نے چوکیدار کی گیٹ سے غیر حاضری کا بہانہ بنایا اور نیچے کو لے ہوئے کوشی کے اندرونی حصے میں ایک کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ حویلی سے یہاں چودھری کے علاوہ کبھی کبھار ہی کوئی آتا تھا لیکن سارے کمرے ہر وقت صاف ستھرے اور تیار رہتے تھے۔ ان کمروں میں سے ہی ایک میں اس نے تاجور کے بچے کو پانچا کر آرام دہ بستر پر لٹا دیا۔ تاجور خود بھی پیچھے ہی چلی آئی۔

”آپ لوگوں کے لیے کھانا لگاؤں بی بی؟“ رانی نے اس سے مؤدبانہ پوچھا۔

”نہیں، کھانا ہم کھا کر آئے ہیں۔ اشرف کے ایک دوست کی شادی تھی یہاں، اسی میں شرکت کر کے آرہے ہیں۔“ تاجور نے اسے جواب دیا۔

”تو غیر میں آپ لوگوں کے لیے دودھ لے کر آتی ہوں۔“ ایک تو اسے معلوم تھا کہ حویلی سے اٹھ کر کھنے والے سارے افراد رات سونے سے پہلے دودھ پینے کے عادی ہیں، دوسرے وہ زیادہ دیر تاجور کے سامنے ٹھہرنا نہیں چاہتی تھی کہ مبادا وہ کشور کے بارے میں کوئی سوال نہ کر لے اس لیے اس کے جواب کا انتظار کے بغیر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ کمرے سے باہر نکلنے کے بعد اس نے سیدھا باورچی خانے کی طرف جانے کے بجائے نشست گاہ کا رخ کیا۔ یہی فون سیٹ بیٹھیں رکھا ہوا تھا۔ اسے کشور کو فون کر کے اس کی صورت حال کے بارے میں خبر دینی تھی۔ ایسی ہی کسی ایمر جیسی کے لیے ذہن نشین کر دیا ہوا کشور کا موبائل نمبر ڈائل کر کے وہ تیل جانے کا انتظار کرنے لگی۔ اس وقت اس پر ایسی گھبراہٹ طاری تھی کہ سینکڑا ہزاروں حصہ گزرتا بھی مشکل لگ رہا تھا۔ جیسے ہی پہلی تیل جانے کی آواز سنائی دی، اس کی رکی ہوئی سانس بحال ہونے لگی۔

”اس وقت کسے فون کر رہی ہے؟“ عقب سے سنائی دینے والے اس سوال پر وہ اس بری طرح اچھلی کر رہی سیور اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ نیچے پڑے رہی سیور پر سے نظر ہٹا کر اس نے اپنے پیچھے کی طرف دیکھا۔ ماتھے پر ڈھیروں ٹھٹھیں سجائے چودھری اشرف شادا سے خشونت بھری نگاہوں سے گھور رہا تھا۔

حادثات و سانحات کی شکل... پناہ کسی تلاش میں سرگرداں
 ماہ بانو کسی داستان حیات کے واقعات اگلے ماہ دیکھیں



اسماقادی

گیارہویں کتاب

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور ہاتھ میں لے کر روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں۔ مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں، بالآخر طریقہ کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے۔ یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے۔ ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور چال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی چال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے۔ پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو۔ محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو پس ہو جاتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے۔ زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی ہاتھیں اور مقدر کی چالیں ہیں۔ کبھی بازی ہلت بھی جاتی ہے۔ بہتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے۔ اس وقت تک ہاتھوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے۔ جرم، افسوسناک، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

نقدی قیوں گری، قسمت کی چال بازی یا مقدر کا کھیل..... ملنے اور بچر جائے والوں کی کہانی



رانی کے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ فوری طور پر اشرف شاہ کے سوال کا جواب دے سکتی۔ وہ خوف زدہ سی گھڑی اس کی شکل دیکھتی رہی۔

”میں نے تجھ سے پوچھا ہے کہ اتنی رات گئے کسے فون کر رہی تھی؟“ اسے خاموش پا کر اشرف شاہ نے اپنا سوال دہرایا۔

”کسی کو نہیں شاہ بی افون کی گھنٹی بجی تھی تو میں نے فون اٹھا لیا تھا، پر دوسری طرف سے کوئی کچھ بولا ہی نہیں۔“

رانی نے ٹھوک ٹھک کر اپنا خشک ہو جانے والا گلہ کر لیا اور

اشرف شاہ کی بات کا جواب دیا۔ اچانک نازل ہو جانے والے چودھری افتخار کے اس بڑے داماد کو لگنے کے لیے فی الحال یہی بہانہ اسے سوجھ سکا تھا۔ اشرف شاہ نے اس کا جواب سنا اور خود آگے بڑھ کر پیچھے ہٹا ہوا ریسیور اٹھا لیا۔

ریسیور کان سے لگائے پر اسے اندازہ ہوا کہ ابھی تک لائن پر کوئی موجود ہے۔

”ہیلو!“ اس نے غرائے کے انداز میں کہا۔ ڈومل

میں فوراً ہی رابطہ منقطع کر دیا گیا اور ٹونوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ اشرف شاہ نے رانی کو کھانچا جانے والے انداز میں دیکھتے ہوئے ریسیور کرڈل پر رکھ دیا۔

”کشور کہاں ہے؟“ یہ سوال کرتے ہوئے اس کے

لبے میں شک سرسار ہاتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اس مقام کال کا

کشور سے تعلق تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

”نی نی تو اپنے کمرے میں سو رہی ہیں۔“ تاجور اور

اشرف شاہ کی گھنٹی میں آمد کے ساتھ ہی اس نے اس سوال کا

جواب سوچنا شروع کر دیا تھا اس لیے اس بار پھر اسے اعتماد

سے اشرف شاہ کو جواب دیا۔

”بی بی کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ بڑی دیر تک مجھ سے

سردیوائی رہی۔ ابھی ٹھوڑی دیر پہلے ہی دوا کھا کر سوئی ہیں۔

سونے سے پہلے انہوں نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ جب تک

میں خود نہ جاؤں، مجھے سو رہے اٹھانا نہیں۔“ حفظہ اللہم کے

تحت اس نے آگے کے حالات کو سنبھالنے کے لیے بھی پیش

بندی شروع کر دی۔

”ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔“ اشرف شاہ نے اسے اجازت

دی اور خود بھی باہر نکل گیا۔ رانی نے فوری مصیبت کے ٹل

جانے پر سکون کا گہرا احساس لیا اور باورچی خانے میں جا کر

بے وقت چلے آئے والے اپنے ان مالکان کے لیے دودھ گرم

کر کے گلاسوں میں نکالنے لگی۔ ہاتھوں کی طرح اس کا ذہن

بھی بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اسے اس ساری صورت

حال کو سنبھالنے کے لیے بہت کچھ کرنا تھا۔ کشور کو مطلع کرنا،

تاجور اور اشرف شاہ کو کشور کے غیاب سے خبر رکھنا اور خواب آور دوا ملی چائے پی کر سو جانے والے ملازمین کو سنبھالنے کی تمام تر ذمے داریاں اس کے سر تھیں۔ صرف وہ

تھی جو کشور کے راز محبت کی امنگی اور اس اہمات کا حق ادا

کرنے کے لیے اسے بے حد مستعدی سے کام لینا تھا۔

☆ ☆ ☆

”آفتاب! مجھے یقین دلائیے کہ یہ سب خواب نہیں

ہے۔ میں سچ کچھ اس وقت آپ کی بیوی کی حیثیت سے آپ

کے قریب، آپ کے ساتھ موجود ہوں۔“ کشور نے اپنا سر

آفتاب کے سینے پر رکھتے ہوئے خواہیدہ سے لہجے میں اس

سے فرمائش کی۔ اس کی فرمائش پر آفتاب نے دونوں ہاتھوں

سے اس کا چہرہ تمام کر اپنی نظروں کی گرفت میں لیا۔ کشور

نے اپنی آنکھیں موند کر رکھی تھیں۔ شاید وہ واقعی اپنی زندگی کے

ان اہم لمحات کو کوئی خواب تصور کر رہی تھی اور اس خوب

صورت خواب کے ٹوٹ جانے کے ڈر سے آنکھیں نہیں

کھول رہی تھی۔ آفتاب اس کی کیفیت بہت اچھی طرح سمجھ

سکتا تھا۔ وہ خود بھی انہی احساسات سے دوچار تھا۔ کبھی کبھی

اچانک مل جانے والی خوشیاں انسان کو ایسی ہی بے یقینی میں

جٹا کر دیتی ہیں۔ وہ خواب جو بار بار دیکھے جائیں، تعبیر کے

مرحلے میں داخل ہونے کے بعد بھی خواب ہی محسوس ہوتے

ہیں۔ خوب صورت خوابوں کی خوب صورت تعبیر خواب

دیکھنے والے کو ڈرا دیتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ تعبیر نہیں

کاٹچ کا نازک بلور ہیں جام ہے جو ذرا سی ٹھیکے پر ٹوٹ

جائے گا۔ وہ دونوں بھی اس وقت ایک دوسرے کے ساتھ

ہونے اور بہت سے کیف آور لمحات گزر جانے کے بعد بھی

اسی ڈر، اسی خوف میں مبتلا تھے۔

”اگر آپ کو یہ لمبے خواب لگتے ہیں تو بھی کیا حرج ہے

کہ ہم یہ خواب دیکھتے رہیں۔ اتنے خوب صورت خواب تو

قسمت والوں ہی کو نصیب ہوتے ہیں۔ رنگ برنگے خوابوں

کے پھولوں سے بھری یہ فصل تو بس انہی دلوں کی سرزمین پر

اگتی ہے جنہیں محبت کے پانی سے سیراب ہونے کا موقع مل

ہو۔ ہم خوش نصیب ہیں کہ قدرت نے ہمارے دلوں کی زمین

آدھی تھی۔ دھرتی بھی جل تھل ہو جانے کے باوجود مزید برسات کا قبول کرنے سے انکاری نہیں تھی۔ ان کے لیے اس

وقت کا نکات میں ایک دو بے سے سوا کچھ نہیں رہا تھا۔ وہ

”میں اتور تو“ کا فرق مٹانے ایک دو بے میں کم تھے۔ ایک

دو بے کو جاہت سے لبریز جام پر جام پلاتے وہ بالکل مدہوش

تھے۔ اچانک ہی ایک آواز نے اس فسون کو توڑ دیا۔ دو

چائے والوں کی تنہائی میں ٹھل ہونے والی یہ آواز کشور کے

موبائل کی رنگ ٹون بھی جسے سن کر وہ بری طرح چونک گئی۔

اس کے موبائل پر صرف ایک شخص کال کرتا تھا اور وہ شخص اس

کے ساتھ تھا۔ یہاں آنے سے ٹل وہ رانی کو اپنا موبائل نمبر

رٹوا کر آئی تھی اور کھنٹی بجنے کا مطلب تھا کہ کال کرنے والی

رانی ہے۔ رانی کی طرف سے کال آنے کا یہی مطلب لیا جا

سکتا تھا کہ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہے ورنہ وہ اس وقت

اسے ہر کچھ ڈسٹرب نہیں کرتی۔ اندیشوں اور خوف میں

گھری کشور نے ہاتھ بڑھا کر اپنا موبائل اٹھا یا۔ موبائل کی

اسکرین پر گھنٹی کا فون نمبر چمک رہا تھا۔ اس نے ”نیں“ کا بٹن

پیش کرتے ہوئے کال ریسیو کی مگر دوسری طرف سے توقع

کے برخلاف رانی کی آواز سنائی نہیں دی۔ وہ کچھ بولتی اس

سے ٹھٹھکی ہی ایک مردانہ آواز اس کے کانوں تک پہنچی۔ اس

نے اپنی سماعتوں کو پوری طرح دوسری طرف سے سنا دیے

والی آوازوں پر مرکوز کر دیا۔

”میں نے تجھ سے پوچھا ہے کہ اتنی رات گئے کسے

فون کر رہی ہے؟“ اس بار وہ آواز سننے کے ساتھ ساتھ لفظوں

کو سمجھنے میں بھی کامیاب ہو گئی۔ اسے اس آواز اور لہجے کو

پہچاننے میں لمحہ بھر بھی نہیں لگا۔ نتیجتاً جاہت کے رنگوں سے جا

اس کا چہرہ فٹ پڑ گیا۔ اس کے ساتھ موجود آفتاب خاموشی

سے اس کی اس بدلتی کیفیت کو دیکھ رہا تھا۔ فی الوقت وہ اسے

بھی بھلائے رانی کی آواز سن رہی تھی۔ رانی کا وضاحتی جملہ

ابھی اس کی سماعتوں سے گزر رہی تھا کہ ایک غرائی ہوئی

مردانہ ”ہیلو“ نے اس کے وجود کو بلا ڈالا۔ اب شک و شبہ کی

کوئی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ وہ سو فیصد اس کا بڑا بہنوئی

”کیا بات ہے کشور... کیا ہوا؟“ آفتاب نے

پر تشویش نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”بھاشا کو گھنٹی پر آئے ہوئے ہیں۔“ اس نے مردہ

سے لہجے میں بتایا۔

”یہ تو واقعی بہت برا ہوا۔“ آفتاب اس کی دی ہوئی

اطلاع کو سن کر پریشان ہو گیا۔

”مجھے فوری طور پر کوئی واپس جانا ہوگا۔“ کشور جو بالکل

بے دم ہی تھی ابھی، کوئی خیال آنے پر یک دم ہی متحرک ہوئی۔

”لیکن اس وقت آپ کا اس طرح سے جانا خطرناک

بھی ہو سکتا ہے۔“ آفتاب نے تشویش کا اظہار کیا۔

”میرا تو جانا رانی کے لیے بہت برا ثابت ہوگا۔ میں

اسے اس کی وفاداری اور محبت کے بدلے میں اتنے بڑے

خطرے سے دوچار نہیں کر سکتی۔“ کشور کا لہجہ اہل اور مکمل

جان دار تھی۔ واقعی انسانیت کا تقاضا یہی تھا کہ ایک وفادار و

جاس ڈار ملازم کو محالات کے رحم و کرم پر نہ چھوڑا جائے۔

”میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔“ اس نے جرأت

مندی سے اپنا فیصلہ سنایا۔ وہ اور کشور ایک دوسرے سے الگ

نہیں تھے۔ وہ اس کی ذات سے اپنے لیے خوشیاں کشید کرتا تھا

چنانچہ اب مصیبت کی گھڑی میں بھی اس کا ساتھ دینے کے

لیے تیار تھا۔ دوسری طرف کشور اسے کسی مصیبت میں مبتلا نہیں

کرنا چاہتی تھی لیکن آفتاب کے ساتھ جانا بھی اس کی مجبوری

تھی۔ رات کے اس پہر وہ ایسی گھنٹی تک واپس نہیں جاسکتی

تھی۔ آفتاب کو گھنٹی کے گیت سے ہی واپس لوٹا دینے کا قسم

ارادہ کرتے ہوئے اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ جانتی

تھی کہ آفتاب آسانی سے واپس لوٹنے کے لیے راضی نہیں ہو

گا مگر وہ اسے اپنی قسم دے کر واپس ہونے پر مجبور کر سکتی تھی۔

”آپ تیار ہو کر باہر آئیں، میں افضل اور بھابی کو

صورت حال سے آگاہ کرتا ہوں۔“ آفتاب نے کہا اور شرٹ

کے بٹن بند کرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ کشور بھی بھجے دل

کے ساتھ حرکت میں آگئی۔ زندگی کے اتنے خوب صورت

خواہش سے بہت کم یہ اصول لکھتے اس کی جھولی میں ڈالے تھے۔ اسے اپنا آپ ایک ایسے سے خوار کی طرح لگ رہا تھا جسے پوری طرح سے سرور آنے سے قبل ہی سے خانے سے رخصت کا حکم سنایا گیا ہو۔

”تیار ہو کھو؟“ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور افضل کی بیوی مہتاب اندر داخل ہوئی۔

”جی، بس یہ چیزیں لینی ہیں۔“ اس نے بیڈ پر بکھرے عروسی لباس اور زیورات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

”میں سیٹ لوں گی۔ تم ایسا کرو کہ اچھی طرح منہ دھو لو۔ افضل گاڑی نکال رہے ہیں۔ وہ اور آفتاب دونوں تمہارے ساتھ جائیں گے۔“ گزرے لکھتے کا فسانہ سناتے اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہوئے مہتاب نے اسے مشورہ دیا اور خود اس کی چیزیں سمیٹنے لگی۔ کشور نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور ملحقہ غسل خانے میں جا کر اچھی طرح منہ دھو آئی۔ منہ دھو لینے کے باوجود اس کے وجود پر کئی ایسی نشانیاں بھی تھیں جو اس کے کئی دہن ہونے کی گواہی دے رہی تھیں۔ مہندی کے نقش و نگار سے سجے ہاتھ، چہ بالوں کا خوب صورت سا اسٹائل جو تھوڑا سا بگڑا ضرور تھا لیکن بہر حال قائم تھا۔ بالوں میں کہیں کہیں چمکیں افشائیں اور سب سے بڑھ کر اس کے وجود کی خوشبو کی پٹیلیں۔ ہر ہر شے گواہی دے رہی تھی کہ وہ ایک دلن ہے۔ مہتاب نے اپنے دل میں اس کے لیے گہری ہمدردی محسوس کی۔ بے رحمانہ اور غیر منصفانہ رویوں کی شکار اس لڑکی نے اپنے ہا اختیار و عالی مرتبت باپ سے چھپ کر اپنے لیے خوشیوں کا ایک چور دروازہ کھولا تھا لیکن اسے خوشی کے بہت ہی مختصر لمحات میسر آ سکے تھے۔

”بھائی! میری یہ چیزیں آپ کے پاس امانت دیں گی۔ انہیں بہت سنبھال کر رکھیے گا کیونکہ یہ صرف باوی اشیا ہیں۔ ان میں میرے جذبات اور زندگی کے اصول لکھوں گی مہک بھی لسی ہوئی ہے۔“ چادر کو ماتھ تک لاکر اوڑھتے ہوئے اس نے زندگی ہوئی آواز میں مہتاب سے درخواست کی۔

”تم فکر مت کرو۔ تمہاری ہر شے بالکل محفوظ رہے گی۔ اللہ تعالیٰ تمہیں لمبی عمر عطا کرے اور تمہیں دوبارہ ان چیزوں کو برتنا نصیب ہو۔“ مہتاب نے بڑی بہنوں کے انداز میں اسے لگے لگاتے ہوئے دعا دی تو اس کی آنکھوں سے اور بھی تیزی سے آنسو بہنے لگے۔ بس یہی تو کئی بھی اس کی زندگی میں۔ اس کے خون کے رشتے اسے زندگی کی ہر آسائش فراہم کرنے کو تیار رہتے تھے لیکن ان کے لبوں پر اس کے لیے ایسی

خوش کن دعا کہیں بھی نہیں ہوتی تھیں۔

”چلو باہر چلتے ہیں۔ افضل اور آفتاب انتظار کر رہے ہوں گے۔“ مہتاب جس کی اپنی آنکھوں میں بھی آنسو اٹھ آئے تھے، خود کو سنبھالتے ہوئے بولی اور اسے خود سے الگ کر کے اپنے دوپٹے کے چلے سے اس کے رخساروں پر بہتے آنسو صاف کیے۔ کشور نے بھی وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے خود کو تیزی سے سنبھال لیا اور چادر کے پلو کو نقاب کے انداز میں چہرے پر لینے کے بعد مہتاب کے ساتھ باہر نکل گئی۔ افضل اور آفتاب باہر منتظر کھڑے تھے۔

”اپنا خیال رکھیے گا۔“ مہتاب نے ان کے نکلنے سے قبل بیویوں والی مخصوص فکر مندی کے ساتھ افضل کو تاکید کی۔

”میں تو کہتا ہوں کہ تم ہمارے ساتھ ہی مت چلو۔ کشور کے ساتھ میرا اکیلا ہی جانا مناسب ہے۔ وہاں کچھ بھی حالات ہو سکتے ہیں۔“ مہتاب کی فکر مندی دیکھتے ہوئے آفتاب نے افضل سے کہا۔

”اس بات پر ہم پہلے ہی بہت بحث کر چکے ہیں اور میں تمہیں واضح طور پر بتا چکا ہوں کہ میں ان حالات میں تمہیں ہرگز بھی اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔“ افضل نے حتمی لہجے میں کہتے ہوئے قدم آگے بڑھائے۔ آفتاب بے بس سا ہو کر مہتاب کو دیکھنے لگا۔

”افضل ٹھیک کہہ رہے ہیں آفتاب! تم ہمیں بھائیوں کی طرح عزیز ہو۔ ہم تمہیں کسی صورت بھی تنہا نہیں چھوڑ سکتے۔ اگر بچوں کا مسئلہ نہیں ہوتا تو میں بھی اس وقت تمہارے ساتھ ہی جاتی۔“ وہ جو یہ خیال کر رہا تھا کہ مہتاب، افضل کے اس کے ساتھ جانے پر حوش ہے، اس کی بات سن کر حیران رہ گیا۔ گوری جی، لمبی چوڑی مہتاب نے اپنے الفاظ سے ثابت کر دیا تھا کہ وہ چہاڑوں میں آباد ایک قبائلی خاندان کا خون ہے۔ ایک ایسے خاندان کا جہاں مردوں کی طرح عورتوں کے حوصلے بھی بہت بلند اور مضبوط ہوتے ہیں۔ وہ مہتاب پر ایک غفلت رانی نظر ڈال کر باہر نکل گیا۔ کشور بھی اسی کے ساتھ تھی۔

”آپ نے دوبارہ کوئی فن کر کے صورت حال معلوم کرنے کی کوشش کی یا نہیں؟“ گاڑی کو روڈ پر لاتے ہوئے افضل نے کشور سے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلادیا۔

”اگر آپ وہاں فن کر سکتیں تو ممکن تھا کہ آپ کو اپنی ملازمہ سے صحیح صورت حال معلوم ہو جاتی۔“

”مجھے ڈر تھا کہ فن رانی کے بجائے بھاشا شریف سنیں گے اس لیے میں ڈر فون نہیں کر سکی۔“ کشور نے اپنے کوئی فن نہ کرنے کی وجہ بتائی۔

”فون کرنے کے مقابلے میں اس طرح براہ راست کوٹھی واپس چل جانا زیادہ خطرناک ثابت ہو گا۔ ہم بالکل اندھیرے میں ہیں۔ نہیں معلوم کہ وہاں کیا صورت حال درپیش ہے۔ فون پر بات کر لینے کی صورت میں کچھ تو واضح ہو جائے گا۔“ افضل نے اسے سمجھایا۔

”صورت حال جو بھی ہو، مجھے ہر حال میں کوٹھی واپس پھینچنا ہے۔ میرا نہ پھینچا رانی کی زندگی کو خطرے میں ڈال دے گا۔ میں بدترین حالات میں بھی اسے کسی زیادتی کا نشانہ بننے کے لیے تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔ آپ لوگوں سے میری درخواست ہے کہ مجھے کوٹھی کے قریب اتار کر خود واپس چلے جائے گا۔ آگے جو کچھ پیش آئے گا، اس سے میں خود منت لوں گی۔“

کشور کا کچھ اس بار بہت مضبوط تھا لیکن آفتاب کو اس کی بات نے تکلیف پہنچائی۔ کشور کا یہ کہنا کہ آپ لوگ واپس چلے جائیے گا میں خود منت لوں گی... اس کو اپنی محبت کی توہین کرنا لگا تھا۔ آخر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ کشور کو کسی خطرے میں کمر اچھوڑ کر خود واپس آ جاتا؟ اس نے پلٹ کر قہقہے سیٹ پر بیٹھی کشور پر ایک ہلکھو کنکناں نظر ڈالی اور کچھ کہنا چاہا لیکن اس سے قبل ہی کشور کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے تیزی سے موبائل کی اسکرین پر نظر ڈالی۔ حسب توقع کوٹھی کا فون نمبر ہی وہاں جھگکا رہا تھا۔ اس نے کال ریسیو کر لی لیکن زبان سے کچھ نہ بولی کہ مبادا دوسری طرف اشرف شاہ ہی موجود نہ ہو۔

”لی بی! میں رانی بول رہی ہوں۔“ دوسری طرف سے رانی نے کال ریسیو کیے جانے کو محسوس کر کے پتلی آواز میں بتایا۔ اس کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ سرگوشی سے زیادہ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

”وہاں کیا حال ہے رانی! تجھے کوئی مشکل تو نہیں ہوئی؟“ رانی کی آواز سن کر کشور نے بے تابی سے پوچھا۔ افضل اور آفتاب کے کان بھی رانی کا نام سن کر کھڑے ہوئے۔

”زیادہ مشکل نہیں ہوئی لی بی! تاجور بی بی اور اشرف شاہ جی نے آپ کے بارے میں پوچھا تھا، میں نے کہہ دیا کہ آپ اپنے کمرے میں سو رہی ہیں۔ پر سویرے میں کیا کروں گی جی؟ اچھی تو میں نے انہیں دودھ میں تھوڑی سی نیند کی دوا ملا کر دے دی تھی، وہ لوگ دودھ کی کر س گئے ہیں۔ آپ بتائیں آپ کب واپس آئیں گی؟“ رانی کی آواز سے خوف جھٹک رہا تھا۔ ظاہر ہے وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھی کہ اگر کشور کے کوٹھی پر موجود نہ ہونے کی بات کھل گئی تو سب سے پہلے اسی کی شامت آئے گی۔

”فکر نہ کر رانی! میں کوٹھی واپس آ رہی ہوں۔ رات سے

میں ہی ہوں۔“ صورت حال قابو میں ہے، یہ جان کر کشور نے ایک سکون بھرا سانس لیا اور رانی کو بھی تسلی دی۔

”ٹھیک ہے لی بی! میں آپ کا انتظار کرتی ہوں۔ آپ دروازے کی گھنٹی مت بجانا۔ میں چھوٹے کیٹ کی کنڈی اندر سے سکول دوں گی اور خود قریب ہی رہوں گی۔ آپ چپکے سے اندر آ جانا۔“ رانی نے جلدی سے آگے کا منصوبہ ترتیب دیا جس سے اتفاق کرتے ہوئے اس نے کال منقطع کر دی اور محسوس سے پیٹھے آفتاب اور افضل کو نصیلات بتانے لگی۔

☆☆☆☆

”کشور کہاں ہے رانی؟ اسے کب کو وہ بھی آ کر ناشتا کر لے۔“ رانی اور حاجرہ میز پر ناشتے کے لوازمات سجا رہی تھیں، تب تاجور نے رانی کو یہ حکم دیا۔

”لی بی نے تو سویرے جلدی ناشتا کر لیا تھا جی۔“ رانی نے اطلاع دی پھر مزید وضاحت دیتے ہوئے بولی۔ ”اصل میں لی بی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے نا، اس لیے میں نے ان کے کمرے میں ہی ناشتا پہنچا دیا تھا۔“

”چل ٹھیک ہے۔ ویسے بھی رات جانے کیوں اتنی گہری نیند آئی کہ سویرے جلدی آنکھ نہیں کھل سکی۔ اب بھی طبیعت مندی مندی سی ہے۔ اچھا ہے تو نے کشور کو ناشتا کروا دیا۔ بے چارہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، کب تک ہمارا انتظار کرتی۔“ کشور کے کمرے سے باہر نہ آنے پر تاجور دل میں بے حد پرہم جی لیکن اشرف کے سامنے اظہار کرنے سے گریز کیا اور فی الحال لیکن کی حمایت کرنا ہی مناسب سمجھا۔ دوسری طرف رانی اس سے نظریں چراہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ تاجور اور اشرف کی صبح جلدی آنکھ کیوں نہیں کھل سکی۔ خود اسی نے تو اس احتیاط کے پیش نظر کہیں کشور کرات کے آخری پہر کوٹھی واپس آنا کسی کے علم میں نہ آ جائے ان کی نیند کے گہرے ہونے کا بندوبست کیا تھا۔ کوٹھی پر موجود دوسرے ملازمین کو بھی وہ کسی نہ کسی طرح قابو کر چکی تھی۔ ویسے بھی وہ اس معاملے میں زبان کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں علم تھا کہ کشور کے بارے میں کوئی ایسی ویسی اطلاع سن کر مالکان اس کا جو مشر کرتے سو کرتے لیکن اس سے بھی پہلے اطلاع دینے والا زیر غائب آتا، سوا انہوں نے خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھی۔ ناشتے کا مرحلہ خاموشی سے تمام ہوا۔ تاجور اور اشرف شاد، کشور کے خود کو نظر انداز کرنے پر کبیدہ خاطر تھے تو رانی اور حاجرہ اندرونی خوف کے زیر اثر تھیں۔ ویسے بھی وہ خادما نہیں تھیں جنہیں مالکان کے خود سے مخاطب کیے بغیر کم ہی زبان کھولنے کی جرأت ہو پاتی تھی۔ ناشتے کی میز پر اگر کوئی

رونی تھی تو وہ نصف منور کی وجہ سے۔ وہی تھا جو چھوٹی موٹی فرمائشیں کرنے کے ساتھ ساتھ ماں باپ سے بات چیت کرنے کی بھی کوشش کر رہا تھا۔

”میں ذرا کشوری طبیعت تو چھ آؤں۔“ ناشتے سے فارغ ہوتے ہی تاجور نے اپنی کرسی چھوڑتے ہوئے اشرف شاہ سے کہا۔

”جلدی آنا۔ پندرہ منٹ میں ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔“ اس نے منہ نہاتے ہوئے حکم دیا۔ تاجور ناشتہ میں سر ہلاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ منور بھی ماں کے ساتھ ہولیا۔

”بڑے فخر سے ہو گئے ہیں تیرے کشوریہ نہیں کہ اگر بڑے بہنوئی کو سلام کر جاتی۔ اب وہاں گاؤں جا کر مینے پھر تک اسی بات کا قطعہ دینا رہے گا کہ تیری بہن مجھے سلام تک کرنے نہیں آئی۔“ کشور کے کمرے میں داخل ہوتے ہی تاجور نے اتنی بر سے ضبط کیسے..... فیصہ کا اظہار شروع کر دیا۔ کشور جواباً کچھ نہیں بولی اور اسی طرح بیڈ پر نیم دراز حالت میں بیٹھی رہی جس طرح تاجور کے کمرے میں آنے سے قبل بیٹھی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ پہلے وہ اپنے ہاتھ میں پٹری کتاب کی طرف متوجہ تھی اور اب تاجور کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”آہا... کشور خالہ نے کتنی پیاری مہندی لگائی ہے۔“

کشور کے پیر تو اس چادر کے نیچے چھپے ہوئے تھے جو اس نے بیروں سے لے کر سیتے تک اوڑھ رکھی تھی لیکن کتاب کو گرفت میں لیے ہوئے ہاتھ واضح تھے۔ تاجور فیصہ میں ہونے کی وجہ سے اس طرف متوجہ نہیں ہو سکی تھی لیکن منور نے صرف خود متوجہ ہوا تھا بلکہ ماں کی توجہ بھی مبذول کرادی تھی۔

”خالہ تو دہن لگ رہی ہیں۔“ تازہ شیمپو کیے ہوئے بالوں کی ڈھیلی ڈھالی پٹیا، دونوں گل پارلے سر کو دانی کی فیس سرور اور اندرونی خوشی کی پمک... یہ سب چیزیں مل کر کشور کو ایسا روپ بخش گئی تھیں کہ معصوم بچہ بے ساختہ ہی ذہن میں ابھرنے والے تاش کا زبان سے اظہار کر گیا۔ اس کی بات سن کر جہاں کشور گھبرا کر وہاں تاجور بھی ٹھٹک گئی۔

”یہ سب کیا ہے کشور؟“ وہ گھٹکھٹک کرتے آئی تھی اسے بھول کر کشور کے چہرے اور ہاتھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”ایسے ہی آہا ایس جی چاہ رہا تھا۔“ کشور نے جھکی نظروں کے ساتھ جواب دیا۔

”پوچھتے تو یہ سب اچھا ہی نہیں لگتا تھا۔ تو تو بھی مہندی لگانے پر تیار نہیں ہوتی تھی۔ ہمیشہ یہی کہتی تھی کہ مجھے کوئی ارمان نہیں ہے۔“ تاجور اس کے جواب سے مطمئن نہیں ہوئی

اور جرح کرنے لگی۔

”کہنے سے کیا ہوتا ہے آہا! ہوں تو آخر میں بھی ایک جیتی جاگتی لڑکی۔ بندہ خود پر اپنے ارمانوں پر بند باندھ کر ہر خواہش سے دست برداری اختیار کر لے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہوتا کہ اندر سرے سے کوئی خواہش موجود ہی نہیں۔ خواہش اور احتیاج کو کتنا ہی پکڑو، یہ سر اٹھانے سے باز نہیں آتیں۔ اپنی تکمیل کے لیے کوئی نہ کوئی راہ نکال ہی لیتی ہیں۔ اب چاہے یہ راہ کوئی چور دروازہ کھول کر ہی نکالی جائے۔“

یاسیت سے یہ سب کہتی کشور کی باتوں کا کیا پس منظر ہے، تاجور نہیں جانتی تھی اسے نہیں معلوم تھا کہ اپنے ایک جائز حق کو چور راستے سے حاصل کر لینے والی کشور پر کیا بیت رہی ہے۔ ہزار کی طرح اس کے بھی دل میں ارمان تھا کہ اس کی رات پوری شان سے اس کے باپ کی چوکھٹ تک آئے۔ وہ سکھوں کی پانچ پھڑ پھڑ، بہنوں کے پارادور ماں باپ کی دعاؤں کے جلو میں اپنے لیے کمر جائے مین زور دولت کے پیاری اس کے باپ نے اس پر خوشی کا یہ در بند کر دیا تھا۔ وہ جو اپنی تاج پر ہر رات ایک ہی عورت کو دیکھنا چاہتا تھا، بیٹی کو اس کا جائز اور شرعی حق بھی دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

”تاجور بی بی! آپ کو چودھری اشرف شاہ یاد رہے ہیں۔ کہتے ہیں جلدی کریں، انہیں درہم بوری ہے۔“ حیران، پریشان سی تاجور کچھ کہنے کے لیے منہ کھولی، اس سے قبل ہی رانی کمرے میں چلی آئی اور اسے اشرف شاہ کا پیغام پہنچایا۔ اس پیغام کو سن کر تاجور کمرے سے باہر نکل گئی۔ البتہ اس نے رانی کو اپنے ساتھ آئے کا اشارہ کر دیا تھا۔

”یہ کشور کو کیا ہوا ہے رانی! بڑی بدلی بدلی سی لگ رہی ہے؟“ باہر نکلتے ہی اس نے رانی سے پوچھا۔

”میں کیا کہوں بی بی! اچھوٹا منہ بڑی بات والی گل ہو جائے گی۔ پرچ تو یہی ہے کہ کشور بی بی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ لگتا ہے درماں پر کچھ اثر ہوا ہے۔ میں نے اپنی اماں سے سنا ہے کہ جن لڑکیوں کی وقت پر شادی نہ ہو، ان کے ساتھ ایسا ہو جاتا ہے۔ کشور بی بی جانے تکب سے اندر ہی اندر گھٹ رہی تھیں، اب پھٹی ہیں تو یہ جاہل ہو گیا ہے۔“ رانی اور کشور میں رات ہی یہ بات طے ہوئی تھی کہ تاجور کس طرح ہینڈل کرنا ہے۔ ظاہر ہے اس سے کشور کا حلیہ پوشیدہ رکھنا تو ممکن نہیں تھا۔ اور بجائے یہ کہ اس کا ذہن کسی خاص رخ پر سوچے، اس کو بھٹکا کر اپنی مرضی کے رخ پر سوچنے پر مجبور کر دینے میں ہی بہتری تھی۔

”ہائے میرے ربا یہ کھل ہے۔ مجھے، مالم تو ہوا تھا کہ

کشور کا درماں کچھ چل گیا ہے۔ ایک دن اماں جی کے سامنے بھی تو جن کرکڑی ہو گئی تھی۔“ رانی کی بات سن کر تاجور کو یاد آیا تو بولی۔ کشور کے کمرے سے نکل کر وہ دونوں بے حدست قدموں سے چلتی اس کمرے کی طرف جاری تھیں جس میں رات تاجور اور اشرف شاہ بچھڑے تھے۔ منور ان سے پہلے ہی بھاگتا ہوا وہاں پہنچ چکا تھا۔

”آپ کو ٹھیک مالم ہوا تھا بی بی! وڈے چودھری صاحب نے مجھے میں ہی تو کشور بی بی کو جو بی بی سے ادھر بھجوایا تھا کہ شہر میں رہ کر ان کا علاج ہو سکے۔“ رانی نے اس کے خیال کو مزید تقویت دی۔

”غیر دکھایا کسی ڈاکٹر کو؟“ تاجور نے پوچھا جس کے جواب میں رانی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”دکھائے گا بھی کون؟ ادھر تو کروں کے اوپر اسے چھوڑ کر سارے ادھر جو بی بی میں بیٹھے ہیں۔ میں وہاں جا کر اماں کو کہتی ہوں کہ چھوٹی اماں کو ادھر بھیجیں۔ اماں جی تو سنا ہے امریکا جانے والے ہیں۔ چھوٹی اماں ہی آکر اپنی دہی کو سنبھالیں گی۔ کڑی کو ایسے آزاد چھوڑ کر ہم ساروں کو اپنی ناکیں تھوڑی کنوائی ہیں۔“ اپنے لیے مخصوص کمرے کے دروازے تک پہنچنے کے بعد تاجور نے وہیں کھڑے کھڑے فیصلہ سنایا اور اندر داخل ہو گئی۔ رانی بے بسی سے بندہ جانے والے دروازے کو تھپتی رہی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ آنے والا وقت کشور کے لیے کوئی آسانی لائے گا یا وہ مزید حالات کے گرداب میں پھنسی چلی جائے گی۔

☆☆☆

”ماہ بانو بہن! یہ ہماری طرف سے تمہارے لیے ہے۔“ وہ اپنے کپڑے رکھ کر بیک کی زپ بند کر رہی تھی کہ گل مینا کمرے میں چلی آئی اور اپنی شہمی میں دبی کوئی شے اس کی طرف بڑھائی۔

”دکھاؤ تو کیا ہے؟“ ماہ بانو نے مسکراتے ہوئے اپنی ہتھیلی اس کے سامنے پھیلائی۔ آج وہ لوگ ہوشے سے واپس کاغذے جانے والے تھے اور وہ اسی سلسلے میں اپنی تیاری میں مصروف تھی۔

”یہ ہماری طرف سے تمہارے لیے تحفہ ہے۔“ شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ گل مینا نے اپنی شہمی میں دبی شے اس کی ہتھیلی پر رکھی۔ ماہ بانو نے دیکھا کہ وہ پتھر کی بنی ایک بھدی سی انگلی ہے۔

”شکر یہ گل مینا! تو بہت پیاری ہے۔“ ماہ بانو نے فوراً وہ انگلی اپنی انگلی میں پکڑ لی۔ انگلی بے شک بھدی

اور بے کشش تھی لیکن جس غلوں سے اسے دی گئی تھی، اس نے اسے بہت خوب صورت بنا دیا تھا۔ ماہ بانو کے منہ سے انگلی کی تعریف سن کر گل مینا کا چہرہ ہلکا اٹھا۔

”یہ بہت خاص انگلی ہے۔ زہر موہرا پتھر سے بنا ہے۔ ہمارا اماں جی شہر کی وادی سے خود زہر موہرا اڑھوٹ کر لایا تھا اور ہمیں یہ انگلی بنا کر دیا تھا۔ یہاں لوگ زہر موہرا کے نام سے بہت چیزیں بیچتا ہے، پر وہ سب اصلی نہیں ہوتا۔ زہر موہرا کوئی اتنی آسانی سے نہیں ملتا ہے۔ یہ پتھر بہت بلند علاقے میں ملتا ہے اور بہت کم لوگوں کو معلوم ہوتا ہے کہ کس پہاڑ کے نیچے زہر موہرا ملے گا۔ ہمارے بھائی کو تو اس کے ایک دوست کی وجہ سے پتا معلوم ہو گیا تھا ورنہ جن لوگوں کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ پتھر کدھر ملے گا، وہ دوسروں کو بتاتا نہیں ہے۔“ ماہ بانو کی تعریف سے حوصلہ پا کر گل مینا اسے جوش و خروش سے بتانے لگی۔

”ایسی ایک خاص بات ہے اس پتھر میں؟“ ماہ بانو نے تجسس سے پوچھا۔

”اس پتھر میں زہر کو جذب کر لینے کا صلاحیت ہوتا ہے۔ کہتے ہیں، بادشاہ لوگ اس پتھر سے اپنے لیے برتن بنواتے تھے تاکہ اگر کوئی دھوکے سے ان کے کھانے میں زہر ملا دے تو سارا زہر برتن میں ہی جذب ہو جائے اور بادشاہ کی جان بچ جائے۔“ گل مینا نے بتایا۔

”پتھر تو یہ واقعی بڑے کام کی چیز ہوئی۔ میں ہمیشہ اسے سنبھال کر رکھوں گی تاکہ کبھی ضرورت پڑے تو کام آئے۔ ویسے کام کی چیز نہیں ہوتی تو بھی تمہارا تحفہ ہونے کی وجہ سے تو مجھے اسے سنبھال کر ہی رکھنا تھا۔ تم اتنی پیاری لڑکی ہو، تم سے یہ ملاقات تو مجھے دیسے بھی ساری زندگی یاد رہے گی۔ میں کوشش کروں گی کہ دوبارہ بھی تم سے ملنے آسکوں... بلکہ ایسا کرتی ہوں کہ بھائی اکرم کی ماں سے بات کرتی ہوں کہ تمہاری اور اس کی جلدی سے شادی کر دے۔ شادی کے بعد تم وہاں کاغذے آ جاؤ گی۔ پھر جب تک میں کاغذے میں ہوں، ہم دونوں مزے سے رہیں گے۔“ ماہ بانو کو اچانک ہی آئینڈ یا سو جھا اور وہ آگے کا منصوبہ ترتیب دینے لگی جسے سن کر گل مینا کا چہرہ گل گوں ہو گیا۔ سرخ چہرے کے ساتھ اس طرح شرمائی ہوئی وہ بے حد پیاری لگ رہی تھی۔ ماہ بانو نے بے ساختہ ہی اسے ہتھ پکڑنے لگا لیا۔

”تم تو جی بڑی پیاری ہو۔“

”تم ایسے ہی ہمیں بنانا ہے۔“ گل مینا اس کی بات سن کر جھپٹے ہوئے لہجے میں بولی۔

”بالکل نہیں جانتا... اگر کہو تو اکرم خان کو بلا کر اس سے بھی پوچھ لیتے ہیں۔“ ماہ بانو نے اسے مزید بھیڑا۔

”مجھ سے کیا پوچھنا ہے؟“ اچانک ہی دروازے کی طرف سے اکرم خان کی آواز سنائی دی۔

”ماہ بانو! بہن پوچھ رہا تھا کہ کب تک واپس جائے گا؟“

ماہ بانو سے الگ ہوتے ہوئے گل مینا نے جلدی سے بات

بنائی۔ اس کے اس طرح بات بنانے پر ماہ بانو کے ہونٹوں پر

مسکراہٹ دوڑ گئی تاہم اس نے تردید کی کوشش نہیں کی۔

”میں یہی جانتے آیا تھا کہ جیپ آگیا ہے۔ اگر تیاری پورا

ہے تو چل کر جیپ میں بیٹھ جاؤ۔“ اکرم خان نے جواب دیا۔

”تیاری تو ہو گئی ہے بھائی اکرم! آخر میرا یہ بیک جیپ

میں رکھو، میں سب گھر والوں سے مل کر ابھی آئی ہوں۔“ ماہ

بانو نے جواب دیا تو اکرم خان گل مینا پر ایک بھرپور نظر ڈال

کر حسب ہدایت بیک لے کر باہر نکل گیا۔ اس کے باہر نکلتے

ہی وہ دونوں بھی کمرے سے باہر آ گئیں۔ اکرم خان کی ماں

اپنے عزیزوں سے رخصت لے رہی تھی۔ ماہ بانو بھی ان سب

سے ملنے لگی پھر وہ اور اکرم خان کی ماں گھر سے باہر نکل

گئیں۔ اکرم خان ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا ان کا

مختصر تھا۔ وہ دونوں پچھلی نشستوں پر بیٹھ گئیں۔ جتنی جگہ میں

ان کے سامان کے علاوہ دیگر سامان بھی رکھا تھا جس کا تعلق

بقینیا کسی نہ کسی اشیاء ڈیشن ٹیم سے ہی ہوگا۔ ان کے بیٹھے ہی

جیپ اشارت ہو کر ایک پھینکے سے آگے بڑھی۔ ماہ بانو نے

پچھے مڑ کر دروازے کے باہر اکھڑے ہونے والے اپنے

میزبانوں کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔ سوائے گل مینا

کے تقریباً سب ہی لوگ اس کی طرف متوجہ تھے۔ گل مینا بھی

لحد بہ لحد آگے بڑھتی جیپ کی طرف ہی دیکھ رہی تھی لیکن اس کی

توجہ کارمز اکرم خان تھا جس کو رخصت کرتے ہوئے جدائی

کے پہلے ہی لمبے میں گل مینا کی آنکھوں میں انتظار کے دیپ

جل گئے تھے۔ ماہ بانو کو اکرم خان پر رشک آیا۔ وہ کتنا خوش

قسمت انسان تھا کہ کسی کی آنکھوں میں اس کے لیے انتظار

کے دیپ جلتے تھے۔ دوسری طرف وہ خود بھی جو اس کے ساتھ

اس جیپ میں سفر کرنے کے باوجود اس جیسی قسمت نہیں رکھتی

تھی۔ اسے قطعی امید نہیں تھی کہ اس کے لیے کہیں کسی کی

آنکھوں میں انتظار کے دیپ جلتے ہوں گے۔ وہ تو وہ حراماں

نصیب بھی جسے وقت کے طوفانوں نے اپنے پیاروں سے جدا

کر کے اس انہی علاقے میں پہنچا دیا تھا۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی

کہ حالات کے اس گرداب سے کب نکلے گی... اور گل بھی

کسے کی یا نہیں؟

لا یعنی خیالات اور اداسیوں میں گھرے ہونے کے

باعث اسے اندازہ بھی نہیں ہو سکا کہ وہ لوگ کب ہوشے سے

باہر نکل آئے۔ اس کے علاوہ جیپ میں موجود باقی تین لائقوں

بھی بالکل خاموش تھے۔ اس کے ساتھ بیٹھی اکرم خان کی ماں

اوندھ رہی تھی۔ خود اکرم خان بھی آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا لیکن

ماہ بانو کو اندازہ تھا کہ وہ سونے کے بجائے اپنی بند آنکھوں

کے پیچھے موجود گل مینا کے تصور میں گم ہے۔ جیپ ڈرائیور

شاید مزاجاً کم گو آدمی تھا یا پھر اپنے ہم سفر کی خاموشی میں

مغل ہونے کو مناسب نہ جانتے ہوئے خاموشی سے ڈرائیورنگ

کر رہا تھا۔ وہ اپنے ذہن میں موجود مایوس کن سوچوں کو چھوڑتی

ہوئی بیرونی مناظر کی طرف متوجہ ہو گئی۔ جیپ گرداڑاتی ہوئی

بڑی بڑی چٹانوں والے ایک نہایت خشک صحرائی علاقے کے

قریب سے گزر رہی تھی۔ اس علاقے میں پتھروں سے تعمیر

کردہ چند گھر موجود تھے۔ ماہ بانو کو یاد آیا، ہوشے جاتے

ہوئے اکرم خان نے اس علاقے کو کینڈا اس تھلک کے نام

سے متعارف کروایا تھا۔ وہی کینڈا اس تھلک جہاں کاندے

کے سیلاب زدگان نے اپنے لیے نئے گھر بنائے تھے۔

چٹانوں کو توڑ توڑ کر بنائے گئے ان گھروں کے کینن اس

علاقے میں پانی جیسی بنیادی ضرورت سے محروم تھے مگر وہ

یہاں رہنے پر مجبور تھے...

ان لوگوں کے حالات پر... دکھ محسوس کرتے

ہوئے وہ اتنی بری طرح ان کے خیال میں ڈوبی ہوئی تھی کہ

اسے اندازہ ہی نہیں ہو سکا کہ ایک بڑی سی چٹان کی آڑ میں

کھڑی جیپ کب حرکت میں آئی اور دندناتی ہوئی ان کے

سروں پر آ پہنچی۔ اس جیپ کے اچانک سامنے آ جانے کے

باعث ان کی جیپ کے ڈرائیور نے ایمر ہنسی پر یک لگائے

جس کے نتیجے میں ایک زوردار جھٹکا لگا۔ وہ لوگ اس جھٹکے

سے سنبھلے تو چار بعد سو افراد ان کی جیپ کو گھیر چکے تھے۔

”کون لوگ سے تم؟“ اکرم خان ذرا سا سنبھلا تو اپنی

جانب کھڑے ہوئے مسلح نقاب پوش سے بلند آواز میں پوچھا

اور جیپ سے اترنے کی کوشش کی۔ نقاب پوش نے اپنی

راغل کی نال اس کی گردن پر رکھتے ہوئے اسے اس کوشش

سے باز رکھا۔ اکرم خان کو راغل کے زور پر قابو میں رکھنے

والے نقاب پوش کے علاوہ باقی تینوں نقاب پوشوں نے جیپ

کا ایک ایک دروازہ سنبھال رکھا تھا لیکن ابھی تک ان تینوں کو

کسی حرکت کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ جیپ ڈرائیور نے

شاید اندازہ لگا لیا تھا کہ انہیں گھبرانے والوں نے جس کسی

مقصود سے انہیں روکا ہے، اس کا تعلق بہر حال اس کی ذات سے نہیں ہے۔ وہ برسوں سے اس علاقے میں جیپ چلا رہا تھا اور کبھی ایسی کسی صورت حال سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ اب جو صورت پیش آئی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ حملہ آوروں کا نشانہ اس کے بجائے اس کی جیپ میں سوار دیگر افراد ہیں۔ چنانچہ اس نے خاموشی اختیار کیے رکھنے میں ہی عافیت جانی تھی یا پھر شاید وہ صورت حال کے واضح ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ بہر حال، جو بھی بات تھی، اس کی طرف سے مکمل خاموشی تھی۔ اکرم خان کی ماں بے حد گھبرا جانے کے باعث کچھ کہنے یا کرنے کے لائق نہیں رہی تھی جبکہ ماہ بانو دھک دھک کرتے دل کے ساتھ سوچ رہی تھی کہ کیا شکاری کتوں کی طرح اس کے تعاقب میں لگے ہوئے چودھری کے کارندوں نے اس جگہ بھی اس کی بو پائی ہے۔ ... اور اب اسے دبوچ کر اسے مالک کے قدموں میں پہنچانے والے ہیں؟

”لڑکی کو بچے اجاڑو۔“ اکرم خان کی گردن سے رائفل کی نال لگائے کھڑے شخص نے حکم صادر کیا تو ذہن میں سرسارے اس خدشے کی تصدیق ہو گئی کہ یوں اس ویرانے میں انہیں گھیرنے والے ماہ بانو کے ہی دشمن ہیں جو ایک بار پھر اس کی زندگی کا سکون و رہم برہم کر دینے کے درپے ہیں۔

”بچہ اتر وڑی!“ حکم ملتے ہی ماہ بانو والی جانب کھڑا نقاب پوش اس کے شانے پر رائفل کی پھکی دیتے ہوئے غرایا اور پھر اپنے کنبے جملے کا روٹیل ظاہر ہونے سے قبل خود ہی ماہ بانو کا بازو پکڑ کر اسے جیپ سے باہر کھینچا۔

”یہ کیا بد تیزی ہے؟ تم نے ہاتھ کیسے لگایا لڑکی کو؟“

اپنی گردن سے لگی رائفل کی نال کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اکرم خان ہلکا ہلکا عورت کا احترام یوں بھی اس کی ٹھنی میں پڑا تھا اور ماہ بانو تو کبھی بھی اس کی مہمان ... جسے پناہ کے لیے ہی اس کے پاس بھیجا گیا تھا۔ اس کے ساتھ کسی بدسلوکی پر اس کا بھڑکنا لازم تھا۔ ماہ بانو جو نقاب پوش کے خود کو کھینچنے کی وجہ سے جیپ سے باہر نکلتی تھی، اکرم خان کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس کا چہرہ شدید غصے کے باعث ہنسنار ہا تھا اور آنکھوں میں سرفی اتر آئی تھی۔ اس حالت میں وہ مشاہیرم خان سے بہت زیادہ مشابہ لگ رہا تھا۔ گئے بھائی ہونے کی وجہ سے یوں بھی ان کی شکلوں میں تھوڑی سی مشابہت تھی اور اب غصے کی کیفیت میں ہونے کی وجہ سے وہ اور بھی زیادہ پُر جوش و خروش دہم جو مشاہیرم خان سے مشابہ لگ رہا تھا۔

”آرام سے بیٹھو۔ زیادہ جوش دکھانا تو اپنی جان سے جاؤ گے۔“ اکرم خان کی گردن سے رائفل کی نال لگا کر

کھڑے نقاب پوش نے نال سے ہی اس کے جڑے پر زوردار ضرب لگائی لیکن اب اکرم خان بری طرح ہلچل چکا تھا۔ اس نے جڑے کی چوٹ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے رائفل کی نال کو پکڑ کر زور سے دھکا دیا۔ رائفل بردار اس جھگڑے سے پیچھے کی طرف لڑھکا۔ اکرم خان دھناتا ہوا جیپ سے نیچے اتر آیا اور نیچے گرے ہوئے شخص کی طرف بڑھا۔ اس وقت وہ عالم جوش میں تھا اور اس حقیقت کو فراموش کر چکا تھا کہ اس کے مقابل صرف یہی ایک شخص نہیں ہے جسے زیر کر کے وہ حالات پر قابو پاسکتا ہے۔ وہاں تین سارے افراد اور بھی موجود تھے۔ اکرم خان کی زور آوری دیکھتے ہوئے اس کی ماں کو گور کے کھڑے نقاب پوش نے اپنی رائفل سیدھی کی اور پھر دھماکے کی زوردار آواز کے ساتھ اکرم خان لہراتا ہوا نیچے آگرا اور ترپے لگے۔ اس کے پہلو سے لگتا خون بہت تیزی سے اس کے کپڑوں کو کھل رنگ کرنا جا رہا تھا۔ اس ساری کارروائی کے دوران خوف زدہ ہی منہ کھولے نہیں اس کی ماں نے یہ منظر دیکھ کر ایک دل دوزخ ماری اور جیپ سے اتر کر اس کی طرف دوڑی۔ نقاب پوشوں میں سے کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ ماہ بانو اور جیپ کا ڈرائیور بھی یہ سب دیکھ رہے تھے۔ ڈرائیور نے شروع سے ہی ایسا طرز عمل اختیار کیا تھا جس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کسی جھگڑے میں پڑنے کے لیے تیار نہیں ہے اور اب جو کچھ ہاں ہوا تھا، اس کے بعد تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا کہ وہ اپنی جگہ سے ڈراسی جنبش بھی کرے گا۔ مبادا کسی مشکل میں پڑ جائے۔ ماہ بانو خود کو جیپ سے اتارنے والے نقاب پوش کی گرفت میں جکڑی شاگ کے سے عالم میں یہ سب دیکھ رہی تھی۔ اکرم خان جس کے گھر میں وہ پناہ گزین تھی ... جسے دولہا بنا کر مکمل پینا کے دروازے تک لے جانے کا وہ اس سے وعدہ کر کے آئی تھی ... جسے اس کی ماں صرف اس لیے بلند و بالا پہاڑوں کا سفر نہیں کرنے دیتی تھی کہ کہیں پہاڑ اس کے ایک اور پیارے کو نہ نگل لے ... اپنے ہی خون میں نہایا خشک زمین پر پڑا تھا۔ پیاسی زمین اس کے جوان خون سے سیراب ہو رہی تھی جبکہ غم سے نڈھال کر لاتی ماں نے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ کر اس طرح اسے اپنے بازوؤں میں دبوچ رکھا تھا جسے فریضہ اجل سے اسے چھپالینا چاہتی ہو۔ ماہ بانو کچھ ہی ہوئی آنکھوں سے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ آج پھر ایک انسانی جان اس پر قربان ہوئی تھی۔ آج پھر کوئی اسے بچانے کے لیے اپنے خون میں نہا گیا تھا۔ آج پھر اس کے گرداب میں پھنسے وجود کو گرداب سے نکالنے کی کوشش کرنے والا خود اس گرداب کا شکار ہو گیا

تھا۔

”لڑکی کو جیپ میں بٹھاؤ۔“ اکرم خان کے دھکے سے نیچے گرے والا نقاب پوش جو یقیناً ان حملہ آوروں کا لیڈر تھا، اب کاسٹیل کر کھڑا ہو چکا تھا۔ اس نے وہاں ہاتھ پاتھ مت پر ایک سرسری سی نظر ڈالی اور ماہ بانو کے عقب میں اسے جکڑے کھڑے شخص کو حکم دیا۔ وہ شخص حکم کی تعمیل میں اسے کھینچتا ہوا اپنی جیپ کی طرف لے گیا۔ ماہ بانو کے صدمے سے ساکت ہو جانے والے وجود میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ اپنی ناگوں کو حرکت دے سکتی۔ اس میں اتنی طاقت بھی نہیں تھی کہ اپنے ساتھ کیے جانے والے سلوک پر مزاحمت کر پائی۔ وہ کچھ کی کچی گڑیا کی طرح خود کو کھینچنے والے کے ساتھ ساتھ چلتی جا رہی تھی۔ ان لوگوں نے اسے جیپ میں ڈالنے کے بعد اس کی ناک پر کلاہور دھام میں ڈوبا ہوا دروازہ رکھا، جب بھی اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور خاموشی سے بے ہوشی کے اندھیروں میں اتر گئی۔ ان اندھیروں میں سفر کرتے اسے علم نہیں تھا کہ کچھ دیر پہلے وہ جس جیپ میں سفر کر رہی تھی، اس کے چاروں جزیرہ رائفل کی گولیوں سے ناکارہ کر دیے گئے ہیں اور اب وہ اپنے دوستوں کے بجائے دشمنوں کی ہم راہی میں ایک انجان واپسی دنیا میں لے جاتی جا رہی ہے۔

☆☆☆

”رانی اڈر ایک کپ گر ماگرم چائے تو لے آئے۔“ گیلے چہرے کو تھپتھپاتے ہوئے اکرم خان صاف کرتے ہوئے کٹورے کے صدمہ دیا۔ وہ رات بھر کی جاگتی ہوئی تھی۔ رات کے آخری پہر کھڑی واپس لوٹنے کے بعد باقی کا وقت نہا دھو کر اپنا حلیہ درست کرنے اور رانی سے مشاورت میں گزارا تھا۔ تاہم رانی کو بھی میں موجودگی اس کے لیے اتنی اعصابی کشیدگی کا باعث تھی کہ جو تھوڑا بہت وقت بچا، اس میں بھی نیند نہیں آسکتی۔ وہ تو اچھا ہوا کہ اشرف شاہ جلدی میں تھا اس لیے تاہم کو زیادہ دیر وہاں رہنے کا موقع نہیں مل سکا۔ اس کے روانہ ہوتے ہی اس نے بے حد ہوشی سکون محسوس کیا اور لمبی تان کر سو گئی۔ رات بیکے اور اعصابی کشیدگی کے بعد آنے والی نیند کافی گہری تھی اور وہ کئی گھنٹوں بعد دوبارہ جاگتی تھی۔ جاگنے کے بعد اس نے منہ ہاتھ دھویا اور اب بھی کچھ کچھ نیند کے خمار میں ڈوبے ذہن کو فریضہ کرنے کے لیے چائے پینے کی فرمائش کی۔

”آپ کہیں تو کھانا کلو ہوں بی بی! آپ نے صبح بھی بہت تھوڑا سنا کھا تھا۔ اب تو وہ پیر کے کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ خالی پیٹ چائے پینے کے بجائے اگر پہلے کچھ کھا لیں تو اچھا ہوتا۔“ ہر دم اس کی بھلائی کے لیے فکر مند رہنے

والی رانی نے مشورہ دیا تو وہ مسکرا دی۔ واقعی صبح رانی کے بے حد اصرار کے باوجود وہ ایک کپ چائے کے ساتھ ایک سلاکس کے سوا کچھ نہیں کھا سکی تھی۔ رات افضل کی بیوی مہتاب نے کھانے پر اچھا خاصا اہتمام کیا تھا لیکن وہ بے حد اہتمام سے تیار کیا گیا کھانا جذبات کی شوریدہ سری کے باعث اس کی اور آفتاب کی بہت زیادہ توجہ اپنی طرف مبذول نہیں کروا سکا تھا۔ ان دونوں ہی نے بہت کم کھانا کھا تھا چنانچہ اصولاً اسے اس وقت بھوک لگتی چاہیے تھی اور لگ رہی تھی ... پھر بھی وہ رانی کو کھل گئی۔

”ابھی تو تم چائے لے آؤ کھانے کا میں جھپٹیں بعد میں بتاتی ہوں۔“ وہ اپنا پرس کھول کر موبائل تلاش کرنے لگی۔ کچھ میں داخل ہوتے وقت اس نے موبائل آف کر دیا تھا جواب تک بند ہی تھا۔ موبائل کی اپنے پاس موجودگی کو دوسروں سے پوشیدہ رکھنے کے لیے وہ موبائل اسے بند ہی رکھتی تھی کہ مبادا اچانک کسی کی موجودگی میں ٹھنکی بجائے اٹھے اور اس کا راز فاش ہو جائے۔ موبائل پرس سے نکال کر آن کرنے کے بعد اس نے آفتاب کا نمبر ملایا۔ پہلی ہی بیل پر کال ریسپونڈ کر لی گئی۔

”کہاں تمہیں آپ؟ میں کب سے آپ کے فون کا انتظار کر رہا ہوں۔“ فوراً ہی دوسری طرف سے آفتاب کی خفا سی آواز سنائی دی تو اسے احساس ہوا کہ وہ اس کے ساتھ کتنی بڑی زیادتی کر چکی ہے۔ پہلے حالات کو اپنے کنٹرول میں لینے کے پکڑ میں اٹھے ہوئے کے باعث اسے خیال ہی نہیں آیا کہ آفتاب کو کال کر لے اور بعد میں رپیکس ہونے کے بعد اسے نیند نے دبوچ لیا۔ وہ بے چارہ رات سے اب تک یقیناً اس کی طرف سے کال کیے جانے کے انتظار میں بیٹھا خواہر ہو رہا تھا۔

”سوری آفتاب! میں آپ کو کال بھی نہیں کر سکی۔ پہلے آپ کی موجودگی کی وجہ سے اتنی تیش تھی، بعد میں سو گئی۔ اچھی اچھی ہوں اور سب سے پہلے آپ کو فون کیا ہے۔“ اس نے نہایت شرمندگی کے عالم میں چٹائی کا اعتراف کیا۔

”کیا کہنے ہیں آپ کی بے نیازی کے۔ شاید اللہ نے عورتوں کو دنیا میں بھیجا ہی اس لیے ہے کہ ہم بے چارے شریف مردوں کو خوار کر سکیں۔“ اس نے شکوہ کیا۔

”میں نے آپ سے سوری کہا تو ہے۔ بس غلطی ہو گئی، اب کیا کان بکڑوں۔ تب معاف کریں گے؟“ اس نے فوراً ناز و ادا کا ہتھیار سنبھال لیا۔ اسی وقت رانی ٹرے میں چائے رکھے اندر داخل ہوئی اور اس کے اشارے پر ٹرے بند کی سائیکل پر رکھ کر باہر نکل گئی۔ کٹورے نے ایک نظر میں ہی دیکھ

لیا کہ ٹرے، چائے کی پیالی کے علاوہ اور بھی بہت سے لوازمات سے بھری ہوئی ہے۔ ان لوازمات میں مکینکس، شامی کباب اور سینڈوچز نمایاں تھے۔

”کان پکڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اگر کچھ پکڑنا ہی ہے تو ہمارے پاس آکر ہمارا ہاتھ پکڑیں۔“ اس بار آفتاب کالجہ خاصا شوخ تھا۔

”انجی فرمائش کی ہے۔ یہ تو پوچھا نہیں کہ یہاں کے حالات کیسے ہیں؟ ہم جیتے ہیں کہ مرتے ہیں... بس فوراً اپنے مطلب کی بات کہہ ڈالی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے اسے ٹوکا اور ٹرے میں سے چائے کی پیالی اٹھا کر اس کا ایک گھونٹ بھرا۔

”اجی ایسے بے خبر بھی نہیں ہیں۔ رات سے آپ کی کوٹھی کے باہر میرے بارے میں پیرا بھایا ہوا تھا۔ سب معلوم ہے کہ آپ کے بہن بہنوں اپنے سپوت کے ساتھ جمع کئے ہوئے کرکٹے منٹ پر روانہ ہوئے تھے۔ باقی کی اطلاعات کوٹھی کے فون پر کال کر کے ان خاتون سے حاصل کر لیں جن کا نام تو رانی ہے لیکن فراموش وہ آپ کی کنیر کے انجام دیتی ہیں۔

دیے آپ کی کیا بات ہے۔ آپ چاہیں تو بیچ کے رانی راجاؤں کو اپنی خدمت پر مامور کر ڈالیں۔ وہ بے جا رہی تو خیر ہے ہی صرف نام کی رانی۔“ آفتاب آج اپنے مزاج کے برخلاف بہت زیادہ شوخی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

شاید ہر انسان کے اندر چاہے وہ کتنا ہی سنجیدہ و بردبار ہو، ایک شوخ و خشک اور شرر سا گوشہ ہوتا ہے... لیکن بعض لوگ بس کسی کسی کو ہی اس تک رسائی حاصل کرنے دیتے ہیں۔ کشور، آفتاب کے مسند پر دل پر ابرہمان بھی اور اس پر حکومت کرتی تھی، اس سے بھلا وہ اپنی ذات کا کوئی گوشہ کیونکر پوشیدہ رکھتا؟ کشور بے ساختہ ہی اس کی باتوں پر ہنسی چلی گئی پھر بولی۔ ”کھداری ہیں نا... لفظوں سے نکھین آپ سے بڑھ کر بھلا کس کو آسکتا ہے؟“

”لفظوں کے کھلوانوں سے بہت کھیل چکے، اب تو بس آپ کی زلفوں سے کھینا چاہیے ہیں۔“ اسے واقعی لفظوں کا استعمال خوب آتا تھا۔ کشور کے جملے سے لفظ پکڑتے ہوئے اپنی مطلب کی بات کہہ گیا۔

”میں کوشش کرتی ہوں آفتاب! بچ پوچھیں تو میں بھی آپ کے پاس آتا چاہتی ہوں... بلکہ میں تو چاہتی ہی یہ ہوں کہ ہر دم، ہر لمبہ آپ کے پاس رہوں لیکن حالات آپ کے سامنے ہی ہیں۔ میری بہت زیادہ بے اعتدالی آپ کے لیے بھی پریشانی کا سبب بن سکتی ہے۔ رات میں نے حالات سنبھال لیے تھے۔ ملازمین کو بھی کسی نہ کسی طرح خاموش

رکھنے میں کامیاب رہی ہوں لیکن مجھے نہیں معلوم کہ ان میں سے کون کب اپنی کاجاسوس بن جائے۔ ان ملازمین کو جل دے کر ہی مجھے آپ تک پہنچنا ہوگا۔“ کشور نے جیدگی اختیار کرتے ہوئے اس کو حالات سے آگاہ کیا۔

”میں آپ کی مجبوری کو کبھی طرح سمجھتا ہوں اور آپ کو بہت زیادہ مشکل میں بھی نہیں ڈالنا چاہتا۔ اس وقت یہ فرمائش اس لیے کی ہے کہ آج رات مجھے بیڑا یاد آجائے۔“

جانا ہے۔ دوبارہ چھٹی کے دن سے پہلے لاہور نہیں آسکوں گا۔ آپ جانتی ہیں کہ بیڑا یاد آسکوں میرے لیے خاص اہمیت رکھتا ہے اور میں اس سے غیر حاضر رہ کر اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اسی لیے چاہتا تھا کہ چائے سے پہلے آپ سے ملاقات کر لوں ورنہ ہم دونوں کو ہی ہنگامی رہے گی۔ جہاں تک میرا خیال ہے، دن کے وقت کوٹھی سے نکلنے میں آپ کو بہت زیادہ مشکل پیش نہیں آئے گی۔“ جوہا آفتاب نے اس سے بھی زیادہ جیدگی سے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ میں ٹھوڑی دیر بعد فون کر کے آپ کو آگے کا پروگرام بتاتی ہوں۔ آپ مہتاب بھائی سے کہیں کہ کھانا تیار رکھیں۔ میں نے رات سے اب تک کچھ نہیں کھایا۔“ اس نے شعوری طور پر اپنے لہجے میں خوش گواری پیدا کرنے کی کوشش کی۔

”کھانا تو میں نے بھی نہیں کھایا۔ چلیں، آپ آجائیں تو ساتھ مل کر ہی کھائیں گے۔“ آفتاب نے بھی جگہ بھینکے انداز میں کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔ فون بند ہونے کے بعد کشور سوچ میں پڑ گئی۔ کوٹھی سے باہر نکل کر کہیں جانے کے لیے ڈرائیور کو ساتھ لے جانا پڑتا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ایسی کون سی جگہ جائے جہاں چند گھنٹے گزارنے کا بہانہ بنا کر ڈرائیور کو واپس بھیجا جاسکے۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد ایک جگہ اس کے ذہن میں آئی لیکن اس دوران پیالی میں بیج جانے والی چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ پیالی ٹرے میں واپس رکھ کر اس نے رانی کو کمرے میں بلایا۔ ”آپ نے تو کچھ نہیں کھایا بی بی! چائے بھی آدھی چھوڑ دی۔“ رانی نے اس سے شکوہ کیا۔

”کوئی بات نہیں۔ کچھ دیر بعد میں بڑا مزہ لے کر آسا کھانا کھانے والی ہوں۔ تم ڈرائیور کو فیروز ڈی والا سوٹ تو نکال دو جو میں دودن پہلے خرید کر لائی تھی۔ اور ہاں، ڈرائیور سے بھی کہہ دینا کہ گاڑی تیار رکھے۔ ہم ٹھوڑی دیر میں سینٹرل لاہور پر تک چلیں گے۔“ کشور نے احکامات جاری کیے جنہیں سن کر رانی کو اندازہ ہو گیا کہ کشور ایک بار پھر آفتاب سے ملنے جانے والی ہے۔ وہ تہذیب کے عالم میں کھڑی

رہی۔ مگر کورک بھی نہیں سکتی تھی لیکن کل جو کچھ پیش آیا تھا، اس کے بعد فوری طور پر یہ دوسرا خطرہ مول لینا بھی مناسب نہیں لگ رہا تھا۔

”نکس آج کی بات ہے رانی! پھر اپنے بھرتک میں کوٹھی سے باہر قدم بھی نہیں بٹھانوں گی۔“ کشور نے اس کا تہذیب بھانپ کر فون دی اسے تسلی دی تو وہ احکامات پر عمل کرنے کے لیے متحرک ہو گئی۔ پندرہ منٹ کے وقفے کے بعد وہ دونوں ڈرائیور کے ساتھ لاہور پر کی طرف جاری تھیں۔

”لاہور پر پانچ بجے تک کھلی رہتی ہے۔ ہم اس وقت تک اندر ہی رہیں گے، تم چاہو تو واپس چلے جاؤ یا باہر ہی رکے رہو۔ میری طرف سے پانچ بجے تک تم آزاد ہو۔“ لاہور پر کی کے سامنے اترنے سے قبل اس نے ڈرائیور سے کہا۔ اس بار اسے شک میں پڑنے سے بچانے کے لیے اس نے ایسا رویہ اختیار کیا تھا۔

”میں یہیں رک کر آپ لوگوں کا انتظار کروں گا گی بی بی!“ ڈرائیور نے اپنا فیصلہ سنایا جس پر کوئی بھی رد عمل ظاہر کیے بغیر وہ رانی کے ساتھ اندر کی طرف بڑھ گئی۔ سیکورٹی کے نقطہ نظر سے چند مخصوص لوگوں کے علاوہ دیگر افراد کو گاڑی لاہور پر کی کی عمارت کے اندر لے جانے کی اجازت نہیں ملتی تھی۔ وہ دونوں لاہور پر کی کے احاطے میں پہنچیں تو افضل کی گاڑی کو وہاں کھڑے دیکھ کر کشور کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ آفتاب اور افضل دونوں پرنٹ میڈیا سے تعلق رکھتے تھے۔ افضل چونکہ لاہور میں رہ کر اس میدان میں زیادہ سرگرم عمل تھا، اس لیے اس کے تعلقات بھی زیادہ تھے۔ اس کے تعلقات کا ہی فائدہ اٹھاتے ہوئے آفتاب اس کی گاڑی کو لاہور پر کی کے احاطے کے اندر لانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

”تم جا کر پانچ بجے تک مزے سے اپنی پسند کی کتابیں پڑھو۔ ہم اتنی دیر میں زندگی کو پڑھ کر آتے ہیں۔“ رانی کو اشارے سے لاہور پر کی کی مرکزی عمارت کا دروازہ دکھاتے ہوئے وہ خود گاڑی میں منتظر بیٹھے آفتاب کی طرف بڑھ گئی۔ وہ اس کے قریب پہنچتے ہی قہقارہ کا دروازہ کھول چکا تھا۔ ”کیا قسمت ہے افضل کی گاڑی اور اس کے گھر کی... جہاں آپ قدم نہ رچو فرمائی ہیں۔“ اس کے اگلی سیٹ پر بیٹھے ہی آفتاب نے سر دی آہ بھر تے ہوئے کہا۔

”گاڑی اور گھر تو آپ کے دم سے اہم ہیں۔ آپ کی خاطر ہی تو ہم آئے ہیں۔“ اس نے دل ربا لہجے میں جواب دیا تو آفتاب مسکرا کر گاڑی اشارت کر کے لاہور پر کی سے باہر نکلی۔ لاہور پر کی کے مین گیٹ سے باہر عام پبلک کے

لیے مختص پارکنگ ایریا میں گاڑی سے ایک لگے لگے کڑا کشور کا ڈرائیور گمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ابھی جو گاڑی تیزی سے گیٹ سے باہر نکل کر ٹریفک کے بہاؤ میں شامل ہوئی ہے، اس میں اس کی مالک بھی سوار ہے۔ احتیاط کے پیش نظر کشور نے اپنے چہرے کو چادر کے پلو کی مدد سے مزید چھپا لیا تھا۔

”آپ کے دوست اور ان کی عینک پنا نہیں میرے بارے میں کیا گمان کرتے ہوں گے۔ اس طرح چوری چھپے نکاح کرنے اور ملنے ملانے والی لڑکیوں کو عموماً لوگ پسند نہیں کرتے۔ ہمارے ہاں ایسی ہر لڑکی کو کہتے سمجھا جاتا ہے۔“ گاڑی ڈرا آگے بڑھی تو کشور نے اپنے ذہن میں ابھرنے والے اندیشے کو آفتاب سے شیئر کیا۔

”کل آپ کو ان دونوں کے رویے میں ایسی کوئی بات نظر آئی تھی جو آپ سے سب سوچ رہی ہیں؟“ آفتاب نے پل بھر کے لیے اس کے چہرے پر نظر ڈالنے کے بعد دوبارہ ڈرائیور کی طرف توجہ مبذول کرتے ہوئے سوال کیا۔ ”نہیں لیکن شاید ایسا تو انہوں نے آپ سے دوستی کے احترام میں کیا ہو، دل میں تو وہ کچھ بھی سوچ سکتے ہیں۔“ وہ زور دیتی تھی۔

”اس بات کی میں آپ کو گارنٹی دے سکتا ہوں کہ ان کے دلوں میں بھی آپ کے لیے احترام ہے۔ وہ دونوں پڑھے لکھے، سمجھ دار اور روشن خیال لوگ ہیں جو ہر معاملے کو ایک ہی عینک سے نہیں دیکھتے۔ کسی لڑکی کا اپنے گھر والوں سے چھپ کر نکاح کر لینا یقیناً کوئی پسندیدہ فعل نہیں لیکن جہاں بنیادی انسانی حقوق کا استحصال کیا جا رہا ہو، وہاں ایسے ہی رویے اور رد عمل ظاہر ہوتے ہیں۔ قانون و شریعت دونوں کی رو سے آپ کو یہ حق حاصل ہے کہ آپ اپنے دل کی رضامندی کے ساتھ کسی بھی شخص کو اپنا رشتہ جیاتی منتخب کر سکتی ہیں لیکن یہ حق تسلیم کرنا تو دور کی بات، آپ کے والد محترم نے تو اپنے خود ساختہ اور جاہلانہ رد و اجوں کی پابندی کرتے ہوئے آپ کو ایک نارمل زندگی سے بھی دور کر رکھا تھا۔ جو لوگ اپنی زیر کفالت عورتوں کے ساتھ ایسی زیادتی کرتے ہیں وہ اللہ کی نظر میں بھی یقیناً معتبوب ہی ہیں۔ تو آپ یہ کیسے سوچ سکتی ہیں کہ ایک خلاق شخص کے ظلم کے خلاف احتجاج کرنے پر میرا دوست یا اس کی بیوی آپ کو برا سمجھ سکتے ہیں؟“

”بس یونہی ذہن میں خیال آ گیا تھا۔ اصل میں ہمارے ہاں عورت کی ضروریات و خواہشات کو سمجھنے کا رواج ہی نہیں ہے نا اس لیے میں ڈر جاتی ہوں۔“ آفتاب کا جواب سن کر کشور اسی بھری مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

”مت ڈرا کریں۔ ہمارے درمیان جو رشتہ ہے، اس کا سب سے زیادہ احترام میرے دل میں ہے اور آپ کو بس میرے دل کی پروا ہوئی چاہیے۔“ دائیں ہاتھ سے اسٹیکر تک میل سنبالے آفتاب نے اس کا ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ کی گرفت میں لیا اور ہونٹوں کے قریب لے جا کر ہاتھ کی پشت پر ایک نرم سا بوسہ لیا۔ کشور کے چہرے پر اس کے اس عمل کے باعث سرخی سی دوڑ گئی۔

”ویسے میں آپ کو ایک حیرت کی بات بتاؤں؟ یہ جو افضل اور مہتاب بھابی ہیں، ان کا کس بھی کچھ ہماری ہی طرح کا ہے اس لیے ان دونوں سے ایک فیصلہ بھی امید نہیں رکھی جاسکتی کہ وہ مجھے یا آپ کو غلط سمجھیں۔“ اس کے ہاتھ پر اپنی گرفت ختم کیے بغیر آفتاب نے انکشاف کیا۔

”مطلب؟“

”مطلب کچھ یوں ہے کہ یہ جو ہماری مہتاب بھابی ہیں، ان کا تعلق ایک پٹھان قبیلے سے ہے۔ بھابی کے والد آکسفورڈ سے ڈگری یافتہ ایک خاصے روشن خیال سردار تھے لیکن یہ روشن خیالی بس اس حد تک تھی کہ انہوں نے بی بی پر تعلیم کا دروازہ بند نہیں کیا۔ بھابی نے نہ صرف گریجویشن کیا بلکہ ماسٹرز کے لیے بھی اپنے علاقے سے نکل کر اسلام آباد کی یونیورسٹی تک پہنچ گئیں مگر خاندانی رواج کے مطابق ان کی شہریت ان کے چچا زادوں کے چچا زادوں سے کر دی گئی تھی۔ چچا زادان سے عمر میں تین سال چھوٹا ہونے کے علاوہ تعلیمی میدان میں بھی بہت پیچھے تھا۔ اصل میں اس بالآخر اور بگڑے ہوئے سردار زادے کو پڑھنے لکھنے سے دلچسپی ہی نہیں تھی۔ ظاہر ہے، مہتاب بھابی جتنی پڑھی لکھی اور نازک احساسات رکھنے والی خاتون ایسے شخص کو پسند نہیں کر سکتی تھیں لیکن اپنے والد کے احترام میں اس رشتے سے انکار بھی نہیں کرتی تھیں۔ ان حالات میں ان کی ملاقات افضل سے ہوئی۔ افضل اپنے ایک اسائنمنٹ کی تیاری کے سلسلے میں قبائلی علاقوں کا دورہ کرتا پھر رہا تھا۔ مہتاب بھابی جوان دنوں چھٹیوں پر اپنے گھر گئی ہوئی تھیں، افضل کے لیے بہت میلپ فل ثابت ہوئیں۔ وہیں دونوں کے دلوں میں پسندیدگی کا جذبہ بھی پیدا ہوا۔ لیکن بھابی نے ایسا کوئی موقع پیدا نہ ہونے دیا کہ اس جذبے کا اظہار ہو سکتا۔ افضل بنا اظہار کیے ہی واپس آ گیا لیکن اسے یہ تو معلوم ہی تھا کہ بھابی اسلام آباد یونیورسٹی سے ماسٹرز کر رہی ہیں۔ اس نے ان سے رابطہ کیا مگر بھابی نے اپنی مشغلی اور روایات کے بارے میں بتاتے ہوئے انکار کر دیا۔ افضل اپنی تمام تر کوشش کے باوجود انہیں قائل نہیں کر سکا۔

اور یوں تقریباً سال بھر کا عرصہ گزر گیا۔ بھابی امتحانات سے فارغ ہو کر اپنے گھر واپس پہنچیں۔ ذہنی طور پر آمادہ بھی تھیں کہ کزن سے شادی کر لیں کی لیکن جب ان کے علم میں یہ بات آئی کہ ان کا منگیترا غلطی ہے راہروی کا شکار ہے تو وہ برداشت نہیں کر سکیں۔ منگیترا صاحب کی اپنی ایک ملازمہ کے ساتھ زیادتی کا کیس ان کے سامنے ہی پیش آیا جسے سرداروں نے اپنے اثر رسوخ کے استعمال سے دبا دیا۔ لیکن ظاہر ہے بھابی پر تو سچائی عیاں تھی۔ انہوں نے اپنے والد سے بات کی کہ بے شک ساری زندگی ان کی کسی سے شادی نہ کی جائے لیکن وہ اس بدکردار شخص سے شادی نہیں کریں گی۔ پڑھے لکھے، روشن خیال والد صاحب اس سوچ پر روادار نہ رہے ثابت ہوئے جن کے مطابق مردوں کی ایسی غلطیاں قابل گرفت نہیں تھیں۔ بھابی نے سمجھ لیا کہ وہ اپنے والد کو قائل نہیں کر سکیں گی۔ انہوں نے متعل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خاموشی اختیار کر لی اور جب اپنا رزلٹ معلوم کرنے اسلام آباد گئیں تو افضل سے رابطہ کر کے اس سے پوچھا کہ کیا تم فوری طور پر مجھ سے نکاح کر سکتے ہو؟ افضل صاحب، اندھا کیا چاہے دو آکھیں کے مصداق فوراً راضی ہو گئے۔ دونوں کا خاموشی سے نکاح ہوا اور پھر وہ لوگ اسلام آباد سے لاہور شفٹ ہو گئے۔ سرداروں میں سے کوئی گمان نہیں کر سکا تھا کہ سال بھر پہلے ان کے علاقے میں آنے والا اخباری رپورٹر ان کی لڑکی کو لے اڑا ہے۔ وہ انکل بچے سے کام لیتے ہوئے اپنی لڑکی تلاش کرتے رہے۔ اب تو کافی سال گزر گئے ہیں لیکن مہتاب بھابی کو یقین ہے کہ آج بھی انہیں تلاش کیا جا رہا ہوگا۔ اس خوف کی وجہ سے وہ بہت کم گھر سے باہر نکلتی ہیں۔ کتنی بھی ہیں تو مکمل پردے میں۔“ آفتاب کے یہ ساری داستان سنانے کے دوران راستہ کٹ بھی گیا اور کشور کو خبر نہیں ہو سکی۔ وہ تو اس وقت چوٹی جب گاڑی افضل کے دو منزلہ مکان کے سامنے رکھی اور آفتاب نے بارن دیا۔ فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔ کل رات کی طرح اس وقت بھی مہتاب نے مسکراتے ہوئے گرم جوشی کے ساتھ ان دونوں کا استقبال کیا لیکن آج اس کے ساتھ افضل اور بچے موجود نہیں تھے۔

”افضل بھابی اور بچے گھر پر نہیں ہیں کیا؟“ کشور نے اپنائیت کے گہرے احساس کے ساتھ اس سے گلے گلے ہوئے سوال کیا۔

”افضل اپنے دفتر گئے ہوئے ہیں اور بچے ابھی اسکول سے آئے نہیں ہیں۔ بس آئے ہی والے ہوں گے۔“ مہتاب کا جواب ابھی اس کے منہ میں ہی تھا کہ باہر سے بارن سنائی دیا۔

”لو آگئے بچے بھی۔ نام لیتے کے ساتھ ہی شیطان حاضر ہیں۔“ مہتاب متا بھری محبت کے ساتھ کہتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی۔ پہلے بھر کے قتلے کے بعد ہی دونوں گول گوتھنے سے بچے کشور کے سامنے موجود تھے۔

”آپا۔۔۔ دہن آئی ہے۔“ اسے دیکھ کر وہ دونوں خوش ہو گئے۔

”پارا تم لوگ انہیں چچی کہہ لیا کرو، دہن تو یہ میری ہیں۔ خواہ مخواہ تمہارے دہن کہنے سے مجھے جیسی ہونے لگتی ہے۔“ آفتاب نے چھوٹے والے کو گود میں اٹھاتے ہوئے شوش چھوڑا۔

”ٹھیک ہے، ہم انہیں دہن چچی کہیں گے۔“ بڑے آصف نے مدبرانہ انداز میں فیصلہ سنایا۔

یعنی دہن سے دست بردار بہر حال صاحبزادے نہیں ہوں گے۔ آخر اولاد کس شخص کی ہیں۔“ آفتاب نے فیس کر کہا اور اندر کی طرف بڑھ گیا۔ باقی سب بھی اس کے پیچھے تھے۔ مہتاب نے حسب فرمائش مزید ارکھانا تیار کر رکھا تھا۔ شیشے مکرانے ماحول میں کھانا کھایا گیا۔ کشور کو زندگی میں پہلی بار ایک مکمل گھرانے کا یہ ماحول میسر آیا تھا۔ وہ مستقل مہتاب کے آصف اور داحصف نامی دونوں بیٹوں کے ساتھ کئی رہی۔ کھانے کے بعد بچوں کا موڈ نہ ہونے کے باوجود مہتاب نے انہیں آرام کے لیے ان کے کمرے میں بھیج دیا اور خود کچن کی مصروفیت کا بہانہ کر کے منظر سے ہٹ گئی۔ مہتاب کی کچھ داری کو دل ہی دل میں سراہتے ہوئے وہ دونوں اس کمرے میں پہنچ گئے جہاں کل رات انہوں نے اپنی شادی شدہ زندگی کے اولین لمحات بتائے تھے۔ اس کمرے کا فیسول آج بھی اسی طرح قائم تھا۔ اس فیسول خیزی کے حصار میں گھر سے وہ پھر ایک دوسرے کو جکارتے دل سنانے لگے۔ کل اگر پہلی شب عروسی کی ہے تباہیاں تھیں تو آج جدائی کی دہلیز پر کھڑے دو پیار کے متوالوں کی الوداعی ملاقات کی ہے قراری! آفتاب آج پیر آباد واپس چلا جاتا تو ہفتہ بھر بعد ہی آ پاتا اور یہ طے نہیں تھا کہ ہفتے بھر بعد وہ دوبارہ ایک دوسرے سے مل سکیں گے۔ محبت میں اندیشے اور خدشات یوں بھی ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور ان کا تو معاملہ ایسا تھا کہ جب ملتے تھے، چاہتے تھے کہ عمر بھر کا پیار اس ایک ملاقات میں ہی ایک دو بے پروا لانا دیں۔ محبت کی اس روم جم سے سیراب ہو کر مقررہ وقت پر طے شدہ طریقہ کار کے مطابق جب کشور واپس کوئی پہنچی تو اس کے دل میں ایک ہی سوال تھا۔ ”خوشی میں بیٹھکے لمبے اتنی جلدی کیوں گزر جاتے ہیں؟“

☆☆☆

”تم نے بیک اپ کر لیا سنبھیا؟“

”نہیں سر!“ لائسن کی دوسری طرف موجود دروازے کے سوال کا سنبھیا نے مستعدی اور انکسار کے ساتھ جواب دیا۔

”گڈ! پھر کب تک تم لوگ منظر سے ہٹ جاؤ گے؟ میں نہیں چاہتا کہ تمہارے اور تمہاری بی بی کے انڈر گراؤنڈ ہونے سے پہلے کوئی کارروائی ہو۔ رانا تم لوگوں کی بوسوگت پھر رہا ہے۔ اس کے ماتحتوں میں سے بھی ایک آدھ لازماً صورت حال سے واقف ہوگا۔ ہماری کارروائی کے جواب میں ایسا کوئی شخص ایکٹو ہو کہ تم تک نہ پہنچے، اس لیے احتیاط ضروری ہے۔“

”ڈونٹ وری سرا آپ کو جو ایکشن لینا ہے لے لیں۔ ہم لوگ بالکل ٹھیک ہیں۔ ارمیلا اور گیتا اپنی ماما کے ساتھ پہلے ہی ٹارورن ایریا کی طرف کھل چکی ہیں اور میں بھی آج کھانا بدلنے والی ہوں۔“ درما کی تشویش کے جواب میں اس نے پرسکون اور بنجید رویہ اختیار کیا۔

”اوکے! مجھے بس تمہاری طرف سے ہی گرین سگنل چاہیے تھا۔ میرا گنگ سیکشن ایکشن کے لیے بالکل تیار ہے۔ رانا کی تمام ایکٹیوئیز ہماری نظروں میں ہیں۔ میں صرف تم لوگوں کی طرف سے خاموشی تھا۔ پہلے ہی ہمارے چند اہم ورکرز مارے جا چکے ہیں اس لیے میں کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ اب تم نے اطمینان دلایا ہے تو بس سمجھو کام ہو گیا۔ بہت جلد تمہیں خود بھی نیوز سننے کو مل جائے گی۔“

”بیسٹ آف لک سر!“ درما کی بات سن کر سنبھیا نے اس کے ارادوں کے لیے اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ درحقیقت اس خواہش میں نیک نیتی کا کوئی دخل نہیں تھا۔ یہ بس اقتدار و اختیار کی وہ ہوش تھی جو دوسروں کو بے امنی اور خوف میں مبتلا کر کے ہی تسکین پاتی تھی۔

”ہینکس!“ درما نے سیٹ سے لہجے میں سنبھیا سے کہتے ہوئے کال منقطع کر دی۔ اس کے فون بند کرتے ہی سنبھیا نے بھی ریسور کر بیل پر ڈال دیا اور میز پر رکھا اپنا ہینڈ بیک ہاتھ میں لیتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ میز پر اب نئی فون سیٹ کے علاوہ کوئی شے موجود نہیں تھی بلکہ پورے دفتر میں فریجیئر کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ لوگ اپنا تمام ضروری اور غیر ضروری سامان بہت خاموشی سے یہاں سے ہٹا چکے تھے۔ دفتر کی بہت باریک بینی کے ساتھ صفائی بھی کر دی گئی تھی کہ اگر کوئی کھوج لگا تا وہ یہاں تک پہنچ بھی جائے تو اسے کوئی کلیو ڈل سکے۔ خصوصاً فکٹر پرنس کے معاملے میں انہوں نے بے

مدا احتیاط برتی تھی۔ سٹھیا تو اس معاملے میں اتنی محتاط تھی کہ ہر وقت ہاتھوں کے لیے باریک دستاں کا استعمال کرتی تھی۔ لباس کی میپنگ سے تیار کیے جانے والے یہ دستاں کسی کو شک میں مبتلا کرنے کے بجائے اس کی شخصیت کو دلکش بنا دیتے تھے۔ عمر کے کئی سنہری سال گزارنے کے بعد اوجیز عمری کی دلچیز پر قدم رکھ چکنے والی سٹھیا کی شخصیت میں ایسا وقار تھا جو لوگوں کے دلوں میں اس کے لیے پسندیدگی کے جذبات ابھارتا تھا۔ اس تاثر کو قائم رکھنے میں اس کے لباس اور رکھ رکھاؤ کا بڑا دخل تھا۔ اس وقت بھی اس نے فائن ٹیکر کا ایک خوب صورت لائٹ اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ اسکرٹ پر گولڈن ٹکری نہایت نازکی سے بیل کر رکھی ہوئی تھی۔ لباس کی مناسبت سے اس نے فائن ٹکری کے ہی گولڈن بچے والے خوب صورت دستاں پہن رکھے تھے۔ کانوں میں موجود سونے کے چھوٹے چھوٹے ٹاپس اور گلے میں پڑی نازکی سی چین بھی اس کے لباس سے ہم آہنگ تھی۔ اپنی شخصیت کے اس گریس سے واقف سٹھیا نے سلفدھرموں سے ملتی ہوئی دفتر سے باہر نکلی اور بیرونی دروازہ لاک کر کے بیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ جس عمارت میں اس کا دفتر موجود تھا، وہ علاقے میں موجود دیگر کمرشل بلڈنگز کی طرح کچھ ایسے طرز پر تعمیر کی گئی تھی کہ دن کے وقت بھی وہاں اچھا خاصا اندھیرا رہتا تھا اور مصنوعی روشنیوں کے بغیر گزارہ ممکن نہیں تھا۔ آج بیڑھیوں کو روشن رکھنے والے ہلکس کی چلائی لائن میں شاید کوئی کڑ بڑ ہو گئی تھی جس کی وجہ سے بیڑھیاں تاریک پڑی تھیں۔ اس تاریکی نے بیڑھیاں ملے کرتے سٹھیا کے قدموں میں کسی قسم کی ڈگمگاہت پیدا نہ ہونے دی۔ وہ ایک تربیت یافتہ ایجنٹ تھی جس کا ذہن ہر شے کا حساب کتاب رکھنے کا عادی تھا۔ اسے بیڑھیوں پر آنے والا ہر موڑ اور اس کے قدموں کی تعداد اور برقی چٹا پنچہ وہ تاریکی میں بھی پورے اطمینان سے چلتی ہوئی گراؤ پر طور تک پہنچ گئی اور وہاں موجود ایک اسٹیٹ ایجنسی کے دفتر کا رخ کیا۔ اس دفتر کا مالک درحقیقت اس پوری بلڈنگ ہی کا مالک تھا جو اپنے کاروبار باری مزاج کی وجہ سے بلڈنگ میں قائم ڈھیروں دفاتر کے کرائے سے حاصل ہونے والی آمدنی کے باوجود مزید کمائی کے لیے یہ ایجنسی کھول کر بیٹھا ہوا تھا۔ سٹھیا کو اپنے دفتر میں داخل ہوتے دیکھ کر اس نے خوش گوار مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا۔ ٹپل از وقت بغیر کسی مطالبے کے پابندی سے کرایہ ادا کرنے والی سٹھیا کو وہ کافی پسند کرتا تھا۔

یہاں آنے کی زحمت کی؟“ سٹھیا صرف کرائے کی ادائیگی کے لیے ہی اس کے دفتر کا رخ کرتی تھی اور کرایہ وہ دو دن پہلے ہی دے چکی تھی اس لیے اسے سامنے پا کر وہ کچھ تشویش محسوس کر رہا تھا۔

”میں بیڑھیوں کی نہیں مسررحت میں بس آپ کو آپ کے دفتر کی یہ چابیاں واپس کرنے آئی تھی۔ میں اپنا میرج بیورو بند کر رہی ہوں اس لیے مجھے مزید آپ کے آفس کی ضرورت نہیں ہے۔“ سٹھیا نے اپنے پینڈ بیک سے دفتر کی چابی نکال کر اس کے سامنے رکھی۔

”لیکن کیوں؟ اتنی اچانک آپ نے یہ فیصلہ کیسے کر لیا؟“ عمارت کا مالک حیران ہوا۔

”اصل میں بات یہ ہے کہ میرے ساتھ کام کرنے والی دونوں لڑکیاں ملازمت چھوڑ کر جا چکی ہیں اور اکیلے کام سنبھالنا میرے بس میں نہیں۔ میں نے سوچا کہ میں بھی کام سمیٹ کر ریٹائرمنٹ لے لوں۔ میرے بچے بہت عرصے سے اصرار کر رہے تھے کہ میں ان کے پاس آ کر رہوں۔ اب میں اپنے بچوں کے ساتھ رہ کر آرام سے الگ انجوائے کروں گی۔“ سٹھیا نے اسے تفصیلی جواب دیا اور مرکز دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس بار عمارت کے مالک نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ اس کا دفتر خالی ہو چکا تھا اور اسی صورت میں کہ دفتر کا کرایہ بھی ادا کیا جا چکا تھا اور ایڈوائس کی رقم کے لیے بھی کوئی تقاضا نہیں ہوا تھا، وہ مکمل طور پر فائدہ سے محروم تھا۔ بس اب اسے خالی ہونے والے دفتر کے لیے نئی پارٹی تلاش کرنی تھی جو کہ ایسا خاص کام نہیں تھا۔

سٹھیا عمارت کے مالک کے تمام احساسات کو اچھی طرح سمجھتی تھی لیکن اسے رقم کی پروا نہیں تھی۔ اس کے لیے وہ مشن اہم تھا جس پر وہ اتنے برسوں سے کام کر رہی تھی۔ اس وقت بھی عمارت سے باہر نکلنے کے بعد اس نے ایک خالی ٹیکسی ہار کی اور ٹیکسی والے کو دس منٹ کی مسافت پر واقع ایک علاقے کا نام بتا کر وہاں چلے گا حکم دیا۔ اپنے مطلوبہ علاقے میں پہنچ کر اس نے ایک پبلک کال آفس کا رخ کیا۔ خود کو ٹریس ہونے سے بچانے کے لیے اہم کالز کے لیے ان پل سی او کا پتہ استعمال سب سے مناسب رہتا تھا۔

”اہمیں بے بول رہی ہوں۔ کام ہونے والا ہے۔ میں ہدایت کے مطابق کچھ عرصے کے لیے انڈر گراؤنڈ بورڈ ہوں۔“ مطلوبہ نمبر پر رابطہ قائم ہونے پر اس نے رپورٹ پیش کی۔

”او کے اپنی اسے کے بارے میں رپورٹ کرو۔ وہاں

کیا پوچھنا ہے؟“ دوسری طرف سے حکم دیا گیا۔

”وہاں سب کنٹرول میں ہے۔ پلی اسے کالارڈ تین دن بعد نیو یارک کے لیے روانہ ہونے والا ہے۔“ پلی اسے سے مراد ہیرو آباد اور لارڈ کا مطلب چودھری افکار تھا۔ سوال کرنے والے کو اطلاع دیتے ہوئے اس نے چودھری افکار کی روانگی کا وقت اور قلائد نمبر بھی بتا دیا۔

”او کے! ہم اسے سنبھال لیں گے۔ بس تم نی اسے کے معاملات پر نظر رکھو۔“ دوسری طرف سے حکم صادر کیا گیا اور لائن کٹ گئی۔ سٹھیا اپنے مخصوص باوقار انداز میں چلتی ہوئی نی سی او سے باہر نکلی اور ایک دوسری ٹیکسی کو اشارے سے روک کر اس میں سوار ہو گئی۔ اس کے بتائے ہوئے پتے کی طرف منہ مانگے واسوں پر ٹیکسی دوڑانے والے ٹیکسی ڈرائیور کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ اس وقت وہ موساد کی انٹیل ایجنٹ سٹھیا کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ بے چارے ٹیکسی ڈرائیور کی تو خیر حیثیت ہی اکیسی تھی۔ خود کو بہت زیادہ ذہین اور قابل سمجھنے والے ”را“ کے سورا بھی کبھی اپنے درمیان موجود سٹھیا کی حقیقت نہیں جان سکے تھے۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ ان کی یہ ظاہر و قادر ایجنٹ سٹھیا درحقیقت ذیل ایجنٹ ہے جس کی اصل وفاداریاں ”موساد“ کے ساتھ وابستہ تھیں۔

☆☆☆

کال گرل جولی اور دیگر کی موت کے سجادارانا کو بری طرح سمجھتا ہوں میں مبتلا کر دیا تھا۔ یہ ظاہر حادثہ معلوم ہونے والی یہ اموات درحقیقت سوچے سمجھے ہیں، وہ یہ بات انہیں طرح سمجھتا تھا۔ دیگر کی روڈ ایکسیڈنٹ میں موت کی اطلاع تو ایسے فوری طور پر مل گئی تھی۔ یہ ظاہر یہ ایک حادثہ تھا جو کسی بھی شخص کے ساتھ پیش آ سکتا تھا لیکن جولی سے اپنی ملاقات کے چند گھنٹوں بعد ہی اس حادثے کی اطلاع میں گروہ چونک گیا اور فوری طور پر اپنے دو ہاتھوں کو جولی کے پارمنٹ کی طرف دوڑایا۔ وہاں جانے والوں نے پہلے پارمنٹ کی کال ٹپل بجائی لیکن کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا۔ جولی ہوٹل سے اپنے پارمنٹ پہنچنے کے بعد دوبارہ باہر نہیں نکلی ہے اس بات کا اسے علم تھا۔ چنانچہ ٹیکسی کا رد عمل ظاہر نہ ہونے پر یہی خیال آیا کہ اندر موجود جولی یقیناً کسی حادثے سے دوچار ہو چکی ہے اور دروازہ کھولنے کے لیے آنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ دونوں ہاتھوں کو اپنے خصوصی اختیارات استعمال کرتے ہوئے دروازے کا لاک توڑ کر اندر جانا پڑا۔ جولی کا کشادہ اور خوب صورت پارمنٹ مکمل خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ بیڈ

روم میں انہیں جولی اس حال میں نظر آئی کہ اس کے ہونٹوں پر ابھی خاموشی تھی۔ زندگی کی رقت سے عاری اس کا جسم موت کی اذیت سے گزرتے ہوئے کچھ بے ترتیب ضرور ہوا تھا لیکن اس کے بیڈ روم سمیت پورے پارمنٹ میں جھپٹیں کوئی بے ترتیبی نظر نہیں آ رہی تھی۔ دودھ کا خالی گلاس اور جولی کے ہاتھ سے لکھا خود کشی کا خط فوراً ہی ان کی نظروں میں آ گیا تھا جسے اپنی کھڑکی میں لینے کے بعد انہوں نے بعد میں سجادارانا تک پہنچا دیا تھا۔ گلاس میں بچ جانے والے دودھ کے نمونے اور جولی کی پوسٹ مارٹم رپورٹ نے ظاہر کر دیا تھا کہ اس کی موت زہر خورانی کے باعث ہی ہوئی ہے۔ جولی کے پورے جسم پر ایسا کوئی نشان یا زخم وغیرہ نہیں ملا تھا جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا کہ اسے زہر دہی زہر ملا دودھ پینے پر مجبور کیا گیا ہے۔ دودھ کے گلاس پر لٹنے والے انگشت پر ٹپس بھی صرف جولی کے تھے۔ پولیس کے انسپکٹر جس پورے پارمنٹ میں سے جولی کے سوا کسی دوسرے شخص کے فنگر پرنٹس حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ کسی قسم کی بے ترتیبی سے عاری پارمنٹ، جولی کے بے دارغ جسم اور خود کشی کے خط کی موجودگی سے یہی ظاہر ہوا تھا کہ یہ واقعی خود کشی کا کیس ہے لیکن سجادارانا جانتا تھا کہ اس نے جن لوگوں کی ڈم پر بیٹھ کر کئی کوشش کی ہے، وہ ایسے ہی بے دارغ جرائم کے پلہ ہیں۔ جولی اور دیگر کی موت نے ظاہر کر دیا تھا کہ وہ بالکل صحیح خطوط پر کام کر رہا ہے لیکن ساتھ ہی جو بری بات ہوئی تھی، وہ یہ تھی کہ مجرم ہوشیار ہو گئے تھے اور انہوں نے وہ نشانات مٹا ڈالے تھے جن پر چل کر کوئی ان تک پہنچ سکتا۔ اس سے قبل گروہ الماس اور ایک دوسرے مشکوک خولید سرکوبھی پولیس کھڑکی میں ہلاک کر کے اس کی راجس مسودہ کی تھیں۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ جتنا آگے بڑھتا ہے، ذہن اسے اس سے دگنا پیچھے دھکیل دیتا ہے۔ یہ ناکامی اس کے سینے میں بھڑکتی آگ پر تیل کے چھینٹوں کے مانند اثر کر رہی تھی۔ ڈی آئی جی کی پوسٹ پر تعینات ہوتے ہوئے وہ اتنے دن گزر جانے کے بعد بھی اپنی لاڈلی بیٹی کے قاتلوں تک رسائی حاصل کرنے میں ناکام تھا۔ شہینا کی سوختہ لاش ہر مل اس کی نظروں کے سامنے گھومتی رہتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ اس کی تو عمر بیٹی کی لاش اس سے اپنے قاتلوں کا مطالبہ کر رہی ہے۔ شہینا کی دنیا سے جانے کی عمر تو نہیں تھی۔ ابھی تو اس پر پوری طرح شباب بھی نہیں آیا تھا۔ وہ تو جتنی بھی کے مانند تھی جسے مٹنے سے پہلے ہی تو ذکر کر لیا گیا تھا۔ کچھ لوگوں کی اپنی پسندی اور جنون نے جتنی جاتی شہینا کو ایک پتھر کی مودنی کی سمجھت

چڑھا کر زندگی سے محروم کر دیا تھا۔

تین دن کے عاتون کو کفر و کفر کے پھانسیوں میں و دھنوں کی حدوں میں داخل ہو گیا تھا اور اس کا رویہ ناراض نہیں رہا تھا۔ اسے اپنی اس اپنا رانی کا احساس بھی نہیں تھا۔ اس پر بھی ذمے دار یوں کا ایک کوہ گراں تھا لیکن دنیا کی موت کسی طور اسے بھولی نہیں تھی۔ اس وقت بھی اسے ایک طے شدہ میننگ میں شرکت کے لیے جانا تھا۔ روز بروز برستی دھشت گردی اور امن و امان کی خراب صورت حال پر غور و فکر کے لیے وزیر اعلیٰ کی طرف سے بلائی گئی اس میننگ کے بعد حسب معمول عوام کے لیے ایک پریس نوٹ جاری کرنے کے سوا کچھ نہیں کیا جائے گا، یہ جاننے کے باوجود اسے میننگ میں شرکت تو کرنی ہی تھی۔ وہ مقررہ وقت پر اپنے دفتر سے نکلا۔ گاڑی ڈرائیور سمیت بالکل تیار تھی۔ ڈرائیور نے دروازہ کھولا اور وہ چھٹی نشست پر بیٹھ گیا۔ آگے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر ایک گمنام بیٹھا تھا۔ آج بھی وہ صرف ایک ڈرائیور اور گمنام کے ساتھ میننگ میں شرکت کے لیے جا رہا تھا۔ اس کے گھٹنوں پر ایک فائل دھری تھی جس کے مندرجات کا وہ آنکھوں پر موجود سنہری کمائی کی عینک سے مطالعہ کر رہا تھا۔ سبک رفتاری سے چلتی گاڑی ایک ٹریفک سگنل پر رکی تو اس نے فائل پر سے نظر ہٹا کر باہر کے منظر پر دوڑائی۔ ٹریفک سگنل کے قریب کھڑا ایک ٹوعمبر ہارلر کا آواز لگا لگا کر اخبار پھینک کر کوشش کر رہا تھا۔

”کاغذ عظیم کی طرف سے مزید اسکولوں کو ہم سے اڑانے کی دھمکی“ اسکول کی دیوار سے ملحق پتھر اکندی میں رکھے گئے ہم۔ دھماکے سے ہلاک ہونے والے معصوم بچوں کا ذکر ابھی اخباروں کی سرشتوں میں زندہ تھا۔ اس نے باہر کے ہاتھ میں موجود اخباروں کی طرف سے توجہ ہٹائی اور ایک بار پھر فائل کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اسی لمحے سگنل گرین ہوا اور اس کی گاڑی حرکت میں آگئی۔ اس سگنل سے آگے دوامیں جانب مڑ کر اس کی گاڑی جس روڈ پر چلی، وہاں ٹریفک کا بھاؤ قدرے کم تھا۔ اس کی گاڑی کے پیچھے ہی ایک سفید رنگ کی مارگا اور سیونی موٹر سائیکل بھی اسی روڈ پر مڑی تھیں۔ سفید مارگا میں تین افراد بیٹھے تھے جبکہ سیونی موٹر سائیکل پر دو افراد تھے۔ پہلی سیونی والے نے اپنی موٹر سائیکل کی رفتار بڑھائی اور درمیانی فاصلہ بات کر سہارا رانی کی گاڑی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اس نے اپنی موٹر سائیکل کی گاڑی کے بائیں جانب دھکی ہوئی تھی۔ اس جانب بیٹھا ہوا گمنام ساتھ چلتی موٹر سائیکل کو دیکھ کر ارٹ ہوا۔ موٹر سائیکل سواروں کے ہاتھ خالی نظر آنے کے باوجود اس کا گاڑی کے ساتھ ساتھ چلنا اسے کھنکھ رہا تھا۔

اس نے اپنی گمنام پہلے کے مقابلے میں اور بھی نمایاں کی تاکہ موٹر سائیکل سواران کی گاڑی سے دور ہٹ جائیں۔ اس کی یہ ترکیب کارگر ثابت نہیں ہوئی۔ کارگر تو ان کی ترکیب بھی جو گاڑی میں موجود اکلوتے گاڑی کی توجہ بٹانا چاہتے تھے۔ کارگر موٹر سائیکل کی طرف متوجہ رہا اور اسے خبر بھی نہیں ہو سکی کہ کب سفید مارگا نے اپنی رفتار بڑھائی اور سہارا رانی کی گاڑی کے دام میں پہلو میں پہنچ کر اس پر بے تحاشا فائرنگ شروع کر دی۔ سہارا رانی گاڑی میں دایمیں جانب ہی بیٹھا تھا۔ پہلے برست میں ہی اس کے جسم میں گولیوں اتر گئیں۔ گولیوں کا نشانہ بننے والا وہ تنہا نہیں تھا۔ ڈرائیور اور گمنام میں بھی اس اندھا دھند فائرنگ کی زد میں آئے تھے۔ سفید مارگا اور سیونی سیکندوں میں اس ساری کارروائی کو نمٹا کر آگے بڑھ چکی تھیں۔ متوجہ ہونے والے جب تک متوجہ ہوئے، منظر میں خون سے نہپائے ہوئے تین بے جان انسانی جسموں کے سوا کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ زندگی سے محروم ان جسموں سے بہتے خون کی سرخی سے اخبارات کی تازہ خبروں کی سرخیوں کی تھیں۔

”کیا خبریں ہیں عبدالمنان؟“

”باقی سب کچھ تو معمول کے مطابق ہی جا رہا ہے۔ بس پیر آباد میں لگنے والے سالانہ میلے کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ فی الحال اسے ملتوی کر دیا گیا ہے۔“

”وہ کیوں بھی؟“ اس اطلاع کو سن کر شہر یار چونکا۔

پیر آباد کے میلے کے ذکر کے ساتھ ہی اسے چودھری کی وہ بھانک سازش بھی یاد آئی تھی جب بہادر شاہ کے دیسے کے موقع پر چودھری نے اس کے کھانے میں کچھ شائل کر دیا تھا اور پھر اس کی بے ہوشی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی ڈاکٹر ماریا کے ساتھ شرمناک تصویریں اتاری گئی تھیں۔ چودھری کا ارادہ تھا کہ تصویروں کو میلے کے موقع پر منظر عام پر لانے کی دھمکی دے کر اس سے اپنے مطالبات تسلیم کروائے گا۔ وہ تو اس کی قسمت اچھی لگتی کہ وہ ڈاکٹر ماریا کے تعاون کی وجہ سے چودھری کے ذریعے کی غلطی تجویزی سے وہ تصویریں نکال لانے میں کامیاب ہو گیا اور چودھری کو موت کی کھائی پڑی ورنہ شاید وہ چودھری کی اس سازش میں جھنسن کر اس کے سامنے مجبور ہو ہی جاتا۔

”چودھری افکار عالم شاہ صاحب اپنے پر غور دار سے ملاقات کے لیے نیو یارک شریف لے جا رہے ہیں۔ ظاہر ہے، ان کی پیر آباد میں غیر موجودگی کے دوران کسی کی جرأت نہیں ہو سکتی کہ کیلوں ٹھیلوں سے لطف اندوز ہو سکے، چنانچہ جب چودھری صاحب نیو یارک سے شغل میلہ کے واپس

آئیں گے تو پیر آباد کے سالانہ میلے کے بارے میں غور و خوض کیا جائے گا۔“

عبدالمنان نے جس نظر سے لہجے میں جواب دیا، اسے سن کر شہر یار مسکرا دیا پھر مسکراہٹ چھپاتے ہوئے بولا۔

”ویسے کچھ معلوم نہیں ہوا کہ چودھری صاحب آں جناب کو اتنی اہم چکی میں بیٹے سے ملاقات کی کیسے کر سکی؟“

”کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ ویسے تو چودھری صاحب ظہرے ہیروں کے خاندان کے چشم و چراغ... کیا خبر خواب میں انہیں بشارت ہوئی ہو کہ بیٹے سے ملنے نیو یارک چلے جائیں، سوا ب وہ یوریا بستر سمیت کرواں جانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔“ عبدالمنان کے جواب پر شہر یار ایک بار پھر مسکرا اٹھا۔ یہ وہی عبدالمنان تھا جو اس کی یہاں آمد کے پہلے دن مکمل طور پر چودھری کے دباؤ میں نظر آتا تھا لیکن جوں جوں اسے یہ معلوم ہوتا گیا کہ کیا اسے سی پچھلوں سے بہت مختلف ہے اور کسی چودھری وغیرہ کے دباؤ میں نہیں آنے والا، اس کی صلاحیتیں اور چودھری کے خلاف ناپسندیدگی مکمل کر سامنے آنے لگی۔ اب وہ نہ صرف چودھری کے لیے اپنی ناپسندیدگی کا برملا اظہار کرتا تھا بلکہ شہر یار کے لیے بھی اچھا معائنہ ثابت ہو رہا تھا۔

”چلو جانے دو اپنے چودھری صاحب کو نیو یارک۔ وہ بھی وہاں کچھ دن عیش کر لیں گے اور یہاں بھی ڈرا سکون رہے گا۔“ شہر یار نے تبصرہ کرتے ہوئے اپنے سامنے دھکی فائل کھول لی۔ یہ اس بات کا بھی اشارہ تھا کہ اب وہ مزید گپ شب لگانے کے موذ میں نہیں ہے۔

”سرا! آج سے مشاہیرم خان نے دوبارہ ڈیوٹی جوائن کر لی ہے۔ باہر آیا بیٹھا ہے۔ آپ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کر رہا تھا۔“ اس کا انداز سمجھنے کے باوجود عبدالمنان نے یہ اطلاع دینا ضروری سمجھا۔

”یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ تم فوراً اسے اندر بھیج دو۔ میں اس سے اس کا حال چال ہی پوچھ لوں گا۔“ شہر یار نے اس کے انداز سے کے مطابق مشاہیرم خان کے لیے ملاقات کی اجازت دے دی۔ مشاہیرم خان بے شک ایک معمولی ڈرائیور تھا لیکن اس کی جاں نثاری کی ادا اسے اس بات کی مستحق بناتی تھی کہ اس کے ساتھ خصوصی سلوک روا رکھا جائے۔ عبدالمنان اس کی طرف سے رضامندی پا کر باہر نکل گیا۔ اس کے باہر لنگھنے کے دو من بعد ہی مشاہیرم خان نے دروازے پر دستک دے کر اندر آنے کی اجازت چاہی۔

”آؤ بھی مشاہیرم خان... بیٹھو۔ تمہیں دیکھ کر بڑی خوشی ہو رہی ہے۔ معاف کرنا بھی، میں مصروفیات کی وجہ

نارائن تہجدوں

قرآن حکیم کی مکتبہ سے احیاء و احاد پبلیکیشنز آپ کے دیوانہ و مہم جوئیات میں، احیاء اور تہذیب کے لیے شائق کی جان ہیں ان کے احیاء اور پبلیکیشنز میں پچھلے سال احیاء صفحات پر ان کی احیاء و تہجدوں کی صحیح سلاطین طریقے کے مطابق سب سے حسرت سے محفوظ رکھیں۔

سے دوبارہ تمہیں دیکھنے اسپتال نہیں آسکا لیکن تمہاری کمی میں نے بہت محسوس کی۔“ مشاہیرم خان کو اندر آنے کی اجازت دیتے ہوئے وہ خوش مزاجی سے بولا۔

”آپ نے مجھے یاد کیا، یہ کافی ہے سرا! آپ کے اسپتال نہ آنے کا مجھے کوئی شکوہ نہیں ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہے کہ آپ بہت مصروف آدمی ہیں۔ آپ فون پر میری خبریت پوچھ لیتے تھے تو ہی میں خوش ہو جاتا تھا۔ ویسے بھی میں بالکل ٹھیک ٹھاک تھا، وہ تو آپ نے اجازت نہیں دی ورنہ میں بہت پہلے ہی ڈیوٹی پر حاضر ہو جاتا۔“ مشاہیرم خان نے عاجزی سے اس کی بات کا جواب دیا۔

”اور سنا، وہاں کاغذے میں کیا حال ہے؟ تمہاری بات تو ہوتی ہوگی نا اپنے بھائی اکرم خان سے؟“ یہ سوال کرتے ہوئے شہر یار نے بے طور خاص کسی کا نام نہیں لیا تھا لیکن اس کی نظروں میں ماہ بانو کا سراپا ضرور گھوم گیا تھا۔ عام سے گھرانے سے تعلق رکھنے والی وہ چھوٹی سی لڑکی جانے کیوں اسے بھولی نہیں تھی۔

”ادھر بات ہوئے ایک ہفتے سے زیادہ وقت گزر گیا ہے۔ آپ نے مجھے موبائل خرید کر دیا ہے لیکن اکرم خان تو بس اسی وقت فون کر سکتا ہے جب اسکو دو میں ہوتا ہے۔ ایک ہفتے پہلے جب اس نے مجھے فون کیا تھا تو بتایا تھا کہ ماموں کے بیٹے کی شادی میں شرکت کے لیے وہ لوگ ہوشے جا رہے ہیں۔ وہ لڑکی ماہ بانو بھی ساتھ ہی جانے والی تھی۔ اکرم خان بہت تعریف کر رہا تھا ماہ بانو کی۔ کہتا تھا، ماہ بانو بالکل نبی کا موافق اماں کا خیال رکھتا ہے۔ گھر کا سارا کام کاج سنبھال لیا ہے اس نے۔“ مشاہیرم خان نے اسے رپورٹ دی۔

”یہ تو اچھی بات ہے۔ اسے نہ جانے کب تک وہاں رہنا پڑے۔ یہ اچھا ہی ہے کہ وہ وہاں اپنا دل لگانے کی کوشش کر رہی ہے۔ تمہاری اب اکرم خان سے بات ہو تو میری طرف سے پوچھ لینا کہ اگر ماہ بانو کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو دے۔ یہاں سے بجوا دی جائے گی۔“ اس نے ماہ بانو کی مصروفیات پر تبصرہ کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے لیے پیغام بھی نوٹ کر دیا۔

”ٹھیک ہے سر! میں کہہ دوں گا۔“ مشاہیرم خان نے جواب دیا اور پھر یوں حرکت کی جیسے کرسی سے اٹھنے والا ہو لیکن مزید کچھ کہنے کی خواہش میں اٹھ بھی نہ رہا ہو۔
”کیا بات ہے مشاہیرم خان... کچھ کہنا چاہتے ہو؟“
شہر یار نے اس کی نگاہیں کھینچتے ہوئے سوال کیا۔
”میں یہ پوچھنا چاہ رہا تھا سر کہ آپ کی گاڑی تو میں ہی چلاؤں گا؟“

”بالکل سچی، وہ تو مجبور ہی تھی ورنہ میں خود بھی تمہیں ساتھ رکھ کر زیادہ آرام محسوس کرتا ہوں۔“ شہر یار نے اسے تسلی دی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ مشاہیرم خان اپنی عدم موجودگی میں اس کی گاڑی چلانے والے ڈرائیور کی وجہ سے پریشان ہے۔ اس کے اور مشاہیرم خان کے درمیان جو ذہنی ہم آہنگی پیدا ہو گئی تھی، اس کے باعث اب مشاہیرم خان مسلسل اسی کے ساتھ رہنے کا خواہش مند تھا۔
”بہت بہت شکریہ...“ مشاہیرم خان کے الفاظ ابھی منہ میں ہی تھے کہ اس کا موبائل بج اٹھا۔
”سوری سر!“ وہ شہر یار کے مقابل بیٹھ کر موبائل کے منہ اٹھنے پر شرمندہ ہو گیا۔

”کوئی بات نہیں... کال اینڈ کر لو۔“ شہر یار نے اجازت دی تو اس نے قمیص کی جیب میں رکھا موبائل نکالا۔
”یہ تو اسکر دو کا نمبر ہے۔“ مشاہیرم خان آہستہ سے بولا اور کال اینڈ کر لی۔ شہر یار اس دوران یہ ظاہر اپنے سامنے رکھی فائل کی طرف متوجہ ہو چکا تھا لیکن لا شعوری طور پر اس کے کان مشاہیرم خان کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔

”کون؟ کل خان بات کر رہا ہے؟ ہاں ہاں یار! میں نے جہیں پہچان لیا ہے۔ تم اکرم خان کے دوست ہو، پر یہ بتاؤ کہ اکرم خان کے بجائے تم نے کیوں فون کیا ہے؟“ وہ کال کرنے والے کو شامت کر لینے کے مرحلے سے گزرنے کے بعد اب قدرے تشویش سے پوچھ رہا تھا۔ دوسری طرف سے یقیناً اس کے سوال کا جواب دیا جائے لگا۔ شہر یار کو دوسری طرف کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی لیکن مشاہیرم خان کی مروت و تشویش ”سب“ اور ”کیسے“ ضرور سنائی دی تھی جسے سننے کے بعد اس نے مشاہیرم خان کے چہرے پر نظر ڈالی۔ وہاں بے تحاشا ضبط کے باوجود زلزلے کے سے آثار تھے۔ وہ بالکل خاموشی سے دوسری طرف موجود شخص کی بات سن رہا تھا لیکن اس کے بشرے سے ظاہر تھا کہ کوئی بہت بری خبر سنائی گئی ہے۔ اس کی اس کیفیت پر شہر یار خود بھی تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ فون کرنے والا اسکر دو سے بول رہا تھا اور اکرم خان کا

دوست تھا۔ مشاہیرم خان کی جو حالت تھی، اس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے اس کے گھر سے متعلق ہی کوئی بری خبر سنائی جا رہی ہے۔ اس کے گھر میں آج کل ماہ بانو بھی مقیم تھیں۔ چنانچہ شہر یار کا ذہن بالاحوال اس کی طرف بھی چلا گیا تھا کہ کہیں وہ کسی پریشانی میں نہ ہو۔ ماہ بانو کی پریشانی اور تکلیف کا خیال آتے ہی اس کا دل خود کا رانداز میں تشویش میں مبتلا ہو جاتا تھا۔
”خیریت تو ہے خان؟ کیا کوئی پریشانی کی خبر ہے؟“
مشاہیرم خان کال سے فارغ ہوا تو اس نے دریافت کیا۔
”بہت بری خبر ہے سر! میرے بھائی اکرم خان کو قتل کر دیا گیا ہے۔“

”ویری سیڈ... یہ واقعہ کب اور کیسے پیش آیا؟“ شہر یار نے دلی ہمدردی کے ساتھ پوچھا۔

”یہ کل کی بات ہے سر! میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میرے گھر والے اور ماہ بانو شادی میں شرکت کے لیے ہوشے گئے تھے۔ ہوشے سے واپسی پر کچھ سگ لوگوں نے ان کی جیب کو گھیر کر ماہ بانو کو انوار کرنے کی کوشش کی۔ اکرم خان ان لوگوں سے مقابلہ کرنے کھڑا ہو گیا چنانچہ انہوں نے اکرم خان کو گولی ماری اور ماہ بانو کو اپنے ساتھ لے گئے۔ جاتے جاتے وہ جیب کے گزری گاڑہ گھر گئے تھے اس لیے ڈرائیور اکرم خان کو اسپتال بھی نہیں پہنچا سکا۔ دو گھنٹے بعد جب ایک دوسری جیب وہاں سے گزری تو اس جیب والوں نے مدد کی لیکن اس وقت تک اکرم خان مر چکا تھا۔ اس کی لاش اسکر دو کے دو خانے اسپتال میں رکھی ہے۔ میری ماں جس کا مد سے سے دماغ الٹ گیا ہے، وہ بھی وہیں داخل ہے۔ اکرم خان کے دوست نے بڑی مشکل سے میرا نمبر تلاش کرنے کے بعد ابھی مجھے حادثے کی اطلاع دی ہے۔“ مشاہیرم خان نے تفصیل سے اس کے سوال کا جواب دیا۔ اس کا حوصلہ اور ضبط قابل رشک تھا۔ فرط غم سے چہرہ سرخ پڑ جانے کے باوجود یہ سب بتاتے ہوئے ایک بار بھی اس کی آواز بھرائی نہیں گئی۔
”یہ تو بہت برا ہوا۔ میں نے ماہ بانو کو حفاظت کے خیال سے اتنی دور بھجوا دیا تھا۔ اس کے دشمن اس کی بوسہ گھٹتے ہوئے وہاں بھی پہنچ جائیں گے، مجھے بالکل امید نہیں تھی۔“
شہر یار تاسف سے بڑبڑایا اور انٹر کام اٹھا کر عبدالمنان کو اپنے آفس میں آنے کا حکم دیا۔

”عبدالمنان! فوری طور پر اسکر دو جانے والی پہلی فلائٹ میں دو تیشیں بک کرواؤ۔ میں اور مشاہیرم خان ابھی یہاں سے نکل رہے ہیں۔ ہمیں یہاں سے لاہور اور لاہور سے بائی انٹر اسلام آباد پہنچنے میں جتنا وقت لگے گا، اس

دوران یقیناً تم یہ سارا انتظام کر لو گے۔"

"اوکے سرا میں ابھی ٹرائی کرتا ہوں۔" عبدالمنان مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ اس نے شہر یار سے یہ پوچھنے کی غرض سے نہیں کی تھی کہ اتنی ایک جاگہ اسکو رو جانے کا پروگرام کیوں بن گیا؟ البتہ اسے یہ ضرور سمجھ آ گیا تھا کہ جو بھی بات ہے، اس کا اعلیٰ لا زماً ہا بنو ہے۔

"صرف ٹرائی کرنے سے کام نہیں چلے گا۔ مجھے ہنڈر ریڈ پرسنٹ شیوہ چاہیے۔ ماہ بانو اغوا کر لی گئی ہے اور اکرم خان ہلاک ہو گیا ہے۔ ہمیں اس معاملے کو دیکھنے کے لیے فوراً اسکو رو پھینکا ہوگا۔ اسکیلے مشاہیرم خان کے جانے سے بات نہیں بنے گی اس لیے میں ساتھ جانا چاہتا ہوں۔" شہر یار کو شاید اندازہ نہیں تھا کہ جذبات میں اس کی آواز کافی بلند ہو چکی ہے۔

"اوکے سرا میں انتظام کرتا ہوں۔" اصل صورت حال جان کر مستعدی کا عبدالمنان اور بھی پھرتی کا مظاہرہ کرتا ہوا باہر کی طرف دوڑا۔

"تمہیں اپنی جو ضروری چیزیں وغیرہ ساتھ رکھنی ہوں، وہ لے لو خان! ہم دس پندرہ منٹ میں یہاں سے نکل جائیں گے۔" اس نے مشاہیرم خان کو ہدایت دی۔ اس کے باہر نکلنے کے بعد خود وہ اپنے بچنے کا نمبر ملا کر بیٹھ مین کو اپنا سامان تیار کرنے کا حکم دینے لگا۔ حکم دینے کے بعد اس نے فون بند ہی کیا تھا کہ عبدالمنان کچھ گھبرا ہوا سانس اندر آیا۔

"ایک بلے نیوز ہے سرا!" اس نے اپنی گھبراہٹ کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے شہر یار سے کہا۔

"کیا ہوا... بیٹھ نہیں لی یا مومن خراب ہونے کی وجہ سے آج اسکو رو کے لیے کوئی فلاح نہیں جاری؟" اس نے اسکو رو جانے کے خواہش مندوں کو درخیز دو عمومی مسائل کے بارے میں اندازہ لگا دیا۔

"اس کام کے لیے تو میں ابھی فون کر ہی نہیں سکا سرا! یہاں سے اپنے کمرے میں جاتے ہی میرے پاس لاہور سے ایک فون کال آگئی۔ اطلاع ملی ہے کہ ڈی آئی جی سجاد رانا کو مارگٹ گلگ کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ میں نے اس خبر کی تصدیق کر لی ہے۔ نیوز چینل پر بھی اس وقت یہی رپورٹنگ نیوز چل رہی ہے۔"

عبدالمنان نے جلدی جلدی بولتے ہوئے اسے بتایا تو وہ ایک چل کے لیے تو سانس ہی رہ گیا۔ اعلیٰ افسران، سیاست دانوں اور ممتاز سماجی و دینی شخصیات کو بدہشت گردی کا نشانہ بنانا کوئی نئی بات نہیں رہی تھی۔ آئے دن نیوز چینل بدہشت گردی کی ایسی کسی نہ کسی کارروائی کی خبریں نشر کرتے

ہی رہتے تھے لیکن اپنی اتنی قریبی ہستی کے بارے میں یہ خبر سن کر حواس کو قہقہہ کھٹکنا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ کہنے کو سجاد رانا اس کا کزن تھا لیکن ان کی حیثیت اس کے نزدیک بڑے بھائی جیسی تھی۔ بڑا بھائی بھی ایسا جس نے بھائی سے بڑھ کر باپ کا کردار نبھایا ہو۔ جب وہ عظیم ہو کر اپنے ماموں لیاقت رانا کی زیر نگرانی آیا تھا تو لیاقت رانا کے ساتھ ساتھ سجاد رانا نے بھی اس پر اپنی بے تحاشا محبت لٹائی تھی۔ قدم قدم پر وہ اس کے کام آیا تھا اور اب اسے اطلاع دی جا رہی تھی کہ وہ سجاد رانا اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔

"آریو اوکے سرا؟" اس کی بے پناہ خاموشی سے گھبرا کر عبدالمنان نے پوچھا۔

"ہیں!" وہ عبدالمنان کو مختصر جواب دے کر مریم کا نمبر ملانے لگا۔ ہینا کے بعد سجاد رانا کی موت کا صدمہ ان کے لیے کتنا بڑا ثابت ہوگا، وہ اندازہ لگا سکتا تھا۔ دوسری طرف بتل جانے کی آواز سنائی دیتی رہی لیکن کسی نے کال ریسپو نہیں کی۔

"میں لاہور کے لیے نکل رہا ہوں۔ تم مشاہیرم خان کے اسکو رو جانے کا بندوبست کر دینا۔" دوسری طرف سے کوئی رسپانس نہ ملنے پر اس نے مایوسی کے عالم میں اپنی سیٹ سے کھڑے ہوتے ہوئے عبدالمنان کو حکم دیا اور خود کوئی اور نمبر ملاتا ہوا باہر کی طرف بڑھ گیا۔ اس بار اس نے لیاقت رانا کا نمبر ملا یا تھا۔ کال ان کے سیکرٹری نے ریسپو کی۔

"رانا صاحب تو اس وقت بات نہیں کر سکتے۔ ان کی طبیعت کافی بگڑ چکی تھی اس لیے انہیں اسپتال شفٹ کرنا پڑا۔ اس وقت وہ آئی سی یو میں ہیں۔" یہ جاننے کے بعد کال کرنے والا شہر یار ہے، سیکرٹری نے مؤدبانہ انداز میں معلومات فراہم کیں جو ظاہر ہے اس کے لیے تشویش ناک تھیں۔ اسے شدت سے اپنی لاہور سے دوری کا احساس ستانے لگا۔ وہ پلک جھپکتے میں لاہور پہنچ جانا چاہتا تھا لیکن بے بس تھا۔ اس کی جدید ماڈل کی طاقتور انجن والی مرسیڈیز بھی ایک حد تک ہی کارکردگی کا مظاہرہ کر سکتی تھی اور مجبوری یہ تھی کہ اس سے بڑھ کر تیز رفتار کوئی دوسرا اعلیٰ واصل کا ذریعہ یہاں موجود ہی نہیں تھا۔

☆☆☆

ماہ بانو نے ہوش کی دنیا میں قدم رکھتے ہوئے اپنی آنکھیں کھولیں اور پھر فراہی بند کر لیں۔ سورج کی کسی پرچی کی طرح آنکھوں میں در آتی کرنوں سے بچنے کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔ سورج کی کرنیں جو روشنی کی پیاہر بن کر

کائنات کے ایک ایک ذرے کو دیدار کے لیے عیاں کر دیتی ہیں... کبھی کبھی، کبھی کسی مقام پر ایسی ہی ظالم غایت ہوتی ہیں کہ دیکھنے والی آنکھوں سے ان کی پینا ہی ایک کر لے جائیں۔ اس کی آنکھوں میں بھی پل بھر کے لیے اپنی روشنی بھر گئی تھی کہ اسے اپنی بصارت جانے کا خدشہ لاحق ہو گیا۔

قدرت کے ودیعت کردہ خود کار نظام کے تحت اس نے فوری طور پر اپنی آنکھیں بند کیں اور دیگر حواس کی ملا جلتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے ارد گرد کے ماحول کے بارے میں اندازہ کرنے لگی۔ سب سے پہلا احساس جو اس کے اندر جاگا، وہ یہ تھا کہ وہ کسی مسلسل پٹی ہوئی شے پر دراز ہو کر سو رہے لیکن یہ پٹی ہوئی شے کوئی انسانی ایجاد نہیں تھی۔ وہ کوئی جانور تھا جس کی پشت پر اسے باندھ کر آگے کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ جانور کی چال کے مخصوص پتھروں کے علاوہ جو دوسری چیز اس نے فوری طور پر محسوس کی، وہ شدید قسم کی سردی تھی۔ اس سردی سے اسے بچانے کے لیے اس پر کوئی تریال ٹماٹے ڈالی گئی تھی۔ وہ کہاں تھی اور کن لوگوں کے ساتھ تھی، اسے فوری طور پر اندازہ نہیں ہو سکا۔ البتہ اپنے اغوا کیے جانے کا سارا منظر کسی فلم کی طرح آنکھوں میں محسوس کیا۔ اس منظر کے یاد آتے ہی اسے اکرم خان کا بے جان وجود اور اس کی بوڑھی ماں کی دیران آنکھیں بھی یاد آئیں۔ اس کے لبوں سے ایک سسکاری سی نکل۔ عجیب نصیب تھا اس کا!... محبت کرنے والے لوگ ملتے تھے اور ایک ہی چھوٹ جاتے تھے... وہ بھی اس عالم میں کہ وہ ان کی جان جانے کا بوجھ اپنی جان پر محسوس کرتی تھی۔ سب سے پہلے اسے پال پوس کر بڑا کرنے والی بے بس اور ابا نے اس کی خاطر اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا تھا۔ چودھری نے اس کے غائب ہو جانے پر سب سے پہلے انہیں ہی ظلم کا نشانہ بنایا تھا کہ کسی طرح ان سے ماہ بانو کا پتا حاصل کر سکے۔ دارالامان جہاں وہ جبر آباد سے نکلنے کے بعد پناہ گزین ہوئی تھی، اس کی منظر اور چوکیدار بھی اسی کی وجہ سے مارے گئے تھے۔ موتی والا کے گھر میں پناہ لی تو چودھری کے گھر کے کتوں کی طرح اس کی بوسہ گھٹتے ہوئے وہاں بھی پہنچ گئے اور موتی والا اور اس کی بیوی کو کٹ کر ڈالا۔ موتی والا کے ڈرائیور سرد نے اسے اپنے دوست عاصم کے گھر پہنچایا تو وہاں عاصم کی ماں اور اس کی پردیسی لڑکی جیلہ حاد نے کا شکار ہو گئیں۔ جیلہ کی لاش اس کے دھوکے میں دفنانے کے بعد کافی دنوں تک یہی سمجھا جاتا رہا کہ وہ ختم ہو گئی ہے لیکن وہ تو جیلہ کے دھوکے میں خلیہ سڑاؤں کے چنگل میں پھنس گئی تھی۔ وہاں بھی اس کی طرف لپٹنے والی موت رخ موڑ کر سجاد رانا کی

مننا: (باہجی سے) "بارش کا پانی کہاں جاتا ہے؟"
باہجی: (فصیحے سے) "میرے سر میں۔"
مننا: تب ہی تو آپ کی ناک ہر وقت بہتی رہتی ہے۔"

بٹی ہینا کی طرف چلی گئی۔ یہ قدرت کا اس پر احسان تھا کہ ہر قدم پر بے شمار مصائب کے باوجود اس کی حفاظت کی جا رہی تھی لیکن وہ اپنی جگہ نام نہمی کی ایک اس کی زندگی پر اپنی جانیں بچھا رہی تھیں اور مصائب کا سلسلہ ہے کہ دراز ہوتا ہی چلا جاتا ہے... اور اب وہ جو پہلے ہی اپنے علاقے اور اپنے لوگوں سے دور تھی، ایک جانور کی پشت پر سوار نہ جانے کہاں لے جانی جا رہی تھی؟ اور کون تھا جس کے اشارے پر یہ مذموم حرکت کی گئی تھی؟ اس کے ذہن میں تو اپنے دشمن کی حیثیت سے بس ایک چودھری افکار کا نام ہی خطرے کی سرخ پٹی کی طرح روشن رہتا تھا اور اب بھی وہ یہی سوچ رہی تھی کہ اتنی بھگ دوڑ اور تک دو کے باوجود بھی بالآخر چودھری اس تک پہنچنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ چودھری کی گرفت میں آ جانے کے خیال سے اس کا بندھا ہوا جسم کسٹھیا اور اس بار اس نے چہرے کا رخ بدل کر ایسے زاویے پر لاتے ہوئے کہ سورج کی روشنی براہ راست آنکھوں میں نہ گھے، دھیرے سے اپنی آنکھوں کو کھولا۔ سب سے پہلے اس کی نگاہ نے اس جانور کو اپنی زد میں لیا جس کی پشت پر وہ سفر کر رہی تھی۔ وہ گھٹے ہوئے بدن کا سیاہ کٹھن کھڑے سے بالوں والا جانور تھا جس کے آگے اسے اسی جیسا ایک دوسرا جانور حرکت کر رہا تھا۔ آگے والے جانور کی خوب سمجھی اور مورچیل تمام دیکھ کر وہ اندازہ کر سکتی تھی کہ اس کی سواری کا کام انجام دینے والا جانور بھی ایسی ہی ایک دم کا مالک ہوگا۔ بس فرق تھا تو یہ کہ وہ جس جانور کی پشت پر سوار تھی، اس کے بال مکمل طور پر سیاہ تھے جبکہ آگے والا جانور چمکے رہتا تھا۔ "پاک..." اس کے ذہن میں جانور کا نام سرسرایا۔ اچھے اچھوں کو صرف اپنی دید اور سمول کی دھمک سے دہشت زدہ کر دینے والا یہ جانور اس وقت اس کی سواری تھا۔ آگے والے پاک پر سوار گرم کپڑوں میں ملبوس انسان یقیناً اس وحشی جانور کو سدھانے اور اس قابل بنانے کے ذمے دار تھے۔ وحشی کو قابو میں کر لینے والے خود کیسے لوگ ہوں گے، اس بات کا اندازہ لگا یا جاسکتا تھا۔ ان یاکوں کو کچھ کر قدرتی طور پر اسے خیال آیا کہ اس وقت وہ کسی بہت ہی بلند مقام پر موجود ہے۔ بلندی پر ہونے کی وجہ سے آئینوں کی مقدار قدر سے کم گئی اس کے چاروں

طرف برف ہی برف تھی جس سے ٹکرا کر سورج کی شعاعیں یوں منتشر ہو کر کہ سیدھی آنکھوں میں ٹھکسی چلی آئیں اور ابھی بھلے انسان کو آسنو پلاسنڈ نہیں کا خطرہ لاحق ہو جاتا۔ وہ بھی چند ساعتوں سے زیادہ اپنی آنکھیں کھلی نہیں رکھ سکتی تھی۔ وہ ہچکچاہٹ لے کھاتے جسم کے ساتھ آنکھیں بند کیے پڑی تھی۔ وہ اس بات پر حیران ہو رہی تھی کہ اگر انھوں کاروں کا تعلق چودھری افتخار سے ہے تو وہ اسے پہاڑوں سے میدانوں کی طرف لے..... جانے کے بجائے مزید بلندی کی طرف کیوں لے جا رہے ہیں؟ کیا چودھری کا ان برف زاروں میں بھی کوئی ٹھکانا تھا؟ شاید ایسا ہی ہو۔ ایسا بندہ جو تہذیب کے آخری گاؤں ہو شے تک رسائی رکھتا ہو..... جس کے بندے اتنی دور پہنچ کر اسے انھوں کرنے کی طاقت رکھتے ہوں، اس سے تو کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ دولت... اور بے تحاشا دولت کے بل بوتے پر تو دنیا کے کسی بھی حصے میں اپنے لیے پیش کردہ خریدایا بنایا جا سکتا تھا۔ اس پیش کردہ میں اپنے من پسند جسم بھی خرید کر ڈالے جا سکتے تھے اور جو براے فرد خست نہ ہوں، ان کو کرائے کے ٹنوں پر لا کر لایا جا سکتا تھا۔ ماہ بانو کو چودھری نہ تو دھوکے سے حاصل کر سکا تھا، نہ دولت کی جھلک دکھا کر پر جا سکا تھا... چنانچہ اب طاقت کے استعمال پر تلا ہوا تھا۔ چودھری کے اختیارات اور مزاحمت اپنی جگہ لیکن اس نے بھی ٹھکان لے کر جا ہے جان چلی جائے، چودھری کو اپنے وجود سے کچھ حاصل نہ کرنے دے گی۔ اس فیصلے پر چٹختے کے بعد وہ پرسکون ہو گئی اور سفر کے اختتام کا انتظار کرنے لگی۔ سفر کچھ طویل تھا۔ راستے میں دو بار ایک آدمی نے اس کے منہ سے بوتل لگا کر کوئی مشروب اس کے حلق میں اندھا لایا۔ ڈالنے میں وہ مشروب نمکوں کے مانند لگتا تھا۔ ڈی بائیڈریشن سے بچنے کے لیے ان برف زاروں میں اکسیر کی سی حیثیت رکھنے والا مشروب، جو پہاڑوں کے عجیب و غریب موسم میں بڑا کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ ماہ بانو نے دونوں بار اس مشروب کے گھونٹ خاموشی سے حلق سے نیچے اتار لیے۔ جب تک جسم سے روح کا ناتا قائم تھا، اسے جسم کی توانائیاں برقرار رکھنی تھیں تاکہ وقت عمل بوت عمل جواب نہ دے جائے۔

آخر کار سفر ختم ہو ہی گیا اور وہ لوگ ایک مقام پر ٹھہر گئے۔ یہاں رکنے کے بعد اس کے جسم کو بندشوں سے آزاد کر کے اسے نیچے اتارا گیا۔ زمین پر قدم ہمارا کہ کھڑے ہوئے کے بعد اس نے اپنے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ وہ کافی کھلی جگہ تھی جس کے ارد گرد چھوٹی بڑی برف پوش پہاڑیاں اس طرح کھڑی تھیں کہ اس جگہ سے ہٹ کر بہت دور تک کا منظر نہیں

دیکھا جا سکتا تھا۔ نظر کی حد ان پہاڑوں سے ٹکرا کر واپس پلٹ آتی تھی۔ وہ لوگوں کی نظروں سے بچ کر رہنے کے خواہش مندوں کے لیے ایک آئیڈیل ٹھکانا تھا مگر ایسا ٹھکانا تو بس وہی لوگ حاصل کر سکتے تھے جو بے پناہ وسائل کے مالک و مختار ہوں۔ ماہ بانو کو انھیں سی محسوس ہونے لگی۔ چودھری افتخار کی دولت مندی میں کوئی کام نہیں تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ چودھری کو ایسے ٹھکانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اس نے اپنا مال یہاں خرچ کیا تھا تو اس سے اسے حاصل کیا ہونے والا تھا؟ محض عیاشی کے لیے تو ایسی حماقت نہیں کی جا سکتی تھی۔

”ادھر چلو۔“ وہ اپنی سوچوں کے تانے بانوں میں الجھی جانے کب تک یوں کھڑی رہتی کہ ایک..... غرائی آواز والے شخص نے کمر درپے کچھ میں حکم دیتے ہوئے ایک جانب اشارہ کیا۔ یہ وہی شخص تھا جو راستے میں اسے نکول پاتا رہا تھا۔ اس شخص کی اپنے قریب آمد و رفت سے اسے اندازہ ہوا کہ آگے جانے والے یاک کے علاوہ ایک یاک اس کے پیچھے بھی موجود ہے۔ اب وہ تینوں یاک اس کی نظروں کے سامنے موجود تھے۔ ان کے جسم سے بندھے کپڑے کے بھرے ہوئے بڑے بڑے پورے نیچے اتارے جا رہے تھے اور انہیں مشقت کا صلہ دینے کے لیے تازہ گھاس ان کے سامنے ڈال دی گئی تھی۔ پہاڑوں پر اتاری شام پر ایک نظر ڈال کر وہ خود کو حکم دینے والے شخص کے اشارے کی سمت بڑھ گئی۔

چند قدم چلنے کے بعد اسے پہاڑ میں موجود وہاں نظر آ گیا جو آگے کسی غار کی موجودگی کا پتہ دے رہا تھا۔ اپنے ساتھ ساتھ چلتے شخص کی حرکات و سکنات سے اس کے اردوں کو پچھاتی، وہ غار کے کھلے دہانے سے اندر داخل ہو گئی۔ اندرونی طور پر بے حد ہیجان میں مبتلا ہونے کے باوجود اس نے ابھی تک کسی سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ وہ کچھ کھتی تھی کہ اسے یہاں تک لانے والے شخص مہرے ہیں جو بساط پر بازی کھیلنے والے کی مرضی سے ہی حرکت کر سکتے ہیں۔ ان بے ظاہر متحرک لیکن درحقیقت قوت عمل سے محروم افراد سے کوئی سوال کرنے سے بچتا تھا کہ اس بازی گر کا سامنا ہونے کا انتظار کیا جائے جس نے یہ سارا کھیل رچا رکھا تھا۔ وہ جو بہت آسانی سے اس بازی گر کے گروہوں کے ہاتھ لگتی تھی، اب اتنی بے تحاشا فیسے میں بھری ہوئی تھی کہ خوف کا نام و نشان مٹ گیا تھا۔ اس کے ساتھ یہ نئی چال چلنے والا اگر چودھری تھا تو وہ پوری طرح تیار تھی کہ اس کا سامنا ہوتے ہی اس کا منہ ٹوچ ڈالے لیکن جیسے ہی وہ دہانے سے گزر کر غار میں داخل ہوئی، بھونچکی رہ گئی۔ اندر سے کافی کشادہ

اس غار کی دنیا تو اس کے لیے بالکل ہی انوکھی تھی اور وہ ونڈر لینڈ میں اٹھاتا یا کھینچنے والی ایٹس کی طرح کھڑی حیرت سے آنکھیں پھپھار رہی تھی۔

☆☆☆☆

لیاقت رانا کے خاندان پر قیامت ٹوٹی تھی۔ ابھی تو وہ لوگ دنیا کی موت کے صدمے سے پوری طرح تسکین نہیں پائے تھے کہ سجاد رانا کے قتل نے ایک اور قیامت ڈھادی۔ پیراندہ سالی سے گزرتے لیاقت رانا نے پوتی کے بعد بیٹے کی موت کی خبر سنی تو بہتر سے جاگے۔ صدمے سے چور چوران کے دل کی دھڑکنوں کو اعتدال پر لانے کے لیے اسپتال میں ملک کے بہترین ڈاکٹر جمع کر دیے گئے تھے لیکن شہر یار کی پریشانی قائم تھی۔ اس کا ایک پیر اسپتال میں تو دوسرا گھر ہوتا تھا۔ گھر میں مسز آفرین رانا اور مریم دونوں ہی کی حالت خراب تھی۔ ان کا رونا شہر یار کے دل کو چیر ڈالتا لیکن فی الحال اس کے پاس انہیں صبر کی تلقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ دونوں خواتین اس تلقین کو سن کر ادھر بھی شدہ سے روٹیں اور اس کا دل جل جھل کر ڈالتیں لیکن وہ مرد ہونے کے ناتے آنکھوں سے آنسو نہیں بہا سکتا تھا۔ کم از کم سب کے سامنے تو بالکل بھی نہیں۔ یہ رعایت تو قدرت کی طرف سے خواتین کو ہی ملی ہے کہ وہ ہر گز پر دل کھول کر رو سکی ہیں اور نتیجتاً دل کا بوجھ لگا ہو جاتا ہے۔ مرد بے چارے اس نعمت سے محروم اپنی مردانگی کا بھرم قائم رکھنے کے لیے سب کچھ اندر ہی اندر سمیٹے رہتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے دنیا میں عورتوں کے مقابلے میں مردوں میں امراض قلب کا تناسب زیادہ ہے۔ مثال رانا یا ڈاکٹر میں ہی موجود تھی۔ خواتین کم سے زیادہ بڑھ چالی نظر آتی تھیں لیکن اسپتال لیاقت رانا پہنچ گئے تھے۔ شہر یار اس وقت ان کی خیریت معلوم کرنے اسپتال ہی پہنچا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے تسلی دی تھی کہ لیاقت رانا کی طبیعت اب سنبھلنے لگی ہے۔ وہ فون پر بھی اسے یہی تسلیاں دیتے رہے تھے اور اسے مجبوراً ان تسلیوں سے بھلنا بھی پڑا تھا۔ اس وقت ساری ڈنٹے داریاں اسی کے شانوں پر تھیں۔ سجاد رانا کی تدفین، تقویت کے لیے آنے والوں سے مننے اور اخباری رپورٹرز کو بیانات دینے کے فرائض اسے ہی انجام دینے پڑے تھے۔ ان سارے فرائض کی انجام دہی میں وہ ضبط کے ٹوٹے مراحل سے گزرا تھا۔ خصوصاً حکمرانوں کے مذمتی بیانات اسے بری طرح پڑانے کا سبب بنے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ حکمرانوں کے یہ بیانات محض زبانی ٹھکڑی باتیں ہیں۔ دہشت گردوں سے ابھی ہاتھوں سے مننے کے ان کے

بارے دعوے سراسر کھوٹے ہیں۔ یہ آپنی ہاتھ نہ تو ماضی میں کبھی حرکت میں آیا تھا اور نہ ہی اب کوئی امید تھی۔ شاید بغیر استعمال کے یومی صرف بیانات کا حصہ بننے والا یہ آپنی ہاتھ رنگ آلود ہو کر ناقابل استعمال ہو چکا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ملک کے طول و عرض میں دہشت گرد اس طرح راج کیسے کرتے پھرتے؟ عوام سے لے کر خواص تک کوئی بھی تو اس دہشت گردی سے محفوظ نہیں تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ عوام ایک ہی جے میں کیڑوں کوڑوں کی طرح بڑی تعداد میں ہے دردی سے مارے جاتے اور خواص کو بڑا ناپ تول کر، حساب کتاب سے ملک عدم کی طرف روانہ کیا جاتا۔ اس نچے تلے قتال کو "ٹارگٹ کلنگ" کا نام دیا جاتا تھا۔ سجاد رانا کی موت بھی ٹارگٹ کلنگ تھی اور حسب معمول کلرز کا کوئی نام و نشان نہیں مل سکا تھا۔ خود ہی آئی جی ہونے اور آئی جی کے داماد ہونے کے باوجود ان کے گھر کی رپورٹ نامعلوم قاتلوں کے نام درج کی گئی تھی۔ ان کے ایم این اے والدہ اپنی تمام تر تعلق کے باوجود بیٹے کی موت کے صدمے سے غم حال اسپتال کے ایک وی آئی بی روم میں بے دست و پا پڑے تھے۔ ان میں تو اتنی بھی سکت نہیں رہی تھی کہ بیٹے کے جنازے میں ہی شرکت کر سکتے۔ شہر یاران سے ملاقات کے لیے اسپتال آیا تو وہ تھوڑی دیر تک صرست بھری نظروں سے اس کا چہرہ دیکھتے رہے اور پھر آنکھیں موند کر اپنا رخ بدل گئے۔ جس سچے کو انہوں نے انکی پکڑ کر چلنا سکھا یا تھا اور قدم قدم پر اس کی راہنمائی کرتے ہوئے اسے اسسٹنٹ کمشنر کی کرسی تک پہنچا دیا تھا، اس کے سامنے وہ اپنے دل کا درد کھول کر آنکھوں سے بہا سکتے تھے؟ ان کی کنایات کو سمجھتے ہوئے شہر یار نے ان کے ہاتھ کی پشت پر ایک عقیدت مندانہ بوسہ دیا اور خود کمرے سے باہر نکل گیا۔ مین اسی وقت مختار مراد وہاں پہنچ گئے۔ غم ان کا بھی کم نہیں تھا کہ ان کی اکلوتی بیٹی کی کوہ اور مانگ دونوں ہی اجڑ گئی تھیں لیکن بے پناہ برداشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہوں نے خود کو سنبھال رکھا تھا۔ غم کے اس طوفان سے گزرتے ہوئے شہر یار کو ان کی ذات سے بڑا سہارا ملا تھا۔ اب بھی وہ نظر آئے تو اس کے دل کو حارس بی بی۔

"کیسی طبیعت ہے رانا صاحب کی؟" شہر یار کے قریب پہنچ کر انہوں نے اس سے سوال کیا۔ ان کی سیکورٹی پر مامور عملہ ذرا فاصلے پر ہی رک گیا تھا۔

"طبیعت تو اب کافی حد تک سنبھل گئی ہے۔ ڈاکٹرز کے مطابق وہ خطرے سے نکل آئے ہیں لیکن میرے انداز سے کے مطابق شدید پریسڈ پر ہینڈ ہیں۔"

"وہ تو ہوتا ہی ہے۔ کسی بوڑھے باپ کے لیے اپنے بیٹے کا جنازہ دیکھنا کسی بھی صورت آسان نہیں ہو سکتا۔" اس کی بات سن کر مختار مراد نے دہشت گردی میں تبصرہ کیا پھر وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے وزینک روم میں دھکی کر سیڑیوں کی طرف بڑھ گئے۔ یہ عام وزینک روم نہیں تھا۔ یہاں صرف لیاقت رانا جیسے وی آئی جی پر تعلق رکھنے والے لوگوں کے حاردار ہی داخل ہو سکتے تھے۔

"کچھ معلوم ہوا سجاد بھائی کے قاتلوں کے بارے میں؟" وہ دونوں ایک دوسرے کے آگے سامنے بیٹھ گئے تو شہر یار نے ان سے پوچھا۔

"قاتلوں کی کوئی نشان دہی تو نہیں ہوئی لیکن ایسی بہت سی وجوہات سامنے آئی ہیں جن کو سجاد کے مرڈر کی وجہ سمجھا جا سکتا ہے۔ اصل میں اس نے ہینا کی موت کا بہت گہرا اثر لیا تھا اور اس کے قاتلوں کو کیفر کر دینا تک پہنچانے کے لیے دہرانہ اور کوششیں کر رہا تھا لیکن اپنی ان کوششوں میں اس نے جیسے شامل کرنا یا گاہ کرنا پسند نہیں کیا تھا۔ تحقیقات کے مطابق ہینا کی موت کے بعد سجاد مسلسل خفیہ سرگرمیوں میں مصروف رہا لیکن اس نے ان سرگرمیوں میں اپنے ماتحتوں کو بھی ایک حد سے زیادہ ملوث نہیں کیا۔ جن لوگوں نے اس کے احکامات کی پیروی کی، وہ بھی حقائق سے واقف نہیں یا بہت کم جانتے ہیں۔ اس سارے عرصے میں کئی بار ایسا بھی ہوا کہ اس نے گاؤں اور ڈرائیور کو بھی اپنے ساتھ رکھنا گوارا نہیں کیا۔ پھر سے پاس جو اطلاعات پہنچی ہیں، ان کے مطابق کچھ دن قبل ہی وہ تنہا اپنی گاڑی خود ڈرائیور کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل پہنچا تھا اور وہاں اس نے جولی نامی ایک لڑکی کے ساتھ چند گھنٹے گزارے تھے۔ جولی ایک کال گرل تھی جسے سجاد نے ہوٹل کے ایک ویٹر کے ذریعے اپروچ کیا تھا۔ سجاد کے حکم پر اس کے ایک ماتحت نے جولی کا تعاقب کر کے اس کی رہائش گاہ کا پتا معلوم کر لیا تھا لیکن حیرت انگیز طور پر اسی رات ہوٹل کا ویٹر ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں مر گیا اور جولی نے اپنی غیر شریفانہ زندگی سے پیڑاری کا اظہار کرتے ہوئے خودکشی کر لی۔" مختار مراد کی باتیں سنتے ہوئے اسے یک دم ہی اپنی سجاد رانا سے آخری ٹیلی فونک گفتگو یاد آگئی۔ اس گفتگو کے دوران انہوں نے اسے بتایا تھا کہ ہینا کے قاتلوں کو تلاش کرتے ہوئے وہ کچھ ایسے سپاؤز تک پہنچ گئے ہیں جن کے روپ میں خطرناک انجنس چھپے بیٹھے ہیں۔ یہ بات بتاتے ہوئے انہوں نے جسم فروشی کے دھندے کا یہ طور خاص ذکر کیا تھا لیکن پھر ٹیلی فون پر ہونے والی گفتگو کو غیر محفوظ قرار دیتے

ہوئے تفصیلات ملاقات پر چھوڑ دی تھیں۔ شوہی قسمت کہ ملاقات کی نوبت ہی نہ آ سکی۔

"مجھے یقین ہے کہ یہ دونوں حادثات یقینی طور پر قتل کی وارداتیں تھیں۔ سجاد بھائی کے اس قسم کے افراد کے خلاف کام کرنے کا تو کسی حد تک مجھے بھی علم ہے۔ یقیناً جو بڑے مجرم ہیں انہوں نے اپنی طرف جانے والے راستوں کا نشان مٹانے کے لیے اپنے ہی بندوں کو بلی چڑھا دیا ہوگا۔" وہ بے ساختہ ہی درمیان میں بول پڑا اور مختار مراد کو اپنی اور سجاد رانا کی گفتگو کے بارے میں بتانے لگا۔

"تمہارا تجربہ بالکل درست ہے۔ میرے سامنے کچھ ایسے شواہد آئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سجاد کچھ خاص قسم کے مجرموں کی راہ پر لگ گیا تھا جس کے نتیجے میں اسے جان سے ہانا پڑا۔ میرے بندے ایک ایسے صیرف بیورو تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جس کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ اس کی مالکن لڑکیوں کی سپلائی رہی ہے لیکن افسوس کہ ہمیں پہنچنے میں کچھ دیر ہوئی۔ وہ صیرف بیورو بندہ ہو چکا ہے اور مالکن سمیت اسٹاف کے بارے میں کوئی خبر نہیں۔ عمارت کے مالک کے ریکارڈ میں عورت کا جو پتا درج ہے، وہ بھی غلط ہے۔ میرے آدھیوں نے دفتر کی تلاشی لے کر کلیڈز حاصل

کرنے کی کوشش کی لیکن اسے پہلے ہی مکمل طور پر پکھن کر دیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ ہم کسی کے فکٹر پرنس حاصل کرنے میں بھی کامیاب نہیں ہو سکے۔ اس صورت حال سے ظاہر ہے کہ مجرم کوئی عام لوگ نہیں بلکہ تربیت یافتہ اور بے حد ذہین تھے جنہوں نے اپنے پیچھے کوئی سراغ نہیں چھوڑا۔" مختار مراد نے اسے آگے کی تفصیلات سے آگاہ کیا اور پھر یوں خاموش ہو گئے جیسے بتانے کے لیے مزید کچھ باقی نہ رہا ہو۔

شہر یار خود بھی کچھ دیر خاموشی سے ان کے سامنے بیٹھا رہا پھر اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "اچھا انگل! اب اجازت دیجیے۔ مجھے کچھ اور معاملات بھی دیکھنے ہیں۔ آپ البتہ ماموں جان سے مل لیں۔ آپ کی بہت اور حوصلے کو دیکھ کر یقیناً انہیں بھی حوصلہ ملے گا۔" وہ ان سے مصافحہ کر کے اسپتال سے رخصت ہو گیا۔ اسے یہاں سے لیاقت رانا کی رہائش گاہ کی طرف جانا تھا۔ مشاہیر خان کی عدم موجودگی میں ڈرائیور کے فرائض انجام دینے والے ڈرائیور نے اس کی سبک رقا مر سید پرنسپل کے بہاؤ میں شامل کی تو اس نے اپنا تیل فون نکال کر مشاہیر خان کا نمبر ملا یا۔ سجاد رانا کی آخری رسومات اور دیگر فرائض کی ادائیگی میں اسے موقع نہیں مل سکا تھا کہ مشاہیر خان سے رابطہ کر پاتا، حالانکہ اس

مایوسی گناہ ہے

ہم چھین لیں گے آپ کی ہر

پریشانی اللہ کے کرم سے

پیرزادہ وسیم جعفری

ادنیٰ کار

کا اعلان

وہ کام جو بڑے سے بڑا عامل و جادوگر نہ کر سکے وہ میرے بزرگوں کی دعا سے ہو جاتا ہے

مثلاً شوہر کے دل سے شک و نفرت کی آگ، سنگدل محبوب نے نیند حرام کر دی ہو

تجارت میں دن بدن نقصان، رشتوں میں بندش، عزیزوں سے لڑائی جھگڑا

عزت و وقار میں کمی یا دشمن جلوی ہو، بیٹی کی سسرال میں عزت نہیں، امیگریشن کے

مسائل، لاٹری نمبر غرضیکہ ہر مشکل کیسی ہی کیوں نہ ہو اپنی آخری امید سمجھ کر رابطہ کریں

0300-7462777

0333-8217808

سمجرات

پاکستان

پیرزادہ وسیم جعفری

بے جا شاربیشانی کے عالم میں بھی وہ اس مسئلے کو بھولا نہیں تھا۔ ماہ بانو کو اس نے اپنی ذمہ داری پر پاکستان بھیجا تھا تو اب اس کے افواہ کی خبر پر وہ خود سب سے بڑھ کر متغیر تھا لیکن حالات ہی کچھ ایسا رخ اختیار کر گئے تھے کہ وہ اپنے ہاتھ پیر کئے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔ خواہ کبھی بھی کسی طرح پاکستان پہنچا جائے اور ماہ بانو کی بازیابی کے سلسلے میں ہاتھ پیر مارے جائیں لیکن فرائض اور خوبی رشتوں کا حق راہ میں حائل تھا۔ وہ اپنے پیاروں کو ان حالات میں تنہا چھوڑ کر کسی لڑکی کی خاطر کھینک نہیں جاسکتا تھا، چاہے وہ لڑکی اسے اپنی زندگی سے بھی بڑھ کر پیاری ہوتی۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ مرد بھی مجبور نہیں ہوتا لیکن عملی زندگی میں بہت سے مقامات ایسے آتے ہیں جب طاقتور سے طاقتور مرد خود کو مجبور محسوس کرتا ہے۔ خصوصاً اگر معاملہ فرض اور خواہش کی جنگ کا ہو تو اعلیٰ ترین تہمت کے حامل افراد اپنی ذاتی خوش قربانی کے فرض کی ادائیگی کو ہی ترجیح دیتے ہیں۔ اس نے بھی ایسا ہی کیا تھا اور خود پر ضبط کر کے ماہ بانو کا معاملہ سیر افتد کر دیا تھا۔ البتہ افتد پر پھر دوسرا کرنے کے باوجود وہ کتنی تدبیر یہاں بیٹھے بیٹھے کر سکتا تھا، وہ اس نے ضروری کتنی اور اب اسی تدبیر کے نتائج جاننے کے لیے مشاہیر خان کو کال ملائی تھی۔

”السلام علیکم سر!“ مشاہیر خان نے کال ریسپونڈ کر لی اور اپنے مخصوص انداز میں سلام کیا۔

”وہیکم السلام! کیا حال ہے خان؟ آرام سے وہاں پہنچے تو گھسے تھے؟“ اس نے پتھر سے ہوئے لہجے میں اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔

”میں ٹھیک ہوں سر! آپ کی مہربانی سے سفر میں بھی کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔“ مشاہیر خان نے ترتیب وار اس کے سوالوں کا جواب دیا لیکن اس کا لہجہ کچھ بچھا ہوا اور صحت مند نہ تھا۔

”تمہاری والدہ کو کسی طبیعت ہے؟“ وہ بے شک ماہ بانو کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین تھا لیکن اخلاقی تقاضا تھا کہ پہلے مشاہیر خان کے مسائل پر بات کی جائے۔

”اماں کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ اس کے دماغ کو سخت صدمہ پہنچا ہے۔ ابھی وہ اسپتال میں ہی ہے اور بے ہوش ہے۔ مجبوری میں مجھے اکرم خان کی تدفین بھی اس کے بغیر ہی کرنی پڑی۔“ مشاہیر خان نے اداسی سے بتایا۔

”وہی سید اجہیں میری کسی طرح کی مدد کی ضرورت ہو تو بتاؤ بلکہ ایسا کر کہ اپنی ماں کو لے کر لاہور یا اسلام آباد کے کسی اسپتال پہنچ جاؤ۔ اسکردو کے مقابلے میں ان شہروں

کے اسپتال زیادہ جدید اور باسہولت ہیں۔ تم کہو تو میں انتظامات کروا دوں؟“ اس نے ہمدردی کے ساتھ مشاہیر خان سے پوچھا۔

”شکر ہے سر! لیکن میرے خیال میں اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ ماں کو کوئی جسمانی مسئلہ نہیں ہے، بس صدمہ ہے جس سے وہ آہستہ آہستہ ہی نکل سکے گی۔“ مشاہیر خان نے جواب دیا تو وہ خاموش ہو گیا۔ اگر مشاہیر خان خود مطمئن تھا تو مزید اصرار بے کار تھا۔

”حادثے کے بارے میں کچھ معلوم ہوا کیا ہوا تھا اور کون لوگ ہیں اس کے پیچھے؟“ اس نے اصل موضوع چھیڑا۔

”واقعہ ہوٹے سے واپس کا مہرے جاتے ہوئے کینڈا اس تھک کے قریب پیش آیا تھا۔ جب کے ڈرائیور کے مطابق اچانک ہی ایک جیپ میں سوار کچھ لوگوں نے انہیں گھیر لیا تھا اور ماہ بانو کو ان کے ہاتھ کی کوشش کی تھی جس پر اکرم خان نے جوش میں ان سے بھڑکنے کی کوشش کی اور جواباً اسے گولی مار کر وہ لوگ ماہ بانو کو لے گئے۔ یہاں کی پولیس نے اس واردات کے بارے میں تحقیقات کیں تو اس جیپ کا پتا چل گیا جس میں افواہ کار آئے تھے۔ وہ ایک فورس ٹپنی کی جیپ تھی۔ جیپ کا ڈرائیور خالی جیپ لے کر پٹنہ شیدول کے مطابق پہاڑوں سے واپس آئے والی ایک ایسی ہی ڈیش ٹیم کو لینے جا رہا تھا کہ راستے میں اس کی جیپ روک لی گئی اور اسے بے ہوش کر کے روکنے والے جیپ لے اڑے۔ ہوش میں آنے کے بعد جب تک اس نے تھانے میں رپورٹ کروائی اور جیپ تلاش کی گئی، تب تک مجرم اپنا کام کر چکے تھے۔ خالی جیپ پولیس کو ایک بالکل دیرین پہاڑی کے قریب کھڑی مل گئی تھی۔ مجرم وہاں سے کہاں اور کیسے گئے، اس بات کا سراغ نہیں مل سکا۔ کیونکہ جس علاقے میں جیپ ملی، وہاں زمین کی ساخت ایسی ہے کہ کسی سواری یا انسانی قدموں کے نشانات حاصل کرنا ممکن نہیں۔ اب یہاں کی پولیس ابھی ہوتی ہے کہ آگے کی تحقیقات کس بنیاد پر کریں؟ ماں کی بیماری اور اکرم خان کی آخری رسومات کی ادائیگی میں اچھے ہونے کی وجہ سے میں خود بھی اس تک کچھ نہیں کر سکا ہوں۔ لیکن آپ فکر نہ کریں سر! اب میں کوشش کروں گا کہ کسی نہ کسی طرح کچھ معلوم کر سکوں۔“ مشاہیر خان نے تفصیلات سناتے ہوئے آخر میں اپنا ختم ظاہر کیا۔

”اپنی سہولت اور وسائل کے مطابق اگر تم کچھ کر سکو تو ضرور کرو خان۔ لیکن میری طرف سے تم پر کوئی زبردستی نہیں ہے۔ مجھے اچھی طرح احساس ہے کہ اس وقت کسی بھی

اور کام سے بڑھ کر تم پر اپنی ماں کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اس لیے تمہیں سب سے زیادہ اپنی کا دھیان رکھنا چاہیے۔“ وہ اور مشاہیر خان کم و بیش ایک ہی جیسی صورت حال سے دوچار تھے، چنانچہ وہ مشاہیر خان کے مسائل کو سمجھ سکتا تھا۔ ان مسائل کو سمجھتے ہوئے ہی اس نے مشاہیر خان کو کسی بھی ذمہ داری کے بوجھ سے آزاد کرنے کی کوشش کی تھی۔

”ماں کا خیال تو اسپتال والے رکھ رہے ہیں سر۔ لیکن مجھے اپنے بھائی کے قاتلوں کو تلاش کرنے کا کام خود کرنا ہوگا۔ ادھر ہمارے علاقے میں ایسی وارداتیں پہلے بھی نہیں ہوئی۔ یہاں کی پولیس کو تو یہ بھی سمجھ نہیں آ رہا کہ کیا کریں؟ اس لیے مجھے خود ہی کچھ کرنا ہوگا۔“ مشاہیر خان کی بات اپنی جگہ درست تھی۔ وہ جگہ جہاں کرائم ریٹ نہ زیادہ ہو، وہاں اس طرح کی کوئی واردات ہو جائے تو وہاں کی پولیس کا پکھانا بھجوا دیتا تھا۔

”ٹھیک ہے خان۔ جیسا تم مناسب سمجھو۔ میں وہاں کی انتظامیہ سے ایک بار پھر درخواست کروں گا کہ تمہارے ساتھ تعاون کریں۔“ اس نے مشاہیر خان کو اجازت دی اور کال منقطع کر کے سیٹ کی پشت سے سر نکالیا۔ گھر، اسپتال اور ماہ بانو سمیت ایک پورے ضلع کی ذمہ داریوں کا بوجھ تھا اس کے شانوں پر تھا اور وہ بے ظاہر آرام و انداز میں بیٹھا ہونے کے باوجود اندرونی طور پر ان ساری ذمہ داریوں سے احسن طور پر عہدہ دہرا ہونے کی تدبیر سوچنے میں ابھی ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ بہت دیر سے غاری دیوار سے پشت لگا کے ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے قدیم دیو بالائی داستانوں میں مذکور کسی دیوی کا ضدی آنکھوں والا مجسمہ دیوار کے ساتھ لگا ہو لیکن یہ ایک ایسا مجسمہ تھا جس کے خطوط میں ایک آہنگ سے ہونے والی حرکت سانسوں کے متوجع کو ظاہر کر رہی تھی۔ سانس جو زندگی کی علامت ہے اور جس کے دم سے ہی سارے جذبے اور خواہشیں قائم ہیں۔ سانس جسم کا ساتھ چھوڑ دے تو حسین سے حسین انسان بھی مٹی کے ڈھیر کے برابر ہو جاتا ہے۔ پھر دل سے تراشے گئے بھی اپنی تمام تر خوب صورتی کے باوجود صرف سانس کی عدم موجودگی کے باعث ادھورے رہ جاتے ہیں۔ ایسے مجسموں کے لیے دیکھنے والی آنکھ میں حسین تو ہوتی ہے لیکن دل میں جذبات نہیں۔ اور اس کی خوبی یہی تھی کہ وہ ادھوری نہیں تھی، اس کے انگ انگ میں زندگی بھری تھی۔ جو ابی اور شباب سے چڑ زندگی جو دیکھنے والی آنکھ میں صرف حسین نہیں

بھرتی، پورے وجود کو کسائی ہے۔ وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی اور بے ظاہر اپنے ارد گرد سے بے نیاز تھی لیکن اچانک ہی اسے اپنے جسم پر پتہ نہیں سی رہی محسوس ہوئی۔ اس کی زبان نہ جلت تھی فوراً ہی اس کے اندر خطرے کی گھنٹی بجائی اور اس نے چونک کر ایک جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں۔ اس سے کچھ ہی فاصلے پر ایک پتہ عمر کا، ابھی ہوئی ڈائری اور بالوں والا شخص کھڑا اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا۔ وہ ان عجیب و غریب لوگوں میں سے ایک تھا جنہیں وہ کینڈا اس تھک سے افواہوں کو اس پرف زار میں آنے کے بعد سے مسلسل اپنے ارد گرد دیکھ رہی تھی۔ دوسارے لوگ بڑے عجیب تھے۔ انہیں دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ انہوں نے ایک زمانے سے تہذیب یافتہ دنیا کی شکل نہ دیکھی ہو۔ ان کے چہروں سے وحشت برستی تھی اور آنکھوں میں کسی جنگلی جانور کی سی زندگی تھی۔ ان کے اعضا کے تناؤ سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اپنے شکار پر گھات لگائے بیٹھے ہوں اور کسی بھی ٹیل اس پر بھٹ پڑنے کے لیے تیار ہوں۔ وہ ان عجیب و غریب لوگوں کے ساتھ ان کی دنیا میں قیدی کی حیثیت سے رہ رہی تھی اور حیران تھی کہ یہ لوگ کون ہیں اور کس مقصد کے تحت دنیا سے کٹ کر اس دیرانے میں رہ رہے ہیں؟ اس بات کا تو اسے حتمی یقین تھا کہ بہر حال، وہ اس جگہ کے قدیمی باشندے نہیں ہیں۔ وہ سب باہر کی دنیا سے آ کر یہاں آیا ہوئے تھے۔ ان کے رنگ روپ اور لہجے چٹلی کھاتے تھے کہ وہ مختلف علاقوں کے رہنے والے ہیں۔ ان کے طبع بے شک یکساں تھے۔ ان کی بڑھی ہوئی ڈاڑھیاں اور اچھے ہوئے بالوں نے انہیں ایک دوسرے سے مشابہ ظاہر کرنے کی کوشش بھی یا پھر اس علاقے میں پانی اور دیگر سہولیات کی قلت کے باعث ان کے لیے خاموش کروانا ممکن نہیں تھا، وہ ابھی تک اس بات کا فیصلہ نہیں کر سکی تھی۔ ان کے جسموں پر موجود لباس بھی ایک جیسے تھے۔ وہ بد رنگ اور گھسے ہوئے اونٹنی پا جاموں کے ساتھ ہی بٹن شرٹ نما ٹی شirts پہنے ہوتے تھے۔ یہ مشرک کہ حلیے اختیار کر لینے کے باوجود وہ ایک دوسرے سے الگ شناخت کیے جا سکتے تھے۔ ان میں کوئی گورے رنگ اور سنہری بالوں کا مالک تھا تو کوئی لیے قد اور کھڑے کھڑے نہیں نکلتا والا۔ سیاہ کورتال سے رنگ والوں کے ساتھ ہونے قد اور سانوئی رنگت والے پھر سے بھی وہاں نظر آ رہے تھے۔ یہی حال زبان کا تھا۔ وہ جو زبان آپس میں بولتے تھے، اس میں سندھی، سرائیکی، پنجابی، پشتو اور انگریزی کے الفاظ آپس میں اس طرح مدغم ہو گئے

ماؤتھ میں لونی اور موہاں جیسے کے پتھر رکھ کر سیدی ہوئی۔
 "کون ہے؟ اندر جاؤ۔" بلند آواز میں دیے گئے اس
 جواب پر حارہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ رانی کو خود
 اس نے اپنی کچھ ذاتی چیزوں کی خریداری کے لیے ڈرائیور
 کے ساتھ مارکیٹ تک بھیجا ہوا تھا۔ پہلے بھی اس کا لاہور آنا
 ہوتا تھا تو وہ اپنی ہر طرح کی خریداری کے لیے خود ہی جایا
 کرتی تھی۔ اس طرح اسے کچھ وقت آزاد فضا میں سانس لینے
 کا موقع مل جاتا تھا لیکن اب وہ خود کو بھی سے باہر نکلنے سے
 گریز کر رہی تھی تاکہ آفتاب کی لاہور آمد پر جب باہر نکلتا
 پڑے تو ملازمین کو یہ محسوس نہ ہو سکے کہ وہ روز بروز سیر پانے
 کرنے چلی جاتی ہے۔
 "کیا کام ہے حارہ؟ کیوں آئی ہو؟" بے نیازی کا
 مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے حارہ سے پوچھا۔
 "وہ لی... آپ سے ملنے کے لیے ایک عورت آئی
 ہے۔ کہتی ہے کہ وہ لی بی بی سے ملنا ہے۔" حارہ نے اپنی آمد کا
 مقصد بتایا۔
 "یہاں کون عورت مجھ سے ملنے آسکتی ہے؟" وہ
 حیران ہوئی۔ "تم نے نام پوچھا تھا اس عورت کا؟"
 "جی لی بی بی! اس نے اپنا نام نہیں بتایا۔ بس یہی کہتی
 ہے کہ آپ سے ملنا ہے۔ لمبی چوڑی سی برقع والی عورت
 ہے۔ منہ پر نقاب بھی لگایا ہوا ہے۔ آپ کہیں تو میں جا کر منع
 کر دوں... جانے کون عورت ہے؟ چوکیدار نے اسے گیٹ پر
 ہی روک رکھا ہے۔" حارہ نے اسے تفصیلات سے آگاہ
 کرتے ہوئے اپنی طرف سے آنے والی عورت کو ٹالنے کے
 سلسلے میں اجازت بھی چاہی۔
 "نہیں، رہنے دو۔ میں دیکھتی ہوں۔ شاید میری کوئی
 جاننے والی ہی ہو۔" وہ ابھی ابھی ہی بستر سے اتر کر کمرے
 سے باہر کی طرف چل پڑی۔ حارہ بھی اس کے پیچھے پیچھے گئی۔
 "چوکیدار سے کہو کہ عورت کو گیٹ سے اندر آنے
 دے۔" گیٹ سے کافی فاصلے پر ہی رک کر اس نے حارہ کو
 حکم دیا تو وہ تیز تیز قدم اٹھائی آگے بڑھ گئی جبکہ کشور اپنی جگہ
 رک کر انتظار کرنے لگی۔ حارہ نے اس کا حکم چوکیدار کو پہنچایا
 تو ڈرائیور کے تذبذب کے بعد اس نے ذہنی گیٹ کھول کر
 عورت کو اندر آنے کی اجازت دے دی۔ لمبی چوڑی عورت
 سر جھکا کر اندر داخل ہوئی اور اعتماد سے چلتی ہوئی فاصلے پر
 کھڑی کشوری کی طرف آنے لگی۔ اس کے پیچھے چوکیدار اور انفل
 تھا سے بالکل الٹ کھڑا تھا۔ عورت ڈرا بھی کوئی اپنی سیدی
 حرکت کرتی تو وہ اسے فوراً گولی مار دیتا۔ کشور خود ابھیں میں

مہتاب نے اس کے بستر پر بیٹھتے ہوئے بچوں کو ساتھ نہ لانے
 کی وجہ بتائی۔
 "ابھی آپ یہ برقع تو تاریں اور آرام سے بیٹھیں۔
 ابھی بچوں کی پچھلی میں کافی وقت ہے۔ کھانا چاہے آپ نہ
 کھائیں لیکن درمیان کا وقت میرے ساتھ ہی گزارنا ہوگا۔"
 کشور نے محبت بھرے لہجے میں کہا تو مہتاب مسکراتی ہوئی برقع
 اتارنے لگی۔
 "وہی مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ اتنی پردہ دار
 خاتون ہیں کہ کمرے سے باہر نکلنے کے لیے باقاعدہ برقع اوڑھتی
 ہوں گی۔ میں تو ملازمہ کی زبانی یہ سن کر حیران ہی ہو رہی تھی
 کہ کوئی برقع پوش خاتون مجھ سے ملنے آئی ہیں۔ آپ نے اپنا
 نام بھی تو نہیں بتایا تھا۔"
 "نام تو میں نے اس لیے نہیں بتایا تھا کہ اچانک
 تمہارے سامنے پہنچ کر تمہیں سر پر اثر دے سکوں۔ رہی
 برقع والی بات تو سچ کہوں، یہ برقع میں پردہ دار ہونے کی
 وجہ سے نہیں پہنچتی بلکہ اس لیے پہنچتی ہوں کہ خود کو کچھ لوگوں کی
 نظروں سے روک رکھ سکوں۔" مہتاب کا جواب سن کر اسے
 آفتاب کی اس کے متعلق سنائی گئی داستان یاد آگئی۔ مہتاب
 نے دور کی سوچی سمجھی جس کے لیے محبوب سے ملن زعم کی
 بنیادی شرط تھا لیکن اس ملن کے لیے اس نے جو قدم اٹھایا تھا،
 وہ منہ زور لہروں کو کچے کھڑے پر پار کرنے سے کم نہیں تھا۔
 اسے قہقہے کے رسم ورواج کو کھل کر وہ ساری دنیا سے ناک توڑ
 کر انفل کی بن گئی تھی اور اب بھی اس خوف کا شکار تھی کہ
 جانے کوئی کب تک لہرا سے اس کے کچے کھڑے سمیت بہا کر
 لے جائے۔
 "اوہو... مجھے تو خیال ہی نہیں رہا کہ میں آپ کے
 آنے سے پہلے آفتاب سے باتیں کر رہی تھی۔ ذرا انہیں آپ
 کے بارے میں بتا دوں تاکہ وہ مطمئن ہو جائیں ورنہ بے
 چارے پریشان ہی ہوتے رہیں گے کہ میں کس مشکل میں
 گرفتار ہوں۔" مہتاب سے متعلق آفتاب کی بتائی ہوئی باتیں
 یاد آئیں تو ساتھ ہی یہ بھی یاد آگیا کہ وہ آفتاب سے اپنی گفتگو
 ادھوری چھوڑ کر حارہ کے ساتھ باہر نکل گئی تھی۔ اب یاد آیا تو
 فوراً آنکھ کے نیچے چھپا موہاں نکال کر آفتاب کو خوشی...
 سے مہتاب کی آمد کے بارے میں مطلع کیا۔
 "ٹھیک ہے، آپ بھابی کے ساتھ انجوائے کریں۔
 میں بھی اپنے کام دھندے سے نمونہ ہوں۔" اس کی دی ہوئی
 اطلاع سن کر آفتاب نے کہا اور فون بند کر دیا۔
 "اب آپ بتائیں بھابی کہ کیا حال ہے؟ بچے اور

افضل بھابی تو خیریت سے ہیں نا؟" آفتاب کی طرف سے
 مطمئن ہو کر وہ مہتاب کے برابر میں آکر بیٹھی اور اس سے
 پوچھنے لگی۔ اپنا موہاں اس نے بے پردائی سے بیڑ پر ہی ڈال
 دیا تھا۔
 "سب ٹھیک ہیں۔ بچے تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔
 مجھ سے بار بار پوچھتے ہیں کہ کتنی چاہی دو بارہ ہمارے گھر
 کب آئیں گی؟" مہتاب مسکراتے ہوئے اسے بتانے لگی۔
 اسی طرح کی چھوٹی چھوٹی بے تکلفانہ باتیں کرتے ہوئے
 وقت گزرنے لگا۔ حارہ اس دوران کھانے پینے کی پرکلف
 اشیاء سے بھری فریال کمرے میں پہنچا کر جا چکی تھی۔ رانی کے
 بارے میں بھی اطلاع مل گئی تھی کہ وہ مارکیٹ سے واپس
 آ چکی ہے اور اب باورچی خانے میں حارہ کا کچھ بنا رہی
 ہے۔ مہتاب کے کھانے سے انکار کے باوجود کشور یونہی اسے
 واپس نہیں جانے دینا چاہتی تھی۔ اگر مہتاب کھانے پر نہ بھی
 رکتی تو وہ بچوں کے نام سے اس کے ساتھ کھانا باندھ کر بھجوا
 دیتی۔ ابھی تو خیر وہ باتوں میں ملن تھیں اور مہتاب نے واپس
 جانے کا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا۔ آپس کی باتوں میں ملن وہ
 دونوں اس وقت چومیں جب کسی نے بنا دستک دیے دھڑ سے
 دروازہ کھولا۔ اس غیر مہذبانہ انداز پر کوئی روتل غار کرنے
 سے قبل ہی کشور نے کھلے دروازے میں کھڑی ناہید کو دیکھ لیا۔
 "السلام علیکم ماں! آپ یہاں... وہ بھی اتنی
 اچانک؟" وہ بولکھلا کر اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی اور ماں کی
 اچانک آمد پر حیرت کا اظہار کرنے لگی۔
 "کیوں، میرے یہاں آنے پر پابندی ہے کیا؟ جیسے
 یہ تیرے باپ کی کوئی ہے، ویسے ہی میرے شوہر کی بھی ہے۔
 تو یہاں رہ سکتی ہے تو میں کیوں نہیں رہ سکتی؟" چودھرائن ناہید
 نے نرم لہجے میں سے جواب دیا۔ عمو ماں کے انداز میں کشور
 کے لیے بڑی رعایت ہوتی تھی لیکن اس وقت وہ خاصی خفا
 لگ رہی تھی۔ کشور اس خفائی کا پس منظر سمجھتی تھی۔ تاہم نے
 اپنے لاہور کے دورے سے واپس جانے کے بعد یقیناً اس
 کے بارے میں ایسی باتیں کہی ہوں گی کہ اس کی ماں
 سے جبراً اسے زیادہ دہن نہیں رکھا گیا اور وہ موقع ملنے ہی بیٹی
 کا حال اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے لاہور آچکی۔ ماں کی
 آمد کا مقصد سمجھتے ہوئے کشور نے بے ساختہ ہی اپنے مہندی
 سے سجے ہوئے ہاتھ پشت پر کر لیے۔ اس کے ہاتھوں پر لگی
 مہندی بے شک مدہم پڑ چکی تھی لیکن آفتاب کی محبت کا جو رنگ
 اس کے پورے وجود پر چڑھا تھا وہ بہت پاک تھا اور اسے
 چھپانا بھی ممکن نہیں تھا۔ چودھرائن ناہید نے بھی یہی نظر میں

یہی اس میں در آنے والی تبدیلی کو محسوس کر لیا تھا اور اب خوشکام نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”میں نے آپ کے یہاں آنے پر اعتراض تو نہیں کیا اماں آپ آئیں، یہاں بیٹھیں۔“ مہتاب کے سامنے ماں کے لہجے پر ہلکی محسوس کرنے کے باوجود کشور نے رسان سے ماں کو مخاطب کرتے ہوئے اسے اس جگہ بیٹھنے کا اشارہ کیا جہاں تھوڑی دیر پہلے وہ خود بیٹھی تھی۔۔۔۔۔ چودھرائیں ناہید مہتاب کو کھورتی ہوئی بیٹھ گئی۔

”تسلی کون ہوئی بی بی؟“ بیٹھنے کے بعد اس نے بڑا راست مہتاب سے سوال کیا۔

”یہ میری سہیلی ہیں اماں۔ یہیں کتابوں کی دکان پر میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ بس پھر ہماری دوستی ہو گئی۔ آج یہ پہلی بار مجھ سے ملنے یہاں آئی ہیں۔“ مہتاب کے کچھ بولنے سے مل خود کشور نے اس کا ماں سے تعارف کروایا۔

”ایسے راہ چلتی عورتوں سے دوستانہ گانٹھنے کی تجھے کس نے اجازت دے دی؟ اپنے اماں کو جانتی ہے نا؟ دو تو کتاب بھی خریدیں تو اس کی کسل کی انہی طرح جانچ پڑتال کرتے ہیں۔ تو بغیر جاننے پر کچھ دوستی کر کے راہ چلتوں کو گھمرا لائے گی۔“ ناہید کے الفاظ اور لہجہ دونوں اتنے جھک آمیز تھے کہ مہتاب کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

”میں اب چلتی ہوں کشور!“ اس نے کشور کی خاطر چودھرائیں ناہید کو کوئی بھی جواب دینے سے گریز کرتے ہوئے خود پر۔۔۔ ضبط کیا اور کھڑی ہو کر اپنا برقع اوڑھ گئی۔ کشور کی آنکھوں میں ماں کے روپ کے لیے گہری معذرت تھی لیکن اس وقت وہ کچھ بھی کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ مہتاب برقع اوڑھ کر باہر نکلے گی تو چودھرائیں ناہید کی آواز نے اس کے قدم روک لیے۔

”یہ فون شاید تمہارا ہے، اسے بھی اپنے ساتھ لے جاؤ۔۔۔ یہاں کہاں چھوڑ کر جا رہی ہو؟“ اس نے ہنسنے پر پڑا کشور کو موبائل اٹھا کر مہتاب کی طرف بڑھایا۔

”یہ موبائل میرا نہ۔۔۔“ مہتاب نے موبائل کی ملکیت سے انکار کرنا چاہا لیکن فوراً ہی کشور نے مداخلت کر کے اسے درمیان میں ہی روک دیا۔

”ارے ہاں اماں! یہ تو ان کا ہی موبائل ہے۔ اچھا ہوا آپ نے صبح وقت پر دیکھ لیا ورنہ بے چاری کو پریشانی ہو جاتی۔“ اس نے چودھرائیں ناہید کے ہاتھ سے موبائل جھٹ کر مہتاب کو تھما دیا۔ اس نے بھی صورت حال کو سمجھتے ہوئے خاموشی سے موبائل اپنے پرس میں رکھ لیا اور خدا حافظ کہتی

ہوئی باہر نکل گئی۔

”میں تجھے اپنے ساتھ واپس گاؤں لے جانے کے لیے آئی ہوں۔ بہت روٹی یہاں۔ اب واپس چل۔ یہاں رہ کر تو جو ڈرا سے گری رہی ہے وہ میں ہور برداشت نہیں کر سکتی۔ ساری حیاتی وڈی چودھرائیں سے دب کر رہی ہوں اور اب تیری وجہ سے ہور بھی ٹھننے سننے پڑتے ہیں۔ جو بی بی چل، میں دیکھتی ہوں وہاں رہ کر تیرا دماغ کیسے ٹھیک نہیں ہوتا۔ تیرے اماں بھی میرے ساتھ ہی آئے ہیں۔ انہیں مراد کے پاس امریکا جانا ہے۔ ابھی تو وہ مجھے یہاں اتار کر خود کسی کام نال گئے ہیں پھر شام میں انٹرپورٹ چلے جائیں گے۔ تو تیاری رکھ۔ ڈیور انہیں چھوڑ کر واپس آئے گا تو ہم اس کے ساتھ واپس گاؤں چلے جائیں گے۔“ مہتاب کے جاتے ہی چودھرائیں ناہید نے اٹل لہجے میں اسے حکم سنایا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے باہر نکلنے ہی کشور گرنے والے انداز میں بیٹھ پڑی تھی۔ بیٹے اٹل لہجے میں چودھرائیں نے اسے حکم سنایا تھا، اس سے صاف ظاہر تھا کہ چاہے وہ کسی ہی جیل و جت سے کام لے، اسے چودھرائیں کے ساتھ واپس جانا ہی پڑے گا۔ واپس جانے کا مطلب تھا۔۔۔ آنے والے ویک اینڈ پر آفتاب سے ملے شدہ ملاقات سے محرومی۔ اس ملاقات کے حوالے سے ان دونوں کے دلوں میں کتنے ارمان تھے، یہ بات کوئی اور کیسے سمجھ سکتا تھا؟ اور وہ کسی کو سمجھا بھی کیسے سکتی تھی؟ فی الحال تو اس کے پاس موجود آفتاب سے رابطے کا ذریعہ وہ غما غما سا موبائل بھی جدا ہو گیا تھا اور وہ فرادار کے لیے ملنے والی پرواز کی آزادی کے بعد ایک بار پھر کسی بے زبان کبوتر کی طرح واپس اپنے قفس کی طرف ہانکی جا رہی تھی۔

☆☆☆

”دیکھ بالے! میرے پیچھے سارے کام ڈھنگ سے نہیں لینا۔ اس واری مجھے تجھ سے کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔ میں تیرے ساتھ وڈی رعایت کر چکے ہوں، پر اب کے کام بگڑانا تو تیرا انجام اچھا نہ ہو گا۔۔۔ کل چٹکی طرح سمجھ لے۔ انور کی طرح میں تجھے کتوں کے آگے ڈکوا دوں گا۔ غداری کی طرح کام چوری بھی تمک حرامی کی نشانی ہے۔ اب کی واری تو نے تمک حرامی دکھائی نا تو سمجھ لے کہ فیہر انجام بھی تمک حراموں جیسا ہی ہو گا۔“ ڈیپارچہ لاؤنچ میں موجود چودھری انثار بالے کو دھکی مہا دیات جاری کر رہا تھا۔ فرماں برداری سے سر ہلاتے بالے کی روح اس کی جھمکنیوں پر اندر سے فنا ہوئی جا رہی تھی۔ وہ انور کو اور اس کے انجام کو بھولا نہیں تھا۔ ماہ بانو کا بڑا بہنوئی انور جو اپنی بیوی لگا کر نازک حالت

میں اسپتال پہنچانے کے لیے جو بی بی کی طرف سے گاڑی کی فراہمی کا مطالبہ کر رہا تھا اور انکار پر برکشت ہو کر بغاوت پر اتر آیا تھا۔ بیوی کی موت کے صدمے نے انور کے حواس بکھین لیے تھے اور غصے میں وہ چودھری سے کمر لیتے ہوئے اسے ہی شہر یار کا خیر بن بیٹھا تھا۔ راز کھلنے کے بعد انور کو چودھری کی طرف سے ملنے والی عبرت ناک سراسیمہ پڑی تھی۔ چودھری نے کمزور اور ناتواں انور کو شکاری کتوں کے آگے ڈھکیل دیا تھا۔ انور اپنے ناتواں وجود کے ساتھ ان طاقتور کتوں سے مقابلہ نہ کر سکا اور کتوں نے انھوں میں اس کے جسم کو ادھیر ڈالا تھا۔ انور کی اس بے بسی سے لطف اندوز ہونے والے بالے نے جب اپنے ساتھ جیسے لے پلائے جسم کو تصور کی آنکھ سے کتوں سے بچھوڑے جانے کا منظر دیکھا تو کانپ اٹھا اور چودھری کی چال پوسی کرتا ہوا خوشامد انداز میں بولا۔

”آپ فکر نہ کریں سرکار۔۔۔ سب کام خیر نالی ہو جائیں گے۔ آپ بس چھوٹے شاہی جی کے پاس امریکا جائیں، پیچھے سے میں کام کر کے آپ کو خوش خبری سناتا ہوں۔ اس واری آپ کے ذہن کی ایک ٹیکس چلے گی۔ میں ناک کے رستے اس کی ساری افسری نکال دوں گا۔ ایک رات میری قید میں گزار لے گا تو اپنے سارے پیچھے والے ماموں چاچوں کو بھول جائے گا۔ بس آپ تھوڑا سا انتظار کریں۔ امریکا سے واپسی پر آپ کے سامنے آپ کی پسند کا تختہ پیش کر دیا جائے گا۔“

”اپنی گل پر قائم رہنا۔ اگر تو نے میری مرضی کے مطابق کام کیا تو میں بھی تجھے بالامال کر دوں گا۔ اور ہاں۔۔۔ اس اے سی کے بیٹے سے کوئی رعایت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وڈا آخر ہے اس میں۔ میں اس کے کزن کی موت پر افسوس کرنے گیا تھا تو اس نے مجھ سے ڈھنگ سے گل تک نہیں کی تھی۔“ چودھری جو شہر یار سے خار کھائے بیٹھا تھا، بالے کو اور چڑھانے لگا۔

”تسلی نے فکر ہو جاؤ سرکار! اے سی کو تو میں گل کرنا سکھاؤں گا۔ طوطے کی طرح فر فریو لے گا اور وہ سب بتائے گا جو ہم چاہیں گے۔“ بالے نے چودھری کا موڈ بحال کرنے کے لیے ہرک مار دی۔

”پراعتیلا سے کام کرنا۔ خبردار! کسی کو ایسا کوئی ثبوت نہ ملنے پائے گا وہ ہم تک پہنچ سکے۔ بغیر ثبوت کے اسے سی کتنا ہی شور مچائے ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔“

”اگر آپ حکم کریں تو اے سی کی زبان ہمیشہ کے لیے ہی بند کر دوں۔ سالار رہے گا نہ شور مچائے گا۔“ بالے نے جوش میں زیادہ ہی مستعدی کا مظاہرہ کرنا چاہا۔

”نہیں اوئے۔۔۔ اے سی کو تو میں نے زندہ ہی رکھنا ہے تاکہ اس کی بے بسی کا تماشا دیکھ سکوں۔ وڈا امرنی کی طرح کڑی کواپے پروں میں پھنسا کر رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جب ہم اس کڑی کوسل کر رکھ دیں گے تو اے سی کی جو حالت ہوگی، اسے دیکھ کر ہمیں اس کی موت سے زیادہ خوشی ملے گی۔“ چودھری نے فوراً ہی بالے کی تجویز سے اختلاف کرتے ہوئے اپنے شیطانی ذہن میں چلتی خواہش کا اظہار کیا۔

”جیسی آپ کی مرضی سرکار! بالو تو آپ کے حکم کا غلام ہے۔“ بالے نے ایک بار پھر خوشامد انداز اختیار کیا جس پر بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چودھری نے اپنی گردن موڑ لی۔ ایسے لہجے اور روئے اس کی زندگی کے معمولات میں شامل تھے۔ وہ ہمیشہ سے لوگوں کو اپنے سامنے جھکتے دیکھنے کا عادی تھا۔ اگر کبھی کوئی جھکتے سے انکار کر دیتا تو وہ بے چین ہو جاتا اور اسے جھکانے کی ترکیبیں سونپنے لگتا۔ اب بھی اسے کافی اطمینان ہو گیا تھا کہ شہر یار سے ماہ بانو کا پتا حاصل کر کے اسے اپنے قبضے میں لانے کے بعد شہر یار کی بے بسی کا تماشا دیکھ سکے گا۔ اسی پر فریب خواب کو آنکھوں میں سجائے وہ چینگ کے مراحل سے گزرتا ہوا چھانچ میں بیٹھ گیا۔ اس کے لیے برٹس کلاس میں سیٹ ریزرو تھی۔ وہاں مسافروں کے استقبال کے لیے موجود انٹر ہوٹس نے ہونٹوں پر دل فریب مسکراہٹ سجاتے ہوئے اس کی سیٹ تک راہنمائی کی۔ انٹر ہوٹس کی یہ دل فریب مسکراہٹ سر اسرار کو باری نوعیت کی تھی جس سے وہ اپنے پیشہ ورانہ فرائض کے مطابق ہر ایک مسافر کو لازمی سمجھ لیں چودھری جیسے خود پسند بندے نے اس مسکراہٹ کو خاص اپنے لیے تصور کیا اور اس کی میٹھ پرست فطرت خوش ہو گئی کہ طویل سفر کے دوران ذرا تھکنی اور مومج مستی رہے گی۔ دوران سفر انٹر ہوٹس سے دل پٹوری کے خیال نے اسے اپنے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھنے گورے کی موجودگی پر بھی کبیدہ خاطر نہیں ہونے دیا۔ ویسے وہ عموماً گوروں کی ہم سفری کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اپنے کام سے کام رکھنے والے اور مختصر گفتگو کرنے والے گوروں کی سنگت اسے بور کر دیتی تھی۔ ایسے لوگ زیادہ بات چیت کا موقع ہی نہیں دیتے تھے تو انہیں اپنے مریعوں اور گامبر کے قصے سنا کر مرعوب کیا خاک کیا جاسکتا؟ جہاز کے ٹیک آف کرنے تک وہ گورے کی طرف سے رخ موڑے چپ چاپ بیٹھا رہا۔ الیت سیٹ جلیٹ باندھنے کے لیے آنے والی انٹر ہوٹس کی قربت کے لحاظ طویل کرنے کے لیے اسے اپنے ساتھ خوب الجھائے رکھا۔ انٹر ہوٹس اپنے ہونٹوں پر پیشہ ورانہ مسکراہٹ

سجائے اسے برداشت کرتی رہی لیکن اس کی آنکھوں سے جھلکتی نگاہیں واضح تھیں۔ چہاڑ کے لب آف کرنے کے بعد جب پرواز ہموار ہوئی اور پائلٹ کی طرف سے مسافروں کو سیٹ بیلٹ کھول لینے کا عندیہ دیا گیا تو چودھری نے خود سے یہ معمولی کام انجام دینے کے بجائے اڑہوسکی کی خدمات حاصل کرنا ضروری سمجھا اور سیٹ کے ساتھ لگے بٹن کو دبائے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”لائیں جناب! میں آپ کی سیٹ بیلٹ کھول دیتا ہوں۔“ چودھری کے بٹن دبانے سے پہلے اس کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا گورا شاہنگی سے رواں اردو میں بولا۔ ”گورے کی زبان سے اتنی صاف اردو سن کر چودھری احتیاجاً ہوا کہ بٹن دبانا بھول گیا۔ اس کی حیرانی کی پروا نہ کرتے ہوئے گورے نے اس کی طرف جھک کر اس کی سیٹ بیلٹ کھول دی۔

”آپ تو بڑی صاف اردو بول لیتے ہیں۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ آپ اردو جانتے ہوں گے۔ شاید آپ نے پاکستان میں طویل عرصہ گزارا ہے۔“ گورے کے اردو بولنے پر حیرت کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ چودھری نے اندازہ بھی لگایا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے جناب! میں یہاں بے شک کئی بار آچکا ہوں لیکن اردو میں نے یہاں سے نہیں بلکہ امریکا میں ہی رہ کر سیکھی ہے۔ اصل میں مجھے زبانیں سمجھنے کا بہت شوق ہے۔ میں اردو کے علاوہ اور بھی کئی زبانیں روانی سے بول سکتا ہوں۔ آپ چاہیں تو مجھ سے پنجابی میں بات کر سکتے ہیں۔“ گورے نے اسے مزید حیران کیا۔

”یہ سن کر مینو ڈی خوشی ہوئی ہے۔ اردو اور پنجابی بولنے والا امریکی مینو پہلی بار ملا ہے۔ ایسا کرو، پہلے تہاڑا تعارف کروا دو تاکہ آگے چلتی مکمل شل رہے۔“ چودھری نے چرخ جوش انداز میں فرمائش کی۔

”میرا نام ڈیوڈ ہے۔ بیٹے کے اعتبار سے میں انجینئر ہوں لیکن سیاحت خصوصاً کلائمٹنگ کا بڑا شوق ہے۔ یہ شوق مجھے بار بار مشرقی ممالک کا رخ کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ آپ اپنے بارے میں بتائیے کہ آپ کیا فعل فرماتے ہیں؟ ویسے آپ کی شخصیت کو دیکھتے ہوئے میں نے آپ کے بارے میں جو اندازہ قائم کیا ہے، اس کے مطابق تو آپ کوئی فیوڈل لارڈ ہی ہو سکتے ہیں۔“

”آپ کا اندازہ بالکل ٹھیک ہے جی۔ میرا نام چودھری افتخار عالم شاہ ہے۔ میں ہیرا آبادی ایک گاؤں کا

مالک ہوں۔ پرکھوں سے ہم وہاں عکرائی کرتے آرہے ہیں۔ پڑھنے لکھنے اور سیر و تفریح کے لیے ادھر ادھر آتے جاتے رہتے ہیں لیکن پھر اپنے اصل ٹھکانے کی طرف پلٹ جاتے ہیں۔ انہی میں اپنے پتر سے ملنے نیویارک جا رہا ہوں۔ تھوڑے دن اس کے ساتھ رہ کر واپس آ جاؤں گا۔ میرا پتر ذرا دھری ٹاپ ہے۔ پرکھوں کی طرح اسے عکرائی کا ذرا شوق نہیں ہے۔ امریکا میں رہ کر پڑھا لکھا اور اب وہیں ملازمت کر کے خوش ہے۔ پتا نہیں آپ کے ملک میں ایسی کیا گل ہے کہ ہمارے جوانوں پر جادو ہو جاتا ہے۔ واپس آنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے۔“ چودھری نے شکوہ کیا۔

”ارے نہیں چودھری صاحب! ہمارے ہاں کچھ نہیں رکھا ہوا، جو کچھ ہے مصنوعی ہے۔ اصل حسن اور جادوگری تو آپ کے ملک میں موجود ہے۔ میں تو آپ کے شمالی علاقہ جات کے حسن کا اتنا عاشق ہوں کہ موقع ملنے ہی یہاں کا رخ کرتا ہوں۔ کہنے والے آپ کے انکار پر بت کو دیا میر یعنی پریوں کی سرزمین کہتے ہیں اور سچ کہوں تو مجھے بھی ان برف پوش پہاڑیوں پر پریاں دھس کرنی ہوتی نظر آتی ہیں۔ آپ پاکستانی تو اس طرف کا رخ ہی نہیں کرتے ورنہ ایک بار ان برف پوش پہاڑوں کی سیر کے لیے چلے جائیں تو ہمارے امریکا کو بھول ہی جائیں۔“ ڈیوڈ کے انداز سے ظاہر تھا کہ واقعی وہ پاکستان کے شمالی علاقہ جات کی خوب صورتی سے بہت متاثر ہے۔

”آپ کہتے ہیں تو ماننا ہی پڑے گا مسٹر ڈیوڈ! ہم پاکستانیوں کو تو ویسے بھی امریکا کی ہر گل مانتے کی عادت ہے۔“ چودھری اپنی بات کہہ کر خود ہی بلند آواز میں ہنسا۔

”بائی باتوں کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا چودھری صاحب لیکن جو بات میں آپ سے کہہ رہا ہوں، اس پر تو آپ آنکھیں بند کر کے یقین کر لیں۔ کیونکہ یہ بات تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہم امریکی بھی کسی جگہ اپنا سرمایہ خرچ نہیں کرتے۔ میں اتنا خرچ کر کے ان علاقوں کی سیر کرنے آتا ہوں تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ کچھ خاص ہے ان علاقوں میں ورنہ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے اپنی رقم ضائع کرنے کی؟“ ڈیوڈ نے ایسی دلیل دی کہ چودھری کو قائل ہو پڑا۔

”مجل تو تہاڑی ٹھیک ہے۔ اب تو میرا بھی دل چاہ رہا ہے کہ میں ادھر کی سیر کے لیے جاؤں۔“

”تو ایسا کریں نا چودھری صاحب میرے ساتھ پروگرام رکھ لیں۔ آپ مجھے اپنا کلائمٹنگ نمبر دے دیں۔ میں ٹیکسٹ نام پاکستان آؤں گا تو آپ کو افطارم کروں گا۔ پھر

آپ میری ٹیم کے ساتھ چلیے گا۔ ویسے ہم لوگ تو کافی اوپر تک جاتے ہیں، آپ کی جہاں تک ہمت ہو ہمارا ساتھ دیجیے گا۔ اصل میں کلائمٹنگ میں نفس کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ آپ کے ہاں لوگ اپنی نفس کا خیال نہیں رکھتے اس لیے زیادہ بلندی تک نہیں جاتے ورنہ تو ہمارے پاس ان لوگوں کی بھی مثالیں ہیں جو ستر اسی سال کی عمر میں گئے تو کے میں کیپ تک پہنچ گئے۔“ ڈیوڈ کے آخری الفاظ نے چودھری کی انا کوڑک بچپائی لیکن بہر حال، سچ چچ تھا اس لیے وہ چاہنے کے باوجود ڈیوڈ کے سامنے کوئی بڑک نہیں مار سکا۔ اگر وہ ابھی اپنی جوان مردی کا دعویٰ کر بیٹھتا تو آنے والے وقت میں اسے ثابت نہیں کر سکتا تھا، چنانچہ اس موضوع پر خاموشی کو ہی قیمت جانا اور ڈیوڈ کو اپنا کلائمٹنگ نمبر کھوانے لگا۔

”تھیں تو پھر دن ہو گیا کہ اب جب بھی میرا دوبارہ پاکستان آتا ہوا، ہم ساتھ مل کر ایسی ڈیفینس پلٹیں گے۔ ابھی میں ایسا کرتا ہوں کہ آپ کو اپنے حالیہ وزٹ کی تصویریں دکھاتا ہوں۔ بڑے شان دار سیزشٹ کیے ہیں میں نے۔“ چودھری کا کلائمٹنگ نمبر فوٹ کرنے کے بعد ڈیوڈ اپنا ریفل کیس کھولتے ہوئے بولا اور اس میں سے ایک بڑا سا لافظ نکالا۔

”ایسے ڈیجیٹل کیمرے سے تصویریں بنائی تھیں میں نے۔ زیادہ تر تو ابھی کیمرے میں ہی محفوظ ہیں۔ بس کچھ خاص خاص تصویریں جو مجھے زیادہ ہی پسند آئی تھیں، انہیں میں نے یہیں سے ڈیوڈ پر کروا لیا۔ آپ تصویریں دیکھیں گے تو خود میرے حسن نظر کے قائل ہو جائیں گے۔“ اس نے لافظ چودھری کے ہاتھ میں تھمایا۔ لافظ کے وزن سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس میں ابھی خاص تصویریں موجود ہیں۔ چودھری نے لافظ کھولا تو اس میں سے ایک البم برآمد ہوا۔ وہ پراشتیاق انداز میں البم کھول کر اس میں گلی تصویروں کا جائزہ

لینے لگا۔ ڈیوڈ کا دعویٰ غلط نہیں تھا۔ واقعی اس نے بڑی خوب صورتی سے قدرتی مناظر کو کیمرے کی آنکھ سے قید کیا تھا۔ چودھری بے ساختہ ہی تعریفیں کرتا ہوا ایک ایک تصویر دیکھتا آگے بڑھتا رہا لیکن پھر اچانک ایک مقام پر اس کی بونی بند ہوئی اور وہ حیرت سے گنگ تصویر میں نظر آنے والے چہرے کو دیکھنے لگا۔ بھاری گرم لہارے میں کسی پہاڑی دو چیزہ کے روپ میں موجود وہ لڑکی ماہ بانو ہی ہے، اسے شناخت کر لینے کے باوجود اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کی انا کے لیے امتحان بن کر اس کی نیندیں چھین لینے والی ماہ بانو پھر یہ پر مسکراہٹ سجائے خوشی کی محفلوں میں شرکت کرنی پھر رہی تھی۔ اس بات کو سوچ کر اس کا تن بدن سلگ اٹھا۔

”خوب صورت لڑکی ہے نا چودھری صاحب؟ مجھے بڑی اچھی لگی تھی اس لیے میں نے اس کے گلی پوز لے لیے تھے۔ آپ آگے دیکھیں، آگے اور بھی پوز ہیں اس لڑکی کے۔“ چودھری کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے ڈیوڈ نے اس سے کہا اور پھر خود ہی ہاتھ بڑھا کر نئی تصویر سامنے کر دی۔

”یہ لڑکی آپ کو کہاں ملی تھی مسٹر ڈیوڈ؟“ تصویر پر نظر جمائے جمائے چودھری نے سرسراہٹ بولی آواز میں ڈیوڈ سے سوال کیا۔

”اسے میں نے ایک پہاڑی گاؤں میں دیکھا تھا۔ میں اپنی ٹیم کے ساتھ اس گاؤں کی یکہ پنگ سائڈ میں موجود تھا کہ ہمیں اطلاع ملی، گاؤں میں شادی کی تقریب ہو رہی ہے۔ ہم لوگ مقامی شادی دیکھنے کے شوق میں بغیر دعوت کے وہاں جا پہنچے۔ بڑے اچھے مہمان نواز لوگ تھے گاؤں والے۔ انہوں نے ہمارے اس طرح پہنچنے کا برا نہیں مانا بلکہ تصویریں بنانے کی بھی اجازت دے دی۔ تصویریں بناتے ہوئے میری اس لڑکی پر نظر پڑی تو میں بے ساختہ ہی اس کی کئی تصویریں لے بیٹھا۔“ ڈیوڈ نے تفصیل سے اس کے سوال کا جواب دیا۔

”اس گاؤں کا کیا نام تھا مسٹر ڈیوڈ؟“ ڈیوڈ کی تفصیلات میں سب کچھ ہونے کے باوجود بنیادی جواب نہیں تھا اس لیے اس بار چودھری نے ذرا زیادہ وضاحت سے اپنا سوال دہرایا۔

”خیریت ہے چودھری صاحب! مجھے لگتا ہے کہ آپ اس لڑکی کو جانتے ہیں اور اس کی تصویر دیکھ کر کچھ پریشان ہو گئے ہیں؟“ ڈیوڈ کا انداز اگرچہ سرسری تھا لیکن وہ بہت گہری نظروں سے چودھری کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں واقعی اس لڑکی کو جانتا ہوں۔ اس کا نام ماہ بانو ہے اور یہ میرے ایک مزاحم کی بیٹی ہے۔ یہ لڑکی کافی دنوں سے اپنے گھر سے غائب ہے اور اس کے ماں باپ اس کے لیے بے حد پریشان ہیں۔ میں نے اپنے طور پر اسے تلاش کروانے کی کوشش کی تھی لیکن میرے لوگ کامیاب نہ ہو سکے۔ کسی کو گمان ہی نہیں تھا کہ لڑکی اتنی دور ایک پہاڑی گاؤں میں پہنچی ہوئی ہوگی۔“ چودھری نے ایک ہمدرد مکران کا سا لہجہ اختیار کرتے ہوئے ڈیوڈ کو تفصیلات سے آگاہ کیا۔

”اوہ، آئی سی! خیر، آپ فکر نہ کریں بلکہ یہ سمجھیں کہ آپ کی تلاش اب ختم ہوئی۔ میرے راپٹے ہیں وہاں۔ ہم

لینڈ کر جائیں پھر میں پاکستان میں موجود اپنے دوستوں سے رابطہ کر کے اس لڑکی کو اس کی موجودہ قیام گاہ سے بازیافت کر والوں گا۔ اگر انہو وغیرہ کا معاملہ ہے تو میں آپ کی پونیس کے ذریعے بھی یہ کام لے سکتا ہوں۔" ڈیوڈ کے لہجے کا اصرار بتا رہا تھا کہ وہ غیر ملکی ہونے کے باوجود پاکستان میں کافی مضبوط رابطہ رکھتا ہے۔

"نہی اپنی پونیس کے ہاتھ میں معاملہ نہیں دیتا ہے۔ وہ لوگ خواہ وہ کتنا ہی بنا دیتے ہیں۔ مجھے لڑکی بالکل رازداری سے اپنے قبضے میں چاہیے۔" چودھری نے فوراً ہی ڈیوڈ کی تجویز سے انکار کرتے ہوئے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

"جیسا آپ چاہیں، ویسا ہی ہوگا چودھری صاحب! آخر آپ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے تو دوستی بھائی بھی ہوگی۔ میرے خیال میں ہم منزل پر پہنچنے پہلے تو پھر اس موضوع پر عمل کر بات کریں گے۔ آپ مجھے تفصیل سے بتائیے کہ آپ کا پرستاری لڑکی میں کیا انٹرسٹ ہے... بلکہ ایسا ہے کہ میں آپ کو اپنے ہاں کھانے پر انوائٹ کروں گا پھر ہم مکمل کر اور اعتماد کی تفصیلات بات چیت کریں گے۔ آپ البتہ اتنا اطمینان رکھیں کہ آپ کی ماہ بانو اب آپ کے ہاتھ سے نکلنے والی نہیں ہے۔ وہ ہماری نظر میں ہے بلکہ آپ ایک طرح سے سبکی جھینس کہ وہ ہمارے پاس ہے۔ آپ جب چاہیں گے، وہ آپ کو مل جائے گی۔" ڈیوڈ کے آخری جملے بڑے متنی خیر تھے۔ ان جملوں سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ماہ بانو کو اچھی طرح جانتا ہے اور چودھری کی اس کے لیے بے تابی سے بھی واقف ہے۔ یعنی اب تک جو کچھ چودھری کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا، وہ جس ایک ڈراما تھا۔ اس ڈرامے کا مقصد سمجھنے کے لیے چودھری، ڈیوڈ کے چہرے کا ٹھٹھانے والی نظروں سے جائزہ لینے لگا۔ وہاں صاف لکھا تھا کہ اس اندازہ غلط نہیں ہے۔

"کون ہو تم؟ اور ماہ بانو کے بدلے میں مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" اس نے سرد سے لہجے میں ڈیوڈ سے دریافت کیا۔ "ان سوالوں کے جواب کے لیے آپ کو انتظار کرنا ہو گا۔" ڈیوڈ نے اس سے بھی زیادہ سرد لہجے میں جواب دیا اور بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موندتا ہوا بولا۔ "ایسکوپ زئی! میں بہت تھک گیا ہوں، اب آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

اس کے لہجے اور چہرے کے تاثرات میں وہی رعونت تھی جو عسکرانی کرنے والوں کا خاصہ ہوتی ہے۔ چودھری اندر ہی اندر چپ و تاب کھاتا خود بھی اس کی طرف سے رخ موز

گیا۔ ڈیوڈ اس کی جاگہ پر کام کرنے والا کوئی بے بس مزارع نہیں تھا جس سے وہ کسی قسم کی زبردستی کر سکتا۔ وہ زیادہ سے زیادہ اپنا موڈ خراب کر سکتا تھا، سو وہ تو پہلے ہی خراب ہو چکا تھا۔ مزاج کی اس خرابی نے اسے طویل سفر میں اتر ہو سٹوں سے دل پشوری کا خیال بھی بھلا دیا تھا۔

☆☆☆☆

کشور بستر پر چیت لیتی کر کے کی چھت کو گھور رہی تھی۔ یہ کمراس کے لیے ایک ایسے نقش کے مانند تھا جہاں اسے ہر حال میں لوٹ کر واپس آنا ہی پڑتا تھا۔ اس بار بھی وہ لاہور میں آزادی کے چند دن گزارنے کے بعد واپس یہاں پہنچا دی گئی تھی۔ چودھرائن ناہید نے اس کی ایک نہ سنتے ہوئے اسے اپنے ساتھ جو لی آنے پر مجبور کر دیا تھا۔ جو لی کی یہ قید اس پر پہلے ہی اتنی بھاری نہیں تھی جتنی کہ اب... اب تو دل ہمیشہ اپنے دلدار کے ساتھ رہنے کی خواہش کرتا تھا لیکن اچانک جو لی واپسی نے سب کچھ درم درم کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ جو آنے والے دنوں میں ایک بار پھر آفتاب کی باہوں میں سا کر زندگی کی خوشیاں کشنے کرنے کے خواب دیکھ رہی تھی، یک دم ہی زمین پر آگری تھی۔ بالائے ستم یہ کہ آفتاب سے رابطے کا ذریعہ وہ موبائل بھی اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ موبائل کو اپنی ملکیت نہ ظاہر کرنے کے پلھ میں اسے موبائل مہتاب کے حوالے کرنا پڑا تھا۔ اس وقت اگر موبائل ہی اس کے پاس ہوتا تو وہ آفتاب سے بات کر کے ہی اپنی تسلی کر لیتی۔ جب آئے سانسے بیٹھ کر ملاقات کرنے کی سہیل نہ لنگے تو اس نشتے سے برقی آلے کا سہارا بھی قیمت لگتا ہے لیکن اس سے تو یہ سہارا بھی جدا ہو گیا تھا۔ لاہور سے پھر آباد واپس آتے وقت راستے پھر اور اب اپنے کمرے میں عالم استراحت میں بھی اس کا ذہن مسلسل اپنے موبائل میں ہی اٹکا رہا تھا۔ بار بار خیال آتا تھا کہ آفتاب میری کال کا انتظار کر رہے ہوں گے، انتظار سے تھک کر اب انہوں نے خود کال ملائی ہوگی... شاید مہتاب بھائی نے ان کی کال ریسیو کی ہو اور بتا دیا ہو کہ کشور کو اس کی ماں واپس جو لی لے گئی ہے۔ آفتاب یہ اطلاع سن کر بڑے مایوس ہوئے ہوں گے۔ آفتاب کی مایوسی کا سوچ کر وہ مزید افسردہ ہو گئی اور چھت پر سے نظر ہٹا کر اپنے ہاتھوں پر ڈالی۔ کچھ دنوں خوب کھل کر اپنا رنگ بھانے والی ہندی کے نقش و نگار بے حد مہم پڑ چکے تھے لیکن وہ جنا کے رنگ سے ہٹ کر بغاوت غریب کی لہجہ جیتنا بہت گہرے آفتاب کی محبت کے رنگوں کو وہاں دیکھ سکتی تھی۔ یہ رنگ تو اس کی پور پور میں بس گئے تھے۔ اس کے

مضبوط مردانہ ہاتھوں کی چوڑی گرفت، ہونٹوں کی نرمی و جدت، پُر شوق لہجوں کی شوخی... سب کچھ ہی تو بڑی آب و تاب سے اس کے وجود سے لپٹا ہوا تھا۔ آفتاب نے اتنی نزاکت سے اسے اپنی محبت کے رنگوں سے رنگا تھا کہ وہ اس کی مہارت کی قائل ہوئی تھی۔ اس کی بے رنگ تصویر آفتاب کی محبت کے رنگوں سے رنگ کر لیں گئی تھی کہ اب اس کا دل چاہتا تھا، وہ ہر روز نئے سرے سے ان رنگوں سے رنگی جائے... مگر یہاں اس نفس تک آفتاب کی رسائی ہی کہاں تھی؟ جو لی میں رہ کر وہ آفتاب سے ملنے کی خواہش کرتی تو اسے رات کی تیار کی میں چھپ کر اس انڈسٹریل ہوم تک جانا پڑتا جہاں پہلی بار اس نے آفتاب کو اپنے جسم و جاں سونے سے... جہاں وہ دونوں نکاح کے بندھن میں بندھے تھے اور آفتاب نے اپنے قلعہ پر سے ہوس کا ٹیک ہٹا کر محبت کا جھنڈا تان دیا تھا۔ آویزاں کر دیا تھا۔ انڈسٹریل ہوم تک راتوں کو چھپ کر ملاقات کے لیے جانا بہت خطرناک تھا۔ خطروں سے وہ اتنا نہیں ڈرتی تھی لیکن نکاح کے بعد اس نے خود اپنے آپ پر یہ پابندی عائد کر لی تھی کہ وہ اس جگہ آفتاب سے ملنے نہیں جائے گی۔ وہ اپنے کسے اس فیصلے پر قائم بھی رہتا تھا اتنی بھی لیکن فیصل اور مہتاب کے گھر اس کی اور آفتاب کی جو یادگار ملاقاتیں ہوئی تھیں، اس کے بعد آفتاب سے زیادہ دن کی دوری برداشت کرنا بھی ممکن نہیں لگ رہا تھا۔ لاہور سے روانہ ہونے سے لے کر اب تک وہ گھنٹوں اس مسئلے پر سوچتی رہی تھی۔ شاید بہت زیادہ سوچنے کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ذہنی دباؤ کا ہی نتیجہ تھا کہ اسے اپنا پورا جسم بری طرح تھکا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ عجیب سی کسل مندی اور سستی تھی کہ وہ بستر سے اٹھنے کی ہمت بھی نہیں کر پا رہی تھی۔ حالانکہ کئی بار فریڈ سے ملاقات کا خیال بھی دل میں آیا۔ حرمیں نصیب فریڈہ جو فنی معذور بہنوئی شاہ کی منکوحہ کی حیثیت سے جو لی کی اوپری منزل میں مقیم تھی اور جسے درحقیقت ساری دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک کر چودھری اپنی ہوس کا پینت بھرنے کے لیے جو لی لے کر آیا تھا... وہ فریڈہ سے مل کر اسے اپنے باپ کے اس ظلم کے خلاف لڑنے پر اکسانا چاہتی تھی لیکن جب اس نے فریڈہ سے ملاقات کے خیال سے اپنے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی تو اتنی بری طرح سر پھٹا کہ پھر وہ ہمت ہی نہیں کر سکی۔ طبیعت میں عجیب سا بھاری پن تھا۔ یہاں تک کہ ملازمرات کے کھانے کا پونہنے آئی تھی تو اس نے انکار کر دیا۔ ایک اور مصیبت یہ تھی کہ رانی اس کے ساتھ جو لی واپس نہیں آئی تھی۔ اسے وہی چودھرائن کی طرف سے حکم چھو گیا تھا کہ وہ لاہور والی کو لی میں ہی رک

کر جا کر وہ کے ساتھ کوئی کام کاج دیکھے۔ کشور نے اس حکم پر احتجاج کیا تھا لیکن اس کے احتجاج کو خاطر میں نہیں لایا گیا اور رانی کو لاہور میں ہی رکنا پڑا۔ رانی کے بغیر وہ خود کو بالکل بے دست و پا محسوس کر رہی تھی۔ وہ بھی جو اس کی آفتاب تک رسائی کو ممکن بناتی تھی۔ وہ نہیں تھی تو نہ تو یہ کام رسائی کا کوئی ذریعہ تھا، نہ ہی ملاقات کی کوئی تسلی نکالی جاسکتی تھی۔ جو لی کے سازشی ماحول میں رانی جیسی وفادار ملازمہ کے بغیر موجودہ صورت حال میں رہنا اسے عذاب ناک لگ رہا تھا۔ اتنا عذاب ناک کہ سوچ سوچ کر سر پھٹتا لگتا تھا۔ اس وقت بھی وہ اپنے پھرتے سر کو ٹیکے پر ادھر ادھر پھرتی خند کے مہربان ہونے کا انتظار کر رہی تھی کہ دروازے پر دستک کی آواز ابھری اور پھر رانی جیسی دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے اپنے ہاتھ میں بڑی سی فرے تمام رکھی تھی۔

"کھانا کھا لیں لی! اوڈی دیر ہو گئی ہے۔ رات میں خالی پیٹ سونا صحت کے لیے چنگا نہیں ہوتا۔" کشور کو اپنی طرف متوجہ کچھ کر وہاں چھین پھیلاتے ہوئے بولی۔ "تجھ سے کس نے کہا تھا کھانا لانے کو؟ چل جا یہاں۔" تجھے نہیں کھانا دانا۔" چچی سے پہلے ہی اس کی جانب چلتی گئی اور اس وقت تو ویسے ہی طبیعت بڑی عجیب ہو رہی تھی اس لیے بالکل بھی برداشت نہیں کر سکی اور چچی کو ڈپٹ کر رکھ دیا۔

"یہ میرے کہنے سے آئی ہے۔" چچی اس کے حکم پر واپس پلٹتی، اس کے بجائے کمرے میں وہی چودھرائن کی آواز گونجی۔ وہ شاید چچی کے پیچھے پیچھے ہی وہاں تک آئی تھی اور اب بالکل مین وقت پر دخل انداز ہو گئی تھی۔

"مجھے بالوم ہے رانی کے شہر میں رکنے کی وجہ سے تجھے پریشانی ہوگی اس لیے میں نے چچی کو حکم دیا تھا کہ جب تک رانی جو لی میں نہیں ہے، اسے تیرا خیال رکھنا ہوگا۔ چل اب اٹھ اور اٹھ کر کھانا کھا لے تاکہ اس وچاری کی ڈیوٹی بھی ختم ہو۔" چودھرائن کی طرف سے محبت کا یہ اظہار درحقیقت اس کی بے بسی سے لطف اندوز ہونے کے لیے کیا جا رہا تھا۔

"میرا خیال نہیں کر رہا ڈیوڈی! اس! وہ وہی چودھرائن کے احترام میں لینے سے اٹھ کر بیٹھ گئی لیکن کھانا کھانے پر پھر بھی آمادہ نہیں تھی۔

"جی نہیں کر رہا، جب بھی تھوڑا سا کھالے۔ تیری طبیعت پہلے ہی سچ نہیں، جھوکی رہ کر اور کمزور ہو جائے گی۔" چودھرائن اس دانتے کے حوالے سے اس کی طبیعت کو خراب قرار دے رہی تھی جب وہ چودھری کو فریڈہ کے ساتھ قابل

احساس ہاگا اور وہ سوچنے پر مجبور ہوگئی۔ سوچنے کے نتیجے میں جو خیال ذہن میں ابھرا اس نے اسے لرزا کر رکھ دیا۔ وہ جو نڈھال سی بیٹھی تھی، بیٹھنے کی سکت بھی کھو بیٹھی اور ہستر پر لڑھک سی گئی۔ زندگی سے اپنے حصے کی خوشیاں وصول ہوتے یہ خیال تو ذہن میں آتی نہیں۔ کاتھا کہ بھی ایسی کسی صورت حال کا بھی سامنا کرنا پڑے گا۔

”کیا گل ہے وڈی آیا! کیا ہوا ہے کشور؟“ وہ آنکھیں بند کیے خوف زدہ سی کھلی تھی کہ اسے اپنی ماں چودھرائن ناہید کی پریشان اور بوکھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”طبیعت تھیک نہیں ہے اس کی۔ الٹیوں پر الٹیوں کر رہی ہے۔ اب کیا ہوا ہے تو ڈاکٹر کی سی آکر بتائے گی۔“ ڈرائیور کو بھجوا دیا ہے میں نے ڈاکٹر کی کولانے کے لیے۔“ وڈی چودھرائن کے طنز بھرے لہجے پر اندر ہی اندر مزید سکتے ہوئے کشور نے آنکھوں کے درمیان ڈرا سی بھری بنا کر کمرے کا منظر دیکھنے کی کوشش کی۔ اس کی ماں کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں جبکہ وڈی چودھرائن الطہان سے ایک کرسی پر بیٹھی فرش صاف کرتی شادو کا جائزہ لے رہی تھی۔

”کیا ہوا ہے کشور! کیا الٹا سیدھا کھالیا تھا جو ایسے طبیعت خراب ہوگئی؟“ چودھرائن ناہید نے کشور کے قریب آکر اس کا شانہ ہلاتے ہوئے لرزائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ کشور اس کی بات کے جواب میں کچھ نہ کہہ سکی اور چپ چاپ پڑی رہی۔ خاموشی سے بوکھلے پریشان کن لمحات آخر کار کسی نہ کسی طرح آگے بڑھ ہی گئے اور ڈاکٹر ماریا جیو یا آچکی۔ آتے کے ساتھ اس نے پیشروانہ انداز میں کشور کا چیک اپ کیا اور اس سے اس کے کھانے پینے کے متعلق پھونے موئے سوالات کیے۔ چیک اپ سے فارغ ہونے کے بعد وہ مسکراتی ہوئی وڈی چودھرائن کی طرف چلی اور اطمینان بھرے لہجے میں بولی۔ ”پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے چودھرائن صاحبہ! ایسا کوئی تشویشناک مسئلہ نہیں ہے بلکہ آپ کے لیے ایک اچھی خبر یہ ہے کہ...“ اس ”مکہ“ کے آگے وہ جو بھی کہنے والی تھی، وہ جو جلی کے درو دیوار کو لرزاکر بھی رکھ سکتا تھا۔ آنے والے طوفان کی آغوش سختی چودھرائن ناہید کا دل چا پا کہ وہ ڈاکٹر ماریا جیو کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے کچھ بھی کہنے سے روک دے... جبکہ خود کشور کی حال تھا کہ طبیعت کی خرابی سے اس کا پیلا پڑ جانے والا چہرہ خوف کی زردی سے مل کر اور بھی پیلا ہو گیا تھا۔

اعتراض حالت میں دیکھ کر اپنے حواس کھو بیٹھی تھی اور عالم طیش میں چودھری کے مقابل کھڑی ہوگئی تھی۔ اس وقت چودھری نے خود کو بچانے کے لیے اسے ڈانٹنے پر تیار قرار دیتے ہوئے علاج کے بہانے لاہور بھجوا دیا تھا حالانکہ درحقیقت خود اس میں حوصلہ نہیں رہا تھا کہ اپنی چوری پکڑی جانے کے بعد جی کا سامنا کر سکے اور اس سے نظر ملا سکے۔

”تو کیا ابھی تک ٹرے پکڑ کر کھڑی ہے؟ یہاں رکھ لی کی کے سامنے۔“ اس بار چودھرائن نے بھی کوڈا مانتے ہوئے حکم دیا تو اس نے ٹرے کشور کے سامنے رکھ دی۔ کشور کو اندازہ ہو گیا کہ وڈی چودھرائن ایسے ملنے والی نہیں۔ چاہے اسے دوبارہ اس قید خانے میں بلا لینے کی خوشی میں اس کی بے بسی سے غصہ اٹھانے کے لیے ہی کبھی... وہ اس وقت اس کی بعد درخت کھڑی تھی تو وہ اس کے حکم سے سر تابی کی جرأت نہیں کر سکتی تھی، چنانچہ دل پر جبر کرتے ہوئے اس نے کھانے سے بھری ٹرے کی طرف ہاتھ بڑھایا اور پیٹ میں تھوڑا سا سامان نکال کر روٹی کا لقمہ منہ میں رکھا۔ لقمہ منہ میں رکھتے ہی اسے زور کی اگائی آئی۔ منہ پر ہاتھ رکھ کر وہ غسل خانے کی طرف دوڑی لیکن اس پر طرح سرچکرایا کہ خود کو سنبھال نہیں سکی۔ اگر بروقت چھٹی اسے سہارا نہ دیتی تو وہ فرش پر گر پڑتی۔ چھٹی کے سہارے وہ غر حالی اسے بستر تک پہنچی۔ منہ میں رکھا لقمہ تو پیلے پیلے پانی کے ساتھ تھیلے ہی نکل چکا تھا۔ بستر پر بیٹھنے کے بعد بھی اسے دوبارہ اگائی آئی، اس بار اس کے پیٹ سے صرف پانی نکلا۔

”ڈرائیور سے کہہ چھٹی کہ اسپتال سے ڈاکٹر کی کولے کر آئے۔ ڈاکٹر آ کر دیکھے تو بالوم ہو کہ کیا ہوا ہے کڑی کو؟“ کشور وہی الٹیوں کے بعد چلی پڑ گئی تھی اور اب بیڈ کی پشت سے ٹیک لگاتے نڈھال سی لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ اس کی حالت کا یہ خود جائزہ لیتی چودھرائن نے سر دے انداز میں چھٹی کو حکم دیا۔ وہ فوراً اس کے حکم کی تعمیل کے لیے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھی۔

”اور ہاں، اس کی ماں کو بھی خبر کر دینا جی کی طبیعت کی خرابی کے بارے میں۔ اس کو اپنی نیندیں پوری کرنے سے ہی فرصت نہیں ملتی، جی کی خبر کیا خاک رکھے گی۔“ یہ دوسرا حکم وڈی چودھرائن نے چھٹی کے کمرے سے باہر نکلتے نکلے جاری کیا تھا جسے سن کر چھٹی تو سر ہلاتی باہر کی طرف دوڑ گئی لیکن نڈھال سی کشور کے اندر عجیب سا احساس جاگا۔ وڈی چودھرائن کے کھیلے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس نے اسے ٹھکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ آخر کوئی حالت کے باوجود وہ اس کی بات پر غور کرنے لگی۔ یک دم ہی اس کے اندر ایک

حادثات و سانحات کی شکل... بیاہ کی تلاش میں سرگرداں
ماہ بانو کی داستان حیات کے واقعات اگلے مادہ چھپے

موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھی۔ اپنی ملازمہ خاص رہنے کی زبانی یہ سننے کے بعد کہ شور کے پاس ماس ہو سکتا ہے، وہ مسلسل خروج میں لگی ہوئی تھی کہ شور کو کی طرح رستے ہاتھوں پکڑ سکے۔ اس مقصد کے لیے اس نے جیتے کی بنیوں بھی اور شاہد کو شور کی گھرانی پر مامور کر رکھا تھا لیکن ابھی تک اسے کوئی کامیابی حاصل نہیں ہو سکی تھی۔ اس وقت امید بندھی تھی کہ شاید کچھ ایسا سامنے آ جائے جسے شور کی مشکوک سرگرمیوں کے ثبوت کے طور پر پیش کیا جا سکے لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹر ماری کو ڈپر لگنے کی تیاریوں میں مصروف پھوس کر دوائی تھکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں ہر طرح کا آرام تھا لیکن رشتوں کے درمیان وہ چند نہیں تھا جو انہیں ایسی پائیداری بخشتا کہ وہ آفتاب کی طرف بڑھنے والے اپنے قدموں کو روک پاتی۔ اس کی پیاسی روح کو سیراب کرنے والا جامعیت آفتاب کے پاس تھا چنانچہ وہ ہر غیب کے کوئی بھی پست و اعلیٰ کراس کی اور سفر کرنے پر خود کو مجبور تھا۔ آفتاب کی زندگی میں آمد کے بعد اس نے جانا تھا

گا۔ جو ملی کا قانون بغیر کسی پلک کے اس کے لیے سزائے موت تجویز کر دے گا۔ وہ زندگی جو ابھی کچھ عرصے سے ہی ابھی گنگے لگی تھی، اس سے محروم ہو جانا اب اسے منظور نہیں تھا۔۔۔ خصوصاً یہ جاننے کے بعد کہ وہ کائنات کے سب سے عظیم رہتے پر فخر فرماؤ گے والی ہے، اسے زندگی کی اور بھی شدت سے خواہش ہو گئی تھی۔

میں ہر طرح کا آرام تھا لیکن رشتوں کے درمیان وہ چند پنکھیں
تھا جو انہیں ایسی بے نیاداری بخلا کرتی کہ وہ آفتاب کی طرف بڑھنے
لے اپنے قدموں کو روک پاتی۔ اس کی پیاسی کی روح کو
یہ اب کرنے والا جانتا کہ آفتاب کی سب سے چمکنا چمکنا وہ در
خضر کے کوئی بھیشت ڈال کر اس کی اور سفر کرنے پر خود کو مجبور
باقی تھی۔ آفتاب کی زندگی میں آمد کے بعد اس نے جانا تھا
نہ کہ خوشی کا ہوتی ہے اور زندگی کب چار دیوڑی سے ہے۔ آفتاب
کی محبت اس کی ساری زندگی کی محرومیوں کا دوا مانگتی تھی۔
اس وقت بھی اس نے اپنی غلی ماس کی بے نیازی کو دیکھا تو یہ
سوچے بغیر نہیں رہ سکی کہ جو کچھ میں کر زوری ہوں، وہ قطعی
جائزہ اور مناسب ہے۔ وہ رشتے جنہیں میری پرورش نہیں، میں
ان کی خاطر سدا محرومیوں کو اپنی جان سے کیوں لگا کر رکھوں؟
”فانی الحال تو میں نے آپ کو مشکل سے پہچانیا ہے لیکن
آج سے کیا ہوگا یہ آپ نے سوچا ہے یا نہیں؟“ خیالات میں
غفلان و بچان کشمکش کے کانوں سے ڈاکٹر ماریا کی آواز گھرائی
تو وہ بری طرح چونکی اور ناگہی کے اعجاز میں اس کی طرف
دیکھنے لگی۔ ڈاکٹر ماریا کا جملہ کچھ سمجھ لیکن کافی معنی خیز تھا۔ وہ
جو زرا مطمئن ہو چکی تھی، ایک بار پھر پریشان ہو گئی۔

شاہنواز وہاں نہیں تھا لیکن ایسے ثبوت ضرور مل گئے جن سے اس کا پردہ ملی ملک سے تعلق ظاہر ہو گیا۔ اس موقع پر شاہنواز کی شخصیت پر سے پردہ اٹھنے کے علاوہ حیرانہ بادی مسجد کے مقرر امام غلام محمد کے بارے میں بھی پتا چلا تھا۔ قمر لودھی باقیات میں شامل غلام محمد نے بھی ایک امام اور معلم کی شخصیت کی دجھیاں بکھیر دی تھیں۔ ماہ نوک انکو بتا دیا تھا اس کی اندھی بیوی کا نشانہ بن کر اپنی جان سے چلا گیا تھا۔ غلام محمد اسے قتل کرنے کے بعد فرار ہو کر اللہ آباد میں شاہنواز کے بندے میں ہی چھپا تھا اور پھر شہر باد اور اس کی قلم کے چھاپا پارے سے قتل ہی وہاں سے بھی فرار ہو گیا تھا۔ اتنے بہت سارے ناخوش گوار واقعات کے ساتھ جڑے اللہ آباد کے نام والے گاؤں سے ایک اور بڑی خبر کے بارے میں سن کر شہر یار مضطرب ہوا تھا اور بے چینی سے عبداللہ ان کے اپنے دفتر میں آنے کا انتظار کرنے لگا۔ عبداللہ ان کو ہاں پہنچنے میں ایک منٹ سے بھی قلیل وقت ہی لگا ہو لیکن اس قلیل وقت میں بھی اس کی قہراری دیدنی تھی۔

”ابن عبداللہ ان ابولو کیا مسئلہ ہے؟ کیا خبر آئی ہے اللہ آباد سے؟“ عبداللہ ان اندر آیا تو اس نے اس کے چہرے کے گھبرائے اثرات کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ عبداللہ ان اچھا خاصا سیاحت کشنر و لہڑی تھا لیکن اس وقت اس کے چہرے سے جو کیفیت بھگ کر رہی تھی، اسے دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ کوئی بہت ہی اندوہناک واقعہ پیش آیا ہے۔

”خبر بہت افسوسناک ہے سر! میں تو سن کر کاپ اٹھا ہوں کہ میں گئے مال باب بھی اتنے بے رحم ہو سکتے ہیں۔ ابھی اطلاع ملی ہے کہ اللہ آباد میں رہنے والے ایک جوڑے نے اپنے بچوں سے اپنے دو بچوں کو ہلاک کر کے گھر میں ہی دفن کر رکھا تھا۔ رات وہ اپنے تیسرے بچے کو بھی ذبح کرنے جا رہے تھے کہ پڑوسیوں کو غم ہو گیا اور انہوں نے دھن اندازی کر کے انہیں اس مذموم حرکت سے روکا۔ اب وہ دونوں میاں بیوی تھے جن میں اور ان سے اس حرکت کے بارے میں پتا چھ گھڑ گیا جا رہی ہے۔“ عبداللہ ان کی دی ہوئی اطلاع واقعی گزراؤ خیر تھی۔ مال باب جیسے عظیم رشتے کا یہ بھانجہ روپ بے حد دل دلا دینے والا تھا۔ اس خبر کو سن کر کوئی بھی صاحب دل شخص رنج محسوس نہ کرتا، یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ والدین جو اپنی اولاد کی پیاراٹکی سے بھی پہلے سے اس کے متعلق سوچنا خواب دیکھتا اور مستقبل کی منصوبہ بندی کرتا شروع کر دیتے ہیں، وہی اپنی اولاد کو اپنے ہاتھوں سے ہلاک کر دیں، یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ انسان کوئی جانور بھی پالے تو

اس سے محبت ہو جاتی ہے اور اسے کسی ضرورت کے تحت خود سے جدا کرتے ہوئے دکھی ہو جاتا ہے تو پھر اپنے بچوں کو جن کی اس نے قدم قدم پر بھلائی کی ہوتی ہے... زمانے کے سرد و گرم سہہ کر انہیں برہمتی سے جانے کی کوشش کی ہوتی ہے، انہیں اس بے دردی سے کیسے ہلاک کیا جا سکتا ہے؟

”اس جوڑے کے پڑوسیوں کو کیسے علم ہوا کہ وہ لوگ اپنے تیسرے بچے کو ہلاک کرنے جا رہے ہیں؟“ دکھ کے شدید احساس کے تحت شہر یار نے واسطے کے بارے میں مزید تفصیلات جاننے کے لیے سوال کیا۔

”پڑوسی بچے کی ماں کے بلند آواز میں رونے پر جاگے تھے۔ آدھی رات کے وقت انہوں نے اپنے چاکہ عورت کے زور زور سے چین کرنے کی آوازیں سنیں تو وہ خینہ سے جاگ کر اس کے گھر کی طرف بھاگے اور گھر کا دروازہ کھانچا لیکن دروازہ بند نہیں کھولا گیا۔ البتہ اندر سے ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے عورت کا شوہر اس کا منہ دبا کر اسے پیٹ رہا ہو۔ پڑوسیوں کو تشویش ہوئی اور ایک لڑکے نے دیوار پھٹا کر اندر سے دروازہ کی کنڈی کھول دی۔ لوگ گھر کے اندر داخل ہوئے تو انہوں نے وہاں عجیب منظر دیکھا۔ گھر کے صحن میں ایک تازہ قبر کھدی ہوئی تھی اور قبر کے قریب تھوڑے ریستوں سے بندھا ہوا تھا اس کے منہ میں کچھ بھی نہیں تھا۔ ہاتھوں کے آواز کرنے لگا جبکہ باقی اندر کی طرف جھپکے جہاں دونوں میاں بیوی موجود تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ شوہر ایک ہاتھ میں تیز دھار چھری اور دوسرے میں بیوی کے بال جھڑے کھڑا تھا۔ اس نے عورت کو اس حد تک خوف زدہ کر دیا تھا کہ وہ منہ سے کوئی آواز بھی نہیں نکال پاری تھی۔ پڑوسیوں نے بڑی مشکل سے مرد کو تھام لیا پھر اس کی پائوں کی عورتوں نے لڑ کر عورت کو منہ کالا۔ بڑی دیر بعد انہیں جاگڑہ اس لائق ہوئی کہ لوگوں کو بتا سکے کہ اس کے بچے کے ساتھ کیا ہونے والا تھا اور پہلے بھی دو بچوں کے ساتھ کیا ہو چکا تھا۔“

”بوری سینہ... یہ تو واقعی بے حد اہلناک صورت حال ہے جس کی ایسی طعنے تفتیش ہونی چاہیے۔ ویسے مجھے حیرت ہے کہ پہلے دو بچوں کی ہلاکت کا پڑوسیوں کو کیوں علم نہیں ہو سکا؟ گاؤں دیہات میں تو لوگ ایک دوسرے سے اتنے غافل نہیں رہتے کہ انہیں ایک دوسرے کے حالات کا علم نہ ہو سکے۔ کم از کم لوگوں کو پہلے دو بچوں کے غیاب پر تو ضرور ہچکچاہے تھا۔“ شہر یار نے ایک اہم نکتہ اٹھایا۔

”اب تک جو صورت حال سامنے آئی ہے سر! اس کے

مطابق مجرم بہت چالاک اور منصوبہ ساز آدمی ثابت ہوا ہے۔ اس نے سارا کام پوری منصوبہ بندی کے ساتھ کیا۔ پہلے بچے کو ہلاک کرنے کے بعد اس نے ارد گرد مشہور کر دیا تھا کہ وہ بچے کو اس کی خند پر گہرا نالہ میں اس کی خالہ کے گھر رہنے کے لیے چھوڑ آیا ہے۔ دوسرے بچے کے بارے میں بھی اس نے یہی بہانہ کیا کہ بڑے بچے کا دل خالہ کے گھر بہت زیادہ لگ گیا ہے اور وہ اپنی بیٹی آنا چاہتا دیکھ دوسرا بھی وہاں جانا چاہتا تھا اس لیے میں اسے بھی وہاں چھوڑ آیا ہوں۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی مشہور کر دیا کہ بچے کی خالہ نے خواہش ظاہر کی ہے کہ بچوں کو مستقبل اسی کے پاس چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ انہیں اسکول میں داخل کر کر ان کی تعلیم کا معقول بندوبست کر دے۔ مجرم اپنے ارد گرد والوں پر یہی ظاہر کرتا رہا کہ وہ بچوں کے اچھے مستقبل کے لیے ان کی خالہ کی یہ پیشکش قبول کرنے کا راز دروہکتا ہے۔ یعنی اس نے مستقبل کے لیے پوری پیش بندی کر لی تھی کہ اس پاس والے طویل عرصے تک اس پر شک نہ کر سکیں۔“

”اوبائی گاؤ! یہ تو بالکل ناقابل یقین صورت حال ہے۔ مجھے نہیں آتا کہ آخر ایک باب اس حد تک اپنی اولاد کا دشمن کیوں بن گیا۔ کہیں وہ شخص نفسیاتی مریض تو نہیں ہے؟“

”میری تفصیلات سن کر شہر یار نے خیال آرائی کی۔

”اس بارے میں ابھی حتمی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے سر! اس شخص نے اس پورے واسطے کے پس منظر میں موجود اصل وجہ کے مسئلے میں ابھی تک زبان نہیں کھولی ہے۔ پڑوسیوں وغیرہ سے اس کے بارے میں جو کچھ معلوم ہوا ہے، اس کے مطابق وہ ایک بے حد جذباتی اور جوشیلا آدمی ہے۔ صوم و صلوٰۃ کی پابندی کرتے ہوئے تو اسے اتنا نہیں دیکھا گیا لیکن دیگر معاملات میں اس کا جوش و خروش دیدنی ہوتا تھا۔ غرض میں شرکت کرنا، خاص مواقع پر گاؤں کو جانا، وقت فوقتہ کسی نہ کسی بزرگ کی قبر پر حاضری دینا اور کبھی بھی مرشد یا ولی کی شان میں معمولی سے بھی گستاخانہ کلمات سن کر کہنے والے کو چڑھنا اور گھر دینے پر جس جانا اس کے معمولات میں شامل تھا۔ کسی بھی شخص کی کسی گرامت کا معمولی شہرہ ہو جانے پر وہ اس سے گہری عقیدت پیدا کر لیتا تھا۔ گاؤں والوں کے نزدیک فیاضی طور پر وہ ایک شریف آدمی ہے جس کی جد سے بڑھ کر مذہبی حساسیت کے علاوہ اس میں کوئی خامی نہیں تھی اور بزرگ حال کی اس حساسیت کو بھی لوگ بڑی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔“ عبداللہ ان کی گفتگو سے ظاہر تھا کہ وہ شہر یار کو اطلاع دینے سے قبل خود ذاتی طور پر واسطے کی تمام تفصیلات

موصول کر چکا ہے۔ وہ ایک تجربہ کار شخص تھا جسے اندازہ تھا کہ اس کا افسر اس سے کسی واسطے کے کن کن پہلوؤں سے متعلق سوال جواب کر سکتا ہے اس لیے ہر معاملے میں اپنی معلومات تک حد تک مکمل رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔

”ان دونوں میاں بیوی کو کس قاتل میں رکھا گیا ہے؟“ شہر یار نے سوال کیا۔

”وہ لوگ یہیں نور کوٹ میں موجود ہیں۔ مرد قاتل میں سے جبکہ عورت کی حالت کافی خراب تھی اس لیے اسے اسپتال منتقل کر دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر نے اسے سکون آور ادویات دی ہیں تاکہ وہ ذہنی طور پر سنبھل سکے۔ قتل جانے والے بچے کو بھی پولیس نے اپنی قوتیں میں لے لیا ہے۔“ عبداللہ ان نے مستعدی سے جواب دیا۔

”میں ان دونوں میاں بیوی سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں تاکہ واسطے کا اصل محرک جان سکوں۔ یہ کوئی معمولی حادثہ نہیں ہے۔ ہمیں اس کی گہرائی میں جانا ہو گا تاکہ آئندہ کے لیے سبب پا جائے۔“ وہ اس وقت بے انتہا سنجیدہ تھا اور پوری سنجیدگی سے اس واسطے کی تحقیقات کروانا چاہتا تھا۔ اس نوعیت کے کچھ واقعات پہلے بھی اخبارات کے ذریعے اس کے علم میں آتے رہے تھے جن پر افسوس کرنے کے علاوہ وہ عملی طور پر کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ان واقعات کا متعلق ان علاقوں سے تھا جو اس کے دائرہ اختیار میں نہیں آتے تھے لیکن اللہ آباد تو اس کے زیر قبضہ تھا، چنانچہ وہاں پیش آنے والے اس افسوسناک واسطے کی مکمل تحقیق وہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔

”آپ جب جا چیں چل سکتے ہیں سر! میں اسپتال اور قاتل دونوں جگہ ملاقات کا انتظام کروا دوں گا۔ اس وقت تک ویسے بھی میڈیا والے ابھی متحرک ہو چکے ہوں گے۔ جائے حادثہ پر ان کا پہنچنا لازمی ہے۔ وہاں بھی اب تک کھدائی وغیرہ کر کے پہلے ہلاک کیے جانے والے دونوں بچوں کی لاشیں دریافت کر لی گئی ہوں گی۔ میڈیا کو تو اپنے مطلب کی بہت سی خبریں مل چکی ہیں گی وہاں سے۔“

”پہلے جن دو بچوں کو ہلاک کیا گیا تھا، ان کی قبریں کہاں بنائی گئیں ان میاں بیوی نے؟“ عبداللہ ان کا جواب سن کر شہر یار کو خیال آیا تو اس نے ہنسی چھڑا۔

”دونوں بچوں کی قبریں بھی گھر کے آگن میں ہی بنائی گئی تھیں قبر قبریں بناتے ہوئے یہ احتیاط کی گئی تھی کہ انہیں لیول میں رکھا گیا اور پھر ان پر بھولوں اور سبز یوں کے پودے لگا کر انہیں کیاری کی گئی تھیں دس دی گئی۔ اسی لیے تو ارد گرد والوں کو شبہ نہیں ہو سکا کہ گھر کے آگن میں دو مذموم

بچوں کی قبریں موجود ہیں۔

”یہ سب کرنے کے لیے تو بہت زیادہ منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ جو کچھ ہوا وہ اتفاقاً یا اچانک ہوا۔ سب کچھ یہی پلان تھا اور اب یہی معلوم کرنا ہے کہ ایک باپ نے ایسا منصوبہ کیوں کر تیار کیا۔ میرے خیال میں ہم میڈیٹل اسپتال چلے ہیں۔ عورت نے تیسرے بچے کو ہلاک کرنے کی کوشش کے وقت جس طرح کاری ایکشن ظاہر کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس مرحلے پر آ کر ٹوٹ گئی تھی اور اگر ہم کوشش کریں تو اس سے پورا جی اٹھوا سکتے ہیں۔“

شہریار نے خیال ظاہر کیا جس کی عبداللہان نے تائید کی۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ہمیں واقعی اس عورت سے ملاقات کر کے مکمل صورت حال جاننے کی کوشش کرنی چاہیے۔“

”اوکے۔“ تو تم ذاتکات کر لو۔ آدھے گھنٹے بعد ہم اسپتال چلیں گے۔ اور ہاں، آرڈر کر دو کہ عورت سے میڈیا والوں کو دور رکھا جائے۔ میڈیا کے لوگوں کی بیخار سے وہ گھبرا کر ہرک مچا سکتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ بہت زری اور احتیاط سے اس معاملے کو ہینڈل کر کے مکمل صورت حال معلوم کی جائے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں ابھی آپ کے آرڈر پر چپکا ہوا ہوں۔ سنا ہے آج آتشیں اس کی صاحب بھی کئی دور سے مطلع سے باہر ہیں اس لیے اس واقعے کو مکمل طور پر آپ ہی کو دیکھنا ہوگا۔“ عبداللہان اسے ایک اور اہم اطلاع دے کر دفتر سے باہر نکل گیا۔ شہریار کے پاس فی الحال اسے دوسرے کا وقت تھا۔ اس درمیانی وقفے کو ضائع کرنے کے بجائے وہ خود کو کمپوز کرنے کی ہر پور کوشش کر رہے ہوئے ایک بار پھر اس فائل کی طرف متوجہ ہو گیا جو کچھ درج فی اس کے زیر مطالعہ تھی۔ ٹھیک آدھے گھنٹے بعد وہ لوگ اسپتال کے لیے روانہ ہو گئے۔

اسپتال میں حسب توقع میڈیا کی نمائندہ سے سوچو دھتے اور اس کوشش میں کچھ کامیابیوں کے ساتھ ساتھ بے نتیجہ نتائج ملے۔ شہریار اور عبداللہان اسپتال پہنچے تو سہانی برادری نے انہیں بھی پھیرنے کی کوشش کی۔

”یقیناً یہ ایک نہایت افسوس ناک واقعہ ہے جس کی جتنی بھی مذمت کی جائے گی۔ میں نے ذاتی طور پر اس واقعے پر گہرا غور محسوس کیا ہے اور میری خواہش ہے کہ واقعے کی حقیقی وجوہات معلوم کر سکیں۔ اگر ہمیں کچھ معلوم ہوا تو ہم میڈیا کو بھی ضرورتی تعلیمات سے آگاہ کریں گے۔“ شہریار نے یہ مختصر بیان دیا اور صحافیوں کے سوالات کو نظر انداز کر کے عبداللہان کے ساتھ اسپتال کے مینے کی راہنمائی میں اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جہاں منتول بچوں کی ماں اور اپنے

غلام کی شریک جرم ہول بی بی کو رکھا گیا تھا۔ کمرے کی طرف جاتے ہوئے اس نے عبداللہان کی طرف ہلک کر اس سے کوئی سوال کیا جس کے جواب میں عبداللہان نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ اس کے مثبت جواب پر اطمینان محسوس کرتا ہوا شہریار لیڈی ایم آراو کے پیچھے کمرے میں داخل ہو گیا۔ لیڈی ایم آراو کے علاوہ ان کے ساتھ اسپتال کے مینے کے جو افراد تھے وہ انہیں باہر کھینے کی حالت کر دی تھی۔ سفید چادر بچے بیڈ پر ایک دینی چلی کر چھ مہینے سال کی سائولی عورت لیٹی ہوئی تھی۔ عورت کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ ایک لگ جھٹ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”ہول بی بی! مطلع کے اسسٹنٹ کسٹمر شہریار عادل صاحب تم سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔“ لیڈی ایم آراو نے اسے مخاطب کیا تو اس نے بتا چوتھے نظر پر پھر کسٹمر شہریار کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بے حد برائی اور دشت تھی۔

”یہی طبیعت ہے آپ کی بی بی؟ یہاں اسپتال میں آپ کا خیال تو رکھا جا رہا ہے؟“ شہریار نے نرم لہجہ میں اسے مخاطب کر کے پوچھا تو اس کی وہاں آنکھوں میں حیرانی کی لہری دوڑ گئی۔ یقیناً گرفتاری کے بعد سے اسے تک وہ مسلسل لوگوں سے ملنے بھگتی ہی سن رہی تھی، ایسے ہی کسی نے نرم لہجہ میں بات کی تو وہ حیران رہ گئی اور سر کو کایات میں ہلکی سی جنبش دے کر شہریار کے سوال کا جواب دیا۔

”آپ کے بچوں کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا اس پر مجھے آپ کے ساتھ دلی ہمدردی ہے۔ یقیناً آپ اپنے شوہر کے جبر کے سامنے مجبور ہو گئی تھیں ورنہ میں جانتا ہوں کہ کوئی ماں اپنے بچوں کو اپنے ہاتھوں سے ہلاک کرنے یا ان کے کھنک میں شامل ہونے کی جرأت نہیں کر سکتی۔ کیا آپ مجھے بتا سکتی ہیں کہ آپ کے شوہر نے آپ کے بچوں کے ساتھ یہ خالہ نہ سلوک کیوں اور کس کے کہنے پر کیا؟“ وہ عورت کے بچے کے قریب ہی رہی کر رہی پر بیٹھ چکا تھا اور بے حد نرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سے پوچھ رہا تھا لیکن عورت نے اس کی زری کے باوجود کوئی جواب نہیں دیا اور سر کو زور زور سے ہلکی میں حرکت دینے لگی۔

”دیکھیں مجھے معلوم ہے کہ اصل مجرم آپ کا شوہر ہے۔ اگر آپ اس کے فعل میں دل سے شامل ہوئیں تو تیسرے بچے کو ہلاک کرنے کی کوشش کے موقع پر ہرگز بھی احتجاج نہیں کریں۔ یقیناً جو کچھ ہوا، وہ کسی مجبوری کی وجہ سے ہوا۔ لیکن جب تک آپ ہمیں اپنی اس مجبوری کے حقیقی تاہمیں کی نہیں، ہم اس حکم کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر

سکیں گے۔“ شہریار نے عبداللہان کو خفیف سا اشارہ کرتے ہوئے عورت کو کھانسنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ عبداللہان اس کے اشارے پر دروازے کی طرف لپکا اور دوسری طرف اپنے انتظار میں کھڑے کھنک سے ایک تقریباً مہینے سال کے بچے کو لے کر وہاں عورت کے بیڈ کی طرف بڑھا۔ بچے کو دیکھتے ہی عورت تیزی سے اٹھ کر جنبشیں ادا کرتی گئی گود میں لینے کے لیے ہاتھیں پھیلائیں۔ شہریار کے اشارے پر عبداللہان نے بچے کو اٹھائے کے حوالے کر دیا۔ بچے کو گود میں لے کر ہول بی بی اسے بچے کا شاپو پہنے لگی۔

”یہ بچہ آج صرف اس لیے زندہ ہے کہ آپ نے مین وقت پر اپنے شوہر کے حکم کے خلاف احتجاج کر ڈالا۔ اگر آپ کئی رات بھی پہلے کی طرح خاموش رہتیں تو اس بچے کی بھی اپنے دونوں بڑے بھائیوں کی طرح گھر کے آگن میں قبر بن چکی ہوتی اور آپ اپنی اولاد کو ہمارے کرنے کے لیے ترس جاتیں۔“ ہول بی بی کی طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے شہریار نے اسے احساس دلایا تو وہ رو پڑی اور مزید شدت کے ساتھ بچے کو پیار کرنے لگی۔

”مجھے افسوس ہے کہ یہ بچہ بچ تو گیا ہے لیکن اسے اپنے ماں باپ کے سامنے سے دور رہنا پڑے گا۔ یہ کسی رفاہی ادارے میں رہ کر ہوا گا اور بڑا ہونے کے بعد اس سوال کا جواب دھونڈتا رہے گا کہ اس کے والدین نے اس کے بھائیوں کو کیوں قتل کیا؟ اس بچے کی زندگی اپنے والدین کی اپنی اعلیٰ کے طے بنتے ہوئے گزرے گی اور وہ سکتا ہے کہ وہ عمل میں یہ خود بھی کوئی خطرناک مجرم یا جنونی قاتل بن جائے۔“

”رب نہ کرے۔“ شہریار کی بات سن کر عورت دغل کر پڑی۔

”میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ رب نہ کرے یہ بچہ کوئی مجرم، ڈاکو یا قاتل ہے۔ اسی لیے تو آپ سے کہہ رہا ہوں کہ مجھے اصل واقعے کے بارے میں بتائیں۔“ شہریار نے گواہ گرم دیکھ کر بیٹھ لگائی۔

”اصل واقعہ تو یہ ہیں آپ بھی سمجھ نہیں آیا۔ میرا خاوند نذر محمد یا اجڈانی اور اللہ والوں سے محبت کرنے والا آدمی ہے۔ کوئی اللہ والا اسے کچھ کہہ دے تو ضرور اس کی محبت مانگا تھا۔ اس پیکر میں کسی اس کے پھرنے سے ہڈی بھی ہو جاتے تھے۔ کسی واری ایسا نہیں ہوا کہ اس نے اپنی ساری آمدنی کسی عمارت یا درگاہ پر دے دی۔ ہمیں لوگوں سے قرض ادا کرنے کے لیے فافا نے کر کے گزارا کرنا پڑا۔ ایسے موقعوں پر

اگر میں نذر محمد کو کچھ کہتی بھی تو وہ میری نہیں سنتا تھا۔ کہتا تھا بھئیے! ادھر کی فتح آگے آسانی ہے۔ اللہ والوں کو خوش رکھیں گے اور ان کی کل مانیں گے تو آخرت میں بخشے جائیں گے۔ میں ہر واری اس کی کل مان جاتی تھی۔ خیر، ہمارے گاؤں میں شاہنواز صاحب نے مدرسہ کھول لیا۔ سارے ہی گاؤں والے ان کی دلی تریف (تحریف) کرتے تھے۔ نذر محمد تو ان کا دیوانہ ہو گیا تھا۔ کہتا تھا، میں نے شاہنواز صاحب جیسے یاد دل، نیک اور بھلا آدمی نہیں اور کوئی دوجا نہیں دیکھا۔ سارا وقت وہ انہی کے گن گاتا رہتا تھا۔ میں بھی دو ایک دفعہ ان سے ملنے کی گئی تھی۔ میںوں بھی وہ دڑے جگے لگے۔ میرے بچوں کو تو دوا چاہا کرتے تھے۔ ان کا دم کیا ہوا پانی میں اپنے کسی بیمار بچے کو پلا دیتی تو وہ فوراً بھلا چنگا ہو جاتا۔ ہور بھی جس ماٹے میں ہم نے ان سے رائے لی، ہمیں فہیدہ (فائدہ) ہی ہوا۔ میں اور نذر محمد تو ان کے بچے کے مریہ بن گئے تھے۔ وہ جو کہتے ہم مانے، پر فیئر ایک ایسی کل ہوئی کہ میں شاہنواز صاحب کی کل ماننے سے کاپ کی پر نذر محمد ذرا نہ گھبرایا، ہور بولا کہ ہم دی کریں گے جس کا ہمیں شاہنواز صاحب نے مشورہ دیا ہے۔“ ہول بی بی یہاں تک بتانے کے بعد بری طرح ہانپنے لگی۔ اس کی حالت دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بیٹوں دور سے دوڑتی ہوئی آ رہی ہو۔ یقیناً شدید بھلائی انتشار نے اس کی یہ حالت کر دی تھی اور اس کے دماغ میں وہ واقعات گردش کر رہے تھے جن کے بارے میں سوچنا ہی شہیت ماں اس کے لیے نہایت تکلیف دہ تھا۔

”شاہنواز نے ہمیں اور نذر محمد کو کیا مشورہ دیا تھا؟ کیا اس نے کہا تھا کہ تم لوگ اپنے بچوں کو ہلاک کر دو؟“ کسی حد تک بات کو سمجھتے ہوئے شہریار نے عورت سے تیز لہجے میں پوچھا۔

”انہوں نے ہم سے کہا تھا کہ ہمیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت پر عمل کرنا ہوگا۔ جس طرح وہ اپنے رب کے حکم پر اپنے پیارے بیٹے کی قربانی دینے کے لیے دل سے تیار ہو گئے تھے، اسی طرح ہمیں بھی اپنے بچوں کی قربانی دینی ہوگی۔ قربانی دے کر ہم اللہ کی نظر میں سب سے اچھے ہو جائیں گے اور وہ ہمیں جنت میں دلی جگہ سے گا۔ ادھر سونے کے کل ہوں گے، اچھے اچھے کھانے ہوں گے اور ہر وہ چیز ملے گی جس کو ہمارا رب کرے گا۔ انہوں نے ہمیں بتایا تھا کہ جنت میں ہمیں ہمارے بچے بھی دلائیے جائیں گے۔“ ہول بی بی خود کو سنہال پھٹی تھی اور اب بڑی حقیقت مندی سے بتا رہی تھی۔

”کیوں، شاہنواز کے پاس کیا وہی آتی تھی جو اس نے تم لوگوں سے یہ سب کچھ کہا؟“ شاہنواز وہ شخص تھا جس کی وجہ سے پہلے ہی عبدالنہیں سمیت کئی لوگ مارے گئے تھے۔ جو اپنے ساتھ گاؤں کے دونوں جوانوں کو لے کر غائب ہو چکا تھا۔ جس کے بارے میں شہ تھاکر وہ بھارتی خلیہ انجمنی ”را“ کا ایجنٹ ہے، چنانچہ اس کے بارے میں یہ جان کر کہ اس نے بتول بی بی اور نذر محمد جیسے اُن پڑھ اور اندھے عقیدے رکھنے والے لوگوں کے ذہنوں کو اس بدبریت کے راستے پر ڈالا تھا، وہ برداشت نہیں کر سکا اور بے حد غصے سے بولا۔

”وہی تو پیشروں پر آتی ہے جی، پر اللہ والوں کے پاس بھی بڑی کرتائیں ہوتی ہیں۔ وہ اشاروں سے بھی بہت کچھ سمجھ لیتے ہیں۔ شاہنواز صاحب نے بھی سمجھ لیا تھا۔ نذر محمد نے انہیں اپنا ایک خواب سنایا تھا۔ خواب سن کر شاہنواز صاحب بولے کہ نذر محمد! تمہاری یہ خواب تو حضرت ابراہیم کے خواب جیسا ہے۔ تجھے ان کی سنت پر عمل کرنا ہوگا۔ فیروز دیکھنا تجھ پر رب کی عیسیٰ رحمت ہوتی ہے۔ انہوں نے ہر نوچندی جمہرات کو یہ کام کرنے کا حکم دیا تھا۔ نذر محمد حکم سن کر رو دیا تو بڑا، پر اس نے کہا کہ رب کے حکم سے بڑھ کر تو کوئی چیز نہیں۔ یہ تو میرا اونچا نصیب ہے کہ رب نے مجھے اس کام کے لیے چنا جس کے لیے پہلے وہ اپنے ایک نبی کو چن چکا ہے۔ بس فیروز اس نے وہی ایسا کیا جیسا اسے شاہنواز صاحب نے بتایا تھا۔ میں بھی اپنے پیچھے پر پتھر رکھ کر رب کی مرضی میں راضی ہو گئی تھی، پر اس واری مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ مدرسے پر چھاپے کے بعد ویسے ہی میرا جی کچھ کھٹک گیا تھا، پر نذر محمد اپنے عقیدے میں پکا رہا۔ کہنے لگا اللہ والوں کو دنیا دار لوگ اسی طرح ٹھک کرتے رہتے ہیں۔ ان کے چکر میں پڑ کر ہمیں کسی اللہ والے کے خلاف دل میں میل نہیں لانا چاہیے۔“

بتول بی بی کے بیان کردہ حقائق رونگٹے کھڑے کر دینے والے تھے۔ ان حقائق کے سامنے آنے کے بعد شاہنواز کا کردار اور بھی مکمل کر دیا جاتا ہو گیا تھا۔ دین داری اور بزرگی کی آڑ میں وہ شخص معصوم کچھوں والوں کی برین واشنگ کا کام کر رہا تھا۔ اس نے جس شخص کے حراج میں ذرا بھی فتنے کے لیے متغافل پائی دل سے راہ سے بھاگ دیا۔ وہ بھی اس طرح کہ بھٹکنے والا یہی سمجھتا رہا کہ وہ غلام کی راہ پر چل رہا ہے۔ عبدالنہیں والا واقعہ اتنا پرانا نہیں ہوا تھا کہ کسی کے ذہن سے نکل جاتا اور اب یہ واقعہ سامنے آ گیا تھا۔ حکم اور جہد بانی دیہاتی نذر محمد کو شاہنواز نے اس طرح گمراہ کیا تھا کہ وہ خود کو مسیح ابراہیمی کا پیروکار سمجھتے ہوئے اپنے دو معصوم بچوں کی

جان لے بیٹھا۔ اگر نذر محمد میں ذرا بھی فہم و شعور ہوتا تو اپنے اور حضرت ابراہیم کے درمیان فرق کو سمجھنے کی کوشش کرتا۔ نبی کا خواب تو وہی ہوتا ہے لیکن عام آدمی کے خواب کے بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کی جاسکتی۔ پھر سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی رحیم و غفور نہیں۔ اللہ نے تو حضرت ابراہیم کی بھی محض آزمائش کی تھی۔ باپ کے ہاتھ بیٹے کے خون سے بہر حال روکتے نہیں دیتے تھے۔ اس کی سوچ اور عمل دونوں غلط تھے۔ جس کا اور اک نہ رکھتے ہوئے اس نے اپنی دونوں اولاد کو ہلاک کر ڈالا اور اس کے بعد تیسرے کی قربانی بھی دینے چلا تھا۔ اس طرح کی اندھی عقیدت مندی کو نفسیاتی مارنے کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ بتول بی بی کی زبانی معلوم ہونے والے حقائق نے شہرہ سمیت عبدالنمان اور لیڈی ڈاکٹر کو بھی اندر سے لرزا کر رکھ دیا۔ جولرہ خیر حقیقت سامنے آئی تھی، اس نے ذہنوں میں یہ سوال بھی اٹھایا تھا کہ ہالے شاہنواز نے اور کتنے ذہنوں میں گمراہی کا بیج بویا ہوگا اور یہ بیج ایک دن پھر کئی طاقتور درست کی صورت میں ابھر کر سامنے آ جائے گا۔

”شاہنواز کے بارے میں یہ ظاہر کیے بغیر کہ اس کا پڑوی ملک سے بھی کوئی تعلق بنتا ہے، اس کی تمام منظم کارروائیوں سے میڈیا والوں کو تعلیمات سے آگاہ کر دو۔ حقائق سامنے آئیں تو شاید لوگوں میں شعور پیدا ہو جائے۔ میں کوشش کروں گا کہ ہر گاؤں میں دینی تعلیم کے لیے مستعد ملا کی تعیناتی ہو سکے۔ عالم دین کا کردار معاشرے کی تعمیر کے لیے بے حد اہم ہوتا ہے لیکن اکثر ہم اس بات کو نظر انداز کر کے شیعہ خواندہ یا پھر سازشی افراد کو اپنا دینی راہنما بنا لیتے ہیں جس کا نتیجہ پھر اس طرح کے ہمیٹک واقعات کی صورت میں ہی سامنے آتا ہے۔“ بتول بی بی کے بیان کردہ حقائق کو سن کر دلی افسوس محسوس کرتے ہوئے شہر یار اس کے کمرے سے باہر نکلا تو اس نے عبدالنمان کو سب سے پہلا حکم یہی دیا۔

”اوکے سر! میڈیا والوں کو تو میں ابھی فوری طور پر بریف کر دوں گا، باقی آگے کی جوبلا ٹھک آپ کے ذہن میں ہے اس کے لیے ظاہر ہے کچھ وقت اور دساکں درکار ہوں گے جس کے لیے میرا مکمل تعاون آپ کو ہر وقت حاصل رہے گا۔“ عبدالنمان نے مستعدی اور فرس شناسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا۔

”ایسا کرنا کہ اس واقعے پر آفتاب کو اسٹیشنل کچھ لکھنے کے لیے ضرور کہنا۔ وہ حساس اور دردمند فطرت رکھنے والا آدمی ہے اس لیے اس کی تحریر میں خاصی اثر انگیزی پائی جانی

ہے۔ "شہر یار نے ایک اور ہدایت جاری کی جس سے ظاہر ہے عبداللہ کو اتفاق ہی کرنا تھا لیکن اس کے کسی بھی طرح کے رد عمل ظاہر کرنے سے مکمل ہی ڈی ایس کی منظور تیز چلتا ہوا ان لوگوں کے قریب چلا آیا۔ اس وقت وہ لوگ اسپتال کی عمارت سے باہر نکل گئے تھے اور گاڑی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ پروگرام یہی تھا کہ وہ لوگ یہاں سے سیدھے تھانے جائیں گے اور نذر محمد سے ملاقات کریں گے۔ اس ملاقات کے بعد ہی میڈیا والوں کو وائے کے متعلق بریفنگ دی جاتی لیکن ڈی ایس کی منظور چہرے پر جس طرح کے تاثرات سجائے اور جس انداز میں سامنے آیا تھا، اس کو دیکھ کر لگتا تھا کہ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آچکا ہے۔

"ابھی ابھی تھانے سے میرے پاس فون آیا ہے سراسر افسوس ہے کہ وہاں سے کوئی ابھی خبر نہیں ہے۔" شہر یار متوجہ ہوا تو ڈی ایس کی منظور نے لٹکوا کر آواز کیا۔ "خبر تمہاری کہانی ہے تھانے سے؟" شہر یار کا ہاتھ ٹھکا۔ "خبر آئی ہے کہ ایک سپاہی نے طرم نذر محمد کو فائرنگ کر کے لاک اپ میں ہی ہلاک کر دیا ہے۔ اصل میں سپاہی بے حد جذباتی ہو گیا تھا اور جذبات میں ہی حرکت کر بیٹھا۔ تھانے کے دوسرے عملے نے اس سپاہی کو گرفتار کر لیا ہے لیکن وہ خود کو مجرم تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ میں نے ایک برس آدی کو اس کے سچ انجام تک پہنچایا ہے، چنانچہ یہ قتل مجرم نہیں بلکہ جہاد کا لہر ہے گا۔" ڈی ایس کی منظور کی بات سن کر شہر یار کا بے ساختہ دل چاہا کہ اپنے سر کے بال توچ لے۔ عوام کی یہ حد سے بڑھی ہوئی جذباتیت ایک ایسا مسئلہ تھا جس کی وجہ سے کبھی بھی کام کرنے والوں کو سچ پلاننگ کے مطابق کام کرنے کا موقع نہیں مل پاتا تھا۔ اب بھی جانے اور کون کون سے حقائق تھے جو نذر محمد کی موت کے بعد ہیوش کے لیے پردے میں چلے گئے تھے۔ وہ نذر ہوتا تو شاید اس سے شانہ واز کے بارے میں کوئی کیڈل جاتا لیکن اب تو خالی گیر پینے کے سوا کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔

"اسلام علیکم اہل ابی!" انرپورٹ پر چینگ کے طویل مرحلے سے گزر کر چودھری افتخار ارا نیل لاؤنج میں پہنچا تو اس آواز کو سن کر چونک پڑا۔ سامنے اس کا بڑا اور چہیتا جیٹا چودھری مراد لوہوں پر مسکراہٹ سجائے اس کا استقبال کر رہا تھا۔ یہ معمول کی بات تھی۔ مراد کے نیو یارک کے قیام کے عرصے میں چودھری جب بھی وہاں آیا تھا، مراد اس کے استقبال کے لیے ضرور پہنچتا تھا۔ خود وہ بھی ارا نیل لاؤنج

میں داخل ہوتے ہی بیٹے کو تلاشی نظروں سے کھینچنے لگتا تھا لیکن آج ذرا مختلف صورت حال تھی۔ وہ اپنے ہم سفر ذوقی وجہ سے بری طرح الجھ رہا تھا۔ ذوقی جو ابندا میں ایک اچھا۔۔۔ ہم سفر اور دوستانہ مزاج رکھنے والا آدمی محسوس ہوا تھا، اچانک ہی خطرناک لگنے لگا تھا۔ چودھری نے اپنی عمارت فطرت کی وجہ سے بھانپ لیا تھا کہ ذوقی کا اس سے ملنا اور ماہ بانو کی تصویریں دکھانا کوئی اتفاق نہیں تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ چودھری کے لیے ماہ بانو کی کیا اہمیت ہے اور اب شاید وہ ماہ بانو کے بدلے اس سے کوئی ذیل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے چودھری کو کھانے پر مدعو بھی کیا تھا۔۔۔ کھانے کی میز پر بیٹھ کر اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کریں گے۔ اس ملاقات کا ایجنڈا کیا ہوگا، چودھری نہیں جانتا تھا لیکن انتہا پر حال سمجھتا تھا کہ ذوقی اسے اپنے کسی مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ وہ کام یا مقصد کیا ہو سکتا ہے، اس سوال نے چودھری کو الجھا رکھا تھا۔ اسی الجھن میں گم رہنے کی وجہ سے اسے مراد شاہ کا خیال نہیں رہا تھا۔ وہ چینگ کے مراحل سے گزر کر ارا نیل لاؤنج میں چنگ تک ذوقی کو کھانے کی کوشش کرتا رہا تھا لیکن وہ تو جہاز سے اترنے کے بعد گھسے کے سر سے سینک کی طرح غائب ہو گیا تھا۔ چودھری کو اس کی کنکری ایک جھلک تک نظر نہیں آئی تھی۔

"خیریت تو ہے ابھی آپ کچھ پریشان پریشان سے لگ رہے ہیں؟" مراد شاہ نے فوراً ہی اس کی کیفیت بھانپ لی۔

"کوئی پریشان نہیں پتہ! بس ادھر یہ لوگ ہم پاکستانیوں کی ایسے چینگ کرتے ہیں کہ طبیعت بڑی ہونے لگتی ہے۔ اپنے ملک میں ہم اچھے شکستہ عزت دار آدمی ہیں۔ لوگ جھک جھک کر ہمیں سلام کرتے ہیں لیکن یہ گورے، ہندے کی ساری عزت خاک میں رول دیتے ہیں۔" چودھری نے خود کو سمجھانے ہوئے بھانڈا بتایا تو مراد شاہ مسکرا دیا۔ یہ شکوہ تو چودھری پر بار بار ذوقی کے موقع پر کرتا تھا اور اب تو صورت حال خاصی کے مقابلے میں اور بھی زیادہ خراب ہو چکی تھی۔ مسلمانوں کے خلاف دہشت گردی کا پروپیگنڈا کرنے والے امریکن اپنے پروپیگنڈے کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے ہر مقام پر مسلمانوں کے لیے بے حد سختی کا مظاہرہ کرتے لگے تھے۔ اس سختی کے چھلے ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ وہ جانتے تھے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ زیادتی کے مرتکب ہو رہے ہیں اور انوکھ میں مسلمان بھی کوئی کارروائی کر سکتے ہیں۔ ساری دنیا پر جنگ مسلط کرنے والے اپنے

بھڑکائے گئے شعلوں کی آج اپنے دامن میں گئے سے سدا خوف زدہ رہتے تھے چنانچہ ان کے حقیقی اقدامات میں بھی اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔

"جانے دیں ابھی! اپنا بی میلانہ کریں۔ ہر جگہ کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ یہاں والے ہمارے لوگوں کے لیے ذرا ردی حقیقت کے ہیں، برآپ کو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اپنے علاقے میں تو آپ کی بڑی عزت ہے نا۔" مراد شاہ نے باب کی دل جوئی کی کوشش کی اور انہیں اپنے ساتھ لیے ہوئے باہر کی طرف بڑھا۔

"سو تو ہے۔ اسی واسطے تو میں تھم سے بھی کہتا ہوں کہ واپس اپنے گاؤں آجا۔ دنیا کا کون سا آرام ہے جو ادھر نہیں ہے۔ اپنی جوتی میں ہر کھات موجود ہے۔ نذر ادھر رہ کر کسی کی رکھوں گے اتنا چھوڑا ہے کہ سات بڑھ بیوں تک بھی چھوڑ کر گھاس کی توڑی کر رہی ہے۔ وہ تیرے لیے تو وہاں اتنا کچھ موجود ہے کہ پچاسیوں ہندے تیرے آگے چھپے ہاتھ باندھ کر گھومیں۔" چودھری نے اپنی ہر بار کہی جانے والی بات ایک بار پھر بتانے کے سامنے اڑھائی۔

"آپ کی بات اپنی جگہ ٹھیک ہے ابھی لیکن میں کیا کروں میرا مزاج ذرا مختلف ہے۔ مجھے لوگوں کا اپنے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا اچھا نہیں لگتا۔ انسان کو اللہ نے آزاد پیدا کیا ہے۔ میں اپنے جیسے انسانوں کو اپنی غلامی کرتا دیکھتا ہوں تو دل برا ہو لگتا ہے۔"

"فیروزی مکی۔ تھم میں اور ان قابل مزارعوں میں وڈا فرق ہے۔ تو چودھری افتخار کا پتہ اس کی جائیداد کا جائیں ہے۔ تو ادھر وہ حراسے دونوں ایک جیسے ہو سکتے ہیں؟ مجھے اللہ نے حکمرانی کے لیے بنایا ہے اور انہیں غلامی کے لیے۔ اگر اللہ سب کو ایک جیسا دیکھنا چاہتا تو فیروزی سب کو برادری سے مال و دولت اور مقام دیتا۔ اللہ نے آپ ہندوں کے درمیان اونچ نیچ رکھی ہے، ہر تیرے جیسے نوجوانوں پر سوشلسٹ بننے کا کھوت سوار پڑتا ہے۔ خیر وہ لے جیتے دن چاہے یہاں... آخر کو ایک دن تجھے میری جگہ آتی جائے گی۔" باب کا جواب چودھری کو پتہ نہ تھا کہ وہ اپنی طرف سے دیکھیں دے کر اسے قائل کرنے کی کوشش کرتے گا۔

"میں جانتا ہوں کہ اللہ نے ہندوں کے درمیان اونچ نیچ رکھی ہے لیکن اس کا مقصد یہ نہیں کہ وہ انسانوں میں سے

کچھ کو برتر اور کچھ کو کم تر رکھنا چاہتا ہے۔ اللہ کے ہاں تو رہے پیسے کی بنیاد پر برتری اور کمتری ہے ہی نہیں۔ اس کے نزدیک تو بس وہ برتر ہے جو تقویٰ اختیار کرے۔ معاشی اور معاشرتی تقسیم کے ذریعے تو بس وہ ہماری آزمائش کر رہا ہے۔ جو اس آزمائش میں پورا اترے گا، وہی اللہ کے نزدیک بلند اور کامیاب ہوگا۔"

"چل جھڑ۔ رہنے دے اس گل کو۔ تیری گل سن کر مجھے لگتا ہے کہ جیسے تو امریکا میں نہیں، سعودی عرب کے کسی مدرے میں رہ رہا ہے جہاں تجھے یہ سب سکھایا جاتا ہے۔" چودھری کا موڈ اچھا خاصا خراب ہو گیا تھا، چنانچہ اس نے موضوع ہی ختم کر دیا مناسب سمجھا۔ مراد نے بھی باپ کا موڈ دیکھتے ہوئے اسے مزید پھیلنا مناسب نہیں سمجھا وہ دونوں تانا جانتا تھا کہ کر دین صرف سعودی عرب کے مدروں میں نہیں سکھایا جاتا۔ فطرت میں بھلائی اور دل میں نیک خواہشات رکھنے والے کو ہر جگہ راجہ بنا مل جاتی ہے۔ وہ نیو یارک جیسے آزادانہ مزاج رکھنے والے شہر میں رہ کر ایسی باتیں کرتا تھا تو صرف اس لیے کہ اس کے احباب کا حلقہ انسانی حقوق کا شعور رکھنے والے افراد پر مشتمل تھا۔ ان افراد میں بہت سے اچھے مسلمان بھی تھے اور کچھ غیر مسلم۔ لیکن اچھے انسان بھی۔ چنانچہ وہ اور اپنی ہی پروش کے ابتدائی عرصے میں خود کو ملنے والی غیر معمولی اہمیت کی وجہ سے کچھ بڑا بھی تھا تو ان چند سالوں میں بالکل سدھر گیا تھا۔

"شاہدہ اور علیہ گھر پر بڑی ہے جیتی سے آپ کا انتظار کر رہی ہوں گی۔ جس وقت میں انرپورٹ کے لیے روانہ ہوا تھا، میں نے فون پر ان دونوں کو اطلاع دے دی تھی۔ مجھے آج آفس میں ضروری کام نہیں ہوتا تو میں جھنڈی کر لیتا اور ان دونوں کو بھی اپنے ساتھ ہی انرپورٹ لانا لیکن مسروریت کچھ ایسی تھی کہ مجھے فون سے نکل کر سیدھا یہاں آنا پڑا۔" موضوع گفتگو بدلنے کے لیے مراد شاہ، چودھری کو اپنی بیوی اور بیٹی کے بارے میں بتانے لگا۔ اس کی بیوی شاہدہ اس کی گلی بیوی کی بیٹی تھی جس کو وہ باپ کی خواہش پر بچاؤ کر اپنے ساتھ امریکا لے آیا تھا۔ مکالمہ مکالمہ مراد شاہ نے مجھ داری مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا لیکن مراد شاہ نے مجھ داری اور بردباری کا ثبوت دیتے ہوئے بیوی کے ساتھ ایہ جھنڈت کی راہ نکال لی تھی۔ اگرچہ بیوی اور اپنے درمیان موجود وہی فرق کی وجہ سے بعض اوقات اسے شاہدہ احساسات جتنی بھی ہوتی تھا لیکن اس نے بھی یہ بات شاہدہ پر بظاہر نہیں کی تھی اور یوں وہ دونوں اپنی بیٹی علیہ کے ساتھ کافی مناسب

زمین کی گزارد ہے تھے۔ علیحدگی مہرتین سال ہو چکی تھی اور اس کا وہ دور وہاں میاں بیوی کے لیے خوشی کا باعث تھا۔

”فوزی کی بیٹی تو پرانی ہوتی ہے کہ بندہ باندہ ہو جاتا ہے۔ اب اگر اس کی بکلا توڑنے کا دن میں ہوتا تو ایسی کوئی مجبوری آئے نہیں آتی۔“ مراد کی بات سن کر چودھری کو ایک گنبد مل گیا چنانچہ اس نے فوراً ہی اسے چتا دیا۔ مراد اس کی بات سن کر محض مسکرایا اور جواب میں کچھ کہے بغیر ڈرائیو کرتا رہا۔ نیو یارک جیسے مصروف شہر کے ٹریفک میں اپنی گاڑی چلانے کے لیے ابھی خاصی حاضردہائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ برسوں پہاں رہنے کی وجہ سے وہ اس ٹریفک کا سادی ہو گیا تھا لیکن پھر بھی احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا تھا۔ بلکہ ہنگامی کی شپ کرتے ہوئے آخر کار وہ لوگ مراد شاہ کے گھوڑی اپارٹمنٹ تک پہنچ گئے۔ مراد کی یہاں ٹھیک ٹھاک ملازمت کی تھی یہ شان دار اپارٹمنٹ بہر حال اسے چودھری نے ہی خرید کر دیا تھا ورنہ وہ مراد کو شاید ابھی تک کسی کرائے کی اپارٹمنٹ میں رہ رہا ہوتا۔ اپارٹمنٹ پہنچ کر چودھری کی ہواور ہوتی سے ملاقات ہوئی تو ان میں لگ کر وہ اپنی ذاتی انجمن کو باگل میں فراموش کر بیٹھا۔ شاید نے اس کے لیے خاص طور پر اپنے ہاتھوں سے شہر کی کھانا تیار کیا تھا۔ وہ خود بھی مشرقی لباس زیب تن کیے ہوئے تھے۔ اسے مراد شاہ کے ساتھ نیو یارک پہنچے ہوئے چودھری نے بیٹے سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو شہر کی روایات کے خلاف امریکی ماحول میں نہیں ڈھلنے دے گا۔ شاید وہ چلی کی دوسری خواتین کی طرح نیو یارک میں رہنے کے باوجود گھریلو زندگی گزارے گی۔ مراد نے یہ شرط قبول کر لی تھی۔ خود شاید وہ کبھی باہر کی دنیا سے زیادہ لگاؤ نہیں تھا اس لیے وہ مراد سے ایک گھریلو بیوی کی ذمہ داریاں نبھانے لگی۔ کامیاب میں مدد کے لیے دن بھر ایک ملازم اس کے ساتھ رہتی تھی اس لیے اس پر بہت زیادہ بوجھ بھی نہیں تھا۔ دوسرے مراد شاہ نے اسے کبھی آزادی سے قطعی محروم نہیں کیا تھا۔ وہ بہت سے معاملات میں اپنی مرضی کی مانگ بھی اور اسے اپنی خواہش کے مطابق عمل کرنے کے لیے آزادی بھی حاصل تھی۔

”ماسوں جان! آپ کا کرکٹ تیار ہے۔ آپ لیے سبز سے آئے ہیں، کچھ دیر آرام کریں پھر پٹی کے لاڈ اٹھائے گا۔“ شاید نے چودھری کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کھانے سے ناراض ہونے کے بعد پٹی کے ساتھ مصروف تھا۔

”ہاں پتر! میں داغی بڑا ٹھیک گیا ہوں۔ اب کچھ دیر آرام کروں گا۔“ چودھری نے فوراً ہی اپنی جگہ چھوڑ دی۔ اس

کی توجہ سے کب دم محروم ہو جانے پر علیحدگی نے احتجاجا رونا شروع کر دیا لیکن اس بار چودھری نے اسے مکمل طور پر نظر انداز کر دیا۔ وہ تو علیحدگی کو پونے دو اور اتنی دور رہنے کی وجہ سے کافی رعایت حاصل تھی ورنہ بیٹیوں سے محبت کا ریت و کرنا جو حلی و دلیوں کی روایات میں ہی شامل نہیں تھا۔ مراد شاہ جو باپ کے اس انداز کو سمجھتا تھا، خود ہی علیحدگی کو گود میں لے کر اسے بھلانے لگا بلکہ چودھری نے اپنے لیے مخصوص کمرے کا رخ کیا۔ کمرے میں پہنچ کر وہ آرام دہ ستر پر لیٹا تو اسے ایک بار پھر ڈیوڈ اور اس کے ساتھ ہونے والی گفتگو یاد آگئی۔ اس گفتگو میں ایک کارآمد بات بھی تھی کہ ڈیوڈ نے اسے ماہ بانو سے متعلق یقین دہانی کروائی تھی کہ وہ اسے مل جائے گی۔ ڈیوڈ سے معاملات جس طرح بھی ملے پاتے لیکن ایک بات واضح ہو چکی تھی کہ اسے ماہ بانو کے حصول کے لیے اب شہر یار بردہاؤ ڈانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی، چنانچہ اسے افوا کر دیا تھی بے کاری تھا۔ اس خیال کے آنے کے بعد اس نے فوراً ہی بالے کا موبائل نمبر ملا۔ موبائل کی سہولت آجانے کے بعد اس نے بالے سمیت اپنے کچھ خاص خاص مائنز کو موبائل سٹ فرائم کر دیے تھے تاکہ وقت ضرورت فوری رابطہ ہو سکے لیکن اس وقت اسے بالے سے رابطہ کرنے میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ جانے کس وجہ سے بالے کا موبائل نمبر لگ ہی نہیں رہا تھا۔ اس کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد چودھری نے مٹی اللہ رکھا کا نمبر ڈائل کیا۔ اس نے دوسری ہی تلاش پر کال ریسیڈ کر لی۔

”سلام کار! کار! خیر حال پہنچ گئے۔ میں بھی انتظار کر رہا تھا کہ آپ کی طرف سے خبریت کا فون آجائے۔“ چودھری کی آواز سننے ہی مٹی نے خوشامد انداز میں ہون شروع کر دیا۔

”ہالا کدھر ہے مٹی؟ میں اتنی دیر سے اسے فون کر رہا ہوں، پر اس کا نمبر ہی نہیں مل رہا۔“ مٹی کی خوشامد باتوں پر کان دھرے بغیر چودھری نے اپنے مطلب کی بات کی۔

”ہالا تو رات سے ہی غائب ہے سر کار! ابھی سے کہہ کر تھا کہ آپ نے اس کے ذمے کوئی کام لگایا ہے اسی کے سلسلے میں انتظامات کرنے جا رہے۔ دو تین دن میں واپسی ہوگی۔“ مٹی نے اسے اطلاع دی تو وہ ایک گھبرا سانس لے کر رو گیا۔ یقیناً بلا شہر یار کے افوا کے انتظامات کرنے کے لیے کسی ایسی جگہ موجود تھا جہاں موبائل سگنل نہیں پہنچتے ہوں گے۔

”ٹھیک ہے، پر تو کوشش کر کے دیکھ کہ کسی طرح جانے

سے خیرا رابطہ ہو جائے۔ اس سے کچھ ہو تو ہونا کہ ابھی رک جائے۔ میں نے اسے جو کام کہا تھا، اس میں فوری تھ نہ ڈالے۔“ چودھری نے جلد بات جاری کیں اور سلسلہ متعلق کر دیا۔ اب اگر مٹی کا بالے سے رابطہ ہو جاتا تو شہر یار کا انوار ک جاتا ورنہ دوسری صورت میں اس نے سوچ لیا تھا کہ بالے سے کہے گا شہر یار سے ماہ بانو کا یہ معلوم کرنے کی کوشش نہ کرے اور پٹی اس کی تھوڑی بہت کھینچ لگا کر اسے آزاد کر دے۔ شہر یار کو اتنی تکلیف بھی پہنچ جاتی تو وہ اپنے دل میں بڑی تھنڈک محسوس کرتا۔

☆☆☆

قدرے ماہور مارک پر پہلے مشاہیر خان کے قدم اس نورست مٹی کے دفتر کی طرف اٹھ رہے تھے جس کی جیب ماہ بانو کے افوا کے لیے استنباط کی گئی تھی۔ اس کی معلومات کے مطابق ماہور افراد نے جیب چلانے والے ڈرائیور کو اپک ہی روک کر اس سے جیب کھینچ لی تھی اور ڈرائیور کو بے ہوش کر دیا تھا۔ پولیس کے مطابق جیب ڈرائیور مٹلہ اوروں کے بارے میں کوئی قابل ذکر بات نہیں بتا سکا تھیں مشاہیر خان ایک بار خود جیب ڈرائیور سے مل کر معلومات حاصل کر چکا تھا۔ اس سے قبل وہ اپنی ماں، ڈاکٹر خان اور ماہ بانو کو بوشے سے کانڈے واپس لانے والے جیب ڈرائیور سے بھی پوچھ کچھ کر چکا تھیں لیکن اس نے محض یہی بتایا تھا کہ افوا کاروں کی تعداد چار تھی اور انہوں نے اپنے پھروں کو قلاب میں چھپا رکھا تھا۔ وہ افوا کاروں کی قریب کے بارے میں بھی کوئی اندازہ و قائم نہیں کر سکا تھا، البتہ اس نے ان کے قد و قامت کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا۔

مشاہیر خان چاہتا تھا کہ افوا کے لیے استنباط کی جانے والی جیب کے ڈرائیور سے مل کر کچھ بات کرے تاکہ اگر وہ کوئی خاص بات تو نہ کر سکا تو اس کے ذریعے مٹلہ اوروں کا سراغ لگایا جاسکے۔ اسے تھا نے سے جیب ڈرائیور کے بارے میں معلومات مل گئی تھیں جس میں شخص کا نام نیاز علی تھا اور وہ کئی سالوں سے ایک نورست مٹی میں رہتے ڈرائیور ملازمت کر رہا تھا۔ اس کا بہت دن کے مختلف حصوں میں مسلسل آتا جاتا رہتا تھا لیکن وہ کبھی بار ایک صورت حال سے دوچار ہوا تھا۔ تو سب سے وہ بے جاہر دہی بھی ہوا تھا۔ حملہ آوروں نے اسے بے ہوش کرنے کے لیے ہر ضرب لگائی تھی جس کی وجہ سے اس کے سر پر زخم آگیا تھا۔ دہی ہونے کی وجہ سے نورست مٹی آج کل اسے کسی جگہ نہیں پہنچ رہی تھی اور

مشاہیر خان کی معلومات کے مطابق ان دونوں وہ اپنے گھر پر آرام کر رہا تھا۔ تھا نے سے اسے نیاز علی کے گھر کا پتا معلوم نہیں ہو سکا تھا چنانچہ وہ نورست مٹی کے دفتر جا کر وہاں سے اس کے گھر کا پتا معلوم کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اپنے خیالوں میں کم دفتر کی طرف جانے والے راستے پر سر جھکائے پہلے ہوئے وہ ارد گرد سے تقریباً بے خبر تھا اس لیے جب کسی نے اس کا نام لے کر پکارا تو وہ چونک پڑا اور سر اٹھا کر آواز کی سمت دیکھا۔ پکارنے والا اس کا ایک واقف کار ڈر تھا۔ بیٹے کے اشیاء سے آواز پر رتھا اور عموماً میزوں میں پہاڑوں کے سطرپی رہ جاتا تھا۔

”اور ہاں مشاہیر خان! کیا حال چال ہے؟ ابھی اس طرح سر جھکائے بے خبری میں کدھر جاتا ہے؟“ مشاہیر خان متوجہ ہوا تو آواز اس کے قریب آتے ہوئے بولا۔

”ہاں ہاں! ایک کام سے جا رہا تھا۔ ماں اسپتال میں داخل ہے اس کے لیے دو مین خریدی تھیں اور ایک دوسرا کام بھی تھا۔“ اس نے آواز کے سوال کا سرسری انداز میں جواب دیا۔

”ہاں ہاں! ہمیں تمہارے ساتھ ہونے والے حادثے کا پتا چلا تھا۔ بڑا بڑا ہوا جہاز رے خاندان کے ساتھ۔ بے جاہر اکرم خان تو بہت اچھا لڑکا تھا۔ ہم دونوں کا اکثر ہی ایک ساتھ آتا جاتا تھا۔ اکرم خان ماں کی بی بی کا خاٹری اوپر پہاڑوں پر نہیں جاتا تھا۔ کبھی کبھار ماں ڈرتی ہے کہ کہیں میرے باپ اور بڑے بھائی کی طرح میں بھی کسی حادثے کا شکار نہ ہو جاؤں، پر قسمت کی خرابی دیکھو کہ اتنی احتیاط کے باوجود بھی بے جاہر ماں کو اس عمر میں اتنا بڑا صدمہ پہنچا۔ میں ایک نیم کے ساتھ کے ٹوکے میں کھپ چک گیا ہوا تھا۔ رات ہی واپس آیا ہوں۔ اگر یہاں ہوتا تو اکرم خان کی ترغیب میں ضرور شریک ہوتا۔ اب تو ساری زندگی میں انہوں رہے گا کہ اپنے اتنے اچھے ماں کی آخری ویدار بھی نصیب نہیں ہوا۔“ آواز اس نے اکرم خان کی موت پر اظہارِ غم سے کرتے لگا۔ جواباً مشاہیر خان خاموش رہا۔ اکرم خان کے ذکر پر اسے اپنے بیٹے میں وہاں سا بھرتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ انتقام کی ایک آگ کی جیوتن بدن کو جھلسا لگتی تھی۔ اپنی اس کیفیت کو لوگوں سے چھپانے کے لیے وہ ایسے مواقع پر خاموش رہتا ہی مناسب سمجھتا تھا۔

”اچھا ہوا کدھر بھڑا رہتے میں بیٹل گئے ورنہ کس خود تم سے ملنے کے لیے اسپتال کی طرف ہی جا رہا تھا۔ مجھے کس سے معلوم ہوا تھا کہ تم اپنا بڑا وقت اسپتال میں اپنی ماں کے

پاس ہی گزارتے ہو۔ چلو چل کر ماں کی دوا لے لیتے ہیں پھر میں تمہارے ساتھ ہی اسپتال تک چلوں گا تاکہ ماں کی جی مزاج پکری کر سکوں۔“ آؤ نے اس کی خاموشی کو محسوس کیے بغیر اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے دلاسادیے کے انداز میں جلی کی پکڑی دی اور اسی راستے پر قدم آگے بڑھائے جس راستے پر مشاہیرم خان پہلے جا رہا تھا۔

”اگر تمہیں جلدی نہ ہو تو میرے ساتھ چلو رتہ جاہو تو سیدھے ماں سے ملنے اسپتال بھی جا سکتے ہو۔ اصل میں مجھے دوا میں خریدنے کے بعد نیاز علی ڈرائیور سے ملنے اس کی فورسٹ مینٹی کے دفتر تک بھی جانا ہے۔ تمہیں شاید کسی سے معلوم ہو ہو کہ اکرم خان کے قتل میں جو لوگ ٹوٹ ہیں، انہوں نے نیاز علی کی جیب ہی استعمال کی تھی۔ میں چاہتا ہوں کہ نیاز علی سے قتل کر ان لوگوں کے چلنے وغیرہ معلوم کر سکوں۔“ آؤ کو اپنے ساتھ چلنے پر مصر و پھستے ہوئے مشاہیرم خان کو اس پر اپنا پروگرام ظاہر کرتا ہوا۔

”ہاں۔ میں نے سنا تھا کہ قاتلوں نے نیاز علی سے جیب چھین کر اسے واردات کے لیے استعمال کیا تھا۔ اگر تم کو تو میں تمہیں اس کے گھر تک لے جا سکتا ہوں۔ شاہے اپنی مینٹی کے دفتر تو وہ آج تک نہیں جا رہا ہے۔ دفتر والوں نے اسے آرام کے لیے چھٹی دی ہوئی ہے۔“

”یہ تو مجھے بھی معلوم ہے لیکن مجھے نیاز علی کے گھر کا پتا نہیں معلوم تھا اس لیے میں دفتر کی طرف جا رہا تھا کہ وہاں سے اس کا پتا معلوم کر لوں گا۔ میں اس کا گھر معلوم ہے تو ابھی بات ہے۔ ایسا کرو کہ مجھے اس کا گھر دکھا دو، پہلے میں اس سے ہی ملاقات کر لیتا ہوں۔“ آؤ کو اپنی پیشکش سن کر مشاہیرم خان فوراً ہی اس کے ساتھ نیاز علی کے گھر جانے پر آمادہ ہو گیا۔

”چلو تم کہتے ہو تو پہلے وہاں چلے جیں لیکن تم نیاز علی سے زیادہ اچھی امید نہ رکھنا۔ کچھ فرد مبالغہ آلودی ہے۔ زیادہ کسی سے ملنا جتنا اہم بات کرتا پسند نہیں کرتا۔ کچھ سال پہلے اس کا مزاج ایسا نہیں تھا۔ سب سے مل کر رہتا تھا، پر اب بہت بدل گیا ہے۔ وہ ظاہر نہیں کرتا لیکن اس کے بوی بچوں کا بیٹنا آواز دھن دھن کر لگتا ہے کہ اس کے پاس نہیں سے چپسا آئے لگا ہے۔ حالانکہ پہلے بھی وہ ڈرائیور ہی کرتا تھا اور اب بھی نہیں کام کرتا ہے۔“ نیاز علی کے گھر کی طرف جاتے ہوئے آؤ نے اسے بتایا تو کھٹک گیا۔ آؤ کا نیاز علی کے بارے میں سرسری طور پر کیا جانے والا تبصرہ قاتل غور تھا۔ اگر کسی طرح نیاز علی کے پاس معمول سے زیادہ چپسا آئے لگا

تھا تو اس کا مطلب تھا کہ نیاز علی کچھ مشکوک شخصیت کا مالک ہے اور اپنے شخص کی ہر بات پر نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

”تم نے بھی غور نہیں کیا کہ نیاز علی کے پاس جیسا کہاں سے آ رہا ہے؟ اگر وہ کوئی نیا کام دھندا کرتا تو چپسا آئے والی بات سمجھ بھی آتی لیکن پہلے والی نوکری کے ساتھ زیادہ چپسا آئے تو ذرا عجیب سی بات ہے۔“ مشاہیرم خان نے آؤ کو ٹوٹنے کی کوشش کی۔

”کہاں پارا؟ ہمارے پاس تو فرصت ہے اور نہ ہی ہمیں عادت ہے کہ دوسرے کے معاملوں میں الجھ اڑائیں اس لیے بھی جان کر اس معاملے میں کچھ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔“ آؤ نے بے نیازانہ انداز میں اس کے سوال کا جواب دیا۔

”پھر بھی۔۔۔“ یہی تو تم نے نیاز علی کی کوئی ایسی حرکت دیکھی ہوگی جو تمہیں معمول سے بہت کر اور ذرا مشکوک لگی ہو؟“ مشاہیرم خان آسانی سے بہت ہارنے والا نہیں تھا، چنانچہ آؤ کو دماغ پر زور دینے کے لیے آکھایا۔

”اسی کوئی خاص مشکوک حرکت تو نہیں دیکھی، پر ایک بار اس کی ایک حرکت پر مجھے بڑی حیرت ہوئی تھی۔ یہ پچھلے سال کا ذکر ہے۔ میں ایک ٹیم کے ساتھ ہنزہ گیا ہوا تھا۔ وہاں سے واپس آیا تو معلوم ہوا کہ کینیڈا کا رابرٹ صاحب اپنی ٹیم کے ساتھ اسکرود آیا ہوا ہے۔ رابرٹ صاحب مجھے بڑا پسند کرتا ہے۔ اسے جب معلوم ہوا کہ میں اسکرود میں نہیں ہوں لیکن جلد واپس آنے والا تو وہ میرے لیے پیغام بھیج دیا کہ میں کسی طرح اسے جوائن کر لوں۔ اتفاق سے مجھے معلوم ہوا کہ نیاز علی ایک ٹیم کو واپس لانے کے لیے آگے جانے والا ہے۔ میں نے اس سے ٹلٹ مانگ لی۔ اس وقت میں نے اس کے ساتھ سفر کرتے ہوئے دیکھا کہ اس کی جیب میں کھانے پینے کا سامان اور دواؤں وغیرہ بڑی مقدار میں موجود ہیں۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ اگر وہ کسی ٹیم کے ساتھ سفر پر جا رہا ہوتا تو سامان کی موجودگی سمجھ آتی لیکن وہ تو ٹیم کو واپس لانے کے لیے جا رہا تھا۔ میں نے اس سے سامان کے بارے میں پوچھا تو بولا کہ کسی گھاس میں اس کے ایک دوست نے سامان منگوایا ہے۔ میں اس کا جواب سن کر خاموش ہو گیا لیکن اس کے بعد بھی کئی بار میں نے نوٹ کیا کہ نیاز علی جب بھی کسی ٹیم کو واپس لانے جاتا ہے تو اس کی جیب خالی نہیں ہوتی، اس میں کافی سامان لدا ہوا ہوتا ہے۔“ آؤ کی فراہم کردہ معلومات بڑی قیمتی تھیں۔ ان معلومات کی روشنی میں نیاز علی کا کردار جس طرح سامنے آیا تھا، اس کے

مطابق وہ قاتل مجرور سا آدمی نہیں تھا، چنانچہ اس کے اس بیان پر بھی یقین کرنا مناسب نہیں تھا کہ انوکھا کاروں نے اس سے چپ چھٹی کی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ چپے کے حصول کے لیے نیاز علی نے خود ان لوگوں سے سودا لینے کیا ہو اور انہیں واردات کے لیے جیب فراہم کر کے خود کو ڈھکی چائے کا ڈراما چلایا ہو۔ یہ امکان ایسا تھا جس کو سامنے رکھتے ہوئے مشاہیرم خان سمجھتا تھا کہ نیاز علی سے سیدھے طریقے سے بات کرنا اتنا سودمند ثابت نہیں ہوگا اور اس شخص سے درست معلومات اکھوانے کے لیے اس پر ذرا محنت کرنی پڑے گی۔

”وہ دیکھو۔۔۔ وہ جولاں محبت والا مکان ہے اس میں نیاز علی رہتا ہے۔“ مشاہیرم خان کی سوچوں سے بے خبر آؤ نے ہاتھ کے اشارے سے ایک مکان کی نشان دہی کی تو وہ مکان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مکان زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن عمارت اچھی حالت میں اور مضبوط تھی اور اس پر موجود رنگ و روغن بھی ایسا لگتا تھا کہ حال ہی میں کیا گیا ہو۔

”ایسا کہ تو تم نیاز علی سے ملاقات کرلو۔ میں پھر کسی وقت تم سے ملنے کے لیے آؤں گا۔ نیاز علی کا معلوم نہیں کہ کس روکے انداز میں لے اور میں رات ہی سفر سے تھکا ماندہ آیا ہوں۔ محسن میں برداشت ذرا کم ہو جاتی ہے اس لیے میرے خیال میں، میں اس سے نہ ہی ملوں تو اچھا ہے۔“ گھر کے قریب پہنچ کر آؤ نے اچانک ہی اندر جانے کا ارادہ بدل دیا اور مشاہیرم خان سے بولا۔

”ٹھیک ہے، جیسی تمہاری مرضی۔ مگر میری تو مجبوری ہے۔ مجھے نیاز علی سے بڑی اہم باتیں معلوم کرنی ہیں اس لیے جاؤ۔ جس انداز میں بھی ملے، مجھے تو اس سے ملنا ہی پڑے گا۔“ مشاہیرم خان خود آؤ کے اس ملاقات میں ساتھ ہونے کے خیال سے ابھن کا ٹھیکہ تھا اس لیے اب جو آؤ نے ارادہ بدل کر خوش ہو گیا اور اسے خوش دلی سے رخصت کی دے دی۔ آؤ اس سے مصافحہ کر کے واپس کے راستے کی طرف چل پڑا جب مشاہیرم خان نے نیاز علی کے دروازے پر دستک دی۔ یہ دستک بلند آواز میں لیکن مہذبانہ انداز میں دی گئی تھی۔ دستک کے جواب میں تقریباً سات آٹھ سال کا ایک بچہ دروازے سے باہر نکلا۔

”میرا نام مشاہیرم خان ہے۔ مجھے نیاز علی سے ملنا ہے۔“ اس نے بچے کی سوالیہ نظروں کے جواب میں بتایا تو وہ سر ہلاتا ہوا واپس اندر چلا گیا۔ ایک دو پڑھ منٹ کے وقفے کے بعد دروازے پر ایک دراز قد، گوری رنگت اور مجبوری آٹھوں والا تقریباً چالیس یا پچاس سالہ مرد چھوڑا ہوا۔

”السلام علیکم بھائی مشاہیرم آؤ اندر آ جاؤ۔“ آؤ کی فراہم کردہ معلومات کے برخلاف نیاز علی نے اس سے کافی گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور اسے گھر کے اندر چھپنے کی دعوت دی۔ مشاہیرم خان نے یہ دعوت قبول کر لی۔

”مجھے معلوم ہوا تھا کہ اکرم خان کا بھائی مشاہیرم خان اسکرود آیا ہوا ہے۔ میں اکرم خان کے افسوس کے لیے تم سے ملنا بھی چاہتا تھا لیکن طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ تمہیں معلوم تو ہو گا کہ جن لوگوں نے اکرم خان کو ہلاک کیا، وہ چپ چھپنے کے پتھر میں بھی بھئی ڈھکی کر گئے تھے۔“ گھر کی چٹھک میں کھڑی کر نیاز علی نے ایک وضاحتی سامان دیا لیکن اس کے لچکے سے ظاہر تھا کہ وہ صرف مشاہیرم خان کو سامنے پارک نہیں بنا رہا ہے ورنہ حقیقتاً وہ ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

”مجھے تمہارے زخمی ہونے کا معلوم ہوا تھا۔ میں نے سوچا چل کر حراج پر سی کر لوں۔ ساتھ ہی اکرم خان کے قاتلوں کے بارے میں کچھ پتا سکوتو بڑی مہربانی ہوئی۔“ نیاز علی کی مجبوری آنکھوں سے چٹھکی عیاری کو ظہور انداز کرتے ہوئے اس نے زنی سے درخواست کی۔

”نہیں والوں نے بھی مجھ سے اس بارے میں پوچھا تھا لیکن میں کیا بتا سکتا تھا۔ جن لوگوں نے مجھ سے چپ چھٹی، وہ اپنے چہروں کو کھاب میں چھپائے ہوئے تھے۔ میں نے ان میں سے کسی کی شکل نہیں دیکھی اس لیے ان کے بارے میں کچھ بتا بھی نہیں سکتا۔“ اس بار نیاز علی کا لہجہ قدرے ردھکا ہو گیا تھا۔

”لیکن تم نے ان لوگوں کے بارے میں کوئی تو اندازہ لگا پا ہوگا۔ کم از کم اتنا اندازہ ہی ہو گیا ہوگا کہ وہ لوگ مقامی تھے یا کہیں باہر کے؟“ اندرونی طور پر غصہ محسوس کرنے کے باوجود مشاہیرم خان نے نیاز علی کے سامنے اپنا لہجہ نرمی رکھا۔ نیاز علی جواب میں کچھ بولا، اس سے قتل ہی مشاہیرم خان کی آمد پر دروازہ کھولنے والے حالات آٹھ سال کا بچہ چھوٹی سی گول تھالی میں تھوہے کی بیاباںیں رکھے اندر چلا آیا۔ بچے کی آمد پر نیاز علی اس کی طرف متوجہ ہو گیا اور اس کے ہاتھ سے تھالی لے کر مشاہیرم خان کے آگے رکھی۔ مشاہیرم خان نے دیکھا کہ تھالی میں تھوہے کی بیاباںوں کے ساتھ ایک پشتری میں خشک خوبانیاں بھی رکھی ہیں۔

”لو بھائی! قہر ہو۔“ بچہ تھالی چھانے کے بعد فوراً ہی واپس چلت گیا جبکہ نیاز علی میزبانی کے فرائض اٹھا رہے تھے۔

”تمہارا بیٹا ہے؟“ مشاہیرم خان نے نیاز علی کی بڑھائی ہوئی پشتری میں سے ایک خشک خوبانی اٹھا لے کر بے

اس سے پوچھا۔

”ہاں... میرا اکوٹ چنا ہے۔ اس سے بڑی وہ نہیں ہیں۔ اللہ نے مجھے ایک ہی بیٹا دیا ہے، پر بے بڑا نیک۔ زیادہ سنا نہیں ہے۔ ہر گھم مانتا ہے اور بڑے پختہ لکھنے کا بھی بڑا شوقین ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ یہ پرائمری اسکول پاس کر کے تو اسے کسی بڑے شہر کے اچھے سے اسکول میں داخل کروا دوں گا۔ اچھی جگہ سے پڑھے گا تو اس کا والدہ بڑا ہو کر کہیں اور اچھا افسر لگ جائے گا۔ ذہنی مشق سے بچے کے تو خواب ہی نہیں دیکھتا میں اپنے بیٹے کے لیے۔ یہ ہے بھی اتنا ذہین کہ مجھے یقین ہے کہ میرے سارے خواب ضرور پورے ہوں گے۔“

نیاز علی نے کچھ میں گہری پدرانہ شفقت و محبت سمجھی۔

”اللہ تعالیٰ تمہاری خواہش پوری کرے لیکن یہ بہت بہت مہنگی خواہش۔ خاص طور پر کسی بڑے شہر کے اچھے سے اسکول میں بچے کو داخل کروا کر پڑھانے میں تو بہت خرچ آئے گا۔ ایک تو بڑے اسکولوں کی فیسیں زیادہ ہوتی ہیں دوسرے نہیں بائبل وغیرہ کا خرچ بھی اٹھانا پڑے گا۔“ مشاہیرم خان کو یاد تھا آؤرنے اسے بتایا تھا کہ نیاز علی کے پاس کتنے سے روپے آئے لگے۔ اب جو اس نے بیٹے کے بارے میں اپنی خواہشات کا اظہار کیا تو اسے احساس ہوا کہ آؤرواقعی مع کبہ رہا تھا۔ ورنہ کسی عام آدمی کے لیے تو اتنے مہنگے خواب دیکھنا ممکن نہیں ہوتا۔

”خرچ تو واقعی آئے گا لیکن اولاد کے اچھے مستقبل کے لیے آدمی کو کچھ نہ کچھ ہیرا پھڑ مارنے ہی پڑتے ہیں۔ میں بھی کسی نہ کسی طرح اپنے بیٹے کی اچھی تعلیم کا انتظام کر لوں گا۔“ نیاز علی نے یہ غائب بے نیازی سے جواب دیا لیکن مشاہیرم خان محسوس کر رہا تھا کہ اس کی اس بے نیازی میں ایک خاص قسم کا یقین ہے۔ یوں لگتا تھا کہ اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لیے اسے وسائل کی کتنی کا فزادہ بھی نہ ضرورت ہو۔

”چلو، اللہ تمہارا ساتھ دے۔ میں نے تو یہی یہی ایک بات کہی تھی ورنہ ظاہر ہے کہ تم خود زیادہ اچھی طرح جانتے ہو گے کہ اپنے بیٹے کے لیے کیا کر سکتے ہو اور کیا نہیں؟ میں تو یہاں اپنے بھائی کے قاتلوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے آیا تھا۔ تم نے مجھے بتایا نہیں کہ وہ لوگ مقامی تھے یا نہیں باہر کے تھے؟“ بیٹے کی آمد کی وجہ سے جو سوال حل گیا تھا وہ مشاہیرم خان نے بھڑک رہا۔

”میں یقین سے کہہ نہیں کہہ سکتا لیکن میرے خیال میں وہ کتنے باہر کے ہی لوگ ہوں گے۔ مقامی افراد میں سے تو کوئی بھی ایسی کارروائی کی جرات نہیں کر سکتا۔“ کوئی واضح

جواب دینے کے بجائے نیاز علی نے خیال آرائی کی۔

”تم مجھے وہ جگہ دکھا سکتے ہو نیاز علی جہاں سے حملہ آوروں نے تمہاری جیب چھین لی؟“

”دکھا تو سکا ہوں لیکن تم وہ جگہ دیکھ کر کیا کرو گے؟ وہ تو بالکل ویران اور چٹیل سی جگہ ہے۔ اس جگہ کا پولیس والے پہلے ہی جائزہ لے چکے ہیں اور انہیں وہاں سے ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا جس کے ذریعے مجرموں کی نشان دہی ہو سکے۔“ نیاز علی نے قدر سے حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے ڈانٹنے کی کوشش کی۔

”بس میں ایک بار اپنی تسلی کے لیے وہ جگہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ تم ایک بار مجھے وہاں لے چلو تو تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔“

”ٹھیک ہے تم خد کر رہے ہو تو میں چلوں گا لیکن وہ جگہ یہاں سے کافی دور ہے اور بغیر جیب کے پہنچنا ممکن نہیں۔ وہاں تک جانے کے لیے جیب کا انتظام نہیں خود کرنا ہوگا۔ میں جس فورسٹ بھیجے کے لیے کہہ رہا ہوں، وہ صرف اپنے کام کے لیے ہی مجھے جیب فراہم کرتی ہے۔“ نیاز علی نے ختم دلائے انداز میں باہر بھری۔

”جیب کا مسئلہ نہیں اس کا میں خود انتظام کر لوں گا۔ تم دو کھنڈے بعد تیار رہنا، میں تمہیں لینے آؤں گا۔“ نیاز علی کو کسی قسم کا بہانہ بنانے کا موقع دے بغیر اس نے کہا اور قبضے کی خالی پٹائی رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

”دو کھنڈے بعد... لیکن میری طبیعت ابھی اتنی اچھی نہیں ہے کہ میں گاڑی چلا سکوں۔ سر کی چوٹ کا معاملہ ہے۔ اگر ایک چمک چمک وغیرہ آگیا تو کوئی حادثہ بھی ہو سکتا ہے۔“ مشاہیرم خان کو بالکل تیار دیکھ کر نیاز علی نے ایک اور بہانہ تراشا۔

”اس کی تم فکر نہ کرو۔ مجھے ذرا نیوڑی کا بڑا تجربہ ہے۔ میں آرام سے جیب چلا لوں گا۔ تمہیں صرف میری راہنمائی کرنی ہوگی۔“ مشاہیرم خان نے اس کا یہ بہانہ بھی سسر دکر کے سسٹے کا کل چٹ کر دیا۔ جواباً نیاز علی کے چہرے کے تضادات کچھ تن سے گئے لیکن اب اپنی بھڑکنے کے بعد انکار کرنا بھی ممکن نہیں تھا چنانچہ وہ دنی سے سی سی اسے آمادی ظاہر کرنی پڑی۔ اس کے آمادی ظاہر کرتے ہی مشاہیرم خان اس سے رخصت کے لیے سیدھا ایک فورسٹ بھیجے کے دفتر پہنچا تا کہ وہاں سے جیب حاصل کر سکے۔ فورسٹ پہنچنے والے نمونہ بغیر ذرا نیوڑے کسی کو جیب فراہم نہیں کرتے لیکن اس دفتر میں مشاہیرم خان کا ایک دیرینہ دوست ملازمت کرتا تھا۔ اس کی ضمانت پر اسے جیب فراہم کر دی گئی۔

دو کھنڈے بعد وہ ایک بار پھر نیاز علی کے گھر کے دروازے پر تھا۔

”میری تو کچھ ہی تھیں آ رہا کہ تم وہ جگہ دیکھ کر کیا کرو گے جہاں سے ان فنڈوں نے مجھ سے جیب چھین لی تھی... یہ کار میں تمہارا اور میرا دونوں کا وقت ہی ضائع جائے گا۔“ اسے سامنے دیکھ کر نیاز علی نے منہ ہاتھتے ہوئے ایک بار پھر اسے اس کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔

”بس تم میری تسلی کے لیے چلے چلو۔ اب تو میں کرائے پر جیب بھی لے آیا ہوں۔“ مشاہیرم خان نے اصرار کیا تو نیاز علی کو چارو تا چاراس کے ساتھ جیب میں سوار ہونا ہی پڑا۔ ذرا نیوڑے مشاہیرم خان کر رہا تھا اور نہایت مہارت سے نیاز علی کی راہنمائی میں گاڑی آگے بڑھاتا جا رہا تھا۔ وضاحتیں نہیں گھنٹے کی خاصی مشقت طلب دوازیہ کے بعد وہ لوگ ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں زمین کی رنگت سیلیٹی بالٹ اور ساخت پتھر کی سی تھی۔ یہ علاقہ بالکل ویران اور خیر تھا اور درہنگ کیسی پتھر کی زمین کے سرے پر اسی کی طرح ویران اور خشک پہاڑ کھڑے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

”اس جگہ ان فنڈوں نے مجھے گھیرا تھا۔ اس جگہ سڑک سختی خراب ہے تم دیکھ رہے ہو۔ یہاں سے گزرتے ہوئے ذرا نیوڑو بہت احتیاط سے اور ہلکی اسپید میں گاڑی چلائی پڑتی ہے ورنہ ڈر ہوتا ہے کہ جیب بے قابو ہو کر سڑک کی دوسری طرف کھائی میں گر جائے گی۔“ جیب اغوا کیے جانے کی جگہ کی نشان دہی کرتے ہوئے نیاز علی نے مشاہیرم خان کی توجہ راستے کی نشانی کی طرف مبذول کروائی۔ وہ سچ کہہ رہا تھا۔ سڑک کی حالت واقعی کافی خراب تھی اور اس کی ایک جانب موجود اونچے لینڈ اسکیپ کے مقابلے میں دوسری طرف گہری کھائیاں تھیں۔ سڑک کو یہاں کھائی کے قریب سے گزرتا بھی سمجھو یہ بھی کیونکہ اسے جا کر جہاں سے پہاڑی سلسلہ شروع ہوتا تھا وہاں راستہ تنگ ہو گیا تھا اور کسی اور ذریعے سے سڑک گزرا نہ ممکن نہیں تھا۔

”میری جیب چھیننے والے فنڈے شاید اس پہاڑ کے چھبے چھبے ہوئے تھے۔ میں راستے پر توجہ ہونے کی وجہ سے دھیان نہیں دے سکا کہ وہ کس طرف سے آئے تھے۔ بس مجھے تو ایسا لگا کہ وہ بالکل اچانک میرے راستے میں آکھڑے ہوئے ہوں۔“ نیاز علی تفصیلات بتا رہا تھا جبکہ مشاہیرم خان نے جیب کو سڑک سے اتار کر گھڑ میں پرایک طرف روک لیا تھا اور ارد گرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ علاقے کا معائنہ کرتے ہوئے اسے نیاز علی کی بات کافی درست محسوس ہو رہی تھی۔ اس سے جیب چھیننے والے فنڈوں کو اصولاً پہاڑی کے چھبے

ہی چھپا ہونا چاہیے تھا۔ مکمل جگہ موجود ہونے کی صورت میں تو وہ فوراً ہی نظروں میں آ جاتے۔ وہ ٹھٹھا ہوا بخر پہاڑی کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ نیاز علی بھی اس کے پیچھے ہی تھا۔ وہ قریب پہنچ کر پہاڑی کا جائزہ لینے پر چونک گیا۔ وہ بلند پہاڑی یقیناً چھیننے والوں کے لیے بہترین جائزہ گاہ ثابت ہو سکتی تھی لیکن اس صورت میں کہ اس کے پیچھے کچھ جگہ موجود ہوگی لیکن اس پہاڑی کے پیچھے تو بالکل بھی جگہ نہیں تھی۔ گھوم کر پہاڑی کی دوسری طرف جانے کی کوشش کرنے والے مشاہیرم خان نے اپنی کوشش میں ناکامی کے بعد بھی خیر انداز میں سر گھما کر نیاز علی کی طرف دیکھا۔ اس کی نظروں کی معنی بخیزی نے نیاز علی کو بولھلا دیا۔ وہ خود بھی وہ بات محسوس کر چکا تھا جسے مشاہیرم خان نے نوٹ کیا تھا۔ پہاڑی کی دوسری طرف کسی شخص کے کھڑے ہونے کے لیے بالکل بھی جگہ نہیں تھی۔ دوسری طرف بالکل ویسی ہی گہری کھائی تھی جیسی سڑک کے دائیں جانب موجود تھی۔

”تم کہتے ہو کہ وہ فنڈے اس پہاڑی کے چھبے چھبے ہوئے تھے لیکن یہاں تو چھیننے کی جگہ ہی نہیں ہے۔“ مشاہیرم خان واپس چلا اور نہایت چھپکچی سے نیاز علی سے بولا۔

”میں نے شاید کہا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ یہیں اور پیچھے ہوں۔“ نیاز علی نے بولھلائے ہوئے انداز میں مقامی جوش کی۔

”نہیں اور کہاں چھپ سکتے تھے وہ لوگ؟ سڑک کے دائیں جانب گہری کھائی ہے جہاں کوئی چھپ ہی نہیں سکتا۔ اب بائیں جانب کا علاقہ ہی رہا جاتا ہے اور یہ اتنا کھلا ہے کہ تم دور سے اسے ان لوگوں کو دیکھ سکتے تھے۔“ اب مشاہیرم خان کے لہجے میں ذرا اندھیری آئی تھی۔

”لیکن میں نے انہیں نہیں دیکھا۔ ہو سکتا ہے وہ زمین سے چپک کر لیٹے ہوئے ہوں اس لیے میری ہی ان پر نظر نہیں پڑ سکی ہو۔“ نیاز علی نے ایک اور دلیل دی جو قدرے معقول تھی۔ اس جگہ کی زمین واقعی ایسی رنگت کی تھی کہ اگر کوئی کھٹے پلٹے رنگ کے پتے پہن کر اس سے چپک کر لیٹ جائے تو بے دھنیاں میں گزرنے والے کو کسی کی موجودگی کا احساس نہیں ہو سکتا تھا لیکن مشاہیرم خان، نیاز علی کی طرف سے ٹھٹھا چکا تھا۔ پہلے آؤری کی فراہم کردہ معلومات اور اب نیاز علی کا بولھلا ہوا رویہ اس کے ذہن میں شک پیدا کر رہا تھا۔ زمین میں موجود خشک ہے ہی اسے راہ بھائی اور اسے ایک اہم نکتے کا خیال آیا۔

”تمہاری جیب چھیننے والے فنڈے خود یہاں تک کیسے پہنچے تھے؟ یہ جگہ ایسی تو نہیں کہ یہاں تک کوئی پیدل آ سکے۔ وہ

لوگ حقیقتاً کسی جیب میں ہی یہاں تک آتے تھے۔ اگر وہ جیب میں آئے تھے تو انہوں نے اپنی جیب کہاں چھپائی تھی؟" نیاز علی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے یہ سوال کیا تو وہ واضح طور پر ہولکھٹا گیا اور اپنی اس ہولکھاہٹ کو چھپانے کے لیے غصے کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے نہیں پتا کہ وہ لوگ یہاں کیسے آئے تھے اور کہاں چھپے تھے؟ میں نے تمہاری درخواست پر نہیں جانے تو وہ دکھا دی ہے۔ اب تمہیں جو دیکھنا ہے اور معلوم کرنا ہے، خود ہی معلوم کر لو۔ میں تمہارے سوالوں کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔"

"مجھے جو دیکھنا تھا وہ تو دیکھ چکا ہوں لیکن جو معلوم کرنا ہے، وہ تم سے معلوم کروں گا اور تمہیں میرے ہر سوال کا جواب دینا پڑے گا۔" اس کا جواب سن کر مشاہیر خان جارجا انداز میں اس کی طرف بڑھا۔

"خبردار اچھے سے دور رہو ورنہ میں تمہیں گولی مار دوں گا۔" نیاز علی نے اس سے بھی زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی جیب سے مہل نکال کر اس پر تان دیا۔

"تمہاری اس حرکت سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر کم خان کے ساتھ جو کچھ ہوا تم خود بھی اس میں شامل تھے اور جیب پیچھے جانے کا ڈراما کر کے تم نے پولیس والوں کو بے وقت بنانے کی کوشش کی ہے۔" اپنی طرف سے مہل کی طرف دیکھتے ہوئے مشاہیر خان نے پریقین لہجے میں کہا۔ نیاز علی کے مہل نکال لینے کے بعد وہ بے شک اپنی جگہ پر رک گیا تھا لیکن اس کے لہجے اور انداز میں خوف زدگی کا ڈراما شاید تک نہیں تھا۔ وہ پوری طرح ہنس مکھ اور مطمئن نظر آ رہا تھا۔

"تم جو چاہو بھگھو۔ میں کبھی چوک نہیں کہ میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔" نیاز علی نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا اور مشاہیر خان پر نظر جمائے جمائے ٹھکانا لہجے میں بولا۔ "تم اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر سر پر رکھو اور اس وقت تک اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا جب تک میں یہاں سے چلا نہ جاؤں۔ اگر تم نے میرے حکم کی خلاف ورزی کی تو پورا رکھنا کہ میں بلا تکلف تمہیں گولی مار دوں گا۔"

نیاز علی کا انداز کسی ایسی ہی کا ساتھ جو بند کمرے میں پھنس گئی ہو اور باہر نکلنے کی خواہش میں سامنے آنے والے انسان کا زخراہ پیدا کرنے میں بھی عار نہ سمجھے۔ اس کے لہجے کی خوش خواری دیکھتے ہوئے مشاہیر خان نے اس کے حکم کی تعمیل کی لیکن اب بھی وہ گھبرا ہوا یا پریشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے اپنی نظریں نیاز علی پر گاڑ رکھی تھیں۔ وہ اس پر مہل تانے والے قاتلوں میں سے ایک تھا۔ مشاہیر خان کو

اس کا ارادہ بھانپنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ اسے اس دیرانے میں چھوڑ کر خود جیب میں فرار ہونے کا سوچ رہا تھا۔ اگر اسے آسانی سے جیب تک پہنچنے کی مہلت دے دی جاتی تو اسے اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے میں کوئی مشکل پیش نہ آتی۔

مشاہیر خان کو جب سے اترتے وقت چانی نکالنے کا خیال نہیں آیا تھا اور چانی ہنوز انہیں میں لگی ہوئی تھی۔ نیاز علی ایک بار جیب تک پہنچ جاتا تو اسے وہاں چھوڑ کر گھر میں ہوا ہو سکتا تھا۔ اسے اپنے اس دیران مقام پر رہ جانے کی تو فکر نہیں تھی کہ کبھی نہ کبھی کوئی نورس یہاں سے گزرتا تو وہ اس سے ٹپ سے مل سکتا تھا ورنہ دوسری صورت میں پیدل چل کر آگے ایسے ہی مقام تک جایا جاسکتا تھا جہاں سے سواری کا کوئی بندوبست ہو جاتا لیکن اصل مسئلہ نیاز علی کا تھا۔ وہ ایک بار ہاتھ سے نکل جاتا تو پھر وہ بارہ اسے گھیرتا اور اس سے کچھ معلوم کرنا بہت مشکل ہوتا۔ مشاہیر خان نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے بل پر بھی میں سے سارا حساب کتاب کیا اور اپنے ارد گرد ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ اس کی دائیں جانب کے قریب چنداچ کا ایک ٹیکسیکلا چھڑا ہوا تھا۔ اس چھڑے نظروں کی گرفت میں آتے ہی وہ فیصلہ کن قدم اٹھانے کے لیے تیار ہو گیا اور بے حد تیزی سے دائیں جانب گولہ باریت بنے تھے انداز میں حرکت دی۔ اس کی ٹوکروں سے ہر کے قریب پڑا چھڑے زمین سے اڑا تھا اور قوس کی صورت میں حرکت کرتا ہوا نیاز علی کی طرف بڑھا۔ نیاز علی جو اس پر نظر میں جمائے ہوا تھا، اس کی حرکت پر ہلک گیا اور بنا وقت فارغ دار ڈاڑھ لایا لیکن مشاہیر خان اس ٹوکروں کے لیے پہلے ہی سے تیار تھا اس لیے اس کے فائر کرنے سے قبل ہی نیچے بیٹھ گیا تھا۔ اس کا پھرتی سے بھٹکانا اس کے کام آیا اور کوئی چنداچ کے فاصلے سے اس کے سر کے اوپر سے گزرنی۔ اس وقت میں اس کا نیاز علی کی طرف اچھا لایا چھڑے بھی اپنا کام دکھا چکا تھا۔ بہت حساب کتاب سے چھپنے گئے چھڑے نے فائر کے اگلے لمبے ہی مہل کو ضرب لگائی اور مہل اچھل کر نیاز علی کے ہاتھ سے نکلنے کے بعد لڑھکنا ہوا نظروں کے سامنے سے غائب ہو گیا۔ مہل کے غائب ہونے ہی نیاز علی کی خود اعتمادی بالکل جواب دے گئی اور وہ پلٹ کر جیب کی طرف بھاگ گیا لیکن مشاہیر خان کب چوکنے والا تھا۔ اس نے ایک لمبی جست لگائی اور چند سینکڑوں میں ہی اسے چھاپ لیا۔ نیاز علی نے جب فرار کی راہ مسدود کی تو وہ بد مقابلے کے لیے فرار ہوا اس کی طرف پلٹا۔ بیٹھے اس مہل میں اسے ایسی خاصی طاقت صرف کرنی پڑی تھی کہ اس کی

گردن اور ایک بازو مشاہیر خان کی گرفت میں تھے۔ بیٹھے کے ساتھ ہی اس نے باقاعدہ اپنے دائیں ہاتھ کا مٹا کر مشاہیر خان کے منہ پر مارنے کی کوشش کی۔ مشاہیر خان نے ہچکچاہٹ کے لیے اپنا چہرہ پیچھے کر لیا لیکن پھر بھی نیاز علی کے نکلنے سے مکمل طور پر متوجہ نہیں رہا اور پھٹکا ہوا سا وار اس کے رخسار پر لگا۔ اس معمولی چوٹ نے ہی ہالیک کی ایک عظیم چوٹی کے ہم نام مشاہیر خان کو غضب ناک کر دیا۔ وہ پہاڑوں کا بیٹا تھا۔ اس نے پہاڑوں کی گود میں پرورش پائی تھی۔ اس کا باپ ساری زندگی پہاڑوں کو کسر کرتا ہوا آخر کار انہی کی آغوش میں جایا ہوا تھا۔ اس پہاڑ آتش فشاں نے اپنے بیٹے کا نام ایک پہاڑی چوٹی کے نام پر رکھا تھا تو کچھ سوچ کچھ گری رکھا تھا۔ شاید وہ اپنے بیٹے کو پہاڑ جیسا ہی مضبوط دیکھنا چاہتا تھا۔ بہر حال وہ جو بھی رہی ہو، بڑے بے کہ جب پہاڑ نہ بہر بان ہو جائیں تو ان کے آگے کسی کی نہیں پھٹتی۔ پہاڑوں کا غضب سہتا کسی کے بس میں نہیں ہوتا۔ مشاہیر خان بھی فیض میں آیا تو نیاز علی کی ڈرا چیٹ نہ چلی۔ مشاہیر خان نے اسے در بے دیوانی کی زد پر رکھا۔ ساتھ ہی اس کی انگلیں بھی مسلسل چل رہی تھیں۔ آخر کار نیاز علی بے حال ہو کر نیچے پڑا۔

"تاکون تھے وہ لوگ جنہوں نے میرے بھائی کی قوتوں کیا اور ہماری مہمان لڑکی کو اغوا کر کے لے گئے؟" مشاہیر خان نے اپنا گھٹنا اس کے سینے پر رکھ کر اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں کی سخت گرفت میں لیتے ہوئے پوچھا۔

"مہ... مجھے نہیں معلوم۔" نیاز علی نے خوف زدہ لہجے میں انکار کیا۔ اس کے اس انکار نے مشاہیر خان کو مزید غضب ناک کر دیا۔ اس نے اپنے دائیں ہاتھ کو حرکت دی اور اس کی دو انگلیوں کو نیاز علی کے گھٹنوں میں ڈال کر اس پر زور سے دباؤ ڈالا کہ اس کے گھٹنے جڑ سے گئے۔ تکلیف کی شدت سے نیاز علی کسی ذرا کیے جانے والے بکری کی طرح چیخنے لگا۔

"مجھ پر اس وقت خون سوار ہے نیاز علی! میرا بیٹا اپنے جوان بھائی کی موت کے غم سے مہل رہا ہے۔ چاہے صرف اسی صورت ہی مجھ سقتی ہے کہ میں بھائی کے قاتلوں کو ان کے انجام تک پہنچا دوں اور اپنی مہمان لڑکی کو ان کی گرفت سے نکال لاؤں۔ اگر تو نے میرے اس ارادے کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی اور مجھے جک نہیں بتایا تو پھر سے بیٹے میں ملتی آگ سب سے پہلے تجھے ہی کھم کر ڈالے گی۔" مشاہیر خان کے چہرے پر بالکل دیکھی سرفی چھائی ہوئی تھی جیسی آگ کے قریب میں موجود کھس کے چہرے پر

دیکھنے میں آتی ہے۔ وہ بالکل سچ کہہ رہا تھا کہ اس کے سینے میں آگ لگی ہوئی ہے۔ اس آگ کے شعلوں کا دھس اس کے چہرے پر دیکھا جاسکتا تھا۔

"وہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔ میں نے جنہیں کچھ بتایا تو وہ مجھے اور میرے بیوی بچوں سب کو مار ڈالیں گے۔" نیاز علی تقریباً رونا پڑا تھا۔

"اس وقت میں بھی تمہارے لیے کسی حاد سے کم نہیں ہوں۔ تم نے اگر مجھے ان لوگوں کے بارے میں نہیں بتایا تو میں بھی انہیں مار ڈالوں گا اور وہ بھی آسانی سے نہیں بڑا پڑا کر بے حد اذیت کے ساتھ۔" نہایت سفاکی سے جواب دیتے ہوئے مشاہیر خان نے اس کے گھٹنوں میں ڈالی ہوئی انگلیوں کو ایک بار پھر چیٹ دی۔ نیاز علی کے حلق سے ایک بار پھر چیخ برآمد ہوئی۔

"کیوں انہیں ہیں وہ لوگ... تمہارا ان فنڈوں سے کیا تعلق ہے؟" اس کے چہرے کی پروا کیے بغیر مشاہیر خان نے پوچھا۔

"وہ کون ہیں، میں نہیں جانتا۔ بس یہ معلوم ہے کہ وہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔" نیاز علی نے سہا سہا لہجے میں بتایا۔

"تمہارا ان لوگوں سے کیا تعلق ہے؟ تمہیں وہ کیسے اور کہاں ملے؟" مشاہیر خان نے اپنا سوال ڈرا سے اٹھانے کے ساتھ دہرایا۔

"وہ خود میرے پاس آئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر میں... ان کا ایک معمولی سا کام کر دیا کروں تو بدلے میں مجھے کافی بڑی رقم ملا کرے گی۔ میں اپنے بچوں کے اچھے مستقبل کے لیے رقم کے لالچ میں آ گیا پھر کام بھی کوئی خطرے والا نہیں تھا۔ انہوں نے مجھ سے مطالبہ کیا تھا کہ میں جب کسی انتہائی قیمتی ٹیم کو واپس لینے جاؤں تو انہیں راشن اور ادویات وغیرہ سپلائی کر دیا کروں۔ بس میں ان کے لیے یہ کام کرتا تھا اور بدلے میں مجھے ایسی رقم مل جاتی تھی۔ اس بار میں انہیں راشن پہنچانے گیا تو انہوں نے مجھ سے میری جیب ڈاکھ لی۔ ظاہر ہے، میں اس طرح انہیں جیب نہیں دے سکتا تھا۔ دے دیا تو اپنی بھئی کے مالک کو کیا جواب دیتا کہ میں وقت پر تم کو لینے کیوں نہیں پہنچا۔ مالک کے سوال جواب سے منجھ کے لیے سم نے جیب پیچھے جانے اور مجھے بے ہوش کرنے کا ڈراما کیا۔ پولیس والوں سمیت سب نے اس ڈرامے پر یقین کر لیا لیکن تم کو پتا نہیں گئے شک پڑ گیا۔ مگر یقین کرو خان! مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ لوگ مجھ سے جیب کے لے کر کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے مجھے کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ بس یہی کہا تھا کہ انہیں اپنے

ایک کام کے لیے چند گھنٹوں کے لیے جیپ چاہیے۔ اس خدمت کے لیے انہوں نے مجھے رقم بھی دی تھی۔ نہیں دیتے، تب بھی میں انہیں انکار نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔ میرے انکار پر مجھے میں آکر مجھے قتل بھی کر سکتے تھے۔" نیاز علی کے لہجے میں واضح خوف تھا۔

"تم انہیں راشن کس جگہ پہنچاتے ہو؟" اس کی بتائی ہوئی تفصیلات سن کر مشاہیرم خان نے پرسوج انداز میں سوال کیا۔ "کسی ایک جگہ نہیں۔ راشن بھیجنے والے جب مال میرے حوالے کرتے ہیں تو اس وقت جگہ کے بارے میں بتاتے ہیں۔"

"کون ہیں وہ لوگ؟ کیا یہیں اسکردو میں رہتے ہیں؟" مشاہیرم خان اس کا جواب سن کر چونکا۔

"میں ان لوگوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" نیاز علی نے جواب دیا لیکن یہ جواب دیتے ہوئے اس نے جس طرح نظریں چرائی تھیں اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ غلط بیانی سے کام لے رہا ہے۔

"جھوٹ مت بولو نیاز علی! یہ ممکن ہی نہیں کہ جو لوگ اسے عرصے سے مسلسل تم سے یہ کام لے رہے ہیں، تم ان میں سے کسی کو پہچانتے ہی نہ ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم ان لوگوں کے بارے میں جانتے ہو گے۔ آخر راشن کی وصولی اور اپنی خدمت کا معاوضہ لینے کے لیے تمہیں کسی سے تو ملنا پڑتا ہوگا۔ تم مجھے ان لوگوں کے بارے میں بتاؤ۔" پہاڑوں میں ٹھکانا بنا کر رہنے والوں کے بارے میں تو مشاہیرم خان یقین کر سکتا تھا کہ وہ نیاز علی کے لیے اپنی ہی ہوں گے۔ جو لوگ سب سے چھپ کر پہاڑوں میں اپنا مکان بناتے ہوئے تھے ان کے بارے میں یہ بات سنی تھی کہ انہوں نے اپنی شناخت چھپائے رکھنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی ہوگی لیکن اسکردو شہر میں وہ کر نیاز علی سے کام لینے والے کا پردے میں رہنا ممکن نہیں تھا۔

"میں نے کہہ دیا تا کہ میں کسی کو نہیں جانتا تو پھر تم کیوں زبردستی میرے پیچھے پڑے ہوئے ہو؟" نیاز علی نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں اسے جواب دیا اور یک دم ہی اسے دھکا دے دیا۔ مشاہیرم خان جو نیاز علی کو گتوان پر آباد دیکھ کر اسے قدرے ڈھیلا چھوڑ چکا تھا، اس اچانک دھکے کو سہار نہیں سکا اور پیچھے کی طرف الٹ گیا۔ اس کے گرتے ہی اب تک بے بس پڑے نیاز علی نے پھرتی کا مظاہرہ کیا اور تیزی سے کھڑا ہو کر چپ کی طرف دوڑا۔ مشاہیرم خان کے سنبھل کر کھڑا ہونے تک وہ جیپ کے قریب کچل چکا تھا۔

مشاہیرم خان کو اندازہ ہو گیا کہ وہ نیاز علی کو نہیں پکڑ سکے گا پھر بھی وہ اس کی طرف دوڑا لیکن اس دوڑ بھاگ کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس کے کچھ بھی کرنے سے قبل نیاز علی جیپ میں بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کر چکا تھا۔ مشاہیرم خان نے پھلانگ لگائی کہ کسی طرح جیپ میں سوار ہو سکے لیکن اس کی یہ کوشش بھی ناکام رہی۔ اس کی انگلیاں صرف جیپ کی باڈی کو مس ہی کر سکی تھیں کہ جیپ بجھنے سے آگے بڑھ گئی۔ بے بس سازشیں پر مگر مشاہیرم خان ابھی کتبہ افسوس ہی مل رہا تھا کہ اگلے پل دم پہ خود وہ گیا۔ اس کی دسترس سے نکل جانے والی جیپ توازن پر قرار نہیں رکھ سکی اور بے قابو ہو کر سڑک کی دوسری طرف موجود کھائی میں لڑکھ کھئی۔ شاید غلط اور گھبراہٹ کے باعث نیاز علی جیسا تجربہ کار ڈرائیور غلطی کر بیٹھا تھا۔

مشاہیرم خان ٹو بھر کے لیے شاک کی کیفیت میں مبتلا رہنے کے بعد اپنی جگہ سے اٹھا اور کھائی کی طرف دوڑا۔ سڑک پر کھائی کے کنارے کھڑے ہو کر اس نے جھک کر نیچے کی طرف جھانکا۔ بے قابو ہو کر سڑک سے گرنے والی جیپ لڑکھائی ہوئی کافی نیچے تک پہنچ چکی تھی اور ابھی لڑکھنے کا عمل جاری تھا۔ موجودہ صورت حال دیکھ کر بغیر کسی فکر و شبہ کے یہ بات بھی جا سکتی تھی کہ نیاز علی کی زندگی کا چراغ جل رہا اب ممکن نہیں تھا۔ لمحوں میں لڑکھتی ہوئی جیپ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ جیپ کے غائب ہو جانے کے بعد مشاہیرم خان ایک گھبراہٹ میں لپٹا ہوا پیچھے ہٹا اور سڑک پر پیدل چلنے لگا۔ اب اس کے واپس شہر پہنچنے کا انھیں اسی بات پر تھا کہ کوئی سواری اتفاق سے اس طرف آنکے اور اسے لفت مل جائے۔ کچھ دیر قبل نیاز علی نے اسے اس دیرالے میں چھوڑ کر فرار ہونے کا جو منصوبہ بنایا تھا، اس میں وہ بہر حال کامیاب ہو گیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ اپنے ارادے کے مطابق یہاں سے نکل کر واپس شہر کی طرف سفر کرنے کے بجائے بیشک واپسی کے سفر پر روانہ ہو گیا تھا۔ یہ وہ سفر تھا جس پر جانے کا ارادہ بھی کوئی نہیں باندا تھا لیکن بالآخر اسے اس راستے پر سفر کے لیے قدم اٹھانے ہی پڑے ہیں۔ نیاز علی کی واپسی کا سفر بھی قدرت کے ملے کر وہ وقت پر شروع ہو گیا تھا اور اس سفر کے دوران ہی اس کو یہ جانتا تھا کہ دنیا کی چند روزہ زندگی کے آرام کے لیے وہ جو مال و زر جمع کر رہا تھا، اس نے اس کا سفر آخرت کتنا مشکل بنا دیا تھا۔

☆☆☆

"کیا حال ہیں چودھری صاحب اسفری تھکن اتر گئی؟" نہیں "گرم گرم کافی سے لطف اندوز ہوتے چودھری نے

کرتے ہوئے اس میں اپنے لیے ایک سوئٹ بک کروایا اور
 وینٹر کا رہنمائی میں اس شان دار سوئٹ میں جا پہنچا۔ یہاں
 پہنچ کر اس نے وقت دیکھا تو معلوم ہوا کہ سوا بارہ بجے
 ہیں۔ ڈیوڈ نے اسے ایک بیچے نامترا اسکواڑ بلایا تھا۔ یعنی اپنی
 تیاری اور وہاں تک کا سفر طے کرنے کے لیے اس کے پاس
 شخص پان گھنٹا تھا۔ اس پان گھنٹے کو اس نے ذرا بھی ضائع
 نہیں کیا۔ یہ تھا ایک جتنے میں ابھی دو تین منٹ باقی تھے کہ وہ
 نامترا اسکواڑ پہنچ چکا تھا۔ نیو یارک کے اس چمروٹق علاقے
 میں وہ پہلے بھی کئی بار چکا تھا اور اس کے تارنگی پس منظر سے
 واقف تھا۔ آج کا مصروف ترین نامترا اسکواڑ انیسویں صدی
 تک "لوئیک ایکٹر" کہلاتا تھا۔ 1904ء میں جب مشہور
 زمانہ اخبار "نیو یارک ٹائمز" کی قمارت اس علاقے میں
 کھڑی کی گئی تو اس بلند عمارت کی مناسبت سے اس جگہ کو
 "ٹائمز اسکوائر" پکارا جانے لگا۔ ماضی میں یہ جگہ کچھ اچھی
 تصور نہیں کی جاتی تھی۔ یہاں فنڈوں کا رائج تھا۔ بعد میں
 جولیا نوام کے ایک میسر نے اس علاقے کی اصلاح کی اور
 یہاں سے فنڈ ادا کرنا شروع کیا۔ اب یہ جگہ کافی پراسن تھی
 جہاں لوگ آنا اور مختلف سرگرمیوں میں حصہ لینا پسند کرتے
 تھے۔ ماضی کے نامترا اسکواڑ کے مقابلے میں اب یہاں شوقیہ
 کاروں، کاروباری افراد، ضرورت مندوں اور سیاحوں
 وغیرہ کا رائج تھا۔ چودھری کی بارے دیکھنے منظر پر سرسری
 نظر ڈال کر آئے ہوتا چلا گیا۔ بالآخر اس کی نظریں پر مشہور
 بکسوں کو دوڑائی کو چوان لڑکیوں کا جائزہ لیتے ہوئے ایک
 ایسی لڑکی پر جو ٹھہریں جو شہر کو بے شک اپنی دوسری
 ساتھیوں سے بڑھ کر خوب صورت نہیں تھی لیکن اس کا جسم
 غصے کا پرکشش تھا۔ وہ بھی طور پر اپنی اس جسمانی کشش
 سے اچھی طرح واقف تھی اس لیے اس نے خود کو ایک پیوز
 کرنے کا منصوبہ ہی انجام کر رکھا تھا۔ چودھری کو یقین تھا کہ
 بھی میں جیتنے کے شوقین افراد میں سے بہتر افراد کا انتخاب
 اسی لڑکی کی بھی ہوتی ہوگی۔ خود اس کا دل لڑکی کی بھی میں
 جیتنے کر میر کرنے کو چاہتا تھا۔ میر کے بہانے وہ اس کے من
 سے غائب کا اور بھی زیادہ تریب سے نگاہ کر سکتا تھا۔ ابھی وہ
 اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لیے قدم اٹھانے کا ارادہ کر رہی
 رہا تھا کہ کسی کے شانے پر ہاتھ رکھنے پر چونک کر پلٹا۔ وہ ڈیوڈ
 تھا جو اس کے بالکل قریب کھڑا سرگرم تھا۔
 "ہیلو چودھری صاحب! یہ دیکھ کر خوش ہوئی کہ آپ
 وقت کے کافی پابند ہیں۔" چودھری کو اپنی طرف متوجہ ہونا
 دیکھ کر وہ شہتہ اردو میں بولا۔ "چودھری اس کی اردو دانی کو

کی صلاحیت تھی تو لمبی سڈول ٹائیکس قدموں سے پلٹ جانے
 پر مجبور کرتی تھیں۔
 "میر کی دوست ابتدا ہے۔ اسے میں نے خاص طور
 پر آپ کی میزبانی کے لیے یہاں بلوایا ہے۔" ڈیوڈ نے اس
 قافلہ حید سے اس کا تعارف کروایا تو اس نے جواباً مسکراتے
 ہوئے چودھری سے مصافحہ کیا۔ یہ ایک نہایت چمکوتہ معائنہ
 تھا جس کے دوران ڈیوڈ نے چودھری کے ساتھ کو مخصوص انداز
 میں دبا کر یوں آگئی سے آزاد کیا کہ وہ اس دباؤ کی
 سنسٹاٹ اپنے پورے جسم میں محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔
 "میر نے خیال میں پہلے بچ کر لیتے ہیں پھر بعد میں
 اطمینان سے جیت کر گفتگو کرتے ہیں۔" چودھری کے سرخ
 پرستے ہوئے چہرے کا سرسری نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے
 ڈیوڈ نے خیال ظاہر کیا۔ اپارٹمنٹ میں قدم نہ رکھتے ہی ڈیوڈ کی
 موجودگی کے باعث ان کے درمیان گفتگو کے لیے انگلیں کا
 استعمال ہونے لگا تھا۔ چودھری اگرچہ اپنے مخصوص لب و
 لہجے میں گفتگو کا پادہ پسند کرتا تھا لیکن اگر بڑی سے ناچاہتیں
 تھا۔ جس طرح اس نے اپنے بیٹے کے لیے بہترین تعلیم کا
 بندوبست کیا تھا، اسی طرح اس کے باپ نے بھی اس کی
 شخصیت کو مکمل کرنے کی کوشش کی تھی۔ بس فرق یہ تھا کہ اس
 کے پاس بیٹے جیسی بھاری بھر کم ذکر یاں نہیں تھیں اور تربیت
 کا کوئی غیر معاملہ ہی الگ تھا۔ وہ دوسروں پر سحرانی کرنے
 والے لوگ تھے جو چاہے ان کی تربیت کتا یوں میں درج
 اخلاقیات کے اصولوں پر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا
 تھا۔ چودھری اور اس سے قبل اس کے آباؤ اجداد کی تربیت
 سحرانی کرنے والوں کے اپنے کے گرد اصولوں پر ہوتی
 رہی تھی۔ جانے کیسے چودھری کی مراد شاہ پر گرفت ڈرا کر اور
 پرانی اور وہ اپنے خاندان کے مردوں سے مختلف تھی آیا۔
 شاید یہ کئی سال اپنے ماحول سے دور ایک آلفو معاشرے
 میں رہنے کا اثر تھا۔ اس آژاد ماحول میں وہ کر اسے جو کچھ
 مناسب محسوس ہوا اسے اپنا تھا اور اب نتیجہ وہ اپنے باپ
 دادا سے بالکل مختلف تھا۔
 "ڈیوڈ سچ کہہ رہا ہے چودھری صاحب! انجی تیار
 ہوئے کافی دیر ہو چکی ہے، اگر ٹھنڈا ہو گیا تو لطف نہیں دے
 گا۔" ڈیوڈ نے ڈیوڈ کی تائید کرتے ہوئے چودھری کا بازو تھما
 اور اس حصے کی طرف بڑھ کر جسے ایک میٹن سے پر دے کے
 ڈرے لے لاؤنچ سے الگ کر کے وہاں آٹھ کر سیوں والی
 ڈائنگ ٹیبل رکھی تھی۔ لاؤنچ میں رکھے سامان کی طرح یہ
 ڈائنگ ٹیبل اور اس پر بھی کرکاری بھی ہے بدشانہ دارگی۔

چودھری کے لیے اس شان و شوکت سے مرعوب ہونا ممکن نہیں
 تھا کہ خود اس کی مدرس میں دنیا کی ہر نعمت موجود تھی لیکن اس
 کا ذہن حساب کتاب ضرور لگا رہا تھا کہ ایک انجینئر کی تنگی
 آمدنی ہو سکتی ہے جو وہ اپنے اپارٹمنٹ میں اپنی پیش قیمت اشیا
 جمع کر سکے۔ ابتدا کی خوب صورت میزبانی میں سچ سے لطف
 اندوز ہوا گیا۔ ڈائنگ ٹیبل پر انگریزی کی کتابوں کے علاوہ وین
 بیک مشرقی کھانے بھی موجود تھے۔ ابتدا خود بڑھ چڑھ کر ہر
 شے چودھری کو پیش کر رہی تھی۔ پہلو میں بیٹھ کر مسلسل آج
 دیتے شایب اور سامنے رکھی شراب سے لطف اندوز ہوتے
 ہوئے وہ کتنا کھا گیا، اسے اندازہ نہیں ہوا۔ اس کا ساتھ
 دینے والے ابتدا اور ڈیوڈ البت بہت محتاط انداز میں کھا پانی
 رہے تھے۔ چودھری کو تاگ تک مختصا دینے کے بعد جب
 وہاں خدمت کے لیے مامور اجیر عمر میڈ ڈائنگ ٹیبل صاف
 کر رہی تھی تو ڈیوڈ کا میل فون بجنے لگا۔ اس نے چودھری اور
 ابتدا کی طرف دیکھتے ہوئے انکسلی زنی کہا اور کال ریسیو
 کر لی۔ موبائل پر کی جانے والی اس کی یک طرفہ گفتگوں کر
 اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے کھیں آئے پر مجبور کیا جا رہا ہے جس
 کے لیے وہ راضی نہیں۔ پھر یوں لگا کہ جیسے اس نے بالآخر
 مجبور ہو کر ہتھیار ڈال دیے ہوں۔
 "کیا بات ہے ڈارلنگ! تم کچھ پریشان لگ رہے
 ہو؟" اس کے موبائل آف کرتے ہی ابتدا نے اس سے پوچھا۔
 "ہاں، اصل میں ہاس کی کال تھی۔ اس نے سی
 پراجیکٹ پر سٹیشن کے لیے بینک رکھی ہے اور اس بینک
 میں میری شرکت کو ضروری قرار دے رہا ہے۔ لیکن مجھے
 چودھری صاحب کو چھوڑ کر کہیں جانا اچھا نہیں لگ رہا۔"
 "یہ کوئی اتنا بڑا پراجیکٹ نہیں ہے کہ تم جاؤ اپنی بینک
 انیڈ کرو، اپنی دیر میں چودھری صاحب کو بھی دینی ہوں۔"
 ابتدا نے گویا پہلی بھاتے میں مسئلہ حل کیا اور چودھری کی
 طرف رخ کرتے ہوئے بولی۔ "آپ کو کوئی اعتراض نہیں
 ہے چودھری صاحب؟ آپ تو سنا ہے نیو یارک کے اپنی
 گھونٹے پھرنے اور تفریح کے ارادے سے ہیں۔ مجھے یقین
 ہے کہ ڈیوڈ کے آنے تک آپ اگرچہ وقت میری تنگی میں
 گزاریں تو بڑبڑ کر رہیں ہوں گے۔" یہ بات کہتے ہوئے
 ابتدا کے بھرے بھرے ہونٹوں پر ایسی ہلاہلا جی مسکراہٹ تھی
 کہ چودھری جیسا پانی تو دور کی بات، کوئی زہر منگ بھی ہوتا تو
 ایک لمحے کے لیے سرور ڈھکا جاتا۔
 "مجھے کوئی اعتراض نہیں مسٹر ڈیوڈ! میں آج ہر اردن
 فارغ ہی ہوں۔ آپ جا کر اپنی بینک انیڈ کر لیں، میں اتنی

دوسرے لڑکے کی کھینچ کو انجوائے کرتا ہوں۔" نہایت لہک کر شراب و شباب کے نشے میں غرق یہ جواب دیتے ہوئے چوہری کو یاد بھی نہیں تھا کہ ڈیوڑے آج کی یہ ملاقات کسی خاص مقصد کے تحت کی جا رہی ہے اور یہاں آنے سے قبل وہ اس مقصد کو جاننے کے لیے بے حد بے چین تھا۔

"ٹھیک ہو چوہری صاحب! آپ نے میری مشکل آسان کر دی۔" ڈیوڑے خوش دلی اور ممنونیت سے اس کا شکر ادا کرتا ہوا وہاں سے رخصت ہو گیا۔ ڈیوڑے کے رخصت ہوتے ہی لڑکا چوہری کی طرف متوجہ ہوئی۔

"آمین چوہری صاحب! تھوڑی دیر آرام کر لیں۔" اس نے چوہری کو صرف دعوت ہی نہیں دی بلکہ اس کی بغل میں بازو ڈال کر سہارا بھی دیا۔ لڑکے کے سین بازوؤں کے سہارے چوہری جھومتا ہوا اٹھا اور لوٹ کر اترنے قدموں سے اس کی طرف بڑھنے لگا جہاں وہ اسے لے جانا چاہتی تھی۔ لڑکے آج دیتے جسم سے چپکا وہ بیٹہ روم کی طرز پر سبے کرے میں داخل ہوا تو خود پر قابو نہ رہا اور بھی مشکل ہو گیا۔ اس نے ایک دم ہی خود کو سہارا دے کر پینڈ پر لٹائی لڑکا کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس نے جواباً کوئی تعرض نہیں کیا اور خود پسندی کے عالم میں چوہری کی سن مانیوں کا سواگت کرنے لگی۔ شراب کے نشے میں شباب کی آمادگی نے بات بہت آگے تک پہنچا دی۔ ہوس و نفسانی لذت میں ڈوبے لحاظ کی تیزی نے گزرتے رہے، چوہری کو اندازہ نہیں ہو سکا۔ اس نے زندگی میں بے شمار خوشیوں کی قربت سے لطف اٹھایا تھا۔ ان عورتوں میں اس کی پیرویوں سے لے کر... یہ پاک طوائفیں اور وہ مظلوم لڑکیاں جنہیں وہ طاقت و اختیار کے زور پر اپنے بستر تک آنے پر مجبور کر دیتا تھا، سب ہی شامل تھیں۔ لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی لڑکا انہی نہیں تھی۔ بے پناہ جسمی کشش کی حامل لڑکا کسی منہ زور عورت کی طرح تھی جس میں اترنے کے بعد چوہری تیرنے کی کوشش میں باپ سا گیا لیکن اسے اعتراف تھا کہ اس منہ زور عورت کی قربت میں جو لطف ہے، وہ اسے اپنی پوری زندگی میں بھی نہیں ملے گا۔ اس لیے وہ ہانپتے اور کھنکھنے کے باوجود اس نری سے باہر آنے کو کسی صورت تیار نہیں تھا۔

"دو کھنکھ گزرا چکے ہیں۔ ڈیوڑے آنے والا ہو گا۔" آخر کار لڑکا نے خودی احساس دلایا تو چوہری طوعاً و کرہاً اس سے الگ ہوا۔ وہ دونوں بندروں سے گھر کے باہر لاؤنچ میں آکر بیٹھے تو پندرہ منٹ بعد ہی ڈیوڑے وہاں پہنچ گیا۔

"موری چوہری صاحب! مسئلہ ایسا سامنے آ گیا

تھا کہ مجھے جانا پڑا۔ آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ کیا میزبان ہے جو عورت پر بلا کر خود غائب ہو گیا۔" چوہری کے مقابل ایک مشکل صور نے پریشانی سے بولے ڈیوڑے معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔

"کوئی بات نہیں مسئلہ ڈیوڑے! آپ اپنے بدلے میں مجھے اتنی شان دار میزبان کی گمراہی میں چھوڑ کر گئے تھے کہ کسی قسم کی یوریت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" چوہری نے اپنے پہلو میں بیٹھی لڑکا کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے ڈیوڑے کو جواب دیا۔ اگر وہ جواب نہ دیتی تو اس کی ساری کیفیت اس کے پیچھے پر لکھی ہوئی تھی۔ بھاری بھر کم چمے کی سرتی اور انھوں نے خمار ان لحاظ کی کہانی سنار ہے تھے جو اس نے لڑکے کے ساتھ گزارے تھے۔

"یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ کو میرے بندہ ہونے سے کوئی پریشانی نہیں ہوئی، ورنہ میں تو سارا وقت اسی انھن میں رہا کہ کہیں آپ پر بندہ ہو رہے ہوں۔"

"میرے ہوتے ہوئے کسی کو یوریت ہو، یہ تم نے سوچ بھی کیسے لیا ڈیوڑے؟" ڈیوڑے کی بات سن کر لڑکا نے بڑی ادا سے کہا تو وہ اس پر ہنس پڑا۔

"یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو مری! تمہارا ساتھ تو بندے کو پرانی شراب کے نشے کی طرح ہوش کر دیتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس بد ہوشی کو کم کرنے کے لیے تم میں گرم گرم پینک کافی پلو اور تانک میں چوہری صاحب سے ذرا کام کی باتیں بھی کر سکو۔"

"یہ بظاہر خوش گواری سے کہتے ہوئے ڈیوڑے کے لہجے میں مٹی خیزی تھی۔ اس مٹی خیزی کو محسوس کر کے چوہری کھینچ کر بیٹھ گیا۔ وہ مرحلہ آگیا تھا جب اس پر اس ملاقات کا مقصد واضح ہو جاتا۔

"وہیں سے بات شروع کرتے ہیں چوہری صاحب جہاں تک کلین میں ہوئی تھی۔ میں جانتا ہوں کہ آپ ماہ بانو نام کی اس لڑکی میں بے حد دلچسپی رکھتے ہیں اور برقیات پر اسے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اب اتفاقاً یہ بات یہ ہے کہ وہ لڑکی کہاں ہے، یہ صرف میں جانتا ہوں اور میں ہی اسے آپ تک پہنچا سکتا ہوں۔ آپ لڑکی کے حصول کے لیے اسے ہی شہر یار کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، اس بات کا بھی مجھے انہی طرح علم ہے۔ اس پیکر میں آپ ایک بار سے ہی کو جو کادے کر اس کی قابل اعتراض حالت میں تصویریں بھی اتار چکے ہیں، اس کا بھی مجھے علم ہے اور اب بھی یقیناً آپ کوئی نئی ترکیب لڑنے کا سوچ رہے ہوں گے، یہ بھی میں جانتا ہوں۔ لیکن ماہ بانو اب کہاں ہے، یہ شہر یار کو بھی معلوم نہیں۔

اس کا ہاتھ دینے والا ساری دنیا میں آپ کو میرے سوا کوئی دوسرا شخص نہیں ملے گا لیکن ظاہر ہے اتنی قیمتی معلومات میں آپ کو ایسے ہی تو فراہم نہیں کروں گا۔ اس کے لیے آپ کو GIVE AND TAKE کے اصول کے مطابق میرے لیے بھی کچھ کرنا ہو گا۔" لڑکا کے لاؤنچ سے نکلنے ہی ڈیوڑے نے بے حد تنجید کی سے گفتگو کا آغاز کر دیا۔

"تم مجھ سے کیا کام لینا چاہتے ہو؟" چوہری نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"کام بھی بتاؤں گا لیکن پہلے اتنا جان لیں کہ میری بات مان لینے کی صورت میں آپ کو صرف ماہ بانو ہی نہیں ملے گی بلکہ میں آپ کو باقاعدہ معاونہ بھی ادا کروں گا۔ اس کے علاوہ لڑکا اور دوسری من پسند لڑکیوں کی قربت یوں سمجھ کر انجوائے کیجئے گا آپ۔" وہ چوہری کی لاپٹی فطرت کو لچکانے کی ہر ممکن ترکیب لڑا رہا تھا۔

"کام بتاؤ۔ کام معلوم ہو گا تب ہی میں کوئی فیصلہ کر سکوں گا۔" چوہری نے بھی کوئی ملکی گولیاں نہیں کھیل رکھی تھیں جو اتنی آسانی سے ڈیوڑے کو خود پر مادی ہونے دیتا۔ لڑکا کی ہوش نہایت قربت میں دو گھنٹے گزار لینے کے بعد بھی پھر حال وہ اتنا تو ہوش نہیں تھا کہ کام کی نوعیت جانے بغیر ڈیوڑے کی کسی پیشکش سے متاثر نہ ہو یا کم از کم اسے متاثر نہ ہونے کا تاثر نہ دے۔

"میری یاد کے ساتھ جو جنگل لگا ہوا ہے وہ آپ کی اہم میں کتنا اضافہ کرتا ہے، یہ بات میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ سنے اسے ہی شہر یار کی دوستی کے بعد آپ اس سلسلے میں بڑے پریشان ہیں۔ ورنہ کوئی اسٹبل کرنے دیتا ہے اور نہ ہی جانوروں کی کھالیں۔ اس کی طرف سے ہونے والی فحش کی وجہ سے آپ کا اچھا خاصا بزنس تباہ ہو گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کا یہ نقصان پورا ہو جائے۔"

"تمہارے پاس اس سلسلے میں کوئی اور منصوبہ ہے؟" ڈیوڑے کی بات سن کر چوہری نے سنے تانی سے پوچھا۔

"ہاں ہے لیکن کوئی اور محالوں کی اسٹبل کے بجائے سنے بزنس کا منصوبہ۔"

"کیا بزنس... وہ کیا؟" چوہری حیران ہوا۔

"اس کی تفصیلات میں ابھی تانک ہوں۔" ڈیوڑے نے کہا اور کافی تک سگ سے کراے والی لڑکا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ لڑکا نے اسے اور چوہری کو کافی ہکرائی اور خود ایک جانب خاموشی سے بیٹھ گئی۔

"زبردست! تم نے بالکل اپنی طرح شان دار کافی

بنائی ہے۔" ڈیوڑے نے گرم کافی کا ایک گھونٹ بھر لیا اور کوسرا ہوا اور پھر چوہری کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"ہاں تو میں آپ کو بزنس کے بارے میں بتا رہا تھا۔ بات یہ ہے کہ میرا آپ کے ضلع کا سب سے بڑا گاہک ہے اور آپ کا ہی پورے علاقے میں سب سے زیادہ بولڈ بھی ہے اس لیے ہم آپ سے معاملات طے کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری صورت میں ہمیں دیگر زمینداروں میں سے کسی سے رابطہ کرنا ہو گا اور یہ بات یقیناً آپ کو اچھی نہیں لگے گی۔" اتنی بات کہہ کر اس نے لمبے بھر کا توقف کیا اور چوہری کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے بات مزید آگے بڑھائی۔

"آپ جانتے ہی ہیں کہ آپ کے علاقے میں جو جنگل ہے وہ حیرت انگیز ماحول رکھتا ہے۔ آپ کی گورنمنٹ نے توجہ نہیں دی ورنہ اس جنگل میں دنیا کے نایاب ترین پودوں اور جانوروں کی نشو و نما ہو سکتی تھی۔ بہر حال میں نے اپنی کم کے ساتھ مل کر صورت حال کا اچھی طرح جائزہ لیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جنگل کا حیرت انگیز ماحول اور موسم بوسنت کی کاشت کے لیے بے حد مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ ہم مشعل میں بہت بڑے پائے پر اس سلسلے میں کام کرنے کا ارادہ کرتے ہیں لیکن فی الحال تو اس سے پہلے کاشت کا مرحلہ ہے اور اس سلسلے میں ہمیں جو زمین پور جائے وہ آپ ہمیں پروانہ کر دیں گے۔ آپ کے پاس ایسے نئی اور قابل اعتماد بندوں کی کمی نہیں ہوگی جو یہ کام کر سکیں اور معائنے گزار میں بھی رہیں۔" ڈیوڑے نے آخر کار قہقہے سے بھری کال اٹھائی۔

"لیکن فارسٹ آفیسر کو ساتھ ملائے بغیر یہ کام کیسے ہو گا؟ میں نے سنا ہے کہ نیا فارسٹ آفیسر عابد انصاری بہت اچھی شہرت رکھتا ہے اور کبھی کسی کرپشن کے سلسلے میں اس کا نام سامنے نہیں آیا۔" چوہری نے ڈیوڑے کی توجہ اہم نکتے کی طرف مبذول کر دالی۔

"اس کی آپ فکر نہ کریں۔ یہ کام ہم کر لیں گے۔ عابد انصاری کتنی ہی اچھی شہرت رکھتا ہو، یہ تو آخر کار انسان ہی... اور انسانوں کو ان کے اصولوں سمیت خریدنے کا پرانا تجربہ ہے۔ ہمیں۔" ڈیوڑے نے ایمان سے جواب دیا۔

"اگر آپ مطمئن ہیں تو مجھے کیا مسئلہ ہو سکتا ہے؟ اصل میں تو عابد انصاری آپ کا اپنا مسئلہ ہے، میں تو اپنے بارے میں بات کروں گا۔ آپ جو کام مجھ سے لینا چاہتے ہیں وہ بہت رکی ہے۔ بندے بے شک میں آپ کو فراہم کر سکتا ہوں لیکن کام کی نوعیت ایسی ہے کہ بہت چھان چھلک کر بندوں کا انتخاب کرنا پڑے گا اور یہ تو آپ مجھ ہی سمجھتے ہیں کہ ایسے منتخب

بندوں کا ریت بھی اونچا ہوتا ہے۔ میرے بندے میرے وقار ہیں تو صرف اس لیے کہ میں انہیں ان کی وفاداری کی مناسب قیمت ادا کرتا ہوں۔ آپ جو کام لیتا چاہتے ہیں اس کے لیے میں جو بندہ لگاؤں گا، ان کی قیمت ابھی خاصی ہو گی۔ اس لیے ضروری ہے کہ آپ مجھے مناسب ادا جلی کریں بلکہ بہتر تو یہ ہوگا کہ یہ کام پانزھ شپ کی بنیاد پر ہو۔ مگر یہ اور کھاؤں والے بڑس میں بھی یہی نام اسی بنیاد پر کام کرتے تھے۔ اس بڑس کے لیے بھی میری یہی شرط ہوگی۔ چودھری نے ایک چل کے لیے بھی نہیں سوچا تھا کہ اس کے تعاون سے کاشت کی جانے والی پوست آنے والے وقت میں کتنوں کی زندگی برباد کرنے کا سبب بنے گی۔ وہ بے ضمیر انسان انسانیت کا ہر فیض و احساس بھولی مال و دولت کے حساب کتاب میں الجھ گیا تھا۔

پانزھ شپ کی شدت نہ کریں چودھری صاحب! آپ نے ضد کی تو ہم آپ کے کسی حریف سے بھی معاملات طے کر سکتے ہیں۔ ڈیوڈ نے اس کا مطالبہ سن کر دھکی دی۔ میرا کوئی حریف! اتنا طاقتور نہیں کہ میرے مقابلے پر آکر کسی کام میں ہاتھ ڈال سکے۔ بلکہ سچ تو یہی ہے کہ اس علاقے میں میرا کوئی حریف و مضبوطی نہیں ہے۔ جیسا باہر کوچھوڑ کر جیتے جی گاؤں ہیں وہاں میں سے کسی کا بھی زمیندار میری فکر کا نہیں ہے اس لیے اگر کسی کے دل میں دشمنی ہو بھی تو زبان سے اتھار کی جرات نہیں کر سکتا۔ معاملے کی نوعیت سامنے آنے کے بعد چودھری مکمل طور پر غار میں آ گیا تھا اور بہت عیاری سے ڈیوڈ سے معاملات طے کر رہا تھا۔

اگر آپ کی یہی شرط ہے تو ہم پر سخت پر معاملہ طے کر لیتے ہیں۔ آپ اس بڑس میں میں نہیں پرست کے حصے دار ہوں گے۔ اب تو آپ خوش ہیں؟ ڈیوڈ بھی چودھری کے بیان کردہ حقائق اچھی طرح جانتا تھا اس لیے فوراً ہتھیار ڈال دیے۔

میں پرست بہت کم ہے۔ قحطی فاقہ پرست سے ایک پوائنٹ نیچے بھی معاملہ نہیں ہوگا۔ ڈیوڈ کی پیشکش کو ٹھکراتے ہوئے چودھری نے اپنا مطالبہ پیش کیا۔

قحطی فاقہ پرست تو بہت زیادہ ہے۔ آپ کو شاید اعزاز نہیں کہ ہم جو بڑس کرنے جا رہے ہیں اس میں قدم قدم پر ملتی دشواریاں سامنے آتی ہیں اور کتنے لوگوں کو ساتھ لانا پڑتا ہے۔ اگر میں اپنے ایک پانزھوی قحطی فاقہ پرست دے دوں گا تو باقی لوگوں کے اخراجات کیسے پورے ہوں گے؟ ڈیوڈ نے اعتراض کیا۔

یہ سب میں نہیں جانتا۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ سب سے زیادہ خطر میرے لیے ہوگا۔ میرے بندے کام کریں گے تو کسی اونچے کی صورت میں، میں ہی بڑا جاؤں گا۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ میرا مطالبہ بالکل درست ہے۔ چودھری نے پتا صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی ڈیما ڈیما بڑا کر دیا۔

اس طرح رویتے میں لپک لائے بغیر تو بات نہیں بنے گی چودھری صاحب! میری نرم گفتاری کو شاید آپ میری کوئی مجبوری سمجھ رہے ہیں لیکن یاد رکھیے کہ ہم جسے کام کرنے والے لوگ کسی کے سامنے مجبور نہیں ہوتے۔ اگر کوئی ہم سے تعاون کرے تو تحفہ دے رہا اپنی راہ کی راہ بنانا نہیں اچھی طرح آتا ہے۔

تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟ ڈیوڈ کی بات سن کر چودھری بھڑک اٹھا۔

یہ دھمکی نہیں حقیقت ہے۔ اس نے منہ ہٹا کر جواب دیا۔ ڈیوڈ میں چودھری اپنی نگاہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ آرام سے ڈار لنگ اپنی چودھری صاحب جیسے شخص سے کس اعزاز میں بات کر رہے ہو؟ اب تک خاموش کردار کی طرح کر کے منظر میں موجود لڑاؤ راہی حرکت میں آئی اور ڈیوڈ کو ٹوکا۔ جیسا کہ میری بری نہیں بنائے لگا۔

ڈیوڈ کی بات کا براہ راست نامیں چودھری صاحب! اصل میں اپنی نگاہ پر بھی بالکل صحیح ہے لیکن آپ چونکہ پہلی بار اس بڑس میں ہاتھ ڈالنے جا رہے ہیں، اس لیے آپ کوئی صورت حال کا اندازہ نہیں ہے۔ آپ کو قحطی فاقہ پرست دے کر واقعی ڈیوڈ کے پاس کچھ نہیں بچے گا۔ اگر آپ مجھ پر اعتبار کریں تو میں ڈیوڈ سے آپ کے لیے کوئی فاقہ پرست شیزر کی سفارش کر سکتی ہوں۔ یقین کریں، کوئی فاقہ پرست لے کر بھی آپ بہت فائدے میں رہیں گے۔

چودھری کا بازو پکڑ کر اسے وہاں صوفے پر بٹھاتے ہوئے لہذا نے کچھ ایسی ادا سے یہ بات کی کہ وہ مزاحمت کے قابل نہیں رہا تھا۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ اب لہذا اس کے پیلو سے بالکل جڑ کر بیٹھی ہوئی تھی۔

تم نے تو مجھے چھٹا، لہذا انوکھی فاقہ پرست شیزر بھی بہت زیادہ ہے۔ ڈیوڈ نے احتجاج کیا۔

کتنا ہی زیادہ ہو، اب تو میں چودھری صاحب سے وعدہ کر چکی ہوں۔ تمہیں میرا یہ وعدہ ہر صورت پورا کرنا ہو گا۔ لہذا اے مجھو ہنا ز کے ساتھ کھم سادریا۔

تمہاری سفارش ہے تو میں انکار کیسے کر سکتا ہوں۔

ڈیوڈ نے فوراً ہتھیار ڈال دیے۔

اب تو آپ خوش ہیں نا چودھری صاحب؟ لہذا نے غلغلہ انداز میں مسکراتے ہوئے چودھری سے پوچھا۔

تم ساتھ ہو تو خوش نہ ہوں گا کیا سوال ہے اپنی اتم نے جو کہ وہاں رہنے مان لیا۔ لہذا کے آج دینے ہوئے بدن کی حدت اپنے اندر اتارتے ہوئے چودھری نے جواب دیا۔ جواب لہذا نے سامنے بیٹھے ہوئے ڈیوڈ کی پروا کیے بغیر اس کے رخسار کو چوم لیا۔ چودھری کے نزدیک یہ اس کی رنج و غصہ کی گراں فریڈ اس کے سامنے اس کے بجائے چودھری کے بازو اٹھاری تھی۔ حسن کی شاطرائے جالوں کے آگے ہار جانے والا چودھری بھلا کیسے جان سکتا تھا کہ کچھ تو انہی کے ہاتھ آئی ہے جنہوں نے اس تھیل کا آغا کیا تھا۔

☆☆☆

بات ستوا ذرا دو منٹ یہاں رک جاؤ۔ کھانے کے برتن لے کر آنے والا اس کے سامنے کھانا رکھ کر پلٹ رہا تھا۔ باہر ہاتھ لے کر اسے نکال دیا۔ تقریباً بیس ایکس سال کا ایک خوش شکل جوان تھا جس کی ہنر انگلیوں میں گہری اداسی تھی۔ ان انگلیوں کو دیکھتے ہی دل میں یہ احساس جاگتا تھا کہ اس جوان نے اپنی زندگی میں کوئی بہت بڑا نقصان اٹھایا ہے۔ ایسا نقصان جس کے بعد اس کے لیے زندگی بے معنی ہو کر رہ گئی ہے۔ باہر ہاتھ لے کر آج دوسری بار اس جوان کو دیکھتا تھا اور جانتے کیوں اس کے دل میں یہ احساس جاگتا تھا کہ وہ وہاں موجود دیگر لوگوں کے مقابلے میں قدرے مختلف ہے۔ اس کے چہرے پر دھشت و ہراس کے وہ آثار نظر نہیں آتے تھے جو دوسروں کی شخصیت کا لازمی حصہ تھے۔ شاید یہ اس کی شکل و صورت کا بھی کمال تھا کہ دیکھنے والے کو خود بہ خود ہی اپنے دل میں اس کے لیے ایک نرم سا گوشہ پیدا ہوتا محسوس ہوتا تھا۔ باہر کو بھی وہ اچھا لگتا تھا اور ایک بے نامی امید کے سارے وہ اسے بکا رہتی تھی۔ اس کی بکا کے جواب میں وہ جوان کا سرور لیکن بغیر کچھ کے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

تمہارا نام کیا ہے؟ باہر ہاتھ لے کر اس سے دریافت کیا۔ ڈیوڈ میں وہ جواب دینے کے بجائے یوں منہ پھیر گیا جیسے اسے جانا چاہتا ہو کہ اگر کوئی کام کی بات کر لے تو کرو ورنہ میں چلتا ہوں۔

دیکھو، میں جانتی ہوں کہ تم میری بات اچھی طرح سمجھ سکتے ہو اور اس کا جواب بھی دے سکتے ہو۔ میں تم سے بات کر رہی ہوں تو اس لیے کہ مجھے تم اپنے دوسرے ساتھیوں

سے مختلف لگے ہو۔ وہ سب دشنی اور جنگلی ہیں لیکن تمہاری شکل سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم کسی ایسے خاندان کے بڑے بھٹے لڑکے ہو۔ تمہیں میرا مسئلہ سمجھنا چاہیے۔ میری طرح تمہاری بھی کوئی کوئی بہن ہوگی۔ ذرا سوچو اگر اسے اس طرح کسی جگہ قید کر دیا جائے تو اس پر کیا گزرتے گی؟ ساری دنیا سے کٹ کر اس دیرانے میں دشنی مردوں کے درمیان رہنا کتنا خوفناک ہے، تم مجھے ایک بہن کی نظر سے دیکھو تو تمہیں اندازہ ہوگا۔ اسے وہاں سے بچنے کے لیے پرتو تار دیکھ کر باہر ہاتھ لے کر دروازے میں جلدی جلدی بولنا شروع کر دیا۔

تم یہاں کیوں قید ہو، مجھے نہیں معلوم لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ یہاں تمہیں ہم سے کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ ہم تمہارے کھانے پینے اور آرام کا پورا خیال رکھتے ہیں۔ رہی مردوں کے درمیان تمہارے کی بات تو اس طرف سے تم سے مکر رہو۔ یہاں کوئی تمہیں ملتی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔ یہ پہلی بار تھا کہ اس برف زار کی قید کے دوران کسی نے باہر ہاتھ لے کر راست بات کی تھی ورنہ تو وہ لوگ اس کے سامنے گونگے بن کر رہتے تھے۔

تو تمہارا خیال ہے کہ مجھے یہاں کوئی ملتی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن کیا ہے کہ میں یہاں خود کو محفوظ نہیں سمجھ رہی۔ جنگلی رات میں نے یہاں کسی کی آنکھوں میں ہوس دیکھی ہے اور اس کو مجھ سے دیکھتے ایک لمبے کے لیے بھی سکون کی فینہ نہیں آئی۔ تم جو کوئی بھی ہو اور تمہارا جو بھی نام ہے، میں تم سے درخواست کرتی ہوں کہ اپنے کسی بڑے تنک میرا پیغام پہنچا دو۔ ان سے کہو کہ مجھے میرا جرم بتایا جائے۔ میں اس طرح کب تک اس قید خانے میں بند رہوں گی؟ اگر میں کسی کی مجرم ہوں تو وہ سامنے آ کر مجھے میرے جرم کی سزا سنانے لیکن اس دشنی اذیت سے تو کسی طرح بچتے لے۔

جوان کا جواب سن کر باہر ہاتھ لے کر اسے بولی پٹی ملی۔ جذبات کی شدت کے باعث بات کے اختتام پر اس کی آنکھوں سے آنسو بھی چھٹک پڑے تھے۔ حقیقت بھی کہ کل جس طرح وہ شخص ہوس ناک انداز میں اس کی طرف بے حد ہار تھا، وہ اس صورت حال سے بے حد خوفزدہ ہو گئی تھی ایک تو بے جرم کی زبردستی مسئلہ کر رہا تھا اور اس پر سے عزت جانے کا خوف۔ اس کے اعصاب چاہتے نہ دیتے تو اور کیا ہوتا؟

جنگلی رات کون نہیں کھانا پہنچانے آیا تھا؟ اس کی بات سن کر جوان ہنسا۔

کوئی کئی شیر نام کا آدمی تھا۔ باہر ہاتھ لے کر رخساروں پر پھیلنے آسوا صاف کرتے ہوئے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ میں آئندہ نظر رکھوں گا کہ کوئی تمہاری طرف لٹلا کر ادا سے نہ سے بڑھ سکے۔ باقی رہی کسی بڑے کو تمہارا پیغام پہنچانے کی بات تو میں کما حقہ سے کہہ دوں گا۔ وہ اوپر والوں سے بات کر لے گا۔“ وہ یہ حد درجہ کے لہجے میں اس سے کہہ رہا تھا لیکن پھر بھی گرا تھا کہ کچھ نہ کچھ اس کی باتوں کا اثر لیا ضرور ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اپنے دیگر ساتھیوں کی طرح وہ بھی حسب معمول کوٹہ بہرہ ہوتا رہتا اور اسے کوئی رسپانس نہ دیتا۔

”بہت بہت شکریہ بھائی! میں تمہاری احسان یاد رکھوں گی۔“ ماہ بانو نے جھٹ اس کا شکریہ ادا کیا جس کے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے وہ لمبے لمبے دنگ بھرت ہوا وہاں سے چلا گیا۔ ماہ بانو بھی اس پر سے توجہ ہٹا کر کھانے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ بچے کی دال کے ساتھ کھانہ کی موٹی موٹی روٹیاں تھیں۔ اس نے ہم اللہ پر دھ کر کھانا شروع کر دیا۔ یہاں آنے کے بعد کھانے سے منہ موڑنے کی حاجت اس نے ایک پارہ بھی نہیں کی تھی۔ شروع سے یہ بات اس کے ذہن میں تھی کہ اس قید کے دوران اگر کوئی ایسا مرحلہ آئے جب جسمانی طاقت کو بروئے کار لانے کی ضرورت ہو تو وہ نا تو اس طاقت سے ہو۔ اور تو اتنی ہی حصول کا ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ غدا یا قاعدہ کی سے ملتی رہے۔ اس وقت بھی طبیعت پر بہت بوجھ ہونے کے باوجود اس نے کھانے سے منہ نہیں موڑا اور پیٹ بھر کر کھانا کھالیا۔ کھانے کے بعد وہ برتن ایک طرف سرکا کر خود کو پار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

اس قید خانے کے میر پاؤں میں سے کوئی خود ہی آکر برتن واپس لے جاتا۔ اس کے پاس تو یہاں کھانے، سوئے اور لائینی سوچوں میں گھرے رہنے کے سوا کوئی چوتھا کام نہیں تھا۔ اس وقت بھی وہ اپنی سوچوں میں گہری بیٹھی تھی کہ ایک دم نظر دوڑا دے پر گئی۔ اسے کھانا پہنچانے والا نوجوان دروازے کو کھٹک کر نا بھول گیا تھا۔ اس کے دل میں جانے کیا خیال آیا کہ اپنی جگہ سے اٹھی اور دے دے قدموں پہنچی ہوئی باہر لگ گئی۔ قید خانے کے آگے موجود تنگ ریمپاری کو اس نے بے حد احتیاط سے دے قدموں سے لیا۔ یہاں لاسے جانے کے وقت اس نے راستہ دیکھا تھا اور اسے ابھی طرح یاد تھا کہ کئی شاخوں میں منتظم اس غار کا پانا بائیں جانب موجود ہے۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے الپتا اسے اس مقام سے گزرنا پڑتا تھا اس نے کئی لوگوں کو دیکھا تھا اور جہاں دیواروں پر دنیا بھر کا اٹلچا کھا ہوا تھا۔ ایک موہمی امید کے سہارے وہ ریمپاری مور کے بائیں جانب مڑ گئی۔ احتیاط کے پیش نظر

وہ جتنی کی طرح بچوں کے بل چل رہی تھی تاکہ کوئی اس کے قدموں کی آہٹ پر چمک نہ پڑے۔ چند قدم کا فاصلہ لے کر تھی اسے ہمیں ہی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ان آوازوں کو سن کر اس کے اندر باہمی کی گہری لہر دوڑ گئی۔ ان آوازوں کا مطلب تھا کہ آگے راست صاف نہیں ہے اور وہ لوگ اس مقام پر موجود ہیں جہاں سے گزر کر اسے وہاں تک پہنچنا تھا۔ غار کا وہ کشادہ حصہ جس کی بال کی طرح تھا جہاں بڑی تعداد میں لوگ بیٹھ سکتے تھے جبکہ اس کی باقی بچتی تھی ریمپاریوں میں نظر پڑی تھی، انہیں اس نے اپنے قید خانے والی ریمپاری کی طرح ٹھک پاتا تھا۔

بائیں ہونے کے باوجود اس نے اپنے قدموں کو نہیں روکا۔ وہ دیکھتا جاتا ہی تھی کہ اسے قیدی بنا کر کھینچنے والے کس قسم کی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ ٹھٹھک مٹیوں والے وہ نیم وحشی سے انسان اس کے لیے ابھی تک معما ہی تھے۔ ابھی تک وہ ان کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کر سکی تھی۔ اب موقع ملا تو سوچا کہ کیوں نہ چھپ کر ان کی ٹوہلی جائے۔ کہہ سکتا ہے اسی طرح ان کی شخصیت پر پڑے اسرار کے پردے کچھ سرک سکیں۔ جس دھوکھ میں مبتلا وہ آگے بڑھی اسے ایسے مقام پر پہنچی جہاں ایک آڑ میں کھڑی ہو کر وہ نہ صرف ان لوگوں کی آوازوں اور دھنوں پر سن سکتی تھی بلکہ ان کی سرگرمیوں کا بھی جائزہ بھی لے سکتی تھی۔

”بھینٹ کر دوا دے! ساروں کو ادھر جمع کر کے بیٹھ گئے ہوا دوا بھی تک پر جو جیکٹر دھنک سے نہیں لگایا۔ آگے اور بھی تو کام کرنے ہیں یا نہیں؟“ اس نے آڑ سے ڈراما سار نکال کر چھانک دیا تو وہ سب اسے شمال میں موجود قاش بیڑوں کی طرف پرو جیکٹر کی طرف منہ کر کے بیٹھ دھکائی دیے۔ آبادی سے بہت دور اس طرف سے ڈھکے پہاڑی علاقے میں پر جو جیکٹر کو چلانے کے لیے طاقتور بیڑوں کا استعمال کیا جا رہا تھا۔ ایک ہی داڑھی والا شخص پر جو جیکٹر کو چلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ خود کو دیکھ جانے والے اس قسم کے اعداد اور بھی مستند نظر آنے لگے۔ ماہ بانو جنس و تہ کے عالم میں یہ ساری کارروائی دیکھنے لگی۔ آخر کار پر جو جیکٹر کو آپریت کرنے والا آدمی اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا اور ساری پڑی اسکرین پر متحرک سائے نظر آنے لگے۔ یہ متحرک سائے دراصل چار عدد مرد تھے۔ ان مردوں میں سے ایک کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور وہ قدر سے لڑکھڑا کر چل رہا تھا جبکہ باقی تینوں کے چہروں پر غلبہ منہ سے ہونے لگے تھے۔ ان کی نقاب سے چھپا کئی آنکھوں سے دھشت بھٹک رہی تھی۔ ان میں سے دو نے آنکھوں پر

پٹی بندھے تو جوان کے بازوؤں کو کھینچی سے جکڑا ہوا تھا۔ فوجان جس انداز میں چل رہا تھا اس سے صاف ظاہر تھا کہ اگر ان دونوں نے اسے پکڑ نہ رکھا ہوتا تو وہ زمین پر گر پڑتا۔ اس منظر کو دیکھ کر ماہ بانو کیوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی فلم یا ڈرامے کا کوئی منظر دیکھ رہی ہو لیکن پر جو جیکٹر پر چلتی فلم کی کوئی تیار ہی تھی کہ اسے کسی عام سودی کمرے سے ریکارڈ کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے فلم یا ڈرامے کے لیے ایسے کمرے کا استعمال نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اپنے اندر جب ہی بے چینی محسوس کرتے ہوئے ماہ بانو نے کچھ اور غور سے اس منظر کا جائزہ لیا۔ اسے لگا کہ وہ بندوں کی گرفت میں موجود نوجوان کا جسم زخمی ہے اور اس کے لباس پر دھکائی دینے والے دہشتہ دراصل خون کے ہیں۔ کمرے سے باقی افراد کو چھوڑ کر اس نوجوان کو فوس کرنا شروع کیا تو اس کے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ نوجوان واقعی شدید زخمی تھا۔ اس کی بائیں چری ہوئی تھیں جن پر خون بہا ہوا تھا۔ ہاف آسٹین والی ٹی شرٹ میں سے چھٹاتے اس کے بازو بھی بری طرح زخمی تھے جبکہ چریوں کی آنکھوں کے خوں چھپے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اسے شدید دھکے دیکھ کر نشانہ بنایا گیا تھا اور جس انداز میں اسے لانے والے نے گر چل رہے تھے، اس سے ظاہر تھا کہ وہ اس پر رحم کرنا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ دھکائی دینے والے اگلے منظر نے ماہ بانو کے انداز سے کی تصدیق کر دی۔ نوجوان کو پکڑ کر لانے والے نقاب پوشوں نے کمرے کے وسط میں پہنچ کر اسے ایک زوردار دھکا دیا۔ نوجوان جس کی آنکھیں پہلے ہی لڑکھڑا رہی تھیں، اس دھکے کو سہ نہ کا اور دھکے فرش پر گر گیا۔ نقاب پوشوں کا تیسرا سامی جوائی حرکات و سکنات سے ان کا لیڈر لگ رہا تھا، کمرے میں پڑی واحد لوہے کی کرسی پر بیٹھ گیا اور باقی دونوں کو احکامات دینے لگا۔ وہ کسی قسم کے احکامات جاری کر رہا ہے، اس بات کا اندازہ ماہ بانو نے اس کا روئے خن اور بائیں دو کے تابع داری سے پہلے ہوئے سروں کو دیکھ کر لگا تھا اور تہ پر جو جیکٹر پر چلنے والی فلم عمل طور پر خاموش تھی۔ کسی قسم کی آواز سنائی نہ دینے کے باوجود اس فلم میں کچھ ایسا تھا جو جسم کے اندر تھق رہی سی پیدا کر رہا تھا اور دل کی آہنی کے اندر بیٹھے سے بری طرح دھڑکے جا رہا تھا۔ آخر کار ماہ بانو کے اس خوف نے حقیقت کا روپ ڈھار لیا۔ اس نے دیکھا کہ نوجوان کو دھکا دے کر فرش پر گرائے والے نقاب پوشوں نے اس کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے اس کے ہاتھ چل دیں وہ کوہ پا چا اور اپنی کمرے کے ساتھ بندھی رہی کا کچھ کھول کر اس کے ہاتھ پر مضبوطی سے باغ جمنے لگے۔ نوجوان

اس نے اس موقع پر شدید مزاحمت کی اور تڑپ تڑپ کر ان کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کرتا رہا لیکن وہ دونوں کی تڑپ کا نقاب ہی سی مہارت رکھتے تھے۔ وہ بیٹھتے ہی دیکھتے انہوں نے نوجوان کی کھٹکوں کو ناکام بنا دیا اور اس کے ہاتھ بیروں کو دھکی سے اچھی طرح جکڑنے کے بعد ان میں سے ایک اس کے پیروں پر جبکہ دوسرا اسے پر گھٹنا دھا کر بیٹھ گیا۔ نوجوان جو بندھے سے جتنے میں پہلے ہی بے بس ہو گیا تھا، اب بٹنے چلنے کے لائق بھی نہیں رہا۔ اس کے عمل طور پر بے بس ہوتے ہی اب تک کرسی پر بیٹھ کر خاموشی سے نگاہ کرنے والا تیسرا نقاب پوش اپنی جگہ سے اٹھا اور اپنی جیکٹ کی زپ کھول کر کریانہ کے اندر ہاتھ ڈالا۔ اس کا ہاتھ کریانہ سے برآمد ہوا تو اس میں لمبے چھل والی ایک تیز دھار چھری چھپتی ہوئی نظر آئی۔ چھری نکالنے کے بعد پہلے اس نے اسے اپنی آنکھوں کے سینے سامنے لاتے ہوئے اس کا جائزہ لیا پھر چریہ اطمینان کے لیے دھار پر اچھی چھیر کر چپک گیا۔ فرش پر بندھے پڑے نوجوان اور اس چھری بردار حرکات و سکنات دیکھتے ہوئے ماہ بانو کا پروردگار کو دیکھا کرتے جارہا ہے۔ آنے والے لحاظ کا سوچ کر ماہ بانو کی پاشا اور آنکھوں سے جان لگتی محسوس کر کے بیٹھ گئی۔ اس کی طرح کارلرہہ منظر خود پہلے بھی ایک بار دیکھا تھا تھا۔ فرق یہ تھا کہ پہلے وہ منظر اس نے لائید دیکھا تھا جبکہ موجودہ منظر ریکارڈ تھا۔ سجادہا کی انگوٹھی بیٹھی بیٹھا کے بھائی کو وہ ساری زندگی فراموش نہیں کر سکتی تھی۔ سامنے پر جو جیکٹر پر جو فلم چل رہی تھی اس کے پس منظر میں بھی شاید ایسا ہی کچھ تھا۔ چھری بردار نقاب پوش چھری لہراتا ہوا نوجوان کے قریب پہنچا تو ماہ بانو نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اپنے اندر ایسا ظالم تھا اور دھشت انگیز منظر دیکھنے کی خطی جرأت محسوس نہیں کر رہی تھی۔

”سارک ہو جوان! بیٹھے بیٹھے ہے کہ اپنے دشمن کا یہ انجم دیکھ کر تمہیں خوشی ہوئی ہوگی اور تمہارے سینے میں گی انتقام کی آگ بجھ گئی ہوگی۔“ اسے آنکھیں بند کیے ایک منٹ کا وقفہ گزرا تھا کہ ایک بھاری مردانہ آواز سنائی دی۔ اس بیٹے کو سن کر اسے اندازہ ہو گیا کہ کسی جانور کی طرح باعدہ کر ڈالا گیا تو جوان اپنے انجام کو پہنچ گیا ہے۔

”بیٹے میں گی آگ کہ نہ پوچھیں بھائی صاحب! یہ آگ تو ایسی زور آور ہے کہ دل کرتا ہے اس کیسے کو سو پار باروں اور زندہ کروں۔ اگر آپ لوگ مجھے یہ کام اپنے ہاتھ سے کرنے کی اجازت دے دیتے تو شاید میرے سینے میں کچھ نہ پڑ جاتی۔ ابھی تو لگتا ہے کہ میرا اس ذیل سے انتقام

ادھر اور دیکھا ہے۔

نہایت نفرت میں ڈوبی یہ آواز ماہ بانو کو شام ساگی۔
 قہقہہ طور پر یہ اسی نوجوان کی آواز تھی جس سے کچھ دیر قبل اس
 نے اپنے قید خانے میں گفتگو کی تھی۔ نوجوان کی اس ابتلا کو
 کچھ بولی نفرت پر دل میں شدید ریغ محسوس کرتے ہوئے
 اور اسے اندازے کی تصدیق کے لیے ماہ بانو نے آنکھیں
 کھول کر آواز کی سمت دیکھا۔ غریب جوش سے سرخ ہوتے
 چہرے کے ساتھ وہ یقیناً وہی نوجوان تھا جس کے بارے میں
 کچھ دیر قبل اس نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں کے
 مقابلے میں بہت معصوم اور شریف ہے۔ وہ معصوم دکھائی
 دینے والا چہرہ اس وقت بھیہ اور اتمام کی آگ میں جل کر
 بری طرح مس ہو کر اپنی دلکشی کو بیٹھا تھا۔

”تم نے جان لیوہ کر تمہیں تمہارے ہاتھوں سے یہ
 کام نہیں کر دیا۔ تم ہمارے دوست ہو اور دوستوں کے
 دشمنوں کو بھڑکتے رہتے۔ مٹانا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ہم نے اپنا
 فرض ادا کر دیا۔ دیکھو تمہارے اتمام کی آگ بجھنے کی بات تو
 میرے خیال میں یہ آگ جلتی رہے تو اچھا ہے۔ یہ آگ جلتی
 رہے گی تو یہ آگ جیسے کرکٹ رن دینے والے دوسرے
 شیطاںوں کو ان کے انجام تک پہنچا سکے۔ ذاتی اتمام پہلے
 کر سکنے سے بیٹھ جانا تو کوئی کارنامہ نہیں، بات تو جب ہے
 کہ آدمی ہرگز بڑے آدمی کے خلاف لڑے اور اس کا وہ حشر
 کرے کہ بائوں کو عبرت حاصل ہو۔ ہم سب یہاں اسی مشن
 پر کام کرنے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ اب تم بتاؤ کہ تم اس
 مشن میں ہمارا ساتھ دو گے یا نہیں؟“ بہت رواں لہجے میں
 بولتا وہ شخص عمران نامی اس نوجوان سے پوچھ رہا تھا۔

”بھائی! میں اب میری زندگی میں اب رہی کیا گیا
 ہے؟ اگر یہ سچ کہتا ہے، والی سائیں کسی ایسے مقصد کے ساتھ
 گزر گئیں تو میں انھیں کا کہ میں نے زندہ رہنے کا حق ادا کر
 دیا۔“ عمران نے وہی کہا تھا جو اس سے مصروف گفتگو کر رہا
 تھا۔ ”نہ جانے وہ کتنے دنوں سے اس معصوم
 نوجوان کی برین واشنگ کر رہا تھا جس کے دل میں زہری
 زہر بھر گیا تھا۔ اپنی عمر سے کھنک بڑھ کر شعور اور حساسیت کی
 مالک ماہ بانو نے اس صورت حال پر گہری سانس لیتے ہوئے
 وہاں موجود دیگر افراد کے چہروں پر نظر ڈالی۔ وہ وحشت زدہ
 چہرے اس وقت کچھ اور بھی بے چارہ لگ رہے تھے۔ ان کے
 چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے بے خیالی میں اس کی آنکھ پر دیکھ کر
 کی آنکھیں پر جا پڑی۔ اسکرین ایسی تھیں کہ روشن کی اور اس پر
 ذبح کیے ہوئے نوجوان کی خون آلود لاش دکھائی دے رہی

تھی۔ جوان، صحت مند جسم سے نکلنے والے دھیروں خون نے
 لاش کے گرد ایک چھوٹا سا سرخ تالاب بنا ڈالا تھا۔ اپنے ہی
 خون میں پڑی نوجوان کی وہ لاش کسی ذبح کیے ہوئے جانور
 کی لاش سے مشابہ لگ رہی تھی۔ ماہ بانو صرف ایک لمبے کے
 لیے یہ منظر دیکھ سکی۔ اس کے لیے اس سے زور کی ایک آئی آدھ
 اپنی جگہ بیٹھ بیٹھ دہری ہو گئی۔ وہ لوگ جو کسی تقریب قہری
 طرح اس دردناک منظر سے لطف اٹھاتے ہوئے تھے، وہ ایک
 کی آواز سن کر چونک پڑے۔

”لنگا ہے قیدی لڑکی کو کھڑی سے نکل کر یہاں آگئی
 ہے۔“ سب سے پہلے عمران بولا اور آواز کی سمت
 دوڑا۔ اس دوران ماہ بانو خود پرتا پرتا پانے کی کوشش میں کام
 ہو کر بے ہوش ہو چکی تھی۔

”یہ تو بہت بُرا ہوا۔ اس لڑکی کو یہ سب نہیں دیکھنا
 چاہیے تھا۔“ وہ آدمی جواب تک عمران سے منہ نہ کر رہا تھا
 اور وہاں موجود افراد کا منظر دیکھتا رہا۔ ”ماہ بانو کو کچھ بولا۔
 “یہ باہر کیسے آگئی؟“ کون اسے کھانا دینے گیا تھا؟“
 صورت حال پر تبصرے کے ساتھ ہی کا منظر کو قہری سب
 سے اہم خیال آیا۔

”میں نے اسے کھانا پہنچایا تھا۔“ عمران نے کسی بزم
 کی طرح اعتراض کیا جسے سن کر کمانڈر کے ہونٹ ہنچ گئے۔
 ”ہمارے کام میں ایسی غلطیوں کی گنجائش نہیں ہوتی،
 اس بات کو ہمیشہ یاد رکھنا۔ اس بار تو میں نہیں معاف کر رہا
 ہوں لیکن آئندہ کسی کو اتنی کا انجام بہت بُرا ہوگا۔“ وہ جواب
 تک بڑی نرمی اور محبت سے عمران سے بات کرتا رہا تھا،
 نہایت سخت لہجے میں بولا۔

”سوری نماز“ عمران نے فوراً ہی اس سے معافی مانگی۔
 ”اسے اس کی کوٹھری تک پہنچا کر کوٹھری کو آگ لگا دو۔“
 اس کی معذرت کو خاطر میں لائے بغیر کمانڈر نے سر ہلچے میں
 حکم دیا اور پلٹ گیا۔ ماہ بانو کو اپنے بازوؤں میں اٹھا کر اس
 کی کوٹھری کی طرف لے جاتے ہوئے عمران کا کھنک لہجے کے
 ان تضادات میں گہری طرح الجھ کر رہ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆
 ”کاٹری تیار ہے سر“ عبدالمنان کی اس اطلاع پر
 اس نے سر کو ہلکی سی جنبش دی اور کرسی چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔
 اس نے لاہور سے واپس آکر جو نیا شیلڈول ترتیب دیا تھا،
 اس کے مطابق آج اسے ہیرا باد کے دورے پر جانا تھا۔ اس
 کے زیریں علاقے میں ہیرا باد سب سے بڑا گاؤں تھا اس
 لیے وہ اسے بالکل بھی نظر انداز نہیں کرتا جانتا تھا۔ دیگر

دیہاتوں کے مقابلے میں ہیرا باد کی ترقی کی رفتار قدرے تیز
 ہونے کے باوجود وہ اس کی طرف خصوصی توجہ دینا چاہتا تھا
 کیونکہ اسے معلوم تھا کہ سب سے زیادہ محنت اسی جگہ
 ہے اور اگر وہ ذرا بھی ڈھیلا پڑا تو سب کیا کر لیا ضائع ہو
 جائے گا۔

”نور ہو میں جو ٹھیکہ دار کام کر رہا ہے آج تم اس سے
 ملاقات ضرور کر لینا۔ اس کی رپورٹ کی روشنی میں ہم کسی دن
 امانک وہاں جا کر کام کا جائزہ لیں گے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ
 یہ کتنا اعتبار کیا جاسکتا ہے۔“ اپنے دفتر سے نکل کر
 باہر بار کھنگ کی طرف جاتے ہوئے اس نے عبدالمنان کو یاد
 دہانی کروائی۔

”میں سر! آپ بے فکر رہیں، میں یہ کام کر لوں گا۔“
 عبدالمنان نے مستعدی سے جواب دیا تو وہ مطمئن ہو کر گاڑی
 میں بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھے ہی ڈرائیور نے دوڑا وہ بند کیا اور
 خود محکمہ کو ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ مشاہیرم خان کی غیر
 موجودگی میں آج کل سب ڈرائیور اس کی گاڑی چلا رہا تھا۔
 مشاہیرم خان ابھی تک واپس نہیں آئے تھے، البتہ اس کی طرف
 سے زچہ نہیں مسلسل آ رہی تھیں۔ اس نے نیاز علی سے اپنی
 ملاقات سے لے کر اس کی حادثاتی موت تک ہر بات تفصیل
 سے شہر بار کو بتا دی تھی۔ نیاز علی کی حادثاتی موت نے اسے
 کچھ مشکل میں بھی ڈال دیا تھا۔ نیاز علی کے جیب سمیت کھائی
 میں گر جانے کے بعد وہ پیدل طویل سفر کر کے ایسے مقام پر
 پہنچنے میں کامیاب ہو چکا تھا جہاں سے اسے پھاڑوں سے
 واپس لوٹنے والی ایک آنکھیں ڈیٹن لیم نے اپنی جیب میں
 لٹک دی اور اس کی درخواست پر تھانے کے قریب
 ڈراپ کر کے چلے گئے۔

تھانے پہنچ کر اس نے وہاں موجود ڈیوٹی افسر کو
 حادثے کے بارے میں بتایا۔ افسر نے پولیس کی رپورٹ کے
 مطابق اسے دھیر سارے سوالوں کی زد پر لے لیا لیکن
 مشاہیرم خان قہقہہ طور پر تیار تھا اس لیے پولیس افسر اس کے
 من سے کوئی ایسی بات اٹھانے میں ناکام رہا جس کے
 ذریعے مشاہیرم خان کو نیاز علی کی موت کا ذمہ دھنسیا جاسکا
 سکتا۔ نیاز علی کے ساتھ اپنے اس علاقے میں جانے کی وجہ
 اس نے بالکل سچ بتا دی تھی جس پر پولیس افسر حقوڑا جیز
 بھی ہوا تھا کہ اسے پولیس کی کارکردگی پر یقین نہیں تھا جو خود
 معافی کی تحقیق کرنے لکل کھڑا ہوا۔ جواب میں مشاہیرم خان
 نے اس کا دھیان ان نکات کی طرف دلوایا جنہیں پولیس
 والوں نے بیکسر نظر انداز کر دیا تھا۔ اس نے آنکھیں باور کروایا

کہ وہ لوگ صرف نیاز علی کے بیان پر تکیہ کر کے بیٹھ گئے تھے
 اور معاملے کے ان پہلوؤں کا جائزہ نہیں لیا تھا جس سے نیاز
 علی کے سچ جھوٹ کا اندازہ ہو سکتا۔ اس نے پولیس افسر کو
 تفصیل سے اس علاقے کے کل وقوع اور مٹی کی ساخت وغیرہ
 سے آگاہ کرتے ہوئے یہ بات کر دیا کہ نیاز علی کا بیان سراسر
 جھوٹ پر مبنی تھا اور کسی نے اس سے جیب کھینچ نہیں سکی بلکہ وہ
 خود جبرموں کا سامھی تھا۔ اس نے پولیس افسر کو صاف لفظوں
 میں یہ بھی بتا دیا کہ نیاز علی اپنا جھوٹ مکمل جانے کے بعد
 گھبراہٹ میں جیب سے لے کر فرار ہونے کے چکر میں حادثے
 کا شکار ہوا تھا، البتہ وہ نیاز علی پر تشدد اور اس کے نتیجے میں
 حاصل ہونے والی معلومات کا ذکر کول کر کیا تھا۔ اس کے
 بیان کی روشنی میں پولیس افسر نے نیاز علی کی لاش اور جیب
 کھائی سے نکلوانے کے انتظامات شروع کر دیے لیکن تاحال
 جیب بالاش نہیں نکالی جا سکی تھی۔ مشاہیرم خان کے ذاتی خیال
 کے مطابق یہ ممکن بھی نہیں تھا۔ بہر حال، لاش نکلی یا نہیں وہ خود
 براہ راست نیاز علی کی موت کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جاسکتا تھا۔
 کچھ کمال شہر بار کی فون کال نے بھی دکھایا۔ اس نے بھستان
 میں موجود اپنے ہم منصب کو فون کر کے یہ باور کروا دیا کہ
 مشاہیرم خان ایک دیانت دار اور بے ضرر آدمی ہے جو اپنی ماں
 کی دیکھ بھال کے لیے اسکرو میں رکا ہوا ہے۔ اپنے بھائی
 کے لڑکے کی تحقیق کے لیے اگر اس نے کچھ ہاتھ بھر مارے ہیں تو
 یہ صرف براہ راست محبت کا نتیجہ ہے ورنہ وہ قانون کو ہاتھ میں
 لینے والا یا انسانی جان سے کھیلنے والا بندہ نہیں ہے۔ اس کی
 شناخت پر مشاہیرم خان کے ساتھ خصوصی نرمی برتی گئی اور اسے
 قتل کے شک میں گرفتار کر کے تھانے میں بند کرنے کے
 بجائے آزاد چھوڑ دیا گیا۔ البتہ اپنی پابندی ضرور عائد کی گئی
 تھی کہ وہ مقامی مختار سے اجازت لیے بغیر اسکرو چھوڑ کر
 واپس اپنی ڈیوٹی پر نہیں جاسکتا۔ مشاہیرم خان کا کافی اطمینان واپس
 لوٹنے کا ارادہ بھی نہیں تھا۔ ابھی وہ وہاں پر کراس معاملے کی
 مزید تحقیق کرتا جانتا تھا چنانچہ اس نے اس حکم پر کوئی احتجاج
 نہیں کیا۔

شہر بار خود بھی اس کے اس پروگرام سے متفق تھا۔
 مشاہیرم خان کے وہاں رہنے اور ہاتھ بھر مارنے کی صورت
 میں ہی یہ ممکن تھا کہ ماہ بانو کو کوئی اتنا سچا مل سکا اور ساتھ ہی
 اس راز سے بھی پردہ اٹھتا کہ وہ کون لوگ تھے جنہیں نیاز علی
 خفیہ طور پر راز دار اور دیات وغیرہ سلائی کر رہا تھا۔ اسے نظریہ
 طور پر چھپ کر رہنے والے لوگوں کا کسی کا کچھ خبر میں مصروف
 ہونے کا گمان تو کیا نہیں جاسکتا تھا پھر ان کا ماہ بانو کو قتل کرنا

بھی ان کے خلاف اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ لوگ منفی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ لیکن یہ بات شہر یار کو بھی سمجھ نہیں آئی تھی کہ ان لوگوں نے اس قدر پانچک کے ساتھ ماہ بانو کو اغوا کیوں کیا؟ ماہ بانو کی کھوج تو صرف ایک ہی بندہ نکستی اور اس شخص کا بھٹان سے کوئی تعلق نہیں بننا تھا۔ اپنے علاقے میں بے حد اختیار اور طاقتور چودھری کی بے شک حکومتی ایوانوں تک بھی پہنچ سکتی تھیں وہ اتنا اختیار بہر حال نہیں تھا کہ بھٹان میں اس کے بندے اس قدر سرگرم ہوتے۔ شہر یار کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ یہ کوئی اور معاملہ ہے۔ لیکن سوال وہی تھا کہ اس معاملے سے ماہ بانو کا کیا تعلق تھا؟ فیصل آباد میں پرورش پانے والی وہ کم عمر لڑکی جو اپنے آبائی گاؤں چھپیاں نزار نے آئی تھی، چودھری کی ہوس بھری نظروں میں آنے کے بعد اتنی مصیبت میں پڑی کہ پھر اس کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں رہا۔ وہ مشاہیرم خان کے مشورے اور شہر یار کے تعاون کے نتیجے میں پناہ کی تلاش میں بھٹان کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں جا کر ٹھہری تو وہاں بھی اسے سکون سے رہنا نصیب نہیں ہوا اور اس دور افتادہ گاؤں میں بھی حالات کے گرداب نے اسے اپنے گھر سے میں لے لیا۔ آجارتا تھے تھے کہ اس بار وہ جن لوگوں کے زمرے میں چھپی ہے، ان کا چودھری سے کوئی تعلق نہیں بننا۔ لیکن سوال وہی تھا کہ ایک عام سی بے ضرورتی میں آخر ایسی کیا بات گی کہ وہ بالکل انجان جگہ پر بھی ٹھکانا لیں وہ کسی اور اسے باقاعدہ ایک سازش کے ذریعے اغوا کر لیا گیا؟

یہ سارے سوالات تھے جن کے جواب کے حصول کے لیے تحقیق و تفتیش کی ضرورت تھی۔ مشاہیرم خان کی صلاحیتیں شہر یار کو کچھ چکا تھا اس لیے اسے یقین تھا کہ وہ یہ کام کر سکتا ہے چنانچہ اس نے اسے بھٹان میں ہی رکھ دینے کی منظوری دیتے ہوئے اس کی چھپیاں پر حادیں۔ خود وہ اپنی پوسٹ اور ذمے داریوں کی وجہ سے مری طرح جکڑا ہوا تھا چنانچہ خواہش رکھتے ہوئے بھی اس کام کے لیے نہیں جاسکتا تھا، کم از کم فوری طور پر تو بالکل نہیں۔ ان حالات میں مشاہیرم خان کے تعاون کو ٹھیکہ جانتے ہوئے اس نے اپنی خواہش کو دل میں ہی دبایا اور ماہ بانو کی تلاش کی ذمہ داری اسے سونپ دی لیکن یہ وہی جانتا تھا کہ اس کا دل بھی بار بار اس بات پر کھل جاتا ہے کہ وہ خود جا کر ماہ بانو کو تلاش کرے۔ اسے آج بھی وہ نجات یاد تھے جب اسٹر آفاب کے اسکول میں چہرے کو نقاب میں چھپانے ماہ بانو اس سے مدد کی درخواست کرنے وہاں پہنچی تھی۔ فرض اور انسانی ہمدردی اپنی جگہ لیکن

حقیقت تھی کہ خود اس کے اپنے دل نے بھی یہ خواہش کی تھی کہ وہ اس ہراساں رہتی چھپی لڑکی کو اپنی پناہ میں لے لے۔ دل کی اس خواہش کو اس نے اپنی سرکاری حیثیت کے اندر رہتے ہوئے پورا بھی کیا تھا لیکن اس کی پرکوشش کا کام چلی گئی اور آج پھر ماہ بانو اس سے بہت دور کسی کی قید میں چھپی اس کی مدد کی طلب گار تھی اور وہ مجبور یوں اور اصولوں کی قید میں جکڑا خود اس کی تلاش میں نکلنے سے قاصر تھا۔

گاڑی کی چھٹی نشست پر یہ ظاہر سکون سے بیٹھا وہ مسلسل حالات و واقعات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ تیز رفتاری سے چلتی گاڑی کے باہر تیزی سے گزرتے منظر کی طرح اس کے ذہن کے حصروں کے سے بھی واقعات ایک ایک کر کے گزرتے جا رہے تھے۔ پچھلے چند دنوں میں کیا کچھ نہیں ہوا تھا۔ اس کی زندگی میں آنے والا ہر نیا دن کی خبر سے گرا آتا تھا۔ ان خبروں میں اچھی خبروں کا تناسب کافی تھا بلکہ دیکھا جائے تو چند چھوٹے نمونے تو قیاتی منصوبوں کے آغاز کے سوا کوئی ایسی بات ہوئی ہی نہیں تھی جس کی وجہ سے وہ خوش ہو پاتا۔ سازشیں، حادثات، دشمنیاں یہی سب تھا جنہیں وہ اس عرصے میں بھگتا رہا تھا۔ لیکن بہر حال خود اس کی طرح اچھی اس کا حوصلہ بھی جوان تھا اور وہ اپنی آسانی سے حالات کے سامنے ہار نہیں مانتے والا تھا۔ اسے حالات کے اس گرداب سے لکھتا تھا اور وہ چند لمبیاں لانی تھیں جن کو لائے بغیر جن انسانیت اور انہیں ہوسکتا تھا۔ اس حق کو ادا کرنے کے لیے وہ ہر ذاتی خواہش اور تکلیف کو نظر انداز کر کے سرگرم عمل ہو گیا تھا اور کسی عام فصر کی طرح اپنے عزیز کنڈ پیٹنڈ دفتر میں بیٹھ کر محض رپورٹوں کا مطالعہ کرنے کے بجائے خود تکلیف اٹھاتے ہوئے جبراً پادی طرف رواں دواں تھا۔ خیالات کے جھوم گھر سے جبراً ہڈیاں کا سر گھیسے لے ہوا، وہ خود بھی اندازہ نہیں کر سکتا لیکن جب گاڑی جبراً آگے کے داخلی راستے پر چلنے کی تو کچھ راستے پر نکلنے والے چٹکوں نے اسے یاد دہانی کروائی کہ اس راستے پر پہنچنے تک کی قیام اندر ضروری ہے۔ اسل میں اسکول اور مرکز صحت کی تعمیر کے کام تو فوری طور پر اس لیے انجام پا گئے تھے کہ ان کے لیے سیمینٹ موٹی والا کی چھوڑی ہوئی جائیداد سے قائم کر دو فرسٹ سے سرمایہ فراہم کر دیا گیا تھا لیکن مرکز کی تعمیر کے لیے خالصتہ حکومتی فنڈ سے رقم حاصل کی جاتی تھی اور اس کے لیے منظور کی تھی، تب ہی سمجھ ہو پاتا۔

جبراً پاد میں اس کا شید دل سے شہہ تھا۔ اسے سب سے پہلے مرکز صحت پھر اسکول وائٹریل ہوم اور آخر میں تے فاریسٹ آفیسر عابد انصاری سے ملاقات کے لیے جانا تھا۔

اس شے شہہ شید دل پر عمل کرتے ہوئے ڈرائیور نے گاڑی مرکز صحت کے سامنے لے جا کر روک دی۔ مرکز صحت کے دروازے پر تیس چھتیس سال کا ایک شخص کھڑا تھا۔ وہ آدمی یہاں پر ایک وقت کھڑا غڈری اور چوکیداری کے فرائض انجام دیتا تھا شہر یار کو کچھ گھرو جھٹ دور آیا اور اسے سلام کیا۔

”وکیلیم السلام۔ سب ٹھیک ہے؟ اندر ڈاکٹر موجود ہیں یا نہیں؟“ اس نے زری سے اس شخص کے سلام کا جواب دیتے ہوئے دریافت کیا۔

”ڈاکٹر فی صاحب جی جی ایک دو مریض عورتیں روہنی ہیں، انہیں دیکھ رہی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب البتہ اپنے کوارٹر میں بیٹھے گئے ہیں۔“ اس شخص نے مستندی سے اطلاع دی جس پر سرگودھر سے ہاتھ ہوئے شہر یار اندر داخل ہو گیا۔

”یہ دو رکھو اور اسے پابندی سے کھاتی رہنا ابھی تمہاری شادی کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے۔ ابھی سے بچوں وغیرہ کے بچھٹ میں بڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ چار پانچ سال آرام سے گزارو پھر اس بارے میں سوچنا۔“ سسرال والے طعنے دیتے ہیں تو دینے دو۔ ابھی تمہارے بیٹے کھیلنے کے دن ہیں، انہیں بچوں کے چکر میں بڑا کر ضائع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ وہ ڈاکٹر ماریا کے کمرے کے قریب پہنچا تو اسے اندر سے اس کی آواز سنائی دی۔

”خزینہ کی موجودگی کی وجہ سے وہ اندر جانے کے معاملے میں تذبذب کا شکار تھا لیکن کھپاؤ غڈر نے خود ہی آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا اور ڈاکٹر ماریا کو اس کی آمد کی اطلاع دی۔ وہ فوراً ہی اس کے استقبال کے لیے کھڑی ہو گئی۔ اب اس کے باہر دے رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ وہ کھلے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔

”ڈاکٹر فی صاحب سربراہ! آپ کو یوں اچانک دیکھ کر مجھے بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے۔“ اس کو بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر ماریا نے خوشی کا اظہار کیا۔

”میں اپنے روہنی اڈت پر آیا تھا۔ آپ بتائیں انیوری ٹیمک ازاد کے اور ات؟“ اس نے سر فیض عورت کا سرسری نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر ماریا سے پوچھا۔

”میں بائیس سال کی وہ عورت ابھی شکل و صورت کی مالک تھی اور چہرے سے کسی طور پر تھکاوٹ نہیں لگتی تھی۔“

”آں ازاد کے سر... بلکہ میرے پاس آپ کو سنانے کے لیے ایک اچھی تھوڑھی ہے۔“ ڈاکٹر ماریا نے خوش گوار لہجے میں اسے جواب دیا اور پھر خزینہ کی طرف متوجہ ہو کر اس سے یوٹی۔“ اب تم جاؤ بی بی اور میری چاریت کے مطابق

پابندی سے دو استعمال کرتی رہنا۔“

”بہت بھتر ڈاکٹر فی صاحب۔“ عورت نورانی باہر نکل گئی۔ اس عورت کی صحت اور عمر دیکھتے ہوئے شہر یار کو خیال آیا کہ ڈاکٹر ماریا چھوڑی درگاہ سے جو مشورہ دے رہی تھی، وہ کچھ مناسب نہیں تھا خصوصاً گاؤں کے باحول میں جہاں کم عمری کی شادی اور پھر جلد بچوں کی پیدائش کو پسند کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے باحول میں خول عرصے تک اس عورت کا مان نہ بننا اس کے لیے مشکلات بھی کھڑی کر سکتا تھا لیکن اس نے اپنے اس خیال کا ڈاکٹر ماریا کے سامنے اظہار نہیں کیا اور یہ سوچ گزرتی تھی کہ جھٹک دیا کہ ممکن ہے کہ عورت کو کوئی ایسی براہم ہو جس کے پیش نظر ڈاکٹر ماریا فی الحال اس کے لیے بچے کی پیدائش کو خطرہ نہ سمجھتی ہو۔ بہر حال، وہ ڈاکٹر ماریا اور ان معاملات کو زیادہ بھتر نہیں سمجھتی۔

”اور کوئی مریضہ رہی تھی تو اسے اندر بھیج دو۔“ عورت کے باہر نکلنے کے بعد ڈاکٹر ماریا نے ڈاکٹر کو حکم دیا۔

”صرف ایک عورت اور ہے جی! میں اسے بھیجتا ہوں۔ آپ اسے دیکھیں، تب تک میں اسے ہی صاحب کے لیے جانے پانی کا بندوبست کرتا ہوں۔“ کھپاؤ غڈر نے مستندی دکھانے کی کوشش کی۔

”جانے پانی رہنے دو۔ وہ میں انہیں اپنے کوارٹر میں لے جا کر کروادوں گی۔“ اس پر چھٹ کو کھنچ دو۔“ شہر یار کا ذکر کرتا اس سے ملنے ڈاکٹر ماریا نے خود ہی متح کر دیا۔

”میں زیادہ دور یہاں نہیں رکوں گا اس لیے کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔ بس مجھے یہاں کی ضروریات اور مسائل وغیرہ سے آگاہ کر دیں۔ اس سلسلے میں اگر آپ ڈاکٹر صاحب کی رائے بھی لے لیں تو مناسب ہوگا۔“ ماریا کو کونو کتے ہوئے شہر یار نے اس سے کہا لیکن وہ کوئی جواب دینے بغیر اندر آنے والی اور جبر عورت کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔ عورت نزلہ زکام اور بخار میں مبتلا تھی۔ اس کا چپک آپ کرنے کے بعد ڈاکٹر ماریا نے پرے پر دو ادویں لکھ کر دیں کہ جا کر کھپاؤ غڈر سے لے کر پھر شہر یار کی طرف متوجہ ہوئی۔

”یہاں کی ضروریات کی کسٹ میں اور ڈاکٹر دادمل کر پہلے ہی بنا چکے ہیں۔ میں ولسٹ آپ کو دے دیتی ہوں البتہ آپ چاہیں تو اپنی سیل کے لیے ڈاکٹر داد سے بھی مل سکتے ہیں۔ میں کھپاؤ غڈر کو بھیج کر انہیں بلوا لیتی ہوں۔ اسلے کی سیل وینٹیشن کی تعداد کم ہونے کی وجہ سے وہ ذرا جلدی فارغ ہو جاتے ہیں اور اپنے کوارٹر میں بیٹھے جاتے ہیں۔ اس وقت شاید وہ ریست کر رہے ہوں گے۔“

”او کے! پھر آپ انہیں رہنے دیں اور سب مجھے دے دیں۔“ شہر یار نے اس کی بات سن کر کہا۔ مرکز صحت کی صورت حال اسے یہاں داخل ہوتے ہی کئی پیشگی تھی۔ اس کی نظر لوگوں نے سب سے بھرپور ہی جائزہ لے لیا تھا کہ وہاں صفائی کا معیار عمدہ ہے اور ہر شے ترتیب و تنظیم کے ساتھ موجود ہے اس لیے سب ڈاکٹر کو زحمت دینا مناسب نہ سمجھا۔

”یہ لیجئے اور اب میرے ساتھ چلیے۔“ ڈاکٹر یار یا نے دراز کھول کر اس میں سے ایک قلم اسکیپ بھی نکال کر شہر یار کے حوالے کرتے ہوئے اپنی فرمائش دہرائی۔ ”پلیز! میں نے کہا تھا کہ کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔ ابھی مجھے یہاں اور بھی کام ہیں۔“ اس سے سبب وصول کر کے اپنے برفیلہ کپس میں رکھتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

”اچھا، میں تو چاہ رہی تھی کہ آپ کی اپنی بھی سے ملاقات کروا دوں۔“ ڈاکٹر یار کے چہرے پر مایوسی چھائی۔ ”مجی سے...؟ میں آپ کی مدد چودھری کی قید سے آزاد ہو کر آپ تک پہنچ چکی ہیں؟“ شہر یار حیران ہوا جس کے جواب میں ڈاکٹر یار نے اثبات میں سر ہلادیا۔ ”لیکن کیسے؟ یہ کیسے ممکن ہوا؟“ شہر یار اب بھی حیران تھا۔

”میرے اور چودھری کے درمیان ڈیل ہو گئی ہے۔ میں یہاں رہ کر چودھری کی مرضی کے مطابق کام کرتی رہوں گی۔ اس شرط پر اس نے میری بھی کوریج کیا ہے اور ساتھ ہی بھی تنخواہ کر دی ہے کہ میں خود کو آزاد نہ سمجھوں۔ اس کے بندے بردست میری اور میری بھی کی گھرائی کرتے رہیں گے۔“ ڈاکٹر یار نے ادا کیے سے بتایا۔

”یہ تو کبھی غلطی نہ ہو گئی ہے۔ آپ کو اس واقعے کی رپورٹ لکھوائی جا چاہیے۔ میں خود اس انصافی کے خلاف آپ کا ساتھ دوں گا۔“ فیسے سے سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ شہر یار نے باریکاسا کیا۔

”جھٹکس فار پور کا ہیڈ فیس سرائے آئی کانت ڈو ات۔ میں ابھی طرح اس فیوڈل سسٹم کو جاتی ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ اس کے خلاف آواز اٹھانے والوں کا کیا حشر ہوتا ہے۔“ ڈاکٹر یار نے صاف انکار کیا۔

”اگر آپ جیسے پڑتے ہوئے کچھ لوگ بھی ایسی باتیں کریں گے اور اس طرح ڈرتے رہیں گے تو کون اس ظلم کے خلاف جہاد کرے گا۔ آپ تھوڑی سی ہمت تو کریں، میں ہوں نا

آپ کے ساتھ۔ میں چودھری کو سبق سکھاؤں گا کہ کسی کے ساتھ اس طرح زبردستی کرنے کا کیا انجام ہوتا ہے۔“ شہر یار نے اس پر زور ڈالا۔

”سواری سرا میں آپ کا ساتھ ہرگز بھی نہیں دے سکتی۔ آپ چودھری کے خلاف ہیں، مجھے معلوم ہے لیکن میں دو گرجھوں کی لڑائی میں خود کو فریق بنانے کے لیے تیار نہیں۔ آپ دونوں بڑے لوگ ہیں۔ اس لڑائی میں آپ کا کچھ نہیں جانے گا لیکن میں اور میری ہی مصیبت میں پڑ جائیں گے۔“

مار یار نے پھر صاف انکار کر دیا۔

”او کے! پھر میں چننا ہوں لیکن مجھے ہمیشہ افسوس رہے گا کہ ایک بڑی کبھی ایسی مظلوم خاتون نے ظالم کے سامنے اتنی آسانی سے ہتھیار ڈال دیے اور دروہوں اور انہیں کیا جواس کا فرض بننا تھا۔“ وہ کافی آف موڈ کے ساتھ ڈاکٹر یار کے پاس سے رخصت ہوا۔ اس کی اگلی منزل اسکول وائٹسٹر میں ہو گیا تھا۔ اسکول کا نام چونگ ختم ہو چکا تھا اس لیے کمروں میں تالا پڑا تھا البتہ وائٹسٹر میں ہوم کلا ہوا تھا۔ وہاں گھرائی پر تعینات چونگیدار شام کے بعد ڈیوٹی پر آتا تھا اس لیے شہر یار کے آنے کی اطلاع اندر پہنچانے والا کوئی نہیں تھا۔ اس نے اپنی گاڑی رکوائی بھی ڈرافٹ سے چھٹی درت گاڑی کی آواز سن کر ہی کوئی متوجہ ہو جاتا۔ گاڑی سے اتر کر وہ پیدل ہی ایسٹن سے چلتا ہوا وائٹسٹر میں ہوم تک پہنچا۔ ایک کمرے پر منتقل ہوا وائٹسٹر میں ہوم کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس کے دروازے سے اندر کام کرتی خواتین صاف نظر آ رہی تھیں۔ وہ بہت منظم انداز میں خاموشی سے اپنا کام سرانجام دے رہی تھیں۔ کام کرنے والی ان خواتین کے علاوہ وہاں آفتاب بھی موجود تھا جو گرجی پر بیٹھا اپنے سامنے کھلے رجسٹر میں بڑی طرح غرق تھا۔ شہر یار کی اچانک آمد نے اسے حیران کر دیا۔

”خیر! لائیں سرا میں اس وقت آپ کی آمد کو ایکسپیکٹ نہیں کر رہا تھا۔“ شہر یار سے معافی کے اسے ہنسنے کے لیے گرجی پیش کرتے ہوئے اس نے خوشی اور حیرانی کی کئی جلی کیفیتیں پیش کیں۔

”ایکسپیکٹ تو میں بھی نہیں کر رہا تھا کہ اس نام نہان چھپن یہاں دیکھ سکوں گا۔“ شہر یار نے مسکراتے ہوئے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

”آپ ٹھیک کر رہے ہیں۔ ویسے تو میں بھی بھاری یہاں کا پتھر لگاتا ہوں لیکن آج کل یہاں گھرائی پر مامور لڑکی چودھری انکھاری لاہور والی کبھی میں سے اس لیے مجھے روزانہ ہی آتا پڑتا ہے۔ وہ لڑکی ان کی ملازمہ ہے۔ اس لیے حکم کی

قیمت پر مجبور تھی۔“ شہر یار کو لگا کہ یہ ظاہر مسکرا کر یہ جواب دیتے ہوئے آفتاب حقیقتاً کافی اہمیت ہے۔

”اوہ آئی سی... لیکن اس طرح چھپن تو بڑی پریشانی ہو رہی ہوگی۔ بہتر ہے کہ میں اس لڑکی کی جگہ کسی دوسری ایسی لڑکی کو لے آؤں جو کسی اور کی ملازمت میں نہ ہو۔“ شہر یار نے اسے مشورہ دیا۔

”یہی تو مشکل ہے کہ یہاں ایسی لڑکیاں ملتی نہیں ہیں۔ رانی کافی سمجھ دار اور تھوڑی سی پڑھی لکھی لڑکی ہے اس لیے مجھے ذرا سکھانا پڑتی ہے۔ خیر، وہ کسی دن واپس آتی جائے گی۔ فی الحال آپ یہ دیکھیں۔ میں نے لاہور اور اسلام آباد میں ملبوسات کے بزنس سے جڑے کچھ افراد سے رابطہ کیا تھا۔ ان کی طرف سے اچھا ریسپانس ملا ہے۔ وہ یہاں کی خواتین سے کام کروانے کے لیے تیار ہیں اور معاوضہ بھی مناسب آفر کر رہے ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ ان کے آرڈرز لے لیے جائیں۔ اس طرح ان خواتین کے لیے آمدنی کا معقول ذریعہ بن جائے گا۔“ آفتاب نے شہر یار کے سامنے دو لفافے رکھے جن پر مشہور ڈریس ڈیزائنرز کے موڈل گرام پرنٹ تھے۔

”وہ ڈیزائن آفتاب اتم تو پرنٹ میں بڑی پرقشیں کے ساتھ کام کرتے ہوئے ہیں آج صبح تمہارا وہ کام پڑھا ہے جو تم نے اللہ آدوالے واقفے پر میرے کہنے پر لکھا تھا۔ بہت شاندار کام ہے۔ تم نے اپنے کام میں ہر وہ پراحت شامل کیا جو میں چاہتا تھا۔ اتنی محنت سے اور اتنا اچھا کام لکھنے پر مجھے چھپن میں جھٹکس کہنا چاہیے۔“ شہر یار نے سکے دل سے اس کی کارکردگی کو سراہا۔

”جھٹکس کی ضرورت ہی نہیں سرا آپ اور میں ایک ہی مشن پر کام کر رہے ہیں۔ اپنی استعداد اور ہلکا جیتوں کے مطابق جس نے جو کر لیا، تمہیں وہ اس کا فرض تھا جس کی ادائیگی کے لیے اللہ نے ذریعے بنا دیے ورنہ انسان کی کیا اوقات کہ کہیں بھی، کبھی بھی کہیں۔“ آفتاب نے انکھاری سے جواب دیا اور یہی انکھاری تو جی جوا سے بہت سے لوگوں میں مبتلا کرتی تھی۔ دل میں بہت خوش گوار سا احساس لیے شہر یار نے وہاں سے رخصت چاہی۔ باشر آفتاب کی کام کے ساتھ کچھ بیٹھ ہی اسے بہت متاثر کرتی تھی لیکن آج اس نے محسوس کیا تھا کہ پوری تن دی سے اپنے کام میں مصروف آفتاب کچھ بچھا ہوا ہے۔

”تمہاری ترنی کی رفتار دیکھ کر مجھے بہت خوش ہوئی آفتاب! اسی اسپرٹ کے ساتھ کام جاری رکھو۔ میری طرف

سے تمہیں اجازت ہے کہ اگر اسکول اور انٹرنل ہوم کی بہتری کے لیے کوئی بھی قدم اٹھانا چاہتے ہو تو اپنی مرضی سے اٹھا سکتے ہو۔ بس تمہارا نوں پر مجھے یا عبد المنان کو اطلاع دینا کافی ہوگا۔“ آفتاب سے معافی کرتے ہوئے اس نے کہا۔

”جھٹک! پورا آپ کا اہتمام میرے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔“ آفتاب مسکراتے ہوئے مسکراہٹ کچھ بھی ہوئی تھی۔

”او کے! تو پھر میں چننا ہوں۔ اگر کسی نوعیت کا کوئی بھی مسئلہ ہے تو تم مجھ سے کہہ سکتے ہو۔“ اس کی کیفیت دیکھتے ہوئے بالآخر شہر یار کو کھانا پڑا۔

”نوسرا کوئی برا نہیں۔“ اس نے اپنی مسکراہٹ کو کچھ اور بھی گہرا کر کے ہونے شہر یار کو یقین دلانے کی کوشش کی تو وہ چپ ہو گیا۔ اتنا اندازہ تو بہر حال اسے ہو گیا تھا کہ مسئلے کی نوعیت کچھ کی قسم کی ہے اس لیے آفتاب بتانے سے گریزاں ہے۔ مزید اصرار کر کے کار جان کے وہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس کی اگلی منزل فاریسٹ آفیسر عابد انصاری کا بھگوا تھا۔ یہ وہی بھگوا تھا جس میں کچھ عرصہ تک ایک اقبال باجوہ رہائش پزیر تھا اور یہ طور فاریسٹ آفیسر جرجی طرح کی بدعنوانی میں ملوث رہنے کے بعد بالآخر ٹریک دن باطل اچانک ہارٹ ایک سے جاں بحق ہو گیا تھا۔ موت اسے اچانک دبوچتے ہوئے نہ اس کی کماٹی دولت سے مرعوب ہوئی تھی، نہ ہی مراسم سے۔ وہ اپنا کیا ہوا سارا مال اسی خالی دیوانا میں چھوڑ کر سیاہ کاریوں سے ملبوسا اہل اعمال کے گرجا خانگی کے سامنے شرمندہ ہونے پہنچ گیا تھا۔ وہ جنگ کی ابتدائی حد میں واقع فاریسٹ آفیسر کے جھٹک سے پہنچا تو شام کے سامنے پھیلنے لگے تھے۔ جھٹک پر عابد انصاری نے اس کا پرجوش استقبال کیا۔ وہ پیچاسی کلین سال کا ایک گرجا تھا جس کے غناست سے کبھی کیے گئے بالوں میں سے کبھی کبھی سفیدی اس کی شخصیت کو اور بھی خوبصورت و پرجوش بنا رہی تھی۔ شخصیت کی اس کشش کو بڑھانے میں اس کی آنکھوں پر لگے شہر یار فریم کے ٹیسے سے جھٹکے کے ساتھ وہ آف واپس سفارڈی سوٹ بھی اہم کردار ادا کر رہا تھا جو اس نے یقیناً فاسی مارڈرز سے سلوا کر زینت بن لیا تھا۔

”آپ سے مل کر بہت خوش ہوئی۔ یہاں پوسٹنگ سے قبل آپ کے بارے میں کافی کچھ سننے کو ملا تھا۔ یہ بھی اطلاع ملی تھی کہ آپ کی سفارش پر مجھے یہاں پوسٹ کیا گیا ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے تو یقیناً تمہیں کہ میں آپ کی امیدوں پر ہوا راتنے کی پوری پوری کوشش کروں گا۔“ اسے ذرا رنگ روم میں بٹھانے کے بعد جب ابتدائی تعارف کا مرحلہ گزر گیا

تو عابد انصاری نے مسکراتے ہوئے اپنے جذبات و خیالات کا اظہار کیا۔

”میں بھی یہی خواہش رکھتا ہوں کہ آپ میری امیدوں پر پورے اثر رکھیں اور میں اچھے ٹیم ورک کے لیے جو ٹیم تشکیل دے رہا ہوں، آپ اس کے ایک اچھے ممبر ثابت ہوں۔ ڈاکٹر ماربانے مجھ سے یہ طور خاص آپ کی تعریف کی تھی۔ وہ خود اپنی تحقیقی اور فرض شناس خاتون ہیں اس لیے میں نے ان کی تعریف پر یقین کرتے ہوئے آپ کی یہاں پوشنگ کے لیے سفارش کر دی۔ اب آگے آپ کا کام بتائے گا کہ میں اپنے اس عمل میں درست تھا یا نہیں۔“ شہریار نے اسے جانچتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے یقین ہے کہ آپ کو مجھ سے مایوسی نہیں ہوگی۔ البتہ میں یہ بات سمجھ سکتا ہوں کہ آپ اتنے محتاط کیوں ہیں۔ دنیا سے اٹھ جانے والوں کی بڑائی مناسب تو نہیں لیکن میں کہنے پر مجبور ہوں کہ باجوہ صاحب نے اپنے فرائض سے غفلت کی حد تک بے پروائی برتی تھی اور یقیناً ان کا یہی رویہ آپ کو کھٹا ہونے پر مجبور کر رہا ہے۔ بہر حال میں اپنے بارے میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ تھوڑے ہی عرصے میں آپ پر میرے اور باجوہ صاحب کے درمیان موجود فرق ظاہر ہو جائے گا۔ آپ کی تسلی کے لیے میں اتنا بتا دوں کہ میں نے اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے منصوبہ بندی شروع کر دی ہے۔ خصوصاً میں ریکارڈ مین بن کر رہنے پر زور دے رہا ہوں۔ ہمارے پاس جنگل میں موجود جانوروں اور درختوں کے صحیح اعداد و شمار موجود نہیں ہیں جس کی وجہ سے اس جنگل کی روک تھام کرنا مشکل ہوتا ہے۔ میں نے ایک درخواست تیار کی ہے جس میں حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ مجھے ایسے افراد پر اہم کیے جائیں جو اس کام کے ماہر ہوں۔ میں جنگل کی تکنیک استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ اس طرح جنگل میں موجود فانا اور فلورا کی کاؤٹنگ بھی ہو جائے گی اور نشان زدہ جانوروں اور درختوں کو اس کی جان بچائی جائے گی۔“ عابد انصاری نے مختصر الفاظ میں اسے اپنا سارا منصوبہ بتایا۔

”یہ تو آپ بہت زبردست کام کریں گے انصاری صاحب! میری ذاتی خواہش بھی یہی تھی کہ جنگل کے سلسلے میں کچھ اس طرح سے کام کیا جائے جو مستقل بنیادوں پر ہو۔ آپ بے فکر ہو کر اپنی درخواست بھجوائیں۔ میں خود بھی آپ کی سفارش کروں گا۔“ وہ جو کام کرنے والے افراد کا دل سے قدراں تھا، عابد انصاری کی بات سن کر خوش ہو گیا اور انہیں اپنے پھر پور تعاون کی یقین دہانی کروانے لگا۔

”تعاون کے لیے شکر ہے شہریار صاحب! اگر آپ کا اعتماد اور تعاون اسی طرح میرے ساتھ رہا تو میں اپنی کارکردگی سے آپ کو حیران کر دوں گا۔“ عابد انصاری اس کے جوش کو دیکھ کر متحیرانہ ہونے لگا۔ اس کے بعد بھی ان دونوں میں کافی دیر تک اس موضوع پر گفت و شنید ہوتی رہی۔ اس گفتگو کے دوران وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوا۔ شہریار کو اس وقت چونکا جب ملازم نے کھانا لگنے کی اطلاع دی۔

”مجھے اجازت دیں انصاری صاحب! آپ کی کھانا میں مجھے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا، ورنہ طے شدہ شیڈول کے مطابق تو مجھے اب تک وہاں نور کوٹ پہنچ جانا چاہیے تھا۔“ وہ فوراً ہی اپنی جگہ سے کھڑا ہو کر عابد انصاری سے اجازت طلب کرنے لگا۔

”اب آپ اس طرح بغیر کھانے تو یہاں سے نہیں جاسکتے۔ جہاں اتنا وقت گزر گیا ہے پندرہ بیس منٹ اور رعایت کر دیں۔“ عابد انصاری نے اسرار کا اور پھر ان کا یہ وضع دارانہ اسرار اتنا زیادہ بڑھ گیا کہ شہریار کو کھانے کے لیے رکتے ہی بنی۔ کھانا عمدہ اور قدر سے پرکشش تھا لیکن اتنی بہتات میں نہیں تھا جیسا چوہدری کی ڈانگ ٹیبل پر ہوتا تھا۔ شہریار اور عابد انصاری نے آپس میں گفتگو کرتے ہوئے خوش گوار ماحول میں کھانا کھایا۔ ڈرائیور کے بارے میں بھی اسے اطلاع مل گئی تھی کہ اسے بھی کھانا کھلا دیا گیا ہے۔ کھانے کے بعد گرین ٹی کا دور چلا اور پھر آخر کار شہریار نے وہاں سے رخصت جانی۔ عابد انصاری کے بیٹے سے نکل کر وہ اپنی گاڑی میں واپسی کے لیے روانہ ہوا تو اس کے ساتھ ایک بہت خوش گوار سا احساس تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ جس مشن کے تحت کام کر رہا ہے، اس کے لیے اس کا ساتھ دینے والوں کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھیوں کا ایک قافلہ تشکیل پا رہا تھا جو اس امر کی نشان دہی کر رہا تھا کہ وہ اپنی منزل تک ضرور پہنچے گا۔ سکون اور اطمینان کے اس گہرے احساس کے ساتھ وہ گاڑی کی سیٹ سے سرکاتے آنکھیں موندے بیٹھا تھا۔ تاہم اس پر چلتی گاڑی کو لگنے والے ہچکچوکے بھی اس کے اطمینان میں فرق نہیں لارہے تھے لیکن پھر یک دم ہی ایک زوردار جھلکا اور بریکس کی زوردار جھجھک کے ساتھ گاڑی رک گئی۔ شہریار نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور سر اٹھا کر دیکھا۔ گاڑی کے باہر نظر آنے والا منظر حیران کن تھا۔

حادثات و سانحات کی شکل۔ پناہ کی تلاش میں سر کوڈان ماہ نامی داستان حیات کے واقعات اگلے ماہ ۲۰۱۰



ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور بااثر سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں۔ مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں، بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے..... یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے..... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے۔ پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو۔ محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہو جاتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے۔ زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں..... کبھی بازی پلٹ بھی جاتی ہے۔ بیٹا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے..... اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے۔ جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

تقدیر کی فسون گری، قسمت کی چال بازی یا مقدر کا کھیل..... ملے اور ٹکڑ جائے والوں کی کہانی



وہ ایک کھلی جیپ تھی جس نے اس کی گاڑی کے عین سامنے آکر اس کا راستہ روک لیا تھا اور اب اس سے ہتھیاروں سے لیس نقاب پوش اچھل اچھل کر باہر نکل رہے تھے۔ وہ کون لوگ تھے؟ فوری طور پر اس کے لیے فیصلہ کرنا ممکن نہیں تھا لیکن یہ تو طے تھا کہ وہ جو بھی ہیں، دوست ہرگز نہیں ہو سکتے۔ وہ اچانک سامنے آ جانے والے ان دشمنوں کے لیے ترنوالہ بننے کو تیار نہیں تھا اس لیے بے حد پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے ہاتھ بڑھا کر گاڑی کا لاک کھولا اور دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکلا۔ باہر نکلتے ہوئے اس نے اس بات کا دھیان رکھا تھا کہ سیدھا کھڑا نہ ہو اور جسم کو ایسے زاویے پر رکھے کہ گاڑی کے دروازے کی آڑ میں چھپ سکے۔ ورنہ دوسری صورت میں اگر حملہ آوروں کی طرف سے فائرنگ کی جاتی تو وہ نشانہ بن سکتا تھا۔ اگلے ہی پل سنائی دینے والی فائر کی آواز نے اس کے اندازے کی تصدیق کر دی۔ اسے باہر نکلتے دیکھ کر ان میں سے کسی نے فائر کر دیا تھا۔ فائر کی آواز کے فوراً بعد دوسری آواز اس کی سماعتوں تک پہنچی، وہ اس کی گاڑی کے ڈرائیور کی بھیانک چیخ تھی۔ وہ بے چارہ اس صورت حال پر بری طرح بوکھلا گیا تھا اور اچانک راستہ روک کے جانے پر ایمر جنسی بریکس لگانے کے سوا کچھ نہیں کر سکا تھا۔

اس کی چیخ سن کر شہریار کو اندازہ ہوا کہ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ہلاک یا شدید زخمی ہو چکا ہے۔ ڈرائیور کے ساتھ جو بھی حادثہ پیش آیا تھا، اسے اس پر دی افسوس تھا لیکن اس وقت وہ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ فی الحال تو اسے اپنی بقا کی جنگ لڑنی تھی اور وہ بھی بنا ہتھیار... فی الوقت وہ قطعی نہتا تھا۔ ایک عام سے معمول کے دورے پر آتے ہوئے اسے خیال ہی نہیں گزرا تھا کہ اپنے ساتھ کوئی ہتھیار لے کر چلتا۔ اس نے ڈرائیور کے پاس موجود ریوالور کو ہی کافی جانا تھا لیکن قسمت کی خرابی سے ڈرائیور اس کے تحفظ کے لیے کوئی قدم اٹھاتا، اس سے قبل خود ہی نشانہ بن گیا تھا۔ اس کی طرف سے کسی مدد کی قطعی امید نہ رکھتے ہوئے شہریار گاڑی کے عقب میں ریگ گیا۔ جیپ سے اترنے والے نقاب پوش ابھی تک اس کی گاڑی کے قریب نہیں آئے تھے اور دور سے ہی جائزہ لے رہے تھے۔

”بے کار کی محنت نہ کریں اے سی صاحب! ہم تعداد میں بھی زیادہ ہیں اور ہمارے پاس اسلحہ بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ اگر ہم چاہتے تو آپ گاڑی سے اتر بھی نہیں سکتے تھے۔ اپنے ڈرائیور کو لٹنے والی گولی کو ہماری کوئی خطا نہ سمجھیے گا۔ نشانہ ہم

سب کا بالکل اے ون ہے۔ آپ ہمیں گلیوں میں کچے کھیلنے والے لونڈے تصور کرنے کی غلطی نہ کریں اور آرام سے بغیر کسی مزاحمت کے ہاتھ اٹھا کر سامنے آجائیں۔“

وہ گاڑی کے عقب میں پہنچا ہی تھا کہ ان نقاب پوشوں میں سے ایک کی قدرے بلند لیکن ہموار آواز سنائی دی۔ وہ اس آواز کو سن کر تذبذب میں پڑ گیا۔ بولنے والے کے لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ ایک پڑھا لکھا اور پُر اعتماد آدمی ہے۔ پھر اس نے جو بات کہی تھی، وہ تو بالکل روشن حقیقت کی طرح عیاں تھی۔ حملہ آور تعداد میں زیادہ بھی تھے اور مکمل طور پر ہتھیار بند بھی۔ وہ اگر ان کے خلاف مزاحمت کرتا بھی تو ان کے آگے اس کی کتنی دیر پیش چلتی۔ آخر کار اسے ہار مانتی ہی پڑتی لیکن اس طرح بغیر کسی مزاحمت کے ہار مان لینا بھی اس کے لیے خلاف فطرت تھا۔ وہ فطرتاً مہم جو تھا اور ایسے کسی موقع پر اپنی حیثیت و مقام سب بھول کر میدانِ عمل میں اترنے کے لیے پرتو لے لگتا تھا۔ اس وقت بھی اس کے عضلات پوری طرح تنے ہوئے تھے اور اس کی فطرت اسے مقابلے پر اکسا رہی تھی۔

”دونوں ہاتھ سر پر رکھ کر کھڑے ہو جائیں اے سی صاحب! کوئی بھی غیر ضروری حرکت آپ کے لیے نقصان دہ ثابت ہوگی۔“ اس سے قبل کہ وہ از خود کوئی فیصلہ کرنا، اس کی پشت پر سے آواز ابھری اور کوئی ٹھنڈی سی شے اس کی گردن سے ٹکرائی۔ وہ ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ گردن پر موجود ٹھنڈک کو پہچاننا اس کے لیے کچھ مشکل نہیں تھا۔ یوہے کی یہ ٹھنڈک یقینی طور پر کسی ہتھیار کی نشان دہی کر رہی تھی۔ اس کا راستہ روکنے والوں میں سے کوئی بہت آہستگی سے چل کر اس کی پشت پر پہنچ گیا تھا اور اسے بے بس کر دیا تھا۔ اس بے بسی پر شدید جھنجھلاہٹ محسوس کرتے ہوئے وہ اپنی پشت پر موجود شخص کے حکم کے مطابق سر پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب اس پر سامنے کا منظر زیادہ واضح تھا۔ اسے روکنے والی جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک ڈھانٹا پوش بالکل تیار بیٹھا تھا۔ اس نے جیپ کا انجن بند نہیں کیا تھا تا کہ کسی ایمر جنسی کی صورت میں اسے اور اس کے ساتھیوں کو فرار ہونے میں مشکل پیش نہ آئے۔ ڈرائیور کے علاوہ دو ڈھانٹا پوش اس کی گاڑی کے بالکل قریب کھڑے ہوئے تھے جبکہ ان کا چوتھا ساتھی تو اس کی پشت پر موجود ہی تھا۔

”آگے بڑھو۔“ وہ اس جائزے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ اس کی پشت پر موجود شخص نے اسے ہلکا سا ٹھوکا دیتے ہوئے حکم دیا۔ شہریار نے اس کی آواز کو شناخت کر لیا۔ اسے

گھیرنے والوں میں سے اب تک صرف یہی شخص اس سے ہم کلام ہوا تھا۔

”میرا ڈرائیور زخمی ہے۔ یہ اگر اسی طرح پہاں پڑا رہا تو مر جائے گا۔“ عقب میں موجود شخص کے حکم کی تعمیل میں اس نے دو قدم ہی آگے بڑھائے تھے کہ زخمی ڈرائیور پر نظر پڑنے پر ٹھٹک کر رک گیا۔ ارد گرد چھائے اندھیرے کے باوجود گاڑی کی اندرونی بتی روشن ہونے کی وجہ سے وہ اندر موجود ڈرائیور کو صاف دیکھ سکتا تھا۔ اس کے سینے پر گولی لگی تھی اور زخم سے نکلنے والے خون نے اس کے سفید یونیفارم کی قمیص کو بے تحاشا رنگ ڈالا تھا۔ خون کے اس بے تحاشا بہاؤ کے باوجود شہریار نے نوٹ کر لیا تھا کہ ابھی اس کی جان نہیں نکلی ہے اور وہ آنکھیں بند کیے اکھڑے اکھڑے سانس لے رہا ہے۔

”اس کی فکر کرنا بے کار ہے۔ یہ چند منٹ سے زیادہ مزید زندہ نہیں رہ سکے گا۔“ بے حد سرد لہجے میں اسے جواب دے کر ایک ٹھوکا اور دیا گیا جو اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ رکتے بغیر آگے بڑھتا رہے۔ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتے ہوئے شہریار نے اپنے قدم آگے بڑھائے لیکن خود کو سوال کرنے سے نہ روک سکا۔

”تم لوگ کون ہو اور مجھے اس طرح گھیرنے کا کیا مقصد ہے؟“

”ہم کون ہیں یہ تو نہیں بتا سکتے، البتہ مقصد شاید آپ کو آگے چل کر معلوم ہو جائے۔ ہم تو بس اپنے دوستوں کا ساتھ دینے کے لیے اس کام میں شامل ہوئے ہیں۔“ بڑے بے نیاز اور پُر اعتماد انداز میں اس کی بات کا جواب دیا گیا۔ اس جواب کو سن کر شہریار چونک گیا۔ قطعی مختلف لب و لہجے میں بات کرنے والا یہ آدمی جس کے بارے میں وہ پہلے ہی اندازہ لگا چکا تھا کہ یہ شخص مقامی نہیں ہے، اس کے کسی دشمن کے ایما پر اسے اغوا کر کے لے جا رہا تھا اور اس علاقے میں اس کی چودھری افتخار کے علاوہ بھلا اور کس سے دشمنی تھی؟

اس سوچ کے حصار میں گہرا وہ جیپ تک پہنچ گیا۔ پشت پر موجود شخص کے علاوہ اب باقی دو افراد کی رائفلیں بھی اس پر اٹھی ہوئی تھیں اور اس کے لیے کسی قسم کی حرکت کی کوئی گنجائش موجود نہیں تھی۔ اسے جیپ کی پچھلی نشست پر بٹھانے کے بعد دونوں ڈھانٹا پوش اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئے جبکہ عقب پر موجود ڈھانٹا پوش نے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ سنبھال لی۔ اس کے جیپ میں سوار ہوتے ہی ڈرائیور نے جھٹکے سے جیپ آگے بڑھا دی۔ رات کے سنائے میں جیپ

کے ٹائروں کی چرچراہٹ دور تک گونجی لیکن آبادی سے دور جنگل کے اس قریبی حصے میں کوئی گولی چلنے کی آواز سننے والا نہیں تھا تو ٹائروں کی چرچراہٹ کے متوجہ کرتی؟ طاقتور انجن والی جیپ زنائے بھرتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔

”تم لوگ جس بھی مقصد کے تحت مجھے...“ یہ سمجھتے ہوئے کہ اگلی سیٹ پر بیٹھا ڈھانٹا پوش ہی اسے اغوا کرنے والوں کا اس کا رروائی کے دوران لیڈر ہے، شہریار نے اس سے گفتگو کی کوشش کی لیکن اس کا جملہ مکمل ہونے سے قبل ہی اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے افراد میں سے کسی ایک نے کلوروفام میں بھیگا ہوا رومال اس کی ناک پر رکھ دیا۔ وہ چونکہ اپنی توجہ مکمل طور پر اگلی سیٹ پر موجود شخص پر مرکوز کیے ہوئے تھا اس لیے بروقت اس کا رروائی سے آگاہ نہ ہو سکا اور بے خبری میں ہی بے ہوشی کے اندھیروں میں ڈوبنے پر مجبور ہو گیا۔

☆☆☆
رات بے حد تاریک تھی اور اس مقام پر تو تاریکی کے ساتھ ساتھ بھیانک بھی لگ رہی تھی۔ دنیا کی رونقوں کا سبب، اس کی سرگرمیوں کو جاری رکھنے والے جسموں کی آخری پناہ گاہ کا یہ عجیب المیہ ہے کہ جیسے ہی روح جسم کو چھوڑ کر پرواز کرتی ہے، مٹی کا ڈھیر خالی وجود کو یہاں لاکر گاڑ دیا جاتا ہے۔ وہ جو کبھی کاروبار حیات چلایا کرتے تھے، اس شہر خموشاں میں منوں مٹی تیلے دبے ڈی کمپوزرز کی کارروائی سے آہستہ آہستہ خود بھی مٹی ہوتے اس مٹی میں ملتے جاتے ہیں۔ ہنگامہ حیات کو جاری رکھنے والے انسانوں کی آخری پناہ گاہ کی خاموشی میں جانے ایسی کیا بات ہوتی ہے کہ جیتا جاگتا انسان اس طرف کا رخ کرے تو ایک دہشت سی محسوس کرتا ہے۔ خصوصاً رات کے وقت قبرستان میں داخل ہونے کو بڑے دل گردے کا کام سمجھا جاتا ہے۔ اکثر لوگ یوں محسوس کرتے ہیں کہ جیسے قبروں کے اندر لیٹے مردے مٹی کے ڈھیر کو چیر کر اپنے ہاتھ باہر نکالیں گے اور انہیں بھی اندر گھسیٹ لیں گے۔

لیکن وہ چاروں اس خوف سے قطعی بے نیاز نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک قبرستان کا گورکن تھا جس کے شب و روز گزرتے ہی اس شہر خموشاں میں تھے۔ وہ انہی قبروں کے درمیان مردوں کی ہڈیوں سے کھیلتا ہوا بڑا ہوا تھا اور اب عمر کی آخری منزل پر تھا۔ عمر کے ان سالوں میں اس نے بے شمار مردوں کو مٹی تیلے اترتے اور پھر ہڈیوں کا جبر بننے دیکھا تھا۔ مرنے والے مر جاتے تو چند دنوں تک ان کے عزیز واقارب

باقاعدگی سے قبر پر آتے رہتے، تازہ قبر پر پانی کا چھڑکاؤ ہوتا اور پھولوں کی چیتاں بکھیری جاتیں۔ پھر آہستہ آہستہ یہ سلسلہ کم ہوتا جاتا اور ایک وقت ایسا آتا کہ عید، شب برأت پر حاضری کا سلسلہ بھی موقوف ہو جاتا۔ گورکن کی بوڑھی آنکھیں برسوں سے یہ سارے تماشے دیکھ رہی تھیں۔

مگر آج کی رات بوڑھے گورکن کے تجربوں میں ایک اور تجربے کا اضافہ کرنے کے لیے آئی تھی۔ رات کے آخری پہر قبرستان میں آنے والے وہ تینوں نفوس کسی مرنے والے کے لواحقین تھے، نہ ہی پناہ کے متلاشی نشتے باز و پریم دیوانے۔ وہ کفن چور بھی نہیں تھے لیکن آئے بہر حال کچھ لے جانے ہی تھے۔ انہوں نے گورکن سے کفن سمیت قبر میں دفن ایک مُردے کا مطالبہ کیا تھا۔ گورکن اس مطالبے پر ہکا بکارہ گیا لیکن مطالبہ کرنے والوں کی شناخت اور حیثیت نے اسے انکار کی جرأت نہیں کرنے دی۔ وہ سرکاری اہلکار تھے اور کچھ عرصے قبل ہی یہاں دفن ہونے والے ایک سرکاری افسر کی ڈیڈ باڈی لے جانے آئے تھے۔ ان کے پاس اس کام کے لیے مختار نامہ موجود تھا اور وہ چاہتے تو دن دھاڑے بھی یہ کام کر سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے اس کام کے لیے رات کے آخری پہر کا انتخاب کیا تھا۔ گورکن کے لیے حکم تھا کہ کام نہایت صفائی اور خاموشی سے کیا جائے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی جائے۔ غریب گورکن کے پاس اس حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ بھاوڑا اور کدال سنبھالے اپنی دھوتی کو گھٹنوں سے اوپر باندھ کر میدانِ عمل میں اتر آیا اور مشاقی سے کھدائی کا کام کرنے لگا تھا۔ یہ تو شکر تھا کہ قبر ابھی کچی نہیں کی گئی تھی اور اسے صرف چاروں طرف اکھری اینٹوں کی چار دیواری چن کر چھوڑ دیا گیا تھا۔ کچی قبر کی کھدائی کرتے کرتے بالآخر گورکن اس مقام پر پہنچ گیا جہاں قبر میں دفن لاش ظاہر ہو گئی۔

لاش ظاہر ہونے سے پہلے وہاں موجود افراد کا اس بدبو سے سابقہ پڑا جو مُردہ گلتے سڑتے جسموں سے اٹھتی ہے۔ یہ کوئی معمولی بو نہیں تھی۔ اگر کسی عام آدمی کے نتھنوں سے ٹکراتی تو وہ ابکانی لے کر پیٹ میں موجود خوراک اٹھنے پر مجبور ہو جاتا لیکن گورکن تو اس شہرِ خوشاں کا ہی باسی تھا۔ یہاں بسنے والے سیکڑوں پاسیوں میں سے واحد زندہ باسی۔ اس کے لیے یہ بو انجان نہیں تھی اور اس نے پہلے ہی حفظِ ماتقدم کے تحت اپنے منہ پر کپڑا لپیٹ لیا تھا۔ اس کے ساتھ موجود سرکاری اہلکاروں نے بھی اپنے منہ اور ناک بلکے سبز رنگ کے ماسکس سے ڈھانپ رکھے تھے۔ وہ لوگ گورکن

کے کھدائی کرنے کے دوران مٹی کو ہٹا کر ایک جانب کرنے میں اس کی مدد کرتے رہے تھے۔ قبر کشائی کے بعد لاش ظاہر ہوئی تو اسے قبر سے نکال کر مخصوص پولی تھین بیگ میں منتقل کرنے کے کام میں بھی وہ پیچھے نہیں رہے۔ لاش بہت زیادہ پرانی نہ ہونے کے باوجود اچھی خاصی خراب ہو گئی تھی۔ گورکن کے تجربے کے مطابق لاش کو دفن ہوئے جتنی مدت گزری تھی، وہ اس سے دُہری مدت کے برابر پرانی لگ رہی تھی۔ اس طرح کی گلی سڑی، بدبودار لاش کو قبر سے برآمد کر کے پولی تھین بیگ میں منتقل کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا لیکن ان لوگوں نے کر لیا۔ ظاہر ہے، وہ اس کام کے ماہر تھے تب ہی تو یہاں بھیجے گئے تھے۔

”قبر کو دوبارہ مٹی ڈال کر پہلے والی حالت میں کر دو۔ کام اتنی صفائی سے کرنا کہ کسی کو قبر کھولے جانے کا شبہ نہ ہو سکے۔“ لاش کو جراثیم کش ادویات اور بودبانے والی خوشبوؤں کے چھڑکاؤ کے بعد اپنے ساتھ لائے ہوئے ایک تابوت میں منتقل کر کے۔۔۔ ان میں سے ایک نے گورکن کو حکم دیا اور پھر اسے ایک نیلا کڑکڑاتا ہوا نوٹ تھا کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ تابوت سمیت وہاں سے رخصت ہو گیا۔ سرکاری اہلکار کا حکم، اس پر سے نیلے کڑکڑاتے نوٹ کی خوشبو۔۔۔ گورکن ان کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی پوری تن دہی سے قبر کا گڑھا بھرنے لگا۔ اس قبر کا گڑھا جو اپنے یلین کے رخصت ہونے پر کسی ماں کی کوکھ کی طرح خالی ہو گئی تھی۔

☆☆☆

شہر یار کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک نیم روشن کمرے میں فرش پر بچھے گدے پر لیٹا ہوا پایا۔ کمرے میں مختصر تھا جس میں اس کے بستر کے بعد بس چند فٹ کی جگہ بچی تھی۔ وہ بستر پر اٹھ بیٹھا اور مدھم روشنی میں کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ وہ ایک چوکور کمرہ تھا جس میں اس کے بستر کے علاوہ جو دوسری شے موجود تھی، وہ دیوار کے ساتھ رکھی پانی کی ایک صراحی تھی۔ اس کے علاوہ کمرے میں کچھ موجود نہیں تھا۔ اس نے بستر پر بیٹھے بیٹھے ہی اپنا باقی جائزہ بھی مکمل کیا۔ کمرہ اینٹوں کی پرد سے بنایا گیا تھا اور دیواریں پلاسٹر اور رنگ و روغن سے قطعی عاری تھیں۔ دائیں دیوار میں لکڑی کا ایک پٹ والا دروازہ لگا ہوا تھا۔ دروازے کی چوڑائی بہت کم تھی اور وہ دیوار میں کچھ اس طرح سے فکس تھا کہ کوئی درز نظر نہیں آرہی تھی۔ یہاں تک کہ باہر سے روشنی آنے کے لیے بھی جگہ موجود نہیں تھی۔ کمرے کی تار کی کوئیم روشن کرنے کے لیے دیوار پر ایک کیل کے ساتھ لائٹن ٹنگی ہوئی تھی۔ اس مختصر قید

خانے کا جائزہ لینے کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھا تو لمحہ بھر کے لیے سر چکرا کر رہ گیا۔ یہ یقیناً اسے بے ہوش کرنے والے کلوروفام کا اثر تھا جو اب بھی باقی تھا۔ اس نے سر جھٹک کر خود کو اس کے اثر سے آزاد کرنے کی کوشش کی اور صراحی کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس پر رکھے اسٹیل کے گلاس میں پانی اٹھایا۔ پانی بالکل شفاف تھا اس لیے اسے پانی پینے میں کوئی عار محسوس نہ ہوا۔ پانی پی کر اس کی طبیعت ہلکا ہو گئی۔ وہ اٹھ کر دروازے تک گیا اور اسے ہلانے جلانے کی کوشش کی لیکن دروازہ مضبوط لکڑی کا تھا اور کچھ اس طرح سے دیوار میں فٹ کیا گیا تھا کہ اسے ہلانے جلانے سے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ اس طرف سے مایوس ہونے کے بعد اس نے دروازے پر دستک دی تاکہ اس کو یہاں تک لانے والے اگر باہر موجود ہوں تو انہیں اس کے ہوش میں آنے کا علم ہو جائے اور وہ اس سے بات چیت کر کے اسے اغوا کر کے یہاں لائے جانے کا سبب بتائیں۔ مگر اس کی مسلسل دستک بے کار گئی اور باہر سے کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا۔ اس کے پاس اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ خاموشی سے بیٹھ کر ان لوگوں کے متوجہ ہونے کا انتظار کرے۔ اس نے یہی کیا لیکن اس خالی خولی انتظار کے دوران بھی اس کے حواس جاگ رہے تھے۔ ذرا سے ارتکاز کے بعد وہ یہ اندازہ لگانے میں کامیاب ہو گیا کہ اسے جس چار دیواری کے اندر قید رکھا گیا ہے، وہ عام آبادی میں موجود نہیں ہے۔ اس کی سماعت چار دیواری سے باہر موجود آوازوں کو محسوس کر رہی تھی۔ پرندوں کی چھپا ہٹ، ہوا کی سرسراہٹ اور کچھ غیر معمولی سی آہٹیں تھیں جو ارد گرد بکھری ہوئی تھیں۔ سماعت کے بعد اس نے اپنی قوتِ شامہ پر زور دیا تو فضا میں جنگلی بوٹوں کی مہک اور نمی سی محسوس ہوئی۔ اس کا ذہن فوراً حساب کتاب کرنے لگا۔ قوتِ سماعت و شامہ کی حاصل کردہ معلومات کے تجزیے نے اس کے سامنے ایک ہی جواب پیش کیا۔ وہ اس وقت جنگل کے کسی حصے میں موجود تھا اور اس خیال کی تصدیق اس بات سے بھی ہوتی تھی کہ اسے جنگل کے قریب سے ہی اغوا کیا گیا تھا۔ یعنی اغوا کرنے والوں نے اسے جنگل ہی میں موجود اپنے کسی خفیہ ٹھکانے میں رکھا تھا۔ وہ کون لوگ ہو سکتے تھے؟ وہ جب بھی خود سے یہ سوال کرتا، اس کے سامنے ایک ہی جواب آتا۔

چودھری افتخار عالم شاہ... یہاں اس کا دشمن بھی وہی تھا اور اختیارات بھی اسی کے اتنے وسیع تھے کہ وہ اس جنگل سمیت پورے علاقے میں جہاں چاہتا اسے قید کر دے سکتا تھا۔

چودھری کے پاس اسے اغوا کروانے کے لیے کئی مضبوط جواز بھی موجود تھے۔ وہ یہاں کا بے تاج بادشاہ تھا اور لوگ اپنی ہر ضرورت کے لیے نہ صرف اس کی طرف دیکھتے تھے بلکہ اس کا ہر ظلم بھی خاموشی سے برداشت کر لیتے تھے... لیکن اب اسکول و اسپتال کے باقاعدہ آغاز نے چودھری کی اس حیثیت کو زک پہنچائی تھی۔ دوسری طرف لکڑی اور کھالوں کی اسمگلنگ کے لیے کی جانے والی سختی نے اسے مالی اعتبار سے نقصان پہنچایا تھا۔ پھر ماہ بانو کا شہر یار کی مدد سے اس کے ہاتھوں سے نکل جانا بھی اس کے غصے کو بھڑکانے کا سبب بنا تھا۔ اس نے ڈاکٹر ماریا کو چارے کے طور پر استعمال کر کے شہر یار کو ٹریپ کرنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن خوش قسمتی سے شہر یار اس کی اس گھناؤنی چال سے بچ گیا تھا۔ اب یقیناً وہ ایک نیا حربہ لے کر آیا تھا اور اس حربے کے استعمال سے پہلے خود امریکا روانہ ہو گیا تھا تاکہ خود کو شک سے بری رکھنے کے لیے عدم موجودگی کا جواز دے سکے۔

شہر یار جوں جوں اس صورت حال پر غور کر رہا تھا، اس کا یقین مضبوط ہوتا جا رہا تھا کہ اس ساری کارروائی کے پیچھے چودھری کا ہی ہاتھ ہے۔ اپنے یقین پر پختہ ہونے کے بعد وہ ایک بار پھر اپنی جگہ سے اٹھا اور دروازے پر دستک دی۔ حسب سابق اس دستک پر بھی کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا لیکن اسے یقین تھا کہ باہر کوئی نہ کوئی ضرور موجود ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اسے اتنی جدوجہد سے اغوا کر کے لانے کے بعد بغیر کسی نگراں کے تنہا چھوڑ دیا جاتا۔

”میں جانتا ہوں کہ باہر میری آواز سنی جا رہی ہے۔ بے شک تم لوگ مجھے رسپانس نہ دو لیکن میرا یہ پیغام چودھری تک پہنچاؤ کہ وہ تھوڑے کلاس مجرموں کی طرح اوجھے ہتھکنڈے استعمال کرنے کے بجائے مجھ سے فیس ٹوفیس بات کرے۔“ اپنے یقین ہی کی بنیاد پر اس نے بلند لیکن باوقار لہجے میں یہ بات کہی اور واپس بستر پر آ بیٹھا۔

”آپ بے کار اندازے لگانے میں اپنی توانائیاں ضائع نہ کریں اے سی صاحب! یہاں جس کو اور جب بھی آپ سے مذاکرات کرنے ہوں گے وہ خود سامنے آجائے گا۔“ ذرا سے توقف کے بعد دروازے کی دوسری جانب قدموں کی آہٹ سنائی دی اور نہایت ٹھنڈے لہجے میں شہر یار کو جواب دیا گیا۔ جواب دینے والے کی آواز شناخت کرنے میں اس بار اسے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ یہ وہی تھا جو اغوا کے دوران بھی اس سے گفتگو کرتا رہا تھا۔ اس شخص کے لہجے کا ٹھہراؤ اور زبان کی روانی اس کو ہر بار ٹھکانا دیتی تھی۔ وہ بولتا تو

صاف احساس ہوتا تھا کہ وہ کوئی پڑھا لکھا، شہری ماحول کا بندہ ہے جو شاید کسی مجبوری کے سبب ان مجرمانہ ذہنیت رکھنے والوں میں شامل ہو گیا ہے۔ فی زمانہ بڑھتی ہوئی... بے روزگاری اور کرپشن نے یہ ایک نیا ٹریڈ جنم دیا تھا۔ یہ حیثیت ایک انسان کے شہر یار کے لیے یہ ایک بڑا لمحہ فکریہ تھا۔ اس وقت بھی وہ اپنی قید و بند کی پریشانی کو بھول کر اس نوجوان کی ذات میں الجھ کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆

”مجھے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر شہر یار عادل زندہ سلامت چاہیے ایس پی صاحب... آپ یہ بات بہت اچھی طرح سمجھ لیں۔ اگر آپ اسے تلاش کرنے میں ناکام رہے تو یاد رکھیے گا کہ پھر پولیس کی نوکری میں آپ کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی۔ یہ ناکامی آپ کے اگلے پچھلے سارے کھاتے کھول دے گی۔ شہر یار عادل کوئی معمولی شخص نہیں ہے جو اسے اس طرح اغوا کر لیا جائے اور کہیں کوئی طوفان نہ اٹھے۔ مجھے ہر حال میں وہ چوبیس گھنٹے سے پہلے واپس چاہیے۔“ ریسور کان سے لگائے یہ سب سنتے معظم تارڑ کو دوسری طرف موجود آئی جی مختار مراد کی کیفیت کا خوب اندازہ ہو رہا تھا۔ وہ غصے سے باقاعدہ چنگھاڑ رہا تھا۔ یقیناً سجاد رانا کی ہلاکت کے بعد ہونے والا شہر یار کا یہ اغوا اس کے اعصاب کے لیے بڑی آزمائش ثابت ہوا تھا اور اس کا اپنا بس نہیں چل رہا تھا کہ کس طرح گھڑی کی چوتھائی میں شہر یار کو بازیافت کروا ڈالے۔

”ہم اپنی پوری کوشش کر رہے ہیں سر! پولیس فورس کے جوانوں نے اس سارے علاقے کو گھیر لیا ہے جہاں سے شہر یار صاحب کی گاڑی اور ان کے ڈرائیور کی لاش ملی ہے۔ میرے جوان کوشش کر رہے ہیں کہ کسی طرح کوئی کلیولر جائے جس سے اندازہ لگایا جاسکے کہ اے سی صاحب کو اغوا کر کے کہاں لے جایا گیا ہوگا۔ ویسے مجھے شک ہے کہ انہیں جنگل کی طرف لے جایا گیا ہے اور اگر ایسا ہے تو پولیس فورس کو کارروائی کرنے میں بہت مشکل پیش آئے گی۔ ہمارے پاس نہ تو اتنی نفری ہے اور نہ ہی اتنی سہولیات کہ گھنے جنگل میں گھس کر کارروائی کر سکیں۔“ اس نے مختار مراد کے سامنے اپنی کارکردگی کی رپورٹ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ذہن میں موجود خدشات اور درپیش مسائل بھی بیان کر دیے۔ وہ خود بھی سمجھتا تھا کہ یہ بہت نازک معاملہ ہے۔ شہر یار کا اغوا اتنی معمولی بات نہیں تھی کہ آرام سے دب جاتی۔ ابھی مختار مراد کا فون آیا تھا بعد میں اور بھی نہ جانے کون کون اس سے رابطہ کر

کے شہر یار کی بازیابی کے سلسلے میں اس پر دباؤ ڈالتا۔ ”آپ کو شہر یار کی تلاش میں جنگل چھاننا پڑے یا کسی کا محل... مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ بس مجھے چوبیس گھنٹے میں اس کے ملنے کی اطلاع چاہیے۔ باقی آپ کو جتنی فورس اور سہولیات درکار ہیں، وہ نوٹ کروادیں۔ آپ کو چند گھنٹوں کے اندر سب کچھ پرووائڈ کر دیا جائے گا۔“ مختار مراد نے طنز اور غصے کی ملی جلی کیفیت میں اس کی بات کا جواب دے کر ریسور پینچ دیا۔ ریسور پینچ جانے کی آواز سن کر معظم تارڑ نے بھی ایک گہرا سانس لیتے ہوئے کان سے لگا ریسور کیڑل پر ڈال دیا۔ وہ بے وقوف نہیں تھا کہ مختار مراد کا اشارہ نہیں سمجھتا۔ اس نے کہا تھا کہ آپ کو شہر یار کی تلاش میں جنگل چھاننا پڑے یا کسی کا محل... مجھے اس سے غرض نہیں ہے۔ اس بات کا مطلب تھا کہ وہ چودھری افتخار پر شبہ کر رہا تھا کیونکہ اس علاقے میں محل جیسی حویلی تو بس اسی کی تھی۔ خود معظم تارڑ بھی سمجھ رہا تھا کہ یہ کارروائی چودھری کی طرف سے ہی کی گئی ہے۔ چودھری اس سلسلے میں پہلے ایک بار اپنا ارادہ ظاہر کر چکا تھا، بعد میں اس نے اچانک نیویارک جانے کا پروگرام بنالیا۔ اب اس کی غیر موجودگی میں یہ واردات ہوئی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ چودھری یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ اس کا اس کارروائی سے کوئی تعلق نہیں... لیکن دوسرے لوگ بھی کوئی گھاس نہیں کھائے ہوئے تھے جو حقیقت کو نہ سمجھ پاتے۔ تارڑ نے بھی حقیقت سمجھ لی تھی اور واردات کی اطلاع ملنے کے بعد سے مسلسل چودھری سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کا موبائل مسلسل بند جا رہا تھا۔ پاکستان اور نیویارک کے درمیان جو طویل فاصلہ تھا، اس نے وقت کا بھی بہت بڑا بعد پیدا کر دیا تھا۔ ایس پی تارڑ کو معلوم تھا کہ اس پہر جبکہ یہاں دن نکلا ہوا ہے، نیویارک میں رات ہوگی۔ اب جانے رات کی یہ گھڑیاں چودھری خواب خرگوش کے مزے لوٹتے ہوئے گزار رہا تھا یا کسی گوری رنگت والی حسینہ کی سنہری زلفوں کی چھاؤں میں۔ وجہ بہر حال جو بھی رہی ہو... مسلسل کوشش کے باوجود وہ چودھری سے رابطے میں ناکام تھا۔

مختار مراد سے احکامات ملنے کے بعد اس نے ایک بار پھر چودھری سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر وہاں ہنوز وہی صورت حال تھی۔ اس طرف سے مایوس ہو کر اس نے حویلی فون کیا اور نشی اللہ رکھا سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ فوراً ہی نشی لائن پر آ گیا۔

”حکم ایس پی صاحب! آپ نے خادم کو کیسے یاد فرمایا؟“ اس کا وہی سدا کا خوشامد انداز اور لب و لہجہ تھا۔

”یاد تو اصل میں مجھے تمہارے سرکار کی آرہی ہے لیکن کئی بار کوشش کرنے کے بعد بھی ان سے رابطہ نہیں ہو پا رہا۔ سوچا تم سے معلوم کر لوں۔ تمہیں تو یقیناً ان کے بارے میں علم ہو گا۔“ تارڑ نے منشی کی خوشامد کو نظر انداز کرتے ہوئے سیدھے اپنے مطلب کی بات کی۔

”سرکار سے تو خود ہمارا رابطہ نہیں ہو پا رہا۔ انہوں نے اپنا فون بند کر رکھا ہے۔ ادھر چھوٹے چودھری مراد شاہ کے گھر کے نمبر پر گل کرنے کی کوشش کی تھی، پر ادھر سے بہوجی نے بتایا کہ چودھری صاحب کسی گل نوں ناراض ہو کے گھر سے چلے گئے ہیں۔ چھوٹے چودھری صاحب نے وہ ہوٹل تو تلاش کر لیا ہے جدھر چودھری صاحب رکے ہیں، پر آپ کو تو معلوم ہی ہو گا کہ ابھی ادھر رات ہو رہی ہے اور چودھری صاحب ہوٹل والوں سے کہہ کر سوئے ہیں کہ انہیں صبح سے پہلے کوئی نہ جگائے... تو آپ سمجھ لیں کہ جب ادھر صبح ہوگی، تب ہی آپ سرکار سے گل کر سکتے ہو۔“ منشی نے اسے چند جملوں میں پوری کھانا دی۔

”ٹھیک ہے... میں چودھری صاحب سے بعد میں بات کر لوں گا۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ بالا کہاں ہے؟“ یہ جان لینے کے بعد کہ ابھی کم از کم تین چار گھنٹوں تک اس کا چودھری سے رابطہ نہیں ہو سکے گا، ایس پی نے دوسرے رخ سے تفتیش کی کوشش کی۔

”ادھر حویلی میں ہی ہے سر جی! کل سے وچارے کو تاپ چڑھا ہوا ہے اس لیے منجی پکڑ کر لیٹا ہوا ہے۔ آپ دسو، آپ کو ہن نال کوئی کام شام ہے کیا؟ میں کسی ہو ر کام کے بندے کو تہاڑے نال بھیج دوں گا۔“ چرب زبان منشی کی باتیں سن کر اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اس کے فون کرنے کی وجہ اچھی طرح سمجھ رہا ہے لیکن کسی نہ کسی طرح اسے بہلانے کی کوشش کر رہا ہے۔

”تم میرے اور چودھری صاحب کے درمیان تعلقات کی نوعیت اچھی طرح جانتے ہو منشی... ہم ایک دوسرے کے راز داں ہیں۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ مجھے بہلانے کی کوشش نہ کرو اور سیدھی طرح سے وہ بتاؤ جو میں پوچھنا چاہ رہا ہوں۔“ ایس پی، منشی کا انداز سمجھ کر یک دم ہی براہ راست گفتگو پر آ گیا۔

”مینوں کیا خبر حضور کہ آپ کیا پوچھنا چاہ رہے ہیں۔ جو کچھ پوچھنا ہے کل کر پوچھیں۔ مینوں اگر کسی گل کی خبر ہوئی تو آپ کو ضرور دسوں گا۔“ منشی کی منافقت تو بھی ہی بے مثال، سو اسی فدویانہ لہجے میں اسے جواب دیا۔

”رات تمہارے علاقے میں اے سی شہر یار کو اغوا اور اس کے ڈرائیور کو قتل کیا گیا ہے۔ یہ بات تو تمہیں معلوم ہی ہو گی۔ اب میں تم سے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اے سی کہاں ہے؟ یہ تو ممکن نہیں کہ تمہارے علاقے میں اتنی بڑی واردات ہو اور تمہیں کچھ خبر ہی نہ ہو۔“ منشی کی اداکاری کی پروا نہ کرتے ہوئے ایس پی نے اس سے سوال کیا۔

”یہ آپ کیسی گل کر رہے ہیں ایس پی صاحب! بے شک اے سی صاحب کا اغوا ادھر سے ہی ہوا ہے لیکن گاؤں سے بہت دور جنگل کے علاقے میں... ہو ر آپ تو جانتے ہیں کہ آج کل ادھر ہمارے بندے کام نہیں کر رہے ہیں۔ ادھر حویلی میں بھی صبح ہی واقعے کی خبر پہنچی ہے۔ میں یہی خبر سنانے کے لیے تو سرکار کو فون کرنے کی کوشش کر رہا تھا، پر ان سے گل نہ ہو سکی... پر آپ کی گل سن کر تو ایسا لگ رہا ہے کہ آپ ہم پر ہی شک کر رہے ہیں۔ یہ تو وڈی غلط گل ہے۔ آدمی کو اپنے دوستوں پر تو بھروسہ کرنا چاہیے۔“ منشی فوراً معصوم بن کر اس کی تردید کرنے لگا۔

”بات شک کی نہیں ہے۔ پیر آباد اور اس کے قرب و جوار کے سارے علاقے میں تم لوگوں کا ہولڈ ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ براہ راست اگر اس واقعے میں تم ملوث نہیں بھی ہو تو بھی تمہیں کچھ نہ کچھ معلوم ضرور ہوگا۔ یہ تو میں یقین کر ہی نہیں سکتا کہ وہاں کچھ ہو اور تم لوگوں کو اس کی سن کن نہ ملی ہو۔“ ایس پی نے طنز اور سختی سے پھر پور لہجے میں منشی کو باور کروایا کہ وہ اس کے انجان ہونے پر قطعی یقین نہیں رکھتا۔

”اب ایسی بھی گل نہیں ہے ایس پی صاحب! اب وہ پہلے والی گل رہی ہی کدھر ہے؟ آپ کو تو خود یاد ہو گا کہ ابھی تھوڑے دن پہلے ادھر ڈیرے پر کوئی گھس آیا تھا اور ہمارے بندوں کو بے ہوش کر کے تہ خانے میں آگ لگا گیا تھا۔ آپ کے ہوتے ہوئے ہم اپنے ساتھ یہ کارروائی کرنے والے کا کچھ نہیں بگاڑ سکے تھے... تو فیراے سی صاحب کے معاملے کی ہمیں کیا خبر؟ آپ کے محکمے کے بندے صبح سے ادھر پہنچے ہوئے ہیں۔ آپ ان سے کہیں کہ وہ کھوج لگائیں اے سی صاحب کا۔ اسان نوں کچھ ملوم ہوا تو آپ کو بتا دیں گے۔“ منشی کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ قطعاً تعاون پر آمادہ نہیں ہے۔ اس کی طرف سے مایوس ہو کر ایس پی نے کال منقطع کر دی اور صورت حال پر غور کرنے لگا۔

شہر یار کا اغوا اس کے لیے اتنی تشویشناک بات نہیں تھی جتنے چودھری کے بدلے ہوئے تیور اس کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجا رہے تھے۔ اس نے چودھری کا باجہ سے

بدلا ہوا رویہ بھی دیکھا تھا اور اس کے بعد باجہ کی اچانک موت بھی۔ بظاہر باجہ دل کے دورے سے جاں بحق ہوا تھا لیکن ایس پی کو یقین نہیں آیا تھا کہ یہ سچ ہے... اور وہ سچ کے سامنے آنے کا منتظر تھا۔ سچ کو جاننے کے لیے ہی اس نے ایک بار پھر ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا اور ایک خاص نمبر ڈائل کیا۔

”اچھا ہوا آپ نے خود کال کر لی تارڑ صاحب! میں آپ سے رابطہ کرنے ہی والا تھا۔ رات جو ڈیڈ باڈی آپ نے جھجوائی تھی، آپ کے حکم پر میں نے اس کا ایمر جنسی میں پوسٹ مارٹم کر ڈالا ہے اور پوسٹ مارٹم کے نتیجے میں بہت ہی حیرت انگیز انکشاف ہوا ہے۔ مرنے والے کی موت آپ کے مطابق ہارٹ ایٹیک سے ہوئی تھی لیکن پوسٹ مارٹم سے معلوم ہوا ہے کہ اس شخص کو زہر دے کر ہلاک کیا گیا ہے۔ ایک ایسا زہر دے کر جس کے ظاہری اثرات دیکھ کر ڈاکٹر ز یہی اندازہ لگا پاتے ہیں کہ مریض کو ہارٹ ایٹیک ہوا ہے اور اسی حساب سے ٹریسٹ بھی دیتے ہیں۔ نتیجتاً مریض کی موت واقع ہو جاتی ہے۔“ دوسری طرف موجود سرجن جو انکشافات کر رہا تھا، انہیں سن کر تارڑ زلزلے کی زد میں آ گیا تھا اور اس کے ذہن میں بجتی خطرے کی گھنٹی کسی دیوہیکل گھنٹے کی سی قوت سے بجنے لگی تھی۔

☆☆☆

”اباجی! ناراضگی جانے دیں نا... دیکھیں میں خود آپ کو منانے کے لیے آیا ہوں۔“ مراد شاہ، چودھری کے مقابل بیٹھا اسے منانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے اپنی بیوی شاہدہ کی زبانی چودھری کی ناراضگی کا سبب بننے والے سارے قصے کا علم ہو گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس معاملے میں شاہدہ کا کوئی قصور نہیں۔ اس بے چاری نے تو چودھری سے وہی کچھ کہا تھا جو مہنی بر حقیقت تھا۔ نیویارک میں قیام کے دوران مراد میں واقعی ایسی کئی تہدیلیاں آگئی تھیں جو حویلی کے طرز زندگی سے میل نہ کھاتی تھیں۔ ان تبدیلیوں میں سے ہی ایک تہدیلی کھانے پینے کے معاملے میں نسبتاً سادگی اختیار کرنا بھی تھی جس کا اظہار شاہدہ نے... جو کہ ایک اچھی مشرقی بیوی کی طرح شوہر کی پسند ناپسند میں ڈھل گئی تھی، چودھری کے سامنے کر دیا تھا اور چودھری کی نازک مزاجی اسے برداشت نہیں کر سکی تھی۔ مراد کو آفس سے واپس آنے کے بعد سارے واقعے کا علم ہوا تو اس نے چودھری کو منانے کے لیے اس کی تلاش شروع کر دی۔ وہ اپنے باپ کے مزاج سے آشنا تھے اس لیے اتنا اندازہ تو کر سکتا تھا کہ وہ کسی بڑے ہوٹل کا ہی رخ کرے

گا۔ اس نے اپنی تلاش کا آغاز انہی ہوٹلوں سے کیا اور بالآخر ایک ہوٹل کے ریسیپشن سے اسے علم ہو گیا کہ چودھری افتخار عالم شاہ نامی شخص وہیں ایک سوئٹ میں قیام پذیر ہے۔ لیکن اس وقت اس کی چودھری سے ملاقات ممکن نہیں ہو سکی۔ وہ ہوٹل انتظامیہ کو پہلے ہی ہدایت کر چکا تھا کہ بے حد تھکن کے باعث وہ رات کے وقت کسی سے ملاقات نہیں کر سکے گا، چنانچہ کسی ملاقاتی کی آمد یا ٹیلی فون کال کی صورت میں اسے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ ناچار مراد کو مایوس لوٹنا پڑا اور دوسرے دن وہ صبح ہی صبح دوبارہ ہوٹل پہنچ گیا۔ اس بار اسے باپ کی طرف سے اذن یا ربابی مل گیا اور اب وہ اس کے سامنے بیٹھا اسے منانے کی کوشش کر رہا تھا۔ چودھری سے بہت سے نظریاتی اختلافات کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ تھی کہ چودھری اس کا باپ تھا اور وہ اس رشتے کو ہرگز بھی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

”تو نہ آتا منانے۔ میں نے کیا تجھے پیغام بھیجا تھا کہ آکر مجھے منا؟“ چودھری اتنی آسانی سے رام ہو جانے والا بندہ ہوتا تو ذرا سی بات پر ناراض ہی کیوں ہوتا؟ مراد کی خوشامد کا تھکے لہجے میں جواب دے کر وہ بے نیازی سے اپنی مونچھوں کو تآؤ دینے لگا۔

”کیسے نہ آتا اباجی! آپ میرے گھر سے ناراض ہو کر نکل گئے، یہ کوئی معمولی بات ہے کیا؟ میں کل سے اتنا بے چین ہوں۔ رات بھر نیند بھی ٹھیک طرح نہ آ سکی۔ شاہدہ بھی بڑی شرمندہ ہے۔ اس نے مجھ سے کہا ہے کہ ایک بار کسی طرح ماموں کو منا کر لے آئیں پھر میں انہیں دوبارہ شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔“ اپنی کیفیت بتانے کے ساتھ مراد شاہ نے لگے ہاتھوں بیوی کا پیغام بھی پہنچا دیا۔

”رنا تو وہ کیوں شرمندہ ہے؟ اس نے تو مجھے وہی کچھ بتایا تھا جو تو نے اسے سکھایا ہے۔ انقلابی بن گیا ہے نا تو۔ وڈی وڈی گلاں کرنے لگا ہے۔ اب ہمیں تجھ سے سیکھنا پڑے گا کہ کیسے رہیں؟ کیا کھائیں؟ کیا پہنیں؟ ہماری پرکھوں سے چلی آئی ریت رسموں کو تیرے جیسا کل کا منڈا غلط کہے گا اور ہم مان لیں گے؟“ چودھری کو موقع ملا تھا، وہ کیوں نہ جی بھر کر بیٹے کے لئے لیتا۔

”میں آپ سے یہ ساری بحث کرنے نہیں آیا ہوں اباجی! میں آپ کو اپنے ساتھ لے جانے آیا ہوں اور اس وعدے پر کہ جب تک آپ یہاں رہیں گے، گھر میں وہی کچھ ہوگا جو آپ چاہیں گے اور جیسی آپ کی مرضی ہوگی۔“ وہ جانتا تھا کہ نظریاتی اعتبار سے اس کے اور اس کے باپ کے

درمیان مفاہمت ممکن نہیں اس لیے ایک بیٹے کی حیثیت سے ہتھیار ڈال دینا ہی مناسب سمجھا۔

”اچھا، میں سوچتا ہوں۔ ابھی تو چل، چل کر ذرا ناشتا کرتے ہیں۔“ چودھری نے اگرچہ اپنا لہجہ سخت ہی رکھا تھا لیکن پھر بھی مراد کو اندازہ ہو گیا کہ وہ کچھ نرم پڑ گیا ہے۔ دونوں ساتھ ساتھ چلتے کمرے سے باہر نکلے اور لفٹ کے ذریعے نیچے ڈائننگ ہال میں پہنچ گئے۔ ان کے وہاں پہنچ کر میز منتخب کرتے ہی ایک ویٹرس خدمت میں حاضر ہو گئی۔ وہ ہوٹل جتنا خوب صورت اور لشکارے مارتا ہوا تھا، وہاں خدمت پر مامور عملہ بھی ویسا ہی تھا۔ ان سے ناشتے کا آرڈر لینے آنے والی ویٹرس بھی ہوٹل کے ماحول سے مکمل طور پر ہم آہنگ تھی۔ وہ نہ صرف خوب صورت تھی بلکہ اس خوب صورتی کے ساتھ ساتھ اپنی ملازمت کے تقاضوں سے بھی اچھی طرح واقف تھی۔ یقینی طور پر اتنے بڑے ہوٹل کی ملازمت کے لیے اسے خصوصی تربیت دی گئی ہوگی۔ پھر اس کا لباس بھی ایسا تھا کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں۔ چودھری نے بھی اس کے حسن بے باک سے خوب آنکھیں سینکتے ہوئے اپنا آرڈر نوٹ کر دیا پھر مراد کی طرف متوجہ ہوا۔

”تم بھی اپنی پسند کے ناشتے کا آرڈر نوٹ کروادو۔“

”میں صرف ایک کپ کافی اور سینڈوچ لوں گا۔“

باپ کے لمبے چوڑے آرڈر کے مقابلے میں اس نے اپنی پسند بتائی۔

”یہ تو حال ہے تیرے کھانے پینے کا... تب ہی تو صحت نہیں رہی ہے۔ ادھر ویسے بھی کھانے کو کیا ملتا ہے، سوکھا سوکھا تو ہوتا ہے سب۔ کھانے پینے کا مزہ تو ادھر اپنے ملک میں آتا ہے۔ ناشتے میں سری، پائے، نہاری، آلیٹ شاملیت، پرائٹوں کے ساتھ کھاتے ہیں تو سواد آ جاتا ہے۔ ادھر یہ جو سینڈوچ اور جوس شوس ہوتے ہیں، وہ تو ہم اپنے ہاں کھانے کے بعد چکھنے ٹکھنے کے لیے رکھتے ہیں۔ تو بھی شاہدہ سے کہہ کر گھر پر ذرا انگڑا ناشتا بنوایا کرتا کہ کچھ باڈی شاڈی بنے۔“ چودھری نے بیٹے کی پسند پر تنقید کرتے ہوئے اسے نصیحت کی۔ مراد جو اچھا خاصا سرخ و سفید اور اسارٹ نوجوان تھا، باپ کی نصیحت سن کر محض مسکرا کر رہ گیا۔ اب وہ اسے یہ کہہ کر کہ ٹھیک کرنا بے ڈول جسم صحت مندی کی علامت نہیں ہوتا بلکہ ایسا شخص کئی عوارض کا شکار ہو جاتا ہے، ناراض کرنے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ باپ کو منانے آیا تھا اس لیے حتی الامکان بحث سے گریز کا رویہ اپنائے ہوئے تھا۔

”اگر آپ کو سری پائے اور نہاری یاد آرہے ہیں تو

کوئی مسئلہ نہیں ہے اباجی! آپ میرے ساتھ گھر چلیں، میں دوپہر کے کھانے پر ان چیزوں کا انتظام کروادوں گا۔“

”باپ کو بچوں کی طرح لالچ دے کر پٹانے کی کوشش کر رہا ہے؟“ مراد کی بات سن کر چودھری نے کہا اور کھل کر ہنس پڑا۔ سب سے بڑی اولاد، وہ بھی زینہ ہونے کی وجہ سے مراد شروع ہی سے اسے بہت عزیز رہا تھا اور وہ اسے دوسروں کے مقابلے میں ہمیشہ ہی زیادہ رعایت دیتا تھا۔ اس بار بھی وہ زیادہ دیر اپنی ناراضگی برقرار نہیں رکھ سکا اور ہنس دیا تو مراد کو اطمینان ہو گیا۔ اس ہنسی نے طے کر دیا تھا کہ وہ اپنے خیریلے باپ کو منانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

”آپ نے اپنا موبائل بھی آف کر رکھا ہے۔ میں اور شاہدہ کل سے سنتی بار آپ کا نمبر ملا کر دیکھ چکے ہیں لیکن رابطہ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ گاؤں سے فشی اللہ رکھا کا بھی فون آیا تھا میرے پاس۔ وہ بھی پریشان ہو رہا تھا کہ چودھری صاحب کا فون کیوں بند ہے؟ میرے خیال میں اس کو آپ سے کوئی ضروری کام ہوگا۔“ مطلع صاف ہوا تو مراد نے اس سے دوسری گفتگو چھیڑ دی۔

”موبائل میں نے جان کر آف کیا تھا۔ مجھے ملوم تھا کہ تو سب سے پہلے مجھے فون کرنے کی ہی کوشش کرے گا، پر میں اتنی آسانی سے تیرے ہتھ تھوڑی آنے والا تھا۔“ چودھری نے فخر سے اپنا کارنامہ بتایا۔

”ڈھونڈ تو میں نے آپ کو پھر بھی لیا۔ کل رات ہی میں یہاں پہنچ گیا تھا لیکن آپ آرڈر دے کر سوئے تھے کہ کسی کو آپ کے کمرے تک نہ آنے دیا جائے، نہ ہی فون پر بات کروائی جائے۔ ایسا نہ ہوتا تو میں رات ہی آپ کو واپس لے جاتا۔“ مراد نے جواباً اپنا کارنامہ بیان کیا۔

”مینوں ملوم تھا کہ تو مجھے ڈھونڈ نکالے گا۔ آخر میرا پتر ہے۔ تیری ذہانت میں مجھے کوئی شبہ تھوڑی ہے اسی لیے پہلے ہی سے سارا بندوبست کر کے سویا تھا۔“ چودھری شرارت سے مسکرایا۔ وقت کے اس لمحے میں وہ ایک بالکل مختلف آدمی لگ رہا تھا جس کی ساری سخت گیری اور سفاکی کہیں گم ہو گئی تھی اور وہ صرف اور صرف ایک جوان بیٹے کا محبت کرنے والا باپ محسوس ہو رہا تھا۔

اس کی اس کیفیت کو دیکھ کر قدرت کے اس اصول پر یقین آتا تھا کہ اللہ نے ہر انسان کے اندر خیر و شر دونوں جذباتوں کو رکھا ہے۔ محبت و نفرت، سختی و نرمی، سفاکی و رحم دلی ہر دو متضاد پہلو انسان کے اندر ہوتے ہیں، بس یہ انسان پر ہوتا ہے کہ وہ کس جذبے کو ابھار کر سامنے لائے اور کس کو دبا

ایک روز عورت جب الفاظ ہزارا اسٹیٹ آپ کہنا کر سے ا گے ہور نام بڑھ نے ج دو تیر سے ا کیور کا اچ

دے۔ چودھری نے بھی اپنے اندر موجود ہر مثبت جذبے کو دبا کر منفی خوبیوں کو اتنی شدت سے پروان چڑھایا تھا کہ اب مشکل سے ہی کبھی کسی مثبت جذبے کی جھلک نظر آتی تھی۔

”اب تو آپ کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا ہے نا... اب آپ میرے ساتھ ٹھہریں۔“ باپ کا اچھا موڈ دیکھ کر مراد شاہ نے بھی ذرا لاڈ کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے مطلب کی بات کی۔
”تو اتنی ضد کر رہا ہے تو چلتا ہوں۔“ آخر کار چودھری نے بھی ہامی بھری لی۔

ناشتے سے فارغ ہو کر وہ ڈائننگ ہال سے باہر نکلے۔ ان کے درمیان یہ طے پایا تھا کہ مراد اوپر کمرے میں جا کر چودھری کا سامان لے آئے گا اور چودھری اس دوران لاؤنج میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرے گا۔ پروگرام کے مطابق مراد نے جیسے ہی اوپر کمرے میں جانے کے لیے لفٹ میں قدم رکھا، چودھری کی نظر حشر سامان لٹا پر پڑی۔ وہ کل ہی کی طرح مٹی اسکرٹ پہنے ہوئے تھی۔ اسکرٹ کی بے حد مختصر لمبائی اور اونچی ایڑی کی سینڈل نے اس کی سڈول ٹانگوں کو اور بھی نمایاں کر دیا تھا۔ کل کی طرح آج بھی چودھری اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔

”اچھا ہوا کہ آپ مجھے یہیں مل گئے چودھری صاحب! میں آپ ہی سے ملنے آئی تھی لیکن آپ کا روم نمبر میرے ذہن سے نکل گیا تھا۔“ چودھری کو دیکھ کر بے حد خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اس نے اپنی سریلی آواز میں کہا۔

”یہ تو میری خوش قسمتی ہے یہی کہ تم مجھ سے ملنے یہاں تک آئی ہو، ورنہ میں تو سوچ رہا تھا کہ تم سے دوبارہ ملاقات کے لیے ڈیوڈ سے رابطہ کرنا پڑے گا۔“ چودھری نے بھی جوابی خوشی کا اظہار کیا۔

”میں صرف آپ سے ملنے نہیں آئی ہوں۔ آج کا سارا دن میں آپ کے ساتھ گزاروں گی اور آپ کو نیویارک دکھاؤں گی۔ آئی ہو پ کہ آپ میری کمپنی کو ضرور انجوائے کریں گے۔“

”وہ تو لازم ہے۔ کون ایسا شکر اہوگا جو تم جیسی حسینہ کی کمپنی انجوائے نہ کرے۔“ چودھری کی باچھیں لٹا کا پروگرام سن کر کانوں تک چر گئیں۔ لٹا کو سامنے پا کر وہ یہ تک فراموش کر چکا تھا کہ مراد بھی اسی ہوٹل میں موجود ہے اور وہ اس کے ساتھ اس کے اپارٹمنٹ جانے کا وعدہ کر چکا ہے۔

”تو پھر چلیں... ابھی نکل پڑتے ہیں۔ ہم سب سے پہلے لبرٹی آئی لینڈ چلیں گے اور وہاں اسٹیجو آف لبرٹی کے سامنے ڈھیر سارے فوٹو گرافس بنوائیں گے۔ میں ساری

تیاری کے ساتھ آئی ہوں۔ آپ کا اس بار کا نیویارک کا ٹرپ یادگار نہ بنا دیا تو میرا نام بھی لٹا نہیں۔“ پُر جوش لہجے میں کہتے ہوئے اس نے چودھری کا بازو تھام لیا۔

”اس کا تو مجھے بھی یقین ہے کہ تمہارے ساتھ نیویارک گھومنے کا مزہ ہی الگ ہوگا، بس یہ ڈر ہے کہ اسٹیجو آف لبرٹی تمہارے سامنے پھیکا نہ پڑ جائے۔“ چودھری نے وارنٹی کا مظاہرہ کیا۔

”اوہ... چودھری صاحب! آپ تو مجھے بنانے لگے۔“ لٹا اس کی بات سن کر کھلکھلا کر ہنسی اور خالص امریکن اسٹائل میں اس کے گلے کا ہار بن گئی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب مراد شاہ ایک سروس بوائے سے چودھری کا سامان اٹھوائے وہاں پہنچا۔ دونوں باپ بیٹے کی نظریں ایک دوسرے سے ملیں تو مراد نے فوراً ہی رخ موڑ لیا۔

”ایکسیکوزی لٹا! میں ابھی آتا ہوں۔“ چودھری لٹا کو خود سے دور کر کے فوراً مراد کی طرف بڑھا۔

”تو میرا سامان اپنے ساتھ لے کر اپنے اپارٹمنٹ چلا جا پتر! میں فارغ ہو کر آپ وہاں پہنچ جاؤں گا۔“ وہ شرمندہ تو خیر نہیں تھا لیکن بیٹے کے چہرے پر موجود ناپسندیدگی کے تاثرات دیکھ کر ذرا دھیمی آواز میں اس سے بولا۔

”ٹھیک ہے ابا جی! میں چلتا ہوں۔“ مراد نے آہستگی سے جواب دے کر اپنے قدم آگے بڑھا دیے۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ اس کے باپ کو کتنی حسین مصروفیت میسر آئی ہے اس لیے اس کے جلد فارغ ہونے کے امکان کو قطعی ناممکن تصور کرتا ہوا وہاں سے فوری طور پر رخصت ہو گیا۔

”بیٹا تمہارا... مجھے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آیا تھا۔“ مراد کے رخصت ہونے کے بعد چودھری پلٹ کر لٹا کی طرف آیا تو اسے بتانے لگا۔

”بڑا ہینڈسم مین ہے۔ لگتا ہے آپ پر گیا ہے۔“ لٹا نے فوراً ریمارکس پاس کیے تو چودھری فخر سے مسکرانے لگا۔ ہنستے مسکراتے وہ دونوں ایک دوسرے کی ہانہوں میں ہانہیں ڈالے ہوٹل سے باہر نکلے۔ پارکنگ میں لٹا کی گاڑی موجود تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر اس نے گاڑی اشارت کی اور پھر چند لمحوں بعد وہ نیویارک کے بے پناہ ٹریفک کے بہاؤ میں شامل ہو گئے۔

”اطلاع ملی ہے کہ اسٹنٹ کمشنر شہر یار عادل کو... کڈنیپ کر لیا گیا ہے۔ کل رات وہ فاریسٹ آفیسر عابد انصاری سے ملاقات کر کے واپس آ رہا تھا، اس وقت یہ واقعہ پیش آیا۔ کڈنیپنگ کو کئی گھنٹے گزرنے کے باوجود پولیس ابھی تک کچھ

نہیں کر سکی ہے۔ خیال ہے کہ اسے کڈنیپ کر کے گھنے جنگل میں کہیں کسی خفیہ ٹھکانے پر رکھا گیا ہے۔ آئی جی مختار مراد اس صورت حال پر سخت چراغ پا ہے اور کوشش کر رہا ہے کہ کسی طرح جنگل میں سرچ آپریشن شروع کر دیا جائے۔ وہ تھوڑا سا ہی آگے بڑھے تھے کہ لٹڈا نے مہارت سے ڈرائیو کرتے ہوئے اسے اطلاع دی۔

”اوہ شٹ! مجھے تو خیال ہی نہیں رہا۔ میرے بندے مجھے اس بات کی اطلاع دینے کے لیے فون کر رہے ہوں گے لیکن میں نے اپنا موبائل بند کیا ہوا ہے اس لیے ابھی تک مجھ تک یہ خبر نہیں پہنچی۔“ لٹڈا کی فراہم کردہ معلومات پر چودھری نے بڑبڑاتے ہوئے اپنا موبائل جیب سے نکالا اور اسے آن کیا۔ اپنی اس مصروفیت میں اسے اندازہ نہیں ہو سکا کہ لٹڈا اس کے چہرے کے تاثرات کا بہ غور جائزہ لے رہی ہے۔

”یہ کام آپ کے حکم پر ہوا ہے نا چودھری صاحب؟“ اس نے سوال کیا تو چودھری چونکا۔ ”ہم جانتے ہیں کہ یہ کارروائی آپ ہی کے بندوں نے کی ہے۔ آپ شہریار سے بڑی طرح خار کھائے ہوئے ہیں اور پہلے بھی ایک بار اسے ڈاکٹر ماریا کے ذریعے ٹریپ کرنے کی کوشش کر چکے ہیں۔ اس وقت وہ آپ کی چال سے بچ گیا تھا، چنانچہ اب آپ اسے اغوا کر کے اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں... لیکن میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ آپ کا یہ عمل ہمارے مفاد میں نہیں ہے۔ اس حرکت سے ہمارے پروجیکٹ کو سخت نقصان پہنچ سکتا ہے۔“ چودھری ابھی تذبذب میں ہی تھا کہ لٹڈا کے سوال کا جواب ہاں میں دے پانہ میں کہ اس نے خود ہی بولنا شروع کر دیا۔ اس کے لہجے کا یقین اتنا گہرا تھا کہ چودھری چاہنے کے باوجود کسی بات سے انکار نہیں کر سکا۔

”جنگل میں سرچ آپریشن شروع ہونے کا مطلب سمجھتے ہیں آپ؟ ایک بار اگر قانون نافذ کرنے والے اداروں کے قدم ان راستوں پر اٹھ گئے تو پھر انہیں ہمیشہ کے لیے راہ مل جائے گی اور ہمارا وہاں پوست کاشت کرنے کا منصوبہ دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔ ہم اس پروجیکٹ پر اچھا خاصا کام کر چکے ہیں اور رقم بھی ٹھیک ٹھاک لگ گئی ہے۔ اس سے پیچھے ہٹنے کا مطلب ہوگا، ویسٹ آف ٹائم اینڈ منی اور یہ قابل برداشت نہیں۔ ویسے بھی آپ کو اب اس اے سی کو اغوا کروانے کی کیا ضرورت رہ گئی تھی۔ وہ لڑکی ماہ بانو، ہم نے آپ کو فراہم کرنے کا وعدہ کر لیا ہے اور لکڑی دکھالوں کے بزنس کا بھی بہتر متبادل آپ کے سامنے ہے۔ اس صورت حال میں اے سی شہریار کو چھیڑنا سوائے حماقت کے کچھ نہیں کہا

جاسکتا۔“ سر۔ جی آواز میں بات کرنے والی لٹڈا کے لہجے میں اس وقت خاصی تلخی تھی اور چہرے کے تاثرات میں بھی سختی کا عنصر نمایاں تھا۔

”آئی ایم سوسوری ہنی! یہ سب ایک ذرا سی غفلت کی وجہ سے ہو گیا ورنہ میں نے خود بھی یہ بات سمجھ لی تھی کہ اب شہریار کے اغوا کی کوئی ضرورت نہیں رہی ہے۔ تم فکر نہ کرو، میں ابھی اپنے بندوں کو فون کر کے شہریار کی رہائی کا حکم دے دیتا ہوں۔ ابھی اتنا زیادہ وقت نہیں گزرا ہے۔ پاکستان میں اس وقت لگ بھگ شام کے چھ ساڑھے چھ بجے ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ ڈیڑھ دو گھنٹوں میں شہریار کو واپس بھیج دیا جائے تو کہیں کچھ نہیں ہوگا۔ سرچ آپریشن کی طرف سے بھی زیادہ ٹینشن لینے کی ضرورت نہیں ہے تمہیں۔ ہمارے ہاں ایسے کام اتنی آسانی سے شروع نہیں ہوتے۔ شہریار واپس پہنچ گیا تو یہ معاملہ بالکل دب جائے گا۔“ یہ یقیناً لٹڈا کا رعب حسن تھا جو چودھری جیسا بندہ زندگی میں پہلی بار کسی سے معافی طلب کر رہا تھا۔ لٹڈا نے اس کی ساری وضاحت بے تاثر چہرے کے ساتھ سنی اور خاموشی سے اسے موبائل پر کوئی نمبر ڈائل کرتے ہوئے دیکھتی رہی۔

”ہاں نشی... گل سن، بالا کدھر ہے؟ اس سے بول کہ شہریار کو فوراً آزاد کر دے۔“ رابطہ قائم ہوتے ہی وہ انگریزی ترک کر کے اپنے مخصوص لب و لہجے میں بات کرنے لگا۔ ”میں کہہ دوں گا سرکار، پر آپ بتائیں کہ آپ کدھر ہیں؟ کل سے میں آپ سے گل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ادھر ایس بی نے بھی آپ کا پیچھے پیچھے کے میری جان کھا کی ہوئی ہے۔ وہ مجھے گھیرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح مجھ سے اگلا لے، اے سی کا اغوا ہمارے ہی بندوں نے کیا ہے لیکن میں نے بھی پٹھے پر ہتھ نہیں رکھنے دیا اسے۔“ چودھری کو اطلاع فراہم کرتے ہوئے نشی نے اپنا کارنامہ بھی فخر سے بیان کیا۔

”ایس بی کو رہن دے اس سے تو بعد میں، میں آپ نمٹ لوں گا... تو بس کسی طرح اپنی زبان نہ کھولنا۔ اور ہاں، بالے کو بولنا کہ آزاد کرنے سے پہلے اے سی کی چنگی طرح پھینٹی شیٹی ضرور لگا دے۔ وہ ہمارا مہمان رہے اور بغیر خاطر مدارت کے واپس چلا جائے یہ تو کوئی چنگی گل نہیں ہے نا۔“ جی چودھری صاحب! وڈی چنگی طرح اس کی خاطر مدارت ہو جائے گی۔ کوئی اور خدمت ہو تو وہ بھی آپ مینوں دس دیں۔“ نشی نے اپنے ازلی خوشامدانہ لہجے میں دریافت کیا۔

”ابھی اتنا ہی کافی ہے۔ میرا موبائل اب کھلا رہے گا۔ اگر کوئی مسئلہ ہو تو مینوں فون کر دیتا۔“ چودھری نے نشی کو حکم دے کر رابطہ منقطع کر دیا اور مسکراتا ہوا لٹڈا کی طرف متوجہ ہوا۔ ”لو ہنی! تمہاری پرابلم سولو ہو گئی۔ ابھی ایک ڈیڑھ گھنٹے میں خبر مل جائے گی کہ شہریار واپس اپنے بنگلے پر پہنچ گیا ہے۔“ ”یہی ہم سب کے حق میں بہتر رہے گا۔“ لٹڈا نے ہنوز سنجیدہ رہتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا۔ چودھری کی ٹیلی فونک گفتگو کے دوران وہ نہایت خاموشی سے ڈرائیونگ کرتی رہی تھی۔

”اوہ کم آن ہنی! اب تو اپنا موڈ ٹھیک کر لو۔ اگر تم اسی طرح موڈ آف رکھو گی تو ہم کیا خاک انجوائے کر سکیں گے؟“ چودھری نے اس کے شانوں پر اپنا بازو پھیلاتے ہوئے اسے منانے کی سعی کی۔ حیرت انگیز طور پر لٹڈا نے اپنا موڈ فوراً ہی بحال کر لیا اور کھل کر مسکرا دی۔ اس کی مسکراہٹ چودھری کے لیے اس نظارے سے بڑھ کر خوب صورت تھی جو لبرٹی آئی لینڈ کی طرف فیری میں سفر کرتے ہوئے سمندر کے پانی میں نیویارک شہر کی روشنیاں پڑنے سے ابھرتا ہوا نظر آتا ہے۔ چودھری قدرت کی صنایع میں سے صرف ایک شے کو سراہنے کا قائل تھا اور وہ شے تھی عورت... جسے سراہنے کے لیے وہ اسے برتنا ضروری سمجھتا تھا اور لٹڈا تو تھی ہی ایسی زوردار عورت جسے ایک بار برتنے کے بعد چودھری کے اندر اس کے قرب کی طلب مزید بھڑک گئی تھی۔

☆☆☆

شہریار کو اس قید میں کئی گھنٹے گزر گئے تھے۔ بیرونی دنیا سے رابطہ تقریباً منقطع ہونے کے باوجود وہ سماعتی مشاہدے کی بنیاد پر دن کے مختلف پہروں کے بارے میں اندازہ قائم کر رہا تھا۔ جس وقت وہ بے ہوشی سے جاگا تھا، اس وقت پرندوں کی چہچہاہٹ نے اسے وقت صبح کے بارے میں مطلع کیا تھا۔ دن آہستہ آہستہ گزر کر شام کے سلاہوں کی آغوش میں آیا تو بھی اس کی قوت سماعت نے اسے مطلع کر دیا۔ کمرے کی دیواروں اور دروازے کے درمیان کوئی درز نہ ہونے کے باعث بصری رابطہ تو تھا ہی منقطع... بات چیت پر بھی باہر موجود فرد یا افراد میں سے کوئی آمادہ نہیں تھا۔ یہاں تک کہ اتنا طویل وقت گزر جانے کے باوجود کسی نے اس سے کھانے کے بارے میں بھی نہیں پوچھا تھا۔ حوائج ضروریہ کا بھی یہی عالم تھا۔ اس سلسلے میں اسے خود پر کڑا ضبط کرنا پڑ رہا تھا۔ ورنہ دوسری صورت یہی تھی کہ وہ اس مختصر کمرے کے ہی کسی کونے کو اس مقصد کے لیے استعمال کرتا۔ اس کی نفاست پسند

طبیعت کو یہ بات گوارا نہیں تھی اس لیے اب تک ضبط سے ہی کام لے رہا تھا۔ یہاں تک کہ پیاس محسوس ہونے پر بھی اس نے کونے میں رکھی صراحی سے دوبار چند قطرے ہی حلق کو تر کرنے کے لیے اپنے منہ میں پٹکائے تھے لیکن گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اسے کسی بھی لمحے اس فطری ضرورت کے آگے ہار مانی پڑے گی۔ ہار ماننے سے قبل اس نے مناسب سمجھا کہ ایک کوشش اور کر دیکھے۔ شاید باہر موجود افراد اس کی درخواست پر کان دھریں۔ اسی خیال کے تحت وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔

”کوئی ہے؟ پلیز! دروازہ کھولو۔ میں حاجت محسوس کر رہا ہوں۔“ اس نے دروازے کے قریب پہنچ کر زوردار دستک دی اور بلند آواز میں بولا۔ یوں محسوس ہوا کہ وہاں اس کی بات سننے والا کوئی موجود ہی نہ ہو لیکن پھر پل بھر کے توقف کے بعد دروازے کے قریب آئیں ابھریں۔ ان آہٹوں کو سن کر اس کے دل میں امید کی لہر جاگی اور باہر موجود افراد پر مزید زور ڈالنے کے لیے اس نے ایک بار پھر دروازے کو بجایا۔ رد عمل میں دروازہ اتنی تیزی سے کھولا گیا کہ اس کو پیچھے ہٹنے کا موقع بھی نہیں ملا اور دروازے کا پیٹ پوری قوت سے اس کے چہرے سے ٹکرایا۔ وہ اچانک لگنے والے اس جھکے کو سہار نہیں سکا اور لڑکھڑا کر پیچھے کی طرف گرا۔ اس اثنا میں دو افراد اندر داخل ہوئے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں موٹے موٹے ڈنڈے تھے اور انہوں نے اپنے چہرے نقاب کے پیچھے چھپائے ہوئے تھے۔ اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے بے یک وقت اپنے ہاتھوں میں موجود ڈنڈوں سے شہریار پر حملہ کر دیا۔ وہ جو گرنے کے بعد سنبھل نہیں سکا تھا، اس اچانک حملے سے اپنا بچاؤ نہیں کر سکا اور دونوں ڈنڈے پوری قوت سے اس کے جسم پر پڑے۔ ڈنڈوں سے لگنے والی چوٹوں نے اسے بلبل کر رکھ دیا اور وہ تڑپ کر اپنے بچاؤ کے لیے سیدھا ہوا۔ اس دوران حملہ آور دوسرا وار کر چکے تھے۔ اس نے ان میں سے ایک کے ڈنڈے کو اپنے دائیں ہاتھ پر روکا اور دوسرے کو روکنے کے لیے بائیں ہاتھ پھیلا یا لیکن کامیاب نہ ہو سکا اور دوسرے حملہ آور کا ڈنڈا پوری قوت سے اس کے بائیں بازو پر آ کر لگا۔ اس چوٹ نے اسے مزید جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر دیا اور بنا کچھ سوچے سمجھے اس نے اپنی دونوں ٹانگیں اس شخص کو دے ماریں۔ اس کے حملے کے زور سے وہ شخص پیچھے کی طرف الٹا اور مختصر کمرے میں رکھی صراحی سے جا کر ٹکرایا۔ صراحی فرش سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ صراحی میں موجود پانی کمرے

کے نیم پختہ فرش پر پھیل گیا۔

اس سارے عمل کے دوران پہلے ڈنڈا بردار نے اپنے حواس قائم رکھے تھے، چنانچہ اس نے بلا توقف ہاتھ چلایا اور ڈنڈے کی زوردار ضرب شہریار کی ٹانگوں پر لگائی۔ ضرب کھا کر شہریار نے خود کو سنبھال کر اس شخص کو اس چوٹ کا جواب دینے کی کوشش کی لیکن کمرے کی محدود چار دیواری اس کے تیزی سے حرکت کرنے میں مائع تھی۔ وہ جب تک سنبھل کر سیدھا کھڑا ہوا، حملہ آور اس پر دوسرا وار کر چکا تھا۔ اس بار اس نے شہریار کی کمر کو نشانہ بنایا تھا۔ کمر پر یہ چوٹ کھانے کے بعد شہریار نے اپنے دائیں ہاتھ کو حرکت دی اور اس شخص کے منہ پر ایک زوردار ہونٹ مار سید کیا لیکن اس دوران اس کا صراحی پر گرنے والا ساٹھی سنبھل چکا تھا۔ اس نے اپنے ڈنڈے سے شہریار پر حملہ کر دیا اور اس کے سر پر ضرب لگائی۔ سر پر لگنے والی یہ ضرب ایسی تھی کہ وہ چکر اٹھا اور پھر اسے سنبھلنے کا موقع نہیں ملا۔ وہ دونوں پے در پے اسے ضربیں لگاتے چلے گئے۔ اس کا جسم جو فطری تقاضے پورے نہ ہو سکے کی وجہ سے پہلے ہی کچھ ٹھہرا سا ہو رہا تھا، زیادہ دیر مزاحمت نہیں کر سکا اور اگلے چھ سات منٹ میں ہی اس کے حواسوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو وہ ایک آرام دہ بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ تکلیف دیتے جسم کی ٹیسوں کے ذریعے اپنے ذہن میں پورے واقعے کو دہراتے ہوئے اس نے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ کمر مختصر لیکن صاف ستھرا تھا اور اپنے ساز و سامان سے کسی اسپتال کا حصہ محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے اس کمرے کے لیے اپنے ذہن میں آشنائی محسوس کی۔ قبل اس کے کہ وہ اپنی یادداشت پر زور دیتا، کمرے کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر کے مخصوص گیٹ اپ میں ایک شخص اندر داخل ہوا۔ شہریار نے اس شخص کو فوراً شناخت کر لیا۔ وہ پیر آباد کے مرکز صحت میں ڈیوٹی دینے والا میل ڈاکٹر داور تھا۔

”اب آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں سر؟“ شہریار کو ہوش میں دیکھ کر اس نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا جس کے جواب میں شہریار اپنے سر کو محض ایک اثباتی جنبش ہی دے سکا۔

”پولیس کے جوان بے ہوشی کی حالت میں آپ کو اٹھا کر یہاں لائے تھے۔ دو لڑکے جنگل سے اپنی بکریاں چرا کر واپس آرہے تھے تو انہوں نے آپ کو راستے میں بے ہوش پڑا ہوا دیکھا۔ اتفاق سے ان لڑکوں کی ایک بکری کھو گئی تھی جس کی تلاش میں انہیں واپس لوٹنے میں کچھ دیر ہو گئی۔ انہوں نے آپ کو بے ہوش پڑا ہوا پایا اور پہچان گئے کہ آپ اے سی

شہریار عادل ہیں۔ گاؤں میں آپ کی مستقل آمد و رفت کی وجہ سے یہاں کے کافی لوگ آپ کو پہچانتے ہیں۔ پھر آپ کے اغوا اور پولیس کی تلاش میں متحرک ہونے سے بھی لوگ واقف ہو گئے تھے اس لیے ان لڑکوں کو آپ کو شناخت کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی۔ انہوں نے فوراً ہی پولیس والوں کو اطلاع دی اور وہ لوگ آپ کو اپنی گاڑی میں یہاں لے آئے تاکہ ابتدائی طبی امداد دی جاسکے۔ آپ کا سر پھٹ گیا تھا اور جسم کے چند اور مقامات پر بھی ایسی چوٹیں لگی تھیں جن سے خون رس رہا تھا۔ آپ کا خون آلود چہرہ اور لباس دیکھ کر ہم لوگ تشویش میں مبتلا ہو گئے کہ کہیں سیریس معاملہ نہ ہو... لیکن اللہ کا شکر ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میں نے اور ڈاکٹر ماریا نے مل کر آپ کو ٹریمنٹ دیا تو فوری طور پر آپ کی حالت سنبھل گئی۔ اب بھی میں نے ڈرپ میں پین کلر شامل کر دیا ہے، امید ہے کہ آپ اپنی چوٹوں میں بہت زیادہ تکلیف محسوس نہیں کریں گے۔“ اس کے سوال کرنے سے قبل ڈاکٹر داور نے از خود اسے تفصیلات سے آگاہ کرنا شروع کر دیا۔

”آپ لوگوں نے میرے آفس فون کر کے میرے ملنے کی خبر دے دی ہے یا نہیں؟“ دیوار گیر گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے شہریار نے سنجیدگی سے اس سے دریافت کیا۔

”نہیں سر! وہاں اطلاع پہنچ چکی ہے۔ آپ کے پی اے عبدالمنان صاحب نے کہا ہے کہ وہ خود یہاں تشریف لارہے ہیں۔ ان کے علاوہ ایس پی معظم تارڑ نے بھی اپنے آنے کی اطلاع دی ہے۔ یہاں موجود پولیس فورس کو لیڈ کرنے والے آفیسر نے اصرار کیا تھا کہ آپ کو نو روکوٹ کے اسپتال میں شفٹ کر دیا جائے لیکن میں نے اور ڈاکٹر ماریا نے اسے یقین دہانی کروائی کہ آپ کی حالت بہتر ہے اور کوئی تشویش ناک بات نہیں۔“ ڈاکٹر داور شاید زیادہ گفتگو کرنے کا عادی شخص تھا جو ہر بات کو نہایت تفصیل سے بیان کر رہا تھا۔

”تھینک یو ڈاکٹر! اب آپ ایسا کریں کہ اس پولیس آفیسر کو میرے پاس بھیج دیں۔“ بیڈ کی پشت سے سر نکا کر اس نے قدرے نیم دراز ہوتے ہوئے ڈاکٹر کو ہدایت دی۔ اس ذرا سی حرکت کو کرنے میں ہی اس کے جسم کے جوڑ جوڑنے جس طرح احتجاج کیا تھا، اس سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ مارنے والوں نے خوب دل کھول کر پٹائی لگائی ہے لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ کوئی بھی چوٹ خطرناک ثابت نہ ہو۔ شاید وہ لوگ اسے محض وارننگ دینا چاہتے تھے کہ بچو، سدھر جاؤ ورنہ نتیجہ اس سے بھی زیادہ برا نکل سکتا ہے۔

”پولیس آفیسر کو بعد میں کال کیجیے گا، پہلے یہ سوپ پی لیں۔ میں اپنے ہاتھوں سے آپ کے لیے گرم گرم بنا کر لائی ہوں۔ پولیس آفیسر کو اندر بلا لیا تو اسے بیان ریکارڈ کرانے میں یہ سوپ ٹھنڈا ہو جائے گا۔“ ڈاکٹر داور کے اس کی ہدایت پر عمل کرنے سے پہلے ڈاکٹر ماریا ایک ٹرے میں بھاپ اڑاتا ہوا سوپ کا پیالہ رکھے اندر داخل ہوئی اور اس سے بولی۔ اسے سوپ کے ساتھ اندر داخل ہوتے دیکھ کر شہریار کو سمجھ آ گیا کہ وہ کیوں یہاں سے غائب تھی، ورنہ اس کی جھکی نیچر تھی اس سے تو یہی امید کی جاسکتی تھی کہ وہ شہریار کے ہوش میں آنے تک اس کے پاس ہی موجود رہتی۔

”تھینک یو ڈاکٹر! میں واقعی اس کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔“ شہریار نے خوش دلی سے اس کی بات کا جواب دے کر ایک طرح سے اس کی تائید کر دی۔ ویسے سوپ کی اشتہا انگیز خوشبو نے اس کے پیٹ کے چوہوں کو پوری طرح جگا دیا تھا اور اسے یاد آنے لگا تھا کہ اسے پیٹ میں کچھ ڈالے

ہوئے چوبیس گھنٹوں سے بھی زیادہ کا وقت گزر چکا ہے۔

”ویل سر! آپ سوپ پیئیں میں پندرہ منٹ بعد پولیس آفیسر کو آپ کے پاس بھیج دوں گا۔“ ڈاکٹر داور کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔ اس کے باہر نکلتے ہی ڈاکٹر ماریا نے اس کے سینے پر نیچیں پھیلایا اور خود بیڈ پر اس کے بائیں جانب بیٹھ گئی۔

”چلیں، اب اچھے بچوں کی طرح منہ کھولیں اور یہ سوپ پی لیں۔“ باؤل میں سے چمچ میں سوپ بھر کر اس نے شہریار کے منہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تو وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔ ایک ڈاکٹر کا یہ خالصتاً گھریلو عورت والا انداز اسے اچھا لگا تھا۔

”اتنی چوٹیں کھا کر بھی آپ مسکراتے ہیں... بڑے بہادر ہیں۔“ ڈاکٹر ماریا نے اسے سراہا۔

”آپ جیسا بیمار دار میسر آجائے تو بیمار کے چہرے پر تو خود بہ خود ہی رونق و مسکراہٹ آ جاتی ہے... لیکن آپ یہ نہ

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

انسان اور دیوتا - 280/-

برہمنی سامراج کے ظہور و برکت کی صدیوں پرانی داستان جس نے اچھوتوں کو راول و اعتبار کرنے پر مجبور کیا

پاکستان سے دیوارِ حرم تک - 160/-

تاریخی پس منظر میں لکھا جانے والا ایک دلچسپ سفرنامہ حجاز

آخری چٹان - 325/-

سید خواجہ جمال الدین خوارزمی کی داستانِ شجاعت جوتا تاریخوں کے میل رواں کے لیے ایک چٹان ثابت ہوا

سوسال بعد - 150/-

گاندھی جی کی جہانگیریت، اچھوتوں اور مسلمانوں کے خلاف سامراجی مقاصد کی منہ بولتی تصویر

سفید جزیرہ - 225/-

بحرالکابل کے کسی نامعلوم جزیرے کی داستان

شاہین - 325/-

اندلس میں مسلمانوں کے شہبازِ فرار کی کہانی

Buy online:
www.anarkalimall.com
www.jbdpress.com

042-37220879
041-2627568

معظم علی - 325/-

لارڈ کلانی کی اسلام دشمنی، میر جعفر کی شہدائی، بنگال کی آزادی و حریت کے ایک مجاہد معظم علی کی داستانِ شجاعت

خاک اور خون - 350/-

سکنتی، تاریخی انسانیت، قیامت خیز مناظر، تقسیم برصغیر کے پس منظر میں داستانِ خونچکاں

کلیسا اور آگ - 300/-

فریڈرک ہیڈلر کی عمارتی مسلمان سپہ سالاروں کی شہدائی، سقوطِ غرناطہ اور اندلس میں مسلمانوں کی شکست کی داستان

قافلہ حجاز - 350/-

راہِ حق کے مسافروں کی ایک بے مثال داستان

محمد بن قاسم - 300/-

عالم اسلام کے 17 سالہ ہیروی تاریخی داستان، جس کے حوصلے اور حکمت عملی نے ستاروں پر کندیں ڈال دیں

پورس کے ہاتھی - 180/-

1965ء کی جنگ کے پس منظر میں فیول اور برہمنوں کے سامراجی عزائم کی شکست کی داستان، جنہیں ہر محاذ پر منہ کی کھائی پڑی

051-35539609
021-2765086

اور تلوار ٹوٹ گئی - 350/-

شیر منصور (شیخو سلطان شہید) کی داستانِ شجاعت، جس نے محمد بن قاسم کی غیرت، محمود غزنوی کے جاوہرِ جلال اور احمد شاہ ابدالی کے عزم و استقلال کی یاد تازہ کر دی

مگشده قافلہ - 350/-

انگریز کی اسلام دشمنی، چینی کی عمارتی و کاری اور سکھوں کی مصوم بچوں اور مظلوم عورتوں کو خون میں نہلانے کی لہر زہ خیر خجی داستان

داستانِ مجاہد - 200/-

فتح دہلی کے بعد راجہ دھرم نے راجوں مہاراجوں کی مدد سے دوسو ہاتھیوں کے علاوہ 50 ہزار سوار اور پیادوں کی نئی فوج بنائی، فاتحِ سندھ کی معرکتہ الارا داستان

پروسی درخت - 325/-

اسلام دشمنی برہمنی مندوؤں اور سکھوں کے گٹھ جوڑ کی کہانی جنہوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کیلئے تمام اخلاقی حدود کو پامال کرنے سے بھی گریز نہ کیا

یوسف بن تاشفین - 325/-

اندلس کے مسلمانوں کی آزادی کیلئے اکام و مصائب کی تاریک راتوں میں امید کی قندیلیں بلند کرنے والے کتاہ سپاہی کی داستان

380/-

اسلام سے قبل عرب و عجم کے تاریخی، سیاسی، ادبی اور مذہبی حالات و زندگی اور فرزندِ زمانہ کے ابتدائی نقوش کی داستان

061-4781781
022-2780128

آخری معرکہ - 350/-

مہاتما کے بڑے بہت کو توڑنے کی باری آئی تو ہندو اور بھاری سلطان کے قدموں میں گر پڑے اور کہا ہم کے دونوں کے برابر سوہنے کیلئے تیار ہیں۔ سلطان کا سامنے سے تھما اٹھا اور اس نے جواب دیا "میں بت فروش ہوں" جس کی وجہ سے وہاں ایک بول گزیر خیر

آخری رات کے مسافر - 325/-

اسلام دشمنی کی آخری سلطنتِ غرناطہ کی تباہی و بربادی، مناظر و بزمیں، عورتوں اور جوانوں کی ذلت

325/-

325/-

150/-

325/-

380/-

380/-

380/-

380/-

380/-

جہانگیر بک ڈپو

سمجھے گا کہ بیمار کا حال اچھا ہے۔“ اس نے مرزا غالب کے شعر کو نثری پیرائے میں استعمال کرتے ہوئے ڈاکٹر ماریا کی بات کا جواب دیا اور اس کے بڑھائے ہوئے تجھے سے سوپ پی لیا۔ دائیں ہاتھ میں جسم کو گلو کو زفر اہم کرنے والی سوئی چبھے ہونے کی وجہ سے وہ خود سے سوپ پینے کے لائق تھا بھی نہیں۔

”ڈاکٹر سے بڑھ کر کون جان سکتا ہے کہ بیمار کا حال کیسا ہے؟ ہم آپ کے ہوش میں آنے کا ٹھیک ٹھاک حساب لگا سکتے ہیں تو یہ کیسے نہیں گے کہ ابھی آپ کا حال اتنا خراب ہے کہ اگلے کئی دن تک بیڈ ریٹ کریں گے، تب ہی کہیں جا کر بہتر ہوں گے۔ مارنے والوں نے آپ کو بڑی احتیاط سے مگردل کھول کر مارا ہے۔ ویسے باقی داوے آپ کو کچھ معلوم ہے کہ وہ کون لوگ تھے؟“ اسے سوپ پلانے کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے ڈاکٹر ماریا نے شوخ لہجے میں بات کرتے کرتے اچانک سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”معلوم تو نہیں بس اندازہ ہی لگا سکتا ہوں کہ اس واقعے کے پیچھے کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے... لیکن حیرت مجھے اس بات پر ہے کہ اس نے اتنا لمبا ڈراما رچانے کے بعد اتنی آسانی سے مجھے چھوڑ کیسے دیا؟ ورنہ میں نے تو اغوا ہونے کے بعد یہی سوچا تھا کہ اب وہ مجھ سے اپنے مطالبات منوانے کی کوشش کرے گا۔“ اس نے مبہم اور پرسوج انداز میں ڈاکٹر ماریا کی بات کا جواب دیا۔

”آپ کا اشارہ چودھری افتخار عالم کی طرف ہے نا؟“ ڈاکٹر ماریا نے اس سے پوچھا۔ جواباً وہ خاموش رہا لیکن یہ خاموشی خود اعلان کر رہی تھی کہ ڈاکٹر ماریا کا اندازہ درست ہے۔ اسے خاموش دیکھ کر ماریا نے سمجھ داری کا ثبوت دیتے ہوئے مزید کوئی سوال نہیں کیا اور چپ چاپ اسے باؤل میں موجود سوپ پلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تھینکس فار دس ڈیٹشیس سوپ ڈاکٹر!“ شہر یار نے اس سے کہا۔ عین اسی وقت دروازے پر دستک کی آواز ابھری۔ ”یس کم ان۔“ شہر یار نے دستک کا جواب دیا۔ فوراً ہی دروازہ کھلا اور عبد المنان کا چہرہ نظر آیا۔ اس کے ساتھ ایس پی معظم تارڑ بھی موجود تھا۔

”آریو اوکے سر؟“ عبد المنان نے اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی بے تابی سے پوچھا۔ اس کے چہرے کی جھکن اور آنکھوں کی سرخی سے ظاہر تھا کہ وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے بالکل بھی آرام نہیں کر سکا ہے۔

”یس، آئی ایم پریٹیکللی اوکے۔ یو ڈونٹ وری۔“ اس کی

کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے شہر یار نے مسکرا کر اسے سلی دی۔ ”آئی جی صاحب آپ کے لیے بہت زیادہ پریشان تھے۔ انہیں آپ کی واپسی کی اطلاع ملی تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ جب ہوش میں آجائیں تو ان کی آپ سے بات کروادی جائے۔ انہوں نے آپ کو علاج کے لیے لاہور شفٹ کرنے پر بھی زور دیا تھا۔“ عبد المنان نے اسے مختار مرادی بابت آگاہ کیا۔

”ان سے میں بات کر لوں گا۔ تم یہ بتاؤ کہ میری گاڑی کے ڈرائیور کے بارے میں کیا رپورٹ ہے؟“ کمرے میں ایس پی کی موجودگی کو نظر انداز کیے وہ مسلسل عبد المنان سے مصروف گفتگو تھا۔

”ڈرائیور بے چارہ تو ختم ہو گیا۔ آپ کی گاڑی فوری طور پر دریافت نہیں کی جاسکتی تھی، چنانچہ زخمی ڈرائیور کو کسی قسم کی طبی امداد نہیں مل سکی۔ وہ کسی مدد کے پہنچنے سے پہلے ہی جاں بحق ہو گیا تھا۔“ عبد المنان نے افسردگی سے بتایا تو وہ ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اغوا کاروں نے اسے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ ڈرائیور کے زندہ بچ جانے کا کوئی امکان نہیں پھر بھی وہ دل سے خواہاں تھا کہ کسی طرح اس غریب کی زندگی بچ جائے لیکن اس کی خواہش نے طے شدہ فیصلے کو نہیں ٹالا تھا۔

”آپ ہمیں وقوعے کی تفصیلات سے آگاہ کر دیں سر! اچانک یہ سب کیوں اور کیسے ہوا، کسی کی سمجھ نہیں آیا۔ آپ کی گاڑی اور ڈرائیور کی لاش کو دیرانے میں پا کر ہم صرف یہی اندازہ لگا سکے تھے کہ آپ کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ پولیس فورس کے جوان آپ کو تلاش کرتے رہے۔ آئی جی صاحب نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ اگر چوبیس گھنٹوں کے اندر آپ کو تلاش نہیں کیا جاسکا تو وہ جنگل میں سرچ آپریشن شروع کروادیں گے لیکن اس سے قبل ہی آپ ہمیں مل گئے۔ آپ کا اغوا ہمارے لیے جتنی حیرت کی بات تھی، اس طرح واپسی اس سے بھی زیادہ حیرت ناک ہے۔ ورنہ میرا تو آئیڈیا تھا کہ اغوا کار آپ کے بدلے میں کسی قسم کے مطالبات کر کے ہم سے سودے بازی کی کوشش کریں گے۔“ افسردگی بھرے ان لمحات میں اس کی اور عبد المنان کی گفتگو میں ذرا تھقل آیا تو ایس پی نے از خود اس سے گفتگو چھیڑ دی۔

”میں تھوڑی دیر بعد آپ کے آدمی کو اپنا بیان ریکارڈ کروادوں گا۔ فی الحال تو میرے سر میں شدید درد ہے اس لیے میں زیادہ بول نہیں سکتا۔“ اس نے قدرے روکھے لہجے میں ایس پی کی بات کا جواب دیا۔ ڈرائیور کی موت نے اس کے دل پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ وہ غریب صرف اس وجہ سے مارا

گیا تھا کہ اسے شہر یار عادل کی گاڑی ڈرائیور کر رہا تھا۔ اس کی ٹکسی سے دشمنی تھی، نہ ہی وہ کسی قسم کے لینے دینے میں تھا۔ وہ تو بس اپنی ڈیوٹی انجام دے رہا تھا لیکن اپنی غرض اور انا میں مبتلا افراد کو کیا مطلب تھا کہ ان کی سفاکی نے کسی غریب خاندان سے اس کا سہارا چھین لیا ہے۔ ایس پی کو چودھری کے گروپ کے بندے کی حیثیت سے وہ اس جرم میں برابر کا شریک سمجھتا تھا، چنانچہ اس نے اس وقت صحیح لہجے میں بات کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

”ایزیووش سر! ابھی آپ آرام کریں اور جب فیل کریں کہ بیان دینے کے قابل ہیں تو اطلاع کر دیجیے گا۔“ ایس پی بنا کسی جیل وجہت کے اس سے کہہ کر باہر نکل گیا۔

”مجھے اپنا موبائل دے دو عبد المنان۔“ ایس پی کے باہر جانے کے بعد اس نے عبد المنان سے فرمائش کی۔ خود اس کا اپنا موبائل اور دیگر اشیا تو نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھیں۔ اغوا ہونے کے بعد جب اسے ہوش آیا تھا تو اس نے اپنے جسم پر موجود لباس کے سوا ہر شے کو غیر موجود پایا تھا۔ اب مرکز صحت کے اس کمرے میں وہ اپنے جسم پر موجود لباس کو بھی تبدیل شدہ پارہا تھا۔ یقیناً اس کا پہلے والا لباس خراب ہو گیا تھا، تب ہی اسے بدل کر یہ ڈھیلا ڈھالا شلوار قمیص پہنا دیا گیا تھا۔

”یس سر!“ عبد المنان نے موبائل نکال کر اسے دیا اور بولا۔ ”آپ اطمینان سے بات کر لیں، میں اس دوران آپ کو یہاں سے شفٹ کرنے کے انتظامات دیکھتا ہوں۔“ شہر یار نے سر کی جنبش سے اسے اجازت دے دی۔ ویسے وہ جانتا تھا کہ انتظامات تو وہ پہلے ہی کر چکا ہوگا اس وقت صرف اسے پرائیویسی فراہم کرنے کے لیے بہانہ بنا کر نکلا ہے۔ عبد المنان کی یہ سمجھ داری اور معاملہ بھی اس کے دل میں اس کی قدر مزید بڑھا دیتی تھی۔ وہ جس سیٹ پر کام کر رہا تھا، واقعی اس کا مکمل طور پر اہل تھا۔

اس کے باہر جاتے ہی اس نے مختار مراد کا نمبر ملایا۔ کال ان کے پی اے نے ریسپونڈ کی اور یہ جاننے کے بعد کہ شہر یار عادل بات کرنا چاہتا ہے، فوراً فون مختار مراد کو تھما دیا۔ یقیناً وہ اس سلسلے میں پہلے ہی ہدایت کر چکے تھے اس لیے پی اے نے اس کا نام جاننے کے بعد مزید کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

”آئی ایم سو پپی شہر یار! یقین کرو تمہاری زندہ سلامت واپسی نے مجھے اتنی خوشی دی ہے کہ مجھے لگ رہا ہے، میرا اپنا سا بیٹا ایک بڑی مصیبت سے بچ کر واپس آ گیا ہو۔“ فون ہاتھ میں آتے ہی وہ جذباتی لہجے میں شہر یار سے بولے۔ ”تھینک یو سوچ انکل! مجھے آپ کی اپنے لیے تشویش

مسلمان حکمران

جب یہ سوال زیر غور تھا کہ خلیفہ المسلمین کا وظیفہ کیا ہونا چاہیے تو حضرت ابو بکر صدیقؓ نے دریافت فرمایا کہ مدینے میں ایک مزدور کی کم از کم روزانہ اجرت کیا ہے؟ وہی اجرت آپؓ نے اپنے لیے بطور وظیفہ مقرر کر لی۔ رفقاء میں سے کسی نے آپؓ سے کہا: ”اتنے کم روزینے میں آپؓ کا گزارہ کیسے ہوگا؟“ تو آپؓ نے فرمایا: ”اس میں میرا گزارہ اس طرح ہوگا جس طرح ایک مزدور کا گزارہ ہوتا ہے اگر گزارہ نہ ہوا تو میں اس مزدور کی اجرت بڑھا دوں گا۔“

ایک دن کھانے کے بعد، حضرت ابو بکر صدیقؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی بیوی سے کہا: ”کیا کوئی میٹھی چیز نہیں ہے؟“

انہوں نے فرمایا: ”بیت المال سے جو راشن آتا ہے اس میں میٹھی چیز کوئی نہیں ہوتی۔“ چند دنوں کے بعد آپؓ نے دیکھا کہ کھانے میں حلوہ بھی ہے۔ آپؓ نے بیوی سے کہا: ”تم نے تو کہا تھا کہ ہمارے راشن میں میٹھی چیز نہیں آتی، آج یہ حلوہ کیسے پک گیا؟“ انہوں نے جواب دیا: ”میں نے جو اس دن محسوس کیا کہ آپؓ کو میٹھی چیز کی خواہش ہے تو میں نے یوں کیا کہ راشن میں جتنا آتا روزانہ آتا تھا۔ اس میں سے کچھ بھر آٹا الگ رکھتی تھی۔ آج اتنا آٹا جمع ہو گیا کہ اس کے بدلے میں نے بازار سے گھور کا شیرہ منگوا دیا اور اس طرح یہ حلوہ پک گیا۔ آپؓ نے اسے تناول فرمایا اور بیوی کا شکریہ ادا کیا۔“

کھانے کے بعد آپؓ سیدھے بیت المال کے مہتمم کے پاس پہنچے اور فرمایا: ”ہمارے ہاں راشن میں جس قدر آٹا جاتا ہے آج سے اس میں سے ایک منھی بھر کم کر دینا کیونکہ ہفتہ بھر کے تجربے نے بتایا ہے کہ ہمارا گزارہ بھی بھر کم آئے میں بھی ہو جاتا ہے۔“

کے بارے میں معلوم ہو چکا ہے اور میں آپؓ کی اس محبت کے لیے دل سے آپؓ کا شکر گزار ہوں۔“ اس نے ممنونیت سے مختار مراد کی محبت کا جواب دیا۔

”شکریے کی ضرورت نہیں بیٹا... میں تو خود اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں کہ اس نے تمہیں جیتا جاگتا واپس پہنچا دیا، ورنہ میں تو پریشان تھا کہ رانا صاحب کو اس واقعے کی اطلاع کیسے دوں؟ انہوں نے جو پے در پے صدے اٹھائے ہیں،

ابھی تو ان سے پوری طرح نہیں سنبھل سکے۔ حد انخواستہ تمہیں کچھ ہو جاتا تو ان کے لیے تو بہت مشکل ہو جاتی۔ صرف ان کی اور بھابی صاحبہ کی وجہ سے ہی میں نے تمہارے اغوا کی خبر نشر نہیں ہونے دی۔ میڈیا والوں کا تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ ہر بات کو کتنا اچھالتے ہیں۔ انہیں خبر نشر کرنے کی اجازت مل جاتی تو سیکڑوں من گھڑت کہانیاں وہ خود بنا لیتے۔ الحمد للہ اب تم واپس آگئے ہو تو خود اس معاملے کو ہینڈل کرنا کیونکہ یہ تو مجھے معلوم ہے کہ ہماری طرف سے پابندی پر وہ لوگ وقتی طور پر تو خبر نشر کرنے سے رک گئے تھے لیکن اب چپ نہیں بیٹھیں گے۔“

”میں بھی انہیں کیا بتا سکوں گا؟ وہ لوگ مجھ سے اس اغوا کا سبب جاننا چاہیں گے لیکن سبب تو مجھے خود نہیں معلوم۔ دوسرا سوال ان کا یہ ہوگا کہ مجھے اس سلسلے میں کس پر شک ہے تو ظاہر ہے میں شک ہونے کے باوجود کسی کا نام نہیں لے سکوں گا۔ ان حالات میں میڈیا والوں سے گفتگو بے کار ہی ثابت ہوگی۔“ اس نے مختار مراد کی بات کا جواب دیا۔

”جتنا بھی اور جو بھی تمہیں مناسب لگے، میڈیا والوں کو بتا دینا۔ تم سے زبردستی تو بہر حال وہ لوگ نہیں کر سکتے... بلکہ ایسا کرو کہ تم مجھے سارا واقعہ تفصیل سے سنا دو۔ میں تمہیں گائیڈ کر دوں گا کہ کیا کہنا ہے اور کیا نہیں؟“

مختار مراد نے اس سے کہا تو وہ اسے تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔ مختار مراد خاموشی سے اس کی بات سن رہا۔ آخر کار وہ چپ ہوا تو وہ بولا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو کہ نہ تو تم کسی کو اغوا کا سبب بتانے کے قابل ہو اور نہ ہی اپنے کسی شک کا اظہار کر سکتے ہو۔ ان حالات میں یہی بہتر ہے کہ جو جو اور جس طرح پیش آیا ہے، وہ بتا دو۔ بس میڈیا والوں کے سامنے اپنے ذاتی خیالات کا اظہار کرنے سے مکمل گریز کرنا ورنہ وہ لوگ پُر کا کو بتانے میں ماہر ہوتے ہیں، خواہ مخواہ کہانیاں گھڑتے پھریں گے۔“

”ڈونٹ وری انکل! میں خیال رکھوں گا۔“ اس نے مختار مراد کی دی۔

”اوکے! تم اب آرام کرو۔ میں نے تمہارے پی اے کو ہدایت دے دی تھی کہ تمہیں پیر آباد سے سیدھا لاہور پہنچا دیا جائے۔ چوٹیں وغیرہ تو سنا ہے کہ تمہیں زیادہ مہلک نہیں آتی ہیں لیکن پھر بھی مناسب ہے کہ تم یہاں کسی اچھے اسپتال سے اپنا علاج کروالو۔ پھر یہاں آنے میں یہ بھی فائدہ رہے گا کہ تمہارے ماموں ممائی آسانی سے تمہاری مزاج پر سی کر سکیں گے۔ تمہارے وہیں رکے رہنے کی صورت میں انہیں

پریشانی ہوگی۔ نہ تو وہ لوگ اتنا لمبا سفر آسانی سے کر سکتے ہیں اور نہ ہی مریم کو تنہا چھوڑ کر گھر سے نکل سکتے ہیں۔ ابھی وہ عدت میں ہے نا۔“ آخری جملہ بولتے ہوئے اس کی آواز جس طرح کانپتی تھی، اس نے شہریار کے دل کو مٹھی میں بھینچ لیا۔ ”مریم عدت میں ہے نا۔“ یہ فقط ایک جملہ نہیں تھا۔ یہ وہ عظیم دکھ تھا جو ان سب نے سجاد رانا کی اچانک موت کی صورت میں بہ یک وقت اٹھایا تھا۔

”ٹھیک ہے انکل! میں لاہور آجاتا ہوں۔“ بچھے ہوئے لہجے میں اسے جواب دے کر اس نے فون بند کر دیا اور تکیے پر سر رکھ کر سیدھا لیٹ گیا۔ ہوش میں آنے کے بعد سے وہ سر میں درد کی جو ہلکی سی ٹیسیں اٹھتی محسوس کر رہا تھا، وہ اب بے حد شدت اختیار کر گئی تھیں اور اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے سر میں زوردار دھماکے ہو رہے ہوں۔

☆☆☆

وہ بالکل گم صم سی بیٹھی خلاؤں میں تک رہی تھی۔ اس کے سامنے دھرا کھانا بھی جوں کا توں رکھا تھا۔ نقاہت کے باوجود دل کسی طرح کھانے کی طرف راغب ہی نہیں ہوتا تھا۔ حالانکہ اس سے قبل وہ نہایت سمجھ داری کا ثبوت دیتے ہوئے صرف خود کو توتا نار کھنے کے لیے ہی اس قید خانے میں ملنے والا کھانا پابندی سے زہر مار کر لیا کرتی تھی مگر جب سے اس نے پروجیکٹر پر چلنے والا وہ کریہہ منظر دیکھا تھا، حلق سے نوالے اتارنا مشکل ہو گئے تھے۔ جب بھی کھانا سامنے آتا اور وہ نوالہ منہ میں رکھتی، خون میں لت پت لاش سامنے آ جاتی۔ جانے وہ کون تھا جسے بے دردی سے قتل کیا گیا تھا۔ وہ ان کی گفتگو سے بس اتنا اندازہ کر سکتی تھی کہ وہ عمران کا کوئی دشمن تھا جسے اس کی نسلی کے لیے اس انجام تک پہنچایا گیا تھا۔ شکل سے معصوم اور شریف نظر آنے والا عمران اندر سے اتنا سفاک نکلے گا، وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی... لیکن اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لینے اور کانوں سے سن لینے کے بعد کسی شک و شبہ کی گنجائش بھی نہیں رہی تھی۔ اب تو وہ یہی کہہ سکتی تھی کہ اس نے عمران کی اچھی صورت سے دھوکا کھا کر اس کے بارے میں اچھا گمان کرنے کی غلطی کی تھی۔ وہ بھلا اچھا کیونکر ہو سکتا تھا۔ آخر وہ بھی تو انہی لوگوں میں سے ایک تھا جن کی قید میں وہ رہ رہی تھی۔ وہ شکل سے وحشی دکھائی دیتے لوگ جو جانے اس برف زار میں کن مذموم مقاصد کے حصول کے لیے پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ جنہوں نے شہروں کی رونق اور گھریلو زندگی کی خوشیاں چھوڑ کر اس سخت ماحول میں ڈیرا ڈال رکھا تھا اور ہتھیاروں سے دل بہلاتے اپنی وحشتوں کو اور بھی ہمیز

کرتے رہتے تھے۔ وہ کون لوگ تھے؟ اس بارے میں وہ ابھی تک حتمی اندازہ نہیں لگا سکی تھی مگر اسے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں تھا کہ وہ سب کے سب ایب نارمل تھے۔ ان ایب نارمل لوگوں کے درمیان رہنا اب اس کے لیے مشکل ترین ہوتا جا رہا تھا۔ اس قید خانے میں ایک کریہہ منظر اور سفاکی دیکھنے کو ملی تو اس کے اعصاب جواب دے گئے۔ وہ جو پورے حوصلے سے حالات کے ان طوفانوں کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیے ہوئے تھی، یک دم ہی کچھ ڈھسے سی گئی۔ شاید یہ مایوسی کی ہی کیفیت تھی جو اس کے اندر سے حالات کا مقابلہ کرنے کی امنگ مٹنے لگی تھی۔

مایوس آدمی زندگی کی بقا کی طرف سے بے پروا ہو جاتا ہے اور پھر زندگی کو جاری و ساری رکھنے والے عناصر میں دوپٹی نہیں رہتی۔ وہ بھی اسی مایوسی کی وجہ سے کھانے کی طرف سے بے نیاز ہو گئی تھی۔ اس کو قیدی بنا کر رکھنے والے اب بھی تمام اوقات کا کھانا پابندی سے اس تک معمول کے مطابق پہنچا رہے تھے۔ کسی وقت وہ اس کھانے میں سے چند لقمے نکل لیتی اور بھی نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔ آج بھی اس نے یہی کیا تھا۔ کھانا سامنے رکھ دیے جانے کے باوجود وہ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئی تھی۔ جو شخص ایک مخصوص وقت کے بعد کھانے کے برتن واپس لے جانے آیا تھا، وہ برتنوں میں کھانے کو جوں کا توں رکھا دیکھ کر برتن اٹھائے بغیر خاموشی سے واپس پلٹ گیا تھا کہ شاید بعد میں بھوک محسوس کرنے پر کچھ کھا لے... لیکن وہ کافی دیر گزر جانے کے باوجود اس طرف متوجہ نہیں ہوئی اور نہ جانے کتنی دیر تک یونہی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی رہی۔

بیٹھے بیٹھے جب تھکن اور نقاہت کے باعث جسم جواب دینے لگا تو وہ اسی جگہ گھڑی سی بن کر لیٹ گئی۔ خالی پیٹ انسان کو نیند نہیں آیا کرتی اور پیٹ میں دوڑتے چوہے احتجاج کرنے لگتے ہیں لیکن وہ چونکہ کئی وقتوں سے ڈھنگ سے کھانا نہیں کھا رہی تھی، اس لیے کم خوراک سے طاری ہونے والی نقاہت اسے غنودگی میں لے گئی۔ غنودگی کی اس کیفیت میں کتنے لمحے بیتے اسے ہوش نہیں تھا لیکن وہ اس وقت بُری طرح چوکی جب اس نے اپنا آپ ایک بھاری بوجھ کے نیچے دبا ہوا محسوس کیا۔ ساتھ ہی کسی کی گرم گرم سانس اس کی گردن سے لکرائیں۔ اس نے بُری طرح کسمسا کر خود کو اس بوجھ سے آزاد کروانا چاہا لیکن اس کے نازک بدن کی طاقت اس پہاڑ جیسے بوجھ کو دھکیلنے کے لیے نا کافی تھی۔ کچھ دیر قبل وہ زندگی سے کتنی ہی مایوس تھی لیکن ابھی تو بہر حال ایک دوشیزہ ہی...

جسے آخری دم تک اپنی عزت کی حفاظت کا خیال رہتا ہے۔ چنانچہ اپنی دوشیزگی چھین جانے کا خطرہ محسوس کر کے بُری طرح چھپنے لگی۔ اس کی کوشش تھی کہ کچھ اور نہ کر سکے تو کم از کم چیخ ہی مار دے لیکن اس ظالم نے اس کے وجود کو اپنے بوجھ تلے پس ڈالنے کے ساتھ ساتھ اس کے منہ کو بھی ایک ہاتھ سے پوری قوت سے بند کر رکھا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے وہ اس کے کپڑے تن سے الگ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ خود پر سوار اس وحشی سے نجات کے لیے... جس کے جسم پر موجود بے تحاشا بالوں کی چھین اور مساموں سے اٹھتی گندی بدبو قطعی ناقابل برداشت تھی، اس نے بدن کی پوری قوت صرف کر کے اپنا دھنا ہاتھ اس کے جسم کے نیچے سے نکالا اور اپنے منہ پر جسے اس کے ہاتھ پر ناخن گاڑتے ہوئے جھکے سے اس کا ہاتھ منہ سے ہٹانے کی کوشش کی۔ اس کے ہاتھ کا جھکاؤ شاید اس وحشت زدہ درندے کا ہاتھ منہ سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو پاتا لیکن ناخنوں کی چھین نے کافی مدد دی اور اس کا ہاتھ ماہ بانو کے منہ سے ہٹ گیا۔

ماہ بانو نے فوراً ہی ایک زوردار چیخ ماری لیکن بس اسے ایک ہی چیخ مارنے کا موقع مل سکا اور اس درندے کا ہاتھ دوبارہ اس کے منہ پر آجھا۔ اب اس کے انداز میں مزید وحشت درآئی تھی اور وہ اور بھی زیادہ شدت سے اسے کچلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس وحشت کی ہی وجہ سے اسے اس طرف دوڑ کر آتے قدموں کی آواز سنائی نہ دے سکی۔ آنے والے نے بس ایک نظریہ منظر دیکھا اور پوری قوت سے اسے ماہ بانو پر سے دھکیل کر غار کی دیوار پر دے مارا۔ نفس کے وحشی جانور کے زیر اثر وہ شخص چوٹ کھا کر کسی نیل کی طرح بُری طرح ڈکرایا اور غراتا ہوا اپنی راہ کی رکاوٹ بننے والے پر حملہ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ پوری طرح ہوشیار تھا۔ اس نے نہ صرف اپنے آپ کو حملے سے بچایا بلکہ اس وحشی کا سر دونوں ہاتھوں سے جکڑ کر ایک بار پھر اسے دیوار پر دے مارا۔ سر غار کی پختہ دیوار سے ٹکرانے پر ایک زوردار آواز ابھری اور اگلے ہی پل ماہ بانو نے اس شخص کے سر سے خون کا فوارہ سا نکلتا دیکھا۔ اس دوران وہ کسی حد تک خود کو سنبھال چکی تھی اور وہی نیلے پھولوں والی سیاہ چادر جو اس وحشی نے اس کے جسم پر سے فوج چھین لی تھی، ایک بار پھر اپنے گرد لپیٹ لی تھی۔

رات کا وقت ہونے کی وجہ سے وہاں بہت زیادہ روشنی نہیں تھی لیکن اس مدھم روشنی میں بھی وہ وہاں موجود ان دونوں افراد کو شناخت کر سکتی تھی۔ اس پر مجرمانہ حملہ کرنے والا شخص وہی گل شیر نامی آدمی تھا جس کی آنکھوں کی ہوس نے

پہلے بھی اس کے اندر خطرے کی گھنٹی بجائی تھی جبکہ ان نازک لحاظ میں اس کے لیے رحمت بن کر آنے والا معصوم صورت عمران تھا۔ وہی عمران جس سے پہلے بھی وہ اچھی امید باندھ چکی تھی لیکن پھر اس کی وحشت کی داستان سامنے آنے پر مایوسی کا شکار ہو گئی تھی۔ اسے مایوسی کے اندھیروں میں دھکیل دینے والا وہ شخص اس وقت اس کا محافظ بن گیا تھا اور اس کی عزت پر حملہ کرنے والے کو بڑی طرح پیٹ رہا تھا۔ ماہ بانو نے محسوس کیا کہ گل شیر کو پیٹتے ہوئے عمران کے انداز میں وحشت اتر آئی ہے اور وہ اس بات کی پروا کیے بغیر کہ وہ پہلے ہی زخمی ہو چکا ہے، مسلسل اس کا سر دیوار سے مارتا رہا۔ چند لمحوں میں ہی اس نے گل شیر کو بالکل ادھ موا کر دیا۔ وہ جو کچھ دیر قبل ایک پھرے ہوئے سائڈ کی طرح ماہ بانو پر حملہ آور ہوا تھا، اب عمران کے ہاتھوں میں بالکل بے جان شے کی طرح جھول رہا تھا۔ خون گل شیر اور وحشت زدہ عمران کو دیکھ کر ماہ بانو کا اتنا بڑا حال ہوا کہ وہ چیخ بھی نہ سکی۔ اس پر چند لمحے قبل جو گزری تھی، وہ ہی کیا کم تھی جو وہ اس دہشت ناک منظر کو دیکھ کر بھی اپنے حواس قائم رکھ پاتی۔ وہ تو شور کی آوازیں سن کر دوسرے لوگ خود ہی اس طرف متوجہ ہو گئے اور دوڑ کر ادھر آئے۔ آنے والوں میں سے تین نے بڑی مشکل سے عمران کو قابو کر کے اس کی گرفت سے گل شیر کو آزاد کروایا۔

”چھوڑ دو مجھے۔ میں اس شیطان کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس جیسے بھیڑیے جو معصوم لڑکیوں کی عزت سے کھیلتے ہیں، زندہ رہنے کے لائق نہیں۔ میں اس کے کٹڑے کٹڑے کر دوں گا۔“ خود کو قابو میں کرنے والوں کی گرفت میں مچلتا ہوا وہ وحشت زدہ انداز میں چلتا ہوا۔

”ہوش کرو عمران! وہ مر چکا ہے۔“ ان میں سے ایک نے اس کے منہ پر زوردار پھپر لگاتے ہوئے اسے احساس دلایا تو وہ عالم وحشت سے باہر نکلا اور سامنے بڑی گل شیر کی لاش کو دیکھنے لگا۔ اس کی وحشیانہ ضربوں کے نتیجے میں اس کا سر پاش پاش ہو چکا تھا اور بھیجا ہوا نکل آیا تھا۔ اس منظر کو دیکھ کر بھی اس کے چہرے سے کسی قسم کا افسوس ظاہر نہیں ہوا بلکہ اس نے ایک نفرت بھری نظر گل شیر کی لاش پر ڈال کر حقارت سے اس پر تھوک دیا اور بولا۔

”اچھا ہوا مر گیا سال! بیچ جاتا تو میں اس کا ریشہ ریشہ الگ کر دیتا۔“

”اسے یہاں سے لے کر جاؤ اور گل شیر کی لاش اٹھوا کر جگہ صاف کرواؤ۔“ ان میں سے ایک نے جو شاید دوسروں سے ممتاز مقام رکھتا تھا، حکم دیا۔ فوراً ہی اس کے حکم

کی تعمیل ہونے لگی۔ عمران کو بازوؤں میں جکڑے کھڑے آدمی اسے گھسیٹ کر وہاں سے لے جانے لگے۔ اس نے بھی زیادہ مزاحمت نہیں کی۔ یقیناً گل شیر کی لاش دیکھنے کے بعد اس کے جنونی غصے کا اہال کم ہو گیا تھا۔

ماہ بانو چادر میں سمٹی ہوئی دہشت زدہ نظروں سے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ عمران کو وہاں سے لے جانے کے بعد گل شیر کی لاش بھی اٹھالی گئی تھی اور اب ایک آدمی وہاں زمین اور دیواروں پر لگے خون کو صاف کر رہا تھا۔ خون کے ساتھ ساتھ گل شیر کے سر سے اس کے بھیجے کا بھی کچھ حصہ باہر نکل آیا تھا۔ صفائی کرنے والے آدمی نے بڑے اطمینان سے اسے بھی صاف کر دیا۔ ماہ بانو نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ ان میں سے کوئی بھی اپنے ساتھی کی موت پر افسردہ یا غمگین نظر نہیں آ رہا تھا۔ ان کے لیے گویا یہ ایک معمول کی بات تھی جس کے پیش آ جانے سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ شاید وہ اس طرح کے مناظر اتنی بار دیکھ چکے تھے کہ اب ان کے لیے ان کی حیثیت بالکل ایسی ہو گئی تھی جیسے روزانہ اپنے گھر سے دفتر جانے والے شخص کے لیے راستے کے مختلف مناظر کی ہوتی ہے۔ ایسا شخص غیر ارادی طور پر سب کچھ دیکھتا تو ضرور ہے لیکن منظر میں کوئی نیا پن محسوس نہ ہونے کے باعث اس کے دل و دماغ میں تحریک پیدا نہیں ہوتی۔ ان تمام لوگوں نے بھی گل شیر کی لاش دیکھی تھی مگر اس پر کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا تھا۔

☆☆☆

”میں سمجھتا ہوں انکل کہ جنگل میں آپریشن بہت ضروری ہو گیا ہے۔ وہاں ڈاکوؤں کی پناہ گاہیں ہیں۔ یہ بات ہم پہلے ہی جانتے ہیں بلکہ میں اس سلسلے میں پہلے بھی آپ سے درخواست کر چکا ہوں کہ ڈاکوؤں کی سرکوبی کے لیے کچھ کیجیے۔“ اسپتال کے آرام دہ کمرے میں صاف ستھرے بستر پر نیم دراز وہ اپنی عیادت کے لیے آئے ہوئے آئی جی مختار مراد سے مخاطب تھا۔ بہترین نگہداشت اور علاج نے اسے تیزی سے روبہ صحت ہونے میں کافی مدد دی تھی ورنہ جس حالت میں وہ اغوا کاروں کے چنگل سے نکل کر آیا تھا، اسے دیکھتے ہوئے یہی قیاس کیا جاسکتا تھا کہ اب اسے دوبارہ سے زندگی کے معمولات میں شامل ہونے میں کافی وقت لگے گا۔ بہر حال، اب بھی وہ سو فیصد تو صحت یاب نہیں ہوا تھا۔ سر پر لگنے والا زخم گہرا ہونے کی وجہ سے اس پر ڈاکٹر داور نے ٹانگے لگائے تھے اور ابھی یہ ٹانگے کھولے نہیں گئے تھے۔ جسم کے باقی حصوں پر لگنے والے زخم بھی ابھی پوری

طرح مندرجہ نہیں ہوئے تھے۔ پھر ڈنڈوں کی ضرب سے لگنے والی اندرونی چوٹیں جو حرکت کرنے میں اسے خاصی تکلیف دیتی تھیں۔ پیر آباد کے مرکز صحت میں ملنے والی ابتدائی طبی امداد نے اگر اس کی زندگی خطرے میں جانے سے بچائی تھی تو لاہور کے اس جدید اسپتال کے ڈاکٹر زخمی اسے تیزی سے روبہ صحت کرنے کے لیے کوشاں تھے۔ فرق دونوں میں صرف اتنا تھا کہ ایک جگہ غریب لوگوں کو سہولیات فراہم کرنے کے لیے رفاہی بنیادوں پر کام ہو رہا تھا جبکہ دوسری جگہ پر خدمت کے عوض لمبے لمبے بل وصول کیے جاتے تھے۔ کہتے ہیں، درخت اگانے والا انگلی نسل کے لیے درخت اگاتا ہے اور خود اسے اس درخت کا پھل کھانا نصیب نہیں ہوتا۔ شہر یار کے ساتھ معاملہ ذرا مختلف ہوا تھا۔ اس نے دوسروں کے بھلے کے خیال سے اپنے ضلع میں دیہی مراکز صحت کا قیام عمل میں لانے کا سلسلہ شروع کیا تھا اور اس کی یہ نیکی و خدمت خود اس کے لیے خوش نصیبی بن گئی، ورنہ ممکن تھا کہ وہ فوری طبی امداد نہ ملنے پر محض خون کے زیادہ اخراج کے باعث ہی جان سے چلا جاتا۔ پس ماندہ دیہاتوں کا سب سے بڑا مسئلہ ہی یہی ہے کہ قابل علاج امراض و مسائل بھی فوری طبی امداد نہ ملنے کے باعث پیچیدہ صورت اختیار کر کے بے چارے مریض کی موت کا سبب بن جاتے ہیں۔

”مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تم نے مجھ سے آپریشن کے لیے بات کی تھی۔ اس وقت تم ایک دیہاتی لڑکی کے اغوا اور پھر اس کی لاش ملنے کے باعث یہ فرمائش کر رہے تھے جس کے بارے میں شک ظاہر کیا گیا تھا کہ اسے ڈاکوؤں نے اٹھایا ہے لیکن مقامی پولیس آفیسر کا کہنا تھا کہ لڑکی اپنی مرضی سے خود اپنے آشنا کے ساتھ گھر سے بھاگی تھی۔“ آئی جی مختار مراد نے اپنے مضبوط حافظے کا ثبوت دیتے ہوئے مختصر اس واقعے کا حوالہ دیا۔

”صرف وہی ایک کیس نہیں تھا۔ اس واقعے کے بعد ڈاکوؤں نے ایک گاؤں پر حملہ کر کے وہاں لوٹ مار بھی کی تھی۔“ شہر یار نے تڑپ کر یاد دلایا۔

”ہاں، وہ واقعہ بھی مجھے یاد ہے لیکن بیٹا... مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ یہ دونوں ہی واقعات اتنے قابل ذکر نہیں تھے کہ میں ان کی بنیاد پر حکومت کو اتنے بڑے آپریشن کے لیے راضی کر پاتا۔ تمہیں اس جنگل کی لوکیشن کا شاید اچھی طرح اندازہ نہیں ہے۔ وہاں گھنے درختوں اور پہاڑیوں کی موجودگی کے باعث چھپنے کی جگہیں بھی بہت ہیں اور آس پاس دیہاتوں کی موجودگی

کے سبب ڈاکوؤں کے لیے راہ فرار اختیار کرنا بھی زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوگا۔ اگر ہم وہاں آپریشن کرنا چاہیں گے تو ہمیں بہت بڑے پیمانے پر یہ آپریشن کرنا ہوگا اور اس کے لیے جتنا بجٹ درکار ہے، اس کی منظوری کے لیے کوئی بہت ہی خاص ریزن سامنے ہونا ضروری ہے۔“ مختار مراد نے اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔

”آپ کے خیال میں ایک معصوم لڑکی کا اس کی شادی سے ایک دن قبل اغوا ہو جانا اور پھر اس کی کٹی پھٹی لاش ملنا کوئی معمولی واقعہ تھا؟ اس واقعے کے اثرات کتنے خطرناک نکلے تھے، یہ بھی آپ کو یاد ہوگا۔ میں تو کبھی اس جذباتی سے لڑکے عبد امتین کو نہیں بھول سکتا جو اپنی بہن کے ساتھ ہونے والی اس زیادتی سے اتنی بری طرح متاثر ہوا کہ شاہنواز جیسے دہشت گرد کے ہاتھ چڑھ گیا۔ صرف اس ظلم کی وجہ سے وہ لڑکا اپنے جسم سے بم باندھ کر بھرے مجمع میں آگھسا تھا۔ وہ مجھے، وزیروں، پولیس والوں اور ایسے تمام افراد کو مار دینا چاہتا تھا جن کے ذمے قانون نافذ کرنا اور لوگوں کو انصاف فراہم کرنا ہے... لیکن اتفاق سے وہ اسٹیج تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہو سکا اور نتیجتاً ہم سارے وی آئی پیز کے صدمے میں بے گناہ عوام مارے گئے۔“ شہر یار نے نہایت سخی سے سنگین واقعے کا ذکر کیا۔

”میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں شہر یار لیکن پھر وہی کہنے پر مجبور ہوں کہ اس واقعے کی بنیاد پر میں آپریشن ڈکلیئر نہیں کر سکتا۔ ہاں، تمہارا معاملہ الگ تھا۔ اگر تم واپس نہ لوٹتے تو میں، رانا صاحب اور فیملی کے دوسرے بارسوخ افراد مل کر زور لگاتے کہ تمہیں بازیافت کرنے کے لیے آپریشن کیا جائے اور اس وقت ہم یہ بات منوا بھی لیتے لیکن اب جبکہ تم واپس آ گئے ہو تو کچھ نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارے پاس اب کوئی ٹھوس وجہ نہیں رہی ہے۔ خود تمہیں بھی یقین نہیں کہ تمہیں اغوا کرنے والے ڈاکو ہی تھے۔ تمہیں تو چودھری اور اس کے بندوں پر شک ہے کہ انہوں نے تمہیں اپنی راہ کی رکاوٹ سمجھتے ہوئے یہ اغوا کیا تھا۔“

”تو یہ بات بھی تو ظاہر ہے کہ چودھری کا ڈاکوؤں سے ربط ضبط ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس نے ہی مجھے ڈاکوؤں کے ذریعے اغوا کر دیا کہ ان کے کسی ٹھکانے پر رکھا ہو، ورنہ خود ڈاکوؤں کو مجھ سے کیا غرض ہو سکتی تھی؟“ اس نے دلیل دیتے ہوئے مختار مراد کو قائل کرنے کی کوشش کی۔

”یہ صرف ایک قیاس ہے۔ تم یا میں اس کا ثبوت پیش کرنے سے قاصر ہیں بلکہ تم کسی مخالف کی تنقیدی نظر سے

دیکھو تو تمہارے اغوا کا معاملہ ہی کافی مشکوک صورت اختیار کر لے گا۔ تمہارے پاس بتانے کے لیے کوئی وجہ نہیں ہے کہ تمہیں کس نے، کیوں اور کس لیے اغوا کیا تھا... اور بغیر کوئی مطالبہ کیے اتنی آسانی سے آزاد کیسے کر دیا؟ کہنے والے کہہ سکتے ہیں کہ تم نے چودھری پر الزام لگانے کے لیے خود ہی اپنے اغوا کا ڈراما چایا تھا اور اب فضول واویلا کر رہے ہو اسی لیے میں نے تمہیں میڈیا والوں کے سامنے کسی پر شک ظاہر کرنے سے منع کیا تھا۔ سچ کیا ہے، وہ تم جانتے ہو اور میں بھی اسے مانتا ہوں لیکن ہم اس سچ کو سب سے نہیں منوا سکتے۔“

آئی جی مختار مراد نے بغیر لگی لپٹی رکھے اس پر ہر بات واضح کر دی تو اس کا جوش بھی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ واقعی موجودہ حالات میں تو خود اس کی اپنی پوزیشن مشکوک ہو گئی تھی۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں انکل! واقعی میں اپنے اغوا والے معاملے پر شور مچاؤں گا تو اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوگا کہ میڈیا والوں کو چپٹی خبریں بنانے کے لیے ایک ایٹو ہاتھ آجائے گا۔“ آخر کار اس نے آئی جی مختار مراد سے اتفاق کرتے ہوئے اپنی شکست تسلیم کر لی۔

”مایوس مت ہو بیگ مین! ابھی تمہارے کیریئر کا اشارہ ہے۔ آگے جا کر تمہیں بہت کچھ کرنے کا موقع بھی ملے گا اور کئی رکاوٹیں بھی سامنے آئیں گی۔ ہم سب جس سسٹم کا حصہ ہیں، وہ اسی طرح چلتا ہے۔ اکثر اوقات ہم جانتے ہیں کہ سچ کیا ہے لیکن اس سچ کا ساتھ نہیں دے پاتے۔ کئی بار ہمیں نا انصافی دیکھنے کے باوجود خاموشی اختیار کرنی پڑتی ہے۔ چودھری اختیار اور تمہارا کیس کوئی انوکھا نہیں ہے۔ ان چودھریوں اور وڈیروں کے مقابل جب بھی کوئی ایمان دار افسر آتا ہے، یہ اسی طرح اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ تم تو خوش قسمت ہو کہ تمہارے فیملی بیک گراؤنڈ کی وجہ سے ابھی تک چودھری کھل کر تمہارے مقابل نہیں آیا اور صرف پیچھے سے وار کرنے پر اکتفا کر رہا ہے، ورنہ تمہاری جگہ کوئی عام فرد ہوتا تو چودھری اب تک اسے اپنے علاقے سے اٹھا کر پھینک دیتا۔ ان با اختیار چودھریوں کی زد میں آنے والوں کا کیریئر کس طرح تباہ ہو جاتا ہے، تمہیں اندازہ نہیں ہے... اور وہ صرف اس وجہ سے کہ تم ایک طاقتور خاندان کے فرد ہو۔ یوں سمجھ لو کہ جس سسٹم کی خامیوں کی وجہ سے چودھری جیسے افراد احتساب سے بچے ہوئے ہیں، اسی سسٹم کے سہارے تم بھی اپنی سیٹ پر نکلے ہوئے ہو۔“ مختار مراد ایک تجربے کا رخص تھا اور اس وقت اس کے لفظوں میں تجربہ بول رہا تھا۔ غصے اور

جوش سے بھرے ہوئے شہر یار کو اس کی بات سمجھ آئی تو وہ ذرا پسپا پڑ گیا اور دھیمی آواز میں بولا۔

”مجھے آپ کے کہے ایک ایک لفظ سے اتفاق ہے لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ میرے اور چودھری کے درمیان سب سے بڑا فرق حق و باطل کا ہے... اور میں حق کے غالب آنے تک یا کم از کم اس وقت تک جب تک میرے جسم میں جان ہے، چودھری سے اپنی جنگ جاری رکھوں گا۔“

”وش یو بیٹ آف لک بیگ مین... مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ اس جنگ میں جوش سے زیادہ ہوش سے کام لینا۔ تمہاری عمر کے لوگ عموماً اپنے جوش کی وجہ سے ہی ان کہنہ مشق جاگیر داروں سے شکست کھا جاتے ہیں اور وہ نہیں کر پاتے جس کی انہیں اللہ نے صلاحیت دی ہوئی ہے۔ سجاد کی مثال تمہارے سامنے ہے۔ اس نے اپنا پورا کیریئر اتنی احتیاط سے گزارا۔ وہ اگر ڈی آئی جی کی پوسٹ تک پہنچا تھا تو اس کے لیے اس نے خود کو اہل بھی ثابت کیا تھا۔ میری ریٹائرمنٹ کے بعد وہ آئی جی بھی ضرور بننا لیکن کیا ہوا؟ شینا کی موت نے اس پر ایسا جنون سوار کیا کہ وہ احتیاط کے سارے تقاضے فراموش کر بیٹھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شینا کے قاتل بھی انجام تک نہیں پہنچے اور وہ خود بھی اپنی جان سے گیا۔“

سجاد رانا کا حوالہ دیتے ہوئے مختار مراد کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی در آئی تھی۔ وہ اس کی اکلوتی بیٹی کا شوہر تھا اور اس نے ہمیشہ اس بات پر فخر محسوس کیا تھا کہ اس نے اپنی بیٹی کے لیے ایک بہت ہی اچھا شخص منتخب کیا ہے لیکن قسمت نے عجیب ہی چال چلی تھی۔ وقت کی آندھی نے نہ صرف اس کی بیٹی کی گود اجاڑ دی تھی بلکہ اس کا سہاگ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ وہ ایک باپ کی حیثیت سے بیٹی کے اس غم پر اندر ہی اندر کڑھتا اور گھلتا رہتا تھا لیکن بظاہر اس نے خود کو سنبھال رکھا تھا۔ دیکھنے والوں کے لیے اس کے چہرے سے اس کی اصل قلبی کیفیت کا اندازہ لگانا بہت مشکل تھا۔ یہ ضبط اور برداشت یقیناً پولیس کی برسوں کی ملازمت کا نتیجہ تھا۔

”سجاد بھائی اور شینا کے قاتلوں کا کچھ معلوم ہوا انکل؟“ ذکر چھڑا تو وہ اس سے یہ سوال کیے بغیر نہیں رہ سکا۔

”نہیں۔“ مختار مراد نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ہم اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں کر سکے کہ ان قاتلوں کے ڈانڈے انڈین خفیہ تنظیم را سے جا کر ملتے ہیں۔ ان لوگوں کے پیچھے ہم جہاں جہاں تک پہنچے، وہ وہاں سے پہلے ہی فرار ہو چکے تھے اور وہ بھی اس طرح کہ پیچھے کوئی ثبوت نہیں چھوڑا تھا۔ میں نے آرڈر دے رکھا ہے کہ خواجہ سراؤں اور جسم فروش عورتوں

کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھی جائے اور جہاں کوئی مشکوک بات ہو، میرے نوٹس میں لائی جائے۔ مجھے یقین دلایا جاتا ہے کہ یہ کام ہو رہا ہے لیکن مجھے نہیں معلوم کہ سچ کچھ ہو رہا ہے یا نہیں۔ ہم جیسے بڑے افسروں کی مجبوری یہ ہوتی ہے کہ ہم اپنے ماتحتوں کے محتاج ہوتے ہیں اور ان میں سے کون اصل میں آپ کا ماتحت اور وفادار ہے، اس بات کا مشکل سے ہی اندازہ ہو پاتا ہے۔ سجاد کی جگہ جو نیا ڈی آئی جی آیا ہے، وہ بظاہر ٹھیک آدمی ہے۔ میرے پاس اس کے خلاف کوئی بڑی شکایت بھی نہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ میرے لیے سجاد کا نعم البدل نہیں ہو سکتا۔ بہر حال، ابھی تو انویسٹی گیشن چل رہی ہے... کچھ سامنے آیا تو میں تمہیں ضرور انفارم کروں گا۔ اب مجھے اجازت دو۔ بہت نام گزر گیا ہے، مجھے کچھ دوسرے معاملات بھی دیکھنے ہیں۔“ وہ گھڑی پر نظر پڑنے پر بات کرتے کرتے اچانک ہی اپنی گفتگو سمیٹ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”تھینک یو سو مچ انکل کہ آپ اپنا قیمتی وقت نکال کر میری عیادت کے لیے آئے۔“ شہر یار نے مختار مراد سے پُر جوش مصافحہ کرتے ہوئے حقیقی شکر گزاری کے احساس کے ساتھ کہا۔

”شکریہ کی کوئی ضرورت نہیں بیگ مین! مجھے خود تم سے ملنا اچھا لگتا ہے کیونکہ تم میں وہ اسپرٹ ہے جس کی بدولت تمہارے بہت اد پر تک جانے کی امید رکھی جاسکتی ہے۔ میری دعا ہے کہ تم اپنے نیک مقاصد میں ضرور کامیاب ہو اور وہ کر کے دکھاؤ جو ہم نہیں کر پائے۔“ مختار مراد نے محبت سے اس کا شانہ تھپتھپایا۔

”اگر کرم فرماؤں نے اگلی بار بالکل ہی اوپر نہ پہنچا دیا تو یقیناً آپ کی دعا قبول ہوگی۔“ شہر یار اس کی بات سن کر شونہ سے ہنستے ہوئے بولا۔

”ایسی باتیں مت کرو بیگ مین! اب تم ہی ہو جو رانا صاحب اور اپنی ممانی کو سنبھال سکتے ہو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں لمبی عمر دے اور تمہارے طفیل وہ لوگ وہ خوشیاں دیکھ سکیں جو وقت نے ان سے چھین لی ہیں۔“ مختار مراد نے اسے فوراً ہی ٹوکتے ہوئے اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا اور ایک بار پھر اس کا شانہ تھپتھپا کر باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد شہر یار بھی تکیہ سیدھا کر کے لیٹ گیا۔ مختار مراد سے ملاقات کر کے اس کے ذہن پر سے بہت سے جالے صاف ہو گئے تھے۔ خاص طور پر اس کا اسے ”بیگ مین“ کہہ کر پکارنے کا انداز اتنا خلصانہ اور محبت سے بھرپور تھا کہ اسے محسوس ہی نہیں ہوتا کہ مختار مراد کے اور اس

کے درمیان کوئی خونی رشتہ نہیں ہے۔ وہ اس کے کزن کا سر ہی تو تھا جو اگر اس سے تعلق نہ بھی رکھنا چاہتا تو وہ شکایت نہیں کر سکتا تھا لیکن وہ اپنے بے حد مصروف شیڈول میں سے بھی خاص طور پر اس کے لیے وقت نکال کر اس سے ملنے آیا تھا تو یہ بڑی بات تھی۔

”آپ کی میڈیسن کا وقت ہونے والا ہے سر! پہلے آپ کچھ کھالیں تاکہ میں تھوڑی دیر بعد آپ کو میڈیسن دے سکوں۔“ مختار مراد کو گئے پانچ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ سفید لباس میں ملبوس ایک نازک سی نرس دستک دے کر اندر چلی آئی اور اس سے بولی۔

”اوکے! آپ میرا لنچ لے آئیں۔“ شہر یار نے اسے اجازت دی۔ اس کی ممانی آفرین رانا نے تو خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ خود اس کے لیے ہر نام کا کھانا اسپتال پہنچایا کریں گی لیکن اس نے ان کی تکلیف کے خیال سے سختی سے انکار کر دیا تھا۔ ویسے بھی یہ اسپتال بہت باسہولت تھا اور ہر شے آسانی سے دستیاب ہو جاتی تھی۔ اس وقت بھی نرس نے اس کی اجازت پا کر ڈاکٹر کے تجویز کردہ فوڈ چارٹ کے مطابق اسے اپنی نگرانی میں ہلکا پھلکا لنچ کروایا اور پھر پانچ منٹ کے وقفے کے بعد اسے دوائیں کھلا کر باہر نکل گئی۔ کمرے میں مستقل نرس کی موجودگی کو خود اس نے ناپسند کیا تھا اس لیے نرس ضرورت کے علاوہ وہاں نہیں رکھتی تھی۔ اگر اسے کوئی کام ہوتا تو وہ بیڈ کے ساتھ لگا کھنٹی کا بٹن دبا کر اسے کال کر سکتا تھا۔

اس وقت نرس اسے دوائیں کھلا کر گئی تو تھوڑی دیر میں ہی اسے غنودگی سی محسوس ہونے لگی۔ یہ یقیناً پین کلرز کا اثر تھا۔ اس نے ریموٹ کا بٹن دبا کر بیڈ کے عین سامنے لگائی وی بند کر دیا۔ لنچ کرواتے ہوئے نرس نے اس کی فرمائش پر دھیمی آواز میں ٹی وی آن کیا تھا تاکہ وہ حسب خواہش نیوز دیکھ سکے۔ اب غنودگی محسوس ہوئی تو اس نے ٹی وی آف کر کے سو جانا ہی مناسب سمجھا۔ یوں بھی اسے عیادت کے لیے آنے والے ملاقاتیوں اور فون کالز کی وجہ سے آرام کا زیادہ موقع نہیں مل رہا تھا۔ آج صبح سے تو اس نے ڈاکٹر کی تجویز پر اپنا موبائل ہی آف کر دیا تھا تاکہ کم از کم ایک طرف سے تو سکون ہو۔ اس وقت وہ اس سکون اور تنہائی کا فائدہ اٹھا کر سونے ہی لگا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اور باہر ڈیوٹی دینے والا پولیس اہلکار اجازت لے کر اندر آیا۔

”سر! ایس پی معظم تارڑ آپ سے ملاقات کے لیے آئے ہیں۔“ اس نے شہر یار کو اطلاع فراہم کی جس پر اس

نے بہ یک وقت حیرت اور کوفت محسوس کی۔ معظم تارڑ اس سے ملنے کے لیے یہاں تک آجائے گا، اسے قطعی امید نہیں تھی اور اب وہ آگیا تھا تو اس کا اس سے ملنے کو ذل نہیں چاہ رہا تھا۔

”اوکے! انہیں اندر بھیج دو۔“ قلبی کیفیت کے برخلاف اسے ایس پی کو باہر سے ہی لوٹانا اچھا نہیں لگا اس لیے جواب کے لیے منتظر کھڑے المکار سے بادل ناخواستہ کہا۔ وہ اس کا جواب سن کر فوراً ہی پلٹ گیا۔ اگلے لمحے معظم تارڑ کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔

”گڈ آفٹرنون سر! آئی ہوپ کہ اب آپ پہلے سے بہت بہتر ہوں گے۔“ اس نے مہکتا ہوا فلاور بکے بیڈ کے قریب رکھی سائنڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں حالانکہ دشمنوں کی کوشش تو یہی تھی کہ میں بہت عرصے تک بستر سے اٹھ ہی نہ سکوں... لیکن اللہ کا کرم ہے کہ میں بہتر ہوں اور بہت جلد اپنی جگہ پر واپس پہنچ کر کام شروع کر دوں گا۔“ معظم تارڑ کو جواب دیتے ہوئے اس کا لہجہ خود بخود ہی قدرے طنزیہ ہو گیا تھا جسے وہ کمال صفائی سے نظر انداز کر گیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

”وائے ناٹ سر! ہم لوگ تو منتظر ہیں کہ آپ آئیں اور اپنی ذمہ داریاں سنبھالیں۔“

”انشاء اللہ... وہ تو میں جلد سنبھال لوں گا۔ آپ یہ بتائیں کہ لاہور کسی کام کے سلسلے میں آنا ہوا تھا یا یہ طور خاص میری عیادت کے لیے تشریف لائے ہیں؟“ اس نے ذہن میں پختہ سوال آخر کار کر ہی ڈالا۔

”دونوں ہی باتیں سمجھ لیں۔ اصل میں مجھے وزیر اعلیٰ صاحب سے ایک کام تھا۔ کام تو خیر میں ان سے فون پر بھی کہتا تو وہ کروا دیتے لیکن میں نے سوچا کہ ان سے ملاقات کے بہانے یہاں آؤں گا تو آپ کی مزاج پُرسی بھی کر لوں گا۔“ معظم تارڑ نے اس کے سوال کا جواب دیا تو وہ محض سر ہلا کر رہ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ تارڑ کی وزیر اعلیٰ سے رشتہ داری ہے اور اس رشتہ داری کے بل بوتے پر وہ ان سے اپنے مطلب کا کام کروا سکتا ہے۔ کام کی نوعیت پوچھنے سے البتہ اس نے تجسس کے باوجود گریز کیا۔

”میرے علم میں آیا تھا کہ محکمہ پولیس کے کچھ افسران کو ایک تربیتی کورس پر دو سال کے لیے بیرون ملک بھیجا جا رہا ہے۔ میں نے ان افراد میں اپنا نام بھی شامل کرنے کی درخواست کی ہے۔ میں کچھ عرصے کے لیے اس سیٹ اپ سے نکلنا چاہتا ہوں بلکہ ہو سکتا ہے کہ اگر مجھے بیرون ملک کوئی

اچھا چانس مل گیا تو میں وہیں سیٹل ہو جاؤں۔ یہاں رہنا اب مجھے اپنے لیے مناسب محسوس نہیں ہو رہا ہے۔“ اس کے سوال نہ کرنے کے باوجود تارڑ نے خود ہی اپنی وزیر اعلیٰ سے ملاقات کا سبب بتا دیا۔ اس کی باتیں سن کر شہریار چونک گیا اور غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ کچھ مضطرب اور الجھا ہوا لگ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی خلاف معمول صورت حال سے دوچار ہے۔

”کیا بات ہے تارڑ صاحب! آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں؟“ آخر کار اس نے تارڑ سے پوچھ ہی لیا۔

”میں اپنے آپ کو یہاں اُن سیف محسوس کرنے لگا ہوں۔ آپ دیکھیں نا کہ حالات کس رخ پر جا رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ کوئی شخص محفوظ نہیں۔ آپ اپنے اغوا کی ہی مثال لے لیں۔ وہ تو آپ کی قسمت اچھی تھی کہ نہ جانے کس وجہ سے اغوا کاروں نے آپ کو آزاد کر دیا ورنہ یہاں تو بندہ غائب ہو جائے تو اس کا کوئی نام و نشان ہی نہیں ملتا۔“ اس نے اپنی پریشانی کا سبب بتایا لیکن شہریار یہ جواب سن کر پوری طرح مطمئن نہیں ہوا۔ اسے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی اور بھی بات ہے جسے تارڑ بتانا چاہتا ہے لیکن جھجک کا شکار ہے۔

”آپ پولیس والے ہو کر خود ڈر رہے ہیں تارڑ صاحب... یہ تو بڑی حیرت کی بات ہے۔“ تارڑ کو ٹٹولنے کے لیے وہ اٹنے چھوڑنے کے انداز میں بولا۔

”پولیس والے بھی انسان ہی ہوتے ہیں۔ پشت پر سے ہونے والا حملہ وہ بھی نہیں روک سکتے۔ آپ سجاد رانا صاحب ہی کی مثال لے لیں۔ وہ تو مجھ سے بہت اوپر کے افسر تھے لیکن ان کے ساتھ کیا ہوا؟ ان کی وردی ان کی حفاظت تو نہیں کر سکی نا۔“ اس نے گویا دلیل کے ساتھ شہریار کو قائل کرنے کی کوشش کی۔

”خیر، سجاد بھائی کا تو کیس ہی الگ ہے۔ وہ جن خطرناک مجرموں کے خلاف کام کر رہے تھے، ان کے اختیارات اور وسائل بہت زیادہ تھے لیکن آپ کو کیا مسئلہ ہے؟ آپ تو ایک چھوٹے سے ضلع کا انتظام سنبھالے ہوئے ہیں اور وہاں بھی آپ کی اچھی پی آر ہے۔“ اس نے نہایت نرمی سے ایک بار پھر تارڑ کو طنز کی پلیٹ میں لیا۔

”پی آر وی آر کیا ہوتی ہے سر! طاقتور لوگ ہمیشہ اپنے سے نیچے والوں کو استعمال کرتے ہیں اور جب انہیں لگے کہ یہ بندہ اب ہمارے کام کا نہیں رہا، اسے اپنے راستے سے ہٹانے میں دیر نہیں لگاتے۔“ تارڑ کا یہ جملہ بے حد چونکا دینے والا تھا۔ شہریار نے اس کا اشارہ سمجھ لیا تھا۔ تارڑ کو استعمال

کرنے والا طاقتور شخص صرف ایک ہی تھا۔ چودھری افتخار عالم شاہ... اور تارڑ کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے چودھری کی طرف سے کوئی خطرہ درپیش ہے۔

”آپ مجھ سے کھل کر بات کریں تارڑ صاحب! آخر آپ کس قسم کے خدشات کا شکار ہیں؟“ اس نے تارڑ سے اصل بات اگلوانے کی کوشش کی۔

”نہیں سر! مجھے خدشات لاحق تھے لیکن اب میں مطمئن ہوں۔ کچھ دنوں میں، میں ملک سے باہر نکل جاؤں گا اور جب یہاں ہوں گا ہی نہیں تو پھر خطرے کی بھی کوئی بات نہیں رہے گی۔“

”اوکے! آپ نہیں بتانا چاہتے تو آپ کی مرضی۔“ تارڑ کا گریز دیکھ کر اس نے خاموشی اختیار کر لی۔

”مجھے اجازت دیں سر! آپ کا کافی وقت لے لیا۔“ وہ یک دم ہی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور اس کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ شہریار نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ آج پہلی بار اسے تارڑ سے مصافحہ کرتے ہوئے اس کے ہاتھ کے دباؤ میں دوستانہ گرم جوشی محسوس ہوئی تھی۔

”اپنا خیال رکھیے گا سر اور ساتھ ہی محتاط بھی رہیے گا۔ زندگی ایک باریکتی ہے اور اسے ایڈونچر کی نذر نہیں کیا جا سکتا۔“ مصافحہ کرتے ہوئے اس نے شہریار کو نصیحت کی۔

”مشورے کا شکریہ لیکن میں یہ واضح کر دوں کہ میں اپنی زندگی کسی ایڈونچر کی نذر کرنے کے بجائے اسے مشن کے تحت بسر کرنے والا آدمی ہوں... اور مشن کی تکمیل کے لیے جان پر کھیل جانا بہادری کا کام ہوتا ہے۔“ شہریار نے اسے دوبارہ جواب دیا۔

”شاید آپ اپنی جگہ ٹھیک ہیں... مرنے تو بہر حال آدمی کو ہوتا ہی ہے۔ اقبال باجوہ کے بارے میں یاد ہے آپ کو کہ بے چارہ اچانک ہی مر گیا تھا۔“ اس نے سابقہ فاریسٹ آفیسر کا حوالہ دیا۔ اقبال باجوہ وہ شخص تھا جس کے تعاون سے ہی چودھری نے جنگل سے لکڑی اور کھالوں کی غیر قانونی اسمگلنگ کا کاروبار شروع کر رکھا تھا۔ ایس پی تارڑ خود بھی اس کام میں شامل تھا لیکن اب جانے کیا ہوا تھا کہ وہاں سے نکل بھاگنا چاہتا تھا۔

”باجوہ کی موت طبعی نہیں تھی سر! اسے ایک ایسا زہر دے کر ہلاک کیا گیا تھا جو بظاہر ہارٹ اٹیک کی علامات دکھاتا ہے... لیکن حال ہی میں ہونے والے باجوہ کی لاش کے پوسٹ مارٹم نے اصل حقیقت ظاہر کر دی ہے۔“ وہ ابھی تارڑ کے رویے کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ وہ اچانک اس

پر یہ انکشاف کر کے تیز قدموں سے چلتا باہر نکل گیا۔ اس کا یہ انکشاف شہریار کے لیے خاصا دھماکا خیز تھا۔ پیر آباد مرکز صحت پر ڈاکٹر ماریا اور ڈاکٹر داوردونوں نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ سنایا تھا کہ باجوہ کی موت ہارٹ اٹیک کے باعث ہوئی ہے۔ ڈاکٹروں کی اس تشخیص کے بعد باجوہ کی موت کا سرٹیفکیٹ جاری کر دیا گیا تھا۔ صورت حال میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی اس لیے پوسٹ مارٹم کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی تھی لیکن اب تارڑ اس پر انکشاف کر کے گیا تھا کہ باجوہ کی موت درحقیقت مہلک زہر سے ہوئی تھی اور یہ بات پوسٹ مارٹم کے ذریعے معلوم ہوئی تھی۔ موت کے اتنے دنوں بعد قبر سے لاش نکلا کر اس کا پوسٹ مارٹم کروانے کی ضرورت کسے اور کیوں محسوس ہوئی، ان سوالات کے جواب یقیناً تارڑ ہی دے سکتا تھا... لیکن وہ تو اسے ابھن میں گرفتار کر کے خود وہاں سے جا چکا تھا۔

☆☆☆

کشور کو عجیب سی گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ گھبرا کر اپنے کمرے سے باہر نکل آئی۔ آج کل اس کی طبیعت کا یہی عالم تھا۔ کبھی دم گھٹتا، کبھی متلی ہونے لگتی اور کبھی دل گھبراتا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ ساری کیفیات وہ ہیں جن سے تخلیق کے مرحلے سے گزرنے والی ہر عورت کو گزرنا پڑتا ہے لیکن بد قسمتی سے وہ ایک ایسی صورت حال میں اس اہم مرحلے سے گزر رہی تھی جس میں اسے ہر حال میں اپنا یہ راز چھپانا تھا... ورنہ نہ صرف اس کی اور آنے والے بچے کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی بلکہ حویلی والے اس کھوج میں بھی لگ جاتے کہ اسے اس حال تک پہنچانے کا ذمے دار کون ہے؟ وہ آفتاب کو کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی اس لیے بہت محتاط تھی۔ احتیاط کے باعث ہی وہ اپنے کمرے سے بھی کم ہی باہر نکلتی تھی کہ نہ کسی کا سامنا ہو اور نہ ہی کوئی اس کا بھید پاسکے۔

حویلی میں اس کی اس روش کو بہت زیادہ تشویش سے نہیں دیکھا گیا تھا۔ وہ پہلے بھی تنہا پسند تھی اور اس کا زیادہ وقت اپنے کمرے میں کتابوں کے درمیان ہی گزرتا تھا۔ چنانچہ کمرے میں رہنے کے اوقات مزید طویل ہوئے تو کسی نے بہت زیادہ دھیان نہیں دیا۔ الٹیوں وغیرہ کے سلسلے میں ڈاکٹر ماریا کے اس بیان کے بعد کہ وہ ڈاکٹر یا کا شکار ہوئی ہے، وڈی چودھرائی کا شک بھی ختم ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر ماریا نے اسے جو دوا دی تھی، وہ الٹیوں اور متلی کو روکنے میں بہت مددگار ثابت ہوئی تھیں اور دوبارہ کسی کے سامنے اس کی طبیعت اس طرح نہیں بگڑی تھی کہ اسے جواب دہ ہونا پڑتا۔

لیکن بہر حال وہ اپنی زندگی کے ایک نہایت نازک تجربے سے گزر رہی تھی جس میں طبیعت کا بالکل معمول پر رہنا ممکن نہیں ہوتا۔ عمومی حالات میں اس مرحلے سے گزرنے والی عورتوں کو یہ سہولت حاصل رہتی ہے کہ ارد گرد والے ان کا خیال رکھتے ہیں اور تجربہ کار لوگوں کے مشورے مشکل کو آسان بنا دیتے ہیں لیکن وہ تو کسی کو کچھ بتا ہی نہیں سکتی تھی۔ ابھی تو اسے یہ موقع بھی نہیں ملا تھا کہ آفتاب کو بھی یہ خوش خبری سنا دیتی۔ رانی کی حویلی سے غیر موجودگی نے اسے بالکل بے دست و پا کر کے رکھ دیا تھا اور اسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ وہ کس طرح آفتاب سے رابطے کی راہ نکالے۔ موبائل فون لاہور والی کو بھی میں اس کے ہاتھ سے اس وقت نکل گیا تھا جب آفتاب کے دوست افضل کی بیوی مہتاب اس سے ملنے وہاں آئی تھی اور اسی وقت اچانک ہی اس کی ماں چودھرائن ناہید بھی وہاں پہنچ گئی تھی۔ اس نے ماں سے مہتاب کا تعارف اتفاقاً بن جانے والی ایک دوست کے طور پر کروایا تھا جس پر اس نے واضح ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ اسی وقت اس کی نظروں میں کشور کا موبائل بھی آگیا تھا۔ کسی مشکل میں پڑنے سے بچنے کے لیے کشور نے موبائل کو مہتاب کی ملکیت قرار دیتے ہوئے اس کے حوالے کر دیا، یوں وہ خود موبائل سے محروم ہو کر آفتاب سے رابطے کی صورت کھو بیٹھی۔ ان حالات میں اس پر اپنی طبیعت کے سلسلے میں ہونے والا انکشاف بڑا سخت ثابت ہوا۔ ایک طرف اگر وہ اپنی محبت کی اس نشانی کے پھوٹنے پر خوش تھی تو دوسری طرف یہ خوف بھی لاحق تھا کہ کسی پر کچھ ظاہر نہ ہو جائے۔

خوف اور خوشی سے بھرے یہ دن وہ بالکل تنہا گزارنے پر مجبور تھی اور یہ تنہائی کبھی بھی اس کی گھبراہٹ میں بے پناہ اضافہ کر دیتی تھی۔ اس وقت بھی وہ اسی گھبراہٹ کا شکار ہو کر کمرے سے نکلی تھی۔ ارادہ تھا کہ کچھ دیر پائیں باغ میں جا کر کھلی فضا میں ٹہلے گی تاکہ طبیعت کچھ فریش ہو جائے لیکن اپنے کمرے سے نکل کر برآمدہ طے کرنے کے بعد جب وہ حویلی کے اس حصے میں پہنچی جہاں سے باہر کی طرف جانے کا راستہ گزرتا تھا تو وہاں ڈاکٹر ماریا کو دیکھ کر چونک گئی۔ ڈاکٹر ماریا اپنے میڈیکل باکس کے ساتھ کھڑی تھی اور قریب ہی وڈی چودھرائن بھی موجود تھی۔

”ہماری چھوٹی بہو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ملازمہ کا کہنا ہے کہ اسے وڈی الٹیاں ہو رہی ہیں اسی لیے میں نے تمہیں بلایا ہے کہ اسے دیکھ لو۔ آج کل شاید اس مرض کی وبا پھیل گئی ہے۔ پہلے کشور بیمار ہوئی، اب بہو نیگم کا مسئلہ ہو گیا۔

میں نے کہا کہ اگر کہیں مصیبت ماری مرمر اگئی تو وڈے چودھری صاحب کو کیا جواب دوں گی۔ ایسا کرو، تم اوپر جا کر اسے دیکھ لو اور کوئی دوا شواہے دو تاکہ یہ سیپا تو مٹے۔“

وڈی چودھرائن اپنے مخصوص تھکمانہ لہجے میں ڈاکٹر ماریا سے مخاطب تھی۔ ڈاکٹر ماریا نے اس کے لہجے کو یقیناً پسند نہیں کیا ہو گا تاہم وہ زبان سے کوئی اظہار کیے بغیر چپ چاپ بالائی منزل کی طرف جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ کشور جو ایک آڑ میں کھڑی یہ ساری باتیں سن رہی تھی، اپنی جگہ ٹھک کر رہ گئی۔ اپنے حالیہ تجربے کے بعد اسے فریادہ کی حالت کے بارے میں سن کر تشویش لاحق ہو گئی تھی۔ فریادہ جو کہ نور پور کے زمیندار کی بہن تھی اور جسے چودھری جبرائیل نے ذہنی معذور بنے بہنرادشاہ کی منکوحہ بنا کر حویلی لے آیا تھا، درحقیقت چودھری کی ہوس مٹانے کا سامان بنی ہوئی ہے۔ اس راز سے صرف کشور واقف تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ ذرا ذرا سی باتوں کے لیے کھوج میں پڑ جانے والی وڈی چودھرائن فریادہ کی طبیعت کے بارے میں سن کر اس لیے نہیں چونکی تھی کہ اس کے نزدیک فریادہ ذہنی معذور بہنرادشاہ کی بیوی تھی اور بہنرادشاہ اس لائق نہیں تھا کہ بیوی کے حقوق ادا کر سکتا لیکن اصل حالات سے واقف کشور کا ٹھٹھک جانا تو لازمی تھا۔

وہ پائیں باغ میں جانے کا ارادہ ملتوی کر کے وڈی چودھرائن کے منظر سے ہٹ جانے کا انتظار کرنے لگی۔ اس وقت چودھرائن کی چچیاں چچی اور شادو بھی اس کی جاسوسی کے لیے اس کے قریب موجود نہیں تھیں۔ یہ مغرب سے کچھ دیر قبل کا وقت تھا اور اس وقت حویلی کے باورچی خانے میں رات کے کھانے کی تیاری کے سلسلے میں زیادہ تر ملازما تیں وہیں مصروف ہوتی تھیں۔ ڈاکٹر ماریا کے اوپر جانے کے دو چار منٹ بعد وڈی چودھرائن وہاں سے ہٹی تو کشور کو سیڑھیاں چڑھنے کا موقع مل گیا۔ ورنہ جب سے وہ لاہور سے واپس آئی تھی، اس پر اوپر جانے پر پابندی عائد تھی۔ پابندی کی تو شاید وہ اتنی پروا نہیں کرتی لیکن درحقیقت وہ اپنے مسئلے میں اس طرح الجھ کر رہ گئی تھی کہ اسے فریادہ کا دھیان ہی نہیں رہا تھا۔

سیڑھیاں چڑھ کر وہ اوپر پہنچی تو حسب معمول وہاں خاموشی کا راج تھا۔ اوپر کمین ہی کتنے تھے۔ فریادہ، بہنرادشاہ اور ان کی ایک ملازمہ۔ اگر بہنرادشاہ کو دورہ پڑ جاتا یا وہ کسی بچکا تا ضد پراڑ جاتا تو اس خاموش ماحول میں ارتعاش پیدا ہو جاتا تھا۔ ورنہ وہاں سنائے ہی بولتے رہتے تھے۔ اوپر پہنچ کر

کشور نے بہنرادشاہ کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اندر جھانکا تو وہ اسے اپنے بیڈ پر اس حال میں بیٹھا ہوا نظر آیا کہ اس کی گردن پر نیپکن لپٹا ہوا تھا اور ملازمہ اس کے سامنے بیٹھی اسے بڑے سے پیالے میں موجود کوئی دلیا نما شے کھلا رہی تھی۔ کشور خاموشی سے دبے پاؤں وہاں سے گزری گئی اور فریادہ کے کمرے کی طرف بڑھی۔ کمرے کے دروازے پر پہنچ کر اس نے سیدھے اندر داخل ہونے کے بجائے باہر ہی رک کر اندر کی سن گن لی۔

”ڈاکٹر صاحبہ! تینوں رب دا واسطہ اس گل کی کسی نوں خبر نہ ہونے دینا۔“ اسے اندر سے فریادہ کی منت بھری آواز سنائی دی اور ذہن میں پلٹا ٹھک اور بھی مضبوط ہو گیا۔

”لیکن کیوں؟ یہ تو خوشی کی خبر ہے۔ چودھری صاحب اور حویلی کے دوسرے لوگوں کو معلوم ہو گا کہ تم ماں بننے والی ہو تو سب بہت خوش ہوں گے۔ آخر تم حویلی کی بہو ہو اور حویلی والوں کی نسل بڑھانے کا سبب بنو گی۔“ جواب میں ڈاکٹر ماریا اس سے حیرت کا اظہار کر رہی تھی۔

”میں حویلی کی بہو تو ہوں لیکن ناپسندیدہ۔۔۔ یہ لوگ میرے بھائی سے انتقام لینے کے لیے زبردستی مجھے ویارہ کر یہاں لائے تھے اور فیئر لاکر اس تنہائی میں ڈال دیا۔ اگر ان کی نظر میں میرا بہو والا مقام ہوتا تو یہ مجھے اس طرح الگ تھلک کیوں ڈالتے؟ بس تسی مہربانی کرو کہ کسی کو ابھی یہ گل نہ پتا لگنے دو۔ مینوں ڈرے کہ اگر کسی نوں خبر ہو گئی تو فیئر یہ لوگ دنیا میں آنے سے پہلے ہی اس بچے کی جان کے دشمن بن جائیں گے۔“ فریادہ بڑی لجاجت سے ڈاکٹر ماریا سے درخواست کرتے ہوئے اسے اپنا نقطہ نظر سمجھا رہی تھی جبکہ باہر کھڑی ہوئی کشور کے لیے اپنے قدموں پر کھڑا رہنا مشکل ہونے لگا۔

”ٹھیک ہے، فی الحال میں خاموش رہوں گی لیکن یہ کوئی چھپنے والی تو بات نہیں۔ آخر کار دوسروں کو اس کا علم ہو ہی جائے گا۔“ ڈاکٹر ماریا نے رضامندی ظاہر کرنے کے ساتھ فریادہ کو آنے والے وقت سے بھی خبردار کیا۔

”پتا لگنے میں بھی وقت لگے گا۔ ویسے بھی ادھر آتا کون ہے جو کچھ دیکھ سکے۔ مہینا بھر تو گزر گیا ہے مجھے اس حال میں۔ دو تین مہینے ہو گزر گئے تو فیئر کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ ابھی بھی نوکرانی نے نیچے خبر پہنچا دی تھی میری طبیعت خراب ہونے کی تو وڈی چودھرائن نے آپ کو بلوا ڈالا۔ آئندہ کے لیے میں نوکرانی کو سختی سے منع کر دوں گی۔ آپ بھی مجھے کوئی دوا شواہے جانا تاکہ طبیعت خراب ہو تو میں کھا کر گزارہ کر

لوں۔“ فریادہ نے گویا سب کچھ سوچ رکھا تھا، سو بڑے اطمینان سے ڈاکٹر ماریا سے کہہ رہی تھی۔ کشور سے اب مزید برداشت نہ ہو سکا اور وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ اس کے اچانک اندر داخل ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر ماریا اور فریادہ دونوں ہی چونک گئیں لیکن پھر اسے سامنے پا کر دونوں کے چہروں پر اطمینان کے رنگ آ گئے۔ کشور اس معاملے میں ضرر رساں ثابت نہیں ہو سکتی، یہ بات دونوں ہی سمجھتی تھیں۔

”آئیں کشور صاحبہ! میں سوچ ہی رہی تھی کہ حویلی آئی ہوں تو آپ کی طبیعت بھی معلوم کرتی ہوئی چلوں گی۔ اچھا ہوا، آپ خود ہی یہاں آ گئیں۔“ ڈاکٹر ماریا نے ایک طرح سے اسے جتایا کہ اگر وہ اس کے اور فریادہ کے درمیان ہونے والی گفتگو سن چکی ہے تو اپنی زبان بند رکھے ورنہ خود اس کا اپنا راز بھی افشا ہو سکتا ہے۔

”میں ٹھیک ہوں اور آپ کی دی ہوئی دوا میں پابندی سے کھا رہی ہوں۔ اگر کوئی مسئلہ ہو تو آپ سے رابطہ کر لوں گی۔“ اس نے ڈاکٹر ماریا کی بات کا جواب دیا اور فریادہ کے قریب بیٹھ کر نرمی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اسے اس چھوٹی سی لڑکی سے دلی ہمدردی محسوس ہو رہی تھی جو پہلے ہی بہت مشکل میں تھی اور اب ایک اور بوجھ اٹھانے پر مجبور ہو گئی تھی۔ لیکن اسے یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ فریادہ کو اپنے اوپر ڈھائے جانے والے ظلم کی نشانی اس بچے میں اتنی دلچسپی کیوں ہے کہ وہ اس کی زندگی بچانے کے لیے خود کو مشکل میں ڈال رہی ہے۔

”وائے ناٹ۔ مجھے آپ کے کام آ کر خوشی ہو گی۔ آپ دونوں میں سے جس کو بھی، جب بھی میری ضرورت ہو، آپ بلا تکلف مجھے کال کر سکتی ہیں۔“ اس کی سوچوں سے بے خبر ڈاکٹر ماریا نے خوشگوار لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا اور خود اپنا میڈیکل باکس سنبھال کر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تھنک یو ڈاکٹر۔“ کشور نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ ڈاکٹر ماریا مسکراتی ہوئی ان دونوں سے مصافحہ کر کے وہاں سے رخصت ہو گئی۔ اس کے جانے کے بعد کشور فریادہ کی طرف متوجہ ہوئی۔

”کیوں کر رہی ہو تم ایسا؟ کیوں گناہ کی اس پوٹ کو اپنے سینے سے لگا کر رکھنا چاہتی ہو؟“

”کیونکہ اسی میں میری بھلائی ہے۔ حقیقت جو بھی ہے لیکن کہلائے گا تو یہ بہنرادشاہ کی ہی اولاد نا۔ میں اس بچے کے ذریعے حویلی میں اپنے قدم مضبوط کرنا چاہتی ہوں۔ حویلی کے وارثوں میں سے ایک کی ماں بن کر میرا مقام

تبدیل ہو جائے گا۔“ فریدہ نے اس پر اپنا نقطہ نظر ظاہر کیا۔
 ”لیکن کوئی یقین نہیں کرے گا کہ یہ بچہ بہنرادشاہ کی اولاد ہے۔“ کشور نے اسے احساس دلایا۔
 ”اس بات کو تمہارا باپ تسلیم کر دے گا، ورنہ میں سب کے سامنے یہ راز کھول دوں گی کہ بچہ بہنرادشاہ کا نہیں بلکہ چودھری افتخار عالم شاہ کی اولاد ہے۔“ فریدہ کا لہجہ سخت سنگین تھا۔ اس کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے، اس پر عمل بھی کر گزرے گی۔ ایک ایسا شخص جو اپنا سب کچھ گنوا چکا ہو، اسے پھر کسی بات کا ڈر نہیں رہتا۔ فریدہ سے بھی اس کا گھر، محبوب اور عزت سب کچھ چھین لیے گئے تھے چنانچہ وہ ہر خوف سے آزاد ہو گئی تھی۔ کشور نے اپنے دل میں اس کے لیے گہری ہمدردی محسوس کی۔ اس نے بے ساختہ ہی فریدہ کو گلے لگالیا اور ہمدردی سے بولی۔

”اللہ تمہاری مشکلات دور کرے۔ میری تو دلی خواہش تھی کہ تم اس مشکل سے نکل جاؤ اور قربان کے ساتھ ایک اچھی زندگی گزارو لیکن خود میں حالات کے گرداب میں اس طرح پھنسی ہوئی ہوں کہ تمہارے لیے کچھ کر نہیں پا رہی۔ ان حالات میں، میں تمہارے لیے بس یہ دعا ہی کر سکتی ہوں کہ زندگی تم پر مہربان ہو جائے اور تم میرے باپ کے ظلم سے آزاد ہو جاؤ۔“

”میں اس کے ظلم سے بچ کر نکل سکوں یا نہ نکل سکوں لیکن یہ طے ہے کہ اسے خود ایک دن اپنے ہر ظلم کا حساب دینا ہو گا۔ اس کے دامن میں اتنی بددعا میں ہیں کہ اللہ اسے معاف کر ہی نہیں سکتا۔“ فریدہ نے جس نفرت سے بھرپور لہجے میں یہ بات کہی، اس نے کشور کا دل لرز کر رکھ دیا۔ مظلوم کی آہ عرش الہی کو ہلا ڈالتی ہے۔ یہ بات وہ اچھی طرح جانتی تھی لیکن طاقت و دولت کے نشے میں چور اپنے بدکردار و ظالم باپ کو سمجھانے سے قاصر تھی۔

☆☆☆

گل شیر کے عمران کے ہاتھوں قتل ہونے والے واقعے کو تین دن گزر گئے تھے۔ ماہ بانو نے اس واقعے کا وہاں کے ماحول پر کوئی اثر نہیں دیکھا تھا۔ اسے اس کی کوٹھری میں اسی طرح معمول کے مطابق تینوں وقت خاموشی کے ساتھ کھانا پہنچایا جاتا جس میں سے وہ خود کو سمجھا بچھا کر چند لقمے زہر مار کر لیتی کیونکہ پیٹ کی آگ دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ کم ہی سہی بددلی کے باوجود بہر حال وہ کچھ نہ کچھ حلق سے اتار ہی لیتی تھی کہ جب تک جسم سانسوں کی ڈور سے بندھا ہے، اس کی ضروریات نجی پوری کرنی ہی ہیں۔

اس تین دن کے عرصے میں اسے عمران کی شکل دوبارہ نظر نہیں آئی تھی۔ وہ دوبارہ اسے دیکھنے کی خواہش مند بھی نہیں تھی۔ اس کے بارے میں اپنے غلط اندازے نے خود اس کو بے حد مایوس کیا تھا۔ وہ شکل سے معصوم نظر آنے والا عمران اتنا وحشی نکلے گا، اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ عمران کے گل شیر کی کھوپڑی دیوار سے ٹکرائی کر توڑ ڈالنے کا منظر اسے بھلائے نہیں بھولتا تھا۔ بے شک اس نے جو کچھ کیا تھا، وہ اس کے لیے ہی کیا تھا۔ اگر وہ صحیح وقت پر وہاں نہ پہنچتا تو گل شیر اس کی عزت کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیتا۔ عمران کی مداخلت کی وجہ سے وہ ایک بار پھر کسی مرد کی ہوس ناک کا شکار ہونے سے بچ گئی تھی لیکن اسے بچانے کے لیے عمران نے جو وحشیانہ طرز عمل اختیار کیا تھا، وہ اس کے لیے نہایت صدمے کا باعث تھا۔ وہ اب تک اس صدمے سے پوری طرح باہر نہیں نکل سکی تھی اور چاہتی تھی کہ دوبارہ عمران سے سامنا نہ ہو لیکن اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی۔

تیسرا دن بھی گزر جانے کے بعد جبکہ وہ رات کے کھانے سے فارغ ہو چکی تھی اور ایک آدی کھانے کے برتن بھی لے گیا تھا، وہ آرام کی غرض سے لیٹی تو بہت دیر یونہی گزر گئی۔ ایک محدود جگہ میں بغیر ہاتھ پیر ہلائے گزرنے والے یہ شب و روز عموماً بے خواب ہی گزرتے تھے۔ نوجوانی کی وہ الہزینند جو بستر پر گر کر آنکھیں موندتے ہی مہربان ہو جایا کرتی تھی، اب اکثر روٹھی رہتی تھی۔ وہ ایک عرصے سے خانماں پر باد تھی۔ وقت کی آندھیاں اسے ادھر سے ادھر اڑائے پھرتی تھیں۔ ان حالات میں ٹھیک سے نیند آ جاتی یہ ممکن ہی کہاں تھا اور یہاں اس قید میں تو یہ مشکل اور بھی بڑھ گئی تھی۔ خصوصاً گل شیر کی حرکت کے بعد تو اس بے سکونی میں خوف کا عنصر بھی شامل ہو گیا تھا۔ بار بار خیال آتا کہ یہاں صرف ایک گل شیر ہی تو نہیں تھا۔ یہاں تو بہت سے مرد تھے جو انسانی آبادی سے دور اس برف زار میں ایک غیر فطری زندگی گزار رہے تھے۔ گل شیر کی طرح ان میں سے کسی اور کو بھی فطرت اکسا سکتی تھی۔ ایسی صورت میں تو وہ مسلسل خطرے میں ہی تھی۔ شاید ذہن میں پلٹتا یہ خوف ہی تھا جو آج بھی وہ آنکھیں بند کر کے بہت دیر لیٹے رہنے کے باوجود سو نہیں سکی۔ لیٹے لیٹے یک دم اسے احساس ہوا کہ اس کے قریب ہی کوئی ہلکی سی آہٹ ابھری ہے۔ اس آہٹ کو سن کر وہ تیزی سے اٹھ بیٹھی۔ اس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ یقینی طور پر وہ ایک انسانی سایہ ہی تھا جسے وہ اپنے قریب دیکھ رہی تھی۔ اس سائے کو دیکھ کر اس کے اعصاب بری طرح تن گئے اور وہ جارحانہ انداز میں اپنی جگہ

سے کھڑی ہوئی۔

”دشش... شور مت مچانا۔ میں عمران ہوں اور تم سے کچھ دیر بیٹھ کر بات کرنا چاہتا ہوں۔“ اس کے تیز دیکھ کر سائے نے دھیمی آواز میں سرگوشی کی۔ ماہ بانو نے آواز دھیمی ہونے کے باوجود شناخت کر لیا کہ یہ واقعی عمران ہے۔ حیرت انگیز طور پر اس کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔

”کیا بات کرنی ہے تمہیں مجھ سے؟“ وہ جواب تک اس کا دوبارہ سامنا بھی نہ ہونے کی خواہش کر رہی تھی، اسے سامنے پا کر نرم پڑ گئی اور قدرے روٹھے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

”میں تمہیں اپنے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔“ وہ تھوڑے فاصلے سے اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

”لیکن کیوں؟ میرا اور تمہارا تعلق ہی کیا ہے جو تم مجھے اپنے بارے میں کچھ بتانے سے دلچسپی رکھتے ہو؟“ اس نے ناراض سے لہجے میں اس سے کہا۔

”تعلق تو واقعی کوئی نہیں ہے لیکن پھر بھی میرا دل چاہتا ہے کہ میں تمہیں اپنے بارے میں سب کچھ بتا دوں تاکہ تم مجھ سے کم از کم اتنی نفرت نہ کرو جتنی کہ پچھلے واقعات کے بعد کرنے لگی ہو گی۔ میں نے تمہاری آنکھوں میں اپنے لیے اچھے جذبات دیکھے تھے۔ تمہارے انداز سے لگتا تھا کہ تم مجھے اچھا انسان سمجھتی ہو اور مجھے تمہاری یہ رائے بہت اچھی لگی تھی۔“

دھیمی آواز میں نرمی سے بات کرتا ماہ بانو کو وہ وہی عمران لگ رہا تھا جیسا اس نے اسے پہلی بار دیکھنے کے بعد تصور کیا تھا۔ وہ خاموشی سے بیٹھی اس کی بات سنتی رہی۔ عمران کہہ رہا تھا۔

”میں ہمیشہ سے ایسا جنونی یا غصہ ورنہ نہیں تھا جیسا کہ تم نے یہاں پایا ہے۔ میری شہرت تو بہت سلجھے ہوئے اور نیک نوجوان کی تھی۔ لوگ میری ماں سے کہتے کہ اللہ نے تمہیں ایک بیٹا دیا ہے، پر بے نیک۔ امی یہ بات سنیں تو خوشی سے مسکرا دیتیں۔ شاید انہیں لگتا ہو کہ میری صورت انہیں اپنی برسوں کی ریاضت کا صلہ مل گیا ہے۔“ وہ جیسے ٹرانس کے عالم میں بول رہا تھا۔ اس نیم روشن جگہ پر بھی ماہ بانو اس کی کھلی آنکھوں کو کہیں خلاؤں میں بھٹکتا ہوا محسوس کر سکتی تھی۔

وہ اس سے مخاطب تھا لیکن اس کی طرف دیکھنے کے بجائے ذہن میں کھل جانے والے کسی درپے سے اپنے ماضی میں جھانک رہا تھا۔

☆☆☆

”ہم صرف دو بہن بھائی تھے۔ میں اور مجھ سے تین سال چھوٹی بہن فرحانہ۔ میرے والد ہماری کم سنی میں ہی

ایک روڈ ایکسڈنٹ میں ہلاک ہو گئے تھے۔ اس وقت امی نے بڑی بہادری کا ثبوت دیا اور ایک پرائیویٹ اسکول میں ملازمت کرنے کے ساتھ ساتھ گھر پر بچوں کو ٹیوشن پڑھانے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ ان کی اس دن رات کی محنت سے ہمارے گھر کا چولہا جلنے لگا لیکن پرائیویٹ اسکول کی نوکری میں تنخواہ بھی کم ملتی تھی اور کام کا بوجھ بھی بہت زیادہ تھا۔ ایسے میں امی کی کسی سہیلی نے مشورہ دیا کہ وہ بی اے پاس تو ہیں ہی، ساتھ ہی بی ایڈ بھی کر لیں تو گورنمنٹ ملازمت حاصل کر سکتی ہیں۔ امی کو اپنی سہیلی کا یہ مشورہ اچھا لگا اور انہوں نے بی ایڈ کی تیاری بھی شروع کر دی۔ ان دنوں انہیں بہت سخت محنت کرنی پڑتی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان دنوں وہ کس وقت سویا کرتی تھیں۔ رات کو ہم بہن بھائی جب سونے کے لیے لیٹتے تو انہیں اپنی کتابوں کے ساتھ مصروف جاتے ہوئے چھوڑ کر سوتے اور صبح اٹھتے تو بھی امی جاگ رہی ہوتیں۔ ہمارے اٹھنے سے پہلے ہی وہ گھر کی صفائی ستھرائی سے فارغ ہونے کے علاوہ ناشتے کے ساتھ ساتھ دن بھر کا کھانا بھی تیار کر چکی ہوتیں۔ ان کے ان مصروفیت بھرے دنوں میں بھی میں نے بھی کسی کام میں بے ترتیبی نہیں پائی۔ یہاں تک کہ وہ ہم بہن بھائی سے کبھی جھنجھلا کر یا سخت لہجے میں بات بھی نہیں کرتی تھیں۔“

اپنی ماں کا تذکرہ کرتے ہوئے عمران کے لہجے میں گہری عقیدت اور مٹھاس بھری ہوئی تھی۔ ماہ بانو کو حیرت ہونے لگی کہ یہ دل میں اتنی گہری محبت رکھنے والا لڑکا آخر نفرت کی راہ پر کیسے چل پڑا؟ اس کی اس حیرت سے بے خبر وہ اپنی ہی سنانے میں مصروف تھا۔

”امی کا بی ایڈ مکمل ہوا اور انہیں اپنے کسی جاننے والے کی وساطت سے گورنمنٹ اسکول میں ملازمت ملی تو ہماری زندگی میں سکون آ گیا اور دن رات ذرا ترتیب اور آرام سے گزرنے لگے۔ میں چونکہ بڑا تھا اس لیے مجھے امی کی شبانہ روز محنت اور کوششوں کا زیادہ احساس تھا۔ اس احساس کی وجہ سے ہی میں خوب دل لگا کر پڑھتا تھا کہ امی کو خوش کر سکوں۔ امی واقعی مجھ سے خوش بھی تھیں لیکن میری چھوٹی بہن فرحانہ جسے ہم پیار سے فری کہتے تھے، امی کی جید و جہد کے ان دنوں میں شاید کسی نفسیاتی الجھن کا شکار ہو گئی تھی۔ اس کے ذہن میں پڑنے والی اس نفسیاتی گرہ کا ہمیں کبھی اندازہ نہیں ہوسکا۔ کبھی کبھی ہم اس کی زبان سے ایسے الفاظ سنتے کہ انسان کے پاس بہت ڈھیر ساری دولت ہونی چاہیے۔ ترس ترس کر اور خواہشات کو مار کر جینا بھی کوئی جینا

ہے... تو زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ ہمارے نزدیک تو یہ وہ باتیں تھیں جو آج کل کے کم از کم ستراتی فیصد نوجوان کرتے ہی تھے۔ چنانچہ جب کالج میں انڈیشن ہونے کے بعد فرحانہ کے لائف اسٹائل میں تبدیلی آئی تو میں نے یا امی نے زیادہ غور نہیں کیا۔ میں تو یوں بھی زیادہ تر اپنی پڑھائی میں مصروف رہتا تھا، امی نے بھی اس لیے زیادہ نوٹس نہیں لیا کہ آج کل کی بچیاں پہننے اوڑھنے اور فیشن کرنے کی شوقین ہیں، فرحانہ کا بھی اپنی کالج فیلوز کو دیکھ کر ذرا بن ٹھن کر رہے کو دل چاہتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

”مگر پھر بات فیشن کرنے سے کچھ اور آگے بڑھ گئی۔ فرحانہ نے ہفتے میں ایک دو دن کالج سے لیٹ گھر آنا شروع کر دیا۔ اس دیر کے لیے اس کے پاس یہ جواز تھا کہ اسے پریکٹیکل کرنے میں دیر ہو جاتی ہے۔ وہ ایف ایس سی پری میڈیکل کی طالبہ تھی اس لیے اس کا یہ بہانہ بھی قبول کر لیا گیا۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ امی ہم دونوں بہن بھائی پر بے پناہ اعتماد کرتی تھیں۔ انہیں اپنی تربیت پر پورا بھروسہ تھا۔ میری حد تک یہ بھروسہ قائم بھی رہا۔ فرحانہ بھی بہر حال کردار کے اعتبار سے کوئی خراب لڑکی نہیں تھی بلکہ فطرتاً وہ بہت معصوم اور بھولی بھالی تھی جس کی وجہ سے اسے زمانے کی چالاکیاں اور چال باز یوں کا کچھ علم نہیں تھا۔ اپنی اسی معصومیت اور کچھ دولت کی خواہش میں وہ ایک صنعت کار کے اوباش بیٹے کے جال میں پھنس گئی۔ اس لڑکے نے اسے نہ جانے کون کون سے سنہری خواب دکھائے کہ وہ اس کی محبت کے سحر میں گرفتار ہو گئی اور گھر والوں سے چھپ کر کالج سے باہر اس سے ملاقاتیں کرنے لگی۔ میں اور امی ان حالات سے قطعی ناواقف تھے۔ ہم پر تو اس وقت پہاڑ ٹوٹا جب ایک روز فرحانہ کالج سے شام ڈھلنے کے بعد گھر آئی۔ امی کو اس نے کالج جاتے ہوئے یہ تو بتا دیا تھا کہ آج اس کے پریکٹیکل کا دن ہے اس لیے واپسی میں دیر ہو جائے گی لیکن اتنی زیادہ دیر ہو جانے پر امی پریشان ہوئیں اور انہوں نے فرحانہ کی دوستوں وغیرہ کو فون کر کے اس کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا۔ اس کی ہر دوست نے یہی جواب دیا کہ آج کوئی پریکٹیکل نہیں تھا اور فرحانہ معمول کے مطابق کالج سے روانہ ہوئی تھی۔ یہ سن کر امی کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ فرحانہ کو کہاں تلاش کریں۔ میں بھی اس روز ایک انٹر کالج ڈبیٹ کمپیشن میں شرکت کے لیے گیا ہوا تھا۔ شام گئے گھر واپس پہنچا تو امی کو بے چینی سے ٹھٹھا ہوا پایا۔ ان سے سبب پوچھنے پر فرحانہ کے غیاب کا علم ہوا تو میں بھی ٹھہرا گیا۔

”میں اور امی کوئی لائحہ عمل طے کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ فرحانہ گھر واپس آگئی۔ اس کی حالت بہت خراب تھی۔ کپڑے جگہ جگہ سے بھٹے ہوئے تھے اور وہ زخمی بھی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر امی کی چھین نکل گئیں۔ فرحانہ نے انہیں تسلی دی اور بتایا کہ کالج سے واپس آتے ہوئے اسے ایک گاڑی نے ٹکرا دی تھی جس کی وجہ سے اس کا یہ حال ہو گیا۔ گاڑی والا تو ٹکرا مارنے کے بعد فرار ہو گیا لیکن ایک ہمدرد راہ گیر نے اسے اسپتال پہنچا دیا جہاں اسے کئی گھنٹوں بعد ہوش آیا اور ہوش آتے ہی وہ رکشے میں بیٹھ کر گھر آگئی۔ اس کی سنائی یہ کہانی سن کر امی نے اس سے سوال جواب کرنے چاہے لیکن میں نے ان سے کہا کہ ابھی وہ فری کو آرام کرنے دیں۔ صبح جب وہ اٹھے گی تو آپ اس سے تفصیلات پوچھ لیجیے گا۔ امی نے میری بات مان لی لیکن افسوس کہ دوسری صبح فرحانہ اٹھی ہی نہیں اور ہمیشہ کی نیند سو گئی۔ رات کے نہ جانے کون سے پہر اس نے اپنی دونوں کلائیوں کی رگیں کاٹ ڈالیں۔ ہمیں تو صبح بس اس کی لاش ہی ملی اور ساتھ ہی ایک خط بھی جس میں اس نے مجھے اور امی کو مخاطب کر کے ہم سے معذرت طلب کی تھی۔“

بہت دیر سے مسلسل بولتا عمران داستان کے اس مرحلے پر آ کر یک دم چپ ہو گیا۔ ماہ بانو نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کی آواز بھرا گئی تھی اور شاید وہ خود پر قابو پانے کی کوشش میں ہی خاموشی اختیار کر گیا تھا۔ رنج میں ڈوبے اس نوجوان کے لیے دل میں گہری ہمدردی محسوس کرتے ہوئے ماہ بانو نے دھیرے سے اس کا شانہ تھپتھپایا۔ یہ ایک خاموش دلاسا تھا جس نے عمران کو سنبھلنے میں مدد دی اور اس نے ایک بار پھر اپنی داستان کا سلسلہ جوڑ دیا۔

”فرحانہ نے اپنے اس خط میں واضح طور پر لکھا تھا کہ وہ کس صنعت کار کے بیٹے کی محبت کے جال میں پھنس گئی تھی اور وقتاً فوقتاً اس سے ملنے یا ہر جاتی رہتی تھی۔ آخری ملاقات میں وہ لڑکا اسے کلفٹن پر واقع اپنے اپارٹمنٹ لے گیا کہ چلو تمہیں وہ گھر دکھاتا ہوں جہاں تمہیں میرے ساتھ رہنا ہے۔ خوابوں کی دنیا میں رہنے والی فرحانہ خوشی خوشی اپنا مستقبل کا گھر دیکھنے اس کے ساتھ چلی گئی لیکن وہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ وہ جال میں پھنس گئی ہے۔ اپارٹمنٹ میں اس امیر زادے کے چار دوست اور بھی تھے۔ ان سب دوستوں نے مل کر میری معصوم بہن کی آبروریزی کی۔“ یہ سب بتاتے ہوئے عمران کی آواز واضح طور پر کانپ رہی تھی۔

”انہوں نے اس موقع پر اس کی تصویریں بھی کھینچ

لیں اور اپنی درندگی کے نتیجے میں اس کے جسم پر لگنے والی چوٹوں پر معمولی مرہم پٹی کرنے کے بعد یہ دھمکی دے کر وہاں سے روانہ کر دیا کہ اگر تم نے کسی کو ہمارے بارے میں بتایا تو یہ تصویریں تمہارے گھر پہنچانے کے علاوہ کالج میں بھی پھیلا دی جائیں گی۔ فرحانہ ان لوگوں کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکی تھی یا اس وقت اتنے شدید صدمے میں تھی کہ اس نے اس دھمکی کے باوجود میرے اور امی کے نام لکھے جانے والے اپنے آخری خط میں اس لڑکے کی نشان دہی کر دی۔ امی تو فرحانہ کی موت اور اس خط کی وجہ جان کر صدمے سے اس بُری طرح چُور ہوئیں کہ انہیں ہارٹ اٹیک ہو گیا اور وہ اسپتال پہنچ گئیں۔ ان کے اسپتال میں داخل ہونے کے بعد کون تھا جو مجھے روکتا یا کچھ سمجھاتا بھاتا۔ میں نے تھانے میں اس واقعے کی رپورٹ لکھوا دی اور فرحانہ کا خط تھانے دار... کو دکھا کر اس سے مطالبہ کیا کہ میری بہن کے ساتھ ظلم کرنے والے شخص کو گرفتار کیا جائے۔ تھانے دار بے وقوف نہیں تھا کہ میری بات پر کان دھرتا۔ اس نے لڑکے کے صنعت کار باپ سے رابطہ کیا اور اسے بتایا کہ جناب کے بیٹے کے خلاف یہ رپورٹ درج ہوئی ہے۔ اب آپ فرمائیں کہ کیا کہتے ہیں؟ صنعت کار کو کیا کہنا تھا، اس نے تھانے دار کا کھلا ہوا منہ نوٹوں سے بھر کر بند کر دیا۔ اور اس طرح فرحانہ کے قتل کا کیس شروع ہونے سے پہلے ہی بند ہو گیا۔ میں بے بس سا کبھی انصاف کے لیے تھانے کے چکر لگاتا اور کبھی اسپتال میں داخل امی کو دیکھنے جاتا۔

”اس روز میں امی کے پاس اسپتال پہنچا تو معلوم ہوا کہ اب وہ نہیں رہی ہیں۔ ڈاکٹرز خود حیران تھے کہ ری کور کرتے کرتے اچانک انہیں کیا ہو گیا۔ پیرامیڈیکل اسٹاف سے پوچھ گچھ کی گئی تو معلوم ہوا کہ کوئی شخص امی سے ملنے آیا تھا اور ان کے لیے ایک لفافہ لایا تھا۔ امی نے اس لفافے کو کھول کر دیکھا تو اس کے بعد ان کی حالت بگڑ گئی اور پھر دوبارہ نہ سنبھل سکیں۔ میں نے امی کے سامان کی تلاشی لی تو ان کے پیرس میں سے وہ لفافہ مل گیا۔ لفافے میں تصویروں کے کچھ ٹکڑے تھے جو یقیناً امی نے ہی کیے تھے۔ میں نے ان ٹکڑوں کو جوڑ کر دیکھا تو مجھے معلوم ہو گیا کہ امی کی یہ حالت کیوں ہوئی۔ وہ فرحانہ کی وہی تصویریں تھیں جو ان اوباش لڑکوں نے اسے دھمکانے کے لیے کھینچی تھیں اور اس کے مرنے کے بعد بھی وہ اس دھمکی پر عمل کرنے سے باز نہیں آئے۔ مجھے امی کی موت نے بالکل پامال کر کے رکھ دیا اور میں ہر مصلحت کو بھول کر اس امیر زادے کو ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوا۔ میں ارادہ

کر کے نکلا تھا کہ وہ مجھے مل گیا تو میں اسے جان سے مار دوں گا لیکن اپنی اس دیوانگی میں، میں نے یہ تک سوچنے کی زحمت نہیں کی تھی کہ کسی کو قتل کرنے کے لیے کسی ہتھیار وغیرہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

”جوش و جذبات سے بھرا میں نہبتا ہی اسپتال سے سیدھا اس امیر زادے کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔ وہاں گیٹ پر گارڈز کھڑے تھے۔ مجھے اندر کون جانے دیتا؟ میرے چیخنے چلانے اور زبردستی اندر گھسنے کی کوشش کرنے پر گارڈز نے مجھے مار مار کر ادھ مو کر دیا اور پھر مجھے پولیس کے حوالے کر دیا گیا کہ اس شخص نے قاتلانہ حملے کی کوشش کی ہے۔ پولیس نے مجھے اور مارا اور پھر میں تین مہینے تک سلاخوں کے پیچھے قید اپنی بے بسی پر روتا رہا۔ میرا سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ نہ بہن رہی تھی نہ ماں۔ ماں کو تو میں... اس کے جنازے کو کندھا دے کر قبرستان تک بھی نہیں پہنچا سکا تھا۔ میرا تعلیمی سلسلہ جو کہ میرے روشن مستقبل کا راستہ تھا، وہ بھی سلاخوں کے پیچھے ہونے کے باعث منقطع ہو گیا۔ خیر، ان دنوں میں جس کیفیت سے گزر رہا تھا، اگر آزاد بھی ہوتا تو کچھ پڑھ لکھ نہیں سکتا تھا۔ میرے شب و روز عجب وحشت کے عالم میں گزر رہے تھے۔ کبھی میں دن بھر بھوکا رہتا تو کبھی رات رات بھر روتا رہتا۔

”میری یہ حالت دیکھ کر ایک دن ایک ساتھی قیدی میرے پاس آیا اور کچھ ایسی ہمدردی سے مجھ سے میرے حالات پوچھے کہ میں اس سے کچھ بھی نہیں چھپا سکا۔ اس شخص نے میرے حالات سننے تو مجھے سمجھایا کہ اس طرح بزدلوں کی طرح روتے رہنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ بہتر ہے کہ خود میں حوصلہ پیدا کرو اور اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کا بدلہ لو۔ وہ شخص اس دن کے بعد ہر روز مجھے اس طرح کی نصیحتیں کرتا۔ آخر کار میں اس کی باتوں سے متاثر ہونے لگا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ ایک ایسی تنظیم سے وابستہ ہے جو اسی طرح کے مظالم کے خلاف جہاد کر رہی ہے اور ظالموں کو ان کے صحیح انجام تک پہنچاتی ہے۔ اس شخص کی باتیں سن کر میں تنظیم کی کارکردگی سے بے حد متاثر ہوا۔

”میرے نزدیک واقعی وہ لوگ لائق تحسین تھے جو اپنی ذات کو فراموش کر کے معاشرے کی اصلاح کے لیے بے لوث خدمات انجام دے رہے تھے۔ اس بے پناہ متاثر ہونے کا ہی اثر تھا کہ جب چھ ماہ بعد مجھے اپنے کچھ دوستوں کی کوششوں کے نتیجے میں رہائی نصیب ہوئی تو میں سیدھا اس تنظیم کے افراد کے پاس پہنچ گیا۔ ان لوگوں نے مجھے یقین دلایا کہ وہ مجھے اپنی بہن کے قاتلوں سے انتقام لینے کے قابل

بنادیں گے لیکن اس کے لیے مجھے کچھ صبر سے کام لینا ہوگا اور تربیت حاصل کرنی ہوگی۔ ابتدائی دو تین ماہ انہوں نے مجھے شہر میں ہی رکھ کر تربیت دی اور یہ جانچ لینے کے بعد کہ میں اپنے ارادے میں مضبوط ہوں، یہاں منتقل کر دیا۔ یہیں مجھے اطلاع دی گئی کہ تنظیم کے ساتھیوں نے میری بہن کے قاتل سے انتقام لے لیا ہے۔ اس روز تم نے جو ویڈیو دیکھی تھی، وہ اسی شخص کی تھی۔ تم چاہے اسے ظلم کہو لیکن مجھے وہ منظر دیکھ کر بڑا سکون ملا تھا۔ میری معصوم بہن کی زندگی برباد کر دینے والا اور ہمارے ہنٹے بستے گھر کو ختم کر دینے والا ایسے ہی انجام کا حق دار تھا۔“

آخری جملے بولتے ہوئے عمران کے لہجے میں نفرت کا وہی زہر بھر گیا تھا جس نے اس جیسے سبھی ہونی طبیعت کے نوجوان کی شخصیت بدل کر رکھ دی تھی اور وہ ان لوگوں کے درمیان آپھنسا تھا جو کسی طور بھی مثبت سوچ کے حامل نظر نہیں آتے تھے۔ عمران کے ماضی کے تناظر میں ماہ بانو کو تین دن قبل پیش آنے والا واقعہ بھی سمجھ آ گیا تھا۔ گل شیر کو اس کی عزت کے درپے دیکھ کر یقیناً عمران کو یونہی لگا ہوگا کہ اس کی اپنی بہن کی عزت خطرے میں ہے۔ اپنی بہن کو تو وہ بچا نہیں سکا تھا اور اس کے قاتل کو بھی اپنے ہاتھوں سے ہلاک نہیں کر سکا تھا، چنانچہ اس نے گل شیر کو وہی امیر زادہ تصور کرتے ہوئے اپنی ساری نفرت اور غصہ اس پر نکال ڈالا۔

”مجھے تمہارے حالات جان کر دلی رنج ہوا ہے لیکن میں پھر بھی یہی کہوں گی کہ تم جو کچھ کر رہے ہو، وہ صحیح نہیں ہے اور نہ ہی یہ لوگ صحیح ہیں جنہوں نے تمہیں برائیوں کے خلاف جہاد کے نام پر اپنے ساتھ شامل کر لیا ہے۔ یہ وحشت زدہ نیم دیوانے لوگ جن کی آنکھوں سے انسانیت کی رقی بھی مٹنے لگی ہے، مجاہد کہلانے کے حق دار ہو ہی نہیں سکتے۔ مجاہد کا تو بڑا مقام اور رتبہ ہوتا ہے۔ اس کے چہرے پر ایسی وحشت نہیں بلکہ نور برستا ہے۔ یہاں تمہیں کسی ایک شخص کے چہرے پر بھی ذرا سا بھی نور دکھائی دیا؟“ عمران کی ساری داستان سننے کے بعد اس نے اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ آخر میں اس سے کٹیلے لہجے میں پوچھا۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ واقعی ان لوگوں میں مجاہدین والی کوئی بھی خوب نہیں ہے۔“ خلاف توقع عمران نے اس سے اختلاف کرنے کے بجائے فوراً ہی اتفاق کر لیا تو وہ حیران رہ گئی۔

”اصل میں، میں جن حالات میں ان لوگوں سے ملا وہ ایسے تھے کہ کوئی بھی مجھے راہ سے بھٹکا سکتا تھا۔ انتقام کے

جنون میں میری اچھے بُرے اور صحیح غلط میں فرق کرنے کی صلاحیتیں ختم ہو گئی تھیں۔ پھر ان لوگوں نے خود کو کچھ اس طرح سے میرے سامنے پیش کیا کہ میں ان کے بارے میں ٹھیک سے اندازہ ہی نہیں لگا سکا۔ تین دن پہلے تک بھی میں ان لوگوں کو بالکل صحیح سمجھتا تھا۔ میرے نزدیک یہ وہ خدائی فوجدار تھے جو معاشرے سے برائیوں کا قلع قمع کرنے کے لیے بے لوث ہو کر جدوجہد کر رہے تھے۔ میں انہیں مظلوموں کا ہمدرد اور ظالموں کا دشمن سمجھتا تھا لیکن پھر اتفاق سے میں نے کمانڈر اور اس کے نائب کے درمیان ہونے والی گفتگو سن لی اور نتیجتاً میری آنکھوں پر بندھی پٹی کھل گئی۔“ عمران کے ان الفاظ نے ماہ بانو کا تجسس بھڑکا دیا۔ وہ سننے کے لیے بے چین ہو گئی کہ آخر وہ کون سے حقائق تھے جنہیں جاننے کے بعد عمران ان لوگوں سے بد دل ہو گیا تھا۔

”گل شیر کی ہلاکت کے اگلے دن جب میں اپنے حواسوں میں واپس آیا اور مجھے احساس ہوا کہ میرے ہاتھوں اپنے ہی ساتھیوں میں سے ایک کا قتل ہو گیا ہے... جس کا ہو سکتا ہے، چند لوگوں کو افسوس بھی ہو تو میں کمانڈر کا ریکیکشن جاننے کے لیے اس سے ملاقات کے لیے چلا گیا۔ اب یہ اتفاق ہی تھا کہ اس وقت کمانڈر اور اس کے نائب کے درمیان اسی موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی۔ میں ان لوگوں کی زبان سے اپنا نام سن کر باہر ہی رک گیا کہ اچھا ہے بغیر سامنے جائے ہی ان کی رائے جان لوں۔ میں نے سنا، کمانڈر کا نائب اس سے کہہ رہا تھا کہ سر! عمران کا کیا کریں؟ یہ تو ضرورت سے کچھ زیادہ ہی جذباتی نوجوان ہے۔ کل رات اس کی وجہ سے ہمارا گل شیر جیسا قیمتی آدمی ضائع ہو گیا۔ لاکھوں کی رقم خرچ کی تھی ہم نے گل شیر کی تربیت پر... اور وہ تھا بھی اپنے کام کا ماہر۔ ہمارے تربیت دیے ہوئے آدمیوں میں... خود کش جیکٹ کی تیاری میں اس جیسی مہارت کسی اور کے پاس نہیں۔ وہ دھماکا خیز مواد کے بارے میں بے حد معلومات رکھتا تھا اور اسے اس طرح کی چیزوں کو ہینڈل کرنا بھی خوب آتا تھا۔ عمران نے اسے قتل کر کے ہمارا بہت بڑا نقصان کیا ہے... جواب میں کمانڈر بولا کہ بات تو تمہاری ٹھیک ہے اور مجھے خود بھی گل شیر جیسے آدمی کے ضائع ہو جانے کا بہت افسوس ہے لیکن ہم اس معاملے میں عمران کو کوئی تنبیہ بھی نہیں کر سکتے۔ گل شیر نے حرکت ہی ایسی کی تھی کہ اگر خود میں بھی اسے وہ حرکت کرتے ہوئے پکڑ لیتا تو سزا دیے بغیر نہیں چھوڑتا۔ وہ لڑکی ہمارے پاس یہاں بگ باس کی امانت ہے اور باس نے سختی سے حکم دیا تھا کہ لڑکی کو کوئی نقصان نہیں

پہنچنا چاہیے... لیکن میری تنبیہ کے باوجود گل شیر کی نیت خراب ہو گئی۔ وہ تو ایک طرح سے اچھا ہوا کہ عمران موقع پر وہاں پہنچ گیا ورنہ اگر لڑکی کو کچھ ہو جاتا تو میرے لیے بگ باس کو جواب دینا مشکل ہو جاتا۔ کمانڈر کی اس بات کو سن کر نائب بولا کہ وہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر لیکن عمران جیسے جونیئر بندے کے ہاتھوں گل شیر جیسے سینئر کا نقصان بھی قابل برداشت نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو اس سلسلے میں عمران کو کوئی سزا ضرور دینی چاہیے تاکہ وہ آئندہ سرکشی سے گریز کرے۔“

”کمانڈر اپنے نائب کی یہ بات سن کر مسکرایا اور بولا کہ تم فکر نہ کرو۔ میں اس معاملے پر پہلے ہی غور و فکر کر چکا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ عمران بہت دور تک ہمارے ساتھ چلنے والا لڑکا ہی نہیں ہے۔ وہ صرف جذبات میں آکر اس راہ پر چل پڑا ہے لیکن میرا تجربہ کہتا ہے کہ اس کی فطرت اسے اس راہ پر چلنے نہیں دے گی۔ معلوم نہیں کیسے کراچی میں موجود کیمپ کے انچارج سے اس لڑکے کو جج کرنے میں غلطی ہو گئی اور اس نے اسے یہاں تک بھجوا دیا۔ اب مجھے اس غلطی کو سدھارنا ہوگا اور اس کا ایک ہی حل ہے کہ ہم جلد از جلد عمران کو استعمال کر کے اس سے اپنی جان چھڑا لیں۔ اندر کمانڈر یہ سب کہہ رہا تھا اور میں باہر کھڑا حیران تھا کہ یہ کون دھوکے باز لوگ ہیں اور کس مقصد کے تحت انہوں نے یہ سارا سیٹ اپ قائم کر رکھا ہے؟ میرے ان سوالوں کا جواب کمانڈر کی آگے کی گفتگو نے دے دیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ہمارے پاس وفاقی وزیر شوکت مرزا کے قتل کا ٹاسک موجود ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں اوپر سے بھی اشارہ مل چکا ہے اور یہاں ہم شوکت مرزا کے ایک مخالف کو بھی گھیر چکے ہیں کہ وہ اس کام کے لیے ہمیں معاوضہ دے دے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اس کام کے لیے عمران کو خود کش بمبار کے طور پر استعمال کیا جائے۔ شوکت مرزا کے بارے میں، میں نے جو معلومات حاصل کی ہیں، ان کے مطابق دیگر برائیوں کے ساتھ ساتھ وہ کئی عورتوں کی آبروریزی میں بھی ملوث ہے۔ اس کے اس طرح کے چکروں کی افواہیں تو گردش کرتی رہتی ہیں مگر کبھی وہ پکڑا نہیں گیا ہے لیکن یہ تو تم بھی جانتے ہو کہ ایسا آدمی کتنا ہی ہاتھ پیر بچا کر کام کرے، کہیں نہ کہیں اس کے جرم کا ثبوت موجود ہوتا ہے... اور یہ ثبوت عموماً صحافی برادری کے کسی بندے کے پاس ہی ہوتا ہے۔ ہمارے لوگوں نے اس صحافی کو تلاش کیا جس کے پاس شوکت مرزا کے خلاف مواد موجود تھا اور وہ اس بلیک میلنگ اسٹف کے ذریعے اس سے بڑی بڑی رقوم اینٹھ

رہا تھا۔ ہم نے صحافی سے وہ اسٹف حاصل کر لیا۔ اب میں وہ ساری چیزیں عمران کو دکھاؤں گا اور اسے شوکت مرزا پر خود کش حملہ کرنے کے لیے اکسائوں گا۔ اس کے کل رات والے رد عمل کو دیکھتے ہوئے تم سمجھ سکتے ہو کہ وہ اس کام کے لیے فوراً راضی ہو جائے گا۔ اپنی بہن کی آبروریزی کے بعد وہ ہر اس طرح کے شخص کو واجب القتل سمجھتا ہے۔ اس لیے اسے شوکت مرزا پر خود کش حملہ کرنے میں کوئی تعرض نہیں ہوگا۔ اس طرح ہمارا ایک کام بھی ہو جائے گا اور ہم عمران سے نجات حاصل کرنے سے پہلے اس پر اب تک لگنے والی رقم بھی سود سمیت وصول کر لیں گے۔“

”کمانڈر کے ان الفاظ نے جہاں مجھے لرزاکر رکھ دیا، وہیں اس کا نائب بے پناہ خوش ہوا اور بولا... یو آر سو جینس سر! آپ نے مسئلے کا ایک ایسا حل ڈھونڈا ہے جسے سن کر دل خوش ہو گیا ہے۔ میں ان دونوں کی اس گفتگو کو سن کر اتنا مشتعل تھا کہ دل چاہتا تھا، ابھی اندر جاؤں اور انہیں جان سے مار ڈالوں لیکن پھر میں نے اپنے جذبات کو قابو میں کیا اور دبے پاؤں وہاں سے واپس پلٹ گیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میری جذباتیت پہلے ہی مجھے بہت زیادہ نقصان پہنچا چکی ہے اس لیے اب مجھے جوش کے بجائے ہوش سے کام لینا ہوگا۔ میں نے وہ سارا دن معمول کے مطابق گزارا۔ پھر رات میں میرے پاس کمانڈر کا بلاوا آ گیا۔ میرا دل تو نہیں چاہ رہا تھا کہ میں اس منافق آدمی کی شکل بھی دیکھوں لیکن مصلحتاً برداشت سے کام لیتا ہوا اس کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ کمانڈر نے بڑی سنجیدگی سے میرا استقبال کیا اور مجھے اپنے سامنے بٹھاتے ہوئے بولا کہ... کل جو کچھ ہوا اس کا مجھے بہت افسوس ہے عمران۔“

”میں نے کہا... بھائی صاحب! افسوس مجھے بھی ہے۔ مجھے ضرورت سے کچھ زیادہ ہی غصہ آ گیا تھا اور اس غصے کی وجہ سے گل شیر کو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔ یقیناً آپ کو اس کی موت کا بہت افسوس ہوا ہوگا... لیکن کمانڈر کے جواب نے مجھے حیران کر دیا۔ اس نے کہا کہ مجھے گل شیر کے قتل پر نہیں، اس کی حرکت پر افسوس ہے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ہم مجاہدین کے درمیان اس جیسا شیطانی فطرت رکھنے والا آدمی بھی موجود ہے۔ تم نے اس شیطان کو قتل کر کے ایک کارنامہ انجام دیا ہے اور اس وقت میں نے تمہیں تمہارے اس کارنامے پر شاباش دینے کے لیے ہی بلایا ہے۔ اگر میں نے کمانڈر کا اصل چہرہ نہ دیکھ لیا ہوتا تو اس کی یہ باتیں سن کر بہت خوش ہوتا۔ میں نے دل ہی دل میں اس منافق پر لعنت

بھیجی اور مصحح اس کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے مجھے غلط نہیں سمجھا۔ کمانڈر میری طرف سے شکرگزاری کے اظہار پر خوش ہوا اور پھر اس نے تھیلے سے بلی نکالتے ہوئے وفاقی وزیر شوکت مرزا کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ بڑھا چڑھا کر مجھے وزیر کی اخلاقی بے راہ روی کے بارے میں باتیں بتاتا رہا اور بولا کہ اس جیسا کر پٹ شخص اس لائق نہیں کہ اسے مزید اس دنیا میں رہنے دیا جائے۔ میں نے کمانڈر کی اس رائے سے اتفاق کیا اور از خود اپنی خدمات پیش کر دیں کہ میں اس بدکردار آدمی کو ٹھکانے لگاؤں گا۔ کمانڈر نے میرے اس جذبے پر مجھے بہت شاباش دی اور بتایا کہ شوکت مرزا نہایت سخت سیکیورٹی میں رہتا ہے۔ اسے دور سے گولی مارنا یا کہیں ایسے ہی گھیر لینا ممکن نہیں ہے۔ اس شخص کو ختم کرنے کے لیے ہمیں خود کش حملے کی تکنیک ہی استعمال کرنی پڑے گی۔ اس کام کے لیے تمہیں یہ کرنا ہوگا کہ بارود سے بھری ہوئی گاڑی لے کر اچانک ہی شوکت مرزا کی گاڑی سے ٹکرا دو۔ گاڑی ہم تمہیں فراہم کر دیں گے اور شوکت مرزا کے شیڈول کے متعلق معلومات حاصل کر کے حملے کی جگہ اور وقت کا تعین کرنا بھی ہماری ذمہ داری ہوگی۔ بس تم ذہنی طور پر اس بات کے لیے تیار رہو کہ تمہیں یہ کام اپنی جان کی قیمت پر کرنا ہے۔ باقی اس سلسلے میں تمہاری جوڑینگ وغیرہ ہونی ہوگی، اس کا انتظام بھی ہو جائے گا۔

”میں نے کہا... بھائی صاحب! جان کی کوئی پروا نہیں۔ اگر ایک شیطان کو دنیا سے مٹانے میں میری جان چلی جائے تو میں سمجھوں گا کہ میں نے جامِ شہادت نوش کر کے ہمیشہ کی زندگی پالی۔“

”کمانڈر میرے اس جواب سے بہت خوش ہوا اور مجھے گلے لگا کر میرے جذبے کی بہت تعریف کی۔ میں اندر ہی اندر اس کی مکاری پر کڑھتا رہا لیکن زبان اور چہرے سے اظہار نہیں ہونے دیا۔ کمانڈر کی اصلیت کھلنے کے بعد میں مسلسل سوچتا رہا کہ میرا کیا لائحہ عمل ہونا چاہیے؟ یہ تو ظاہر ہے کہ میں یہاں رہ کر اکیلا ان سارے لوگوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا، اسی کشمکش میں جتنا دودن گزر گئے۔ آج شام کمانڈر نے مجھے پھر اپنے پاس بلایا اور بتایا کہ کل کسی وقت مجھے یہاں سے روانہ کر دیا جائے گا۔ پروا لگی کے بارے میں سن کر مجھے تمہارا خیال آگیا اور دل میں تجسس جاگا کہ تم سے معلوم تو کروں کہ آخر تم کون ہو اور کیسے ان لوگوں کے جال میں پھنس گئی ہو۔ ممکن ہے کہ میں تمہیں اس جال سے نکالنے کے لیے کچھ کر سکوں۔ میرے پاس زیادہ مہلت نہیں تھی اس لیے میں موقع

ملنے ہی تم سے ملنے یہاں آگیا ہوں۔ میں تمہیں ان بیھڑیوں کے درمیان تنہا چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا۔ تمہاری صورت میں مجھے اپنی فری کی صورت دکھانی دیتی ہے۔ فری کو تو میں اپنی لاعلمی کی وجہ سے نہیں بچا سکا تھا لیکن تمہارے لیے جو بھی کر سکا، ضرور کروں گا۔“

عمران کے لہجے میں جو سچائی اور خلوص تھا، اس نے ماہ بانو کے دل پر گہرا اثر کیا اور فطرت جذبات سے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ چند ظالموں کی وجہ سے وہ اگر حالات کے گرداب میں پھنس گئی تھی تو یہ حقیقت بھی اپنی جگہ تھی کہ دست قدرت ہر جگہ بہانے بہانے سے اس کی مدد کے لیے کارفرما ہو جاتا تھا۔ اس وقت بھی اللہ نے عمران کی صورت میں اس کے لیے ایک مددگار بھیج دیا تھا۔ وہ اس مددگار کے ظہور پر دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے عمران کو دھیمی آواز میں مختصر اپنے حالات زندگی سناتی چلی گئی۔ اس کی زندگی کی داستان ایسی نہیں تھی جو عمران جیسے درد دل رکھنے والے انسان کو متاثر نہیں کرتی۔ وہ خاموشی سے مگر دلی افسوس کے ساتھ اس کی داستان سنتا چلا گیا۔

”تم ذہنی طور پر تیار رہنا۔ میری کوشش ہوگی کہ کل یہاں سے روانہ ہوں تو تم ہر صورت میرے ساتھ موجود ہو۔“ رات اپنا بالکل آخری پہرے کر رہی تھی جب عمران نے اس کے پاس سے رخصت ہوتے ہوئے یہ الفاظ کہے اور اس کے دل میں امید کی شمعیں روشن کر کے خود جس طرح تاریکی میں خاموشی سے یہاں تک آیا تھا، اسی خاموشی سے واپس پلٹ گیا۔

☆☆☆

مشاہد خان ہنوز اسکردو میں ہی مقیم تھا۔ پولیس کی طرف سے عائد کردہ پابندی کے باعث وہ فی الحال اپنی ملازمت پر واپس نہیں جاسکتا تھا۔ اس طرف سے اسے کوئی پریشانی بھی نہیں تھی کیونکہ شہر یار نے اس کی چھٹی منظور کرتے ہوئے اسے وہیں رکنے کا مشورہ دیا تھا۔ یہاں رہ کر وہ اپنی ماں کی دیکھ بھال بھی کر سکتا تھا اور اکرم خان کے قاتلوں اور ماہ بانو کے اغوا کاروں کا کھوج بھی لگانے کی کوشش کر سکتا تھا۔ اسپتال میں داخل اس کی ماں کی حالت ہنوز پہلے جیسی تھی۔ جوان بیٹے کی موت کے غم نے اسے اتنی بری طرح متاثر کیا تھا کہ وہ آنکھیں کھول کر اس حقیقت کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھی۔ مشاہد خان روز اسپتال جاتا اور خاموشی سے ماں کے سرہانے بیٹھا رہتا۔

اسپتال سے نکلتا تو ان لوگوں کی تلاش شروع کر دیتا جو

نیاز علی کو اپنے آلہ کار کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔ نیاز علی نے مرنے سے قبل اسے یہ بتا دیا تھا کہ وہ کسی شخص کے کہنے پر پہاڑوں میں کہیں خفیہ طور پر روپوش لوگوں کے لیے خوراک اور ادویات کا ذخیرہ سپلائی کرتا ہے لیکن اس نے اس آدمی کی نشان دہی نہیں کی تھی۔ وہ ایسے کسی پوائنٹ کا نام بھی نہیں بتا سکا تھا جہاں سے اس سے سپلائی لی جاتی ہو۔ اس کے مطابق مال وصول کرنے والے ہمیشہ مختلف مقام پر اس سے وصول کرتے تھے۔ یعنی نیاز علی کو استعمال کرنے کے باوجود وہ لوگ اس پر بھروسہ کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ایسی صورت میں مشاہد خان کے پاس یہی راستہ رہ جاتا تھا کہ وہ اس شخص کو تلاش کرے جو یہاں اسکردو میں نیاز علی کو آگے لے جانے کے لیے سامان فراہم کرتا تھا۔ اس شخص کی تلاش کے لیے اس نے نیاز علی کے ملنے جلنے والوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا شروع کر دیں۔ اس کے بہت زیادہ لوگوں سے تعلقات نہیں تھے اور کچھ عرصے سے تو اس نے دوستوں وغیرہ سے ملنا تقریباً ترک ہی کر دیا تھا۔ بس لے دے کر ٹورسٹ کمپنی میں اس کے ساتھ ملازمت کرنے والے چند ساتھی ہی تھے جن سے اس کا تھوڑا میل ملاپ تھا۔ مشاہد خان نے ان ملازمین اور کمپنی کے مالک پر نظر رکھنی شروع کر دی لیکن تنہا ہونے کی وجہ سے اسے اس کام میں بہت دشواری پیش آرہی تھی۔ وہ بیک وقت ان تمام افراد کی نگرانی نہیں کر سکتا تھا۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ کمپنی سے وابستہ ڈرائیورز تو عموماً سفر میں ہی رہتے تھے۔ وہ ان میں سے کس کس کا چھچھا کرتا اور کس طرح؟ اس کے پاس یہاں اپنی کوئی ذاتی سواری بھی نہیں تھی۔ کرائے کی جیپ البتہ مل سکتی تھی لیکن ابھی تک اس نے اس سہولت کو حاصل کرنے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ فی الحال وہ یہیں رہ کر جائزہ لے رہا تھا کہ کوئی ایسی مشکوک جیپ نظر آجائے جسے پہاڑوں پر جانے والی کسی ایسی ڈیشن ٹیم کو واپس لانے جانا ہو اور اس کے باوجود اس میں سامان لوڈ ہو۔ اس مقصد کے لیے وہ اکثر نیاز علی کے دفتر کے آس پاس چکراتا رہتا تھا۔ اسے امید تھی کہ نیاز علی کی موت کے بعد اس کام کے لیے کسی اور ڈرائیور کو ہائر کیا جائے گا۔ وہ کوشش میں تھا کہ کسی طرح نیاز علی کی جگہ لینے والے ڈرائیور کا کھوج لگا لے۔ نئے ڈرائیور کا علم ہو جاتا تو پھر اس شخص تک پہنچنے کی راہ بھی نکل آتی جو یہ کام کروا رہا تھا۔ اپنی اس کھوج کے چکر میں وہ صبح ہی صبح ٹورسٹ کمپنی کے دفتر کے سامنے جا پہنچتا۔ عموماً جیسے ہی اس وقت روانہ ہوتی تھیں اور نظر رکھنے کی صورت میں ایسی جیپ پکڑ میں آسکتی تھی جو مشکوک ہو۔ ابھی تک اسے

اس مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی پھر بھی وہ ثابت قدمی سے اپنے معمول پر ڈٹا ہوا تھا۔

نگرانی کا کام انجام دینے کے لیے اس نے دفتر کے عین سامنے موجود ایک چھوٹے سے ہوٹل کو اپنا ٹھکانا بنالیا تھا۔ وہ ہوٹل بھی کیا تھا، بس ایک طرح سے چائے خانہ ہی تھا جہاں چائے کے ساتھ ناشتے کے لوازمات بھی مل جاتے تھے۔ مشاہد خان ہر روز صبح وہاں پہنچ کر ناشتا کرتا۔ اس دوران اس کی نظریں ٹورسٹ کمپنی کے دفتر پر ہی لگی رہتیں۔ ابھی تک اس نے وہاں سے جتنی جیسیں روانہ ہوتی دیکھی تھیں، ان میں سے کوئی بھی مشکوک نہیں لگی تھی۔ وہ موقع پا کر جیپ کے ڈرائیور سے بات چیت بھی کر لیتا تھا۔ اس گفتگو سے اسے علم ہو جاتا کہ کون سی جیپ کہاں اور کس مقصد کے لیے روانہ ہو رہی ہے۔ اس کے سامنے اب تک کوئی ایسی جیپ روانہ نہیں ہوئی تھی جسے کسی ایسی ڈیشن ٹیم کو واپس لانے جانا ہو۔ مسلسل ناکامی نے اسے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ اس کا لائحہ عمل غلط ہے۔ اسے نیاز علی کی ٹورسٹ کمپنی کے علاوہ دوسری کمپنیوں پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔ اب تک تو وہ اس شک کی بنیاد پر صرف اسی کمپنی کی جیپوں کی نگرانی کر رہا تھا کہ ہونہ ہو، کمپنی کا مالک بھی اس کام میں شامل ہوگا۔ نیاز علی نے اگرچہ ایسا کوئی اعتراف نہیں کیا تھا لیکن مشاہد خان کو شبہ تھا کہ اتنا بڑا کام مالک کی شمولیت کے بغیر کرنا صرف ڈرائیور کے بس کی بات نہیں... لیکن اب وہ خود اپنے اس نظریے کی طرف سے مشکوک ہونے لگا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کی لائن آف ایکشن غلط ہے اور اب اسے اپنی نگرانی کا دائرہ وسیع کر کے دیگر ٹورسٹ کمپنیوں اور ان کے ڈرائیورز کو بھی چیک کرنا چاہیے۔ یہ بہت بڑا کام تھا جس کے لیے تنہا اس کی ذات ناکافی ہوتی اور اسے مقامی حکام سے مدد دینی پڑتی۔ شہر یار کی وجہ سے اسے یہ مدد مل بھی جاتی لیکن اس صورت میں شاید وہ خود لاعلم رہ جاتا۔ سرکاری لوگ اسے اپنے ساتھ شامل کرنے کے بجائے جو بھی کرنا ہوتا، اپنے طور پر کرتے جبکہ اس کی شدید خواہش تھی کہ وہ خود یہ مہم سر کرے۔

اکرم خان کے قتل اور ماہ بانو کے اغوانے اس معاملے کو اس کی ذاتی لڑائی بنادیا تھا۔ نہ وہ اپنے بھائی کے قاتلوں کو معاف کر سکتا تھا، نہ ہی اپنے گھر بٹا گزین ماہ بانو کے اغوا کو نظر انداز کر سکتا تھا۔ اب بھی کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کس مصیبت میں مبتلا تھی اور کن حالات سے گزر رہی تھی۔ ان ساری سوچوں اور فکروں کے گرداب میں پھنسا آج پھر وہ اپنی مخصوص جگہ پر موجود تھا اور ناشتے سے فارغ ہونے کے

بعد سبز چائے کے گھونٹ بھر رہا تھا۔ اچانک ہی اس کی جیب میں موجود سیل فون بجنے لگا۔ اس نے فون نکال کر اسکرین پر آنے والا نمبر چیک کیا۔ یہ اس اسپتال کا نمبر تھا جہاں اس کی ماں داخل تھی۔ اسپتال کا نمبر دیکھ کر اس کا دل دھڑک اٹھا۔ اس نے اسپتال انتظامیہ کو خود اپنا نمبر دیا تھا کہ کسی ایمرجنسی کی صورت میں اسے کال کر لی جائے۔ وہاں سے فون آنے کا مطلب تھا کہ خیریت نہیں تھی۔

”ہیلو۔“ اس نے تشویش کے عالم میں کال ریسیو کی۔ ”تمہاری ماں کی طبیعت بہت خراب ہو گئی ہے، فوراً اسپتال پہنچو۔“ کسی نے بہت تیزی سے یہ پیغام دے کر فون بند کر دیا۔ مشاہد خان اپنے بدترین اندیشے کے درست ثابت ہونے پر گھبرایا ہوا پھرتی سے اٹھ کر اسپتال کے لیے روانہ ہوا۔ اسے اپنی ماں سے بہت محبت تھی اور اس کے مسلسل بے ہوشی میں ہونے کے باوجود وہ یہ آس لگائے بیٹھا تھا کہ ایک دن ماں بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ اب جو اس کی طبیعت بگڑنے کا فون آیا تو اس کی اپنی دنیا زیرِ برہونے لگی۔ وہ حتیٰ الامکان تیزی سے کام لے کر فوراً ہی اسپتال پہنچا لیکن جب ماں کو دیکھا تو وہ پہلے والی ہی کیفیت میں تھی۔ ”مجھے یہاں سے کسی نے فون پر اطلاع دی تھی کہ میری ماں کی حالت بہت خراب ہے۔ کیا سچ اس کی حالت بگڑ گئی تھی؟“ یہ گمان کرتے ہوئے کہ ممکن ہے، ماں کی حالت خراب ہوئی ہو اور ڈاکٹرز نے قابو پالیا ہو... اس نے ڈیوٹی زس سے پوچھا۔

”نہیں، ان کی طبیعت تو پہلے ہی جیسی ہے۔ یہاں سے تو کسی نے آپ کو فون نہیں کیا۔ آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔“ نرس کے جواب نے اسے چکرا کر رکھ دیا۔ ایک دم ہی اسے احساس ہوا کہ اسے نہایت خوب صورتی سے بے وقوف بنایا گیا ہے۔ ماں کی طبیعت کی خرابی ایک ایسا بہانہ تھا جس کی مدد سے اسے اس کی جگہ سے ہٹایا جاسکتا تھا اور یقیناً اسے وہاں سے ہٹانے کے بعد مجرم اپنا کام کر گئے تھے۔ اس صورت حال نے جہاں اس پر یہ مشکف کیا کہ نیاز علی جس ٹورسٹ کمپنی سے وابستہ تھا، وہ اس غیر قانونی کام میں ملوث ہے وہیں یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ وہ لوگ اس کی طرف سے غافل نہیں تھے۔ انہیں علم تھا کہ وہ ان کی نگرانی کر رہا ہے... چنانچہ انہوں نے عین موقع پر اسے وہاں سے ہٹانے کا انتظام کر دیا۔

☆☆☆

کشور کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک طرف

طبیعت کی خرابی نے نڈھال کر رکھا تھا تو دوسری طرف راز کھل جانے کا خوف ہر آن گھیرے رکھتا۔ فریدہ کے بارے میں ہونے والے انکشاف نے اسے اور بھی پریشان کر دیا تھا۔ اس کی کونکھ میں چودھری کے گناہ کا بیج پھوٹ پڑا تھا اور یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اسے ہر آن یوں لگتا کہ حویلی پر کوئی عذاب نازل ہونے والا ہے۔ اتنے بڑے بڑے مظالم اور گناہوں کے نتیجے میں عذاب نازل بھی ہونا چاہیے تھا۔ وہ تو حیران تھی کہ اللہ نے کیوں اب تک اپنی رستی دراز کر رکھی ہے؟ شاید اس میں بھی اللہ کی کوئی مصلحت تھی... لیکن بہر حال وہ اس جگہ پر مزید ٹھہر کر کسی عذاب کا انتظار نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کے وجود میں آفتاب کی محبت کی نشانی پل رہی تھی اور وہ چاہتی تھی کہ کم از کم اتنا ضرور جیے کہ اپنی محبت کا یہ تحفہ آفتاب کو پیش کر سکے۔ یہ تحفہ اسی صورت میں آفتاب کو دیا جاسکتا تھا کہ وہ حویلی سے نکل جاتی لیکن اس کے لیے حویلی سے نکلنے کی ساری راہیں مسدود تھیں۔ رانی کی حویلی میں عدم موجودگی نے اس کے ہاتھ پیر کاٹ دیے تھے۔ رانی کی واپسی کے سلسلے میں اس نے ایک دو بار وڈی چودھرائن سے بات بھی کی تھی لیکن اس کا کہنا تھا کہ رانی کا لاہور والی کوشی میں رکنا ضروری ہے کیونکہ وہاں حاجرہ اکیلی صحیح طرح سے انتظامات سنبھال نہیں پا رہی تھی۔

کشور کہنا چاہتی تھی کہ رانی کو واپس بلا کر کسی اور ملازمہ کو وہاں بھیج دیا جائے لیکن اسے یہ بھی علم تھا کہ وڈی چودھرائن سے بحث فضول ہے۔ وہ وہی کچھ کرتی تھی جو اس کا دل چاہتا تھا۔ بہت سوچنے کے بعد آخر کشور کو آفتاب سے رابطے کی ایک صورت نظر آئی۔ آفتاب اس کی بڑی بہن تاجور کے بیٹے منور کو پڑھانے کے لیے جاتا تھا۔ اس کی دونوں بڑی سوتیلی بہنیں تاجور اور صنوبر اپنے ماموں کے گھر بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ بہنوں اور ان کے بچوں سے ملنے کے بہانے وہاں جاسکتی تھی۔ اس امید پر کہ وہاں جانے پر آفتاب سے رابطے کی کوئی صورت نکل آئے، اس نے وڈی چودھرائن سے بہنوں کے گھر جانے کی اجازت طلب کی۔ پہلے تو وہ ٹال مٹول کرتی رہی پھر اس کے اصرار پر اس شرط پر راضی ہو گئی کہ دو دن بعد چلیں گے۔ ان دو دنوں میں اسے حویلی میں استعمال ہونے والے اناج کے اسٹورز کی اپنی نگرانی میں صفائی کروانی تھی۔ بے شمار مستعد ملازماؤں کی موجودگی کے باوجود وڈی چودھرائن ایسے ہر کام کی خود نگرانی کرنا پسند کرتی تھی۔ اسے شک رہتا تھا کہ اگر وہ ملازماؤں کے سر پر مسلط نہیں رہی تو وہ ہڈ حرامی کریں گی یا موقع کا فائدہ اٹھا کر کچھ چرا

کر لے جائیں گی۔ اللہ اللہ کر کے انتظار کے یہ دو دن گزرے اور کشور نے وڈی چودھرائن کے ساتھ اس کے میکے جانے کے لیے رختِ سفر باندھا۔ اس کی اپنی ماں چودھرائن ناہید البتہ ساتھ نہیں جا رہی تھی۔ اسے وڈی چودھرائن نے اپنے پیچھے حویلی کی نگرانی کا کام سونپا تھا اور خود شاید کشور کی نگرانی کے لیے اس کے ساتھ گئی تھی۔

وہ دونوں وہاں پہنچیں تو ان کا گرم جوشی سے استقبال کیا گیا۔ تاجور اور صنوبر ماں کی آؤ بھگت کرنے کے ساتھ ساتھ اسے بھی کریدتی رہیں کہ اس کی ذہنی حالت کو جانچ سکیں۔ پچھلے دنوں تسلسل سے یہ سننے میں آتا رہا تھا کہ کشور کی ذہنی کیفیت ٹھیک نہیں ہے۔ اسے دورے پڑنے لگے ہیں۔ تاجور تو اپنے تئیں لاہور میں اس کے قیام کے عرصے میں اس کی دیوانگی کا مظاہرہ اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی آئی تھی۔ یہ اس وقت کی بات تھی جب کشور نکاح کے بعد پہلی بار آفتاب سے ملنے گئی تھی اور اس نے اس ملاقات کے اہتمام کے لیے پور پور خود کو سجا دیا تھا۔ اس وقت رانی نے مصلحتاً یہ جھوٹ بول دیا کہ بی بی کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے اور وہ دیوانگی کی حالت میں خود کو اس طرح سجانے سنوارنے بیٹھ جاتی ہیں۔ تاجور نے واپس گاؤں آکر ماں کو ساری رپورٹ دی۔ ساتھ ہی صنوبر کو بھی سب کچھ بتایا، چنانچہ اب جبکہ وہ بہنوں سے ملنے ان کے گھر گئی تھی تو وہ بہانے بہانے سے اس کی ذہنی حالت جاننے کی کوشش کر رہی تھیں۔ کشور نا سمجھ نہیں تھی لیکن سب کچھ سمجھنے کے باوجود انجان بن گئی اور بہنوں کی باتیں نظر انداز کر کے ان کے بچوں کے ساتھ ہنسنے کھیلنے میں لگی رہی۔ سوتیلے رشتے کے باوجود اسے ان بچوں سے بہت محبت تھی اور اب تو جبکہ وہ خود ماں بننے جا رہی تھی، اسے یہ بچے اور بھی اچھے لگ رہے تھے۔ بچوں کے ساتھ مصروف وقت کس طرح گزرا اسے احساس ہی نہیں ہوا۔ البتہ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اس کے اعصاب تن گئے۔ اسے معلوم تھا کہ آفتاب دوپہر کے بعد ہی منور کو پڑھانے آتا ہے اور اسے اسی موقع سے کسی طرح فائدہ اٹھانا تھا۔ کھانے کے بعد کا وقت اس کے لیے بڑا ٹھن اور صبر آزما تھا۔ آخر خدا خدا کر کے یہ وقت بھی گزرا اور ایک ملازمہ نے اطلاع دی کہ منور شاہ کے ماسٹر صاحب پڑھانے کے لیے آگئے ہیں۔ کشور اس وقت غیر محسوس طور پر منور کے ساتھ ہی مصروف تھی اور اس کے بیک سے کتابیں، کاپیاں نکال کر بظاہر اس سے پڑھائی کے بارے میں ہی پوچھ گچھ کر رہی تھی۔ اس نے ماسٹر کی آمد کی اطلاع سنی تو اس کا دل بری طرح دھڑک اٹھا۔ منور کی کتابیں

کاپیاں سمیٹ کر بیک میں رکھتے ہوئے اس کے ہاتھ بڑی طرح کپکپا رہے تھے۔

”منور کو پڑھانے کے بعد مجھ سے حویلی کے باغ میں ملیں۔“ اس نے منور کی اردو کی کاپی کے اس صفحے پر جہاں آفتاب نے اسے ہوم ورک دیا تھا، یہ مختصر سا پیغام موقع ملتے ہی جیکے سے لکھ دیا تھا اور بیک میں وہ کاپی سب سے اوپر رکھ دی تھی۔ پھر بھی اس کا دل ڈر رہا تھا کہ جانے آفتاب یہ پیغام دیکھے گا بھی یا نہیں۔ وہ کسی وجہ سے نہ دیکھ پاتا تو اس کا یہاں آنا بے کار چلا جاتا پھر دوبارہ ایسا موقع نکالنا بھی مشکل تھا۔ منور اپنی ملازمہ کے ساتھ پڑھنے کے لیے چلا گیا... وہ تب بھی بہت دیر تک تذبذب کے عالم میں بیٹھی رہی۔

”کیا گل ہے کشور! وڈی چپ چپ سی ہے؟“ اس کی خاموشی کو دیکھ کر صنوبر نے اس سے دریافت کیا۔

”کچھ نہیں آیا! بس طبیعت کچھ ست ہو رہی ہے۔ تھوڑی دیر سوؤں گی تو ٹھیک ہو جاؤں گی۔“ اس نے بہانہ بنایا۔ اس بہانے کی اسے ضرورت بھی تھی تاکہ کسی طرح ان لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو سکے۔

”تو جا، جا کر تھوڑی دیر سو لے۔“ اس کی حسبِ خواہش صنوبر نے مشورہ دیا جس پر اس نے فوراً عمل کیا اور اپنی جگہ سے کھڑی ہوتے ہوئے بولی۔

”میں بچوں کے کمرے میں جا کر لیٹ جاتی ہوں۔ وہاں آپ نے بڑی اچھی سیٹنگ کروائی ہوگی ہے۔ مجھے وہاں بڑا سکون ملتا ہے۔“

”یہ تو ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اختر نے خاص طور پر شہر سے بندہ بلا کر وہ کمرہ سیٹ کروایا تھا۔ تجھے وہاں چنگا لگتا ہے تو جا... وہیں جا کر سو جا۔ بچے کون سا وہاں رہتے ہیں؟ انہیں تو اماؤں کے کچے میں ہی گھسنے سے فرصت نہیں ملتی۔“ اس کی تعریف پر خوش ہوتے ہوئے صنوبر نے اپنے شوہر کا نام لیا اور وہ بات بتائی جو اس سے قبل بھی متعدد بار بتا چکی تھی اور ساتھ ہی فراخ دلی سے اجازت بھی دے دی۔

”ابھی بچے چھوٹے ہیں نا آپا... اس لیے انہیں آپ کے پاس رہنا زیادہ اچھا لگتا ہے۔ بڑے ہوں گے تو خود اپنے کمرے کی طرف لپکیں گے۔“ کشور نے اسے تسلی دی اور خود بچوں کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کمرے کا انتخاب اس نے خود جان بوجھ کر کیا تھا کیونکہ ایک تو واقعی یہ کسی کے زیرِ استعمال نہیں رہتا تھا، دوسرے اس کمرے میں سلاؤنگ وینڈوز لگی تھیں جن کے باہر کسی قسم کی سلاخیں یا جالیاں وغیرہ نہیں تھیں اور وہ وہاں سے اتر کر باغ میں جاسکتی تھی۔ کمرے

میں پہنچ کر اس نے اندر سے لاک لگا لیا اور وقت گزرنے کا انتظار کرنے لگی۔ اس کے اندازے کے مطابق اب آفتاب کے وہاں سے رخصت ہونے میں دس منٹ ہی رہ گئے تھے۔ وہ ذرا سی کوشش کرتا تو گیٹ کی طرف جاتے ہوئے بائیں طرف مڑ کر باغ میں جاسکتا تھا۔ کشور کو یقین تھا کہ اس کا پیغام پڑھ لینے کی صورت میں وہ یہ کوشش ضرور کرے گا۔ ٹھیک دس منٹ بعد اس نے حسب پروگرام کمر اچھوڑ دیا اور نہایت احتیاط کے ساتھ کھڑکی پھلانگ کر باغ کی طرف بڑھ گئی۔ وہ جس حالت میں تھی اس میں اس طرح کی حرکت نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتی تھی لیکن بڑے خطرے میں پھنسنے سے پہلے اس نے یہ قدرے چھوٹا خطرہ مول لینا مناسب سمجھا تھا۔ خیر گزری کہ وہ آسانی سے اس مرحلے سے گزر گئی اور باغ کے اس حصے میں پہنچ گئی جہاں امرودوں کے درخت تھے۔ دو منٹ بعد ہی اسے آہٹ سنائی دی۔ وہ آہٹ پر متوجہ ہوئی تو یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ آنے والا آفتاب ہی تھا۔

”کہاں کھو گئی ہیں آپ؟ میں اس عرصے میں کتنا پریشان رہا ہوں آپ کو لفظوں میں بتا نہیں سکتا۔“ اس کے قریب پہنچ کر اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے وہ بے تابی سے بولا تو کشور کی آنکھوں میں نمی آگئی۔ یہ محبت ہی تو تھی جو اسے ہر خطرے سے بے خوف کر دیتی تھی لیکن فی الحال یہ جذباتی ہونے یا اپنی کیفیات کے اظہار کا وقت نہیں تھا۔ اسے اس مختصری مہلت میں آفتاب کو سارے حالات سے باخبر کرنا تھا چنانچہ خود کو مضبوط کرتے ہوئے بولی۔

”پچھلے دنوں مجھ پر کیا گزری اور میرا آپ سے رابطہ کس طرح ٹوٹا، یہ ساری تفصیلات میں آپ کو بعد میں بتاؤں گی۔ فی الحال میں نے آپ کو ایک بہت ضروری بات بتانے کے لیے بلایا ہے۔“

”کیا ہوا ہے کشور! خیریت تو ہے؟“ آفتاب اس کی سنجیدگی دیکھ کر پریشان ہوا۔

”پتا نہیں اسے کیا کہیں گے۔ میں جو خبر آپ کو سنانے جا رہی ہوں، عام حالات میں تو وہ کسی شادی شدہ جوڑے کے لیے بہت بڑی خوش خبری ہوتی ہے لیکن ہمارے حالات ایسے ہیں کہ ہم کھل کر اس خوشی پر خوش بھی نہیں ہو سکتے۔“

”کیسی خوش خبری؟“ اس کی بات سن کر آفتاب چونکا۔ ”میرے وجود میں آپ کی محبت کی نشانی سانس لینے لگی ہے آفتاب۔“ کشور نے جھٹکتے ہوئے اسے بتایا۔ ”واقعی؟“ اس نے رد عمل میں بے ساختہ خوشی کا اظہار کیا۔

”ہاں، یہ سچ ہے۔ میں تصدیق کروا چکی ہوں لیکن

مسئلہ یہ ہے کہ اب میں مزید حویلی میں نہیں رک سکتی۔ کسی پر اگر میرا یہ راز کھل گیا تو حویلی میں قیامت آجائے گی۔“ اس کی خوشی کو دیکھتے ہوئے کشور کا دل تو نہیں چاہتا تھا کہ اس لمحے میں اس طرح کی گفتگو کرے لیکن مجبوری یہ تھی کہ اسے ابھی یہ ساری باتیں کرنی تھیں۔ آفتاب نے اس کی بات سنی تو سوچ میں پڑ گیا پھر کچھ دیر کی سوچ بچار کے بعد اس سے پوچھنے لگا۔

”کیا آپ کسی بہانے کچھ دیر کے لیے حویلی سے باہر کہیں جاسکتی ہیں؟ کچھ نہیں تو درگاہ تک ہی سہی۔“

”ہاں، یہ تو ممکن ہے۔ میں جمعرات کے دن درگاہ پر حاضری کے بہانے کسی ملازمہ کے ساتھ وہاں پہنچ سکتی ہوں۔“ اس کا مطلب پوری طرح نہ سمجھتے ہوئے بھی کشور نے جوش سے اس کی بات کا جواب دیا۔

”بس تو پھر آپ اب آنے والی جمعرات کو عصر مغرب کے درمیان وہاں پہنچ جائیے گا۔“ وہ دھیمی آواز میں اسے اپنا منصوبہ سمجھانے لگا۔ اچانک سامنے آجانے والی اس صورت حال پر اس نے گھبرانے یا شپٹانے کے بجائے پوری بیدار مغزی کا ثبوت دیا تھا اور بہت تیزی سے آئندہ کا لائحہ عمل طے کیا تھا۔ کشور پوری توجہ سے اس کے منصوبے کی ساری جزئیات سن کر ذہن نشین کرنے لگی۔ اب اس منصوبے کی کامیابی پر ہی اس کی اور اس کے آنے والے بچے کی زندگی کا دار و مدار تھا۔

”ٹھیک ہے نا... آپ میری ساری بات اچھی طرح سمجھ تو گئی ہیں نا؟“ اسے سب کچھ سمجھانے کے بعد آفتاب نے اس سے سوال کیا جس کے جواب میں کشور نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”بس تو پھر اب میں چلتا ہوں۔ میرا زیادہ دیر یہاں ٹھہرنا اور آپ کا منظر سے غائب رہنا کوئی مشکل بھی کھڑی کر سکتا ہے۔“ آفتاب نے اس سے کہا اور جاتے جاتے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لے کر اپنے ہونٹوں کے نزدیک لے گیا۔ بس یہی وقت کا وہ مختصر لمحہ تھا جو وہ دونوں اپنے ارد گرد سے بے خبر ہو گئے اور انہیں اپنے اس گوشہ تنہائی میں کسی کے آنے کی آہٹ سنائی نہیں دے سکی۔

”خبردار!“ ایک نہایت رعب دار آواز قریب سے ابھری تو وہ دونوں بڑی طرح بدک کر مدہوشی کی کیفیت سے نکلنے ہوئے اس سمت متوجہ ہو گئے جہاں سے آواز آئی تھی۔

حادثات و سانحات کی شکار... پناہ کی تلاش میں سرگرداں
ماہ بانو کی داستان حیات کے واقعات اگلے ماہ پڑھیے



چودھویں قسط

اسماقادی

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور بااثر سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں۔ مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں، بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے..... یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے..... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے۔ پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو۔ محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہو جاتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے۔ زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں..... کبھی بازی ہلٹ بھی جاتی ہے۔ بیٹا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے..... اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے۔ جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چال بازی یا مقدر کا کھیل..... ملنے اور ٹپھڑ جانے والوں کی کہانی

بارسوخ خاندان سے تعلق رکھنے والا شہر یار عادل ایک پُر جوش جوان ہے جس کی بطور اسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیر نگیں ضلع کے سب سے بڑے گاؤں پیر آباد کا چودھری افتخار عالم شاہ ایک رواجی جاگیردار ہے جو شہر یار کو اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا اور دونوں کے درمیان خاصیت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ چودھری عالم و جاہر اور عیاش تھا۔ وہ سرکاری افسروں کی ملی بھگت سے لکڑی اور کھالوں کی اسمگلنگ کر رہا تھا۔ شہر یار نہ صرف یہ دھندے روک دیتا ہے بلکہ علاقے میں اسکول وغیرہ قائم کرنے کی کوششیں شروع کر دیتا ہے۔ پیر آباد کا رہائشی ماسٹر آفتاب جو عرصے سے گاؤں کے پرائمری اسکول کی ترقی کا خواہش مند شہر یار کا سہارا بنا کر کھل کر اپنے مشن پر کام کرنے لگا۔۔۔۔۔ آفتاب بھی چودھری کے ناپسندیدہ افراد میں سے ایک ہے جسے اسکول چلانے کے جرم میں چودھری اپنے آدمیوں کے ذریعے زد و کوب کرتا ہے لیکن آفتاب ہتھیار نہیں ڈالتا۔ چودھری کی نفاست پسند بیٹی کشور، آفتاب کو دیکھتی ہے تو اس کی محبت میں جھلا ہو جاتی ہے۔ اس کی محبت کی شدت کو دیکھتے ہوئے آفتاب کو اسے اپنے دل میں جگہ دینی پڑتی ہے اور دونوں کے درمیان ہونے والی چوری چھپے کی ملاقاتیں خفیہ نکاح تک جا پہنچتی ہیں۔ ماہ بانو کا تعلق بھی پیر آباد سے ہے۔ اس کے والدین بچپن میں ہی اسے اس کے خالہ خالو کو گود دے دیتے ہیں جن کے ساتھ وہ فیصل آباد میں رہتی تھی لیکن والدین اور بھائی بہنوں سے ملاقات کے لیے اس کا پیر آباد آنا جانا رہتا تھا۔ چودھری افتخار پیری مریدی کے چکر میں اپنے مرحوم دادا کا عرس بڑی شان و شوکت سے مناتا ہے۔ عرس کے دنوں میں جبراً حوٹلی کے کاموں کے لیے بلوائی جانے والی ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آ جاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چودھری کے چنگل سے نکل کر بھاگ جانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اگلی بار اس کا اپنی بہن کی شادی میں دوبارہ پیر آباد آنا ہوتا ہے۔ چودھری اسے اغوا کر لیتا ہے لیکن ماہ بانو ایک بار پھر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ چودھری افتخار ہر صورت اس سے شادی کرنا چاہتا ہے مگر ماہ بانو شادی سے قبل ہی اپنی بہن زہرہ کے تعاون سے گھر سے بھاگ نکلتی ہے اور شہر یار سے جا ملتی ہے۔ شہر یار اسے اپنی گاڑی میں چھپا کر پیر آباد سے نکال دیتا ہے اور دارالامان بھجوا دیتا ہے لیکن چودھری کے آدمی وہاں بھی پہنچ جاتے ہیں لیکن دارالامان کے چوکیدار کی مداخلت کی وجہ سے وہ ماہ بانو کو لے جانے میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔ شہر یار ماہ بانو کو دارالامان سے چودھری کے سابق دوست موتی والا کی کوشی پر بھجوا دیتا ہے۔ موتی والا جو لکڑی کی اسمگلنگ میں چودھری کا دست راست تھا، اپنے اکلوتے بیٹے کی موت کے بعد چودھری کا ساتھ چھوڑ کر شہر یار سے مل جاتا ہے۔ چودھری غداری کرنے کے جرم میں موتی والا اور اس کی بیوی کو مروادیتا ہے۔ کوشی کی انیسویں میں مقیم ماہ بانو موتی والا کے ڈرائیور سردار کے مدد سے فرار ہو کر اس کے ایک دوست عامر کے گھر پہنچ جاتی ہے۔ عامر کے گھر ایک ایسی لڑکی کا آنا جانا ہوتا ہے جو درحقیقت تیسری صنف سے تعلق رکھتی ہے۔ خواجہ سراؤں کا ایک گروہ اس لڑکی کے پیچھے پڑ جاتا ہے اور لڑکی کو بچانے کے چکر میں ماہ بانو خود اس گروہ کے ہاتھ لگ جاتی ہے۔ خواجہ سراؤں کا گروہ الماس بہ طور سزا اس سے وہی کام لیتا ہے جو اس کے گھر سے کرتے ہیں۔ ایک روز الماس اسے لے کر ایک ہندو سیٹھ کی کوشی پہنچتا ہے۔ راستے میں ٹیکسی والے کی بدتمیزی کی وجہ سے ماہ بانو زخمی ہو جاتی ہے۔ کوشی میں اسے ایک حیرت انگیز منظر دیکھنے کو ملتا ہے۔ کوشی کے تہ خانے میں کئی خواجہ سرا جمع ہوتے ہیں جن کی موجودگی میں ان کا مہار گرو ایک نوجوان لڑکی کو ایک مورتی کے قدموں میں بیٹھ چڑھا دیتا ہے۔ وہ گروہ الماس کے ساتھ واپس ٹھکانے پر آتی ہے اور وہاں ایک نیک فطرت خواجہ سرا نگار کو اس راز میں شریک کر لیتی ہے۔ انہی دنوں گروہ الماس ایک شادی پر بھیجتا ہے۔ وہاں ماہ بانو کو پتا چلتا ہے کہ لہن نیلم وہ لڑکی ہے جسے موتی والا کا ڈرائیور سردار پسند کرتا ہے اور لڑکی کی سوتیلی ماں اس کی زبردستی ایک بوڑھے سے شادی کروانے پر رضامندی دے رہی ہے۔ وہ نیلم کو اپنے کپڑے پہنا کر نگار کے ساتھ وہاں سے نکال دیتی ہے۔ صبح شادی والے گھر پر چھاپا پڑتا ہے اور ماہ بانو عزت کے ساتھ تھانے لے جایا جاتا ہے جہاں شہر یار کے ماموں زاد بھائی ڈی آئی جی سجاد رانا سے اس کی ملاقات ہوتی ہے۔ سجاد رانا کو اپنی بیٹی شینا کی تلاش ہوتی ہے جسے خواجہ سراؤں کے ایک گروہ نے اغوا کر لیا تھا۔ چنانچہ جب اسے یہ اطلاع ملتی ہے کہ خواجہ سراؤں کے ایک گروہ میں ایک لڑکی دیکھی گئی ہے تو وہ اسے اپنی بیٹی سمجھ کر بازیافت کروانے کی کوشش کرتا ہے اور نتیجے میں ماہ بانو آزاد ہو جاتی ہے۔ ماہ بانو کو وہ اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاتا ہے جہاں شہر یار بھی موجود ہوتا ہے۔ وہیں وہ شینا کی تصویر دیکھتی ہے اور شہر یار کو بتاتی ہے کہ اس لڑکی کو ہندو سیٹھ کی کوشی میں ایک دیوی کے قدموں میں بیٹھ چڑھایا جا چکا ہے۔ ہندو سیٹھ کی کوشی پر چھاپا مارا جاتا ہے لیکن وہاں سے سیٹھ اور شینا کو اغوا کرنے والے خواجہ سراؤں کی لاشوں کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ سجاد رانا کو اپنی بیٹی کے قاتلوں کی تلاش تھی اور یہ تلاش اس کی را کے ایجنٹوں سے ڈیجیٹل کرادیتی ہے جس کا حتمی نتیجہ اس کے قتل کی صورت میں نکلتا ہے۔ چودھری ماہ بانو کی سجاد رانا کے گھر موجودگی کی بجائے پیر آباد سے وہاں سے اغوا کروانے کی کوشش کرتا ہے لیکن یہ کوشش ناکام ہو جاتی ہے اور شہر یار اپنے ڈرائیور مشاہد خان کے مشورے پر ماہ بانو کو کاندے منتقل کر دیتا ہے۔ کاندے سے ماہ بانو مشاہد خان کے بھائی اکرم خان اور ماں کے ساتھ ہونے والی شادی میں شرکت کے لیے جاتی ہے اور وہاں کی سیٹنگ سائٹ پر ایک گورے کی ہوس کا نشانہ بننے سے بچ جاتی ہے لیکن وہ ماہ بانو کو اغوا کرتا ہے اور اس کا رروائی میں اکرم خان مارا جاتا ہے۔ گورہ جس کا نام ڈیوڈ ہے اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ ماہ بانو کے بارے میں ساری معلومات حاصل کر لیتا ہے اور یہ جاننے کے بعد کہ چودھری ماہ بانو کی تلاش میں ہے، ایک منصوبہ تشکیل دیتا ہے۔ پیر آباد سے متصل جنگل کو اس کے مخصوص ماحول کی وجہ سے پوسٹ کی کاشت کے لیے استعمال کرنا اس کے منصوبوں میں سے ایک ہے جس کے لیے وہ ماہ بانو کا لالچ دے کر چودھری کو اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ چودھری کے ظلم و جبر کی ایک نشانی فریدہ ہے۔ وہ نور پور گاؤں کے چودھری مختار کی بہن ہے۔ چودھری مختار کو افتخار عالم شاہ اس کی روشن خیالی اور اپنی غلامی نہ کرنے کی وجہ سے پسند نہیں کرتا تھا۔ فریدہ اپنے بھائی کے مخالفوں میں ایک نوجوان قربان کی محبت کے جال میں پھنس جاتی ہے اور اس کے ساتھ بھاگ کر پیر آباد چودھری کی پناہ میں آ جاتی ہے۔ وہاں اسے پناہ کے بجائے چودھری کی ہوس کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چودھری اسے اپنے ذہنی معذور بیٹے کی دہن بنا کر حوٹلی لے آتا ہے۔ یہ شادی ایک ڈھونگ تھی جس کی آڑ لے کر چودھری مسلسل رشتوں کا تقدس پامال کر دیتا ہے۔ شہر یار اور چودھری کے درمیان خاصیت اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ چودھری ڈاکٹر ماریانا کی ایک لڑکی کے ساتھ اس کی قابل اعتراض تصویریں اتار کر اسے بلیک میل کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن ڈاکٹر ماریا کے تعاون کی وجہ سے شہر یار وہ تصویریں حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور چودھری کی چال سے بچ نکلتا ہے۔

”آپ میرا ہوم ورک کروائیں گی نا خالہ؟“ کشور ابھی جانے والے کے قدموں کے نشانوں میں ہی محو تھی کہ منور نے اس کا ہاتھ ہلاتے ہوئے پوچھا۔ وہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”بالکل کرواؤں گی۔ مگر ایک شرط پر۔“

”وہ کیا؟“ منور نے تجسس سے پوچھا۔

”آپ کسی کے سامنے ذکر نہیں کرو گے کہ آپ نے مجھے اور ماسٹر صاحب کو یہاں دیکھا تھا۔“

”نہیں کروں گا لیکن پہلے آپ یہ بتائیں کہ آپ دونوں

یہاں کیا کر رہے تھے؟“ منور نے اس کی بات ماننے کی تو ہامی

بھری لیکن فطری تجسس کے باعث سوال کیے بغیر نہیں رہ سکا۔

”یہ بات میں تمہیں اندر چل کر بتاؤں گی۔“ کشور

نے گزرتے وقت کا احساس کرتے ہوئے اس سے کہا اور پھر

اس کی انگلی تھام کر واپسی کے راستے پر چل پڑی۔

”ہم یہاں سے اندر جائیں گے؟“ وہ واپس بچوں

کے کمرے کی کھلی سلانڈنگ ونڈو کے پاس آ کر کھڑی تو منور

نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں، یہاں سے اندر جانے میں بہت مزہ آئے

گا۔“ کشور نے اسے جواب دیا اور پہلے اسے سہارا دے کر

کھڑکی پر چڑھنے میں مدد دی، اس کے بعد خود بھی کھلی کھڑکی

سے گزر کر اندر پہنچ گئی۔

”کیوں آیا مزہ؟“ اندر پہنچ کر اس نے منور سے پوچھا۔

”بہت مزہ آیا۔“ وہ بچہ تھا اور اسے زندگی میں ہونے

والا ہر نیا تجربہ انوکھا اور خوش کن ہی لگ سکتا تھا۔ چنانچہ اس

وقت یوں کھڑکی پھلانگ کر اندر پہنچنے پر ہی خوش ہو گیا۔

”بس اسی لیے میں یہاں سے چھلانگ لگا کر باغ میں

گھومنے کے لیے گئی تھی۔ مجھے بھی ایسے کھڑکی سے آنے جانے

میں بڑا مزہ آتا ہے۔“ وہ منور کا ذہن اپنی اور آفتاب کی ملاقات

کی طرف سے صاف کرنے کے لیے اقدامات کر رہی تھی۔

”اور ماسٹر صاحب کس لیے باغ میں گئے تھے؟“

خالہ کی طرف سے کچھ مطمئن ہونے پر اس نے اپنے استاد

کے بارے میں سوال کیا۔

”ان کا امرود کھانے کا دل چاہ رہا تھا اس لیے وہ

وہاں گئے تھے۔“ کشور نے اسے بہلایا۔

”تو وہ مجھ سے کہہ دیتے۔ میں مالی سے بہت سارے

امرو تڑوا کر انہیں دے دیتا۔“

”لیکن ان کا تو خود سے امرود توڑ کر کھانے کا دل چاہ

رہا تھا۔ جیسے کھڑکی پھلانگ کر کمرے میں آنے جانے میں

اپنی پشت پر سے سنائی دینے والی بارعب آواز پر وہ دونوں بدگ کر بولنے والے کی طرف متوجہ ہوئے اور دونوں کے سینے سے ہی بے اختیار ایک اطمینان بھرا سانس خارج ہوا۔ وہ منور شاہ تھا جو اپنے ننھے ہاتھوں میں ایک کھلونا کلاشکوف اٹھائے ان کے پیچھے کھڑا تھا۔ اس کی کلاشکوف کا رخ ان دونوں کی طرف تھا۔ ”میں نے آپ دونوں کو ڈرا دیا۔ اتنے بڑے ہو کر بھی آپ دونوں اتنے بزدل ہیں۔“ منور شاہ جس کی کھلونا کلاشکوف کا رخ ان دونوں ہی کی جانب تھا، اس طرح انہیں ڈرا دینے کے اپنے کارنامے پر کھلکھلا کر ہنس رہا تھا۔

”بہت شریر ہو گئے ہو تم شیطان!“ کشور نے اس کے

قریب جا کر اس کا کان پکڑتے ہوئے کہا۔ ویسے وہ اور

آفتاب دونوں ہی اپنی اپنی جگہ جھپینے ہوئے تھے کہ وہ ایک بچے

سے ڈر گئے۔ اصل میں کچھ تو خوف ان کے اپنے اندر تھا اور

کچھ منور آواز بھی بھاری بنا کر بالکل کسی بڑے آدمی کی طرح

بولتا تھا، اس لیے لمحہ بھر کے لیے وہ دونوں ہی سن پڑ گئے تھے۔

”آپ دونوں یہاں کیا کر رہے تھے؟“ منور نے اپنا

کان کشور کی گرفت سے چھڑوانے کی کوشش کرتے ہوئے

پوچھا۔ اس کے سوال نے انہیں احساس دلایا کہ منور کا یہاں

آنا اور ان دونوں کو ساتھ دیکھ لینا اتنا بھی بے ضرر نہیں ہے۔

لے شک وہ بچہ تھا اور ان کے درمیان موجود تعلق کو نہیں سمجھ سکتا

تھا لیکن اپنی نادانی اور معصومیت میں وہ کسی کے سامنے اس

بات کا تذکرہ تو کر سکتا تھا۔

”آپ جائیں آفتاب! میں اسے سنبھال لوں گی۔“

گزرتے وقت کا احساس کرتے ہوئے کشور نے آفتاب کو

پہلے وہاں سے رخصت کر دینا مناسب سمجھا۔ زیادہ تاخیر

گیٹ پر موجود چوکیدار کی نظر میں آ سکتی تھی۔ اس کا مقصد

سمجھتے ہوئے آفتاب نے بھی فوری طور پر وہاں سے رخصت

ہو جانا مناسب سمجھا اور ننھے منور سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

”او کے ماسٹر! میں چلتا ہوں۔ تم اپنا ہوم ورک اچھی

طرح کر لینا۔“

”یس سر! میں کر لوں گا بلکہ خالہ سے کہوں گا کہ یہ میرا

ہوم ورک کروادیں۔“ منور نے جواب دیا۔ اس تھوڑے سے

عرصے میں وہ آفتاب سے کافی مانوس ہو گیا تھا اور اس کے

ساتھ بڑے طریقے سلیقے سے بات چیت کرتا تھا۔ اصل میں

ابھی وہ تھا بھی اتنا کم عمر کہ مزاج میں حاکمانہ خوبو پیدا نہیں

ہوئی تھی۔ آفتاب نے اس کے معصومانہ انداز پر پیار سے اس

کا رخسار تھپتھپایا اور مسکراتا ہوا وہاں سے رخصت ہو گیا۔

بہت مزہ آتا ہے، ایسے ہی خود اپنے ہاتھ سے امرود توڑ کر کھانے میں بھی بڑا مزہ آتا ہے۔“ کشور نے اسے سمجھایا۔

”اچھا تو یہ بات تھی... ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا۔“ منور شاہ یوں سر کو ہلا کر بولا جیسے کوئی بہت بڑی کتھی سلجھ گئی ہو۔

”اب آپ کسی کے سامنے اس بات کا ذکر نہیں کرنا ورنہ پایا ماسٹر صاحب سے ناراض ہو جائیں گے اور ان کا یہاں آنا بند کروادیں گے۔ ماسٹر صاحب نہیں آئیں گے تو آپ کو پڑھائے گا کون؟“ وہ واقف تھی کہ منور، آفتاب کو اچھا خاصا پسند کرتا ہے اس لیے اس کی کمزوری کو پکڑتے ہوئے اسے زبان بندی کے لیے پابند رکھنے کی کوشش کی۔

”میں نے کہہ دیا ہے تاکہ میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ اب آپ جلدی سے میرا ہوم ورک کروادیں۔ ورنہ ثانی جان آپ کو واپس بڑی حویلی لے جائیں گی۔“ منور نے اسے یقین دہانی کروائی اور اپنے مسئلے کی طرف متوجہ کروایا۔

”ٹھیک ہے۔ جاؤ، آپ اپنا بیگ لے کر آؤ۔ میں آپ کا ہوم ورک کروادیتی ہوں۔“ کشور نے اس کی معصومانہ ادھر اس کا رخسار چومتے ہوئے اس سے کہا تو وہ دروازہ کھول کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ کشور اس کے باہر نکلتے ہی بے دم سی ہو کر ایک فلور کشن پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ ایک ننھے سے بچے کی مداخلت کی وجہ سے صورت حال کافی گمبیر ہو گئی تھی۔ اپنے طور پر تو اس نے پکا انتظام کر دیا تھا کہ منور شاہ کسی کے سامنے زبان نہ کھولے لیکن ایک معصوم بچے پر کتنا بھروسہ کیا جاسکتا تھا۔ اپنی معصومیت میں وہ غیر ارادتا ہی کسی کے سامنے یہ سارا واقعہ دہرا دیتا تو بڑی مشکل ہو جاتی۔

☆☆☆

ناشتا کرتے ہوئے ماہ بانو کا ذہن رات عمران سے ہونے والی گفتگو میں الجھا ہوا تھا۔ عمران کی داستانِ حیات واقعی بڑی پرورد تھی۔ ایک امیر زادے کی ہوس نے ہتے بستے گھر کو اجاڑ ڈالا تھا۔ وہ گھر جو عمران کی ماں نے اپنی شبانہ روز محنت سے تنکا تنکا جمع کر کے بنایا تھا، صرف اس لیے بکھر گیا تھا کہ عمران کی نادان بہن اس امیر زادے کی محبت کے جال میں پھنس گئی تھی۔ امیر زادے نے جال میں پھنسی اس چڑیا کی بے بسی سے خوب لطف اٹھایا اور اس بات کی پروا نہ کی کہ اس کی یہ حرکت ایک عزت دار سفید پوش گھرانے کے لیے کیسی مصیبت لے آئے گی۔ ماہ بانو کو اپنی اور عمران کی زندگی میں کافی مماثلت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بھی ہوس پرست و دولت کے پجاری چودھری افتخار عالم شاہ کی وجہ سے در بدر تھی۔ چودھری نے اس کی وجہ سے اس کے پورے خاندان کو برباد

کر دیا تھا۔ نہ تو فیصل آباد میں موجود اس کا وہ چھوٹا سا گھر باقی رہا تھا جہاں وہ بے بے اور بابا کی محبت کی چھاؤں میں رہا کرتی تھی اور نہ ہی پیر آباد کا وہ کچا مکان جہاں اس کے سگے ماں باپ، بھائی بہن رہتے تھے۔ وہ کبھی بھی چھٹیوں میں گاؤں جاتی تھی تو اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ کچھ وقت گزار آتی تھی۔ اماں بابا سے بے شک اسے یہ شکوہ تھا کہ انہوں نے اسے بیٹی ہونے کی وجہ سے بوجھ جان کر پیدا ہوتے ہی دوسروں کو تھما دیا تھا لیکن بہر حال وہ اپنے دل سے ان کی فطری محبت نہیں نکال سکی تھی۔ چنانچہ جہاں اسے اپنے پرورش کرنے والے بے بے اور بابا کی ناگہانی موت رلاتی تھی، وہیں اپنا پیر آباد والا گھر اجڑ جانے کا غم بھی بے چین رکھتا تھا۔ وہ بالکل عمران کی طرح ہی خانماں برباد تھی۔ ان دونوں میں فرق تھا تو اتنا کہ ایک تو وہ عمران کی بہن فری کی طرح کسی کی ہوس کی بھیٹ چڑھنے سے بچ گئی تھی، دوسرے وہ عمران کی طرح انتقام کی راہ پر نہیں چلی تھی۔ عمران نے اپنا گھر اجاڑنے والے سے اس کی زندگی چھین لی تھی جبکہ وہ ابھی تک اپنی بقا کی جدوجہد میں مصروف تھی۔ اس جدوجہد کے دوران اسے کبھی انتقام کا خیال آیا ہی نہیں تھا۔ وہ بس بھاگتی پھر رہی تھی کہ کسی طرح وہ گوشہ عافیت میسر آجائے جہاں وہ چودھری کی دسترس سے محفوظ رہ سکے۔ اس خواہش نے اسے اس برف زار میں لاپھینکا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ وہ ایک گرداب سے نکلے بغیر ہی دوسرے گرداب میں پھنس گئی ہے... جس سے باہر نکلنے کا اسے کل تک کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا لیکن گوشہ رات عمران نے اسے اس دلائی تھی کہ وہ اسے یہاں سے نکال کر لے جائے گا۔ اس آس نے اس کے مایوسی میں گھر جانے والے دل میں ایک بار پھر امید کی شمع روشن کر دی تھی۔ وہ جو دکھ اور مایوسی کے باعث کھانا پینا تک ترک کر چکی تھی، ایک بار پھر جی اٹھی تھی اور اس وقت اپنے سامنے رکھنا ناشتا کافی رغبت سے کر رہی تھی۔

پوری طرح باخبر نہ ہونے کے باوجود اسے اتنا اندازہ بہر حال تھا کہ یہاں سے فرار کا سفر بہت دشوار ثابت ہوگا اور اس دشواری کا مقابلہ کرنے کے لیے جسم میں توانائی کا ہونا ضروری تھا۔ اس توانائی کے حصول کی خاطر ہی اس نے پیٹ بھر کر ناشتا کیا۔ ناشتے کے بعد اس کا وقت حسب معمول تنہائی کے اذیت ناک لمحے شمار کرتے ہوئے گزرنے لگا۔ لیکن آج آزادی کی امید نے اس اذیت کو کافی کم کر دیا تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ قید جو نہ ختم ہوتی ہوئی نظر آتی تھی، اب اس سے نجات ملنے والی ہے۔ اس امید کے ساتھ ہی وقت

دھیرے دھیرے آگے بڑھتا رہا اور صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شام ہو گئی۔ شام کے سائے جب گہرے ہو کر رات کی تاریکی میں ڈھلنے لگے تو اسے تشویش محسوس ہونے لگی۔ پورے دن میں عمران نے اس سے ایک بار بھی رابطے کی کوشش نہیں کی تھی اور نہ ہی اسے ماحول میں کوئی ایسی تبدیلی نظر آئی تھی جس سے یہ احساس ہو پاتا کہ وہاں کوئی غیر معمولی صورت حال ہے۔ اسی فکر میں مبتلا وہ اپنے مخصوص انداز میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی کہ قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس آہٹ کو سن کر بھی اس کے اندر کوئی تحریک پیدا نہیں ہوئی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ یہ رات کے کھانے کا وقت ہے اور کوئی نہ کوئی اس کے لیے کھانا لے کر آیا ہوگا۔

”ماہ بانو!“ آنے والے نے جب اسے اپنی طرف متوجہ نہ ہوتے دیکھا تو کھانے کے برتن اس کے قریب رکھتے ہوئے دھیمی آواز میں پکارا۔ وہ آواز شناخت کر کے فوراً ہی متوجہ ہوئی۔ وہ عمران ہی تھا جو اس کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا تھا۔

”اچھی طرح پیٹ بھر کر کھانا کھا لو اور کچھ دیر آرام کر لو۔ چند گھنٹے بعد ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔“ سرگوشی کے انداز میں اسے یہ نوید سنا کر وہ ایک پل بھی مزید ٹھہرے بغیر تیزی سے واپس پلٹ گیا لیکن تشویش کا شکار ماہ بانو کے لیے اتنا ہی بہت تھا۔ اس اطلاع نے کہ چند گھنٹوں بعد وہ اس قید خانے سے نکل سکے گی، اس کے اندر ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ ملنے والی آزادی کی امید نے اسے اتنا پُر جوش کر دیا کہ اس نے اس قید خانے میں پہلی بار بے حد رغبت سے کھانا کھایا۔ آج کھانا تھا بھی کافی پر تکلف۔ مرغی کے شوربے والے سالن کے ساتھ ساتھ ٹیونس کے تیلے ہوئے قیلے بھی کھانے میں شامل کیے گئے تھے۔ ایک پیالے میں بھاپ اڑاتا کارن سوپ بھی تھا... یعنی پورا دعوت کا اہتمام تھا۔ اس نے جی بھر کر یہ غذائیت بخش کھانا کھایا اور حسب معمول اس مختصر سی جگہ میں ٹہلنے لگی۔ بیٹھے بیٹھے کھانا ہضم ہونا مشکل ہوتا ہے اس لیے اس نے قید کے دنوں میں یہ معمول بنالیا تھا کہ کھانا کھا کر تھوڑی دیر ٹہکتی ضرور تھی۔ حالانکہ ٹہلنے کے لیے وہ جگہ بے حد محدود تھی۔ آج بھی اس نے دس منٹ تک چہل قدمی کی اور پھر عمران کی حسب ہدایت آرام کی غرض سے لیٹ گئی۔ بہت دنوں بعد پیٹ بھر کر کھانا کھایا تھا اور ذہن بھی کافی پرسکون تھا، چنانچہ لیٹتے ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔

اسے اندازہ نہیں ہوا کہ وہ کتنی دیر سوئی ہے لیکن ماحول میں کوئی غیر معمولی تبدیلی آئی تھی جس نے اسے نیند سے جگا

دیا۔ وہ لمحہ بھر تو خالی الذہنی کی کیفیت میں اچانک اپنی آنکھ کھلنے کی وجہ سمجھنے کی کوشش کرتی رہی پھر اس کی قوت سماعت نے احساس دلایا کہ وہ ماحول میں پیدا ہونے والے غیر معمولی شور کی وجہ سے جاگی ہے۔ اس جگہ جہاں کوئی مشکل سے ہی بولتا تھا اور وہ انسانی آواز سننے کے لیے ترس جاتی تھی، یہ شور بڑا عجیب محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے کان لگا کر آوازوں کو سمجھنے کی کوشش کی۔ سماعت پر ذرا سا زور دینے پر اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ لوگ اپنی بھونڈی آوازوں میں گانے کے ساتھ ساتھ بلند و بالا قہقہے لگا رہے ہیں۔ یوں لگتا تھا کہ وہاں کوئی جشن منایا جا رہا ہو۔ اس کے اندر جشن کی نوعیت جاننے کے لیے تجسس جاگ اٹھا اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر دبے قدموں سے باہر کی طرف بڑھی۔ اسے کھانا پہنچانے چونکہ عمران خود آیا تھا، اس لیے قید خانے کا راستہ کھلا ہوا تھا۔ وہ بے حد احتیاط سے چلتی آوازوں کی جانب بڑھتی چلی گئی۔ حسب معمول غار کے کشادہ حصے میں وہ سب جمع تھے اور محفل بھی ہوئی تھی۔ اس نے دیکھا کہ ان بے ہنگم حلیوں والے لوگوں میں سے بیشتر دیواروں کے ساتھ لگ کر کچھ اس طرح بیٹھے ہوئے تھے کہ دائرہ سا بن گیا تھا اور اس دائرے میں پانچ چھ افراد رقص کے انداز میں جھوم رہے تھے۔ ناچنے والوں میں اور بیٹھے ہوئے دونوں افراد میں یہ قدر مشترک تھی کہ وہ بلند آواز سے گانے کے ساتھ ساتھ ہاتھوں میں جام بھی تھامے ہوئے تھے۔ جام پر جام لٹکھاتے وہ جس مستی کی کیفیت میں تھے، اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اس محفل میں ام النجاشہ گردش میں ہے جس کے زیر اثر وہ وحشی مرد جھوم رہے ہیں۔

ماہ بانو کے دیکھتے ہی دیکھتے رقص کرنے والوں میں سے ایک نے ایک جانب بیٹھے عمران کو ہاتھ تھام کر کھڑا کیا اور پھر اپنے کاندھوں پر بٹھا کر ناچنے لگا۔ اس کی اس حرکت سے محفل میں مزید گرمی آگئی اور بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے بھی مزید کچھ افراد کھڑے ہو کر ناچنے والوں میں شامل ہو گئے۔ عمران کو کاندھ سے پر بٹھانے والا درمیان میں رقص کر رہا تھا جبکہ باقی سب اس کے ارد گرد ناچتے ہوئے بار بار عمران کے جسم کو چھگی دیتے تھے۔ ان سب کے رویوں سے ایسا لگ رہا تھا جیسے عمران کوئی دلہا ہو جس کی برات روانہ ہونے کو ہو... اور بے تکلف دوست اپنے یار کی شادی کا جشن منا رہے ہوں۔ کافی دیر تک یہ بڑا ہڑی جاری رہی پھر یک دم ان میں سے ایک شخص اٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ کے اشارے سے ناچنے گانے والوں کو خاموشی اختیار کرنے کی ہدایت کرتے ہوئے

بلند آواز میں بولا۔ ”دوستو! تھوڑا صبر کرو اور آرام سے بیٹھ جاؤ۔ بھائی صاحب آپ لوگوں سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔“ اس شخص کے یہ اعلان کرتے ہی وہاں ایسی خاموشی چھا گئی جیسے وہاں کوئی ذی نفس موجود ہی نہ ہو۔ اس خاموشی کے چھا جانے کے بعد ایک دراز قد شخص اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔ ماہ بانو نے اس شخص کو پہچان لیا۔

بھائی صاحب کہلانے والے اس آدمی کو اس سے قبل وہ اس وقت بھی دیکھ چکی تھی جب پروجیکٹر پر عمران کی بہن کی عزت برباد کرنے والے جوان کے ذبح کیے جانے کا منظر دکھایا جا رہا تھا۔ بھائی صاحب کہہ کر پکارا جانے والا وہ آدمی جو وہاں ان لوگوں کا کمانڈر تھا، کھڑے ہونے کے بعد اپنا گلا

کھنکھارتے ہوئے بولا۔ ”ساتھیو... میرے بہادر مجاہدوں! آپ سب جانتے ہیں کہ ہم ایک بڑے مقصد کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے ہم نے اپنی جانیں تک قربان کرنے کا عہد کر رکھا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ جس نیک مقصد کے لیے ہم جدوجہد کر رہے ہیں، اس کے لیے اگر ہماری جان بھی چلی جائے تو یہ سودا مہنگا نہیں۔ اس قربانی کے بدلے میں پروردگار ہمیں اپنی جنتوں میں ہمیشہ کی زندگی بخشے گا۔ میری دعا ہے کہ پروردگار ہم میں سے ہر ایک کو یہ اعزاز نصیب کرے۔ فی الحال میں یہ بتاتے ہوئے بے حد خوش محسوس کر رہا ہوں کہ ہمارے درمیان سب سے کم وقت گزارنے والے اور ہم میں سے سب سے کم عمر عمران کے نصیب میں یہ خوش قسمتی لکھی گئی ہے کہ وہ ہم سب سے پہلے شہادت کی راہ پر چلنے کے لیے چن لیا گیا ہے۔ آج کا یہ جشن ہم عمران کے اعزاز میں ہی منا رہے ہیں۔ شہید بھی مرتا نہیں بلکہ اسے ہمیشہ کی زندگی مل جاتی ہے۔ اس لیے راہ شہادت پر جانے والے کے لیے رونے اور اداس ہونے کے بجائے اسے بہت خوش دلی سے رخصت کرنا چاہیے۔ آپ سب آج رات دل کھول کر کھائیں پیئیں، ناچیں گائیں۔ آج آپ پر کوئی پابندی نہیں ہے۔“ کمانڈر کے اس اعلان نے وہاں خوشی کی لہر دوڑادی۔ ان میں سے کسی نے بھی یہ سوچے بغیر کہ ایک جیتے جاگتے، ہنستے کھیلتے جوان کو حرام موت کی طرف دھکیلا جا رہا ہے، تالیاں پیننا شروع کر دیں۔ تالیوں کی گونج بھی تو کمانڈر نے عمران کو اپنے قریب بلایا اور اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا۔

”کیوں عمران! ڈر تو نہیں لگ رہا؟“

”نہیں بھائی صاحب! ڈرنے کا کیا سوال۔ میں تو

آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس کام کے لیے چنا۔“ عمران نے مسکراتے ہوئے کمانڈر کی بات کا جواب دیا۔ ”شاباش میرے شیر! مجھے تم سے اسی بہادرانہ جواب کی امید تھی۔“ کمانڈر نے اس کے جواب پر خوش ہو کر ایک بار پھر اس کی پیٹھ پر زور دار چھگی دی اور بلند آواز میں بولا۔ ”میری طرف سے ایک جام عمران کی اس بہادری کے نام۔“ فوراً ہی کمانڈر کے اعزاز میں سکوت اختیار کرنے والے حرکت میں آگئے اور محفل میں ایک بار پھر جام گردش کرنے لگے۔

ماہ بانو پھٹی آنکھوں سے یہ سارا تماشا دیکھتی رہ گئی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کس قسم کے مجاہد ہیں جو شراب کے رسیا ہیں اور گانے بجانے سے دل بہلاتے ہیں۔ اپنی اس کیفیت میں اسے احساس بھی نہیں ہو سکا کہ وہ پوری طرح سے اوٹ میں نہیں رہی ہے اور اس پر کسی کی نظر پڑ سکتی ہے۔ خوش قسمتی سے اس پر نظر پڑی بھی تو عمران کی ہی۔ اسے دیکھتے ہی اس نے اسے اشارہ کیا کہ واپس پلٹ جاؤ۔ وہ خود بھی اسی کی طرف متوجہ تھی چنانچہ اس خفیف اشارے کو دیکھ لیا اور جس خاموشی سے وہاں تک آئی تھی، اسی خاموشی سے واپس پلٹ گئی۔ واپس اپنی جگہ پر پہنچ کر اس کے پاس انتظار کرنے کے سوا کوئی دوسرا کام نہیں تھا اور اب انتظار کی یہ گھڑیاں بہت کٹھن لگ رہی تھیں۔ دل کے اندر یہی خواہش اٹھ رہی تھی کہ کسی طرح جلد از جلد یہاں سے نکلا جائے لیکن ادھر سے سنائی دیتے شور کون کریوں لگ رہا تھا کہ رات بھر یہ محفل بھی رہے گی۔ آخر اللہ اللہ کر کے انتظار کی یہ گھڑیاں گزریں۔ پہلے آہستہ آہستہ باہر سے سنائی دیتی گانے بجانے کی آوازیں معدوم ہونا شروع ہوئیں اور پھر یوں لگا جیسے سارے ماحول پر ایک سکوت سا طاری ہو گیا ہو۔ اس سکوت میں وہ قدیموں کی تیز آہٹ سن کر تیزی سے کھڑی ہوئی۔ حسب توقع اس طرف آنے والا عمران ہی تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں کچھ سامان اٹھایا ہوا تھا۔

”جلدی سے یہ لباس اور جوتے موزے وغیرہ پہن لو۔ پانچ منٹ میں ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔“ وہ اپنے ہاتھ میں موجود سامان اسے تھما کر خود جس تیزی سے آیا تھا، اسی تیزی سے واپس پلٹ گیا۔ ماہ بانو نے اس کی ہدایت کے مطابق وہ چیزیں پہننی شروع کر دیں۔ جو لباس اس نے اس وقت پہن رکھا تھا، وہ بھی خاصا گرم تھا جس پر اس نے عمران کا دیا ہوا موٹا اونٹنی لبادہ پہن لیا۔ اسے یہاں لاتے وقت بھی اسی قسم کا لباس پہنایا گیا تھا اور وہ اس کی وجہ سمجھ سکتی تھی۔ اس برف زار میں باہر کا موسم غار کے مقابلے میں بہت شدید تھا۔

غار کے اندر کی سردی باہر کے مقابلے میں کچھ نہیں تھی کیونکہ یہاں این قاتل ہواؤں کا گزر نہیں تھا جو انسان کے جسم سے ٹکراتی تھیں تو اسے لگتا تھا کہ ایک برچی سی جسم میں اتر گئی ہو۔ لباس پہننے کے بعد اس نے پیروں میں موٹے اونٹنی جراب پہن کر جو گرز چڑھائے۔ جو گرز اس کے پیروں میں قدرے ڈھیلے تھے اور چلتے وقت دشواری کا باعث بن سکتے تھے۔ اس بات کو محسوس کر کے وہ کچھ پریشان سی ہو گئی پھر یک دم ہی اس کی نظر جرابوں کی دوسری جوڑی پر پڑی۔ اس نے جو گرز اتار کر وہ دوسری جوڑی بھی پہلے والے جرابوں پر چڑھائی۔ اب اس نے دوبارہ سے جو گرز پہنے تو وہ پہلے کے مقابلے میں اس کے پیروں میں کافی بہتر تھے۔ عمران کے لائے ہوئے سامان میں سے پہننے کے لیے اب دو چیزیں رہ گئی تھیں۔ ایک اونٹنی ٹوپی اور دوسرے مٹاف (پہاڑوں پر پہنے جانے والے خصوصی دستانے)۔ اس نے پہلے بالوں کو سمیٹ کر اونٹنی ٹوپی اپنے سر پر جمائی اور پھر ہاتھوں پر مٹاف بھی چڑھالے۔ اب وہ پوری طرح تیار تھی۔

”تم تیار ہو گئیں... ویری گڈ۔ چلو اب یہاں سے نکل چلتے ہیں۔“ اسی وقت عمران وہاں چلا آیا اور اسے تیار دیکھ کر بولا۔ اس وقت وہ خود بھی اس سے ملتے جلتے حلیے میں تھا اور اسی کی طرح اس حلیے میں اپنے اصل حجم سے کئی گنا زیادہ نظر آ رہا تھا۔ ”ٹوپی کا باقی حصہ اپنے چہرے پر بھی چڑھا لو ورنہ باہر کی ٹھنڈی ہوا تمہارے چہرے کی جلد ادھیڑ ڈالے گی۔“ اس کا کھلا منہ دیکھ کر اس نے ماہ بانو کو ہدایت کی اور پھر ایک ذرا مختلف ساخت کی عینک اس کی طرف بڑھادی۔ وہ خود بھی اپنی آنکھوں پر ایسی ہی عینک پہنا ہوا تھا۔ ماہ بانو نے خاموشی سے عینک تھام کر اپنی آنکھوں پر لگائی۔ عینک لگانے کے بعد اسے لگا کہ وہ نیم تاریک ماحول پہلے کے مقابلے میں واضح ہو گیا ہو۔ یہ ان نائٹ گائڈز کا کمال تھا جو عمران کے کہنے پر اس نے ابھی ابھی پہنی تھیں۔

”آجاؤ لیکن بہت احتیاط سے۔ سب لوگ نشے کی حالت میں دھت پڑے ہوئے ہیں... پھر بھی اگر آوازوں سے کسی کی آنکھ کھل گئی تو ہمارے لیے مشکل کھڑی ہو سکتی ہے۔“ سرگوشی میں اسے یہ ہدایت کر کے وہ وہاں سے آگے بڑھا۔ ماہ بانو اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ عمران کا بے حد محتاط رویہ اسے بھی احتیاط پر کاربند کیے ہوئے تھا۔ اپنے ساتھیوں کی مدد ہوشی کے باوجود وہ اتنا محتاط اور چوکنا تھا کہ اس نے اپنے ہاتھ میں موجود یو الوور بالکل تیار رکھا ہوا تھا۔ اگر وہاں کوئی اسے روکنے کی کوشش کرتا تو یقیناً وہ اس کے سینے میں

اس ریوالور کی گولی بلا تکلف اتار دیتا۔ ریوالور کے علاوہ اس نے اپنے شانے سے ایک دور مار رائل بھی لٹکائی ہوئی تھی۔ شاید لباس کے اندر بھی کچھ اسلحہ چھپایا تھا جس کو ماہ بانو دیکھ نہیں سکتی تھی، صرف اس کے بارے میں قیاس ہی کر سکتی تھی۔ مخصوص راستے پر سے گزرتے ہوئے وہ دونوں غار کے کشادہ ہال نما حصے میں پہنچے۔ وہاں مہرہ کی پتھری ہوئی ہڈیاں، شراب کے خالی پیانے اور انسانی جسم ایک جیسی بے ترتیب حالت میں ادھر ادھر لٹکے ہوئے تھے۔ وہ دونوں اس احتیاط کے ساتھ کہ ان کا پیر کی کے جسم سے نہ ٹکرا جائے، وہاں سے گزر کر غار کے دہانے کی طرف بڑھے۔

”کون ہے؟“ ابھی وہ دہانے تک پہنچے ہی تھے کہ کسی کی مدہوش سی آواز ابھری اور مردوں کی طرح بے جان پڑے انسانی جسموں میں سے ایک نے سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنے کی کوشش کی۔ ماہ بانو کا دل اس صورت حال پر اچھل کر حلق میں آ گیا۔ یوں نفس کے دروازے پر دھڑلے جانے کا سوچ کر ہی اس کا جسم پھڑپھڑانے لگا۔

”میں ہوں بھائی عمران۔ ذرا پیشاب کے لیے جا رہا ہوں۔“ ماہ بانو کے برعکس عمران نے پرسکون رہتے ہوئے متوازن آواز میں سوال کرنے والے کو جواب دیا جسے سن کر اس نے مطمئن ہو کر دوبارہ اپنی گردن فرش پر ڈال دی اور پہلے ہی کی طرح خزانے لینے لگا۔ عمران نے ماہ بانو کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ سے دباؤ ڈالتے ہوئے اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ اس نے اپنے سینے میں اٹک جانے والا سانس آہستہ سے خارج کرتے ہوئے قدم بڑھا دیے۔ غار کے دہانے سے باہر قدم رکھتے ہی سردیلی ہواؤں نے ان کا استقبال کیا اور باوجود پوری تیاری کے، ماہ بانو کو اپنے جسم میں سردی کی ایک لہری دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ کپکپاتی ہوئی عمران کے ساتھ آگے بڑھی۔

باہر روشنی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ صرف چاند کی مدہم روشنی تھی جو منظر کو پوری طرح واضح کرنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہی تھی۔ اگر ان دونوں نے اپنی آنکھوں پر نائٹ گلاز نہیں لگائے ہوئے ہوتے تو بہت دشواری پیش آتی مگر گلاز کی وجہ سے یہ مشکل آسان ہو گئی تھی۔ ماہ بانو دیکھ سکتی تھی کہ وہاں وہی قوی ہیکل جانور کھڑا ہے جس پر لاڈ کر اسے یہاں لایا گیا تھا۔ رات کی تاریکی میں وہ اپنے بھاری جتنے کے ساتھ اور بھی دہشت ناک لگ رہا تھا۔ ماہ بانو کو حیرت تھی کہ ان لوگوں نے کیونکر اس جانور کو سدھا کر اپنے استعمال کے لائق بنایا ہوگا۔ ایسے وحشی کو قابو کرنے کے لیے تو اس سے

بڑھ کر وحشت کی ضرورت تھی اور شاید اسی وجہ سے وہ لوگ کامیاب بھی ہو گئے تھے۔ بہر حال جو بھی تھا، اس وقت تو ایک سیاہ پر شکوہ پاک ان کی سواری کے لیے تیار کھڑا تھا۔ اس پر سامان کا بڑا سا تھیلہ بھی لدا ہوا تھا۔ یہ یقیناً زادراہ تھا جس کا عمران نے پہلے ہی انتظام کر لیا تھا۔

”ہمیں یہاں سے نکلنے کے لیے اس پاک کو استعمال کرنا ہوگا۔ اس بر فانی علاقے میں یہ بہت تیزی سے حرکت کرتے ہیں اور پھر اس پر سواری کا دوسرا بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہ سدھائے ہوئے ہیں اور راستوں کو خوب پہچانتے ہیں۔ میں نے چونکہ خود بھی یہ جگہ اچھی طرح نہیں دیکھ رکھی اس لیے اندیشہ ہے کہ پیدل نکلنے کی صورت میں ہم راستہ بھٹک جائیں گے۔“ پاک کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے عمران نے اسے بتایا اور پھر اس کے قریب پہنچ جانے پر ماہ بانو کو اس پر سوار ہونے میں مدد دینے لگا۔

”اپنی جگہ پر رک جاؤ عمران! اگر تم نے کوئی حرکت کی تو مارے جاؤ گے۔“ ابھی ماہ بانو سوار نہیں ہو پائی تھی کہ وہ دونوں عقب سے سنائی دینے والی اس آواز پر بری طرح چونک کر پلٹے۔ وہ نائب کمانڈر تھا جو ہاتھ میں گن لیے ان دونوں کو خوں خوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کی گن کا رخ تو ظاہر ہے سو فیصدی ان دونوں ہی کی طرف تھا۔

”مجھے پہلے ہی شک ہو گیا تھا کہ تم کوئی گڑبڑ کرنے والے ہو اس لیے میں تم پر اعتماد کرنے کے لیے تیار نہیں تھا لیکن بھائی صاحب اور میرا دونوں کا یہ خیال تھا کہ تم جو کچھ بھی گڑبڑ کرو گے، وہ شہر پہنچ کر کرو گے۔ ہمیں بالکل اندازہ نہیں تھا کہ تم یہاں ہمارے اس ٹھکانے پر ایسی کوئی جرات کر سکتے ہو۔ وہ تو آج کی محفل میں، میں نے اتفاق سے اوروں کے مقابلے میں کم شراب پی تھی اس لیے میری اس وقت آنکھ کھل گئی اور میں نے دیکھ لیا کہ تم اس لڑکی کو لے کر یہاں سے فرار ہو رہے ہو۔ اب ایسا کرو کہ فرار کا خیال دل سے نکال کر اچھے بچوں کی طرح واپس اندر چلو۔ تمہارا فیصلہ صبح ہونے پر بھائی صاحب خود کریں گے۔“ نائب کمانڈر نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں حکم صادر کرتے ہوئے کہا لیکن عمران اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوا اور وہیں کھڑا اسے گھورتا رہا۔

”ہری آپ مین! ٹائم ویسٹ مت کرو۔ تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ یہاں کتنی سردی ہے اور میں نے تمہاری طرح سردی سے بچاؤ کا انتظام بھی نہیں کر رکھا۔“ عمران کو اپنی جگہ سے ہلنے نہ دیکھ کر نائب نے اسے پچکارے ہوئے کہا۔ اس کے انداز سے یوں لگ رہا تھا کہ وہ اس صورت حال کو خوب

انجوائے کر رہا ہے۔ عمران کو یوں عین موقع پر دھریے جانے کے کارنامے پر یقیناً وہ بہت خوش تھا اور اس سے یہ خوشی سنبھالی نہیں جا رہی تھی۔

”اور ہاں، دیکھو... آگے بڑھنے سے پہلے اپنے پاس موجود اسلحہ ضرور نیچے ڈال دو۔ یہ کافی خطرناک چیز ہے اس لیے تم جیسے بچے کے پاس اس کا رہنا مناسب نہیں۔“ نائب نے ایک بار پھر عمران کا مذاق اڑاتے ہوئے اسے حکم دیا۔ اس کا یہ حکم سن کر عمران نے ہاتھ میں موجود ریوالور نیچے ڈال دیا اور پھر شانے سے لٹکی رائل اتارنے لگا۔ رائل اتارتے اتارتے اچانک ہی اس نے بے پناہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پینٹر ابدلا اور بجائے رائل نیچے پھینکنے کے سیدھی کر کے نائب کی طرف ایک فار داغ دیا۔ رائل سے نکلنے والی گولی سیدھی جا کر نائب کے بائیں شانے سے ذرا نیچے سوراخ بنا گئی۔ گولی کھا کر نائب کو زوردار جھٹکا لگا اور وہ نیچے گر گیا۔ معلوم نہیں گولی نے اس کے دل کو متاثر کیا تھا یا نہیں... لیکن زخم بہر حال کاری تھا اور نائب زمین پر گرنے کے بعد دوبارہ اٹھ نہیں سکا تھا۔

”ہری آپ ماہ بانو! ہمیں بہت تیزی سے یہاں سے نکلنا ہوگا۔ گولی چلنے کی آواز سن کر اندر مدہوش پڑے ہوئے افراد میں سے کوئی نہ کوئی ضرور جاگ گیا ہوگا۔ اگر زیادہ افراد اٹھ کر باہر نکل آئے تو میں ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکوں گا۔“ اسے سوار کرواتے ہوئے وہ اس پر صورت حال واضح کرنے لگا اور پھر خود بھی اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ پاک بر سوار ہونے سے قبل وہ نیچے زمین پر گرا ہوا اپنا ریوالور اٹھانا ہرگز بھی نہیں بھولا تھا۔ سوار ہو کر اس نے جیسے ہی اشارہ کیا، پاک چل پڑا۔ اس کی رفتار خاصی تیز تھی پھر بھی ان دونوں کو لگ رہا تھا کہ وہ بہت سست روی سے آگے بڑھ رہے ہوں۔ رگوں کو کاٹتی سردی کے ساتھ ہڈیوں کا گودا بجا دینے والا خوفیل کران کے جسموں کو کپکپا رہا تھا اور دل میں خواہش ابھر رہی تھی کہ کاش کسی طرح اس پاک کو پُر لگ جائیں اور وہ لمحوں میں اس جگہ سے بہت دور نکل جائیں۔ ایسے میں انہوں نے اپنے پیچھے کچھ آوازیں سنیں تو اور بھی زیادہ متوحش ہو گئے۔ دونوں نے بے یک وقت پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ دو تین افراد تھے جو شاید گولی چلنے کی آواز سن کر جاگنے کے بعد غار سے باہر نکل آئے تھے اور اب نائب کمانڈر کی لاش کے قریب کھڑے صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے ابھی تک اس سمت نہیں دیکھا تھا جس طرف ماہ بانو اور عمران پاک بر سوار اڑے جا رہے تھے۔ ان کی یہ کوتاہی بے تحاشا شراب کے نشے کے سبب تھی ورنہ

بھاری بھر کم پاک کے چلنے سے زمین میں جو دھک پیدا ہوتی ہے اسے دور ہی سے محسوس کر لیا جاتا ہے۔

”یہاں اور بھی تو پاک ہیں۔ کہیں یہ لوگ ان پر سوار ہو کر ہمارا پیچھا کرنے کی کوشش نہ کریں؟“ ماہ بانو نے خوف زدہ سے لہجے میں عمران سے کہا۔

”فی الحال وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ میں نے پاکوں کو کافی مقدار میں شراب پلا دی تھی اس لیے اس وقت ہمارے اس پاک کے علاوہ کوئی دوسرا پاک سواری کے لائق نہیں ہوگا۔ اگر ان لوگوں نے زبردستی ایسی کوئی کوشش کی بھی تو بڑا نقصان اٹھائیں گے۔“ عمران نے اسے تسلی دیتے ہوئے اپنی توجہ پیچھے کی طرف ہی مرکوز رکھی تھی چنانچہ یہ نوٹ کیے بغیر نہیں رہ سکا کہ نائب کمانڈر کی لاش کے قریب کھڑے افراد ان کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں۔ وہ لوگ شور مچاتے ہوئے ان کے پیچھے لپکے لیکن درحقیقت وہ دونوں ان کی رسائی سے بہت دور نکل چکے ہیں، اس بات کو محسوس کر کے ان میں سے ایک کو عقل سوچھی اور اس نے رک کر اپنی رائل ان کی طرف تان لی۔

”نیچے جھک جاؤ۔“ عمران نے اسے ہدایت کی اور خود بھی اپنا سر اور بالائی جسم جھکا لیا۔ اب وہ دونوں تیزی سے حرکت کر کے پاک کی پشت پر اس طرح محسوس تھے کہ ان کے جسم اس کے سیاہ جتنے سے لپٹے ہوئے تھے۔ پیچھے سے فار داغا گیا جو کسی نشانے پر نہیں بیٹھ سکا، البتہ فار کی آواز نے پاک کو بھڑکا کر اس کی رفتار اور بھی تیز کر دی۔

”خود کو مضبوطی سے اس کی پیٹھ پر جمائے رکھو۔“ فارنگ سے خوف زدہ مت ہونا۔ ہم بہت دور نکل آئے ہیں اور اتنے فاصلے سے ان لوگوں کے لیے ہمیں نشانہ بنانا ممکن نہیں۔“ عمران نے یہ محسوس کر کے کہ کہیں وہ خوف کا شکار ہو کر پاک کی پشت سے گر نہ پڑے، اسے تسلی بھری ہدایت دی۔ اس نے اپنے اعصاب کو قابو میں رکھتے ہوئے اس ہدایت پر عمل کیا پھر پے در پے ہونے والے اگلے مزید فاروں کی آواز نے عمران کی اس بات کی تصدیق بھی کر ڈالی کہ وہ فارنگ رینج سے نکل چکے ہیں۔ پیچھے سے فار کرنے والوں نے بھی اس بات کو سمجھ لیا اور فارنگ کا سلسلہ موقوف کر دیا۔ اب وہ جانے کون سا حریر استعمال کر کے ان دونوں کو روکنے کی کوشش کرتے، فی الحال یہ واضح نہیں تھا۔ وہ دونوں پاک کی پشت سے چھٹن بہ تقدیر انجانے راستوں پر... تیزی سے گزرتے جا رہے تھے۔

☆☆☆

صبح پیش آنے والے واقعے نے مشاہیرم خان کو بری

طرح جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔ اسے نہایت چالاکی کے ساتھ بے وقوف بنایا گیا تھا۔ وہ اتنے دنوں سے ٹورسٹ کمپنی کے دفتری نگرانی کر رہا تھا اور وہاں سے روانہ ہونے والی جیپوں پر نظر رکھے ہوئے تھا لیکن وہ ایک جیب جس کی روانگی کا اسے انتظار تھا، نہایت صفائی سے اس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر روانہ کر دی گئی تھی۔ کسی نے عین موقع پر اسے اسپتال کے نمبر سے فون کر کے یہ اطلاع دی تھی کہ تمہاری ماں کی طبیعت بہت خراب ہے۔ ماں کی طبیعت کی خرابی کا سن کر وہ نگرانی وغیرہ بھول گیا اور دیوانہ وار اسپتال کی طرف دوڑا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ ماں کی طبیعت تو حسب معمول ہے اور اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں آیا۔ اس وقت اسے احساس ہوا کہ یہ سارا ڈراما اسے ٹورسٹ کمپنی کے دفتر کے سامنے سے ہٹانے کے لیے رچا یا گیا تھا۔

مخالف پارٹی کی اس چال نے جہاں اسے جھنجلاہٹ میں مبتلا کیا، وہیں اس بات کا بھی یقین ہو گیا کہ ٹورسٹ کمپنی کا مالک اس کام میں ملوث ہے۔ چنانچہ اب وہ کمپنی کے مالک کے خلاف ڈائریکٹ ایکشن لینے کے بارے میں ہی غور کر رہا تھا۔ کافی غور کرنے کے بعد اس کے ذہن میں جو منصوبہ آیا اس کے مطابق اس نے ٹورسٹ کمپنی کے دفتر کی معمول کی نگرانی ترک کر دی اور چائے کے ہوٹل پر جا کر بیٹھنے کے بجائے سارا دن اپنی ماں کے ساتھ اسپتال میں گزارا۔ شام کے وقت جب اس کی معلومات کے مطابق دفتر بند ہونے کا وقت قریب آیا تو وہ اسپتال سے نکلا اور چپکے سے کمپنی کے دفتر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس سے قبل وہ اپنے لیے کرائے کی ایک جیب حاصل کرنا بالکل نہیں بھولا تھا۔ جیب کے لیے اس نے دن میں ہی اسپتال سے فون کر کے بنگلہ کردالی تھی لیکن احتیاطاً دن میں اپنے پاس جیب رکھنے سے گریز کیا تھا تا کہ اگر کوئی اس کی حرکات و سکنات پر نظر رکھے ہو تو جیب کرائے پر لینے کی وجہ سے چونک نہ جائے۔

اسپتال سے روانہ ہوتے ہوئے بھی وہ اس طرف سے بہت محتاط رہا تھا لیکن اسے اپنے ارد گرد کوئی ایسا مشکوک شخص نظر نہیں آیا جس کے بارے میں اسے یہ گمان ہوتا کہ وہ اس کی نگرانی کر رہا ہے۔ شاید اپنا کام کر گزرنے کے بعد مخالفین نے اس کی نگرانی کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ نگرانی کی طرف سے مطمئن ہو کر وہ جیب میں اس راستے کی طرف روانہ ہوا جو ٹورسٹ کمپنی کے دفتری طرف جاتا تھا لیکن دفتر تک جانے کے بجائے راستے میں ہی ایک جگہ رک گیا۔ یہ وہ مقام تھا جہاں سے کمپنی کے مالک کو دفتر سے اپنے گھر جانے کے

لیے لازماً گزرنا پڑتا۔ مشاہیرم خان کو مالک کے گھر کا پتا معلوم تھا اور وہ چاہتا تو وہاں جا کر بھی اسے چھاپ سکتا تھا لیکن ڈرائیور نیاز علی کی ہلاکت کے بعد وہ اس معاملے میں محتاط ہو گیا تھا۔ نیاز علی کو وہ اس کے گھر سے ہی معلومات حاصل کرنے کے لیے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ نیاز علی اپنی غلطی کے باعث کھائی میں گر کر ہلاک ہو گیا لیکن اس واقعے نے مشاہیرم خان کی حیثیت مشکوک کر دی تھی۔ اسی وجہ سے ابھی تک اسے بلتستان چھوڑنے کی اجازت نہیں تھی۔ ان حالات میں اگر ٹورسٹ کمپنی کے مالک کے ساتھ کچھ برا بھلا ہو جاتا اور اس کا نام سامنے آ جاتا تو اسے اپنی جان چھڑانا مشکل ہو جاتی، اسی لیے اس کی پوری کوشش تھی کہ خود کو پوشیدہ رکھے۔

کمپنی کے مالک کو راستے میں ہی روکنے کے لیے بھی اس نے اپنے مقام کا انتخاب کیا تھا جہاں لوگوں کی آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ اسے امید تھی کہ وہ اس مقام پر اسے روکنے اور اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب ہو جائے گا۔ اپنی جیب اس نے سڑک سے اتار کر ایک طرف روک لی تھی اور راستے پر نظریں جما کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہاں روکنے کے بعد اسے زیادہ دیر انتظار کی زحمت نہیں اٹھانی پڑی۔ ٹورسٹ کمپنی کے مالک کی جیب کو اس نے دور سے ہی شناخت کر لیا اس کی جیب شناخت کرتے ہی وہ فوراً حرکت میں آیا اور اپنی جیب اشارت کر کے عین سڑک کے درمیان میں لے گیا۔ سڑک پر سیدھے چلے آئے والے ٹورسٹ کمپنی کے مالک کو اپنی جیب کو امیر جنسی بریکس لگانے پڑے۔

”کون پاگل کا بچہ ہے تو؟“ جیب رکتے ہی وہ غصے سے دھاڑتا ہوا باہر نکلا لیکن مشاہیرم خان تو اپنی جیب کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود ہی نہیں تھا۔ جیب عین سڑک پر روکنے کے بعد وہ بے مثال پھرتی کا مظاہرہ کرتا ہوا اس سے کود کر نیچے سڑک پر رینگ گیا تھا۔ شام کے جھک آنے والے سایوں میں کمپنی کا مالک اس کی یہ نقل و حرکت نہیں دیکھ سکا، چنانچہ اب خالی ڈرائیونگ سیٹ دیکھ کر انگشت بدنداں تھا۔ اس کی اس حیرت میں اس وقت مزید اضافہ ہو گیا جب مشاہیرم خان نے پیچھے سے آکر اسے چھاپا۔ پھر کنبیٹی پر لگنے والی مشاہیرم خان کی پنی تلی ضرب نے اس کے حواس اس طرح غائب کیے کہ وہ حیرت سمیت کچھ بھی محسوس کرنے کے قابل نہیں رہا اور لہراتا ہوا سڑک پر گرنے لگا لیکن مشاہیرم خان نے اس کے گرنے سے قبل ہی اسے اپنی بانہوں میں سنبھال لیا اور گھسیٹتا ہوا اپنی جیب تک لے گیا۔ اسے جیب کے پچھلے حصے میں ڈالنے کے بعد وہ خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور

سڑک پر ترچھی کھڑی جیب کو ریورس کر کے اسے سیدھا کرتے ہوئے برق رفتاری سے دوڑا دیا۔ اتنی زیادہ تیزی کا مظاہرہ کرنے کے باعث جیب کے پیچھے بری طرح چرچرائے اور فضا میں چرچراہٹ دور تک پھیل گئی۔ اس دوران سڑک پر کوئی دوسری گاڑی نمودار نہیں ہوئی تھی اس لیے مشاہیرم خان کو اطمینان تھا کہ اس سارے واقعے کا کسی کو علم نہیں ہو سکا۔ ویسے اس نے جس انداز میں اپنی جیب ریورس کر کے اسے دوڑایا تھا، وہ انداز بہت رکھی تھا۔ ذرا سی غلطی جیب کو غیر متوازن کر کے حادثے کا سبب بن سکتی تھی لیکن خیر گزری اور اس کی ڈرائیونگ میں مہارت نے کوئی حادثہ رونما نہیں ہونے دیا اور وہ اسی رفتار سے جیب چلاتا ہوا اپنی طے شدہ منزل کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

یہ ایک خوش کن اتفاق ہی تھا کہ ایک دن قبل ہی آذر نے اسے اپنے گھر پر رہائش اختیار کرنے کی پیشکش کی تھی۔ آذر نامی ٹورسٹ گائڈ جو اکرم خان کے دوستوں میں سے تھا، بہت اچھا اور بااخلاق آدمی ثابت ہوا تھا۔ نیاز علی کی موت کے بعد ایک روز اتفاقاً اس کی مشاہیرم خان سے جائے کے ہوٹل میں ملاقات ہو گئی تھی۔ اسے جب اس بات کا علم ہوا کہ مشاہیرم خان کی ماں ہنوز اسپتال میں داخل ہے اور وہ ایک سرائے میں سکونت اختیار کیے ہوئے ہے تو اس نے پُر زور اصرار کر کے مشاہیرم خان کو اپنے گھر پر ٹھہرنے کے لیے راضی کر لیا۔ آذر تنہا آدمی تھا جس کے ایک کمرے کے گھر میں کوئی دوسرا تنفس موجود نہیں تھا اور وہ خود بھی کم ہی اپنے گھر میں ٹک پاتا تھا۔ آئے دن اسے کسی نہ کسی ٹیم کے ساتھ پہاڑوں کے سفر پر جانا ہوتا تھا۔ مشاہیرم خان نے اس کے خلوص سے ہار کر اس کی پیشکش قبول کر لی تھی اور اس کی گزشتہ رات آذر کے گھر پر ہی گزری تھی۔

آذر حسب معمول ایک نئے سفر پر روانہ ہو گیا تھا اور جاتے جاتے گھر کی چابیاں مشاہیرم خان کو دے گیا تھا، چنانچہ مشاہیرم خان کے لیے ٹورسٹ کمپنی کے مالک کو اغوا کرنے کے بعد کسی ٹھکانے تک لے جانے کا کوئی مسئلہ نہیں رہا تھا۔ درحقیقت وہ یہ سارا منصوبہ بنا ہی اس لیے رکھا تھا کہ اس کے پاس ایک مناسب ٹھکانا موجود تھا۔ دوسرے گھروں سے ہٹ کر بنا آذر کا چھوٹا سا گھر اس کے لیے موجودہ صورت حال میں بہت کارآمد ثابت ہونے والا تھا۔ وہاں تک پہنچنے کے بعد اس نے پہلے دروازے پر لگا تالا کھولا اور پھر جیب کی پچھلی طرف بڑے ٹورسٹ کمپنی کے مالک کو اٹھا کر اندر لے گیا۔ اس نے عقل مندی کی تھی کہ اسے جیب میں ڈالنے کے بعد

ایک بڑے ترپال سے ڈھانپ دیا تھا اور اب اسی ترپال میں لپیٹے ہوئے ہی اندر لے گیا تھا۔ اگر کسی شخص نے اس کی نقل و حرکت دیکھ بھی لی ہوگی تو یہی گمان کیا ہوگا کہ وہ کوئی سامان مکان کے اندر لے جا رہا ہے۔

مکان کے اندر پہنچنے کے بعد اس نے ٹورسٹ کمپنی کے مالک صغیر بیگ کے ہاتھ پیروں کو رسی کی مدد سے باندھا اور ساتھ ہی آنکھوں پر پٹی باندھنے کے بعد اس کے منہ میں بھی کپڑا ٹھونس دیا۔ یہ سب اس نے احتیاطی تدبیر کے طور پر کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ صغیر بیگ آذر کے گھر کو شناخت کر سکے یا ہوش میں آنے کے بعد شور مچا کر کسی راہ چلتے شخص کو متوجہ کر سکے۔ آذر کا گھر دوسرے مکانات سے الگ تھلگ ہونے کے باوجود وہ اپنے طور پر پوری احتیاط کرنا چاہتا تھا۔ اپنے ان انتظامات کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد وہ باورچی خانے میں گیا اور وہاں سے گوشت کاٹنے کی تیز دھار والی چھری کے ساتھ پانی کا جگ بھی بھر کر لے آیا۔

پانی کا بھرا ہوا جگ اس نے صغیر بیگ کے چہرے پر انڈیل دیا۔ وہ چہرے پر ٹھنڈا پانی گرنے پر جھرجھری سی لے کر ہوش میں آیا۔ اس کے ہوش میں آنے کی نشانی یہ تھی کہ اس نے پانی ڈالے جانے کے بعد بے ساختہ ہی اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی تھی لیکن ہاتھ پیر بندھے ہونے کی وجہ سے اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ منہ میں کپڑا ٹھنسا ہونے کی وجہ سے آواز نکالنا تو یوں بھی اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس صورت حال پر وہ بے چین ہو کر بری طرح کسمانے لگا۔ ”میں تمہارے منہ میں ٹھنسا کپڑا نکالنے کے لیے تیار ہوں صغیر بیگ... لیکن اس سے پہلے تمہیں مجھے یہ یقین دلانا ہوگا کہ تم غیر ضروری آوازیں نہیں نکالو گے اور میں جو کچھ پوچھوں گا، اس کا صحیح جواب دو گے۔“ اس کی بے چینی ملاحظہ کرتے ہوئے مشاہیرم خان نے گھبر لہجے میں اسے مخاطب کرتے ہوئے اپنی شرائط پیش کیں۔ جواب میں وہ شدد سے اثبات میں سر ہلانے لگا۔ مشاہیرم خان نے آگے بڑھ کر اس کے منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا باہر کھینچ لیا۔ کپڑا نکلتے ہی وہ زور زور سے کھانسنے لگا۔

”پپ... پانی۔“ کھانسی کے دوران ہی اس نے... یہ مشکل یہ ایک لفظ ادا کیا۔ مشاہیرم خان نے جگ میں فحج جانے والے پانی میں سے دو گھونٹ اس کے منہ میں ڈال دیے۔ ”کون... کون ہو تم؟ مجھے اس طرح اغوا کیوں کیا ہے؟“ پانی نے خشک حلق کو تر کیا تو اس نے پوچھا۔

”سوال تم نہیں میں کروں گا اور تمہیں میرے ہر سوال کے جواب میں سچ بولنا ہوگا، ورنہ اپنے انجام کے تم خود ذمے

دار ہو گئے۔“ مشاہد خان نے اپنی آواز میں سفاکی سموتے ہوئے اسے دھمکی دی اور ساتھ ہی چھری کی نوک اس کے رخسار میں اس حد تک چھوئی کہ وہاں سے خون کا ایک قطرہ نکل آیا۔

”مم... میں سب بتانے کو تیار ہوں۔ اگر تمہیں روپیہ پیسا چاہیے تو وہ میں تمہیں دے دوں گا... بلکہ تم خود جا کر نکال لو۔ میرے دفتر میں لکڑی کی الماری کے پیچھے ایک سیف...“ وہ چھری کی صرف نوک چھونے پر ہی اتنا خوف زدہ ہو گیا تھا کہ مشاہد خان کو کوئی لٹیرا سمجھ کر از خود اسے اپنے دفتر میں موجود خفیہ سیف کے بارے میں بتانے لگا۔

”مجھے تمہارے روپے سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ تم خود سے بک بک کرنے کے بجائے ان باتوں کا جواب دو جو میں تم سے پوچھوں۔“ اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی مشاہد خان نے اسے ڈپٹ دیا تو وہ سہم کر خاموش ہو گیا۔

”تم کس کے لیے کام کرتے ہو؟“ مشاہد خان نے اپنی تفتیش کا آغاز کیا۔

”کسی کے لیے نہیں۔ میرا اپنا ذاتی بزنس ہے۔ اسکرود پینچ کر اوپر پہاڑوں پر جانے والے میرے تھرو سواری، پورٹرز اور دوسری ضروری چیزوں کا انتظام کرتے ہیں۔“ اس نے نہایت بھولپن سے جواب دیا۔

”میں اس بزنس کے بارے میں نہیں پوچھ رہا ہوں۔ مجھے اپنے اس کام کے بارے میں بتاؤ جس کے لیے تم نیاز علی کو استعمال کرتے تھے۔ اب کون نیاز علی کی جگہ یہ کام کر رہا ہے؟“ اس نے چھری کی نوک پر کچھ اور دباؤ ڈالتے ہوئے سر دلچے میں پوچھا۔

”نیاز علی جیپ ڈرائیور تھا۔ اس کا کام ٹورسٹس کو لے جانا اور واپس لانا تھا۔ ابھی سیزن زوروں پر نہیں ہے اس لیے میں نے ابھی تک نیاز علی کی جگہ دوسرا ڈرائیور نہیں رکھا ہے۔“ صغیر بیک نے کراہتے ہوئے اسی معصومیت سے جواب دیا جس کا وہ اب تک مظاہرہ کر رہا تھا۔

”اس کا مطلب ہے کہ تم سیدھے طریقے سے میرے سوالوں کا جواب نہیں دو گے؟“ مشاہد خان کو اس کا جواب سن کر اتنا غصہ آیا کہ اس نے صغیر بیک کے رخسار میں چھری کی نوک کو بے دردی سے حرکت دے ڈالی۔ چھری کی نوک نے صغیر بیک کے رخسار پر ڈیڑھ انچ کے قریب گہری سرخ لکیر کھینچ دی۔ اس زخم کو کھا کر صغیر بیک کے حلق سے ایک بھیا تک چیخ بلند ہوئی جس کو مشاہد خان نے درمیان میں ہی اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر گھونٹ ڈالا۔

”سچ بتاؤ کہ نیاز علی جب کسی ٹیم کو واپس لینے کے لیے جاتا تھا تو اپنے ساتھ کسے راشن پانی سپلائی کرنے کے لیے لے جاتا تھا؟ کون ہیں وہ لوگ جو پہاڑوں پر چھپے ہوئے ہیں اور جنہوں نے اکرم خان کو قتل کرنے کے علاوہ اس کی مہمان لڑکی کو اغوا بھی کیا ہے؟“ مشاہد خان نے قہر آلود لہجے میں اس سے سوال کرتے ہوئے اس کے منہ پر رکھا ہاتھ ہٹا دیا۔

”مجھے نہیں معلوم۔“ صغیر بیک نے سسکی لیتے ہوئے جواب دیا۔

”میں تم سے معلوم کر کے رہوں گا۔“ مشاہد خان نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسا اور پھر اس پر پل پڑا۔ وہ بے دریغ اس پر لائیں اور کتے برساتا جا رہا تھا۔ صغیر بیک کا بندھا ہوا جسم اس کی لگائی گئی ہر ضرب پر تڑپا لیکن وہ بالکل بے بس تھا اور اس کے پاس مار کھانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ آخر کار وہ مار سہہ سہہ کر ادھ موا ہو گیا اور اس کا جسم بالکل ڈھیلا پڑ گیا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر مشاہد خان نے اپنے ہاتھ روک لیے۔ صغیر بیک یقینی طور پر بے ہوش ہو چکا تھا۔ وہ پانی کا خالی ہو جانے والا جگ اٹھا کر باورچی خانے میں لے گیا اور ایک بار پھر جگ بھر کر کمرے میں واپس آیا۔ اس بار اس نے جگ میں موجود تمام پانی ایک ساتھ صغیر بیک کے اوپر انڈیل دیا۔ ٹھنڈا پانی اسے بے ہوشی کی دنیا سے واپس لے آیا۔

”بولو، اب بھی سچ بتاؤ گے یا میں تمہاری اور خاطر کروں؟“ مشاہد خان نے اس کے منہ میں ٹھنڈا ہوا کپڑا بے دردی سے کھینچ کر باہر نکالتے ہوئے سوال کیا۔

”میں سچ کہہ رہا ہوں۔ مجھے تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں معلوم۔“ صغیر بیک دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ آنکھوں پر پی بندھے ہونے کی وجہ سے اس کے آنسو تو بے شک بہتے ہوئے نظر نہیں آ رہے تھے اور نہ ہی ان میں موجود تاثرات کو پڑھ کر سچ جھوٹ کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا لیکن اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس نے مشاہد خان کو سوچ میں ڈال دیا۔ اتنی مار کھانے کے بعد اس قدر استقامت سے جھوٹ برڈٹے رہنا بہت ہی ڈھیٹ اور پیشہ ور مجرموں کے لیے ہی ممکن ہوتا ہے لیکن صغیر بیک جس قدر رنڈھال اور خوف زدہ نظر آ رہا تھا، اسے دیکھتے ہوئے یہ بھی یقین نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ مجرموں کی اس قسم سے تعلق رکھتا ہے۔

”اگر تم نیاز علی کی حرکتوں سے واقف نہیں تھے تو یہ بتاؤ

کہ وہ تمہاری کمپنی کی جیپ میں تمہارے علم میں آئے بغیر سامان لوڈ کر کے کیسے لے جاتا تھا؟ کیا کبھی تم نے نوٹ نہیں کیا کہ جب وہ کسی ٹیم کو لینے جاتا ہے تو اس کی جیپ خالی نہیں ہوتی؟“ اس بار اس نے اپنا لہجہ ذرا نرم کرتے ہوئے صغیر بیک سے سوال کیا۔

”نیاز علی میرا بہت پرانا ڈرائیور تھا۔ میں اس پر بہت زیادہ اعتماد کرتا تھا۔ اسے جب پہاڑوں سے اترنے والی کسی ٹیم کو واپس لینے جانا ہوتا تھا تو وہ رات میں ہی مجھ سے جیپ لے جاتا تھا اور صبح دفتر آنے کے بجائے اپنے گھر سے ہی روانہ ہو جاتا تھا۔ اس کی کبھی کہیں سے شکایت نہیں ملی تھی اس لیے میں بھی اس معمول پر اعتراض نہیں کرتا تھا۔“ صغیر بیک نے گویا کوئی عقدہ کھولا جس پر مشاہد خان سوچ میں پڑ گیا۔ پہلے وہ سمجھ رہا تھا کہ ماں کی طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے اسے عین وقت پر صغیر بیک کے دفتر کے سامنے سے اس لیے ہٹایا گیا تھا کہ اسے خاص جیپ کی روانگی کا علم نہیں ہو سکے... لیکن اب جو صورت حال سامنے آئی تھی، اس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ مشکوک جیپ تو صغیر بیک کے دفتر سے روانہ ہی نہیں ہوئی تھی۔ یعنی اس نے اتنے دن دفتر کی نگرانی کر کے اپنا وقت ضائع کیا تھا لیکن بہر حال یہ کوئی حتمی بات نہیں تھی۔ ممکن تھا کہ صغیر بیک جھوٹ بول رہا ہو۔ وہ اس کے نیاز علی کے بارے میں دیے گئے بیان کی تصدیق کیے بغیر اس پر مکمل بھروسہ نہیں کر سکتا تھا۔ اگر صغیر بیک سچا تھا تو اس کا یہ مطلب تھا کہ اصل مجرم اس پر مکمل نظر رکھے ہوئے ہیں اور انہوں نے جان بوجھ کر اسے چھپانے کے لیے ایسی حرکت کی تھی جس کے باعث وہ صغیر بیک کے پیچھے پڑ جائے۔

”کیا تم پولیس والے ہو؟“ وہ اپنے خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ صغیر بیک کی آواز نے اسے چونکایا۔

”ہاں۔“ اس نے اس کے خیال کی تصدیق کرنا ہی مناسب سمجھا اور پھر سرد لہجے میں بولا۔ ”تم نے جو کچھ مجھے بتایا ہے، اس کے سچ جھوٹ ہونے کا پتا لگایا جائے گا۔ سچ کی صورت میں رہائی اور جھوٹ کی صورت میں قہر تمہارا نصیب ہوگا۔ تم اپنے انجام کے لیے یہاں رک کر انتظار کرو۔“ وہ ایک بار پھر صغیر بیک کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر آذر کے گھر سے روانہ ہو گیا۔ عارضی طور پر قوت حرکت و گویائی سے محروم کردہ صغیر بیک کی طرف سے اسے بے فکری تھی کہ وہ یہاں سے کسی طور نہیں بھاگ سکے گا۔

☆☆☆

”یہ کافی پی لو۔ اسے پی کر تمہارے جسم میں گرمی

آجائے گی۔“ عمران نے بھاپ اڑاتا ہوا کافی کا کپ ماہ بانو کی طرف بڑھایا۔ وہ دونوں یاگ کی پشت پر اندھیرے میں کیے جانے والے تکلیف دہ اور خطرناک سفر کو سپیدہ سحر نمودار ہونے کے بعد کچھ دیر کے لیے ترک کر کے ایک پہاڑی چٹان کے سائے میں رکے تھے۔ اس موقع پر عمران نے اپنے ساتھ لائے ہوئے بڑے سے تھیلے کو کھول کر اس میں سے مٹی کے تیل سے جلنے والا اسٹون نکالا اور پھرتی سے کافی تیار کر ڈالی۔ کافی کے ساتھ ڈبل روٹی کے ٹکڑے بھی تھے جو اس نے کھانے کے لیے ماہ بانو کو پیش کیے۔

”جلدی سے ناشتے سے فارغ ہو جاؤ تاکہ ہم اپنا سفر جاری رکھ سکیں۔ وہ لوگ ہمارے فرار کے بارے میں جاننے کے بعد آرام سے نہیں بیٹھیں گے... اور ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہ لوگ ہمارے مقابلے میں ان راستوں سے بہت اچھی طرح آشنا ہیں اس لیے وہ زیادہ تیزی سے فاصلہ طے کر سکتے ہیں۔“ کافی کا ایک بڑا سا گھونٹ حلق سے نیچے اتارتے ہوئے عمران نے بے حد صاف گوئی سے ماہ بانو کو حقیقت سے آگاہ کیا۔

”تو پھر چلو، ابھی چلتے ہیں۔“ اس نے فوراً ہی اپنے ہاتھ میں موجود کپ نیچے رکھ دیا اور سر اسیسگی سے بولی۔

”پہلے ناشتا کر لو۔ اس علاقے میں سروائیو کرنے کے لیے جسم میں طاقت ہونا بہت ضروری ہے ورنہ دشمن سے پہلے موسم کی سختی ہمیں ہلاک کر ڈالے گی۔ خصوصاً تمہیں تو بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ ایک تو تم عورت ہونے کے ناطے ویسے ہی کمزور ہوؤ اور پر سے قید کے دنوں اور ڈپریشن نے تمہیں اور بھی کمزور کر دیا ہے۔“ عمران نے بردباری سے اسے سمجھایا تو وہ فوراً ہی قائل ہو گئی اور عمران کی پیروی کرتے ہوئے خود بھی ڈبل روٹی کے ٹکڑے تیزی سے حلق سے نیچے اتارتے ہوئے کافی کے بڑے بڑے گھونٹ بھرنے لگی۔ پانچ منٹ بعد وہ ناشتے سے فارغ ہو چکی تھی۔ اس اثنا میں عمران جو کہ پہلے ہی ناشتے کو منٹا چکا تھا، ناشتے کی تیاری کے لیے نکالا جانے والا سامان واپس رکھ چکا تھا۔ وہ ناشتے سے فارغ ہوئی تو انہوں نے ایک بار پھر سفر کا آغاز کر دیا۔ ابھی وہ مشکل سے چند گز ہی آگے بڑھے تھے کہ فضا میں فائر کی آواز گونجی اور اگلے ہی لمحے عمران کے منہ سے ایک درد بھری چیخ نکلی۔ اس چیخ کو سن کر ماہ بانو نے اس پر نظر ڈالی تو یہ دیکھ کر خوف زدہ ہو گئی کہ عمران کے بائیں شانے سے خون نکل کر اس کے اوئی لباس پر پھیلتا جا رہا ہے۔

”اپنا سر جھکا لو اور نیچے چھلانگ لگانے کی کوشش

سے بُری طرح پریشان ہو گیا تھا اور پریشانی کے عالم میں ادھر سے ادھر بھاگا پھر رہا تھا، یک دم ہی گولیوں کی زد میں آ گیا تھا۔ قوی ہیکل جانور کے گولی کھا کر تڑپنے کا وہ منظر بے حد دل دوز تھا۔ گولی کا زخم فوراً ہی اسے زمین بوس کرنے کے لیے کافی نہیں تھا۔ البتہ اس زخم کو کھا کر وہ غضب ناک ہو کر بُری طرح اچھل کود کرنے لگا تھا۔ اس کے پھاری قدموں کی دھمک فائرنگ کے شور کے باوجود سنی جاسکتی تھی۔

اپنی اس غضب ناکی میں وہ بے قابو ہو کر بھاگا اور سیدھا اس شخص سے جا کر ٹکرایا جو راتفل اٹھائے جھکا جھکا آگے آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ قوی ہیکل جانور کی نکر نے اسے کئی فٹ اور پراچھالا اور پھر وہ ایک دل دوز چیخ کے ساتھ دوبارہ زمین پر آ کر گرا۔ اس کی راتفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کئی گز دور جا گری اور پھر مرے پر سوڑے کے مصداق بھاری بھر کم مشعل یاک اسے روندنا ہوا آگے بڑھ گیا۔

یاک کے اس پر سے گزرنے کے بعد یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ اس کی گوئی ہڈی سالم رہی ہوگی یا وہ ایک کے بعد دوسرا سانس لے سکا ہوگا۔ زخمی یاک کو بھی زیادہ سانس لینے کا موقع نہیں ملا۔ وہ طیش کے عالم میں کچھ اور تباہی مچاتا، اس سے قبل ہی ایک سنسناتی ہوئی گولی آئی اور اس کے سر میں پیوست ہو گئی۔ یقیناً یہ گولی مرنے والے کے کسی ساتھی نے اپنے بھائی بند کی موت کا انتقام لینے کے لیے چلائی تھی۔

”وہ دیکھو... وہ راستہ اوپر کی طرف جارہا ہے۔ اگر ہم وہاں سے اوپر چلے جائیں تو بہتر پوزیشن میں آجائیں گے۔“ یاک کی موت کے بعد ماہ بانو نے عمران کی توجہ ایک تنگ سے راستے کی طرف مبذول کروائی۔ جس وقت عمران جوانی فائرنگ میں مصروف تھا، وہ ارد گرد کا جائزہ لینے کا ہی کام کرتی رہی تھی اور یہ راستہ اس کی نظر میں آ گیا تھا۔ عمران نے خود کو گھیرے جانے کا خدشہ ظاہر کیا تو اس نے حل کے طور پر اپنے ذہن میں آنے والی تجویز اس کے گوش گزار کر دی۔ عمران نے اس کی تجویز پر لمحے بھر کے لیے غور کیا تو اسے یہ ایک بہت ہی موزوں حل نظر آیا۔ بلندی کی طرف جانے کے باوجود اس راستے کی خوبی یہ تھی کہ وہ دونوں براہ راست فائرنگ کی زد میں نہیں آسکتے تھے۔ جگہ جگہ ابھری ہوئی چٹانیں انہیں اوپر تک پہنچانے کے لیے بہترین آڑ فراہم کر سکتی تھیں۔

”چلو... ہری آپ۔“ عمران نے ماہ بانو سے کہا اور خود اس راستے کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے یہ احتیاط کی تھی کہ کھڑے ہو کر سیدھے چلنے کے بجائے ہاتھ پیروں کے بل رینگتا ہوا اوپر چڑھ رہا تھا۔ اس طرح اگر کوئی دور سے دیکھ بھی

کرو۔“ پہلی بے ساختہ چیخ کے بعد خود پر قابو پاتے ہوئے اس نے بچتی ہوئی آواز میں ماہ بانو کو ہدایات دیں۔ اتنی دیر میں کچھ اور گولیاں بھی سائیں سائیں کرتی ہوئی ان کے آس پاس سے گزر چکی تھیں۔ دشمن نے ان کی توقع سے بہت قبل انہیں آلیا تھا اور اب ان کی فرار کی راہ مسدود کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ عمران جانتا تھا کہ بھاگنے کی کوشش کا رگر ثابت نہیں ہوگی کیونکہ تعاقب میں آنے والے اس راستے پر سفر کرنے میں ان سے زیادہ مہارت رکھتے تھے۔ اب ان کے پاس یہی چارہ تھا کہ وہ رک کر اپنے پیچھے آنے والوں کا مقابلہ کریں اور ان سے جان چھڑانے کے بعد آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔

ماہ بانو نے بھی بڑے خود کار انداز میں یہ بات سمجھ لی تھی، چنانچہ نیچے چھلانگ لگانے سے قبل از خود ایک راتفل اپنے ہاتھ میں لے لی۔ عمران یقیناً اس کی اس حرکت پر حیران ہوا ہوگا اور اس کے ذہن میں یہ سوال بھی ابھرا ہوگا کہ یہ تازک اندام لڑکی بھلا راتفل کا کیا کرے گی؟ لیکن یہ موقع کسی قسم کے سوال جواب کا نہیں تھا اس لیے وہ چپ رہا اور اسے ایک پہاڑی کی آڑ میں ہونے کا اشارہ کرتا ہوا خود بھی اس کی طرف دوڑ گیا۔ اس دوران میں ان پر مسلسل فائرنگ کی جاتی رہی تھی اور یہ محض خوش قسمتی تھی کہ وہ دونوں اب تک کسی گولی کی زد میں نہیں آئے تھے اور پہاڑی کی آڑ لینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

آڑ میں پہنچنے کے بعد عمران نے راتفل سیدھی کر کے اس سمت فائرنگ کرنا شروع کر دی جس طرف ان کے تعاقب میں آنے والے موجود تھے۔ اس جوانی فائرنگ کا کوئی خاص نتیجہ اس لیے نہیں نکل سکا کہ آنے والے بھی اپنے تحفظ کا خیال رکھتے ہوئے آڑ میں چھپے ہوئے تھے۔ دو تین منٹ تک دونوں طرف سے فائرنگ کا سلسلہ جاری رہا۔ ماہ بانو نے اگرچہ عمران کے پاس موجود فاضل راتفل ہاتھ میں لے لی تھی لیکن ابھی تک اس نے کوئی فائرنگ نہیں کیا تھا جبکہ دوسری طرف سے سنائی دینے والی فائرنگ کی آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ لوگ تعداد میں کم از کم تین سے چار ہیں۔

”وہ ہمیں گھیرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ یکا یک عمران کو احساس ہوا کہ فائرنگ پہلے کی طرح ایک سمت سے ہونے کے بجائے مختلف سمتوں سے ہو رہی ہے تو وہ سرسراپی ہوئی آواز میں ماہ بانو سے بولا۔ وہ جواب میں کچھ کہتی، اس سے قبل ہی سامنے نظر آنے والے منظر نے اس کی توجہ کھینچ لی۔ ان کی سواری کا کام دینے والا یاک جو کہ اس سارے ہنگامے

رہا ہوتا تو وہ فوراً اس کی نظر میں نہیں آسکتا تھا۔ ماہ بانو نے بھی اس کی تھلید کرتے ہوئے اوپر چڑھنے کے لیے یہی طریقہ اختیار کیا۔ اب فائرنگ کی آوازیں جس طرح سے سنائی دے رہی تھیں، اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ دشمن ان کی سابقہ پناہ گاہ سے بہت قریب پہنچ چکا ہے۔

پھر یکایک فائرنگ رک گئی۔ یعنی طور پر وہ لوگ عمران کی طرف سے فائرنگ کا سلسلہ بند ہونے پر سوچ میں پڑ گئے تھے۔ خاموشی چھا جانے پر وہ دونوں اور بھی تیزی سے بلندی تک کا سفر طے کرنے لگے۔ اسی تیزی کی وجہ سے ماہ بانو سے ذرا سی بے احتیاطی ہوئی اور اس کے پیر تلے آنے والا ایک پتھر اپنی جگہ سے ہٹ کر نیچے کی طرف لڑھکتا چلا گیا۔ پتھر کے لڑھکنے کی آواز نے انہیں گھبرانے کی کوشش کرنے والوں کو متوجہ کر دیا۔ فوراً ہی ایک فائر ہوا اور ماہ بانو کے منہ کے قریب چٹان کے کئی ٹکڑے ادھر ادھر اڑے۔ ایک ٹکڑا سا ٹکڑا اس کی پیشانی سے بھی آکر ٹکرایا اور اس نے شدید تکلیف کے ساتھ ساتھ پیشانی سے خون بھی نکل کر بہتا ہوا محسوس کیا لیکن موجودہ صورت حال میں یہ تکلیف کچھ بھی نہیں تھی۔

وہ فائر کی زد میں آنے سے بال بال بچی گئی۔ اگر اس پر فائر کرنے والے کا نشانہ نہ چوکتا تو چٹان کے بجائے اس کی گھوڑی کے ٹکڑے ادھر ادھر اڑ رہے ہوتے۔ اس نے بری طرح گھبرا کر خود کو ایک چٹان کی آڑ میں چھپایا اور پلٹ کر اس طرف دیکھنے کی کوشش کی جہاں سے فائر ہوا تھا۔ اگلے ہی لمحے اس نے بلند چیخ کے ساتھ ایک شخص کو نیچے گرتے ہوئے دیکھا۔ یہ عمران کا کارنامہ تھا جو اس سے پہلے مطلوبہ مقام تک پہنچ گیا تھا اور ماہ بانو پر فائر کرنے والے کے نظر میں آ جانے پر اس نے اسے ٹھکانے لگا دیا تھا۔

ماہ بانو نے ایک گہرا سانس لیا اور مزید اوپر چڑھنے کا ارادہ ترک کر کے اسی چٹان کی آڑ میں بیٹھ کر ارد گرد کا جائزہ لینے لگی۔ اس کو نشانہ بنانے کی کوشش کرنے والے کی موت کے بعد دوستوں سے ان پر بڑی شدت سے فائرنگ کی جانے لگی تھی۔ فائرنگ کی آواز سے دشمن کی پوزیشن کا اندازہ کرتے ہوئے اس نے اپنے پاس موجود رائفل سیدھی کی اور دائیں طرف موجود شخص کو اس کی فائرنگ کا جواب دیا۔ اسے میدان عمل میں اترتے دیکھ کر عمران کو کچھ تقویت سی محسوس ہوئی۔ اب تک وہ بہت بلند امتی کا مظاہرہ کرتا رہا تھا، ورنہ زخمی شانے کے ساتھ مسلسل فائرنگ کرنا اور اتنی بلندی پر چڑھنا آسان نہیں تھا۔ بلندی پر پہنچ جانے کے بعد البتہ یہ فائدہ ضرور ہوا تھا کہ وہ بہتر پوزیشن پر آ گیا تھا اور اس کو اندازہ ہو گیا تھا کہ حملہ

آور کہاں سے فائرنگ کر رہے ہیں۔ بائیں طرف والے نے ایک بڑے سے پتھر کی آڑ میں پناہ لے رکھی تھی جبکہ دائیں طرف والا ایک چھوٹی چٹان کے پیچھے تھا۔

عمران اکا دکا فائر کرتے ہوئے اس تاک میں لگا ہوا تھا کہ ان دونوں میں سے کسی سے غلطی ہو اور وہ جوش میں آکر اپنی پناہ گاہ سے جسم کا کوئی عضو باہر نکالنے کی غلطی کرے تو وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا سکے۔ آخر کار بائیں جانب والے نے اسے یہ موقع فراہم کر دیا۔ اس کی طرف سے فائرنگ میں وقفے کی وجہ سے اس نے شاید کوئی چانس لینے کی کوشش کی تھی لیکن اس کی یہ کوشش اسے مہنگی بڑی اور جوئی اس کا سر پتھر کی آڑ سے باہر آیا، عمران کی رائفل سے نکلی ہوئی گولی سیدھی جا کر اس کی پیشانی میں پیوست ہو گئی۔ وہ بغیر آواز نکالے ڈھیر ہو گیا۔ اب صرف ایک دشمن باقی رہا تھا جس سے انہیں اپنی جان چھڑانی تھی لیکن وہ بے حد محتاط تھا اور اس نے اپنی پناہ گاہ سے انگلی تک باہر نکالنے کی غلطی نہیں کی تھی۔ یقیناً اس نے اپنے ساتھی کی رائفل خاموش ہونے پر اس کی موت کا اندازہ لگالیا ہوگا۔

”خبیث... بھاگنے کی کوشش کر رہا ہے۔“ یک دم ہی عمران کو احساس ہوا کہ مقابل کی طرف سے فائر تو کیا جا رہا ہے لیکن اس کی آواز دور ہوئی جا رہی ہے۔ سو وہ غصے سے بڑبڑایا اور پھر ہونٹ بھیجتے ہوئے اپنے پاس موجود ہینڈ گریینیڈ نکالا۔ اگلے ہی پل اس کے دائیں بازو نے فضا میں قوس بناتے ہوئے حرکت کی اور ہینڈ گریینیڈ درمیان کا اچھا خاصا فاصلہ طے کرتا ہوا اس چٹان کے عقب میں جا کر گرا جس کے پیچھے ان کا آخری دشمن اب تک چھپا رہا تھا۔

پہاڑوں میں ایک کان پھاڑ دھماکا گونجا اور چٹان کے عقب سے مٹی اور پتھروں کے اٹھتے طوفان کے ساتھ اس نے انسانی اعضا کو بھی اڑتے ہوئے دیکھا۔ دل کو کپکپا دینے والے اس منظر نے وقت کے اس پل میں اسے حقیقتاً بے حد سکون بخشا تھا۔ کسی انسان کی ایسی عبرت ناک موت لاکھ ناپسندیدہ سہی لیکن یہ سچ تھا کہ جو لوگ ابھی اس کے ہاتھوں مارے گئے تھے، اسے ان میں سے کسی کی بھی موت کا افسوس نہیں تھا۔ ان افراد کی موت نے اس کے اور ماہ بانو کے علاوہ اور بھی بہت سے انسانوں کی زندگی کو بچا بخشی تھی۔ وہ جواب بھی ان پہاڑوں میں حقیر چوہوں کی طرح مارے گئے تھے، درحقیقت خود چلتی پھرتی موت تھی... جو اگر جیتے تو جانے کتنوں کی زندگیوں کا چراغ گل کر ڈالتے۔

آخری دشمن کے بھی موت کے گھاٹ اتر جانے کے

بعد عمران کچھ ٹھٹھا حال سا ہو کر وہ اپنی جگہ پر ہی لیٹ گیا۔ ماہ بانو جو کہ اس لڑائی میں کسی دشمن کو ٹھکانے نہیں لگا سکی تھی لیکن عمران کی معاونت کرتی رہی تھی، امن ہو جانے پر اپنی پناہ گاہ سے نکل کر اس کے پاس آئی۔

”تمہارا تو بہت زیادہ خون بہہ رہا ہے۔“ عمران کے خون سے تر لباس کو دیکھ کر اس نے تشویش سے کہا اور پھر اس کے قریب بیٹھ کر اس کے زخمی شانے کا معائنہ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

”میں ٹھیک ہوں۔ میرے خیال میں ہمیں یہاں مزید ٹھہرنے کا خطرہ مول لینے کے بجائے آگے کا سفر شروع کرنا چاہیے۔“ عمران نے اسے معائنے کے لیے اپنا زخمی شانہ پیش کرنے کے بجائے آہستہ سے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر واپس نیچے کی طرف جانے لگا۔ ماہ بانو نے بھی کچھ سوچتے ہوئے خاموشی سے اس کی پیروی کی۔ وہ دونوں انسانی لاشوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اس مقام تک پہنچے جہاں ان کی سواری کا کام دینے والے پاک کا مردہ جسم پڑا ہوا تھا۔ ان کے سامان کا تھیلہ اب بھی پاک کی پشت سے بندھا تھا اور سواری سے محروم ہو جانے کے باوجود یہ بات خوش آئند تھی کہ پاک ایسے رخ سے گرا تھا کہ ان کے سامان کا تھیلہ اس کے دیوہیکل جسم کے نیچے آنے سے محفوظ رہا تھا، ورنہ دوسری صورت میں وہ دونوں کسی طور بھی اس کے پہاڑ جیسے وجود کو ہٹا کر اس کے نیچے سے اپنا سامان نہیں نکال سکتے تھے۔

”یہ تو کیا۔ اب ہمیں پیدل ہی سفر کرنا ہوگا۔“ پاک پر سے اپنا تھیلہ اتارتے ہوئے عمران بولا۔

”ہمارے تعاقب میں آنے والے بھی تو کسی سواری پر آئے ہوں گے۔“ اس کی بات سن کر ماہ بانو نے پر خیال لہجے میں کہا۔

”یہ لوگ دو یا کون پر آئے تھے لیکن وہ دونوں پاک فائرنگ کے شور سے بدک کر بہت پہلے ہی یہاں سے بھاگ چکے ہیں۔ اب اگر ہم نے کسی طرح ان پاکوں کو تلاش بھی کر لیا تو ان پر قابو پا کر ان پر سواری نہیں کر سکیں گے۔“ عمران نے سنجیدگی سے اس کی بات کا جواب دیا اور سامان کے تھیلے میں سے ایک نسبتاً چھوٹا تھیلہ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

”میں شرمندہ ہوں لیکن مجبوری ہے کہ تمہیں بھی اس سفر میں کچھ وزن اٹھانا پڑے گا۔“ وہ یقیناً اپنے زخمی شانے کی وجہ سے ایسا کہہ رہا تھا۔

”سامان میں دوائیں وغیرہ بھی موجود ہیں یا نہیں؟“ اس کے ہاتھ سے تھیلہ تھامتے ہوئے ماہ بانو نے سنجیدہ لہجے

میں پوچھا۔

”بالکل ہیں بلکہ اسی تھیلے میں ہیں جو میں نے ابھی تمہیں دیا ہے۔“

”ٹھیک ہے تو پھر تم کچھ دیر آرام سے بیٹھ جاؤ۔ پہلے میں تمہارے زخمی شانے کی مرہم پٹی کروں گی پھر ہم آگے کا سفر کریں گے۔“ عمران کا جواب سن کر وہ تحکمانہ لہجے میں بولی۔

”میرا خیال تھا کہ ہم کچھ فاصلہ طے کر لیتے پھر اس کے بعد یہ مرہم پٹی کا کام ہوتا رہتا۔“ عمران نے انکار کرنا چاہا۔

”نہیں، تم بہت زخمی ہو اور اس حالت میں تمہارا وزن اٹھا کر ایسے ہی سفر جاری رکھنا مناسب نہیں۔“ ماہ بانو کے انداز میں جو قطعیت تھی، اس سے عمران کو اندازہ ہو گیا کہ وہ اپنی بات سے پیچھے نہیں ہٹے گی چنانچہ اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ ماہ بانو نے اچھی خاصی مہارت سے کام لیتے ہوئے اس کے زخمی شانے کی مرہم پٹی کی اور دواؤں میں موجود ایک پین کرا سے کھانے کے لیے دی۔ کالج میں بھی شوق میں لی جانے والی فرسٹ ایڈ کی ٹریننگ اس ویران برفانی پہاڑی علاقے میں کام آئے گی، اسے کبھی گمان بھی نہیں گزرا تھا۔ اس وقت اس نے اپنی تربیت کی اچھی خاصی لالچ رکھتے ہوئے عمران کی ٹھیک ٹھاک قسم کی بیینڈج کر تو دی تھی لیکن اسے یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ گولی اندر ہی موجود ہے اور وہ اس گولی کو نکالنے سے معذور تھی۔ اس کام کے لیے نہ تو اس کے پاس مطلوبہ مہارت تھی اور نہ ہی سامان۔ وہ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ جلد از جلد کسی محفوظ پناہ گاہ تک پہنچ جائیں جہاں طبی سہولتیں بھی میسر آسکیں۔ پھر اس نے عمران کی معیت میں آگے کا سفر شروع کر دیا۔ ایک ایسا سفر جس کے راستوں کا انہیں علم نہیں تھا۔ وہ جسے ان راستوں پر چلنے کی تربیت دی گئی تھی، ایک مٹی کے تودے کی طرح بے جان پڑا تھا۔ ایک جانور کی موت نے انہیں سواری ہی نہیں راہنما سے بھی محروم کر دیا تھا اور اب وہ اپنا بوجھ خود اٹھائے انجانے راستوں پر تن بہ تقدیر سفر کرنے پر مجبور تھے۔

☆☆☆

”تم یہیں رکو، اندر میں اکیلی جاؤں گی۔“ درگاہ کے احاطے میں پہنچنے کے بعد کثور نے اپنے ساتھ آئی ہوئی شادو سے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

”لیکن بی بی... وڈی چودھرائن نے تو کہا تھا کہ میں آپ کے ساتھ ساتھ رہوں۔“ اس نے فوراً ہی اعتراض کیا۔

کشور کی درگاہ پر حاضری کی خواہش پر وڈی چودھرائن نے یوں تو کوئی اعتراض نہیں کیا تھا لیکن اپنی خاص ملازماؤں میں سے شاد کو اس کے ساتھ روانہ کر دیا تھا۔ حویلی کی عورتیں تنہا صرف ڈرائیور کے ساتھ کہیں جاتی تھیں۔ ایسے ہر موقع پر ان کے ساتھ کوئی نہ کوئی ملازمہ ضرور موجود ہوتی تھی لیکن کشور جانتی تھی کہ اس وقت شاد کو اس کے ساتھ بھیجے کا مقصد روایت کی پاسداری نہیں بلکہ اس کی نگرانی ہے اور اب شاد کو کے جملے نے اس بات کی تصدیق بھی کر دی تھی۔

”ساتھ رہنے کو کہا تھا یہ تو نہیں کہا تھا کہ میرے سر پر ہی سوار ہو جانا۔ یہاں تک ساتھ آگئی ہے نا، بس کافی ہے۔ اندر حاضری کے وقت میں تجھ کو اپنے سر پر نہیں برداشت کر سکتی۔ حویلی واپس جا کر تو وڈی چودھرائن کو بتا دینا کہ میں نے تجھے باہر روک دیا تھا۔“ کشور نے سخت لہجے میں اسے جھڑک کر اپنے ساتھ اندر جانے سے روک دیا۔ وہ عموماً ملازماؤں سے ایسا برتاؤ کرنے کی عادی نہیں تھی لیکن اس وقت صورت حال ایسی تھی کہ اسے شاد کو سے اپنا پیچھا چھڑانے کے لیے ایسا لہجہ اختیار کرنا پڑا۔ ویسے بھی چھٹی، شاد کو اور ان کی یاں جس طرح ہر وقت بڑی چودھرائن کی چچہ گیری کرتی رہتی تھیں، اسے ان سے کچھ چڑی ہو گئی تھی۔

”لا، یہ مجھے دے۔“ شاد کو جھڑکی سن کر تذبذب کے عالم میں کھڑی تھی کہ اسے مزید کچھ بھی کہنے کا موقع دیے بغیر اس نے اس کے ہاتھ میں موجود بڑا سا تھال خود تھام لیا اور حسب قاعدہ پیروں سے چل اتار کر اس بڑے سے ہال میں داخل ہو گئی جس کے بالکل وسط میں اس کے دادا چودھری مراد عالم شاہ کی قبر بنائی تھی۔ اس کا حتمی انداز دیکھتے ہوئے شاد کو ہمت نہیں کر سکتی تھی کہ اس کے پیچھے اندر داخل ہو۔ اس نے اندر پہنچ کر دروازہ بند کر دیا اور کٹڈی چڑھا دی۔ قیمتی سنگ مرمر لگی دیواروں والے اس ہال کے اندر ٹھنڈک کا احساس تھا۔ مختلف مقامات پر لگے بلبس کے علاوہ عین قبر کے اوپر موجود بڑے سے فانوس کی دودھیاروشنی نے ماحول میں ایک عجیب سا تقدس بھرا احساس پیدا کر دیا تھا۔ اس احساس کو تقویت دینے کے لیے وہ خوشبو میں بھی اہم کردار ادا کر رہی تھیں جنہیں قبر پر موجود چادر کے علاوہ دیواروں پر بھی چھڑکا گیا تھا۔

سادہ لوح آن پڑھ دیہاتی یہ سب دیکھ کر بے حد متاثر ہوتے تھے اور ان کے دینی تعلیم و شعور سے ناواقف ذہن اندھی عقیدت کے تاریک گڑھے میں بھٹکتے لگتے تھے۔ لیکن کشور کے لیے یہ سب کچھ کسی ڈرامے کے سیٹ سے زیادہ

نہیں تھا۔ وہ اندازہ کر سکتی تھی کہ جس شخص کی تربیت نے اس کے باپ جیسے شیطان صفت آدمی کو جنم دیا ہے، وہ خود اخلاقی اعتبار سے کس قدر پستی میں ہوگا۔ ایسے شخص سے کسی بھی قسم کی عقیدت محسوس کرنا اس کے لیے ناممکن تھا۔ یوں بھی اس کا شعور اسے قبروں کی پوجا سے روکتا تھا چنانچہ وہ اس سارے سیٹ اپ سے ذرا بھی متاثر ہوئے بغیر سپاٹ سے انداز میں چلتی ہوئی قبر کے قریب پہنچی اور اپنے ہاتھ میں موجود تھال اس کے سر ہانے رکھ دیا۔ اس تھال میں جلنا ہوا دیا، سبز رنگ کی قیمتی چادر، گلاب کے پھول، خشک میوہ جات اور نذرانے کی موٹی رقم موجود تھی۔

درگاہ پر حاضری کے لیے آنے والوں کے لیے مثال قائم کرنے کی خاطر حویلی کے مکین وقتاً فوقتاً اسی اہتمام کے ساتھ یہاں آتے رہتے تھے۔ حویلی کے مکینوں کی پیروی کرتے ہوئے دوسرے لوگ بھی کوشش کرتے کہ اسی طرح کا اہتمام کر سکیں۔ باہر سے آنے والا کوئی بھی شخص اپنے ساتھ نذرانے کے لیے جو کچھ بھی لاتا، درگاہ کے خدام اسے فوراً قبضے میں لے لیتے لیکن چونکہ اس وقت چودھری افتخار عالم شاہ کی بیٹی وہاں حاضری دینے آئی تھی، اس لیے کسی خادم کو اجازت نہیں تھی کہ وہ اس ہال میں رک سکے۔ اس کی وہاں موجودگی تک دیگر عقیدت مندوں کا بھی وہاں آنا ممکن نہیں تھا بلکہ انہیں تو درگاہ کے احاطے میں بھی آنے کی اجازت نہیں تھی۔ بی بی کشور اپنے دادا کی قبر پر چڑھاوا چڑھا کر واپس جاتی تو پھر عام لوگ اپنی عقیدت مندی کے اظہار اور حاجات کے بیان کے لیے یہاں قدم رکھ سکتے تھے۔ اب یہ الگ بات تھی کہ کشور بی بی کا یہاں سے واپس حویلی لوٹنے کا کوئی پروگرام ہی نہیں تھا۔ وہ یہاں سے نئی دنیاؤں کے سفر پر روانہ ہونے کا ارادہ کر کے حویلی سے نکلی تھی، چنانچہ نذرانوں سے بھرے تھال کو قبر کے سر ہانے پٹخنے کے بعد پھرتی سے چلتی ہوئی ہال کے اس دروازے کی طرف بڑھی جو دوسری سمت میں موجود تھا۔

عرس وغیرہ کے موقع پر جب درگاہ پر لوگوں کا بے حد رش ہوتا تھا، صرف ایک دروازہ کافی نہیں ہوتا تھا۔ لوگ اندر داخل ہونے اور باہر نکلنے کے چکر میں ایک دوسرے کو روندنے لگتے تھے۔ چنانچہ اس بد نظمی پر قابو پانے کے لیے ہال کی چاروں دیواروں میں ایک ایک دروازہ لگا دیا گیا تھا۔ عام دنوں میں تین دروازے بند رہتے تھے اور صرف وہ ایک دروازہ کھلا رکھا جاتا تھا جس سے گزر کر کشور اندر داخل ہوتی تھی۔ اپنے باہر نکلنے کے لیے اس نے تین بند دروازوں میں

سے اس دروازے کا انتخاب کیا تھا جو درگاہ کی عقبی دیوار سے سب سے زیادہ نزدیک تھا۔

دروازے کی موٹی کٹڈی اندر سے بند تھی لیکن اس پر کوئی تالا وغیرہ نہیں لگا تھا۔ کشور نے ہاتھ بڑھا کر اس کٹڈی کو کھولنے کی کوشش کی تو اسے اندازہ ہوا کہ وہ کافی سختی سے بند ہے اور اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر رہی ہے۔ شاید بہت کم استعمال ہونے کی وجہ سے کٹڈی جام ہو گئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں کا زور لگا کر اسے کھولنے کی کوشش کی۔ زیادہ طاقت کے استعمال سے کٹڈی نے تھوڑی سی حرکت تو ضرور کی لیکن ساتھ ہی رگڑ کا شور بھی بلند ہوا۔ یہ شور کسی کو اپنی طرف متوجہ کر سکتا تھا، خصوصاً باہر موجود شاد کو کی طرف سے اسے خطرہ تھا کہ وہ بے شک اس کے ساتھ اندر داخل نہیں ہو سکی ہے لیکن کان اسی طرف لگا کر کھڑی ہوگی کہ کوئی بھی غیر معمولی بات ہو تو فوراً اس کے علم میں آسکے۔

اس نے کٹڈی پر زور لگانا چھوڑ کر لمحہ بھر کے لیے اس مسئلے کا حل سوچا اور پھر پلٹ کر قبر کی طرف آئی۔ سر ہانے رکھے تھال میں موجود دیا ہنوز جل رہا تھا۔ اس نے پھونک مار کر اسے بجھایا اور تھال سے اٹھا کر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ دیا ہاتھ میں لیے وہ واپس دروازے کی طرف آئی اور اس میں موجود تیل کٹڈی پر ڈالنے لگی۔ کٹڈی کو تیل دینے کے بعد اس نے تقریباً تیس سیکنڈ تک انتظار کیا اور ایک بار پھر اس پر طبع آزمائی کرنے لگی۔ اس بار کٹڈی نسبتاً آسانی سے اور کم شور کے ساتھ حرکت کرنے لگی۔

اس نے مستقل مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوری کٹڈی کھلنے تک اپنے ہاتھوں کو نہیں روکا۔ اس ذرا سی مشقت پر اس کی آئندہ زندگی کا دار و مدار تھا چنانچہ وہ کسی طور پیچھے نہیں ہٹ سکتی تھی۔ کٹڈی کھلی تو اس نے بے حد احتیاط سے زور لگا کر دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی شام کی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا۔ کٹڈی کھولنے کی مشقت میں اس کے چہرے پر پسینے کی بوندیں ابھر آئی تھیں۔ ہوا کا جھونکا چہرے سے ٹکرایا تو اس نے بڑی فرحت محسوس کی اور ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہوئے قدم باہر رکھ دیے۔

مغرب کا وقت قریب تھا چنانچہ ماحول اتنا روشن نہیں تھا۔ شام کے اترتے سایوں نے دن کی روشنی کو شکست دینا شروع کر دی تھی۔ درگاہ کے احاطے کی لائیں بھی فی الحال روشن نہیں کی گئی تھیں اس لیے بھی کچھ اندھیرا سا ہو رہا تھا۔ اس کے لیے یہ نیم تاریکی ایک نعمت کے مانند تھی۔ وہ محتاط قدموں سے چلتی ہوئی احاطے کی دیوار کی طرف بڑھنے لگی۔ اسے

آفتاب نے یہیں تک کے ایکشن کے بارے میں ہدایات دی تھیں۔ اس کے مطابق آگے کے معاملات وہ خود سنبھال لیتا۔ وہ اپنے جیسے کام کرنے کے بعد کچھ ہراساں سی عقبی احاطے میں کھڑی تھی کہ کسی نے آہستہ سے اسے پکارا۔

”کشور بھابی! آجیں، میرے ساتھ آجائیں۔“ اس پکار پر وہ چونک کر پلٹی تو افضل کی جانی پہچانی شکل نظر آئی۔ اسے دیکھ کر اس نے اپنے دل میں طمانیت کی ایک لہری دوڑتی ہوئی محسوس کی اور وہ بنا کوئی سوال جواب کیے اس کے ساتھ چل پڑی۔

”یہاں سے باہر نکلنے کا اور کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے اس لیے آپ کو تھوڑی سی زحمت کرنی پڑے گی۔ ویسے دیوار زیادہ بلند نہیں ہے۔ آپ میری پیٹھ پر پیر رکھ کر آرام سے اس پر چڑھ سکتی ہیں۔“ وہ چند قدم چلنے کے بعد دیوار کے قریب پہنچے تو افضل نے اس سے کہا۔ کشور جو دیوار کی جڑ میں بے ہوش پڑے آدمی کو دیکھ کر الجھ گئی تھی، اس کی بات سن کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ زمین پر گھٹنوں اور کہنیوں کے بل گھوڑا بنا ہوا تھا۔ بے ہوش آدمی کے مخصوص سبز لباس کی وجہ سے یہ اندازہ لگانے کے بعد کہ وہ درگاہ کا کوئی خادم ہے، جو یقیناً اس طرف پہرے کا فریضہ انجام دے رہا تھا اور افضل کے ہاتھوں اس حالت کو پہنچا ہے، وہ افضل کی ہدایت کے مطابق اس کی پیٹھ پر چڑھ گئی۔

وہ دیوار پر چڑھی تو افضل پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا اور اچک کر خود بھی دیوار پر چڑھ گیا اور دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔ دوسری طرف پہنچنے کے بعد اس نے کشور کو سہارا دے کر آہستہ سے نیچے اتار لیا۔ احاطے کی دوسری طرف دور تک گھنی جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں اور لوگوں کا عموماً اس طرف گزرنہ ہونے کی وجہ سے یہ جگہ زیادہ تر سنسان ہی پڑی رہتی تھی، اسی لیے کشور کے فرار کا منصوبہ بناتے وقت اس جگہ کا انتخاب کیا گیا تھا۔ کشور دیکھ سکتی تھی کہ وہاں ایک گاڑی کھڑی ہے اور گاڑی کی عقبی نشست پر ایک نقاب پوش عورت بھی موجود ہے۔ عورت کے بارے میں اس نے فوراً ہی اندازہ لگا لیا کہ وہ افضل کی بیوی مہتاب ہے۔ افضل نے گاڑی کا عقبی دروازہ کھول کر اسے اندر بٹھایا تو اس کے اندازے کی تصدیق بھی ہو گئی۔ مہتاب نے والہانہ انداز میں اسے اپنے گلے سے لگا کر پیار کرتے ہوئے سلام کیا جس کا کشور نے گرم جوشی سے جواب دیا۔ البتہ افضل ان دونوں کی طرف سے یکسر انجان بنا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کر چکا تھا اور اب اس کی گاڑی فرائے بھرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ کشور جو پہلے

ہی خود کو چادر سے ڈھانپے ہوئے تھی، تھوڑا سا اور گھونگھٹ نکال کر بیٹھ گئی۔ ابھی وہ لوگ گاؤں کی حدود میں موجود تھے چنانچہ اس کے لیے بہت زیادہ خطرہ تھا۔ وہ اپنے ساتھ ساتھ افضل اور مہتاب کی سلامتی کے لیے بھی پریشان تھی۔

اگر کسی کے علم میں یہ بات آجاتی کہ وہ اسے لے کر یہاں سے فرار ہو رہے ہیں تو اس سے پہلے ان لوگوں کو بدترین انجام سے دوچار ہونا پڑتا۔ زیرِ لب دعا میں مانگتے ہوئے، دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے وہ سارا راستہ طے کیا۔ مہتاب اور افضل کی خاموشی سے بھی پتا چل رہا تھا کہ وہ لوگ بھی اعصابی تناؤ کا شکار ہیں۔ کشور کو پیر آباد سے نکال کر لے جانا شیر کی کچھار میں ہاتھ ڈالنے کے برابر تھا۔ چنانچہ ان کا اعصاب زدہ ہونا کچھ ایسا انوکھا بھی نہیں تھا۔

”آفتاب کہاں ہیں؟ وہ آپ لوگوں کے ساتھ کیوں نہیں آئے؟“ گاڑی پیر آباد کی حدود سے کافی آگے نکل کر بڑی سڑک تک پہنچی تو کشور نے سکون کا سانس لیتے ہوئے بہت دیر سے ذہن میں انکا ہوا سوال دہمی آواز میں مہتاب سے کیا۔

”آفتاب کو میں نے جان بوجھ کر اپنے ساتھ نہیں رکھا۔ اس کے کسی بھی طرح کے شک سے محفوظ رہنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ یہیں سب کی نظروں کے سامنے موجود رہے۔“ دہمی آواز کے باوجود اگلی نشست پر موجود افضل نے اس کا سوال سن لیا تھا چنانچہ خود اسے جواب دیا۔

”تمہیں یہاں سے نکال کر لے جانے کے ساتھ ساتھ ہمارے لیے تم دونوں کے مستقبل کی سلامتی بھی بہت اہمیت رکھتی ہے، چنانچہ ہم نے بہت سوچ سمجھ کر اور بڑی عرق ریزی کے ساتھ ساری منصوبہ بندی کی ہے۔ آفتاب نے جو منصوبہ بنایا تھا، وہ بہت زیادہ پرخطر تھا۔ افضل نے دماغ لڑا کر اس کی خطرناکی کو ذرا کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں اور افضل اس وقت تنہا پیر آباد نہیں آئے ہیں۔ ہمارے ساتھ ایک اور گاڑی میں میڈیا کے چند دوسرے نمائندے موجود تھے جو افضل کے ایما پر پیر آباد اور ارد گرد کے دوسرے دیہاتوں میں ہونے والے ترقیاتی کاموں پر ایک رپورٹ تیار کر کے اپنے چینل پر چلائیں گے۔ وہ لوگ چینل کی گاڑی میں آئے ہیں جبکہ ہم نے یہ کار کرائے پر لے لی تھی۔ چینل کے جو نمائندے ہمارے ساتھ آئے ہیں، انہیں ہمارے اس منصوبے کا کچھ علم نہیں۔ افضل نے ان سے کہا تھا کہ میری بیوی کو دیہاتی زندگی دیکھنے کا بہت شوق ہے اور وہ اس دورے پر میرے ساتھ جانا چاہتی ہے اس لیے میں آپ کی گاڑی کے بجائے

الگ گاڑی میں چلوں گا۔ ان لوگوں کو ظاہر ہے کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ پروگرام چونکہ سارا افضل نے ترتیب دیا تھا، اس لیے ہمیں آفتاب کے تم سے ملے کیے گئے وقت کے مطابق درگاہ تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ بس مجھے ذرا سی ایکٹنگ کرنی پڑی۔“ یہ جملہ کہتے ہوئے مہتاب دھیرے سے ہنسی۔

”ایکٹنگ... وہ کیوں؟“ کشور نے حیرت سے پوچھا۔ ”ہمیں یہاں سے اپنی قبل از وقت روانگی کے لیے کوئی بہانہ چاہیے تھا چنانچہ میں نے عین موقع پر یہ ڈراما شروع کر دیا کہ میرے گردے میں شدید درد ہو رہا ہے۔ افضل نے اپنے ساتھیوں سے معذرت کی کہ وہ مزید ان کے ساتھ نہیں ٹھہر سکتے کیونکہ انہیں اپنی وائف کو اسپتال لے جانا پڑے گا۔ بس پھر ہم بہانے سے وہاں سے نکل آئے۔ تمہارے مپاں جی البتہ گھرے ہوئے تھے میڈیا والوں کے درمیان اور انہیں بتا رہے تھے کہ کس طرح ان کا اسکول ترقی کے مدارج طے کر رہا ہے۔ میں آتے آتے ان چھپے رستم کو آنکھ مار کر آئی ہوں۔ بے چارے بڑے جھینپے لیکن سب کے سامنے مجھے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے تھے۔“ مہتاب نے اپنی بات کے اختتام پر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ جوں جوں وہ لوگ فاصلہ طے کرتے جا رہے تھے، اعصابی تناؤ کم ہوتا جا رہا تھا اور ان کی حرکات و سکنات اور رویے میں واضح فرق نظر آ رہا تھا۔

”منصوبہ تو واقعی آپ لوگوں نے بہت اچھا بنایا ہے۔ اگر آپ لوگ چینل والوں کے ساتھ آنے کے بجائے ایسے ہی آجاتے تو گاڑی کی وجہ سے فوراً ہی اباجی کے کارندوں کی نظر میں آجاتے اور پھر وہ لوگ آپ کی یہاں آمد کا مقصد جانے بغیر آپ کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔“ کشور جو اس کی بات پر خود بھی دھیرے سے ہنسی تھی، سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے حسین آمیز لہجے میں بولی۔

”اس منصوبے سے ہمیں ہی نہیں آفتاب کو بھی بہت سیفٹی ملے گی۔ جس وقت آپ کے گاؤں سے غائب ہونے کا واقعہ پیش آیا ہے، وہ مسلسل سب کی نظروں کے سامنے رہا ہے۔ پھر چینل والوں کی موجودگی سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ گاؤں کے بیشتر لوگ نیوی والوں کو دیکھ کر ان کی طرف متوجہ ہو گئے اور ہمیں میدان صاف مل گیا۔“ افضل نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے اس سارے معاملے کے مزید پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔

”میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں افضل بھائی۔ آپ اور مہتاب بھائی اتنا ساتھ نہیں دیتے تو میں بڑی مشکل میں پڑ

جاتی۔“ کشور کی آنکھوں میں ایک دم نمی اتر آئی۔ ”بے وقوف... اس میں شکریہ ادا کرنے کی کیا بات ہے۔ تم ہمارے لیے چھوٹی بہنوں جیسی ہو۔ اس مشکل کھڑی میں ہم تمہارا ساتھ نہ دیتے، یہ کیسے ممکن تھا۔“ مہتاب نے اسے آہستہ سے اپنے ساتھ لگایا۔

”مہتاب ٹھیک کہہ رہی ہے بھابی! ویسے بھی مجھے تو لڑکی بھگانے کا پرانہ تجربہ ہے۔ ضرورت پڑنے پر یہ تجربہ میرے دوست کے کام آگیا تو اس میں کیا حرج ہے۔“ افضل نے بھی شوخ لہجے میں بولتے ہوئے ماحول کی اداسی کو کم کرنے کی کوشش کی۔

”فضول نہ بولیں۔ اللہ نہ کرے کہ ہم بلا وجہ کسی لڑکی کو اس کے گھر سے نکلنے کی ترغیب دیں۔ میرے اور کشور کے کیس میں صرف محبت گھر چھوڑنے کا سبب نہیں بنی ہے۔ ہم دونوں ایسی خواتین ہیں جنہیں اگر اپنے گھر والوں کی محبت اور اعتماد حاصل ہوتا تو ہم ہرگز گھر کی دہلیز پار نہیں کرتے لیکن جب ہم نے دیکھا کہ ہمارے اپنے ہمارے بنیادی حقوق سلب کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تو ہمیں مجبوراً یہ قدم اٹھانا پڑا۔“ مہتاب نے افضل کی بات کا کچھ بُرا مانتے ہوئے فوراً ہی اسے ٹوکا۔

”سوری بیگم صاحبہ! آپ تو بُرا ہی مان گئیں۔ میرا ایسا کوئی مطلب نہیں تھا۔ میں صرف مذاق کر رہا تھا ورنہ میرے دل میں تمہاری جتنی قدر ہے، اس کے ہوتے ہوئے ممکن ہی نہیں کہ میں تمہارے لیے کوئی غلط لفظ استعمال کروں۔“ افضل نے جلدی سے معذرت کی۔

”مجھے معلوم ہے افضل... آپ صرف مذاق کر رہے تھے لیکن صرف اپنی مرضی سے میکے کی دہلیز پار کرنے والی عورت کے ساتھ یہ مسئلہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی بھر اس بات سے ڈرتی رہتی ہے کہ کہیں کوئی اسے ”بھاگی ہوئی عورت“ کا طعنہ نہ دے دے۔ اس لیے میں نہ چاہتے ہوئے بھی آپ کی بات کا بُرا مان گئی تھی۔“ مہتاب نے اس کی معذرت سن کر اداس سے لہجے میں اپنے رویے کی وضاحت کی تو کشور کا دل بھی عجیب سی اداسی میں گھر گیا۔

اداسی کے اس احساس کو ختم کرنے کے لیے اس نے موضوع گفتگو بدلا اور مہتاب کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ”یہ تو بتائیں بھابی کہ آپ کے وہ دونوں بلوگٹزے کہاں ہیں؟ آپ دونوں سیر کرنے کے لیے نکلے ہوئے ہیں تو انہیں کہاں چھوڑا ہے؟“

”وہ دونوں گھر پر ہی ہیں۔ میں نے کام والی کو ایکسٹرا

پیسے دے کر اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ وہ آج رات تک ہمارے گھر پر بچوں کے ساتھ رک جائے۔ اچھی اعتماد کی عورت ہے، میرے کہنے پر فوراً راضی ہو گئی۔ بچے بھی اس سے مانوس ہیں اس لیے آرام سے اس کے ساتھ رک گئے۔ اب ہم تمہیں اپنے ساتھ لے کر گھر جائیں گے تو خوب خوش ہوں گے کہ چچی آئی ہیں۔ بہت یاد کرتے ہیں تمہیں۔ اصل میں بے چارے ننھیال، ددھیال دونوں سے ہی محروم ہیں اس لیے کوئی بھی بھولا بھٹکا مہمان گھر آجائے تو بڑے خوش ہوتے ہیں۔“ مہتاب ابھی تک مکمل طور پر اداسی کے حصار سے نہیں نکل سکی تھی۔

”چلیں اب تو مہمان بلائے جان بن کر آپ کے گھر میں نازل ہو رہے ہیں۔ جانے کتنا عرصہ مجھے آپ کے ہاں قیام کرنا پڑے۔ بچوں کا خوش ہو ہو کر بھی دل بھر جائے گا۔“ کشور کی اپنی کیفیت اندرونی طور پر مہتاب جیسی ہی تھی لیکن وہ خود کو سنبھال کر اسے اداسی کے حصار سے نکالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”خوامخواہ... تم کیوں ہونے لگیں بلائے جان؟ ذرا ہمارے ساتھ رہ کر تو دیکھو پھر دیکھنا ہم تمہیں کیسے تھیلی کا چھالا بنا کر رکھتے ہیں۔“ حسبِ توقع مہتاب اسے ٹوکتے ہوئے اپنی سابقہ ٹون میں لوٹ آئی۔

”اب یہ تو آزمانے پر ہی معلوم ہو گا۔“ کشور نے جان بوجھ کر اسے چھیڑا۔ جواباً وہ اسے مصنوعی غصے سے گھورنے لگی اور پھر یک دم دونوں ہی کھلکھلا کر ہنس دیں۔ ایک ایسی ہنسی جس میں زندگی اور امید تھی۔

☆☆☆

وڈی چودھراؤن کے سامنے کھڑی شادو بید مجنوں کی طرح کانپ رہی تھی۔ شدید خوف کے باعث اس میں یارا نہیں تھا کہ وڈی چودھراؤن کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ سکے۔ وہ بس نظریں جھکائے کھڑی اس کی گھن گرج سن رہی تھی۔

”جانتی ہے تیرا کیا انجام ہو سکتا ہے؟ میں نے تیرے ذمے ایک کام لگایا تھا اور وہ بھی تجھ سے نہیں کیا گیا۔ اپنا منحوس بو تھالے کر میرے سامنے آگئی ہے کہ کشور بی بی درگاہ سے کہیں غائب ہو گئی ہیں۔ میں پوچھتی ہوں کہ تیرے ہوتے ہوئے وہ کیسے غائب ہو گئی؟ تو نے بھگ پٹی رکھی تھی جو تجھے اتنی وڈی کڑی کے نہیں جانے کا پتا نہیں لگا؟“ اس پر گرجتی چودھراؤن درحقیقت اندر سے خود لرزاں تھی۔ چودھری کی غیر موجودگی میں حویلی کے اندرونی معاملے کلی طور پر اس کے ذمے ہوتے تھے۔ اسے میں کشور کا غائب ہو جانا خود اس کے لیے باعثِ عتاب بن سکتا تھا۔

”میں تو پورا ٹیم (ٹائم) ہوشیار ہی کھڑی تھی وڈی چودھرائن جی... پر آپ کے حکم کے مطابق کشور بی بی کے ساتھ اس لیے نہیں رہ سکی کہ انہوں نے مجھے ڈانٹ کر باہر رکنے کا حکم دیا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ اندر درگاہ میں سے غائب ہو جائیں گی۔ میں تو وڈی دیری تلک باہر کھڑی ان کے اندر سے نکلنے کا ہی انتظار کرتی رہی۔ وہ تو جب درگاہ کے خادموں میں شور مچا کہ ان کا ایک ساتھی باہر بے ہوش پڑا ہے اور درگاہ کا پچھلا دروازہ کھلا ہے تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں فوراً اس دروازے سے اندر گئی، پر کشور بی بی کا اندر نام و نشان نہیں تھا۔ چڑھاوے کا تھاں جو وہ اپنے ساتھ لے گئی تھیں، وہ ادھر ہی تھا لیکن بی بی کا کچھ معلوم نہیں تھا۔ میں کسی سے بی بی کے بارے میں تو پوچھ نہیں سکتی تھی کہ اس میں حویلی کی بدنامی تھی۔ میں آپ ہی ساری درگاہ میں گھوم پھر کر بی بی کو تلاش کرتی رہی پر وہ اندر تھیں ہی نہیں۔“ شادو نے وہ ساری تفصیلات جن سے وہ حویلی پہنچتے ہی وڈی چودھرائن کو آگاہ کر چکی تھی، ایک بار پھر دہرائیں۔

”ڈرائیور سے کیا کہا تھا تو نے کہ بی بی تیرے ساتھ واپس حویلی کیوں نہیں جا رہی ہیں؟“ وڈی چودھرائن نے اسے گھورتے ہوئے پرسوج لہجے میں پوچھا۔

”میں نے اس سے کہا تھا کہ بی بی ابھی کچھ دیر اور درگاہ پر کیوں گی۔ مجھے انہوں نے حویلی میں کچھ کام بتایا ہے اس لیے مجھے حویلی لے چل۔ بی بی کو لینے کے لیے وڈی چودھرائن بعد میں دوسری گڈی بھیج دیں گی۔“ شادو کا جواب سن کر وڈی چودھرائن نے ایک ہنکارا بھرا اور پھر سوچ میں ڈوب گئی۔ اس کی پیشانی پر پھیلی لکیروں کا جال اس کے گہرے فکر کا پتا دے رہا تھا۔ اسی کمرے میں اس کے ساتھ کشور کی سگی ماں چودھرائن ناہید بھی موجود تھیں لیکن وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھنے کے علاوہ کسی بھی قسم کے رد عمل سے محروم تھیں۔ بی بی کے اس طرح سے غائب ہو جانے نے اس کی سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں گم کر دی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے اور بی بی کے اس فعل کی سزا اسے بھی بھگتنی ہوگی۔

”نچھی کہاں ہے؟ اس کو یہاں بلا کر لا۔“ وڈی چودھرائن کی پیشانی پر پھیلی لکیروں میں کچھ کم ہوئیں تو اس نے شادو کو حکم دیا۔ وہ تیر کی طرح اس حکم کی تعمیل کے لیے کمرے سے باہر نکلی۔

”اب سر پکڑ کر بیٹھی ہو، اگر پہلے ہی دھمی کی لگا میں کھینچ کر رکھی ہوتیں تو آج یہ دن دیکھنا نصیب نہیں ہوتا۔ مجھے تو

بہت دنوں سے کڑی کی حرکتیں شک میں ڈالے ہوئے تھیں۔ اپنے طور پر کوشش بھی کی کہ اصل مالے کی کھوج لگا سکوں، پر تیری دھی تھی وڈی ہوشیار۔ میری آنکھوں میں بھی دھول جھونک گئی۔ ویسے بھی میں اکیلی جان کون کون سے دھندے نیڑوں۔ حویلی کی ساری ذمے داری میرے کندھوں پر ہے۔ تم تو ساری حیاتی بس عیش ہی کرتی رہیں۔ نہ کوئی ذمے داری سنبھالی، نہ ہی اپنی اولاد۔ کچھ نہیں اپنی اولاد کو ہی دیکھا ہوتا تو آج یہ مشکل سر پر کھڑی نہ ہوتی۔ اب بتاؤ چودھری صاحب کو کون جواب دے گا؟ وہ تو جان کھا جائیں گے ساروں کی۔“

شادو کے باہر نکلنے کے بعد وڈی چودھرائن نے چودھرائن ناہید کے لئے لینا شروع کر دیے۔ شادو کے تنہا درگاہ سے واپس لوٹنے کا معاملہ ابھی ان تینوں کے ہی درمیان تھا اور بات وڈی چودھرائن کے کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی۔ کسی کو کچھ معلوم ہو جاتا تو حویلی کی عزت خاک میں مل جاتی۔ چنانچہ اندر ہی اندر بے حد چراغ پا ہونے کے باوجود وڈی چودھرائن بڑے ضبط سے کام لے رہی تھی۔

”تسی کچھ کرو وڈی آپا! کسی طرح اس ناہنجا کو ڈھونڈ کر واپس حویلی لاؤ، ورنہ چودھری صاحب تو میری چوٹی ہی گڈی سے اکھاڑ ڈالیں گے۔“ سوکن سے ڈانٹ کھانے کے بعد بجائے برامانے کے چودھرائن ناہید اس کی منت سماجت کرنے لگی۔

”چوٹی تو وہ میری بھی اکھڑ دیں گے۔ بس اب تو دعا کر کہ کسی طرح یہ مالمہ بیٹ جائے ورنہ پھر چودھری صاحب کو امریکا فون کر کے سب کچھ بتانا پڑے گا۔ ابھی تو میں اس... کا بندوبست کرنے کی کوشش کر رہی ہوں کہ کسی کو کشور کے غائب ہو جانے کی خبر نہ ہو سکے۔ کڑی کو تو بعد میں چودھری صاحب ڈھونڈ ہی نکالیں گے لیکن ابھی حویلی کی عزت بچانا سب سے اہم ہے۔“ وڈی چودھرائن کے لہجے سے پریشانی ہو رہی تھی۔ وہ اپنی بات کہہ کر خاموش ہی ہوئی تھی کہ شادو، نچھی کے ساتھ وہاں پہنچ گئی۔ چودھرائن جا سختی ہوئی نظروں سے نچھی کا جائزہ لینے لگی اور پھر کچھ مطمئن ہوتے ہوئے سر ہلایا۔

”کُشور کی الماری میں سے کوئی چنگا سا جوڑا نکال کر پہن لے اور چپکے سے درگاہ پہنچ جا۔ وہاں سے شادو تجھے ڈرائیور کے ساتھ جا کر لے آئے گی۔ اپنا منہ چنگی طرح چھپا لینا۔ ڈرائیور کو خبر نہ ہونے پائے کہ تو کشور نہیں چھپی ہے۔“ اس نے نچھی کو حکم دیا تو دونوں بہنیں سمجھ گئیں کہ وڈی چودھرائن کشور کے غائب ہونے کے معاملے کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہے اور یہ تاثر دینا چاہتی ہے کہ کشور درگاہ سے

واپس لوٹ آئی ہے۔

”چنگا وڈی چودھرائن“ کہتی ہوئی وہ دونوں حکم کی تعمیل کے لیے باہر نکل گئیں۔ ان کے باہر جانے کے بعد وڈی چودھرائن نے ایک ملازمہ کے ذریعے منشی کو طلب کیا اور خود ملاقات کے کمرے میں پہنچ گئی۔ پردے کے پیچھے منشی اس کا منتظر تھا۔

”منشی! تجھے گاؤں کی کچھ خبر ہے؟ گاؤں میں کوئی نئی گل ہوئی ہے تو مینوں بتا۔“

”ایسی کوئی خاص گل تو نہیں ہوئی چودھرائن جی۔ بس آج ٹی وی والے ادھر آئے ہوئے ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ یہاں جو ترقیاتی کام ہوئے ہیں، ان کے بارے میں فلم تیار کریں گے۔ اسی اے سی نے بھیجا ہوگا انہیں اپنی شہرت کے لیے۔“ منشی نے منہ بناتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا۔

”اور اس ماسٹر کے بارے میں کیا خبر ہے؟ وہ گاؤں میں ہی ہے یا کہیں گیا ہوا ہے؟“ چودھرائن کو کشور اور آفتاب کے تعلقات کے بارے میں حتمی طور پر کچھ معلوم نہیں تھا لیکن پھر بھی اسے شک سا رہتا تھا اس لیے اس نے آفتاب کے بارے میں جاننے کی کوشش کی۔

”وہ تو گاؤں میں ہی ہے جی۔ وہ تو ہے ہی اے سی کا چچو... آج وہ کیسے گاؤں سے کہیں جا سکتا تھا۔ لگا ہوا ہے ٹی وی والوں کے سامنے اے سی کی تعریفیں کرنے میں۔“ منشی نے رپورٹ دی تو چودھرائن پر مایوسی طاری ہونے لگی۔ اس کے حساب سے تو اگر کشور غائب تھی تو آفتاب کو بھی منظر سے غائب ہونا چاہیے تھا۔

”ٹھیک ہے منشی! تو جا... اور ہاں، ارد گرد نظر رکھنا۔ چودھری صاحب کی غیر موجودگی میں تجھے ہی ہر مالے پر نگاہ رکھنی ہے۔“ وہ منشی کو ہدایت دیتے ہوئے واپس پلٹ گئی۔ اب اسے نچھی اور شادو کا انتظار تھا۔ دوسرے وہ چودھری کو امریکا فون کر کے اس حادثے کی اطلاع کرنے کے بارے میں سوچ رہی تھی تاکہ اس کی ہدایات کے مطابق ایکشن لے سکے۔ معاملہ اتنا نازک تھا کہ خود سے اسے کچھ بھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔

”منشی جی آپ سے ملنا چاہتے ہیں وڈی چودھرائن جی۔“ ابھی اسے ملاقاتی کمرے سے واپس آئے پانچ منٹ نہیں گزرے تھے کہ ایک ملازمہ نے آکر اطلاع دی۔ وہ تیزی سے منشی سے ملنے کے لیے پہنچی کہ شاید کوئی نئی خبر مل جائے۔

”معافی چاہتا ہوں وڈی چودھرائن۔ گل تو اتنی خاص نہیں کہ میں آپ کو پریشان کرتا لیکن فیصلہ میں نے سوچا کہ

آپ کو اطلاع دے دوں۔“

”کیا گل ہے؟“

”ابھی ابھی درگاہ کا ایک خادم میرے پاس آیا ہے۔ کہتا ہے کہ وہاں کسی نے پچھلی طرف پہرہ دینے والے خادم کو بے ہوش کر دیا ہے۔ وہ کون تھا اور کیوں آیا تھا، کسی کو کچھ نہیں آیا لیکن میں اس لیے پریشان ہو گیا کہ مجھے خبر ملی تھی کہ آج کشور بی بی درگاہ گئی ہوئی ہیں۔“ اس کے پوچھنے پر منشی نے وہ اطلاع دی جو شادو کی زبانی پہلے ہی اس تک پہنچ چکی تھی۔

”کُشور کے لیے پریشان نہ ہو۔ شادو ڈرائیور کے ساتھ اسے لینے گئی ہوئی ہے، ابھی واپس آ جائے گی۔ لیکن یہ ملوم کرنے کی کوشش ضرور کرو کہ وہ کون تھا جس نے خادم کو بے ہوش کیا۔“ چودھرائن منشی کو حکم دے کر ایک بار پھر اپنے کمرے میں واپس پہنچ گئی جہاں چودھرائن ناہید ہنوز پہلے والی پوزیشن میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے نظر انداز کر کے وہ اپنی وسیع و عریض مسہری پر نیم دراز ہو گئی۔ کچھ دیر بعد شادو واپس پہنچ گئی۔

”میں نے نچھی کو کشور بی بی کے کمرے میں پہنچا دیا ہے وڈی چودھرائن۔ آپ بتائیں میرے لیے اور کیا حکم ہے؟“ چودھرائن کی خود پر جچی نظروں سے گھبرا کر اس نے اطلاع دینے کے ساتھ ساتھ آگے کے لیے بھی ہدایت چاہی۔

”چنگی گل ہے۔ اب ایسا کر کہ نچھی سے بول کہ واپس اپنے کپڑے پہن کر باہر آ جائے۔ فیتم دونوں بہنیں تہ خانے کے دروازے پر پہنچ جاؤ۔ میں بھی ادھر ہی آ رہی ہوں۔“

”چنگا وڈی چودھرائن۔“ اس کا حکم سن کر شادو مستعدی سے بولتی ہوئی پلٹی۔

”گل سن...“ چودھرائن نے اسے پکارا۔

”جی وڈی چودھرائن۔“ شادو نے فوراً اس کی پکار کا جواب دیا۔

”تم دونوں بہنوں کے علاوہ اور کس کس کو اس مالے کی خبر ہے؟“ اس کو اندر تک اتر جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے چودھرائن نے دریافت کیا۔

”کسی کو نہیں چودھرائن جی۔ ہم نے تو اپنی اماں کو بھی ابھی تک کچھ نہیں بتایا۔“

”ٹھیک ہے، فیتم تو جا اور نچھی کو اپنے ساتھ لے کر تہ خانے تک پہنچ۔“ اس حکم کی شادو نے پھرتی سے تعمیل کی۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں بہنیں تہ خانے کے راستے پر پہنچ گئیں اور سہمی ہوئی وڈی چودھرائن کا انتظار کرنے لگیں۔ تین چار منٹ کے انتظار کے بعد انہوں نے وڈی چودھرائن کو چابیوں

کے سچے کے ساتھ وہاں آتے دیکھا۔
 ”تالا کھول۔“ اس نے چابیوں کا گچھا شادو کو تھمایا تو اس نے کانپتے ہاتھوں سے گچھا تھام کر چودھرائن کی نشان دہی کردہ چابی سے تالا کھول دیا۔ پھر اس کے اشارے پر دونوں بہنیں سیڑھیاں اتر گئیں۔ خود چودھرائن بھی اپنے بھاری بھر کم جتنے کو سنبھالے ان کے پیچھے تھی اور بری طرح ہانپتی ہوئی سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ کئی کوششوں پر مشتمل اس نے خانے میں پہنچ کر اس نے شادو کے ہاتھ سے ہی ایک کوشری کا دروازہ کھلویا اور پھر اس سے چابیوں کا گچھا لیتے ہوئے دونوں بہنوں کو اندر داخل ہونے کا حکم دیا۔ وہ دونوں جواب کسی حد تک خود کو یہاں تک لائے جانے کا مقصد سمجھ گئی تھیں، اندر داخل ہونے کے بجائے اس کے پیروں میں گر گئیں۔
 ”ہمیں مافی دے دیں چودھرائن جی۔ ہمیں اس کال کوشری کی سزا نہ دیں۔“ چودھرائن کے قدموں سے لپٹی وہ آہ وزاری کرتے ہوئے اس سے استدعا کرنے لگیں۔
 ”دور ہونمک حراموں۔ تمہاری غلطی کی وجہ سے اتنا بڑا حادثہ ہو گیا۔ اب کیا دوسری غلطی میں کروں اور تمہیں آزاد چھوڑ دوں کہ تم لوگوں کے سامنے سب بکتی پھرو۔“ چودھرائن نے اپنی بھاری ٹانگ ان دونوں کو رسید کرتے ہوئے انہیں پیچھے دھکیلا۔
 ”ہم کسی سے کچھ نہیں کہیں گے وڈی چودھرائن! ہم تو ہمیشہ سے آپ کے وفادار رہے ہیں۔ ہماری ماں نے بھی ساری حیاتی آپ کی خدمت کی ہے اور ہم بھی ہمیشہ آپ کی خدمت کریں گے۔“ اب وہ دونوں اپنے ہاتھ جوڑے اپنی خدمتوں کا واسطہ دیتے ہوئے اس کا دل نرم کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔
 ”تمہاری خدمتوں کا ہی خیال ہے جو میں تمہیں صرف اس کوشری میں قید کر رہی ہوں۔ کوئی اور ملازمہ ایسی غلطی کرتی تو میں اس پر کتے چھڑوا دیتی۔ اب بھی تم نے زیادہ شور مچایا تو فیہ مجھے اسی طریقے سے تمہارا منہ بند کرنا پڑے گا۔“ چودھرائن کی دھمکی اتنی خطرناک تھی کہ دونوں بہنوں کی آوازیں حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئیں اور وہ از خود اس اندھیری کوشری میں داخل ہو گئیں۔ آج انہوں نے جان لیا تھا کہ دوسروں کے خلاف سازش کر کے مالکوں کا قرب حاصل کرنے سے کامیابی نہیں ملتی کیونکہ جن کو ظلم کی عادت ہو، وہ رحم بھی ایسے کرتے ہیں کہ ان کے ظلم سے بچنا ممکن نہیں ہوتا۔

☆☆☆

”لنڈا... مائی ڈارلنگ! میں تمہیں کیا بتاؤں کہ تمہاری

قربت میں کیا جادو ہے۔ میں اس سے پہلے بھی بہت بار نیویارک آیا ہوں لیکن اس سے پہلے مجھے نیویارک اتنا حسین کبھی نہیں لگا جتنا کہ اب لگ رہا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ اپنا ویزا بڑھوا کر مزید کچھ عرصہ یہاں رک جاؤں۔“ چودھری کی انگلیاں لنڈا کے عریاں بازو پر تھرک رہی تھیں اور اس کی آنکھوں سے شراب و شباب کا نشہ چھلکا پڑ رہا تھا۔
 ”ویزا تو آپ کا ابھی کافی باقی ہے چودھری صاحب... لیکن ہم تو چاہتے ہیں کہ آپ اس سے پہلے ہی واپس روانہ ہو جائیں۔ آپ یہ مت سمجھیے گا کہ آپ کی میزبانی کرنا ہمیں بھاری پڑ رہا ہے مگر وہاں پاکستان میں کچھ کام ہیں جن کے لیے آپ کا وہاں ہونا ضروری ہے۔ لنڈا کا کیا مسئلہ ہے، یہ خود آپ سے ملنے وہاں آجائے گی۔“
 ڈیوڈ کی بے وقت انٹری نے چودھری کے رومانٹک موڈ کا بیڑا غرق کر کے رکھ دیا لیکن اس کا آخری جملہ ایسا تھا کہ اس نے ڈیوڈ کی بات کی سختی کو کچھ کم کر دیا اور چودھری دانت نکالتے ہوئے بولا۔ ”اگر لنڈا وہاں آگئی تو پھر تو ہمیں اپنا پیر آباد آپ کے نیویارک سے بھی زیادہ حسین لگنے لگے گا۔“
 ”آپ نے خوب پٹری بدلی ہے چودھری صاحب! پیر آباد سے نکلے تھے تو ماہ بانو کے سوا کچھ یاد نہیں تھا اور اب لنڈا میں یوں کھوئے ہیں کہ ماہ بانو بالکل بھول گئی ہے۔“ ڈیوڈ نے اسے چھیڑا۔
 ”وہ بالکل الگ معاملہ ہے مسٹر ڈیوڈ! لنڈا اسے تو ہمیں عشق ہو گیا ہے جبکہ ماہ بانو ہماری ضد ہے۔ اس لڑکی نے ہماری انا کو لکا رہا ہے۔ ہم جب تک اسے خاک میں نہیں ملائیں گے، ہمیں چین نہیں آئے گا۔“ چودھری نے پُر عرونت انداز میں جواب دیا۔
 ”چلیں آپ پاکستان واپس پہنچیں، آپ کی یہ خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔ ہماری طرف سے ہماری دوستی کا ثبوت ماہ بانو کی شکل میں آپ تک پہنچ جائے گا اور لنڈا تو ہے ہی آپ کی۔ جب آپ اسے یاد کریں گے، تب یہ آپ کی خدمت میں پہنچ جائے گی۔“ بلتستان کے پہاڑی کیمپ کے انچارج نے ابھی تک ماہ بانو کے فرار کی خبر ڈیوڈ تک نہیں پہنچائی تھی اور فی الحال اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح مفرور ماہ بانو اور عمران کو ڈھونڈ نکالے اس لیے ڈیوڈ بڑے پُر اعتماد لہجے میں چودھری کے سامنے دعویٰ کر رہا تھا۔ درحقیقت پہلے تو خود اس کی نیت ماہ بانو پر خراب ہوئی تھی۔ مشرقی حسن کا نمونہ ماہ بانو پہلی نظر میں ہی اس کے دل کو بھاگتی تھی۔
 پہلی بار اس نے اسے اس وقت بشام ہوٹل کے باہر

دیکھا تھا جب وہ ایک ایکسی ڈیشن ٹیم کے ساتھ وہاں سے روانہ ہو رہا تھا۔ اس وقت وہ شہریار کے ساتھ تھی اور چونکہ وہ خود بھی وہاں سے روانہ ہو رہا تھا اس لیے اس کی طرف ایک فلائنگ کس اچھال کر ہی اکٹفا کر لیا تھا۔ بعد میں وہ اتنا مصروف رہا کہ اسے ماہ بانو کا خیال بھی نہیں رہا۔ وقتاً فوقتاً پاکستان کے شمالی علاقہ جات میں جا کر ہائیکنگ کے بہانے وہ ان پہاڑوں کے محل وقوع اور مختلف جغرافیائی حالات کے بارے میں بیش قیمت معلومات حاصل کرتا رہتا تھا۔ انجینئرنگ کی پیشہ ورانہ تعلیم اور تنظیم کی طرف سے دی گئی تربیت کی وجہ سے اسے اپنے کام میں خاص مہارت حاصل تھی۔ سیر و تفریح اور ایڈونچر کے بہانے مختلف علاقوں میں گھومتے ہوئے اس نے کئی اہم اور قیمتی نقشے تیار کر لیے تھے جو نہ صرف ان کی اپنی تنظیم کے پاس ریکارڈ میں موجود تھے بلکہ وقتاً فوقتاً وہ ان معلومات کا بھارتی سیکرٹ سروس را سے بھی تبادلہ کرتے رہتے تھے۔ ان معلومات کی فراہمی کے عوض راکو بھی ان کے لیے خدمات انجام دینی پڑتی تھیں لیکن چونکہ یہ خدمات پاکستان مخالف سرگرمیوں پر ہی مشتمل ہوتی تھیں اس لیے راوالپنڈی بنا احتجاج خاموشی سے ان کا یہ کام کر دیتے تھے۔ بعض اوقات معلومات کی اس فراہمی پر وہ لوگ صرف پاکستان کے خلاف کارروائی کروانے پر ہی اکٹفا نہیں کرتے تھے بلکہ نقد معاوضہ بھی وصول کرتے تھے۔ اپنی پاکستان دشمنی میں بھارتی حکومت کو یہ سودا بھی مہنگا نہیں لگتا تھا کیونکہ موساد سے حاصل کردہ معلومات انہیں پاکستان کے خلاف شراٹنگز کارروائیاں کرنے میں مدد دیتی تھیں۔ موساد کا اہم ترین ایجنٹ ڈیوڈ اپنے پاکستان کے دوروں میں نہ صرف یہ معلومات جمع کرتا تھا بلکہ موساد ہی کی پالیسی کے تحت قائم کردہ ایک مذہبی انتہا پسند تنظیم جو درحقیقت دہشت گردی کی کارروائیوں میں ملوث تھی، اس کے مختلف مراکز کا دورہ بھی کر ڈالتا تھا۔ اس بار بھی اس نے پہاڑوں پر موجود خفیہ کیمپ کا دورہ کیا تھا اور وہاں کے انچارج سے زیر تربیت افراد کے بارے میں رپورٹ حاصل کرنے کے علاوہ ہتھیاروں اور بارود کی مزید فراہمی کے بارے میں بھی ان کی ضروریات کے بارے میں جان کر آیا تھا۔ یہ ہتھیار اور بارود، فوڈ سپلائی کے ساتھ ہی چھپا کر کیمپ تک بھیجے جاتے تھے لیکن انہیں لے جانے والے جیپ ڈرائیورز کو اس بارے میں کانوں کان خبر نہیں ہوتی تھی اور وہ اچھے معاوضے کے عوض ایک بہ ظاہر بے ضرر نظر آنے والا کام بہ خوشی انجام دے دیا کرتے تھے۔
 ڈیوڈ اپنے معمول کے کامیاب دورے سے واپس

لوٹ رہا تھا جب اس نے ہوشے میں ماہ بانو کو ایک بار پھر دیکھا۔ اس موقع پر وہ مخصوص پہاڑی لباس زیب تن کیے ہوئے تھی اور بشام کے باہر نظر آنے والی ماہ بانو کے مقابلے میں خاصی مختلف نظر آنے کے باوجود اپنی شخصیت کی خاص دل آویزی کے باعث وہاں موجود سب خواتین سے ممتاز لگتی تھی۔ اس موقع پر ڈیوڈ نے بے ساختہ ہی اس کی کئی تصویریں کھینچ ڈالیں۔ جواب میں اس نے ماہ بانو کے چہرے پر پھیلنے والا ناگواری کا تاثر بھی دیکھا تھا لیکن پروا نہیں کی۔ البتہ خواہش کے مطابق وہ وہاں اس سے ملنے یا چھیڑ چھاڑ کرنے کی جرات بھی نہیں کر سکا۔

کئی برسوں سے ان علاقوں میں سفر کرتے رہنے کے باعث اسے وہاں کے لوگوں کے مزاج کے بارے میں... بہ خوبی علم تھا اور وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے کوئی بھی بے احتیاطی کی تو اسے لینے کے دینے بھی پڑ سکتے ہیں... مگر اگلی صبح جب اس نے ماہ بانو کو اپنی کیمپنگ سائٹ پر دیکھا تو شدید غلط فہمی کا شکار ہو گیا۔ اس نے گمان کیا کہ ماہ بانو ان لڑکیوں میں سے ہے جو غربت سے نمٹنے اور روپیہ کمانے کے لیے غیر ملکی سیاحوں کا کھلونا بننا قبول کر لیتی ہیں۔ اسی حساب سے اس نے اسے اپنے خیمے میں گھسیٹ کر اس سے زبردستی کرنی چاہی لیکن ماہ بانو کے رد عمل نے اسے بتا دیا کہ وہ غلطی پر ہے۔ پھر اکرم خان کی مداخلت کی وجہ سے نہ صرف اسے اپنے مکروہ ارادے میں ناکام ہونا پڑا بلکہ اکرم خان کے ہاتھوں شدید ہزیمت بھی اٹھانی پڑی۔

جہاں وہ اپنی اس ذلت پر بری طرح چڑا، وہیں ماہ بانو کی شخصیت کے بارے میں بھی کھٹک گیا۔ اس کے پہاڑی لڑکیوں سے مختلف نین نقش ویسے ہی چونکا دینے والے تھے، اس پر سے اس کی اس سے جو مختصر گفتگو ہوئی، اس سے بھی یہ بات سامنے آگئی کہ وہ کوئی پہاڑی دوشیزہ نہیں ہے۔ ایک مختلف ماحول کی لڑکی ان پہاڑی وادیوں میں کیا کر رہی ہے، اس کے ذہن میں تجسس جاگ اٹھا۔ ری سورسز کی تو اس کے پاس کی نہیں تھی۔ وہ پاکستان میں موجود اپنے نیٹ ورک کو حرکت میں لے آیا۔ نتیجتاً اسے ماہ بانو کی ساری ہنری معلوم ہو گئی۔ چودھری افتخار کا نام اپنے مقاصد کے حصول کے لیے پہلے ہی ان کی لسٹ میں موجود تھا۔ چودھری کو لالچ دینے کے لیے اس نے بہتر سمجھا کہ ماہ بانو کو کسی طرح اپنے قبضے میں لے لیا جائے۔ ہوشے سے اسے اغوا کر کے کسی بڑے شہر تک فوری طور پر پہنچانے میں خطرہ ہوتا چنانچہ اس نے اس کام کے لیے اپنے پہاڑی کیمپ پر موجود بندوں کو استعمال کیا اور یوں ماہ

بانو ہوشے سے نکل کر برف زار کے ایک غار میں پہنچ گئی۔
ڈیوڈ کو اطمینان تھا کہ وہ ماہ بانو کی تلاش کا سلسلہ ٹھنڈا
پڑنے پر جب چاہے گا اسے وہاں سے نکال کر چودھری تک
پہنچا دے گا۔ اس طرح ایک تیر سے دو شکار ہو جاتے۔
چودھری بھی ان کی مٹھی میں آجاتا اور ماہ بانو سے وہ اپنی ذلت
کا بدلہ بھی چکا دیتا۔ اکرم خان کو تو پہلے ہی اس کے آدمی
ٹھکانے لگا چکے تھے۔ جدید دنیا کا باسی... یہ ظاہر بہت مہذب
دکھائی دینے والا ڈیوڈ درحقیقت پیر آباد کے چودھری افتخار
سے فطرت میں مختلف نہیں تھا۔ چودھری کو اگر اپنی چودھراہٹ
اور جاگیر کا غرور تھا تو ڈیوڈ بھی اپنے اختیارات پر نازاں تھا۔
یہ غرور اور ناز ایسے جذبات نہیں جو آدمی کو آپے میں رہنے
دیں۔ ”میں اوروں کے مقابلے میں باختیار ہوں...“ یہ
احساس بہت کم ہی افراد میں عاجزی اور خدمت گزاری کا
وصف پیدا کرتا ہے، ورنہ عموماً تو لوگ خود کو زمینی خدا تصور
کرنے لگتے ہیں جنہیں خلاف مزاج کچھ گوارا نہیں ہوتا اور
جب کچھ مرضی سے ہٹ کر ہو جائے تو پھر وہ اس کا بدلہ لیے
بغیر نہیں رہ سکتے۔

”کیا بات ہے مسٹر ڈیوڈ! آپ ہم سے بات کرتے
کرتے کن خیالات میں ڈوب گئے؟“ چودھری سے ماہ بانو کا
ذکر کرتے ہوئے ڈیوڈ کو خود بھی بہت کچھ یاد آ گیا تھا چنانچہ وہ
کچھ دیر کے لیے ماحول سے کٹ گیا۔ اس کی خاموشی کو محسوس
کرتے ہوئے چودھری نے اسے ٹوکا۔

”ہمیں کس کے خیالوں میں ڈوبنا ہے چودھری
صاحب! یہ تو آپ خوش نصیب ہیں جو ہر جگہ ایک حسینہ آپ کی
منتظر ہے۔“ ڈیوڈ نے ہنس کر مذاق میں بات ٹالی تو چودھری
بھی زوردار قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ اس قہقہے کی گونج میں ہی اسے
اپنے موبائل کی گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے موبائل
نکال کر اسکرین پر آنے والا نمبر دیکھا۔ حویلی کے نمبر سے کال
کی جارہی تھی۔ پہلے اس کا دل چاہا کہ لائن کاٹ دے پھر یہ
سوچ کر کہہ سکتا ہے کوئی اہم معاملہ درپیش ہو، کال ریسیو
کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ شہر یار کے اغوا والے معاملے کے بعد وہ
اپنی فون کا لڑکی طرف سے خاص احتیاط تھا۔ اس وقت بھی موبائل
فون بند رکھنے کی وجہ سے اس کا اپنے بندوں سے رابطہ منقطع ہو
گیا تھا اور کچھ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

”سلام چودھری صاحب! میں وڈی چودھرائن گل
کر رہی ہوں۔“ چودھری نے جیسے ہی کال ریسیو کی، دوسری
طرف سے اپنی بیگم نمبر ایک کی آواز سنائی دی جسے خود کو وڈی
چودھرائن کہلوانے کی اس قدر عادت پڑ چکی تھی کہ اپنے نام کا

استعمال وہ خود بھی ترک کر چکی تھی اور خود کو اکثر وڈی
چودھرائن ہی کہہ کر متعارف کرواتی تھی۔
”کی گل ہے؟ اس وقت تو نے مجھے کیسے فون کیا
ہے؟“ جوان حسین لہذا کی قربت میں اپنی موٹی بھتی اور
برسوں پرانی بیوی کی آواز سننا بھی اسے سخت ناگوار گزرا تھا،
چنانچہ اس کے سلام کا جواب دیے بغیر بیزاری سے پوچھا۔
”وڈی خاص گل تھی چودھری صاحب... اس لیے مجھے
آپ کو فون کرنا پڑا۔ آپ اتنی دور ہو، کچھ جنگل گل نہیں لگتی کہ
آپ کو پریشان کروں، پر میں بھی مجبور ہوں... گل ہی کچھ ایسی
ہے کہ آپ کو بتائے بغیر رہا بھی نہیں جاسکتا۔ میری تو اپنی مت
ماری گئی ہے۔ کچھ سمجھ نہیں آتا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔
اب آپ ہی کچھ مشورہ دیں گے تو میں کچھ کر سکوں گی۔“
”کیا پہیلیاں بھجوائے جارہی ہے... سیدھی طرح بتا
کہ کیا گل ہے؟“ وڈی چودھرائن کے لہجے سے اس نے اتنا تو
بھانپ لیا تھا کہ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آچکا ہے لیکن یہ
اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ وہ کون سی غیر معمولی صورت حال ہو
گی جس کے لیے وڈی چودھرائن نے اسے اتنی دور کال کر
کے اطلاع دینا ضروری سمجھا ہے؟ اس لیے ذرا غصے اور
چڑچڑے پن سے سوال کیا۔

”کیا بتاؤں چودھری صاحب! گل ہی کچھ ایسی ہے کہ
بتاتے ہوئے میری زبان رکتی ہے۔ حویلی کی عزت داؤ پر لگی
ہے اور میری کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ کیا کروں؟“ اپنی بات کے
اختتام پر وڈی چودھرائن نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا تھا۔
”میں کہتا ہوں مینوں اصل گل دس، پہیلیاں نہ بھجوا۔“
چودھری اعصاب زدہ ہو کر حلق کے بل دھاڑا۔

”کشور کہیں غائب ہو گئی ہے چودھری صاحب! آپ
کی دھی ہمارے منہ پر کالک مل گئی ہے۔“ وڈی چودھرائن
نے ایسے الفاظ اور انداز میں اطلاع دی کہ حادثے کی شدت
دگنی ہو کر چودھری تک پہنچی۔

”کیا بک رہی ہے... ہوش میں تو ہے یا نہیں؟“ اس
نے یقیناً چیخنے کی ہی کوشش کی تھی لیکن آواز حلق کے اندر ہی
گھٹ کر رہ گئی تھی اور وہ بس سرگوشی میں ہی وڈی چودھرائن
سے یہ سوال کر سکا تھا۔

”ہوش تو میرے سچ مچ گم ہو گئے ہیں چودھری صاحب!
لیکن جو کچھ میں نے آپ کو بتایا ہے وہ بالکل سچ ہے۔“

”مجھے تفصیل سے ساری گل بتا۔ آخر تیرے ہوتے
ایسا کس طرح ہو گیا؟ کیا میرے پیچھے تو نے حویلی کے
معاملات کی طرف سے آنکھیں بند کر لی تھیں؟“ وہاں ڈیوڈ

اور لہذا کی موجودگی کی وجہ سے اس نے خود کو کافی سنبھال لیا
تھا لیکن پھر بھی لہجے سے دبا دبا غصہ جھلک ہی رہا تھا۔ ڈیوڈ کی
اردو اور پنجابی سے واقفیت کی بنا پر اسے خاص طور پر احتیاط
برتنی پڑ رہی تھی۔

”میری آنکھیں بند نہیں تھیں مگر وہ میری آنکھوں میں
دھول جھونک گئی۔ حویلی سے درگاہ جانے کی اجازت لے کر
نکل گئی۔ شادو اور ڈرائیور اس کے ساتھ تھے لیکن جانے اس
نے کیا چکر چلایا کہ ان دونوں کو خبر بھی نہیں ہوئی اور وہ درگاہ
سے غائب ہو گئی۔ جانے کون ہے جس نے اس کو یہ راہ دکھائی
اور اپنے ساتھ لے اڑا۔ میں تو پہلے ہی اس کڑی کے کرتوتوں
کی طرف سے فکر میں تھی لیکن اس کی ماں کی شہ اور آپ کی
ڈھیل کی وجہ سے ہر واری مجھے ہی چپ ہونا پڑا۔“ وہ بہت
عرصے سے کشور کے خلاف اپنے دل میں جمع زہرا گلنے لگی۔

”یہ وقت ایسی گلاں کرنے کا نہیں۔ تو ایسا کر کہ اس کی
سب سے قریبی ملازمہ رانی کو ٹٹول۔ مجھے یقین ہے کہ اس کو
ضرور کچھ نہ کچھ خبر ہوگی۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹھلٹھا ہوا
اپارٹمنٹ کی بالکنی کی طرف چلا گیا اور دھیمی آواز میں
چودھرائن کو مشورہ دیا۔

”ہاں چودھری صاحب! میں ابھی بندہ دوڑاتی
ہوں۔ رانی آج کل شہر والی کوٹھی میں رہ رہی ہے۔ اسے
گاؤں بلوا کر میں اس کے حلق سے اگلواتی ہوں کہ یہ سارا چکر
کیا ہے؟“ چودھری کا مشورہ سن کر وہ فوراً جوش میں آ گئی۔
کشور کی ملازمہ خاص رانی پر ویسے ہی اسے شک رہتا تھا کہ
وہ حویلی سے زیادہ کشور کی وفادار ہے لیکن آج کل چونکہ رانی
لاہور میں رہ رہی تھی، اس لیے کشور کے غائب ہوتے ہی
اسے رانی کا خیال نہیں آیا تھا۔

”تو یہ کام کر۔ میں پہلی فلائٹ ملتے ہی واپس آتا
ہوں۔ اور ہاں... خیال رکھنا کہ کسی کو کانوں کان اس گل کی خبر
نہ ہو سکے۔“

”تسی فکر نہ کرو چودھری صاحب! کسی نوں کچھ خبر نہیں
ہے۔ صرف شادو اور اس کی بہن چھی کو ملوم تھا، ان دونوں کو
میں نے حویلی کے تہ خانے میں ڈال دیا ہے۔“ چودھری کی
ہدایت کے جواب میں اس نے فخر سے اپنا کارنامہ سنایا۔

”چنگی گل ہے۔ اب تو فون بند کر۔ میں کچھ دوستوں
کے ساتھ ہوں زیادہ کھل کر گل نہیں کر سکتا۔“ چودھری نے
کہتے ہوئے خود ہی لائن کاٹ دی اور پھر موبائل جیب میں
رکھ کر چہرے پر ایک نمائی سی مسکراہٹ سجائے ہوئے کمرے
میں واپس آیا۔

”خیریت چودھری صاحب! آپ کچھ پریشان لگ
رہے ہیں؟ کوئی مسئلہ ہے تو بتائیں... آخر ہم آپ کے دوست
ہیں، آپ کی پریشانی برداشت نہیں کر سکتے۔“ اس کی
مسکراہٹ کے باوجود ڈیوڈ نے اس کی پریشانی کو بھانپتے
ہوئے اس سے پوچھا۔

”کچھ نہیں مسٹر ڈیوڈ! بس ایک چھوٹا سا پرسل پر اہل
ہے، میں خود ہی سولو کر لوں گا... بلکہ ابھی آپ ذکر کر رہی
رہے تھے کہ مجھے واپس پاکستان چلے جانا چاہیے تو بس
سمجھیں کہ ایسا سبب بن گیا ہے کہ میں خود بھی فوری طور پر
واپس جانا پسند کروں گا۔“ جو حادثہ اس کے ساتھ پیش آچکا
تھا، وہ اس کے بارے میں اپنی زبان سے کسی کو کیسے کچھ بتا
سکتا تھا؟ چنانچہ ڈیوڈ کے سوال کرنے پر اسے ٹال گیا اور پھر
فوری طور پر اس سے اور لہذا سے اجازت لے کر وہاں سے
رخصت ہو گیا۔ ابھی وہ جس پریشانی میں مبتلا تھا، اس کے
ہوتے لہذا کا حسین وجود بھی اپنی کشش کھو بیٹھا تھا۔ لہذا اور
ڈیوڈ نے اس کا یہ انداز دیکھا تو چونک پڑے۔

”مجھے لگتا ہے کہ چودھری کے ساتھ کوئی بڑا مسئلہ ہو گیا
ہے۔ ہو سکتا ہے ہم اس کے مسئلے سے کوئی فائدہ اٹھا سکیں۔ تم
فون کر کے پیر آباد میں موجود ایجنٹ کی ڈیوٹی تو لگاؤ کہ وہ ذرا
اس معاملے کی کھوج لگائے۔“ ڈیوڈ نے لہذا کو ہدایت کی تو وہ
ٹیلی فون پر مطلوبہ نمبر ملانے لگی۔ رابطہ ملنے پر اس نے ڈیوڈ کا
حکم دوسری طرف سنایا اور پھر اس اطمینان کے ساتھ کہ جلد
اصل معاملہ ان کے سامنے آجائے گا، کال منقطع کر دی۔

☆☆☆

”تم شہر کس کام سے آئے تھے؟“ گاڑی کی پچھلی
نشست پر اپنے سامان کی کٹھڑی کے ساتھ بیٹھی رانی نے
ڈرائیور سے پوچھا۔ اسے اتنی اچانک واپسی کا حکم دیا گیا تھا
کہ وہ ڈھنگ سے اپنا سامان بھی سمیٹ نہیں پائی تھی۔ اب
گاڑی میں بیٹھ کر اسے یاد آ رہا تھا کہ کوٹھی کی عقبی جانب اس
نے اپنا بالکل نیا جوڑا دھو کر ڈالنا تھا اور جلدی میں وہ جوڑا وہیں
رہ گیا تھا۔ یہ جوڑا اسے کشور نے اپنے لاہور میں قیام کے
عرصے میں خرید کر دیا تھا اور اسے خاص پسند تھا۔ اس کے علاوہ
اس کی چاندی کی بالیاں بھی جو کہ حاجرہ نے اس سے مستعار
لے کر پہنی تھیں، وہیں رہ گئی تھیں۔ دوسرے بھی کئی چھوٹے
چھوٹے معاملات تھے جن پر اس کے خیال میں وہ ڈرائیور
کے جلدی بچانے کی وجہ سے خاطر خواہ توجہ نہیں دے سکی تھی
لیکن اب چلتی گاڑی میں بیٹھ کر کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا اس لیے
وقت گزاری کے لیے ڈرائیور سے گفتگو شروع کر دی۔

”نہیں، مجھے شہر میں کوئی کام نہیں تھا۔ بس میں تجھے لینے کے لیے ہی آیا تھا۔ سویرے سویرے نکلنے سے بھی پہلے وڈی چودھرائن کا حکم ملا کہ شہر جا کر رانی کو لے آؤ تو میں تجھے لینے آ گیا۔“ ڈرائیور نے اس کے سوال کے جواب میں بیزار سے بتایا۔ اسے اپنا منہ اندھیرے جگا کر شہر روانہ کیا جانا اچھا نہیں لگا تھا لیکن اسے کیا خبر تھی کہ وڈی چودھرائن نے رات چھٹی کس مشکل سے گزاری ہے۔ کشور کے غائب ہونے کا علم ہونے کے بعد دیگر معاملات سے نمٹنے اور چودھری سے رابطہ ہونے میں اچھا خاصا وقت لگ گیا تھا، ورنہ ممکن تھا کہ وہ رات کو ہی اسے لاہور روانہ کر دیتی۔

”کشور بی بی تو خیریت سے ہیں نا؟ کہیں انہوں نے ہی تو مجھے نہیں بلوایا؟“ رانی چونکہ اپنے اچانک بلائے جانے پر حیران تھی اس لیے اس اچانک طبعی وجہ جاننے کی کوشش کی۔ اس کے خیال میں کشور کی ضد ہی اس کی واپسی کا سبب بن سکتی تھی اس لیے اس کے بارے میں سوال کیا۔

”مجھے تو وڈی چودھرائن کا حکم ملا تھا۔ اب ان سے کس نے کہا مجھے خبر نہیں۔ ویسے تو اطمینان رکھ، کشور بی بی بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ کل ہی میں عصر کے بعد انہیں درگاہ پر حاضری کے لیے لے کر گیا تھا۔“ اس کی فکر مندی دیکھتے ہوئے ڈرائیور نے اسے تسلی دی تو وہ ڈرائیور کے لیے خاموش ہو گئی لیکن تشویش اپنی جگہ قائم تھی۔ بغیر وجہ کے وہ خاص طور پر گاڑی بھیج کر اپنے بلوائے جانے کو کسی طرح قبول نہیں کر پا رہی تھی۔

”میرے گھر پر تو سب ٹھیک ہے نا؟“ مختصر سی خاموشی کے بعد اس نے دل میں آنے والے ایک اندیشے کے تحت سوال کیا۔

”ہاں ہاں، سب ٹھیک ہے۔ اگر ٹھیک نہیں بھی ہوتا تو کیا تیرے خیال میں حویلی والے اتنے رحم دل ہیں کہ تیرے گھر کی پریشانی پر گڈی بھیج کر تجھے شہر سے بلواتے۔ ان کا اپنا ہی کوئی کام شام ہوگا جو انہوں نے تجھے بلوایا ہے۔“ ڈرائیور نے جھنجھلاہٹ زدہ لہجے میں جواب دیا، وہ بخ ہونے کے باوجود اپنی جگہ بالکل صبح تھا جسے سن کر رانی کو خاموشی اختیار کرنی پڑی۔ اسی خاموشی میں اوگھتے جاگتے واپسی کا سفر طے ہو گیا اور وہ پیر آباد کی حدود میں داخل ہو گئے۔ گاڑی کے پیر آباد میں داخل ہوتے ہی رانی کے دل نے بے حد خوشی محسوس کی۔ لاہور جیسے بڑے اور پُر رونق شہر میں رہ کر بھی اسے اپنے اس کچے کچے گھروں والے پیر آباد کی یاد مسلسل ستاتی رہی تھی اور اب جبکہ وہ پیر آباد کی فضاؤں میں سانس

لے رہی تھی تو یہ اس کے لیے از حد خوشی کا مقام تھا۔ خوشی کی اس کیفیت میں ڈوبی وہ آنے والے ظالم وقت کی آہٹیں سنے بغیر حویلی تک پہنچ گئی۔

”سیدھی وڈی چودھرائن کے پاس چلی جا۔ انہوں نے کہا تھا کہ رانی کو لاتے ہی فوراً میرے پاس بھیجنا۔“ وہ گاڑی سے اتر ہی رہی تھی کہ ڈرائیور نے اسے وڈی چودھرائن کا پیغام پہنچایا۔ وہ جو حویلی پہنچتے ہی کشور کے کمرے کا رخ کرنے کا ارادہ رکھتی تھی، اس حکم کو سن کر ٹھنک گئی۔ اب تک وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ اسے کشور کے اصرار پر حویلی واپس بلوایا گیا ہوگا لیکن اب اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ہے۔ گڑبڑ کا پتا وڈی چودھرائن سے ملنے کے بعد ہی چل سکتا تھا چنانچہ وہ اس کے کمرے کی طرف چل پڑی۔ اس کے سامان کی گھڑی بھی اس کی بغل میں دبی ہوئی تھی۔

”وڈی چودھرائن اپنے کمرے میں نہیں ہے رانی! میرے ساتھ آئیں تجھے ان کے پاس لے چلوں۔“ ابھی وہ وڈی چودھرائن کے کمرے کی طرف جانے والی راہداری میں مڑی ہی تھی کہ اسے کچھ ٹپک گئی۔

”خیر تو ہے... تو بڑی کمزور لگ رہی ہے... چہرہ اترا ہوا سا ہے۔ کیا بیمار ہی ہے؟“ کچھ کے ساتھ قدم ملا کر چلتے ہوئے اس نے اس سے دریافت کیا۔

”ٹھیک ہوں میں۔“ کچھ نے جس کی شکل ایک دن کی قید کے بعد ہی بالکل اتر کر رہ گئی تھی، سپاٹ سے لہجے میں جواب دیا تو اس کی مزید سوال جواب کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ویسے بھی کچھ اور اس کی بہن شادو سے اس کے تعلقات کبھی بھی زیادہ اچھے نہیں رہے تھے۔ وہ ان خوشامدی اور سازشی لڑکیوں سے دور ہی رہنا پسند کرتی تھی۔

”وڈی چودھرائن ادھر ہے؟“ جب کچھ اسے لے کر تہ خانے کی سیڑھیاں اترنے لگی تو اس نے حیرت سے پوچھا۔ جواباً کچھ نے محض اثبات میں سر کو جنبش دینے پر اکتفا کیا۔

”پر وہ ادھر کیا کر رہی ہے؟“ اسے تہ خانے میں جاتے ہوئے خوف محسوس ہو رہا تھا۔

لے تہ خانے کے ایک کمرے کی طرف بڑھی۔ رانی کا آج پہلی بار تہ خانہ دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا لیکن اس تہ خانے کے بارے میں اس نے بہت سی کہانیاں ضرور سن رکھی تھیں۔

سنا تھا کہ یہ تہ خانہ چودھری کے دادا نے حویلی تعمیر کرتے وقت بنوایا تھا اور اس تہ خانے کی حیثیت ایک نجی جیل جیسی تھی جہاں وہ اپنے ناپسندیدہ افراد کو قید میں رکھتے اور ایذا دیتے تھے۔ دادا کے بعد چودھری کا باپ بھی اس تہ خانے کو اسی مقصد کے لیے استعمال کرتا رہا لیکن چودھری کے بارے میں یہی سننے میں آیا تھا کہ اس نے تہ خانے کا یہ استعمال بند کر دیا تھا۔ اس کی وجہ اس کی رحم دلی نہیں بلکہ عقل مندی تھی۔ بدلتے ہوئے سیاسی حالات کے پیش نظر اس نے یہ احتیاط کی تھی کہ اپنی ذاتی رہائش گاہ کو کسی متنازع کام کے لیے استعمال نہ کرے۔ دوسرے وہ اپنے باپ دادا کی طرح اپنے مخالفین کو مستقل قید میں رکھنے کی زحمت کو ادا نہیں کرتا تھا۔ عموماً اس کے مجرم و دشمن چند دن کی قید اور ایذا سہہ کر اپنے انجام کو پہنچ جاتے تھے... اور اس مقصد کے لیے ڈیرا حویلی سے زیادہ مناسب تھا جہاں معاملات اہل خانہ سے بھی مخفی رہتے ہوئے بالا ہی بالا طے پا جاتے تھے۔ بہر حال جو بھی تھا، فی الحال تو رانی اس بدنام تاریخی پس منظر رکھنے والے تہ خانے کی ٹھن زدہ فضا میں خود کو نہایت خوف زدہ اور مجبور محسوس کر رہی تھی۔ کچھ اسے لے کر ایک کمرے میں داخل ہوئی تو وہاں موجود وڈی چودھرائن کے چہرے کے تاثرات نے اس کے خوف کو اور بھی زیادہ بڑھا دیا۔ وہ قہر برساتی نظروں سے اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”سلام وڈی چودھرائن۔“ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں سلام کیا۔ اپنا جرم معلوم نہ ہونے کے باوجود وہ اتنا اندازہ تو لگا چکی تھی کہ کچھ نہ کچھ ایسا ہوا ہے جس نے وڈی چودھرائن کو اس کی طرف سے برگشتہ خاطر کر دیا ہے۔

”شادو، کچھ! اسے پکڑ کر رسیوں سے باندھ دو۔“ اس کے سلام کا جواب دیے بغیر وڈی چودھرائن نے اپنی چمچوں کو حکم دیا۔ وہ دونوں فوراً ہی حرکت میں آ گئیں۔ خود ان کے ساتھ وڈی چودھرائن نے جو سلوک کیا تھا، اس کے پیش نظر تو اصولاً ان دونوں کی ہمدردیاں رانی کے ساتھ ہونی چاہیے تھیں لیکن وہ اپنی لاپچی اور مکار فطرت کی وجہ سے ایک بار پھر وڈی چودھرائن کے جھانسنے میں آ گئی تھیں۔

وڈی چودھرائن نے ان سے کہا تھا کہ میں جانتی ہوں تم دونوں میری وفادار ہو اور کشور والے معاملے میں بھی مجھ سے وفاداری نبھاتے ہوئے رازداری برتو گی لیکن میں تمہیں

قید کرنے پر مجبور تھی کیونکہ یہ چودھری صاحب کا حکم تھا۔ اب ایسا ہے کہ تم دونوں کی جان اسی طرح چھوٹ سکتی ہے کہ کسی طرح کشور ہمارے پاس واپس آ جائے۔ اسے واپس لانے کے لیے ہم جو کوششیں کر رہے ہیں اس میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کشور کی ملازمہ خاص رانی سے کسی طرح اس شخص کا نام پتا اگلوایا جائے جس کی خاطر کشور نے ایسی حرکت کی ہے۔ میں رانی کو یہاں بلوا کر پوچھ گچھ کروں گی۔ ظاہر ہے، وہ آسانی سے تو بتائے گی نہیں اس لیے ہو سکتا ہے کہ اسے مار پیٹ کر سچ اگلوانے کی کوشش کرنی پڑے۔ میں خود تو یہ کام نہیں کر سکتی اس لیے تم دونوں کو میری مدد کرنی ہوگی۔ اگر تم رانی سے سچ اگلوانے میں کامیاب ہو گئیں تو میں چودھری صاحب سے تمہاری سفارش کر کے تمہیں یہاں سے باہر نکلوا دوں گی۔

آزادی کے لالچ میں دونوں بہنوں نے اس کی یہ پیشکش قبول کر لی تھی اور یہ بھول گئی تھیں کہ حکمرانوں کے وعدے بھی انہی کی طرح چھوٹے ہوتے ہیں۔ اس وقت چودھرائن نے جو پیشکش کی تھی، وہ اپنی غرض سے تھی۔ رانی سے سچ اگلوانے کا کام وہ تنہا خود نہیں کر سکتی تھی اور کسی اور ملازم کو اس کام کے لیے استعمال کرنا بات کو پھیلانے کا سبب بنتا چنانچہ جو پہلے ہی سے با علم تھے، انہی کو استعمال کرنا بہتر تھا۔

”چھوڑو... مجھے کیوں باندھ رہی ہو؟“ دونوں بہنیں اسے بازو سے پکڑ کر رسی تک لے گئیں تو وہ احتجاجاً چلائی مگر انہوں نے اس کی مزاحمت کے باوجود اسے دو مخالف دیواروں میں لوہے کے کنڈے کی مدد سے دیوار سے لٹکی ہوئی رسیوں تک پہنچا کر دم لیا۔ پہلے اس کے دائیں ہاتھ کو رسی کی مدد سے باندھا گیا اور پھر بائیں ہاتھ کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔ اب وہ فرش پر اس طرح کھڑی تھی کہ اس کے دونوں ہاتھ دائیں بائیں بندھی رسیوں سے لٹکے ہوئے تھے۔

”میرا قصور کیا ہے وڈی چودھرائن! میں نے ایسی کون سی غلطی کر دی ہے کہ آپ مجھے ایسی سزا دے رہی ہیں؟“ خود کو باندھے جانے کے بعد اس نے مزاحمت ترک کر کے وڈی چودھرائن سے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

”زیادہ معصوم نہ بن۔ مجھ سے اپنا قصور پوچھتی ہے نمک حرام! تو ہی تو ہے جس کے سہارے وہ کشور کی بچی اتنا بڑا کام کر گئی ہے۔ اب تو ہمیں بتائے گی کہ وہ حویلی سے بھاگ کر اپنے کس یار کے پاس گئی ہے؟“ وڈی چودھرائن نے قہر آلود لہجے میں پوچھا۔

”کشور بی بی حویلی سے چلی گئیں؟“ رانی حیرت اور خوشی کی ملی جلی کیفیت میں بولی۔

”ہاں... اور اب تو ہمیں بتائے گی کہ وہ بھاگ کر کہاں گئی ہے؟“ چودھرائن نے اس کا انداز بھانپ لیا اور دو ٹوک لہجے میں بولی۔

”میں یہ کیسے بتا سکتی ہوں جی! میں تو حویلی میں تھی ہی نہیں۔ مجھے بھلا کیا خبر کے وہ کہاں گئی ہیں؟“ رانی نے تجاہل برتتے ہوئے اپنی قطعی لاعلمی کا مظاہرہ کیا۔

”شادو...“ اس کا جواب سن کر وڈی چودھرائن بلند آواز سے چیختی۔ نتیجتاً رانی کے بائیں جانب ہاتھ میں چمڑے کا بیلٹ لے کر کھڑی ہوئی شادو کا ہاتھ حرکت میں آیا۔ بیلٹ کا بکل لوہے کا تھا اور شادو نے اسے اس انداز سے پکڑا ہوا تھا کہ بیلٹ حرکت کرتا ہوا اس کی پیٹھ کی طرف بڑھتا تو اس کا بکل والا سرا آزاد تھا جو ٹھک سے آکر اس کی پیٹھ پر لگا۔ کھا کھا کر جسم میں چربی جمع کر لینے والی شادو کے اس وار میں بڑی طاقت تھی۔ رانی اچھی خاصی سخت جان ہونے کے باوجود بلبلاتا کر رہ گئی۔

”اب بھی وقت ہے، مجھے سب کچھ بتادے ورنہ میں تیری کھال اڈھڑوا کر رکھ دوں گی۔“ اسے بلبلاتے دیکھ کر وڈی چودھرائن نے اسے خبردار کیا۔

”مجھے کچھ نہیں معلوم“ چودھرائن کی دھمکی کے باوجود رانی اپنے بیان سے پیچھے نہیں ہٹی۔ وہ ہمیشہ کشور سے وفاداری کا دم بھرتی رہی تھی اور آج وہ وقت آ گیا تھا کہ وہ اپنی وفاداری کو ثابت کر دکھاتی۔ چنانچہ نتائج کی پروا کیے بغیر اپنی لاعلمی کے دعوے پر قائم رہی۔

”ٹھیک ہے فیر۔ تیری چمڑی کو مار ہی چاہیے تو اب میں ان دونوں کو نہیں روکوں گی۔ جب تیرا مار کھا کھا کر دل بھر جائے تو آپ مجھے بتا دینا۔“ چودھرائن سفاکی سے کہتے ہوئے کرسی کی پشت سے اطمینان کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور منکر نکیر کی طرح رانی کے دائیں بائیں کھڑی چچی اور شادو کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں کمرے میں موجود واحد کرسی پر براہمان چودھرائن کے اشارے پر فوراً ہی حرکت میں آ گئیں اور ان کے ہاتھ متواتر چمڑے کی بیلٹوں سے رانی کی پشت پر ضرب لگانے لگے۔ ہر ضرب پر رانی کے حلق سے ایک دل دوز چیخ نکلتی لیکن مارنے والے ہاتھ اور تماشا دیکھنے والی آنکھیں رحم سے ناواقف تھیں۔

”مجھے چھوڑ دو۔ مجھے کچھ نہیں معلوم۔“ چیخوں کے درمیان رانی کا تواتر سے کہا جانے والا یہ جملہ بھی گویا کوئی سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ بالآخر پہلے اس کے الفاظ کم ہوئے اور پھر حلق سے نکلتی چیخیں بھی دم توڑ گئیں۔ وہ اس بہیمانہ تشدد

سے نڈھال ہو کر بے ہوش ہو گئی تھی اور اس کا سر ایک طرف لڑھک گیا تھا۔ اگر اس کے دونوں ہاتھ دیوار کے ساتھ بندھی رسیوں میں نہ جکڑے ہوتے تو وہ فرش پر گر پڑتی لیکن اب اس کا بے ہوش وجود کمپرسی کے عالم میں جھول رہا تھا۔ وہ بے ہوش ہوئی تو چچی اور شادو نے اپنے ہاتھ روک لیے۔ وہ خود اس مشقت کی وجہ سے ہانپ سی گئی تھیں۔

”ہوش میں لاؤ اسے۔ مکر کر رہی ہے نمک حرام۔ اسے سارے جگر کا چنگی طرح پتا ہے۔ دن رات کشور کے پاس گھسی رہتی تھی۔ اس کی راز داں تھی جب ہی تو وہ ہر وقت اس کی طرف داری کرتی تھی۔ اس کے سوا کسی اور نوکرانی کو تو اس نے کبھی اتنا سر نہیں چڑھایا۔“ رانی کو بے ہوش ہوتے دیکھ کر وڈی چودھرائن نے نفرت زدہ لہجے میں حکم جاری کیا۔ اس کے حکم پر شادو نے وہاں موجود پانی کا جگ رانی کے چہرے پر الٹ دیا۔ پانی کی ٹھنڈک سے وہ جھرجھری سی لے کر ہوش میں آ گئی۔

ہوش میں آنے کے بعد تکلیف کے شدید ترین احساس کے ساتھ اس نے جو دوسری بات محسوس کی وہ یہ تھی کہ چہرے اور گردن کو بھگونے کے بعد گھیس کو بھی تر کر کے زمین پر گرنے والے پانی کے قطروں کے علاوہ کوئی اور سیال بھی ہے جو اس کے جسم پر سے قطروں کی صورت پھسلتا ہوا نیچے گر رہا ہے۔ اس سیال کی حرکت وہ اپنی پشت پر محسوس کر رہی تھی۔ ذرا سا سر جھکا کر نیچے اپنے قدموں کی طرف دیکھا تو پانی کے ساتھ گھلتے ملتے سرخ رنگ نے اس پر حقیقت عیاں کر دی۔ لوہے کے بکل سے اڈھڑ جانے والی پیٹھ سے خون کا اخراج شروع ہو گیا تھا اور یہ خون قطرہ قطرہ کر کے نیچے گر رہا تھا۔

”کچھ یاد آیا تجھے... یا یاد کروانے کے لیے کچھ اور انتظام کرو؟ میرے پاس ابھی تجھ سے سچ اگوانے کے لیے بہت طریقے ہیں۔“ چودھرائن نے اس کی کھلی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے طنز سے پوچھا۔

”میں کچھ نہیں جانتی جی! میں تو یہاں تھی ہی نہیں۔“ رانی نے نقاہت زدہ لہجے میں اپنا پچھلا بیان دہرایا۔

”اچھا چل، مان لیا کہ تو یہاں نہیں تھی اس لیے تجھے کچھ خبر نہیں کہ تیری بی بی کس کے ساتھ اور کس طرح بھاگی، پر جب تو یہاں تھی، تب کی گل تو بتا سکتی ہے۔ مجھے بتا کہ وہ کس سے چھپ چھپ کر فون پر گل کرتی تھی۔ اس کے پاس جو موبائل تھا وہ اسے کس نے دیا تھا؟“ چودھرائن نے طراری کے ساتھ اس سے سوال کیا۔

”مجھے نہیں خبر۔ میں نے ان کے پاس کوئی موبائل

نہیں دیکھا۔“ اس نے چودھرائن سے نظریں چراتے ہوئے اس کے سوال کا جواب دیا۔

”تو بہت ڈھیٹ چیز ہے۔ تیری اس ڈھٹائی کا علاج کرنا ہی پڑے گا۔“ چودھرائن اس کا جواب سن کر چراغ پا ہو گئی اور اپنی چچیوں کو ہاتھ سے کوئی اشارہ کیا۔ اس اشارے کو پا کر چچی نے ایک جانب رکھی پلاسٹک کی برنی اٹھائی اور اس میں موجود نمک اور سرخ مرچوں کا مکسچر مٹی میں بھر کر رانی کی زخمی پیٹھ پر مل ڈالا۔ پہلے ہی ٹیسس دیتے زخم، نمک اور مرچ لگتے ہی جل اٹھے۔ رانی کو بالکل ایسا لگا کہ اس کی پیٹھ پر کسی نے آگ بھڑکا دی ہو۔ وہ تکلیف کی شدت سے ذبح کیے جانے والے بکرے کی طرح چیختی گئی۔ یہ تکلیف اتنی شدید تھی کہ ایک دفعہ تو اسے وفاداری کا سبق بھی بھولنے لگا اور دل میں خیال آیا کہ وڈی چودھرائن کو سب کچھ بتا کر اس عذاب سے نجات حاصل کر لے لیکن یہ خیال بس لمحات ہی تھا۔ شدید تکلیف کے عالم میں بھی عقل نے اس کا دامن تھام لیا اور وہ سچ اگلتے اگلتے اپنے لبوں کو بچھنچ گئی۔

ایک دم ہی اسے خیال آ گیا تھا کہ سچ بولنے کے بعد بھی اس کی جاں بخشی ہونا ممکن نہیں۔ کشور کے جرم میں اس کا ساتھ دینے اور اس کے راز کو راز رکھنے کا قصور اتنا بڑا تھا کہ وہ سب بتا کر بھی سزا سے نہیں بچ سکے گی۔ حویلی والوں کی یہ ریت رہی تھی کہ وہ اپنی کسی بہو، بیٹی کے قدم لڑکھڑانے پر اس سے بعد میں حساب لیتے تھے، اس کے مددگاروں کو پہلے ٹھکانے لگاتے تھے۔ یعنی یہ طے تھا کہ وہ زبان بند رکھے یا کھول دے، خود کسی صورت میں بچ سکتی تھی... تو پھر بہتر تھا کہ اپنی وفاداری پر آج نہ آنے دیتی اور کشور کو جس سے وہ حقیقتاً خود بھی بہت محبت کرتی تھی، ایک بار اسے اس کی مرضی کی زندگی جینے کا موقع فراہم کر دیتی۔ ذہن و دل میں یہ یک وقت ابھرنے والے یہ خیالات و جذبات ایسے تھے کہ بیٹھ پر بھڑکتے شعلوں کی آج کھم ہونے لگی اور اس کے حلق سے نکلتی چیخیں دم توڑ گئیں۔ درحقیقت وہ ایک بار پھر ہوش و خرد سے بیگانہ ہو کر بازوؤں میں بندھی رسی سے جھول گئی تھی۔

”اسے ایسے ہی بندھا رہے دو۔ دوبارہ ہوش آئے تو کھانا پانی دینے کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ ہوش میں آنے کے بعد ایک بار پھر اس کے زخموں میں نمک بھر دینا اور ناک میں مرچوں کی دھونی دینا۔ یا تو یہ اپنی زبان سے سچ نکالے گی یا پھر اس کے جسم سے روح نکلے گی۔“ رانی کی مستقل مزاجی نے وڈی چودھرائن کو وقتی طور پر تو ہار ماننے پر مجبور کر دیا تھا لیکن وہ اسے چھوڑنے یا اس کی بات پر یقین کرنے کے لیے قطعی تیار

نہیں تھی۔ چنانچہ رعونت سے حکم جاری کرنے کے بعد اپنے بھاری بھر کم جیسے کو سنبھالتی ہوئی وہاں سے روانہ ہو گئی۔

☆☆☆

”باجوہ والے معاملے کی تحقیق کروائی تم نے عبدالمنان! کچھ معلوم ہوا کہ تارڑ کے بیان میں کتنی سچائی ہے؟“ طبیعت ذرا بہتر پا کر شہر یار نے اسپتال سے چھٹی لے لی تھی اور اپنی ڈیوٹی پر واپس آ گیا تھا۔ اسپتال میں داخل رہنے کے دوران بھی وہ اپنے ضلع کے معاملات سے یکسر بے خبر نہیں رہا تھا اور فون پر عبدالمنان کو ہدایات جاری کرتا رہتا تھا۔ باجوہ والا معاملہ بھی اس نے فون پر اسے بتا دیا تھا۔ تارڑ اسپتال میں اس سے ملاقات کے لیے آیا تھا تو اس نے دبے لفظوں میں یہ شک بھی ظاہر کر دیا تھا کہ اس قتل کے پیچھے چودھری کا ہاتھ ہو سکتا ہے کیونکہ اب باجوہ قانون کی نظروں میں آنے کے بعد اس کے لیے زیادہ مفید نہیں رہا تھا۔ شاید اس نے سوچا ہو کہ وہ نیا فارسیٹ آفیسر اپنی مرضی کا لے آئے گا لیکن اتفاق سے ڈاکٹر ماریا کی سفارش پر شہر یار کو عابد انصاری جیسا بندہ مل گیا۔ شہر یار اس سے ملاقات کر کے کافی مطمئن ہوا تھا اور اسے لگا تھا کہ یہ شخص اس کی خواہش کے مطابق بہت اچھے طریقے سے کام کرے گا۔ بہر حال، عابد انصاری کی کارکردگی تو ابھی سامنے آئی تھی لیکن اس سے پہلے وہ باجوہ والے معاملے کو پرکھنا چاہتا تھا اور اس مقصد کے لیے اس نے عبدالمنان کی ڈیوٹی لگا دی تھی جس کے بارے میں اسے علم تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح یہ کام سرانجام دے ڈالے گا۔

”لیس سر! میں نے ساری معلومات حاصل کر لی ہیں۔ باجوہ کا آبائی گاؤں الگ ضلع میں ہونے کی وجہ سے معلومات حاصل کرنے میں کچھ وقت تو لگا لیکن تارڑ کے بیان کی تصدیق ہو گئی ہے۔ میرے اعتماد کے ایک آدمی نے گورکن سے مل کر یہ تصدیق کر لی ہے کہ باجوہ کی قبر کھود کر وہاں سے اس کی ڈیڈ باڈی نکالی گئی ہے اور ڈیڈ باڈی نکالنے والے سرکاری اہلکار تھے۔ وہ شخص باجوہ کی خالی قبر بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا ہے۔ اس کے علاوہ ہم نے اس پولیس سرجن کو بھی اپروچ کر لیا ہے جس نے باجوہ کا پوسٹ مارٹم کیا تھا۔ وہاں سے بھی یہ تصدیق ہو گئی ہے کہ تارڑ کی آپ کو دی ہوئی انفارمیشن درست ہے۔ باجوہ کی موت واقعی ہارٹ فیل سے نہیں بلکہ زہر خورانی کی وجہ سے ہوئی ہے۔“ حسب توقع عبدالمنان کے پاس مکمل رپورٹ موجود تھی۔

”جب آئی باتیں درست ہیں تو تارڑ کا یہ شک بھی درست ہو سکتا ہے کہ باجوہ کی موت کے پیچھے چودھری کا ہاتھ

ہے لیکن مسئلہ وہی ہے کہ ہمارے پاس ایسا کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہیں جس کی بنیاد پر ہم چودھری پر ہاتھ ڈال سکیں۔ خود تارڑ بھی اس سے خوف زدہ نظر آ رہا ہے اور ملک سے باہر نکلنے کے چکر میں ہے بلکہ سمجھو کچھ دن میں روانہ ہی ہو جائے گا۔

”آپ کا خیال درست ہے سر... لیکن سر درست ہم اس مسئلے پر کچھ نہیں کر سکتے اور بہت سے معاملات کی طرح ہمیں اس معاملے کو بھی فی الحال نظر انداز ہی کرنا ہوگا۔“

عبدالمنان نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے حقیقت پسندی کا مظاہرہ کیا۔

”ایسا ہے تو ایسا ہی سہی لیکن تم دیکھنا کہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب چودھری کو اپنے اعمال کا حساب اسی دنیا میں دینا پڑے گا۔ اس کی گردن کب گرفت میں آتی ہے، یہ ابھی مجھے بھی معلوم نہیں لیکن وہ پکڑا ضرور جائے گا۔“

”ضرور سر! انشاء اللہ۔“ عبدالمنان نے صدق دل سے کہا پھر موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ ”آپ نے کہا تھا کہ آپ کے مختلف دیہاتوں میں دورے کا شیڈول تیار کر دوں، وہ میں نے کر دیا ہے۔ آج آپ کوچنگ ٹائم کے بعد وزٹ کے لیے نور پور جانا ہوگا۔“

”اوکے! یہ تم نے اچھا کیا کہ سب سے پہلے نور پور کا وزٹ رکھ لیا۔ میں کافی دنوں سے چودھری بختیار سے ملنا چاہ رہا ہوں لیکن موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ اب جاؤں گا تو مل لوں گا۔“ عبدالمنان کی کارکردگی کو سراہتے ہوئے شہریار نے ایک بار پھر اپنے دل میں اس شخص کی صلاحیتوں کو بہت گہرائی سے محسوس کیا۔ اپنے آفیسر کا اس حد تک مزاج آشنائی اے مل جانا بڑے شکر اور خوشی کا مقام تھا۔

”ایک کام اور کرو عبدالمنان! میری ایس پی تارڑ سے بات کروادو۔ اس شخص میں بہتری کے آثار نظر آرہے ہیں تو کیوں نہ موقع کا فائدہ اٹھا لیا جائے۔“ عبدالمنان نے فوراً ہی اس کے حکم کی تعمیل کی اور تارڑ کا نمبر ملا کے اس کے لائن پر آنے کے بعد ریسپور شہریار کو تھما دیا۔

”خیریت سر! آج صبح صبح ہماری یاد کیسے آگئی آپ کو؟“ شہریار کی ہیلو کے جواب میں تارڑ نے خوش گوار لہجے میں اس سے سوال کیا۔

”میں نے سوچا کہ اب تو آپ رخصت ہونے والے ہیں، آپ سے معلوم کر لوں کہ کوئی کام وغیرہ میرے لائق ہو تو بتائیں۔“ شہریار نے بھی جوانی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔

”کام تو کوئی نہیں، ہاں ایک خواہش ہے کہ اگر میرے جانے سے پہلے آپ میرے ساتھ کسی روز ڈنر کر لیں تو

بہت اچھا رہے گا۔“ تارڑ نے پیشکش کی۔

”چلیں ٹھیک ہے، ایسا کر لیتے ہیں لیکن ڈنر میری طرف سے ہوگا۔ آپ نے پہلے ذکر چھیڑ دیا ورنہ اصولی طور پر مجھے آپ کو اس الوداعی ڈنر کی دعوت دینی تھی۔ آپ ایسا کریں کہ اس سنڈے کو میرے بنگلے پر تشریف لے آئیں، ساتھ بیٹھ کر ڈنر بھی کر لیں گے اور کچھ گپ شپ بھی رہے گی۔“ اس نے جوابی پیشکش کی جس سے انکار ظاہر ہے تارڑ کے لیے ممکن نہیں تھا۔

”مجھے آپ سے ایک کام اور تھا تارڑ صاحب! امید ہے کہ آپ میرے ساتھ تعاون کریں گے۔“ رمی گفتگو کا سلسلہ ختم ہوا تو اس نے اصل مطلب پر آتے ہوئے تارڑ سے کہا۔

”حکم فرمائیے سر! اگر میرے اختیار میں ہوا تو میں ضرور آپ سے تعاون کروں گا۔“

”نور پور بم بلاسٹ میں خودکش حملہ آور لڑکے کے والدین اور بڑے بھائی کو آپ نے گرفتار کر لیا تھا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ گرفتار تو وہ میرے کہنے پر کیے گئے تھے لیکن بعد میں آپ نے انہیں اپنی کھڑی میں لے لیا تھا۔ ان لوگوں کا بعد میں کچھ پتا نہیں چلا حالانکہ میں ہنڈرڈ پرسنٹ شیور ہوں کہ ان بے چاروں کا اس بم بلاسٹ سے کوئی تعلق نہیں تھا اور وہ بالکل بے قصور تھے۔ آپ کی مہربانی ہوگی اگر آپ مجھے ان لوگوں کے بارے میں انفارم کر دیں۔“ اس کی اس درخواست کے جواب میں تارڑ پل بھر کے لیے خاموش ہو گیا اور پھر بولا تو اس کے لہجے میں ندامت تھی۔

”آئی ایم سوری اے سی صاحب! اس فیملی کا تو اب مجھے بھی کچھ اتنا پتا معلوم نہیں ہے۔ ایچولی بلاسٹ کی انویسٹی گیشن شروع کرتے ہی ایجنسز والوں نے ان لوگوں کو اپنی کھڑی میں لے لیا تھا، چنانچہ بعد میں میرا بھی ان لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔“ تارڑ کا جواب اس کے لیے خاصا مایوس کن تھا۔ وہ افسر شاہی کا ایک پُرزہ تھا اور بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ ایجنسز کے ہاتھ لگ جانے والوں کے بارے میں کچھ بھی معلوم کرنا آسان نہیں ہوتا۔

”اوکے تارڑ صاحب! آپ نے جتنا بتا دیا، یہ بھی کافی ہے۔ اب مجھے اجازت دیں۔ مجھے کچھ اور بھی ضروری امور نمٹانے ہیں۔“ ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے رابطہ منقطع کر دیا اور پل بھر کے توقف کے بعد اپنا موبائل نکال کر مشاہیرم خان کا نمبر ملانے لگا۔ عبدالمنان کو وہ تارڑ سے گفتگو کے دوران ہی اشارے سے جانے کی اجازت دے چکا تھا چنانچہ اس وقت اپنے دفتر میں بالکل تنہا تھا۔ اس تنہائی

نے اسے ماہ بانو کی یاد دلائی تھی، تب ہی اسے اس کی تلاش میں سرگرداں مشاہیرم خان سے رابطے کا خیال آیا تھا۔ اس کے نمبر ملانے پر بہت دیر تک تیل جاتی رہی لیکن دوسری طرف سے کال ریسپونڈ نہیں کی گئی۔ اللہ جانے مشاہیرم خان کہاں مصروف تھا کہ اسے اس کی کال ریسپونڈ کرنے کی بھی فرصت نہیں تھی۔ اس کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد اس نے بلتستان میں موجود اپنے ہم منصب سے رابطہ کیا۔

”ماہ بانو نامی لڑکی کے اغوا کے کیس میں کچھ پیش رفت ہوئی جناب یا نہیں؟“ رمی سلام دعا اور حال احوال کے بعد اس نے وہ سوال کیا جس مقصد کے تحت کال کی تھی۔

”سوری مسٹر شہریار! میں بہت شرمندہ ہوں کہ ابھی تک ہم لڑکی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کر سکے ہیں۔ یہ کیس بہت پیچیدہ صورت اختیار کر گیا ہے۔ پہلے ٹورسٹ کمپنی کا وہ ڈرائیور حادثاتی موت کا شکار ہوا جس کی جیب چھین کر اسے ماہ بانو کے اغوا کے لیے استعمال کیا گیا تھا اور اب ٹورسٹ کمپنی کا مالک صغیر بیگ غائب ہے۔ صغیر بیگ کی گاڑی ایک جگہ خالی کھڑی پائی گئی ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اسے کسی نے اغوا کر لیا ہے لیکن کڈنپر کون ہے، اس کے بارے میں ابھی تک کوئی اندازہ نہیں لگایا جاسکا۔“ دوسری طرف سے ذرا شرمندہ سے لہجے میں جواب دیا گیا۔

”یہ تو واقعی بہت پیچیدہ صورت حال ہے۔ بہر حال، آپ خیال رکھیے گا اور جیسے ہی کوئی نئی بات معلوم ہو، پلیز مجھے انفارم کر دیجیے گا۔“ وہ جانتا تھا کہ ان لوگوں کا اپنا طریقہ تفتیش ہے جو ان کی سیدھی سادی زندگیوں کے باعث اتنا زیادہ تیز رفتار نہیں۔ ویسے بھی پولیس کی کارکردگی تو لاہور اور کراچی جیسے بڑے شہروں میں بھی اتنی واجبی تھی کہ اتنے دشوار گزار علاقے میں ان سے کوئی اچھی امید رکھنا عبث تھا۔

اس کال سے فارغ ہونے کے بعد اس نے ایک بار پھر مشاہیرم خان کا نمبر ٹرائی کیا۔ اس بار بھی تیل جاتی رہی لیکن کوئی کال ریسپونڈ نہیں کر رہا تھا۔ بالآخر وہ مایوس ہو کر سلسلہ منقطع ہی کرنے لگا تھا کہ کسی نے کال ریسپونڈ کر لی۔ کال ریسپونڈ کرنے والے کی آواز سے لگ رہا تھا کہ وہ کوئی سترہ اٹھارہ سال کا کم عمر لڑکا ہے۔

”کون بات کر رہا ہے؟“ مشاہیرم خان کا فون ہے نا تو وہ خود کہاں ہے؟“ اس نے تیز لہجے میں لڑکے سے سوال کیا۔

”ہم نہیں جانتا صاحب کہ مشاہیرم خان کون ہے۔ یہ فون ہمیں راستے میں پڑا ہوا ملا تھا تو ہم نے اٹھا کر اپنے پاس رکھ لیا۔“ لڑکے نے گہرائے ہوئے لہجے میں جواب دیا تو وہ

ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا اور قدرے نرمی سے پوچھا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”ہم سمندر خان ہے۔ یہاں ایک موبائل میں ویٹر کا کام کرتا ہے۔“ لڑکے نے فخریہ لہجے میں جواب دیا۔

”سنو سمندر خان! یہ موبائل جس شخص کا ہے، مجھے اس سے بات کرنی ہے۔ تم ایسا کرو کہ ہوٹلوں میں گھوم پھر کر معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ مشاہیرم خان کہاں ٹھہرا ہوا ہے۔ وہ مل جائے تو یہ فون اسے دے دینا۔ اس کے بدلے تمہیں انعام مل جائے گا۔“ بہت سمجھانے والے انداز میں اس نے لڑکے کو یہ ہدایت دی۔

”ٹھیک ہے جناب! ہمیں وقت ملا تو کوشش کرے گا۔“ لڑکے کا انداز ٹالنے والا تھا۔

”وقت کی بات مت کرو، تمہیں ہر حال میں مشاہیرم خان کو تلاش کرنا ہے۔ انعام میں، میں تمہیں اس سے بھی اچھا موبائل دلوادوں گا۔“ یہ محسوس کر کے کہ لڑکا موبائل کے لالچ میں مشاہیرم خان کو ڈھونڈنے میں آنا کافی کر رہا ہے، اس نے اسے لالچ دیا۔

”سچ کہہ رہے ہو صاحب؟“ اس نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

”سو فیصد سچ کہہ رہا ہوں۔ بس تم میرا کام کر دو... اور ہاں، اس موبائل کو آف مت کرنا۔ میں اسی نمبر پر تم سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد رابطہ کرتا رہوں گا۔“ اس نے لڑکے کو پابند کرنے کے لیے کہا۔ دراصل وہ مشاہیرم خان کی طرف سے تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس کا موبائل کسی جگہ پڑا ملنا کوئی اچھی علامت نہیں تھا۔ یہاں بیٹھ کر وہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ موبائل مشاہیرم خان سے بے خیالی میں گر گیا تھا یا وہ کسی غیر معمولی صورت حال سے دوچار ہوا تھا اور کسی سے لڑائی جھگڑے میں اس کا موبائل گرنے کی نوبت آگئی تھی۔

”سنو سمندر خان! ایک کام کرو۔ ہوٹلوں میں معلوم کرنے سے پہلے سب سے پہلے دوکانے (اسپتال) جاؤ۔ وہاں مشاہیرم خان کی ماں داخل ہے۔ تم وہاں جاؤ گے تو مشاہیرم خان مل جائے گا یا پھر اس کے بارے میں کوئی خبر ہی مل جائے گی۔“ وہ فون بند ہی کرنے لگا تھا کہ مشاہیرم خان کی تلاش کا ایک نسبتاً آسان راستہ دکھائی دیا چنانچہ سمندر خان کو ہدایت دی۔

”ٹھیک ہے صاحب! ہم ایسا ہی کرے گا۔“ سمندر خان نے جواب دے کر فون بند کر دیا تو وہ بھی اپنا سر جھٹک کر دوسرے کاموں کی طرف متوجہ ہو گیا لیکن یہ توجہ خالصتاً پیشہ

ورانہ نوعیت کی تھی۔ اس مصروفیت کے دوران بھی دل اس پریشانی میں مبتلا تھا کہ جانے ماہ بانو کہاں اور کس حال میں ہو گی؟ اپنی بے پناہ مصروفیات اور مسائل کے باوجود وہ زندگی میں آنے والی اس بے ظاہر عام سی لڑکی کو فراموش کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ ہر پریشانی، ہر مصروفیت اور ہر کام کے دوران اس کا خیال ساتھ ساتھ رہتا تھا۔ اس طرح پل پل خیال میں رہنے والی ہستی درحقیقت زندگی میں سب سے اہم مقام کی حامل ہوتی ہے۔ اے سی شہریار عادل کو ابھی اس حقیقت کا ادراک نہیں ہوا تھا۔ ابھی وہ محبت میں اس مقام تک نہیں پہنچا تھا جہاں کام عشق کے آڑے آنا چھوڑ دیتا ہے اور بندہ صرف محبوب کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ جو بھی تھا، فی الحال تو وہ اپنے فرائض منصبی کو ہی ترجیح دیتا تھا چنانچہ خیال کے پردے پر بار بار ابھرنے والی ماہ بانو کی شبیہ سے نظریں چرا کر لچ ٹائم تک اپنے معمول کے کام نمٹاتا رہا۔ لچ کے فوراً بعد وہ اور عبدالمنان نور پور کے لیے روانہ ہو گئے۔ نور پور تک کا راستہ کافی طویل ہونے کی وجہ سے یہی امید تھی کہ انہیں واپسی میں مغرب تک کا وقت تو ضرور ہی ہو جائے گا۔

”نور پور میں کنسرکشن کی کیا صورت حال ہے؟“

دوران سفر اس نے عبدالمنان سے پوچھا۔

”کام تو حتی الامکان تیزی سے ہی ہو رہا ہے۔ اسکول اور مرکز صحت دونوں کی عمارتیں تیاری کے تقریباً آخری مراحل میں ہیں۔ ہم نے اسٹاف کے اپائنٹمنٹ کی کارروائی بھی شروع کر دی ہے لیکن نور پور کا اہم مسئلہ یعنی بجلی کی فراہمی... ابھی تک اس سلسلے میں کچھ نہیں ہو سکا ہے۔ چیمہ صاحب نے اس سلسلے میں جو وعدہ کیا تھا، وہ ابھی تک بس وعدہ ہی ہے۔ میری چودھری بختیار سے جو آخری ملاقات ہوئی تھی اس میں اس نے اس معاملے کی طرف توجہ دلائی تھی۔ اصل میں اس نے گاؤں میں چھوٹی صنعتوں کے آغاز کا جو منصوبہ بنا رکھا ہے، اس پر عمل درآمد کے لیے بجلی کی عدم موجودگی سب سے بڑا مسئلہ ہے۔“ عبدالمنان نے تفصیل سے اس کے سوال کا جواب دیا۔

”واقعی یہ تو بہت اہم مسئلہ ہے۔ میں بھی پچھلے سارے عرصے میں اتنی بڑی طرح الجھا رہا کہ اس معاملے کو بھول ہی گیا۔ تم ذرا چیمہ صاحب کا نمبر ملاؤ۔ ابھی اسی وقت انہیں یاد دہانی کروا دیتے ہیں۔“ اپنی کوتاہی پر دلی افسوس محسوس کرتے ہوئے اس نے عبدالمنان کو حکم دیا جس پر اس نے فوراً ہی عمل درآمد کیا۔

”میں اے سی شہریار عادل صاحب کا پی اے

عبدالمنان بات کر رہا ہوں۔ اے سی صاحب مسٹر چیمہ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ کیا اس وقت یہ ممکن ہو سکے گا؟“ رابطہ ہونے پر اس نے مہذب لہجے میں دوسری طرف سے کال ریسپونڈ کرنے والے چیمہ کے پی اے سے پوچھا۔

”آئی ایم سوری مسٹر عبدالمنان! فی الحال چیمہ صاحب ایک اہم میٹنگ میں ہیں اس لیے ان سے بات کروانا ممکن نہیں۔ جیسے ہی وہ میٹنگ سے فارغ ہوتے ہیں، میں انہیں میسج دے دیتا ہوں۔“ دوسری طرف سے بھی اسی پیشہ ورانہ تہذیب کا مظاہرہ کیا گیا۔ ویسے چیمہ کا پی اے چونکہ شہریار اور چیمہ کی ملاقات کے دوران موجود رہا تھا، اس لیے وہ اس سے اور اس کے خاندانی پس منظر سے اچھی طرح واقف تھا۔... ورنہ ممکن تھا کہ ایک وفاقی وزیر کا پی اے، ایک **چھوٹے ضلع** کے اے سی کے پی اے سے اتنی رواداری کا مظاہرہ نہ کرتا۔

”او کے! فی الحال تو بات نہیں ہو سکی لیکن تمہیں خود دوبارہ اب دھیان سے میری چیمہ صاحب سے بات کروانی ہو گی۔“ عبدالمنان نے دوسری طرف سے ملنے والا جواب شہریار کے گوش گزار کیا تو اس نے اسے تاکید کی اور پھر فوراً ہی سامنے کے منظر میں الجھ گیا۔ وہ تقریباً دس بارہ افراد تھے جو ایک چارپائی اٹھائے سڑک پر آٹکے تھے۔ چارپائی پر کوئی مختصر سا وجود دراز ہے، یہ فاصلہ ہونے کے باوجود شہریار نے دیکھ لیا تھا۔

”گاڑی روک دو۔“ ہجوم تقریباً سڑک کے درمیان آ گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ ڈرائیور اس سے کئی کاٹ کر آگے نکل جاتا، شہریار نے اسے حکم دیا۔ ڈرائیور نے حکم کی تعمیل کی۔ شہریار اور عبدالمنان گاڑی سے نکل آئے۔

”یہ کیا معاملہ ہے؟ تم لوگ اس طرح بچ سڑک پر کیوں کھڑے ہو؟“ عبدالمنان نے آگے بڑھ کر ان لوگوں سے سوال کیا۔

”یہ میرا بھانجا ہے صاحب! اس کی حالت بہت خراب ہے۔ اگر اسے فوراً اسپتال نہیں پہنچایا گیا تو یہ مر جائے گا۔ ہم اپنے گاؤں سے اسے منجی پر ڈال کر یہاں تک لائے ہیں کہ اگر کوئی لاری یا ٹرک سڑک سے گزرے تو اسے نورکوٹ کے اسپتال تک پہنچا سکیں۔“ ایک منحنی سے شخص نے آگے بڑھ کر عبدالمنان کے سوال کا جواب دیا۔ اس دوران لوگوں نے چارپائی نیچے رکھ دی تھی اور اس پر لیٹا بارہ تیرہ سال کا لڑکا صاف نظر آ رہا تھا۔ لڑکے کی حالت واقعی بہت خراب تھی۔ اس کی باجھوں سے جھاگ بہہ رہا تھا اور وہ خود

تقریباً غشی کے عالم میں تھا۔

”اے گاڑی میں بٹھاؤ عبدالمنان۔ ہم واپس نورکوٹ جائیں گے۔“ لڑکے کی حالت کے پیش نظر شہریار نے فوری فیصلہ کرتے ہوئے عبدالمنان کو حکم دیا اور خود واپس گاڑی کی اگلی نشست پر جا بیٹھا۔ اس کے حکم پر لڑکے کو چارپائی سے اٹھا کر گاڑی کی پچھلی نشست پر منتقل کیا گیا۔ اس کے ساتھ عبدالمنان اور لڑکے کا ماموں بھی موجود تھا۔

”آپ کا بہت شکریہ صاحب! یہ لڑکا میری بہن کا اکلوتا پُتر ہے۔ اس کا پیو وڈی خراب طبیعت کا مالک ہے۔ اگر منڈے کو کچھ ہو گیا تو وہ میری بہن کو جان سے مار دے گا۔“ ڈرائیور نے گاڑی موڑ کر واپس نورکوٹ جانے والے راستے پر ڈالی تو بچے کا ماموں شکر گزار لہجے میں بولا۔

”اس بچے کو ہوا کیا ہے؟“ شہریار نے بچے کی غیر ہوتی حالت دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”رب جانے صاحب کہ کیا ہو گیا۔ چنگا بھلا ہی تھا سویرے تک۔ دوپہر میں تاپ چڑھا تو ماں ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ اس نے جانے کیسا ٹکا لگایا کہ بچہ ہاتھوں میں آنے لگا۔ خبیث بولا کہ پریشانی کی کوئی گل نہیں۔ بچے کو گھر لے جاؤ، تھوڑی دیر بعد طبیعت سنبھل جائے گی۔ میری بہن سیدھی سادی عورت اس کی چال میں آگئی، پر گھر جا کر تو بچے کی حالت ہی بگڑ گئی۔ اس کو جھٹکے لگنے لگے۔ بہن دوبارہ ڈاکٹر کی دکان کی طرف بھاگی کہ اسے بلا کر بچے کی حالت دکھائے لیکن وہ مردود تو وہاں پر تھا ہی نہیں۔ ارد گرد والوں نے بتایا کہ وہ تو ایک تھیلے میں اپنا سامان رکھ کر اپنی ویسپا پر بھاگ نکلا۔ میں نے کہا اس مردود سے بعد میں نمٹیں گے، پہلے بچے کو تو اسپتال پہنچانے کی کوشش کریں۔ بس اللہ نے ساتھ دیا کہ سڑک پر آتے ہی آپ کی گڈی مل گئی۔ بچہ چنگا بھلا ہو کر خیر نال گھر آجائے، باقی اس ڈاکٹر دے پُتر سے تو اس کا پیو خود ہی بعد میں دودو ہاتھ کر لے گا۔ وڈا وکھری بندہ ہے وہ۔ تھہ چھٹ ایسا کہ گل بعد میں کرتا ہے بندے کی گڈی پہلے پڑتا ہے۔“ بچے کا ماموں مسلسل بولتا ہوا انہیں معلومات فراہم کر رہا تھا۔

”اس ایریے میں ڈاکٹر کہاں سے آیا؟ ہمیں اپنے ہیلتھ یونٹس کے لیے تو ڈاکٹر ملتے نہیں ہیں۔“ شہریار نے پلٹ کر عبدالمنان سے سوال کیا۔

”ڈاکٹر واکٹر کیا سر... اس طرح کے علاقوں میں جہاں میڈیکل کی سہولیات دستیاب نہیں ہوتیں، اتائی اپنی دکانیں کھول کر بیٹھ جاتے ہیں اور خود کو ڈاکٹر کہلوانے لگتے

ہیں۔ ان ٹان کو ایفائیڈ ڈاکٹر کی کم علمی اور ناٹری پین کی وجہ سے اس طرح کے واقعات رونما ہونے کی اطلاع ملتی رہتی ہے... جیسا کہ اس وقت ہمارے سامنے ہے۔“ عبدالمنان نے اپنے سامنے موجود بچے کی طرف اشارہ کیا جس کی حالت ہرگز رتے لمحے کے ساتھ دگرگوں ہوتی نظر آرہی تھی۔

”یہ تو سیدھا سیدھا کرائم ہے۔ ایسے افراد کے خلاف تو سخت ایکشن لینا چاہیے۔ آخر ہم کیسے کسی کو اجازت دے سکتے ہیں کہ وہ انسانی زندگیوں کے ساتھ کھیلے۔“ بچے کی حالت شہریار کو غصے میں مبتلا کر رہی تھی۔ وہ ذرا سارخ موڑ کر بچے کے ماموں کی طرف متوجہ ہوا۔

”آپ اس جعلی ڈاکٹر کا حلیہ اور اس کی ویسپا کا نمبر بتا سکتے ہیں؟“

”ویسپا کا نمبر تو مجھے نہیں مالوم صاحب! بس اتنا پتا ہے کہ نیلے رنگ کی ویسپا ہے۔ رہی اس خبیث کے حلیے کی گل تو حلیہ تو اس کا ایسا ہے کہ دیکھتے ہی اس کی خباثت کا مالوم بڑھ جاتا ہے۔ کالی سیاہ تو بے جیسی رنگت، بوٹا سا قد، خوب باہر کوٹنگی ہوئی توند اور وڈی وڈی موچھیں ہیں اس کی۔“ بچے کا ماموں جو شہریار کو بطور اے سی نہیں پہچانتا تھا، اس کے بارے میں لہجے اور انداز سے اس کی بااختیار حیثیت کا اندازہ لگاتے ہوئے مرعوب سے لہجے میں بتانے لگا۔

”عبدالمنان! ڈی ایس پی منظور کو فون کرو کہ ساری چیک پوسٹس پر پیغام دے دے کہ نیلے رنگ کی ویسپا پر ایسے حلیے والا کوئی شخص نظر آئے تو اسے فوراً گرفتار کر لیا جائے۔ ابھی اتنی زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے۔ وہ شخص ضلع سے باہر نکلنے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہو گا۔“ اس نے عبدالمنان کو حکم دیا جس کی تعمیل کے لیے وہ اپنا موبائل نکال کر فوراً ہی ڈی ایس پی منظور کو کال کرنے لگا۔

”یہ کون صاحب ہیں جناب؟“ وہ کال کر کے فارغ ہوا تو بچے کے سختی سے ماموں نے سرگوشی میں اس سے پوچھا۔

”یہ ہمارے ضلع کے اے سی صاحب ہیں۔“ عبدالمنان نے جواب دیا تو اس کا منہ کھل گیا۔ یقیناً کسی سرکاری افسر کا ایسا ہمدردانہ رویہ اس کے لیے حیران کن تھا۔ اسے اپنی اس حیرت کا زبان سے اظہار کا موقع نہیں ملا اور گاڑی نورکوٹ کے اسپتال کے سامنے رک گئی۔ ڈرائیور اور بچے کے ماموں مل کر بچے کو گاڑی سے اتار کر اسپتال میں منتقل کرنے لگے۔ اسپتال کے عملے کے لیے شہریار کی گاڑی جانی پہچانی تھی چنانچہ فوراً ہی ایک ذمے دار بھاگا ہوا باہر آیا۔

”اس بچے کا ٹریڈنٹ بہت کیرفل ہو کر کرنا ہے۔ بعد

میں مجھے اس کی حالت کے بارے میں انفارم کیجیے گا۔“
شہر یار نے اسے ہدایت دی جس کے جواب میں اس نے تیزی سے اپنی گردن کو حرکت دی اور بولا۔ ”آپ فکر نہ کریں سر! ہم بچے کا پورا دھیان رکھیں گے۔“
”واپس دفتر چلو۔“ اسپتال کے گیٹ پر عملے کے کسی فرد نے ڈرائیور کی جگہ سنبھال لی تھی اس لیے وہ واپس آ گیا تھا۔ شہر یار نے یہ جملہ اسی سے کہا تھا۔ اس نے فوراً حکم پر عمل درآمد کیا اور گاڑی دفتر کی طرف چل پڑی۔ اس ایمرجنسی کیس کی وجہ سے ان کا آج نور پور جانے کا پروگرام ملتوی ہو گیا تھا لیکن شہر یار مطمئن تھا۔ ایک انسانی زندگی اس کے نور پور کے دورے سے زیادہ اہم تھی۔

”اس جعلی ڈاکٹر کو گرفتار کر لیا گیا ہے سر۔“ وہ لوگ ابھی دفتر واپس نہیں پہنچے تھے کہ عبدالمنان کے موبائل پر کال موصول ہوئی اور اس نے شہر یار کو اطلاع دی۔
”گڈ... ویری گڈ۔ خیال رکھنا کہ یہ شخص کسی طرح بچ نکلتے میں کامیاب نہ ہو۔ اس کے علاوہ اس طرح کے جو دوسرے افراد مختلف علاقوں میں سرگرم ہیں، ان کے بارے میں بھی معلومات حاصل کر کے ان کے خلاف ایکشن لو۔ ہم لوگوں کی زندگیاں ان اتائیوں کے ہاتھ میں دینے کا خطرہ نہیں مول لے سکتے۔“ جعلی ڈاکٹر کی گرفتاری پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اس نے مزید ہدایات جاری کیں لیکن خود اسے اس بات کا بھی احساس تھا کہ عوام کو اتائیوں کے چنگل سے نکالنے کے لیے صرف ان افراد کے خلاف ایکشن لینا کافی نہیں ہوگا۔ اسے جلد از جلد لوگوں کو علاج کی ایسی سستی سہولیات فراہم کرنی ہوں گی کہ اگر کوئی اتائی کہیں بے خبری میں اپنا دھندا اچھانا بھی چاہے تو از خود نا کام ہو جائے۔ طبی سہولیات کی ناقص فراہمی یا عدم دستیابی ملک بھر کا مسئلہ ہے، وہ جانتا تھا لیکن پورے ملک کے مسائل کو حل کرنا اس کے دائرہ اختیار میں نہیں تھا۔ وہ اپنے دائرہ عمل میں رہ کر جو اور جتنا کر سکتا تھا، اتنا کر رہا تھا اور مزید بھی کرتے رہنے کا عزم دل میں رکھتا تھا۔

☆☆☆

ان کے ہر سو برف ہی برف تھی۔ وہ گھنٹوں چلتے تھے اور پھر بھی خود کو اسی برف زار میں پاتے تھے۔ انہیں خود بھی ادراک ہو چکا تھا کہ وہ اس برف زار میں بھٹک گئے ہیں۔ درحقیقت وہ دونوں ہی راستوں سے قطعی نا آشنا تھے۔ انہوں نے فرار کا منصوبہ بناتے وقت صرف ایک بات کو مد نظر رکھا تھا اور وہ یہ کہ تربیت یافتہ یا ک انہیں جانے پہچانے راستوں

سے گزار کر خود ہی منزل مقصود تک پہنچا دے گا لیکن قسمت کی خرابی سے وہ پہلے ہی مرحلے پر یا ک سے محروم ہو گئے تھے۔ انہیں فرار سے روکنے کی کوشش کرنے والوں نے جب ان پر فائرنگ کی تھی تو اس فائرنگ کی زد میں ان کی سواری کا ذریعہ اور راہبر یا ک آ گیا تھا۔ یا ک کے بغیر وہ بالکل بے دست و پا ہو کر رہ گئے تھے۔ اوپر سے عمران خود بھی زخمی تھا۔ ماہ بانو مخصوص وقفے کے بعد اس کے زخم کی مرہم پٹی کر دیتی تھی۔ وہ درد کم کرنے اور بخار اتارنے کی گولیاں بھی باقاعدگی سے کھا رہا تھا لیکن اس کے باوجود اس کی حالت مسلسل دگرگوں ہوئی جا رہی تھی۔

ایسا اس گولی کی وجہ سے تھا جو ابھی تک جسم میں پیوست تھی اور زخم کو خراب کرنے کا سبب بن رہی تھی۔ اس وقت بھی وہ تکلیف کی شدت سے ٹھہرا ہوا تھا اور ساتھ ہی اس کے چہرے کی لہجہ بہ لہجہ بڑھتی سرخی اس بات کی نشان دہی کر رہی تھی کہ بخار ایک بار پھر کافی زیادہ ہو گیا ہے۔ اس کیفیت کے باوجود اس نے اپنے قدم نہیں روکے تھے اور مسلسل چل رہا تھا۔ اس کے صحت مند شانے سے وہ تھپلا بھی لٹکا ہوا تھا جس میں ان کی ضرورت کا سامان تھا۔ ایسا ہی ایک تھپلا ماہ بانو کے پاس بھی تھا۔ یا ک کی موت اور عمران کے زخمی ہونے کے بعد انہوں نے اپنے ساتھ لایا ہوا سامان دو حصوں میں تقسیم کر کے الگ الگ تھیلوں میں رکھ لیا تھا۔ ماہ بانو کے جیسے میں جو تھپلا آیا تھا، اس میں خوراک اور ادویات موجود تھیں جبکہ عمران کے تھیلے میں سلپنگ بیگز، اسٹوو، پانی کی بوتلیں اور کچھ ایسی چیزیں موجود تھیں جو کسی برفانی علاقے میں سفر کے دوران معاون ثابت ہوتی ہیں۔ اسلحہ بھی زیادہ تر اس نے اپنے پاس ہی رکھا تھا اور ماہ بانو کے پاس صرف ایک ہلکی سی رائفل تھی۔ اگر وہ زخمی نہیں ہوتا تو یقیناً سارا بوجھ خود ہی اٹھانا پسند کرتا لیکن اب مجبوری تھی اس لیے ماہ بانو کو بھی اس کا ساتھ دینا پڑ رہا تھا۔

وہ دونوں ہی بے حد تھک چکے تھے لیکن ایک بار پھر زندگی کی رونقوں میں شامل ہونے کی خواہش نے انہیں سفر جاری رکھنے پر مجبور کر رکھا تھا۔ اس خواہش کا دامن تھا، اس وقت وہ ایک کلیشیز پر سے گزر رہے تھے۔ قدرے سخت برف والے اس کلیشیز پر قدم بجا کر چلنے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آرہی تھی لیکن تیز نیکی ہوائیں خوب مزاج پوچھ رہی تھیں۔ ان ہواؤں کی ٹھنڈک میں ایسی کاٹ تھی کہ بارہا انہیں محسوس ہوتا جیسے ہوا کے ساتھ برف کی کرچیاں سی آ کر ان کے چہرے سے ٹکرا رہی ہوں۔ ان کاٹ دار ہواؤں سے

بچنے کے لیے انہوں نے اپنے سروں پر پہنی مخصوص ٹوپوں کو چہرے پر بھی بٹخ لیا تھا اور اب صرف ان کی آنکھیں ہی کھلی تھیں جن پر انہوں نے چشمے چڑھالیے تھے۔ لیکن برف زاروں کی موسمی شدت کا مقابلہ کرنا اتنا آسان کہاں ہوتا ہے... یہاں موسم اتنی تیزی سے اور اچانک بدلتے ہیں کہ ہر احتیاطی تدبیر نا کام ہوتی چلی جاتی ہے۔

ان کے ساتھ بھی یہی صورت حال پیش آئی۔ پہلے ٹھنڈی بخ ہواؤں کا ساتھ دینے کے لیے موٹے موٹے بارش کے قطرے ٹپکنے لگے اور پھر بڑی تیزی سے ان قطروں نے منجمد ہو کر برف کی شکل اختیار کر لی۔ روٹی کے گالوں کی طرح تو اتر سے گرتی برف جہاں سردی کے احساس کو بڑھا رہی تھی، وہیں اس نے ارد گرد کے منظر کو بھی دھندلا ڈالا تھا۔ ان کے لیے چند فٹ آگے کا راستہ دیکھنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ قدیم اٹھانے پر مجبور تھے کیونکہ آس پاس کوئی ایسی پناہ گاہ بھی نہیں تھی جہاں کچھ دیر رک کر اس برف باری سے محفوظ رہا جاسکے۔

”ماہ بانو! میرا ہاتھ تھام لو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس دھند میں ہم ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں۔“ ماہ بانو کو اپنے قریب سے عمران کی مدہم سی آواز سنائی دی تو اس نے فوراً اس کی ہدایت پر عمل درآمد کیا۔ اس ویران برف زار میں تنہا رہ جانے کا خیال ہی بہت خوفناک تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ جگہ جہاں عمران کے ساتھ ہونے کے باوجود زندگی کی بقا کے لیے جدوجہد کرنا دشوار محسوس ہو رہا ہے، تنہا رہ جانے کی صورت میں دشوار تر بن ہو جائے گی۔

”پتا نہیں ہم یہاں سے نکل بھی سکیں گے یا نہیں؟“
لہجہ بہ لہجہ اپنے لباس پر مونی ہوئی برف کی تہ کو محسوس کرتے ہوئے اس نے قدرے مایوس کن لہجے میں عمران سے کہا۔
”انشاء اللہ... ہم یہاں سے ضرور نکلنے میں کامیاب ہوں گے۔ تمہیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جیسے اللہ تمہیں پہلے ہر مصیبت سے بچاتا رہا ہے، ویسے ہی یہاں سے بھی بچا کر نکال دے گا۔“ عمران نے اسے تسلی دی۔

”شاید تم ٹھیک کہہ...“ ابھی اس کے الفاظ اس کے منہ میں ہی تھے کہ ایک زوردار جھٹکا لگا اور اس نے اپنے بڑھے ہوئے دائیں قدم کے نیچے سے زمین کو غائب پایا۔ اس کا بائیں قدم ابھی زمین پر ہی تھا لیکن وہ بھی اتنی مضبوطی سے نہیں جما ہوا تھا کہ وہ خود کو سنبھال پائی۔ اضطرابی طور پر اس کے حلق سے ایک زوردار چیخ نکلی پھر اس کے جسم کو ایک اور زوردار جھٹکا لگا۔ یہ عمران تھا جس نے پوری قوت سے اسے

پیچھے کی طرف کھینچا تھا۔ نظر اسے بھی کچھ نہیں آیا تھا لیکن ماہ بانو کا ہاتھ گرفت میں ہونے کی وجہ سے اس نے اس کے جسم کو لگنے والا جھٹکا فوری طور پر محسوس کر لیا تھا اور فوری رد عمل کے طور پر اسے پیچھے کی طرف بٹخ لیا تھا۔ اس خوفناک لمحے سے گزرنے کے بعد انہوں نے بہ غور جائزہ لیا تو ایک دراڑ نظر آئی۔ کسی کلیشیز پر موجود ایسی دراڑیں نہایت قاتل ہوتی ہیں۔ اگر کوئی شخص بے دھیانی میں دراڑ میں گر جائے تو پھر اس کا بچنا ممکن نہیں رہتا۔ نیچے موجود برف جیسا پانی لمحوں میں اسے منجمد کر کے زندگی سے محروم کر دیتا ہے۔ یہ ماہ بانو کی خوش قسمتی تھی کہ دراڑ نے اسے نکلنے نکلنے یک دم ہی بخش دیا تھا اور عمران کا ہاتھ تھامنا اس کے کام آ گیا تھا۔

جو حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا تھا، اس کے خوف نے انہیں مزید قدم آگے بڑھانے کی ہمت نہیں کرنے دی اور وہ وہیں رک کر برف باری رکنے کا انتظار کرنے لگے۔ یہ انتظار زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا اور برف باری جس طرح اچانک شروع ہوئی تھی، اسی طرح اچانک رک گئی۔ لیکن اتنی دیر میں ان دونوں کا حشر خراب ہو چکا تھا۔ ان پر اتنی برف گر چکی تھی کہ وہ خود برف سے بنے ہوئے پتے لگ رہے تھے۔ برف باری رکی تو انہوں نے اپنے اوپر سے برف کی تہ جھاڑی اور آگے کا سفر شروع کیا۔

جس دراڑ میں ماہ بانو گرتے گرتے پگی تھی، وہ زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ ان دونوں نے آرام سے وہ دراڑ پھلانگ لی اور آگے کا سفر شروع کیا لیکن اب وہ بہت زیادہ محتاط تھے اور ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھا رہے تھے۔ انہوں نے اپنی رائفلز کو واکنگ اسٹک کی طرح ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔ اس طرح وہ برف کی کسی پتلی تہ کے نیچے چھپی دراڑ سے محفوظ رہ سکتے تھے۔ آگے کا سفر زیادہ طویل نہیں تھا۔ وہ جلد کلیشیز کو پار کر کے ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے جہاں کچھ دیر سستایا جاسکتا تھا۔ عمران جواب تک بہت زیادہ ہمت کا مظاہرہ کرتا رہا تھا، اس مقام پر پہنچ کر بالکل ڈھے گیا اور اپنا سلپنگ بیگ بچھا کر اس میں گھس گیا۔ اس کی حالت کے پیش نظر ماہ بانو نے چولہا جلایا اور جلدی سے نوڈلز سوپ کا پیکٹ نکال کر سوپ تیار کیا اور پھر چائے کا پانی چڑھایا۔

گرما گرم سوپ نے عمران کے سرد پڑتے جسم کو خاصی توانائی فراہم کی اور وہ اس لائق ہو گیا کہ اٹھ کر بیٹھ سکے۔ سوپ پینے سے خود ماہ بانو نے بھی خود کو کافی بہتر محسوس کیا تھا۔ چنانچہ چائے نکالنے سے پہلے اس نے پہلے عمران کے زخم کی نئے سرے سے مرہم پٹی کی۔ ٹھنڈک نے زخم پر برا اثر ڈالا تھا اور زخم کے ارد گرد کی جگہ پر اس کا گوشت کالا پڑتا ہوا محسوس

ہو رہا تھا... لیکن ماہ بانو مجبور تھی۔ وہ زخم کی پٹی تبدیل کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ پٹی تبدیل کرنے کے بعد اس نے کپوں میں چائے نکالی۔ ساتھ ہی ڈبل روٹی کے ٹکڑے بھی تھے۔ چائے کے ساتھ ڈبل روٹی کھانے کے بعد عمران نے بخار اور درد کم کرنے والی گولیاں کھائیں اور ماہ بانو کو سامان سمیٹتے ہوئے دیکھتا رہا۔

”اب آگے چلتے ہیں۔“ وہ سامان سمیٹ چکی تو اس نے اس سے کہا۔

”تم مزید چل سکو گے؟“ ماہ بانو نے اس کی حالت کے پیش نظر تشویش سے پوچھا۔

”چلے بغیر گزارہ بھی تو نہیں ہے۔ یہاں بیٹھ کر اپنی موت کا انتظار کرنے سے بہتر ہے کہ آخری سانس تک جدوجہد کی جائے۔“ اتنی تکلیف اور مایوس کن صورت حال کے باوجود عمران کا عزم اور حوصلہ قابل ستائش تھا۔

”ٹھیک ہے پھر چلتے ہیں۔“ ماہ بانو نے اپنے سامان کا تھیلہ کاندھے پر لٹکا لیا۔ سامان سمیٹ کر رکھنے کے دوران وہ عمران کے تھیلے کا بھی کچھ سامان اپنے تھیلے میں منتقل کر چکی تھی۔ وہ زخمی اور بیمار تھا اس لیے وہ اسے کم سے کم زحمت دینا چاہتی تھی۔ اگر ممکن ہوتا تو وہ پورا ہی سامان خود اٹھا لیتی... لیکن ظاہر ہے اس کا تعلق صنف نازک سے تھا اور وہ ایک حد سے زیادہ بوجھ اٹھانے کی اہل نہیں تھی۔ اگر اس کی پرورش گاؤں کے سخت ماحول میں ہوئی ہوتی تو پھر بھی اسے سخت کوشش کی عادت ہوتی لیکن بے بے اور ابانے اسے بڑے ناز و نعم سے پالا تھا اور اس نے زندگی میں کتابوں کے بوجھ کے سوا مشکل سے ہی کوئی دوسرا بوجھ اٹھایا تھا۔ وہ تو اس میں قدرتی طور پر ماحول کے مطابق خود کو ڈھال لینے کی زبردست صلاحیت موجود تھی اس لیے وہ اپنے سخت حالات سے کسی نہ کسی طرح گزرتی جا رہی تھی۔ اس صلاحیت کے بغیر ممکن ہی نہیں تھا کہ گرم میدانوں کی رہنے والی یہ لڑکی اس برف زار میں اپنی بقا کی جنگ لڑ سکتی۔

”میرے خیال میں ہم اپنا رخ بدل کر جنوب کی طرف سفر شروع کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اس سمت میں چلنے پر ہمیں آبادی کی طرف جانے والا کوئی راستہ بھائی دے جائے۔“ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد عمران نے خیال ظاہر کیا۔ اس کے پاس اتفاق کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ لوگ برف کے ان سفید اندھیروں میں مسلسل ٹامک ٹوبیاں ہی مار رہے تھے۔ ان کے پاس سفر کے لیے کوئی واضح منصوبہ تو موجود نہیں تھا کہ اختلاف کی گنجائش نکل پائی۔ بس راستہ چلتے ایک کو اگر کوئی خیال سوجھ جاتا تو دوسرا اس پر عمل درآمد کرنے میں ہی بہتری جانتا۔

اس وقت بھی انہوں نے اپنا رخ بدل کر جنوب کی سمت سفر شروع کر دیا۔ زخمی ہونے کے باوجود عمران کی رفتار اس سے زیادہ تھی۔ وہ اپنے جیسے کے بوجھ میں اضافہ کرنے کے بعد کچھ سست رفتار ہو گئی تھی لیکن بہر حال منظر صاف ہونے کی وجہ سے یہ درمیانی فاصلہ کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا تھا اور وہ دورہ کر بھی ایک دوسرے پر نظر رکھ سکتے تھے۔ اس وقت وہ جس مقام سے گزر رہے تھے، وہ خود تو ہموار تھا لیکن اس پر بہت سی برف پوش چوٹیاں بھگی ہوئی تھیں۔ ان چوٹیوں نے نہ جانے کب سے گرنے والی برف کا بوجھ اپنے سروں پر اٹھایا ہوا تھا اور دیکھنے کے ساتھ ہی یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ اپنا بوجھ اتار پھینکنے کی خواہش مند ہوں۔ کم از کم ماہ بانو کو ان چوٹیوں پر نظر ڈال کر یہی احساس ہوا تھا۔ اب جانے یہ قدرت کا طے شدہ فیصلہ تھا یا اس کے احساس کی شدت کہ یکا یک فضا میں ایک زوردار دھماکا گونجا اور دو پہاڑوں کے درمیان سے برف کا تودہ لڑھکتا ہوا نیچے آنے لگا۔

برف کا یہ بھاری تودہ اپنے راستے میں موجود برف کو بھی دھکیلتا ہوا لارہا تھا۔ برسوں سے پہاڑوں پر گری برف سفید سفوف کے آبشار کی شکل میں نیچے کی طرف برق رفتاری سے بہتی چلی آرہی تھی۔ یہ ایواناچ تھا۔ برف زاروں کا ایک خاص تحفہ جسے ایک جانب کھڑے ہو کر خوش گوار موڈ میں دیکھو تو اس سے بڑھ کر خوب صورت منظر کوئی نہ لگے... اور اگر جو کوئی اس کی زد میں آجائے تو بچ نکلنے کی راہ نہ پائے۔ ماہ بانو نے اپنی زندگی میں پہلی بار کوئی ایواناچ دیکھا تھا چنانچہ مل بھر کو تو وہ منہ کھولے حیرت کے عالم میں اسے ٹکٹی ہی چلی گئی لیکن پھر یک دم اسے عمران کا خیال آیا۔ وہ اسی طرف تھا جس طرف اس ایواناچ کا رخ تھا۔ اس نے نظروں کا رخ بدل کر عمران کی پوزیشن کا اندازہ کرنے کی کوشش کی۔ اس نے بھی ایواناچ کی وجہ سے ابھرنے والی گونج سن لی تھی اور بالکل اسی کی... طرح حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اپنی اس کیفیت میں اسے قطعی ادراک نہیں تھا کہ ایواناچ اس کی طرف بڑھتا چلا آرہا ہے۔

”عمران! بھاگو... ہٹ جاؤ وہاں سے۔“ ماہ بانو زور سے چیخی لیکن اس کی آواز برفانی تودے کی گڑگڑاہٹ میں دب گئی۔ پھر عمران نے خود ہی صورت حال کو بھانپ لیا اور اپنی جگہ سے بھاگا لیکن اس کی رفتار ایواناچ کی رفتار کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ ایواناچ کسی پھنکاریں مارتے سفید اثر دہے کی طرح اس کی طرف لپکتا چلا جا رہا تھا۔

حادثات و سانحات کی شکار... پناہ کی تلاش میں سرگرداں
ماہ بانو کی داستان حیات کے واقعات اگلے ماہ پڑھیں